خطباتِ طاہر

خطباتِ جمعہ 1996ء

فرمودہ

سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع
رحمہ اللہ تعالیٰ

جلد 15

طاہر فاؤنڈیشن

نام کتاب	....	خطبات طاہر جلد نمبر 15
بیان فرمودہ	....	حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ
اشاعت	....	
ناشر	....	طاہر فاؤنڈیشن
مطبع	....	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے ادارہ طاہر فاؤنڈیشن احباب جماعت کی خدمت خطبات طاہر کی 15 ویں جلد پیش کرنے کی سعادت پا رہا ہے۔ **الحمدللہ علیٰ ذالک**

خطبات طاہر کی یہ جلد سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کے 1996ء کے باون معرکۃ الآرا اور پر معارف خطبات جمعہ پر مشتمل ہے۔

نظام جماعت کی اطاعت اس کی افادیت اور برکات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''جماعت کی طاقت کا راز اس اطاعت میں ہے جو فرشتوں نے دکھائی تھی۔ جانتے تھے کہ یہ وہ وجود آنے والا ہے جس کے نتیجے میں خوب خون خرابہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں فسادات سے زمین بھر جائے گی۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ کیوں بھرے گی یہ معاملہ بعد میں ان پر کھلا جب شیطان نے بغاوت کی اور خدا کو یہ چیلنج دیا کہ میں تیرے بندوں کو کھینچ کر اپنی طرف لے جاؤں گا اور اس طرح ان پر حملہ آور ہوں گا کہ ان کو کچھ دکھائی نہیں دے گا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں۔

پس سب سے بڑا اندھیرا نفس کا یہ اندھیرا ہے۔۔۔اس اندھیرے نے ہمیشہ لوگوں کو ہلاک کیا اور کچھ عرصے کے بعد یہ ٹولے جو بڑے بڑے سر اٹھانے والے تھے، جتھے بنانے والے، سازشیں کرنے والے، ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ جس طرح دودھ سے مکھی کو نکال کے باہر پھینک دیا جاتا ہے خدا تعالیٰ نے ان کی برائیوں سمیت، ان کی انا سمیت، ان کے بڑے بڑے دعاوی سمیت ان کے ٹولوں سے جماعت کو صاف ستھرا کر کے نتھار لیا اور اب ان کا حال دیکھو کہاں پہنچے ہیں۔ کوئی ہے جو جماعت کے مقابل پر فتنے کے سر اٹھانے کے بعد اس سر کو اپنے وجود پر قائم رکھ سکا ہو۔ ان کی سرداریاں ہی ختم ہو گئیں۔ وہ سب سرداریاں جماعت کی برکت تھی، جماعت ہی کی وجہ سے عطا ہوئی تھیں اور ان ظالموں کو پتا نہیں لگا کہ ہم ہیں کیا، ہماری حیثیت کیا ہے۔ یہ جماعت کی برکت ہے جو ہمیں کچھ لوگ عزت سے خطاب کرتے ہیں اور ان عزتوں کو جماعت کے بعد ہم زندہ نہیں رکھ سکیں گے اور نہ کبھی رکھ سکے۔'' (صفحہ: 281، 282 جلد ھذا)

تحریک جدید کے انیس (19) مطالبات پر روشنی ڈالتے ہوئے حضور انور فرماتے ہیں:

''حضرت مصلح موعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ اصل نجات کا راز تحریک جدید کی اس سکیم میں ہے جس کے انیس نکات ہیں۔ وہ تحریک جدید کی سکیم ایسی ہے کہ اگر کسی قوم میں رائج ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوم بھی وہاں سے مالی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ جو قوم اپنی زندگی کے رہن سہن کو سادہ اور غریبانہ بنا لے، جس کو نہ بدیشی کپڑوں میں دلچسپی رہے، نہ بدیشی زیورات میں دلچسپی رہے، نہ بدیشی کھانوں میں دلچسپی رہے، جن کو روزمرّہ کی ساگ اور روٹی گھر میں میسر آ جائے اسی پہ راضی رہیں، جو اپنا کپڑا کاتیں اور اس کھدر پہ راضی رہیں۔ جن کو دکھاوے کے لئے کسی سے قرض لینے کی ضرورت نہیں کسی بینک کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں وہاں کا بینکنگ نظام بھی زیادہ دیر نہیں چل سکتا یعنی ان کے خون نہیں چوس سکتا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایسی قوم ہی ہے جو درحقیقت دنیا میں آزادی کے سانس لے سکتی ہے اور غیروں کو اس میں دخل دینے کا کوئی موقع ہی میسر نہیں آ سکتا۔'' (صفحہ:299 جلد ھذا)

26/اپریل 1984ء کے آرڈیننس کا تذکرہ کرتے ہوئے حضور انور فرماتے ہیں:

''پس آج کے دن سب سے پہلی جو تنبیہ ہے اور ضروری ہے کہ اس تنبیہ کو بار بار دہرایا جائے وہ یہی ہے کہ میں اپنی قوم کو متنبہ کرتا ہوں، ان کے دانشوروں کو، جن میں کچھ دانش باقی ہے کہ غور کر کے دیکھیں تو سہی کہ ان سارے ظلموں کی جڑ ہے کہاں؟ 26/اپریل کے دن جو منحوس فیصلہ ہوا ہے ان تمام نحوستوں کی جڑ اس فیصلے میں ہے اور اس کا ایک قطعی ثبوت یہ بھی ہے کہ جس نے خدا کے نام پر اور اسلام کی محبت کا دعویٰ کر کے اور ایک خادم اسلام کا روپ دھار کر یہ کارروائی کی خدا کی تقدیر نے اس کے پرخچے اڑا دیئے اس کی خاک اڑ گئی اس کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ ایک بھیانک آواز کے ساتھ وہ آسمان پر پھٹا ہے اور اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر بگولوں کی نظر ہو گیا۔ ایک جبڑے کا نشان ہے مگر وہ بھی مصنوعی ہے جس کو ڈنچر کہتے ہیں اس کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی محبت میں قربانیاں پیش کرنے والے، اپنے دین کے دفاع کے لئے عظیم کارنامے کرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کیا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی انگلی نے تو نشاندہی کر دی ہے، دکھا دیا ہے کون بدبخت تھا، کس کی نحوست ہے جو آج تک ساری قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ **جب تک اس فیصلے کو تبدیل نہیں کرو گے تمہارے دن پھر نہیں سکتے ناممکن ہے۔**'' (صفحہ:315 جلد ھذا)

مذہبی انتہا پسندی کے مضمرات سے متنبہ کرتے ہوئے حضورانور فرماتے ہیں:

''جو میں دیکھ رہا ہوں آگے آنے والی باتیں اگر بی۔ جے۔ پی کو حکومت نصیب ہوگئی جو ابھی تک لٹکا ہوا معاملہ ہے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا، تو پھر دیکھیں کہ وہاں کس تیزی سے کیسے گہرے اور دیرپا اثر کرنے والے واقعات رونما ہوں گے اور اس پہلو سے مسلمانوں کو ہر جگہ اپنے کردار، اپنے اعمال، اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ مذہب کے نام پر کسی دوسرے انسان کا حق سلب کرنے کی دنیا کا کوئی مذہب اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر ہندوستان پر لعنتیں ڈالی گئیں تو ہندوستان سے گزر کر تم پر پڑیں گی کہ تم وہ بدبخت لوگ ہو جنہوں نے ان مظالم کا آغاز کیا تھا۔ اس لئے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جو آج ہوا ہے۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک آئندہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا آغاز ہے۔ ایسی تبدیلیاں ہیں جن کی داغ بیل رکھی جا چکی ہے اور اس وقت اس صورت حال میں جماعت احمدیہ پر سب سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ محض اپنی برتری دکھانے کے لئے کہ دیکھو خدا نے ہمیں سچا کر دکھایا ہرگز کمینگی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ہماری قدر مشترک ہے۔ اسلام کی تہذیب، اسلام کے تمدن، اسلام کی طرز زندگی پر حملہ ہونے والا ہے۔ یہاں کسی مسلمان یا کسی مولوی کی بات نہیں ہو رہی۔ وہ حملہ ہے جو مجھے دکھائی دے رہا ہے اور اس میں جماعت احمدیہ کو قربانیوں کی صف میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ہر قیمت پر اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی۔'' (صفحہ:363 جلد ھذا)

محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی وفات پر ان کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضورانور فرماتے ہیں:

''سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ تک پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل۔ بلکہ ایک دفعہ مجھے کہہ رہے تھے کہ جب میں کسی سائنسی اجتماع میں جاتا ہوں تو بعض سرگوشیوں کی آواز آتی ہے یہ وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے اور بھی سائنسدان اب ماننے لگے ہیں پہلے سے بڑھ گئے ہیں لیکن جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد ویگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے اور اس جھنڈے کو بلند کیا ہے ویسا کوئی اور سائنس دان اس جیتی دنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا اور پھر خدائے واحد ویگانہ کی عظمت کے نتیجے میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں ہمیشہ رہا۔ نظام جماعت کے سامنے خادمانہ حیثیت کی حفاظت کی ہے۔'' (صفحہ:805 جلد ھذا)

وقف جدید کی اہمیت اور اس کی برکات کا تذکرہ کرتے ہوئے حضور انور فرماتے ہیں:

’’قادیان ہی نے تو سب دنیا کو دینی ضرورتوں کے لحاظ سے پالا ہے۔ ہندوستان ہی کو لمبے عرصے تک یہ فخر حاصل رہا ہے کہ جب باہر کی دنیا چندوں سے تقریباً نا آشنا تھی تمام دنیا کی ضرورتیں ہندوستان پوری کرتا تھا۔ پھر پاکستان نے ہجرت کے بعد یہ عظیم خدمت اپنے ہاتھوں میں لی، خوب سنبھالا، خوب حق ادا کیا۔ تو ہندوستان کے تعلق میں چونکہ پرانی غیرتیں ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہندوستان میں پیدا ہونا ہے اس محبت کے تقاضے کے طور پر میری دلی خواہش یہی رہتی ہے کہ ہندوستان کو پھر وہ پرانی عظمتیں نصیب ہو جائیں۔ تو اس پہلو سے وقفِ جدید بھی ایک ذریعہ بن گئی ہے ہندوستان کی پرانی کھوئی ہوئی عظمتوں کو واپس حاصل کرنے کا تو اس کی طرف آپ متوجہ ہوں اور اللہ توفیق عطا فرمائے کہ آپ کے اندر کثرت کے ساتھ وہ ولی پیدا ہو جائیں جن ولیوں کا حضرت مصلح موعودؓ نے وقفِ جدید کے تصور میں ذکر فرمایا ہے۔‘‘ (صفحہ: 1005 جلد ھذا)

اللہ تعالیٰ ان سب احباب کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں جلد ھذا کی تیاری میں معاونت فرمائی ہے۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ طاہر فاؤنڈیشن کی اس پیشکش کو قبول فرمائے۔ اس علمی، روحانی اور تاریخی خزانہ کو لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنائے اور ہمیں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کے علمی فیضان کو جاری رکھنے اور اسے لوگوں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرماتا چلا جائے۔ آمین

خاکسار

مظفر احمد ظفر

چیئرمین طاہر فاؤنڈیشن



سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ (1928-2003)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست خطبات (1996ء)

حکمت تو اموال سے بہت بہتر ہے اور حکمت ہی ہے جو دراصل اموال کے حصول کا موجب بن جایا کرتی ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 5 /جنوری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۸﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۹﴾ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۷۰﴾ (البقرہ: 268 تا 270)

فرمایا:

یہ آیات کریمہ جن کی میں نے تلاوت کی ہے یہ سورۃ البقرہ کی 268 تا 270 ویں آیات ہیں۔ ان آیات میں مالی قربانی کی طرف بہت ہی لطیف انداز میں اس طرح توجہ دلائی ہے کہ انسانی فطرت کی ایک کمزوری کو سامنے رکھ کر متنبہ فرمایا ہے کہ خدا کی راہ میں جب خرچ کرنے ہوں تو اپنی اس کمزوری کو پیش نظر رکھنا اور خرچ کرتے وقت ٹھوکر نہ کھا جانا تمہیں علم ہونا چاہئے کہ تم جو بھی خرچ کرتے ہو کس مقصد سے کر رہے ہو، کس کے حضور پیش کر رہے ہو اور اس کے آداب کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا لازم ہے۔

یہ مضمون اس طرح بیان فرمایا کہ دیکھو جب تم خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہو تو اے ایمان والو! طیبات میں سے خرچ کیا کرو مَا كَسَبْتُمْ جو کچھ بھی تم کماتے ہو ان میں سے بہترین چیز پیش کیا کرو کیونکہ جب ایک دوسرے کو تم تحائف پیش کرتے ہو تو جتنا کسی سے زیادہ تعلق ہو، جتنا کسی کی عزت ہو، جتنا کسی کا احترام ہو اسی قدر تحفہ چنتے وقت انسان اپنی ملکیت میں سے بہترین چنتا ہے۔ اگر باغوں والا ہے تو پھل وہ چنے گا جو چوٹی کا پھل ہے اور تاجروں کی طرح نہیں کرتا کہ گندہ پھل شامل کر کے تو اوپر دو چار پھل رکھ دیئے تا کہ اچھی چیز قبول ہو جائے، قیمت مل جائے خواہ بعد میں پتا چلے کہ یہ تو نہایت ہی گندی اور غلیظ چیز تھی جس کا سودا کیا گیا ہے تو اللہ سے تو دھوکہ ہو نہیں سکتا لیکن دنیا میں بھی انسان اپنی محبتوں اور تعلقات کی قدر کرتا ہے اور اپنے پیاروں سے دھوکے نہیں کیا کرتا۔ تاجر دھوکے کرتا ہے، محبت کے ساتھ پیش کرنے والا دھوکہ نہیں کرتا تو فرمایا تمہارا تو میرے ساتھ ایک محبت کا سودا ہے اور دوسرے یہ کہ ہم نے تمہیں دیا ہے۔ اس لئے جب ہم نے دیا ہے تو پھر اگر تم گندی چیز دو گے تو تمہارا بہت گہرا نقصان ہو گا ایک تو یہ کہ تحفہ نامقبول، دوسرے تم یہ ہمیں نمونہ دکھا رہے ہو گے کہ ہم تو گندی چیزیں دیا کرتے ہیں۔ ہمیں بھی پھر گندی ملنی چاہئے اور احسان فراموش کو تو حقیقت میں کچھ بھی نہیں ملا کرتا۔ تو خدا نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے تو نہیں مانگا خدا نے تو ہماری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مانگا ہے اور یہ ضرورتیں دو طرح سے پوری ہوتی ہیں۔ اول تزکیہ نفس، دوسرے احسان کا بدلہ اتارنے کی جو تمنا ہے وہ کچھ نہ کچھ پوری ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات عید پر بچے بھی ماں باپ کے لئے تحفے لے کر آتے ہیں حالانکہ سب کچھ وہی دیتے ہیں۔ انہی سے وظیفے ملتے ہیں، انہی سے ماہانہ اخراجات عطا ہوتے ہیں، انہی کا کھانا کھاتے ہیں، انہی کے گھر میں رہتے ہیں مگر جب وہ عید یا کسی اور ایسے موقع پر تحفہ پیش کرتے ہیں تو ماں باپ کا دل خوشیوں سے اچھلنے لگتا ہے۔ اس تحفے کو جو پیار اور محبت سے سجا کر پیش کرتے ہیں وہ قبول کرتے ہیں جیسے ان کو ایک دنیا جہان کی نعمت مل گئی ہو تو یہ محبت کے سلسلے اور ہیں، ان کا نظام اور ہے، ان کے قوانین مختلف ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے جب ہم تجھ سے مانگتے ہیں تو ایک پیار کا اظہار ہے تا کہ تمہیں بھی محبت کے سلیقے آئیں تا کہ تمہاری بھی یہ خواہش پوری ہو کہ جس نے ہمیں سب کچھ دیا ہے کبھی ہم بھی تو اسے کچھ دیں۔ اگر خدا نے یہ نظام نہ قائم کیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ انسان

اس تمنا کو جو اس کی فطرت میں گھول دی گئی ہے کبھی کسی پہلو سے بھی پوری کر سکتا۔مگر ماں باپ کے تعلق میں جب انسان یہ کر دیتا ہے اور لذت وخوشی محسوس کرتا ہے تو خدا کے تعلق میں بھی اگر ایسا رشتہ نہ ہو اور ایسی خوشی انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ وابستہ نہ ہو تو انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضائع ہو جائے گا، خدا کو نہیں پہنچ سکتا۔اس مضمون کو یوں اس مثال کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔جو تم کماتے ہو اس میں سے بہترین چیز پیش کیا کرو۔وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ اور اس میں سے جو زمین میں سے ہم نے تمہارے لئے اگایا ہے۔

اب اس کے علاوہ دوسری آیات میں اور اس آیت کی طرز بیان میں ایک تھوڑا سا فرق رکھ دیا گیا ہے جو ابتدائی آیت ہے، جس میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ:4) جو کچھ ہم انہیں عطا کرتے ہیں اس میں سے وہ دیتے ہیں اور یہاں فرمایا ہے مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ جو تم کماتے ہو اس میں سے بہترین دو۔یہ اس لئے کہ انسان کے ضمیر کی پیاس بجھے، اس کو وقتی طور پر یہ خیال آئے کہ جو میں نے کمایا ہے اس میں سے دے رہا ہوں۔مگر اس جاہلانہ خیال کی نفی کرنے کے لئے کہ جو تم نے کمایا ہے گویا تم ہی گھر سے لے کر آئے ہو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو کچھ زمین اگاتی ہے وہ ہم ہی تو اگاتے ہیں عطا کا آغاز ہم سے ہے مگر پھر بھی تم نے محنت میں حصہ لیا ہے، محنت کر کے اس میں حصہ ڈال لیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ تم اپنی محنت سمجھو اور اپنی محنت میں سے جو بہتر حصہ ہے وہ ہمارے حضور تحفے کے طور پر پیش کرو اور یہ نہ کرنا وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ جو پلید چیز ہے جو خبیث اور گندی چیز ہے ہمارے نام پر وہ نہ نکالا کرنا کیونکہ وہ نکالو گے تو تمہارا خبثِ باطن ہی نکلے گا اور کوئی خبیث اور پلید چیز خدا کو نہیں پہنچ سکتی۔وہ چٹی بھی ہے تو ذلیل قسم کی چٹی پڑ گئی ہے تم پر اور اللہ کو ایسی قربانیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور پہچان یہ رکھ دی کہ وہ چیزیں خدا کو مقبول نہیں ہیں جو تم اگر وصول کرو تُنْفِقُوْنَ جب تم خرچ کرتے ہو تو اگر وہ چیزیں تمہیں عطا ہوں تو تمہاری آنکھیں شرم سے جھک جائیں وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وہ چیزیں پلید نہ پیش کرو جو تم دیتے ہو خرچ کے طور پر وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ لیکن جب لینا پڑے تو ایسی پلید چیز قبول نہیں کرتے اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ سوائے اس کے کہ نظریں جھکا کر، شرم پیتے ہوئے، بے چینی کے ساتھ ایک مجبوری کے طور پر قبول کر لو لیکن باوجود اس کے سخت خفت محسوس کر رہے ہوتے

ہو۔ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيۡدٌ اور جان لو کہ اللہ تو غنی ہے اور قابل تعریف ہے۔ غنی ہونے کے لحاظ سے اس کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حمید ہونے کے لحاظ سے اس کو خبیث چیز پہنچ ہی نہیں سکتی۔ جو گندی چیز کسی کو دے گا، جو صاحب حمد ہے اس کو گند تو نہیں پہنچ سکتا۔ ناممکن ہے۔ اس کو وہی چیز ملے گی جو قابل حمد ہو، تعریف کے لائق ہو۔ تو تمہارا تعلق خدا سے کٹ جائے گا بجائے اس کے کہ خدا سے تمہارا تعلق قائم ہو۔

اس کے بعد ایک اور بڑا لطیف مضمون بیان فرمایا کہ تم جب ہاتھ روکتے ہو اچھی چیزیں پیش کرنے سے تو اس کے پیچھے کوئی بات ہے اور بات یہ ہے کہ شیطان تمہیں ایسے رستے پر ڈال رہا ہے جس رستے پر پڑ کے خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے تم محروم ہوتے چلے جاؤ گے اور پھر بھی تمہاری آرزوئیں پوری نہیں ہوسکیں گی۔ تمہارے نفس کی پیاس کبھی بجھ نہیں سکے گی اور تم بد سے بدتر حال میں مبتلا ہوتے چلے جاؤ گے۔ اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ خدا کی راہ میں جو کنجوسی کرنے والے ہیں ان کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ شیطان انہیں فقر سے ڈراتا ہے کہ تم غریب ہو جاؤ گے، فقیر بن جاؤ گے۔ جو کچھ آتا ہے تم دیتے چلے جاتے ہو، تمہارے پاس کیا رہے گا، تمہاری تجارتیں کیسے چلیں گی، بیوی بچوں کے حقوق کیسے پورے کرو گے، روزمرہ زندگی میں جو تم نے ایک عزت بنائی ہوئی ہے اس کے تقاضے کیسے پورے کرو گے تو فقر سے ڈراتا ہے اور جو ڈرنے والا ہے وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ شیطان نے کب دیا تھا جو اس کے تصرفات کے متعلق ہمیں نصیحتیں کر رہا ہے، دیا تو خدا نے تھا اور جس کو ہم دے رہے ہیں وہی ہے جس نے ہمیں دیا تھا تو یہ فقر کا سودا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ عطا کرنے والا لے اور اس طرح لے کہ اس کو غریب اور فقیر اور منگتا بنا کے چھوڑ دے۔ اگر یہ تھا تو پھر دینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تو ایک ایسی ناممکن بات ہے جو کسی صورت میں بھی عقل میں آنہیں سکتی لیکن پھر بھی ڈر جاتے ہو، تم بڑے بے وقوف ہو۔ شیطان جس کا کوئی تعلق بھی نہیں تمہارے رزق سے ہاں بعض صورتوں میں تعلق تم خود بنا لیتے ہو جب ناجائز رزق کماتے ہو تو پھر شیطان کا تم پر دخل ہوتا ہے مگر اللہ نے یہاں ناجائز رزق کی بات ہی نہیں شروع کی۔

فرمایا ہے جو تم کماتے ہو طیبات میں سے تو یہاں اس گروہ کی بات ہو رہی ہے جو ناجائز نہیں کما رہے۔ جو ناجائز کمانے والے ہیں ان سے تو اللہ مانگتا ہی نہیں کبھی۔ کب خدا نے کہا ہے کہ اپنی

حرام کی کمائیوں میں سے مجھے پیش کرو۔ وہ مضمون بحث میں شامل ہی نہیں۔ پس جن کو خدا نے دیا ہے شیطان نے نہیں دیا وہ بڑے بے وقوف ہوں گے اگر شیطان کے ڈرانے سے ڈر جائیں اور خدا کی راہ میں جس نے ان کو عطا فرمایا ہے خرچ کرنے سے پیچھے ہٹ جائیں اور شیطان اس کے ساتھ کیا کہتا ہے۔ یہ بہت ہی گہرا نفسیاتی مضمون ہے کہ فقر سے ڈراتا ہے لیکن فحشاء کا حکم دیتا ہے اور فحشاء وہ زندگی ہے جس میں انسان کو بے حد خرچ کرنا پڑتا ہے اور شیطان کا جھوٹا ہونا اسی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ تمہیں فقر سے ڈراتے ہوئے ایسی باتوں کے شوق لگا دیتا ہے، ایسی تمناؤں کو بھڑکا دیتا ہے جو بہت مہنگی ہوتی ہیں اور تمہاری زندگی کی عام ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا ہے اس سے زیادہ خرچ کرو تب بھی تمہاری وہ خواہشیں جو فحشاء سے تعلق رکھتی ہیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ تو شیطان کی دھوکہ بازی اور اس انسان کی جو اس دھوکے میں آئے ان کی عقل کا پورا پول کھل جاتا ہے اس سے۔ اگر وہ تمہارا پیسہ بڑھانا چاہتا ہے تو فحشاء کی طرف کیوں لگاتا ہے تمہیں، کیوں کہتا ہے کہ بہت مہنگی کاریں خریدو تو پھر تمہیں تسکین ملے گی۔ کیوں کہتا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ عیاشی کے سامان مہیا کرو یا حاصل کرو تب تمہیں صحیح زندگی کا سکون ملے گا اور ایک دوسرے سے دکھاوے میں آگے بڑھو ایسے اخراجات کرو جس سے تمہاری ظاہری طور پر قوم میں یا برادری میں ناک قائم رہ جائے اور اندر سے سب کچھ کٹ جائے اور سب کچھ ختم ہو جائے۔ یہ تعلیم جو فحشاء کی تعلیم ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ شیطان کو تمہارے اموال میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تمہارے حق میں کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ تمہارا دشمن ہے اور دشمنوں والے وساوس میں تمہیں مبتلا کر دیتا ہے۔

اللہ اس کے مقابل پر کیا کہتا ہے شیطان تمہیں فقر کا اور فحشاء کا حکم دیتا ہے اور اللہ فرماتا ہے يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اور اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے مغفرت کے وعدے کرتا ہے۔ پس انفاق فی سبیل اللہ کا تعلق ایک مغفرت سے بھی ہے اور یہ بہت ہی اہم تعلق ہے جس کو آخر پر بیان فرمایا ہے۔ وہ پہلے تعلقات جو میں نے بیان کئے ہیں قرآن کریم کی اس آیت کی روشنی میں ان پر یہ مستزاد ہے کہ یاد رکھو وہ تمہیں چیزیں تو ملیں گی ہی مگر تم اتنے گناہ گار ہو کہ اگر محض نیکیوں اور گناہوں کا آپس میں حساب تکڑی کے تول کیا جائے تو تمہاری بخشش کے سامان بہت مشکل ہیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ اگر باقاعدہ ناپ تول کر حساب ہو کہ نیکیاں کتنی ہوئیں اور بدیاں کتنی تو بھاری اکثریت انسان کی

ایسی ہے جن کے بدیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے اور نیکیوں کے کم ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَ فَضۡلًا ان دونوں کا گہرا تعلق ہے۔ فرمایا مغفرت کے ذریعے تو ہم تمہارے بوجھ کم کر دیں گے جو بدیوں کے بوجھ ہیں وہ شمار میں نہیں لائیں گے اور فضل کے ذریعے نیکیوں کا پلڑا بھاری کر دیں گے۔ پس دونوں طرف انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ عجیب طریقے سے پہنچے گا کہ گناہوں کا پلڑا تو ہلکا ہوتا چلا جا رہا ہے اور نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوتا چلا جا رہا ہے اور باقی سب چیزیں اس کے علاوہ ہیں جو پہلے نصیب ہو گئیں۔

اور فضل کا دوسرا معنی ہے کہ اموال میں برکت دے گا کیونکہ لفظ ''فضل'' قرآن کریم میں اموال کی برکت سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ واضح طور پر جا بجا اس کو دنیاوی نعمتوں کے لئے بھی استعمال فرمایا گیا ہے تو دوہرا فائدہ بھی نکل آتا ہے کہ تمہارے اموال بڑھیں گے کم نہیں ہوں گے شیطان جھوٹ بول رہا ہے فقر نہیں ہوگا اور شیطان فحشاء کی طرف بلاتا ہے جس سے گناہوں کے پلڑے بھاری ہوتے چلے جائیں گے۔ ہم مغفرت کی طرف بلا رہے ہیں جس سے تمہارے کئے ہوئے گناہ بھی کالعدم ہونے شروع ہو جائیں گے۔ وہ فقر سے ڈراتا ہے ہم فضل کے وعدے کرتے ہیں اور ہم اپنے وعدوں میں سچے ہیں شیطان اپنے وعدوں میں جھوٹا ہے۔ اس صفائی، اس لطافت کے ساتھ، اس تفصیل سے دنیا کی کسی کتاب میں آپ کو انفاق کا مضمون دکھائی نہیں دے گا۔ انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون قرآن کریم میں مختلف جگہ بیان ہوا ہے ہر جگہ ایک عجب انفرادی حسن کے ساتھ بیان ہوا ہے جو دوسری باتوں کے علاوہ کچھ مزید حکمت کی باتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس کو دیکھیں، اس کو غور سے پڑھیں، غور سے سنیں اور سمجھیں تو کتنا حسین نظارہ ہے اس تعلیم کا۔ دنیا کی کوئی تعلیم اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔

پھر فرماتا ہے يُّؤۡتِي الۡحِكۡمَةَ مَنۡ يَّشَآءُ دیکھو خدا کیسی کیسی حکمتیں عطا فرما رہا ہے جس کو چاہتا ہے وہ حکمت عطا کر دیتا ہے اور فرمایا حکمت تو اموال سے بہت بہتر ہے اور حکمت ہی ہے جو دراصل اموال کے حصول کا موجب بن جایا کرتی ہے۔ وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِيَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا اگر اموال کے بدلے صرف حکمت ہی کسی کو عطا کر دی جائے تو اسے بہت بڑا مال عطا ہو گیا اور اموال بھی بڑھائے جائیں اور پھر حکمت بھی بڑھا دی جائے تو بہت بڑی دولت ہے جو

نصیب ہوگئی اور حکمت کی باتیں ہیں ساری جو آپ نے سنی ہیں اور حکمت کے متعلق ایک واضح حقیقت ہے جو آج کے زمانے میں خوب کھل گئی ہے کہ جن کے پاس حکمت ہے وہ امیر ہیں جن کے پاس حکمت نہیں وہ غریب ہیں۔ ساری قومیں جو آج دنیا کے اموال پر قابض ہوئی ہیں اپنی حکمت کے ذریعے قابض ہوئی ہیں انہوں نے اسرارِ علوم کو سیکھا ہے۔ وہ علوم کے پردے میں جو راز تھے ان کو دریافت کرنے والے لوگ ہیں اور اس کے نتیجے میں تمام دولتوں نے اپنے خزانوں کے دروازے ان پر کھول دئے ہیں اور جو بے چاری قومیں حکمت سے عاری ہیں جاہل قومیں ہیں ان کو اموال بھی نصیب نہیں ہوئے، جو تھا وہ بھی امیر قومیں لوٹ کر لے گئیں۔

تو قرآنی تعلیم حکمت کے خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ فرمایا: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ جو بھی تم میں سے حکمت عطا کیا جائے گا اسے گویا بہت مال و دولت نصیب ہوا۔ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ لیکن عقل والوں کے سوا سیکھتا کون ہے۔ مصیبت تو یہ ہے۔ اتنی باتیں کھول کر بیان ہوئیں ہیں پھر بھی جب خرچ کے وقت آئیں گے تمہاری مٹھیاں بند ہی ہو جاتی ہیں جن کو کنجوسی کی عادت ہے پھر تمہیں حوصلہ نہیں پڑے گا۔ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ اہل عقل کے سوا کون ہے جو نصیحت پکڑتا ہے جو ان نصیحت کی باتوں سے استفادے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ جو مضمون ہے آگے آیتوں میں بھی یہ چل رہا ہے لیکن میں آج صرف ان دو آیتوں پر اکتفا کرتے ہوئے وقف جدید کے سال نو کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔

وقف جدید کا 1995ء میں چالیسواں سال غروب ہو رہا ہے اور 1996ء میں اکتالیسواں سال طلوع ہو رہا ہے۔ سال 1994ء انتالیسواں سال تھا، سال 1995ء چالیسواں اور اب جس سال میں ہم داخل ہو چکے ہیں یہ خدا تعالیٰ کے فضل سے وقف جدید کا اکتالیسواں سال ہے اور جماعت احمدیہ بحیثیت مجموعی جو خدا کی راہ میں خرچ کر رہی ہے اور جس انداز سے خرچ کر رہی ہے اس پہلو سے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی یہ ایک ایسی دلیل ہے جو سورج کی طرح روشن ہے۔ دن کو سورج بن کر چمکتی ہے تو رات کو چاند بن کے نور برساتی ہے۔ دن رات جماعت احمدیہ جو خدا کی راہ میں قربانیاں پیش کر رہی ہے ان کے اندر ایسا نور ہے کہ اس کی مثال دنیا میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کوئی ہے تو جماعت لا کے دکھائے۔ ہم نے تو ایسے دیکھے ہیں جو دین کے

نام پر جمعیتیں بھی بناتے ہیں، خدمتیں بھی کرتے ہیں مگر اس وقت تک جب تک کوئی پیسہ عطا کرنے والا ہاتھ ان کو عطا کرتا رہے۔ کسی حکومت نے امداد بند کر دی تو ان کی خدمتیں بھی وہیں ختم ہو جاتی ہیں مگر وہ جماعت جو خدا کے نام پر بنی نوع انسان کی خدمت بھی کر رہی ہو اور مذہب کی خدمت بھی کر رہی ہو یعنی دینی، روحانی اقدار کی بھی، ایک ہی ہے کل عالم میں جو جماعت احمدیہ ہے جو یہ سب کچھ کرتی ہے اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے کرتی ہے۔ کوئی غیر ہاتھ اس کو عطا نہیں کر رہا، ہاں اللہ کا ہاتھ ہے جو عطا فرماتا ہے۔

اور یہ بات کہ خدا کی خاطر کرتے ہیں طیبات دیتے ہیں، جو کمایا وہ خدا کی عطا سمجھتے ہوئے اس کے حضور عاجزانہ طور پر پیش کرتے ہیں اور اس میں لذت محسوس کرتے ہیں یہ اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ ہر سال قربانی والا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ وہ شخص جس کو قربانی کرتے ہوئے تکلیف محسوس ہو وہ دو چار سال چلے گا اس کے بعد تھک کے رہ جائے گا۔ کہے گا بس کافی ہوگئی، جو دینا تھا دے دیا، اب نہ ہمارے دروازے کھٹکھٹائے جائیں اور جن کو یعنی جماعت احمدیہ کے جن مخلصین کو خدا کی راہ میں قربانی کی عادت ہے اگر سیکرٹری مال ان کے دروازے کھٹکھٹانا چھوڑ دے تو وہ جا جا کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ کہتے ہیں کیا بات ہوگئی تم ہم سے چندہ لینے نہیں آئے اور دیکھو اگر اس طرح سستی کی تو پھر ہو سکتا ہے کہ ہم سے غفلت ہو جائے اور پھر یہ روپیہ کہیں اور خرچ ہو جائے اور جوان سے بھی آگے سبقت لے جانے والے ہیں وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ روپیہ جو خدا کے لئے وقف کیا ہے کسی اور جگہ خرچ ہو جائے گا وہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ روپیہ جو ہم نے فلاں غرض کے لئے رکھا ہوا تھا کیوں نہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیں کیونکہ پھر توفیق ملے نہ ملے اور ایسے واقعات بڑی کثرت سے ہر سال ہوتے ہیں اور بڑی کثرت سے خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ جو فضل کی صورت میں ان معنوں میں ہے کہ ہم بڑھانے والے ہیں یہ بھی پورا ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایسے حیرت انگیز واقعات آئے دن میرے سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک آدمی نے وعدہ کیا ہے معین طور پر وعدہ کرتے وقت پوری طرح دل کو اطمینان نہیں ہے کہ میں پورا بھی کر سکوں گا مگر اخلاص تھا، ہمت تھی وہ وعدہ کر دیا اور پھر دعا کی کہ اللہ اسے پورا کرنے کے سامان فرمائے۔ پھر جس طرح غیب سے وہ سامان پیدا ہوتے ہیں اور بسا اوقات بعینہٖ اتنی رقم اچانک

ملتی ہے جو وعدہ کی گئی تھی یعنی اگر کسی نے 7572 روپے کا وعدہ کیا تھا تو خدا تعالیٰ یقین دلانے کی خاطر کہ یہ میں نے خصوصیت سے تمہارے اخلاص کو قبول کرتے ہوئے اس لئے دی ہے کہ تم اپنا تحفہ مجھے پیش کر سکو اور جو رقم ملتی ہے 7572 روپے ہی ہوتی ہے۔ اب یہ جو واقعات ہیں یہ جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ایک زندہ اور جاری وساری حقیقت بن چکے ہیں یہ کوئی ماضی کے قصے نہیں ہیں۔ جیسے کل تھے ویسے آج بھی ہیں، جیسے آج ہیں ویسے کل بھی ہوں گے اور یہ نشان صداقت اور عظمت کا نشان سوائے جماعت احمدیہ کے دنیا میں اور کسی جماعت کو عطا نہیں ہوا۔ پھر وہ لطف ایسا محسوس کرتے ہیں جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے کہ وہ ہر سال ہر آنے والے وقت میں قربانی میں پہلے سے بڑھ جاتے ہیں۔ صاف ثابت ہے کہ وہ محبت ہی کے نتیجے میں خرچ کر رہے ہیں چٹی والے تو ایسا نہیں کیا کرتے۔

کل جو ''لقاء مع العرب'' کا پروگرام تھا اس میں منیر عودہ صاحب نے مجھ سے ایک سوال کیا کہ نئے سال کی باتیں ہو رہی ہیں پرانا سال جا رہا ہے، لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ جماعت احمدیہ کا کیا مؤقف ہے۔ اس میں جو میں نے تفصیل سے ان کو مؤقف سمجھایا کل ایک یہ بات بھی ان کو سمجھائی کہ جماعت احمدیہ کا ہر آنے والا سال گزرے ہوئے سال سے لازماً بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ جماعت احمدیہ پر کوئی ایسا سال طلوع کرے جو پچھلے سالوں سے کسی طرح نیکیوں میں پیچھے رہ جائے وہ ضرور آگے بڑھتا ہے اور اس کا تعلق حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ سے براہ راست ہے کیونکہ آپ کے ساتھ خدا تعالیٰ نے ایک وعدہ فرمایا ہے اور وہ وعدہ ہر اس شخص کے حق میں اور اس جماعت کے حق میں لازماً پورا ہوگا جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے اپنا ذاتی تعلق پختہ کر لیتا ہے یا کر لیتی ہے۔ وہ وعدہ ہے۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (الضحیٰ:5) تیرے لئے یہ قانون ہے جو اٹل ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں، تیرا ہر آنے والا لمحہ ہر گذرے ہوئے لمحے سے بہتر ہوگا۔ اس کے باوجود آپؐ کی زندگی میں ابتلاء بھی آئے، کئی قسم کی آزمائشوں میں مبتلا ہوئے، جسمانی آزار بھی پہنچائے گئے مگر یہ وعدہ پھر بھی پورا ہوتا رہا۔ کوئی ایذا رسانی، کوئی رستے کی روک آپؐ کے اور آپؐ کی جماعت کے قدم آگے بڑھنے سے روک نہیں سکی۔ پس یہ مراد نہیں ہے کہ وقتی تکلیفیں نہیں آئیں گی۔ مراد یہ ہے کہ دشمن جو چاہے کر لے ناممکن ہے کہ تیرے آنے والے لمحات کو گزرے ہوئے لمحات سے بدتر کر کے دکھا دے وہ لازماً زیادہ شان سے چمکیں گے، لازماً ان کو زیادہ رفعتیں عطا ہوں گی۔

پس جماعت احمدیہ، میں نے ان سے مختصراً یہ کہا ویسے تو تفصیل سے مضمون بیان کر رہا ہوں مگر اس وقت میں نے ان کو اس معاملے میں کہا کہ، اس بات کی ایک زندہ مثال موجود ہے اور یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ ہمارا تعلق اس رسولؐ سے ہے جس کے حق میں یہ وعدہ فرمایا گیا تھا اور ہمارے حق میں وہ وعدہ پورا ہو رہا ہے اور دوسری جماعتوں کے حق میں نہیں ہو رہا۔ اس لئے اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس کا رسولؐ سے تعلق ہے کس کا نہیں ہے۔ جب وہ وعدے پورے کرتا ہے تو کھول دیتا ہے اس بات کو کہ جن کا تعلق ہے وہ کوئی لکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں میں وہ وعدے پورے ہوتے دیکھو گے جو میں نے اپنے پیارے رسولؐ سے کئے تھے۔ پس جماعت احمدیہ کی مالی قربانیاں ایک حیرت انگیز صداقت کا نشان ہیں اور اخلاص کے بغیر اور محبت کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لئے لوگ لاکھ طعنے دیں کہ جی یہ تو چندے کی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ اس حقیقت پر پوری طرح قائم رہیں۔ آپ کی سچائی کا قدم ٹلنا نہیں چاہئے اس حقیقت سے کہ آپ جو خدا کی راہ میں پیش کرتے ہیں وہ چٹی نہیں ہے، وہ محبت کے رشتے ہیں، محبت کے اطوار ہیں جو از خود آپ کو خدمت دین پر یعنی مالی خدمت پر مجبور کرتے چلے جاتے ہیں کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہے، ہاں نفس کی اپنی ایک تمنا ہے کہ وہ جس نے سب کچھ دیا ہے ہم بھی تو اس کی راہ میں کوئی تحفہ پیش کریں جسے وہ قبول کرے اور ہماری ادنیٰ پیش کش کے مقابلے پر محبت کا سودا ہو اس کے پیار کی نظریں ہم پر پڑنے لگیں۔

اس پہلو سے وقف جدید بھی کوئی مستثنیٰ نہیں۔ ساری دنیا میں جماعت احمدیہ جو ہر قسم کے چندے پیش کر رہی ہے ان میں جب وقف جدید کا اضافہ کیا گیا تو دوسرے چندوں میں کمی نہیں آئی۔ یہ چندہ بڑھنا شروع ہو گیا۔ یہ عجیب سی چیز ہے کہ جتنا مرضی بوجھ ڈال دو اور بوجھ ڈالو تو رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے، کم نہیں ہوتی کسی قیمت پر اور اگر بوجھ والی سواریاں ہیں تو جتنی سواریاں بعد میں داخل ہوتی ہیں وہ بھی تیز رفتار اسی طرح اسی شان کے ساتھ آگے بڑھنے والی ہیں۔ جس پہلو سے بھی دیکھو یہ جماعت احمدیہ کی زندگی کی علامتیں ہیں اور یہ اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک آپ کے اندر روحانیت زندہ رہے گی، جب تک آپ کے اندر خدا کا تعلق زندہ رہے گا جب تک آپ اپنے خرچ کو اس آیت کے اسلوب کے مطابق ڈھالیں گے جو ہمیں بتاتی ہے کہ تم نے پیار اور محبت کے نتیجے میں خدا کے حضور پیش کرنا ہے اور ڈرنا نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ تم پر ایسے فضل نازل فرمائے گا کہ تم خود اس کے

نتیجے میں حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔

ہر سال جماعت کی مالی قربانیوں میں اضافہ جہاں ایک طرف اس بات پر گواہ ہے کہ جماعت احمدیہ اخلاص میں آگے بڑھ رہی ہے وہاں اس بات پر بھی گواہ ہے کہ خدا اپنے وعدے پورے کرتا چلا آرہا ہے اور اتنی قربانیوں کے باوجود جماعت غریب نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بڑھ کر امیر ہوگئی ہے۔

اب اس پس منظر میں آپ کو وقف جدید کے بعض کوائف پڑھ کے سناتا ہوں۔ وقف جدید کا آغاز تو 1957ء کے آخر میں ہوا غالباً ستمبر میں یا اس کے لگ بھگ حضرت مصلح موعودؓ نے اس کی بنیاد ڈالی۔ جو ابتدائی ممبر مقرر فرمائے تھے ان میں اس عاجز کے نام کے علاوہ حضرت شیخ محمد احمد مظہر صاحب کا نام بھی تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت مولانا ابوالمنیر نورالحق صاحب کا نام بھی تھا جن کا ابھی چند دن ہوئے وصال ہوا ہے اور آج انشاء اللہ ان کی نماز جنازہ غائب پڑھی جائے گی اور حضرت مولوی ابوالعطاء صاحب کا نام بھی تھا۔ حضرت ملک سیف الرحمٰن صاحب کا نام بھی تھا اور بھی ایک دو نام تھے تو کل سات ممبران تھے جن سے اس تحریک کا آغاز ہوا اور ابتدائی وعدہ مجھے یاد ہے اس سال کا شاید ستر بہتّر (72) ہزار روپے تھا اور پھر جو خدا تعالیٰ کے فضل سے خدا تعالیٰ نے اسے ترقی عطا فرمانی شروع کی تو اب آج کے وقت تک پہنچتے پہنچتے بالکل کایا پلٹ چکی ہے۔ جو ابتدائی رقمیں تھیں وہ جو لاکھوں کی رقمیں تھیں کروڑوں میں بدل چکی ہیں، جو ہزاروں کی تھیں لاکھوں میں اور لاکھوں کی کروڑوں میں بدل چکی ہیں اور دنیا کی وہ قومیں بھی اب اس قربانی میں شامل ہوگئی ہیں جن کو پہلے وقف جدید کی قربانی میں شامل نہیں کیا جاتا تھا یعنی یورپ اور دیگر مغربی اقوام یعنی یورپ کی اور امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کی اقوام۔

تو اب میں مختصراً آپ کے سامنے یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح محبت اور پیار سے جماعت احمدیہ وقف جدید کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کریں کہ 73 ممالک کی رپورٹس کے مطابق 1995ء کے سال میں جماعت احمدیہ کو تین کروڑ چار لاکھ پانچ ہزار وعدے پیش کرنے کی توفیق ملی تھی اور وصولی تین کروڑ اڑتالیس لاکھ چھیاسی ہزار ہوئی ہے۔ یعنی وعدے کم اور وصولی بہت زیادہ اور اس میں سب سے آگے امریکہ نے قدم رکھا ہے ماشاء اللہ۔ اس

کی جب میں تفصیل بیان کروں گا تو انگلستان والوں کے لئے کافی سوچ و بچار کے سامان ہیں اس میں ایک طرف آپ کا امریکہ سے مقابلہ ہے، دوسری طرف ہندوستان سے بھی ہے اور میں آپ کو وقت پر متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان دوڑ میں بہت پیچھے سے شروع ہوا اور آپ کے قریب قریب پہنچ چکا ہے۔ انٹرنیشنل کرنسی میں اگر اس کو تبدیل کر کے پیش کروں تو 5 لاکھ 77 ہزار 7 صد پاؤنڈ کے وعدے تھے یعنی آپ کی کرنسی، انگلستان کی کرنسی میں اگر ڈھالوں اس کو، اور اس کے مقابل پر وصولی خدا کے فضل سے چھ لاکھ ستر ہزار نو صد پاؤنڈ ہوئی۔ یہ وصولی کی جو خبریں ہیں یہ دراصل ابھی تک مکمل نہیں ہوئیں کیونکہ وصولی بعد میں بھی ہوتی رہتی ہے۔ جب رپورٹیں آتی ہیں تو اس وقت تک جو رقمیں آ چکی ہوتی ہیں سب رپورٹوں میں شامل نہیں ہوسکتیں کیونکہ حساب کتاب میں دفتری انتقالات میں وقت لگتے ہیں اور بعض لوگ اپنی وصولیاں سال ختم ہونے کے بعد بھی پچھلے سال کے حساب میں کرتے رہتے ہیں اور مرکز کو بھیجتے رہتے ہیں تو یہ جو خدا کے فضل سے حیرت انگیز وصولی کی رقمیں آپ نے سنی ہیں ان سے انشاءاللہ تعالیٰ زیادہ ہوگی کم نہیں ہوگی۔

اب میں بعض سالوں کے مقابلے آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ یعنی پچھلے دو سالوں کے مقابلے سال انتالیس میں یعنی 1994ء میں چار لاکھ بیاسی ہزار پاؤنڈ کے وعدے تھے اور وصولی پانچ لاکھ چھبیس ہزار آٹھ سو چھیاسی کی تھی۔ تو یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ وعدوں سے وصولی آگے بڑھ گئی ہے پچھلے دو سالوں کے موازنے میں بھی یہی ہوا تھا۔ سال 1994ء چار لاکھ بیاسی ہزار کے وعدے اور وصولی پانچ لاکھ چھبیس ہزار کی تھی۔ سال چالیس میں پانچ لاکھ ستتر ہزار سات سو نوے پاؤنڈ کے وعدے اور چھ لاکھ ستر ہزار نو سو تیرہ پاؤنڈ کی وصولی اور جہاں تک فی صد اضافے کا تعلق ہے گزشتہ دو سالوں کے موازنے میں اضافہ وعدوں سے بڑھ کر وصولی کی نسبت یہ تھی 19.86 فیصد اور یہ جو سال ابھی گزرا ہے اس کو پچھلے سال پر اپنے وعدوں اور وصولی کی جو نسبت بنی ہے۔ وہ 1995ء میں 27 فیصد وعدوں سے زیادہ وصولی ہوئی ہے۔ جبکہ گزشتہ سال 19.86 فی صد تھی۔

جہاں تک مجاہدین کی تعداد کا تعلق ہے اس لحاظ سے بھی خدا کے فضل سے یہ سال بہت بابرکت ہے۔ سال انتالیس میں ایک لاکھ اکانوے ہزار تین سو چوہتر چندہ دہندگان نے وقف جدید

میں حصہ لیا تھا۔ایک لاکھ اکانوے ہزار تین سو چوہتر۔سال 1995ء میں دو لاکھ دس ہزار چھ سو بیالیس افراد نے، مخلصین نے وقف جدید کے چندے میں حصہ لیا۔

جہاں تک امریکہ کی غیر معمولی خدمات کا اور سبقت کے جوش کا تعلق ہے میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ امریکہ نے ایک فیصلہ کیا میں جب وہاں گیا تو ایم ایم احمد نے مجھ سے بات کی جو امیر ہیں امریکہ کے کہ ہم نے غور کیا آپس میں کہ جب بھی کسی ملک کے سبقت لے جانے کا ذکر ملتا ہے تو ہمارے دل میں بڑی ایک قسم کی بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے، جہاں خوشی ہوتی ہے وہاں بے چینی بھی کہ کاش کسی مد میں تو ہماری سبقت کا بھی ذکر آئے تو بہت غور کے بعد ہم نے سمجھا کہ دوسرے بڑے بڑے چندوں میں تو ہم اپنی تعداد اور حالات کے لحاظ سے دنیا کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتے تو وقف جدید کے چندے کو اپنے لئے خاص مطمح نظر بنالیں اور یہ فیصلہ کریں کہ سارے مل کر وقف جدید میں بہر حال سب دنیا کی جماعتوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔اس وعدے کو وہ پھر سال بہ سال پورا کرتے رہے اور مسلسل ان کا قدم ترقی کی طرف بڑھا ہے۔چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ اس وقت دنیا بھر کی جماعتوں میں پاکستان کے سوا باقی سب جماعتوں سے امریکہ کی جماعت آگے بڑھ گئی ہے۔جو چندوں کے لحاظ سے بھی آگے بڑھ گئی ہے، وعدوں کے مقابل پر وصولی حاصل کرنے کی رفتار میں بھی آگے بڑھ گئی ہے اور تعداد چندہ دہندگان بڑھانے میں بھی آگے بڑھ گئی ہے۔

امریکہ کا 1995ء والے سال کا وعدہ ایک لاکھ ستر ہزار ڈالر تھا اور بڑی خوشی سے مجھے فون پر بتایا گیا ہے کہ ہم نے بڑی چھلانگ لگائی ہے اور اس دفعہ وعدہ ایک لاکھ ستر ہزار ڈالر کا ہے۔وصولی پتا ہے کتنی ہوئی ہے، دو لاکھ نوے ہزار ڈالر۔مجھے انہوں نے بتایا خود ان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ عجیب بات ہے، اللہ کی شان کہ ہم ایک لاکھ ستر کو زیادہ سمجھ رہے تھے اور خدا نے ایسا ولولہ پیدا کر دیا ہے دلوں میں کہ وصولی کی جو آخری خبر موصول ہوئی ہے وہ دو لاکھ نوے ہزار ڈالر کی ہے اور چندہ دہندگان کے اعتبار سے بھی ماشاء اللہ گزشتہ سال کے مقابل پر (49) اُنچاس فی صد اضافہ ہوا ہے اور وہی اضافہ غالباً اس وصولی پر بھی اثر انداز ہوا ہے کیونکہ جن کو بعد میں انہوں نے چندہ دہندہ بنایا ہے ان کا پہلے وعدوں میں نام نہیں آیا ہوگا۔ظاہر بات ہے۔تو اس کی وجہ سے ان کی وصولی کی پھر رفتار خدا کے فضل سے یا وصولی کی نسبت خدا کے فضل سے بڑھ گئی۔

ویسے الحمد للہ کہ آج تک پاکستان کو یہ جھنڈا سب جھنڈوں سے بلند رکھنے کی توفیق مل رہی ہے۔تمام دنیا میں سب سے زیادہ وقف جدید کے میدان میں قربانی کرنے کی پاکستان کی جماعتوں کو توفیق ملی ہے۔ پیچھے سے بہت آگے بڑھنے والی جماعتوں میں سے امریکہ اب نمبر دو پر آ گیا ہے۔ پاکستان کے بعد ان کا نمبر دو ہے لیکن فرق اب تھوڑا رہ گیا ہے۔اس لئے بعید نہیں کہ اگلے سال یہ اپنی خواہش کے مطابق دنیا کی وقف جدید کی قربانی میں نمبر ایک جماعت بن جائیں، جرمنی سب چندوں میں اللہ کے فضل سے اچھا اور مخلص اور متوازن قربانیاں کرنے والا ہے۔وقف جدید میں جرمنی کی پوزیشن نمبر تین ہے اور اب آپ انتظار کر رہے ہوں گے کہ برطانیہ کی باری آجائے گی۔میں بھی یہاں رہتا ہوں آج کل لیکن افسوس کہ کینیڈا نے برطانیہ کو پیچھے چھوڑ دیا حالانکہ کینیڈا باقی چندوں کے لحاظ سے ان سے پیچھے ہے۔اس کی مالی استطاعت جماعت برطانیہ کی مالی استطاعت سے کم ہے مگر اس کو خدا نے توفیق بخش دی کہ کینیڈا کے بتیس ہزار پاؤنڈ کے مقابل پر برطانیہ کی طرف سے چھبیس ہزار پاؤنڈ پیش ہوئے ہیں اور خطرناک بات یہ ہے کہ انڈیا چھٹے نمبر پر آکر اکیس ہزار نو سو تریسٹھ پاؤنڈ کی قربانی پیش کر رہا ہے جب کہ اس سے پہلے چند ہزار سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔اب ہندوستان اور برطانیہ کے اقتصادی حالات کا موازنہ بھی کریں اور احمدیوں کی تعداد کا بھی موازنہ کریں اور پھر ان کو ملا کر دیکھیں تو پھر صحیح تصویر سامنے آئے گی۔تعداد کے لحاظ سے اس وقت ہندوستان کی تعداد جو میں نے اندازہ لگایا ہے وہ تقریباً سات گنا زیادہ ہے۔یعنی اگر ایک احمدی یہاں ہے تو سات احمدی وہاں ہیں اور جو بہت سے نو مبائعین اب آ رہے ہیں ان کو میں شمار نہیں کر رہا کیونکہ ابھی ہم نے ان کو سنبھالا نہیں ہے۔ پچاس ہزار جو گزشتہ سال آئے تھے ان کو تو فوراً اس میدان میں نہیں جھونک سکتے کیونکہ ان کی تربیت پہ ابھی کچھ وقت لگے گا۔وہ احمدی جو مستحکم ہو چکے ہیں ان میں سے اکثر چندہ دہندگان نکلے ہیں جو پرانے احمدی تھے اور اس طرح نسبت ایک اور سات کی ہے۔یعنی ان کو عددی فوقیت آپ پر سات گنا کی ہے لیکن اقتصادی نقطہ نگاہ سے اگر دیکھیں تو آپ کو ان کے مقابل پر فی آدمی بارہ گنا زیادہ آمد ہوتی ہے اور یہ ایک محفوظ اندازہ لگایا گیا ہے جو یونائیٹڈ نیشنز کے چھپے ہوئے اعداد و شمار سے نکالا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے رفیق چانن صاحب نے جو اقتصادیات سے تعلق رکھتے ہیں مجھے یہ رسالہ بھیجا جو تازہ چھپ کے آیا تھا اور کہا کہ آپ نے چندوں کے موازنے کرنے ہوتے ہیں تو اس پہلو کو

بھی مدنظر رکھ لیا کریں کہ کسی قوم میں مالی استطاعت کیا ہے اور اقتصادی حالت کیسی ہے۔تو جواب تو ان کو یہی دیا تھا یا ابھی لکھوانا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ باتیں تو ہم اقتصادی جائزوں کے طور پر پیش کر ہی نہیں رہے۔ یہ تو ذریعے ہیں ایک دوسرے سے مقابلہ پیدا کرنے کے، فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرہ:149) کے بہانے ملتے ہیں اور اللہ کے فضل سے یہ باتیں کام کر بھی رہیں ہیں۔اگر میں اقتصادی گہرائیوں میں اتر کر یہ موازنے شروع کردوں کہ دراصل کیا بات ہے، اصل میں کون آگے ہے تو یہ سارا لطف بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا اور ان باتوں کی اکثر سمجھ بھی نہیں کسی کو آنی تو اس لئے مجھے چلنے دیں اسی طریقے سے۔ جماعت کو ضرورت ہے اچھی باتوں کی تحریص کی اور تحریک اسی غرض سے کی جاتی ہے اس لئے آپ اپنے نقطہ نظر سے جو مرضی سمجھیں مگر جس انداز سے مجھے خدا کے فضل سے جماعت کے دلوں میں ایک ہلچل پیدا کرنے کی توفیق مل جاتی ہے وہی میرا مقصد ہے اور وہ پورا ہو رہا ہے مگر بہر حال انہوں نے چونکہ بھیجا تھا اس لئے میں نے کہا استعمال ضرور کرنا ہے کیونکہ ان کا پہلا وار ہے وہ خالی نہیں جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اس کو استعمال کیا۔اب اسی کی رو سے میں آپ کو یہ موازنہ بتا رہا ہوں کہ ہندوستان کی مالی استطاعت اگر دہلی کا لندن سے مقابلہ کیا جائے تو ایک اور بارہ کی نسبت ہے۔ ہندوستان اگر ایک روپیہ کماتا ہے تو انگلستان بارہ روپے کماتا ہے۔تعداد دیکھی جائے تو آپ کے چندہ دہندگان کے مقابل پر ان کی تعداد سات گنا ہے اور اس پہلو سے اس موازنے کے بعد آپ کو ان سے بہت زیادہ آگے ہونا چاہئے لیکن وہ آپ کے قریب پہنچ گئے ہیں اور بعید نہیں کہ اگلے سال یا اس سے اگلے سال آپ کو پیچھے چھوڑ جائیں۔اس لئے پتا نہیں میں نے یہ کہہ کر آپ کے دلوں کو ہلایا ہے یا آپ الحمد للہ کر کے بیٹھ گئے ہیں کہ چلو اچھا ہوا ہمارے بھائی کو فوقیت مل گئی۔ جہاں مقابلے ہوں وہاں بھائی نہیں دیکھے جاتے۔قرآن کریم فرماتا ہے: وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ بھائی بھائی بنا دیا ہے تمہیں لیکن مقابلہ پھر بھی کروانا ہے اور وہ مقابلہ یہ ہے کہ تمہارے لئے ہم نے یہ مطمح نظر بنا دیا ہے کہ نیکیوں میں ضرور ایک دوسرے سے آگے بڑھو گے۔اس لئے جب نیکیوں میں مقابلہ ہو پھر بھائی بھائی نہیں دیکھنا پھر ضرور آگے بڑھنے کی کوشش کرنی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کا نمبر سات ہے اور سوئٹزرلینڈ اس پہلو سے مالی اقتصادی حیثیت کے لحاظ سے

دنیا کی سب سے اونچی قوموں میں سے ہے۔ جو یونائیٹڈ نیشنز کی طرف سے چارٹ چھپتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے، وہ کہتے ہیں فرض کرو سوئٹزرلینڈ سو ہے تو امریکہ کتنا ہے، انگلستان کتنا ہے یا وہ شہروں کے موازنے کر کے بتاتے ہیں کہ اگر زیورچ اتنا ہے تو لندن کتنا ہے اور کوپن ہیگن کتنا ہے وغیرہ وغیرہ تو اس پہلو سے جو میں موازنہ بتا رہا ہوں سوئٹزرلینڈ کو خدا کے فضل سے تمام دنیا میں اقتصادی برتری اگر سب ملکوں پر نہیں تو اکثر ممالک پر حاصل ہے اس لئے ان کا آگے آنا خوشی کی بات تو ہے مگر اتنی تعجب کی بات نہیں۔

انڈونیشیا بھی مالی قربانیوں میں ترقی کر رہا ہے اس کا نمبر آٹھواں ہے۔ بیلجیئم کا نواں نمبر ہے اور جاپان کا دسواں نمبر ہے۔ بعض دوسرے چندوں میں جاپان آگے نکل جاتا ہے۔ یہ ہوتا رہتا ہے کبھی اس دوڑ میں کوئی کبھی دوسری دوڑ میں کوئی اور تو اس پہ کچھ پژمردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوشش کرتے رہیں خدا جب جس کو توفیق دے اسی کو کامیابی نصیب ہوگی۔ فی کس مالی قربانی کے لحاظ سے سوئٹزرلینڈ نمبر ایک ہے اگر سوئٹزرلینڈ کے یونائیٹڈ نیشنز کے چارٹ کی طرح سو نمبر مقرر کیے جائیں تو دوسرے نمبر پر امریکہ آتا ہے اس کے تہتر نمبر بنیں گے تیسرے نمبر پر بیلجیئم آتا ہے جس کے اکسٹھ نمبر بنیں گے، چوتھے نمبر پر کوریا ہے جس کے انتیس نمبر اور جاپان کو پانچویں نمبر پر یہاں رکھا ہوا ہے لیکن دنیا میں وہ سوئٹزرلینڈ کے بعد نمبر دو ہے Per Capita Income کے لحاظ سے سوئٹزرلینڈ کے اگر سو نمبر ہیں تو جاپان کے چھیاسی نمبر یونائیٹڈ نیشنز نے مقرر کئے ہیں یہاں Per Capita Income سے مراد تجارتی انکم مراد نہیں ہے بلکہ Wages یعنی ایک آدمی جب نوکری کرتا ہے تو اس کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کے اعداد و شمار سے یونائیٹڈ نیشنز نے یہ موازنہ شائع کیا ہے۔ سوئیٹزرلینڈ میں سب ملازموں کی اگر اوسط نکالی جائے تو ملازم پیشہ کو اگر سو پاؤنڈ ملتے ہیں تو جاپان کے ملازم کو پیشہ کو چھیاسی ملتے ہیں۔ پس اس پہلو سے سوئٹزرلینڈ کی جماعت کا نمبر ایک ہونا نسبت کے لحاظ سے یہ ایک بڑا مبارک قدم ہے اور انہوں نے دنیا کی اقتصادی توقعات کے مطابق جماعتی مالی قربانیوں میں بھی ویسا ہی نمونہ دکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ پاکستان کے موازنے میں صرف اتنا بتانا کافی ہے لمبی فہرستیں پڑھنے کا وقت تو نہیں ہے کہ الحمدللہ ربوہ کو گزشتہ سالوں میں ہمیشہ اول آنے کی توفیق ملتی رہی ہے اس دفعہ بھی اول آیا ہے اور نمبر دو جہاں تک بالغان کی قربانی کا تعلق ہے دفتر

بالغان الگ ہے دفتر اطفال الگ ہے۔ ربوہ نمبر ایک ہے، کراچی نمبر دو ہے اور لاہور نمبر تین ہے۔

جہاں تک اضلاع کا تعلق ہے اسلام آباد پھر سیالکوٹ پھر راولپنڈی پھر فیصل آباد، گوجرانوالہ، گجرات، شیخوپورہ، سرگودھا، عمرکوٹ، کوئٹہ یہ دس اضلاع ہیں جن کو اسی ترتیب سے خدا تعالیٰ نے زیادہ خدمت کی توفیق بخشی ہے۔ جہاں تک اطفال کا تعلق ہے وہاں بھی ربوہ نمبر ایک ہے اور کراچی کی بجائے لاہور نے دوسری پوزشن سنبھال لی ہے۔ چنانچہ ربوہ اول، لاہور دوم اور کراچی سوم ہے۔ جہاں تک اضلاع کا تعلق ہے گوجرانوالہ بہت پیچھے رہ جانے والی جماعتوں میں سے تھا جو آگے بڑھ کر اس میدان میں اول آ گیا ہے اور راولپنڈی اس کے بعد، پھر سیالکوٹ، پھر شیخوپورہ، پھر فیصل آباد، اسلام آباد، اوکاڑہ، سرگودھا، نارووال اور آخر پر میر پور خاص۔ یہ ہے خلاصہ اس سال کی مالی قربانیوں کا اور میں امید رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ آئندہ بھی اسی ذوق وشوق کے ساتھ آپ وقف جدید کے میدان میں ہر پہلو سے پہلے سے بڑھ کر قربانیاں پیش کرتے رہیں گے۔

جماعتوں کو میں پھر دوبارہ یاد دہانی کرواتا ہوں کہ نومبائعین کو ضرور شامل کریں خواہ معمولی رقم لے کر بھی ان کو شامل کریں۔ ایک دفعہ جس کو خدا کی راہ میں محبت سے کچھ پیش کرنے کی توفیق مل جائے پھر وہ چسکا پڑ جاتا ہے پھر وہ زندگی بھر اس کا وہ چسکا اترتا نہیں ہے۔ اس لئے بڑے بڑے بھاری بھاری چندے وصول نہ کریں شروع میں جتنی توفیق ہے اتنا وصول کریں تا کہ وہ جو محبت کا مضمون ہے وہ قائم رہے چٹی کا مضمون نہ آ جائے۔ ایک دفعہ آپ نے نئے آنے والوں پر توفیق سے بڑھ کر بوجھ ڈال دیا اور اصرار کیا کہ تم سولہواں حصہ ضرور دو اور فلاں میں اتنا دو اور فلاں چندے میں اتنا دو تو بعید نہیں کہ وہ چونکہ کمزور ہیں ان کی کمریں ٹوٹ جائیں اور ایمان میں بڑھنے کی بجائے وہ پہلے مقام سے بھی نیچے گر جائیں اس لئے حکمت کے تقاضے پورے کریں۔ خدا نے جو انفاق فی سبیل اللہ کی روح بیان فرمائی ہے کہ وہ تعلق باللہ ہونی چاہئے اور انسان اپنے شوق سے محبت کے طور پر پیش کرے اس رو سے جتنا کوئی توفیق پاتا ہے اس توفیق کو مدنظر رکھ کر اس سے لیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ کی توفیق تو ہر ایک رکھتا ہے اگر ایک معمولی رقم بھی وہ دے دے، خوشی سے دیدے تو وہ بھی قبول کر لیں اور تعداد بڑھانے کی کوشش کریں۔

تعداد تو جماعت میں مالوں کی بھی بڑھ رہی ہے اور انفس کی بھی بڑھ رہی ہے اس کے علاوہ ایک نظام ہے کہ جہاں تعداد کم بھی ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ موت کے ذریعے خدا کا قطعی اٹل نظام چلتا ہے کہ نیک ہوں یا بد ہوں سب نے بالآخر خدا کے حضور واپس جانا ہے۔ جو ترقی کرنے والی قومیں ہیں ان کے زندوں کی تعداد مرنے والوں کے مقابل پر بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔ جو زندہ رہنے والی قومیں ہیں ان کے اندر صاحب ایمان اور پرخلوص اور تعلق باللہ رکھنے والوں کی تعداد ان کے مقابل پر بہت زیادہ بڑھتی ہے جو چھوڑ کر واپس خدا کے حضور حاضر ہو رہے ہوتے ہیں۔

حضرت مولوی ابوالمنیر نورالحق صاحب کا میں نے ذکر کیا تھا ان کے علاوہ بھی کچھ جنازے ہیں۔ مولوی امیر احمد صاحب درویش قادیان، سلمیٰ صدیقہ صاحبہ امیر صاحب اسلام آباد علیم الدین صاحب کی بیگم، چوہدری فضل الٰہی صاحب ربوہ، منور احمد صاحب لون، مکرمہ سردار بیگم صاحبہ اہلیہ علی محمد صاحب۔ یہ ہمارے شیر محمد کی بھاوجہ تھیں۔ مکرم ملک ناصر احمد صاحب ہم زلف ملک اشفاق احمد صاحب، افسر حفاظت یا نائب افسر حفاظت، ان سات کے جنازے بھی ابھی نماز جمعہ اور عصر کے بعد پڑھے جائیں گے۔

مولوی صاحب کے متعلق بالکل مختصر تعارف میں کروا دیتا ہوں کہ آپ کی پیدائش 17 ردسمبر 1917ء کی ہے یعنی مجھ سے عمر میں گیارہ سال بڑے تھے اور اللہ کے فضل کے ساتھ بچپن ہی سے خدمت دین کے لئے وقف اور ہمہ تن خدمت دین خصوصاً علمی خدمت میں پیش پیش رہے۔ آپ کے دادا حضرت حکیم چراغ دین صاحبؓ اور والد حضرت منشی عبدالحق صاحبؓ دونوں صحابی تھے اور منشی صاحب کی اولاد ساری خدا کے فضل سے دیندار، بہت نیک، خدمت کرنے والی اور ان کی اگلی نسلیں بھی آگے پھر اسی رنگ میں رنگین ہیں۔ حضرت مصلح موعودؓ کا دست شفقت خصوصیت سے حضرت مولوی صاحب پر ہوا کرتا تھا یہاں تک کہ بہت سے لوگ اس سے کچھ حسد نہیں تو رشک محسوس کیا کرتے تھے مگر دیکھنے والوں کو حسد لگا کرتا تھا۔ اس حد تک مولوی صاحب سے حضرت مصلح موعودؓ شفقت فرمایا کرتے تھے کہ دوسرے علماء کو بھی تکلیف ہوتی تھی کہ اس میں کون سی زیادہ باتیں آگئیں ہیں جو اتنا لاڈلا ہے اور بڑی بات یہ تھی کہ خدمت دین میں خصوصیت سے علمی خدمت میں مولوی صاحب کو ایک بڑے لمبے عرصے تک توفیق ملی ہے کہ مصلح موعودؓ کی مدد کریں اور اس کا اظہار مختلف

رنگ میں حضرت مصلح موعودؓ نے اس طرح بھی فرمایا کہ قادیان میں 1943ء ہی میں جو تعلیمی کمیٹی انجمن کی قائم فرمائی جس کے صدر حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ تھے، اس میں مولوی صاحب کو بھی اپنی کم عمری کے باوجود اس زمانے کے لحاظ سے اس کا ممبر بنایا اور باقی ممبر جو تھے ان کا اندازہ کریں کہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے علاوہ ملک غلام فرید صاحب، مولانا شمس صاحب، ملک سیف الرحمان صاحب وغیرہ یہ اس کے ممبران تھے۔ پھر ایک موقع پر آپ کو ناظر انخلاء آبادی مقرر فرمایا گیا۔ جامعۃ المبشرین میں 1949ء میں آپ بطور مدرس مقرر ہوئے، اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جماعت میں جو عہدے ہیں ان کی کوئی خاص قیمت نہیں ہے۔ خدمت ہے بس۔ کسی وقت بھی کسی شخص کو کبھی ناظر بنا دیا جائے کبھی استاد بنا دیا جائے، مجال ہے جو کبھی ماتھے پر بل پڑیں کہ میں ناظر تھا اب میں استاد بنا دیا گیا ہوں۔ اسی طرح شوق اور ولولے سے ہنستے کھیلتے، مسکراتے ہوئے خدمت سرانجام دینے کی روح ہے جو جماعت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ تو وہاں میرے بھی استاد تھے۔ قرآن کریم کے لئے ہمارے مولوی نورالحق صاحب بھی استاد ہوا کرتے تھے اور بڑی شفقت کا تعلق تھا، بے تکلفی بھی تھی، بچے ان کو تعلیم میں چھیڑا بھی کرتے تھے اور یہ مسکرا کر کافی حوصلے کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ یہ عجیب قسم کے ہمارے تعلقات ہوتے تھے، ادب بھی ہوتا تھا، بے تکلفیاں بھی تھیں۔

وقف جدید کا قیام ہوا ہے تو آغاز ہی سے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے آپ بھی مجلس وقف جدید کے ممبر رہے اور ہم ہمیشہ مالی معاملات میں حضرت مولوی صاحب کو ضرور مقرر کیا کرتے تھے کیونکہ یہ یقین تھا کہ یہ مالی نگرانی میں بہت اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں اور یقین ہوتا تھا کہ کسی غلط خرچ کی اجازت ہی نہیں دیں گے، اس لئے امانتوں پر دستخط کے لئے مولوی صاحب کا نام ضروری تھا اور اکاؤنٹس کو دیکھنے کے بعد جب تسلی کر لیتے تھے کہ ہر چیز درست خرچ ہو رہی ہے تب دستخط کیا کرتے تھے۔ پھر اراکین افتاء میں بھی آپ رہے، دارالقضاء کے بورڈ میں بھی رہے اور قرآن پبلیکیشنز ناظم بک ڈپو، سیکرٹری نصرت پرنٹرز رہ کر اہم خدمات سرانجام دیں۔ اب میں جو قرآن کریم کا اردو ترجمہ کر رہا ہوں اس میں بھی حسب سابق جیسا کہ حضرت مصلح موعودؓ بعض علماء سے خدمتیں لیا کرتے تھے میں نے ایک ترجمۃ القرآن کمیٹی بنائی ہے ربوہ میں جو میرے ترجمے پر گہری نظر ڈالتے ہیں کہیں کوئی گرائمر کی غلطی میری لاعلمی کی وجہ سے رہ گئی ہو یا کوئی ایسا نقطہ جو میری توجہ میں لانا ضروری ہو وہ بڑی محنت

سے اس پر غور کرتے ہیں تفصیل سے چھان بین کر کے اپنا مافی الضمیر میرے سامنے رکھ دیتے ہیں پھر میں فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کی بات سے اتفاق کروں یا نہ کروں۔ بسا اوقات کرتا ہوں بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر تجویزیں رد کرنی پڑتی ہیں وہ سمجھتے ہیں تو بڑی خوشی سے پھر قبول کر لیتے ہیں کہ ہاں یہ بات درست ہے تو اس طرح ہم مل جل کر خدمت کر رہے ہیں۔ مولوی نور الحق صاحب کو بھی اس میں مقرر کیا گیا تھا اور اس میں انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہر میٹنگ میں شامل ہوتے تھے اور بڑی گہری نظر سے مشورہ بھیجا کرتے تھے جب میں مشورہ رد بھی کر دیتا تھا تو خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے ہاں میں سمجھ گیا ہوں آپ کی بات درست میری غلط اور جب قبول کرتا تھا تو شاید اور بھی زیادہ خوش ہوتے ہوں مگر اچھے تعلقات رہے ہمیشہ ان سے اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے۔

وہ پود جو واقفین کی اس زمانے کی قادیان کی پود ہے وہ عجیب بے نظیر پود تھی۔ کچھ رہ گئے ہیں بہت سے رخصت ہو گئے۔ جو رہ گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی اپنے پیار اور اپنی رضا کی چادر میں لپیٹ کر یہاں سے لے جائے اور جو چلے گئے ہیں ان پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔ پس نماز جمعہ کے بعد نماز عصر ہوگی کیونکہ آج کل دن چھوٹے ہیں اور اس کے معاً بعد انشاء اللہ ان سب کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

ہر ظلمت سے نکلنے کی ایک الگ راہِ سلام ہے اور ہر راہِ سلام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روشنی ڈال رہے ہیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 12 / جنوری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ
تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٦﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ
السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٧﴾ (المائدہ:16 تا 17)

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٨﴾ (الاعراف:158)

اس سے پہلے جو دو آیات کی تلاوت کی گئی تھی وہ سورہ المائدہ آیات 16 تا 17 ہیں۔ پس یہ

دو مختلف مقامات ہیں جن سے آیات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پہلی دو آیات سورہ المائدہ سے لی گئیں اور دوسری آیت جو بعد میں پڑھی گئی وہ سورۃ الاعراف سے ہے۔ ان کو اس لئے اکٹھا تلاوت کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اور قرآن کریم میں جو ہر قسم کے جوڑوں کا ذکر ملتا ہے ان طیبات کے جوڑوں میں سے آیات کے بھی جوڑے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو تقویت بھی دیتی ہیں ایک دوسرے میں اٹھائے ہوئے مضامین کی مزید تشریح بھی کرتی ہیں۔ پس یہ ایسا ہی ایک آیات کا جوڑا ہے جو بعینہٖ ایک دوسرے پر منطبق ہو رہا ہے مگر مضامین کھولنے میں مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی ہیں اس لئے بات بہت زیادہ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اہل کتاب قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ وہ خوب کھول کر بیان کرتا ہے، بکثرت ایسی باتوں کو مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ کہ جن کے متعلق تم اخفاء سے کام لیا کرتے تھے مِنَ الْكِتٰبِ کتاب میں سے وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی فرماتا ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور آچکا ہے۔ وہ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ اور ایک روشن کتاب آچکی ہے۔ اس آیت کا جو پہلا حصہ ہے وہ اس آیت کے آخری حصہ پر منطبق ہوتا ہے اور دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر مضمون کھل جاتا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا کی تشریح میں فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ یعنی رسول جو آیا ہے وہ نور ہے اور اس بات میں ایک ادنیٰ سا بھی شبہ باقی نہیں رہتا کہ خدا تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے اس رسول کا تعارف کرواتے ہوئے فرماتا ہے کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ اور لفظ قَدْ جَآءَكُمْ وہی ہیں جو پہلی آیت کے شروع میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ دوسرا كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ فرمایا ہے اور پہلی آیت میں رَسُوْلُنَا کے بعد يُبَيِّنُ کا لفظ جو رکھا گیا ہے وہ دراصل كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کی طرف اشارہ فرما رہا ہے کیونکہ رسول اپنی طرف سے کوئی تبیین نہیں کرتا، کوئی روشنی مضامین پر اپنی ذات سے نہیں ڈالتا بلکہ کتاب اللہ کے حوالے سے وہ امور کو روشن کرتا ہے۔ تو يُبَيِّنُ کی تفسیر ہے یہ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ایک روشن کتاب بھی اس کے ساتھ آئی ہے اور جب وہ نور، الٰہی امور پر یا دنیا کے امور پر تمہاری ہدایت کے لئے روشنی ڈالتا ہے تو ہمیشہ وہ اس کتاب کے نور

سے استفادہ کرتے ہوئے ان مضامین کو کھولتا ہے۔ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ، اب ضمیر ساری رسول کی طرف ہی پھیری جارہی ہے آغاز ہی سے رسول کے مضمون کو اول طور پر اٹھایا گیا ہے۔ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ اللہ اس رسولؐ کے ذریعے، اس نور کے ذریعہ، جو آسمان سے اترا ہے ہدایت دیتا ہے مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ اس کو جو اللہ کی رضا چاہتا ہے۔ اب جہاں رضوان کا تعلق ہے وہاں رسولؐ کی رضوان کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ رسول کی رضا کامل طور پر اللہ کی رضا کی تابع ہوتی ہے اور رضوان چاہنے میں رسول پیش نظر نہیں بلکہ اللہ پیش نظر ہوتا ہے۔ جو اللہ کی رضا چاہے اس سے اللہ بھی راضی، اس کا رسول بھی راضی، اس پر دیگر تمام ایمان لانے والے بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یاد رکھیں تقویٰ کا فیصلہ رضوان اللہ سے ہوا کرتا ہے اور اللہ کے نمائندوں کے حوالے سے تقویٰ نہیں ہوا کرتا۔ تقویٰ صرف خدا کا ہے اور اس مضمون میں تقویٰ اور نور دراصل ایک ہی چیز کے دو نام دکھائی دیتے ہیں مگر اس معاملے میں شاید میں کچھ باتیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں سر دست میں ایک دوسرے پہلو سے آپ کے سامنے یہ آیات رکھ رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ جو اللہ کی رضا چاہتا ہے اس کو محمد رسول اللہ ﷺ ہدایت دیتے ہیں سُبُلَ السَّلٰمِ سلامتی کے رستوں کی طرف۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ راستہ تو ایک ہی ہے جس کی طرف دعا سکھائی گئی کہ اے خدا ہمیں اس رستے کی طرف ہدایت دے وہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ: 6) سیدھے رستے کی طرف جس پر انعام یافتہ لوگ سفر کر رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے کی ہمیں توفیق بخش۔ یہاں اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ جو بھی اللہ کی رضا چاہتا ہے اس کو یہ رسول ہدایت دیتا ہے سُبُلَ السَّلٰمِ سلام کے رستوں کی طرف لیکن کیوں ان سلام کے رستوں کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ ان کی اپنی منزل کس طرف ہے۔ فرمایا وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وہ ان کو مختلف قسم کے اندھیروں میں سے نکالتا ہے نور کی طرف بِاِذْنِهٖ اللہ کے حکم سے يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور انہیں ہدایت دیتا ہے صراط مستقیم کی طرف۔ تو وہ جو رستوں کا زیادہ ہونا ذہن میں تعجب پیدا کر رہا تھا کہ قرآن کریم تو ایک صراط مستقیم ہی کی طرف بلاتا ہے، اللہ کا رسول مختلف سلام کے

رستوں کی طرف کیوں ہدایت دیتا ہے۔ یہ مضمون خوب کھل گیا اور مسئلہ حل ہو گیا۔ فرمایا کہ مختلف سلام کے رستوں پر ان کو چلاتے ہوئے صراط مستقیم تک پہنچا دیتا ہے اور صراط مستقیم تک پہنچنا ہی نور پانا ہے۔ پس جو بھی اندھیروں سے نکلتا ہے وہ یک دفعہ، ایک دم صراط مستقیم پر نہیں آ جایا کرتا۔ جو اللہ کی رضا چاہتے ہوئے جستجو شروع کرتا ہے آنحضرت ﷺ جو اللہ کے نور کے نور ہیں وہ اپنی روشنی کے پیچھے پیچھے ان کو چلاتے ہیں اور وہ روشنی ہمیشہ سلامتی کے رستوں پر چلاتی ہے کیونکہ جو رستے روشن ہوں ان میں ٹھوکر کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ جن رستوں پر اندھیرے ہوں یا سائے ہوں کچھ نہ دکھائی دینے والے خطرات چھپے ہوئے ہوں ان کو سُبُلَ السَّلٰمِ نہیں کہا جا سکتا۔

پس سُبُلَ السَّلٰمِ کا ایک تعلق ظلمات کے جمع ہونے سے ہے۔ ظلمات کا لفظ جمع میں استعمال ہوا ہے یعنی مختلف قسم کے انسان مختلف قسم کے اندھیروں میں مبتلا ہیں۔ کچھ شرک کے مختلف اندھیروں میں مبتلا ہیں، کچھ بالعمد گناہ کے، کچھ دہریت کے اندھیروں میں مبتلا ہیں، کچھ نفس کی اندرونی کمزوریوں میں طرح طرح سے اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ ان سے نکلنے کی راہ نہیں پاتے، یہ سب ظلمات ہیں۔ ہر ظلمت سے نکلنے کی ایک الگ راہ سلام ہے اور ہر راہِ سلام پر محمد رسول اللہ ﷺ روشنی ڈال رہے ہیں۔ یعنی کوئی بھی ایسی پیچیدگی نہیں جس میں انسان گھیرا گیا ہو، جس سے نکلنے کی راہ نہ پاتا ہو مگر حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہر ایسے موقع پر ہدایت کی راہ دکھائی ہے اور وہ راہ سلامتی کا رستہ ہے۔ اس راہ کو اختیار نہیں کرو گے تو خطرات میں گھرے رہو گے۔ اس راہ پر نہیں چلو گے تو ان خطرات کا لقمہ بن جاؤ گے، ان کا نشانہ ہو جاؤ گے اور یہ جو سلامتی کی راہ ہے یہ محض خطروں سے بچانے کی خاطر نہیں بلکہ نور کی طرف لے جانے اور صراط مستقیم تک پہنچانے کے لئے اختیار کرنی ضروری ہے۔ اس لئے کس طرح رفتہ رفتہ انسانی نفس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کس طرح وہ مختلف خطرات کے چنگل سے نکل کر آخر صراط مستقیم تک پہنچتا ہے۔ اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ یہ تب ہی ممکن ہے اگر تم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرو اور اپنی ہر خامی کے مقابل پر وہ تعلیم ڈھونڈو جس میں اس خامی کا علاج ہے اور ایک بھی انسانی کمزوری ایسی نہیں، ایک بھی انسانی ظلمت ایسی نہیں ہے جس کے مقابل پر آنحضرت ﷺ معین طور پر سہارا نہ دے رہے ہوں اور معین طور پر روشنی نہ ڈال رہے ہوں۔

پس نور ایسا ہے جو رسول کی صورت میں اترا، نور ایسا ہے جس کے ساتھ ایک نورانی کتاب اتری، نور ایسا ہے جو ہر اندھیرے کے خواص کے مقابل پر ایک روشنی کا جواب اپنے ساتھ رکھتا ہے اور وہ معین رستے بیان فرماتا ہے جہاں سے چل کر بالآخر تمہارا سفر نور کا سفر ہو جائے گا۔ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ ۔ بِاِذۡنِهٖ سے وہی بات پہلے والی دوبارہ سامنے کھول کر رکھ دی کہ نبی کتاب سے تبیین کرتا ہے۔ اس کتاب سے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے نور نازل فرمائے ہیں۔ نبی خود نور ہے مگر پھر بھی اپنی ذات سے از خود کوئی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ تعلیم جو قرآن کریم میں اتری ہے اسی تعلیم سے استفادہ فرماتا ہے۔ پس یہ جب اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے تو ہر ایسے موقع پر بِاِذۡنِهٖ اللہ کی طرف سے مجاز ہوتا ہے، اللہ کی ہدایت کے تابع ایسا کر رہا ہوتا ہے اس لئے اس کے پیچھے چلنے میں کوئی خوف نہیں ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جو خود بھی نور ہو، جس کی ہدایت کی کتاب بھی نور ہو، جو ہر قدم پر اللہ کی راہنمائی اور اجازت سے اقدام کرتا ہے۔ اس سے زیادہ محفوظ راہنما دنیا میں ممکن ہی نہیں ہے

پس یہ ہے آنحضرت ﷺ کا نزول نور کے طور پر اور قرآن اور بنی نوع انسان سے آپ کے تعلق کے مضمون میں یہ آیت بہت ہی حیرت انگیز طور پر جامع اور مانع ہے مگر ایک پیغام ہے، ایک ہدایت ہے، اے اہل کتاب ایسا کرو کیونکہ تمہارے پاس وہ رسول آچکا ہے۔ اس لئے رسول سے مراد وہ رسول ہے جس کا ذکر اہل کتاب کے صحیفوں میں ملتا ہے۔ جب الۡكِتٰبِ کہتے ہیں تو ایک کتاب مراد نہیں ہے۔ بظاہر عنوان الۡكِتٰبِ ہی کا دیا جاتا ہے مگر وہ کتاب جس کو Old Testament کہا جاتا ہے اس میں کئی صحیفے ہیں، کئی کتب ہیں۔ پس الۡكِتٰبِ میں وہ ساری کتب شامل ہیں اور ان سب کتب میں کسی نہ کسی رنگ میں آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی موجود ہے۔ اب اس کے نتیجے میں کیا واقعہ ہوا؟ کیا کسی نے قبول کیا؟ اگر کیا تو اس کو خدا نے اس کا کیا اجر دیا یہ جواب ہے جو سورۃ الاعراف آیت 158 میں بیان ہوا ہے اور الاعراف میں اس کا بیان ہونا بہت ہی ایک لطیف شان رکھتا ہے کیونکہ الاعراف وہ سورۃ ہے جس میں یہ پیش گوئی فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھی جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک بہت ہی بلند مقام پر فائز ہوں گے اور آنے والوں کو ان کے چہرے دیکھ دیکھ کر پہچانیں گے۔ ان کو دیکھتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ جہنمی لوگ ہیں یا جنتی لوگ ہیں

اور جنتی لوگوں کو وہ جنت کی خوشخبریاں دیں گے۔ پس سورۃ الاعراف میں ان کی پہچان بیان فرمائی گئی کہ اب ہم ان لوگوں کا حال بیان کرتے ہیں جنہوں نے اس ہدایت کو قبول کر لیا جو ان کو مخاطب کر کے خدا تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی۔ فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۔ دیکھو کیسے خوش نصیب لوگ ہیں، ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اس رسول کی پیروی کی جن کی پیروی کی ان کو ہدایت کی گئی تھی۔ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ایسا نبی جو اُمّی ہے۔ پس اگر ہدایت دیتا ہے تو اللہ سے علم پا کر دیتا ہے ورنہ اپنی ذات میں وہ ہدایت دینے کا دعویٰ ہی نہیں کرتا۔ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وہ وہی نبی ہے جس کے متعلق وہ تورات میں اپنے پاس لکھا ہوا دیکھتے ہیں وَالْاِنْجِيْلِ اور انجیل میں بھی۔

پس اہل کتاب کو مخاطب کیا گیا تھا آؤ اور اس نبی کی پیروی کرو جو سراپا نور ہے اور اب بتایا جا رہا ہے کہ ان اہل کتاب میں سے ایسے بھی خوش نصیب ہیں جو پیروی کرتے ہیں يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ اب اندھیروں سے نور کی طرف نکالنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ جب یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں تو يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ان کو ہدایت دیتا ہے۔ امر فرماتا ہے یعنی لفظ امر کا لفظی ترجمہ تو حکم ہے مگر مراد یہی ہے کہ ان کو تلقین فرماتا ہے، ان کو ہدایت دیتا ہے بِالْمَعْرُوْفِ نیک کاموں کی وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ اور ان کو معیوب باتوں سے روکتا ہے۔ الْمُنْكَرِ ایسی معیوب باتیں جو ہر جگہ، ہر ملک، ہر قوم میں انسانی فطرت کی رو سے بری سمجھی جاتی ہیں اور ان کے لئے کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جھوٹ جھوٹ ہے، ظلم ظلم ہے، دھوکہ دھوکہ ہے، یہ ایسی باتیں ہیں جو کھلی کھلی سب کے علم میں ہیں اور کسی کتاب کے حوالے سے آپ نہیں کہا کرتے، کتاب کے حوالے سے کہہ تو سکتے ہیں مگر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ جھوٹ بری بات ہے۔ پس فرمایا وہ ان کو منکر سے روکتا ہے۔ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ اور بہترین چیزیں ان پر حلال کرتا ہے۔ صرف وہ چیزیں حلال نہیں کرتا جو کھائی جا سکتی ہیں۔ جو کھائی جا سکتی ہیں ان میں جو سب سے اچھی ہیں وہ ان پر حلال کرتا ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اور جو خبیث چیزیں ہیں اور پلید چیزیں ہیں وہ ان پر حرام کر دیتا ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ اور ان پر سے ان کے بوجھ اتارتا ہے وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ

كَانَتْ عَلَيْهِمْ اور طوق ان کے کھولتا ہے گردنوں سے اور اتار کے پھینک دیتا ہے جوان کی گردنوں میں مدتوں سے پڑے ہوئے تھے۔ کیسا عظیم مضمون ہے اندھیروں سے نور کی طرف نکالنے کا۔ وہ سُبُلَ السَّلٰمِ بیان فرمادی گئیں جن کا اس آیت میں ذکر تھا کہ امن کی جو راہیں یہ کھولتا ہے یہ تمہیں پکڑ کر امن کے رستوں پر چلاتا ہے، ان سب امور میں یہ محنت کرتا ہے اور تمہیں ہر معاملے میں، ہر مصیبت سے بچاتے ہوئے امن کی راہوں پر ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر لے کے چلتا ہے اور ساری محنت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوئی ہے۔ یہ ایک بہت ہی پر لطف بات ہے کہ اگر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہم کمزوروں اور گناہ گاروں پر محنت نہ فرماتے تو ممکن نہیں تھا ہمارے لئے ،ہمیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں وہ امن کی راہیں، ممکن نہیں تھا کہ ہم از خود اپنی طاقت سے ان پر چل سکتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر رسول اللہ ﷺ پر سارا بوجھ ڈال دیا ہے اور یہ بوجھ ڈالنا منفی معنوں میں نہیں ہے بلکہ مثبت معنوں میں ہے فرمایا تم کیا چیز تھے یہ سب کچھ یہی رسولؐ کر رہا ہے تمہارے لئے۔ تم نے صرف حامی بھری ہے اس کے پیچھے چلنے کی اور اسی کی جزا تمہیں عطا کی جارہی ہے۔ گردنوں کے طوق اتارے، خبیث چیزوں پر مطلع کیا، پاک چیزیں سمجھائیں، ہر قسم کی اچھی اور بری باتیں ان کو بتلائیں اور ان کے بوجھ اتار لئے۔ یہ بوجھ کیا ہیں اگر آپ ان کو نہیں سمجھیں گے، اگر ان طوقوں پر نظر نہیں رکھیں گے جو آنحضرت ﷺ نے گردنوں سے اتار کر پھینک دئے تھے اور یہ خطرہ محسوس نہیں کریں گے کہ کہیں ہم نے ان بوجھوں کو پھر تو نہیں اٹھا لیا۔ ان گرے پڑے دھتکارے ہوئے بوجھوں کو پھر تو نہیں اٹھا کے اپنے کندھوں پر لگا بیٹھے یا وہ گردن کے طوق پھر تو نہیں پہن لئے جن سے آنحضرت ﷺ نے ہمیں آزادی بخشی تھی۔ پس وہ تمام رسوم، وہ تمام جاہلانہ باتیں، وہ تصورات، وہ توہمات وہ روایتی ایسی بدعادات جو قوموں کے لئے واقعۃً ان کے پاؤں کی زنجیریں بن جاتی ہیں یا گردنوں کے طوق بن جاتی ہیں ان کو راہ راست پر ہدایت کے رستوں پر چلنے کی توفیق نہیں رہتی۔ وہ ساری باتیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے باخبر فرما دیا ہے اور جب تک وہ بوجھ اتارے نہ جائیں، جب تک گردنوں کو طوقوں سے آزاد نہ کیا جائے سُبُلَ السَّلٰمِ کی طرف لے جایا جا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے آخر پر طوقوں کا ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا ہے جب تک تم آزاد نہیں ہو گے تم کیسے محمد رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چلو گے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تمہیں آزاد کرنے کا بھی ذمہ

لیتے ہیں۔خود تم پر محنت کریں گے، تمہیں پاک وصاف کریں گے، تمہیں ہلکا کر دیں گے تاکہ آسانی سے تم سلامتی کی راہوں پہ دوڑ سکو اور پھر تمہاری گردن کے طوق کاٹ کے کہیں گے آؤاب چلو۔جس طرح ڈرائیور دنیا میں بھی انجن چلا کر بریک سب سے بعد میں اٹھاتا ہے اور یہی سب سے محفوظ طریق ہے تو جب تک بریکوں سے پاؤں نہ اٹھے آزادی نصیب نہ ہو، موٹر ہر طرح سے تیار بھی ہو تو چل نہیں سکتی۔تو پہلے اس کا انجن درست کیا، اس کے اندر ساری خامیوں سے پاک وصاف کیا۔اس کو چلنے کی طاقت بخشی اور پھر گردنوں کے طوق کاٹ کے پھینک دیئے یعنی وہ دنیا کی آلائشیں، وہ دنیا کے تعلقات جو یہ سمجھ آنے کے باوجود کہ یہ اچھی راہ ہے انسان کو اس راہ پر چلنے سے باز رکھتے ہیں۔کیا یہ طوق ہماری گردنوں سے ایک دفعہ جو کاٹ کے پھینک دئے گئے دوبارہ ہماری گردنوں میں آ تو نہیں گئے؟ یہ فیصلہ ہر انسان کے لئے بڑا آسان ہے۔جب بھی اسے برائیوں سے روکا جاتا ہے، جب بھی اسے نیک باتوں کی ہدایت کی جاتی ہے تو اس کے دل سے ہمیشہ بلا استثناء ایک آواز اٹھتی ہے۔ایک آواز یہ اٹھتی ہے کہ الحمدللہ میں تو اس معاملے میں تیار بیٹھا ہوں سفر کے لئے، سفر پہ روانہ ہونے والا ہوں اور ایک آواز اٹھتی ہے کہ بہت بوجھل تعلیم ہے، بڑا مشکل کام ہے۔اتنی باتوں پہ کون عمل کر سکتا ہے اور ایسا انسان پھر وہیں بیٹھا کا بیٹھا رہ جاتا ہے۔پھر کچھ ایسے ہوتے ہیں جو فیصلہ تو یہی دیتے ہیں کہ یہ بہت مشکل تعلیم ہے ہم سُبُلَ السَّلٰمِ پر چلنے کے ابھی اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتے مگر بے چین ضرور ہوتے ہیں۔بے قراری دل میں پیدا ہوتی ہے، اپنے آپ پر حسرت کی نظر ڈالتے ہیں۔کہتے ہیں کاش ہم بھی وہ ہوتے جو اس رسول کے پیچھے پیچھے سلام کے رستوں پر ہلکے قدموں کے ساتھ پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہوتے۔ان کا معاملہ ایسا ہے جن پر اکثر اللہ اپنے رحم کی نظر ڈالتا ہے اور سوائے اس کے کہ خدا کی حکمت کاملہ سمجھے کہ ان کے اندر بعض ایسی بنیادی کمزوریاں ہیں کہ ہدایت کے لائق نہیں ہیں، رفتہ رفتہ ان کے بھی بوجھ اتار دیئے جاتے ہیں۔مگر یہ بات کہ بوجھ ہم پر ہیں کہ نہیں، یہ بات کہ ہماری گردنیں طوقوں کے اندر جکڑی ہوئی ہیں کہ نہیں، یہ کوئی ایسی راز کی بات نہیں ہے جس کو سمجھنا بالکل کوئی دور کی بات ہو، بڑے بھاری علم کی ضرورت ہو، یہ تو کھلی کھلی بات ہے۔

پس جب بھی خدا اور اس کے رسولؐ کی کوئی آواز آپ کے کانوں میں پڑتی ہے اس وقت آپ کے دل کی کیفیات آپ کو بتا دیتی ہیں کہ کتنا آپ پر بوجھ ہے اور کس حد تک آپ آزاد یا قید

ہیں اور بسا اوقات بعض رستوں میں انسان آزاد ہوتا ہے اور بعض رستوں میں قید ہوتا ہے اور بیک وقت یہ سلسلہ جاری ہے۔ بعض سلامتی کے رستے ایک انسان اپنے مزاج کے مطابق آسانی سے طے کر رہا ہوتا ہے اور اسی وقت وہ دوسرے رستوں میں جکڑا ہوا بھی پایا جاتا ہے۔ بظاہر ایک شخصیت ہے مگر اس کے مختلف قالب مختلف رستوں پر بیٹھے ہی چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پس اس پہلو سے یہ جو Split Personality کا مضمون ہے جو گہری حکمت رکھتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں بعض لوگوں کی پرسنیلیٹی Split ہو جاتی ہے۔ وہ بیک وقت اپنے آپ کو دو مختلف وجود سمجھ رہے ہوتے ہیں اور یہ وہ دیوانہ پن کی نشانی سمجھتے ہیں لیکن دیوانے کا کام نہیں بہت بڑے عارف کا بھی یہی کام ہے کہ اپنی Split Personality کو پہچانے اور دیکھے میں کہاں کہاں تقسیم ہو چکا ہوں۔

اسی لئے جنت میں جو سات دروازوں کا حکم ہے کہ سات دروازوں سے انسان داخل ہو سکتا ہے یا جہنم کے مختلف دروازوں کا ذکر ہے تو اس میں یہی حکمت ہے۔ یہ تو نہیں کہ ایک آدمی بٹ کر، پھٹ کر، سات چیتھڑے بن جائے گا۔ ایک چیتھڑا ایک دروازے سے جا رہا ہوگا اور دوسرا چیتھڑا دوسرے دروازے سے جا رہا ہوگا۔ اس کی جو روحانی طور پر Split Personality ہے وہ جب جنت میں داخل ہوگی تو وہ لطف اٹھائے گی اگر وہ سات دروازوں والی Personality ہے تو سات گنا لطف اس کو دوسروں سے زیادہ آ رہے ہوں گے یا ایسے ایسے لطف آ رہے ہوں گے جن میں بعض دوسرے شریک نہیں ہو رہے ہوں گے۔ پس ایک سات دروازوں والی جنت ہے اور بظاہر وہی جنت ہے جس میں سب داخل ہو رہے ہیں مگر کوئی ایک دروازے سے داخل ہو رہا ہے کوئی دو دروازوں سے داخل ہو رہا ہے کوئی تین دروازوں سے داخل ہو رہا ہے لیکن اس کے مقابل پر ایک بڑا مکروہ نظارہ ہے کہ جہنم میں بھی مختلف دروازے ہیں اور کوئی تمام دروازوں سے وہاں داخل ہو رہا ہے۔ جہنم کی تمام تر بدبختیاں اٹھائے ہوئے، ہر قسم کے طوق اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے جو جہنم میں بھی اس کی گردن پر اسی طرح پڑے رہیں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ پر قرآن کی صورت میں نازل ہوئیں اور آپؐ نے اپنے نور سے ہم پر روشن فرمائیں اور اس کی تفصیل میں کوئی ایک ایسا پہلو بھی باقی نہیں چھوڑا جو سمجھانا ضروری ہو اور آپ نے نہ سمجھایا ہو۔ اتنی باریکیوں میں اترنے والا رسول ہے کہ تمام دنیا کے رسولوں کی تعلیمات کو اکٹھا کر کے دیکھ لیں آنحضرت ﷺ نے جس طرح تفصیلی روشنی

ڈالی ہے اس کا عشر عشیر بھی کہیں دکھائی نہیں دے گا اور جو اندھا ہو، بدنصیب ہو، وہ جاہل انہیں باتوں پر آنحضرت ﷺ کو اعتراض کا نشانہ بناتا ہے۔ ایسے بدبخت پیدا ہو جاتے ہیں جو نام رشد کا رکھتے ہیں اور مجسم ذلالت ہوتے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں، طرح طرح کے آوازے کستے ہیں کہ دیکھو یہ کیسا رسولؐ ہے جس نے وضو کی تفصیل بھی سکھائی ہے یہ بھی بتایا ہے کہ یہاں اس طرح کرو گے تو وضو ٹوٹ جائے گا، یہ بھی بتایا کہ دیکھو ایڑی کا خیال رکھنا، یہ حصہ جہنم میں نہ چلا جائے، اتنی باریک تفصیل کون انسان ان پابندیوں میں جکڑنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرسکتا ہے۔ بڑی مصیبت ہے، بڑا مصیبت کا مذہب ہے۔ حالانکہ اس مضمون کو آپ دوسرے زاویے سے دیکھیں تو اتنا کامل مذہب ہے، اتنا Advanced مذہب ہے کہ کوئی باریک سے باریک ایسا خطرہ نہیں جو ایک مسافر کو رستے میں پیش آسکتا ہو جس کے متعلق کھلے کھلے سائن بورڈز نہ لگا دیئے گئے ہوں روشن حروف میں نہ لکھا گیا ہو اور تفصیل میں خطرات سے آگاہ کرنا اور تفصیل کے ساتھ اس منظر کی خوبیوں پر آگاہ کرنا جس منظر کی تلاش میں انسان نکلا ہے، جس سیر پہ انسان روانہ ہوا ہے، یہ انتہائی ترقی یافتہ صورتیں ہیں نہ کہ وہ جیسے ایک جاہل کو نظر آرہا ہے کہ دخل اندازی ہو رہی ہے۔ اب وہی جاہل جب انگلستان میں یا امریکہ کی سڑکوں پر موٹر پر روانہ ہوتا ہے تو کبھی اس کو خیال بھی نہیں آیا کہ کس مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ جگہ جگہ بورڈ لگے ہوئے ہیں کہ یہاں خطرہ ہے آگے ٹریفک بند ہو رہی ہے، آگے پھسلن آگئی ہے، آگے Black Ice ہے، آگے موڑ بڑا سخت ہے تو اس کو تو اس ملک کو چھوڑ کر بھاگ جانا چاہئے۔ ایسا جاہلانہ ملک کوئی باریک سے باریک چیز بھی نہیں ہے جس کو چھوڑ دیا گیا ہو اور ہدایتیں ہیں، سیر پر جا رہے ہیں کہ دیکھو فلاں پہاڑی میں فلاں جگہ دیکھنا نہ بھولنا، وہاں ایک غار بھی ہے، اس غار کا منظر بڑا ہی خوبصورت ہے۔ اس میں آواز دو گے تو نیچے سے تمہیں اپنی آواز سنائی دے گی اور اس رنگ میں سنائی دے گی جیسے وہ کئی آوازیں بن چکی ہیں اور ایک کے بعد دوسری، تیسری، چوتھی ایک کم گہرائی سے پھر دوسری زیادہ گہرائی سے، پھر اس سے زیادہ گہرائی سے آواز آئے گی۔ ایک حیرت انگیز گوش کی جنت یعنی کانوں کی جنت بن جاتی ہے۔ یہ شخص وہاں پہنچے، دیکھے کہے کیسا پاگلوں والا ملک ہے ہر خوبصورت جگہ کی تفصیل بے ضرورت خواہ مخواہ بیان کی ہوئی ہے۔ ہم باشعور لوگ نہیں ہیں؟ کیا یہ ترقی یافتہ زمانہ نہیں ہے؟ کیا ہم خود نہیں سمجھ سکتے کہ فلاں چیز دیکھنی ہے اور فلاں نہیں دیکھنی

ہے؟ لیکن کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب تک ان گائیڈز Guides کو لے کر ساتھ نہ چلیں جو کسی نئے ملک کے سفر میں آپ کی راہنمائی کرتے ہیں کہ کیا دیکھنا اور کن خطروں سے بچنا، نہ انسان خطروں سے بچ کر واپس آسکتا ہے نہ ان مناظر کے حسن سے صحیح لطف اندوز ہوسکتا ہے۔تو قرآن کریم میں جس رسول ﷺ کا تعارف فرمایا گیا ہے وہ، وہ نور ہے جس نے ہر چیز کی تفصیل بیان کردی ہے، ہر خطرے سے آگاہ کردیا ہے۔ بات کھولتا ہے پھر گردنوں کے طوق اتارتا ہے پھر کہتا ہے آؤ میرے پیچھے چلو۔جس راہ پر میں چلوں گا وہ سلامتی کی راہ ہوگی اور یہ راہ ایک ہی طرف چلتی ہے۔جس طرف سے بھی آؤ گے میرے پیچھے لگو گے تو لازماً صراط مستقیم پر پہنچو گے اور صراط مستقیم وہ ہے جو نور کا سفر ہے۔تو نور پر آنے سے پہلے اندھیروں سے نجات ضروری ہے اور اندھیروں سے بیک وقت نجات ضروری نہیں بلکہ کوشش فرض ہے پھر اگر آنحضرت ﷺ سے استفادہ کرو گے تو ہر اندھیرے سے نکلنے کی ایک راہ آپؐ بتائیں گے۔اس راہ پر چلو اس حد تک تم سلامتی کی راہ پر چل رہے ہو گے۔ پھر ایک اور راہ اختیار کرو گے وہ بھی سلامتی کی راہ ہو گی یہاں تک کہ اپنے نفس کا جتنا گہرائی سے جائزہ لو گے، جتنا اپنے اندھیروں سے، اپنی ذات کے اندھیروں سے آگاہ ہوتے چلے جاؤ گے اتنا ہی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ضرورت تم پر روشن ہوتی چلی جائے گی اور کوئی بھی الجھن ایسی نہیں ہے جس کا حل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش نہ فرما دیا ہو کیونکہ فرمایا: وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ ہر قسم کی ظلمات سے وہ اللہ کے حکم سے ان کو نکالتا چلا جاتا ہے وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور انہیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

اس مضمون کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ پس وہ لوگ جو اس رسول پر ایمان لے آئے جس پر ایمان لانے کی اہل کتاب کو اور ان کے حوالے سے سب دنیا کو دعوت دی گئی تھی وَعَزَّرُوْهُ اور اس کو طاقت پہنچائی۔اب ایمان لانا کافی نہیں ہے جب تک اس رسول کو تقویت نہ پہنچائیں جس نے سب دنیا کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔اس کو مددگاروں کی ضرورت ہے اس کو ایسے ہی اور وجودوں کی ضرورت ہے جو اس کے پیچھے چل کر محض اپنی نجات پر مطمئن نہ ہوں بلکہ اسی کے رنگ میں رنگین ہو کر تمام بنی نوع انسان کی

نجات کے لئے کوشش شروع کردیں عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وہ اس کو طاقت پہنچاتے ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں اس کی نصرت کرتے ہیں۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے یعنی کتاب۔ پس بارہا اس سلسلہ مضامین میں مَیں نے جو آپ کو متوجہ کیا ہے کہ نور کی حیثیت سے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ اور کتاب میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ کتاب جو کچھ کہتی ہے اسے محمدؐ نے اپنا لیا اور اس لئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا نور اپنی ذات میں نور ہونے کے باوجود بنی نوع انسان پر ہدایت کے لئے نہیں چمکا جب تک کہ وہ کتاب نہ نازل ہوگئی جس میں نور تک پہنچانے کے لئے تمام تفاصیل موجود تھیں، ہر قسم کے احکامات موجود تھے۔ یہ ہے مضمون جسے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ (النور:36) کہا گیا ہے۔ اس لئے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کہہ کے محض خالی تصور میں ایک نشے کی حالت پیدا نہ کیا کریں کہ آہاہا! رسول اللہ ﷺ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ہیں جب کہ کچھ بھی آپ کو پتا نہیں کہ مطلب کیا ہے۔ صرف عظمت کے خیال سے اپنے دل کو مطمئن نہ کیا کریں سمجھنے کی کوشش کریں کہ عظمت ہے کیا، نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کہتے کس کو ہیں۔ جب آپ سمجھیں گے تو آپ حیران ہو جائیں گے یہ دیکھ کر یا آپ کا دل بلیوں اچھلنے لگے گا یہ معلوم کر کے کہ یہ تو وہ نور ہے جس تک پہنچنے کے لئے میں بنایا گیا ہوں۔ جو میری ہدایت کرے گا خود اپنے نور کی طرف۔ سارا سفر کروا کے آخر کہاں پہنچادے گا وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو اس کے ساتھ اتارا گیا یعنی قرآن کریم اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔

اب آپ یہاں ترتیب پر بھی غور فرمائیے فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ پہلے ایمان پھر اس کو طاقت پہنچانا۔ ایمان لاکر خالی بیٹھ رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو ایمان لاتا ہے کہتا ہے جی میں ایمان لے آیا ہوں کافی ہوگیا۔ صرف ایمان لاکر عمل کرنا بھی نہیں، ایمان لاکر محمد رسول اللہ ﷺ کے مقاصد کو تقویت پہنچانا یہ پہلی شرط رکھی ہے ایمان کے بعد وَنَصَرُوْهُ اور ہر طرح سے اس کی مدد کرنا۔ اس کے بعد فرمایا وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ پھر وہ نور کی پیروی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتباع نور ممکن نہیں ہے کہ محض ایمان سے حاصل ہو جائے۔ تم نور کی پیروی کرنے والے خدا کے حضور اس وقت لکھے جاؤ گے جب تم اپنی تمام تر طاقتیں جو کچھ تمہیں نصیب ہوئی ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے رستے

میں جھونک دو گے تا کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے دین کو طاقت ملے اور ہر طرح سے اس کی نصرت کرو گے جس نے تمہاری نصرت فرمائی ہے۔ پس دیکھیں وہ کمزور لوگ جن میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ اپنے نفس کے بندھنوں سے آزاد ہو سکتے ان کو محمد رسول اللہ ﷺ نے آزاد کروایا ہے اور آخر پر خدا کی طرف سے یہ مطالبہ ہے کہ اب اس کی مدد کرو، اب اس کو طاقت پہنچاؤ۔ ایسے عظیم محسن ہیں کہ تم جو چاروں طرف سے ظلمات میں گھرے پڑے تھے، ایک قدم اٹھانے کی طاقت نہیں تھی، سر سے پاؤں تک جکڑے ہوئے تھے، تمہارے سارے بندھن توڑے، تمہیں طاقت بخشی، تمہیں اٹھایا، تمہیں پیچھے چلایا۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس رسول کی مدد کرو، اس کو طاقت پہنچاؤ، کیونکہ صرف تم تک طاقت پہنچانا مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ یہ وہ رسول ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے بنایا گیا ہے اور کام ابھی باقی ہے۔ ابھی بہت بڑا سفر ہے جو طے کرنا پڑے گا اور اس سفر میں جتنے جتنے غلام آزاد ہوتے چلے جائیں گے وہ سارے کے سارے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے معین اور مددگار بن جانے چاہئیں۔ ایسا کرو گے تو پھر خدا کے نزدیک تمہارے متعلق یہ فیصلہ ہوگا وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ہاں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے فی الحقیقت اس نور کی پیروی کی ہے جو اس کے ساتھ اتارا گیا تھا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یقیناً یہی ہیں جو کامیاب ہونے والے لوگ ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جس عبارت سے میں نے ایک اقتباس پیش کیا تھا اس کا ایک حصہ باقی تھا اور اس کا اسی مضمون سے تعلق ہے۔ اس لئے اب آخر پر میں اس عبارت کے حوالے سے آپ کو اس مضمون کی بعض اور باریکیاں سمجھاتا ہوں۔ میں نے گزشتہ خطبے میں یہ عرض کیا تھا کہ ''میرے نزدیک آگ اگر اسے نہ بھی چھوئی ہوتی تو وہ بھڑک اٹھنے پر تیار تھا'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آگ کی انتظار تھی آگ چھوئے گی تو پھر وہ بھڑکے گا۔ آگ سے پہلے بھڑک تو سکتا تھا مگر جب آگ کا شعلہ پڑا تو بھڑک اٹھا، یہ ہرگز مراد نہیں۔ آگ کا تو آنحضرت ﷺ کے وجود سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ آگ کے متعلق تو محمد رسول اللہ ﷺ کے کامل غلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے الہاماً یہ فرمایا کہ

''آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے''

(تتمہ حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 584)

وہ آگ جسے ابراہیمؑ پر بھڑکنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی کیسے اسے اجازت مل سکتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے اس شفاف نورانی تیل پر بھڑکے گویا وہ تیل اس کی بھڑک کا محتاج تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔

''اور تیل ایسا صاف اور لطیف کہ بن آگ ہی روشن ہونے پر آمادہ''

(براہین احمدیہ حصہ سوم جلد 1 صفحہ 195 حاشیہ)

یعنی آگ کی ضرورت نہیں ہے اس کو۔ روشن کیسے ہوگا؟ ''یعنی عقل اور جمیع اخلاق فاضلہ اس نبی معصوم کے ایسے کمال موزونیت و لطافت و نورانیت پر واقعہ'' یعنی یہ وہ صفات ہیں جن کی سب سے اعلیٰ درجہ کی صفت نورانیت ہے اور جو نورانیت سے روشن ہونے پر تیار بیٹھا ہو اس کو آگ کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا کہ الہام سے پہلے ہی اب الہام تو آگ نہیں ہے الہام سے پہلے ہی خود بخود روشن ہونے پر مستعد تھے۔ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یہ ہے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ۔ پس الہام قرآن کریم ہے جو کلام کی صورت میں آپؐ پر نازل ہوا اور نورعلیٰ نور سے مراد وحی الٰہی ہے جو آنحضرت ﷺ پر، نور پر چمکی تو ایک نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کا منظر پیدا ہو گیا۔ فرماتے ہیں:۔

''یعنی جب کہ وجود مبارک حضرت خاتم الانبیاء ﷺ میں کئی نور جمع تھے سوان نوروں پر ایک اور نورِ آسمانی جو وحیءِ الٰہی ہے وارد ہو گیا اور اس نور کے وارد ہونے سے وجود باجود خاتم الانبیاء ﷺ کا مجمع الانوار بن گیا۔ پس اس میں یہ اشارہ فرمایا کہ نورِ وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے''

(براہین احمدیہ حصہ سوم جلد 1 صفحہ 195 حاشیہ)

اب جہاں بھی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے آنحضرت ﷺ کی گہری سیرت کا بیان فرمایا ہے۔ اس سیرت کا نہیں جو ان لوگوں کو نظر آتی ہے جن کی نگاہ کملی پر ٹھہر جاتی ہے۔ اس سیرت کا ذکر فرمایا ہے جسے کملی لپیٹے ہوئے ہے یعنی سیرت باطنہ جو آپؐ کی روح کی سیرت ہے، آپؐ کے دل کی سیرت ہے۔ اس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام روشنی ڈالتے ہوئے ہمیشہ کوئی ایسی بات بیان فرما دیتے ہیں جس سے اچانک ہمارا اس نور سے تعلق قائم ہو جاتا ہے اور ہم پر ایک فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ لطف تو اٹھا لئے قلب و نظر نے، مگر اب پیچھے بھی چلو۔ اگر پیچھے

نہیں چلو گے تو نور کی محبت کے دعوے سب جھوٹے اور فرضی ہیں۔ فرمایا یہ ثابت ہوا ہے کہ اگر اللہ کا نور چاہتے ہو تو لازماً پہلے نور بننا ہوگا۔ اگر نہیں بنو گے تو تم وہیں کے وہیں پڑے رہ جاؤ گے اور تمہیں نور عطا نہیں ہوگا۔ پس جن آیات کی میں نے تلاوت کر کے آخری نتیجہ نکالا تھا یہ بعینہٖ وہی نتیجہ ہے جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام ایک دوسری آیت کے حوالے سے نکال رہے ہیں کہ جب تم محمد رسول اللہ ﷺ کی متابعت کرو گے تو پہلے درجہ بدرجہ نور بنتے چلے جاؤ گے۔ جب بنو گے تو پھر اس نور کی پیروی کے مستحق قرار دیئے جاؤ گے جس پر آسمان سے شعلۂ نور اترتا ہے۔

''یہ اشارہ فرمایا کہ نورِ وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے۔ تاریکی پر وارد نہیں ہوتا''۔

پس جن جن گوشوں میں تم اندھیروں میں جکڑے ہوئے بیٹھے ہو۔ اندھیروں میں گھرے ہوئے مقیّد ہو۔ ان گوشوں میں بیٹھے ہوئے تم پر خدا نہیں اترے گا۔ ہر اس گوشے سے نکلنا ہوگا۔ ہر اس قید سے رہائی پانی ہوگی۔ مگر خوشخبری یہ ہے کہ اللہ کا نور انتظار نہیں فرمائے گا کہ جب تک تم کامل طور پر ہر کمزوری سے آزاد نہیں ہو جاتے وہ تم پر جلوہ گر نہ ہو۔ جس حد تک بھی آزاد ہو گے تم راہِ سلام پر چل پڑو گے۔ تمہارے وجود کا کوئی حصہ سلامتی کی راہ پر چل رہا ہوگا پھر اور حصے بھی اس کے ساتھ شامل ہوتے چلے جائیں گے اور جن جن راہوں پر تم سلامتی کی راہ اختیار کرو گے وہاں خدا تعالیٰ سے تعلق کے آثار بھی دیکھو گے۔ اب یہ وہ مضمون ہے جو ہم پر بہت سی بعض ایسی باتیں کھول دیتا ہے جسے لاعلم نہ سمجھ کر بعض نیک لوگوں پر اعتراض کرتا ہے۔ کئی ایسے لوگ دنیا میں دیکھے گئے ہیں کوئی نمازوں میں بہت اچھا ہے، کوئی چندوں میں بہت اچھا ہے، کوئی اور بہت سی خوبیاں رکھتا ہے، غریبوں کا بے حد ہمدرد ہے۔ غرضیکہ خوبیاں بہت سی ہیں اور وہ ساری سُبُلَ السَّلٰمِ ہیں۔ یہ نہ بھولیں کہ یہی وہ سلامتی کی راہیں ہیں جن پر محمد رسول اللہ ﷺ آپ کو نجات لے کر چلاتے ہیں، ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھاتے ہیں اور ان راہوں پر اگر یہ سُبُلَ السَّلٰمِ ہیں تو نور کا ایک حصہ تو ضرور وارد ہوتا ہو گا کیونکہ یہ سارے رستے صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ یہ سارے رستے قرآن کے بیان کے مطابق نور کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ تو کیا پتہ کہ جس راہ میں جا رہا ہوں وہ نور کی راہ ہے بھی کہ نہیں۔ اس دغدغہ کو دور کرنے کے لئے یا جو بھی وہم ہے اس کو دور کرنے کے

لئے ، یقین کی حالت پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جزوی انعامات سے بخشار ہتا ہے اور جس دائرے میں وہ نیکی اختیار کرتا ہے، جس پاک راہ پر چلتا ہے اس راہ کے انعامات سے اس کو اس لئے محروم نہیں کر دیتا کہ جب تک تم تمام راہوں کو اختیار نہیں کرو گے میں تمہیں کسی راہ کی جزاء نہیں دوں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ پس ایسے پاک لوگ جو ابھی پاکی کا سفر کر رہے ہیں ابھی سفر کا آغاز ہوا ہے ان کو آغاز ہی سے اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے نوازنا شروع فرما دیتا ہے اور باہر سے دیکھنے والا جو ان انعامات سے محروم ہوتا ہے جس کو پتا ہی نہیں کہ تعلق باللہ کی کیا کیا منازل ہیں، کیسے کیسے اس کے عارفانہ مضامین ہیں وہ اپنی جہالت میں اور کچھ حسد کے نتیجے میں اس کی ایک سچی رؤیا کو دیکھ کر مذاق اڑاتا ہے کہ بڑا نیک بنا پھرتا ہے۔ ہمیں نہیں پتا فلاں کمزوری اس میں واقع ہے۔ فلاں معاملہ میں تو یہ ٹھوکر کھا گیا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیار کے لئے یہی نظر آیا ہو، اب یہ اعتراض تو بظاہر ایک خاص معین طور پر ایک عام انسان پر کیا جا رہا ہے ۔ مگر یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ اپنی مکمل صورت میں یہی اعتراض انبیاءؑ پر بھی کیا جاتا رہا ہے اور قرآن اس ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ ہر نبی کو اسی اعتراض کا نشانہ بنایا گیا کہ خدا کو یہی نظر آیا ہے اپنے کلام کے لئے اور اپنے لئے انتخاب کرنے کی خاطر! ہم جانتے ہیں عام سا انسان ہے تو ان کی آنکھ جو دیکھ رہی ہے ایک نبی کو، اس کو بھی اس لائق نہیں پا رہی کہ خدا اسے اپنے فضلوں کا وارث بنائے اور حسد کی آنکھ ہے دراصل ۔ پس حسد کی آنکھ تنگ ہوا کرتی ہے اور حسد کی آنکھ سے جب اپنے بھائیوں کو آپ دیکھتے ہیں تو آپ کو صرف ایک برائی دکھائی دیتی ہے اور اردگرد کا اس کا جو منظر ہے وہ نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پس ایک Slit میں سے آپ دیکھتے ہیں اور اسی لئے چشم حسود کو تنگی کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ آنکھیں جو حسد کی وجہ سے نبیوں کی خوبیاں دیکھنے سے بھی عاری ہو جاتی ہیں وہ لازماً یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ اس شخص میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خدا اسے اپنے کلام کے لئے چن لے اور وہ انسان جو کمزور انسان ہیں جن کا نبوت سے کوئی رشتہ ہے تو محض غلامی کا رشتہ ہے ان پر بھی اعتراض اٹھتا ہے۔ تو یہ فطری اعتراض ہے، انسانی فطرت کی بعض کمزوریاں جن میں حسد سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ کمزوریاں پاکوں پر حملہ کرواتی ہیں اور یہ نہیں دیکھتیں کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اگر ایک بھی ہدایت کی راہ نصیب کی ہو تو اس ہدایت کی راہ کے نشان اس راہ پر بندے کو

ضرور ملیں گے۔ اس لئے تم حسد کرو یا نہ کرو اس کا کوئی اثر بھی نیک رستوں پر چلنے والوں پر نہیں پڑے گا لیکن دوسری طرف بھی ایک خطرہ ہے۔ جن راہوں میں تم محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی نہیں کرو گے وہاں ہمیشہ خطروں کی تلوار کے نیچے پڑے رہو گے۔ اس لئے اللہ بہتر جانتا ہے کہ تمہارا انجام کس صورت میں ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بعض راہیں جن میں تم آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سلامتی کی راہوں پر قدم مار رہے ہو ان کے مقابل پر ان راہوں کے خطرات بڑھ جائیں جن پر تم زنجیروں میں پڑے بند اندھیروں میں بیٹھے ہوئے ہو۔ تم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ایسے وقت میں موت آجائے تو یہ ناکامی اور نامرادی کی موت ہے اور اگر ایسے وقت میں آئے کہ ساری راہیں اس ایک راہ پر اکٹھی ہو جائیں جو نور کی ہے وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یقینی طور پر کامیاب ہونے والے لوگ ہیں۔

پس جہاں ان باریک راہوں پر نظر رکھیں، اپنے نفس کو ٹٹولتے رہیں، اپنے پر لازم کرلیں کہ ہم نے ضرور اس سفر میں آگے بڑھنا ہے وہاں اس کی بعض علامتیں اپنے اندر جانچتے رہا کریں، دیکھتے رہا کریں وہ پیدا ہوئی ہیں کہ نہیں ہوئی ہیں تو آگے بڑھ رہی ہیں کہ نہیں۔ ان میں بعض موٹی موٹی علامتیں یہ ہیں کہ آپ دین کے لئے اپنی طاقتوں کو قربان کرتے ہوئے دین کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نہیں۔ اگر عَزَّرُوْهُ کا عمل آپ کی ذات پر اثر نہیں دکھا رہا۔ اگر محمد رسول اللہ ﷺ کے احسان کی باتیں تو کرتے ہیں، آپؐ کے نور کے گیت تو الاپتے ہیں لیکن اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اگر محسن اعظم کہتے ہیں۔ کہتے ہیں تو سب دنیا کا محسن ہے اور اپنے احسانوں کو بھول جاتے ہیں۔ آپؐ پر جو احسان ہوئے ان کا بدلہ اتارنے کی خواہش ہی دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ تو پھر آپ آنحضرت ﷺ کے احسانات کا بدلہ اس طرح اتارنے کی کوشش نہیں کریں گے کہ آپؐ کے دین کے غلبہ کی خاطر اپنی طاقت کو دین کی طاقت کی طرف منتقل کریں۔ وہ مالی طاقت بھی ہو سکتی ہے، وہ جسمانی طاقت بھی ہو سکتی ہے۔ غرضیکہ ہر قسم کی طاقت جو خدا نے آپ کو عطا کی ہے عَزَّرُوْهُ کا عمل آپ پر ہونا چاہئے۔ وَنَصَرُوْهُ میں وہ کون سا زائد مضمون ہے جو عَزَّرُوْهُ میں نہیں ہے۔ یہ بھی ایک قابل توجہ بات ہے۔ نصر کا دائرہ بہت وسیع ہے اور نصر دراصل اللہ کی طرف سے اترتی ہے۔ پس دعائیں جو ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ نَصَرُوْهُ کے تابع آتی ہیں۔ وہ اپنی

تمام طاقتوں کو ہی اس راہ میں نہیں جھونکتے ، جان و مال ہی قربان نہیں کرتے مگر نصرت دے کر کرتے ہیں اور نصرت کا بنیادی تعلق آسمان سے اترنے والی نصرت کے ساتھ ہے جو دعاؤں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے ۔اس لئے دعائیں بھی فرض ہیں۔دین محمد مصطفی ﷺ کے لئے دل میں درد اتنا پیدا ہونا چاہئے کہ سب دعاؤں سے دین کی دعا فوقیت لے جائے اور جب بھی آپ پریشانیوں میں مبتلا ہوں تو کبھی کبھی اپنا جائزہ لے لیا کریں کہ آپ کو دین کی بھی ویسی ہی پریشانی لاحق ہوتی ہے جیسے اپنے روزمرہ کے کاموں میں ،اپنی مصیبتوں میں،اپنے قرضوں میں ،اپنی بیماریوں میں لاحق ہوتی ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے جو دین کی نصرت فرمائی انہی معنوں میں سب سے بڑھ کر نصرت فرمائی۔ایک موقعہ پر بڑی حسرت سے آپؑ کہتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے ان لوگوں پر جن کا تمام ہم وغم بس دنیا ہی کے لئے ہے۔اپنی مصیبتوں میں مبتلا ،اپنے قرضوں کے جھگڑوں سے آزادی کی تمنا رکھنے والے اور دین کے معاملات سے یا غافل ہیں یا ہلکی سی سرسری سی توجہ ہے، جہاں اپنے لئے دعائیں مانگتے ہیں وہاں ضمناً کہہ دیتے ہیں اچھا دین کو بھی فتح عطا فرمادے لیکن وہ دعا ہونٹوں سے اٹھتی ہے،اپنی مصیبتوں میں جو دعا مانگتے ہیں وہ دل کی گہرائی سے مضطر کی دعا بن کے اٹھتی ہے۔آپؑ نے فرمایا تم دین کے لئے ہم وغم لگالو پھر دیکھو کہ تمہارے کام اللہ کے کام بن جائیں گے۔تم محمدؐ رسول اللہ کی نصرت پر مستعد ہو جاؤ گے تو خدا تمہاری نصرت پر مستعد ہو جائے گا۔بسا اوقات تمہیں خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ میری یہ ضرورت ہے اور آسمان سے اللہ تمہاری ضرورت پوری کر رہا ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا اصل ہم وغم ،اصل فکر دین محمد مصطفی ﷺ کے لئے ہے جو اس کی جان کو لگ گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اس مضمون کو بہت ہی بلند اور ارفع صورت میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دین پر قربان ہو جانا محض وقتی طور پر اپنی جان قربان کر دینے کو نہیں کہتے۔نہ اس بات کا نام ہے کہ تم دین کے خیال اور غم سے چھرا گھونپ کر مر جاؤ یا سنکھیا (کچلہ) کھا کر جان دے دو۔یہ تو محض جہالت اور ضیاع ہے۔دین کی خاطر مرنا اس کو کہتے ہیں کہ دین کا غم تمہیں ایسا لگ جائے کہ تمہارا وجود گھل رہا ہو اندر اندر۔وہی غم سب سے زیادہ تم پر کڑا گزرے یہاں تک کہ اس غم میں گھل گھل کر تم جان دے دو۔انسان سمجھ رہا ہوگا کہ عام طور پر ایک جان گئی ہے طبعی اسباب نے اپنا اثر دکھایا ہے مگر اللہ جانتا ہوگا کہ یہ جان دین کے غم میں گئی ہے۔اس کو

کہتے ہیں جان قربان کرنا۔ پس آنحضرت ﷺ جن کا ذکر ان آیات میں چل رہا ہے جو مجسم نور ہو چکے تھے اس سلسلہ میں اللہ آپؐ کے حق میں گواہی دیتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۝ (الکہف:7)

دوسری آیت ہے

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝ (الشعراء:4)

تو اپنی جان کو ہلاک کرلے گا اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ تو دیکھیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے جو کچھ بھی بیان فرمایا قرآن ہی کی تفسیر میں بیان فرمایا۔ جو کچھ بھی بیان فرمایا دین کی محبت میں اور محمد رسول اللہ ﷺ کے عشق میں بیان فرمایا۔ یہی وہ سُبُلَ السَّلٰمِ ہیں جن پر چل کر آپ صراط مستقیم تک پہنچ سکتے ہیں۔

خدا کی خاطر خدا کی عبادتوں کی توفیق مانگنے کیلئے سب سے عظیم مہینہ رمضان کا مہینہ ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 19 / جنوری 1995ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۖ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۖ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ (البقرۃ: 186، 187)

فرمایا:

یہ آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے سورۃ البقرہ کی 186 اور 187 آیات ہیں۔ان میں رمضان مبارک کا ذکر ہے اور اس کے مختلف فوائد اس رنگ میں بیان فرمائے گئے ہیں کہ پڑھنے والا بے ساختہ رمضان مبارک کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔آغاز ان آیات کا اس عنوان سے ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کہ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس کے بارے میں قرآن اتارا گیا یا جس میں قرآن اتارا گیا۔اب جس میں قرآن اتارا گیا کا جو پہلا معنی عموماً کیا جاتا ہے اس سے چونکہ بعض دلوں میں سوال اٹھتے ہیں اس لئے بعض لوگوں نے دوسرے معنوں کو

ترجیح دی ہے کہ جس کے بارے میں قرآن اتارا گیا۔ پہلے معنی کی رو سے یہ مطلب بنتا ہے کہ رمضان مبارک ہی میں قرآن اتارا گیا اور وہ لوگ جو جانتے ہیں احادیث کے مطالعہ سے یا سن کر بھی کہ قرآن کریم تو سارا سال اتارا گیا ہے اور ایک رمضان اور دوسرے رمضان کے درمیان آنحضرت ﷺ کی وحی منقطع نہیں ہو جایا کرتی تھی بلکہ ہمیشہ جاری رہتی تھی ان کے لئے یہ دقت ہے کہ ''رمضان میں اتارا گیا'' کا ترجمہ کیسے کریں۔ چونکہ ایک معنی فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کا یہ بھی بنتا ہے ''اس کے بارے میں'' تو انہوں نے اس ترجمہ کو ترجیح دی اور اس ترجمہ پر بھی بعض سوال اٹھتے ہیں کہ کیا قرآن کریم رمضان کے سوا اور مضمون پر بحث نہیں کرتا کیا تمام تر رمضان ہی کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اگر ذرا غور سے ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو دونوں بالکل درست ہیں اور اعتراض بے محل ہیں۔ چنانچہ بہت سے وہ علماء جنہوں نے پہلے ترجمہ پر زور دیا فِيْهِ الْقُرْاٰنُ اس مہینے میں قرآن اتارا گیا وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اول قرآن کا آغاز رمضان المبارک سے ہوا ہے۔ نمبر دو یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ پر جبرائیلؑ اترا کرتے تھے، روزانہ اترتے تھے اور روزانہ اس وقت تک کا قرآن جو نازل ہو چکا تھا اس کی دہرائی کرواتے تھے۔ تو لفظاً یہ ترجمہ بھی درست ہے کہ پورا قرآن اس ایک مہینہ میں اتارا گیا کیونکہ اور کوئی مہینہ ایسا نہیں جس میں اس طرح وہ قرآن کا حصہ جو نازل ہو چکا تھا اس کی دہرائی کی جاتی تھی یہاں تک کہ جب مکمل ہو گیا تو آخری رمضان میں بلا شبہ پورے کا پورا قرآن ایک ہی مہینہ میں دہرایا گیا اور یہ دُہرانا چونکہ انسانی ذرائع سے نہیں تھا بلکہ جبرائیل علیہ السلام خود اترتے تھے اللہ کے حکم سے اور آنحضرت ﷺ کو قرآن یاد کرواتے تھے، سنتے تھے۔ اب تفصیل تو نہیں آتی کہ جہاں کوئی سہو ہو گئی ہو گی وہاں درستی کرواتے ہوں گے۔ مگر مضمون یہی ہے چونکہ خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ اپنی زبان کو جلدی حرکت نہ دے ہمارا ذمہ ہے کہ ہم تجھے قرآن یاد کروائیں اور اس کی حفاظت کریں اس لئے تجھے بالکل بے فکر ہو جانا چاہئے ناممکن ہے کہ تیری یادداشت کی غلطی کے نتیجہ میں قرآن دنیا کے سامنے غلط پیش کیا جائے پھر یہ جو حفاظت فرمائی گئی تھی اس کا یہ بھی ایک طریق تھا۔ اس حفاظت کے وعدے کو اس طرح پورا فرمایا گیا۔ پس اس پہلو سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تراویح میں بہت سی جگہوں پر سارا قرآن دہرایا جاتا ہے تو غالباً اس کی سند یہیں سے ملتی ہے ورنہ کوئی ایسی سند نہیں کہ ضرور قرآن کریم رمضان مبارک میں تہجد

یا تراویح کی نماز میں دہرایا جائے۔ قرآن خود دہرائی جانے والی کتاب ہے وہ ایک الگ مضمون ہے وہ تو سال میں بار ہا دہرایا جاتا ہے مگر رمضان میں دُہرانے کا جو مضمون ہے اس کا تعلق ان احادیث سے ہے جن میں آنحضرت ﷺ کے متعلق آتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام خود آپؐ پر نازل ہو کر آپؐ پر پورا قرآن جو اس وقت تک اترا ہوتا تھا پڑھتے تھے یعنی گویا کہ قرآن کریم دوبارہ نازل ہوتا تھا اور آپؐ بھی ساتھ اس قرآن کریم کو جو جبرائیلؑ پڑھ کر سناتے تھے دہراتے جاتے تھے۔ پس ایک معنی تو یہ ہے۔

فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کا جو دوسرا معنی بیان کیا جاتا ہے اور تفسیر کبیر میں بھی آپ ترجمہ دیکھیں گے تو یہی ملے گا کہ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم نازل کیا گیا تو ''جس کے بارہ میں'' کیوں فرمایا گیا۔ رمضان کے علاوہ بھی تو بہت سی باتیں ہیں اور بہت کثرت سے ہیں جو رمضان نہیں کہلاتیں مگر قرآن کریم ان کے متعلق مضامین کھولتا ہے تو اس میں حکمت یہ ہے کہ تمام تر شریعت احکامات اور نواہی جس کثرت کے ساتھ اور جس تکمیل کے ساتھ رمضان میں دہرائے جاتے ہیں یعنی ان پر عمل کیا جاتا ہے اور کروایا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک پہلو بھی شریعت کا باقی نہیں رہتا جو رمضان میں نہ ادا ہو۔ اس پہلو سے کوئی اور مہینہ ایسا نہیں کہلا سکتا کہ گویا قرآن کریم اس کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ جب رمضان کے بارے میں نازل ہوا پڑھتے ہیں تو مراد ہے کہ قرآن کریم نے جتنی بھی انسان سے توقعات کی ہیں، جتنے بھی ارشادات فرمائے ہیں، جتنی باتوں سے روکا ہے یا ناپسند فرمایا ہے ان سب کا اس ایک مہینے سے تعلق موجود ہے۔

پس خدا کی خاطر بھوکے رہ جانا اب یہ بھی ایک عبادت کا مضمون ہے لیکن رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں لازم نہیں ہے۔ خدا کی خاطر کسی سختی کا جواب بھی سختی سے نہ دینا۔ جس کا سختی سے جواب دینے کی قرآن بعض حالات میں اجازت بھی دیتا ہے مگر خدا کی خاطر نیکی کو اس کے اعلیٰ درجے پر پہنچ کر ادا کرنا اور ادنیٰ درجے پر بھی ادا کرنا یہ تمام تر مواقع رمضان میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ وہ چیزیں جو جائز ہیں ان سے خدا کی خاطر مزید احتراز اور نوافل پر زور یہ روزمرہ کے عام مہینوں میں دیکھنے میں آتا تو ہے مگر شاذ کے طور پر، اس طرح نہیں کہ پوری قوم مسلسل ان باتوں میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ پس اس پہلو سے کوئی بھی ایسی نیکی نہیں جس کا قرآن میں ذکر ہوا اور رمضان میں خصوصیت کے ساتھ اس کو ادا کرنے کے مواقع نہ ہوں اور کوئی بھی ایسی بدی نہیں ہے جس سے رُکنے کا حکم ہوا اور

رمضان مبارک میں خصوصیت کے ساتھ ان بدیوں سے روکنے کی تلقین نہ فرمائی گئی ہو۔ تو گویا اگر رمضان کا مفہوم آپ سمجھ جائیں اور رمضان کو کامیابی سے گزار جائیں تو گویا آپ نے تمام شریعت پر عمل کر لیا، تمام قرآن پر عمل کر لیا اور یہ امر واقعہ ہے اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں ہے۔ پس اس پہلو سے وہ ترجمہ بھی بعینہ درست ہے کہ گویا قرآن رمضان کے مہینے کے بارے میں اتارا گیا ہے۔

اور جب فرمایا کہ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ تو اس کی تشریح ساتھ ہی فرما دی هُدًى لِّلنَّاسِ وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن ہدایت بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عام ہدایت ایک زیادہ روشن اور کھلی کھلی ہدایت۔ عام ہدایت تو ہر مہینے میں، روز و شب جاری رہتی ہے۔ مگر رمضان میں یہ ہدایت خوب کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ هُدًى کہنے کے بعد فرمایا هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ صرف اس مہینے میں ہدایت عام ڈگر پر نہیں چلتی بلکہ غیر معمولی طور پر کھل کر اور روشن ہو کر انسان کے سامنے چمک اٹھتی ہے وَ الْفُرْقَانِ اور فرقان بن جاتی ہے۔ یعنی ایسے دلائل اور ایسے روشن دلائل میں تبدیل ہوتی ہے جو قوی غلبے کی طاقت رکھتے ہیں۔

پس رمضان مبارک کا حق ادا کرتے ہوئے رمضان مبارک سے گزرنا عام روزمرہ کی ہدایت سے بڑھ کر غیر معمولی ہدایت پانا ہے اور مقام فرقان تک پہنچ جانے کے مترادف ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ اس عظیم عنوان کے بعد یہ جو اس مضمون سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے پھر فرمایا ہے کہ روزے رکھو اور صاف پتا چلتا ہے کہ پہلے ذہن اور قلب کو تیار کیا جا رہا ہے، کیا ہونے والا ہے؟ کون سا عظیم مہینہ آ رہا ہے؟ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ شهـــد شهـــراً سے مراد ہے جو رمضان کو طلوع ہوتا دیکھے۔ یعنی رمضان کا چاند جس پر طلوع ہوگا وہ روزے رکھے۔

اب رمضان کا مہینہ اصل میں بیک وقت، ہر جگہ اکٹھا طلوع نہیں ہوتا اور یہ بحثیں عام اٹھ رہی ہیں کہ کیوں نہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ سب مسلمان بیک وقت روزے رکھیں اور یہ جو جھگڑے چل رہے ہیں آج ان کا رمضان شروع ہو گیا کل ان کا رمضان شروع ہو گیا ان جھگڑوں کا قضیہ ہی چکا دیا جائے مگر قرآن تو نہیں چکاتا۔ قرآن کریم نے تو اس مضمون کو کھلا چھوڑا ہوا ہے۔ مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہو اور اس ملک کے افق

الگ الگ ہوں اور اگر ایک شخص نے مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ کے وقت کو پایا ہو تو اس پر فرض ہے کہ روزے رکھے۔ایک وہ جس نے نہیں پایا اس پر فرض نہیں ہے بلکہ مناسب نہیں ہے کہ رکھے۔اسے انتظار کرنا ہوگا جب تک اس آیت کا اطلاق اس پر نہ ہو۔

تو رمضان بھی بعینہٖ ایک ہی تاریخ کو ہر جگہ شروع نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ممالک بدل جائیں تو پھر تو ویسے ہی ناممکن ہے کیونکہ اگر جب بھی رمضان کا چاند طلوع ہوگا اس وقت کسی جگہ گھپ اندھیرا، آدھی رات ہوگی، کسی جگہ صبح کا سورج طلوع ہو رہا ہوگا، کسی جگہ دوپہر ہوگی، کسی جگہ عصر کی نماز پڑھی جا رہی ہوگی تو کیسے ممکن ہے کہ خدا نے جو نظام پیدا فرمایا ہے اس کے برعکس احکام جاری فرمائے۔اس لئے مَنْ شَهِدَ کا مضمون ہے جو بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ہرگز خدا کا یہ منشاء نہیں کہ سب اکٹھے روزے رکھیں، اکٹھے ختم کریں۔ہرگز یہ منشاء نہیں کہ تمام دنیا میں ایک دن عید منائی جائے یا سارے ملک میں اگر وسیع ملک ہے ایک ہی دن عید منائی جائے۔چھوٹے ملک میں تو ممکن ہے مگر وسیع ممالک بعض ایسے ہیں جو شمال سے بہت دور تک جنوب کے ایک حصے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ان کے افق بدل جاتے ہیں یا شرقاً غرباً بہت وسیع ہیں۔اب Chile کو دیکھیں کہ کتنا اوپر سے امریکہ کے وسط سے قریباً شروع ہو کر اور جنوب میں وہاں تک چلا جاتا ہے کہ اس سے آگے کوئی اور ملک نہیں ہے جو قطب جنوبی کے قریب تر ہو اس سے اور روس کی چوڑائی اتنی ہے کہ تین گھنٹے کا فرق پڑ جاتا ہے روس کے اندر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔امریکہ کی چوڑائی میں وسعت اتنی بڑی ہے کہ وہاں بھی کم و بیش اتنا ہی فرق پڑ جاتا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ایک ملک میں بھی بیک وقت رمضان شروع ہو سکتا ہے یا بیک وقت ایک ملک میں ایک عید کا دن طلوع ہو سکتا ہے۔

پس قرآن کریم کے جو الفاظ کا انتخاب ہے بہت ہی پر حکمت ہے اور اپنے مضمون کو خود کھول رہا ہے۔اب بَيِّنٰتٍ کہہ کر پھر اس مضمون کو کھولنا اور پھر لوگوں کا اس سے غافل ہو جانا یہ بہت بڑا ظلم ہے۔وہ سمجھتے ہیں مشکوک معاملہ ہے، پتا نہیں کہ قرآن کیا کہنا چاہتا ہے۔قرآن کریم نے تو فرمایا ہے اس میں تو بَيِّنٰتٍ ہیں اس میں الْفُرْقَانِ ہے اس کو پیش نظر رکھو اور پھر غور کرو مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جس پر یہ مہینہ طلوع ہوگا اسی کو روزے رکھنے ہیں۔دیکھا دیکھی سنی سنائی بات پر روزے نہیں رکھنے اور یہاں مَنْ میں صرف ایک فرد واحد مراد نہیں ہے بلکہ وہ قوم ہے جس کا

افق ایک ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کا طریق یہ جاری فرمایا کہ اگر ایک ہی افق کے لوگ کسی موسم کی خرابی کی وجہ سے اکثر نہ دیکھ سکتے ہوں تو ان میں دو قابل اعتماد یا چار قابل اعتماد، کچھ قابل اعتماد لوگ اٹھ کھڑے ہوں اور وہ کہیں، گواہی دیں کہ ہم نے دیکھا ہے تو اگر افق مشترک ہے تو سب کا ہی رمضان شروع ہو جائے گا اور اگر افق مشترک ہے تو سب ہی کی عید ہو جائے گی۔

تو مَنْ کا لفظ واحد پر بھی آتا ہے اور جمع پر بھی، یہ مراد نہیں ہے کہ ہر ایک جب تک آنکھ سے دیکھ نہ لے رمضان شروع نہ کرے۔ یہ تو ناممکن ہے۔ جو ہلال ہے خصوصاً پہلے دن کا ہلال وہ تو آنی جانی چیز ہے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔ انگلیاں اٹھ رہی ہوتی ہیں اتنے میں وہ مطلع سے غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ پس ہلال کا مطلع بھی چھوٹا ہوتا ہے اس لئے مَنْ شَهِدَ کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم میں سے جو اپنی آنکھوں سے دیکھے صرف وہی شخص روزے رکھے۔ مراد ہے وہ لوگ جن کا افق ایک ہے، جن کے ہمیشہ سے ہی چاند اکٹھے طلوع ہوتے ہیں، جب طلوع ہوتے ہیں سب پر ہی طلوع ہوتے ہیں جب غروب ہوتے ہیں تو سب پر ہی غروب ہوتے ہیں، پس وہ لوگ جن کا افق مشترک ہو ان میں سے کوئی بھی دیکھے تو سب قوم کے دیکھنے کا حکم ان پر صادق آجائے گا گویا ساری قوم نے دیکھ لیا۔ پس اس پہلو سے مثلاً انگلستان میں غالباً ایک ہی افق ہے خواہ شمال سے جنوب تک جائیں، چاند کے تعلق میں دو افق میرے علم میں نہیں ہیں۔ امریکہ میں بعض دفعہ دو افق پیدا ہو جاتے ہیں بعض علاقوں کے لحاظ سے مگر اکثر ایک ہی ہے اور بعض دفعہ امریکہ کا افق عرب کے افق سے مل جاتا ہے۔ چاند کا جو Behaviour ہے، چاند کا جو طرز عمل ہے یہ عام روزمرہ کے سورج کے طرز عمل سے بالکل مختلف ہے۔ سورج کے طلوع ہونے میں ایک قطعیت ہے اور سورج کے غروب ہونے میں بھی ایک قطعیت ہے۔ چاند کے اندر احتمالات اور امکانات ہیں۔ اس لئے مَنْ شَهِدَ کا جو ارشاد فرمایا گیا ہے انہی بدلتے ہوئے امکانات اور احتمالات کے پیش نظر ہے۔

اب اس مضمون میں ایک پہلو رہ جاتا ہے جس کی عموماً آپ بحثیں سنتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں وہ یہ ہے کہ کیا مشینی ذرائع سے چاند کا علم پانا مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ کے تابع ہو گا یا نہیں ہو گا؟ اگر ہو تو پھر دیکھنا متروک ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشینوں کے ذریعہ چاند دکھائی دے جاتا ہو لیکن نظر سے نہ دکھائی دیتا ہو۔ تو کیا قرآن کریم کا پہلا عمل یعنی پہلے دور کا عمل اس مشینی عمل کے مقابل پر رد

ہو جائے گا یا پہلے دور کا عمل جاری رہے گا اور مشینی دور کا عمل متروک سمجھا جائے گا؟ یہ بحث ہے جو بہت سے لوگوں کو الجھن میں مبتلا رکھتی ہے حالانکہ اس میں ایک ادنیٰ ذرہ برابر بھی کوئی الجھن نہیں۔ الجھن لوگوں کی نافہمی اور ناسمجھی میں ہے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ نئے دور میں مشینوں کے حوالے سے یا برقیاتی آلوں کے حوالے سے اگر آپ چاند کے طلوع کا علم حاصل کریں تو وہ مَنۡ شَهِدَ کے تابع رہتا ہے اور جہاں مَنۡ شَهِدَ سے ہٹتا ہے وہاں اس کا عمل درآمد نہیں ہوگا، وہاں بے اعتبار ہو جائے گا۔ جو لوگ نہیں سمجھتے وہ ٹھوکر کھاتے ہیں اور پھر آپس میں خوب لڑائیاں ان کی ہوتی ہیں۔

اس لئے میں آپ کو سمجھا رہا ہوں آگے عید بھی آئے گی، یہ بحثیں چلیں گی، بچوں سے سکول میں بھی گفتگو ہوگی دوسرے بچوں کی، کالجوں میں یہ معاملہ زیر بحث آجائے گا، بزنس پر، کاموں پر زیر بحث آئے گا۔ اس لئے سب احمدیوں کو اچھی طرح ہر ملک کے احمدی جو یہ خطبہ سن رہے ہیں ان کو اچھی طرح اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

چاند جو طلوع ہوتا ہے وہ جب زمین کے کنارے سے اوپر آتا ہے تو اگر چہ سائنسی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین کے افق سے چاند ذرا سا اوپر آچکا ہے لیکن وہ چاند لازم نہیں کہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہو۔ اس لئے سائنس دانوں نے بھی ان چیزوں کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اگر آپ اچھی طرح ان سے جستجو کر کے بات پوچھیں تو وہ آپ کو بالکل صحیح جواب دیں گے کہ دیکھو ہم یہ تو یقینی طور پر معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ چاند کس دن کتنے بجے طلوع ہوگا، یعنی سورج غروب ہوتے ہی اوپر ہو چکا ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھو کہ اگر موسم بالکل صاف ہو اور کوئی بھی رستے میں دھند نہ ہو تب بھی تم اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہو کیونکہ چاند کو طلوع ہونے کے بیس منٹ یا کچھ اوپر مزید چاہئے اور ایک خاص زاویئے سے اوپر ہونا چاہئے۔ اگر وہاں تک پہنچے تو پھر آنکھ دیکھ سکتی ہے ورنہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے ہوسکتا ہے جیسا کہ پچھلے سال مولویوں نے یہاں یہ کیا کہ آبزرویٹری Observatory سے یہ تو پوچھ لیا کہ چاند کب نکلے گا اور انہوں نے وہی سائنسی جواب دے دیا کہ فلاں دن یہ اتنے بجے طلوع ہو جائے گا اور سورج ڈوبنے کے معاًبعد کا وقت تھا۔ تو مولویوں نے فتویٰ دے دیا کہ اس دن شروع ہو جائے گا رمضان یا عید جو بھی تھی اور بعض دوسرے جو ان میں سے سمجھدار تھے، تعلیم یافتہ مسلمان یہاں موجود ہیں احمدی نہیں ہیں مگر وہ ان باتوں پر غور کرتے ہیں انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا ہم تو ایسی

عید نہیں کریں گے یا ایسا رمضان شروع نہیں کریں گے اور وہ سچے تھے کیونکہ اگر وہ مولوی صاحبان ان لیبارٹریز سے یا جوان کے مراکز ہیں آسمانی سیاروں وغیرہ کو دیکھنے کے ان سے پوچھتے تو وہ صاف بتا دیتے کہ نکلے گا تو سہی لیکن تم اس کی شہادت نہیں دے سکتے، تم اپنی آنکھ سے اس کو کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ جتنا نکل کے وہ اونچا جاتا ہے اس طلوع سے کوئی آنکھ بھی اس کو اس لئے نہیں دیکھ سکتی کہ وہ زمین کے بہت قریب ہوتا ہے اور زمین کے قریب کی فضا اس کی شعاعوں کو نظروں تک پہنچنے سے پہلے پہلے جذب کر چکی ہوتی ہے۔ اس لئے عین نشانے پر پتا ہو کہ وہاں چاند طلوع ہو رہا ہے آپ نظر جما کے دیکھیں آپ کو ایک ذرہ بھی کچھ دکھائی نہیں دے گا تو شَهِدَ کا مضمون اس پر صادق نہیں آئے گا۔

شَهِدَ کا مطلب ہے جو گواہ بن جائے، جو دیکھ لے، جو پالے۔ مگر سائنس دان ہی یہ بھی آپ کو بتاتے ہیں اور قطعیت سے بتاتے ہیں کہ اگر اتنے منٹ سے اوپر چاند ہو چکا ہو یعنی سورج ڈوبنے کے بعد مثلاً پندرہ منٹ کی بجائے بیس منٹ تک رہے تو پہلے پندرہ منٹ میں اگر دکھائی نہیں دے سکتا تو آخری پانچ منٹ میں دکھائی دے سکتا ہے یا اس کا زاویہ اتنا ہو کہ وہ زمین کے ایسے افق سے اونچا ہو چکا ہو جو افق چاند اور ہماری راہ میں حائل رہتا ہے، اس سے جب اونچا ہو گا تو لازماً دیکھ سکتے ہو۔ پھر بادل ہوں تو الگ مسئلہ ہے لیکن اگر بادل نہ ہوں تو لازماً ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے ہو تو پھر شَهِدَ مِنۡكُمُ کا حکم صادق آ گیا کیونکہ شَهِدَ میں ساری قوم کا دیکھنا تو فرض تھا ہی نہیں۔ کچھ بھی دیکھ سکتے ہوں لیکن اس طرح دیکھ سکتے ہوں جیسے انسان کی توفیق ہے کہ ننگی آنکھ سے دیکھ سکے وہ فتویٰ لازماً ساری قوم پر برابر صادق آئے گا اور وہ لوگ جن کا افق ایک ہے وہ سائنسی ذرائع سے معلوم کر کے پہلے سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

تو اس لئے وہ جھگڑے کہ اب اکٹھی کیسے عید کی جائے یا اکٹھا رمضان کیسے شروع کیا جائے یہ جھگڑے تو اس دور میں ختم ہو چکے ہیں اور اگر ہیں تو ان لوگوں نے پیدا کئے ہیں جو بے وجہ نا سمجھی سے اختلاف کرتے ہیں۔ پس یہ جو نظارے یہاں دکھائی دیتے ہیں کہ ایک ہی ملک میں ایک عید آج ہو رہی ہے ایک کل ہو رہی ہے ایک پرسوں ہوگی یہ قرآن کریم کے بیان کا ابہام ہرگز نہیں ہے۔ قرآن کریم کا بیان بَيِّنٰتٍ میں سے ہے، صاف کھلا کھلا ہے۔ اگر اس پر چلیں تو ناممکن ہے کہ یہ اختلاف ہوں۔ یا ننگی آنکھ سے چاند نظر آئے گا یا آلات کے ذریعہ آئے گا اور دونوں ایک دوسرے پر بالکل

چسپاں ہوں گے اور ان کے درمیان کوئی بھی اختلاف نہیں ہوگا۔ سائنسی فتویٰ بعینہ وہی ہوگا جن شرائط کے ساتھ میں بیان کرر ہا ہوں جو ننگی آنکھ کے دیکھنے کا فتوی ہے۔ تو اس لئے یہ دور ایسا ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کے قائم کردہ قوانین کو خدا نے خود ہی بندوں کے لئے مسخر فرما رکھا ہے اور نئی نئی باتیں جو ہمارے علم میں آ رہی ہیں ان کو خدمتِ دین میں استعمال کرنا چاہئے۔

پس جماعت احمدیہ کی طرف سے جو کیلنڈر شائع ہوتے ہیں اور ابھی بھی یہاں ہو چکے ہیں یا ہر ملک میں ہوتے ہیں ان کی گواہی قطعی ہے کیونکہ ہم کبھی بھی ایسی گواہی کو قبول نہیں کرتے جہاں ننگی آنکھ سے چاند کا دیکھنا ممکن نہ ہو۔ جہاں یقینی ہو کہ اگر موسم صاف ہے تو چاند ضرور دکھائی دے گا وہاں قبول کیا جاتا ہے اور مہینوں کے جو دوسرے دن ہیں یا اس کا شروع اور آغاز، دوسرے مہینوں سے تعلقات وہ ہمیشہ ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ اگر غلطی ہو تو بعض دفعہ عجیب سی غلطی بن جاتی ہے۔ بعض مہینے اس کے اٹھائیس دن کے رہ جاتے ہیں اور اٹھائیس دن کا مہینہ ہو ہی نہیں سکتا چاند کا۔ یہ کوئی فروری تو نہیں ہے جو اٹھائیس دن کا آئے۔ چاند کا تو ہر مہینہ یا انتیس کا ہوگا یا تیس کا ہوگا۔ پس اس پہلو سے جماعت احمدیہ کا جو فیصلہ ہے وہ قطعی اور درست ہے اور قرآن کے عین مطابق ہے۔ پس وہ دن اب طلوع ہونے والا ہے یعنی رمضان کا دن جو انشاء اللہ تعالیٰ اتوار کی شام کو طلوع ہوگا اور پیر کا پہلا روزہ ہوگا۔

اب ایک بحث یہ ہے کہ رمضان کو سورج سے کیوں نہیں باندھا؟ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں مثلاً ہر ملک کا موسم الگ الگ ہے۔ بعض ممالک ایسے ہیں جن میں سردیوں میں دن بالکل چھوٹے رہ جاتے ہیں اور گرمیوں میں بے انتہا لمبے ہو جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جہاں شدید گرمی ہے اور دن برابر ہیں۔ بعض ایسے ہیں جہاں شدید گرمی ہے اور پھر دن برابر نہیں ہیں۔ تو اگر ایک ہی سورج کے حساب سے مہینہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ مہینہ ہر جگہ ایک ہی طرح ایک ہی موسم میں رہتا، کبھی اس میں تبدیلی نہ ہوتی۔ ناروے کے لوگوں کے لئے مثلاً اگر وہ مہینہ سردیوں میں ہوتا تو ناروے کے لوگوں کے لئے ادھر روزہ رکھا ادھر کھولنے کا وقت آ گیا اور جو جنوبی قطب کے پاس رہتے ہیں ان کا روزہ ختم ہی نہ ہوتا۔ جو زیادہ قریب ہیں وہ تو سال بھر روزہ چلتا لیکن جو ذرا مناسب فاصلے پر ہیں ان کا بھی ہوسکتا ہے 23 گھنٹے کا روزہ ہو۔ ایک گھنٹے کے اندر نمازیں بھی پڑھنی ہیں، تہجدیں بھی پڑھنی ہیں، کھانا بھی کھانا ہے اور پھر 23 گھنٹے کے روزے کے لئے تیاری کرنی ہے۔ اول تو جو 23 گھنٹے

والا واقعہ ہے وہ احادیث کے مضمون کی روشنی میں حقیقت میں ممکن ہی نہیں ہے یہ بھی میں آپ کو اچھی طرح سمجھا دوں۔اس لئے یہ قرآن کریم نے جو فرمایا ہے علامتیں جاری فرمائی ہیں وہ دو طرح سے۔ایک علامتیں وہ ہیں جن کا تعلق چاند سے ہے،ایک علامتیں وہ ہیں جن کا تعلق سورج سے ہے۔رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں عبادتیں دونوں طرح اکٹھی ہوگئی ہیں۔کسی اور مہینے میں اس طرح عبادتیں اکٹھی نہیں ہوئیں جس طرح رمضان کے مہینے میں عبادتیں ہر پہلو سے جڑی ہیں۔یہی سورج کے سال کا بھی تعلق ہے اور چاند کے سال کا بھی تعلق ہے۔جہاں تک قرآن کریم کی عبادات کا تعلق ہے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ روزانہ نمازیں بھی تو مغرب کے بعد آتی ہیں۔آتی تو ہیں مگر وہ سورج کے حوالے سے آتی ہیں چاند کے حوالے سے نہیں۔پانچ نمازیں جو فرض ہیں اور تہجد کے وقت یہ سارے کے سارے سورج کی علامتوں سے تعلق رکھے ہوئے ہیں۔چاند کے تعلق سے جو عبادت آتی ہے وہ صرف رمضان کی ہے۔یا پھر حج ہے جو چاند سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کے علاوہ تمام عبادتیں سورج سے تعلق رکھتی ہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے سورج کے ساتھ نمازوں کو باندھ کر یہ بات ناممکن بنادی ہے کہ ایک انسان علامتوں کے مطابق ایسی جگہ پانچ نمازیں ادا کر سکے جو شمالی قطب یا جنوبی قطب کے بہت قریب ہو اور یہ ناممکن بنا کر آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع فرمادی کہ ایک زمانہ آنے والا ہے،دجال کا زمانہ جب کہ دن دنیا میں بعض جگہ روزمرہ کے چوبیس گھنٹے کے دن ہوں گے اکثر جگہ تو یہی ہوگا لیکن بعض ایسی جگہیں بھی ہوں گی جہاں لمبے بھی ہوں کہیں چھ مہینے کا دن بھی ہوگا کہیں سال کا دن بھی ہوگا۔یہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو مطلع فرمایا تا کہ آئندہ زمانے کے انسان کے لئے مشکل نہ رہے۔اس کے ساتھ ہی صحابہؓ میں سے کسی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا جب ایک سال کا دن آئے گا تو ہم اس ایک سال میں پانچ نمازیں پڑھیں گے۔آپؐ نے فرمایا بالکل نہیں اندازہ لگا کر اپنے ویسے ہی دن تقسیم کرنا جیسے روزمرہ کے معمول کے دن ہیں اور جب وہ دن گزرے تو اس کے مطابق اپنی پانچ نمازیں پوری کیا کرنا۔

تو جہاں سورج کی ظاہری علامتیں قاصر رہ جائیں کہ وہ ایک دن کے خدوخال کو نمایاں کر سکیں،جہاں سورج کی ظاہری علامتیں عاجز آجائیں کہ دن کو چوبیس (24) گھنٹے کے اندر باندھے رکھیں وہاں نمازوں کے احکامات بدل گئے،وہاں اندازے شروع ہوگئے اور اندازوں کی شریعت نے

اجازت دی اور اس میں حکمت ظاہر و باہر ہے۔ اول تو یہ کہ لمبے روزے میں تو سارے ہی شہید ہو جاتے ایک ہی روزے میں اور چھوٹے روزے کا پتا ہی نہ لگتا کہ کیسے رکھیں وہ ایک تماشا سا بن جاتا مگر جہاں بھی یہ اجنبی دن چڑھتے ہیں خواہ وہ ایک دن کے چوبیس (24) گھنٹے کے دائرے میں بھی رہیں تو قرآن کریم کا کمال یہ ہے عبادت کی علامتیں ایسی بتائی ہیں کہ وہاں علامتیں عبادت کو ان دنوں کے اندر ساکت کر دیتی ہیں اور اندازہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی غیر معمولی دن کیلئے ضروری نہیں کہ چوبیس گھنٹے سے لمبا ہو۔ چوبیس گھنٹے سے قریب دن پہنچا ہوا ہو تب بھی وہ ناممکن دن بن جائے گا اور جہاں وہ ناممکن دن بنے گا وہیں سے اندازہ شروع ہو جائے گا۔

اس کی مثال میں آپ کو سمجھا دوں کیونکہ ناروے سے بھی مجھے سوال آئے ہوئے ہیں بعض دوسرے ملکوں سے بھی اس لئے میں اس خطبے میں ساری باتیں کھول رہا ہوں کیونکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے دنیا کے اکثر احمدی جہاں جہاں بھی اب یہ آج کل ٹیلی ویژن پہنچ رہی ہے، یہ خطبہ سنتے ہیں، سن رہے ہیں، بات یہ ہے کہ اگر دن فرض کریں اٹھارہ گھنٹے کا ہو یعنی سورج نکلنے سے (روزے کی بات نہیں کر رہا) دن سورج نکلنے سے سورج غروب ہونے تک اٹھارہ گھنٹے ہوں تو پیچھے چھ گھنٹے کی جو رات رہ جائے گی اس رات میں صبح اور شام کی شفق اتنی پھیل چکی ہوں گی کہ ان کے درمیان سیاہی آئے گی ہی نہیں۔ پس جب سیاہی غائب ہو گئی تو نمازوں کی تقسیم ممکن نہ رہی۔ مغرب کس وقت پڑھیں گے، عشاء کس وقت پڑھیں گے، تہجد کس وقت ہو گی، صبح کس وقت طلوع ہو گی یہ ایک ہی چیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم نے خود یہ ایسے دن دیکھے ہیں جب ہم گرمیوں میں ایک دو سال پہلے ناروے گئے تھے شمال کی طرف تو جہاں چوبیس گھنٹے کا دن شروع ہو چکا تھا وہاں تو بالکل ہی معاملہ اور ہے۔ وہاں تو صبح بھی سورج، دوپہر کو بھی، رات کو بھی، آدھی رات کو بھی اور سورج نکلے ہوئے میں تہجد پڑھنی پڑتی تھی مگر اندازے کر کے کیونکہ آنحضرت ﷺ **اصدق الصادقین** ہیں، سب سچوں سے بڑھ کر سچے اور یہ ایک بات بھی آپؐ کی سچائی پر سورج سے بڑھ کر زیادہ روشن گواہ بن جاتی ہے۔ اس اندھیرے زمانے میں اتنی روشنی سے چودہ سو سال بعد کے حالات معلوم کئے اور ان پر روشنی ڈالی۔ اتنی دور تک روشنی ڈالنے والا نبی اس شان کا کوئی دکھاؤ تو سہی۔ فرمایا وہ ہوں گے جب بھی وہ دن عام عادت سے بدل چکے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ہے روزمرہ کے عادی دنوں کے مطابق اندازے کرنا۔ عادی دن وہ ہیں جن میں

پانچ نمازیں سورج کی علامتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز کی جاسکتی ہیں۔ جہاں وہ نمازیں ممتاز نہیں ہوسکتیں وہاں اندازہ شروع اور پھر کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

تو اس لئے یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ رمضان مبارک کو چاند کے ساتھ جو باندھا ہے اب میں اس طرف واپس آرہا ہوں، اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ مہینہ جگہ جگہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ جنوب والے لوگوں کے لئے آسان ہو جاتا ہے، کبھی شمال والوں کے لئے۔ پس ایسے موقع پر اگر یہ سورج والا مہینہ ہوتا تو بعض لوگوں پر ہمیشہ بہت ہی سخت رہتا۔ لمبے سے لمبا دن اور پُر آزار دن جس میں گرمی سے لوگوں کی زبانیں سوکھ جاتیں اور تڑپ تڑپ کے بعض جان دے دیتے۔ ہمیشہ مسلسل ایسی ہی تکلیف لے کر ان کے لئے آتا اور بعض جگہ اتنا چھوٹا ہوتا اور موسم بھی ٹھنڈا کہ ان کو پتا ہی نہیں لگتا بلکہ ان کے لئے یہ مصیبت ہوتی کہ کھائیں کیسے۔ ایک روزہ افطار بھی کریں اور سحر بھی کریں، بیچ میں تہجد بھی پڑھیں، چند گھنٹوں کے اندر یہ ممکن نہیں ہے۔ پس کتنے گھنٹے کے لئے ممکن ہے اس کی علامتیں ساتھ بیان فرمادی گئیں کہ جہاں سورج کی علامتوں سے عبادتیں کھل کے واضح ہوں، جہاں رمضان پر یہ بات صادق آئے کہ سفید دھاگہ کالے دھاگے سے ممتاز ہو سکے وہ دن معمول کے دن ہیں۔ جہاں ان میں کوئی علامت اطلاق نہ پائے وہاں تم نے اندازے کرنے ہیں۔ مگر معمول کے دنوں میں بھی تو بہت فرق ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا کہ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران: 141) کا مضمون رمضان سے بھی باندھ دیا اور رمضان چکر کھاتا رہتا ہے۔ کبھی سخت روزے آتے ہیں اور وہ اپنا سبق سکھا کے چلے جاتے ہیں کہیں نرم روزے آتے ہیں تو راتوں کی جفاکشی بڑھ جاتی ہے۔ پس کبھی دن کی سختی کے مزے ہیں کبھی رات کی لمبائی کے مزے ہیں۔ کبھی ایک ابتلاء ہے کبھی دوسرا۔ کبھی ایک انعام ہے کہیں دوسرا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان ایام کو آپس میں پھیر رکھا ہے۔

پس رمضان ہی وہ مہینہ ہے جس میں سورج اور چاند دونوں اکٹھے عبادتوں پر گواہ بنتے ہیں۔ ورنہ سارا سال سورج تو بنا رہتا ہے چاند گواہ نہیں بنتا۔ تو فِيْهِ الْقُرْاٰنُ میں ایک یہ بھی مضمون ہے کہ کوئی چیز رمضان میں باقی ہی نہیں رہی جس کا بیان نہ ہوا ہو قرآن کریم میں۔ قرآن میں چاند والی عبادتوں کا بھی ذکر ہے، سورج والی عبادتوں کا بھی ذکر ہے، رمضان میں یہ بھی دونوں اکٹھی ہوگئیں۔

پس رمضان کے مہینے کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھیں جہاں ظاہری علامتوں کا تعطل ہو گیا ہے وہاں آپ پر فرض ہے کہ روزمرہ کے معمول کے دنوں کا اندازہ کریں۔معمول کے دن قرآن کی تعریف سے یہ بنیں گے کہ جن دنوں میں صبح کی سفیدی اور شام کی شفق کے درمیان میں ایک اندھیرا حائل ہو، تا کہ قرآن کریم کی یہ بات پوری اتر سکے کہ سفید دھاگہ کالے دھاگے سے الگ ہو جائے اور اگر دونوں دھاگے ہی سفید ہوں تو پھر الگ کیسے ہوں گے۔اس لئے تمام جماعتوں میں علماء کے ایسے بورڈ بنانے چاہئیں ،ان تمام جماعتوں میں جو یا جنوب کے زیادہ قریب ہیں یا شمال کے زیادہ قریب ہیں تا کہ اپنی اپنی جماعتوں کی راہنمائی کرسکیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی ملک میں بعض دفعہ ایک رمضان ایک جگہ غیر معمولی ہو جاتا ہے، دوسری جگہ معمولی رہتا ہے اور جتنا شمال کی طرف یا جنوب کی طرف جائیں گے اتنا ہی ایک ملک کے اندر رہتے ہوئے بھی تفریق کرنا پڑتی ہے۔پس بجائے اس کے کہ آپ ہر بات مرکز سے لکھ کر ہم سے حساب کروائیں ، اصول سمجھ لیں اور پھر جو آپ کے ہاں مختلف گورنمنٹ کے محکمے ہیں موسمیات کے ان سے مشورہ کریں۔آبزرویٹری Observatory جو بھی ہے جو بھی ان کی رصد گاہیں بنی ہوئی ہیں جہاں سے وہ زمین و آسمان کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی موسمیات کے دفتر اور ان کے محکمے ان سے مشورہ کر کے تو مختلف جماعتوں کے لئے رمضان سے پہلے ہی ان کے شیڈول Schedule بنانے چاہئیں اور بتانا چاہئے کہ فلاں جماعت کا معمول کا رمضان فلاں دن سے فلاں دن تک ہے اور فلاں سے فلاں دن تک کا جو رمضان کا حصہ ہے وہ معمول سے نکل گیا ہے اس لئے وہاں آپ کو قرآن کریم اختیار دیتا ہے اور آنحضرت ﷺ یعنی آنحضرت ﷺ نے جو قرآن کا مفہوم سمجھا اور وہی درست ہے وہ آپ کو اختیار دیتا ہے کہ اندازے کے مطابق اپنی نمازوں کو بھی تقسیم کریں اور روزوں کے وقت بھی مقرر کریں۔

اور ایسی صورت میں دو طریق ہیں دونوں میں سے ایک آپ اختیار کر سکتے ہیں۔ایک یہ ہے کہ معمول کے دن کے روزوں سے مراد بارہ گھنٹے کا دن، بارہ گھنٹے کی رات لے لی جائے جو سطحی ہے لیکن اگر یوں کریں گے تو ان دنوں کا اس ملک کے باقی دنوں سے بہت زیادہ فرق ہو جائے گا اور جہاں بھی معمول کے دنوں کا غیر معمولی دنوں سے جوڑ ہو گا وہاں تفریق بہت بڑی ہو جائے گی۔اس لئے دوسرا جو طریق ہے جو میرے نزدیک زیادہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ اپنے سے قریب تر معمول

کے دنوں کے مطابق عمل کریں۔یعنی اگر ساٹھ (60) یا ستر (70) ڈگری شمال پر ایک ملک کا کوئی شہر آباد ہے اور اس ملک کا ایک حصہ پچاس (50) ڈگری یا چالیس (40) ڈگری شمال پر بھی ہے اگر ایک سال میں جو جنوبی حصہ ہے اس کا سارا رمضان معمول کا رمضان ہے یعنی سورج کی علامتیں اور چاند کی علامتیں پوری اس پر صادق آ رہی ہیں اور شمالی حصے پر صادق نہیں آ رہیں تو بجائے اس کے کہ وہ چھلانگ لگا کر خط استواء تک پہنچے اور وہاں کا معمول پکڑے، عقل تقاضا کرتی ہے کہ اپنے ہی ملک میں جو قریب تر جگہ ہے جہاں معمول کے روزے چل رہے ہیں ان کے اندازے کے مطابق اپنے روزوں کے اندازے کر لیا کریں۔تہجد کا وقت بھی اس کے مطابق کرے اور سحری کا وقت بھی اور افطاری کا وقت بھی اور اس طریق پر انشاء اللہ تمام جماعت اسلامی کو وقت کے اختلاف کے باوجود بھی ایک وحدت ضرور نصیب ہوگی اور وحدت کے مختلف رنگ ہیں۔ایک وحدت یہ ہے کہ ایک ہی اصول کے مطابق سب چلیں، نئے اصول اپنی اپنی جگہ الگ نہ گھڑیں۔قرآن کریم نے جو اصول بنایا ہے وہ بڑا واضح اور قطعی ہے جو میں آپ کے سامنے کھول چکا ہوں۔آنحضرت ﷺ نے جو اس کا مطلب سمجھا اور دنیا پر خوب کھول دیا اس کے بعد آپ اس اصول پر عمل کریں پھر خواہ کسی کا رمضان کسی اور دن شروع ہو اور کسی کا اور دن شروع ہو وحدت میں فرق نہیں آئے گا کیونکہ وحدت توحید کی اطاعت سے وابستہ ہے انسانی گھڑیوں کے حساب سے وحدت نہیں بنائی جاسکتی۔اتنا فرق پڑ جاتا ہے زمین کے دور کی وجہ سے کہ ایک دن یہاں آج جمعہ ہے تو ایک ایسی جگہ ہے جہاں جمعرات ہے اور اسی وقت ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہفتہ طلوع ہو چکا ہے تو زبردستی وحدت کیسے آپ بنائیں گے۔توحید کے خلاف چل کر وحدت بنائی جاسکتی ہے؟ جس خدا نے پیدا کیا ہے اس کی غلامی میں وحدت بنے گی اس سے ہٹ کر نہیں بن سکتی۔پس اس کے قوانین کو سمجھنا اور ان پر ایک اصول کے مطابق تمام دنیا میں یکساں عمل کرنا پھر اگر وقت تبدیل بھی ہوں تو وحدت نہیں ٹوٹ سکتی کیونکہ اللہ کے احکام کے تابع آپ منسلک رہیں گے، ایک لڑی میں منسلک رہیں گے کوئی آپ کو الگ نہیں کرسکتا۔

پس میں امید رکھتا ہوں کہ آج کے بعد اس بارہ میں مجھے مزید خط موصول نہیں ہوں گے ورنہ سارا رمضان کافی ڈاک پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ہر آدمی اپنی جگہ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ ہم یہاں کیا کریں، ہم وہاں کیا کریں، تمام ممالک اس خطبہ کی روشنی میں کمیٹیاں بنائیں اور وہ سب کی راہنمائی

کریں اور جو اصول میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں وہ بالکل کھل چکے ہیں، مجھے نہیں سمجھ آ سکتی کہ اس کے بعد پھر بھی کوئی ابہام باقی رہے۔

اب اگلا حصہ ہے وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ پس جو کوئی بھی مریض ہو یا سفر پر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ تو اسے دوسرے ایام میں اس عدت کو پورا کرنا ہوگا یعنی مریض ہو تو روزہ نہ رکھے۔ سفر کے ساتھ یہ شرط نہیں لگائی کہ اگر سفر مشکل ہو تو روزہ نہ رکھے، سفر آسان ہو تو رکھ لے۔ اس لئے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس آیت کی رو سے یہ واضح فتویٰ تھا کہ روزے کی آسانی یا مشکل زیر بحث نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت ہی میں آسانی ہے اور اسی میں نیکی، اسی میں تقویٰ ہے۔ پس جب رمضان میں سفر آئے تو روزہ نہ رکھو اور جب رمضان گزر جائے تو جتنے روزے چھٹ گئے ہیں فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ پھر دوسرے دنوں میں اس مدت کو پورا کر لیا کرو۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں یہ نیکی ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھ لیا جائے اور یہ زیادہ بہتر ہے حالانکہ بالکل غلط بات ہے۔ تمام روزہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ رمضان کے مہینے میں روزے آسان ہو جاتے ہیں کیونکہ سارے ہی رکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے نفس کا بہانہ ہوتا ہے کہ میں نیکی کر کے سفر میں روزے رکھ رہا ہوں۔ نفس بعض دفعہ دھوکہ دیتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سفر کے دوران رمضان میں روزے رکھ لئے جائیں تو وہ آسان ہیں۔ رمضان گزرنے کے بعد پھر وہ روزے پورے کئے جائیں تو یہ مشکل ہے۔ تو وہ اپنی طرف سے نیکی کر رہا ہوتا ہے، حالانکہ نفس کے بہانے کے تابع وہ خود دھوکہ کھا رہا ہوتا ہے۔ نیکی تنگی یا مشکل میں نہیں ہے۔ نیکی اللہ تعالیٰ کی رضا میں ہے۔ جس بات کا اللہ حکم دے اسے قبول کرو جس کی وہ اجازت دے شوق سے اس اجازت کو استعمال کرو اور یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ بعض دفعہ کسی کو آپ کوئی چیز دیتے ہیں بعض بچے آتے ہیں کہ نہیں نہیں رہنے دیں، کوئی ضرورت نہیں، میں نے دیکھا ہے ماں باپ کی لگتا ہے جان نکل گئی ہے، فکر سے وہ ڈانٹتے ہیں، ضرورت نہیں کیا مطلب لے لو تمہیں خدا نے توفیق دی ہے تمہیں کچھ انعام دیا جا رہا ہے اسے ضائع مت کرو اور یہ انسانی فطرت کی آواز ہے کیونکہ وہ جو تکلف ہے جب کوئی دینے والا ایسا ہو جس سے تمہیں پیار ہو یا جس کے لئے تمہارے دل میں عزت ہو اس کا کچھ عطا کرنا اگر تم قبول کرو تو اس کے لئے خوشی کا موجب ہوتا ہے اگر نہ قبول کرو تو اس کے چہرے پر ملال کے آثار

آجاتے ہیں، اس کا دل چاہتا ہے میں دے رہا ہوں لے لے، اس کو بھی مزہ آئے مجھے بھی مزہ آئے۔

تو انسان کو خدا تعالیٰ نے اپنی فطرت کے مطابق پیدا فرمایا ہے۔ اس کا ایک یہ بھی معنی ہے اگر فطرت سچی اور پاک ہو تو اس کو دیکھ کر خدا کے منشاء کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پس جہاں اللہ تعالیٰ رعایت دے رہا ہے وہاں نہیں نہیں جی ہم تو سختی کر سکتے ہیں، کوئی بات نہیں یہ بہت بے وقوفی کی بات ہے اس رعایت کو پیار اور محبت سے سر جھکا کر عشق کے جذبے سے قبول کرو۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو چھ چھ مہینے کے مسلسل روزے رکھے ہیں اور ایسے روزے رکھے ہیں جن میں صبح اور شام کی خوراک اتنی کم ہو چکی تھی کہ ایک عام انسان اس پر زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کے باوجود عبادت کی سختیاں، تو اس کا فتویٰ ہے یہ، جس کی اپنی عبادتوں کا یہ حال تھا جس کا مطلب ہے کہ لازماً سراسر ایک عشق کے اعلیٰ مقام کا فتویٰ ہے۔ ایک ایسے عارفانہ مقام کا فتویٰ ہے جو جانتا ہے کہ نیکی صرف رضا کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جسم کی سختی کے ساتھ نہیں اور روزوں میں بھی جسمانی سختی خدا تعالیٰ کے پیش نظر ہے ہی نہیں اور بہت سی باتیں جو پیش نظر ہیں مگر تکلیف دینا خدا کے پیش نظر نہیں ہے۔ پس جب خدا فرماتا ہے کہ چھوڑ دو تو چھوڑ دو جب خدا کہتا ہے رکھو تو رکھو۔

پس فرمایا مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا جو بیمار ہو اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا سفر پر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ تو پھر رمضان میں روزے نہ رکھنا بعد میں رکھ لینا۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ اس وہم میں مبتلا نہ ہو کہ سختی کرو گے تو خدا بہت خوش ہوگا۔ اپنی جان کو مصیبت میں ڈالا ہوا ہے تو اللہ بڑا راضی ہو گیا تم مصیبت میں پڑ گئے۔ اللہ تو تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا اور کوئی دوست کسی دوست کے لئے سختی نہیں چاہتا۔ کوئی ماں کسی بچے کے لئے سختی نہیں چاہتی۔ پس یہ مفہوم بھی ہے جو سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے اس کے باوجود ماں صبح جلدی بچے کو اٹھا کر تیاری کرواتی ہے، سکول بھجوانے کے لئے، روتا پیٹتا بھی رہے تب بھی اس کو زبردستی ٹھیک ٹھاک کر کے سکول بھیج دیتی ہے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ ماں سختی چاہتی ہے۔ اس حد تک سختی لازم ہے جس حد تک جس پر سختی کی جائے یعنی اپنا پیارا وہ اس سختی کا محتاج ہے اور اس کے بغیر وہ فوائد سے محروم رہ جائے۔ پس محبت میں جہاں سختی ہٹائی جا سکتی ہو، ترک کی جا سکتی ہو، محبت کرنے والا کبھی سختی میں نہیں ڈالے گا۔ جہاں سختی لازمہ ہے اس سے گزرے بغیر اپنے محبوب کی بھلائی ممکن نہیں ہے اس حد تک

اور صرف اس حد تک سختی ایک پیار کرنے والے سے اپنے پیارے کے اوپر ڈالی جاتی ہے اور یہی عبادتوں کا سارا مفہوم ہے۔ جہاں سختیاں ہیں وہاں اس کے بدلے ضرور آسانیاں مقدر ہیں۔ ورنہ کبھی بھی خدا تعالیٰ انسان پر سختی نہ ڈالتا۔ چنانچہ فرمایا فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ؕ (الم نشرح: 7،6) دیکھو عبادت کے مضمون میں یہ بات ہو رہی ہے۔ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۙ﴿۸﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ (الم نشرح: 9،8)۔

تو عبادت کے تعلق ہی میں یہ بات ہو رہی ہے رمضان کی۔ فرمایا دیکھو جو سختی بھی ہم ڈالتے ہیں ایک یہ معنی بھی ہے اس آیت کا لازماً اس کے بعد آسانی آتی ہے اور آسانی کی خاطر سختی ڈالی جا رہی ہے، سختی کی خاطر سختی نہیں ڈالی جا رہی۔ پس قرآن کریم کی تمام آیات مسلسل اسی مضمون پر روشنی ڈالتی چلی جا رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سختی کو پسند نہیں کرتا، نہ سختی کی خاطر کسی کو سختی میں مبتلا فرماتا ہے ہاں بعض فوائد ایسے ہیں جو سختی میں سے گزرنے کے بعد آخر پر رکھے گئے ہیں۔ اب زمیندار ہے جو محنت کرتا ہے تو اس کو چھ مہینے یا سال کے بعد آنے والی فصل دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ اس کی خاطر وہ خود اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا ہے۔ کوئی شخص اپنا دشمن نہیں ہوا کرتا سوائے اس کے کہ پاگل ہو۔ تو وہاں اس کو دکھائی دے رہا ہے کہ یہ سختی ہی مجھے مناسب ہے، یہی مجھے راس آئے گی اور جہاں ہمیں دکھائی نہیں دے رہا ہوتا وہاں اللہ کو دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ پس خدا کی وسیع نظر کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ جو اللہ چاہے جس حد تک سختی ڈالے اسی حد تک قبول کریں اس سے آگے بڑھ کر زبردستی سے آپ خدا کو راضی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ اس مضمون پر آنحضرت ﷺ نے عبادتوں کے تعلق میں ہی ایک موقع پر بڑے جلال سے فرمایا کہ دیکھو تم اپنے اوپر سختیاں کر کر کے خدا پر غالب نہیں آسکتے۔ ناممکن ہے کہ تم زبردستی خدا کو خوش کر سکو ہاں تم ٹوٹ جاؤ گے اور خدا کی تقدیر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ پس سختیاں خدا کی طرف سے بھی سختی کی خاطر نہیں ڈالی جاتیں اور انسان کو بھی زبردستی خدا کو خوش کرنے کی توفیق نہیں ہے۔ ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو خود مارا جائے گا۔ اس لئے اس مضمون کو سمجھتے ہوئے اس رمضان میں داخل ہوں تا کہ یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ۫ کا یہ مضمون بھی روشن ہو کہ یہ رمضان ہمارے لئے بہت سی آسانیاں لے کر آئے جو پہلے نہیں تھیں۔ ان آسانیوں میں

سے عبادت کا سہولت کے ساتھ اور ہلکے مزاج کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ بہت سے ایسے احمدی بڑے اور چھوٹے ہیں جو مجھے خط لکھتے ہیں کہ ہمارے لئے عبادت بڑی مشکل ہے اور ہم خطبے سنتے ہیں، سمجھتے بھی ہیں، دل بھی چاہتا ہے مگر کیا کریں کہ دل کے اوپر وہ جو بوجھ سا رہتا ہے زبردستی عبادت کرنے کا وہ اترتا نہیں۔ رمضان کا ایک ایسا موقع ہے جس میں یہ بوجھ اتارنا آسان ہو جاتا ہے۔

رمضان میں عبادت کی جو ورزش کی جاتی ہے اس کے بعد نسبتاً زیادہ طاقت ور اور ہلکے محسوس ہونے والے بدن کے ساتھ انسان رمضان میں سے نکلتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خدا کی خاطر خدا کی عبادتوں کی توفیق مانگنے کے لئے سب سے عظیم مہینہ رمضان کا مہینہ ہے کیونکہ اس مہینے کے تعلق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ اگر تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ دے کہ میں قریب ہوں اور بہت سے عارف باللہ ہیں جنہوں نے اس مضمون کو اسی معنی میں سمجھا کہ میں قریب ہوں خصوصیت سے رمضان میں۔ رمضان کی بات ہو رہی تھی تو کہو میں دور کہاں ہوں، اب تو میں بہت قریب اتر آیا ہوں اور آنحضرت ﷺ نے بہت سی احادیث میں بالکل یہی مضمون بیان فرمایا ہے کہ جیسا قریب رمضان میں خدا آتا ہے ویسا قریب نہیں آتا تو سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ مجھے بلاتا ہے۔ ایک شرط ہے فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ میری باتیں بھی تو مانا کریں۔ یک طرفہ تو نہیں کہ مصیبت میں پڑ گئے، پیٹ میں درد ہو رہی ہے، کینسر ہو گیا، کوئی رشتہ ٹوٹ رہا ہے، کوئی قرضوں میں مبتلا ہو گئے تو دوڑے دوڑے اس خدا کی طرف گئے جس کا عام حالات میں رستہ ہی نہیں آتا تھا۔ اس کے قریب نہیں ہے اللہ۔ اس کے قریب ہے جو ہمہ وقت قریب رکھتا ہے اور اگر عام حالات میں نہیں رکھتا تو رمضان میں تو اس نے نمازیں شروع کر دی ہیں نا۔ اب دیکھیں کتنے لوگوں کے واقعۃً خدا قریب آ گیا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو سارا سال سوائے جمعہ کے کوئی نماز نہیں پڑھتے یا جمعہ بھی نہیں پڑھا کرتے تھے، رمضان میں یا جمعہ شروع کر دیتے ہیں یا باقی نمازیں بھی شروع کر دیتے ہیں۔ تو خدا تعالیٰ کا یہ اعلان رمضان کے تعلق میں کتنا مناسب حال ہے کہ تم میں سے بہت سے تھے جن سے میں دور تھا یعنی تم نے مجھے دور رکھا ہوا تھا۔ رمضان میں میں ان کے بھی قریب آ جاؤں گا۔ پس رمضان میں مجھ سے دعائیں کرو، مجھ

سے مدد مانگو تو تمہاری مشکل آسانی میں تبدیل ہو جائے گی اور عبادت کی مشکل بھی تمہارے لئے آسان ہو جائے گی۔ اس رمضان سے گزر کے باقی سال کی عبادتیں پھر بڑے ہلکے انداز کے ساتھ تم کر سکو گے۔ تو دعا کریں میں بھی دعا کرتا ہوں اللہ کرے ہم سب کے لئے یہ رمضان وہ تمام برکتیں لے کے آئے جن کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے اور واقعۃً ہم خدا کو اس طرح قریب دیکھ لیں کہ ہم دعا کریں اور وہ ہماری دعاؤں کا جواب دے اور یہ تبھی ممکن ہو گا اگر ہم ہمہ وقت اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہیں، اپنی روح کے ساتھ بھی، اپنے بدن کے ساتھ بھی، اپنی جانوں کے ساتھ بھی، اپنے اموال کے ساتھ بھی۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق بخشے۔ آمین

رمضان کی برکتوں، اس کی مصلحتوں، اس کے گہرے فوائد کا سب سے بڑا علم حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کو تھا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 26 /جنوری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (البقرة: 184، 185)

فرمایا:

گزشتہ خطبہ پر میں نے دو آیات کی تلاوت کی تھی جن کا رمضان سے تعلق تھا آج کے لئے میں نے دو اور آیتوں کا انتخاب کیا ہے جو اسی مضمون پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈال رہی ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کئے گئے تھے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ گنتی کے چند دن ہیں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا پس تم میں سے جو بھی کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ تو اسے بعد کے ایام میں وہ مدت پوری کرنی ہوگی۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اور وہ لوگ جو اس کی طاقت رکھتے ہیں فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ مسکین کا کھانا فدیہ دینا ہے یعنی ہٗ سے مراد کھانا

دینے کی طاقت رکھتے ہوں وہ کھانا دے دیں۔ دوسرا معنی ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اور وہ لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت رمضان کے بعد بھی نہیں رکھتے ان کو چاہئے فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیں۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ پس جو کوئی بھی خیر کے معاملے میں تطوع کرے تو اس کے لئے بہتر ہے اور اگر تم روزے رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے کہ اس میں کیا فوائد ہیں اور یہ بہتر ہے اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کاش تم جانتے، کاش تمہیں علم ہوتا یا اگر تمہیں علم ہوتا تو تم یہی نتیجہ نکالتے کہ روزے رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

یہاں تَطَوَّعَ کا میں نے ترجمہ نہیں کیا فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا کیونکہ اس کے دو ترجمے رائج ہیں۔ دو ترجمے کئے جاتے ہیں جو دونوں جائز ہیں اور عربی گرائمر دونوں کی اجازت دیتی ہے۔ ایک ترجمہ جو زیادہ تر معروف ہے وہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی بطور نفل نیکی کرے تَطَوَّعَ کے معنی ہیں نفلاً جہاں حکم نہ ہو بلکہ حکم کے بغیر ہی نیکی کی جائے۔ وہ نفلی نیکی، طوعی نیکی، طوعی لفظ جو ہے وہ یہی تَطَوَّعَ والا لفظ ہی ہے۔ یعنی دونوں ایک ہی روٹ سے نکلے ہوئے ہیں تو جو بھی کوئی نفلی نیکی کرے گا پس وہ اس کے لئے بہتر ہوگا۔ اس ترجمے میں کچھ دقتیں ہیں وہ یہ کہ اس سے پہلے یہ گزرا ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْعَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ جو بھی تم میں سے مریض ہو یا سفر پہ ہو وہ بعد کے ایام میں روزے رکھ لے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ پس جو کوئی نفلی طور پر نیکی کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے تو اس سے اس طرف ذہن جاتا ہے کہ اگرچہ اجازت ہے کہ رمضان کے دوران بیماری کی حالت میں اور سفر کی حالت میں روزے نہ رکھے جائیں مگر رکھ لو تو بہتر ہے کیونکہ یہ ایک نفلی نیکی ہوگی لیکن اس میں یعنی ترجمہ تو یہ کیا جاتا ہے مگر اس میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ فرض کے وقت نفلی نیکی نہیں کی جاسکتی۔ اگر فرض ادا ہو تو فرض ادا ہوگا فرض کے بدلے نفلی نیکی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پس یہ ناممکن ہے کہ نفلی طور پر فرضی روزے رکھ لو۔ اس لئے یہ ایک تضاد پیدا ہو جاتا معنی میں اور محل میں جو موقع ہے اس کے ساتھ یہ معنی ٹھیک نہیں بیٹھتا۔

دوسرا معنی ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ جو کوئی اطاعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیکی کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ یعنی نیکی اطاعت ہی کا نام ہے کوئی اطاعت کی روح کو پیش نظر رکھے اور پھر نیکی کرے وہ نیکی ہے وہ اس کے لئے بہتر ہے اور جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کا فتویٰ میں نے پہلے آپ کے سامنے رکھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں مریض ہو یا سفر پر ہو تو یہ نیکی نہیں ہے کہ انسان زبردستی روزہ رکھے۔ جب اللہ نے فرمایا ہے کہ پھر دوسرے ایام میں رکھو تو نیکی اطاعت میں ہے۔ پس اطاعت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس وقت روزے نہ رکھے اور بعد میں رکھے تو یہ دوسرا معنی جو ہے بعینہٖ اس کے ساتھ مطابقت کھاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے معنی پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے۔

Lane نے یہ دونوں معنی بیان کئے ہیں لکھتا ہے who so does good that is not obligatory on him یعنی نیکی، نفلی نیکی۔ Or does good in Obedience نیکی کرے اطاعت کو اپناتے ہوئے۔ تو یہ جو اطاعت کو اپنانے والا معنی ہے یہ بہتر ہے اور مضمون کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی ترجمہ کیا ہے اور جو شخص پوری فرمانبرداری سے کوئی نیک کام کرے گا تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ بعد کا جو آخر پہ مضمون ہے وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ رمضان کے متعلق عمومی حکم ہے اس کا اس استثنائی حکم سے کوئی تعلق نہیں کہ رمضان کے مہینے میں جو روزے ہیں وہ تمہارے لئے بہر حال بہتر ہیں۔ تمہیں علم نہ ہو تو الگ بات ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تم علم رکھتے کہ روزوں کے کیا کیا فوائد ہیں تو تم جان لیتے اور یہی بات خود کہتے کہ یہ اچھی چیز ہے ہمارے فائدے میں ہے۔ اب وہ علم سے تعلق میں آنحضرت ﷺ کے کچھ ارشادات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں کیونکہ جب علم نہ ہو تو صاحب علم سے علم حاصل کرنا چاہئے اور رمضان کی برکتوں، اس کی مصلحتوں، اس کے گہرے فوائد کا سب سے بڑا علم حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کو تھا۔ پس اسی حوالے سے اس علم کے تعلق میں چند احادیث آپ کے سامنے رکھتا ہوں، ایک حدیث نسائی کتاب الصوم سے لی گئی ہے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان مبارک کا ذکر فرمایا اور اسے تمام مہینوں سے افضل قرار دیا اور فرمایا جو شخص رمضان کے مہینے میں حالت ایمان میں ثواب اور اخلاص کی خاطر عبادت کرتا ہے وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے اس روز تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا، تو ہر رمضان ہمارے لئے ایک نئی

پیدائش کی خوشخبری لے کے آتا ہے۔

(سنن نسائی کتاب الصیام باب من قام رمضان و صامه ایماناو احتسابا)

اگر ہم ان شرطوں کے ساتھ رمضان سے گزر جائیں جو آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائی ہیں تو گویا ہر سال ایک نئی روحانی پیدائش ہوگی اور گزشتہ تمام گناہوں کے داغ دھل جائیں گے۔

ایک دوسری حدیث بخاری کتاب صلاۃ التراویح **سے لی گئی ہے**"باب فضل من قام رمضان"۔ **حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص ایمان کے تقاضے اور ثواب کی نیت سے رمضان کی راتوں میں اٹھ کر نماز پڑھتا ہے اس کے گزشتہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔**

ان دونوں حدیثوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پہلی حدیث میں عبادت کا عمومی ذکر تھا جو اخلاص کے ساتھ ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہوئے عبادت کرتا ہے اس کی گویا کہ از سر نو روحانی پیدائش ہوتی ہے، یہاں تہجد کی نماز کا خصوصیت سے ذکر فرمایا گیا ہے جو رمضان کی راتوں میں اٹھ کر نماز پڑھتا ہے اس کے گزشتہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ پس رمضان خصوصیت کے ساتھ تہجد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے یعنی تہجد کی نمازیں یوں کہنا چاہئے خصوصیت سے رمضان سے تعلق رکھتی ہیں اگر چہ دوسرے مہینوں میں بھی پڑھی جاتی ہیں اور اس پہلو سے وہ سب جو روزے رکھتے ہیں ان کے لئے تہجد میں داخل ہونے کا ایک راستہ کھل جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اگر عام دنوں میں تہجد پڑھنے کی کوشش کی جائے تو ہوسکتا ہے بعض طبیعتوں پر گراں گزرے مگر رمضان میں جب اٹھنا ہی اٹھنا ہے اور پیٹ کی خاطر اٹھنا ہے تو روحانی غذا بھی کیوں انسان ساتھ شامل نہ کرلے۔ اس لئے اسے اپنا ایک دستور بنالیں اور بچوں کو بھی ہمیشہ تاکید کریں کہ اگر وہ سحری کی خاطر اٹھتے ہیں تو ساتھ دو نفل بھی پڑھ لیا کریں اور اگر روزے رکھنے کی عمر کو پہنچ گئے ہیں پھر تو ان کو ضرور نوافل کی طرف متوجہ کرنا چاہئے۔ یہ درست نہیں کہ اٹھیں اور آنکھیں ملتے ہوئے سیدھا کھانے کی میز پر آجائیں، یہ رمضان کی روح کے منافی ہے اور جیسا کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا اصل برکت تہجد کی نماز سے حاصل کی جاتی ہے اور امید ہے کہ اب اس کو رواج دیا جائے گا، بچوں میں بھی اور بڑوں میں بھی۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بیان کیا ہے قادیان میں جو بچپن ہم نے گزارا اس میں تو یہ تصور ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص تہجد کے بغیر سحری

کھانا شروع کر دے، ناممکن تھا، بڑا ہو یا چھوٹا ہو وقت سے پہلے اٹھتا تھا اور توفیق ملتی تھی تو تہجد کے علاوہ قرآن کریم کی تلاوت بھی پہلے کرتا تھا پھر آخر پر سحری کے لئے وقت نکالا جاتا تھا اور سحری کا وقت تہجد اور تلاوت کے وقت کے مقابل پر ہمیشہ بہت تھوڑا سا رہتا تھا۔ بعض دفعہ جلدی جلدی کر کے ان کو کھانا پڑتا تھا کیونکہ اگر دیر میں آنکھ کھلی ہے تو کھانے کا حصہ نکالتے تھے تہجد کے لئے، تہجد کا حصہ نکال کر کھانے کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پس یہی وہ اعلیٰ رواج ہے جسے اس زمانے میں بھی رائج کرنا چاہئے اور اس پر قائم رہنا چاہئے۔

مسند احمد بن حنبل میں سے یہ حدیث ہے بحوالہ فتح الربانی، ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اور جس نے رمضان کے تقاضوں کو پہچانا اور ان کو پورا کیا اور جو رمضان کے دوران ان تمام باتوں سے محفوظ رہا جن سے اس کو محفوظ رہنا چاہئے تھا یعنی جس نے ہر قسم کے گناہ سے اپنے آپ کو بچائے رکھا تو ایسے روزہ دار کے لئے اس کے روزے اس کے پہلے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

پس وہ دیگر شرائط جو تہجد کی نماز یا عبادت ادا کرنے کے علاوہ لازم ہیں وہ یہ ہیں کہ تقاضوں کو پورا کیا جائے اور تقاضے پورے کرنے میں اہم بات یہ ہے کہ وہ ان تمام باتوں سے محفوظ رہے جن کے متعلق قرآن کریم میں یا احادیث میں ذکر ملتا ہے کہ خصوصیت سے رمضان کے مہینے میں ان سے پرہیز کیا جائے اور ہر قسم کے گناہ سے اپنے آپ کو بچائے ایسا روزے دار اگر رمضان کے مہینے روزہ رکھتے ہوئے گزار دے تو اس کے پہلے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

بخاری کتاب الصوم سے ایک اور حدیث لی گئی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیطان کو جکڑ دیا جاتا ہے۔

(صحیح بخاری کتاب الصوم باب هل يقال رمضان أو شهر رمضان ومن رأى كلّه واسعاً)

اس ضمن میں ایک خطبے کا بڑا حصہ پہلے بھی اس حدیث کے لئے وقف کر چکا ہوں تا کہ عامۃ الناس کو جو اس حدیث کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس کا ازالہ کیا جائے۔ ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ رمضان کے مہینے میں دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو دوزخی کام کرے اور ہر وہ شخص جس

پر رمضان کا مہینہ گزر رہا ہے خواہ مومن ہو یا کافر ہو اس کے لئے جنت کے دروازے کھل جائیں گے اور جہنم کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر مومن بھی ہو یعنی ظاہری طور پر ایمان لاتا ہو لیکن رمضان کا مہینہ دیکھنے کے بعد اس کے تقاضوں کے خلاف بات کرے اور عمداً ایسی باتوں کا ارتکاب کرے جو رمضان کے منافی ہیں بلکہ عام دنوں کے بھی منافی ہیں تو ایسے شخص پر تو جہنم کے دروازے زیادہ زور سے کھولے جائیں گے۔ دراصل یہ خوشخبری ہے محض ان مومنوں کے لئے جو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی اطاعت کے دائرے میں رہتے ہیں اور قرآن کی اطاعت کے دائرے میں رہتے ہیں۔ اصل میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں مگر قرآن کریم بھی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت الگ الگ بیان فرماتا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اگر تمہیں براہ راست قرآن کریم میں کوئی حکم دکھائی نہ بھی دے رہا ہو مگر آنحضرت ﷺ نے وہ حکم دیا ہو تو چونکہ اللہ کے حکم کے سوا وہ بات کرتے ہی نہیں تھے اس لئے یقین جانو کہ آپؐ کی اطاعت ویسی ہی ہے جیسے اللہ کی اطاعت ہے۔ پس اس وجہ سے قرآن کریم بار بار اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت پر زور دیتا ہے مگر حقیقت میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں کیونکہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں کیونکہ رسول خدا کی اطاعت کے سوا کوئی اطاعت نہیں جانتا تھا۔ پس اس پہلو سے دروازے جب کھولے جاتے ہیں تو ان پر کھولے جاتے ہیں جو اللہ اور رسول کی اطاعت میں وقت گزارتے ہیں نہ کہ ان لوگوں کے لئے جن پر یہ مبارک مہینہ طلوع ہوا لیکن اس کی طرف پیٹھ پھیر کے اس کے سارے تقاضوں کو جھٹلا دیا، اس کے سارے تقاضوں کو رد کر دیا، ایسے لوگوں پر تو جہنم پہلے سے زیادہ بھڑکنے کے احتمالات ہیں بجائے اس کے کہ جہنم کے دروازے بند ہوں۔ تو اُمتِ محمدیہ جو حقیقی معنوں میں اطاعت خداوندی اور اطاعت رسولؐ کی پابند ہو اس کے لئے خوشخبری ہے کہ ان پر دوزخ کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ دوزخ کے دروازے ان پر رمضان کے بعد کیا کھول دئے جاتے ہیں، رمضان ہی میں بند ہوتے ہیں؟ تو مراد یہ ہے کہ رمضان ان کے لئے اتنی نیکیوں کے پیغام لاتا ہے اور اتنی تقوی کی تعلیم دیتا ہے کہ ان کے لئے ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کریں جو ان کو دوزخ میں لے جائے مگر عام دنوں میں بے احتیاطیاں ہو جاتی ہیں اور اتنی توجہ، اتنے انہاک سے

نیکیوں پر عمل اور بدیوں سے بچنے کی طرف توجہ نہیں رہتی۔ اس لئے رمضان کا مہینہ مومن کے لئے سب سے زیادہ پرسکون مہینہ ہے، سب سے زیادہ محفوظ مہینہ ہے۔ اس مہینے میں مومن کے لئے کوئی خطرہ درپیش ہی نہیں ہوتا کیونکہ ہمہ وقت اس کی توجہ اس طرف رہتی ہے کہ اس رمضان سے میں نیکیاں کما کر گزروں اور بدیاں جھاڑ کر نکلوں۔

پس اس پہلو سے اس حدیث کو سمجھنا چاہئے کہ وہ مومن ہے جس پر یہ سب کچھ ہوتا ہے جس کے لئے یہ سب کچھ ہوتا ہے جہنم کے دروازے بند، جنت کے دروازے کھلے اور شیطان جکڑ دیا جاتا ہے۔ یعنی مومن کا شیطان، وہ شیطان بھی ہے جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور وہ ہر انسان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ پس آپ دیکھ لیں کہ رمضان کے مہینے میں کتنی ایسی عادتیں تھیں جو نیکی کے اعلیٰ معیار کے مطابق نہیں تھیں مگر اب جب آپ کی وہ عادتیں آپ کو اپنی طرف بلاتی ہیں تو بار ہا آپ کے دل سے یہ آواز اٹھتی ہے ''نہیں''۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک قید ہے اور بہت سے روزے دار قید کا احساس نمایاں طور پر رکھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ بھوک کوئی چیز نہیں ہے جو دراصل مشکل ہو۔ صبح سحری کھائی اس کا لطف الگ آتا ہے جب افطاری کا وقت آتا ہے تو اس کا ایک الگ لطف ہے۔ بیچ کا جو وقت ہے وہ بھول جاتا ہے ان دو وقتوں کے درمیان۔ جو اصل چیز ہے وہ آزادی کا احساس ہے جس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہر شخص، ہر روزے دار جانتا ہے کہ دن رات جو ہر وقت پابندی میں جکڑے ہوئے وقت گزرتا ہے اور نفس کے اوپر ہمیشہ یہ خیال غالب رہتا ہے کہ دیکھو تم آزاد نہیں ہو۔ یہ وہ چیز ہے جو درحقیقت مومن پر، روزے دار پر بطور قید کے عیاں ہوتی ہے اور یہ شیطان کی قید ہے ورنہ نماز پڑھنے میں تو اس کو کوئی تنگی محسوس نہیں ہوتی قید کی۔ نیک کام کرنے میں، اچھی بات کرنے میں جس کی اس کو پہلے سے ہی عادت ہو وہ بڑی بشاشت محسوس کرتا ہے اس کو کوئی قید محسوس نہیں ہوتی لیکن وہ عادتیں ہیں دراصل جو ظاہری طور پر اس کے سامنے اس کے دماغ میں ابھریں یا نہ ابھریں مگر قید کا احساس بعض ایسی بدعادتوں سے تعلق رکھتا ہے جو پہلے زمانے میں تھیں اور رمضان میں آکر محسوس ہوتا ہے کہ اب میں یہ نہیں کرسکتا۔

پس وہ قید شیطان کی قید ہے اور یہاں شیطان سے مراد عام شیطان نہیں ہے کیونکہ عام شیطان ہو تو وہ سب کے لئے جکڑا جائے گا، عام شیطان اگر جکڑا گیا تو کیا مومن کیا کافر سب کا شیطان

جکڑا گیا لیکن یہ وہ شیطان ہے جس کا ذکر احادیث میں دوسری جگہ ملتا ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کی رگوں میں، اس کے خون میں ایک شیطان دوڑ رہا ہے وہ قید ہو جاتا ہے اور بڑی مشکل سے بعضوں کا وقت گزرتا ہے۔ وہ عید میں داخل ہوتے ہیں تو کہتے ہیں چلو رہائی ہوئی لیکن اگر وہ غور کریں تو سوچیں گے کہ بعض بدعادتوں کی طرف لوٹنے کو وہ رہائی کہتے ہیں اور بعض اچھی عادتوں سے بچ نکلنے کو وہ رہائی سمجھتے ہیں لیکن انسان بسا اوقات باشعور طور پر اپنے نفس کا جائزہ نہیں لیتا خود اپنے حالات سے بھی بے خبر رہتا ہے اس لئے بس ایک مبہم سا احساس، ایک قید ہے جس میں سے وہ نکل کر پھر آخر عام دنوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

تو یہ جو شیطان کا جکڑا جانا ہے یہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایک پیغام ہے، ایک نصیحت ہے جو گہری نفسیاتی نصیحت ہے۔ اس پر غور کر کے اگر آپ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ شیطان کیا ہے؟ کیسے جکڑا جاتا ہے؟ تو پھر ممکن ہے کہ رمضان کے بعد بھی آپ اس شیطان کو باندھ کر رکھنے کی کوئی تدبیر سوچیں یا ہمہ وقت بیدار رہنے کی کوشش کریں کہ اب جب قید کیا ہے تو پھر قید ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ پھر یہ چھٹ جاتا ہے اور اگلے رمضان سے پہلے پہلے وہ ساری عادتیں ڈھا جاتا ہے جن سے بچنے کے لئے رمضان آپ کے لئے اس کی قید کا اور آپ کی رہائی کا پیغام لایا تھا۔ دراصل مومن، اعلیٰ درجے کا مومن تو وہ ہے جو مسلسل جکڑا رہتا ہے۔ وہ ایک رمضان سے آزاد ہو کر نہیں نکلتا بلکہ قید ہی کی حالت میں جاتا ہے۔ یعنی اس کے نفس کی خواہشات کا جہاں تک تعلق ہے وہ قید رہتا ہے۔ پس شیطان مومن کے اندر کا شیطان ہے جو قید ہوتا ہے اور وہ قید ہو جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے گویا مومن قید ہے تو وہ آزاد نہیں رہتا۔

چنانچہ اسی بات کو آنحضور ﷺ نے ایک اور محاورے میں یوں بیان فرمایا کہ

الدنیا سِجن للمومنین و جنته الکافر

(صحیح مسلم کتاب الزّھد و الرّقائق)

کہ دنیا تو مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ یہاں شیطان کے لئے نہیں فرمایا بلکہ مومن کے لئے قید خانہ فرمایا ہے۔ پس وہی معنی بنتے ہیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں کہ شیطان کا لفظ ہر شخص کے اندر کے شیطان پر اطلاق پاتا ہے اور

ہر مومن کے اندر بھی ایک شیطان ہے جو ہمہ وقت اس کو آسانیوں کی طرف بلاتا اور خدا کی راہوں میں تکلیفوں سے ڈراتا ہے۔ ہر وقت اس کو من مانی کرنے کی تلقین کرتا اور اطاعت کے رستوں سے پیچھے ہٹاتا ہے۔ یہ شیطان ہے جو قید ہو جائے اور اگر اسے عمر قید ہو جائے تو پھر آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث صادق آئے گی۔ **الدنیا سجن للمومنین و جنته الکافر**۔ دنیا تو مومن کے لئے ساری زندگی قید خانہ بن جاتی ہے۔ پس عجیب بات ہے کہ لفظ مومن اور شیطان یہاں دونوں بظاہر ایک دوسرے پر انطباق کر رہے ہیں مگر معنی اگر سمجھ لئے جائیں تو اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مومن کے اندر نفس امارہ کا شیطان ہے جو زندگی بھر ہمیشہ قید رہتا ہے اور ان معنوں میں دنیا مومن کا قید خانہ بنتی ہے۔

پھر ایک اور حدیث میں اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا گیا ہے یہ بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطان اور جن جکڑ دیئے جاتے ہیں اور آگ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

(سنن الترمذی کتاب الصوم باب ماجاء فی فضل شهر رمضان)

شیطان اور جن! یہ جن کیا چیز ہے جو شیطان کے ساتھ جکڑا جاتا ہے۔ شیطان اگر نفس امارہ ہے تو جن غصے کی حالت میں اور اشتعال کی حالت میں اپنے حواس کو بے قابو کر دینا یا حواس پہ سے قابو اٹھا لینے کا نام ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے غصے کو بھی ''جن'' کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ پس شیطان کے علاوہ جن اس طرح قید ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو ہیں بڑی جلدی مشتعل ہونے والے لوگ ہوتے ہیں اور مغلوب الغضب ہوتے ہیں مگر روزے کی حالت میں جب کوئی ان سے ایسی بات کہے جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بے عزتی ہوگئی، ہم پر چوٹ ماری گئی ہے تو اچانک آنحضرت ﷺ کی آواز سنائی دیتی ہے کہ کوئی غصہ کرے، کچھ زیادتی کرے تم نے آگے سے ویسا جواب نہیں دینا۔ تم یہ کہو میں روزے سے ہوں، میں مجبور ہوں۔ تو قید جو ہے وہ جن کی بھی ساتھ ہوگئی ہے اور جن سے مراد غصے کا جن ہے۔ تو اشتعال کی حالت میں جو لوگ بدیاں کرتے اور بعض دفعہ ایسے ظلم کر جاتے ہیں کہ پھر ہمیشہ ہمیش کے لئے وہ اپنے جن کی سزا پاتے رہتے ہیں۔ ایک اشتعال کی حالت کا فعل عمر بھر کی قید میں اس کو مبتلا کر سکتا ہے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا سکتا ہے یا اور کئی قسم کے عوارض میں مبتلا کر سکتا ہے کئی قسم کے پچھتاوے لگ جاتے ہیں۔

تو جن بھی بڑی خطرناک چیز ہے مگر اگر آپ کو پتا ہو کہ جن ہے کیا؟ ورنہ اور جن اگر آپ تلاش کرتے پھریں کہ باہر سے کوئی جن آیا تھا یا نہیں آیا تھا تو کچھ بھی نہیں ملے گا آپ کو اور آپ کو پتا بھی نہیں لگے گا کہ جن آزاد ہے حالانکہ آپ کی خاطر قید کیا جانے والا جن یہ غصے کا جن ہے اور شیطان نفس امارہ کا شیطان ہے۔ یہ دونوں قید ہو جائیں تو آگ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں ان کا آپس میں تعلق ہے۔ ہر ایک کے لئے آگ کے دروازے بند نہیں ہوتے جن کا جن قید ہو جائے ،جن کا شیطان پکڑا جائے ان کے لئے آگ کے دروازے بھلا کیسے کھل سکتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یہ ایک طبعی نتیجہ ہے۔نفس امارہ کو لگامیں دے دیں اور غصے کو قابو میں کر لیں تو اس کے نتیجے میں لازم ہے کہ آپ سے ایسی نیکیاں سرزد ہوں جو خدا کے ہاں آپ کو مقبول بنا دیں چنانچہ فرمایا جنت کے دروزے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور ایک منادی کرنے والا منادی کرتا ہے اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے شر کے چاہنے والے رک جا اور اللہ کے کئی ایسے بندے ہیں جنہیں آگ سے نکالا جاتا ہے یہ ہر رات کو ہوتا ہے۔

تو یہ ایسی تجربہ گاہ ہے رمضان جس میں انسان کو موقع ملتے ہیں اپنے اوپر تجربات کرنے کے ،نیکیوں میں آگے بڑھنے کے، بدیوں سے روکنے کے تجربے، غصے کی حالتوں پہ قابو پانے کے، نفس امارہ کے خلاف ایک جہاد کرنے کا موقع ،ان موقعوں سے جو کامیابی سے گزر جاتا ہے اس کے متعلق کیا ہی سچ فرمایا ہے کہ ایسے بندے ہیں جنہیں آگ سے نکالا جاتا ہے۔ ہر رمضان ایک شخص کو ہمیشہ کے لئے جہنم سے نکال لیتا ہے اس جہنم سے جس کی طرف وہ روزمرہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کا کوئی اس کو خیال نہیں ہوتا کوئی شعور نہیں ہوتا اور فرمایا ایسا ہر رات کو ہوتا ہے۔ پس بڑے ہی وہ خوش نصیب ہیں جو رمضان کی راتوں میں کسی رات کو اُٹھ کے جب تہجد پڑھ رہے ہوں تو دل پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جائے کہ انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ان کو خواب غفلت سے بیدار کر دے۔انہیں احساس ہو کہ اب مجھے لازماً ایک نئے وجود کے طور پر زندہ رہنا ہوگا اور اس پہلو سے اس احساس کے بعد جب وہ خدا تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے تو ہر رات خدا کے ایسے بندے ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ جہنم سے نکل گئے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا

''**الصیام جُنّة**'' کہ روزہ ڈھال ہے۔ (صحیح مسلم ، کتاب الصیام باب فضل الصّیام)

ڈھال وہ چیز ہے جس سے ہر قسم کے خطروں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ پس روزے کی پناہ میں آ جاؤ تو ہر قسم کے فساد، ہر قسم کے خطروں سے بچ جاؤ گے لیکن اگر روزہ رکھا ہوا ور منہ پر وہی پہلے کی طرح لغو باتیں یا گالی گلوچ یا اشتعال انگیز باتیں کرنا اور اشتعال انگیز باتوں کے جواب میں بے قابو ہو جانا یہ ادائیں پہلے کی سی اگر جاری رہیں تو اس روزے کا کیا فائدہ؟ ایسا روزہ محض بھوک کی سزا ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی بھی حقیقت نہیں رہتی۔

آج صبح جب پاکستان کی خبروں سے متعلق جنگ اخبار دیکھا تو اس امید سے دیکھا کہ شاید اب یہ خبر مل جائے کہ رمضان کے مہینے میں کوئی قتل و غارت نہیں ہوگا، کوئی فساد نہیں ہوگا، پاکستان کی گلیوں میں کم سے کم کچھ عرصے کے لئے تو امن آ جائے گا اور اس خوف سے دیکھا کہ کہیں یہ میری امید جھوٹ ہی نہ نکلے تو خوف سچا نکلا اور امید جھوٹی نکلی۔ کیونکہ اخبار اسی طرح گناہوں کی خبروں سے کالا ہوا پڑا ہے۔ ہر قسم کے فساد کی خبریں موجود ہیں اور رمضان شریف کے احترام کے ذکر شاید مسجدوں میں ملتے ہوں مگر پاکستان کی گلیاں، پاکستان کے گھر، پاکستان کے بازار، پاکستان کے دن، پاکستان کی راتیں اس رمضان سے بے خبر ہیں جس رمضان کا ذکر میں حضور اکرم ﷺ کی زبان سے آپ کے سامنے کر رہا ہوں۔ کسی بے چارے کو وہ ڈھال ہی میسر نہیں۔ ایک ہی شہر میں ایک خاندان کو اس طرح ذبح کر دیا جاتا ہے۔ آج ہی کی خبر میں تھا کہ ایک شخص جو اپنی فیکٹری میں سویا ہوا تھا وہ روزہ رکھنے کی نیت سے گھر گیا تو بیوی نے کہا کہ سوئی گیس بند ہو گئی ہے اس لئے روٹی نہیں پکا سکی۔ وہ واپس اپنی فیکٹری کی طرف گیا کہ شاید بازار سے چیز لے کے کھائے لیکن اس کے بعد دیکھا نہیں گیا۔ تو دوسرے دن جب پتا چلا کہ وہ چور یا ڈاکو یا اس کے دشمن اس وقت آئے ہیں جبکہ سحری کا وقت تھا اور پہلے اس کو وہاں ذبح کیا پھر اس کو گھسیٹ کر باہر لائے اس کے اپنے دفتر کا سامان ٹیلی ویژن وغیرہ کا الاؤ لگایا اور اس آگ میں اس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ جہنم کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ پس جہنم کا دروازہ کھل بھی جاتا ہے اور اس طرح بھڑک بھی اٹھتا ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو آنحضرت ﷺ اور قرآن کے احکامات کے دائرے سے باہر زندگی بسر کرتے ہیں۔

پھر آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''**ان لکل شئی بابا و باب العبادة الصیام**'' ۔ یہ جامع

الصغیر سے حدیث لی گئی ہے۔

(الجامع الصغير فی احاديث البشير النذير از امام جلال الدین سیوطی صفحہ نمبر 146 حدیث نمبر 2415)

اسی طرح ایک دار قطنی بحوالہ جامع الصغیر حدیث ہے۔

اذا سلم رمضان سلمت السنة

(الجامع الصغير فی احاديث البشير النذير از امام جلال الدین سیوطی صفحہ نمبر 48 حدیث نمبر 685)

پہلی حدیث کا ترجمہ ہے ہر چیز کا ایک دروازہ ہے اور عبادت کا دروازہ روزے ہیں۔ دوسری حدیث کا ترجمہ ہے کہ جب رمضان سلامتی سے گزر جائے تو سمجھو کہ سارا سال سلامت ہے۔ جب رمضان سلامت رہا تو سارا سال سلامت رہا۔ یہ ترجمہ ہے۔

پہلی حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ عبادت کا دروازہ رمضان ہے تو اس سے کیا مراد ہے کیا رمضان کے بغیر عبادت نہیں ہوتی۔ پانچوقتہ نماز جو فرض ہے اس کے علاوہ بھی تو بہت سی عبادت ہے تہجد کی نمازیں بھی ہیں یہ سارا سال ہوتی رہتیں ہیں تو صیام کو عبادت کا دروازہ کیوں فرمایا گیا ہے؟ ایک تو یہ معنیٰ ہے کہ عبادت کا وسیع تر مفہوم جس میں بندگی بھی شامل ہے جیسا رمضان سکھاتا ہے ویسا کوئی اور مہینہ نہیں سکھاتا۔ دوسرے یہ کہ رمضان کے وقت عبادت کے لئے ایسا جوش پیدا ہوتا ہے اور ایسی گرمی پیدا ہوتی ہے کہ حقیقت میں اگر عبادت کی لذّت پانی ہو تو رمضان کے رستے سے داخل ہو پھر تمہیں یہ بات سمجھ آئے گی کہ عبادت کیا ہوتی ہے؟ پس یہ مفہوم ہے ''عبادت کا دروازہ'' ورنہ یہ مراد نہیں کہ رمضان کے بغیر عبادت نہیں ہوسکتی۔

دوسری حدیث میں ہے رمضان سلامت رہا تو سارا سال سلامت رہا۔ اس حدیث میں جو مومن سے توقع ہے کچھ اس کا بھی بیان ہے کہ وہ مومن جو حقیقت میں رمضان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور کوئی تقاضا توڑتا نہیں اس کے لئے خوشخبری ہے کہ اس کا آئندہ سارا سال سلامتی سے گزرے گا۔ پس پہلی جو احادیث تھیں ان میں ماضی کے تعلق سے خوشخبری دی گئی تھی یعنی پچھلے جو گناہ ہیں وہ معاف کر دیئے جائیں گے، گزشتہ کوتاہیاں جو ہوئیں ان سے صرفِ نظر فرمایا جائے گا اس لئے فکر نہ کرو اگر رمضان نصیب ہو گیا تو جو کچھ پہلے لغزشیں ہوئیں، کوتاہیاں ہوئیں اللہ تعالیٰ انہیں بھی معاف فرمادے گا۔ اب اس حدیث میں یہ خوشخبری ہے کہ اگر تم صحیح طور پر رمضان کے تقاضے پورے کرو گے

تو رمضان کا مہینہ تمہیں بچالے جائے گا اور تمہارا پورا سال بچادے گا۔ پس تم نے رمضان کے مہینے میں جو رستہ اختیار کیا ہے وہ پورے سال تک کے لئے رمضان سے طاقت پائے گا اور سیدھا رہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی گولی بندوق کی نالی سے نکلتی ہے اگر چھوٹی نالی ہو تو بہت جلدی وہ رستے سے بھٹک جاتی ہے اور جتنی لمبی نالی ہو اتنی زیادہ دیر تک سیدھی نشانے کی طرف حرکت کرتی رہتی ہے۔ پس اسی لئے لمبی نالیوں سے دور کے نشانے لئے جاتے ہیں، چھوٹی نالیوں سے نزدیک کے نشانے لئے جاتے ہیں۔ پس تیس دن کا جو خدا تعالیٰ نے رمضان رکھا۔ یہ ایک ایسی نالی ہے جس میں اگر آپ سیدھے رہ کر گزریں اور رمضان کے حقوق ادا کرتے ہوئے گزریں تو سارا سال آپ کو سیدھا رکھے گی یہاں تک کہ اگلا رمضان آ جائے گا اور پھر اگلے رمضان میں ایک اور نالی میں پھر دوبارہ داخل ہوں گے پھر آپ کو سیدھا کیا جائے گا، آپ کی کجیاں صاف کی جائیں گی تو ساری زندگی بچتی ہے اصل میں۔ ایک رمضان کو آپ سلامتی سے گزار لیں تو گویا اگلا سال سلامتی سے گزر گیا اور جب ہر دو رمضان کے درمیان سال سلامتی سے گزرے تو دوسرے معنوں میں ساری زندگی سلامتی سے گزر جائے گی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت ہے ابن ماجہ سے لی گئی ہے۔ فرمایا:

''ہر چیز کو پاک کرنے کے لئے ایک زکوٰۃ ہوتی ہے اور جسم کی زکوٰۃ اور پاکیزگی کا ذریعہ روزہ ہے۔''

(سنن ابن ماجه كتاب الصيام باب في الصوم زكاة الجسد)

زکوٰۃ اموال کو پاک کرنے کے لئے بھی دی جاتی ہے اور اعمال کی نشوونما کے لئے بھی دی جاتی ہے دونوں معنی بیک وقت اس میں موجود ہیں اور تزکیہءنفس کے لئے بھی دی جاتی ہے۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ جسم کو اگر پورے طور پر اس کے ہر پہلو سے دیکھا جائے تو روزہ ایسی چیز ہے جو سارے جسم کی زکوٰۃ بن جاتا ہے اور اس کے متعلق تشریح ایک اور حدیث میں یوں بھی آئی ہے کہ **صوموا تصحوا** اگر تم روزے رکھو گے تو صحت مند رہو گے۔

(المعجم الأوسط للطبرانی ،باب الميم ،من بقية من اول اسمه ميم ،موسیٰ بن ذكريا التستری)

پس صرف روحانی زکوٰۃ ہی نہیں بدنی زکوٰۃ بھی ہے اور رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ روزے کے نتیجہ میں صحت بہتر ہوتی ہے خراب نہیں ہوا کرتی بشرطیکہ بیماری کی شرط کو

پیش نظر رکھے۔ جب اللہ فرماتا ہے کہ بیمار ہو تو روزے نہیں رکھنے۔ اگر اس شرط کو نظر انداز کریں گے تو پھر صحت بگڑے گی تو آپ کی اپنی غلطی سے بگڑے گی۔ رمضان کے نتیجے میں صحت نہیں بگڑا کرتی بلکہ صحت عطا ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو ڈائٹنگ Dieting کرتے ہیں مثلاً، بڑی مصیبت پڑی ہوتی ہے سارا سال کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی وزن کم نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ضروری نہیں کہ وہ کھانا زیادہ کھاتے ہوں۔ کئی ایسے موٹے میں نے دیکھے ہیں میرے پاس مریض آتے رہتے ہیں جن کی مشکل یہ ہے کہ اگر وہ کھانا کم کر دیں تو خون کم ہو جاتا ہے مگر جسم کم نہیں ہوتا اور کئی ایسی مریضائیں آئیں ہیں جن کو بیچاروں کو انیمیا ہو گیا اس کوشش میں کہ کسی طرح وزن کم ہو یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے مجبور کیا کہ اپنی غذا نارمل کرو خواہ وزن کم ہو یا نہ ہو تو یہ Metabolism کی خرابی کی وجہ سے بعض دفعہ موٹاپا ہوتا ہے۔ لازم نہیں کہ کوئی انسان زیادہ کھائے تو موٹا ہو۔ Metabolism اس کو کہتے ہیں کہ ایک انسان جب خوراک لے رہا ہے تو وہ خوراک جسم میں ہضم ہو رہی ہے اور دوسری طرف جسم کے اندر ایسا نظام ہے کہ اس خوراک کو دوبارہ Energy میں یعنی توانائی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور وہ توانائی اس کے مختلف کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ دماغ کے لئے بھی، سانس لینے میں، دل کے دھڑکنے میں خواہ انسان کوئی حرکت دوسری کرے یا نہ کرے ہر وقت استعمال ہو رہی ہے اور گرمی بھی بناتی ہے حرارت غریزی بھی اسی سے ملتی ہے۔ اگر یہ توازن بگڑ جائے اور ایک انسان جتنا کھاتا ہے اتنا وہ گرمی میں تبدیل نہ کر سکے تو لازماً جو بقیہ بچی ہوئی Enegy ہے وہ Fats میں یا گوشت میں تبدیل ہو گی۔ صحت اچھی ہو گی ورزش کی عادت ہو گی تو وہ Muscles میں تبدیل ہوتی ہے پھر اور پروٹینز بنتی ہیں اس سے، اور اگر صحت خراب ہو اور جگر کی خرابی سے عموماً ایسا ہوتا ہے تو پھر صرف چربی بنتی ہے اور مسلز نہیں بنتے اور ایکسرسائز اس کا علاج ہے بعضوں کو اتنی توفیق نہیں ہوتی بعض بیچارے اتنے بیمار ہوتے ہیں کہ Excercise یعنی ورزش کے باوجود وہ یہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔ یہ ہے وہ صورتحال جس کا علاج روزہ ہے اور روزے میں اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جو دو کھانوں کے درمیان فاصلہ ڈالا جاتا ہے وہ بعض دفعہ خوابیدہ ایسی طاقتوں کو بیدار کر دیتا ہے جو انرجی بنانے کی کارروائی کو تیز کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کو عام طور پر بھوک نہیں لگتی روزے میں سے گزریں

تو بھوک ان کی ٹھیک ہو جاتی ہے۔بعض لوگ ڈائٹنگ کرتے ہیں لیکن روزے کے بعد ان سے ڈائٹنگ نہیں ہوسکتی کیونکہ جسم کی طرف سے ایسی بھڑ کی لگتی ہے کہ مجبور کرتی ہے کہ ضرور انسان کچھ نہ کچھ کھائے ورنہ بے چینی رہتی ہے یعنی بے چینی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔یہ وہ مضمون ہے جو صحت سے تعلق رکھتا ہے اوراس کی اور بھی بہت سی شاخیں ہیں۔تمام تفصیل شاخوں کی بحث، میں اس خطبے میں نہیں اٹھانا چاہتا مگر یہ یقین کریں کہ جنہوں نے غور کیا، جنہوں نے تحقیق کی وہ اس نتیجہ پہ پہنچے کہ روزہ صحت کا ضامن ہے، روزہ صحت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

چنانچہ ایک تحقیق کا شاید میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔اسرائیل میں اس مضمون پر ریسرچ ہوئی اوران کی نیت بظاہر یہی معلوم ہوتی تھی کہ وہ ثابت کریں کہ مسلمانوں کا جو یہ طریق ہے روزے رکھنے کا یہ ان کے لئے نقصان دہ ہے اور بچوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے بڑوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔چنانچہ پوری گہری ریسرچ کی گئی، ایک بڑی ٹیم نے اس پہ کام کیا اور یہ بھی پیش نظر تھا کہ روزے کے دنوں میں تو بعض لوگ پہلے سے بھی بڑھ کر کھاتے ہیں اور زیادہ کھانے کے نتیجے میں اور بیچ میں فاقے رہنے کے نتیجے میں ایسا نقصان ان کو پہنچ سکتا ہے کہ پھر وہ بعد میں سنبھل نہ سکیں۔جو ریسرچ کا ماحصل تھا اس نے ان کو حیران کر دیا بالکل برعکس نتیجہ نکلا۔جس چیز کی تلاش میں تھے اس کی بجائے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ جتنی تحقیق کی گئی ہے اس کے نتیجے میں رمضان کے مہینے کے بعد انسان بہتر صحت کے ساتھ باہر نکلتا ہے، کمزور ہو کے نہیں نکلتا۔ ہر پہلو سے اس کے جائزے لئے گئے۔کولیسٹرول لیول کے لحاظ سے جائزے لئے گئے Metabolism کی Ratios کے آپس میں توازن کے لحاظ سے لئے گئے غرضیکہ باقاعدہ ریسرچ کا جو حق ہے وہ ادا کیا گیا اور نتیجہ یہ نکلا ہے۔پس آنحضرت ﷺ نے چودہ سوسال پہلے جو بات فرمائی دیکھیں، کیسی صحت کے ساتھ وہ بات فرمائی، کتنی سچی بات فرمائی صوموا تصحوا روزے رکھا کرو صحت اچھی ہو جائے گی، یہ خیال نہ کرنا کہ تمہاری صحت بگڑے گی۔پھر ایک موقع پر فرمایا صبر کے مہینے کے روزے سینے کی گرمی اور کدورت دور کرتے ہیں اور رمضان کا مہینہ صبر کا مہینہ کہلاتا ہے کیونکہ اپنی خواہشات پر صبر کرنا ہے اپنے غصوں پر صبر کرنا ہے نیکیوں پر جم کے بیٹھنا ہے۔بدیوں کی طرف جو تحریک ہے اس کا مقابلہ کر کے رک جانا ہے۔ان سب چیزوں کو صبر کہا جاتا ہے۔تو فرمایا صبر کے مہینے یعنی رمضان کے روزے سینے کی گرمی اور کدورت کو دور

کرتے ہیں۔ سینے کی گرمی میں ایک وہ گرمی بھی ہے جو میں نے بتایا ہے Heart Burns اور اس قسم کی چیزیں لیکن اصل سینے کی گرمی میں روحانی طور پر نقصان دہ جذبات اور اشتعال انگیز باتیں ہیں۔ بعض لوگوں کے سینے کھولتے رہتے ہیں بعض بری نیتوں کے ساتھ، بعض بدیوں کے ساتھ، کچھ غصوں کے ساتھ تو اول معنی وہ ہے جو سینے کی گرمی کو دور کرنے کا ہے ورنہ جہاں تک Heart Burns کا تعلق ہے وہ بسا اوقات بعض لوگوں کو رمضان کے مہینے میں زیادہ ہو جاتا ہے اس لئے اس کو ظاہری معنوں میں اس طرح محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ کولیسٹرول لیول گرنے کے نتیجے میں رمضان کے بعد اس کا رجحان کم ہو جائے گا لیکن بعض لوگ ہیں جو فوری طور پر اگر کوئی دوا وغیرہ استعمال نہ کریں تو ان کے روزوں کی وجہ سے ان کے معدے میں ایک قسم کا تیزاب کھولنے لگتا ہے۔ اس کا علاج بھی میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ عام طور پر میرے تجربے میں ہے کہ Bryonia 200 کی اگر ایک خوراک رات کو روزہ کھولنے کے دو تین گھنٹے کے بعد یا صبح تہجد کے وقت کھا لی جائے تو ایسے مریضوں کو عموماً اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور رمضان کے نتیجے میں جو تیزابی تلخی ہے اس سے بچت ہو جاتی ہے۔ جن کو اس دوا سے فائدہ نہ ہو ان کو Nux Vomica 30 کی ایک خوراک بہت فائدہ پہنچاتی ہے اسی طرح Acid معدے کا تیزاب مارنے کے لئے بعض دوسری ہومیو پیتھک دوائیں ہیں وہ استعمال کی جا سکتی ہیں ان میں Iris Versicolor 200 اگر کبھی کبھی کھائی جائے تو یہ بھی مفید ہے۔ Robina بھی ایک دوا ہے جو 30 یا 200 طاقت میں کھائی جا سکتی ہے۔

تو جو جسم کی اندرونی تیزابی گرمی ہے اس کے لئے یہ علاج موجود ہے لیکن یہاں ظاہر ہے کہ مراد وہ سینے کے طیش، سینے کے کھول، غصے کی حالت میں سینے میں جو باتیں ابلتی رہتی ہیں یا نفسانیت کے جوش سے جو سینے میں جذبات کھولتے رہتے ہیں رمضان ان کا بہترین علاج ہے اس میں کوئی بھی شک نہیں ہے اور بھی بہت سی نصیحتیں ہیں انشاء اللہ ان کو پھر میں آئندہ خطبے میں بیان کروں گا۔ اب ایک دو باتیں ایسی ہیں جو اس کے علاوہ کرنے والی ہیں۔

ذکر کرنا ہے MTA کا، MTA کے ذریعے خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جو تمام دنیا میں اسلام اور احمدیت کا فیض پہنچایا جا رہا ہے اس کے رستے میں کچھ روکیں پیدا ہوئی تھیں جس کے لئے میں نے جماعت کو دعا کے لئے بھی تحریک کی اور امید بھی دلائی تھی کہ انشاء اللہ یہ سب روکیں دور ہو

جائیں گی۔تو پہلی خوشخبری تو یہ ہے کہ وہ جو مستقل انتظام ہمارا، اس کو عالمی تو نہیں کہنا چاہئے اردو میں اس کا ترجمہ مشکل ہوگا لیکن ایسا ٹرانسپانڈر Transponder جو آدھی دنیا کو بیک وقت تمام سگنلز دے سکتا ہے اور بڑی صفائی کے ساتھ دے سکتا ہے وہ ٹرانسپانڈر Transponder جس کی موجودہ طاقت جتنے بھی ٹرانسپانڈر رائج ہیں ان میں اوپر کی، چوٹی کی طاقت ہے وہ لینے کی کوشش ہو رہی تھی تا کہ جو سرسری انتظام ہے تین چار مہینے کے لئے اس کی خامیوں سے بچا جاسکے۔ جو سرسری انتظام ہے اس میں ہمیں دو ہیمی، بیمز Hemi-Beams لینی پڑتی ہیں اور یہ جو میں کہہ رہا ہوں اس کو گلوبل بیم کہا جاتا ہے اگر چہ یہ آدھی دنیا کی بیم ہوتی ہے پوری دنیا کی نہیں۔ مگر نصف کرہ ارض کے لئے یہ بیم ہوتی ہے وہ مل نہیں رہی تھی۔ اس کے اوپر بہت سے پہلے سے ہی ان کے تقاضے موجود تھے اور ایک ایسی بیم تھی جس کے متعلق خیال تھا کہ اگر ہمیں مل جائے تو ہماری ساری مشکلات کا ازالہ ہو جائے گا اور وہی گلوبل بیم ہی تھی اور اس کی طاقت بھی زیادہ تھی صرف مشکل تھی کہ اس میں خرچ زیادہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ بہت قیمتی بیم ہے وہ۔ مگر میں نے کہا کہ اللہ کے فضل سے، پہلے بھی اللہ ہی پورے کر رہا ہے ہم کونسا اپنے زور بازو سے پیسے لا رہے ہیں انتظام ہو جائے گا، لیکن لینی ضرور ہے۔ کمپنی نے جواب دیا کہ لینی تو ضرور ہے مگر مشکل ہے کہ ایک آدمی نے پہلے سے ریزرو کرائی ہوئی ہے یا ایک کمپنی نے ریزرو کروائی ہوئی ہے اور ہمارا قانون یہ ہے کہ اگر تم نے ضرور لینی ہے تو اتنے پیسے پیشگی جمع کراؤ جو اس بیم پر لگیں گے اور پھر پینتالیس دن انتظار کرو۔ اگر اس پینتالیس دن کے عرصے میں اس نے اپنا Claim کر دیا تو تمہارا کلیم ختم اور ہم اسے مجبور کریں گے کہ اب پیسے دے اور بیم سنبھالے۔ آپ اندازہ کریں کہ وہ ایک ایک دن کتنا بھاری ہوگا، بہت دعائیں کرتے ہوئے وقت گزرا، ہر روز یہی فکر تھی کہ خدا کرے آج نہ کہیں اس نے کہہ دیا ہو یہاں تک گزشتہ پیر پہلا روزہ تھا وہ آخری دن تھا اور بڑی مشکل سے روزہ کٹا ہے لیکن اللہ نے خوشخبری دی اور وہ دن پورا گزر گیا اور اس کمپنی یا اس شخص کو توفیق نہ ملی کہ وہ اپنی ریزرو کی ہوئی بیم کو سنبھال لے۔ پس جونہی ہمیں اطلاع ملی اسی وقت کنٹریکٹ فائنلی سائن کر دیئے گئے ہیں۔ اب یہ خوشخبری ہے سارے عالم احمدیت کو اور دوسری دنیا کو بھی کیونکہ وہ سب فیض اٹھا رہے ہیں کہ بیچ میں جو خلا رہ گئے تھے اس عارضی انتظام میں مثلاً مشرق وسطی میں جو سعودی عرب کے بعض علاقے اور ابوظہبی وغیرہ وہاں موجودہ انتظام نہیں

دیکھا جا سکتا کیونکہ دو بیمز کے درمیان بیچ میں ایک سایہ سا بن جاتا ہے اور اس سائے پہ کچھ بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ اب جو گلوبل بیم ہمیں ملی ہے یہ جہاں ٹیلی ویژن دیکھا جا رہا ہے وہاں پہلے سے زیادہ روشن اور صفائی سے دیکھا جا سکے گا کیونکہ اس کی طاقت Maximum ہے۔ جتنی طاقت بھی استعمال کی جاتی ہے اس سے زیادہ نہیں کرتے اور جہاں پہلے آدھی بیم کے ذریعے پاکستان وغیرہ میں اطلاعیں مل رہی تھیں کہ اچھا بھلا صاف ہے پہلے سے بہتر ہے ان کے لئے خوشخبری ہے کہ پہلے سے بہت بہتر ہو جائے گا۔ ایسا ہی ہوگا جیسے لوکل ٹیلی ویژن دیکھا جا رہا ہو۔ تو یہ ایک مسئلہ خدا تعالیٰ نے حل فرما دیا اور ایک اور مسئلہ بھی حل کے قریب پہنچ گیا ہے اور وہ ہے امریکہ کے لئے ٹیلی ویژن کا مستقل انتظام۔ عارضی طور پر ہندو پاکستان، ایشیا کے لئے تو ہم نے انتظام کر دیا تھا مگر امریکہ کے ساتھ سوائے جمعہ کے ایک گھنٹے کے تعلق کے باقی تعلق کٹ چکا ہے اور اس کے رستے میں بہت سی مشکلات تھیں جو تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن بہت سخت مشکلات حائل تھیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک ایسا انتظام کر دیا ہے جس کو ہم اب Finalise کر رہے ہیں۔ آخری مراحل پر ہے۔ آپ دعا کریں یہ مراحل بھی خیریت سے گزر جائیں تو اس انتظام میں امریکہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، مرکزی امریکہ، وسطی امریکہ یہ سارے پوری طرح کور Cover ہوں گے اور انشاء اللہ پہلے انتظام سے بہتر ہوگا اس سے کم تر نہیں ہوگا اور چوبیس گھنٹے کا انتظام ہوگا بجائے چند گھنٹے کے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ رمضان جماعت کے لئے بہت مبارک چڑھایا ہے خدا کرے کہ ہر اگلا دن بھی مبارک آئے اور سلم رمضان والی حدیث جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی تھی خدا کرے کہ ان معنوں میں بھی یہ رمضان ہمارے لئے ایسا سلامت گزرے کہ اس کے بعد ہر سال سلامت گزرتا چلا جائے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کامل وفاداری اور کامل سچائی کے ساتھ خدا کو بلانے والے ''الدَّاعِ'' حضرت محمد ﷺ تھے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 2 رفروری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٧﴾ (البقرۃ: 187)

پھر فرمایا:

رمضان کے تعلق میں اس آیت کی پہلے بھی کئی بار تلاوت کی جا چکی ہے۔ اس کے مضمون پر مختلف پہلوؤں سے جماعت کو متوجہ کر چکا ہوں۔ اب جب کہ رمضان تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور ہم اس کے دوسرے دہاکے یعنی عشرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ تو جب دوسرا عشرہ لگ جاتا ہے تو عموماً تجربہ یہی ہے کہ پھر تیزی سے رمضان آگے بڑھتا ہے جیسے ایک لٹو چل گیا ہو اور پندرہ دن آئے تو پھر آگے اعتکاف کے دن شروع ہو جائیں گے اور اعتکاف آیا اور گیا پتا نہیں چلتا کہ کب آیا اور کب نکل گیا، تو جو دن باقی ہیں اگرچہ بظاہر بارہ کے مقابل پر ابھی اٹھارہ دن باقی ہیں مگر چونکہ اب دنوں کی رفتار اور راتوں کی رفتار بہت تیز ہو چکی ہے اس لئے اب جو کچھ بھی کرنا ہے ابھی کر لیں، دن تھوڑے رہ گئے ہیں اور رمضان کے دن تو ویسے ہی اللہ نے فرمایا ہے أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (البقرۃ: 185) بڑی برکتوں والے ہیں اس پہلو سے أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مشکل ہے تو تھوڑے دن ہی ہے۔ اصل معنی اس کا یہ ہے کہ اتنے اچھے دن مگر کتنے تھوڑے ہیں۔ آئے اور نکل گئے۔ تو اس لئے جو کچھ بھی کمانا ہے اس عرصے میں کما لو جو محنت کرنی ہے کر لو اور اس حد تک کما لو کہ سارا سال کام آئے۔

پس اس پہلو سے زاد راہ لے کر آگے بڑھو یہ مضمون ہے جو میں آپ کے سامنے بڑی وضاحت کے ساتھ کھولنا چاہتا ہوں اور اس تعلق میں اس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے۔ وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ کہ جب میرے بندے تجھ سے یہ پوچھیں یا تجھ سے سوال کرتے ہیں میرے متعلق فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ میں تو قریب ہی ہوں أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وہ بھی تو میری باتیں مانیں وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ اور مجھ پر ایمان لائیں لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ تا کہ وہ ہدایت پا جائیں۔

سوال یہ ہے کہ لوگ آنحضرت ﷺ سے سوال کرتے تھے۔ اللہ فرماتا ہے میرے متعلق تجھ سے پوچھتے ہیں۔ اس حد تک تو بات درست اور سمجھ میں آنے والی ہے جس نے کوئی گھر دیکھا ہوا سی سے اس کا پتا پوچھا جاتا ہے، اسی سے اس کے رستے کی تلاش میں مدد مانگی جاتی ہے۔ جس نے کوئی گھر دیکھا ہی نہ ہو اس سے تو نہیں پوچھا جاتا۔ حضرت گوتم بدھ کے متعلق یہ آتا ہے کہ کچھ پنڈت ان کے پاس آئے جو ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے تھے جو تمام ہندوستان میں پنڈت پیدا کرنے کے لحاظ سے سب سے چوٹی کا گاؤں تھا اور انہوں نے حضرت گوتم بدھ سے کچھ سوالات کئے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت گوتم بدھ کے متعلق جیسا کہ عام انبیاءؑ کے متعلق یہی طریق ہوتا ہے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ دہریہ ہیں، بے دین ہیں، خداؤں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ پس اس خیال سے ان کو دلچسپی پیدا ہوئی کہ ان سے انہوں نے سوال کیا۔ تو بہت ہی پر حکمت جواب دیا۔ انہوں نے کہا تم کس گاؤں سے آئے ہو۔ فلاں گاؤں سے، اس لئے اگر کوئی شخص اس گاؤں جانا چاہے تو تم سے رستہ پوچھے گا، کسی اور سے تو نہیں پوچھے گا اور جو کسی گاؤں کا رہنے والا نہ ہو، جس نے کبھی دیکھا تک نہ ہو اس سے کون رستہ پوچھا کرتا ہے۔ تو وہ بات سمجھے۔ انہوں نے کہا پھر تم مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو۔ مراد یہ تھی کہ خدا کی باتیں مجھ سے پوچھتے ہو جس پر الزام یہ ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہیں ہے۔ مگر پھر کہا تم لوگوں کو تو اپنے گاؤں کا بھی نہیں پتا۔ تمہارے پنڈتوں کو بھی اس کا رستہ نہیں آتا۔ میں اس ملک کا رہنے والا ہوں جو خدا کا ملک ہے۔ میں اس ملک کا باشندہ ہوں جو بقا کا ملک ہے۔ میں وہاں کی بھی خبر جانتا ہوں اور یہاں کی بھی جانتا ہوں اس لئے جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔ یہ بہت ہی پیارا گہرا کلام ہے قطعی طور پر

ثابت کرتا ہے کہ حضرت بدھ علیہ السلام خدا کے ایک پیارے پاکیزہ نبی اور خدا کی ہستی کے گہرے قائل بلکہ اس کے عرفان کے دعویدار تھے۔ تو اس لئے جو جس ملک کا ہو، جس جگہ کا باشندہ، جس ذات کے ساتھ گہرا تعلق ہو اس کے متعلق اسی سے پوچھا جائے گا۔ یہ پہلو تو ہرگز تعجب انگیز نہیں وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کہ اے محمد ﷺ جب یہ میرے بندے تجھ سے پوچھتے ہیں تو اس پہ تو کوئی اعتراض نہیں مگر وہ کہتا ہے میں قریب ہوں تو کیوں اس کو محسوس نہیں کر رہے؟ کیوں اس کے قرب کا احساس نہیں پیدا کرتے؟ رستہ پوچھتے پھرتے ہیں وہ تو ٹھیک ہے پوچھتے بھی اس سے ہیں جو درست ہے اسی سے رستہ پوچھنا چاہئے تھا مگر وہ وجود جو ہر وقت ساتھ رہتا ہو اس کے متعلق پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے بلاتا ہے اور یہ جو دعوت ہے یہاں یہ عام دعوت مراد نہیں۔ ایسی دعوت جس میں گہری سچائی پائی جائے، جس میں اخلاص ہو، جس میں یقین ہو اس دعوت کا خدا جواب اس حد تک دیتا ہے کہ فرماتا ہے جب وہ لوگ جو کشتیوں میں سفر کرتے ہیں نرم خو ہواؤں میں چلتے ہیں یہاں تک کہ وہ ہوائیں بدل جاتی ہیں اس سے پہلے خدا کے قائل بھی نہیں ہوتے مگر اس وقت جب کہ موت سامنے کھڑی نظر آتی ہے جب ان کو غرقابی دکھائی دیتی ہے تو گھبرا کر پھر مجھے پکارتے ہیں میں پھر بھی ان کی سن لیتا ہوں، انہیں بچا لیتا ہوں۔ جانتے ہوئے کہ جب وہ ساحل کے امن تک پہنچ جائیں گے تو وہ اس وقت پھر اسی شرک میں مبتلا ہو جائیں گے جو پہلے کیا کرتے تھے۔ تو خدا تعالیٰ کا سننا ایک قطعی ثابت شدہ حقیقت ہے یہاں تک کہ دہریوں کی بھی سن لیتا ہے، مشرکوں کی بھی سن لیتا ہے اس سے زیادہ قریب اور کیا ہو سکتا ہے اور ہر موقع پر جب کہ بیچ میں کوئی اور راہ بتانے والا نہ ہو خدا وہاں موجود ہے۔ تو اس پہلو سے توجہ یہ دلائی گئی ہے کہ میں جو ہمیشہ قریب ہوں تم مجھے دور نہ رکھو۔ اتنا دور نہ رکھو کہ میرے متعلق تمہیں پوچھنا پڑے، پوچھتے پھرو کہ میں کہاں ہوں۔ پس ایسی ذات جو دور بھی ہے اور قریب بھی ہے تم چاہو تو اسے دور بھی بنا سکتے ہو، چاہو تو اسے قریب بھی سمجھ سکتے ہو، میرا وعدہ ہے کہ اگر تم مجھے قریب سمجھو گے تو میں قریب ہو کر تمہیں دکھائی دوں گا۔ تمہاری باتوں کا جواب دوں گا جیسے قریب بیٹھا شخص بولتا ہے تو آپ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسے بہت چیخنا نہیں پڑتا۔ اسی مضمون میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اپنے سفر کے اُن

ساتھیوں کو جو بہت اونچی آواز سے تسبیح کر رہے تھے فرمایا ذرا تحمل سے کرو، آرام سے بات کرو، جس خدا کو تم پکار رہے ہو وہ بہرہ تو نہیں ہے، وہ دور تو نہیں ہے، وہ سن رہا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات بلند آواز سے بھی آنحضرت ﷺ نے تکبیر کی اور تسبیح و تحمید میں بھی بلند آواز سے کام لیا۔ مگر مراد یہ تھی کہ بعض دفعہ انسان محض دکھاوے کے لئے، رسم و رواج کے طور پر، ایک مشغلہ بنا کر اونچی آوازیں کرتا ہے جو حضور اکرم ﷺ کو پسند نہیں تھی۔ اس لئے آنحضور ﷺ مومن کو ہمیشہ معنی خیز کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ بامعنی بات، سچی بات، دل کی گہرائی تک سچی ہو۔ اونچی آواز ہو تو وہ بھی ایک سچی وجہ سے اونچی آواز ہو۔ دھیمی آواز ہو تو وہ بھی ایک سچی وجہ سے دھیمی آواز ہو۔ مگر ضمناً یہ بھی تو بتایا کہ وہ تو ساتھ ہی ہے۔ تم دل میں بھی بات کرو گے تو وہ ضرور سن لے گا اور وہ جانتا ہے، ہر بات پر نظر رکھتا ہے۔ پس فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کا یہ معنی ہے اور جو اتنا قریب ہو اس کا قرب محسوس ہو اس کے متعلق یہ نہیں پوچھا جائے گا وہ ہے کہ نہیں ہے، وہ کہاں ہے، پس یہ سوال ناجائز ہیں۔ یہ پہلو جائز ہے کہ آپ جانتے ہیں اس کے رستے کو ہمیں بھی وہ طریقے دکھائیں، ہمیں بھی وہ سکھائیں گُر جن پر چل کر، جنہیں استعمال کر کے ہم اللہ کے ان معنوں میں قریب ہو جائیں جن معنوں میں آپ ہیں اور اس پہلو سے قریب کا معنی یہ ہوگا اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ آپؐ کی دعائیں وہ سنتا ہے۔ آپؐ جب بھی اسے پکارتے ہیں وہ جواب دیتا ہے۔ ہم اپنی ذات پر فضل نازل ہوتے اس طرح نہیں دیکھ رہے۔ پس وہ خدا جو قریب ہے اور ہم نے جان لیا آپ کے وجود پر غور کر کے کہ یقیناً قریب ہے اس کا ہمیں تو بتائیں کہ کیسے اس تک پہنچنا ہے۔ یہ اس پہلو سے اور معنی بن جاتے ہیں۔

اس مضمون کے ایک پہلو سے دعوت عام ہے کہ ہر کوئی شخص مطمئن ہو جائے، تسلی پا جائے کہ اس کا خدا دور نہیں ہے۔ ہر وقت اس کے ساتھ ہے مگر اسے محسوس کرنا ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ دعوتوں کا جواب ویسا آنا چاہئے جیسا کہ تم چاہتے ہو تو تم نے ٹھیک پوچھا ہے محمد مصطفی ﷺ جانتے ہیں اور آپؐ ہی کی زندگی کا لحہ لحہ اس بات پر گواہ ہے کہ میں قریب ہوں۔

پس فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ان معنوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات کے حوالے سے یہ معنیٰ دے گا کہ ان کو بتاؤ مجھے دیکھتے نہیں مجھ سے جو پوچھ رہے ہو تمہیں پتا نہیں کہ خدا میرے کتنے قریب ہے، ہر وقت میری دعاؤں کو سنتا ہے، ہر پکار کا جواب دیتا ہے، پس اگر تم نے طریق پوچھنا ہے تو وہ

طریق یہ ہے فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِي اللہ مخاطب ہے مگر چونکہ سوال رسول اللہ ﷺ سے کیا گیا تھا اس لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک جواب دیا جارہا ہے اور گویا آپؐ کو یہ سکھایا جارہا ہے کہ تم یہی جواب دینا جو اصل اور حقیقی جواب ہے میں تو اتنا قریب ہوں کہ جب بندے سے مخاطب ہوتا ہوں تو بیچ سے سارے سلسلے اڑ جاتے ہیں اور کوئی بیچ میں نہیں رہتا۔ اس لئے یہ نہیں فرمایا کہ تو جواب دے۔ فرمایا میں قریب ہوں جواب خود ہی شروع کر دیا ہے اور اس مضمون میں اس کو آپ غور سے پڑھیں تو یہ ساری باتیں شامل ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ جس شخص سے تم نے پوچھا درست پوچھا ہے مگر تمہیں پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ خدا جو ہر وقت پاس رہتا ہے ہمیشہ قریب رہتا ہے اس کے متعلق یہ سوال نہیں پوچھا جا سکتا کہ وہ کہاں ہے۔ پس ابتدائی سوال کے لحاظ سے جس میں خدا کی ہستی کے متعلق سوال ہو، ہے بھی کہ نہیں؟ ہے تو کہاں ہے؟ کیسے مل سکتا ہے؟ اس کے جواب میں قریب کا یہ معنی بنے گا کہ تم عجیب لوگ ہو، میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہوں اور تم میرے متعلق پوچھتے پھر رہے ہو مگر جس سے پوچھا ہے وہ گواہ ہے اس بات کا کہ اِنِّيْ قَرِيْبٌ اور اس کی گواہی اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

یہاں ان معنوں میں دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں الدَّاعِ سے مراد آنحضرت ﷺ بن جاتے ہیں۔ سب سے بڑا، سب سے خلوص کے ساتھ اور پیار کے ساتھ، کامل وفاداری کے ساتھ اور کامل سچائی کے ساتھ خدا کو بلانے والا الدَّاعِ حضرت محمد ﷺ تھے اور اس لحاظ سے یہ معنی بالکل ٹھیک بیٹھتے ہیں کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ جس کے پاس تم آئے تھے اس کو دیکھو، قربت کے معنی کیا ہیں۔ وہ جب مجھے بلاتا ہے میں اس کا جواب دیتا ہوں فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِي اب دیکھیں وہ ضمیر سب انسانوں کی طرف پھیر دی ایک دعوت والے کا ذکر فرما کر فَلْيَسْتَجِيبُوْا پس اے میرے متلاشیو! تم میرا جواب دو۔ محمد رسول اللہ ﷺ مجھے اس لئے پیارے ہیں کہ میری ہر بات کا جواب لبیک کہتے ہوئے دیتے ہیں۔ ایک بھی میری منشاء نہیں ہے جسے انہوں نے پورا نہ کیا ہو۔ ان کا تو کامل وجود میری رضا کا مظہر بن چکا ہے، سر سے پاؤں تک میری رضا پر ان کی نظر ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام:163) اے محمد ﷺ! تو اعلان کر دے، بتا دے کہ تو میرے کتنے قریب ہے یعنی بندے کا بھی تو قریب ہونا ضروری ہے۔ وہ قرب یہ ہے کہ اِنَّ صَلَاتِيْ

وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ میری تو نمازیں، میری عبادتیں، میری قربانیاں، میرا تو جینا مرنا کلیۃً خدا کا ہو چکا ہے۔ پس فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ کا یہ معنی ہے، اس طرح میری باتوں کا وہ جواب دیں جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ میری باتوں کا جواب دیتے ہیں اور انہی سے تم پوچھ رہے ہو، انہی کا حوالہ ہے کہ ان سے سیکھو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ دوسری شرط لگائی ہے یہ ایمان ہے، محض فرضی ایمان کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ پس وہ مجھ پر حقیقی معنوں میں ایمان لائیں۔

اب اس مضمون کا فَلْيَسْتَجِيْبُوْا کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بارہا اس پر روشنی ڈالی ہے اور بڑی اہمیت دی ہے اس بات کو کہ تم اپنے ایمان کو پرکھتے رہا کرو۔ اگر ایمان ہو تو استجابت یعنی خدا کی باتوں کے جواب میں لبیک کہنا ایک طبعی نتیجہ ہے اس کے لئے کسی منطق کی ضرورت نہیں، زور لگانے کی ضرورت نہیں، وہ از خود قاعدے کی طرح خود بخود ایک نتیجہ پیدا کرے گا اور وہ ہے خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے تم تو جانوروں پر بھی زیادہ ایمان لاتے ہو اس کے مقابل پر جتنا خدا پر لاتے ہو۔ فرمایا سانپ کا بل ہو اور اس میں سانپ تمہارے سامنے داخل ہوا ہو کبھی جرأت ہوگی کہ اس میں انگلی ڈالو؟ یا زہر کے متعلق معلوم ہو کہ یہ زہر ہے اور زہر قاتل ہے اور اٹھو اور جس طرح میٹھے کی ایک مٹھی بھر کے بعض دفعہ منہ میں ڈال لیتے ہو اور اس کو پکڑو مٹھی بھرو اور منہ میں ڈال لو کیا یہ ممکن ہے؟ ہر گز نہیں کیونکہ تمہارا ایمان سچا ہے۔ پس جب ایمان سچا ہو تو جس ذات پر ایمان ہے اس کے تقاضے کوشش سے نہیں بلکہ بے اختیاری سے پورے ہوتے ہیں۔ انسان چاہے بھی تو سانپ کے سوراخ میں انگلی نہیں ڈال سکتا۔ اگر زبردستی اس کی انگلی پکڑ کے ڈالنے کی کوشش کی جائے تو بہت زور لگائے گا، بہت جھگڑا کرے گا۔ ناممکن ہے کہ جب تک اس کے اندر طاقت ہو وہ آخری وقت تک اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے یہاں تک کہ بے اختیار ہو کر نڈھال ہو کر جا پڑے۔

یہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے بڑی وضاحت کے ساتھ کھولا ہے۔ تو استجابت اور ایمان کا یہ تعلق ہے جو اس آیت میں بیان ہو رہا ہے۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ حالانکہ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایمان پہلے آیا ہے پھر استجابت ہے اور ہے یہی بات۔ مگر استجابت کا دعویٰ دائر کرنے والوں کے لئے خدا کو ڈھونڈنے میں سچے لوگوں کی علامت کے

طور پر یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ جو واقعۃً خدا کی طلب میں سچے ہوتے ہیں وہ اپنے اعمال سے پہچانے جاتے ہیں اور وہ اعمال گواہی دیتے ہیں کہ وہ ایمان لا رہے ہیں ورنہ محض ایمان گواہی نہیں دیا کرتا کہ کس کے اعمال سچے ہیں۔ ایمان سچا ہو تو وہ اندر کی بات کیا ہے پتا کیسا ہے لیکن جو اعمال اس ایمان کے نتیجہ میں ظہور میں آتے ہیں وہ تو سب دنیا کو دکھائی دیتے ہیں۔ تو لاکھ انسان دعویٰ کرے کہ میں خدا کی تلاش میں سچا ہوں لاکھ یہ کہے کہ میں مومن ہوں، ایمان دار ہوں جب تک اعمال کی گواہی ساتھ نہ ہو اس وقت تک اس کے ایمان کی سچائی کے اوپر کوئی دلیل نہیں ہے۔

تو اگر یہ معنی اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کے آنحضرت ﷺ کے حوالے سے کئے جائیں کہ میں دیکھو الدَّاعِ کی اس بلانے والے کی آواز کا ہمیشہ جواب دیتا ہوں جس کی طرف تم آئے ہو۔ تو پھر دوسرے معنے اس کے یہی بنیں گے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ پس تم جس طرح یہ میرے لئے ہر بات پہ لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور گردن جھکا دیتا ہے تم بھی ویسا ہی کرو۔ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ تب تم حقیقت میں ایمان والے کہلا سکتے ہو۔ پھر تم جو ایمان لاؤ گے وہ مقبول ایمان ہوگا۔ یہ باتیں ان کو سمجھا دے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ تا کہ وہ عقل کریں وہ سمجھیں کہ سچائی کی حقیقت کیا ہے۔

پس اس پہلو سے رمضان کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں اور یہاں جس خدا کا ذکر ہے کہ میں قریب ہوں میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ رمضان میں یہ قریب تر آجاتا ہے۔ پس یہاں قریب کا ایک اور معنی بھی ہے کہ اگر چہ ہمیشہ قریب ہوں مگر بعض دن قربت کے دن ہوتے ہیں، بعض وصال کے دن آجایا کرتے ہیں ، وصال کے موسم ہوتے ہیں، بہار کے بھی موسم ہوتے ہیں، خزاں کے بھی موسم ہوتے ہیں۔ پس فرمایا کہ یہ موسم میرے ملنے کا موسم ہے یہ وہ موسم آیا ہے جب میں قریب ہوں۔ پس اس قرب کے دور میں جو زادراہ آپ نے کمانا ہے وہ خدا خود ہے کیونکہ اگر خدا کما لیں گے تو سارا سال وہ آپ کا بنا رہے گا اور گزشتہ سال کی نسبت سارا سال آپ کو زیادہ قریب محسوس ہوگا اور یہ قرب جو ہے یہ کسی ایک مقام کا نام نہیں بلکہ ہمیشہ ایک بڑھتے رہنے والے متحرک مقام کا نام ہے جسے ایک جگہ قرار نہیں ہے، آگے بڑھ رہا ہے۔ پس قربت کا مضمون لامتناہی ہے۔

فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ سے مراد یہ ہے کہ میں ہمیشہ قریب رہوں گا لیکن جب تم استجابت کرو گے، میری باتوں کا جواب دو گے تو ایک اور ایمان تمہارے اندر پیدا ہو گا اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اس اور ایمان کے مضمون کو بھی بڑی شان اور وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں انسان کو پتا نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہے کہ میرے تعلقات کسی سے درست ہیں مگر جب حقیقت میں درست ہوتے ہیں تو ان تعلقات میں سے ایک اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ تعلقات ایک اور شان کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ جو خواب میں سوتے ہوئے سمجھ رہا ہے کہ میں جاگا ہوا ہوں اس کو بھی تو ایک ہوش ہے مگر جب جاگنے کے بعد اسے ہوش آتی ہے تو وہ اور ہی قسم کی ہوش ہوتی ہے لیکن جہاں تک خدا کا تعلق ہے ہم ہمیشہ ہی سوئے رہیں گے اور ہمیشہ ہی جاگتے رہیں گے اور ہمارا جاگنا ایسا ہی ہو گا جیسے خواب کے اندر سلسلہ بہ سلسلہ ہم جاگتے چلے جارہے ہیں اور وہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔

پس خدا تعالیٰ کا تصور، اس کا عرفان، اس کے قریب ہونے سے پیدا ہوتا ہے اور جتنا عرفان بڑھتا ہے اتنا وہ قریب ہوتا ہے۔ جتنا عرفان بڑھتا ہے اتنا ہی حقیقت میں ایمان بڑھتا ہے کیونکہ عرفان اور ایمان کا آپس میں گہرا جوڑ ہے۔ یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ الگ الگ کی بھی جاتیں ہیں مگر در حقیقت الگ ہونی نہیں چاہئیں کیونکہ ایک چیز جس کی صفات کا آپ کو علم نہ ہو اس پر ایمان بھی ہو تو وہ کافی نہیں ہے۔ ایک جنگل کا پھل آپ دیکھتے ہیں بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے اور خوشبو بھی اچھی ہے، دل چاہتا ہے آپ توڑ کر اسے کھائیں ایمان تو ہے کہ یہ پھل ہے، خوبصورت بھی ہے لیکن یہ پتا نہیں کہ وہ کڑوا کیوں ہے، کسیلا ہے یا میٹھا ہونے کے باوجود بھی زہریلا ہے۔ یہ جو دوسرا پہلو ہے اس کو عرفان کہتے ہیں۔ یہ علم ہی کی ایک قسم ہے لیکن وہ علم جو آہستہ آہستہ گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے اسے عرفان کہا جاتا ہے ورنہ حقیقت میں علم ہی کی شاخیں ہیں سب۔ تو علم کے بغیر اور عرفان کے بغیر خدا تعالیٰ پر ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ اس سے انسان پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پس فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ میں یہ دوسرا ایمان یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ وہ میری باتوں کا جواب دیں گے تو ایک اور ایمان ان کو نصیب ہو گا میں نسبتاً زیادہ قریب آؤں گا اور یہ قربت جو ہے یہ نہ ختم ہونے والی ہے۔ بعض دوریاں بھی نہ ختم ہونے والی ہوتی ہیں۔ بعض قربتیں بھی نہ ختم ہونے والی ہوتی ہیں۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے انسان کو بھی یہ تجربے ایک دوسرے سے تعلقات میں ہوتے رہتے

ہیں ۔ بعض لوگوں کا قرب دکھائی دیتا ہے کہ بہت قریب ہیں لیکن پھر بھی اس ذات میں اور قرب چاہنے والے کے درمیان ایک فاصلہ رہتا ہے اور جوں جوں وہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے ہیں ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ کسی انسان کی کتنی گہرائی ہے ، جتنی طبیعت میں گہرائی ہوگی اتنا قرب رفتہ رفتہ ملے گا اور بیک وقت یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے فلاں شخص کا قرب نصیب ہو گیا ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے وہ قریب تر ہوتے ہوئے بھی تو اتنا دور ہے کہ اس کے متعلق لوگ پوچھتے پھرتے ہیں ۔ اس سے صاف پتا چلا کہ قریب سے مراد کوئی ایک ایسا مقام نہیں ہے جو حاصل ہو گیا ، آپ نے پکڑ لیا اور قریب چیز ہاتھ آ گئی ۔

قرب کی اتنی منازل ہیں کہ قریب ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتا ، سنائی نہیں دیتا ۔ اس کا شعور پیدا نہیں ہوتا اس پر ایمان نہیں آتا اور قریب پھر بھی ہے ۔ جب شعور پیدا ہوتا ہے تو ایمان بڑھنے لگتا ہے وہ حقیقت میں کچھ اور قریب ہونے لگتا ہے اور یہ قرب ایسا نہیں کہ چیز چیز سے ٹکرا گئی اور بات ختم ہوگئی ۔ یہ قرب ایسا ہے جو لامتناہی سفر ہے کبھی نہ ختم ہونے والا اور اسی لئے **سیر فی اللّٰہ** کا مضمون قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے ۔ تو ایک سیر ہے جو کسی جگہ پہنچ کر اس کو دیکھا جاتا ہے اس کا نظارہ کیا جاتا ہے ۔ ایک سیر ہے جو ڈوب کر ہوتی ہے ۔ تو **سیر فی اللّٰہ** کا جو محاورہ ہے اس میں یہی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ڈوب کر اس سے زیادہ قریب تو ہو نہیں سکتے کہ کسی کی ذات میں ڈوب جاؤ مگر وہاں پہنچ کر اتنے قرب کے بعد تمہیں یہ سمجھ آئے گی کہ منزل آ نہیں گئی ، منزل کی طرف سفر شروع ہوا ہے اور یہ وہ سفر ہے جو غیر متناہی سفر ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے کیونکہ غرق ہونے کے بعد ، ایک ایسی ذات میں غرق ہونے کے بعد جس کی کوئی اتھاہ نہیں ، جس کی کوئی آخری حد نہیں ہے ، کوئی نیچے ایسی چٹان نہیں کہ پہنچ کے آپ کہہ دیں کہ یہ اس کی آخری حد تھی بلکہ اس کی گہرائی لامحدود ہے کوئی مقام نہیں جہاں پہنچ کے پاؤں لگ سکیں انسان کے ۔

پس اس پہلو سے قریب کے معنی جو ہیں وہ یہ ہوں گے کہ وہ جب میری باتوں کا جواب دیں گے تو اس کا مجھ پر ایمان ہمیشہ بڑھتا رہے گا اور ایمان بڑھنا یہاں ان معنوں میں ہے کہ عرفان بڑھتا رہے گا ۔ ایمان بڑھنا یہاں ان معنوں میں ہے کہ میری ذات کا علم ان کو ایسا نصیب ہوگا کہ ہر دفعہ وہ کہیں گے ، ہیں ! یہ خدا تھا ، ہم تو دھوکے میں رہے ، ہم تو کچھ اور سمجھتے رہے لیکن اللہ یہ بھی

ہے اور یہ بھی ہے اور یہ بھی ہے اور یہ بھی ہے۔ایک ایسی خوبصورت وادی کا سفر جو نہ ختم ہونے والی ہو ہر موڑ پر ایک نیا حسن دکھائے اس سفر کی طرف اشارہ ہے وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ استجابت کریں ۔میری باتیں مان کے تو دیکھیں ان کو پتا تو لگے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ مجھ پر ایمان لائیں گے اور وہ ایمان جو ہے وہ نہ ختم ہونے والا ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن:30) پھر وہ مجھے دیکھیں گے کہ میری تو ہر دن ہر لمحہ جوان پر گزرتا ہے شان بدلتی چلی جا رہی ہے۔ایک شان کے ساتھ میں آج ان پر طلوع ہوا ہوں،ایک نئی شان کے ساتھ کل طلوع ہوں گا۔ جب ہر لمحہ شان بدلے گی تو علم کامل ہو ہی نہیں سکتا مگر علم صحیح رخ پر رواں ہوسکتا ہے اس سے زیادہ انسان کو کوئی طاقت نہیں اس سے زیادہ وہ کچھ حاصل نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ کے عرفان یا اس کے علم کے سفر میں انسان غرق ہو جائے اور آگے بڑھتا چلا جائے یہاں تک کہ وہ خود راہنمائی کر کے ہاتھ پکڑ کر پھر اپنی طرف لے کر جائے۔

اب یہ عجیب بات لگتی ہے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف لے جانا مگر قران کریم یہی فرماتا ہے آنحضرت ﷺ کے روحانی سفر کے متعلق اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (بنی اسرائیل:2) اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کا گویا ہاتھ پکڑا، ہاتھ پکڑ کر وہ ایک سفر پر ساتھ روانہ ہوا جو خدا کی طرف کا سفر تھا۔تو ظاہر بات ہے کہ اس میں جسمانی سفر مراد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کوئی شخص کسی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے وہ اپنی طرف اس کو روانہ کر ہی نہیں سکتا۔مگر اگر لامحدود ذات ہو اور اس کی ذات کے اندر کا سفر ہو تو وہ ہاتھ پکڑنے والا جہاں ہاتھ پکڑتا ہے وہاں بھی ہے اور اپنی جن گہرائیوں کی طرف لے کر جا رہا ہے وہاں بھی ہے۔پس وہ ہاتھ پکڑتا ہے اور اپنی ذات کے اندر کا ایک ایسا سفر شروع کرواتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔پس ان معنوں میں وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کے مضمون کو آپ سمجھیں تو فرمایا لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ یہ حقیقت لوگ سمجھ جائیں تو پھر وہ ہدایت پا جائیں گے۔ہوسکتا ہے وہ ہدایت پا جائیں لَعَلَّهُمْ ان کے لئے امکان پیدا ہوگا۔

پس اس رمضان مبارک میں یہ مزے چکھیں تو پھر آپ کو سمجھ آئے گی کہ عبادتوں کا کیا مقصود ہے؟ بھوکا رہنا کیوں ہے؟ ورنہ خالی بھوکا رکھنے سے اور تکلیف دینے سے تو خدا کو کوئی مزہ نہیں

آتا۔ وہ تو رزاق ہے وہ تو جب اپنے بھوکے بندے کو کھانا کھاتے دیکھتا ہے تو جولذّت بھی خدا کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے وہ محسوس فرماتا ہے یہاں تک کہ لوگوں سے قیامت کے دن سوال کرے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کیوں نہ کھلایا۔ گویا ایسی لذّت محسوس کرتا ہے گویا بھوکا کھاتے وقت محسوس کر رہا ہو۔ ہم تو ہر بھوکے کی ذات میں ڈوب کر اس کی بھوک کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے ،اس بھوک کے مٹنے پر اس کی لذّت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مگر وہ ذات جو ہر جگہ ہے، ہر کنہ سے واقف ہے وہ جانتی ہے کہ بھوک کیا تھی۔ وہ ذات جانتی ہے کہ بھوک مٹنے پر جو لطف آیا ہے یا سکون نصیب ہوا ہے وہ کیا چیز ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی جہاں اس حد تک باریک نظر ہو اپنے بندوں پر کہ ان کی بھوک بن جائے ،ان کی سحری خدا کی سحری ہو جائے اس ذات کے متعلق یہ کہنا کہ ہم نے اسے حاصل کر لیا ہم جان گئے ہیں یہ درست نہیں ہے۔ یہ تو تجربہ ہو گا تو پتا چلے گا، رفتہ رفتہ اس میں سفر ہو گا۔

پس رمضان کے مہینہ میں وہ آپ کو بھوکا رکھنے سے کیا مزے اٹھا سکتا ہے جو خود بتا رہا ہے کہ میں تو تمہاری بھوک مٹا کے لطف اٹھاتا ہوں۔ آپ کو پیاسا رکھ کے وہ کیسے مزے اڑا سکتا ہے جب کہ وہ خود کہتا ہے کہ میں پیاسے کی پیاس بجھاتا ہوں، ننگے کو کپڑے دیتا ہوں ،جس کی چھت نہیں ہے اس کے لئے چھت کا سامان کرتا ہوں اور جو ایسا کرتا ہے وہ گویا میری خاطر ایسا کرتا ہے، مجھے دیتا ہے۔ پس یہ معنے ہیں بھوک اور تکلیف کے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بنی نوع انسان کی تکلیفوں کو سمجھتا ہے اور جس حد تک سمجھتا ہے اس حد تک کوئی اور ذات سمجھ نہیں سکتی۔ تکلیفوں کے دور ہونے کا لطف جو خدا کو علم ہے دنیا میں کسی اور ذات کو علم نہیں تو ہمیں بھی اپنے عرفان کی خاطر ان باتوں میں سے گزارتا ہے اور عرفان الٰہی کا ایک یہ بھی مضمون ہے کہ جیسے خدا اپنے بندوں کے حال پر گہری نظر رکھتا ہے ان کی بھوک پر بھی نظر رکھتا ہے، ان کی پیاس پر بھی، ان کی غربت پر بھی، ان کی بھوک مٹنے کے لطف بھی جانتا ہے، پیاس بجھنے کے لطف بھی جانتا ہے، غربت سے امیری کی طرف سفر کی جولذّتیں ہیں ان سے بھی آشنا ہے، اس خدا کی طرف تم نے حرکت کرنی ہے تو وہ طریق اختیار کرو۔ اس لئے جو بھوک ہے وہ خدا تعالیٰ کے مزید عرفان کی خاطر ہے اور ہمیں وہ عرفان اپنی ذات کے حوالے سے دیا جا رہا ہے ورنہ خدا کو ہم بذات خود پہچان سکتے ہی نہیں کیونکہ وہ ذات ہی الگ ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ:12) اس جیسی تو کوئی ذات ہے ہی نہیں۔ پس خدا کے سکھانے کے

ڈھنگ بھی دیکھیں کتنے پیارے ہیں۔ ہمیں ہمارے حوالوں سے سکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ دیکھو جب تم بھوکے رہو گے تو اس بھوک کے نتیجہ میں تمہیں اپنے بھائی کی تکلیف کا احساس ہوگا اور یہ اس وقت تمہیں یاد آنا چاہئے کہ خدا کو احساس ہے اور وہ بھوک، بھوک کی خاطر نہیں ڈالتا بلکہ اس سے اور بہت سے عظیم مقاصد ہیں جو حاصل ہوتے ہیں اور بھوک اور تکلیف کے نتیجہ میں اگر وہ خدا کی خاطر برداشت کی جائیں تو اللہ کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے اور انسان ان ذرائع سے اپنے آپ کو مزید چمکاتا ہے، اس اہل بنا دیتا ہے کہ وہ خدا کا قرب حاصل کر سکے۔

پس جب رمضان شریف میں ایک انسان کسی غریب بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے اور اس کی لذّت محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بھوک کیا ہے۔ پہلے بھی جانتا تھا مگر پہلے علم اور تھا اور اب ایک لمبا روزہ رکھا ہے اس نے اب جو وہ بھوک کو پہچاننے لگا ہے ویسا پہلے نہیں پہچانتا تھا پھر وہ کسی کو کھلاتا ہے اور خدا کی خاطر کھلاتا ہے۔ تو خدا نے جو بھوک کی تکلیف کا ذکر فرمایا کہ میں محسوس کر رہا تھا اور بھوک مٹنے کی خوشی کا اظہار فرمایا بعض لوگوں سے کہے گا تم نے مجھے کھانا کھلایا تھا جب میں بھوکا تھا تو یہ مراد ہے۔ یہ دونوں تجربے آپ رمضان میں دیکھیں کس شان اور صفائی کے ساتھ اور کس گہرائی کے ساتھ حاصل ہو سکتے ہیں۔

لیکن اگر یہ نہ ہو بلکہ افطاریاں کرانا ایک رسم بن جائے اور نام ونمود کا ذریعہ ہو جائے تو یہ رمضان بالکل فضول، خالی خالی چلا جائے گا۔ نہ آپ کو اللہ کا عرفان نصیب ہوگا، نہ اس کے وہ فوائد ملیں گے نہ اس کے نتیجہ میں قرب الٰہی کا احساس پیدا ہوگا کیونکہ رمضان کمانا ہے تو اس طرح کمائیں جیسے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے کمایا اور آپؐ سے بڑھ کر قربت کسی نے کمائی نہیں۔ اگر چہ یہ بھی خدا کا فضل ہی تھا جو آپؐ کو عطا ہوا۔ مگر قربت کمانے کے بھی تو کچھ راز ہوا کرتے ہیں، کچھ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے تو قربت نہیں کمائی جاتی۔ آپ سمجھتے ہیں حسن ایسی چیز ہے جس میں کوئی محنت نہیں ازخود اس کے نتیجہ میں ایک شخص دوسروں کو قریب کر لیتا ہے مگر روحانی حسن کمانے پڑتے ہیں۔ یہ یاد رکھیں خَلق اور خُلق میں ایک نمایاں فرق ہے۔ خلق تو وہ تحفہ ہے جو آپ کو بنا بنایا نصیب ہو گیا اور خلق میں سے ہر خلق کی قیمت دینی پڑتی ہے۔ پس باوجود اس کے کہ بعض لوگ اعلیٰ اخلاق کی صلاحیتیں لے کے پیدا ہوتے ہیں مگر یہ خیال غلط ہے کہ ان کے خلق کی ان کو قیمت نہیں دینی پڑتی۔ ہر

خلق کے بدلے کوئی قربانی کرتے ہیں اور خلق نام ہے مسلسل قربانی کا۔ مسلسل ایثار کے بغیر آپ کو خلق کا معنٰی سمجھ آ ہی نہیں سکتا۔ ایک آدمی کسی ناپسندیدہ بات کو دیکھتا ہے اگر بے اختیار اس کا ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے، گالی منہ سے نکلتی ہے، مشتعل ہو جاتا ہے، کبھی ہاتھ اٹھا بیٹھتا ہے، کبھی کسی اور ایسے طریق پر اس کو ذلیل اور رسوا کرتا ہے کہ اس کے دل سے اس کی بھڑاس نکل جائے اس کو خلق تو نہیں کہتے۔ یہ تو بنیادی بہمیت ہے۔ وہ فطرت ہے جو Raw حالت میں ہے جو اپنی کچی حالت میں ہے۔ خلق کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے۔ ایسا شخص جب برداشت کرتا ہے تو بسا اوقات دیکھنے والے کو پتا ہی نہیں کہ اس کے دل پہ بھی تو کچھ گزر رہی ہے یہ بھی محسوس کر رہا ہے، محسوس ہونے کے باوجود برداشت کرتا ہے۔ تو دیکھیں ایک دیکھنے والے کے نزدیک تو کوئی آواز ہی نہیں آئی، چپ کر کے ایک آدمی بیٹھا رہا ہے کہتے ہیں یہ بڑا خلیق ہے اس نے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا مگر اس مظاہرے کے دوران اندر اس کے کیا کیفیت تھی یہ آپ کو کیا پتہ لگ سکتا ہے۔

خلق میں اگر آپ تفصیل سے غور کریں گے اپنے تجربات پر غور کریں گے تو لازماً آپ کو دکھائی دے گا کہ ہر خلق کے اندر ایک مشقت اور محنت ہے اور بغیر محنت کے خلق کمائے نہیں جاتے۔ پس یہ کہہ دینا کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں زیادہ بخشی تھیں اس لئے آپؐ نے تو اوپر آنا ہی تھا۔ جتنی صلاحیتیں آپ کو بخشی ہیں آپ نے استعمال کر لی ہیں؟ کیا اپنی استعداد کے مطابق آپ خلیق ہو گئے ہیں ان معنوں میں کہ آپ کو جو استعدادیں ملیں تھیں آپ نے ان کو اس طرح زیر نگین کر لیا اور ہر لمحہ اپنے جذبات کے حوالے سے آپ نے قربانیاں دے دے کر اپنے آپ کو چمکایا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر تو ٹھیک ہے کہ آپ کہیں جہاں تک ہم پہنچ سکتے تھے ہم پہنچ گئے ہیں جہاں تک محمد رسول اللہ ﷺ پہنچ سکتے تھے پہنچ گئے اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں، مگر یہ درست نہیں ہے۔ صرف یہ بات نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو وسیع تر اخلاق کی صلاحیتیں بخشی گئی تھیں بلکہ یہ بھی درست ہے کہ آپ اس کنارے تک پہنچے ہیں، اپنی حدود کے آخری کناروں کو چھوا ہے اور اس سفر کے لئے بے انتہا قربانیاں دی ہیں۔ ایک ایک لمحہ آپ کا خلق کماتے ہوئے گزرا ہے تب جا کے وہ معراج نصیب ہوا جس کو لوگ دیکھتے ہیں اور عش عش کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ پس ہر شخص کا اپنا بھی تو ایک معراج کا مقام ہے۔ ہر شخص کو جو صلاحیتیں بخشی گئی ہیں اُن کو اگر بروئے کار لائے، ان کا

حق ادا کرے، ان کا حساب دے سکتا ہو تو ہر شخص سے ایک خوبصورت وجود رونما ہوگا جو ایک خلق آخر کہلائے گا اور یہی خلق کمانا ہے۔ اس مضمون کو سمجھے بغیر آپ خلیق بن ہی نہیں سکتے، خلق کما ہی نہیں سکتے۔ پس صلاحیتیں سب کو بخشی گئی ہیں لیکن یہ مضمون ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ کہ خلق کمانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر اپنی رضا کی گردن اس کے سامنے جھکا دیں اور اس سے بہتر خلق کمانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جب رضائے باری تعالیٰ کی خاطر آپ ایک کام کرتے ہیں تو قطع نظر اس کے کہ آپ کو خلق کی تعریف آتی بھی ہے کہ نہیں آتی آپ خلیق ہورہے ہوں گے۔ دن بدن آپ زیادہ با اخلاق ہوتے چلے جائیں گے۔ پس اس کے لئے کسی علم کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے لطف کی بات جو اس آیت میں ہمیں سمجھائی گئی ہے کہ جس سے پوچھا ہے اس کی پھر ادائیں بھی تو سیکھو۔ یہ منہ سے کہہ دینا تو آسان ہے کہ قرب الٰہی، خدا ہر جگہ ہے ہم ہر وقت خدا کے قریب ہیں تو اب جس سے پوچھ بیٹھے ہو اب اس کی ادائیں بھی دیکھنی ہوں گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قریب ہے تو کن معنوں میں قریب ہے۔ ان معنوں میں قریب ہے کہ ہمہ وقت، ہر لمحہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو رہا ہے ایک لمحہ بھی جدائی کا نصیب نہیں ہوا اور اس لئے ہوا ہے کہ ہر لمحہ حضرت محمد ﷺ نے استجابت سے کام لیا ہے یعنی خدا کی باتوں پر ''لبیک اللھم لبیک'' کہا ہے۔ اپنے سارے وجود کو ایک سواری جس طرح اپنے آپ کو سوار کے حضور پیش کرتی ہے آپؐ نے اللہ کی رضا کو اپنی جان پر سوار کرلیا اور اس سواری کے خوب حق ادا کئے۔ یہ کرو گے تو پھر وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ پھر تمہیں ایک عجیب ایمان نصیب ہوگا۔ ایک ایسا عرفان نصیب ہوگا کہ اس وقت تم کہو گے کہ ہیں، ہیں! ہم تو یونہی سوئے ہوئے تھے۔ جاگے تھے تو خواب ہی میں جاگے تھے، اب پتا چلا ہے کہ خدا ہے کیا؟ اب سمجھے ہیں کہ قرب اس کو کہتے ہیں۔

پس قرب کی خاطر اس مہینہ میں جب خدا قریب تر آیا ہوا ہے یعنی ہماری پہنچ کے نزدیک ہے اب اسے ایسا پکڑ لیں کہ پھر وہ سارا سال اس سے پیچھے نہ ہٹ سکے۔ یہ وہ بات ہے جس کی طرف میں آپ کو خصوصیت سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اگلا جمعہ جو آئے گا اس وقت تک رمضان اپنے نصف سے پلٹ کر دوسرے نصف کی طرف ڈھل چکا ہوگا اور اس سے اگلا جمعہ جو آئے گا تو عین ان راتوں میں آئے گا جب کہ سب کو لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی تلاش ہوتی ہے گہما گہمی ہوتی ہے، مسجدیں بھر جاتی ہیں وہ نمازی بھی جو

کبھی ویسے توفیق نہیں پاتے ، گھر میں بھی نماز پڑھنے کی توفیق نہیں پاتے وہ بھی مسجدوں کی طرف دوڑتے ہیں۔تو اس سے پہلے پہلے باتوں کو سمجھ لیں ورنہ افراتفری میں کچھ بھی کمائی نہیں ہوتی۔آپ سمجھ رہے ہوں گے بڑا مزہ آیا بڑا جوش وخروش ہے لیکن بعد میں جب حساب کریں گے تو ہاتھ پلے کچھ بھی نہیں ہوگا۔اس لئے ہاتھ پلے کچھ اگر رکھنا ہے تو خدا کو کمائیں اس طرح کمائیں کہ وہ قریب دکھائی دینے لگے اور ایسا قریب ہو کہ اس کی قربت کے اثرات آپ کی ذات میں ظاہر ہوں۔اگر وہ اثرات ظاہر نہیں ہوں گے تو وہ قریب نہیں ہے۔اگر وہ اثرات ظاہر نہیں ہوں گے تو آپ کا ایمان اسی طرح خالی ہے جیسے پہلے تھا۔

پس یہ تو اتنا واضح کھلا کھلا مضمون ہے کہ جیسے ایک دکاندار سارے دن کی محنت کے بعد رات کو بہی کھاتے لے کر بیٹھ جاتا ہے اور جمع تفریق کرتا ہے اور جانتا ہے کہ مجھے یہ فائدہ ہوا اور نقصان ہوا۔پس رمضان کے دوران ہر رات اپنا ایک بہی کھاتہ کھول لیا کریں اور غور کیا کریں کہ خدا کو آپ نے پایا بھی ہے کہ نہیں۔اس طرح کا پانا ایک فرضی بات ہے کہ اب میرا خدا ہو گیا بس چھٹی ہوگئی۔یہ پانا جو ہے انچ انچ ،لمحہ بہ لمحہ اس کی طرف بڑھنا اسے اپنانا ہوگا اور یہ اگر سفر آپ سیکھ لیں قرب کے یہ معنٰی آپ سمجھ جائیں ان معنوں کے مطابق اللہ کے قریب ہونا شروع ہوں تو اس رمضان کے آخر تک ہم یقین سے کہہ سکیں گے کہ اب خدا ہمارے اس سے زیادہ قریب ہے جتنا پچھلے سال رمضان کے آخر پر تھا اور یہ جو قرب ہے یہ پھر واپس نہیں ہوا کرتا۔نیکیاں اور نیکیوں کے جذبے بڑھتے بھی ہیں کم بھی ہو جاتے ہیں مگر قرب جس کی بات میں کہہ رہا ہوں اس میں کبھی کوئی کمی نہیں آتی۔وہ ایک دائمی حقیقت ہے اور اسی کا دوسرا نام روح القدس ہے۔روح القدس ایک زندہ حقیقت بھی ہے لیکن ہر انسان کو جو روح القدس نصیب ہوتی ہے وہ اس طریق پر نصیب ہوتی ہے کہ اس کا ساتھ دائمی ہوا کرتا ہے۔آنحضرت ﷺ نے بھی روح القدس کو اسی معنی میں سمجھا۔اسی معنی میں بیان فرمایا اور قرآن کریم نے اس مضمون کو خوب کھول دیا ہے کہ روح القدس ایک ایسی برکت ہے جو آکر پھر جایا نہیں کرتی۔کہیں قرآن کریم میں اشارۃً بھی یہ نہیں بیان فرمایا کہ روح القدس آکر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔وہ ساتھ رہنے والی حقیقت ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی روح القدس کو اسی معنی میں وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھا ہے کہ یہ تو ایک دائمی برکت ہے۔پس خدا تعالیٰ کا قرب ایسا جو آکر ٹھہر جائے ،ٹھہر ان معنوں میں نہ جائے کہ بڑھے نہیں بلکہ ان معنوں میں ٹھہر جائے

کہ آپ کے گھر کا ہو چکا ہو اور پھر آپ کو یہ خطرہ نہ ہو کہ یہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اتنا خدا آپ کما لیں کہ پھر جو مستقلاً آپ کا ضرور ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرب الٰہی تا کہ اتنے حصے پر تو جب بھی ہاتھ بڑھائیں آپ کا ہاتھ پڑ جائے، آپ دیکھ لیں ٹٹولیں کہ ہاں یہ ہے۔ پس یہ وہ معنٰی ہیں قرب کے جن معنوں کی طرف متوجہ کر کے میں آپ کو بقیہ رمضان میں دعاؤں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

اپنے لئے دعا کریں اور ہر روز یہ پہچان کرنے کی کوشش کریں کہ آپ نے خدا کو کس حد تک پایا ہے کہ نہیں پایا اور کیا اس حد تک پایا ہے کہ وہ آپ کا اپنایا گیا ہے اور اگر اس حد تک نہیں پایا تو پایا ہی نہیں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ کوئی یہ سمجھے میں نے خدا کو پایا تو تھا مگر وہ چھوٹ گیا، جاتا رہا کیونکہ خدا کی حقیقت ایک حسن ہے اور ایسا کامل حسن ہے کہ پھر اسے چھوڑا جا سکتا ہی نہیں۔ تو اس خدا کو پائیں جو حسن کامل ہے جو دور سے بھی دکھائی دیتا ہے اور غیروں کی نظروں سے بھی دکھائی دیتا ہے مگر قریب سے بھی دکھائی دیتا ہے اور اپنی نظر سے بھی دکھائی دیتا ہے اور اپنی نظر سے دکھائی دیتا ہے تو رگ جان سے بھی قریب تر ہو جاتا ہے۔ یہ معنی ہے قرب الٰہی کا جو پھر کبھی بے وفائی نہیں کرتا، کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ رگ جان سے قریب تر ہو گیا تو کیسے ممکن ہے کہ آپ زندہ رہیں اور وہ چھوڑ کر چلا جائے۔ رگ جان چھٹے گی تو پھر وہ خدا چھٹے گا اور رگ جان کا رشتہ کٹا تو موت واقع ہوگئی تو خدا تو اس سے بھی قریب تر ہے۔ پس یہ دوام ہے قرب الٰہی کا جس کی طرف اس آیت کریمہ میں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ خدا تمہارا ہوگا لیکن جب بھی ہوگا، جتنا بھی ہوگا، تب تمہارا ہوگا اگر وہ تمہارا ہو چکا ہو اور پھر کبھی تمہیں نہ چھوڑے یعنی تم پھر کبھی اس کو چھوڑ نہ سکو۔ چھوڑو تو تمہاری جان اس چھوڑنے میں جائے۔ یہ وہ مضمون ہے جس کو آپ سمجھ کر رمضان میں اپنی نگرانی کریں اور اپنی دعاؤں میں یہی باتیں مانگیں جس طرح ظفر نے کہا ہے:

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کئے لاکھ فریب کروڑ فسوں، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

تو دنیا کے محبوب تو ایسے بھی ہوتے ہیں، انسان چاہے بھی پیار ہو جائے، عشق ہو جائے واقعۃً یہ چاہتے ہوں کہ ''میری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں'' مگر جب (بہادر شاہ ظفر)

جاتے ہیں تو لاکھ فریب کریں، کروڑوں فسوں کریں ''نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا'' مگر خدا تو ایسا محبوب نہیں ہے۔ وہ تو جب آپ کا بنتا ہے جتنا بن جاتا ہے پھر ممکن ہی نہیں کہ وہ آپ کو چھوڑ کر چلا جائے ، آپ کے لئے بھی ممکن نہیں رہتا کہ اسے چھوڑ دیں اور یہ مضمون جو ہے یہ رفتہ رفتہ خدا کو پانے کے ساتھ بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ سارا خدا مل جائے۔ سارا خدا تو بندے کو مل سکتا ہی نہیں۔ سارے خدا کی طرف دائمی حرکت ہو سکتی ہے اور سارے خدا کی طرف دائمی حرکت کے لئے یہ شرط ہے کچھ تو ملے۔ کچھ تو ہاتھ میں ہو کہ جس کو آپ سمجھیں کہ ہاں یہ خدا تھا، خدا ہے یہ میرا ہو چکا ہے۔ یہ تعلق قائم ہو گا تو سفر شروع ہوگا۔ اگر قائم نہیں ہو گا تو لاکھ رمضان آئیں اور گزر جائیں آپ کو رمضان کے بعد یہی واویلا کرنا ہوگا ''نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا'' لگتا تھا کہ آیا ہے، لگتا تھا کہ ہمارے دل پہ بھی رونق کی ہوائیں چلی ہیں مگر وہ آئیں اور گزر گئیں اور دل کی ویرانی نہ گئی۔ خزاں خزاں ہی رہی اور بہار کے موسم میں تبدیل نہ ہوئی کیونکہ بہار کی علامتیں باقی نہیں دکھائی نہیں دے رہیں۔

پس خواہ تھوڑا کمائیں اتنا کمائیں جو واقعۃً خدا کا کمانا ہو اور جب خدا کمایا جائے گا تو فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا کی علامتیں آپ کی ذات میں بولنے لگیں گی۔ پھر آپ کا دعویٰ ایمان کا نہیں ہوگا، دنیا دیکھے گی کہ ہاں ان کی ذات میں ہمیں خدا کی استجابت کے نظارے دکھائی دے رہے ہیں، اس کی علامتیں ظاہر ہو گئیں ہیں۔ اس طرح اگر آپ کرتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ یہ رمضان ہمارا بہت ہی بابرکت رمضان گزرے گا۔

اس ضمن میں میں نے ایک مختصر سی بات کہی تھی اب پھر اسی کو یاد کرا کے اس خطبہ کو ختم کروں گا کہ افطاری کروانا اچھی بات ہے مگر افطاریوں میں جان ڈال دینا ان معنوں میں کہ خوراک کی باتیں ہوتی رہیں۔ کس نے زیادہ اچھا کھلایا، کس نے زیادہ اچھا پکایا یہ تو رمضان کے مضمون کے منافی ہے، سوشل فنکشن منا لینا اس حد تک کہ بعض جگہ اطلاعیں ملی ہیں کہ چندے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ افطاریاں کروائیں۔ کل کی بات میں نے فیکس پہ ان کو کہا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہرگز اجازت نہ دیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا جماعت کی طرف سے کر لیں۔ میں نے کہا جماعت کی طرف سے یہ بھی رمضان کا ایک حصہ ہے کبھی اکٹھا بیٹھنے سے ایک محبت بڑھتی ہے اگر جماعت اپنی طرف سے کرتی ہے تو کرے بے شک لیکن افطاریاں کروانے کو رسم بنا لینا اور اس کے لئے چندے اکٹھے کرنا اور جو پیسے

دے سکتا ہے وہ آئے، یہ بالکل ظلم ہے، رمضان کی روح کے بالکل منافی اور اس سے متصادم ہے۔

رمضان کی روح تو یہ ہے کہ آپ بھوکے رہتے ہیں، ان بھوکوں کی خاطر جن میں خدا آپ کا انتظار کر رہا ہے جن کی تکلیف میں خدا موجود ہے آپ وہاں پہنچیں گے تو خدا کو پہچانیں گے ان کی خدمت کریں۔ اصل افطاری وہ ہے کہ جب جہاں آپ کو بھوکوں کی تلاش ہو جہاں غریبوں کی جستجو ہو دیکھیں کہ کون کون ہیں جو دکھوں میں مبتلا ہیں، ان تک پہنچیں، ان کے دکھ دور کریں، وہ لذّت جو آپ محسوس کریں وہ لذّت خدا محسوس کر رہا ہوگا یہ ہیں وصل کے ذریعے۔ اس بھوک میں بھی آپ کو وصل نصیب ہوگا جو غیر کی، خدا کے بندے کی بھوک آپ کے دل میں مچل رہی ہوتی ہے۔ اس سحری میں بھی آپ کو خدا محسوس ہوگا جو سحری ایک خدا کے غریب بندے کی کروا کر آپ ایک لذّت محسوس کرتے ہیں تو قرب کے ذریعے ایسے بھی نہیں ہیں جو فرضی ہیں، وہ دکھائی دیتے ہیں اور ان غریبوں میں خدا کا قرب بھی تلاش کریں ان کے حقوق ادا کریں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ اپنے سینے کھولیں تو ان سینوں میں خدا ضرور بس جائے گا اور پھر ہمیشہ بس جائے گا۔

یہ بھی ایک تجربہ ہے جس کو غریب کی خدمت کی لذّت آ جائے ناممکن ہے کہ زندگی بھر پھر وہ لذّت اس کا ساتھ چھوڑ دے۔ یہ تو ایسا چسکا ہے جو جان کا حصہ بن جاتا ہے۔ کسی کا دکھ دور کرنا ایک ایسی لذّت ہے جو کسی اور جزا کو چاہتی ہی نہیں ہے۔ دکھ دور کرنا خود ایک لذّت ہے۔ تو فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ کا یہ معنٰی ہے۔ اس کو سمجھیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا قرب عطا فرمائے جو دوام رکھتا ہے جسے روح القدس کی برکت بھی کہا جاتا ہے۔

خطبہ ثانیہ سے قبل حضور انور نے فرمایا:۔

ابھی نماز جمعہ اور عصر کے بعد ایک بیعت ہوگی۔ عام طور پر تو یہ رواج نہیں ہے، مطلب ہے دستور نہیں ہے مگر روس سے ہمارے ایک دوست تشریف لائے ہوئے ہیں جن کا نام آذربائیجان ہے اور یہ ایک بہت بڑے آرٹسٹ ہیں اور اس ملک کے تھیٹرز ایسوسی ایشن کے صدر اور انٹرنیشنل کنفیڈریشن آف تھیٹرز ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں۔ گورباچوف کے زمانے میں سینٹ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ یہ احمدیت کی جستجو میں یہاں نہیں آئے تھے ان کے اپنے آرٹس کے کام تھے جن کی خاطر یہ یہاں تشریف لائے مگر چونکہ ان کا وہاں احمدیوں سے تعارف تھا انہوں نے ہمارا بھی حوالہ دیا۔ یہاں

آتے رہے درس میں شریک ہوتے رہے اور ہمیں دیکھتے رہے نمازیں پڑھتے ہوئے۔کل مجھے ملے ہیں تو مجھے کہا کہ میں پہلے مسلمانوں کو جو عام طور پہ دیکھا کرتا تھا اس سے مجھے کبھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی اسلام میں۔مگر میری خوش نصیبی ہے کہ رمضان کے مہینے میں میں یہاں آ گیا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں دیکھا ہے تو یہ عجیب پر کیف نظارہ ہے۔یہ اسلام ہے جو حقیقت میں لوگوں کو زندہ کرسکتا ہے۔یہ مختصر سی بات کی تھی اور جانے کے بعد پیغام ملا کہ میری خواہش ہے کہ میں جمعہ کی نماز کے بعد بیعت کروں۔تو اگر چہ عام طور پر اس وقت اتنا وقت نہیں ہوا کرتا مگر یہ چونکہ یہ ایک خاص موقع ہے اور بہت ہی معزز انسان اور پاکباز، پاک دل ہیں بالکل،کوئی لمبی بحثیں نہیں کیں،صرف دیکھا ہے، ہاں ایک اور بات بھی کی ہے انہوں نے کہ جو میرے گزشتہ مضامین چھپے ہیں روس کے متعلق یا ویڈیوز تیار ہوئی ہیں۔بیٹھ کے پورا دیکھتے بھی رہے ہیں۔اندر اندر ذہنی اور علمی تیاری بھی کی ہے مگر بحث کے طور پر نہیں بلکہ خود دیکھ کر تو اس وجہ سے ان کے احترام میں میں نے اجازت دے دی کہ جمعہ اور عصر کی نماز کے معاً بعد ان کی بیعت ہوگی اگر چہ یہ ٹیلی وائز نہیں ہوگی مگر لوگ چونکہ سن چکے ہیں اس لئے اپنے طور پر دعا میں شامل ہو جائیں۔

تمام تر مقصد رمضان کا خدا کا ملنا ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 9 رفروری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (البقرۃ: 184 تا 185)

فرمایا:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے جاتے رہے تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ گنتی کے چند دن ہیں یا چند دن جنہیں گنا جاتا ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ پس تم میں سے جو بھی کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں وہ یہ گنتی پوری کر لے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ اور وہ لوگ جو طاقت نہیں رکھتے یعنی روزے کی طاقت نہیں رکھتے ان پر مسکین کو کھانا کھلانا فدیہ ہے۔ یا وہ لوگ جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں ان کو فدیہ دینا چاہئے۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ پس اس پہلو سے جو طوعی نیکی، شوق سے نیکی کرنے والا ہو وہی اس کے لئے اچھا ہے یعنی نیکی میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہئے وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ اور اگر تم روزے رکھ سکو تو یہ بہتر ہے اگر تم اس کو جانتے کہ اس میں کیا فوائد ہیں۔

یہ آیت پہلے بھی میں نے رمضان ہی میں تلاوت کی تھی پہلے بھی اس کے متعلق کچھ باتیں

آپ کی خدمت میں عرض کی تھیں مگر قرآن کریم کے مضامین تو بے انتہا ہیں ہر آیت کو بار بار پڑھنے سے کچھ نئے مضامین سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔رمضان کے تعلق میں سب سے پہلے تو میں ’’گنتی کے چند دن‘‘ کی بات کرتا ہوں جیسا کہ میں نے کہا تھا ایک پہلو اس کا یہ ہے کہ تھوڑے دن ہی تو ہیں چند دن کی بات ہے اور یہ پہلو کمزوروں کے لئے ہے۔ وہ لوگ جو روزے کا خوف کھاتے ہیں جو روزے سے ڈرتے ہیں جن کو نیکیوں کی عادت نہیں جن کو خدا کی راہ میں قربانیاں دینے کی مشق نہیں ہے ان کے لئے یہ بات کیسے پیارے انداز سے ایک سہارا ہے۔ چند دن کی بات ہے کچھ کرلو، جو کچھ کر سکتے ہو کرلو اس سے تمہیں فائدہ پہنچے گا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کاش کہ تم جانتے، تمہیں پتا ہوتا کہ یہ چند دن کی قربانی تمہارے لئے کیسی دائمی برکتیں لے کے آئے گی۔

ایک دوسری بات مَّعْدُوْدٰتٍ میں یہ ہے کہ افسوس کہ یہ چند دن کی باتیں ہیں بہت پُر بہار موسم آنے والا ہے مگر وہ لوگ جن کو محبت ہو جن کو ہر بار رمضان سے گزرنے کے بعد ایسے روحانی تجربات ہوئے ہوں ایسے لطف انہوں نے اٹھائے ہوں تو وہ جب رمضان گزرنے لگتا ہے پھر حسرت سے دیکھتے ہوئے یہ کہتے ہیں چند دن کی باتیں تھیں جو گزر گئیں،سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی سال میں وہ کیوں انہی نیکیوں کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر بات کے موسم ہوا کرتے ہیں ۔ بہار کا بھی ایک موسم ہے،خزاں کا بھی ایک موسم ہے اور موسم پر انسان کو اختیار نہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ خزاں کا موسم ہو اور کچھ پودے پھول پھل رہے ہوں لیکن عمومی کیفیت یہی ہے کہ جہاں تک قاعدہ کلیہ کی بات ہے خزاں میں کم ہی سبزہ دیکھنے میں آتا ہے اور کم ہی پودے ہیں جنہیں خزاں موافق آجاتی ہے اور بہار میں بھی یہی صورت ہے کہ عمومی طور پر ہر چیز سرسبز و شاداب دکھائی دیتی ہے،سوکھے ہوئے درخت ہرے ہونے لگتے ہیں،شاخیں کونپلیں نکالتی ہیں اور رونق پھر دوبارہ لوٹ آتی ہے لیکن کچھ ایسے بھی سوکھے درخت ہیں جو بہار آنے پر بھی سوکھے رہ جاتے ہیں تو موسم کی بات ہے۔رمضان ایک موسم لے کے آتا ہے یہ موسم قرب الٰہی کا موسم ہے ۔ یہ موسم فضا تبدیل کر دیتا ہے کمزور بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور طاقتوروں کے اردگرد سہارے بن جاتے ہیں طاقتوروں کو اور آگے بڑھنے کی توفیق ملتی ہے۔تو موسم کے جھرمٹ میں جو چیزیں ہوتی ہیں وہ بے موسم میں چاہو بھی تو ہو نہیں سکتیں سوائے اس استثناء کے،سوائے ان لوگوں کے جن کو خدا کے حضور

ایک دائمی حضوری حاصل ہے مگر وہ کم ہوتے ہیں وہ استثناء ہیں۔

پس اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے دوسرے معنی یہ بنیں گے کہ گنتی کے چند دن آ کے گزر جانے والے ہیں اور کاش یہ جاری رہ سکتے مگر جتنے دن ہیں ان سے تو پورا فائدہ ہم اٹھائیں اور مَّعْدُوْدٰتٍ میں جو حرص پیدا ہوتی ہے کہ یہ گزرنے والے دن ہیں اس کی مثال وصل کی گھڑیوں سی ہے۔ وصل کی گھڑیاں بھی تو بعض دفعہ مقرر ہوتی ہیں معین ہو جایا کرتی ہیں۔ پتا ہے کہ محبوب کتنی دیر کے لئے آیا ہے اور انسان چاہتا ہے کہ اس کا ہر لمحہ اس کے قرب میں گزر جائے۔ یہ بھی اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ہیں اور سزا کی گھڑیاں بھی معین ہوتی ہیں ،فراق کے لمحے بھی اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ بن سکتے ہیں لیکن کتنے مشکل لمحات ہیں کہ ایک ایک گھڑی ،ایک ایک دن ،ایک ایک رات گن گن کے کاٹنی پڑتی ہے۔

تو مَّعْدُوْدٰتٍ کے دونوں معنے ہیں اور ان دونوں معنوں میں یہ مضمون رمضان مبارک پر صادق آتا ہے اور پھر عجیب بات ہے کہ اس کے دن واقعی جس طرح گنے جاتے ہیں اس طرح کسی اور مہینے کے دن گنے نہیں جاتے۔ آج پہلا روزہ ہو گیا، آج دوسرا ہو گیا، آج تیسرا ہو گیا اور دن گنتے وقت بھی وہی کیفیت گننے والے کی الگ الگ کیفیت اس کے لئے الگ الگ پیغام لے کے آتی ہے۔ آخر پر جب پہنچ جاتے ہیں تو وہ لوگ جو ڈرتے ڈرتے رمضان میں داخل ہوئے تھے کہ کتنا لمبا رمضان پڑا ہوا ہے آج ایک روزہ گزرا ہے اور بڑی مشکل سے گزرا ہے، کل دوسرا ہو گا پھر تیسرا پھر چوتھا لیکن جب رمضان الٹ پڑتا ہے جب اپنے اختتام کے پاس پہنچتا ہے تو اس کی کیفیت ویسی ہو جاتی ہے جیسے آبشار کے قریب پہنچتے پہنچتے دریا کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس میں ایک روانی آتی ہے ایک تیزی آتی ہے ایک بہاؤ ہے جو موجیں مارتا ہوا اس کنارے کی طرف بڑھتا ہے۔ پس رمضان بھی جب بیچ کا نصف گزر چکا ہو تو الٹنے لگتا ہے، رفتہ رفتہ انسان محسوس کرتا ہے کہ اب یہ اس کنارے پر پہنچتا ہے جس کے بعد یہ آبشار بن جائے گا اور آبشار بننے کے دن دراصل یہ آخری دس دن ہیں۔ اس قدر جوش اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے رمضان میں جیسے طغیانی آئی ہوئی ہو اور ہم ان دنوں کے قریب ہیں اس لئے آپ دیکھیں کہ پچھلے پندرہ دن جب پندرہ روزے گزرے ہیں اس کے اور اب کے درمیان تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا کہ کیسے گزر گیا تو اس لئے کہ ہم اس آبشار کے دہانے پر کھڑے

ہیں آج انیسواں روزہ ہے کل اعتکاف شروع ہو جائے گا۔ عام طور پر اکیس سے تیس تک کے دس دن اعتکاف کے ہونے چاہئیں مگر چونکہ یہ پتا نہیں لگ سکتا تھا کہ آخری دس دن نصیب ہوں گے کہ نہیں اس لئے احتیاطاً گیارہ دن کا اعتکاف ہونے لگا کیونکہ اگر انتیس کے روزے ہو جائیں اور آپ دس دن کے خیال سے اعتکاف بیٹھیں تو اعتکاف نو دن کا رہ جائے گا اور اعتکاف کے لئے دس دن کی شرط ہے۔ اس لئے فقہاء اور علماء نے اس کے سوا چارہ نہ پایا اور یہی دستور، یہی سنت آنحضرت ﷺ کی کہ رمضان مبارک کے آخر پر اس احتمال سے کہ کہیں انتیس کا رمضان نہ ہو ایک دن پہلے اعتکاف بیٹھتے تھے۔ اب جبکہ یقینی طور پر ہمیں پتا چل چکا ہے کہ آخری دس دن ہمیں میسر آ سکتے ہیں اگر تیس کا رمضان ہے، اس کے باوجود ہم اعتکاف کو ایک دن پہلے ہی شروع کرتے ہیں کیونکہ ایک دن کم کرنے کا فائدہ تو کوئی خاص نہیں مگر ایک دن بڑھانے کی برکت بڑی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سنت یہ تھی۔ آپؐ بھی تو اسی طرح کبھی گیارہ دن، کبھی دس دن بیٹھتے تھے مگر اس احتمال سے کہ دس، نو نہ رہ جائیں آپ گیارہ قبول کر لیتے تھے۔ پس اگر اس احتمال سے کہ دس کہیں نو نہ رہ جائیں گیارہ قبول کئے جا سکتے ہیں تو اس ذوق و شوق سے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل ہو جائے کیوں دس کو گیارہ نہ بنایا جائے۔ پس اس لئے ہم نے باوجود یقینی علم ہونے کے اس طریق کو تبدیل کرنا پسند نہیں کیا اور اب بھی تمام احمدی مساجد میں قطعی طور پر علم ہونے کے باوجود کہ یہ تیس دن کا رمضان ہے گیارہ دن کا اعتکاف بیٹھا جاتا ہے، بجائے دس دن کے اور جب انتیس کا ہو تو پھر وہ طبعی طور پر دس ہی دن کا بن جاتا ہے۔

پس اعتکاف کل سے شروع ہونے والا ہے اور جب اعتکاف آ جائے تو پھر تو آبشار کا منظر بالکل سامنے کھل کے آ جاتا ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ آدمی خود چل رہا ہے یا چلایا جا رہا ہے۔ کشتیاں کئی دفعہ چلائی جاتی ہیں کئی دفعہ وہ تمہیں بہا کے لے جاتی ہیں۔ تو رمضان کے آخری دس دن تو انسان کو بہا لے جاتے ہیں اور اور قسم کی بھی آبشاریں پیدا ہوتی ہیں جو آنسوؤں سے جاری ہوتی ہیں، دلوں سے پھوٹتی ہیں اور دعاؤں کی آبشاریں ہیں جو ان آنسوؤں کے ساتھ ساتھ گرتی ہیں۔ پس عجیب مناظر ہیں جو آخری دس دن ہمارے سامنے لانے والے ہیں اور ان مناظر کو دیکھتے ہوئے اگر ان کی کیفیات سے گزریں پھر اس آیت کا مفہوم سمجھ آتا ہے اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ چند گنتی کے دن تھے گزر گئے پتا نہیں ہم خدا کو راضی کر سکے کہ نہیں کر سکے۔ پتہ نہیں ہمارے گناہ بخشے گئے کہ نہیں بخشے

گئے۔ پتہ نہیں ہم ویسے ہی تو نہیں نکل رہے جیسے داخل ہوئے تھے۔ چکنا گھڑا لاکھ سال بھی پانی میں رہے جب نکلتا ہے اسی طرح چکنا، پانی کے بغیر، اس کے اندر پانی کا ایک ذرہ بھی سرایت کیا ہوا محسوس نہیں ہوتا Scientifically تو معلوم کرلیں گے مگر انسانی تجربے کے لحاظ سے چکنا گھڑا کہتے ہیں لاکھ سال بھی رہے گا تو چکنا گھڑا ہی نکلے گا۔ پس ایسے بھی تو ہیں بدنصیب جو جیسے داخل ہوتے ہیں ویسے ہی نکل آتے ہیں۔ مگر ایسے بھی ہیں جو جیسے داخل ہوتے ہیں اس سے بدتر نکلتے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے ان کے متعلق ڈرنا چاہئے کہ بعض دفعہ ایسے لوگ قوموں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں جو لوگ شرارت سے باز نہیں آرہے، جو فتنہ فساد پھیلانے سے باز نہیں آتے، جو دنیا کا امن اٹھانے کی تدبیریں سوچتے ہیں اور خدا کے نام پر منبر پر کھڑے ہو ہو کے ایسی باتیں کرتے ہیں جس سے بعضوں کے دل بعض دوسروں سے نفرت کرنے لگیں اور بعض صورتوں میں غیظ وغضب سے بھر جائیں، رمضان کے مہینے میں مذہبی منافرت کی تقریریں بھی خوب چلتی ہیں۔ پس ایسے بھی ہیں جو داخل تو کچھ نسبتاً بہتر ہوتے ہیں لیکن جب نکلتے ہیں تو بہت بدتر ہو کے نکلتے ہیں تو یہ تینوں امکانات ہیں اور یہ گنتی کے چند دن دیکھیں کیسے کیسے انقلاب لے آتے ہیں۔

پس دعا کریں اور توفیق پائیں اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کے ساتھ، محنت کے ساتھ کہ جو دن باقی ہیں ان کا حق ادا کریں ان کو اس طرح اپنا لیں کہ آپ کو ان دنوں سے پیار ہونے لگے، وہ دن آپ ایسا اپنا لیں کہ اپنی برکتیں آپ کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائیں، پس جب نکلیں تو دامن بھرے ہوئے ہوں، نکلیں تو کچھ پیاس بجھی ہوئی ہو، کچھ پیاس لگی ہوئی ہو، پیاس بجھے اس پہلو سے کہ خدا کے قرب کی علامتیں دیکھیں اور اس کے لطف اٹھائیں۔ پیاس لگے اس پہلو سے کہ جو مزہ ایک دفعہ پڑ گیا ہے اس کی یاد آپ کو پھر ان مزوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بے قرار کر دے، تو یہ وہ چند دن ہیں جن کے تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کے متعلق جو مختلف نصیحتیں آنحضرت ﷺ کی احادیث سے میں نے اخذ کی ہیں اور کچھ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ملفوظات یا تحریرات سے اخذ کی ہیں۔ میں آپ کے سامنے وہ رکھتا ہوں۔

صحیح بخاری **کتاب الصوم باب الریان للصائمین** میں درج ہے کہ حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک دروازہ ہے جس کو ریّان کہتے ہیں۔ قیامت کے

دن روزہ دار اس سے داخل ہوں گے اور ان کے سوا کوئی اس میں سے داخل نہ ہوگا اور جب وہ داخل ہو جائیں گے تو وہ بند کر دیا جائے گا اور پھر کوئی اس سے جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یہ جو ریـان لفظ ہے یہ دراصل سیری کا نام ہے۔سخت پیاس اور طلب کے بعد کوئی چیز حاصل ہوتو اس سے جو لطف حاصل ہوتا ہے اس کا نام ریّـان ہے۔پانی تو ہم روزمرہ پیتے ہی ہیں مگر ریّـان اصل میں اس پانی پینے کو کہیں گے جس میں پیاس بھڑک اٹھی ہو اور پھر جب آپ پانی پیتے ہیں تو جو سیرابی نصیب ہوتی ہے اس کو ریّـان کہا جاتا ہے۔پس ریّـان کا معنی ہے جو خاص طور پر قابل توجہ ہے اور دوسرا جنت کا گیٹ یا جنت کا دروازہ ایک ہی معنے رکھتے ہیں، اس ضمن میں پہلے بھی میں سمجھا چکا ہوں کہ یہ تمثیلات ہیں۔ یہ تو نہیں کہ لوہے، لکڑی یا اینٹ پتھر کا کوئی گیٹ بنا ہوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسانی فطرت اس طرح تیار کی گئی ہے کہ بعض نعمتیں جنت میں انہی کو حاصل ہوں گی جن کے لئے پہلے انسانی فطرت کو ان کے مطابق تیار کر دیا گیا۔ پس ریّـان کے دروازے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں جنہوں نے خدا کی خاطر اپنی خواہشات کو روک دیا اور پیاس سے مراد صرف پانی کی بحث نہیں ہے، تمام خواہشات پیاس کا مقام رکھتی ہیں، تمام خواہشات ایک بھڑکی پیدا کرتی ہیں جو پیاس سے مشابہ ہے اور دنیا کے ادب میں ان کو ہمیشہ پیاس ہی قرار دیا گیا۔

پس ریّـان کا معنی صرف پانی کی پیاس نہیں، ہر طلب، ہر خواہش جو فطرتاً انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور ایک بھڑکی لگا دیتی ہے جب وہ بھڑکتی ہے اور جوش مارتی ہے اس وقت جو لوگ خدا کی خاطر رکے رہتے ہیں جب وہ اپنی پیاس کو خدا کی اجازت سے بجھاتے ہیں تو جو لطف اس کا ہے وہ عام حالات میں نہ پیاس بجھانے کا لطف ہے نہ ویسے خواہش کو پورا کرنے میں کوئی لطف ہے۔ بھڑکی ہوئی خواہش کو پورا کیا جائے تو لطف اور ہی بڑھ جاتا ہے۔ مگر اگر کسی محبوب کی رضا کی خاطر ایسا کیا جائے تو پھر جو لطف ہے وہ دہرا لطف ہے اور اسی کا نام وہ دروازہ ہے جس میں سے وہ داخل ہوں گے۔ ورنہ پیاس کے مضمون کو تو سب جانتے ہیں۔ پیاس کی سیری سے بھی سب واقف ہیں۔ کوئی طوعاً کوئی مجبوراً یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ امیر آدمی کو کبھی پیاس کا تجربہ ہی نہ ہوا ہو یا خواہش ہوگئی ہو تو اسے دبانے کی توفیق نہ ملی ہو یا اس کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ بعض دفعہ توفیق مجبوری کی توفیق ہوتی ہے۔ پس امیر سے امیر آدمی کی ہر خواہش کہاں پوری ہوتی ہے۔ بعض خواہشیں زور مارتی رہتی ہیں جب پوری ہوں تب پتا چلتا ہے۔ مگر ان

سب کو جنت کے اس دروازے سے داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی جو الریان کہلاتا ہے۔

یہاں مراد یہ ہے کہ خدا کی خاطر، خدا کی رضا کی خاطر جب خواہش پوری کر سکتے تھے اور نہیں کی گئی، جب پیاس بجھا سکتے تھے اور نہیں بجھائی اس وقت تم جانتے ہو کہ دنیا میں روزے نے تمہیں سکھا دیا ہے کہ جب پیاس بجھاتے ہو تو دوہری لذت حاصل کرتے ہو کہ اپنے رب کی خاطر میں ایک امتحان سے کامیابی سے گزر گیا اور گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر دوہری لذتیں رکھتا ہے کہ اب خدا کی اجازت سے میں نے اپنی پیاس کو بجھایا اپنی دوسری خواہشات کو پورا کیا۔ تو یہ جو جنت کا ایک زائد مضمون ہم یہاں اپنے لئے پیدا کر دیتے ہیں یہی وہ دروازہ بنانا ہے۔ یعنی ہم اس دنیا میں خود اپنے اس دروازے کو تعمیر کر رہے ہیں جو آخری دنیا میں ہمارے سامنے پیش ہوگا اور جس نے دروازہ بنایا ہے جس کا وہ مالک وہی اس دروازے سے گزرے گا اور کوئی نہیں گزر سکتا۔ پس یہ مراد نہیں کہ ایک گیٹ اکٹھا ایک جگہ کھڑا ہوا ہے اور کروڑ ہا آدمی اس کے سامنے Que (لائن) لگا کے کھڑے ہیں کہ ہمیں اجازت ہو تو ہم بھی اس میں سے گزریں کیونکہ جنت میں تو دوسرے دروازوں سے بھی گزرے ہیں تو کیا بار بار نکلنا پڑے گا؟ پھر اگر یہ منظر ہو تو کوئی روزے کے دروازے سے گیا ہے، کوئی نماز کے دروازے سے گیا ہے، کوئی جہاد کے دروازے سے گیا ہے اور جو روزے دار جہاد کے دروازے سے گیا ہے وہ کہے گا روزے کا مزہ تو میں نے چکھا کوئی نہیں اب چلو پھر دوبارہ باہر نکلتے ہیں اور روزے والے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ یہ سوچ ان لوگوں کی ہے جو دنیاداری کے مضامین کو دین پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دین کے اپنے محاورے ہیں اور دین کی الگ کیفیات ہیں اور ایسا ممکن ہے کہ بیک وقت ایک انسان مختلف لذتیں حاصل کر رہا ہو گویا دروازے بظاہر الگ الگ ہیں لیکن آپ ان سب دروازوں سے بیک وقت داخل ہو رہے ہیں۔ مثلاً ایک مجاہد ہے اس کو جہاد کی ایک لذت حاصل ہوئی جو اس دنیا میں ہوئی اور روزہ دار ہے جو مجاہد تھا روزے دار بن گیا اس کو روزے کی ایک لذت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوہری لذت کی صورت میں اس دنیا میں پیدا ہو سکتی ہیں اور یہی لذتیں جو ایک کے اوپر دوسری منازل بنا رہی ہوں۔ یہ جب جنت میں متمثل ہوں گی تو بیک وقت ایک ہی گیٹ کے ساتھ اور گیٹ اس کے اوپر ایک اور گیٹ گویا کہ گیٹ کے اوپر ایک گیٹ چڑھا ہوا

ہوگا۔ داخل آپ ایک ہی دفعہ ہوں گے مگر ہر گیٹ اپنی تاثیر آپ کے اوپر ڈال رہا ہوگا۔ ہر گیٹ کا لطف آپ کو محسوس ہو رہا ہوگا مگر ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس گیٹ سے داخل ہو جاؤ پھر واپس نکلو، پھر دوسرے گیٹ سے جاؤ، پھر تیسرے گیٹ سے جاؤ یہ تو ایک بچگانہ تصور ہے جو آنحضرت ﷺ کی طرف کسی صورت میں منسوب نہیں ہوسکتا، ناممکن ہے مگر اگر اس کا عرفان آپ سمجھیں اس پر نظر ڈالیں تو بہت ہی عجیب پر لطف مضمون ہے جو روزمرہ ہمارے تجربہ میں آتا ہے۔

پس جس کو ایک خاص لذت نصیب ہو وہی جانتا ہے کہ وہ لذت کیا ہے اور جب وہ دوسروں سے باتیں کرتا ہے تو کہتا ہے تمہیں کیا پتا۔ یہاں تک کہ شراب پینے والے بھی نہ پینے والوں کو کہتے ہیں ''ظالم تو نے پی ہی نہیں'' تجھے کیا پتا کیا چیز ہے جو تو چھوڑ رہا ہے، پئے گا تو پتا چلے گا، تو شراب معرفت کے متعلق یہ کہنا کہ جنہوں نے پی ہے انہیں کو پتا ہے باقی کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے اگر سچ ہے تو یہ سچ ہے۔ شراب کا تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا نشہ ہے مگر اس سے زیادہ نشہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی مے کے دنیا میں بسا اوقات ایک انسان پالیتا ہے اور اس کے مقابل پر ہر نشہ ختم ہو جاتا ہے۔ پس قیامت کے دن جو ریان کا دروازہ ہے وہ یہ دروازہ ہے جو اس دنیا میں ہم تعمیر کرتے ہیں اور صرف پیاس کی بات پانی سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ دنیا کی ہر خواہش جو ہم خدا کی خاطر چھوڑتے ہیں اور ہمارے دل میں وہ ایک بھڑکی لگا دیتی ہے جب خدا کی خاطر اس کو پورا کرتے ہیں تو وہ لذت ہے جو جنت میں متمثل ہوگی اور بہت بڑھ جائے گی اتنی کہ اس دنیا کی لذّت سے اس کی کوئی نسبت نہیں ہوگی یا اس کے ساتھ اس دنیا کی لذّت کو کوئی نسبت نہیں ہوگی۔

ایک دوسری حدیث ہے یہ بھی صحیح بخاری سے لی گئی ہے ابراہیم بن سعد نے بتایا کہ ابن شہاب نے ہمیں خبر دی عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ سے مروی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا نبی اکرم ﷺ نیکی میں سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں بہت ہی سخاوت کرتے تھے۔ جب جبریلؑ آپؐ سے ملتے اور جبرائیل علیہ السلام رمضان کی ہر رات آپؐ سے ملاقات کرتے تھے یہاں تک کہ رمضان گزر جاتا۔ نبی ﷺ قرآن کا دور کرتے جب جبرائیل علیہ السلام آپؐ سے ملتے تو آپؐ نیکی میں تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہو جایا کرتے تھے۔

(صحیح البخاری کتاب الصوم باب أجود ما كان النبی ﷺ يكون فی رمضان)

تو وہی موسم والی بات ہر ایک پر اطلاق پاتی ہے۔آنحضرت ﷺ سارا سال نیکیوں میں بہت تیز رفتار تھے تو رمضان میں کیا اسی رفتار سے چلتے تھے یا اس میں ایک نئی شان پیدا ہو جاتی تھی ، نئی جان آجاتی تھی ۔حدیثیں بتاتی ہیں کہ ان نیکیوں میں جو روزمرہ آپؐ کی عادت تھی ان میں ایک نئی جلاء پیدا ہو جاتی تھی ، ایک نیا جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ پہلے سے بڑھ کر تیزی سے آنحضرت ﷺ اپنی روزمرہ کی نیکیوں میں بڑھ جایا کرتے تھے۔اب اس حدیث نے ہمیں ایک بڑا وسیع مضمون سمجھا دیا اپنے موازنے کا مضمون، اپنے سال پر نظر ڈالیں ، اپنی نیکیوں پر نظر ڈالیں ہر انسان خواہ نیک ہو یا بد ہو اسے کچھ نہ کچھ نیکی کی توفیق تو مل ہی جاتی ہے یعنی بد بھی ہو تو مل جاتی ہے ، نیک ہو تو اس کو بہر حال کچھ نہ کچھ توفیق ملتی رہتی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ رمضان میں وہ نیکیاں جو ہم نے سارا سال کی تھیں ان میں ایک نئی جلا پیدا ہوئی ہے۔کیا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے جس طرح عبادت کیا کرتے تھے اس سے زیادہ بڑھ کر اس سے زیادہ توجہ سے عبادت کر رہے ہیں ، جس طرح پہلے صدقہ دیا کرتے تھے اس سے زیادہ توجہ کے ساتھ اور دلی خواہش کو ملا کر صدقے دیتے ہیں۔محض بوجھ اتارنے کے لئے نہیں بلکہ محبت کے جذبے کے ساتھ ، جیسے محبت کے جذبے سے جب تحفے پیش کئے جاتے ہیں تو بعض دفعہ بڑے بڑے خوبصورت کاغذوں میں یا ڈبوں میں لپیٹ کر دیئے جاتے ہیں بعض دفعہ تو اتنے زیادہ خوبصورت کر دیئے جاتے ہیں کہ اندر کا تحفہ کم اور باہر کی سجاوٹ زیادہ لیکن اللہ کے حضور بھی کسی حد تک سجاوٹ تو ضروری ہے اور وہ سجاوٹ جو ہے وہ خدا تحفوں کی طرح قبول فرماتا ہے وہ اس کا جزا بنا دیتا ہے۔

تو دیکھنا یہ ہے کہ ہماری قربانیوں میں کیا کوئی نئی حسن کی بات بھی پیدا ہوئی ؟ ہم نے انہیں سجانے کی کوشش کی ؟ جو نمازیں پہلے پڑھتے تھے ان کو اگر ہم بے خیالی سے پڑھ جایا کرتے تھے اور خیال کو خدا تعالیٰ کی طرف مرکوز رکھنے پر محنت نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ چار رکعتیں پوری ہو گئیں یا تین رکعتیں پوری ہو گئیں تو بات ختم ہو گئی آؤ واپس اب دنیا کی طرف چلتے ہیں بلکہ بسا اوقات دنیا چمٹی رہتی تھی اور نماز کے دوران وہ پیچھا چھوڑتی ہی نہیں تھی ۔پس محض ایک ظاہری بندھن تھا جس کے ٹوٹنے کے بعد کوئی بھی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی ۔ویسی ہی بات ہوتی ہے بعض دفعہ نماز پڑھنے والوں سے جس طرح غالب نے کہا ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

تو ایسے لوگوں کی نمازسے جب آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا۔ نہ زیاں نہ سود لیکن ایک زیاں ضرور ہوتا ہے۔ غالب کا شعر (دیوان غالب:27) تو ایک انسانی حالت پر طاری ہونے والا ہے، اطلاق پانے والا ہے۔ نماز کے معاملے میں ہاتھ تو کچھ نہیں آتا مگر وہ وقت ضائع ہو جاتا ہے جس میں ہاتھ آ سکتا تھا اور اس لحاظ سے زیاں کا پہلو غالب رہتا ہے۔

پس یہ بھی دیکھیں کہ رمضان میں آپ کی وہ نیکیاں جن کی آپ کو پہلے توفیق ملا کرتی تھی کسی نئے جذبے سے جاگ اٹھی ہیں کہ نہیں۔ ان نیکیوں کی آنکھیں کھلی ہیں کہ نہیں یا غفلت کی حالت میں سوئے سوئے ادا ہو رہی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق قطعی طور پر ثابت ہے ایک حدیث نہیں اور بہت سی احادیث میں یہی مضمون ہے کہ رمضان کے دنوں میں تو آپؐ کی نیکیاں اس قدر جوش دکھاتی تھیں کہ جیسے ہوا آندھی میں تبدیل ہو جائے اس طرح آپؐ ہر نیکی میں آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ تو یہ جو نیکیوں کا موازنہ ہے یہ بعض دفعہ دل کے طبعی جوش سے پیدا ہوتا ہے، بعض دفعہ بالارادہ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کو تو اس بارے میں ارادے کے ساتھ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ محنت تو بہت کرنی پڑتی تھی کیونکہ جب خدا کی رضا کی خاطر انسان پورا زور لگاتا ہے تو کچھ نہ کچھ جسمانی محنت اور اس کی تھکاوٹ کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر وہ محنت خود اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے کیونکہ ولولے اور محبت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اس لئے محنت تو ہے مگر اس طرح تھکا دینے والی محنت نہیں جیسے ایک آدمی ایسا کام کرے جس میں دل نہ ہو، اس کو بیگار کہتے ہیں۔ مزدور کو بھی اگر پوری مزدوری دو بلکہ اس سے کچھ زیادہ دے دو تو سخت محنت کر کے بھی وہ اتنا نہیں تھکتا جتنا کسی مزدور کو پکڑ لیا جائے اور کہا جائے چلو محنت کرو ورنہ تمہیں ماریں گے۔ وہ بے چارہ ہر قدم جو اٹھاتا ہے وہ منوں بوجھل ہو جاتا ہے خواہ ہلکا کام ہی اس کے سپرد ہو۔ تو محنت کے بھی مختلف مدارج ہیں، مختلف کیفیتیں ہیں، ان کے تابع ہمیں اپنے آپ کو دیکھنے جانچنے کا بہت اچھا موقع ہے خصوصاً رمضان شریف میں۔ رمضان میں ہم جتنا قدم نیکیوں میں آگے بڑھاتے ہیں اول تو جانچ سکتے ہیں کہ کیا آنحضرت ﷺ کی طرح

ایک طبعی جوش سے ہم آگے بڑھے ہیں اور اس کی تکلیف کی بجائے جو محنت ہم کر رہے ہیں ہم اس سے لذّت پا رہے ہیں اگر چہ جسم کمزور ہے اور روح کی تازگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعودؑ نے بھی کہا کہ روح جوش رکھتی ہے لیکن جسم کمزور ہے ویسی ہی کیفیت ہر انسان کو اپنے زندگی کے تجارب میں محسوس ہوتی ہے۔ ایک پیارے کی خاطر جاگتا ہے اور ایک مصیبت کے طور پر فرض کے طور پر جاگتا ہے، ان دونوں میں فرق ہے اور وہ مزدور جس کو تھوڑی مزدوری ملتی ہے اس کی محنت اس کے لئے بہت ہی مشقت اور مصیبت لے کے آتی ہے۔ وہ مزدور جس کو زیادہ مل جاتی ہے وہ زیادہ وقت چاہتا ہے اگر اس سے زیادہ محنت نہ لیں تو وہ شکوہ کرتا ہے۔ اب آپ کو پاکستان یا ہندوستان میں شاذ ہی یہ احتجاج ملیں گے کہ ہمیں Overtime نہیں دے رہے مگر یہاں اگر فیکٹریاں Overtime نہیں دیں گی تو خاص طور پر آزاد کشمیر کے جو آنے والے ہیں وہ تو بڑا شور مچاتے ہیں۔ ان کا بدن زیادہ سخت جان ہے اور اس کو وہ پیسے میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ تو کہتے ہیں یہاں Overtime نہیں دیا جا رہا بڑا ظلم ہو رہا ہے ہمارے اوپر اور اگر واپس وہاں چلے جائیں اور تھوڑے پیسے دے کے Overtime لیں تو کہیں گے Overtime لیا جا رہا ہے بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ ایک ہی چیز ہے صرف کیفیت اور رجحان بدلنے سے وہ مختلف اثرات پیدا کر دیتی ہے۔

تو رمضان مبارک کو اس طرح بھی جانچیں۔ کچھ تو اس طرح، دیکھیں کہ آپ نے جو کہ گزشتہ نیکیاں کی تھیں کیا رمضان کے مہینے میں ان میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی ؟ کیا آپ نے ان نیکیوں میں کچھ قدم آگے بڑھایا جو رمضان کے بغیر آپ کو توفیق نہیں ملی تھی ؟ اور پھر نیکیوں میں آپ نے پہلے سے بڑھ کر لذّت محسوس کی کہ نہیں؟ اگر لذّت محسوس کی ہے تو لازماً آپ کو کچھ ملا ہے اور یہی وہ ملنا ہے جس کی طرف رمضان ہمیں متوجہ کر رہا ہے اور وہ خدا کا ملنا ہے۔ تمام تر مقصد رمضان کا خدا کا ملنا ہے اور یہ لذّتیں جن کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں یہ تمام لذّتیں خواہ کسی نوعیت کی ہوں تب پیدا ہوتی ہیں جب وصل کا احساس پیدا ہو، جب قرب الٰہی کا احساس پیدا ہو اس کے بغیر کوئی لذت، لذت بن ہی نہیں سکتی۔ نماز میں بھی اگر مزہ آئے گا تو لازماً ان لمحات میں مزہ آئے گا جب آپ کو خدا کے قرب کا احساس ہو گا ورنہ یہ نماز بور ہی رہے گی۔ روزوں کے درمیان بھوک اور پیاس میں بھی اگر کوئی مزہ آئے گا تو محض اس وقت جب آپ کی توجہ اللہ کی طرف ہو گی اور آپ دل سے محسوس کریں گے کہ

ہاں میں نے اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے تکلیف اٹھائی ہے اور مجھے خوشی ہے۔ وہ جو خوشی ہے وہ زبان کی بات نہیں ہوتی وہ دل کا تجربہ ہوا کرتا ہے۔ واقعۃً روزے دار جب یہ احساس پیدا کرے تو اس کو لطف آتا ہے کہ آہا بہت اچھی بات ہے۔ کچھ غریب ایسے بھی ہیں جو بے اختیار ہیں وہ بھوکے رہنے پہ مجبور ہیں مجھے تو اختیار تھا میں تو خدا کی خاطر رکا ہوں۔ پس اس پہلو سے رمضان ہوش کے ساتھ گزاریں اور جو گنتی کے چند دن باقی رہ گئے ہیں ان میں اپنا موازنہ کرتے رہیں۔ اس دوران کی کیفیت کا موازنہ اپنی پہلی کیفیات سے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے احساس کا موازنہ اپنے پہلے احساسات سے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو میں امید رکھتا ہوں کہ اگلے دن آپ کے لئے بہت کچھ فائدہ چھوڑ جائیں گے اور زیاں کا کوئی احساس نہیں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ابو ہریرہؓ سے روایت ہے یہ بھی صحیح بخاری سے حدیث لی گئی ہے کہ روزے ڈھال ہیں، سو کوئی شخص فحش بات نہ کرے اور نہ جہالت کی بات اور اگر کوئی آدمی اس سے لڑے، گالی دے تو چاہیئے کہ اس سے دو بار کہے کہ میں روزہ دار ہوں۔ اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

(صحیح البخاری کتاب الصوم باب هل یقول انّی صائم أذا شتم)

اب یہ حدیث جو ہے اس میں جو بُو کا بیان ہے یہ ویسا ہی بیان ہے جیسا کہ ''ریّان'' کی بات ہو رہی ہے کہ وہ ایک دروازہ ہوگا جنت میں۔ وہ کوئی ظاہری لکڑی کا دروازہ نہیں ہوگا۔ اور یہاں جو بو ہے خدا کو تو بو آتی ہی نہیں ان معنوں میں جن معنوں میں ہمیں آتی ہے۔ اگر خدا کو ان معنوں میں بو آئے تو دنیا کی اکثر جگہوں پہ ہر قسم کی بد بو پائی جاتی ہے اور گناہوں کی بدبُو تو اتنی عام ہے کہ زمین کے قریب بھی خدا نہ پھٹکے کبھی۔ مگر خدا کو ان معنوں میں بو نہیں آتی۔ نہ ظاہری نہ روحانی معنوں میں بلکہ اس کا علم ہے اور اسی علم کا نام بعض دفعہ، یہ رکھا جاتا ہے کہ خدا نے محسوس کیا، خدا کو اس بو کا علم ہوا۔ تو علم اور چیز ہے اور ویسے تجربے میں سے گزرنا اور چیز ہے۔

تو مراد یہاں صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے صاف ستھرے ہوں اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندوں میں سے خوشبو اٹھے ظاہری خوشبو بھی اور باطنی خوشبو بھی اور یہ ایک امر واقعہ ہے جو ہر مذہب میں ہمیں اسی طرح ملتا ہے۔ تمام مذاہب میں رواج ہے کہ

کہیں وہ اپنے مندروں میں لوبان جلاتے ہیں، کہیں کئی قسم کی خوشبودار چیزیں چھڑکتے ہیں کہیں وہ عطر خود پہن کر یا لگا کر چلتے ہیں تو مسجد کے ساتھ خوشبو کا ایک تعلق ہے، گرجوں کے ساتھ بھی خوشبو کا تعلق ہے، مندروں کے ساتھ بھی خوشبوؤں کا تعلق ہے تو مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوشبو پسند ہے اس لئے نہیں کہ وہ خود سونگھتا ہے۔ اس لئے کہ تم سے محبت ہے تم سے پیار ہے تم جو اچھے لگتے ہو تو خدا کو بھی یہ اچھا لگتا ہے تم جب خوشبودار ہو تو اللہ کو گویا تمہاری خوشبو کا لطف آ رہا ہے اور اس کے باوجود رمضان میں تمہارے منہ کی بدبو کا اس کو علم ہے اور جانتا ہے کہ تم تکلیف میں ہو لیکن خدا کی خاطر ہو، یہ تکلیف خدا کی خاطر اٹھا رہے ہو، بدبو سے گزارا کر رہے ہو اللہ کی خاطر۔ تو یہ بات اللہ کو پسند ہے کہ دیکھو میرا بندہ جس کو میں نے بہت ہی پاکیزگی کی تعلیم دی، پاکیزگی کی عادات ڈالیں، جس کو بار بار صاف ستھرا ہونے کے سلیقے سکھائے، پانچ دفعہ وضو کرتا ہے، ہر گندی چیز سے بچنے کی کوشش کرتا ہے آج میری خاطر ایک ایسا کام کر رہا ہے کہ اتنے لطیف مزاج کا، اتنے صاف ستھرے مزاج کا انسان منہ میں بدبو لئے پھر رہا ہے اور بے بس ہے۔ تو یہ پیار کی کیفیت ہے۔ اپنا بچہ، اپنا عزیز جب کسی کی خاطر کوئی گند بھی لگا بیٹھے تو وہ گند اس وقت اچھا لگتا ہے کہ اس نے اس کی خاطر کیا ہے۔ کئی دفعہ ایک انسان کسی چیز کو پکڑنے لگتا ہے جو نسبتاً گندی ہو تو کوئی پیار کرنے والا آگے بڑھ کر لپک کر اس کو ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے۔ اب اس وقت کا اس کا گندا ہاتھ اس کو برا تو نہیں لگا کرتا۔ کون کہہ سکتا ہے اُوں ہُوں تم نے تو ہاتھ گندا کر لیا۔ ہاتھ گندا کیا محبت کی خاطر اور وہ گندا ہاتھ پیارا لگ رہا ہوتا ہے اس پر رحم تو آتا ہے اس سے نفرت پیدا نہیں ہوتی۔ پس یہ معنی ہے کہ خدا کو روزے دار کے منہ کی بدبو بھی پیاری لگتی ہے اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ خوشبوؤں میں کستوری کو، مشک کو ایک مقام ہے تو ساری دنیا میں شاعروں کی زبان پر جاری رہتا ہے کہ مشک کی خوشبو بہت ہی پاکیزہ اور عظیم خوشبو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مشک کی خوشبو سے زیادہ خدا کو روزے دار کے منہ کی بدبو پسند ہے جو خدا کی خاطر اس بدبو کے ساتھ نبھانے کی کوشش کرتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب جھگڑیں تو جواب میں کہے ''میں تو روزے دار ہوں'' یہ بحث ہے جواب میں کہے ''میں تو روزے دار ہوں'' یہ ایک ایسی دلچسپ چیز ہے جس کے کئی پہلو ہیں اصل میں۔ ایک تو یہ کہ جب آدمی کہے میں تو روزے دار ہوں تو اس وقت اس کا کسی اشتعال سے رک جانا اس اشتعال سے رک جانے کو ایک نیکی بنا دیتا ہے اور اس کے دل میں احساس جاگ اٹھتا ہے کہ میں خدا کی خاطر

رک رہا ہوں۔ دوسرا یہ کہ جو سننے والا ہے جس نے زیادتی کی ہے اس کو یہ کہہ کر انسان ایک تسکین پا لیتا ہے کہ کہیں مجھے کمزور ہی نہ سمجھ رہا ہو اور بعض ایسے جوشیلے ہیں کہ ان کو صرف غصہ دبانا مشکل نہیں بلکہ یہ برداشت کرنا مشکل ہے کہ اگلا مجھے نکما ہی نہ سمجھ رہا ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری بے عزتی کر جائے جو مرضی کر جائے میں اسی طرح بیٹھا رہ جاؤں گا۔ چنانچہ ایسے مزاج کے لوگ بعض دفعہ اپنے کپّتے پن پہ بھی فخر کرتے ہیں۔ خبردار ہے جو ہمارے متعلق کوئی کہے ہم بڑے کپّتے، بدمعاش لوگ ہیں۔ ہم یوں جواب دیا کرتے ہیں۔ اب وہ بے چارے کپّتے بدمعاش اگر تھے روزے میں پھنس گئے ہیں تو کس طرح برداشت کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے طریقہ سکھا دیا ہے تم یہ کہہ دیا کرو کہ میں پھنسا ہوا ہوں، مجبور ہوں، بندھا ہوا ہوں ورنہ میرا دل تو بڑا چاہ رہا ہے اس وقت کہ جوابی حملہ تم پہ کروں تو نفسیاتی طور پر جو ایک کمزوری کا احساس پیدا ہوتا ہے یہ بات کہنا اس کمزوری کے احساس کو دور کر دیتا ہے کہ میں تو خدا کی خاطر رکا ہوا ہوں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو آئندہ جوشوں پر قابو پانے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ ایک انسان جب اپنے جوشوں کو کھلی چھٹی دیتا ہے تو یاد رکھیں کہ ہمیشہ وہ چھٹی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ مونہہ تھوڑا سا کھلتا ہے تو پھر پھٹنے لگتا ہے۔ پھر ایسے لوگ مستقلاً منہ پھٹ ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ جو منہ کو سنبھالتے ہیں وہ سنبھالتے سنبھالتے منہ کو ادب سکھا دیتے ہیں اور پھر بے اختیار منہ سے کوئی سخت لفظ نکلتا ہی نہیں۔ تو رمضان مبارک میں جو یہ بات زور سے کہی جاتی ہے آواز کے ساتھ کہ میں خدا کی خاطر رکتا ہوں تو کسی انسان میں تو یہ جذبہ جاگتا ہوگا کہ اللہ کی خاطر ان باتوں سے رکنا اگر اچھی بات ہے تو رمضان کے بعد میں کیوں پھر ایسی باتوں کو جاری رکھوں اور رمضان کی ایک مہینے کی پریکٹس اس کے گیارہ مہینے کے کام آسکتی ہے اور وہ واقعۃً رمضان سے نکلتا ہے تو پہلے سے زیادہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اور قابو پانے کی صلاحیت حاصل کر کے نکلتا ہے۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں یہ بھی بخاری ہی سے حدیث لی گئی ہے اور ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، کہ جو شخص جھوٹ بولنے اور جھوٹ بولنے پر عمل کرنے سے اجتناب نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(صحیح البخاری کتاب الصوم باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم)

اور یہاں روزے کے دوران کی بحث نہیں ہے بلکہ رمضان کی بات ہو رہی ہے۔ رمضان کا

مہینہ آتا ہے اور کوئی شخص جس کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے وہ اس سے باز نہیں آتا تو ایسے شخص کا بھوکا اور پیاسا رہنا خدا تعالیٰ کے نزدیک قابل ستائش ہے ہی نہیں، قبولیت کے لائق نہیں ہے اور وہ بھوکا پیاسا گزر جائے گا اور اس کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔تو جھوٹ کی طرف بھی توجہ کریں یہ آج کل بہت پھیل رہا ہے اور میں پہلے بھی بارہا جماعت کو متوجہ کر چکا ہوں کہ جھوٹ کے خلاف ایک عالمی جہاد کی ضرورت ہے جو ہمارے گھروں سے شروع ہوگا، ہمارے نفوس سے شروع ہوگا، بسا اوقات لوگ ملتے ہیں کہ جی آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں کہتا ہوں انّا لِلّٰہ و انّا الیہ راجعون میرے سامنے نہیں بولنا خدا کے سامنے بولتے چلے جانا ہے کیونکہ خدا سے چھپ کے کہاں جھوٹ بولیں گے بہت ہی پاگلوں والا محاورہ ہے۔اب اگر کسی کے منہ پر آئے گا تو مجھے یقین ہے ملاقات کے وقت ہاتھ رکھ کے اپنے آپ کو روک لے گا مگر کئی ہیں جن کو عادت ہے وہ کہتے ہی ہیں۔میں نے اس پہ خطبے دیئے تب بھی کئی آدمی کہتے ہیں۔میں نے کہا واقعۃً یہ اسی طرح ہوا تھا؟ کہ جی میں آپ کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہوں؟ میں نے کہا جو خدا کے سامنے بول سکتا ہے وہ سب کے سامنے بول سکتا ہے۔یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ کے سامنے نہیں بول سکتا بلکہ ایسے ہی لوگ ہیں جو سامنے جھوٹ بولتے ہیں۔

اس لئے جھوٹ ایک بڑی لعنت ہے اور جب یہ عادت بن جائے تو انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں یہ بڑی بدنصیبی ہے اور اتنی عادت بن چکی ہے دنیا میں کہ آپ دیکھ کے حیران ہوں گے۔بعض ملک کے ملک قوموں کی قومیں جھوٹ کے سمندر میں ایسا غرق ہو چکے ہیں کہ ان کو پتا ہی نہیں کہ ہم ڈوب چکے ہیں اور فنا ہو چکے ہیں احساس ہی نہیں رہا اور سب سے بڑا عذاب اسی احساس کا مٹ جانا ہے کہ جھوٹ ایک لعنت ہے اور ہمیں سچائی کی طرف لوٹنا ہوگا۔یہ جو جھوٹ کا سیلاب ہے اس نے اب بڑی بڑی ایسی قوموں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جو کسی زمانے میں سچائی پر فخر کرتی تھیں اور یہ جو قوموں کا معاملہ ہے یہ ہر ملک میں الگ الگ قبائل سے بھی تعلق رکھتا ہے۔مجھ سے ملنے کے لئے ایک معزز دوست پاکستان سے تشریف لائے جن کے قبیلے کی بعض روایات ہیں بڑی بلند اور مقدس روایات ہیں کہ ظلم نہیں کرنا، جھوٹ نہیں بولنا فلاں کام نہیں کرنا۔تو انھوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ اب تو سارے ملک میں اپنے علاقے میں جدھر نگاہ ڈالتے ہیں سب

قومیں غرق ہو چکی ہیں اس بات میں۔ دعا کریں کہ ہمیں یہ جھنڈا اٹھائے رکھنے کی توفیق ملے۔ اب تک تو خدا کے فضل سے ہم نے بڑی محنت اور کوشش کے ساتھ اس جھنڈے کو بلند رکھا ہے اور اپنی قومی روایات کو جو اعلیٰ روایات ہیں مرنے نہیں دیا مگر ایسے لوگ کم رہ گئے ہیں جزائر کی صورت میں ہیں اور ان میں بھی پھر انفرادی طور پر بہت سے نوجوان ایسے بھی ہوں گے جو رفتہ رفتہ دوسرے سیلاب میں بہہ گئے ہیں یا بہہ جانے والے ہیں۔ تو ان کے لئے دعا کرنی چاہئے جن کو احساس ہے کہ ہم ان خوبیوں کو زندہ رکھیں اور قوم میں بالعموم گردوپیش میں اس کا درس دینا چاہئے کہ جھوٹ سے بڑی دنیا میں اور کوئی لعنت نہیں ہے۔

قوموں کے اعتبار سے اور ملکوں کے اعتبار سے وہ ممالک جن میں یہ فخر ہوتا تھا کہ ہم کم سے کم اپنی قوم سے جھوٹ نہیں بولتے اور سیاستدان جو قوم سے جھوٹ بولے اس کا تصور بھی نہیں تھا لیکن اب تو یہ روزمرہ کی بات بن گئی ہے۔ ایسے ممالک ہیں جہاں پولیس کے متعلق تقریباً یقین ہوا کرتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گی مگر اب تو روزمرہ دستور بن گئے ہیں ان ممالک میں کہ پولیس بھی جھوٹے مقدمے بناتی اور اس کے نتیجے میں بعض معصوموں کو مظالم کا نشانہ بنا دیتی ہے ایسے واقعات ہوتے ہیں ان ملکوں میں کہ ایک آدمی بے چارہ دس پندرہ سال کی قید برداشت کر کے اپنے جوانی کے دن قید میں گلا کر اور ضائع کر کے باہر نکلتا ہے اس لئے کہ پندرہ سال کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ پولیس نے سارا کیس ہی جھوٹا بنایا ہوا تھا۔ تو جھوٹ کا تو اب یہ حال ہو گیا ہے اور جھوٹ کے خلاف جو جہاد کرنا ہے اس کا جھنڈا جماعت احمدیہ کے ہاتھ میں تھمایا گیا ہے۔ اگر آپ نے اس جھنڈے کو گرنے دیا تو کوئی ہاتھ نہیں ہوگا جو اس کو اٹھا سکے گا۔ اس لئے ساری دنیا میں جھوٹ کے خلاف جہاد جاری رکھیں اور یہ جہاد اپنے نفوس سے شروع ہوگا اپنے گھروں سے شروع ہوگا اور رمضان مبارک میں تو بالخصوص آپ کے لئے بہت اچھا موقع ہے کہ رمضان کی ہوائیں آپ کی تائید کر رہی ہیں۔

رمضان سچ کی ہوائیں چلاتا ہے اور یہ ہوائیں جو ہیں یہ آپ کی مددگار بن گئیں ہیں۔ پس جھوٹ سے خود بھی اجتناب کریں اور اپنے بچوں پر بھی نظر رکھیں، اپنی بیوی پر اپنے ماحول اپنے گردوپیش پر، اپنے دوستوں پر کہ ان کی جو عادت بن گئی ہے روزمرہ جھوٹ بولنے کی اس سے وہ نکل کے باہر آئیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں جی یہ تو عادت کی بات ہے معمولی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عادتیں جو ہیں

یہ دراصل پیش خیمہ ہیں بڑے جھوٹوں کا۔ جب ایک جگہ سے حیا اٹھ جائے تو پھر آگے حیا اٹھتی چلی جاتی ہے۔ دنیا میں کہیں کوئی مقام ٹھہراؤ کا مقام نہیں ہے یا آپ جوان ہو رہے ہیں یا آپ بوڑھے ہو رہے ہیں تیسری کوئی چیز نہیں۔ اگر جوانی کے بعد کہیں قدم رُکے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ قدم روکے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں مسلسل یا آپ جوانی کی طرف مڑ جائیں گے یا بڑھاپے کی طرف تیزی سے آگے بڑھ جائیں گے کھڑے ہونے کا کوئی مقام نہیں ہے۔ پس بدیوں کا بھی یہی حال ہے جب آپ ان سے تعلق بڑھاتے ہیں تو پھر وہ بڑھتے چلے جاتے ہیں یا تعلق کاٹنے ہوں گے اور پھر وہ کٹتے چلے جائیں گے یا بڑھیں گے اور بڑھتے چلے جائیں گے بیچ کی کوئی حالت نہیں ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا کہ دیکھو بعض دفعہ ایک کالا سا تل چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ بیماری کا تل ہوتا ہے وہ پھیلنے لگتا ہے تو دیکھو تمہیں کتنی تکلیف ہوتی ہے کیسی گھبراہٹ ہوتی ہے کیسی کیسی فکروں میں مبتلا ہو جاتے ہو ڈاکٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتے طبیبوں کے پاس پہنچتے کہ یہ داغ تو پھیلتا جا رہا ہے اور بسا اوقات اگر صحیح علاج نہ ہو تو وہ چھوٹا سا داغ سارے چہرے کو بدنما کر دیتا ہے اور یہ داغ بعض دفعہ سفیدی کا داغ سفید برص کی صورت میں آتا ہے حالانکہ سفیدی کو لوگ پسند کرتے ہیں مگر جب یہ بیماری بن جائے تو وہ پھیلتے پھیلتے سارے جسم پر قبضہ کر جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ دیکھو گناہوں کا یہی حال ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم نے بہت معمولی معمولی ابتدائی گناہ کئے ہیں اور وہ کرتے چلے جاؤ اور ان کے خلاف تمہارے دل میں کوئی نفرت پیدا نہ ہو۔ اگر نہیں ہوگی تو پھر یہ داغ پھیلیں گے۔ پھر چھوٹے گناہ بڑھ کر بڑے گناہ بنیں گے اور بڑے گناہ بڑھ کر تمہیں گھیر لیں گے اور جہاں تک گھیرنے کا تعلق ہے قرآن کریم میں ایک ایسی آیت ہے جو بہت ہی انذاری آیت ہے۔ فرماتا ہے وہ لوگ نہیں بخشے جائیں گے جن کو ان کی سیآت نے گھیر لیا ہو۔ (البقرہ:82) یعنی خدا تعالیٰ اپنی بخشش کا ذکر فرماتا ہے کہ میں اگر چہ ہر گناہ کو بخش سکتا ہوں لیکن وہاں ایک بہت ہی باریک تعلیم یہ بھی دی کہ وہ لوگ جن کو ان کی برائی نے گھیر لیا ہو وہ نہیں بخشے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بعضوں کو کینسر کی بیماری گھیر لیتی ہے بعضوں کو دوسری بیماریاں ہیں سل ہے یا دوسری ایسی بیماریاں وہ گھیرے میں لے لیتی ہیں ان کا گھیرا نہیں ٹوٹا کرتا پھر تم گناہ کے گھیرے میں نہ آؤ یہ تعلیم ہے۔ اگر تم گھیرے میں آگئے تو پھر تمہاری

جوابی جدو جہد ہی ختم ہو جائے گی یا بے معنی ہو جائے گی اور بسا اوقات ختم ہو جاتی ہے پھر انسان اس چیز کو ایک تقدیر کے طور پر ایک قانون کے طور پر قبول کر کے اس پہ راضی ہو بیٹھتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں ایک اور گناہ ایسا پیدا ہوتا ہے جس کا دائرہ پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

تو رمضان مبارک میں جھوٹ کے خلاف اگر آپ جہاد کریں تو یاد رکھیں اس کے نتیجے میں آپ کے روزے میں بھی برکت ہوگی۔ آپ ویسے بھی تو خدا کی خاطر کھانے سے رک رہے ہیں، پینے سے رک رہے ہیں مگر اگر ساتھ یہ جہاد بھی شروع ہو جائے جو جھوٹ کے خلاف ہے، اس جھوٹ کے خلاف جو روزے کا زہر قاتل ہے، اگر جھوٹ کھالیا تو گویا سب کچھ روزے میں کھالیا اور روزے کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ پس جھوٹ کے خلاف اگر آپ جہاد شروع کریں گے اور باریکی سے گرد و پیش میں نظر رکھیں گے تو آپ کے روزے کی بھوک آپ کے لئے زیادہ ثواب لے کے آئے گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبولیت کی شرط سچائی رکھ دی ہے۔ پس جتنا آپ سچائی کی طرف بڑھیں گے اتنا ہی آپ کے روزے مقبول ہوتے چلے جائیں گے اور اس کے نتیجے میں آپ کو دنیا میں بھی یہ محسوس ہوگا کہ یہ روزہ آپ کے لئے روحانی صحت کا موجب بنا ہے۔

پس سارے عالم کو جھوٹ سے صاف کرنے کے لئے ایک بڑی عظیم جدو جہد کی ضرورت ہے۔ تبلیغ کے ذریعے جہاں لوگ احمدیت کو قبول کرتے ہیں وہاں ان کے اوپر اصلاحی، تربیتی کام کا آغاز وہیں سے شروع ہو جانا چاہئے اور جن قوموں میں جھوٹ پایا جاتا ہے وہاں اس کے خلاف جہاد کریں۔ بعض قومیں ہیں جو غریب بھی ہیں مگر سچی ہیں مگر بعض ہیں جو امیر بھی ہیں اور جھوٹی ہیں اور اسی طرح خاندانوں کا حال ہے، اسی طرح افراد کی کیفیت ہوتی ہے۔ تو آپ کو بیدار مغزی کے ساتھ جس شخص کو احمدیت کے دائرے میں لے کے آنا ہے اس کی کمزوریوں پر نظر ڈالنی ہوگی اور ان کی اصلاح کا جہاد فوراً شروع کرنا ہے کیونکہ کسی کا احمدیت میں آنا اس کے سوا کوئی معنے نہیں رکھتا کہ اب مجھے جو ٹھیک کرنا ہے کرلو میں حاضر ہوں، میں نے قبول کرلیا، جو اصلاح کا دور ہے وہ ختم نہیں ہوا، شروع ہوا ہے۔

قرآن کریم اسی مضمون کو بیان فرماتا ہے یہ کہہ کر، ہمیں یہ دعا سکھا کر کہ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا (آل عمران:194) اے ہمارے رب ہم نے سنا ایک منادی کرنے والے کو، ایک اعلان عام کرنے والے کو کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ

پس ہم ایمان لے آئے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سفر ختم ہونے کا اعلان ہے ہم ایمان لے آئے الحمدللہ بچ گئے ۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے اس کے بعد وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۔اب ہماری زندگی کا وہ دور شروع ہوا ہے جہاں ہم نے ایک نئے تخلیق کے عالم میں دوبارہ ابھرنا ہے، پھر سے پیدا ہونا ہے۔اس کے لئے ہماری درخواست یہ ہے، ہماری التجا یہ ہے کہ پرانے گناہوں کو، پرانی غلطیوں کو بخش دے اور جاری غلطیوں کی اصلاح فرماتا جا اور اس وقت تک ہمیں یہ توفیق دے، اس وقت تک ہم زندہ رہیں جب تک تیری نظر میں ہم نیکوں میں جان دے رہے ہوں، بدوں میں جان نہ دے رہے ہوں ۔پس ہر آنے والے کے لئے یہ کوشش ضروری ہے اور اپنی ذات کے لئے اگر یہ نہیں ہوگی تو آنے والے کے لئے بھی نہیں ہو سکتی۔

پس اس رمضان میں ان باتوں کو سمجھ کر ان سے حتی المقدور استفادے کی کوشش کریں۔خدا کرے کہ یہ رمضان ہمارے لئے ایسا زندہ ہو جائے کہ ہمیں ہمیشہ کی زندگی دے کر جائے، زندگی لے کر واپس نہ جائے۔آمین

محض لیلۃ القدر کی تلاش کافی نہیں جب تک قرآن کریم سے ایک دائمی، مستقل تعلق قائم نہ ہو۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 16؍فروری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

حٰمٓ ۞ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۞ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۞ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۞ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۞

(الدخان: 1 تا 8)

فرمایا:

یہ سورۃ دخان کی پہلی آٹھ آیات ہیں جن کی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے۔ان کا تعلق ماہ رمضان میں آنے والی ایک رات سے ہے۔رمضان کے آغاز میں میں نے جس آیت کی آپ کے سامنے تلاوت کی تھی اس میں سارے رمضان سے متعلق یہ فرمایا گیا تھا کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرة: 186)۔

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کہ اس کے بارے میں قرآن اتارا گیا یا اس مہینے میں قرآن اتارا گیا هُدًى لِّلنَّاسِ ہدایت ہے لوگوں کے لئے وَبَيِّنٰتٍ اور کھلی کھلی آیات رکھنے والا روشن نشان رکھنے والا مِّنَ الْهُدٰى ایسی کھلی آیات جن کا ہدایت سے تعلق ہے، ایسے روشن نشان جن کا ہدایت سے تعلق ہے وَالْفُرْقَانِ اور ایسے عظیم دلائل رکھتا ہے جن

کوفرقان کہا جاتا ہے جو کھرے کھوٹے میں اس طرح تمیز کر دیتی ہیں جیسے دن چڑھ جائے تو اندھیرے اور روشنی میں تمیز ہو جاتی ہے۔ تو اَلْفُرْقَانِ ہر اس غالب اور طاقتور دلیل کو کہتے ہیں جس کے بعد کسی ابہام کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔ یہ رمضان کے تعلق میں جو قرآن اتارا گیا، قرآن کی تفصیل ہے کہ قرآن کیا کچھ کہتا ہے۔

یہ آیات جو میں نے آج تلاوت کی ہیں ان میں یہی باتیں جو سارے رمضان کے متعلق فرمائی گئیں ہیں ایک رات کے متعلق فرمائی جارہی ہیں گویا رمضان میں ایک رات ایسی آتی ہے جو سارے رمضان کا خلاصہ ہے۔ پس وہ لوگ جو یہ اصرار کرتے ہیں کہ قرآن کریم رمضان ہی میں اتارا گیا ہے اس آیت کو کہاں لے جائیں گے اور اس کا کیا معنی کریں گے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ ہم نے قرآن کو ایک رات لَیْلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ میں اتارا ہے تو لازماً اس کے وسیع تر معنے ہیں اور اسی سے استنباط ہوتا ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو یہ فرمایا کہ دراصل اس رات سے مراد محض ایک رات نہیں بلکہ وہ اندھیری راتوں کا دور ہے جو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے زمانے میں بے حد گہری ہو چکی تھیں۔ ظلمت نے ڈیرے ڈال دیئے تھے، نور کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا اس رات میں یعنی زمانہ محمد مصطفی ﷺ میں قرآن کریم اتارا گیا۔ تو پھر کسی ایک مہینے کی بات بھی نہیں رہتی اور کسی ایک رات کی بات بھی نہیں رہتی وہ سارا دور ہی لَیْلَةُ الْقَدْرِ کا ایک عظیم دور بن جاتا ہے۔

جب حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ تفسیر پیش فرمائی تو بہت سے علماء نے آپ کے خلاف زبانیں دراز کیں، بہت بے ہودہ تبصرے کئے کہ ساری امت تو سمجھتی ہے کہ ایک ہی رات مراد ہے اور آپ نے سارا زمانہ مراد لے لیا ہے۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے جواب میں ان کو سمجھایا کہ تم کیوں قرآن کریم کے بطن کو محدود کرتے ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک رات بھی تھی یا اب بھی آتی ہے جس رات میں خدا تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کا خاص نزول ہوتا ہے اس رات کی جستجو کا احادیث میں کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ فرمایا میں کب کہتا ہوں کہ کوئی ایسی رات نہیں آتی مگر قرآن کریم خود اس رات کی جو تفاصیل بیان فرما رہا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ دراصل زمانہ نبوی ہے اور اعلیٰ درجہ کے معنی اس کے یہی ہیں کہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے ایک

زمانے کے اندھیروں کو ہمیشہ کی روشنی میں تبدیل کر دیا کیونکہ اس زمانے کے بعد جو صبح پھوٹی ہے پھر وہ دائمی صبح ہے۔ یہ معنے جو بہت ہی اعلیٰ ہیں اور قرآن سے ثابت ہیں ان کو کیوں چھوڑتے ہو۔

پس یہ جو آیت ہے جب یہ رمضان والی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے تو اس بات کو خوب کھول دیتی ہے کہ باوجود اس کے کہ رمضان والی آیت میں یہ فرمایا گیا تھا کہ اس مہینے میں قرآن اترا ہے اس آیت میں جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے فرمایا اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ گویا اس کو ہم نے ایک ہی رات میں اتارا ہے۔ اب امر واقعہ یہ ہے کہ رمضان ہی میں قرآن نہیں اترا آنحضرت ﷺ کے تمام وسیع دور میں قرآن اترا ہے جو تئیس سال تک پھیلا ہوا ہے اور مسلسل اترتا رہا ہے۔ اسی لئے مفسرین کو مشکل پیش آئی اور انہوں نے یہ ترجمہ کیا کہ مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اترنا شروع ہوا ہوگا۔ پھر یہ بھی اس کا معنیٰ لیا گیا کہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کا جو دور ہوا کرتا تھا وہ ایک رات میں یا ایک مہینے میں مکمل ہوتا ہو۔ مگر اب تو قرآن فرما رہا ہے کہ ایک ہی رات میں اتارا گیا اور پھر دور سارے قرآن کا ہر سال کیسے مکمل ہوسکتا تھا جب کہ قرآن ابھی پورا اترا ہی نہیں تھا۔ قرآن کریم تو تئیس سال میں پھیلا ہوا ہے، تئیس سال تک اترتا رہا ہے۔ اس سے پہلے جتنے رمضان آئے تھے ان کے متعلق لفظاً یہ کہا جا ہی نہیں سکتا کہ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ خواہ اس کی دہرائی ہو چکی ہو، اس کی دہرائی وہاں تک ہوتی تھی جہاں تک قرآن اُتر چکا تھا۔

پس درحقیقت حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو عظیم معنی اس آیت کے سمجھے اور ہمارے سامنے پیش فرمائے اس نے بہت سے تفسیری اندھیروں کو دور کیا اور یہ معنیٰ بھی ایک قسم کی لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ کا منظر پیش کرتے ہیں جس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کا نزول ہوا اور اندھیرے روشنیوں میں تبدیل کئے گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تفاسیر کے مقابل پر باقی پرانی باتیں تو واقعۃً یوں لگتا ہے جیسے روشنی کے پیچھے اندھیرا ہو۔ عظیم الشان تفاسیر ہیں جو نور کے سوتے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پس اس تعلق میں آج آپ کے سامنے کچھ باتیں رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر سب سے پہلے جمعۃ الوداع کی بات کرتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ تو جمعۃ الوداع ہی کا انتظار کرنے میں سال گزارتے ہیں اور مہینہ پھر گزارتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جمعۃ الوداع ہی ہے جس کے بارے میں قرآن اتارا گیا اور نہ قرآن میں جمعۃ الوداع کا ذکر ملتا ہے نہ

احادیث میں ملتا ہے کہ اس دن کوئی خاص برکتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہیں۔سلامتی اور برکتیں یہ دو لفظ ہیں دونوں کا تعلق لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے ہے۔

اور جمعۃ الوداع کے تعلق میں کہ اس جمعہ کا خیال کرو اس جمعے کا انتظار کرو، اس دن جو کچھ مانگنا ہے مانگ لو، آخری جمعہ ہوگا اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔مگر یہ عجیب بات ہے کہ ساری اُمت محمدیہ میں، صلی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلم ، یہ بات رواج پا چکی ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ وہ لوگ بھی جنہوں نے سارا سال نماز نہ پڑھی ہو وہ جمعۃ الوداع کے دن اکٹھے ہو جاتے ہیں۔مسجدیں بھر کر اچھل پڑتی ہیں یعنی وہاں سے نمازی چھلک کر باہر نکل آتے ہیں۔گلیوں میں تمبو تان لئے جاتے ہیں، بازار بند ہو جاتے ہیں اور ہر طرف ایک عظیم منظر دکھائی دیتا ہے عبادت کرنے والوں کا جو دیکھنے میں بہت اثر ڈالتا ہے لیکن جو دردناک پہلو ہے وہ یہ ہے کہ کہتے تو ہیں کہ خدا کی عبادت کے لئے ہم اکٹھے ہوئے ہیں اور خاص برکتیں حاصل کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں مگر جمعۃ الوداع کو اس طرح وداع کہتے ہیں کہ جمعوں کو ہی وداع کہہ جاتے ہیں اور جمعوں سے بھی چھٹی، نمازوں سے بھی چھٹی اور اگلے جمعہ جا کر دیکھیں تو بازار ہی خالی نہیں مسجدیں بھی خالی ہو چکیں ہوتی ہیں اور حیرت ہوتی ہے وہ لوگ آئے کہاں سے تھے؟ گئے کہاں؟ جو شمع کا پروانہ ہونے کے دعویدار تھے۔پروانے تو ہر رات میں جب شمع جلتی ہے پھر بھی آ جاتے ہیں۔ان کا عشق تو اس سے ثابت ہے کہ وہ اپنی جان نچھاور کر دیتے ہیں۔جل جاتے ہیں مگر ان کی محبت کی شمع نہیں جلتی۔وہ ہمیشہ روشن رہی ہے ہمیشہ روشن رہے گی۔تو یہ کیسی محبت ہے رمضان سے اور جمعۃ الوداع سے کہ آئے اور پھر اس طرح چلے گئے جیسے کبھی کوئی تعلق ہی قائم نہیں ہوا تھا۔پس یہ ایک جذباتی بات ہے دیکھنے میں بہت ہی اثر پذیر منظر ہے کہ دیکھو کتنا عظیم جمعہ آیا ہے سارے بازار بھر گئے گلیاں بھر گئیں لیکن بعد کے آنے والے جمعہ کا بھی تو خیال کرو جب مسجدیں بھی خالی ہو چکی ہوں گی۔وہی چند نمازی جو پہلے آیا کرتے تھے وہی آئیں گے شاید ان میں بھی کمی آ جائے کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ ایک مہینہ خوب محنت کی ہے اب چند جمعہ آرام بھی تو کر لیں۔قرآن کریم جو منظر پیش کرتا ہے اس کے پیش نظر جیسا کہ میں نے بیان کیا اول تو جمعہ کا ذکر نہیں ہے، ذکر ہے تو رات کا ہے یا ذکر ہے تو سارے رمضان کا ہے اور سارے رمضان میں قرآن کریم جو خصوصیت سے اتارا گیا اس کا وہ معنی بھی درست ہے جو عموماً مفسرین کرتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ

الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ میں اس کی تردید نہیں کرتا وہ بھی ایک حد تک چسپاں ہوتا ہے۔ مگر عظیم تر معنے جو ہے اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ رمضان کے مہینے میں قرآن کریم جستہ جستہ اتارا گیا ہے اور جتنا بھی اتارا گیا ہے اس کی دہرائی بھی ہوتی رہی۔ جبرائیلؑ خصوصیت کے ساتھ نازل ہوتے رہے۔ مگر جو بنیادی اور مرکزی معنی ہے وہ یہی ہے کہ قرآن کریم رمضان کے مہینے میں جو برکتیں ہیں جس میں تمام عبادتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں ان کے متعلق اتارا گیا ہے۔ یہ سمجھانے کے لئے کہ اس مہینے کی برکتیں ایسی ہیں جن کو حاصل کرو، ورنہ قرآن کے فیض سے محروم رہ جاؤ گے۔ اگر قرآن اس مہینے کی برکتوں کے متعلق اتارا گیا ہے تو پھر ان برکتوں سے جب محروم ہو گے تو پھر قرآن کے فیض سے محروم رہو گے۔

مگر اس آیت میں جو بات پیش کی گئی ہے اس میں ایک اور بہت ہی عظیم اشارہ بھی ملتا ہے۔ فرمایا اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ (الدخان:4)

کہ دیکھو ہم نے اس قرآن کو لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ کے متعلق اتارا ہے یا ایک لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ میں اتارا ہے اور یہ جو برکت ہے اس کے ساتھ انذار بھی داخل ہے۔ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ یاد رکھنا یہ برکتوں والی رات ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے یا جس کے متعلق اتارا گیا ہے مگر ہم متنبہ کرتے ہیں کہ بہت ہی انذار کا پہلو بھی داخل ہے اس برکت کی خوشخبری کے ساتھ اور وہ یہ ہے فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ۔ یہ وہ رات ہے جس میں تمام حکمت کی باتوں میں فرق کر کے دکھایا جائے گا اور کھول کھول کر پیش کی جائے گی۔ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ہماری طرف سے یہ ایک فیصلہ شدہ تقدیر ہے۔ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ یقیناً ہم ہی ہیں جو ہمیشہ مرسلوں کو بھیجا کرتے ہیں رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ یہ تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ یقیناً وہ بہت سننے والا اور بہت جاننے والا ہے۔ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا وہ آسمانوں کا رب بھی ہے اور زمین کا بھی اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ کاش تم ایمان لے آتے تم ایمان لانے والے کیوں نہیں بنتے؟

یہاں جو اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ ہے اس آیت کے اس ٹکڑے نے دراصل وہی بات پیش فرمائی ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ کے تعلق میں بیان فرمائی تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ کا تم زمانہ اتنا محدود کرتے

ہو کہ رمضان کی ایک رات ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ زمانہ نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کا تمام زمانہ ہے بلکہ ہر نبی کا زمانہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ہوا کرتا ہے کیونکہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ہی ہے جس میں نبوت کا ظہور ہوتا ہے۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ہی ہے جس کو روشنی میں تبدیل کرنے کے لئے آسمان سے نور اترتا ہے۔ فرمایا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ہی میں تمام انبیاءؑ بھیجے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ جو آیت ہے یہ اس بات کو کھول رہی ہے اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ہماری طرف سے ایک تقدیر ہے اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ کہ ہم ہمیشہ مرسل بھیجا کرتے ہیں اور جو مرسل بھیجتے ہیں ان کا اسی لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ سے تعلق ہے اور جو مرسل بھیجے جاتے ہیں۔ فرمایا مُرْسِلِيْنَ ان کے متعلق یاد رکھیں کہ وہ نذیر بھی ہیں اور بشیر بھی ہیں۔ ڈرانے والے بھی ہیں اور خوشخبریاں دینے والے بھی ہیں۔ پس مبارک لفظ کے ساتھ منذر کہہ دینا صاف بتاتا ہے کہ یہ دو پہلو ہیں جن کا اس رات سے تعلق ہے۔

اور ایک اور پہلو جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ فرمایا قرآن کریم اس رات کے متعلق اتارا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس رات کے تمام مضامین قرآن کریم میں موجود ہیں۔ یہ ایک بہت اہم پہلو ہے رات تو آ کے گزر جاتی ہے قرآن تو نہیں گزر جاتا، قرآن تو ہمیشہ ہمارے سامنے رہتا ہے۔ پس یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ تم ایک رات میں برکتیں ڈھونڈ نہیں سکتے جب تک ان برکتوں سے دائمی تعلق نہ قائم کرلو جو تمام تر قرآن میں موجود ہیں۔ اس لئے ایک رات اٹھ کر شور مچادو اور یہ سمجھو کہ تم نے جو کچھ مانگا تھا سب کچھ مل گیا اور اب مزید تمہیں کوئی حاجت نہیں رہی اگلے سال پھر مانگنے آ جاؤ گے۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، قرآن کریم میں جو باتیں ہیں وہ ساری اس رات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ گویا اس رات کے ساتھ جتنی برکتیں ہیں وہ قرآن میں موجود ہیں۔ رات گزر جائے گی مگر قرآن تو تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ اگر اس سے دائمی تعلق رکھتے ہو تو رات کی برکتیں بھی ملیں گی۔ اگر اس سے تعلق نہیں ہے تو رات کی برکتوں سے بھی محروم رہو گے کیونکہ یہاں قرآن کو لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے کاٹا جا ہی نہیں سکتا۔ نہ قرآن کریم کو رمضان مبارک سے کاٹا جاسکتا ہے، نہ قرآن کریم کو لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے کاٹا جاسکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن سے تم کاٹے جاؤ اور رمضان نصیب ہو جائے۔ اس لئے محض لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی تلاش کافی نہیں ہے جب تک قرآن کریم سے ایک دائمی مستقل تعلق قائم نہ ہو اور قرآن کریم کے مضامین پر غور نہ کرو۔

ایک اور بات اس میں جو قابل توجہ ہے۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ اس رات میں ہر اہم اور حکمت والے معاملے کا فیصلہ کیا جاتا ہے وہ فیصلہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تقدیروں کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ایک تو ایسے معاملات ہیں جن کا تعلق زمانے کی تقدیر سے ہے اور ہر زمانے میں ایک لَيْلَةُ الْقَدْرِ جب آتی ہے یعنی وہ دور جس میں خدا تعالیٰ مرسل بھیجتا ہے وہ دور جس میں خدا تعالیٰ غیر معمولی طور پر بشیر اور نذیر بنا کر اپنے نمائندے بھیجا کرتا ہے اس دور میں تقدیروں کے فیصلے ہوتے ہیں۔قوموں کی تقدیریں بنائی جاتی ہیں اور جو بدنصیب ہوں ان کی بگڑی ہوئی تقدیر کے فیصلے کھول دیئے جاتے ہیں لیکن ایک اور بات بھی اس میں ہے وہ ہے انفرادی فیصلے، ہر انسان کی تقدیر کا فیصلہ اس رات میں کیا جاتا ہے اور وہ ایسا فیصلہ ہے جس کا آپ کو علم ہوسکتا ہے۔وہ جو عظیم فیصلے ہیں ان کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں پتا نہیں وہ کیا فیصلے ہوئے ہیں۔کون سی قومیں بچیں گی، کون سی زندہ رکھی جائیں گی اور باقی رکھی جائیں گی۔کون سی قوموں کی صف لپیٹ دی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لئے ماضی میں دفن ہو جائیں گی۔یہ سب اہم فیصلے جو ہوتے ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں۔مگر ہر ذات سے بھی تو کچھ فیصلے متعلق ہوا کرتے ہیں۔ہر فرد بشر سے بھی تو کچھ فیصلے متعلق ہوتے ہیں۔وہ بھی اسی رات میں کئے جاتے یں اور ان کا علم ہر انسان کو ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے کیونکہ جب وہ خدا کے حضور پیش ہوتا ہے تو اس کے متعلق کیا فیصلے ہوئے ہیں اس کا اس کو پتا نہ لگے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا اور پہچان کیا ہے؟ کس طرح پتا چلے گا کہ اس کے متعلق اچھے فیصلے ہوئے ہیں، برکتوں والے فیصلے ہوئے ہیں، انذار والے فیصلے نہیں ہوئے۔وہ اس طرح پتا چلتا ہے کہ انسان جب لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی تلاش میں راتیں گزارتا ہے تو کچھ اسے خود فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن فیصلوں کی اس کو توفیق ملے۔جو نیکی پر قائم ہونے کے فیصلے ہیں اور گناہوں کو چھوڑنے کے فیصلے ہیں وہی فیصلے ہیں جو آسمان پر اس کے متعلق ہوتے ہیں اور خدا ان کی توفیق عطا فرماتا ہے۔پس اگر آپ اپنے دل میں کوئی ایسے فیصلے نہ کریں جو آپ کو ایک نئی زندگی عطا کرنے والے فیصلے ہوں، جزوی طور پر بھی آپ کو یہ توفیق نہ ملے کہ بعض بدیوں کو ہمیشہ کے لئے ترک کرنے کا ایک عزم کرلیں اور فیصلہ کریں کہ ہم کبھی اب اس بدی کے قریب تک نہیں پھٹکیں گے اور بعض نیکیاں اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیں اور کہیں کہ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہمیشہ اس نیکی کو مقدم رکھیں گے تو یقین جانیں کہ وہی فیصلے ہیں جو لَيْلَةُ الْقَدْرِ میں

آپ کی ذات کے متعلق آسمان سے ہوں گے کیونکہ یہ قبولیت کی رات ہے۔

ہر نیکی میں آسمان سے مددگار اترتے ہیں مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۞ سَلٰمٌ (القدر:5 تا 6) ہر بات میں سلامتی ہوتی ہے۔ مگر انسان کی اپنی تقدیر کے فیصلے کا اس کی اپنی ذات کے ریزولیوشن سے، اس کے اپنی ذات میں کئے ہوئے عہدوں سے ایک گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ (الرعد:12)

اب فیصلہ تو اللہ نے کیا ہے اور یہاں بھی یہی فرمایا گیا ہے يُفۡرَقُ فیصلے کئے جائیں گے كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ہر فیصلہ جو کیا جائے گا وہ امر حکیم ہوگا یعنی حکمت کے ساتھ فیصلے ہوں گے۔ یونہی اندھا دھند فیصلے نہیں ہیں کہ جس طرح بعض دفعہ بڑے لوگ بیٹھ جاتے ہیں کہ چلو جی یہ اس کو دے دو اور فلاں اس کو دے دو ان کو پتا ہی کچھ نہیں ہوتا کہ جس کے حق میں فیصلے کر رہے ہیں وہ اس لائق بھی ہے یا نہیں۔ تو قرآن کریم فرما رہا ہے کہ اللہ اس رات جو فیصلے کرتا ہے وہ تمام فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور انسانی فیصلوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ پہلے ہوتے ہیں ان کے مطابق پھر ان کی سچائی پر نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ آسمان سے ایک فیصلہ صادر فرماتا ہے۔

اس کی تائید میں یہ دلیل ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت بدلتا نہیں جب تک پہلے وہ خود اپنی حالت نہ بدل لے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس نے اپنی حالت بدل لی ہے تو اللہ پھر کیسے بدلے گا۔ وہ تو بدلی گئی، تبدیل ہو گئی، غور کی بات ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں خدا ان کی حالت نہیں بدلتا مگر یہ جو ترجمہ ہے یہ درست نہیں۔ ترجمہ ہے مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ جب تک وہ اپنے دل کی اندرونی نیتوں کو تبدیل نہ کریں، وہ اپنے دلوں میں کچھ فیصلے نہ کریں، اس وقت تک ان کی حالت تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ انسان خواہ کیسے ہی اچھے فیصلے کرے محض اپنے فیصلوں سے توفیق نہیں پاسکتا کہ ان اعلیٰ مقاصد کو حاصل کر لے جن کی خاطر فیصلے کئے ہیں۔ فیصلوں کے پورا ہونے کی توفیق آسمان سے اترتی ہے۔ پس اَنۡفُسِهِمۡ نے ہمیں بتایا کہ دراصل قوم اپنی حالت تبدیل نہیں کیا کرتی حالت تبدیل کرنے کے ارادے باندھا کرتی ہے، حالت تبدیل کرنے کی تمنائیں دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اور

چونکہ اخلاص کے ساتھ ایسا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ جب جان لیتا ہے کہ واقعۃً ان کے دلوں میں پاک ارادے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ بدیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں چاہتے ہیں کہ بدیوں سے رہائی حاصل کر کے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی آزادی کے دور میں داخل ہو جائیں تب آسمان سے تقدیر اترتی ہے۔ یہ ہے یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ ہر بات کا فیصلہ ہوتا ہے مگر فیصلہ حکمت والا ہوتا ہے حکمت سے عاری نہیں ہوتا۔

پس اب سوال یہ ہے کہ یہ جو راتیں لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ کی راتیں کہلاتی ہیں، جمع کا صیغہ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ کوئی پتا نہیں کہ کون سی رات وہ رات ہے، ان راتوں میں ہمارے حق میں، انفرادی طور پر ہم سب کے حق میں کون کون سے فیصلے ہوں گے، اگر بغیر فیصلوں کے گزر گئے تو جیسے تھے ویسے ہی رہے اور بڑی محرومی ہے کہ کسی عظیم دربار میں آپ پہنچیں اور اپنے خالی دامن کو پیش کر کے اس سے کچھ مانگیں اور کچھ بھی نہ ملے۔ ساری رات چلاتے رہیں مگر کشکول خالی کا خالی رہے اور اس میں کچھ بھی نہ اترے۔ جو اترنا ہے اس کے لئے یہ شرطیں ہیں جو میں آپ کے سامنے قرآن کے حوالے سے رکھ رہا ہوں کہ آپ کو اس رات میں درحقیقت کچھ فیصلے کرنے چاہئیں کیونکہ اس کی برکتیں بارش کی طرح خود بخود نہیں اترتیں۔ ان برکتوں کے مضمون پر روشنی ڈالتے ہوئے اللہ فرماتا ہے کہ ان برکتوں کا تعلق کچھ فیصلوں سے ہے اور وہ تقدیر خیر وشر کے فیصلے ہیں۔ ان فیصلوں کا تعلق تمہاری اپنی ذات سے ہے۔ تمام تر اپنے نفوس میں پاک تبدیلیاں لے کر اس رات حاضر ہو گے تو یاد رکھو کہ تمہارے حق میں آسمان سے ویسی ہی تقدیریں جاری کی جائیں گی۔ اگر تم خالی خولی لفظوں کے تحفے لے کر آؤ گے تو خالم خولی لفظ تمہارے اوپر لوٹا دیئے جائیں گے جیسے خالی وہ گئے تھے خدا کے حضور ویسے ہی خالی اتر آئیں گے۔

تو دراصل لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ہے جس کا مضمون رمضان میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ پس جہاں تک زمانے کا تعلق ہے میں پچھلی دفعہ، پچھلے رمضان میں اس پر روشنی ڈال چکا ہوں۔ اب میں انفرادی پہلو کو نمایاں کر کے آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے زمانہءِ خیر وشر کی بات کی ہے پورے زمانہ نبوی کو ایک لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ قرار دیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا کہ ایک رات واقعۃً بھی ایسی آتی ہے جو ساری زندگی سنوار دیتی ہے یا اگر

محرومی ہوتو ساری زندگی کی محرومیاں چھوڑ کے چلی جاتی ہے۔اسی لئے فرمایا کہ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ وہ رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ ہزار مہینے تقریباً اسّی (80) سال بنتے ہیں۔انسان کی عمر بھی اسّی (80) سال کے لگ بھگ شمار کی جاتی ہے۔یعنی غریب قوموں میں تو اگر چہ زندگی کی اوسط کم ہوگئی ہے مگر احقاب کا لفظ جو عربی میں آتا ہے وہ اسّی (80) سال کا ہی ہے اور قرآن کریم نے بھی ایک صحتمند آدمی کی اوسط عمر اسّی (80) سال ہی مقرر فرمائی ہے۔خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسّی (80) سال سے اوپر کچھ مہینے۔تو اب یہ دیکھ لیجئے کہ ایک رات ایسی آتی ہے جو ساری زندگی کی راتوں سے، ساری زندگی کے دنوں سے، ہر ہر لمحے سے برکتوں میں بڑھ جاتی ہے اور بڑی فضیلت والی رات ہے جو ساری زندگی پر بھاری ہے۔ایک طرف یہ رات اور دوسری طرف باقی ساری راتیں، سارے دن، تمام لمحات، جن کو وہ راتیں اور دن سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔اس رات کی تلاش بھی ضروری ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہاں اسّی (80) مہینوں والی رات سے مراد واقعۃً ایک ایسی رات ہے جو قبولیت کی رات ہے۔آنحضرت ﷺ نے اس رات کا تعلق بخشش سے باندھا ہے اور سب سے بڑی برکت یہ بیان فرمائی ہے کہ پچھلے سارے گناہ بخشے جاتے ہیں اور اس بخشش کا تعلق سچی توبہ سے ہے۔پس وہ رات جو توبہ کی رات ہے وہ نصیب ہو جائے یہ مراد ہے۔ایسی رات جس میں انسان اپنے ماضی پر نگاہ ڈال کر اپنی کمزوریوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے اور ایک ایک کر کے ان کو رد کرتا چلا جائے اور ایک ایک کے تعلق میں خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے اور ان سے دور ہٹنے کا فیصلہ کرلے۔یہ جو اپنی زندگی کا تفصیلی جائزہ ہے یہ وہ جائزہ ہے جو اس رات کو آپ کے لئے برکتوں سے بھر سکتا ہے۔ورنہ چند باتیں آپ مانگ کر آجائیں کہ ہمیں دولت مل جائے، زمین مل جائے، مقدموں کے فیصلے ہو جائیں اولاد نہیں ہو رہی اولاد عطا ہو جائے تو اس سے ان دعاؤں کے قبول ہونے یا نہ ہونے سے آپ کی زندگی کی برکتوں کا اصل میں کوئی تعلق نہیں ہے۔وہ زندگی کی برکتیں اس فیصلے سے تعلق رکھتی ہیں کہ تم خدا کے ہوگئے ہو، اس فیصلے سے تعلق رکھتی ہیں کہ اب یہ برکتیں زندگی بھر تمہیں کبھی نہیں چھوڑیں گی اور ہمیشہ کے لئے تمہارے اندر ایک پاک تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔وہ پاک تبدیلی کیا ہے هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ کہ تمہارے اندر سے

ایک صبح پھوٹ پڑے گی اور جب صبح پھوٹ پڑے گی تو رات کے سارے اندھیرے ماضی بن گئے وہ خوابوں کی باتیں ہوگئیں اور صبح جب پھوٹتی ہے تو پھر اندھیروں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہتا وہ زمانہ گزر جاتا ہے۔ پس اسی لئے میں نے کہا کہ دائمی ہے۔ یہ فرشتے اترتے ہیں اور جب اندھیری رات صبح میں تبدیل ہو جاتی ہے پھر ہمیشہ انسان اسی نور میں رہتا ہے، اسی نور میں زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے خدا کے حضور حاضر ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اس رات کی تلاش کرنی چاہئے جو انفرادی رات ہے۔

اس تعلق میں احادیث کا مطالعہ کریں تو آنحضرت ﷺ کی سیرت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ خصوصیت سے اس رات کی تلاش آخری دس راتوں میں کیا کرتے تھے اور بہت ہی غیر معمولی انہاک سے نیکیاں بڑھا دیا کرتے تھے۔ جب پہلی دفعہ میں نے اس حدیث کو پڑھا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں جو لمحہ لمحہ خدا کے لئے وقف تھا نیکیاں بڑھانے کی گنجائش کہاں تھی کیونکہ وہ حد استطاعت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ مگر پھر مجھے یہ بات سمجھ آئی کہ ہر لمحے کے اندر بھی اپنی ایک شان ہوا کرتی ہے اور روح پگھل کر ہر لمحے کو ایک نئی شان بھی عطا کرسکتی ہے۔ پس آنحضرت ﷺ ان معنوں میں تو نیکیاں نہیں بڑھا سکتے تھے کہ بعض لمحے جو نیکیوں سے عاری تھے، خالی تھے، ان میں بھی نیکیاں بھر دیں کیونکہ آپؐ کا تو لمحہ لمحہ مجسم نیکی تھا۔ مگر خدا تعالیٰ کی عبادت میں، اس کے حضور گریہ وزاری میں ایک ایک لمحے کو ایک نیا نور عطا کرنے کے لئے آپؐ جو محنت فرمایا کرتے تھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آخری عشرہ آتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیا کرتے تھے اور راتوں کو خود بھی جاگتے تھے اور گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔ کہتے اٹھو اٹھو یہ سونے کے دن نہیں ہیں جاگو تا کہ تمہاری زندگی دن میں تبدیل ہو جائے۔ یہ بخاری کتاب فضل لیلۃ القدر سے حدیث لی گئی ہے۔

(صحیح بخاری کتاب فضل لیلۃ القدر باب العمل فی العشر الأواخر من رمضان)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے ایک دفعہ پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ **لیلۃ القدر** ہے تو اس میں کیا دعا مانگوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا تم یوں دعا کرنا:

''اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی''

(سنن ابن ماجه كتاب الدعاء، باب الدعا بالعفوو العافية)

کہ اے میرے اللہ تو بہت بخشش کرنے والا ہے **تحب العفو** تو تو بخشش سے محبت کرتا ہے **فاعف عنی** پس مجھ سے بخشش کا سلوک فرما۔اب یہ دیکھنے کی بات ہے بڑی اہم بات ہے کہ کوئی مثبت چیز مانگنے کی نصیحت نہیں فرمائی گئی۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک منفی دائرے کی دعا ہے کہ جو پہلے گناہ تھے وہ مٹ جائیں اور پہلے گناہوں سے خدا تعالیٰ ہمیں بخشش عطا فرمائے لیکن یہ نہیں فرمایا کہ اس کے بعد کیا مانگو۔امر واقعہ یہ ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ کا مضمون ہی اس بات سے تعلق رکھتا ہے کہ اگر بخشش ہوئی تو صبح ہوگئی اور جو صبح ہے وہ پھر ایک مثبت دائمی رہنے والی حالت کا نام ہے جو پھر کبھی رات میں تبدیل نہیں ہوگی یعنی انسان کی باقی تمام زندگی اس صبح کی حالت میں کٹے گی۔تو استغفار کا مضمون سکھایا ہے۔

فرمایا ہے اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ہے تو پھر بخشش ہی کی دعا کرنا یہی تمہارے لئے بہت کافی ہے۔اگر خدا تعالیٰ تمہارے پچھلی زندگی کے سارے گناہ باطل کر دے اور ان پر بخشش کی اور رحمت کی چادر ڈال دے تو پھر تم امن میں آگئے ہو تمہیں اس کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔پس سب سے پہلے تو اس دعا پر زور دینا چاہئے کہ اے خدا تُو عفو ہے بہت ہی بخشش کرنے والا ہے، بخشش سے محبت کرتا ہے ہم سے بھی یہ سلوک فرما اور بخشش کی طلب کے لئے جو پہلے فیصلہ ہونا ضروری ہے اس کا اسی مضمون سے تعلق ہے جو میں بیان کر چکا ہوں کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ یہ ناممکن ہے کہ آپ بخشش کے لئے دعا مانگیں اور گناہوں پر اصرار کا عزم ساتھ ساتھ جاری رہے۔یہ ناممکن ہے کہ دل کی گہرائی سے آپ یہ چاہیں کہ اے خدا میرے گناہ بخش دے اور فیصلہ کریں کہ تو بخش دے میں نے پھر بھی کرنے ہیں اور نہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔یہ جو ایک منفی پہلو ہے وہ دل میں موجود رہتا ہے خواہ انسان باشعور طور پر اسے سمجھے نہ سمجھے اور اکثر لوگ بخشش کی دعا اس فیصلے کے بغیر مانگتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ کیا کیا برائیاں ان کے اندر ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ سارا سال انہوں نے کیا کیا گناہ کئے، کس کس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہوئے۔سب کچھ سمجھنے کے باوجود وہ خالی بخشش مانگتے ہیں۔جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو باز نہیں آنا ہم تو نافرمانی پر قائم رہیں گے۔اس لئے تیرا کام ہے تو بخش، تو بخشا

چلا جائے۔ یہ جذباتی باتیں ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی بخشش اگر ہوئی ہے تو رمضان کے بعد کی زندگی بتائے گی کہ بخشش ہوئی تھی کہ نہیں۔ اگر خدا نے بخشا ہے تو ان کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو جانا چاہئے اور رمضان کے بعد کی حالت رمضان کی ایک رات پر گواہی دینے والی بنے گی۔

اگر باقی سب زندگی خواہ اسّی (80) برس کی بھی ہو یعنی باشعور آدمی جب دعا مانگتا ہے تو اس کے بعد اسّی (80) سال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اسّی (80) سال کے اندر مر جائے گا ہوسکتا ہے اس کو اسّی (80) سال اور نصیب ہوں۔ اسّی (80) سال بھی زندگی رہے تب بھی پرانی حالت واپس نہ آئے تب وہ ایک رات باقی زندگی پر بھاری ہوگی ورنہ نہیں ہوسکتی۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک رات بھاری تو ہو مگر آنے والی زندگی میں کچھ بھی تبدیل نہ کر سکے۔ پس لَیْلَۃُ الْقَدْرِ کے مفہوم کو سمجھیں۔ یہ ایک بہت ہی گہری حقیقت ہے کہ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ کی مقبولیت کے نتیجہ میں آپ کی زندگی میں ایسا انقلاب برپا ہوسکتا ہے کہ ساری زندگی اُس کا لمحہ لمحہ کی برکتیں پا جائے اور اُس کا لمحہ لمحہ اِس رات کے نور سے منور ہو جائے۔ یہ مقصد حقیقی بخشش کی طلب کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ اگر فرضی بخشش کی باتیں ہیں تو وقتی طور پر ہوسکتا ہے آپ اپنے بعض جرائم کی سزا سے بچ بھی جائیں۔ کوئی آدمی بددیانتی کرتا ہے اور ساری رات لَیْلَۃُ الْقَدْرِ میں روتا ہے کہ اے اللہ میں پکڑا نہ جاؤں، مقدمہ چل رہا ہے میرے حق میں فیصلہ ہو جائے۔ یہ بعید نہیں کہ ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ مضطر کی دعا قبول فرما لیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما لیتا ہے کہ اس نے پھر دوبارہ یہ حرکت کرنی ہے۔ مگر اس کی زندگی میں تبدیلی نہیں پیدا کرتا۔ تبدیلی کا مضمون اور ہے وہ لَا یُغَیِّرُ والی آیت سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ مشرک کے متعلق بھی فرمایا کہ اگر وہ سیلاب میں اور طوفانوں میں گھر کر موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے اور پھر دعا کرے کہ اے خدا مجھے بچالے تو اللہ تعالیٰ پھر بھی بچا لیتا ہے لیکن جب وہ خشکی کی طرف لوٹتا ہے تو خدا کی طرف نہیں لوٹتا، اپنے شرک کی طرف لوٹتا ہے۔ تو باوجود علم کے محض کسی وقتی سزا سے خدا کا بچا دینا یہ اس کی عظیم مغفرت کے نتیجہ میں تو ہے مگر اس کے نتیجے میں جس کے ساتھ یہ سلوک ہو اس کی زندگی تبدیل نہیں ہوتی۔ زندگی تبدیل ہونے کے اور راز ہیں جن سے لَیْلَۃُ الْقَدْرِ والی آیات پردہ اٹھا رہی ہیں اور جن سے لَا یُغَیِّرُ والی آیت جو میں نے بیان کی

وہ پردہ اٹھا رہی ہے۔تم اپنے اندر ایک ایسی تبدیلی پیدا کرو جو واقعۃً تمہاری زندگی تبدیل کر دینے والی ہو تو یاد رکھو تمہارے حق ، میں آسمان سے یہ تقدیر نازل ہوگی کہ تم نے دیانت داری سے فیصلہ کیا ہے توفیق تمہیں نہیں مل رہی خدا توفیق عطا فرمائے گا۔واقعۃً تمہارے ارادوں کو عملی طور پر تمہاری زندگی میں رائج ہونے ،ثابت ہونے ،اطلاق پانے کی توفیق بخشے گا اور لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی بخشش اس کے بعد ایک نیا آدمی پیدا کرتی ہے۔ویسا آدمی پیدا کرتی ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس کی بخشش ہو جائے وہ پھر وہ تو نہیں رہتا جو پہلے تھا۔فرمایا وہ تو ایسا ہوتا ہے جیسے ماں نے ابھی جنا ہے۔ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہو جاتا ہے جو کوئی داغ لے کے نہیں آیا بلکہ ایک فطرت سلیمہ، پاک اور نیک فطرت اور نیک مزاج لے کر پیدا ہوا ہے۔تو آپ یہ کہہ دیں کہ عفو ہو گیا،رات نصیب ہوگئی اور باقی زندگی اسی طرح پہلے کی طرح ہو تو یہ ایک جھوٹ ہے جس میں آپ زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔خوش فہمیاں ہیں اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

پس یاد رکھیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ یہ دعا کرنا تو اس سے مراد عفو کے عام معنی نہیں بلکہ وہ عفو مراد ہے جس کی تشریح خود رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ عفو ہوگی تو نئی زندگی پاؤ گی۔عفو خدا کی طرف سے نصیب ہوگی تو گویا تم نئی پیدا ہوئی ہو،تم پہ کوئی داغ باقی نہیں رہے گا،ایک خلق آخر بن کر تم دنیا میں ظاہر ہوگی۔یہی مضمون ہے جو ہر طلب کرنے والے کے لئے ہے۔جو راتیں باقی ہیں اگر لَيْلَةُ الْقَدْرِ ان میں ہے تو پھر اس توجہ سے اس دعا کو مانگیں اور اس کے معانی کو سمجھتے ہوئے اس دعا کو مانگیں۔بخاری کتاب فضل لیلة القدر میں ایک اور روایت ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے کچھ صحابہؓ کو لَيْلَةُ الْقَدْرِ خواب میں رمضان کے آخری سات دنوں میں دکھائی گئی۔اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب رمضان کے آخری ہفتے پر متفق ہیں اس لئے جو شخص لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی تلاش کرنا چاہے وہ رمضان کے آخری ہفتے میں کرے۔

(صحیح بخاری کتاب فضل لیلة القدر باب التماس لیلة القدر فی السبع الأواخر)

یہاں ہفتے سے مراد سات دن ہیں۔آخری سات راتوں میں اور آخری دس راتوں کی محنت اپنی جگہ لیکن لَيْلَةُ الْقَدْرِ کو آخری سات راتوں میں مخصوص کرنا آنحضرت ﷺ کی اپنی رؤیا

سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ صحابہؓ کی ایسی رؤیا سے تعلق رکھتا تھا جن کا اتفاق ہو گیا اور یہ ایسا مضمون ہے جو ہمیشہ کے لئے اسی طرح جاری ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی فضل نازل ہونا ہو تو اکثر لوگوں کو جو رؤیا دکھائی جاتی ہیں وہ ایک ہی مضمون کی، ایک ہی طرح کی اور بہت سے امور میں اتفاق کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس وقت اگر اس سے برعکس کوئی رؤیا آجائے تو یہ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ اس کے نفس کی رؤیا ہے کیونکہ آسمان سے جو برکتوں کا نزول ہو رہا ہے اس کی روشنی میں تو رؤیا اور طرح کی دکھائی جا رہی ہیں۔ ایک اکیلا آدمی کوئی بدنصیبی کی رؤیا دیکھ لیتا ہے، کوئی غلط مضمون اس کو دکھایا جاتا ہے تو صاف پتا چلتا ہے کہ اس کے نفس کا تأثر ہے۔ حقیقت میں ان رؤیائے صادقہ کے خلاف اس رؤیا کو نہیں لیا جا سکتا جو کثرت سے دنیا میں دوسری جگہ لوگوں کو دکھائی جا رہی ہیں اور جب بھی ایسا ہو ہمیشہ یہ نتیجہ درست ثابت ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اگر کوئی خاص فضل نازل فرمانا ہے تو مختلف ممالک کے احمدیوں کو ویسی ہی خوابیں آنے لگ جاتی ہیں اور موسم کے طور پر آتی ہیں۔ صاف پہچانی جاتی ہیں کہ یہ الٰہی خوابیں ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کو ہمیشہ ایک ہی طرح کی خوابیں اپنے نفس کے مطابق آتی رہتی ہیں۔ بعضوں کے نفوس ایسے ہیں جو خود ڈرے ہوئے ہیں اور ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں۔ ان کو جب خواب آئے نحوست کی خواب ہی آتی ہے اور وہ لکھ لکھ کے مجھے ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ مجھے کوئی ڈر نہیں آپ کی خوابوں کا۔ آپ نے جتنا ڈرنا ہے ڈرتے رہیں۔ بے شک ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ یہ وہ خوابیں ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی بائیں طرف تھوک دیا کرو اور لاحول پڑھ کے سو جایا کرو کیونکہ جو عالمی مضمون ہے رؤیا کا وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی رکھتا ہے اور رؤیا اپنی اندرونی صفائی، اپنے اندرونی نشانات سے صاف پہچانی جاتی ہے کہ الٰہی رؤیا ہے۔ ایک یہ بات ہے جو اس حدیث سے ضمناً ہم نے پائی یعنی زائد فائدے کے طور پر پائی۔

دوسری یہ کہ آنحضرت ﷺ نبی ہیں۔ عالم الغیب سے سب سے زیادہ تعلق آپؐ کا ہے لیکن اس کے باوجود آپؐ کے غلاموں سے بھی خدا ایسا تعلق رکھتا تھا کہ ان کو ایسی سچی خوابیں دکھاتا تھا کہ وہ مبشر بن کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور یہ مضمون کہ کسی اور شخص کو نبی کو خوشخبری دینے کے لئے چنا جائے یہ قرآن کی دوسری آیات سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ وہ جو

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق آتا ہے کہ آپؑ کے پاس حاضر ہوئے اور ان فرشتوں کے متعلق بھی اور بعض دوسرے فرشتوں کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ انسان تھے لیکن نیک اور بزرگ انسان تھے جن کو خدا تعالیٰ نے پیغام دیا اور وہ پیغام ان کے پاس امانت تھا۔ وہ لے کر وقت کے نبی کے پاس حاضر ہوئے کہ خدا نے ہمیں یہ پیغام بھیجا ہے اور یہ ہوسکتا ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کے تعلق میں ہوسکتا ہے تو باقی انبیاءؑ کے تعلق میں تو ضرور ہوا ہوگا اس لئے وہ تفسیر لازماً غلط نہیں ہوسکتی۔ یہاں یہ مضمون ہے اور ایک اور جگہ اذان کے متعلق ہمیں پتا چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان کے الفاظ بتائے گئے اور بعض صحابہؓ کو بھی بعینہٖ وہی الفاظ دکھائے گئے تو آنحضرت ﷺ ہر پیغام کو قبول نہیں فرمالیا کرتے تھے۔ اس کا جائزہ لیتے تھے اور اپنے نور فراست سے معلوم کرتے تھے کہ کیا یہ واقعۃً الٰہی پیغام ہے اور ایک آپ کا طریق یہ تھا کہ ایک دوسرے کی تائید ڈھونڈتے تھے۔ نبی کا تو اکیلا رؤیا سب دوسری خوابوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کا اکیلے کا پیغام ساری دنیا کے لئے کافی ہے۔ مگر جب دوسرے بزرگ کوئی دعویٰ کریں کہ ہمیں خدا نے کچھ بتایا ہے تو ان کا اکیلا پیغام کافی نہیں۔ تب بھی بعض لوگ استخارہ کے جواب میں جب مجھے کہتے ہیں کہ جی ہمیں تو یہ خواب آئی ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں تم کون سے نبی ہو کہ تمہاری ایک ہی خواب پر ہم اعتماد کر جائیں اور بزرگوں کو بھی دعا کے لئے لکھو سب کی جو مجموعی خوابیں تأثر پیدا کریں گی وہ درست فیصلہ ہوگا۔ ورنہ ایک آدھ آدمی پیٹ خراب ہوا سویا اس کو ڈراؤنا خواب آ گیا اس نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ اب یہ شادی نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ بالکل غلط طریق ہے اور بعض لوگ تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ حکماً رشتے دار کو منع کر دیتے ہیں کہ رات میں نے یہ رؤیا دیکھی ہے خبر دار ہے جو تم نے یہ شادی کی۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ خبر دار ہے جو اس کی بات مانی۔ بالکل لغو بات ہے۔ دعا کرو، استخارہ کرو اور پھر اگر تمہیں خدا تعالیٰ روکتا نہیں ہے، اگر تمہارے دل میں خدا تعالیٰ خود گانٹھ نہیں ڈال دیتا اور لڑکا یا لڑکی نیک ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے اس فیصلے کو قبول کرو کہ نیکی کو تم نے ترجیح دینی ہے۔ کوئی اس کے اندر برائی نہیں دیکھتے۔ تم نے دعائیں کیں تو خدا نے تم کو نہیں روکا اس لئے ایک آدھ آدمی کو اگر کوئی منذر خواب بھی آ گئی ہے تو پرواہ نہ کرو جبکہ اس کے مقابل پر مبشر خوابیں بھی آ رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ جب مجھے ساری خوابیں لکھ کے بھیجتے ہیں استخاروں کے بعد تو عجیب منظر نظر آتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں منذر ہے بالکل نہ کرو۔ بعض لوگ

کہتے ہیں مبشر ہے کرلو، کرلو۔اب سوال یہ ہے کہ کیا خوابوں سے اعتبار اٹھ جائے ۔ ہرگز نہیں ۔ان خوابوں کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ کس نوع کی خوابیں ہیں جو روحانی ہیں اور کس نوع کی خوابیں ہیں جو رد کرنے کے لائق ہیں اور یہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا ہے کہ خوابوں کو پہچان سکے اور الگ الگ کر سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت عطا ہوتی ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو خدا نے کیسا عظیم ملکہ عطا فرمایا لیکن پہلے بچپن کے زمانے میں جب تک یہ ملکہ نہیں ملا تھا خود اپنے خواب کی تعبیر بھی نہیں کر سکے۔ بھائیوں کے ہاتھوں مار کھا گئے ۔تو یہ نعمت ہے جو ہبہ کے طور پر آسمان سے اترتی ہے اس لئے اس میں تکبر نہیں کرنا چاہئے ۔ جو بھی خدا کے فضل سے صاحب علم لوگ ہیں ان کی خدمت میں بھیجو اور کئی ایسے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے رؤیا کا بہت اچھا علم عطا کیا ہوتا ہے صرف ایک شخص کی بات نہیں ہے۔ان سے بات کرو اور پھر عمومی فیصلہ کرو یہ تو میں اس سے استنباط کر کے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

مگر حضور اکرم ﷺ کا انکسار بھی تو دیکھیں ۔جن پر وحی نازل ہوئی ہے،جن پر فرمایا کہ ہر روشن نشان عطا کر دیا گیا جس کو زمانے کی تقدیریں تبدیل کرنے کے راز عطا کر دیئے گئے کتنا منکسر المزاج نبیؐ تھا کہ اپنے غلاموں کی بات کو غور سے سنتا ہے۔کہتا ہے ہاں ہوسکتا ہے خدا نے تمہارے ذریعے مجھے پیغام بھیجا ہو لیکن میں چھان بین کرلوں اگر یہ علامتیں ملیں تو پھر مانوں گا۔ چنانچہ اس بارے میں آپ نے ان رؤیا کو قبول فرما لیا اور یہ فیصلہ دیا کہ آئندہ سے لَيْلَةُ الْقَدْرِ کو آخری سات دنوں میں تلاش کرو۔فرمایا نویں رات، یا ساتویں، یا پانچویں کیونکہ سات راتوں میں اکیس اور تئیس کی نکل جاتی ہے۔یہ پہلی تین کے اندر داخل ہو جاتی ہیں ۔ پہلے یہی خیال تھا کہ یہ بھی لَيْلَةُ الْقَدْرِ کی راتوں میں شامل ہیں مگر آنحضورؐ نے ان رویائے صادقہ کی روشنی میں جو دوسروں کو عطا ہوئیں اور آپؐ کو پیغام کے طور پر بھیجی گئیں یہ فیصلہ فرمایا کہ آئندہ سے پچیس، ستائیس اور انتیس کی راتوں میں لَيْلَةُ الْقَدْرِ کو تلاش کرو۔پچیس کی رات تو گزر چکی ہے لیکن دو راتیں ابھی باقی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک رات معین کیوں نہ بتا دی؟ آنحضرت ﷺ کو معین بتائی تھی ۔عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ باہر تشریف لائے کہ ہمیں

لَيْلَةُ الْقَدْرِ کے بارے میں بتائیں کہ کون سی رات ہے اور کیا کرنا چاہئے۔ دو مسلمان آپس میں جھگڑنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا میں تو تمہیں شب قدر کے بارے میں بتانے آیا تھا لیکن ان کے آپس کے جھگڑے کی وجہ سے مجھ سے یہ علم اٹھالیا گیا۔

(بخاری کتاب فضل لیلة القدر باب رفع معرفة لیلة القدر لتلاحی النّاس)

اب ایک اور سوال اٹھ جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اگر ایک خوشخبری عطا ہوئی تھی سب کو بتانے کے لئے تو لوگوں کے جھگڑے کی وجہ سے وہ واپس کیوں لے لی گئی؟ ایک خیر کے بدلے شر پیدا ہو گیا۔ مگر یہ درست نہیں۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں ہوسکتا ہے اس میں تمہاری بھلائی ہو۔ پس وہ جو ایک رات بتائی گئی تھی وہ دراصل رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات کے لئے بتائی گئی تھی اور جہاں تک امت کا معاملہ ہے تقدیر یہی تھی کہ ان کو پتا نہ چلے کہ کونسی رات ہے اور بھلائی اِس میں وہی ہے جو ایک کہانی کی صورت میں ہمارے سامنے بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں ایک شخص مرنے لگا تو اس نے اپنے بچوں کو اکٹھا کیا اور نصیحت کی کہ دیکھو میں نے کھیت میں، جو جتنا بھی کھیت اس کے پاس تھا، اس کھیت میں میں نے ایک جگہ خزانہ دفن کیا ہے تو میرے مرنے کے بعد کھود کے تلاش کر لینا یہ نہ ہو کہ وہ دبا ہی رہ جائے۔ اس کے بعد انہوں نے کدالیں اٹھائیں اور اتنی محنت کی کہ اس ساری زمین کا چپہ چپہ کھود ڈالا اور کوئی خزانہ نہ ملا۔ تو ایک عقل والا راہ گیر تھا اس نے کہا یہ کیا کر رہے ہو، تم نے تو حشر کر دیا ہے زمین کا۔ انہوں نے کہا ہمارے ابا نے یہ کہا تھا مرتے مرتے کہ یہاں تمہارے لئے خزانہ دفن ہے۔ ہم نے تو ڈھونڈا ہمیں تو کچھ نہیں ملا۔ تو انہوں نے کہا یہی تو خزانہ ہے۔ تم نے اس زمین پر اتنی محنت کی ہے کہ اب جو کچھ بھی ڈالو گے وہ سونا اگائے گا۔ جو بیج ڈالو گے وہ سونا اگائے گا اور واقعۃً جب اس زمین کو انہوں نے کاشت کیا تو ایسی فصل حاصل ہوئی کہ کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔ تو آنحضرت ﷺ تو ہر رات ہی کو سجایا کرتے تھے آپؐ کو اگر وہ رات بتادی گئی تو یہ مطلب نہیں تھا کہ باقی راتوں میں آپؐ آرام فرمائیں اور کہیں کہ بس اسی رات کو جاگوں گا۔ ہم کمزوروں میں کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو ایک جمعہ کی انتظار میں سارا سال گزارتے ہیں اور اس کے بعد جمعوں سے بھی چھٹی، نمازوں سے بھی چھٹی۔ اگر ان کو رات بتادی جاتی تو رمضان کی راتیں بھی چھوڑ بیٹھتے۔ ایک رات کے لئے سارا دن سوتے اور پھر اس رات ساری رات جاگتے تو دین ایک مذاق بن جاتا۔ پس آنحضرت ﷺ جس

فائدے کا ذکر فرما رہے ہیں وہ یہ ہے کہ تمہیں خوب محنت کرنی پڑے گی۔ اگر تمہیں دس راتوں کی محنت کی توفیق نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے آخری سات راتوں کے اندر اس مضمون کو اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ سات راتیں تو محنت کرلو۔ ان سات راتوں میں سے اب دو راتیں باقی ہیں۔ یعنی ایک رات نسبتاً آرام، مگر وہ بھی یہ نہیں ہے کہ تہجد چھوڑ دینا ہے اس رات۔ کوشش کریں اور نسبتاً آرام۔ مگر پھر دوسری رات جو طاق راتیں ہیں ایک ستائیس اور ایک انتیس کی۔ ان راتوں میں خوب محنت کریں اور وہی مانگیں جس کی نصیحت حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمائی ہے کہا **اللّٰھم انک عفو تحبّ العفو فاعف عنی** یہ دعا بہت عظیم دعا ہے اس دعا کی قبولیت کا نشان آپ کی بعد کی زندگی بنے گی۔ ایک تو یہ بات یاد رکھیں۔

دوسرے مختصراً میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو عبادت میں محنت کیا کرتے تھے اور دن کو خدمت خلق میں محنت کیا کرتے تھے۔ محض آپؐ کی راتیں نہیں جاگتی تھیں آپؐ کا دن بھی غیر معمولی طور پر جاگ جایا کرتا تھا۔ اتنا صدقہ وخیرات کرتے تھے اتنی غریب کی خدمت کرتے تھے کہ صحابہؓ حیران رہ جاتے تھے کہ اتنی محنت، اتنی مشقت جیسے آندھی چل پڑی ہو صدقہ وخیرات کی اور غریب پروری کی، یہ آپؐ کا دستور تھا۔ تو صرف راتوں کو نہ جاگیں آپ دن کو بھی یہ سوچیں کہ آپ کے گردو پیش میں کون غریب ہیں، کون محروم ہیں، کن کی خدمت سے خدا تعالیٰ آپ کی راتوں کی دعائیں قبول کر لے گا۔ پس یہ بھی وہ عمل ہے جس کے نتیجے میں آپ کی تقدیر کے فیصلے ہوں گے۔ آپ غریب کی حالت بدلنے کی کوشش کریں اللہ آپ کی حالت کو تبدیل فرمائے گا۔

اور آئندہ عید میں بھی میرا پیغام یاد رکھیں کہ آپ کی سچی عید تب ہوگی جب آپ غریبوں کی عید کریں گے۔ ان کے دکھوں کو اپنے ساتھ بانٹیں گے، ان کے گھر پہنچیں گے، ان کے حالات دیکھیں گے، ان کی غریبانہ زندگی پر ہوسکتا ہے آپ کی آنکھوں سے کچھ رحمت کے آنسو برسیں۔ کیا بعید ہے کہ وہی رحمت کے آنسو آپ کے لئے ہمیشہ کی زندگی سنوارنے کا موجب بن جائیں۔ ہوسکتا ہے آپ کو پہلے علم نہ ہو کہ غربت کیا ہے اس وقت پتا چلے اور آپ کے اندر ایک عجیب انقلاب پیدا ہو جائے۔ پس لَيْلَةُ الْقَدْرِ کا صرف رات سے تعلق نہیں ہے۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ کا دنوں سے بھی تعلق ہے اور آنحضرت ﷺ کے متعلق ثابت ہے کہ راتوں کی عبادتیں غیر معمولی شان کے ساتھ بڑھ

جایا کرتی تھیں اور دنوں کی غریبوں کی خدمتیں ایسا رنگ اختیار کر لیتی تھیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں یوں لگتا تھا کہ ایک تیز رفتار ہوا میں اور بھی تیزی آگئی ہو اور ایک جھکڑ بن جائے۔تو اللہ تعالیٰ ہمیں آنحضرت ﷺ کے دنوں اور آپؐ کی راتوں کی پیروی کی توفیق بخشے اسی میں ہمارا مقدر سنورے گا ان مبارک دنوں اور ان مبارک راتوں کی پیروی جو محمد رسول اللہ ﷺ کے مبارک دن اور مبارک راتیں تھیں یہی ہیں جو ہماری زندگی کے اسّی (80) برس سنوار سکتے ہیں۔اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔آمین

سب نوروں سے بڑھنے والا نور حضرت محمد مصطفی ﷺ کا نور ہے کیونکہ آپ کا ظرف بہت بڑا تھا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 23رفروری 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

رمضان مبارک بہت سی برکتیں لے کے آیا اور بہت سی برکتیں پیچھے چھوڑ گیا اور بہت سی برکتیں ساتھ لے گیا خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے ان برکتوں سے حصہ پایا جو رمضان مبارک پیچھے چھوڑ گیا اور محروم ہیں وہ جو کچھ برکتیں رمضان کے مہینے میں حاصل تو کرتے رہے مگر جب وہ نکلا تو سب برکتیں ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔

برکت وہی ہے جو دائمی طور پر ساتھ رہتی ہے برکت وہی ہے جو آ کر ٹھہر جاتی ہے اور پھر کبھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتی باقی یونہی نفس کی لذّتیں ہیں، اگر ہیں، ورنہ محض ایک مشقت ہی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ جنہوں نے لذّت پائی ہو اور وہ لذّت وقتی ہو اس میں کوئی دوام کا پہلو نہ ہو۔ وہ لذّت بھی ایک فرضی روحانی لذّت ہے، روحانی لذّت سے اس کا تعلق نہیں۔ روحانی لذّت میں ابدیت پائی جاتی ہے اور یہ ایک بہت بڑا فرق ہے اور امتیاز کرنے والا فرق ہے جو روحانی لذّت اور مادی لذّت میں پایا جاتا ہے اور غور کرنے سے صاف کھلا کھلا دکھائی دینے لگتا ہے۔

مادی لذّت جب آ کے گزر جاتی ہے تو پیچھے ایک تکلیف دہ یاد چھوڑ دیتی ہے۔ اس لذّت میں ایک قسم کا مزہ بھی ہے مگر اس مزے کے ساتھ ایک تلخی بھی وابستہ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

اچھا کیا مجھ کو فراموش کر دیا

مگر یہ مضمون بعینہٖ اس طرح تو پورا نہیں آتا مگر اچھی یادوں کے ساتھ تلخیاں ویسے ہی وابستہ ہوتی ہیں کیونکہ وہ یادیں کھوئے ہوئے مضمون سے تعلق رکھتی ہیں ایسی چیز جو پیاری لگی اور اب نہیں ہے۔ مگر وہ یادیں جو ایک دائمی وجود سے تعلق سے وابستہ ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کے پیار، اس کی محبت کے اظہار کے جلوے، وہ یادیں ایسی ہیں جو ان جلوؤں سے، ان پیار کے اظہار سے وابستہ ہوں کہ وہ اپنی ذات میں ایک دوام رکھتی ہیں اور محرومی کا احساس نہیں چھوڑتیں۔ پس حقیقی نیکی وہی ہے یا حقیقی روحانی لطف وہی ہے جو دوام اپنے اندر رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنت کو دائمی قرار دیا گیا ہے۔ (محمد حسن لطفی)

اس سے پہلے میں نے خطبے میں مختصراً، غالباً عید کے خطبے میں ہی عذاب کے متعلق ذکر کیا تھا، تکلیف کے متعلق ذکر کیا تھا کہ اس میں دوام نہیں پایا جاتا مگر تھوڑا ہونے کے باوجود لمبا دکھائی دیتا ہے اور جتنا اس سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں اتنا ہی لطف بڑھتا جاتا ہے اور اس کی یاد محض ان معنوں میں فائدہ دیتی ہے کہ شکر ہے اب ہمارا تعلق ٹوٹا اور اس تعلق کے دوبارہ قیام سے ہی جسم لرز اٹھتا ہے تو تلخ یادوں میں جتنی دوری ہو اتنا لطف بڑھتا ہے اچھی اور پیاری یادوں میں جتنی دوری ہو اتنی تکلیف بڑھتی ہے کہ کیا ہوئے وہ دن جن میں یہ کچھ ہوا کرتا تھا۔ بعض شعراء اپنے بچپن کی یادوں کو پھر اتنا پیار دیتے ہیں اور اتنے پیار سے پالتے ہیں کہ وہ یادیں ان کی راتوں کی لوریاں بن جاتی ہیں۔

ایک انگریزی نظم کا کسی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ ایسا کیا کہ گویا اس نظم کو اپنا گیا ہے اور میں نے دونوں کا موازنہ کر کے دیکھا ہے جو ترجمہ ہے وہ اپنی خوبی میں اصل سے بھی اونچا نکل گیا ہے اور وہ نظم ہے۔

اکثر شب تنہائی میں، کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں، بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی، اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

(ترجمہ: نادر کاکوروی)

اسی طرز پر وہ مضمون کو بڑھاتا ہے۔

وہ بچپن اور وہ سادگی، وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے، وہ دل لگی، وہ قہقہے

غرض یہ کہ ہر پرانی یاد کو وہ رات کو اس طرح اپنے سینے سے چمٹا تا (ترجمہ: نادر کاکوروی) ، اپنے دماغ میں الٹ پلٹ کے اس کے مزے لیتا ہے کہ وہی اس کی لوریاں بن جاتی ہیں مگر حسرت پھر نہیں جاتی۔ ان چیزوں کو واپس لانے کی جو حسرت ہے وہ اس نظم میں جوں جوں آگے بڑھتی ہے وہ اور کھلتی چلی جاتی ہے۔ ''ان حسرتوں کی قبر پر'' پھر آخر پر وہ یہ کہتا ہے کہ وہ یادیں پتیاں برسا رہی ہیں پھول کی ان حسرتوں کی قبر پر۔

تو وہ چیزیں، جو یادیں ایسی ہوں جن میں دوام پایا جائے ان میں حسرت کوئی نہیں ہوتی اور نور میں بھی یہی ایک خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ نور جو خدا کا نور ہے وہ آتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے اور اندھیرا پھر اس کی جگہ دوبارہ نہیں لے سکتا۔ وہ مستقلاً زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے جو جگہ بنا لے وہ بنا بیٹھتا ہے۔ اس لئے انبیاءؑ کا نور ہمیشہ دائمی ہوتا ہے۔ انبیاءؑ کے اوپر کوئی ایسا دور نہیں آتا کہ جو نور انہوں نے خدا کی محبت اور پیار میں کمایا ہو وہ نور ظلمتوں نے واپس چھین لیا ہو۔ وہ بڑھتا ہے، پھولتا ہے، پھیلتا ہے اور جگہیں بناتا چلا جاتا ہے، بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں ایک دوام پایا جاتا ہے۔ وہی دوام ہے جو جنت بنے گا۔ جیسا کہ تلخ تجربہ جو ہے وہ اپنی ذات میں اگر لمبا ہو جائے تو ایک عذاب بنتا ہے اور تھوڑا بھی ہو تو اس میں ایک لمبائی کا مضمون پایا جاتا ہے۔ چند لمحے عذاب کے بعض دفعہ ساری زندگی کو تلخ کر دیتے ہیں۔ تو جہنم میں بھی جس حد تک دوام ہے وہ اسی حد تک ہے کہ خواہ تھوڑی بھی ہو، وہ سزا ابدی تو بہر حال اس رنگ میں نہیں ہوگی، جس رنگ میں جنت ہے مگر تھوڑی بھی ہو تو یوں لگے گا جیسے ابد ہو رہی ہے انسان پر، ایک دو لمحے بھی گزرنے کا نام نہیں لیں گے مصیبت پڑ جائے گی۔ بعض گھڑیاں تکلیف میں اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ قرآن کریم ان کے متعلق فرماتا ہے کہ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (الانعام: 16) یہ ایک عظیم دن کا عذاب ہے جو دن ختم ہونے میں نہ آئے۔ تو دنوں کا لمبے اور بڑے ہو جانا اس کا تعلق عذاب سے ہے اور سُکڑ جانا اور اس کے باوجود ختم نہ ہونا اس کا تعلق نیکی اور ثواب سے ہے وہ ثواب جو اللہ کی طرف سے آتا ہے وہ ان معنوں میں دوام پکڑتا ہے کہ اس لذّت کی یاد ہمیشہ دل میں ٹھہرتی ہے اور لطف پیدا کرتی ہے کوئی حسرت نہیں پیدا کرتی

کیونکہ لذّت ایک زندہ لذت ہے۔ جس کے ساتھ تعلق ہوگا جس نے احسان فرمایا اس نے احسان سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ جس نے پیار کی نظر ڈالی اس نے نظر پھیری نہیں اور بے اختیار ایسے شخص کا دل یہ پکار اٹھتا ہے۔ **سبحان من یرانی** ۔ پاک ہے وہ ذات جو ہمیشہ مجھے دیکھتی چلی جارہی ہے، ہر لمحہ میں اس کی نظر کا پیار محسوس کرتا ہوں۔

پس ان معنوں میں رمضان مبارک جو آ کے گزر گیا ہے وہ کچھ ایسی لذتیں عطا کر گیا جو دوام رکھتی ہیں اور وہ کبھی مٹ نہیں سکتیں۔ جن بدیوں کو مٹا گیا وہ پھر زندہ نہیں ہوسکتیں۔ جن نیکیوں کو قائم کر گیا ان کو پھر کوئی چیز جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتی۔ یہ وہ دائمی لذت ہے جن سے ہم اپنی آئندہ جنت بنائیں گے اور بنا رہے ہیں اور اس کا فیصلہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔

ابھی رمضان کو گزرے جمعہ، جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے کیونکہ جو پچھلا جمعہ تھا وہ رمضان کے اندر تھا اس کے بعد بھی ہم نے تین دن یا چار دن رمضان کے دیکھے تو اب دیکھ لیجئے کہ اتنے تھوڑے سے وقفے میں بھی رمضان بعض لوگوں کو اپنے سے کتنا دور ہٹا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اتنا دور چلا گیا ہے کہ وہ چیزیں جن کی کبھی جرأت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا ان کی طرف طبیعتیں مائل ہو رہی ہیں، انہی غفلتوں کی طرف انسان لوٹ رہا ہے، وہ تہجد کی رونقیں ختم، صبح کی نمازیں بھی قضا ہونے لگیں اور لوگ مزے کی نیندیں سونے لگے کہ اب رمضان کی تھکاوٹ دور کرلیں۔ حالانکہ رمضان کی تھکاوٹ تو قرب الٰہی دور کیا کرتا ہے اس کے سوا تو رمضان کی تھکاوٹ دور نہیں ہوسکتی۔ جس چیز کو آپ تھکاوٹ دور کرنا کہتے ہیں وہ تھکاوٹ کی طرف لوٹنا ہے اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ دنیا کی مشقت اور محنت ایک بے معنی اور بے حقیقت تھکاوٹ ہے جس کے آگے کوئی جنت نہیں ہے۔ اس کے آگے سراب ہے۔ تھکاوٹ جس کا نتیجہ سراب ہے۔

چنانچہ قرآن کریم ایسے شخص کی مثال جو دنیا کی لذتوں کی طرف دوڑ رہا ہے ایسے شخص سے دیتا ہے جو پیاسا بہت ہو مگر سراب کی طرف دوڑ رہا ہو۔ اسے دور سے پانی دکھائی دے لیکن وہ پانی نہیں نظر کا دھوکہ ہو اور صحرا میں جو لق و دق صحرا ہو اس میں پانی کی بوند بھی دکھائی نہ دے وہیں وہ پانی دکھائی دیتا ہے جو نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کی پیروی کرتا ہے دوڑتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ تھک کر وہ جگہ جہاں اس کا دم ٹوٹتا ہے وہ وہی سراب کا مقام ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا

سوائے اس کے کہ اللہ اسے جزاء دینے کے لئے وہاں موجود ہو۔ تو دنیا کی لذّتوں کی بھی ایک تھکاوٹ ہے اور امر واقعہ ہے کہ جو لوگ غور کریں ان کو محسوس ہوگا کہ ضرور اس میں تھکاوٹ پائی جاتی ہے کیونکہ انسان جو دنیا کی لذّتوں کی طرف دوڑتا ہے اور مگن ہو کر پیروی کرتا ہے جہاں پہنچتا ہے کہ اب مجھے کامل تسکین نصیب ہو جائے گی اسے کامل تسکین نصیب نہیں ہوتی۔ وہی جگہ جو بہت ہی پیاری دکھائی دیتی تھی وہ لذّتوں سے خالی ہوتی ہے اور خالی ہونے میں وقت نہیں لیتی۔ تھوڑی دیر ہی میں آناً فاناً اس کا حسن زائل ہو جاتا ہے، اس کے حسن کی عادت پڑ جاتی ہے، اس کا آرام مزید آرام نہیں رہتا، اسی آرام میں کچھ تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے اور انسان بہتر اور اعلیٰ لذّتوں کی طرف یعنی نسبتاً کامل حسن کی طرف، زیادہ آرام کی طرف حرکت شروع کرتا ہے۔ اگر نہ کرے تو جس کو اس نے جنت سمجھا تھا وہ اس کی بوریت بن جائے گی۔ وہ ایک جگہ ٹھہر کر دنیا کی پیروی میں کوئی ایسا مقام قرار نہیں دے سکتا کہ میں اب یہاں ٹھہر گیا ہوں یہاں میری تسکین ہے۔ سراب کی طرح اس کی تسکین اس کے آگے دوڑتی ہے اور اس سے ہٹتی ہوئی دور دکھائی دیتی ہے اور پھر وہ کوشش کرتا ہے اور پھر اس سے یہی ہوتا ہے منزل بہ منزل اس کی لذّتیں اس سے بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ جب وہ پاتا ہے تو تھکاوٹ تو پاتا ہے لیکن وہ تھکاوٹ دور نہیں ہوتی۔ وقتی طور پر ایک جھلکی سی محسوس ہوتی ہے کہ مجھے امن ملا ہے لیکن تھوڑی دیر میں وہ امن کا تصور غائب، وہ حسن کو پالینے کا لطف جاتا رہتا ہے صرف ایک پیروی، دوڑ کی تمنا ہے جو اسے پھر اور آگے لے جاتی ہے۔ یہ سراب کی پیروی ہے۔

مگر جو دینی لذّتیں ہیں انکی بالکل اور مثال ہے ان میں جو آپ نیکی کمالیں وہ ہمیشہ کے لئے آپ کی تسکین کا موجب بن جاتی ہے۔ بعض ایسی نیکیاں ہیں کہ جو اپنی تکلیف کے لحاظ سے تو تھوڑی دیر رہ کر گزر گئیں مگر اپنے سکون کے لحاظ سے وہ کبھی بھی مٹتی نہیں یہاں تک کہ مدّتوں ان کی یاد دل کی تسکین کا موجب بنتی ہے۔ جب انسان کو خوف دامن گیر ہو جائیں تو وہی ایک آدھ نیکی جو کسی وقت اس کو توفیق ملی وہ ایک ہی سایہ رہ جاتا ہے جس میں وہ ماحول کی تکلیف اور اس کے عذاب سے امن ڈھونڈتا ہے وہاں کچھ تسکین پاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ایسے آدمیوں کی مثال پیش کرتے ہیں کہ تین آدمی ایک غار میں اس طرح پھنس گئے کہ زلزلے کی وجہ سے ایک بہت بڑا پتھر اُن کے سامنے آگیا اور وہ اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بھی یہی نفسیاتی تسکین کی راہ ڈھونڈی اور آپس میں

باتیں کیں کہ ہم کوئی ایسی نیکی سوچیں جس نیکی کی یاد ہمارے دل میں ابھی بھی تروتازہ ہے۔ہم جانتے ہیں کہ خدا کو وہ پسند آئی ہوگی اور اس نیکی کی یاد کر کے، اس کا حوالہ دے کر خدا سے دعا مانگتے ہیں یہ پہلے آپ کے سامنے کئی بار میں بیان کر چکا ہوں ۔مختصر یہی کہ انہوں نے اپنی اپنی اس نیکی کی یاد کی جو ابھی تک ان کے ذہن میں تازہ تھی اور اتنا یقین تھا کہ یہ نیکی اتنی پیاری ہے کہ خدا اس کے حوالے سے دعا کو ضرور قبول کرے گا۔انہوں نے اس نیکی کا ذکر دعا میں کیا اور اللہ سے عرض کیا کہ اگر واقعۃً یہ تیری خاطر ایسا کیا گیا تھا تو اس پتھر کو ہٹا دے اور وہ پتھر کسی حد تک ایک اور زلزلے کی جنبش سے سرک کر آگے سے ہٹ گیا لیکن ابھی نکل نہیں سکتے تھے یہاں تک کہ دوسرے نے بھی اسی طرح اپنی پرانی نیکی کو یاد کیا اور پھر ایک تیسرے نے بھی۔

یہ تو انفرادی نیکیوں کا حال ہے مگر نہ صرف یہ کہ وہ لذّتیں رکھتی ہیں، فائدے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں ۔ یہ دوسرا پہلو ہے جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں ۔نیکی مرتی نہیں ہے صرف یاد کے طور پر زندہ نہیں رہتی اس میں نشوونما کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ان تین کی مثال جن کی آنحضرت ﷺ نے مثال دی ان کی مثال ایسے اشخاص کی مثال تھی جو بدیوں سے رکے ہیں۔حقیقت میں انہوں نے نیکیاں نہیں کی تھیں۔ان کے بدیوں سے رکنے کے نتیجے میں وہ ادا خدا کو پسند تو آئی اس کو خدا نے دعا کے حوالے میں قبول بھی فرمایا مگر ان میں سے کسی ایک کے لئے اس کی ایک نیکی نجات کا موجب نہیں بن سکتی تھی اور یہاں جب اجتماعی نیکی بنی ہے۔تب ان کو نجات ملی ہے۔اس حصّے پر بھی غور کرو کہ ایک شخص کی نیکی کے نتیجے میں جو بدیوں سے بچنے والی نیکی تھی وہ اکیلا بھی نجات نہیں پا سکا اور اس کی اکیلے کی دعا سے پتھر اتنا نہ سرکا کہ وہ اس کے رستے سے نکل جاتا اور دوسرے بھی فائدہ اٹھاتے۔دوسرے نے جب دعا کی تو پھر سرکا کہ بمشکل گھسٹ کے شاید کوئی آدمی نکل سکتا ہو مگر جو مضمون بیان ہوا ہے اس سے لگتا ہے کہ اتنا راستہ نہ بن سکا تھا کہ اس سے انسان گزر سکتا اور تیسرے نے جب دعا کی تو اتنا سرک گیا کہ اس میں سے ایک آدمی نکل سکتا تھا چنانچہ تینوں اس میں سے نکل گئے۔

انبیاءؑ کی نیکی کا مقام بہت بلند ہے اور ابرار کی نیکی کا مقام بھی اس سے بہت بلند ہے۔اس لئے وہ لوگ جو اس نیکی کی مثال سے متاثر ہو کر سمجھتے ہیں کہ اسی قسم کی کوئی ایک نیکی ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے نجات کا موجب بن جائے گی۔ان کو غور کرنا چاہئے کہ ان میں سے کسی کی نیکی بھی اس نجات

کا موجب نہ بن سکی کیونکہ اس میں ایک منفی پہلو تھا۔ بدی سے رکنا بھی ایک نیکی ہے مگر اگر اس کی جگہ اعلیٰ خوبیاں نہ لے لیں تو وہ نیکی نیکی نہیں رہتی۔ یہ اللہ کا احسان تھا کہ اس کو قبول فرما لیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون پر بہت روشنی ڈالی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ ترکِ شر اپنی ذات میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی اگر اس کی بجائے خیر کو اپنانا اس کے ساتھ شامل نہ ہو، اس کا لازمی نتیجہ نہ نکلے۔ جہاں شر کو دور کرو وہاں خیر کو قبول کرو۔ وہ خیر ہے جو حقیقت میں ترکِ شر کا اجر ہے اور اس کے نتیجے میں تمہیں ایک مثبت چیز ایسی حاصل ہو جاتی ہے، ایسی دولت ہاتھ میں آجاتی ہے جو پھر خرچ کرنے پر کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہے۔

چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ بدی کے ترک کرنے کے ساتھ جو انسان کو روحانی قوت ملتی ہے اس سے نیکی کو قبول کرنے کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور ان لوگوں کا جن کا ذکر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کا حال بنظر غور دیکھو کہ ان کو اس کے بعد کسی بڑی نیکی کی توفیق ملی نہیں ہے۔ اگر ملی ہوتی تو وہ اس نیکی کا ذکر کرتے۔ انہوں نے ایک پرانی ایسی نیکی کا ذکر کیا ہے کہ اے خدا ہم یہ شر کر سکتے تھے اس بدی میں مبتلا ہو سکتے تھے مگر تیرے خوف سے، تیرے ذکر سے مرعوب ہو کر ہم نے وہ کام نہیں کیا۔ اس کے بعد توفیق ملنی چاہئے تھی آگے بڑھنا چاہئے تھا مگر چونکہ وہ نہ کر سکے اس لئے ایک کی نیکی خود اس کے لئے بھی کافی نہیں ہوئی۔ تینوں کی نیکی نے مل کر ان کی نجات کے سامان کئے۔ مگر ابرار کی نیکی کا یہ حال ہے کہ ایک کی نیکی کثرت سے دوسروں کے کام آتی ہے اور ایسے لوگوں کے بھی کام آتی ہے جو گناہوں میں ملوث ہوں، جن کا کچھ بھی نہ ہو۔ بسا اوقات ان کی نجات کا موجب بھی بن جاتی ہے۔

اب دیکھیں آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو جب تک تو اس شہر میں ہے میں عذاب نہیں دوں گا۔ (انفال: 34) کتنی عظیم بات ہے جو فرمائی گئی کہ تیرے ہوتے ہوئے عذاب دیا جائے تو یہ تیری شان کے خلاف ہے اور اس عذاب میں تو بھی کسی حد تک ملوث ہوگا اور پھر اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھے گا تو تجھے بھی تکلیف پہنچے گی بہت سے مضامین ہیں اس میں۔ مگر ایک محمد رسول اللہ ﷺ کا وجود اہل مکہ کو عذاب سے بچا گیا جب کہ وہ دعائیں کرتے تھے کہ اے خدا اگر یہ سچا ہے ہم جھوٹے ہیں تو ہم پر پتھر برسا مگر اس وقت تک نہیں برسائے گئے جب تک حضرت محمد

رسول اللہ ﷺ ان میں جسمانی طور پر موجود رہے اور جب وہ مقابل پر نکلے تو جنگ بدر میں دیکھو ایک مٹھی پتھر بن گئی اور پتھروں کا طوفان لے آئی ایسا طوفان جس نے اس عظیم لشکر کے منہ پھیر دیئے اور ناکارہ اور ذلیل کر دیا۔ تو یہ مثبت نیکیوں کا حال ہے۔ ابرار کی نیکیاں اپنے لئے ہی نہیں بلکہ عالم کی نجات کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس پہلو سے آنحضرت ﷺ وہ کامل نور تھے جنہوں نے بدیوں کا ازالہ ہی اپنی ذات سے نہیں کیا یعنی بدیوں کو قریب تک نہیں پھٹکنے دیا اور ہر پہلو سے اپنے وجود کو نور مجسم کر دیا۔ یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نور کی تفسیر میں بڑے پیارے انداز میں بیان فرمایا ہے اور تمام انبیاءؑ کی یہی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ اپنی اپنی حیثیت توفیق کے مطابق وہ یہ کچھ کرتے ہیں تو خدا کی نظروں میں جچتے ہیں اور خدا ان سے پیار کا وہ سلوک کرتا ہے جو عام انسانوں سے نہیں کرتا۔

پس اس رمضان المبارک کے حوالے سے بھی ہمیں اپنے نفس کو ٹٹولنا چاہئے، اپنے تجربے کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا حصّہ رمضان کا ایسا ہے جس کو ہماری ذات میں کچھ دوام ملا ہے۔ کون سا رمضان کا حصّہ ہے جو ہمارے ساتھ ٹھہر گیا ہے، ہمارے ساتھ ہمارے بدن میں ٹھہر گیا ہے اور ہمارے ساتھ حرکت کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر وہ ترکِ شر یعنی بدیوں سے رکنا یا گالیاں نہ دینا یا اور خدا کی خاطر بعضوں کے ظلم برداشت کر لینا وہ تو ماضی میں دب جائیں گے اور ان کا کچھ بھی ایسا فائدہ نہیں ہے جو آپ کو مستقلاً نجات کی طرف لے جائے۔ مستقلاً نجات کی طرف جانا یہ اصل مضمون ہے جس کو سمجھنا ضروری ہے یعنی نیکی وہ ہے جو ہاتھ پکڑ لیتی ہے، آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ کہیں بھی دامن نہیں چھوڑتی اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ آپ نیکی پر اس پیار اور محبت سے ہاتھ ڈالیں کہ اسے اپنانے کی کوشش کریں۔ وہ آپ کو واقعۃً اتنی اچھی لگنے لگے کہ وہ چھوڑی نہ جائے۔ اس سے محبت ہو جائے اس سے پیار ہو جائے اور یہی ہے جو دراصل نور کمانے کا ایک ذریعہ ہے ورنہ محض نور کی باتیں کرنا فرضی قصّے ہیں ان کی کوئی اور حقیقت نہیں ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو تحریرات میں آپ کے سامنے پیش کر رہا تھا اب ان میں سے جو بعض رہ گئی تھیں یا کچھ حصہ شاید میں پڑھ بھی چکا ہوں مگر یہ جو صفحہ میرے سامنے ہے اس کا ایک حصّہ تو یقیناً رہ گیا تھا جہاں سے بات آگے بڑھانی تھی۔ اس تعلق میں جو تمہید باندھی ہے اس کا

اس سے گہرا تعلق ہے یہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں۔

فیضان کے لئے مناسبت شرط ہے اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم، حاشیہ نمبر 11 روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 195)

حکیم مطلق جسے عقل کل بھی ایک موقع پر فرمایا یعنی کامل حکمتوں والا وہ ایک ہی ہے جو خدا کی ذات ہے وہ مناسبت کے بغیر کوئی فعل نہیں کرتا۔ نور کو ظلم سے نہیں ملاتا یہ نامناسب بات ہے۔ کہتے ہیں ایک قطرہ بھی گندگی کا ڈھیروں دودھ میں ملا دو تو سارا دودھ گندا ہو جائے گا تو یہ غیر مناسب فعل ہے غیر حکیمانہ فعل ہے۔ پس حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ نور اترتا ہے مگر انہی جگہوں پر جنہیں پہلے صاف کر لیا جائے اور انہیں گندگیوں سے پاک کیا جائے اور اندرونی نور انسان کو نصیب ہو، تا کہ اس نور پر نور اترے۔ جیسے آپ بھی باہر سفر کے دوران کسی جگہ بیٹھنا چاہیں تو بعض دفعہ ہاتھ سے یا رومال نکال کے وہ جگہیں صاف کرتے ہیں پھر بیٹھتے ہیں۔ آپ کو اگر صفائی کا یہ احساس ہے اور اس قدر اہتمام ہے کہ جب تک صاف نہ کر لیں آپ کے کپڑے بھی اس معمولی سی میل کو نہ چھوئیں تو اللہ کی شان کے خلاف ہے کہ **نعوذ باللہ من ذالک** ہر گندگی پہ اپنا نور اتارتا رہے۔ یہ ناممکن ہے۔ اس لئے کوئی گوشہ تو صاف کرنا ہوگا۔

کسی گھر میں اگر کوئی اچانک معزز مہمان آجائے سارے گھر کی تو صفائی ممکن نہیں ہوتی مگر بچے اور عورتیں دوڑتے ہیں کہ کم سے کم کچھ حصّہ تو صاف کر لیں اور وہ بیٹھنا چاہے بھی تو بیٹھنے نہیں دیں گے ذرا ایک منٹ ٹھہریں، ایک منٹ موقع دیں ذرا ہم اس سیٹ کو صاف کر لیں۔ یہ آپ کے بیٹھنے کے لائق نہیں ہے۔ انسان انسان کی عزت کرتا ہے تو یہ سلوک کرتا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ خدا کی عزت کا احساس اس کے دل میں ہو اور اپنے دل کو صاف کئے بغیر کہے مجھے نور عطا کر۔ عطا تو وہ کرے گا پر وہ اترے گا کہاں؟ جگہ کون سی تم نے بنائی ہے جہاں آ کر وہ بیٹھے گا اور قیام کرے گا اور اگر تم نے جگہ بنا دی تو یاد رکھو کہ پھر وہ نور خود اپنے اردگرد روشنی کو اس طرح پھیلاتا ہے کہ اس کے قریب سے گند دور ہونے لگتا ہے۔ وہ گندگی پر نہیں آتا مگر ماحول سے گندگی اس کا خوف کھاتی ہے اور اس سے پرے ہٹنے

لگتی ہے۔یہی مضمون ہے جو ہم دنیا میں ہالوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ایک روشنی کسی جگہ مرکز ہوتی ہے اور اس کے اردگرد ایک ہالہ بن جاتا ہے اور ظلمت سرکنے لگتی ہے۔اس جگہ کو چھوڑتی ہے اور بھاگتی ہے جہاں نور اتر آیا ہے۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۖ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل:82) حق سے باطل گھبراتا ہے جیسے نور سے ظلمت گھبراتی ہے اور جہاں وہ ایک دفعہ جگہ بنالے اردگرد سے تاریکیاں زائل ہونے لگتی ہیں شروع میں سایہ دار جگہ دکھائی دیتی ہے کچھ اندھیرے، کچھ روشنی مگر پھر جب پوری پاکی اور صفائی عطا ہو جائے تو نور پھیل کر اپنی جگہ اور بنالیتا ہے۔یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام ان الفاظ میں کھول رہے ہیں:

> نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ایسے ہی فیضان نور میں بھی اس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے اسی کو اور نور بھی دیا جاتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے اور انبیاءؑ من جملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نور باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم، حاشیہ نمبر 11 روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 195 تا 196)

انبیاءؑ وہ انسان ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اول فطرتاً اپنا نور ودیعت فرمایا، نورِ حق ودیعت فرمایا اور پھر انہوں نے اپنے سارے وجود کو اس نور میں رنگ دیا ہے جیسے مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

> ؎ دل کو ان نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے

(آئینہ کمالات اسلام روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 225)

یہاں وہبت کے ساتھ کسب شامل ہو جاتا ہے۔ایک نور ہے جو فطرت میں ودیعت ہوا ہے اور ہر انسان کو ضرور نور عطا ہوا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی انسان بھی نور کے بغیر پیدا ہو۔اگر آپ حواسِ خمسہ پر غور کریں تو یہ مضمون اور بھی کھل جائے گا۔ جو حواسِ خمسہ میں سے کچھ بھی نہیں رکھتا وہ مر گیا ہے، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔نور سے مراد صرف آنکھوں کا نور نہیں ہے۔نور سے مراد وہ ذریعہ ابلاغ ہے جو باہر کے حالات کو روح کے اندر تک پہنچاتا ہے اور ذہن کے آخری نقطے میں جو شعور کا آخری نقطہ ہے باہر کی دنیا کی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں جن کا اس ذریعہ ابلاغ کے سوا معلوم ہونا ممکن ہی نہیں۔ پس اگر ایک آدمی اندھا ہے، بہرہ ہے، گونگا ہے، اگر وہ لمس کی صفت بھی نہیں رکھتا، اگر مثبت صفات سے عاری ہے اور منفی صفت بھی نہیں رکھتا، یعنی بھوک محسوس نہیں کرتا، دکھ محسوس نہیں کرتا، جلن کا احساس نہیں، سردی کا گرمی کا احساس نہیں، نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے تو مردہ اور کس کو کہتے ہیں۔ پس کوئی انسان ایسا نہیں جو نور کے بغیر ہو اور ہم اسے زندہ کہہ سکیں۔ ہر انسان کو خواہ وہ کمزور ہے یا زیادہ ہے کچھ نہ کچھ نورِ فطرت عطا ہوا ہے اور جس حد تک کسی کو نورِ فطرت عطا ہوا ہے اسی حد تک اللہ تعالیٰ کا نور اس سے رابطہ کرتا ہے اگر وہ چاہے۔ اگر اس کی توجہ اس طرف ہو اور اپنے نور کو نورِ الٰہی سے ملانے کے لئے وہ محنت کرے جس کو کسب کہتے ہیں واقعۃً توجہ کرے۔

اس محنت کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ملتا ہے یٰٓاَیُّھَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ (الانشقاق:7) یعنی اے انسان نور تو تجھے عطا ہوا ہے نورِ فطرت سے تو کسی کو بھی خدا نے خالی نہیں چھوڑا مگر ملے گا وہی خدا سے جس کے متعلق فرمایا: اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا تو اپنے رب کی طرف جانے کے لئے بڑی محنت کر رہا ہے فَمُلٰقِیۡهِ پس یاد رکھ کہ تیری محنت کام آئے گی اور رائیگاں نہیں جائے گی جس طرح دنیا کی محنت کو پھل لگتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری طرف آنے کے لئے تو نے جو محنت کی یا جو کرے گا یا کر رہا ہے میں تجھے خوشخبری دیتا ہوں فَمُلٰقِیۡهِ تو اپنے اس رب کو پالے گا جس کے لئے تو محنت کر رہا ہے۔

یہی محنت تھی رمضان کی جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ روزے کی میں جزا ہوں کیونکہ یہ محنت خدا کی طرف تھی۔ پس اگر کوئی پھل نہ لگا ہو اگر ہمارے اندھیرے کسی معنوں میں بھی روشنی میں تبدیل نہ ہوئے ہوں تو ہم پر نہ اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم

نے اس رمضان سے کوئی ادنیٰ بھی نور کمایا ہے کیونکہ خدا کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ فرماتا ہے اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا اے انسان ضرور تو محنت کرے گا اور کر رہا ہے اور اِنَّكَ میں جو مضمون ہے یہ شرط پیدا کر رہا ہے بڑی شدت کے ساتھ کہ یاد رکھ تیرے لئے لازم ہے کہ محنت کرے یہ معنی بھی اسی میں سے نکل رہا ہے ہاں ہم جانتے ہیں کہ تو ضرور محنت کر رہا ہے اور كَدْحًا اس لفظ کو اس کے Infinitive کو، اس کے مصدر کو زور پیدا کرنے کے لئے دہرایا ہے کہ بڑی محنت کر رہا ہے تو فَمُلٰقِيْهِ پس خوشخبری ہو کہ تو اسے ضرور پالے گا۔ پس یہ جو پانا ہے یہ نور کمانے والی بات ہے جس کو اردو میں ہم نور کمانا کہتے ہیں۔ نور تو ہے مگر اس کو صیقل نہیں کیا گیا اور دروازے کھولے نہیں گئے اور غفلتوں اور سستیوں کے پردوں کو ہٹا کر آسمان کے نور کو اندر پہنچنے کے لئے رستہ نہیں دیا گیا ہو تو اندر کا نور کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ پس یہ تین چیزیں ہیں جن کا اکٹھا ہونا ضروری ہے۔ ایک اندر کی صلاحیت اور وہ نور جو خدا عطا کرتا ہے پیدائش کے وقت ہر انسان کو حصہ رسدی اس کی توفیق کے مطابق جو توفیق خدا کی تقدیر نے بنائی ہوتی ہے اس کو ایک نور ملتا ہے۔ پھر كَدْحًا کے دور میں وہ ڈالا جاتا ہے اور ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا ہے جہاں اس کو اس نور کو چمکانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے اور ان روکوں کو دور کرنا پڑتا ہے جو غفلت کی وجہ سے ایسے نوروں کی راہ میں ضرور حائل ہوتی ہیں۔ غفلت کی مثال نیند کی ہے۔ اب سورج چمک بھی رہا ہو تو تھکے ہوئے آدمی کو عین دوپہر کو سورج کے نیچے بھی نیند آجاتی ہے اور آنکھیں کھولنا بھی چاہے تو مند جاتی ہیں پھر کچھ بھی اس کو دکھائی نہیں دیتا۔ تو وہ شخص جو اپنی آنکھوں کو کھولنے کے لئے محنت نہیں کرتا اس پر نیند کا غلبہ آجائے وہ غفلت کی حالت میں اس روشنی کے وقت سے محروم رہ جاتا ہے اور جہاں تک روحانی آنکھوں کا تعلق ہے ان کا مضمون اس سے زیادہ گھمبیر اور مشکل ہے جو ظاہری روشنی دیکھنے والی آنکھوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہری روشنی دیکھنے کا تعلق ہماری بسر اوقات سے ہے اور ہم سست بھی ہوں تو مجبوراً کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہم بیرونی نور دیکھ سکیں اور اسے حاصل کر سکیں لیکن روحانی بقا میں انسان کو بسا اوقات محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ مر رہا ہے اور اس لئے وہ اپنے لئے لازم نہیں سمجھتا کہ میں ضرور اپنے نور کو چمکاؤں اور اپنی آنکھوں کو کھولوں یہی بڑی وجہ ہے کہ روحانی دنیا میں اندھیرے زیادہ ہیں اور ان کو صاف کرنا، ان کے پردوں کو چاک کر کے آگے نکلنا زیادہ محنت کو چاہتا ہے اور زیادہ شعور کو چاہتا ہے۔ جب تک شعور

بیدار نہ ہو اس محنت کی طرف توجہ پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔اب دیکھیں دن میں پانچ مرتبہ ہم کھانا کھاتے ہیں یعنی ترقی یافتہ ملکوں میں پانچ دفعہ تو ضرور کچھ نہ کچھ منہ میں ڈالتے ہی رہتے ہیں اور اگر سارا دن پانچ دفعہ نہ کھائیں بلکہ دو دفعہ ہی کھائیں جس کو ہم روزہ کہتے ہیں تو کتنی مشکل سے وقت گزرتا ہے۔ایسے سخت روزے بھی آتے ہیں کہ اس کا لمحہ لمحہ یاد کروا رہا ہوتا ہے کہ تم کسی چیز سے محروم ہو۔مگر روحانی دنیا میں بعض لوگ عمر بھر نماز نہیں پڑھتے ان کو پتا بھی نہیں لگتا کہ ہم بھوکے ہو کر مر ہی چکے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک کسی حد تک تو محسوس ہوتی ہے جب وہ موت میں تبدیل ہو جائے تو پھر کیسے محسوس ہوگی۔اکثر تو غفلت کی حالت میں نہیں بلکہ موت کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔مگر اس موت کا اور مادی موت کا ایک فرق ہے۔مادی موت ایک دفعہ آجائے تو پھر ہمیشہ کے لئے چمٹ جاتی ہے اس سے انسان نکل نہیں سکتا لیکن روحانی موت اگرچہ موت کی ساری علامتیں رکھتی ہے یعنی کھائے پیئے بغیر انسان پھر بھی جیسے دنیا میں سانس لے رہا ہے یہ امکان رکھتا ہے اپنے اندر کہ پھر وہ آنکھیں کھول دے۔پس روحانی موت کے مردوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب یہ رسول۔ اللہ کا رسول۔محمد رسول اللہ ﷺ تمہیں بلائے تا کہ تمہیں زندہ کرے تو استجابت کیا کرو، لبیک کہا کرو۔اب دیکھ لیں بظاہر تو ایک ہی قسم کی اصطلاحیں ہیں مگر ان دونوں میں فرق ہے۔پس جب مثالیں دی جاتی ہیں یا اصطلاحیں پیش کی جاتی ہیں تو آنکھیں بند کر کے مادی اصطلاحوں یا مثالوں کو بعینہٖ روحانی اصطلاحوں یا مثالوں پر چسپاں کرنا بیوقوفی ہے۔غور کر کے دیکھیں تو مضمون خود سمجھ میں آجائے گا۔زندگی اور موت کی باتیں ہوتی ہیں مادی زندگی میں تو خدا کہتا ہے ایک دفعہ مر گیا تو کبھی زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔پس جہاں موت کی اور زندگی کی اکٹھی باتیں کرتا ہے وہاں ضرور روحانی زندگی مراد ہے۔چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب عرض کیا رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرة:261)۔

تو خدا نے مردہ زندہ کرنے کا گُر سکھا دیا۔صاف پتا چلتا ہے کہ وہاں روحانی موت مراد تھی،جسمانی موت کا تو حال ہی مختلف ہے۔

پس جہاں آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا کہ اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو جب تمہیں یہ خدا کا رسولؐ بلاتا ہے تا کہ تمہیں زندہ کرے تو لبیک کہا کرو۔تو وہاں بھی روحانی زندگی مراد ہے۔تو ہر دفعہ

جو انسان بیرونی نیکیوں سے محروم رہتا ہے تو بعض دفعہ غفلت اور بعض دفعہ موت حائل ہو جایا کرتی ہے، جہاں تک موت کا تعلق ہے وہ تو دوبارہ اس مردے کا جی اٹھنا ایک غیر معمولی روحانی وجود کو چاہتا ہے اسی لئے انبیاءؑ کا سلسلہ جاری ہے۔ انبیاءؑ آتے ہیں تو پھر مردے زندہ ہونے شروع ہوتے ہیں۔ جب وہ نہیں ہوتے تو بسا اوقات غفلت سے پردے اٹھانے کے انتظام تو دیگر بزرگ بھی کرتے ہی رہتے ہیں مگر مردوں کو زندہ کرنے کی توفیق شاذ و نادر کسی کو ہوتی ہے۔ انبیاءؑ وہ ہیں جو ان غفلتوں کے پردے چاک کر دیتے ہیں، دبے ہوئے نوروں کو اٹھا دیتے ہیں، آنکھیں کھلنے لگتی ہیں، سوئی ہوئی حِسّیں جاگنے لگتی ہیں اور انسان پھر بیرونی نور سے رابطے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بیان فرما رہے ہیں کہ:

> جس کے آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے اور انبیاءؑ من جملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے۔

یہ مشکل الفاظ ہیں مگر جب بڑے مضمون کو کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے تو پھر عام جو زبان ہے وہ متحمل ہی نہیں ہوتی اس کے لئے اعلیٰ درجے کی زبان جو عامتہ الناس کے لئے مشکل ہے اس کو استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں سلیس اردو لکھتے ہیں وہاں حیرت انگیز خود روی کے ساتھ وہ زبان چلتی ہے اور ساتھ پڑھنے والے کو بھی بہاتی چلی جاتی ہے۔ جہاں بہت گہرے اور مشکل مضامین بیان ہونے ہوں وہاں آپؑ کی زبان اسی طرح مشکل ہو جاتی ہے اسے سمجھانا پڑتا ہے۔ **''سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی''** مراد یہ ہے کہ تمام فطرت انسانی کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی حال، ایک ہی صلاحیت، ایک ہی حدود اربعہ کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔ فطرت انسانی نیک اور پاک تو ہے مگر کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا ہے۔ کہیں کوئی کوزہ ہے کہیں کوئی وسیع دریا کے بہاؤ کا برتن ہے یا ظرف ہے جس میں دریا بہتا چلا جاتا ہے، کہیں وہ سمندر کا ظرف ہے جو لامتناہی دکھائی دیتا ہے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہ دیکھو تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ایسا ہی انسانی فطرت میں خدا تعالیٰ نے مختلف صلاحیتیں، مختلف ظرف رکھے ہیں۔

''اور انبیاءؑ وہ افراد عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسم ہو گئے ہیں''

اب نورِ مجسم کیا چیز ہے؟ نور تو جسم نہیں رکھتا۔ اگر اس بات کو سمجھیں تو پھر وحیءِ الٰہی اور انبیاءؑ کے عالی مرتبہ کا کچھ تصور دلوں میں باندھا جا سکتا ہے۔ جسم کے اندر مختلف صلاحیتیں ہیں اور ہر صلاحیت کا خدا تعالیٰ کی کسی صفت سے تعلق ہے اور اس صفت کے شکر کا حق ادا کرنے کا مضمون ہمیشہ انسان کو بعض نیکیوں کی طرف بلاتا ہے۔ آنکھ ہے، آنکھ کا بھی شکر ادا کرنے کا حق ہے۔ آنکھ پہلے خدا تعالیٰ کے نور کو دیکھنے، سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرے۔ جن جگہوں سے روکا جا رہا ہے وہاں سے رکے جن جگہوں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو وہاں دیکھے۔ اس کا دیکھنا اور اس کے دیکھنے کی سچائی یہ سارے وہ مضامین ہیں جن کا آنکھ کے نور سے تعلق ہے۔ صرف ظاہری طور پر شعاعوں کے منعکس ہونے سے انسان نہیں دیکھ سکتا۔ جب روحانی دنیا میں بات کرتے ہیں تو یہ ساری باتیں آجاتی ہیں یعنی وہ مقام جہاں خدا فرماتا ہے رک جاؤ یہاں ٹھوکریں ہیں اگر آپ ان مقامات سے گزر جائیں اور وہ مقامات آپ کو دکھائی نہ دیں تو لازماً ٹھوکر کھائیں گے اور اسی کا نام اندھے کا بھٹکنا ہے۔ ظلمات میں بھٹکنے والے اسی طرح بے چارے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ انبیاءؑ وہ ہیں جو نورِ مجسم ہو جاتے ہیں یعنی ان کے جسم کا کوئی ذرہ بھی ایسا نہیں رہتا جس کی صفات پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا نور جلوہ گر نہ ہو چکا ہو۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، ان کی ہر حرکت، ان کا ہر سکون خدا کے تابع ہو تو تب اسے نورِ مجسم کہیں گے نا۔ اس کے بغیر وہ نور مجسم کیسا ہو سکتا ہے اور جب نور ہر چیز کو ڈھانپ لیتا ہے تو گویا جسم غائب ہو گیا، جسم برتن بن گیا، اس برتن کو نور نے بھر دیا ہے اور پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جسم ہے اور یہ نور ہے۔ ان معنوں میں واقعۃً بندوں کے نور مجسم بنتے ہیں مگر ان بندوں کے جو بندگی کا حق ادا کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ بھی نور مجسم تھے۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ تمام انبیاءؑ نور مجسم تھے۔ نور مجسم ہوئے بغیر ان پر وحی کا نزول ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نورِ مجسم ہونے

کے لحاظ سے ان میں اور حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ میں ایک فرق رہ جاتا ہے کہ ایک چھوٹا وجود نور مجسم بنا ہے یا ایک بڑا وجود نور مجسم بنا ہے۔ ایک چھوٹا ظرف بھرا ہے یا ایک بڑا ظرف بھرا ہے۔ پیالہ بھی تو بھرتا ہے، کشکول بھی بھرتا ہے مگر وہ خزانہ بھی بھرا ہوتا ہے۔ بسا اوقات جس سے لاکھوں کروڑوں کشکول بھرے جاسکتے ہیں ایک تالاب بھی بھرتا ہے اور سمندر بھی بھرتا ہے۔ تو یہ کہہ دینا کہ انبیاءؑ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو شامل کیا گیا یہ گویا کہ نعوذ باللہ من ذالک رسول اللہ ﷺ کی تخفیف فرمائی، ہرگز درست نہیں۔

آپؑ یہ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاءؑ نورِ مجسم تھے مگر ان سب نوروں سے بڑھنے والا نور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نور رہے کیوں کہ آپؐ کا ظرف بہت بڑا تھا اور جتنا بڑا ظرف تھا اتنی آپؐ کو محنت کرنی پڑی ہے اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا کی دین تھی اس کو بنا دیا، اس کو نہ بنایا۔ یہ بات نہیں ہے۔ جس کو جتنا زیادہ دیا اس کو اتنا ہی زیادہ محنت کرنا پڑے گی اسے بھرنے کے لئے۔ کسی نے ایک گلاس بھرنا ہے، کسی نے جگ بھرنا ہے، کسی نے مٹکا بھرنا ہے، کسی نے پورا تالاب بھرنا ہے، کسی کو کہا ایسا سمندر بھر دو کہ کل عالم کی پیاس بجھا دو تمام بنی نوع انسان کا رسول تمہیں بنا کے بھیجا جارہا ہے۔ فرق تو ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اس کا ذکر کرتے ہوئے آگے اس مضمون کو بڑھاتے ہیں۔

> اس جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت ﷺ کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے
> جیسا کہ فرمایا: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ: 16)۔
> وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب: 47)

اور اللہ کی راہ میں بلانے والا اس کے اذن کے ساتھ جو سِرَاجًا مُّنِيْرًا ہے۔ تو جو کل عالم کو نور بخشے اس کو سورج ہی کہنا چاہئے جب کہ کسی اور نبی کو سورج نہیں فرمایا گیا مگر سارے ہی روشن تھے۔ سارے ہی سرتاپا روشن تر تھے۔ کوئی ان کے وجود کا حصہ اندھیرا نہیں تھا مگر خدا نے ان کو جتنا ظرف دیا تھا وہ بھر گیا اس ظرف کو بھرنے میں ان کو نسبتاً آسانی تھی کم محنت کرنی پڑی اس لئے جزا سزا کا مضمون بھی اسی طرح جاری ہے انصاف کے ساتھ زیادہ دیا تھا تو زیادہ محنت کے تقاضے بھی تو

پورے کرنے پڑے اور جس نے سب تقاضے پورے کر دیئے اپنے ظرف کے مطابق بعینہٖ اس کی طاقتوں کے مطابق اس پر بوجھ ڈالا گیا لیکن جو فرق ہے وہ نمایاں فرق ہے۔ بہت سے اور پہلو بھی ہیں فی الحال میں ان کا ذکر چھوڑ رہا ہوں۔

آخر پہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کا خلاصہ یوں نکالتے ہیں، میں مضمون جو نور کے تھے بیان کروں گا لیکن اس موقع پر کیونکہ مضمون وہاں تک پہنچ گیا ہے جہاں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی اس تحریر کا پڑھنا عین مناسب حال ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔

''وجود مبارک حضرت خاتم الانبیاء ﷺ میں کئی نور جمع تھے سو ان نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو وحی الٰہی ہے وارد ہوا اور اس کے وارد ہونے سے وجودِ باوجود خاتم الانبیاء ﷺ کا مجمع الانوار بن گیا''

(براہین احمدیہ حصّہ سوم، حاشیہ نمبر 11 روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 195)

وہ حوالہ ایک اور بھی ہے جو اس موقع پر بہت ہی برمحل چسپاں ہو رہا ہے لیکن اس وقت اس کی تلاش میں دقت پیش آ رہی ہے شاید اللہ کا منشاء یہی ہے کہ باقی مضمون کو آگے بڑھانے کے بعد پھر آخر پر ہی اس کو پیش کروں۔ اب وقت بھی چونکہ ختم ہو رہا ہے اس لئے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں اور یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ جتنی باتیں میں نے کہی ہیں یہ گزشتہ رمضان کے حوالے سے کہی ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم ہاتھوں سے جاتے ہوئے رمضان کا جتنا حصہ روک سکتے ہیں روک لیں اور دامن پکڑیں کوشش کریں کچھ تو ہاتھ آ جائے۔ اس لئے یہ وقت سوچ میں اور فکر میں اور نفس کے مطالعہ میں اور کھوج میں خرچ کریں کہ رمضان آیا تھا، چلا بھی گیا، کچھ دقتیں لے کے آیا کچھ سہولتیں باقی چھوڑ گیا مگر دقتوں نے کچھ ایسی سہولتیں بھی عطا کی ہیں جو دائمی ہو چکی ہیں، جن کے نتیجے میں آپ کہہ سکتے ہوں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے کچھ ایسا تعلق قائم کر لیا ہے جو اب مجھ سے وفا کرے گا مجھے کبھی چھوڑ کے نہیں جائے گا۔ اگر اس مضمون پر غور کریں اور ہاتھ کچھ نہ آئے جیسے خالی برتن لے کے داخل ہوئے تھے ویسے خالی برتن ہو کے نکلے ہیں، اگر آپ کا غصے پر کنٹرول اتنا نہیں ہے ویسے ہی ہے جیسے پہلے تھا یعنی کوئی اس میں فرق نہیں پڑا۔ اگر نفس کی پیروی سے رکنے کی مزید طاقتیں نصیب نہیں ہوئیں، اگر نیکی کا ایسا لطف نہیں آیا کہ اور نیکیاں کرنے کو جی چاہنے لگے اور جو نیکیاں ہو گئیں ان کو چھوڑنے کو دل

نہ چاہے بلکہ رستے تلاش کریں کہ میں پھر دوبارہ ایسی ہی نیکیاں کروں، یہ مضامین ہیں جن پر غور کرنے سے آپ حقیقت میں اس دکاندار کی طرح ہوں گے جو سارا دن کی کمائی کے بعد رات کو بیٹھتا ہے، رات کے چراغ جلاتا ہے، دیکھتا ہے کہ کیا پایا اور کیا کھویا اور جو نہیں کرتا اس کو کچھ پتا نہیں چلتا۔

پس میں پسند نہیں کرتا کہ جماعت غافلین کی جماعت ہو۔ہم نے دنیا میں بہت سے ایسے کام کرنے ہیں جن کی توفیق غافلوں کو مل نہیں سکتی۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیکھو سِرَاجًا مُّنِيْرًا کی تعریف کے ساتھ داعی الی اللہ کے مضمون کو جیسا کہ قرآن نے فرمایا باندھ کر نمایاں طور پر دکھایا ہے۔داعی الی اللہ کے لئے سراج منیر ہونا ضروری ہے، اس داعی الی اللہ کے لئے سراج منیر ہونا ضروری ہے جو سب دنیا کو بلا رہا ہے جو سب دنیا کو روشنی کی طرف بلاتا ہے روشنی دے گا تو بلائے گا نا۔جس کی اندھیروں تک رسائی ہی نہیں ہے وہ کیسے لوگوں کو کھینچ کر روشنی کی طرف نکالے گا۔پس آنحضرت ﷺ داعی الی اللہ بنائے گئے اس لئے اللہ فرماتا ہے سِرَاجًا مُّنِيْرًا بنائے گئے۔طبعی تقاضا تھا دعوت الی اللہ کا۔

ہماری جماعت آج یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ ہم داعی الی اللہ بنائے گئے ہیں تمام دنیا کے انسانوں کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے نور سے منور کرنے کے لئے۔اب دامن میں کچھ نور ہوگا تو لے کے چلیں گے نا اور کچھ نہیں ہے تو اپنے رومال میں جگنو ہی اکٹھے کر لئے ہوتے۔وہ کچھ روشنیاں چھوٹی چھوٹی جو چمکتی بھی ہیں اور بجھ بھی جاتی ہیں اگر زیادہ اکٹھی ہو جائیں تو اس سے بھی کچھ رستہ دکھائی دینے لگتا ہے تو نور کی تلاش کریں۔تب داعی الی اللہ بنیں گے اور نور کو محفوظ کریں اور اس نور کو پھر چمکائیں اور صیقل کریں تا کہ آپ کے آگے آگے بھاگے جیسا کہ قرآن کریم فرما رہا ہے آپ کا رستہ بھی صاف کرے تو دشمن بھی دیکھے تو جان لے کہ نجات اسی میں ہے کہ اس صاحب نور کے ساتھ چلیں۔جب اندھیرے گھیر لیں، رستے خطرناک ہوں تو کوئی ایک صاحب چراغ بھی ہو سب اکٹھے ہو کر اس کے پیچھے چلتے ہیں اس کا دامن پکڑتے ہیں اس کے ساتھ قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ خود اپنا نقصان ہے، تو ایسے چمکتے ہوئے نورانی وجود کے طور پر دنیا کے سامنے ابھریں جہاں آنحضرت ﷺ کے سراج منیر کا کچھ حصہ موجود ہو۔

سراج منیر کا لطف یہ ہے کہ سراج منیر ہر نور پیدا کرتا ہے، وہ شمع جو جلائی جاتی ہے وہ بھی

سورج کے نور سے بنی ہوئی ہے وہ تیل جس کی طاقت سے ہوائی جہاز اڑائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے کارخانے قائم کئے جاتے ہیں وہ بھی سراج منیر سے بنا ہوا ہے اور سِرَاجًا مُّنِيْرًا کی آگ سے نہیں سِرَاجًا مُّنِيْرًا کی روشنی سے۔ میں پہلے بھی یہ مضمون آپ پر کھول چکا ہوں میں صرف حوالہ دے رہا ہوں اس حوالہ کو ذہن میں یاد رکھیں کہ نور الٰہی ہے جو سورج میں بھی چمکا ہے اور سورج اس نور کا پردہ ہے خود نور الٰہی بذات خود نہیں ہے لیکن وہ پردہ چمک اٹھا ہے نور الٰہی سے۔ آنحضرت ﷺ وہ نور کا پردہ ہیں۔ جس میں خدا اس شان سے چمکا ہے کہ گویا وہی خدا دکھائی دینے لگے۔ یہ مضمون ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سِرَاجًا مُّنِيْرًا سے کچھ نور مانگیں۔ اپنی جھولی اس کے آگے پھیلائیں اس نور سے اپنا کوئی گوشہ تو منور کریں۔ اگر پیار اور محبت سے آپ نے محمد رسول اللہ ﷺ کا نور مانگا اور اپنایا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ نور اپنے اردگرد بھی نور کے لئے جگہیں پیدا کرنا شروع کر دے گا اس نور میں بڑھنے کی صلاحیت ہے اس نور میں پھیلنے کی صلاحیت ہے اور پھر آپ کا سفر حقیقت میں زندگی اور نور کا سفر ہوگا پھر آپ کا سفر بے ثمر نہیں رہے گا۔

دعوت الی اللہ کے پھل جب ایسے داعیین الی اللہ کو لگنے لگتے ہیں جو نور کی روشنی لے کر چلتے ہیں تو اس نور سے وہ بھی حصہ پاتے ہیں ورنہ بسا اوقات اندھی تبلیغ سے بھی کچھ لوگ احمدی ہو جاتے ہیں اسلام قبول کر لیتے ہیں مگر وہ بھی مردہ مردہ سے رہتے ہیں، ان میں جان نہیں پڑتی۔ آپ وہ نئے ہونے والے مسلمان بنائیں آپ وہ نئے ہونے والے احمدی پیدا کریں جو آپ کے نور سے منور ہوں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے نور کا ایک جلوہ ہے اور آپ کی زندگی سے ان میں بھی جھلکنے لگے۔ آپ کی قربانی کی روح ان کے دل میں بھی دھڑکنے لگے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اس کے بغیر دنیا زندہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے بغیر اس دنیا کے اندھیرے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جس دعوت کے میدان میں ہمیں جھونکا گیا ہے وہ اسلام کی اشاعت کا میدان ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ یکم مارچ 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ﴿۴۶﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۷﴾ (الاحزاب: 46، 47)

فرمایا:

اے نبی ﷺ ہم نے تجھے نگران بنا کر بھیجا ہے وَّمُبَشِّرًا اور خوش خبری دینے والا وَّنَذِيْرًا اور ڈرانے والا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ اور اللہ کی طرف سے داعی، داعی الی اللہ، اس کے حکم کے ساتھ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا اور ایک روشن سورج۔ یہ وہ صفات حسنہ ہیں جو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی بیان ہوئیں اور ان صفات کا جو مرکزی نکتہ ہے وہ نور ہی ہے اور غرض دعوت الی اللہ ہے تو وہ صفات حسنہ جو نور کے گرد گھوم رہی ہیں یا نور کی تشکیل کر رہی ہیں اور مقصد دعوت الی اللہ ہے یہ مضمون ہے جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا گیا اور چونکہ یہ جو نور کے مضامین کا سلسلہ ہے میں آج کے خطبے میں سر دست اس کو ختم کر کے پھر دوسرے مضامین کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں اس لئے یہ آیت میں نے عنوان بنائی ہے آج کے خطبہ کی کیونکہ نور کے تعلق میں سب سے زیادہ ضرورت ہمیں دعوت الی اللہ کے لئے پیش آرہی ہے اور کوئی دعوت الی اللہ کی سکیم دنیا میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی جب تک دعوت الی اللہ کرنے والا نور سے کچھ حصہ پائے ہوئے نہ ہو۔

جو نور سے حصہ پاتا ہے اور پھر دعوت الی اللہ، اللہ کے اذن سے کرتا ہے وہی ہے جو کامیاب

بنایا جاتا ہے، وہی ہے جس کی دعوت کے کچھ معنی ہیں ۔ ورنہ ایسے دعوت الی اللہ کرنے والے بھی دنیا میں بے شمار ہیں بلکہ اکثریت میں ہیں جو دعوت تو کرتے ہیں مگر بے نور اور بے اذن ۔ نہ ان کو خدا نے اس دعوت کا اذن دیا نہ اس نور سے ان کا ماحول، ان کا دل، ان کا سینہ اُجالا کیا گیا جس نور کے بغیر خدا کی طرف بلانا بے معنی ہے۔اس مضمون کا سب سے پہلا نکتہ جو سمجھنے کے لائق اور دل میں بٹھا دینے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نور ہے بلکہ وراء النور ہے اور ہر پردہ خدا کا ایک نور کا پردہ ہے۔اس کی طرف دعوت دینے والا اگر اندھیرا ہو تو اس کو اس دعوت کا حق ہی نہیں پہنچتا اور یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی نے نور سے حصہ پایا ہو اور اس کا دل، اس کا سینہ اور اس کا دماغ ،اس کی تمام صلاحیتیں روشن نہ ہوئیں ہوں ۔ روشنی کا کچھ نہ کچھ پرتو تو اس کے اندر ہونا ضروری ہے اور اگر کسی کے پاس وہ روشنی ہے جو خدا سے ملتی ہے تو پھر وہ خدا کی طرف بلانے کا حقدار بنتا ہے۔ پھر اس کی دلیل اس کے ساتھ چلتی ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل اس کا نور ہے اور اس سے بہتر کوئی دعوت الی اللہ کی طرف بلانے کا اور نسخہ نہیں ہے اور کوئی طریق نہیں ہے کیونکہ ہر دوسرے طریق میں خامیاں ہیں اور نقصانات ہیں اور ایسی دعوتیں جھگڑوں اور فساد پر منتج ہوتی ہیں اور بسا اوقات دنیا میں دعوت الی اللہ ہی کے بہانے فسادات کئے جاتے ہیں۔اس لئے مرکزی نکتہ یہی ہے کہ نور کے بغیر دعوت کا کوئی تصور نہیں ۔نور میسر ہو تو دعوت کا حق پہنچتا ہے مگر تب بھی لازم ہے کہ خدا کا اذن بھی ہو اور بغیر اذن کے کوئی دعوت نہیں ہے۔

پس اذن الٰہی کے نتیجے میں جس دعوت کے میدان میں ہمیں جھونکا گیا ہے وہ اسلام کی اشاعت کا میدان ہے۔ وہ اللہ کی طرف بلانے کا میدان ہے۔مگر اس نور کی طرف جس کے بغیر خدا کی طرف سفر ممکن نہیں ہے یعنی سراج منیر کی طرف ۔ سراج منیر جو سورج ہے وہ خود اپنی ذات میں خدا کا نور نہیں مگر خدا کے نور کا جو اس کے ماوراء ہے، پرلی طرف ہے، اس کا ایک چمکتا ہوا نشان ہے۔ایسا پردہ ہے جو خود روشن ہو گیا ہے۔ پس جو سب سے زیادہ روشن پردہ خدا کا ہمیں اس دنیا میں دکھائی دیتا ہے وہ سورج ہے اور سورج کی طرف کا سفر ہی حقیقت میں ماوراء نور کی طرف کا سفر قرار دیا جاسکتا ہے۔ پس جیسے دنیاوی نظام میں سورج کی مثال ہے ویسا ہی روحانی نظام میں حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کا وجود ہے جو خدا کے نور کا وہ پردہ ہے جس سے زیادہ روشن تر پردہ ہماری دنیا کے انسانوں کو دکھائی نہیں دیا، نہ دے سکتا ہے۔ وہ ایسا نور کا روشن پردہ ہے کہ جب ظاہر ہوتا ہے تو ہر نور

والا اس کے سامنے مٹ جاتا ہے نہ چاند کا وجود رہتا ہے، نہ ستارے چمکتے ہیں کوئی اور نور دنیا کا اس کے سامنے چمکنے کی مجال نہیں رکھتا۔ روشنیاں جو انسان بناتا ہے وہ بھی بجھ جاتی ہیں یا بجھا دی جاتی ہیں اگر نہیں بجھتیں تو نور دینا چھوڑ دیتی ہیں۔ پس یہ وہ نور ہے جس کی طرف ہم نے تمام دنیا کو بلانا ہے اور اسی کا ہمیں اذن دیا گیا ہے۔ ایسے نور کیسے پیدا ہوتے ہیں اور کیسے ہم اس نور سے حصہ پا سکتے ہیں اس مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض اقتباسات آپ کے سامنے رکھے تھے جو ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے تھے یعنی جو اقتباسات میں نے چنے تھے ان کا مضمون جاری تھا۔ پہلے اقتباسات ہیں جو پچھلے خطبے میں، اس سے بھی پہلے آپ کے سامنے پڑھتا رہا ہوں ان کا مرکزی نقطہ نبوت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اصل نور اور کامل نور خدا کے کامل بندوں کو دیا جاتا ہے اور اس نور میں غیر نبی شریک نہیں ہے۔ انبیاءؑ کی ساخت ایسی ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے اس کامل نور کا محافظ اور امین بنانے کی خاطر پیدا فرمایا ہے۔ اس لئے ان کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو نور کو اپنانے اور اس کو بغیر نفسی میل کے چمکا کر باقی دنیا کو دکھانے کی طاقت بخشتی ہیں، وہ صلاحیتیں ان کے اندر موجود ہیں اور اس نورِ روحی کو جو انبیاءؑ کے ساتھ خاص ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بعض مثالیں دے دے کر سمجھا رہے ہیں اور یہ واضح فرما رہے ہیں کہ یہ نور صرف نبیوں کے لئے ہے غیر نبی اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ اقتباس جو بقیہ حصہ ہے میں آپ کے سامنے پڑھ کے سناتا ہوں۔ آپؑ فرماتے ہیں۔

> ”وہی ہے جس نے ہر ایک چیز کو ظلمت خانہ عدم سے باہر نکالا اور خلعتِ وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حدّ ذاتہٖ واجب اور قدیم ہو۔“

کہ خود صرف ایک اللہ ہی کی ذات ہے جس نے انسان کو ظلمت خانہ قدیم سے باہر نکالا یعنی عدم کا نام ظلمت خانہ رکھا ہے فرمایا ہے خدا کے سوا ہر طرف تاریکی ہے یعنی عدم ہے اور وہی وجود ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ سے عدم سے وجود پیدا کرتا ہے اور عدم سے وجود میں آنا ایک نور کو چاہتا ہے کیونکہ عدم کو ظلمات سے تشبیہ دی ہے۔ پس ایک وہ نور ہے جو فطری نور ہر انسان کو، ہر وجود کو ملتا ہے اور اس میں درحقیقت انسان اور غیر انسان، زندہ اور مردہ کی کوئی تمیز نہیں ہے بغیر نور کے وجود کا تصور ہی ممکن نہیں کیونکہ ہر وجود نور سے عدم سے نکل کے وجود کی روشنی میں آیا ہے اس لئے جب وہ اندھیرے

سے نکل کے روشنی میں آیا ہے تو بغیر روشنی کے ہو ہی نہیں سکتا۔ پس وہ تمام صفات جن کو ہم مادی صفات کہتے ہیں وہ بھی نور رکھتی ہیں اور ان میں سے ہر صفت خدا تعالیٰ کے کسی نور کا پرتو ہے اور اس کے بغیر عدم ہے۔ پس جب وہ صفات مر جائیں تو کائنات عدم ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہاں زندگی اور موت کی وہ بحث نہیں ہے جس کا انسان سے یا دیگر حیوانوں سے تعلق ہے۔ یہاں زندگی اور موت کی وہ بحث ہے جس کا عدم اور وجود سے تعلق ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اول نور وہی ہے جس کے ذریعے عدم کو وجود میں تبدیل کیا گیا اور اس پہلو سے ہر موجود میں خدا تعالیٰ کا نور کسی رنگ میں ضرور چمک رہا ہے اور اگر نہیں ہے تو پھر وہ چیز نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔

اس تفسیر میں فرماتے ہیں۔

”۔۔۔کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حدّ ذاتہٖ واجب اور قدیم ہو۔ یا اس سے مستفیض نہ ہو۔ خاک اور افلاک۔۔۔“

یعنی اللہ سے استفادہ کئے بغیر کوئی نور یا وجود موجود ہو یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ”خاک اور افلاک“ ان کو بھی اللہ کے نور کا مورد قرار دیا۔ پس یہ جو نور کی تفسیر بیان فرما رہے ہیں اس کا سفر لفظ خاک سے کیا ہے جس میں کوئی زندگی نہیں ہے اور افلاک یعنی زمین اور کائنات ساری۔

”۔۔۔اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور روح اور جسم سب اسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔ یہ تو عام فیضان ہے جس کا بیان آیت اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (النور:36) میں ظاہر فرمایا گیا۔۔۔“

فرمایا یہ فیضان عام ہے جس کو اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ میں بیان فرمایا گیا۔

”۔۔۔یہی فیضان ہے جس نے دائرہ کی طرح ہر یک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے جس کے فائز ہونے کے لئے کوئی قابلیّت شرط نہیں۔۔۔“

اس میں کسب کا کوئی دخل نہیں یہ روحانیت کی جلوہ گری سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے قرآن کریم نے رحمانیت سے خلق کو منسوب فرمایا۔ رحمانیت ہی سے انسان کا وجود ظہور پذیر ہوا ہے۔ رحمان ہی ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے وہاں خالق نہیں فرماتا اللہ تعالیٰ، رحمان فرماتا ہے کیونکہ رحمٰن کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی ہو اور اس سے فیض طلب کرے رحمٰن کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کوئی

فیض کا مستحق وجود ہو۔ وجود نہ بھی ہو تو رحمان خدا، از خود اپنے کرم اس طرح نچھاور کرتا ہے جیسے خودرَو چشمے سے پانی ابلتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی پیاسا وہاں موجود ہے کہ نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پانی کسی ایسی زمین تک پہنچتا ہے کہ نہیں، کہ وہ سیراب ہونے کا تقاضا کر رہی ہو۔ پس اس پہلو سے یہ فیضان عام ہے جس کو نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ میں فرمایا گیا۔ اس کا دوسرا نام رحمانیت ہے۔

"۔۔۔یہی فیضان ہے جس نے دائرہ کی طرح ہر ایک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے جس کے فائز ہونے کے لئے کوئی قابلیّت شرط نہیں لیکن بمقابلہ اس کے ایک خاص فیضان بھی ہے جو مشروط بشرائط ہے اور انہی افراد خاصّہ پر فائض ہوتا ہے جن میں اس کے قبول کرنے کی قابلیّت واستعداد موجود ہے یعنی نفوس کاملہ انبیاء علیھم السلام پر۔۔۔"

۔۔۔تو جس نورِ عام کا ذکر خاک کے ذکر سے شروع فرمایا اب اس کا انتہائی مقام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بیان فرما رہے ہیں وہ وجود خاصہ ان افراد پر مشتمل ہے۔ جنہیں ہم انبیاء علیہم السلام کہتے ہیں۔

"۔۔۔جن میں سے **افضل اور اعلیٰ** ذات جامع البرکات **حضرت محمد مصطفیٰ** ﷺ ہے۔ دوسروں پر ہر گز نہیں ہوتا۔۔۔"

یعنی **محمد** رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے جو سب انبیاءؑ سے **افضل** جامع برکات ہے۔ اس گروہ کے سوا وہ نور "دوسروں پر ہر گز نہیں ہوتا"، یعنی وہ نور جو آسمان سے نازل ہوتا ہے وہ ان کے سوا کسی اور پر نازل نہیں ہوتا۔

"۔۔۔اور چونکہ وہ فیضان ایک نہایت باریک صداقت ہے اور دقائقِ حکمیّہ میں سے ایک دقیق مسئلہ ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اول فیضانِ عام کو (جو بدیہی الظہور ہے) بیان کر کے پھر اس فیضانِ خاص کو بغرض اظہارِ کیفیت نور حضرت خاتم الانبیاء ﷺ ایک مثال میں بیان فرمایا ہے کہ جو اس آیت سے شروع ہوتی ہے۔
مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ (النور:36)۔۔۔"

فرمایا چونکہ اصل غرض نور کی جلوہ گری کی جس کا آخری جلوہ پیدا کرنا تھا جو حضرت اقدس **محمد** رسول اللہ ﷺ کی ذات میں وجود میں آیا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ شان دکھائی دیتی ہے کہ آغاز فرماتا ہے کائنات کا بے جان چیزوں سے، خاک سے، مادے سے، دنیا سے، زمین و آسمان

اور جو کچھ ان میں ہے ان کے ذکر سے اور پھر فرماتا ہے اور خدا کے نور کی مثال جو اعلیٰ مثال ہے، جو ارفع مثال ہے وہی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ اور یہاں آنحضرت ﷺ مراد ہیں لیکن آپؑ کے متعلق فرمایا آپؑ منجملہ گروہ انبیاءؑ میں سے ہیں اور یہ جو نور کا عطا ہونا ہے اس نورِ روحی کا جس کا ذکر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام آخری درجہ کمال کی صورت میں پیش فرما رہے ہیں یہ انبیاءؑ کے سوا دوسروں کو نہیں ملتا۔ کوئی ان میں انبیاءؑ کا شریک نہیں ہے۔ پھر آپؑ فرماتے ہیں، میں کچھ حصے چھوڑ کر آپ کو وہ باتیں بتانا چاہتا ہوں جن پر اس مضمون کو میں ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ فرمایا:

”۔۔۔ورنہ نور کے فیض کے لئے نور کا ضروری ہونا ایسی بدیہی صداقت ہے کہ کوئی ضعیف العقل بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔۔۔“

نور تو ملتا ہے انسان کو مادے کو بے جان چیزوں کو بھی ملا اور جتنا ان کے اندر ظرف ہے اتنا ہی آسمان سے نور اترتا ہے ان پر، اسی قدر ان کا تعلق اللہ جل شانہٗ کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اب انبیاءؑ کو جو نور ملا ہے وہ ان کے اندرونی نور کا مظہر ہے اور ان کے اندرونی نور سے ایک مناسبت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں یہ تو ایک ایسی ظاہری سچائی ہے کہ ایک ضعیف العقل کو بھی معلوم ہو جاتی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عقل اتنی روشن تھی کہ آپؑ کے معیار کے مطابق ایک ضعیف العقل کو بھی معلوم ہونی چاہئے مگر وہ دنیا والے جو نبی کے نور سے روشن نہ ہوں وہ قوی العقل بھی اس بات سے محروم ہیں بے چارے کیونکہ ان کے اندر وہ نور نہیں ہے جو نور کی باتیں سمجھ سکتا ہو۔ ”مگر ان کا کیا علاج“ اب ان کا ذکر بھی فرما رہے ہیں۔ ضعیف العقل کو بھی معلوم ہونا چاہئے مگر ضعیف العقل سے مراد ہے وہ عقل کی تعریف جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے وہ جن لوگوں پر صادق آتی ہے وہ تھوڑی عقل بھی رکھتے ہوں تو ان کو بھی پتا لگ جائے گا اس مضمون کا۔ مگر جہاں تک دنیا والوں کی باتوں کا تعلق ہے فرماتے ہیں۔

”مگر ان کا کیا علاج جن کو (اس) عقل سے (یعنی اس کا لفظ نہیں ہے مگر مراد یہ ہے اس عقل سے) کچھ بھی سروکار نہیں اور جو کہ روشنی سے بغض اور اندھیرے سے پیار کرتے ہیں اور چمگادڑ کی طرح رات میں اُن کی آنکھیں خوب کھلتی ہیں۔“

یعنی مذہب کے علاوہ بات ہو دنیا داری کے اندھیرے ہوں جن کا خدا سے تعلق وہ نہ باندھ

سکیں ان مضامین میں ان کی آنکھیں خوب کھل جاتی ہیں۔پس آنحضرت ﷺ کا دجال کو یک چشمی قرار دینا اور دائیں آنکھ کا کلیۃً اندھی اور بائیں بہت بڑی اور روشن، یہ اسی مضمون کی وضاحت کی خاطر تمثیل پیش کی گئی ہے کہ ان کا الٰہی نور سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوگا گویا کلیۃً اندھے ہیں اور جہاں تک دنیا کے اندھیروں کا تعلق ہے خدا کے نور کے مقابل پر دنیا اندھیری ہے وہاں چمگادڑوں کی طرح ان کی آنکھیں خوب کھل جاتی ہیں اور بہت روشن ہو جاتی ہیں۔وہ کچھ دیکھنے لگتی ہیں جو نور سے دیکھنے والے کی آنکھ کو وہاں اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔تو یہ دو الگ الگ دنیائیں ہیں جن کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اس طرح بیان فرمائی کہ جن کو اندھیروں سے پیار ہے چمگادڑ کی طرح رات کو ان کی آنکھیں خوب کھلتی ہیں۔

”لیکن روز روشن میں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔**خدا اپنے نور کی طرف**“

اور یہاں نور سے مراد قرآن شریف لیا گیا ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا نور آنحضرت ﷺ کا بھی نام ہے اور قرآن کا بھی نام ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام فرما رہے ہیں کہ

”**خدا اپنے نور کی طرف** (یعنی قرآن شریف کی طرف) **جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ ہر یک چیز کو بخوبی جانتا ہے**“

اس کے بعد پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”۔۔۔پس اس مثال میں جس کا یہاں تک جلی قلم سے ترجمہ کیا گیا ہے۔“

وہاں اصل عبارت میں وہ آیات جو ہیں اور مثال ہے اس کا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جلی قلم سے ذکر فرمایا ہے تا کہ دیکھنے والا معلوم کرے کہ یہ مرکزی چیز ہے، بڑے قلم سے اس کو لکھا ہوا ہے لیکن یہ جو میرے سامنے تحریر ہے اس میں جلی قلم نہیں ہیں مگر میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ جلی قلم کے مضمون کا مطلب Underline ہے جو خاص طور پر Emphasized ایسی بات جس کو نمایاں روشن کر کے دکھایا گیا ہے، وہ کیا ہے۔فرماتے ہیں۔

”خدا تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے دل کو شیشہ مصفّٰی سے تشبیہ دی“

یعنی دل کا جہاں تک تعلق ہے وہ شیشہ ہے جو بالکل پاک اور صاف ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو۔

''۔۔۔پھر آنحضرت ﷺ کے فہم وادراک وعقل سلیم اور جمیع اخلاق فاضلہ جبلّی وفطرتی کو ایک لطیف تیل سے تشبیہ دی''

اب یہ آپ کو سمجھانا پڑے گا کیونکہ اس میں سے کچھ نہ کچھ سب نے اخذ کرنا ہے اگر سمجھ نہیں آئے گی تو پھر لیں گے کیا۔ایک چیز ہے دل۔دل نیتوں کی آماجگاہ ہے اور میلانات رکھتا ہے جو طبعاً ہر دل میں موجود ہیں۔اگر نیتیں بگڑیں تو دل اسی حد تک میلا ہوتا چلا جاتا ہے۔اگر میلانات غلط ہو جائیں تو وہ دل نور کی حفاظت کا اہل نہیں رہتا اور اس کے غلط استعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔پس اس پہلو سے دل سے سفر کا آغاز فرمایا کہ دل، جہاں تک حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے آپ کا دل روشن اور مصفّٰی تھا کہ اس میں فطرتاً ہی کسی غیر اللہ کی طرف کوئی میلان نہیں تھا۔تکدر نہیں تھا۔یعنی غیر کا سایہ بھی آپ کے دل پر نہیں پڑا تھا۔کوئی خوف نہیں تھا جس نے آپ کے دل کو میلا کر دیا ہو۔پس **لا حول ولا قوة** کی یہ تفسیر ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آنحضور ﷺ کے دل کے تعلق میں بیان فرمائی۔کوئی خوف غیر اللہ کا آپ کے دل پر نہیں تھا، کوئی تکدّر نہیں تھا، کوئی محبت خدا کے سوا کسی اور چیز کی نہیں تھی۔یہ وہ دل ہے جو نور کی آماجگاہ بنانے کے لئے یعنی نور کامل کے اظہار کے لئے چنا گیا اور دوسری چیز اس کے لئے کیا ضروری تھی۔صرف دل کافی نہیں ہے۔وہ چیز یہ ہے۔فہم اور ادراک، عقل بھی ہونی چاہئے، باتوں کو صحیح سمجھنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہئے۔محض نور اپنی ذات میں دل پر نازل ہو تو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچائے گا اگر اسے سمجھنے کی، اس نور کے باریک لطائف تک نظر پہنچانے کی استطاعت نہ ہو۔تو فرمایا اس کے بغیر کچھ بن نہیں سکتا پر آنحضرت ﷺ کو اس دل کے بعد ''**فہم وادراک عقل سلیم**''، عقل سلیم اس عقل کو کہتے ہیں جو تعصب سے پاک ہو کر سوچتی ہے۔جو کسی دلی خواہش یا کسی اور مقصد کی خاطر اپنے غور کو گندہ اور میلا نہیں کرتی بلکہ جب بھی غور کرے گی ہر رجحان، ہر میلان، ہر تعصب سے بلند ہو کر کرے گی اسے عقل سلیم کہا جاتا ہے۔فرمایا عقل سلیم عطا فرمائی گئی آپ کو اور ''**جمیع اخلاق فاضلہ جبلّی وفطرتی**'' وہ تمام اخلاق فاضلہ جو آپ کی بناوٹ سے تعلق رکھتے تھے یا اس پاک فطرت سے تعلق رکھتے ہیں جو ہر ایک کو دی جاتی ہے ان اخلاق فاضلہ کو اور اس عقل کو اس دل کے بعد ایک لطیف تیل سے تشبیہہ دی۔پس یہ عقل ہے جو دل میں وہ دیا روشن کرتی ہے جس دیئے کے روشن ہونے سے خدا کا نور پھیلتا ہے اور خدا کے نور کا شعلہ دل میں

جگمگانے لگتا ہے۔تو دل اگر برتن ہے تو اس کا پاک اور صاف ہونا ضروری ہے۔اس برتن میں چمکے گا کیا۔وہ تیل جلے گا جو انسان کی صفات حسنہ کا خلاصہ ہے۔اس میں اس کے تمام اخلاق فاضلہ شامل ہیں،اس کی عقل سلیم شامل ہے،اس کی فہم اور ادراک کی طاقتیں شامل ہیں۔یہ سب ہوں تو انہی کا نام خدا نے وہ تیل رکھا ہے جس کا بیان فرمودہ تمثیل میں ذکر ہے۔فرمایا؛

”۔۔۔۔یہ **نورِ عقل** ہے (پہلا نور قلب تھا)۔کیونکہ منبع و منشاء جمیع لطائفِ اندرونی کا قُوّتِ عقلیّہ ہے“

ہر چیز کا منبع قُوّتِ عقلیّہ ہے۔یہ وہ تفسیر ہے جو مذہب کو Rationality یعنی عقلی تقاضوں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیتی ہے کہ اسلام کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مذہبی عقائد ایک طرف کھڑے ہیں اور عقل دوسری طرف کھڑی ہے۔مذہبی نور بنتا ہی عقل کی آمیزش سے ہے اور عقل کی آمیزش نہ ہو تو مذہب میں کوئی نور باقی نہیں رہتا۔مگر عقل سلیم ہونی چاہئے۔ہر میلان سے پاک اور صاف ہونی چاہئے اور دل کی آماجگاہ ایسی روشن ہونی چاہے کہ وہ عقل کو دھندلا نہ دے اور کسی بیرونی بداثر کے نتیجے میں وہ نور اس سے باہر دکھائی نہ دے۔یعنی شیشہ میلا کر دیں گے تو نور اسی حد تک دھندلایا ہوا دکھائی دے گا یا اور میلا کر دیں گے تو دکھائی دینا ہی بند کر دے گا تو یہ نور عقل ہے۔

”کیونکہ منبع و منشاء جمیع لطائف اندرونی کا قُوّتِ عقلیّہ ہے“

قُوّتِ عقلیّہ کو تیز کرو گے تو تمہارے اندر لطائف جو ہیں وہ اور زیادہ چمکتے چلے جائیں گے۔

اب آپ دیکھ لیں کہ مثلاً ایک دوست ہے وہ خالص دوست ہے،اس کا مخلص ہونا اس کے دل سے تعلق رکھتا ہے مگر آپ کے کسی کام کا ہے بھی کہ نہیں اس کا تعلق اس کی عقل سے ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بے وقوف دوست سے تو عقلمند دشمن بہتر ہے کیونکہ وہ کچھ مارے گا تو عقل سے مارے گا۔بے وقوف دوست تو اپنی طرف سے بھلائی کر رہا ہوگا وہاں پھینکے گا جہاں سے تمہارے لئے نجات کی کوئی راہ نہیں ملے گی۔تو حقیقت یہ ہے کہ عقل نیت سے تعلق نہیں رکھتی،نیت دل سے تعلق رکھتی ہے اور دوستی اور دشمنی کا تعلق دل سے ہے وہ اس کی آماجگاہ ہے۔عقل نہ ہو تو یہ دوستی کسی کام کی نہیں۔عقل نہ ہو تو انسان دشمنی بھی نہیں کر سکتا۔دشمنی بھی بھونڈے طریق پہ کرے گا اور بعض دفعہ وہ دشمنی اپنے اوپر الٹ پڑے گی۔تو جمیع لطائف جس کا انسان کی ذات سے تعلق ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ

والسلام فرماتے ہیں وہ عقل کے چشمے سے پھوٹتے ہیں۔ پس اپنی عقلوں کو صیقل کرو ورنہ تمھیں کچھ سمجھ نہیں آئے گی کہ نور ہے کیا؟ کیا پاؤ گے، کیسے سمجھو گے، جب تک عقل سلیم اور وہ ایک چمکتی ہوئی عقل جس کو ایک تیل سے تشبیہہ دی گئی ہے جب تک وہ تمہیں میسر نہیں آئے گی۔

پھر فرماتے ہیں۔

''پھر ان تمام نوروں پر ایک نور آسمانی جو وحی ہے۔ نازل ہونا بیان فرمایا۔ یہ **نورِ وحی** ہے۔''

یہ مکمل تصویر بنتی ہے۔ دل ہو تو ایسا ہو، عقل ہو تو ایسی ہو پھر اس پر وہ آسمان سے وحی کا نور اترے، پھر وہ شخص ہے جو دعوت الی اللہ کا مستحق بنتا ہے۔ تو نورِ وحی نے اذن کا کام کیا ہے۔ نورِ وحی کے بغیر اذن ہے ہی نہیں۔ نورِ وحی کے بغیر کسی کو اس کے پیچھے چلنے کی ہدایت بھی موجود نہیں ہے۔ فرمایا: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر:30)۔

میں آدم کو ٹھیک ٹھاک کر لوں گا یعنی اس کو عقل بخش دوں، اس کا توازن پیدا کر دوں، اس کی صفات حسنہ کو متوازن بنا دوں پھر بھی تم نے اس کی پیروی نہیں کرنی۔ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ جب میرا اذن اس پر اترے، شعلۂ امر نازل ہو تب وہ اس لائق ہوگا کہ تم نے اس کی پیروی کرنی ہے، تب وہ داعی الی اللہ کے مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر سب دنیا کو اس نور کی طرف بلاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

''۔۔۔یہی حقّانی اصول ہے جو وحی کے بارے میں قُدّوسِ قدیم کی طرف سے قانون قدیم ہے اور اس کی ذات پاک کے مناسب۔ پس اس تمام تحقیقات سے ثابت ہے کہ جب تک نورِ قلب و نورِ عقل کسی انسان میں کامل درجے پر نہ پائے جائیں تب تک وہ نورِ وحی ہرگز نہیں پاتا''

جب تک یہ دونوں نور کامل نہ ہوں یعنی اس کے اندر ظرف کے مطابق، کامل سے مراد ہر شخص کا اپنا ظرف ہے اس کو بھی دیکھنا ہوگا۔ تو مراد یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو ایک ہی جیسا نورِ وحی عطا ہوتا ہے۔ فرمایا اس کی ذات میں جو کچھ بھی صلاحیتیں ہیں جب وہ درجہ کمال کو پہنچ جائیں تب ان پر یہ شرط ہے کہ ان کے درجہ کمال پر پہنچنے کے بعد نور وحی نازل ہوگا ورنہ ہرگز نہیں۔ ایسا نور اس کو عطا نہیں ہوتا جو

ان صفات کو کمال تک نہ پہنچائے۔

”اور پہلے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کمالِ عقل اور کمالِ نورانیّتِ قلب صرف بعض افرادِ بشریہّ میں ہوتا ہے کُل میں نہیں ہوتا۔اب ان دونوں ثبوتوں کے ملانے سے یہ امر بپایہءِ ثبوت پہنچ گیا کہ وحی اور رسالت فقط بعض افراد کاملہ کو ملتی ہے نہ ہر یک فردِ بشر کو“

(براہین احمدیہ حصہ سوم، روحانی خزائن جلد نمبر 1، صفحات 191 تا 198)

پس وحی اور رسالت کے مرتبے پر کھڑا کرنا کہ میرے اذن کے ساتھ آگے پیغام پہنچاؤ یہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا صرف انبیاءؑ کاملہ کو نصیب ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم پھر دعوت الی اللہ کیسے کریں۔ نہ ہماری عقل صیقل ہو، نہ درجہ کمال تک پہنچے۔ نہ دل اتنا صاف اور پاک ہو کہ ہر دوسرے میلان سے بچا ہوا ہو اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اور کسی کو یہ وحی کا درجہ نصیب ہی نہیں ہوتا۔ تو ان اندھیروں میں ہم کس کی طرف بلائیں گے۔ جو بے نور جھولیوں میں اندھیرے لئے پھرتے ہوں ان کو حق کیا ہے؟ ان کو تو اذن بھی نہیں ملا ، پھر یہ وہ الجھن ہے جسے میں دور کرنے کی خاطر اب اس اقتباس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک اقتباس پڑھ کے سناتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

”پس گناہوں سے بچنے کے لئے اس نور کی تلاش میں لگنا چاہئے جو یقین کی کرّار فوجوں کے ساتھ آسمان سے نازل ہوتا اور ہمت بخشتا اور قوت بخشتا اور تمام شبہات کی غلاظتوں کو دھودیتا“

فرمایا تم سراج منیر تو نہیں بن سکتے مگر سراج منیر کا فیض تو پا سکتے ہو اور جب تک وہ فیض نہیں پاؤ گے تمہارے اندر یقین پیدا ہو ہی نہیں سکتا اور غلاظتیں صاف نہیں ہوسکتیں۔ سب سے اچھا ذریعہ Disinfect کرنے کا سورج کی روشنی کے سامنے ڈال دینا ہے۔ جیسے اعلیٰ پائے پر سورج کی روشنی Disinfect کرتی ہے یعنی جراثیم کی آلودگیوں سے پاک کرتی ہے ویسی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اب دیکھ لیں کب سے کائنات وجود میں آئی ہے کب سے دنیا اپنی ان کیمیاوی ترقیات کے بعد اور حیات کی نشو ونما کے بعد غلاظتوں میں ملوث ہوتی چلی جاتی ہے کیونکہ جہاں ایک طرف کسی غذا کا فیض پانا

ہو وہاں دوسری طرف اس غذا کی گندگی اور بدبودار صورت کا جسم سے نکالنا بھی ایک لازمی امر ہے۔ بیکٹیریا بھی کھاتے ہیں اور بیکٹیریا بھی اپنے فضلوں کو باہر پھینکتے ہیں۔ تو اگر یہ سلسلہ جاری ہے کروڑ ہا سال سے تو یہ ساری دنیا غلاظتوں سے بھی بھر جاتی یہاں تک کہ بیکٹیریا کے لئے بھی سانس لینے کی جگہ باقی نہ بچتی۔ وہ کونسی طاقت ہے جو اس سارے نظام کو از سر نو صحت بخشتی ہے ہر غلاظت کو دور کرتی ہے اور اس کی جگہ پاکیزگی پیدا کرتی ہے۔ یہ نظام شمسی ہے۔ سورج روز آتا ہے اور ساری رات کے گند دھو کر پھر دوسرے دن چلا جاتا ہے اور پھر دوبارہ آتا ہے اور پھر وہ اس کی صفائی کرتا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ سورج کی صفائی کا نظام کتنا وسیع ہے۔ کیسی کیسی شعاعیں اس میں موجود ہیں وہ کس کس چیز پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اگر سورج نہ نکلتا تو ساری دنیا گندگی سے بھر جاتی۔ پس آنحضرت ﷺ کو سراج منیر جو فرمایا گیا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ تم پر لازم ہے کہ شبہات کی غلاظتوں کو دھوؤ اور وہ تبھی ممکن ہے کہ روشنی کے سامنے نکلو اس سراج منیر سے فیض پاؤ جسے خدا نے تمہیں پاک صاف کرنے کے لئے بنایا ہے وہ کیا کرتا ہے۔

> ”آسمان سے نازل ہوتا ہے اور ہمت بخشتا ہے اور قوت بخشتا ہے اور تمام شبہات کی غلاظتوں کو دھو دیتا ہے اور دل کو صاف کرتا اور خدا کی ہمسائیگی میں انسان کا گھر بنا دیتا ہے۔ پس افسوس ان لوگوں پر کہ بچوں کی طرح گرد و غبار میں کھیلتے اور کوئلوں پر لیٹتے ہیں اور پھر آرزو کرتے ہیں کہ ہمارے کپڑے سفید رہیں اور حقیقی نور کو تلاش نہیں کرتے اور پھر چاہتے ہیں کہ ظلمت سے نجات پاویں۔“

پس ہمیں کیا کرنا ہے ہمیں دنیا کو ظلمت سے نجات بخشنے سے پہلے اس الٰہی نور سے تعلق باندھنا ہے جس کو سراج منیر فرمایا گیا اور وہ اذن الٰہی سے چمکا ہے۔ اس سے اذن پائیں گے تو ہم بھی اذن کے مقام پر کھڑے ہوں گے۔ اگر اس سے اذن نہیں پائیں گے تو ہم بھی اذن کے مقام پر کھڑے نہیں ہوں گے۔ اذن کا مقام دوطرفہ مقام ہے۔ ایک طرف سے انسان اذن پاتا ہے اور دوسری طرف اذن جاری کرتا ہے اور آدم کو جو سجدے کی تعلیم دی گئی وہ یہی مضمون ہے جو بیان ہوا ہے کہ جب ہم نے اسے اذن دیا تو اسے صاحب اذن بھی بنا دیا اور پھر تمھیں مجبور کیا گیا کہ اس کو سجدہ کرو، اس کی اطاعت کرو اور یہ سجدہ بعض دفعہ طوعی ہوتا ہے، بعض دفعہ جبری ہوتا ہے طوعاً و کرھاً

جیسا کہ فرمایا ہے۔

اور یہ امر واقعہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے نور سے باشعور طور پر، آنکھیں کھول کر تعلق باندھتے ہیں اور اپنے اندر اس کی گرمی محسوس کرتے ہیں ان کی باتوں میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ سنتے ہیں اور مانتے ہیں اور بعض دفعہ بڑے بڑے سرکش بھی اپنی گردنیں ان کی آواز کے سامنے جھکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہی دلائل جب کوئی دوسرا شخص دیتا ہے تو ان کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتے پس یہ نور کی صفت ہے اور اس نور کی صفت ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اذن کے مقام پر فائز فرمایا ہے اور وہ سب سے اعلیٰ درجے کا نور حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کا نور ہے جو سراجاً منیراً بن کے چمکا۔ پس آج اگر کسی احمدی نے دعوت الی اللہ کا حق ادا کرنا ہے تو اس نور سے فیضیاب ہوئے بغیر وہ ہرگز اس حق کو ادا نہیں کر سکتا۔ وہ نور ہے جو اپنے دلوں میں سمانا پڑے گا۔ اس کی کچھ روشنی اپنے اخلاق میں ڈال کر اپنے اخلاق کو جگمگانا پڑے گا۔ جتنی جتنی روشنی تم پاؤ گے اتنا ہی تم صاحب نور ہوتے چلے جاؤ گے اتنا ہی تم خدا کی طرف بلانے کے حق دار بنتے چلے جاؤ گے ورنہ تمہیں یہ حق نصیب نہیں ہوگا۔

فرماتے ہیں

''حقیقی نور کیا ہے؟ وہ جو تسلی بخش نشانوں کے رنگ میں آسمان سے اترتا اور دلوں کو سکینت اور اطمینان بخشتا ہے''۔

پس ایک طرف فرمایا کہ وحی صرف ان کے لئے ہے جن کو انبیاءؑ کا مقام عطا کیا گیا ہے، زمرہ انبیاءؑ کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف تعلق باللہ کی نفی نہیں فرمائی گئی، الہام کی نفی نہیں فرمائی گئی، اس وحی کی نفی نہیں فرمائی گئی جو وحی نبوت سے علاوہ ہے۔ پس بالکل یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ باقی سب بالکل کورے اور بے فیض ہی رہیں گے۔ نور سے آپ کا تعلق باندھنا ضروری ہے کیونکہ وحی مقام نور پر اترتی ہے خواہ وہ غیر نبی کی وحی بھی ہو وہ بھی مقام نور چاہتی ہے۔ پس محمد رسول اللہ ﷺ کے نور سے فیضیاب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہی آخری مقام ہے، آخری مقام کی طرف یہ تعلق لے کر جائے گا۔ آنحضرت ﷺ سے تعلق آپ کو اس مرتبے تک پہنچا دیتا ہے جہاں خدا کی توجہات اترتی ہیں جہاں خدا کا پیار نازل ہوتا ہے اور یہ توجہات اور یہ پیار انبیاءؑ کے لئے خاص نہیں بلکہ ہر انسان کو عطا ہوتی ہیں۔

''جو تسلی بخش نشانوں کے رنگ میں آسمان سے اترتا اور دلوں کو سکینت

اور اطمینان بخشتا ہے۔اس نور کی ہر ایک نجات کے خواہش مند کو ضرورت ہے۔‘‘

فرمایا کوئی بھی نجات کا خواہش مند ایسا نہیں جو اس نور کے بغیر گزارہ کر سکے اور یہ نور ہر ایک کو عطا ہو سکتا ہے مگر اس دور میں وساطت حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے بغیر نہیں عطا ہو سکتا۔

’’کیونکہ جس کو شبہات سے نجات نہیں اس کو عذاب سے بھی نجات نہیں۔جو شخص اس دنیا میں خدا کے دیکھنے سے بے نصیب ہے وہ قیامت میں بھی تاریکی میں گرے گا۔خدا کا قول ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى‘‘(بنی اسرائیل:73)۔

یعنی اس کا مطلب ہے جو کوئی بھی اس دنیا کی زندگی میں اندھا ہوگا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔

’’اور خدا نے اپنی کتاب میں بہت جگہ اشارہ فرمایا ہے کہ میں اپنے ڈھونڈنے والوں کے دل نشانوں سے منور کروں گا۔‘‘

پس وحی اگر انبیاءؑ کے لئے مخصوص ہے تو وحی ءِ رسالت ہے جس کی بات حضرت مسیح موعودؑ فرما رہے ہیں۔دوسری وحی کی بہت سی اقسام ہیں جو نہ صرف یہ کہ ہم سب کو نصیب ہو سکتی ہیں بلکہ ہوتی ہیں اور اپنے ساتھ نشانات لے کر آتی ہیں اور ان کے بغیر ہمیں نور کو آگے پہنچانے کا حق ہی نہیں ملتا اذن ہی نصیب نہیں ہوتا۔تو بغیر اذن کے تبلیغ کرو گے تو اندھیروں سے اندھیروں کی طرف ہی بلاؤ گے کوئی بھی اس کا فائدہ نہیں ہے اور تمہاری تبلیغ میں برکت بھی کوئی نہیں ہوگی۔جو لوگ پیدا ہوں گے وہ ویسے ہی اندھیرے ہوں گے جیسے پہلے تھے۔پس وہ لوگ جو تعداد کی خاطر تبلیغ کرتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ انہوں نے دنیا کو کوئی بھی فیض نہیں پہنچایا۔جیسے سیاہ بخت پہلے تھے وہ لوگ ویسے ہی سیاہ بخت بعد میں رہے،نام بدل گئے۔کسی کو آپ نے غیر احمدی مسلمان سے احمدی مسلمان کہہ دیا کسی کو عیسائی سے مسلمان بنا دیا،کسی کو بت پرست سے اسلام کے دائرے میں لے آئے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کے نتیجے میں ان کو کوئی ایسی روشنی نصیب ہوئی ہے جو پہلے نہیں تھی۔اگر ہوئی ہے اور وہ وہ روشنی ہے جو آپ نے فیضان محمد ﷺ سے پائی تھی ﷺ تو پھر ان کو زندہ کرنے کے سامان پیدا کر دیئے۔پھر وہ نور جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس میں پھر

طاقت ہے کہ آگے نشو ونما پائے مگر اس کا پہلا بیج بویا جانا لازم ہے اس کے بغیر از خود کوئی شخص اندھیروں سے روشنی کی طرف سفر نہیں کرسکتا۔ پھر فرماتے ہیں۔

''یہاں تک کہ وہ خدا کو دیکھیں گے''

یعنی فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''اور خدا نے اپنی کتاب میں بہت جگہ اشارہ فرمایا ہے کہ میں اپنے ڈھونڈنے والوں کے دل نشانوں سے منور کروں گا۔''

یہاں انبیاءؑ کی کوئی شرط نہیں ہے۔

''یہاں تک کہ وہ خدا کو دیکھیں گے اور میں اپنی عظمت انہیں دکھلا دوں گا یہاں تک کہ سب عظمتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جائیں گی''

یہ بھی ایک بہت اہم نکتہ ہے جس کا دعوت الی اللہ سے تعلق ہے وہ یہ ہے جن کی نظر میں خدا کے سوا اور عظمتیں ہیں ان کو وہ جرات اور وہ سر بلندی نصیب ہی نہیں ہوتی جو خدا کی طرف سے نمائندہ بن کر کلام کرنے والے کو ہوتی ہے۔

کئی بار میں حضرت چوہدری فتح محمد صاحب سیال رضی اللہ تعالیٰ کی مثال دے چکا ہوں جن کا اسی مسجد فضل سے تعلق تھا جن کی ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں یہ جگہ خریدی گئی ہے۔ حضرت مصلح موعودؓ یہ جاننے کے باوجود کہ آپ کو اپنے کپڑوں کی ہوش نہیں، جوتوں کی ہوش نہیں اور اپنی چیزیں جگہ جگہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں جب گورنر وغیرہ یا بڑی بڑی دنیاوی شخصیتوں کو کوئی پیغام دینا ہوتا تو چوہدری فتح محمد صاحب کو ہی بھجوایا کرتے تھے بلکہ بسا اوقات آپ کو بھجوایا ایک معین پیغام دے کر۔ اب کسی نے یہ دیکھا کہ چوہدری صاحب تو بالکل سادہ سے آدمی ہیں بعض دفعہ جاتے ہیں تو اپنے بچے کی چھوٹی شلوار پہن کر باہر نکل جاتے ہیں جو گھٹنے تک رہتی ہے صرف اور کوئی ہوش نہیں کہ میں نے کیا پہنا ہوا ہے یہ جب گورنر سے ملتے ہوں گے جا کے، تو پتا نہیں ان کے دل کا کیا حال ہوتا ہو گا، کس طرح یہ کانپتے ہوں گے اس کے سامنے، تو اس نے سوال کیا کہ آپ جاتے ہیں تو آپ کو کیا لگتا ہے بتائیں تو سہی۔ تو انہوں نے کہا لگتا کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے سامنے پنجابی میں کہا ''کوئی چڑی دا بوٹ پیا ہوئے'' کہتے ہیں میں خدا کا نمائندہ، وہ دنیا کا نمائندہ مجھے کیا لگنا ہے اس کے سوا جیسے

سامنے چڑی کا بوٹ یعنی وہ بچہ جو ابھی انڈے سے نکلا ہے جس کے پَر و بال نہیں نکلے، مرغی کا بچہ نہیں فرمایا جو بڑا خوبصورت دکھائی دیتا ہے کیونکہ جتنا بے چارہ بے اختیار بچہ چڑی کا بوٹ ہے ویسا کوئی بچہ بے اختیار نہیں ہوتا۔ نہ بال، نہ شکل نہ صورت، وہ کچے گوشت کی بوٹ سی پڑی ہوتی ہے نہ کھا سکتا ہے نہ مدد کے بغیر ایک دن بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ گرمی بھی ماں سے پاتا ہے تو گرمی ملتی ہے ورنہ اس کی ذات میں کوئی گرمی بھی نہیں ہوتی حقیقت میں۔ فرمایا مجھے تو لگتا ہے کہ میرے سامنے چڑی کا بوٹ بیٹھا ہوا ہے تو یہ ہے وہ نور کی عظمت جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں خدا کہتا ہے کہ میں اپنی عظمت انہیں دکھلا دوں گا یہاں تک کہ سب عظمتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جائیں گی۔

یہ مرتبہ اور مقام ہے داعی الی اللہ کا کہ ہر دوسری عظمت ہیچ ہو چکی ہو اور جو عظمت اس طرح جلوہ گر ہو کہ اس کے سامنے ہر عظمت ہیچ ہو جائے اس کی طرف بلانے کا آپ کو حق بھی ہے اور آپ کو طاقت بھی ہے اور آپ کی آواز میں دیکھیں کیسی شوکت پیدا ہو جائے گی۔

”یہی باتیں ہیں جو میں نے براہ راست خدا کے مکالمات سے بھی سنیں“

یعنی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما رہے ہیں۔

”پس میری روح بول اٹھی کہ خدا تک پہنچنے کی یہی راہ ہے اور گناہ پر غالب آنے کا یہی طریق ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم حقیقت پر قدم ماریں فرضی تجویزیں اور خیالی منصوبے ہمیں کام نہیں دے سکتے۔ ہم اس بات کے گواہ ہیں اور تمام دنیا کے سامنے اس شہادت کو ادا کرتے ہیں کہ ہم نے اس حقیقت کو جو خدا تک پہنچاتی ہے قرآن سے پایا ہے۔ ہم نے اس خدا کی آواز سنی اور اس کے پُر زور بازو کے نشان دیکھے جس نے قرآن کو بھیجا۔ سو ہم یقین لائے کہ وہی سچا خدا اور تمام جہانوں کا مالک ہے اور ہمارا دل اس یقین سے ایسا پُر ہے جیسا کہ سمندر کی زمین پانی سے۔ سو ہم بصیرت کی راہ سے اس دین اور اس روشنی کی طرف ہر ایک کو بلاتے ہیں“

یہ ہے بصیرت کی راہ جو داعی الی اللہ کے لئے ضروری ہے، فرماتے ہیں۔

”ہم نے اس نور حقیقی کو پایا جس کے ساتھ سب ظلماتی پردے اٹھ جاتے

ہیں اور غیر اللہ سے درحقیقت دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔یہی ایک راہ ہے جس سے انسان نفسانی جذبات اور ظلمات سے ایسا باہر آجاتا ہے جیسا کہ سانپ اپنی کینچلی سے“

(کتاب البریّۃ مع آیات ربّ البریّہ، روحانی خزائن جلد 13 صفحہ 65،64)

یعنی اپنی کینچلی کو جب سانپ چھوڑتا ہے تو پھر کبھی اس کی طرف نہیں لوٹتا۔ بظاہر سانپ کی مثال تو بڑی بھیانک سی مثال ہے لیکن زندگی کی مثالوں میں اس سے بہتر مثال نہیں دی جاسکتی کہ کوئی ایسی حالت سے اس طرح باہر آجائے کہ دوبارہ پھر کبھی اس طرف لوٹنے کا خیال بھی نہ کرے بے کار وجود کے طور پر پہلے وجود کو ختم کر دے۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس نور کی طرف بلاتے ہوئے اس کی کامل مثال آنحضرت ﷺ کی صورت میں پیش فرماتے ہیں ؛

”وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسانِ کامل کو۔ وہ ملائک میں نہیں تھا۔ نجوم میں نہیں تھا۔“

اب یہ جو اقتباس ہے یہ ہمارے جلسوں میں بسا اوقات اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ بہت پر شوکت کلام ہے اور فصاحت و بلاغت کے آسمان پر ایسا بلند اور ارفع چمک رہا ہے کہ حیرت کے ساتھ نظریں اٹھتی ہیں کہ کسی قلم میں یہ طاقت ہو کہ ایسا عظیم بیان کر سکے لیکن اسی ظاہری چمک میں ہی لوگوں کی آنکھیں الجھی رہتی ہیں آواز کی شوکت اور اس کے حسن میں ہی کان لگے رہتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ یہ وہ مضامین ہیں جن میں ڈوبے بغیر آپ کو ان مضامین سے کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ محض یہ دعویٰ کر دینا کہ فلاں میں تھا فلاں میں نہیں تھا۔ ایسے دعوے تو سب مذہب والے کرتے ہی رہتے ہیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کے کلام میں ادنیٰ درجہ بھی مبالغے کا وجود نہیں۔ جب آپؑ فرماتے ہیں تو سچ فرماتے ہیں اور حقیقت پر نظر رکھ کے جیسے سامنے دیوار پر لکھا ہوا دیکھ رہے ہوں اور اسے پڑھ رہے ہوں اس طرح آپ کے سامنے عرفان کے مضمون بیان فرماتے ہیں۔

”وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسانِ کامل کو۔ وہ ملائک میں نہیں تھا۔ نجوم میں نہیں تھا۔۔۔“

اب ملائک میں کون سا نور ہے جو نہیں تھا۔ وہ نور سے پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی اس مضمون کو کھولا اور آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا

ہے جب کہ شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے تو کیا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تک اس حدیث کی رسائی نہیں تھی۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ آپؑ سمجھتے تھے کہ ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ عبارت سو فیصدی درست ہے اس میں ادنیٰ بھی شبہ کی گنجائش نہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا وہ ملائک کو نہیں ملا اور وہ اعلیٰ درجہ کا نور اعلیٰ تھا۔ اس کا ثبوت خود حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے معراج نے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ ملائک میں سے اعلیٰ فرشتہ، سب سے اعلیٰ وجود روح القدس ہے اس سے اونچا فرشتوں کا وجود متصور نہیں ہوسکتا اور معراج کی شب جو عجیب روحانی کشف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو دکھایا گیا ایک ایسے مقام پر آپؐ پہنچے جہاں جبرائیلؑ کے پروں نے جواب دے دیا یعنی اس کی اڑان کی طاقتیں ختم ہو گئیں۔ اس نے کہا اس سے آگے میں نہیں جا سکتا، تیرا مقام ہے تو آگے چل۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر گز کسی بھی زبان کی خوبصورتی کی خاطر کلام نہیں فرماتے۔ یہ دل کی قوت سے جو نور صداقت پھوٹتا ہے وہ ہے جو کلام میں حسن پیدا کر رہا ہے۔ ادنیٰ بھی اس میں جھوٹ اور مبالغے کا شائبہ نہیں۔

''یعنی انسانِ کامل کو۔ وہ ملائک میں نہیں تھا۔ نجوم میں نہیں تھا''

اب نجوم کے اندر نور تو ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام خود بھی لکھ چکے ہیں کہ ہر چیز کا آغاز ہی نور سے ہوا ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ نجوم میں نور نہ ہو۔ مگر اس نور میں وہ زندگی نہیں وہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کی صلاحیتیں موجود نہیں ہیں جو انسان کو اس کے درجہ کمال تک پہنچانے کی خاطر عطا کیا جاتا ہے۔

''قمر میں نہیں تھا۔ آفتاب میں بھی نہیں تھا''

یعنی یہ نور جو ہیں قمر اور آفتاب کے یہ دنیاوی زندگی تو پیدا کر سکتے ہیں مگر دنیاوی زندگی پیدا کرنے کا جو مقصد ہے وہاں تک نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ مقصد وہی اعلیٰ مضمون ہے، بالا مضمون ہے۔ یہ زندگی بے کار ہے اگر بالآخر خدا سے نہ جا ملے۔ تو اس کے لئے دنیا کا سورج نہیں سِرَاجًا مُّنِيْرًا چاہئے، اس کا نور اس سے اعلیٰ اور ارفع نور ہے۔ فرماتے ہیں یہ ظاہری باتوں میں بھی جو نور ہے وہ بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے نور کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور جو چھپے ہوئے نور ہیں خزانوں کی

صورت میں ان کی بھی کوئی حیثیت محمد رسول اللہ ﷺ کے نور کے مقابل پر نہیں ۔فرماتے ہیں:

"قمر میں نہیں تھا۔آفتاب میں بھی نہیں تھا۔وہ زمین کے سمندروں اور دریاؤں میں بھی نہیں تھا۔وہ لعل اور یاقوت اور زمرّد اور الماس اور موتی میں بھی نہیں تھا۔غرض وہ کسی چیز ارضی وسماوی میں نہیں تھا۔صرف انسان میں تھا یعنی انسان کامل میں"

اب انسان سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ نہیں ہیں، یاد رکھیں ۔وہ تمام کامل وجود جن کے متعلق فرمایا وہ نور سے مرصع ہوتے ہیں ان پر وحی اترتی ہے یعنی منجملہ انبیاءؑ سب کو آپ کامل بیان فرما رہے ہیں۔

"یعنی انسان کامل میں۔جس کا اتم اور اکمل اور اعلیٰ وارفع فرد ہمارے سید"

یعنی تمام کاملین میں سے سب سے اکمل ۔تمام انبیاءؑ بلند ہیں مگر بلند تر ان سے ۔سب سے بڑی شان والے ہیں مگر اس شان کا حامل جیسے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں ان میں اور کوئی نہیں تھا۔

"اعلیٰ اور ارفع فرد ہمارے **سید و مولا سید الانبیاءؑ سید الاحیاء محمد مصطفیٰ** ﷺ ہیں۔سو وہ نور اس انسان کو دیا گیا اور حسب مراتب اس کے تمام ہم رنگوں کو بھی"

پس وہ جو درجہ کمال والے تھے وہ حسب مراتب ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ہم رنگ قرار پائے ہیں۔

"یعنی ان لوگوں کو بھی جو کسی قدر وہی رنگ رکھتے ہیں"

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 160، 161)

یہاں اُمتِ محمدیہؐ کے لئے بھی ایک خوشخبری ہے۔اس کا ایک اشارہ سابقہ انبیاءؑ کی طرف بھی ہے اور ایک اشارہ آنے والے امت کے افراد کی طرف بھی ہے جو کسی قدر وہی رنگ رکھتے ہوں یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے نور سے آپ منور ہونے شروع ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر بھی نور ضرور اترے گا اور آپ بھی اس مقام پر کھڑے ہوں گے کہ ایک طرف سے اذن الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکا رہے ہوں گے اور دوسری طرف اذن الٰہی تمام دنیا کی گردنیں آپ

کے سامنے جھکا دے گا اور آپ کی آواز میں وہ قوت اور شوکت اور عظمت پیدا ہوگی جس کی دنیا کو انکار کی مجال نہیں رہے گی۔

خدا کرے کہ یہ دعوت الی اللہ کا نور ہماری آوازوں کو روشن کر دے اور ہم تمام دنیا کو محمد رسول اللہ ﷺ کے نور سے بھر دیں۔ اس مقصد کے ساتھ آپ اپنے بقیہ سال کے مہینوں میں محنت کریں۔ اگر پہلے کوئی اندھیرے تھے، کوئی اور نیتیں تھیں، کچھ اور نفس کی بڑائی کی تمنائیں تھیں تو ان سب کی گردنوں پر چھری پھیر دیں اور پاک اور صاف دل کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھیں۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

روشنی سمجھتے ہوئے جو اندھیروں کا سفر ہے وہ سب سے خطرناک ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 8 / مارچ 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات تلاوت کیں:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (النور: 40، 41)

پھر فرمایا:

سورۃ النور آیت چالیس اور اکتالیس کی میں نے تلاوت کی ہے۔اس سے پہلے قرآن کریم اور احادیث نبی ﷺ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کے اقتباسات پیش کر کے نور کے مضمون پر میں نے چند خطبات دیئے تھے۔اب نور کا برعکس ظلمت ہے اور ظلمتیں بھی کئی قسم کی ہیں اور پھر ظالم جسے گناہ گار کہا جاتا ہے یا حد سے بڑھا ہوا گناہ گار ظالم کہلاتا ہے اس کا بھی ظلمت سے تعلق ہے۔تو نور تو آتے آتے آئے گا مگر جب ظلمت جاتے جاتے جائے گی اور دونوں بیک وقت اکٹھے نہیں ہو سکتے۔اس لئے اس مضمون کو نسبتاً آسان کرنے کے لئے کہ نور کی محبت پیدا ہوئی، اس کے لئے دل میں ایک تڑپ اٹھی کہ ہم بھی صاحبِ نور ہو جائیں۔یہ تو ہر سننے والے کے دل میں طبعاً یہ

جذبات اٹھتے ہیں اور اکثر خطوں سے پتا بھی چلتا ہے کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں مگر جو مشکل کام ہے وہ منفی حصے کی صفائی ہے۔

جب تک پہلے دل کی جڑی بوٹیاں اور وہ گند نہ دور کئے جائیں جو ظلمات کی پیداوار ہیں اس وقت تک فی الحقیقت نور سے محبت ہونے کے باوجود بھی نور وہاں اپنی جگہ نہیں بناتا۔ عام زمیندارہ تجربے میں یہ ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ بیج بو دینا اور پانی ڈالنا آسان ہے مگر کھیتوں کو جڑی بوٹیوں سے صاف کرنا اور ایسے ذرائع اختیار کرنا کہ بار بار محنت کے ذریعے جڑی بوٹیوں کے آئندہ ہونے کا بھی امکان نہ رہے اور مسلسل ان پر نگاہ رکھنا یہ بیج بو دینے کے مقابل پر بہت زیادہ مشکل کام ہے۔ اچھے اور برے زمیندار میں یہی ایک فرق ہے۔ بُرا زمیندار بھی تو بیج ڈالتا ہی ہے اور پانی بھی دیتا ہے مگر بعض دفعہ اس کی کھیتی میں سوائے جھاؤ کے اور گند کے اور کچھ بھی نہیں اگتا اور اکثر جو اس کا بیج تھا اس کی پرورش کو وہ بوٹیاں کھا جاتی ہیں جن کا اس کھیت سے تعلق کوئی نہیں یا اس کھیت پر حق نہیں بنتا تو نور اور ظلمت کی باہمی جدوجہد میں بھی ایسے ہی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

ایک طرف یہ مضمون ہے کہ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا یعنی نور آ گیا اور ظلمتیں جاتی رہیں اور دوسری طرف یہ بھی مضمون دکھائی دیتا ہے کہ ظلمتوں نے جہاں ایک دفعہ جڑیں پکڑیں وہاں پھیلتے پھیلتے نور کو اس علاقے سے نکال دیا۔ تو پہلا سوال تو یہ ہے کہ یہ تضاد کیوں ہے اور حقیقت کیا ہے۔ اگر نور میں غالب آنے کی طاقت ہے تو جب ایک دفعہ آ جائے تو پھر کیوں آخر اس نور کو ظلمتیں دھکیل کے باہر کر دیتی ہیں اور یہ جو سوال ہے یہ ایک ازل کا سوال ہے ہمیشہ سے اٹھا ہے تمام دنیا کے فلاسفرز نے اس مضمون کو کسی نہ کسی رنگ میں ضرور چھیڑا ہے کہ ظلمت اور نور کی جنگ کیا چیز ہے۔ چنانچہ حضرت زرتشتؑ کا مذہب ظلمت اور نور کی لڑائی پر ہی مبنی دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ ہر مذہب میں ظلمت اور نور کی لڑائی ہے کسی نے کسی رنگ میں اس کا ذکر کیا ہے، کسی نے کسی رنگ میں لیکن حضرت زرتشتؑ نے اس کو اس طرح دو متقابل طاقتوں کی طرح کھول کر بیان کیا کہ بعد میں آنے والوں کو یہ دھوکہ ہو گیا کہ نور کا الگ خدا ہے اور ظلمت کا الگ خدا ہے۔

پس اس پہلو سے یہ مسئلہ سمجھنے والا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ ہم ظلمت سے اگر بچنا چاہتے ہیں تو نور اختیار بھی کر لیتے ہیں پھر بھی بچ نہیں سکتے تو آخر کیا وجہ ہے۔ یہ مسئلہ حل کرنے کی خاطر میں اب یہ

ظلمتوں کا مضمون آپ کے سامنے کھولوں گا انشاء اللہ اور بتاؤں گا کہ کون کون سی احتیاطوں کی ضرورت ہے تا کہ نور آپ کے اوپر غالب رہے کبھی مغلوب نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو میں سورہ نور ہی کی ایک آیت آپ کے سامنے رکھتا ہوں کیونکہ قرآن کریم جو ایک مکمل کتاب ہے جب ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے تو دوسرے پہلو کو بھی ضرور بیان فرماتا ہے اور اسی سورت میں دونوں مضامین کھول دیتا ہے اور اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ ایک ہی سورت میں ایک مضمون کا ایک پہلو کھولا گیا ہے تو کسی اور جگہ اسی سورت میں اس مضمون کا دوسرا پہلو بھی کھولا گیا ہے اور جو اشتباہات کے احتمالات ہیں ان کو کلیۃً دور کر دیا جاتا ہے۔ پس ظلمات والی آیت بھی اسی سورۃ نور میں ہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظلمات کی قسمیں کتنی ہیں اور کیسے کیسے ظلمات ہیں جن سے تمہیں واسطہ ہوگا۔

اور سب سے پہلی بات جو حیرت انگیز ہے لیکن غور کرو تو حیرت انگیز نہیں رہتی ظلمت کی ایک قسم وہ ہے جس کا روشنی سے تعلق ہے اور پہلے اسی کا بیان ہوا ہے۔ جیسے کہ دوسری جگہ قرآن کریم بعض ظلم کی باتیں کرتا ہے مگر وہ حد سے زیادہ روشنی کے معنوں میں کرتا ہے، بے انتہا روشنی ہو تو اس کو بھی ظلم کے تابع شمار فرمایا گیا اور صاحب نور کو ظالم قرار دے دیا گیا۔ وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب: 73)۔

نور آسمانی کو کوئی اور مخلوق کوئی اور انسان اٹھا نہیں سکا، مگر دیکھ محمد مصطفی ﷺ انسان کامل آگے بڑھا اور اس نور کو اٹھا لیا۔ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا یہ تو حد سے زیادہ ظلوم والا ہے، ظلموں والا ہے یا ظالم ہے تو ظالم کے مبالغے کا صیغہ ظلوم ہے بہت زیادہ ظلم کرنے والا لیکن وہ تعریف کا کلمہ ہے۔ پس ایک ہی لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اور بالکل ایک دوسرے سے الٹ معانی بن جاتے ہیں۔ اب ''بـــــلا'' کا لفظ کوئی بہت ہی ذلیل، گھٹیا، خوفناک چیز ہو تو اس پر یہ ''بـلا'' کا تصور اطلاق پاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ بڑی ''بـلا'' ہے لیکن بعض دفعہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کی چیز ہو تو کہتے ہیں بـلا چیز ہے، آج تو بـلا کی خوشی پہنچی، آج تو بـلا کا دن چڑھا ہے کہ اتنی خوشیاں اتنی چیزیں اکٹھی ہو گئیں جو ہمیں ترو تازگی بخش رہی ہیں، ہمارے لئے طمانیت کے سامان لائیں۔ علماء کے متعلق بھی بـلا کا لفظ استعمال ہوتا ہے بـلا کا عالم ہے۔ چنانچہ میں نے ایک دفعہ مثال دی تھی کہ حضرت حافظ شاہ جہانپوری صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو

اس ملاقات میں کچھ تھوڑے سے بجھے بجھے دکھائی دے رہے تھے اور کسی سوچ میں تھے۔ وہ مسئلہ یہ نکلا بعد میں کہ مجھ سے پہلے ان سے کوئی مقامی بڑا زمیندار ملنے آیا تھا اور وہ پنجابی کا بہت ماہر، جو خاص جھنگ کی پنجابی ہے چوٹی کا زبان دان تھا اس نے کچھ دیر حضرت شاہ جہانپوری صاحب کی صحبت میں وقت گزارا اور آپ کی علمی باتیں اور ادبی چٹکلے اور عظیم الشان مضامین ان سے سنے جو ایک علم و عرفان کا بہتا ہوا سمندر تھا تو اتنا متاثر ہوا کہ جاتے ہوئے وہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ''بـــلا بدھی ہوئی اے، بـــلا بدھی ہوئی اے'' کہ اندر تو ان لوگوں نے بـــلا باندھی ہوئی ہے اور یوں جھٹکتا جاتا تھا اور حافظ صاحب اس سے مغموم تھے کہ میں نے اتنی اچھی اچھی باتیں کیں مجھے جاتے جاتے بـــلا کہہ گیا۔ میں نے کہا حافظ صاحب اس سے بڑا آپ کو Compliment دے ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو چوٹی کا کلام ہے کہ بلا بدھی ہوئی ہے۔ تو حیرت انگیز چیز ہے اس کا اپنے دائرہ علم میں جس طرح اس کو حاصل ہے اس شان کا اور کوئی آدمی نہیں تو دیکھیں لفظ ''بـــلا''، بھی کبھی کسی معنے میں، کبھی کسی معنے میں مگر دونوں جگہ انتہا کے معنوں میں ہے۔ پس ظلم پر بھی اور انتہا کی نیکیوں پر بھی بولا جاتا ہے۔

پس اس پہلو سے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں ظلمت کا ذکر فرمایا، دیکھیں کیسی عظیم کتاب ہے، حیرت انگیز پہلو ہے جو بالکل عقل پر ایک عالم حیرت ہی طاری کر دیتی ہے یعنی پہلے روشنی کی مثال سے ظلم کی بات شروع کی۔ فرمایا ایک وہ ظلم ہے جو روشنی کے سفر کرنے والوں کے مقدر میں ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کئے ان کے اعمال تو ایسی سراب کی طرح ہیں بِقِيْعَةٍ جو ایک ایسے چٹیل میدان میں ہو جہاں دور دور تک پانی دکھائی نہ دے۔ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً پیاسا اس سراب کو پانی سمجھتا ہے جو روشنی کی تیزی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو سراب کا بھی کوئی وجود نہیں۔ مگر روشنی ہی کا ایک دھوکہ بھی ہے۔ دیکھنے میں وہ روشنی ایک پانی کا، ایک زندگی بخش پیغام لے کر آتی ہے مگر حقیقت میں موت کی طرف بلا رہی ہوتی ہے۔

انہی معنوں میں قرآن کریم فرماتا ہے: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۖ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام: 109) کہ اس طرح ہم نے ہر اُمت کو اس کے لئے ان کے اعمال خوبصورت کر کے دکھا دیئے ہیں۔ کچھ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ

الدُّنۡيَا (الکہف:29) میں محو ہیں اور اسی کے عاشق ہو کر اسی میں کھوئے گئے ہیں کچھ اخروی زینت جسے تقویٰ کی زینت کہا گیا ہے اس کے دلدادہ ہیں اور اسی کی جانب سفر رہتا ہے۔مگر زینتیں دونوں ہی زینتیں ہیں مگر کتنا فرق ہے۔ایک جگہ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فرمایا دوسری جگہ تقویٰ کو زینت قرار دیا گیا اور فرمایا اسی زینت کو ہر جگہ لئے پھرو، جہاں سجدہ کرو یہ زینت تمہارے ساتھ ہو۔پس انہی معنوں میں اللہ تعالیٰ نے پہلے روشنی سے متنبہ فرمایا ہے جو دنیا کی چمک اور اپنی نفس کی تمناؤں کے نتیجے میں تمہیں غلط پیغام پہنچاتی ہے اور اندھا پن جو روشنی کا اندھا پن ہو بہت ہی خطرناک ہے ایسے آدمی کو ہر طرف روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے اور وہ کوشش ہی نہیں کرتا کہ اس مصیبت اس اندھیرے سے نکل سکے۔

پس وہ لوگ جو اندھیروں میں لپٹے ہوئے ہیں ان کا بھی بہت بدتر حال ہے لیکن کم سے کم کوشش تو کرتے ہیں جن کو شعور پیدا ہو جائے جیسا کہ اگلی مثال میں اللہ فرماتا ہے وہ اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر بے بسی کا عالم ہے۔یہ اندھیرا جو ہے یہ ایسا ظالمانہ اندھیرا ہے روشنی کا اندھیرا کہ اس میں انسان سمجھتا ہے میں تو دیکھ رہا ہوں مجھے کوئی کیوں رستہ دکھا رہا ہے مجھے تو سب پتا ہے۔ایسے آدمی کو آپ حق کا پیغام دیں، نصیحت کریں، جو چاہیں آپ زور آزمالیں وہ آپ کو یہ کہے گا کہ تم کو کیا ہو گیا ہے پاگل ہو گئے ہو، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مجھے ضرورت ہی کوئی نہیں۔فرمایا ایسا آدمی جو ہے وہ پھر بے روک ٹوک اپنے بدانجام کی طرف بڑھتا ہے۔اس کے رستے میں کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے اور اسے ہدایت دے سکے اور جب وہ آخری انجام کو پہنچتا ہے اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں جس زندگی کے پیچھے دوڑتا رہا ہوں وہ دراصل موت کی پیاس تھی اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔وہ آگ تھی جو ہر سراب ایک حد سے بڑھے ہوئے پیاسے کے لئے تحفۃً پیش کرتا ہے جس کے بعد پانی کی ایک بوند کو ترستے ہوئے مرنا مقدر ہے، اس کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

فرمایا: اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۭ بِقِيۡعَةٍ ایسے لوگوں کے اعمال تو ایسے سراب کی طرح ہیں جو دور سے پانی دکھائی دیتا ہے بِقِيۡعَةٍ ایک چٹیل میدان میں واقع ہے۔يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً اسے پیاسا جو ہے وہ پانی سمجھتا ہے۔اب پیاسا پانی سمجھتا ہے، یہ بھی ایک بہت اہم مضمون ہے

جس کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے۔ جتنی دنیا کی پیاس بڑھے اتنا ہی انسان اپنے نفس کو دھوکا دیتا چلا جاتا ہے اور اگر آپ کو بالکل پیاس نہ ہو پانی ہو تو آپ اس سراب کو دیکھتے بھی ہیں متوجہ نہیں ہوتے اور آپ کا دل بتاتا ہے کہ یہ پانی نہیں ہے محض دھوکہ ہے لیکن وہ جس کی جان نکل رہی ہو پانی کی بوند کے لئے اس کو تو ہر چمکنے والی چیز پانی دکھائی دینے لگتی ہے۔ تو فرمایا کہ تم دنیا کی طلب میں ایسے اندھے نہ ہو جاؤ، ایسے پاگل نہ بن جاؤ کہ جہاں کچھ سیرابی کے لئے نہ ہو وہاں بھی تمہیں پانی دکھائی دے اور تم پھر اس کے پیچھے دوڑنے لگو اور امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا طلبی کی اس سے زیادہ حسین مثال دی جا ہی نہیں سکتی۔ روشنی ہے انسان اس روشنی میں ایک اور چمکتی ہوئی چیز کو دیکھتا ہے اور اس کے پیچھے بگٹٹ دوڑا چلا جاتا ہے اس خیال سے کہ میری پیاس بجھے گی۔ پس دنیا والے جن بدیوں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پیاس بجھے گی ان کی پیاس نہیں بجھا کرتی یہ ایک اور پیغام ہے جو اس آیت میں دیا گیا ہے۔ ان کی روشنی انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اور دن بدن جوں جوں موت کے قریب ہوتے ہیں ان کی طلب بڑھتی چلی جاتی ہے اور بالآخر یہ یقین کر کے مرتے ہیں کہ ہم نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ساری عمر ضائع کر دی۔ چنانچہ اکثر پٹے ہوئے سیاستدانوں سے آپ بات کر کے دیکھیں، یا بڑی بڑی نوکریوں سے اترے ہوئے لوگوں سے ملیں یا ریٹائرڈ جرنیلوں سے بات کریں تو ان سب کی باتوں میں آپ کو یہ بات دکھائی دے گی جی کچھ بھی نہیں ہم نے اتنی خدمتیں کیں آخر کچھ نہ نتیجہ نہ نکلا۔ کل تک جو پوجتے تھے آج ملتے ہیں تو دیکھتے ہی نہیں اس طرف۔ کئی ایسے جو بڑے بڑے وزیر یا گورنر رہ چکے ہوں جب وہ دوبارہ اترنے کے کچھ عرصے کے بعد سیکرٹریوں کے کمروں میں داخل ہوتے ہیں تو سیکرٹری اس طرح ان پر نظر ڈالتا ہے جیسے کوئی مصیبت داخل ہو گئی اب یہ مانگیں گے کچھ اب تقاضا کریں گے پہلے آتے تھے تو اٹھ کر ملا کرتے تھے۔

تو زندگی کی پیاس جو خدا کے فیض سے خالی ہو زندگی کی پیاس جو عشق الٰہی سے عاری ہو اس زندگی کی پیاس کا مقصد سوائے سراب کی پیروی کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور کبھی بھی طمانیت قلب نہیں بخشتی۔ انفرادی طور پر بھی یہی اصول کارفرما ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں اور اجتماعی طور پر بھی یہی اصول کارفرما ہے چنانچہ Materialist Society جہاں طرح طرح کی ایجادات کی گئی ہیں عیش و عشرت کے سامان کی، وہاں پیاس بڑھ رہی ہے لیکن بجھ نہیں رہی اور سوسائٹی کی بڑھتی ہوئی

بے چینی اور خلاء کا احساس اور مزید کی تلاش یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن پر اگر آپ عمومی نظر ڈالیں تو ادنیٰ بھی اس بات میں شک نہیں رہے گا کہ ایسی سوسائٹیاں پھر سراب کے پیچھے دوڑتی چلی جاتی ہیں اور جانتی ہیں کہ ہمارا حال بد سے بدتر ہو رہا ہے، اب مغربی دنیا میں تو اللہ کے فضل کے ساتھ سچائی کا عنصر اکثر مشرقی دنیا سے زیادہ ہے کیونکہ جہاں گناہوں کے بڑھ جانے نے ان کو نقصان پہنچائے وہاں کچھ ضمنی فائدے بھی پہنچائے۔ یہ بات یعنی منافقت کم ہوگئی اور عام دنیا کے حالات میں اپنی کمزوریاں کھل کر بیان کرنے کے حوصلے ہو گئے اور یہ بات بُرائی تک بھی پہنچاتی ہے اور بعض فائدے بھی رکھتی ہے۔ بے حیائی کے نقصان تو بہر حال ہیں مگر کچھ فوائد بھی ہیں یہ اپنے امراض کو باہر سب کے سامنے کھول کر اور دکھا کر بتاتے ہیں کہ یہ مرض ہیں یہ بڑھ رہے ہیں، یہ یہ مصیبتیں ہیں۔ چنانچہ ان کے دانشور جب ان موضوعات پر ٹیلیویژن وغیرہ میں گفتگو کریں تو آپ دیکھیں ہر ایک کے اوپر یہ مایوسی ہوتی ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، جو چاہیں زور لگالیں ہمارے نوجوان ہاتھ سے نکل گئے ہمارا امن اٹھ گیا۔ دن بدن یہاں چوری، ظلم، سفا کی بڑھتے چلے جارہے ہیں، امن وامان قائم کرنے والی طاقتوں میں بھی رفتہ رفتہ فتور آ گیا ہے، ان کے اندر بھی بدیاں داخل ہو رہی ہیں۔ قانون بناتے ہیں چیزیں روکنے کے لئے وہی قانون ظالموں کو مزید پیسے حاصل کرنے کے ذرائع مہیا کر دیتا ہے۔ جتنا جرم کے خلاف سختی بڑھے گی اتنا ہی جرم پکڑنے والے ادارے، اگر بددیانت ہوں، ان کی فیسیں بھی ساتھ ساتھ بڑھیں گی ان کی طلب بھی اور اونچی ہوتی چلی جائے گی۔ تو جو اصل بنیاد ہے جہاں جڑیں قائم ہیں وہاں ہاتھ ڈالے بغیر معاشرے کے اندھیرے دور نہیں ہو سکتے اور یہ آیت ان تمام اندھیروں پر برابر چسپاں ہو رہی ہے جو انسان اپنے آپ کو روشنی میں سمجھ کر یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اپنی عقل سے اپنے لئے کچھ حاصل کر سکتا ہوں اور بظاہر وہ دیکھ رہا ہے اور اس طرح دیکھتا ہے جیسے دوسروں کو دکھائی نہیں دے رہا اس کو زیادہ پتا ہے کہ اس کا مفاد کیا ہے ایسے شخص کی زندگی اکیلی بھی اسی طرف سفر کرتی ہے اور اپنے معاشرے کی مجموعی زندگی بھی اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر قرآن کریم نے دکھایا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ آخر پر پہنچتا ہے۔ وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۔ وہ اللہ کو وہاں دیکھتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اب دیکھیں روشنی کے سفر کا نتیجہ روشنی ہی ہونی چاہئے۔ کیسے اندرونی آپس میں تعلقات ہیں مضمون کے اور لفظوں کے۔ یہ نہیں کہا

وہاں خدا کو نہیں دیکھتا۔ فرماتا ہے دیکھتا تو خدا ہی کو ہے مگر حساب دینے کی غرض سے۔ اس غرض سے کہ اسے سزا دے۔ پس لقاء باری تعالیٰ بھی تو دو طرح کی ہے۔ جانا تو خدا ہی کی طرف ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ:157)۔ ہم اللہ ہی کے ہیں اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور لازماً اس کی طرف ہی لوٹیں گے مگر کیسے لوٹیں گے۔ رحمان اور رحیم کے رستے سے یا مغضوب اور ضالین کے رستے سے۔ اگر مغضوب اور ضالین کے رستے سے لوٹیں گے تو وہ ملاقات بہت بری ملاقات ہوگی مگر یہاں دیکھیں روشنی کا سفر بھی ہے اور روشنی تک پہنچا بھی رہا ہے مگر جیسے وہ روشنی کا تصور جھوٹا تھا ویسے اس روشنی تک پہنچ کر اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا اور سوائے گناہ کی پاداش کے اور کچھ اس کے حصے میں نہیں آیا۔ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ اللہ وہاں اسے اس کا حساب دے گا اور پورا پورا حساب دے گا۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اور اللہ تعالیٰ بہت تیز حساب کرنے والا ہے۔ اب تیز حساب اور اس موقع کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں میں پہلے بھی روشنی ڈال چکا ہوں مگر بعض لوگوں کے خیال پھر بھی الجھے رہتے ہیں کیونکہ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے خطبے میں پوری تفصیل سے بات کی لیکن ہوسکتا ہے اس میں مَیں مضمون ٹھیک بیان نہ کر سکا ہوں وہ لوگ جو خطبے میں موجود تھے پھر دوبارہ وہی سوال کرتے ہیں یہ بات نہیں بتائی آپ نے۔ میں کہتا ہوں بتا تو چکا ہوں اور کس طرح بتاؤں مگر پھر بتاتا ہوں کوشش کرتا ہوں۔ بعض دفعہ ایک انسان کے خیال بھٹک جاتے ہیں خطبہ سنتے سنتے اس کو کوئی گھر کی بات یاد آجاتی ہوگی یا کوئی تجارت کا مسئلہ آ گیا اس نے دماغ پر قبضہ کر لیا یا کوئی پروگرام بنانا ہے یا کسی بچے کی بیماری کی پریشانی ہے تو یہ انسان کے ساتھ اندھیرے اور روشنی چلتے رہتے ہیں ساتھ ساتھ کبھی اندھیرا آ جاتا ہے تو اس لئے بتانا ضروری ہے اس لئے اس مضمون کو بھی میں دوبارہ سمجھاتا ہوں کہ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ہونے کے باوجود اتنا لمبا انتظار کہ ایک آدمی کا ہر قدم گناہ کی طرف اٹھ رہا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے اس تمام سفر کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سَرِيْعُ الْحِسَابِ کہ میں حساب میں بہت تیز ہوں۔

سَرِيْعُ الْحِسَابِ سے مراد یہاں یہ نہیں ہے کہ جزا دینے میں تیز ہوں۔ یہ دو الگ الگ مضمون ہیں۔ اگر جزا دینے میں تیز کہا جاتا تو پھر وہ آیت کہاں جائے گی جو کہتی ہے میں ڈھیل دیتا ہوں وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (الاعراف:184) میں انہیں ڈھیل دیتا چلا جاتا ہوں

مگر میری پکڑ ہے بہت سخت۔ تو حساب سے مراد یہ ہے کہ اس کے اس تمام سفر کے قدم قدم کا حساب اسے وہاں پورا دیا جائے گا۔ تیز حساب سے مراد یہ ہے کہ ایک لمحہ بھی حساب کا ایسا نہیں گزرا جب کہ خدا غافل ہوا ہو اس کے حساب سے۔ اس پر ایسے حساب کرنے والے مقرر ہیں جو لمحہ لمحہ بلکہ اس سے بھی کم عرصے کی اس کی نیتوں کی خرابیاں، اس کی تمناؤں کے فساد، اس کے اعمال کے جو فتنے پیدا ہوتے ہیں لوگوں کو ضرر پہنچتے ہیں ان سب باتوں کا، ایک ایک ضرر کا حساب خدا تعالیٰ نے رکھا ہوا ہے۔ پس جو ساتھ ساتھ حساب کرتا رہے اس سے زیادہ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اور کیا ہو سکتا ہے۔ حساب میں اگر تاخیر ہو جائے تو بعض دوسری چیزیں رہ جایا کرتی ہیں۔ اللہ کی یادداشت سے تو کچھ نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ ایک بہت ہی حسین انداز ہے خدا کے حساب کے متعلق اطمینان دلانے کا کہ اس نے چھوڑا کچھ بھی نہیں کیونکہ جو ساتھ ساتھ حساب کر رہا ہے اس سے کچھ نہیں چھٹا کرتا۔ جو کہتا ہے کل کر لیں گے، پرسوں کر لیں گے اس سے کئی چیزیں رہ جایا کرتی ہیں۔ تو فرمایا جو حساب دے گا وہ یقیناً پورا ہوگا اس میں کوئی کمی نہیں ہو گی کیونکہ وہ ساتھ ساتھ حساب کر رہا تھا ایک لمحہ کی تاخیر نہیں ہوئی۔ پس ایسے حساب کرنے والے سے ڈرو جب وہ پورا حساب دے گا تو تمہارے گناہوں کی تمام تر پاداش تمہیں مل جائے گی۔ یہ وہ اندھیروں کا سفر ہے جو روشنی کے نام پر کیا جا رہا ہے اور دنیا کی بھاری اکثریت جس روشنی میں سفر کر رہی ہے وہ یہ خوفناک اندھیرا ہے اور پہلے اس لئے رکھا کہ اس اندھیرے کا شعور تک بیدار نہیں ہوتا۔ روشنی سمجھ رہا ہے انسان، ساری عمر روشنی سمجھتا رہے گا کوئی کہنے والا بتائے گا آواز بھی دے گا تو کہے گا تم پاگل ہو گئے ہو مجھے پتا ہے میں کیا کر رہا ہوں وہ دیکھو سامنے پانی ہے اور پاگل کو جب یقین ہو جائے کہ میں جس طرف جا رہا ہوں وہ ٹھیک ہے تو وہ پھر کسی کی بات سنتا ہی نہیں اس کو لاکھ سمجھائیں کہ تمہیں سمجھ نہیں آ رہی یہ نقصان دہ ہے، کہے گا جاؤ جاؤ اپنا رستہ لو بڑے آئے ہو میرے ہمدرد مجھے تم سے زیادہ پتا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے میرے لئے۔ ایسے کئی لوگ ہیں جو پھر بات نہیں مانتے جب وہ نقصان اٹھا لیتے ہیں پھر واپس آتے ہیں اس وقت دل کی شرم ہے جو روک ڈال دیتی ہے کہ ان کو کیا کہا جائے کہ کل تک تو تم ضد کر رہے تھے کہ اچھی چیز ہے اب آ گئے ہو کہ نقصان پہنچ گیا یہ بھی ایک طبعی بات ہے اور انسان کو مناسب نہیں ہے کہ بے وجہ کسی کو اس کی غلطی یاد دلا کے اس کو رگڑے اور تکلیف پہنچائے کہ دیکھا تم کل تک کیا کہہ رہے تھے اب تمہیں پتا لگ

گیا۔ بعض دفعہ آئندہ کے لئے بچانے کی خاطر نصیحتاً یہ بات کہنی پڑتی ہے مگر اس کے اندر کسی قسم کی تعلّی نہیں ہونی چاہئے ورنہ کہنے والے کو نقصان پہنچ جائے گا ورنہ یہ مضمون تو شاعری میں، عشق و عاشقی میں برابر چلتا ہے جہاں زیادہ پیار ہو وہاں کم طعنہ دیا جاتا ہے جتنا پیار بڑھے گا اتنا ہی طعن کی طرف طبیعت کم مائل ہوگی۔ غالب کہتا ہے۔

گئے وہ دن کہ، نادانستہ، غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے

کہتا ہے گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری۔ اب دیکھیں یاد دلانے میں بھی کتنی احتیاط برتی ہے غالب نے ذہین شاعر تھا اور فطرت کے باریک امور پر نظر تھی (دیوان غالب: 391) کہتا ہے جب تم کیا کرتے تھے ہمیں پتا ہے نادانستہ کرتے تھے۔ بھولے آدمی تمہیں پتا ہی نہیں تھا کہ غیر دشمن ہیں ''کیا کرتے تھے تم تقریر......'' بڑا اچھا آدمی ہے تم کیا روک رہے ہو مجھے کہتا ہے ہم خاموش رہا کرتے سنا کرتے تھے کہ ہاں ہوگا۔

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی

اب جب اس سے بگڑ گئی ہے تمہارے اوپر اس کا اصل حال کھل گیا ہے تو شرمندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہم سے قسم لے لو اگر جو یہ بھی کہیں ''کیا ہم نہ کہتے تھے'' کبھی یہ بھی کہہ کے تمہیں جتائیں کہ ہم نے کہا نہیں تھا۔ اب یہ غالب کے اندر بھی ایک کمال ہے فصاحت کا پہلے جب یہ جو کہہ دیا کہ ہم خاموش رہتے تھے تو پھر قسم بھی کھا سکتا ہے کہ ہم نہ کہتے تھے ہم نہیں کہیں گے۔ کہا ہی نہیں مگر خاموشی بھی تو زبان رکھتی ہے۔ مراد یہ نہیں ہے کہ ہم نے تم پر ظاہر نہیں ہونے دیا، مراد یہ ہے کہ تم دیکھ لیتے تھے، سمجھنا چاہئے تھا جب ایک آدمی کسی کی تعریفوں کے پل باندھ رہا ہو اور دوسرا ''ہوں'' بھی نہ کہے تو صاف پتا چلتا ہے کہ اس کے دل کو لگی نہیں بات۔ کہتا ہے ہم خاموش رہا کرتے تھے، سنتے تھے یک طرفہ، کیا ضرورت تھی تمہاری مخالفت کرنے کی مگر پیغام پہنچ جاتا تھا اس لئے کہہ تو سکتے ہیں کہ ہم کہتے تھے مگر چونکہ منہ سے نہیں بولے اس لئے قسم کھاتے ہیں کہ اب نہیں کہیں گے، کیوں ہم نہ کہتے تھے۔

تو امر واقعہ یہ ہے کہ گناہ گار جس کو آپ روشنیوں کی طرف بلاتے ہیں اور وہ یہ کہتا ہے کہ یہ روشنیاں ہیں تمہیں کیا اس سے۔ مجھے نظر آرہا ہے۔ روشنی ہے اس کا کچھ حساب تو ہے جو انجام کار خدا اسے دیتا ہے۔ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے سفر درپیش ہوتے ہیں زندگی کے اندر اور وہ ہر سفر سراب کی طرح ہوتا ہے اس کا حساب ملتا چلا جاتا ہے اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری موت کے وقت اگر حساب ملا بھی اور آنکھیں کھلیں بھی تو کیا فائدہ۔ میں جانتا ہوں کہ بسا اوقات ایسے لوگوں کو اپنے زندگی کے چھوٹے سفروں میں قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت کا مزہ چکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ روشنی سمجھتے ہوئے جاتے ہیں دھوکہ کھاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں پھر اگلی دفعہ پھر دھوکہ کھاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں۔ اگلی دفعہ پھر دھوکہ کھاتے ہیں تو جو آخری حساب ہے وہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہے جو وقتی حسابوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور سَرِيْعُ الْحِسَابِ ان معنوں میں بھی ہے کہ ہر منزل پر تمہارے دھوکے کا حساب چکا دیا گیا تھا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج اتنی دیر کے بعد بتایا اب کیا فائدہ جب سارا وقت گزر گیا اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں تو یہ وہی مضمون ہے ''قارعہ'' والا۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ ہم صرف آخری لمحوں میں تمہاری موت کے قریب آ کے تمہیں جھنجوڑ کے جگاتے نہیں ہیں بلکہ پہلے بھی جگاتے رہتے ہیں یا تم پر قارعہ اترتی ہے۔ ایسی بلا اور ایسی آفت یا ایسی تنبیہہ کہ جو تمہارے گھروں کے بڑے زور کے ساتھ دروازے کھٹکھٹاتی ہے اور یا ساتھ کے گھروں کے کھٹکھٹاتی ہے اور تمہیں آواز آرہی ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک بیدار کرنے والی آگئی ہے اس لئے خدا کو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب بتایا جب کہ وقت گزر گیا جب کہ کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ فرمایا ہم وہ حساب تو دیں گے مگر اس سے پہلے بھی تو ہم سَرِيْعُ الْحِسَابِ تھے اور ان معنوں میں کہ جو جو حساب پہلے ہوتے رہے ان کی جزا بھی تمہیں ملتی رہی ہے۔ سَرِيْعُ الْحِسَابِ یہ دوسرے معنی ہیں جو یہاں اختیار کر لیتا ہے اور ان کی تائید وہی قارعہ والی آیت اور بعض دوسری آیات بتاتی ہیں کہ وقتاً فوقتاً انسان کو تنبیہات ملتی رہتی ہیں جان لیتا ہے کہ یہ بات غلط تھی مگر پھر جب وہ حرکت اسی طرح جاری رکھتا ہے تو ساری زندگی سرابوں کا سفر بن جاتی ہے اور اس سے بڑی ظلمات اور کیا ہو سکتی ہیں کوئی دکھانے والا دکھائے، نظر نہ آئے یہاں تک کہ بالآخر خدا ہی اسے بتائے کہ یہ اندھیرے تھے یہ روشنیاں نہیں تھیں ان سے پناہ کی ضرورت ہے اور ان سے بچنے کی ضرورت ہے اور اس دھوکے سے

بچنے کی صرف ایک راہ ہے کہ انسان انکساری اختیار کرے۔ جب اسے کوئی بات کہتا ہے مشورہ دیتا ہے سب سے پہلی بات یہ دیکھنے والی ہے کہ مشورہ دینے والا اپنا کوئی مطلب رکھتا ہے یہ اپنی غرض رکھتا ہے یا اسے کوئی غرض نہیں ہے؟ اگر وہ بے غرض ہے تو پھر اس کی بات نہ سننا تمہاری جہالت ہے۔ اتفاق کرو یا نہ کرو مگر یہ کہہ کر اس سے بات نہ توڑو کہ ہمیں پتا ہے، ہمیں نظر آ رہا ہے، ہمیں دکھائی دے رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر روشنیوں کی طرف بلانے والا اور کوئی نہیں تھا، نہ ہے، نہ ہوگا مگر آپؐ کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے ساتھ یہ احتیاط برتی ان دشمنوں کی خاطر فرمایا ان کو کہہ دے تو اپنی ذات کے لئے ان سے کوئی اجر بھی نہیں مانگ رہا ہرگز کسی قسم کا اجر ان سے طلب نہیں کر رہا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (سبا:48) میرا اجر تو خدا کے سوا کسی پر ہے ہی نہیں۔ اس لئے تم کیوں اتنے بے وقوف ہو کہ، سمجھتے ہو کہ میں اپنے مطلب کی خاطر بات کر رہا ہوں۔ ایسا ناصح جو اپنی غرض نہ رکھتا ہو یا اپنی غرض کی طلب نہ کرے وہ ناصح اس لائق ہے کہ اس کی بات توجہ سے سنی جائے اور انکسار کی راہ اختیار کرتے ہوئے انسان یہ سوچے کہ ہوسکتا ہے میری غلطی ہو اور دوسرے پہلو سے بھی دیکھ لے اور یہ جو دوسرا پہلو ہے یہ زاویہ بدلنے سے نظر آیا کرتا ہے۔ ایک زاویئے سے ایک بات دیکھی پھر دوسرے زاویئے سے جا کے دیکھا تو اس کے نتیجے میں وہ آنکھیں جو پہلے اندھی تھیں انہیں دکھائی دینے لگتا ہے۔ وہ جو پہلے ایک بات کو روشنی دیکھ رہا تھا وہ اسے اندھیرا دیکھنے لگ جاتا ہے۔ دراصل ایسا انسان تکبر کے اندھیرے میں بھی رہتا ہے ایک اور اندھیرے کا سایہ اس کے اوپر رہتا ہے اور متکبر کے لئے پھر کوئی روشنی کا سامان نہیں۔ انسان انکسار سے کام لے اور زاویہ بدل کے دیکھے تو اس سے بسا اوقات وہ تکبر کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور دوسرا پہلو صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔

(اس موقع پر بعض لوگ لاؤڈ سپیکر سسٹم میں خرابی کو درست کرنے والے منتظمین کی طرف دیکھنے لگے اس پر حضور نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا، مگر اگر آپ وہ پہلو دیکھتے رہیں گے تو یہ پہلو دکھائی نہیں دے گا۔ اس لئے بعض نظریں جو بے وجہ اس بے غرض تماشے میں لگ گئی ہیں اس سے ان کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا تار ہی ہلتی دکھائی دے گی نا۔ میں آپ کے دلوں کے تار ہلانے کی کوشش کر رہا ہوں)

پس ایسا شخص جو تکبر کا اندھیرا رکھتا ہو اس کو اگر آپ روشنی دکھانے کی کوشش بھی کریں گے تو

ہرگز نہیں دیکھ سکے گا ایسا تجربہ بسا اوقات ہوا ہے۔

بنگلہ دیش میں ایک دفعہ ایک واقعہ گزرا کہ وہاں کے کچھ دینی مدرسے کے طالب علموں نے یہ سوچا کہ احمدیت کو ہم جانتے ہیں جھوٹی ہے لیکن چلو دیکھیں تو سہی ایک بحث کر کے دیکھیں کہ دوسری طرف کے دلائل ہیں کیا؟ اور اگر ہم طلبہ میں ایسی بحث تیار کر کے پیش کریں تو پھر قادیانیوں کو یا مرزائیوں کو جو بھی وہ کہتے تھے یہ موقع تو نہیں ملے گا کہ بعد میں اپنے دلائل دیں اور ہمارے طلبہ متاثر ہو جائیں مگر کوشش یہ کرنی چاہئے کہ جس طرح قادیانی بات کرتے ہیں ویسی کی جائے۔ چنانچہ وہ وفد جس نے Debate کا ایک حصہ اپنے لئے اختیار کیا تھا وہ ہمارے مربی صاحب اور امیر وغیرہ کی خدمت میں پہنچ گیا انہوں نے کہا یہ مقصد ہے ہمیں صرف آپ اپنے دلائل بتائیں اور یہ سمجھائیں کہ آپ کس طرح پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جب انہوں نے دلائل احمدی نقطۂ نظر سے دیکھے تو سب کا دل قائل ہو گیا۔ انہوں نے کہا او ہو یہ تو ہیں ہی سچے۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ Debate اساتذہ نے پوری ہونے بھی دی تھی کہ نہیں مگر وہ احمدی جو اس میں شامل تھے انہوں نے بتایا کہ ان کا پلڑا اتنا بھاری رہا کہ علماء میں وہاں سراسیمگی پھیل گئی کہ یہ کیا واقعہ ہو گیا ہم تو کچھ اور کرنے نکلے تھے کچھ اور نکل آیا۔

تو زاویہ بدلنے سے بعض چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور انسان کا فرض ہے کہ تکبر سے کام نہ لے۔ یہ دیکھ لے کہ ناصح خود غرض ہے اور بدیہی طور پر غلط چیز کی طرف بلا رہا ہے یا ہماری بھلائی کی طرف بلا رہا ہے۔ اب بدیہی طور پر بعض چیزیں غلط ہوتی ہیں مثلاً ایک آدمی کہتا ہے جھوٹ بولو میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں تمہارے فائدے کی چیز ہے۔ روشنیوں سے جو شخص بظاہر روشنی میں دیکھ رہا ہے اس کو اس وقت یہ نظر ہی نہیں آئے گا کہ جھوٹ سے تو کوئی فائدہ وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ صاف دیکھتا ہے کہ ہاں ہے۔ اگر کوئی دوسرا کوئی اس کو کہے کہ دیکھو جھوٹ نہ بولو تو اسے وہ دھتکارنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ جھوٹ نہ بولنا ایک بدیہی صداقت ہے جس کے خلاف فطرت از خود کوئی آواز نہیں اٹھاتی۔ اگر کسی کو کہو جھوٹ نہ بولیں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم بدانسان ہو، گندے ارادے کے ساتھ بات کر رہے ہو۔ وہ تو یہ کہہ سکتا ہے جاؤ جاؤ اپنا رستہ لو میں زیادہ سمجھدار ہوں مجھے پتا ہے جھوٹ سے فائدہ ہوتا ہے مجھے پتا ہے بعض جگہ جھوٹ بولے بغیر گزارہ ہی کوئی نہیں۔ اگر ایسے شیطان کی بات انسان مان لے تو بظاہر وہ ایک روشنی کا فیصلہ کر رہا ہے وہ جانتا ہے کہ یہی قاعدہ ہے جھوٹ سے فائدہ ہے مگر

دراصل یہ ایک اور اندھیرے کی طرف قدم ہوگا۔

پس یہ سراب کی جو مثال قرآن کریم نے پیش کی ہے اس پر آپ جتنا غور کرتے چلے جائیں اور نئے نئے پہلو اس کے نکلتے آئیں گے۔ابھی کچھ عرصہ پہلے یہیں واقعہ ہوا ہے ویسے تو مخلص نوجوان ہے وہ لڑکا لیکن اسے ایک تجربہ کار نے یہ نصیحت کی کہ فلاں انٹرویو کے لئے جا رہے ہو یہ بات نہ صحیح بتا دینا۔ ہر سچ بولنا یہ نہ کہہ دینا ورنہ وہ تمہیں رد کر دیں گے۔ یہ بات جو کمزوری ہے، پتا لگ گئی تو ضرور رد کر دیں گے۔ چنانچہ اس بے وقوف نے بجائے اس کے کہ مجھ سے بات کرتا آنکھیں بند کر کے وہ بات مان لی اور ساری باتیں سچی کہیں وہی ایک جھوٹ بولا۔اس کی نوکری کی درخواست صرف اس وجہ سے رد ہوئی کہ تم نے وہ جھوٹ بولا ہے اس لئے ہم رد کرتے ہیں۔ بعد میں بے چارہ سر جھکا کے آیا کہ جی یہ غلطی ہوگئی ہے۔میں نے کہا جھوٹ تو ہے ہی غلطی۔تمہیں اس گند پہ منہ مارنا ہی نہیں چاہئے تھا۔زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ ناکام ہوتے مگر یہ تو خوشی ہوتی کہ شیطان کے ہاتھوں سے نہیں کھایا خدائے واحد و یگانہ کے ہاتھ سے ملا ہے جو بھی ملا ہے۔

پس روشنی سمجھتے ہوئے جو اندھیروں کا سفر ہے وہ سب سے خطرناک ہے۔ہم جانتے ہیں ہمارے کیا مفادات ہیں،عدالتوں میں لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو اسی روشنی میں جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔اگر وہ سیاست میں جھوٹ بول رہے ہیں یا دھوکے دے رہے ہیں یا مذہب میں جھوٹ بول رہے ہیں یا دھوکے دے رہے ہیں۔ یہ سارے سفر سراب کے سفر ہیں۔ایک مقصد لے کر نکلے ہیں اس پیاس بجھانے کی خاطر ہر ظلم کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہاری حساب فہمی تو مکمل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وقتاً فوقتاً تمہیں اس کے مزے چکھائے جائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بالآخر اگر وہ شخص ایسا ظالم ہو کہ اس کے متعلق خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہو کہ کوئی تنبیہہ کام آہی نہیں سکتی کوئی امکان ہی نہیں ہے ضروری نہیں کہ اس کو ضرور پہلے قارعہ ہی نصیب ہو۔اللہ بہتر جانتا ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر کیسی تاریکی رکھتا ہے تو ایسے شخص کو پھر مسلسل اسی طرف بڑھنے دیا جاتا ہے جس طرف وہ اپنی ہلاکت کے آخری کنارے کی طرف جا رہا ہے۔

سب سے زیادہ استغفار کا یہ موقع ہے کہ اللہ ہمیں نفس کے ایسے دھوکے سے بچائے کہ جب اندھیرے کو روشنی دیکھنے لگیں اور روشنی کو اندھیرا دیکھنے لگیں۔ یہ بیماری سب سے خطرناک اور سب

سے زیادہ لاعلاج ہے۔اس کے علاوہ دوسری بیماریاں ہیں جو بیرونی اثرات کے نتیجے میں اندھیرے پیدا کرتی ہیں۔ان کے تعلق میں قرآن کریم کی اس سے اگلی آیت روشنی ڈال رہی ہے جہاں تک مــن شــرور انـفسنـا کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں یہ آیت ان سارے مضامین پر حاوی ہے۔ایک شخص کسی اور کا نہ محتاج ہے نہ کچھ، اپنا ہی نفس اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے اور کسی غیر کے دھوکے کا اس میں دخل نہیں ہے۔اب یہ دیکھیں مضمون بالکل واضح ہے اس کا سراب کو دیکھنا اس لئے نہیں ہے کہ بادل آئے ہوئے ہیں۔اس کا سراب کو دیکھنا اس لئے نہیں ہے کہ اندھیرا ہے رات ہوگئی ہے۔رات ہوگئی تو سراب نہیں دکھائی دے گا، بادل آئے ہوں گے تو سراب نہیں دکھائی دے گا۔پس روشنی میں اندھیرا یہ بہت خطرناک ظلم ہے اور اس میں غیر کی محتاجی ہی کوئی نہیں، کسی باہر سے آنے والے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ آپ کو اشارہ کر کے بتائے دیکھو وہ پانی ہے اور وہ پانی نہ نکلے آپ کا نفس ہی کافی ہے اس دھوکے کے لئے۔

اگلی جو آیت ہے اس میں بیرونی محرکات کا اور بیرونی پردوں کا ذکر ہے جو ایک انسان پر بعض دفعہ ایک، بعض دفعہ دو، بعض دفعہ تین تین اندھیرے، بعض دفعہ ظلمات کی کئی کئی قسمیں وارد کر دیتے ہیں اور ایسے شخص کا سفر بھی اندھیروں کا رہتا ہے مگر اندھیرا سمجھتے ہوئے دھکے کھاتا پھرتا ہے کہیں اس کو نور کی راہ نہیں ملتی۔اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے اگلی آیت فرماتی ہے۔ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ یا اس کی مثال ایسی ظلمتوں کی سی ہے فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ جو بہت ہی گہرے اور بھرپور سمندر میں واقع ہوتی ہیں۔اب یہاں لُّجِّيٍّ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔سب سے پہلے تو اس پر غور کریں۔سمندر کے اندر جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ یہ ہے فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ایسے اندھیرے کہ ایک موج کے بعد دوسری موج نے ڈھانپا ہوا ہو اور اس کے اوپر بھی سورج دکھائی نہ دے۔سَحَابٌ دن بھی اندھیرا جہاں سورج کی روشنی کی راہ میں بادل حائل ہو گیا ہو اور پھر موج در موج وہ انسان ہو، اسے اس کے علاوہ لُّجِّيٍّ سے کیا فرق پڑے گا۔سمندر گہرا ہو یا کم گہرا ہو لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ سمندر سب سے زیادہ روشنی کو کاٹنے والا ہوتا ہے اور جتنا گہرا ہوتا جائے اتنا اندھیرا ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ گہرے سمندروں میں کوئی نور کا اشارۃً بھی نشان دکھائی

نہیں دیتا۔ مکمل اندھیرا اگر ممکن ہے تو باہر کی فضاؤں میں ممکن نہیں ہے۔ جن کو آپ مکمل اندھیرا سمجھے ہیں اگر تیز حساس فلموں سے اس اندھیرے میں تصویر کھینچیں اور وقت زیادہ دیں تو تصویریں پھر بھی آ جاتی ہیں، میں نے خود بعض ایسے کیمروں سے تصویریں کھینچی ہیں کہ مکمل اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا آنکھ سے لیکن ہلکی ہلکی روشنی، کہیں سے ستاروں سے کوئی ایسی روشنی پہنچتی ہے جو انسان جس کے ذریعے دیکھ تو نہیں سکتا مگر موجود ہے اور فلم کی حساس سطح اسے قبول کر لیتی ہے۔ تو تصویریں جب دھل کے آئیں تو خود فوٹو گرافر جس نے یہ تصویریں صاف کی تھیں حیران رہ گیا جب اس کو بتایا کہ یہ اندھیرے کی تصویر ہے۔ اس نے کہا یہ تو پھولوں کے رنگ بھی صاف آ گئے ہیں۔ مگر سمندر کی تہہ کا جو اندھیرا ہے اس میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ ناممکن ہے۔ بیس پچیس گز نیچے سے ہی اندھیرے شروع ہو جاتے ہیں اور گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں جہاں دس ہزار فٹ نیچے تک سطح واقع ہو یا پندرہ یا تیس ہزار فٹ تک وہاں جائیں تو روشنی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ تو ایک شخص اندھیروں میں سفر کر رہا ہے، اس کے اوپر بھی اندھیروں کی تہہ اور نیچے بھی اندھیرے ہیں مگر وہ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ کے اندھیرے ہیں اس لئے وہاں سے روکنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ روشنی آ سکتی تھی تو اوپر سے آ سکتی تھی گہرے سمندر میں نیچے سے روشنی آ ہی نہیں سکتی۔ تو اوپر بھی اندھیرا نیچے بھی اندھیرا اور نیچے کا اندھیرا جو خدا سے بے تعلق یعنی آسمان کی بجائے زمین سے اٹھتا ہے یا گہرے سمندر سے پیدا ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ خطرناک اندھیرا ہے۔ فرمایا ایسا شخص اِذَآ اَخۡرَجَ یَدَہٗ لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىہَا اپنا ہاتھ دیکھے تو نہیں دیکھ سکتا، ہاتھ بڑھائے یوں کر کے کہ کہاں ہے تو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ مگر یہاں ہاتھ کا قصور نہیں ہے اس کے نفس کا قصور نہیں ہے اور اس کی آنکھوں کا قصور نہیں ہے کیونکہ لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىہَا کا مضمون بتا رہا ہے کہ آنکھوں کا نور باقی ہے مگر غیر اندھیرے چھا گئے ہیں۔ تو فرمایا اگر تم نے نور پانا ہے تو بیرونی طور پر خود اپنے نفس کے تکبر کے اندھیروں میں بھی تم سفر کر سکتے ہو، روشنی ہوتے ہوئے بھی تمہیں اندھیرے سے زیادہ اور کچھ فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ ویسا ہی ہے جیسے اندھیرا ہو، ویسے ہی روشنی ہو گی اور روشنی تمہیں فائدہ دینے کی بجائے وہ نقصان ضرور پہنچا دے گی جو اندھیرا پہنچا سکتا ہے۔ مگر نفس کی روشنی جو دھوکے والی ہے وہ لازماً پہنچا دے گی۔ یہ فرق ہے۔ اگر آپ اندھیرے میں سفر کریں تو کسی سمت غلطی سے منہ اٹھ جائے ہو سکتا ہے وہاں پانی نکل آئے مگر جو نفس کے دھوکے کی روشنی ہے وہ آپ

کولازماً غلط سمت میں لے کے جائے گی اور اندھیرے میں سراب دکھائی دے ہی نہیں سکتا۔ اگر کچھ نہ دکھائی دے تو کم سے کم چند منٹ چین سے تو انسان بیٹھ سکتا ہے مرے تو وہیں نسبتاً زیادہ آرام کی حالت میں جان دے ورنہ ہر قدم جو سراب کی طرف اٹھاتا ہے اس کی پیاس بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تو سب سے خطرناک وہ اندھیرا ہے جیسا کہ قرآن کی کریم آیات کی ترتیب نے بھی ہمیں سمجھا دیا جو بظاہر روشنی ہے مگر اپنے نفس کا اندھیرا ہے جس نے ہر روشنی کو بے معنی اور بے حقیقت کر دیا ہے اور اس میں غیر کی مدد کی حاجت نہیں ہے۔ کوئی شیطان بیرونی ہو یا نہ ہو تمہارا اپنا شیطان بہت کافی ہے۔ پس اس لئے جو یہ دعا ہے من شرور انفسنا کہ اے اللہ! ہمیں اپنے نفس کے شرور سے بچا یہ بہت اہم دعا ہے جس کے بغیر ہمارا اندھیروں سے روشنی کی طرف سفر ممکن نہیں ہے۔

پس باقی مضمون انشاء اللہ اگلے جمعہ میں شروع کروں گا جو زیادہ تر اس آیت کے دوسرے حصہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن پہلے حصے کا دوسرے حصے سے موازنہ کرنے کی خاطر آپ کو یہ سمجھانے کے لئے کہ پہلا اندھیرا نفس کا اندھیرا ہے دراصل اور اس اندھیرے کا سوائے اس کے کوئی علاج نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے ورنہ کان سنیں گے اور سننا نہ چاہیں گے۔ سنتے بھی ہوں تو سننا نہیں چاہیں گے۔ آنکھیں دیکھ بھی رہی ہوں آپ دکھائیں وہ دیکھنا نہیں چاہیں گی ایسے شخص کا کیا علاج ہوسکتا ہے سوائے اس کے کہ اللہ اس کے دل میں ایک تغیر پیدا فرما دے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے شرور انفسنا کی دعا سکھا کر، دیکھیں ہم پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے تاکید فرمائی خطبات میں اس کو ہمیشہ بیان کیا انہی آیات کو پڑھا تا کہ ہم اپنے نفس کے شر سے بچتے رہیں اس سے بڑا اور کوئی شر نہیں جو انسان کے اندر سے پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ اس شر سے بچیں تو پھر ہماری آنکھیں کام کریں اور ہمیں دکھائی دینے لگے۔ آمین

ہر اندھیرے کے مقابل ایک نور ہے۔ جب تک یہ اندھیرے موجود رہیں گے نور داخل نہیں ہوگا

(خطبہ جمعہ فرمودہ 15 /مارچ 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کیں:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ
مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ
حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ﴿۴۰﴾ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا
فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ
يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۱﴾ (النور: 40، 41)

پھر فرمایا:

یہ جو دو آیات ہیں ان سے متعلق میں نے گزشتہ خطبے میں یہ بیان کیا تھا کہ ان دونوں کا تعلق دراصل اندھیروں ہی سے ہے اگر چہ پہلی آیت میں بظاہر روشنی کا منظر کھینچا گیا ہے۔ مگر ایسی روشنی جو روشنی کے فائدے سے محروم رکھے بلکہ الٹا اندھیروں والا نقصان پہنچا دے وہ اندھیروں سے بھی بدتر ہے کیونکہ اندھیروں میں تو انسان جانتا ہے کہ میں اندھیرے میں ہوں، ٹٹول کر چلتا ہے، احتیاط سے قدم اٹھاتا ہے، کوشش ضرور کرتا ہے کہ اندھیرے کے نقصان سے بچ سکوں مگر جسے روشنی ہی روشنی دکھائی دے رہی ہو اس کا دھوکہ سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ پس قرآن کریم نے پہلی مثال اس روشنی کی دی ہے جو دراصل اندھیروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اب دیکھنا یہ ہے کہ اس روشنی کی مثال

میں کس قسم کے اندھیرے ہیں۔

ان دونوں آیات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں نفس کے اندھیروں کی طرف زیادہ اشارہ ملتا ہے جو اپنے نفس سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسری آیت میں بیرونی اثرات کے اندھیرے ہیں جو بیرونی عوامل کے نتیجے میں انسان کو نور یا بصیرت سے محروم کر دیتے ہیں۔ مثلاً بادل ہے وہ نفس سے نہیں اٹھتا باہر کی چیز ہے اس کے نیچے بھی ایک اندھیرا ہوتا ہے۔ موج ایک بیرونی چیز ہے جو بادل کے نیچے ہو تو اور بھی اس کا اندھیرا گہرا ہو جائے گا۔ اس کے نیچے ایک اور موج ہو وہ اور بھی زیادہ گہری ہو جائے گی۔ تو اگلی مثال میں تین اندھیرے جو بیان فرمائے وہ تینوں بیرونی محرکات سے یا وجوہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا اندھیرا جو ہے وہ نفس سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ بھی ایک اندھیرا نہیں ہے اس میں بھی کئی اندھیرے ہیں اور قرآن کریم کی ہر آیت پر کوئی نہ کوئی دوسری آیت روشنی ڈال رہی ہے اور اس طرح آیات کے بھی جوڑے جوڑے ہیں۔ پس اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ پہلی آیت کی مثال قرآن کریم میں کس آیت میں ملتی ہے تو اس مضمون پر مزید روشنی پڑ جائے گی اور معین ہو جائے گا کہ کون کون سے خطرات نفس سے وابستہ ہیں جو اٹھ کر اندر سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کو اندھیروں میں غرق کر دیتے ہیں اور انسان سمجھتا یہی ہے کہ میں اچھی چیزوں کی پیروی کر رہا ہوں ۔ دیکھ رہا ہوں اور جو دیکھ رہا ہوں وہ میرے فائدے میں ہے اور اس کے باوجود وہ چیز ضرور اس کے نقصان میں ہوتی ہے۔

یہ مضمون ہے جو اس پہلی آیت میں بیان ہوا ہے۔ ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا ایک ایسے سراب کی سی ہے جو ایک بہت بڑے چٹیل میدان میں واقع ہو، اسے پیاسا پانی سمجھتا ہے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا ہے جہاں سمجھتا تھا کہ پانی ہے اس کی پیاس بجھانے کے لئے کوئی چیز وہاں نہیں ملتی ہاں اس کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے خدا وہاں ملتا ہے جو اس کا حساب چکا دیتا ہے۔ اس سے ملتی جلتی دوسری آیت جس میں ان نفسانی اندھیروں کی تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ

بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿۲۱﴾

(الحدید: 21)

یہ پانی کی بجائے یا سراب کی بجائے ایک اور مثال پیش فرمائی گئی مگر دونوں کا نتیجہ بعینہ وہی نکلتا ہے اور آخری خلاصہ یہ ہے۔ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ دنیا کی زندگی دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس طرح سراب ایک دھوکہ ہے اس میں پیاس بجھانے کی کوئی طاقت نہیں اور زندگی بخشنے کی کوئی طاقت نہیں۔ اسی طرح دنیا کی زندگی کی اور بھی ایسی چیزیں ہیں جو محض ایک دھوکہ ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ ان میں تمہارے لئے بقاء کے سامان ہیں لذتیں ہیں مگر جب تم ان کو پاتے ہو تو اس سے پہلے پہلے خدا تعالیٰ بسا اوقات ان کو ایسا ضائع کر دیتا ہے کہ جو کچھ تمہاری محنتیں ہیں سب اکارت جاتی ہیں۔ جن چیزوں کی تمہیں تلاش تھی وہ وہاں نہیں ملتیں۔ پس وہی مضمون ہے جو سراب والا مضمون ہے مگر اس میں زیادہ تفصیل سے ان اندھیروں کا ذکر فرمایا گیا تا کہ انسان ان کو پہچان لے اور ان سے بچنے کی کوشش کرے۔

دنیا کی زندگی کی مثال ''جان لو'' سے شروع ہوتی ہے آیت اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا جان لو کہ دنیا کی مثال لَعِبٌ وَّلَهْوٌ کھیل اور تماشا، محض ایک کھیل اور دل بہلاوہ ہے۔ یہ ایک جوڑا ہے۔ اصل میں، ایک ہی مضمون سے تعلق رکھنے والا۔ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ اور زینت، سجنا دھجنا اور پھر اس زینت کو ایک دوسرے سے مقابلے کے لئے استعمال کرنا تا کہ تم ایک دوسرے پر فخر کر سکو کہ دیکھو ہماری چیز اتنی خوبصورت اور اس کی ایسی بے کار اور مقابل پر بھدی دکھائی دینے والی۔ یہ دوسری ظلمت ہے جس کا ذکر فرمایا۔ تیسرا ہے وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ تکاثر کے نیچے دو باتیں ہیں جو ایک اور قسم کے اندھیرے سے تعلق رکھتی ہیں اور پہلا جو اندھیرا ہے وہ بھی جوڑے میں بیان فرمایا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ۔

پس دوسری آیت میں جو میں نے پہلے تلاوت کی تھی اس میں بھی تین ظلمات کا ذکر ہے اور

جو اندرونی اندھیرے ہوتے ہیں ان کی بھی دراصل تین ہی قسمیں ہیں۔ تین قسموں کے اندھیرے ہیں جو انسانی نفس سے وابستہ ہیں اس سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کو اس دھوکے میں مبتلا کرتے ہیں اور آخری نتیجہ یہی ہے کہ یہ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کی مثال بیان فرمائی: كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ اس کی مثال ایسی بارش کی سی ہے جو کھیتی اگاتی ہے تو وہ کھیتی کفار کو بہت ہی اچھی معلوم ہوتی ہے ثُمَّ يَهِيْجُ پھر وہ لہلہاتی ہے مگر پھر فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا پھر وہ زرد ہو جاتی ہے ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا پھر وہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔ ہیجان کہتے ہیں لہلہانے کو اور حرکت کو تو يَهِيْجُ کا مطلب ہے وہ خوب نشوونما دکھا کے ہوا کے ساتھ لہلہانے لگتی ہے لیکن بالآخر زرد پڑ جاتی ہے اور يَكُوْنُ حُطَامًا وہ خشک ہو جاتی ہے۔ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے جو اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ دنیا کی ناکامی اور نامرادی جن کاموں میں محنت کی تھی وہ دراصل نیک انجام کو نہ پہنچیں اور انسان کو جو توقعات وابستہ تھیں وہ توقعات پوری نہ ہوں یہ اس کھیتی کی سی مثال ہے جو شروع میں بہت اچھی لگتی ہے مگر بالآخر انجام اس کا ناقص اور خراب ہے۔

فرمایا فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ آخرت میں عذاب شدید بھی ہے مگر وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ مغفرت بھی ہے اور رضوان بھی۔ مغفرت اور رضوان کے لئے کوئی الگ بنیاد قائم نہیں فرمائی، کوئی ایسا مضمون نہیں فرمایا کہ یہ تو عذاب والا مضمون تھا اب مغفرت اور رضوان والا مضمون یہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہی دنیا کی زندگی مغفرت اور رضوان کا موجب بھی بن سکتی ہے اور وہی دنیا کی زندگی سزا اور عذاب کا بھی موجب بن سکتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ جو خدا سے دور ہیں ان کو دنیا کی زندگی فائدہ نہیں پہنچاتی اور بسا اوقات بدانجام مرتے ہیں اور اپنی محنتوں کے لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اگر اسی دنیا کی زندگی ان تین بلاؤں سے محفوظ رکھو جو اندھیروں کی بلائیں ہیں جن کا پہلے ذکر فرما دیا گیا تو پھر وہی دنیا کی زندگی مغفرت کا موجب بھی بن سکتی ہے اور اللہ کے رضوان کا موجب بھی بن سکتی ہے کیونکہ نتیجۃً وہی باتیں بنیادی ایک نتیجہ نکال سکتی تھیں دوسرا بھی نکال سکتی تھیں اس لئے الگ مضمون باندھنے کی بجائے اسی پہلے مضمون کے آخر پر دو نتیجے رکھ دیئے۔ ایک آخرت میں عذاب شدید کا نتیجہ دوسرا مغفرت اور رضوان کا نتیجہ۔

اب آپ اس پر غور کریں تو آپ کو سمجھ آئے گی کہ وہ تمام چیزیں جو انسانی نفس سے تعلق رکھتی ہیں، باہر سے نہیں آئیں۔ جو ہم یہ کہتے ہیں۔

''نعوذ بک من شرور انفسنا ومن سیئٰت اعمالنا''

(سنن ابن ماجه ، كتاب النكاح ،باب خطبة النكاح)

تو اس دعا میں یہی اندھیرے ہیں، یہی برائیاں ہیں جن سے بچنے کے لئے ہم خدا سے التجا کرتے ہیں کہ اے خدا! ہم تیری پناہ میں آتے ہیں۔ من شرور انفسنا ان شرور سے جو ہمارے اندر پھوٹ رہے ہیں اور ان برائیوں سے جو ہمارے اعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ تو دیکھیں بیرونی کوئی چیز نہیں ہے تمام اندھیرے اس آیت سے تعلق رکھنے والے اور اس سے پہلی آیت سے تعلق رکھنے والے نفس کے اندھیرے ہیں اور نفس کے اندھیرے روشنی کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے جو نفس سے اٹھتی ہے وہ خوبصورت بن کے دکھائی دیتی ہے اور انسان پہچان نہیں سکتا کہ یہ ظلمت ہے یا روشنی ہے۔

قرآن کریم میں دنیا کی زندگی کا جو خلاصہ نکالا گیا ہے یہی ہے جس کے دائرے میں دنیا کی زندگی محدود ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تمام دنیا میں جو قوموں کی ایک دوسرے سے برتری کی دوڑ ہو رہی ہے اقتصادی جنگیں ہیں یا سیاسی جنگیں ہیں یا اور معاشرتی مقابلے ہو رہے ہیں ان کا یہ آیت مکمل احاطہ کئے ہوئے ہے کچھ بھی اس سے باہر نہیں۔ پس اس زندگی میں جس کا ہم خصوصیت سے آج کل، اس زمانے میں مشاہدہ کر رہے ہیں اس سے بہتر خلاصہ نکالا جا ہی نہیں سکتا، ہو ہی نہیں سکتا، کوئی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔ پہلا پہلو لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ کھیل کود اور دل بہلاوا جوں جوں یہ زمانہ ہلاکت کی طرف بڑھ رہا ہے لعب اور لہو کو زیادہ اہمیت ہوتی چلی جا رہی ہے اور زندگی کی اہم چیزوں کو نسبتاً کم اہمیت دی جا رہی ہے یہاں تک کہ اکثر دنیا کی امیر قوموں کا پیسہ زیادہ لہو و لعب پر خرچ ہو رہا ہے اور ایک معمولی حصہ ہے جو ان کی روزمرّہ کی زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ جو روزمرّہ کی زندگی کی ضرورتوں پر انسان خرچ کرتا ہے وہ تو بنیادی طور پر اتنا تھوڑا ہے کہ امیر قومیں اگر صرف اسی پہ راضی رہیں تو ان کو سمجھ نہ آئے کہ ہم اس دولت کو کہاں پھینکیں کیونکہ ایک ملک کے اکثر نہیں، تمام انسانوں کی تمام تر ضرورتیں جہاں تک امیر قوموں کا تعلق ہے ان کی کل

آمد کے سوویں حصے سے پوری ہوسکتی ہیں، باقی صرف عیاشی کے ذریعے ہیں عیش و عشرت کے سامان، مکانوں کی دوڑ ، جائیدادوں کی دوڑ۔ مگر پہلے لہو و لعب کی بات کرتے ہیں کھیل تماشہ، تھیٹر، سینما اور عیاشی کے اڈے یہ وہ جگہیں ہیں جہاں پر ملک کی اکثر دولت خرچ کر دی جاتی ہے اور اسی کے مقابلے کے نتیجے میں پھر اندھیروں کے بطن سے اور اندھیرے پیدا ہوتے ہیں، جرائم پھیلتے ہیں اور اکثر جرائم پھیلنے کی وجہ لہو و لعب کی تلاش اور ان کی جستجو ہے اور ان کا منبع، ان کے پیچھے چلنا ہے۔ اکثر آدمی غریب ہیں یعنی دنیا کے اکثر آدمی غریب ہیں امیر ملکوں میں غربت کا معیار بدل جائے گا مگر غریب وہاں بھی ہیں اور اکثر غریب ہی ہیں۔ انگلستان میں بھی اکثر غریب ہیں، امریکہ میں بھی اکثر غریب ہیں جرمنی میں بھی، کوئی دنیا کا ترقی یافتہ ایسا ملک نہیں جہاں آپ یہ کہہ سکیں کہ اکثر امیر ہیں تو اکثریت غریبوں کی ہے اور لہو و لعب کا معیار امیرانہ بن جاتا ہے۔ لہو و لعب میں غریبانہ لہو و لعب کوئی چیز ہی نہیں رہتی جو بھی لہو و لعب ہے وہ امیرانہ ٹھاٹھ ہیں اور وہ ٹیلی ویژن پر دکھائی جاتی ہے وہ اخبارات میں اشتہاروں کے طور پر دی جاتی ہے وہ ریڈیو پر سنائی جاتی ہے کبھی گانوں کی صورت میں، کبھی یہ بتا کر کہ یہ نئی قسم کا ایک البم نکلا ہے تو اس میں فلاں گانے والے حصہ لے رہے ہیں اس پر روپیہ خرچ کرو اور اسی طرح عیش و عشرت کے دوسرے سامان ہیں میوزک کا دلدادہ انسان کو بنا کر ایک قسم کی Drug Adiction پیدا کر دی جاتی ہے اور یہ تمام باتیں لہو و لعب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب دیکھیں پہلا عنوان خدا نے یہ لگایا ہے دنیا کی زندگی تو لہو و لعب ہے اور اگر لہو و لعب کی تم پیروی کرو گے تو تمہیں سوائے ناکامی، نامرادی اور بالآخر تکلیف اٹھانے کے اور کچھ میسر نہیں آسکتا کیونکہ لہو و لعب کی پیروی ہی خود کئی قسم کے جرائم پیدا کرتی ہے اور وہ لوگ جو غریب ہیں ان کا دل بھی تو چاہتا ہے کہ وہ بھی امریکہ کے ہالی وڈ کے طریقے پر ویسی ہی زندگی بسر کریں اور وہ میوزک خریدیں جو دوسرے امیر لوگ خریدتے ہیں ویسے وہ Deck خریدیں جن پر Three Dimensional اثر پیدا کرنے والی میوزک پیدا ہوتی ہے۔ وہ جب یہ چیزیں خرید نہیں سکتے تو پھر چاقو لے کر نکلتے ہیں یا رات کو کسی گھر کے دروازے توڑتے ہیں۔ انہوں نے پیسے تو حاصل کرنے ہیں کیونکہ لہو و لعب کے رسیا بن جاتے ہیں اور پھر لہو و لعب کا رسیا انسان دوسرے انسانوں کی ہمدردی سے دن بدن محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کو لہو و لعب کی عادت پڑ جائے اس کی بلا سے کوئی غریب فاقے مر رہا ہے یا نہیں

مر رہا۔ اپنے ملک کے غریبوں کی اس کو ہوش نہیں رہتی کجا یہ کہ افریقہ کے غریبوں کی فکر کرے یا اور دوسرے دنیا کے فاقہ کشوں کی فکر اس کو لاحق ہو جائے پس سوال ہی اس کا پیدا نہیں ہوتا۔ اپنے گھر کے، اپنے بھائی اور بہن کی ضرورتوں کی فکر سے بھی وہ مستغنیٰ اور آزاد ہو جاتا ہے۔ لہو ولعب کا رسیا تو بعض دفعہ اپنے بچوں کی فکروں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے صرف اپنی فکر لگی رہتی ہے۔ چنانچہ کئی دفعہ بعض خواتین کے ایسے معاملات سامنے آتے ہیں کہ خاوند نے جتنا بھی کمایا وہ اپنے عیش وعشرت پر خرچ کرتا ہے اتنا تھوڑا بیوی بچوں کے لئے بچاتا ہے کہ اس سے ان کی بمشکل روزمرّہ کی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ وہ غریبانہ زندگی بسر کرتے ہیں جب کہ باپ ٹھاٹھ سے رہ رہا ہے۔ ماں سارا دن محنت کرتی ہے اور مرتی ہے گھر میں اور خاوند آتا ہے اور اپنے حکم جتا کر اور کچھ سختیوں کے احکامات دے کر کچھ تھوڑے سے پیسے پکڑائے اور باہر جا کر ہوٹلوں میں کھانا کھاتا، اپنے دوستوں کے ساتھ عیش وعشرت کرتا یا اور لہو ولعب کے سامان ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

تو لہو ولعب ایک بہت ہی اہم چیز ہے جس کا انسانی زندگی کے سدھارنے یا بگاڑنے سے گہرا تعلق ہے اور یہ اندھیرا نفس سے پیدا ہوتا ہے جہاں انسان سمجھتا ہے کہ میرے اس میں مزے ہیں اور لہو ولعب ایسی چیز ہے جو عمر کے ساتھ ساتھ از خود دور ہونے لگتی ہے یعنی لہو ولعب کی تمنا از خود ڈھلنے لگتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک انسان اس دور کو نہ پہنچے سوائے اس کے کہ جوانی میں مر جائے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ایسے بڈھے ملیں گے جن کی گناہوں کی حسرتیں پوری ہی نہیں ہوئیں اور گناہوں کی طاقتیں ختم ہو گئیں۔ چلنے پھرنے کی طاقت باقی نہیں رہی، جوڑ جوڑ دکھنے لگے لیکن گناہوں کی حرص مٹی نہیں۔ غالب نے جس طرح کہا ہے کہ:

دریائے معاصی، تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سرِ دامن بھی، ابھی تر نہ ہوا تھا (دیوان غالب: 83)

عجیب حال ہے میرا گناہوں کا دریا تو اپنے جوش وخروش میں اور لہریں مار مار کے اس تیزی سے بہہ گیا کہ اب وہ خالی برتن رہ گیا ہے دریا کا اس میں کچھ بھی نہیں رہا سب پانی بہہ گیا اور:

میرا سر دامن بھی، ابھی تر نہ ہوا تھا

میرے تو دامن کا کنارہ بھی ابھی پوری طرح نہیں بھیگا تھا جو میری گناہوں کی حسرت ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جتنا میں کر سکا ہوں یا کر سکتا ہوں اور بعینہٖ یہی انسانی زندگی کی صورت ہے۔

حقیقت میں ہر انسان پر سوائے اس کے کہ اللہ اسے بچالے یہی مضمون صادق آتا ہے۔ ہر انسان خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو اس کے گناہوں کی حسرت اس کے گناہوں کی حد سے ہمیشہ آگے بھاگ رہی ہوتی ہے سو قدم آگے چلتی ہے اور تلاش جو ہے وہ پھر بھی جاری ہے پیاس پھر بھی باقی ہے۔ پس عملاً دیکھا جائے تو ہر قدم ہی وہ قدم ہے جہاں خدا تعالیٰ اس کا حساب چکانے کے لئے کھڑا ہے مگر جو اندھا ہو جو نفس کا اندھا ہو وہ بظاہر روشنی میں قدم اٹھا رہا ہے مگر وہ ہر چیز کی حقیقت جاننے سے عاری ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ دیکھے وہ کیا کر رہا ہے اور یہ صلاحیتیں انفرادی طور پہ بھی ظاہر ہو جاتی ہیں قومی طور پہ بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اب بسا اوقات مسائل سامنے آتے ہیں تو میں کہتی ہیں ہمارے ان مسائل کا کیا حل ہے، چوریوں کا کیا حل ہے، ڈاکوؤں کا کیا حل ہے اور وہ جو سکولوں میں داخل ہو رہے ہیں بچے اٹھتے ہیں بغاوت کرتے ہیں اور اپنے پرنسپل کو قتل کر دیتے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں دن بدن یہ باغیانہ رویہ بڑھتا چلا جا رہا ہے وہ یہ سوچتے نہیں کہ جو بنیادی وجوہات ہیں وہ فطرت کے اندر ہیں انسانی فطرت کے اندر ان کی تلاش کرو اور ان کا وہاں علاج کرو جہاں سے وہ سر اٹھا رہی ہیں اور قرآن کریم نے اس تجزیے میں ہر چیز کو کھول دیا ہے کہ تمہارے اندر جو لہو و لعب کی جو جاہلانہ، پاگلوں والی تمنا ہے وہ تمہیں لے ڈوبے گی اور بالآخر تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ دوڑو جتنا مرضی دوڑنا ہے۔ ایک مثال میں فرمایا پیاسے کی طرح تم سراب کی پیروی کر رہے ہو آگے پہنچو گے تو حسرت کے سوا تمہیں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ جو پاگل پن ہیں یہ بھی اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لہو و لعب کی تمنا زیادہ ہو، اسے پانے کی توفیق کم ہو ہر وقت بے چینی میں ایک انسان جلتا رہے وہ نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

ابھی حال ہی میں جو سکاٹ لینڈ میں ایک نہایت دردناک واقعہ ہوا ہے ساری قوم یہ سوچ رہی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک پاگل اتنے معصوم بچوں کو اٹھ کر ذبح کر دے اور قتل کرے۔ گولیوں سے بھون دے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جن کے اوپر شاید کوئی جانور بھی حملہ نہ کرے، بسا اوقات جانور بھی چھوٹے بچوں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ جو شکار کے مضمون پر مستند کتابیں ہیں وہ بتاتی

ہیں کہ شیر اگر بکری کا لیلا وہاں کھڑا رہ جائے اور باقی سارے دوڑنے والے جانور بھاگ چکے ہوں یا ہرن کا بچہ رہ جائے تو اس کھڑے بچے کو شیر کبھی کچھ نہیں کہے گا، بھوکا بھی ہو تو کچھ نہیں کہے گا۔ انسانی فطرت میں خدا تعالیٰ نے یہ بات رکھ دی ہے کہ جو معصوم بے سہارا ہو جس کو اپنے دفاع کی طاقت نہ ہو اس پر جانور بھی رحم کرتے ہیں لیکن اس بدبخت نے کوئی رحم نہیں کیا۔ یہ سوچ رہے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہوئی ہے کیوں ایسا ہوا۔ آؤ ہم ان وجوہات کی تلاش کریں قانون بدلیں فلاں بات کریں فلاں بات کریں۔ مگر جو مرضی قانون بدلیں جب تک قرآن کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق فطرت میں اتر کر جائزہ نہیں لیں گے اس وقت تک ان کو کوئی سمجھ نہیں آئے گی۔ جس معاشرے میں عیش وعشرت کی طرف توجہ دلانے کے لئے تمام ذرائع اختیار کئے جا رہے ہوں اور عیش وعشرت سے منہ پھیرنے کے لئے کوئی ذریعہ اختیار نہ کیا جائے، جہاں کھلی دعوت ہو بے حیائی کی، جہاں لہو ولعب اس طرح پلیں اور پنپیں جیسے ماں کے دودھ پر بچہ پلتا ہے اس قوم میں محرومیاں تو لازمی ہوں گی۔ یہ ناممکن ہے کہ تمنائیں اونچی ہو جائیں اور حصول کی طاقتیں کم ہوں اور محرومیاں پیدا نہ ہوں۔ تمناؤں اور حسرتوں کا ایک طبعی تعلق ہے ایک چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پس یہ حسرتیں ہیں جو پاگل کرتی ہیں لوگوں کو اور یہ حسرتیں کئی قسم کی ہیں۔ کئی ایسی حسرتیں ایسی ہیں جن کا اپنے بچپن کی حسرتوں سے تعلق ہے اور بچپن میں ایک انتقامی جذبہ پیدا ہوا ہے جو دب گیا ہے اُس وقت۔ جب وہ پاگل پن دوبارہ کودا ہے تو بچوں پر ظلم کی صورت میں وہ جذبہ اٹھا ہے اور اس نے وہ بہیمانہ ظلم کیا ہے جو جانور بھی نہیں کرتا۔ تو کہاں کہاں روکیں گے قانون سے، قانون کے ذریعے جرائم کو نہیں روکا جا سکتا قانون کے ذریعے اگر بڑھتے ہوئے، اونچے ہوتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں گے تو بسا اوقات وہ دوسرے رستے نکال لے گا مگر سیلاب روکا نہیں جا سکتا، بند ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسا وقت بھی آیا یہاں کہ جب Drug کو روکنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تو انہوں نے یہ آواز اٹھانی شروع کی کہ اب Drug کو جائز ہی قرار دے دو۔ جھگڑا ہی ختم کرو چنانچہ ایک بندھن ٹوٹتا ہے تو دوسرا بندھن آگے کھڑا کر دیا جاتا ہے وہ بھی ٹوٹ جاتا ہے تو پھر تیسرا۔ مگر جو سیلاب ہیں جو اندر سے قوت سے اٹھتے ہیں ان کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی کیونکہ وہ قوانین قدرت کے تابع اٹھتے ہیں اور قوانین قدرت میں ان کی وجوہات تلاش کرو اور یہ قوانین قدرت کو سمجھنے کے بعد وہاں روک پیدا کرو جہاں ان کے اٹھنے کی جگہ

ہے تب ممکن ہوگا۔ پس یہ وہ جگہ ہے جہاں اس واقعہ کا ذکر قرآن کریم میں ملتا ہے لہو ولعب یا لعب اور لہو، جب ساری سوسائٹی لعب اور لہو کی مریض بن جائے اس میں تو یہ چیزیں از خود ہوں گی کوئی روک سکتا ہی نہیں ہے۔ اب لعب اور لہو جتنا آگے بڑھے گی اتنا ہی کئی قسم کے بھیانک جرم از خود ان کے پیٹ سے پھوٹیں گے۔ بعض جگہ محض لعب ہے جو پاگل پن پیدا کر دیتی ہے، بعض جگہ لہو ہے جو پاگل پیدا کرتی ہے بعض جگہ دونوں مل کر پھر ایک دوسرے کے ساتھ کھیل کھیلتی ہیں اور عجیب وغریب نتیجے نکالتی ہیں۔

اب کرکٹ کا میچ ہوا ہے اور اس کا ایک بخار چڑھا ہوا ہے قوموں کو اور حیرت کی بات ہے لعب ہے صرف لہو نہیں ہے۔ وہ اکیلی لعب، کھیل اور وہ لوگ جن کا کوئی دور سے تعلق ہی نہیں ہے وہ دوسرے ملکوں میں بیٹھے خودکشیاں کر رہے ہیں کہ ٹیم ہار گئی۔ جنہوں نے کبھی کرکٹ کے بلّے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ان کا حال یہ ہے کہ وہ Criticize کر رہے ہیں کہ کیپٹن نے یہ غلطی کی۔ آئیں سہی ہم اس کا سر پھوڑیں گے۔ اب یہ کھیل ہے کہ پاگل پن ہے۔ یہ وہی پاگل پن ہے جس کے اندھیرے کی طرف ذکر فرمایا ہے کہ لعب ولہو کو اگر تم نے کھلی چھٹی دے دی تو جان لو کہ متاع غرور کے سوا یہ کچھ بھی نہیں ہے تم نے ایک دھوکے کی بات کھڑی کر لی ہے تمہارے نفس نے دھوکے کے مزے پیدا کر لئے ہیں ان میں کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔

اب پاکستان جیسا ملک جہاں اسلامی معاشرہ اور اسلامی اقدار کی باتیں ہو رہی ہیں ایک صاحب اٹھے جب پاکستان ہارا ہے تو پہلے ٹیلیویژن کو اپنی گولیوں سے بھون دیا پھر خودکشی کر لی خود گولیاں مار کے۔ پیچھے اس کے بیوی بچے یا جو بھی عزیز تھے ان کو کس قدر دردناک تکلیف میں مبتلا کر گیا اور قوم کا منہ کالا کر گیا لیکن لعب بھی جب سر پہ سوار ہو جائے تو جنون بن جاتی ہے اور جنون ہی اندھیرا ہے بالکل پاگل کر دیتی ہے مخبوط الحواس کر دیتی ہے۔ کھیلوں کی لڑائیوں میں بڑے قتل ہوئے ہیں ہندوستان میں بھی اب۔ اس بناء پر کہ ہندوستان کو سری لنکا نے ہرا دیا سری لنکا کی ایمبیسی پر حملہ ہو گیا۔ اگر حملہ کرنا ہے تو اپنے فارن آفس پر یا اپنے ہوم آفس پہ حملہ کرو تم ہارے ہو۔ سری لنکا کا کیا قصور ہے جس نے تمہیں ہرایا ہے۔ قصور تمہارا ہے تم ہارے ہو لیکن انہوں نے ایک دوسرے کو بھی کاٹا ہے کئی قتل ہوئے ہیں اس غصّے میں آکے اور پاکستان میں ایک نانی نے اپنے نواسے کی ٹانگ توڑ دی

غصّے میں ۔ یہ اندھیرے ہیں اور دکھائی روشنی دے رہی ہے ۔دن دہاڑے کرکٹ کے میچ دیکھے جارہے ہیں، آگیں لگ رہی ہیں،قتل عام ہو رہے ہیں، گندی گالیاں دی جا رہی ہیں،اب ہمارے ملک میں بھی پاگل پن،انڈیا میں بھی پاگل پن دونوں جگہ پاگل پن لیکن لعب کا پاگل پن ہے۔ پاکستان میں یہ پاگل پن کہ اپنے کھلاڑیوں کو گالیاں دے رہے ہیں کہ آؤ تو سہی ہم تمہاری ٹانگیں توڑیں گے،تمہیں قتل کر دیں گے،تم کیوں ہارے ہواور جھوٹے الزام سراسر کہ تم پیسے لے کے ہار گئے ہو۔ یہ الزام اب دیکھیں ایک اندھیرے کی پیداوار ہے اور ایک اندھیرا ہے۔جس قوم میں رشوت ستانی عام ہو جس قوم میں بِک جانا عام بات ہو جس قوم کے ممبرز آف پارلیمنٹ کے متعلق اس گروہ کے آدمی بھی دوسرے گروہ کے آدمی بھی جو خود ممبر پارلیمنٹ ہیں اخباروں میں کھلم کھلا بیان دیں کہ یہ سارے بکاؤ ہیں، ہارس ٹریڈنگ ہو رہی ہے ۔ ہماری ڈیما کریسی اور ہارس ٹریڈنگ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔یعنی گھوڑوں کی منڈی ہے جو زیادہ پیسے دے آ کے وہ گھوڑا خرید کے لے جائے یہ حال ہو جہاں، وہاں اپنے کھلاڑیوں بے چاروں پہ انہوں نے کون سا احسان کرنا تھا۔ساری عمر انہوں نے محنتیں کیں، تکلیفیں اٹھائیں، ورزشیں کیں، ڈسپلن کئے، بال پکڑ پکڑ کے ہاتھ کی انگلیاں توڑیں اور آخر پہ ان کو بدلہ یہ ملا ہے کہ تم ضرور پیسے کھا گئے ہو جو ہار گئے ۔اس پر بعض کھلاڑیوں نے استعفے دے دیئے ہیں ۔ انہوں نے کہا ہماری تو بہ جواب ہم کبھی اپنی قوم کے لئے کھیل گئے ۔ اور لعب کو آپ کچھ سمجھتے ہی نہیں قرآن کریم کہہ رہا ہے بہت بڑی چیز ہے جو قوم لعب کی غلام بن جائے گی وہی پاگل ہو جائے گی ۔ وہ بھی اندھیرے پیدا کرے گی اور جو قوم لہو کی غلام ہو جائے گی وہ تو اور بھی زیادہ پاگل ہو جاتی ہے اور یہ دونوں چیزیں اگر اکٹھی ہو جائیں تو ساری قوم کا دماغ بالکل مختل ہو جاتا ہے وہ اندھیروں میں مبتلا ہوتی ہے جو اس کے نفس سے اٹھ رہے ہیں۔اب یہ دیکھیں یہ مضمون کس طرح سب دنیا کے اوپر کس صفائی کے ساتھ پورا آ رہا ہے مگر دیکھا اس لئے نہیں جاتا کہ نفس کا اندھیرا ہے اور نظر ہی نہیں آتا۔اپنا نفس انسان کو دکھائی نہیں دیتا یہ بھی بڑی مصیبت ہے اور اس کے اندھیرا کہلانے میں ایک یہ بھی حکمت ہے اپنا قصور نظر نہیں آ رہا اپنی آنکھ کا تنکا بھی دکھائی نہیں دیتا جبکہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا شہتیر بن کے دکھائی دے رہا ہے اور ''اپنی آنکھ کا شہتیر'' ۔غلط کہہ گیا اس لئے دماغ میں شہتیر نہیں آتا کہ آنکھ میں شہتیر آ ہی نہیں سکتا۔مگر محاورے میں ہے بہر حال،تو تنکا دماغ میں آیا مگر بہر حال محاورہ

یہ ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر بھی دکھائی نہیں دیتا دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی دکھائی دے دیتا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اندھیرے ہیں جو نفس کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں اور تہہ بہ تہہ اندھیرے ہیں جن کی تقسیم اگر کی جائے تو ایک قسم یہ ہے لعب اور لہو کی۔

تو جہاں قرآن کریم نے اندھیرے بیان فرمائے وہاں ایسے بھی اندھیرے بیان فرمائے جو تمہیں روشنی دکھائی دیتے ہیں بظاہر ان میں کوئی بھی اندھیرے کا پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ بچے بھی کھیلتے ہیں بڑے بھی کھیلتے ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس میں آنکھ کوئی اندھیرا نہیں دیکھتی۔ لیکن قرآن توجہ دلا رہا ہے کہ جہاں بھی تم نے توازن کھو دیا وہاں یہی طبعی حالتیں اندھیروں میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں اس لئے ان اندھیروں سے بچو جو تمہیں اندھیرے دکھائی دیں گے۔ ایک بچہ کھیلتا بھی ہے پڑھتا بھی ہے اس کی اس حالت کو اندھیرا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا کھیلنا اس کی پڑھائی کو طاقت بخشتا ہے اور اس کی صحت کو بحال رکھتا ہے اور بسا اوقات وہ دونوں میدانوں میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور زیادہ تسکین پاتا ہے۔ ایک بچہ ہے جو پڑھائی کی قربانی دے کر کھیل میں وقت ضائع کر دیتا ہے۔ ایک بڑا ہے جو عیش و عشرت کی خاطر اپنی زندگی کے فرائض سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اب ان دونوں قسموں کی مثالیں دراصل اندھیروں میں پلنے والوں کی سی ہیں مگر اگر دنیا کی لذّتیں اس حد تک رکھی جائیں جس حد تک فرائض پر اثر انداز نہ ہوں تو اس صورت میں اس بچے کی طرح جو کھیلتا بھی ہے اور پڑھتا بھی ہے ایک انسان جائز حد تک اپنی خواہشات کو بھی پورا کر لے جو طبعی ہیں مگر خدا تعالیٰ کے فرمان کی حدود کو نہ پھلانگے تو یہی دو چیزیں جو ایک جگہ ہلاکت کا موجب بنتی ہیں ایک جگہ مغفرت اور رضا کا موجب بن جاتی ہیں۔

متناسب کھیل، متناسب پڑھائی اور دونوں کے درمیان توازن رکھنا دنیا کی نعمتیں بھی عطا کرتا ہے اور دین کی نعمتیں بھی عطا کرتا ہے اگر انسان دین دار ہو، تو کھیل کی کامیابیاں بھی بخشتا ہے اور علم کی کامیابیاں بھی بخشتا ہے۔ تو مغفرت اور رضا کا یہ تعلق ہے ان باتوں سے کہ لعب تو وہی رہے گی لہو بھی وہی ہوگی لیکن کسی حد تک اگر خدا کی رضا کے تابع تم لعب سے بھی تعلق رکھو گے اور لہو سے بھی تعلق رکھو گے تو وہ بدی والی لہو نہیں رہے گی، وہ بدی والی لعب نہیں رہے گی۔ چنانچہ قرآن کریم نے انسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے، ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے ایک جائز طریق بھی بیان

فرما دیا ہے۔اس جائز طریق کی حدود میں رہ کر وہ باتیں جو دوسری طرح لہو دکھائی دیں گی وہاں لہو نہیں رہتیں ۔میاں بیوی کے تعلقات ہیں، دوسرے اور ایسے سیر گاہوں پہ جانا ہے، تفریحات سے استفادہ کرنا ہے، کھیلنا ہے، یہ سب چیزیں وہی ہیں جن کا انسانی فطرت کے طبعی تقاضوں سے تعلق ہے اور خدا تعالیٰ نے ہر جگہ ان کی محدود اجازت دے کر یہ نہیں فرمایا کہ تمہیں ہم نے یہ طاقت بخشی تو ہے مگر اس طاقت سے فائدہ نہیں اٹھانا، فرمایا طاقت تو بخشی ہے مگر اس حد تک فائدہ اٹھانا ہے اس سے آگے نہیں جانا۔ یہ بات لوگ بھول جاتے ہیں کہ جس حد تک خدا نے فائدے کی اجازت فرمائی ہے لذّت وہیں ختم ہو جاتی ہے، پوری لذّت زیادہ سے زیادہ وہیں تسکین پاتی ہے اس سے آگے بڑھیں تو پھر وہی لذّت اور وہی تسکین تکلیف کا سامان بن جاتی ہے۔ مثلاً کھانے کے متعلق فرمایا كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف:32) کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرنا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کھانا کھانے کا صحیح طریق یہ ہے کہ ابھی بھوک ہو تو ہاتھ کھینچ لو۔ اب لذّت ایسے شخص کو بھی ملتی ہے مگر ایسے شخص کی لذّت نقصان سے پاک ہے۔ اس لذّت کے بعد کوئی بدی اس کی لذّت میں رخنہ نہیں ڈالتی۔ مگر وہ شخص جو ہاتھ نہیں کھینچتا وہ سمجھتا ہے میں زیادہ لذّت اٹھا رہا ہوں۔ وہ کھاتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پیٹ تن جاتا ہے اور اس وقت جبکہ جس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا وہ آرام کی نیند سویا ہوا ہے، مزے لے رہا ہے، کھانے کا مزہ بھی باقی ہے، اس کے بعد جو غنودگی ہے اس نے بھی لطف دیا ایک سایہ تسکین کا پیدا ہوا اور کوئی تکلیف نہیں اور جو لگتا تھا کہ بھوک رہ گئی ہے بھوک خود بخود مٹ جاتی ہے کیونکہ اس بات کو ڈاکٹر جانتے ہیں کہ انسان جب بھوک مٹائے تو اصل میں ضرورت سے زیادہ کھا چکا ہوتا ہے ابھی بھوک کچھ باقی ہو اور چھوڑ دے تو تھوڑی دیر میں ہی وہ کھانا میٹھے میں تبدیل ہو کر خون میں گھلنے لگتا ہے تو بھوک مٹا دیتا ہے اور جتنا کھانا وہ بھوک مٹانے کے لئے کافی ہے وہ بھوک مٹنے سے پہلے کافی ہوتا ہے۔ جب مٹتی ہے بھوک اس وقت ضرورت سے زیادہ کھایا جاتا ہے تو دیکھیں جو قرآن کریم نے فرمایا اور حدیث نے جس پر روشنی ڈالی وہی مضمون ہے جس میں تسکین بھی ہے اور لذّت بھی ہے۔

تو اللہ تعالیٰ آپ کو لذّتوں سے محروم نہیں کرتا۔ یہ فرماتا ہے کہ اگر ہمارے کہنے میں آؤ ہماری ہدایت کے مطابق لذّتوں کی پیروی کرو تو ان میں کوئی بھی نقصان کا پہلو نہیں ہوگا۔ کوئی حسرتیں اس کے بعد تمہارا دامن نہیں پکڑیں گی۔ اگر تم خود بخود بھاگے پھرو گے تو لذّت ایک حد کے بعد حاصل ہونا

ایسے ہی بند ہو جاتی ہے۔ جو لوگ بھوک کے ساتھ کھانا کھانے کا مزہ جانتے ہیں ان کو پتہ ہے جوں جوں بھوک مٹنے کے قریب پہنچ رہے ہوتے ہیں وہی کھانا جو پہلے بہت مزیدار لگ رہا تھا آہستہ آہستہ کم مزیدار ہوتا چلا جاتا ہے اور آخری لقمے جو وہ لوگ زبردستی زہر مار کرتے ہیں۔ ان میں مزہ وزہ کوئی خاص نہیں ہوتا صرف ایک لالچ ہی ہے۔ بھوک ہی میں مزہ ہے طلب میں مزہ ہے طلب نہ رہے تو مزہ بھی مٹ جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے طلب بھی پیدا فرمائی ہے اور مزے لوٹنے کا Scientific طریق بھی بیان فرمایا ہے۔ فرمایا اس کی حد کے اندر رہنا ورنہ نہ مزہ رہے گا نہ تسکین رہے گی اور مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد جو اس کے عوارض ہیں وہ جھیلتے جھیلتے عمر کٹ جائے گی۔ چنانچہ جتنے بھی عیاشی کے ذریعے ہیں ان سب سے عوارض کا تعلق ہے، جو ویسے گناہ نہیں کرتا مگر کھانے میں بے اعتدالیاں کرتے ہیں ان کے اپنے عوارض کا اک پورا سیٹ ہے۔ ایک فہرست میں بیان کئے جاسکتے ہیں کہ یہ کھاؤ پیئو لوگوں کے عوارض ہیں اور وہ تھوڑی سی زندگی عیش کر گئے، باقی زندگی کھانا سامنے ہے دکھائی دے رہا ہے کھایا ہی نہیں جاتا۔ کسی کو شوگر لگ گئی ہے کسی کو اور مصیبت واقع ہوگئی آنکھوں کے سامنے ہے اور کچھ نہیں حاصل کر سکتے کہ نہیں چلو جی منہ میں طاقت نہیں ہے۔ کہتے ہیں ہم تو دودھ پینے سے بھی گئے۔ ہم تو روٹی چکھنے سے بھی محروم ہو گئے تو پہلے حرکتیں کیوں کی تھیں۔ تو جتنی لذّت مقدر ہے اس سے آپ ویسے بھی نہیں بچ سکتے جو مرضی کرلیں۔ پنجابی میں خوب کہا ہے کہ اس کے ''دانے مُک گئے'' وہ پنجابی محاورہ ہے وہ ختم ہو گیا ہے اس کے دانے مک گئے ہر انسان کے دانے مقرر ہیں اس سے زیادہ کھا ہی نہیں سکتا جو جلدی کھالے گا اس کی باقی عمر کم کھانے پہ مجبور کرے گی اس کو اور زیادہ توفیق ہی نہیں ہوگی تو یہ بھی بے وقوفوں والی بات ہے کہ ہم بے پناہ، بے حد لذّت حاصل کر سکتے ہیں ہم تو محض مجبور لوگ ہیں جتنے خدا نے تقدیر میں مزے لکھے ہیں اس سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ جب بڑھیں گے تو اول تو وہ مزے کر کرے سے ہوں گے اور دوسرے وہ سزا دیں گے پھر۔ پھر چوری کے مزے ہوں گے اور چوری کی سزا ملے گی۔ ڈاکے کے مزے ہوں گے تو ڈاکے کی سزا ملے گی۔ پس ہر قسم کے گناہ گار اپنے گناہوں کی شامت اعمال اس دنیا میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ کھیتیاں ان کے سامنے زرد ہو جاتی ہیں ان میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور حسرتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ کچھ حاصل ہو مگر کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کی بجائے وہ

کیوں نہیں کرتے کہ جس کے نتیجے میں مزے بھی زیادہ اور پھر مغفرت بھی ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا مضمون اس تھوڑی سی بھوک سے تعلق رکھتا ہے جو آپ نے خدا کے حکم کے تابع برداشت کی اور آپ سمجھتے ہیں کہ بھوک برداشت ہوئی فوراً پتہا چل گیا اس کے بعد کہ یہ تو یونہی دھوکہ تھا۔اصل میں تو کچھ بھی نہیں تھا مجھے تو جتنا کھانا تھا سب مل گیا ہے مزہ بھی پورا ہو گیا ہے بعد کی تسکین بھی مل گئی لیکن وہ تھوڑا سا ٹکڑا ایک آزمائش کا ہلکا سا دور، چونکہ رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں اختیار کیا گیا،طوعی طور پر اختیار کیا گیا تو اس کے نتیجے میں پھر لامتناہی مغفرت کا مضمون ہے جو آئندہ دنیا میں پیش آئے گا پھر مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ تو بدیوں کو چھوڑنا اور نیکیوں کی حدود میں محدود رہنا بظاہر ایک قربانی ہے اور بظاہر حد بندی ہے لیکن اگر اس میں رہنے کی عادت ڈالو پھر آنکھیں کھلتی ہیں اور سمجھ آتی ہے کہ کتنی مصیبتوں سے نجات ملی ہے اور نفس کے اندھیرے سے بڑا اور کوئی اندھیرا نہیں کیونکہ انسان سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مجھے اس میں فائدہ ہے اور فائدہ وائدہ کچھ نہیں۔

دوسرا پہلو بیان یہ فرمار ہے ہیں وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ زینت اور تفاخر کا جو مزہ ہے اس کے مقابل پر محض ایک تصور ہے اور ٹھوس چیز نہیں ہے۔کھیل بھی ایک ٹھوس چیز ہے جس کا بدن سے تعلق ہے انسان کچھ لذّت پاتا بھی ہے پھر کچھ نہیں بھی پاتا۔لہو کا بھی یہی حال ہے کچھ لذّت تو پاتا ہے پھر بعد میں کچھ محروم بھی ہو جاتے ہیں بعد میں وہی لذّت سزا بھی بن جاتی ہے۔مگر زینت جو ہے وہ صرف دکھاوا ہے یعنی وہ زینت مراد نہیں جس کو قرآن کریم زینت قرار دے رہا ہے۔یہاں منفی معنوں میں زینت کا ذکر پہلے آئے گا جس کو ہم اندھیرا کہتے ہیں وہ زینت ہے کہ صرف دکھاوے کا ہی شوق ہے اور یہ زینت بھی اپنے اندر بڑے اندھیرے رکھتی ہے کیونکہ اس زینت کے ساتھ تفاخر بھی وابستہ ہے۔بعض زینتیں ہیں جو انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں۔ایک انسان کو اچھا پہننے کا شوق ہے،خوبصورت بننے کا شوق ہے وہ اچھے کپڑوں پر خرچ کردے گا اور کچھ کریمیں لگائے گا، چاہے رنگ سفید ہو یا نہ ہو مگر کوشش تو ضرور کرے گا کہ کچھ رنگ میں، سیاہی میں کمی واقع ہو جائے گی۔یہ جو کوششیں ہیں زینت کی یہ نسبتاً معصوم ہیں۔اپنی ذات میں بے چارہ کرتا رہتا ہے کسی کو اچھا لگے نہ لگے کم سے کم اپنے آپ کو تو اچھا لگتا ہے مگر جو تفاخر ہے وہ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور اصل ہلاکت جو ہے وہ تفاخر میں ہے۔

تفاخر کا مطلب یہ ہے کہ زینت اس غرض سے کی جائے کہ دنیا کو دکھایا جائے اور اپنے بھائیوں کو یا بہنوں کو نیچا دکھایا جائے۔ دنیا کو یہ بتایا جائے کہ ہم زیادہ رکھتے ہیں اور دل میں یہ شوق ہو کہ ہمارا بھائی یا ہماری بہن ہم سے نیچے اور چھوٹے دکھائی دیں اور اس مقابلے کا مزہ ہم دیکھیں کہ ہم اونچے ہو گئے۔ یہ زینت کے پاگلوں والے شوق کا طبعی نتیجہ ہے ورنہ انبیاءؑ بھی زینت کا خیال رکھتے ہیں اور قرآن کریم فرماتا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف:33) کون ہے جس نے اللہ کی زینت کو حرام کر دیا ہے وہ زینتیں یا وہ طیبات جو رزق سے پیدا کیے گئے ہیں۔ کون ہے جس نے حرام کیا ہے۔ یہ تو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور دوسروں کے لئے بھی وہ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر آخرت میں ان زینتوں سے، ان طیبات سے دوسرے محروم رہ جائیں گے اور خدا کے نیک بندے یہاں بھی فائدہ اٹھائیں گے وہاں بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

تو زینت کی بھی دو قسمیں ہیں جیسے لَعِبٌ وَّلَهْوٌ کے متعلق میں نے بیان کیا ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں زینت میں ایک زینت ہے جو انسان اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صفائی کو پسند فرماتا ہے، نزاکت کو پسند فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے صاف ستھرے، اچھے ہو کر نکلیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ بھی اپنی زینت کا خیال رکھتے تھے اس زینت میں کوئی اندھیرا نہیں ہے کیونکہ یہ نفس سے نہیں پیدا ہوئی یہ تعلق باللہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ خدا کی رضا کے تابع رہنے کے نتیجے میں اس طرف دیکھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اور زینت کا دیکھنے سے تعلق ضرور ہے ورنہ اپنی ذات میں زینت کوئی چیز نہیں۔ اندھیرے میں بیٹھا ہوا کسی کی بلا سے، وہ اچھا دکھائی دے رہا ہے یا برا دکھائی دے رہا ہے، دکھائی ہی نہیں دے رہا اس کو اس سے کیا غرض۔ عورتیں جو گھر میں بیٹھی ہوتی ہیں پتا نہیں ہوتا کہ کوئی آئے گا تو اپنے حال میں اسی طرح رہتی ہیں گندی، یعنی سب نہیں بعض، کوئی اچانک مہمان آجائے پھر دیکھیں کس طرح دوڑتی ہیں وہ چادر ڈھونڈنے کیلئے غسل خانے میں جائیں گی وہ منہ پہ چھینٹے ماریں گی صاف ستھری ہو کر نکلنے کی کوشش کریں گی تو زینت کا دیکھنے سے تعلق ہے۔ خدا کے پاک بندے انبیاءؑ بھی زینت کرتے ہیں مگر اللہ دیکھ رہا ہے اس لئے زینت کرتے ہیں اور اسی لئے اصل زینت تقویٰ بن گئی۔ فرمایا خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ

كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف:32) ہر مسجد میں اپنی زینت لے کے جایا کرو اور زینت کی تعریف اس آیت میں دراصل تقویٰ کی تعریف ہے تو زینت کا تعلق ظاہری زینت سے بھی ہے وہ بھی خدا کی خاطر ہوسکتی ہے، باطنی زینت سے بھی ہے وہ بھی خدا کی خاطر ہوسکتی ہیں اور یہاں زینت حرام نہیں بلکہ مغفرت اور رضا کا نتیجہ پیدا کرنے والی زینت ہے لیکن وہ زینت جس کا دنیا کی آنکھ سے تعلق ہے وہ بھی دیکھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوگی اگر وہ پیدا ہوگی تو ضرور تفاخر میں تبدیل ہوگی اور جو تقویٰ کی سچی زینت ہے وہ تفاخر میں تبدیل نہیں ہوسکتی اس کے قدم وہیں رک جاتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان غیر معمولی انعامات کا ذکر فرمایا جو آپ کی زینت تقوی کے نتیجے میں آپ کو حاصل ہوئے اور ہر بار جب ایک انعام کا ذکر فرماتے تھے تو فرماتے تھے و لا فخر، و لا فخر۔ مجھے خدا نے تم سب پر فضیلت دے دی ہے تمام انبیاءؑ پر فضیلت دے دی ہے اولین پر دے دی ہے آخرین پر دے دی ہے و لا فخر کوئی فخر نہیں اس کے باوجود میں تم سے بڑا بننے کی تمنا ہی نہیں رکھتا نہ اس بات کو بیان کر کے تمہارے دل جلانا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ یونسؑ ابن متی پر بھی جب کسی اُن کے ماننے والے نے آنحضرت ﷺ کے فضیلت دیئے جانے کو پسند نہیں کیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابیؓ کو روک دیا جس نے یہ کہا تھا۔ ایک صحابیؓ نے یونسؑ ابن متی کے مرید اُن کے ماننے والوں پر رسول اللہ ﷺ کی فضیلت کا ذکر فرمایا کہ تمہارے نبی سے ہمارا نبی زیادہ افضل ہے۔ اس کو تکلیف پہنچی۔ یہ جھگڑا جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے فرمایا لاتفضلو نبی علی یونس ابن متی۔

مجھے یونسؑ ابن متی پر کوئی فضیلت نہ دو۔ یہ مراد نہیں ہے کہ مجھے فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت تو اللہ نے دے دی ہے۔ خود ذکر بھی فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں و لا فخر پس اس حدیث کا حل لا فخر کے اندر ہے کہ مجھے فخر کی عادت نہیں ہے۔ فخر سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے اور مومن کی زینت کا دوسروں سے تکلیف پہنچانے سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ پس تم مجھے فضیلت نہ دو وہاں جہاں یہ فخر کے طور پر دوسروں کو تکلیف دے رہی ہو اور اگر گہری نظر سے مطالعہ کریں تو جب قومیں آپس میں اپنے اپنے انبیاءؑ کے مقابلے کرتی ہیں تو بنیادی طور پر فخر کی خواہش ہی ہے جو ان مقابلوں پر ان کو آمادہ کرتی ہے محض اپنے رسولؐ کی محبت نہیں ہوتی۔ بسا اوقات دوسرے کو نیچا دکھانا ہے یہ مضمون ہے جس کے نتیجے میں اپنوں کا ذکر مبالغہ آمیزی کے ساتھ اور دوسروں کی خوبیوں کو گھٹا کے

دکھایا جاتا ہے۔

پس زینت کا بھی تفاخر سے تعلق ہے اور وہ زینت جو دنیا کی زینت ہے اس کے پیٹ سے ضرور تفاخر کا بچہ پیدا ہوگا۔ اگر وہ ہوگا تو بڑی بڑی جہالتیں اس سے پیدا ہوں گی۔ اب لہو ولعب میں بھی ایک تفاخر ہے روزمرہ کی زندگی کے ایسے کاموں میں جن کا ہر انسان سے تعلق ہے ان میں بھی تفاخر بے وجہ آ کر زندگی کو کرکرا کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیں ہمارے زمینداروں میں شادی کے موقع پر جو دکھاوے کا شوق ہے کتنی مصیبتیں ہیں اس کے نتیجے میں، کتنے گھر برباد ہوتے ہیں اور اتنے اس کے بد اثرات ہیں ہر طرف کہ بعض دفعہ وہ اس بیٹی کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے جس کو بیاہا جاتا ہے۔ اگر اس کے ماں باپ نے جہیز اتنا نہیں دیا جو خاوند کے گھر والوں کی توقع تھی تو وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ ہمیں جہیز کیوں کم دیا ہے وہ کہتے ہیں ہماری ناک کٹوا دی۔ ہم ایسی گھر میں بیاہ کے لائے یہ فقیرنی کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا، جہیز کیا ساتھ آیا تھا جو ہماری عزت سوسائٹی میں ہوتی اور جو اس ڈر کے مارے پھر بیٹیوں کو دیتے ہیں وہ اپنی عزتوں کی ناک کاٹ کر دیتے ہیں منتیں کرتے ہیں، قرضے مانگتے ہیں ایسے قرضے لے لیتے ہیں جو واپس کر ہی نہیں سکتے اور ساری عمر ان قرضوں کے بوجھ کے نیچے خود بھی دبتے ہیں اور اپنی عزتیں بھی برباد کراتے ہیں۔ قرض خواہ تو پھر کوئی عزت نہیں کرتا کسی کی۔ عدالتوں میں گھسیٹے جاتے ہیں گھروں کی قرقیاں بھی ہو جاتی ہیں بعض لوگوں کی، مگر تفاخر کے نتیجہ میں جو اخراجات ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جو بنیادی ضرورتوں سے بالکل بے تعلق ہیں مگر اس کا نمبر دوسرا ہے۔ پہلا جو تعلق ہے لعب ولہو ان کا ایک حصہ بنیادی ضرورتوں میں داخل ہے مگر تفاخر جو ہے اس کا کوئی جواز نہیں۔ تفاخر کی خاطر قرض اٹھانے، تفاخر کی خاطر اپنی حیثیت سے بڑھ کر چھلانگ لگانا یہ ایک ایسی مصیبت ہے جو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اس کے نتیجے میں گناہ بھی پیدا ہوتے ہیں اور معاشرہ دکھوں سے بھر جاتا ہے۔ ایسے خاندانوں کے جھگڑے، لڑائیاں، آگے ساس بہو کی آپس کی ایک دوسرے سے بد زبانیاں یہی نہیں بہت سے ایسے مسائل ہیں جو سوسائٹی کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور یہ نفس کے اندھیرے ہیں باہر سے کہیں سے نہیں آئے۔

تیسرا جو ہے ذکر وہ فرمایا ہے۔ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ لیکن چونکہ اب وقت ختم ہو گیا ہے میں انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ خطبے میں یہاں سے پھر مضمون کو لوں گا۔ ابھی بہت سا ایسا

مضمون ہے جس کا اندھیروں سے تعلق ہے اب ان کی نشاندہی کر کے آپ کو دکھانا ہے کہ یہ یہ اندھیرے ہیں جب تک یہ رہیں گے نور داخل نہیں ہوگا اور ہر اندھیرے سے تعلق رکھنے والا ایک متقابل نور ہے وہ بد بخت اندھیرا دل سے نکالیں گے تو پھر نور وہاں قدم رکھے گا اور پھر جب قدم رکھے گا حقیقت میں اور وہ اندھیرا نہیں رہا ہوگا تو پھر وہ نور نہیں مٹ سکتا۔ میں نے آپ سے یہ بھی بات کی تھی کہ جب نور طاقتور ہے تو اس کے آنے کے بعد اندھیرے واپس کیوں آتے ہیں وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کا ابھی اندھیرا نہیں مٹا ہوتا تو اللہ اپنی رحمت سے کچھ نور کا حصہ مزے کے طور پر دے دیتا ہے۔ نفس کا اندھیرا باقی رہتا ہے ابھی، پھر انسان اس کی پرورش شروع کر دیتا ہے اور نور کی ناقدری کرتا ہے تو نور از خود نکلتا ہے اندھیرے سے ہٹتا نہیں ہے۔ وہ شخص جس کا ظرف اندھیرے رکھتا ہے وہ شخص ہار جاتا ہے۔ نور کو تو وہ خود پھر کہتا ہے کہ بھئی میرا پیچھا چھوڑ و اب اور نور زبردستی نہیں ملتا۔ نور تو عطا ہے۔ اگر کوئی شخص مستحق ہے اور قدر دان ہے تو اس کے پاس رہے گا ورنہ نہیں۔ اندھیرے کو فی ذاتہٖ نور کے اوپر غالب آنے کی توفیق نہیں ہے ہاں وہ مالک جس نے کچھ اندھیرے سے حصہ پایا ہے، کچھ روشنی سے حصہ پایا ہے اس کا اپنا رجحان، اس کا اپنا طرز عمل ہے جو یہ فیصلہ کرے گا کہ بالآخر نور باقی رہے گا یا ظلمت باقی رہ جائے گی۔ مگر یہ بھی ایک نسبتاً زیادہ تفصیل کا محتاج مضمون ہے۔ اب میں اس خطبے کو ختم کرتا ہوں اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے اندھیروں سے ہمیں پاک و صاف کر دے اور ہر اندھیرے کے بدلے وہ نور عطا فرمائے جو آکر ٹھہر جانے والا، بس جانے والا ہو اور پھر ہمیں کبھی نہ چھوڑے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کی عزت، رفعت، غیرت برداشت نہیں کرتی کہ وہاں اپنے نور کو زبردستی ٹھونس دے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 22/مارچ 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (النور:40)

پھر فرمایا:

سورۃ النور کی اس آیت کے حوالے سے میں نے اس آیت کو اس سے مشابہ ایک دوسری آیت کی مدد سے حل کیا اور ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ خطبے کا وقت ختم ہو گیا۔ دوسری آیت جو اس آیت کے مضمون کے بالکل مشابہ ہے اور اس تفصیل کو بیان فرما رہی ہے جس کا مجملاً یہاں ذکر موجود ہے کہ ایک ایسا انسان جو سراب کی پیروی کرتا ہے اسے بالآخر کچھ بھی نہیں ملتا سوائے اس کے کہ اپنے اعمال کی جزا کو اس وقت پاتا ہے جب کہ اس کی طلب، اس کی پیاس کی شدت اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہوتی ہے اور سوائے محرومی کے اور سزا کے کچھ بھی اس کے حصے میں نہیں آتا۔ یہ روشنی کا اندھیرا ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا کہ اسے ہم روشنیوں کے اندھیرے کہہ سکتے ہیں یعنی ایسا سفر جو بظاہر روشنی میں ہو، سفر کرنے والا یہ سمجھتا ہو کہ روشنی ہے مگر فی الحقیقت وہ اندھیرا ہی ہو، نتیجہ وہی ہو جو اندھیرا پیدا کرتا ہے۔

پس ایک انسان جب کسی چیز کو پانی سمجھ کر اس کی پیروی کرتا ہے تو بظاہر دیکھ رہا ہے مگر جب اس مقصد کو پاتا ہے جسے وہ اپنا مطلوب بنا کر اس کے پیچھے چلتا ہے تو اس وقت اس کو سمجھ آتی ہے کہ وہ

دھوکہ ہی تھا۔اسی لئے قرآن کریم نے آخر پر یہ رکھا۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ کہ دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، محض دھوکے کی پیروی ہے۔ پس روشنی کا دھوکہ سب سے خطرناک دھوکہ ہے اور اس کی بھی تین منازل ہیں یا تین اس کی قسمیں ہیں جس طرح دوسرے اندھیرے کی جو بعد کی آیت میں بیان ہوا ہے تین قسمیں بیان فرمائی گئی ہیں اور اس اندھیرے میں بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو ظلمات کے اندر چلنے والے کا حاصل ہے یعنی ٹھوکریں کھانا، رستے سے ہٹ جانا، تباہی کے گڑھے میں جا پڑنا، ہر قسم کے خطرات درپیش ہوں لیکن معلوم نہ ہو کہ وہ خطرات ہیں کیا۔ یہی نتیجہ ہے روشنی کے اس سفر کا جو غرور کے نتیجے میں ہو، دھوکے کے نتیجے میں ہو اور یہ اندھیرا ایسا ہے جو نفس سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی مضمون تھا جو میں نے آپ کو پچھلی دفعہ سمجھایا کہ ان تمام قسم کے اندھیروں کا جن کا اس آیت میں ذکر موجود ہے من شرور انفسنا سے تعلق ہے۔ تب ہی خدا نے ہمیں یہ دعا سکھائی کہ اے خدا ہمیں اپنے نفس کے شرور سے بچا کیونکہ اپنے نفس کا شر انسان کو دکھائی نہیں دیتا۔ سب سے زیادہ مخفی حملہ کرنے والا شیطان نفس کا شیطان ہے اور یہی شیطان غرور بھی کہلاتا ہے یعنی سب سے بڑا دھوکے باز اور اس کے پیدا کردہ اندھیروں کو خدا تعالیٰ نے غرور فرمایا یعنی دھوکے محض دھوکے، اس کے سوا ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

اب اس دوسری آیت کے حوالے سے جیسا کہ میں نے بیان کیا یہ مضمون کھل رہا ہے اور دوبارہ اب میں اسی مضمون کو پھر لیتا ہوں کیوں کہ لعب اور لہو کا ایک ترجمہ تو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیا اور کچھ اس پر روشنی ڈالی مگر اسی آیت پر قرآن کریم دوسری جگہ مزید روشنی ڈالتا ہے۔ لعب اور لہو کا دھوکہ کیا ہے۔ یہ کن کن منازل سے گزر کر کہاں تک پہنچاتے ہیں۔ پس ظلمات ثلاث ان اندھیروں کے اندر بھی تہہ بہ تہہ موجود ہیں۔ کہنے کو تو تین اندھیرے ہیں مگر آگے ان کی قسمیں اور پھر ہر قسم کے اندھیرے میں تہہ بہ تہہ اندھیروں کا وجود ملتا ہے اور قرآن کریم ان کے اوپر سے پردے اٹھاتا اور ایک ایک چیز کھول کر دکھا دیتا ہے تا کہ پھر ٹھوکر کھانے والے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے کہ میں نے لاعلمی میں ٹھوکر کھائی۔ پس اندھیروں کو بھی خدا دکھا رہا ہے یہ دیکھو یہ اندھیرے ہیں ان سے بچ کر گزرنا ہے۔

لعب اور لہو، کھیل اور تماشہ بظاہر دیکھنے میں معصوم سی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ بچے بھی کھیلتے ہیں، بڑے بھی کھیلتے ہیں اور تماشے بھی دیکھتے ہیں بسا اوقات ایسے تماشے انبیاءؑ بھی دیکھ لیتے ہیں اور

تماشہ اپنی ذات میں کوئی بری بات نہیں ہے۔ کھیل اپنی ذات میں کوئی بری چیز نہیں، انبیاءؑ بھی کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ پہلی منزل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے دائرے کے اندر رہنے والی منزل ہے۔ اندھیرا تب بنتا ہے جب اس رضا کی منزل سے انسان اگلی منزل میں قدم رکھتا ہے اور لعب بھی اور لہو بھی یہ دونوں انسان کو بعض دفعہ انتہائی گناہ میں مبتلا کر دیتے ہیں، ایسے گناہ جسے خدا تعالیٰ شرک قرار دیتا ہے جو ظلم کی انتہائی صورت ہے یعنی اندھیروں کی آخری شکل شرک ہے اور قرآن کریم سے ثابت ہے کہ یہ دونوں باتیں انسان کو اس آخری شکل تک بھی پہنچا دیتی ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ میں تو معمولی کھیل کود اور تماشوں میں مصروف ہوں اس میں کون سا گناہ ہے مگر جب یہ دونوں باتیں خدا کی رضا سے باہر قدم رکھتی ہیں تو پھر ایسے ظلمات میں تبدیل ہو جاتی ہیں جن کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ بالآخر انسان کی کامل ہلاکت تک اسے پہنچا دیتی ہے۔ اس تعلق میں جو آیات میں نے سامنے رکھی ہیں ان کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھنے سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ لعب اور لہو روزمرّہ کی عام زندگی میں بھی گناہ کی شکل اختیار کرنے لگتی ہیں اور اکثر ہمیں دکھائی نہیں دیتا اور لازم ہے کہ آپ اپنے ماحول پر یہ نظر رکھیں کہ لعب کو اپنی حدود کے اندر رکھیں، لہو کو اپنی حدود کے اندر رکھیں اور اپنی اولاد کو ان حدود سے تجاوز نہ کرنے دیں۔ اس سے پہلے جو عبادات کے سلسلے میں میں نے خطبے دیئے تھے ان میں یہ بات کھولی تھی کہ مثلاً ایک انسان معصومانہ کھیل میں مصروف ہے، بچے ہیں وہ مصروف ہیں، بڑے ہیں وہ کوئی کھیل دیکھ رہے ہیں مثلاً کرکٹ کا کھیل جو گزرا ہے اور اسی قسم کے ٹینس کا زمانہ آتا ہے تو ٹینس میں مصروف ہو جاتے ہیں Boxings ہو رہی ہیں تو باکسنگ کے تماشے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو کھیل نہیں سکتے وہ کھیلتا دیکھ تو لیتے ہیں اور یہ ان کی کھیل ہے۔ مگر ادھر عین اس وقت جب کہ کوئی میچ اپنے انتہا کو پہنچا ہوا ہے اس وقت اذان کی آواز آتی ہے نماز کے لئے بلایا جاتا ہے کتنے ہیں جو اس معصوم کھیل میں مصروف رہنے کی وجہ سے نماز کا حق ادا کرنے کو فوقیت دیتے ہیں۔ کتنے ہیں جو بلاتر دد اس ٹیلی ویژن کو بند کر دیں گے یا اس ریڈیو کو ختم کر دیں گے یا چھوٹے بچوں کو یا بیویوں کو جنہوں نے مسجد میں نہیں جانا ان کو بیٹھا چھوڑ کر مسجد کا رخ کریں گے۔ وہ جو ایسا کرتے ہیں ان کے کنارے محفوظ ہیں، ان کی سرحدوں پر پہرے بیٹھے ہوئے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرحدیں اللہ کے فضل سے محفوظ ہیں اور ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ لیکن وہ لوگ جو ان مصروفیتوں کے

وقت ان فرائض کا خیال نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور دیگر فرائض کو ان مشاغل پر قربان کر دیتے ہیں خواہ وہ کھیل ہو یا لہو ہو یعنی تماشہ، تو ایسے لوگوں کے لئے خطرہ درپیش ہے اور ان کے قدم پھر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور مزید اور بھی زیادہ سفر اندھیروں میں جا کر کلیۃً ہدایت کے رستے سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں جو قرآن کریم کی آیات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں بہت سی ہیں مثلاً ان میں سے دو فرما رہی ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۹﴾ (المائدۃ: 58، 59)

وہی مضمون جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یہاں بیان فرمایا گیا۔ فرمایا ہے کہ یاد رکھو ایسے لوگ بھی ہیں جو جب کھیل کود میں مصروف ہوں یا لہو میں مبتلا ہو جائیں تو پھر اپنے معصوم دائروں میں نہیں رہتے بلکہ آگے قدم بڑھا کر دین سے بھی ایسا ہی سلوک کرنے لگتے ہیں اور دین کو بھی کھیل کود بنا لیتے ہیں۔ جس طرح کھیل کود پر تبصرے ہوں تو کسی انسان کو گناہ کا احساس نہیں ہوتا۔ کیا فرق پڑتا ہے کوئی کسی ایک کھلاڑی کے خلاف بات کر دے یا دوسرے کے خلاف بات کر دے۔ مگر جب کھیل کود کے دائرے پھلانگ کر یہ لوگ مذہب کے دائرے میں داخل ہو کر خدا کے برگزیدہ لوگوں پر زبانیں کھولتے ہیں، ان پر تبصرے شروع کر دیتے ہیں، اپنی مجالس میں ان تبصروں کا نشانہ دین والوں کو بناتے اور ان کے دین کو بنا دیتے ہیں تو پہلی ہدایت یہ دی ہے کہ یہ ظالم لوگ ہیں ان سے بچ کے رہو، ان کی سوسائٹی سے قطع تعلق کرو اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو بالآخر تم انہی جیسے ہو جاؤ گے۔

پس جہاں ایسے لوگ مخاطب ہیں جو بالعموم اپنے روزمرّہ کے مشاغل میں کھیل کود اور لہو کو اپنی حدود میں رکھتے ہیں ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ یہ مقام محفوظ نہیں ہے اگر تم ان لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہو جو یہاں رعایت نہیں کرتے یعنی یہ خیال نہیں کرتے کہ کن لوگوں کی باتیں ہو رہی ہیں کس مضمون کی بات ہو رہی ہے اور ادب کی رعایت سے نکل کر پھر وہ گستاخی کی حدود میں

داخل ہو جاتے ہیں لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ایسے لوگ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی ہے۔ مِنْ قَبْلِكُمْ تم سے پہلے وَالْكُفَّارَ اور دوسرے بھی ہیں ان کو اولیاء نہ بناؤ۔ ان کو اپنا دوست نہ ٹھہراؤ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم مومن ہو تو پھر اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بچ کے رہو۔ ان کی نشانی کیا ہے۔ کون لوگ ہیں جو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ جب ایسے لوگ جو عبادت کو فوقیت دیتے اور ترجیح دیتے ہیں، دنیا کے مشاغل چھوڑ کر عبادت کے لئے اٹھتے ہیں تو اس وقت اس سے برداشت نہیں ہوتا ان کی باتوں سے خود ان کے سینے کا گند فوراً اچھل پڑتا ہے۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا جب تم خود بھی نماز کے لئے اٹھتے ہو اور لوگوں کو بھی بلاتے ہو، کہتے ہو اٹھو جی اب نماز کا وقت آ گیا چلو چلیں تو کچھ ایسے ہیں جو اسی مجلس میں بیٹھے رہیں گے اور اس وقت مذاق کے رنگ میں بات کریں گے کہ یہ بڑا عبادت گزار آ گیا ہے، اس کو زیادہ خدا کو راضی کرنے کا شوق ہے۔ یہ چھپے ہوئے کافر ہیں اگر ظاہر نہ بھی ہوں اور اس کے بعد تمہارے لئے جائز نہیں کہ ان کو اولیاء بناؤ اور ان کو ہم نشین بناؤ۔ ان کی مجلسوں میں بیٹھنا ترک کر دو اور ان سے تعلقات کاٹ لو ورنہ دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ بالآخر تم انہی جیسے ہو جاؤ گے اور پھر رفتہ رفتہ تم میں اور ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔

دوسری آیت جو اس مضمون پر ایک اور پہلو سے روشنی ڈالتی ہے فرماتی ہے۔ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (الانعام:71)۔ یہاں اس آیت میں اور اُس آیت میں فرق یہ ہے کہ یہاں یہ فرمایا گیا تھا کہ تمہارے دین کو وہ مذاق بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بیماریاں آگے بڑھنے والی ہیں۔ یہ ایک جگہ رکا نہیں کرتیں۔ جو لوگ تمہارے دین کو تماشہ بناتے ہیں اور اس پر تمسخر سے کام لیتے ہیں ایسے لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ پھر اپنے دین کو بھی کھیل تماشہ ہی بنا لیتے ہیں اور خود اپنے دین کی بھی کوئی عزت ان کے دلوں میں باقی نہیں رہتی، کوئی احترام باقی نہیں رہتا۔ فرمایا وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ محض اس وجہ سے تم نے ان سے بے تعلقی نہیں کرنی کہ تمہارے دین کو ناجائز تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں اور تماشے کے طور پر اس کو Treat کرتے ہیں اس سے معاملہ کرتے ہیں۔ فرمایا دین کا معاملہ تو خدا سے تعلق رکھتا ہے اس لئے

کوئی انتقامی کارروائی نہیں اگر یہ لوگ اپنے دین کو بھی اسی طرح لیں اور لعب اور لہو سے کام لیں اور دین کو کھیل کود ہی سمجھیں۔ ذَرِ الَّذِيْنَ ایسے لوگوں کو چھوڑ دو۔ دیکھیں کیسی کامل تعلیم ہے قرآن کریم کی۔ ہر معاملے کو وضاحت سے پیش کر رہی ہے۔ اب اندھیروں کا مضمون بھی اتنی روشنی سے دکھاتی ہے کہ ہر اندھیرا اپنے اپنے مقام پر ٹھہرا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی حد بندی کرتی ہے مختلف قسم کے اندھیروں کی تفصیل بیان فرماتی ہے کچھ بھی انسان پر اندھیرا نہیں رہنے دیتی۔ وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اور ان کو اپنے دین سے مذاق کرنا اور دین کو تخفیف سے دیکھنا، اپنے دین کا تخفیف سے ذکر کرنا اس مرتبے تک پہنچا دیتا ہے۔ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کہ دنیا کی زندگی ان کو دھوکے میں مبتلا کرتی ہے۔

پس وہ غرور جس کا ذکر پہلے گزرا ہے کہ انسان پیروی تو کرتا ہے پانی دیکھ کر لیکن دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا پانی کی بجائے وہاں سراب ملتا ہے۔ فرمایا یہی لوگ ہیں جو اس مرتبے کو پھر پہنچتے ہیں۔ ان کو اپنے دین سے مذاق بھی راس نہیں آتا اور رفتہ رفتہ ان کو دنیا کی زندگی دھوکے میں مبتلا کر دیتی ہے یعنی دین سے جہاں حقیقت میں انسانی روح کی سیرابی اور شادابی کا سامان ہے اس سے نظریں پھر جاتی ہیں وہاں ان کو سراب دکھائی دیتا ہے اور جہاں سراب ہے الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا میں، وہاں وہ پانی دیکھتے ہیں اور اسی کا نام غرور ہے، اس کو دھوکہ کہتے ہیں۔ فرمایا اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جان جو کچھ بھی اس نے کمایا ہے اس کے ذریعہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائے، تباہ و برباد ہو جائے اس کا کچھ بھی باقی نہ رہے اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ یہ بہت ہی اہم بات ہے ایسے لوگ پھر دنیا میں جو بھی کماتے ہیں نیکیاں بھی دکھائی دیں ان کی، تو وہ فائدہ نہیں پہنچاتیں کیوں، غرض دنیا ہے اور دنیا کا پلڑا دین پر بھاری ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دین سرکنے لگتا ہے اور دنیا غالب آتی جاتی ہے۔ پھر ان کا جو کچھ بھی کمایا ہے وہ ان کے کچھ کام نہیں آتا سوائے اس کے کہ ان کو ہلاک کر دے۔ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ہر ایسی جان کو یہ تنبیہ ہے کہ اللہ کے سوا اس کا درحقیقت کوئی بھی ولی یا شفیع نہیں۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے ساتھ دوستی کرے اور اس کی دوستی اس کو فائدہ پہنچائے۔ کوئی نہیں جس کی شفاعت اس کے حق میں کام آجائے مگر اللہ ہی شفیع ہے۔ یہاں اللہ کے شفیع ہونے کا کیا

معنی ہے۔شفیع تو دوسرے کی شفاعت کرتا ہے، دوسرے کے پاس شفاعت کرتا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ **شفیع المذنبین** ہیں، وہ گنہگاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں۔مگر قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ کوئی بھی اپنی ذات میں شفاعت کا حق نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ اللہ اسے شفاعت کا حق عطا کرے۔پس یہاں شفیع سے مراد یہ ہے کہ شفاعت بھی خدا کی مرضی کے بغیر کسی کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ وہی اصل شفیع ہے یعنی شفاعت کو سننے والا اور شفاعت کو قبول کرنے والا۔پس ایسا شخص جو دنیا کی زندگی کے پیچھے لگ جائے اس کا سفر آغاز میں بظاہر معمولی دلچسپیوں کا سفر ہوتا ہے، ایسی دلچسپیوں کا سفر جو انسانی فطرت سے تعلق رکھتی ہیں اور مذہب ان میں دخل نہیں دیتا اور مذہب انہیں جائز قرار دیتا ہے لیکن جب وہ آگے بڑھتے ہیں تو یہ سفر پھر اندھیروں کے بعد دوسرے اندھیروں میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔

اب دیکھ لیں پہلی قسم کا اندھیرا یہ ہے کہ دوسرے کے دین کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اور اس ضمن میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑی تنبیہ ہے۔ جب دوسرے کے دین کی بات بھی کرتے ہیں تو یہ احترام ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ابتداءً وہ بھی خدا کا کلام تھا اور پوری وضاحت کے ساتھ جو خدا کا کلام ہے اس کو الگ کر کے اگر تنقید کا نشانہ بنانا ہے تو دوسرے حصے کو جو انسانوں نے داخل کر دیا اس پر بے شک تنقید کرو مگر کلام اللہ پر تنقید کے قریب تک نہ پھٹکو اور کوشش کرو کہ دوسرے ادیان کی جو غلط تشریحات ان ادیان کے پیروکار خود کرتے ہیں وہ بے چارے خود اندھیروں میں مبتلا ہیں ان پر ان کے اپنے مذہب کو روشن کرو اور بتاؤ کہ اس تمہارے مذہب میں کیا کیا خوبیاں ہیں تم غلط سمجھ رہے ہو یہ توحید کا علم بردار ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ویدوں کی بھی تعریف فرمائی جن میں سے اکثریت انسان کی خرد برد کے نتیجے میں بالکل محفوظ نہیں رہی۔مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیغام صلح میں ویدوں کے متعلق بہت ہی عمدہ خیالات کا اظہار فرمایا ان معنوں میں کہ آغاز میں خدا ہی کی طرف سے یہ نازل ہوئی تھیں، بندوں نے ان میں دخل اندازی کر کے ان کا حلیہ بگاڑ دیا مگر آج بھی اگر آپ غور کریں تو اللہ تعالیٰ کے کلام کا نور ان میں دکھائی دیتا ہے اور خدا کا نور کلیۃً بجھ نہیں سکتا، کلیۃً مٹایا نہیں جا سکتا۔ انسان کے اندھیرے وقتی طور پر اس پر پردے ڈالتے ہیں مگر ایک انسان فراست کی نظر سے اگر اس نور کی تلاش کرے تو کوئی بھی الٰہی کتب

ایسی نہیں ہیں جن میں خدا کے نور کی اصلی شان جگہ جگہ جھلکتی ہوئی دکھائی نہ دے۔ پس اس پہلو سے فرمایا کہ اگر تم محض تمسخر کی خاطر بدتمیزی کے لئے دوسروں کے مذاہب پر زبانیں کھولو گے جیسا کہ بعض لوگ تمہارے مذہب پر زبانیں دراز کرتے ہیں تو انجام کیا ہوگا؟ جو ان کا انجام ہے وہی تمہارا بھی ہوگا۔ تم پھر خود اپنے دین کے معاملے میں بھی گستاخ ہو جاؤ گے۔ بدتمیز اور بے ادب بن جاؤ گے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے، ایسی گہری نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر اس پر آپ غور کریں تو انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کوئی بھی زبانیں کھولنے والے ٹولے جو آپ کے ذہن میں آئیں یا فرد کوئی آپ کے ذہن میں ہو اس کی تاریخ کا جائزہ لیں کس طرح اس کی زبان آغاز میں پہلے دوسروں پر کھلتی تھی پھر رفتہ رفتہ قریب آنے لگی خود اپنے دین کے متعلق وہ بدتمیز ہوا اور پھر وہ مجلسیں بن گئیں جن کا ذکر ہے کہ وہ اکٹھے بیٹھتے ہیں لہو ولعب میں مشغول ہوتے ہیں پھر اپنے دین پر بدتمیزی کی باتیں شروع کر دیں یہاں تک کہ خود اپنے مفاد کے خلاف پھر ان کی زبانیں چلنے لگتی ہیں۔ چنانچہ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ یہ بہت ہی اہم مضمون ہے۔ ذَكِّرْ بِهٖٓ اس کو خوب کھول کھول کر بیان کر۔ اس کو بار بار نصیحت کے طور پر بیان کر مبادا کوئی جان جو کچھ اس نے کمایا ہے اس کے ذریعے اور اس کے باوجود ہلاک نہ ہو جائے۔ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا کہ ایسی جان جو تمسخر اور مذاق کر کے دین کے معاملوں کو کھیل تماشہ بنا کر ہر اس نتیجے سے محروم رہ جاتی ہے جو اس کی کمائی کا نتیجہ ہے اور سوائے ہلاکت کے اس کی دنیا کی محنت اسے کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچاتی اس کے متعلق فرمایا کہ پھر وہ وقت آ جائے گا کہ اگر وہ ہر قسم کا بدلہ جو بھی دے سکتی ہے اپنی جان کو عذاب سے بچانے کے لئے وہ بھی دے دے گی تو بھی لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس میں دو روکیں ہیں اول تو بدلہ دینے کی توفیق ہی کوئی نہیں کیونکہ قیامت کے دن تو انسان بے مالک ہو کر جائے گا۔ کوئی بھی اس کی ملکیت نہیں ہوگی۔ وہ بدلہ کس چیز سے دے گا۔ تو یہ ایک نظریاتی دلیل ہوا کرتی ہے جس کا معنیٰ صرف یہ ہے امکانی دلیل ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ واقعۃً کچھ لوگ یا کچھ جانیں قیامت کے دن سونوں کے پہاڑ لے کر خدا کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے کہ یہ قبول کر لے اور ہماری جان چھٹ جائے۔ فرمایا اگر ایسا ہو کہ دنیا جہاں کی دولتیں بھی پیش کر دیں تب بھی ایسے لوگوں کا کوئی بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ جان کسی بدلے کو دے کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔

دوسرا اس میں مومنوں کے لئے یہ اشارہ ہے کہ اس دنیا میں تمہیں پتا ہے کہ تم سے بدلے قبول کئے جاتے ہیں صدقے قبول کئے جاتے ہیں نیکی کے کاموں پہ خرچ کرتے ہو وہ تمہارے گناہوں کی بخشش کا موجب بن جاتے ہیں تو اب جبکہ وقت ہے تو تم کرو۔ کیوں کہ تمہارا آج کا خرچ تمہاری آج کی مالی قربانی قیامت کے دن وہ بدلہ بنے گی جو دوسروں کے کام نہیں آسکتا مگر تمہارے کام آئے گا۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا کَسَبُوۡا یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ہلاکت میں ڈال دیئے جائیں گے۔ بِمَا کَسَبُوۡا اس وجہ سے جوانہوں نے کمایا لَھُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ (الانعام: 71) ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے۔ اب پیاس بجھانے کے لئے جو سراب کا نقشہ ہے وہ اور یہ اس پہلو سے ملتے جلتے ہیں کہ کھولتا پانی بھی کسی کی پیاس نہیں بجھا سکتا بلکہ اس کی پیاس کو اور بھڑکا دیتا ہے، اس کے لئے اور بھی درد کا موجب بن جاتا ہے۔ جس طرح سمندر کا پانی کسی کی پیاس کو بجھا نہیں سکتا بلکہ اس کو اور بھی کھولا دیتا ہے فرمایا شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ پیاس بجھانے کی بجائے ان کے لئے یہ چیز دردناک عذاب کا موجب بنے گی۔ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ اس وجہ سے کہ وہ جو دنیا میں کام کیا کرتے تھے بسبب اس کے جو وہ انکار کیا کرتے تھے۔

اب ایک جگہ جب ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑ دو، ان کی مجلسوں میں نہ بیٹھو کیوں کہ یہ ظلماتی لوگ ہیں، یہ تمہیں بھی روشنی سے ظلمت کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے تو پیچھے پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ کن لوگوں میں گزارہ کرنا ہے اور کن لوگوں میں اپنا دل بہر حال لگانا ہے اس کے سوا چارہ کوئی نہیں ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡھَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡھُمۡ ۚ (الکہف: 29)۔ وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّھُمۡ ان لوگوں کے ساتھ اپنا دل لگا لے اور اسی پر صبر کر یعنی اپنی تمام کائنات کو ان لوگوں کی حد تک سمیٹ لے یعنی دلچسپیوں کی ساری کائنات کو جو لوگ خدا کو پکارتے ہیں صبح کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡھَہٗ اور اسی کی رضا چاہتے ہیں، اسی کا چہرہ مانگتے ہیں۔ وَجۡھَہٗ سے مراد ہے چہرہ یعنی توجہ اور رضا دونوں باتوں کے لئے وجہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

تو فرمایا جب کچھ لوگوں کو چھوڑ و گے تو پھر کن لوگوں میں تمہاری دلچسپیاں محدود ہونی چاہئیں، کن میں تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہونا چاہئے۔ ان لوگوں میں جن کی اپنی توجہ کا مرکز خدا کی ذات ہے اوران کی ساری رضا، ان کی ساری دلچسپیاں اللہ کی ''وجہ'' میں ہیں۔ یعنی یہ مراد نہیں ہے کہ یہ لوگ بور ہیں یا ان کے ساتھ زندگی جو ہے اس میں وہ اکتاہٹ والی اور بے لذّت ہو جاتی ہے۔ فرمایا وہ لوگ جو دنیا کی لذّات کی اندھا دھند پیروی نہیں کرتے، ان حدود میں رہتے ہیں جن حدود تک خدا تعالیٰ اجازت دیتا ہے ان کو بھی لذّتیں ملتی ہیں بلکہ جیسا کہ میں نے پچھلے خطبے میں کھول کر بیان کیا تھا سراب کی پیروی کرنے والوں سے بہت زیادہ لذّتیں پاتے ہیں۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو ان سے سوا بھی لذّتیں ملتی ہیں اور وہ لذّتیں ''وجه الله'' میں ہیں، اللہ کے چہرہ میں ہیں، اللہ کی توجہ میں ہیں، اللہ کی رضا میں ہیں۔ پس ایک طرف سے تو تم آنکھیں بند کرو گے تو اس کے مقابل پر کچھ اور چیز تمہیں میسر آنی چاہئے ورنہ ناممکن ہے کہ خدا کی خاطر انسان ایک مثبت چیز کو چھوڑ دے اور یہاں اندھیروں سے روشنی کے سفر کا طریقہ سمجھا دیا گیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان کو چھوڑ کر الگ ہو کر اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہو۔ فرمایا ایک سوسائٹی سے دوسری سوسائٹی کی طرف منتقل ہو، تمہیں سہارا چاہئے۔ اور وہ سوسائٹی ایسی ہے جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچتے وقت فرماتا ہے ان کی اللہ کی رضا پر آنکھ رہتی ہے اور جو رضائے باری تعالیٰ ہے اس میں بے انتہا لذّتیں ہیں اور اندھیرے سے روشنی کے سفر کا دوسرا نام یہی ہے کہ انسان خدا کی رضا سے محروم لوگوں سے جدائی اختیار کر کے اس جگہ سے ہجرت کرتے ہوئے ان لوگوں کی طرف ہجرت کرے جن لوگوں کو ہمیشہ صبح بھی اور شام کو بھی اللہ کی رضا مطلوب ہے۔ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ اور تیری آنکھیں ان سے ہٹ کر دوسری طرف نہ دیکھیں۔ یعنی صبر کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ تجھے کافی ہوں اور یہ نہ ہو کہ اچھوں کی صحبت میں کچھ دیر دل لگے بھی لیکن نظر یہ رہے کہ کب یہ صحبت ختم ہو تو ہم اس صحبت میں واپس لوٹ جائیں۔ یا ہمیشہ دل للچایا رہے کہ وہ بھی تو چیزیں ہیں ان کی طرف بھی تو جانا چاہئے کچھ ان میں سے بھی دیکھ لیا جائے۔ فرمایا یہ بس ہوں تمہارے لئے، یہ تمہاری کائنات بن جائیں، تمہارا سب کچھ یہی ہو جائیں اور تمہاری ساری لذّتیں اپنی تسکین ان لوگوں کی صحبت میں پالیں۔ چنانچہ فرمایا تیری دونوں آنکھیں ان سے ہٹ کر پرے دیکھنے کی کوشش ہی نہ کریں، خیال تک نہ ان کو آئے کہ اس سے پرے بھی کوئی دنیا بستی ہے اور

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی کو روشنی کا سلیقہ ہو اور واقعۃً روشنی کو روشنی سمجھ رہا ہو تو اردگرد کے اندھیروں میں اس کی آنکھ وہ دیکھ ہی نہیں سکتی جو روشنی سے آشنا ہے۔ نظر ہی کچھ نہیں آتا تو وہ ہٹے گی کیسے۔ تو فرمایا اپنی نظر کو اتنا Tune کرلو روشنی کے ساتھ کہ روشنی ہی دکھائی دے اور اردگرد دیکھنے کا موقع ہی پیدا نہ ہو۔ تمہاری ساری کائنات وہی ہو جو اللہ کے نور کی پیدا کردہ کائنات ہے اس کو دیکھو اور وہیں تک تمہاری سرحدیں ہوں۔ اس سے اردگرد چونکہ اندھیرا ہے اس لئے آنکھیں وہاں سے ہٹ کر کسی اور چیز کی تلاش کر ہی نہیں سکتیں۔ اگر تو ایسا کرے گا تو فرمایا تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تو تو اصل میں ابھی تک دنیا کی زینت کی تلاش میں ہی ہے اور اس مصیبت نے تیرا پیچھا نہیں ابھی تک چھوڑا۔ اگر تو ایسا کرے تو پھر تیرا حال یہ ہے ابھی بھی تجھے دنیا کی زینت ہی کی تلاش ہے۔ جس زینت کو اللہ تعالیٰ جھوٹ اور غرور کہہ چکا ہے، جس کو بے حقیقت اور بے معنی اور بے مقصد بتا چکا ہے۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف:29) اور ہرگز اس کی پیروی نہ کر۔ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وہ بھی خلا میں نہیں رہ سکتا۔ جب ہماری یاد سے غافل ہوتا ہے تو کیا کرتا ہے وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتا ہے، اپنی دلی آرزو کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا معاملہ ہوتا ہے یعنی ایسا معاملہ ہے کہ جو حدیں پھلانگ چکا ہے اور اب اس کا ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دائمی سفر ہے یعنی یہ مراد نہیں کہ ایک مقام پر کھڑا ہو گیا اور وہ آخری تجاوز کا مقام ہے۔ تجاوز سے مراد ایک سفر ہے جہاں ہر اگلی حالت پہلے سے زیادہ بے اعتدالی کی حالت ہوتی ہے۔ ہر اگلا اندھیرا پہلے سے زیادہ سخت اور ظالم اندھیرا ہوتا ہے۔ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا یہاں ضمیر خدا تعالیٰ نے اپنی طرف پھیری ہے کہ ہم اس کے دل کو اپنے ذکر سے غافل کر دیتے ہیں۔

دراصل یہ ایک جزا ہے جس کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ایک ایسے انداز میں ذکر کیا جا رہا ہے جس سے خدا کی شان تمجید ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا مجد، اس کی عزت، اس کا وقار، اس کی بلندی۔ ہم جب کسی کو چاہتے ہیں اور وہ ہمیں نہیں چاہتا تو اس کے باوجود ہم اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور بسا اوقات انسان اپنی زندگی اسی طرح کے سراب کی پیروی میں بھی ضائع کر دیتا ہے۔ جو لذّت اس کو نصیب

ہونی ہی نہیں جو اس کے حصے کی چیز نہیں ہے اکثر اس کی پیروی میں لگا رہتا ہے یہ بھی ایک اندھیرا ہے۔ مگر جب نہیں بھی پاتا یا ردّ بھی کیا جاتا ہے تب بھی بسا اوقات وہ طلب مرتی ہی نہیں ہے یہ اس کے ادنیٰ مقام کا نشان ہے، یہ اس کے احتیاج کی علامت ہے۔ پس جو عشاق اپنے محبوب، اپنے مطلوب کو نہ پائیں اور پھر بھی اس کے پیچھے لگے رہیں اور اکثر دنیا کے عشاق کا یہی حال ہوتا ہے یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کا مقام دراصل ادنیٰ ہے۔ وہ اپنی ذات میں غنی نہیں ہیں، مستغنی نہیں ہیں اور وہ جس کی طلب ہے اگر وہ ان کو جواب میں پیار عطا نہ کرے تو ان کی زندگی محرومیوں کا شکار رہے گی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے دل پر ان کی یاد کے خلاف کوئی پردہ نہیں ڈالتا بلکہ پردہ پڑنے بھی لگے تو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے میں ساری عمر اسی کی پوجا کروں اسی کے پیچھے لگا رہوں کسی اور کا خیال تک میرے دل میں نہ آئے، ٹھوکریں لگتی ہیں تو ٹھوکریں لگتی رہیں مگر آخر دم تک میں اسی محبوب کا پجاری بنا رہوں۔ یہ انسانی فطرت ہے جو اسے اپنے لا حاصل عشق پر ثبات قدم عطا کرتی ہے۔ ایسا عشق جو لا حاصل ہے اس کا فائدہ کوئی نہیں پھر بھی اسے ثبات قدم ہے۔ یہ ثبات قدم خوبی کا ثبات قدم نہیں ہے۔ یہ استقلال ایسا نہیں جس کی تعریف کی جائے۔ یہ اس کی کمزوری کا مظہر ہے وہ بے چارہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں ایسا بے چارہ نہیں ہوں کہ تم مجھے نہ چاہو اور میں تمہارے بغیر نہ رہ سکوں بلکہ میں تو بے نیاز ہوں۔ حقیقت میں میں جو تمہارے دل میں آتا ہوں تو تمہاری ضرورت کے خیال سے۔ اگر تم نہ چاہو گے تو مجھے کوڑی کی بھی پرواہ نہیں ہے کہ تمہارے دل میں براجمان ہوں۔ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا ایسا شخص جو ہماری یاد کو پیار اور محبت سے نہیں دیکھتا یعنی جس طرح اُردو میں تو ہم کہتے ہیں ہماری بلا سے، خدا فرماتا ہے مجھے اس کی کچھ بھی پرواہ نہیں پھر کہ میں اسے یاد رہوں یا نہ رہوں بلکہ ہم خود اپنی عزت اور اپنی شان کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کے دل پر اپنی طرف سے پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس کے مددگار بن جاتے ہیں ان چیزوں میں جو وہ خود اپنے لئے پسند کر بیٹھا ہے۔ تو وہ موقع ہی ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں جن موقعوں میں خدا کی یاد اس کو آسکتی ہے اور جتنا انسان خدا کے مخالف سمت سفر اختیار کرتا ہے، جو اندھیروں کا سفر ہے، اتنا ہی خدا کی سمت میں اور پردے اترتے جاتے ہیں اور ہر پردہ اس کے اندھیروں کو زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔ تو فرمایا کہ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ اس کے پیچھے نہ لگ جانا اس کی

پیروی نہ کرنا۔ یعنی اس کی تمنائیں، اس کی آرزوئیں، اس کی خواہشات، جب وہ تم میں بیٹھے گا تو بتائے گا کہ میں نے یہ یہ چیزیں حاصل کیں، اس طرح میں نے دنیا کمائی، اس طرح میں نے دوست کمائے، اس طرح عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتا ہوں، یہ یہ چیزیں چاہتا ہوں، یہ جب سنو گے تو تمہارے دل میں ادنیٰ بھی حرص پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا تم سے کیا تعلق جس کا خدا سے تعلق نہیں۔ اس کی پیروی نہیں کرنی سے مراد ہے اس کی تمناؤں کی پیروی نہیں کرنی، اس کے طرز زندگی کی پیروی نہیں کرنی۔ اس طرح بے نیاز ہوکر اس کو دیکھو جیسے خدا بے نیاز ہو کے اس کو دیکھتا ہے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اور پھر اپنے ''هــوٰى'' کی پیروی کرتا ہے۔ تم تو ہوا و ہوس کی پیروی کرنے والے نہیں ہو۔ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا اور اس کا معاملہ حد سے تجاوز کرنے لگ گیا ہے۔ جب تجاوز کرتا ہے تو پھر ایک اور مقام ایک تیسری منزل اندھیرے کی اس کے سامنے لے آتا ہے۔

فرماتا ہے اِنَّ السَّاعَـةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ: 16) قیامت یقیناً آنے والی ہے اَكَادُ اُخْفِيْهَا قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کردوں۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ یہاں اُخْفِيْهَا کا جو مضمون ہے اس کے دونوں معنیٰ ہیں مخفی رکھنا بھی اور ظاہر کرنا بھی۔ اس آیت کی تفسیر کا یہاں اس وقت موقع نہیں، باقی اس کے پہلوؤں پر اس وقت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، اس تعلق میں اس کا یہی معنیٰ ہوگا۔ اِنَّ السَّاعَـةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا بعید نہیں کہ میں اسے ظاہر کردوں یا قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کردوں كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ہر نفس پر اس معاملے میں جس کی اُس کو جزا دی جائے گی جس کے لئے وہ کوشش کر رہا ہے۔ جزا کا تعلق لِتُجْزٰى سے ہے اور بِمَا تَسْعٰى کا مطلب ہے جس کی وہ کوشش کر رہا ہے۔ پس اس ترجمے کی تفصیل یوں بنے گی کہ قیامت تو بہر حال آنے والی ہے۔ تم لوگوں کو دکھائی نہیں دے رہی ایسا شخص جو دنیا کی پیروی کر رہا ہے، دنیا کے دھوکوں میں مبتلا ہے، اسے آئندہ کی زندگی کی طرف اپنے بڑھنے کا احساس تک نہیں لیکن ایک ایسی منزل ضرور آئے گی جہاں پچھلی دنیا دکھائی دینی بند ہو جائے گی اور اگلی دنیا دکھائی دینے لگے گی۔ وہ وقت ہوگا یعنی موت کا وقت جب وہ جانتا ہے کہ اس کا پچھلا سفر تو ختم ہوا اس کا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا اگلا سفر اب قریب ہے۔ اسے سوائے آخرت کے پھر اور کوئی خیال نہیں آتا وہ کون سا وقت ہے۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى تا کہ جزا دی جائے ہر اس جان کو جس

نے کچھ دنیا میں کمایا ہے یا کچھ کوشش کی ہے۔

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنۡھَا مَنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِھَا پس وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک وہ اس آخری منزل تک نہیں پہنچتے اگر تم ان کے قریب رہو گے تو وہ تمہیں بھی اس سے ہٹالیں گے تمہیں بھی اس راہ سے روک دیں گے۔ پھر عجیب بیان ہے ایک طرف یہ قطعی خبر ہے کہ ہر جان لازماً اس مقام تک پہنچائی جائے گی جہاں اس پر بعد کی زندگی روشن کر دی جائے گی اور پردے اٹھائے جارہے ہوں گے۔ لیکن جن کو اس وقت دکھائی دے گا فرمایا وہ پہلے ایمان نہیں لاتے۔ اگر پہلے ایمان لاتے تو انہیں پہلے بھی دکھائی دیتا۔ ایسے لوگوں کے قریب نہ رہو، ایسے بے ایمانوں کے ساتھ دوستی نہ کرو جن کو آخرت پر یقین نہیں ہے۔ یقین تو ہوگا لیکن اس وقت ہوگا۔ جب ان کے لئے دیر ہو چکی ہوگی اور بے فائدہ ہو چکا ہوگا۔ جب موت کے چنگل میں مبتلا ہوں گے اس وقت وہ دیکھ لیں گے اور فرمایا ضرور ایسا وقت آنے والا ہے۔ مگر جب تک وہ نہیں دیکھتے وہ دوسروں کو اس راستے سے روکتے ہیں۔ فرمایا تجھے ایسے لوگوں کا تعلق روک نہ دے۔ مَنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِھَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىهُ فَتَرۡدٰی (طٰہٰ: 17) وہ اپنی ہوا کی پیروی کرنے والے لوگ ہیں وہ رضائے باری تعالیٰ کی پیروی نہیں کرتے۔ پس اگر تو ایسے لوگوں سے دوستی رکھ کر ان کے پیچھے لگے گا تو تو بھی ہلاک ہو جائے گا۔ فَتَرۡدٰی لازماً تو ہلاک ہوگا اور ہلاکت کی آخری شکل کیا ہے۔ فرماتا ہے اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَکُوۡنُ عَلَیۡهِ وَکِیۡلًا (الفرقان: 44)۔ کیا تو نہیں جانتا کہ ایسے لوگوں کی ظلمت پھر بالآخر کتنی گہری ہو جاتی ہے۔ پہلے وہ اپنی ''ھــــوىٰ'' کے پیچھے چلتے ہیں پھر اپنی خواہش کو معبود بنا لیتے ہیں۔ پہلے اس کی پیروی کرتے ہیں اس کو حاصل کرنے کے لئے۔ پھر جس کو وہ حاصل کرنے کی پیروی کرتے ہیں وہ چیز ان پر سوار ہو جاتی ہے ان پر قبضہ کر لیتی ہے اور یہ لوگ اپنی خواہش کے غلام بن جاتے ہیں اور جب خواہش کا غلام ہوں تو اس کی عبادت کرنے لگتے ہیں اور یہ وہ مضمون ہے جو ایک گہری انسانی فطرت پر روشنی ڈال رہا ہے جس سے تمام دنیا کے مذاہب کا تعلق ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ بے خدا کوئی انسان رہ نہیں سکتا۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص خدا کے بغیر رہ سکے کیونکہ خدا کی طلب اس کی فطرت میں مرتسم فرما دی گئی ہے۔ قول بَلٰی سے ہر روح نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہاں ہمارا ایک ربّ ہونا چاہئے اور ہے، کیوں نہیں ہے۔ پس وہ لوگ جو حقیقی ربّ سے تعلق توڑتے ہیں یہ وہم ہے کہ وہ بے خدا رہتے ہیں۔ فرمایا ان پر ان کی خواہشات اس طرح غالب آجاتی

ہیں جیسا مومن بندوں پر خدا کا تصور غالب آتا ہے اور اندھا دھند ان خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ جرائم میں بڑھتے چلے جاتے ہیں کیونکہ خواہش کا شیطان ان کو کسی برے رستے سے روکتا نہیں بلکہ برے رستوں کی طرف بلاتا اور اکساتا ہے اور آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے لیکن عبادت کے بغیر وہ نہیں رہتے۔ پس دنیا ان کی عبادت کی جگہ بن جاتی ہے۔ دنیا کی پیروی ان کی عبادت ہو جاتی ہے اور دنیا ان کا معبود بن جاتی ہے۔ اب جتنی بھی قومیں خدا سے ہٹی ہیں ان کو دیکھ لیں دنیا ان کا معبود ہے، سب کچھ دنیا ہے اور اتنے انہماک سے ان کی پیروی کرتے ہیں کہ وقتی طور پر خدا ہی کے قانون کے تابع اس معبود باطل کی پرستش کے نتیجے میں کچھ نہ کچھ اپنے مقاصد کو حاصل بھی کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے جو فرمایا:

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝۱۰۳ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۴ ۭ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۵ (الکہف: 103 تا 105)

یہ جو آخری ٹکڑا ہے اس آیت کا یہ ہے جس کا اس آیت سے جو زیر نظر ہے اس سے گہرا تعلق ہے۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا جب دنیا ان کی معبود ہو جائے تو ان کی تمام تر کوششیں اس معبود کی عبادت میں خرچ ہوتی ہیں اور کچھ حاصل بھی کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دنیا ان کو ضرور حاصل ہونے لگتی ہے اور اسی دھوکے کی زندگی میں، اسی روشنی میں جس کو میں قرآن کی تعریف میں اندھیرا کہہ رہا ہوں اس میں وہ دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہم نے تو بہت کچھ حاصل کر لیا ہم تو صنعتوں پر غالب آ گئے ہیں ہمارے جیسا کاریگر تو دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوا اور صنعتوں کی وجہ سے ہم دنیا پر غالب آئیں گے اور دنیا کو نیچا دکھا دیں گے یہ مضمون ہے جو اس پیروی سے وابستہ ہے۔ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا گھاٹا کھانے والے تو ہیں مگر آخرت میں گھاٹا کھانے والے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ان کو ملے گی مگر یہ دنیا کا معبود آخرت میں ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس معبود کو وہ پیچھے چھوڑ کر آگے جائیں گے۔ نہ ان کا ولی ہو سکے گا، نہ ان کا شفیع ہو سکے گا۔

تو ’’ھوٰی‘‘، جو ہے یہ دیکھنے میں تو ایک دل کی تمنا تھی اور انسان کہتا ہے کہ کیا حرج ہے کہ انسان اپنی خواہش کو پورا کر لے۔ خدا ہی نے تو فطرت میں پیدا کیا ہے اور کئی لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں۔ کہتے ہیں عجیب ہے اللہ تعالیٰ، ایک طرف دل میں طلب رکھ دی ہے کہ یہ بھی لو، وہ بھی لو، یہ بھی مزہ کرو اور جنسی طلب بھی ہے، مال و دولت کی بھی طلب ہے اور فخر و مباہات کی بھی طلب ہے اور دوسری طرف رستے بند کر دیئے ہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص نے مجھے لکھا وہ اپنی طرف سے نفسیات کے ماہر تھے انہوں نے لکھا یہ تو نفسیات کے خلاف بات ہے۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ ہر انسان مریض بن جائے۔ میں نے کہا آپ کا سوال جو ہے یہاں نہیں ٹھہر رہا آگے بھی چلتا ہے۔ آپ جب کسی سٹور میں جاتے ہیں وہاں آپ کو اچھی پیاری پیاری چیزیں ملتی ہیں کیا آپ کے دل میں آرزو نہیں ہوتی کہ اس کو اٹھا لیں۔ اٹھاتے کیوں نہیں؟ کیوں نفسیاتی مریض نہیں بن جاتے؟ کوئی خوب صورت لڑکی دکھائی دیتی ہے دل چاہتا ہے کہ اپنے خاوند کے ساتھ نہ ہو میرے ساتھ چلے کیا کبھی آپ نے جھپٹ کے اس کو کھینچ کر اپنے خاوند سے الگ کیا ہے؟ کسی خوب صورت کوٹھی، کسی محل کو دیکھتے ہیں آپ کا طبعی دل بتائیں چاہتا ہے کہ نہیں؟ کیا فطرت کی یہ آواز اٹھتی ہے کہ نہیں کہ ہاں کاش یہ میرا ہوتا؟ تو پھر دندناتے ہوئے چلے جائیں کیوں اپنی خواہش کو دباتے ہیں؟ نفسیاتی مریض کیوں نہیں بن گئے؟ محض جہالت ہے۔ نفسیات کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں ماہرین نفسیات نے بڑے بڑے بے ہودہ اور پاگلوں والے نتیجے نکالے ہیں اور اسی کے نتیجے میں آج کل کے اس تعلیمی ماحول پر بہت ہی بد اثر پیدا ہوا ہے۔ جہاں نیکی کے معاملات ہوں، جہاں خدا کی حدود کی باتیں ہوں وہاں سکول کے بچوں کو کہتے ہیں ’’ہیں ہیں‘‘، تمہیں کیوں روکتے ہیں ماں باپ۔ ان کا کیا حق ہے۔ تمہاری فطرت کی آواز ہے جاؤ بدمعاشیاں کرو، آوارگی کرو، جو چاہو کرو، کوئی تمہیں روکنے والا نہیں۔ جب دنیا کے قوانین کو توڑتے ہیں تو وہاں ان کی پکڑ کے ہاتھ سخت ہو جاتے ہیں۔ محض ایک منافقت ہے، ایک دھوکہ ہے اور **متاع الغرور** میں منافقت کی زندگی بھی داخل ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ھوٰی کو معبود بناؤ گے تو پھر کوئی حد باقی نہیں رہے گی کیونکہ معبود تک پہنچنے کے لئے رستے میں کوئی قانون حائل نہیں ہوسکتا۔ معبود تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے دوڑو اور اس کی طرف چلے جاؤ۔ تو اس کے آخری نتیجے تک تم پہنچو گے۔ دنیا تمہاری معبود ہوگی تو رستے کے تمام

قوانین، تمام انسانی فطرت کے تقاضے جو تمہیں تہذیب سکھاتے ہیں جو تمہیں بعض مقامات پر رکنے کی تعلیم دیتے ہیں، جو آواز دیتے ہیں کہ اس سے آگے تم نے قدم نہیں رکھنا ہر ایسے موقع پر تمہیں اپنی خواہش کی گردن پر چھری پھیرنی پڑتی ہے۔ تب دنیا میں امن قائم ہوتا ہے۔ اگر خواہش تمہارا معبود بن گئی تو دنیا کی گردن پر چھری پھیرنی پڑے گی، دنیا کے حقوق برباد کرنے پڑیں گے تب تم اپنی خواہش کی پیروی کر سکتے ہو ورنہ یہ طاقت تمہیں نصیب ہی نہیں ہوسکتی۔ یہ لہو ولعب کے تعلق میں وہ آخری اندھیرا ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے دوسری آیت میں کھول کر بیان فرمایا۔ فرمایا اس کو معبود نہ بنا بیٹھنا۔ اگر یہ معبود بن جائے گا تو ہر بات جس کی تمہاری فطرت میں طلب ہے وہ جائز رستوں پر نہیں رہے گی۔ وہ تمہاری قربانی کے نتیجے میں نہیں بلکہ دنیا کی قربانی کے نتیجے میں زندگی پائے گی، زندگی کا پانی حاصل کرے گی یعنی دوسروں کا خون تمہاری غذا بن جائے گا اور ایسی دنیا بے امن ہو جاتی ہے۔ ایسی دنیا میں ہر طرف ایک لاقانونیت کا دور چلتا ہے۔ ہر سکون چھینا جاتا ہے۔ ہر امن کی پناہ گاہ میں ظالم داخل ہو جاتے ہیں اور ہر گھر میں سند لگ جاتی ہے یعنی ہر گھر میں نقب لگ جاتی ہے اور کوئی گھر، گھر باقی رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ آج کا دور جو ہے اس میں لعب ولہو نے بعینہ یہ نقشہ پیدا کر دیا ہے۔

پس قرآن کریم نے جو یہ فرمایا کہ خدا کے سوا اگر کوئی اور معبود ہوتے تو دنیا تباہ و برباد ہو جاتی، فساد برپا ہو جاتا۔ وہ ایک دوسرے کی بادشاہی سے چیزیں لے اڑنے کے لئے کوشش کرتے۔ یہ ایک پہلو سے اس کی تفصیل ہے۔ جب غیر اللہ کی عبادت کرو گے تو سب سے خطرناک عبادت اپنے نفس کی عبادت ہے۔ اپنے نفس کی عبادت کے نتیجے میں جہاں خدا کی ملکیت ہے، جہاں تمہارے ہاتھ روکے گئے ہیں، جہاں تمہارے قدم تھامے گئے ہیں نہ ہاتھ رکیں گے نہ قدم چلنے سے باز آئیں گے۔ اس طرف بڑھیں گے اور وہ جس طرف بڑھیں گے وہ عملاً خدا کی ملکیت ہے مگر عطا اس کے بندوں کو ہوئی ہوتی ہے۔ براہ راست خدا سے نہیں کوئی چھین سکتا کچھ۔ خدا کی تقسیم میں رخنہ ڈالتا ہے۔ جن خدا کے بندوں کو عارضی ملکیت نصیب ہوئی ہے ان کا امن ٹوٹتا ہے اور اس دور میں جیسے شیشے میں تصویر دکھائی دیتی ہے اور شیشہ اس تصویر کو اچھال کر باہر پھینکتا ہے اس طرح سوسائٹی تمہاری تصویر کو اچھال کر تمہارے منہ پر مارے گی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم لوگوں کے امن اٹھاؤ، اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے لوگوں کے امن برباد کرو اور تمہارا امن برباد نہ ہو۔ ایسی سوسائٹی میں پھر ہر ایک کا

امن برباد ہوجاتا ہے اور جھوٹے خدا کی عبادت یہاں تک پہنچائے گی اس کے سوا تمہیں کچھ نہیں پہنچا سکتی۔ تو ایسا طبعی منطقی نتیجہ ہے کہ اس سے مفر ہی کوئی نہیں ہے۔ جو چاہو کرلو، جتنی چاہو، دلیلیں تلاش کرو جو نتیجہ قرآن نے نکالا ہے کہ اندھیرے کی پیروی میں ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہیں اور ہلاکت ہی ہلاکت ہے، جتنا آگے بڑھو گے اتنے ہی زیادہ خوفناک نتائج منہ پھاڑے تمہارا انتظار کررہے ہوں گے اور تم ان چیزوں کے غلام بن جاؤ گے جن کو اپنا غلام بنانے کے لئے ان کی پیروی شروع کی تھی۔

پس اللہ تعالیٰ ان سب اندھیروں سے ہمیں بچائے اور اس کی مزید تفصیلات کی بھی ضرورت ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو اس مضمون کو روزمرّہ کی انفرادی زندگی میں مزید چسپاں کر کے آپ کو دکھانے کی کوشش کروں گا کہ کن اندھیروں سے بچنا ہے تا کہ خدا کا نور حاصل کرنے کے لئے جگہ تو بنے۔ جس دل کو اندھیروں نے گھیر رکھا ہو، وہاں کوئی جگہ نہ ہو خدا کے نور کے لئے وہاں خدا کا نور نہیں آئے گا کیونکہ وہ اندھیرے سے شکست نہیں کھاتا، خدا کی غیرت اسے واپس کھینچ لیتی ہے۔ پس یہ وہم ہے کہ خدا کا نور اندھیروں سے شکست کھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس کی رفعت اور اس کی غیرت برداشت نہیں کرتی کہ جس دل میں اس کے نور کی طلب نہ رہے وہاں اپنے نور کو زبردستی ٹھونس دے۔ وہ واپس بلاتا ہے اور پردے ڈالتا رہتا ہے کہ تمہیں میں اس نور سے خوب بچاؤں گا جس نور سے تم خود بچنے کی کوشش کررہے ہو، جس سے تم متنفر ہو چکے ہو۔ پس اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور عملی زندگی میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ یہ محض علمی دلچسپی کی باتیں نہیں ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں، ٹھوس حقائق ہیں جن کے سمجھنے کے نتیجے میں، جن پر عمل کرنے کے نتیجے میں ہماری زندگی بھی تبدیل ہوسکتی ہے اور ہمارے ماحول بھی سدھر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ایک مرکز پر جمع ہونا رحمت سے تعلق رکھتا ہے

ممبران شوریٰ کو نصائح

(خطبہ جمعہ فرمودہ 29 / مارچ 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران: 161,160)

پھر فرمایا:

ان آیات کا تعلق اسلام کے نظام شوریٰ سے ہے اور اس کی بنیادی صفات ان آیات میں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ذکر حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ سے شروع ہوتا ہے اور اس رحمت کے ذکر سے جو خدا تعالیٰ نے آپ پر بطور خاص فرمائی۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ تو مومنوں کے لئے نرم ہو گیا اس رحمت کی بناء پر جو تجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ پس مجلس شوریٰ کا آغاز اس رحمت سے فرمایا گیا یعنی نظام شوریٰ کا آغاز اس رحمت سے فرمایا گیا ہے جو خدا کی طرف سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ: 4) کے مضمون کے تابع آپؐ سے پھر وہ رحمت دوسرے بنی نوع انسان میں اس طرح جاری ہوئی کہ جو

قریب تر تھا اس نے سب سے زیادہ فیض پایا۔ ورنہ رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ کا مضمون بتا رہا ہے کہ آپؐ کی رحمت محض صحابہؓ کے لئے خاص نہیں تھی تمام بنی نوع انسان کے لئے تھی جیسا کہ اللہ کی رحمت سب بنی نوع انسان کے لئے ہے بلکہ ہر مخلوق پر حاوی ہے۔

پس فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ سے طبعًا اور قطعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آنحضورﷺ کی رحمت جو خدا سے آپؐ پر اتری وہ اسی طرح بندوں میں تقسیم ہوئی بلکہ مخلوق نے بھی اس سے حصہ پایا اور یہ وہ رحمت ہے جو بنی نوع انسان کو ایک ہاتھ پر جمع کرنے کے لئے ضروری ہے ورنہ کوئی نظام بنی نوع انسان کو ایک ہاتھ پر جمع نہیں کر سکتا۔ یہ مرکزی نکتہ ہے جو بہت ہی قابل توجہ ہے اور اگر یہ رحمت نہ ہو جو بندوں کو آپس میں باندھے تو ان کا کوئی نظام شوریٰ بھی فائدہ مند نظام شوریٰ نہیں ہو سکتا۔ اگر نفرتوں سے دل پھٹے ہوئے ہوں اور ایک نیشنل اسمبلی کی چھت کے نیچے وہ شوریٰ کی خاطر، مشوروں کے لئے اکٹھے ہو جائیں تو جوتیوں میں دال تو بٹ سکتی ہے مگر فائدے کی چیزیں رونما نہیں ہو سکتیں۔ پس قرآن کریم کی تعلیم دیکھیں کیسی کامل ہے اور کیسی پر حکمت اور کتنی گہری اور کتنی باہم مربوط ہے۔ ذکر رحمت کا چلا ہے بات شوریٰ پہ ختم فرماتا ہے کیونکہ یہ بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط ہے۔

کوئی انسان جو رحمت سے عاری ہو یا اپنے بھائی کے لئے اس کا دل محبت سے خالی ہو وہ نہ مشورہ لینے کا اہل ہوتا ہے نہ مشورہ دینے کا اہل ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ مشاورت کا لفظ بولا ہے یا شوریٰ کا **المستشار مؤتمن** کہ شوریٰ یا مشاورت یعنی ایک دوسرے سے باہمی مشورہ کرنا ایک امانت ہے اور جس سے مشورہ کیا جائے اس کا فرض ہے کہ بعینہٖ وہی بیان کرے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے لئے بہتر ہے اور اپنے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ مشورہ کرنے والے کے مفاد کی خاطر مشورہ دے اور جب وہ مشورہ طلب کرے گا تو اس سے بھی بعینہٖ یہی سلوک ہوگا۔ پس یہ بات آپس کے تعلقات ہی میں نبھ سکتی ہے ورنہ ناممکن ہے۔ ورنہ اگر آپس میں محبت نہ ہو، ایک دوسرے کے بدخواہ لوگ ہوں تو جب بھی مشورہ مانگا جاتا ہے کوئی چکر والا مشورہ دیا جاتا ہے تا کہ اس سے مشورہ لینے والا تباہ ہو جائے اور دنیا کا نظام، نظام شوریٰ اگر بعینہٖ ایسا نہیں تب بھی اس میں فساد کی راہیں اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی ایک نظام شوریٰ بھی نہیں جس کے متعلق ہم یہ کہہ سکیں کہ وہاں ہر مشورہ دینے والا امین ہوتا ہے۔ بلکہ وہ نظام شوریٰ جو پارٹیوں میں تقسیم ہو چکا ہے اس میں مخالفت برائے

مخالفت، پارٹی کی تائید یا پارٹی کی مخالفت کی وجہ سے ایک ایسا روزمرّہ کا دستور بن جاتا ہے کہ اس سے ہٹنے والا قوم کا یا اس پارٹی کا بے وفا سمجھا جاتا ہے۔ ابھی انگلستان کی پارلیمنٹ میں بھی ایسے واقعات ہوئے۔ ایک پرانے کنزرویٹو ممبر نے کسی اختلاف کی وجہ سے جس کو اس نے اصولی اختلاف قرار دیا پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کیا اور بہت شور پڑا اس پر اور ان کی اپنی Constitution میں بھی ان کے خلاف، مخالفت کی آوازیں اٹھائی گئیں مگر یہ ضرور ہے کہ ان کا حق ضرور تسلیم کیا گیا۔ چھوٹے اور غریب ملکوں میں تو حق کے ساتھ ایسا حق استعمال کرنے والا بھی مارا جاتا ہے۔ مگر بہر حال نظام ہے نظام میں کجی ہے اور اس نظام کی رو سے الا ما شاء اللہ جیسا کہ میں نے مثال دی ہے خواہ انسان حق سمجھے یا نہ سمجھے پارٹی کی وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ پارٹی کے ساتھ رہیں اور اسلامی نظام میں پارٹی کا وجود ہی کوئی نہیں ہے اور پارٹی کا وجود مٹنا اپنی ذات میں ایک بہت بڑی رحمت ہے کیونکہ ہر شخص اپنے نفس کی خاطر نہیں بلکہ اپنے نفس کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ محض اللہ کی خاطر فیصلہ کرنا ہے۔ محض اللہ کی خاطر مشورہ دینا ہے۔ یہ اصولاً تو بات ٹھیک ہے مگر چل نہیں سکتی جب تک کہ رحمت کا مضمون اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ اس کا قطعی ثبوت قرآن کریم کی یہ آیت اس رنگ میں پیش کرتی ہے کہ تمہارے قومی معاملات میں جو باہمی محبتیں اور باہمی ربط کے سلسلے جاری ہوں گے ان کی بناء عقلی نہیں ہے، ان کی بناء دلائل پر نہیں ہے۔ یہ جو قومی وحدت ہے محض رحمت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بڑا اس کا ثبوت نہیں ہوسکتا کہ فرمایا لَوْكُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ کہ اے محمد ﷺ! تیرے جیسا کامل فہم والا انسان، اولوالالباب کا سردار تو بھی ان کو اکٹھا نہیں کرسکتا تھا اگر رحمت سے خالی ہوتا۔ پس عقل کبھی بھی قوموں کو اکٹھا باندھ نہیں سکتی۔ تدبیریں کبھی قوموں کو اکٹھا نہیں رکھ سکتیں۔ ایک مرکز پر جمع ہونا رحمت سے تعلق رکھتا ہے۔ باہمی محبت اور پیار اور ایک دوسرے کا ادب، ایک دوسرے کا خیال، ایک دوسرے کے مفادات کو اپنے مفاد سمجھنا یہ سب رحمت کے تقاضے ہیں جن کے نتیجے میں قومی وحدت ظہور میں آتی ہے۔ پس فرمایا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ تجھ پر جو خدا کی رحمت ہے وہ تو اتنی ہے کہ اسی رحمت کا ایک طبعی تقاضا تھا کہ تو ان کے لئے نرم پڑ گیا۔

آنحضرت ﷺ کو یہ کیوں فرمایا ہے کہ رحمت کی وجہ سے تو نرم پڑا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں

Absolute Leadership ہو وہاں ماتحت کے لئے نرمی رفتہ رفتہ غائب ہونی شروع ہو جاتی ہے سوائے اس کے کہ اللہ کا حوالہ ہمیشہ پیش نظر رہے اور یہ ایک ایسا طبعی اصول ہے جس کے تابع جتنا بلند مرتبہ اور زیادہ طاقتور بادشاہ ہوگا اتنا ہی اپنے آپ کو غریبوں کے مسائل کا خیال کرنے کا کم پابند پائے گا۔ اتنا ہی اس میں ایک ایسی غناء پیدا ہوتی چلی جائے گی جو قابل تعریف غناء نہیں بلکہ قابلِ مذمت غناء ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ اس سے ہنس کے ہی بات کروں۔ پس یہ وہ مضمون ہے جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کو بطور خاص خدا تعالیٰ نے چن کر فرمایا کہ تو اپنی تمام عظمتوں کے باوجود اگر خدا کی رحمت تجھے بطور خاص عطا نہ ہوتی تو ضروری نہیں تھا کہ ان کے لئے نرم ہوتا کیونکہ انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ یہ فطرت انسان کو بعض دفعہ اپنے بہاؤ پر اس طرح لے کے چلتی ہے کہ چلنے والے اور بہنے والے کا کوئی اختیار نہیں ہوا کرتا۔ Moving Plateforms ہوتے ہیں۔ کشتیوں میں، سمندروں میں، دریاؤں کے بہاؤ کے ساتھ مسافر خود بخود آگے بڑھتے ہیں۔ پس یہ وہ مضمون ہے جو فطرت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کبھی بنی نوع انسان میں کسی کو اپنے غلاموں پر اختیار نہیں دیا گیا۔ اور غلام بھی ایسے کامل تھے کہ انہوں نے اپنا سب کچھ آنحضور ﷺ کے حوالے کر رکھا تھا یہاں تک کہ یہ بھی دستور تھا کہ جب آپؐ مشورہ مانگتے تھے تو عرض کیا کرتے تھے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں مشورہ دینے والے۔ اسی لئے قرآن کریم فرماتا ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ اے محمد رسول اللہ ﷺ! یہ تو تیرے کامل غلام بنے ہوئے ہیں یہ بندوں کی طرح تیرے حضور حاضر رہتے ہیں ان کو کہہ اے میرے بندو! یہاں بندے کہہ کر خدا سے الگ بندگی مراد نہیں بلکہ یہ پیغام ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کیوں کہ عبد کامل ہیں اس لئے جو ان کا بندہ بنتا ہے وہ خدا کے سوا کسی کا بندہ بن ہی نہیں سکتا اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے کہ تو ان کو اپنا بندہ کہہ دے تا کہ ان کی توحید پرستی کی تعریف ہو کیونکہ محمد ﷺ کا بندہ خدا کا بندہ ہے اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں ہے۔

پس اس پہلو سے فرمایا کہ تو اتنی عظمتوں کا مالک، تجھے خدا نے سارے اختیار دے دیئے یہ بھی تیرے حضور اپنی گردنیں جھکائے بیٹھے ہیں لیکن اگر تجھے وہ رحمت عطا نہ ہوتی جس کے نتیجے میں طبعی محبت کے جوش سے تو ان پر جھکا ہے، عقلی تقاضوں کی وجہ سے نہیں محبت کی وجہ سے، تو پھر ان کو تو

اکٹھا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ محبت، محبت کو پیدا کرتی ہے اور محبت کے بغیر محبت پیدا ہو نہیں سکتی۔ اس لئے ظاہری، عقلی اطاعت اور چیز ہے محبت کے تقاضوں کے نتیجہ میں اطاعت اور چیز ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام کبھی آپس میں جڑ نہ سکتے خواہ حضور کے سامنے گردنیں جھکا دیتے اگر رسول اللہ ﷺ کی محبت کا فیض نہ ہوتا یہ وہ مضمون ہے اور پھر بالآخر آنحضرت ﷺ سے بھی دور ہٹنا شروع ہو جاتے کیوں کہ جس کو محبت سے نہ باندھا گیا ہو وہ عذر ڈھونڈتا ہے۔ ذرا سا بھی عذر پیدا ہو جائے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے اور دور نکل جاتا ہے لیکن محبت ہو تو بڑی سے بڑی سزا کو بھی انسان خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ محبت ہو تو بڑی سے بڑی سختی بھی دل پر اتنی ناگوار نہیں گزرتی کہ انسان کا دل اپنے محبت کے رشتے توڑ کر الگ ہو جائے۔ کچھ دیر غم کی حالت رہے گی مگر پھر رہے گا وہیں کا وہیں اس سے دور ہٹ نہیں سکتا۔ یہ جو کشش ثقل ہے یہ بھی تو محبت ہی ہے اس کے سوا اس کی اور کوئی طاقت نہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ محبت دنیا کی ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ہے۔ چنانچہ کشش ثقل کا راز سائنس دان اتنی ترقی اور غور و فکر کے باوجود بھی آج تک سمجھ نہیں سکے اور جو زیادہ دانشور ہیں اور حق پرست ہیں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں اس کی سمجھ نہیں آئی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ ڈاکٹر عبدالسلام سے گفتگو کے دوران وہ جانتے ہیں جو چار بنیادی طاقتوں کو آپس میں ملانے کے لئے دو کا راز سمجھ گئے اور چار کی بجائے تین طاقتیں رہ گئیں ہیں جن کے متعلق رشتے ڈھونڈے جا رہے ہیں کن رشتوں سے ان کو باہم ملا کر ایک بنایا جائے لیکن آخری طاقت کشش ثقل کی ہے۔ کشش ثقل کی طاقت اتنی مشکل ہے سمجھنے کے لحاظ سے کہ حساب بے کار ہو جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ اس کو کس طرح ظاہر کیا جائے کہ یہ طاقت ہے کیا چیز؟ جس قوت کے ساتھ زمین ہر چیز کو اپنے گرد سمیٹے ہوئے ہے جو Energy خرچ ہو رہی ہے اس پر وہ اتنی بھی نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ میں کسی وزن کو اٹھائے تو اس پر جو خرچ ہوتی ہے اتنی ہو۔ چونکہ محبت دونوں طرف ہے زمین جن چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے وہ چیزیں زمین کی طرف کھنچتی چلی آ رہی ہیں۔ اس لئے محبت کے مضمون کو سمجھے بغیر یہ سائنس کا مضمون حل ہو ہی نہیں سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بھی محبت کے کرشمے سے تمام کائنات کو آپس کے بندھنوں سے باندھا ہے۔ اور اسی محبت کے نتیجے میں پھر دوسری طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بجلی کی طاقت ہے Electricity ہے۔ یہ کشش ثقل کی براہ راست مرہون منت ہے۔ اگر کشش ثقل نہ ہو تو کوئی چیز اوپر اٹھ کر نیچے نہیں

گرے گی تو طاقت نہیں پیدا کرے گی۔ بارش کا پانی جب گرتا ہے تو پھر اس سے بجلی بنتی ہے۔ وہ گرتا کیوں ہے؟ کشش ثقل کی وجہ سے گرتا ہے۔ لیکن یہ مضمون بہت تفصیلی ہے اس کی بحث میں نہیں میں جاؤں گا۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رحمت کا جو ذکر ہے۔ یہ سب سے بنیادی طاقت ہے۔ جس سے آگے سب طاقتیں پھوٹتی ہیں اور آنحضرت ﷺ ایک ہی نبیؐ ہیں جن کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ دنیا کی تمام کتب کا آپ مطالعہ کر لیں کہیں بھی کسی نبیؑ کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ قرار نہیں دیا۔ قوموں کے لئے رحمت تو پیدا ہوئے لیکن عالمین کے لئے ایک ہی نبی تھا جسے رحمت کا مظہر بنا کر بھیجا گیا اور یہی رحمت ہے جس کو شوریٰ کی بناء بنایا گیا ہے، شوریٰ کی بناء قرار دیا گیا ہے۔ اگر رحمت کے بغیر محض عقل کے بندھن ایک قوم کو باندھے ہوئے ہوں تو ان کے مشوروں میں سچا تقویٰ اور دیانت پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے لئے رحمت اس لئے ضروری ہے کہ اگر آپ کو کسی سے محبت ہو اور وہ آپ سے پوچھے کہ رستہ کون سا ہے تو آپ بے اختیار ہیں۔ آپ کی دیانت کی بحث نہیں ہے، آپ کی محبت کی بحث ہے۔ آپ اسے ضرور صحیح رستہ بتائیں گے، غلط رستے پر ڈال سکتے ہی نہیں۔ ایک ماں اپنے بچے کو غلط مشورہ نہیں دے سکتی۔ لاعلمی اور جہالت کی اور بات ہے، مگر جہاں تک اس کی تمام تر کوشش کا تعلق ہے، وہ سچا مشورہ ہی دے گی۔ پس مشوروں میں سچائی کے پیدا ہونے کے لئے رحمت ضروری ہے ورنہ مشوروں میں سچائی پیدا نہیں ہو سکتی اور اگر مشورے سچائی سے عاری ہوں تو ان میں طاقت پیدا نہیں ہوتی۔ پس جس طرح کشش ثقل پر آپ غور کریں تو تمام تر طاقتیں بالآخر اسی کشش کی مرہون منت بنتی ہیں۔ اسی طرح محبت ہی کی مرہون منت تمام انسانی تعلقات ہیں اگر وہ صحیح ہیں اور اسی کے تصرف کے نتیجے میں پھر نئی نئی طاقتیں وجود میں آتی ہیں، نئے نئے تعلقات ابھرتے ہیں۔

پس مجلس شوریٰ جو اس وقت ربوہ میں ہو رہی ہے ان کو میں سمجھا رہا ہوں کہ یہ وہ شوریٰ کا مضمون ہے جسے وہ ہرگز کبھی نظر انداز نہ کریں اور ان کے حوالے سے تمام دنیا کی جماعتیں بھی اس بات کو سمجھیں۔ وہ لوگ جو کسی عہدیدار کا عناد لے کر اس کمرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں مومن مشورے کے لئے بیٹھے ہیں وہ دودھ میں زہر گھولنے کی خاطر آتے ہیں۔ وہ حقیقت میں اس بات

کے اہل نہیں ہیں کہ اس جگہ داخل ہوسکیں۔ وہاں محض رحمت والے لوگوں کا کام ہے رحمت کے نتیجے میں ہی شوریٰ کا نظام بنتا ہے رحمت کے نتیجے میں ہی یہ نظام زندہ اور دائم ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ پس سب سے اہم مشورہ اس آیت کے منطوق کے پیش نظر ربوہ میں جو پاکستان کی مجلس شوریٰ ہورہی ہے، ان کو میرا یہی ہے کہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں کیا ان سب بھائیوں سے آپ کا باہمی محبت کا تعلق ہے یا کچھ کی رائے آپ کو بری لگی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو تقریر کے لئے آتے ہیں تو آپ بل کھاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس کے دلائل کا کیا توڑ کروں۔ اگر یہ ہے تو جہاں جہاں ہے وہاں وہاں مجلس شوریٰ کے نظام میں رخنہ پیدا ہوگیا ہے۔ پس اگر تعلقات بگڑے ہوئے بھی ہوں تو خدا کی خاطر ایسے موقع پر جب کہ خدا کے نام پر مشورے کے لئے بلایا جائے اپنے بگڑے ہوئے تعلقات کو باہر پھینک کر آئیں اور اگر ایسا کریں گے اور خدا کی خاطر ایسا کریں گے تو باہر نکل کر بھی آپ کا دل پھر ان کو اٹھانے کو نہیں چاہے گا۔ وہ مکروہ مردہ صورتیں دکھائی دیں گے اور حقیقت میں ایک نیکی دوسری نیکی کو ضرور پیدا کرتی ہے۔

پس اللہ کی خاطر اپنے دلوں کو باہمی رنجشوں سے پاک کریں اور ساری دنیا میں نظام جماعت کی بناء چونکہ شوریٰ پر رکھی گئی ہے اور شوریٰ کا خلیفہ وقت سے وہ رابطہ ہے جو قرآن نے محمد رسول اللہ ﷺ کا مومنوں کی جماعت سے قائم فرمایا تھا اور وہی رابطہ ہے جو زندہ رکھنے کے لائق ہے ورنہ کوئی رابطہ زندہ رکھنے کے لائق نہیں۔ اسی رابطے کے نتیجے میں جماعت کو تقویت نصیب ہوگی، اسی رابطے کے نتیجے میں جماعت کو وحدت نصیب ہوگی، اسی رابطے کے نتیجے میں جماعت کو سرخروئی عطا ہوگی، اسی رابطے کے نتیجے میں جماعت اپنے مسائل پر ایسے غور کرے گی کہ دنیا بھر کی بڑی سے بڑی طاقتیں بھی اس قسم کے پاکیزہ غور سے محروم ہوں گی جو اس چھوٹی سی جماعت کو اللہ تعالیٰ یہ سعادت نصیب فرمائے گا جیسا کہ ہمیشہ فرماتا رہا ہے۔ تو پہلا نکتہ حکمت کا یہ ہے کہ مشوروں سے پہلے اپنے دلوں میں نرمی پیدا کیا کریں اور رحمت کا نمونہ دکھائیں۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو ایک اور لطیف انداز میں بھی بیان فرمایا۔ فرمایا جب رسول کی خدمت میں مشورے کے لئے حاضر ہوا کرو تو کچھ صدقہ دیا کرو۔ وہاں صدقے سے مراد ہدیہ بھی ہے جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ نے مثلاً اس مضمون پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور یہ مسلمہ ترجمہ چلا آ رہا ہے، ہدیہ بھی ہے اور اگر کسی غریب کو صدقہ دیا جائے خدا کی رضا کی خاطر کہ اللہ تعالیٰ صحیح معنوں

میں اپنا مضمون پیش کرنے کی توفیق بخشے اور صحیح مشورہ حاصل کرنے کی توفیق بخشے تو یہ بھی اس میں شامل ہے اس لئے ہرگز اسے ہدیہ پر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ہرگز لازم نہیں کہ جو بھی پیش ہو وہ ہدیہ دے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے بعض لوگوں کو شاید یہ سن کر شاق گزرے تو فرمایا ءَ اَشْفَقْتُمْ کیا تم ڈر گئے ہو اس بات سے کہ کچھ دینا ہوگا۔ نہیں دے سکتے، استغفار کرو، کچھ نہ دو۔ مگر وہ دینے میں حکمت کیا ہے۔ وہ حکمت وہی محبت کے رشتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک طبعی محبت کا رشتہ پیدا ہوتا ہے جو دو طرفہ ہے اور دونوں طرف برابر اثر دکھاتا ہے۔ اس مضمون سے ہٹ کر عام انسانی تعلقات پر غور کریں تو آپ کو آسانی سے بات سمجھ آ جائے گی۔ جب بھی آپ کسی کو محبت کی وجہ سے تحفہ دیتے ہیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو زیادہ خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ تحفہ دینے والا کبھی بھی گھٹن محسوس کر کے تحفہ نہیں دیا کرتا۔ وہ تو ٹیکس ہوگا یا چٹی ہوگی۔ تحفے کے اندر محبت کا مضمون ایسا داخل ہے کہ اسے الگ کیا جا ہی نہیں سکتا۔ پس یہ خیال کہ جو تحفہ دیتا ہے وہ دوسرے کو خوش کرتا ہے یہ بالکل سادہ بچگانہ خیال ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تحفہ دیتا ہے تو اس کو سجاتا اس لئے ہے کہ دوسرا خوش ہو، ورنہ دینے والا خوش نہیں ہوگا۔ پس درحقیقت دینے والے کو اپنی خوشی زیادہ منظور ہوا کرتی ہے کیونکہ اس تحفے کے بدلے وہ پیار جیتنے جاتا ہے اور جانتا ہے کہ پیار ملے گا اس لئے وہ زیادہ پیار لینے کی خاطر تحفے کو اس طرح سجا کر بنا کر پیش کرتا ہے اور نظر رکھتا ہے کہ دیکھیں کیا اثر ہوا ہے اس کا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں ہم آپ کے سامنے کھول کے دکھاتے ہیں کیا چیز ہے۔ یہ کوئی رسمیں نہیں ہیں، دکھاوا نہیں ہے۔ یہ محبت کے رشتے ہیں اور محبت سے ایسی باتیں خود بخود پیدا ہوتی ہیں۔

پس آنحضرت ﷺ سے بھی جہاں مشورہ لینے کا ارشاد ہے۔ وہاں اس مضمون کو پھر داخل فرما دیا گیا اور خدا تعالیٰ سے رشتے باندھنے کے لئے فرمایا اپنا سب کچھ اپنے ارادے کے لحاظ سے اس کے حضور حاضر کر دو۔ التحیّات للّٰہ ہر روز نماز میں ہمیں یہ عہد یاد دلاتا۔ ہر نماز کے تشہد میں ہمیں یہ بات یاد دلائی گئی کہ تم نے خدا سے ایک سودا کیا ہوا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: 111) کہ اللہ نے سب مومنوں سے ایک ایسا سودا کر لیا ہے کہ اب نہ ان کے اموال ان کے رہے، نہ ان کی زندگیاں ان کی رہیں، سب کچھ خدا کے ہو گئے ہیں۔ پس جب ہو چکے، تو جب چاہے، جتنا چاہے اس میں سے طلب کر لے اور اس مضمون کو فرمایا یہ

تحیّات ہیں، یہ تحفے ہیں، کوئی ٹیکس نہیں ہے۔

پس چندوں کا نظام آپ دیکھیں اس میں ادنیٰ بھی ٹیکس کی بو نہیں ہے۔ ورنہ جو ٹیکس ادا نہ کرے اسے کئی قسم کی سزائیں ملتی ہیں اور پکڑا جاتا ہے، مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر چندے کے نظام میں ایک پوری آزادی حاصل ہے۔ جو چاہے قربانی پیش کرے جو چاہے نہ کرے کیونکہ یہ تحفہ ہے۔ اگر خدا سے اتنا سا اس کا تعلق ہے کہ جو کچھ اس نے دیا تھا وہ بھی اس کے حضور لوٹا نہیں سکتا تو اسی حد تک وہ عہد کی پابندی سے الگ ہو گیا اور جو سزا کا تصور ہے وہ صرف بدعہدی کے نتیجے میں طبعی نتائج ہیں حقیقت میں Coercion نہیں ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ جو چندے نہیں دیتا اس کو مجلس شوریٰ میں ووٹ دینے کا حق نہیں، کسی مرکزی عہدے کو سنبھالنے کا حق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خدا کی محبت کے تحفے اس کو اس بات کا اہل بناتے ہیں اس کے نتیجے میں اس کے دل میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور جس سے وہ محبت کرتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنی جان عزیز کو بھی اس کے حضور میں پیش کر دیتا ہے اپنے کمائے ہوئے مالوں کو بھی جو اسے بہت محبوب ہوتے ہیں اس کے حضور پیش کرتا ہے۔ اگر ایسا کرتا ہے تو محبت کے رشتوں میں باندھا ہوا ہے اس کا مشورہ قیمتی ہے۔ اس کے مشورے کی قدر ہے۔ اس کے کام میں برکت ہوگی۔ مگر اگر ایسا نہیں کرتا تو خدا کو ایسے شخص کے مشوروں کی ضرورت کیا ہے یعنی خدا والوں کو، اس کا نظام چلانے والوں کو ایسے شخص کے مشوروں کی نہ ضرورت ہے، نہ ان کی نظر میں کوئی قیمت ہے۔ پس اگر یہ سزا آپ سمجھتے ہیں تو یہ ایسی سزا تو نہیں کہ اس کے نتیجے میں وہ پیسے دینے پر مجبور ہو جائے۔

بعض لوگ جو خدمت نہیں کر سکتے چندے نہیں دے سکتے وہ وقت بھی قربان نہیں کرتے، بہت کم ہیں جو ایسا کرتے ہیں کہ چندوں میں ہاتھ روک لیتے ہیں اور وقت کی قربانی کے لئے آ جاتے ہیں۔ ان میں بھی یاد رکھو کہ ان کی وقت کی قربانی محبت کی وجہ سے نہیں ہوتی دکھاوے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں عہدے سنبھالنا ہماری دنیاوی عزت کا موجب ہے۔ وہ سمجھتے ہیں ہم اگر کاموں میں آگے آئیں گے تو ہماری چودھراہٹ بڑھے گی۔ پس ایسے لوگ ابتلاؤں میں سب سے پہلے مارے جاتے ہیں۔ اسی لئے میں جماعت کو بار بار نصیحت کرتا ہوں کہ خدمت کے کام لیں لیکن یاد رکھیں جو خدا کی راہ میں مالی قربانی کرتا ہے وہی وفادار ہے وہی وقت پر آپ کے کام آئے گا ورنہ

ویسے چودھراہٹ کے لئے آگے آنے والے ہر ابتلا میں ٹھوکر کھا سکتے ہیں اور بنیادی طور پر ٹھوکر کھائے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ فتنوں میں مبتلا لوگ ہیں جن سے آپ کام لے کر دھوکہ کھا رہے ہیں کہ گویا وہ خدا کی خاطر خدمت کر رہا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات میں نے عملاً اس غرض سے جائزہ لیا ہے کہ وہ لوگ جو منافقانہ رنگ رکھتے تھے جن کے نفاق ننگے ہوئے ان کی مالی قربانی کا جائزہ لیا تو صفر نکلا یا اتنا معمولی کہ گویا وہ سانس اٹکانے کی خاطر کچھ دے رہے ہیں مگر سخت مجبوری کے پیش نظر۔ اور اس کی مثال ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں جب بھی کوئی ابتلا آیا ہے میں نے ہمیشہ ایسے لوگوں کے ریکارڈ نکلوائے اور دیکھا تو پتا چلا کہ پتا نہیں کیوں دھوکے کی وجہ سے کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ یہ تو خالی کھوکھلے لوگ تھے ان سے کام لینا ہی نہیں چاہئے تھا۔ ان کے سپرد اہم ذمہ داریاں کرنی ہی نہیں چاہئیں تھیں۔ مگر لاعلمی میں یا بظاہر بعض دفعہ کسی کی شان و شوکت ایسی ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اتنا مخلص آدمی ہو سکتا ہے بھلا کہ یہ قربانی میں پیچھے ہو اس لئے مزید جستجو ہی نہیں کی جاتی اور ان کو کاموں میں قبول کر لیا جاتا ہے اور جب وقت آتے ہیں تو ان کے کاموں میں خلاء نکلتے ہیں، ان کے کاموں میں کمزوریاں رہ جاتی ہیں۔ بعض دفعہ ان کے جماعت کے نام پر کئے ہوئے معاہدوں میں ایسے رخنے ملتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص جو محبت کی وجہ سے خدا کی خاطر قربانی دینے والا ہو وہ بے اعتنائی سے وہ معاہدے کر ہی نہیں سکتا۔ ایک ایک پیسے کی خاطر اس کی جان نکل رہی ہوتی ہے۔ اپنی خاطر نہیں بلکہ اللہ کی خاطر کہ میں خدا کا امین ہوں کہیں کوئی ایسا سودا نہ ہو جائے جس سے ہمیں کوئی نقصان پہنچے۔ تو یہ سارے مضامین آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

پس شوریٰ کے لئے دوسرا مشورہ یہ ہے اور بڑا اہم ہے کہ جو خدا کی خاطر قربانیاں دینے والے ہیں ان کو آگے لایا کریں اور اپنی سوچوں میں اس مضمون کو ہمیشہ داخل کریں کہ انتخاب کرتے وقت محض ظاہری طور پر اچھے، سمجھدار لوگ آپ کے پیش نظر نہ رہیں۔ یہ دیکھا کریں کہ ان میں ٹھوس خدمت کرنے والا، تقویٰ سے مشورہ دینے والا کون ہے اور کس کا سب کچھ خدا کے لئے حاضر رہتا ہے۔ وہ غریب ہو یا امیر ہو کالا ہو یا گورا ہو یہ بحثیں بالکل بے تعلق ہیں۔ پس جو خدا کو تحفے دیتا ہے جس کے التّحیّات لِلّٰہ خدا کے حضور اس کا ایک تعلق قائم کرتے ہیں وہ زیادہ اہل ہے کہ وہ مشورے دے۔ پس مجلس شوریٰ میں انتخاب کے وقت جانی اور مالی قربانیاں دونوں ہی پیش نظر رہنی چاہئیں

اور عادتاً اس کا مزاج دیکھنا چاہئے کہ یہ عبد بن چکا ہے کہ نہیں۔ ایسے عباد جو ہیں جب وہ مشورہ دیں گے تو پھر لازماً ان مشوروں میں وقعت پیدا ہوگی ان کے اندر قدر و قیمت ہوگی کیونکہ یہ مشورے محض قانون سازی نہیں بلکہ ان کے اندر کچھ اور مضمون ہے۔

اب بقیہ نصیحتوں سے پہلے میں اس مضمون کو آگے بڑھاتا ہوں۔ یہ مشورے ہیں کیا، ان کی حیثیت کیا ہے۔ فرمایا فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ یہ لوگ جو ہیں جن سے تجھے پیار ہے تیرا دل ان پر جھکا ہوا ہے کیونکہ تو نے خدا کی رحمت سے حصہ پایا ایسا حصہ پایا کہ کبھی کسی اور نے نہیں پایا تو تمام وہ عالم جو خدا کی مخلوق ہے جو خدا کی رحمت سے کسی نہ کسی رنگ میں حصہ پاتا ہے وہ سارا عالم تیری رحمت کے تابع کر دیا گیا۔ پس ان سے وہ سلوک کر جو اللہ تعالیٰ اپنے پاک اور اپنے پیارے بندوں سے کرتا ہے خواہ وہ گنہگار بھی ہوں۔ فرمایا فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ان کو بخش دے۔ ان سے عفو کا سلوک کر اور ان کے لئے بخشش طلب کر۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور اللہ تعالیٰ میں جو ایک ایسا فرق ہے جو خالق اور مخلوق میں ہے جو رحمت کے اکٹھا ہونے کے باوجود لازماً رہے گا وہ استغفار کا مضمون ہے۔ جو خدا کے گناہ (حقوق اللہ) ہوتے ہیں ان کو نبی بخش نہیں سکتا۔ نبی اپنے خلاف باتوں کو نظر انداز فرما دیا کرتا ہے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ کا مطلب یہ ان سے جو کمزوریاں لاحق ہوتی ہیں جہاں تک ممکن ہو نظر پھیر لیا کر، پرواہ نہ کیا کر کیونکہ جب پیار ہو تو ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ایک ماں کا محبوب بچہ ہو اس سے برتن ٹوٹ بھی جائے تو ماں دوسری طرف دیکھ لیتی ہے۔ کوئی اور کام ایسا سرزد ہو جائے جسے بعض دوسرے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے جان بوجھ کر وہ غفلت دکھاتی ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں ہوا تو یہ حصہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ اس معاملے میں کوئی مابہ الامتیاز بندے اور خدا کے درمیان نہیں۔ فرمایا تجھے محبت ہے ہم جانتے ہیں تجھے ان سے پیار ہے تو ان پر جھک گیا ہے لِنْتَ لَهُمْ بہت ہی عظیم مضمون ہے۔ تیرا دل نرم پڑ چکا ہے ان کے لئے، تو ان پر اس طرح بچھا جا رہا ہے جیسے ماں بچے پر بچھتی ہے اس لئے عفو کی حد تک جہاں تک ممکن ہے ان سے یہ سلوک کر۔ لیکن ان سے ایسی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں جو خدا کو ناراض کر دیں۔ پس ہمیشہ ان کے لئے بخشش طلب کرتا رہ۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اب باری آئی ہے شوریٰ کی۔ وہ لوگ جن سے ایسا پیار ہو، جن

کی اس طرح تربیت کی جارہی ہو، جن کے لئے دعائیں مانگی جارہی ہوں، جن کی کمزوریوں سے جہاں تک ممکن ہے صرف نظر کیا جا رہا ہو ان سے مشورہ مانگ فِي الْاَمْرِ ۔ الْاَمْرِ کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے اہم معاملات میں ۔ ورنہ روز مرّہ کی ہر بات میں تو مشورہ نہیں چل سکتا۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ لیکن ان کے مشورے کی حیثیت مشورے ہی کی ہے۔ امر تیرے پاس ہے۔ خدا کی طرف سے تو مجاز بنایا گیا ہے۔ پس جب یہ مشورہ دے بیٹھیں تو فیصلہ ان کا نہیں تیرا چلے گا۔ فَاِذَا عَزَمْتَ پس جب تو ایک فیصلہ کر لے فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ تو توکل پھر اللہ پر کرنا ہے، ان پر نہیں کرنا۔ ان پر توکل نہیں کرنا، اللہ پر توکل کرنا ہے اس میں ایک اور مضمون ہے جو ان الفاظ کے لباس میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس نے آخری فیصلہ کرنا ہے وہ پابند تو نہیں کہ بات مانے۔ وہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چند آدمیوں کی مان لے اور اکثر کی ردّ کر دے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب کی ردّ کر دے مشورہ کرے اور کہے میں اس کو درست نہیں سمجھتا جو کچھ تم نے کہا ہے غلط ہے میں اب فیصلہ کروں گا۔ تو مراد یہ نہیں کہ مشورہ بے کار تھا۔ مراد یہ ہے کہ ہر مشورہ دینے والا اپنی ایک عقل وفہم رکھتا ہے اور نسبتاً کم عقل وفہم رکھنے والوں کی اکثریت بھی ہو جائے تو ممکن ہے ایک اکیلا شخص جو ان میں سے ہر ایک سے زیادہ عقل وفہم رکھتا ہو اس کا فیصلہ ان سب پر غالب ہو۔ اس لئے بسا اوقات ایک عقل مند کی بات دوسرے نسبتاً کم عقل مندوں کی بات پر حاوی ہو جاتی ہے باوجود اس کے کہ کم عقل مندوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ ایک طبعی امر ہے، ایک حسابی امر ہے، اس میں کسی وہم کا کوئی شائبہ تک نہیں، حقیقت ہے۔ ہر بات ہر شخص کو سمجھ نہیں آتی لیکن ایک صاحب فہم آدمی کی جب دوسرے نسبتاً کم فہم لوگ مدد کرتے ہیں تو اس کی فہم میں ان کی فہم کے مثبت پہلو شامل ہو جاتے ہیں اور وہ اور زیادہ جلاء کے ساتھ، اور زیادہ بلند مقام پر فائز ہوتے ہوئے فیصلے کی اہل بنتی ہے۔ پس مشورہ بے کار نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ صاحب عقل ہیں، سب سے زیادہ اولوالالباب میں آپؐ کا مقام ہے اس لئے آپؐ کو مشورے کی ضرورت نہیں۔ مشورے کی ضرورت اس لحاظ سے ہے کہ عقل کل صرف اللہ ہے اور اس کے نیچے آنحضرت ﷺ نے سب سے زیادہ عقل سے حصہ پایا لیکن اور بھی ہیں جو اولوالالباب ہیں کثرت سے ان کا وجود موجود ہے خاص طور پر غلامان محمد مصطفیٰ ﷺ میں اولوالالباب کی کثرت تھی۔ ان سے بھی پوچھو، ہوسکتا ہے

بعض باتوں پر تمہاری نگاہ نہ پڑی ہو یا بعض باتیں تمہیں معلوم نہ ہوں جو ان کو معلوم ہیں۔

اب یاد رکھیں مشوروں میں صرف عقل کام نہیں کیا کرتی علم کا بھی ایک تعلق ہے۔ Facts جو Feed کر رہے ہیں ان Facts کے مطابق کمپیوٹر فیصلہ کرتا ہے۔ کیسا ہی اعلیٰ کمپیوٹر کیوں نہ ہوا گر اس میں بعض Facts ڈالے ہی نہ گئے ہوں تو بعید نہیں کہ اس کا فیصلہ غلط نکلے۔ تو مشورے میں صرف عقل کا مقابلہ نہیں ہے۔ مجموعی علم کا بھی سوال اٹھتا ہے اور عالم الغیب چونکہ صرف خدا ہے اور کوئی رسول بھی عالم الغیب نہیں اس لئے تمام وہ اولوالالباب جن کی عقلیں تقویٰ کی وجہ سے صیقل کی جا چکی ہیں اور مختلف زاویوں سے مختلف باتوں کا علم رکھتے ہیں وہ سب جب اکٹھے ہوں گے تو اپنے اپنے علم کو اپنی اپنی عقل کے ساتھ ملا کر کچھ باتیں پیش کریں گے۔ صاحب تقویٰ ہیں اس لئے جان بوجھ کر کسی غلط بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ سے محبت رکھتے ہیں، رسول ﷺ سے محبت رکھتے ہیں، اس لئے جان بوجھ کر ان کو غلط رستے پر چلانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان حالات میں مجلس شوریٰ بنتی ہے اور مجلس شوریٰ پر عمل ہوتا ہے اور پھر جو بات کی جاتی ہے اس کے بعد جس کو مشورہ دیا جائے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی بات ہو رہی ہے اس وقت فرمایا کہ مشورے کو سننا ہے، فیصلہ تو نے کرنا ہے اور چونکہ بعید نہیں کہ تیرا فیصلہ ان سب سے جدا ہو اس لئے پھر خوف نہیں کرنا کہ اتنی کثرت رائے کو میں نے رد کر دیا ہے تو میرے فیصلے پر عمل کیسے ہوگا، کیسے میں کامیاب ہوں گا۔ فرمایا یہ اللہ کی باتیں ہیں، اللہ ہی والی ہے۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ پس فیصلہ کرتے وقت ادنیٰ خیال بھی اکثریت کا یا بندوں کا، اپنے مشیروں کا دل میں نہیں لانا کیونکہ وہ شرک ہے پھر۔ فیصلہ چونکہ تو نے اللہ کی خاطر کیا ہے اس لئے توکل علی اللہ ہی ہوگا اس کے سوا توکل کسی پہ تصور کیا جا ہی نہیں سکتا اور توکل کا مطلب ہے کہ ضرور اللہ تیری مدد فرمائے گا۔ اللہ توکل کرنے والوں کو خالی نہیں چھوڑا کرتا۔ تو اس رنگ میں جو بھی فیصلے جماعت احمدیہ کرتی ہے۔ چونکہ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں جس زمانے میں جو بھی امیر بنایا گیا ہو اسی کو مشورے پیش ہوں گے اور اس کو یہ اختیار ملتا ہے پھر کہ چاہے تو فیصلے کو قبول کرے چاہے تو رد کر دے اور اگر رد کرے گا تب بھی خدا اس کا سہارا بنے گا۔ اگر قبول کرے گا تب بھی توکل اللہ پر ہوگا، اکثریت پر نہیں ہوگا۔ اس طرح فیصلوں میں وہ برکت پڑتی ہے جس کا دنیا والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی سے اس کی بہت سی مثالیں ہیں

مگر اس آیت کو پہلے میں مکمل کرلوں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ اب محبت کی بات میں نے شروع کی تھی دیکھیں بات بھی محبت پر ہی ختم ہوئی ہے۔ رحمت کا مضمون جیسے میں سمجھا تھا اگر وہ درست نہ ہوتا تو آخر پر محبت کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ متوکلوں کو خدا ضائع نہیں کرتا۔ فرمایا یہ سب توکل کرنے والے محبت کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ رحمت کے نتیجے میں ان میں یہ صفات پیدا ہوئی ہیں۔ رحمت کے نتیجے ہی میں فیصلہ ردّ ہونے کے باوجود ذرا بھی دل پہ میل نہیں آتا۔ فیصلے دیئے بہت سوچ بچار کے دیئے بعض دفعہ لمبی لمبی تقریریں کیں اور آخر پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ نہیں یہ درست ہے، مجال ہے جو کسی دل پہ میل آگئی ہو۔ تو یہ محبت کے رشتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے توکل کیا، محبت کے نتیجے میں سارے تمہارے کاروبار تھے، میں بتاتا ہوں کہ اللہ متوکلین سے محبت کرتا ہے اور چونکہ توکل کے امر میں محمد رسول اللہ ﷺ واحد کے طور پر مخاطب ہیں اس لئے متوکلین کہہ کر سب کے لئے خوش خبری تو ہے مگر بطور خاص حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے خوش خبری ہے اے توکل کرنے والے یادرکھ کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں تیرا ساتھ چھوڑ دوں اور تجھ پر دوسروں کو ترجیح دے دوں۔ پس یہ وہ اسلامی مجلس شوریٰ ہے جسے ہم نے ورثے میں پایا ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ یاد رکھو جب اللہ نے فیصلہ کر لیا تمہاری مدد کا تو کوئی دنیا کی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی۔ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ اگر تم نے سب باتیں خدا کی خاطر نہ کیں، توکل خدا پر نہ رکھا اور خدا نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر کوئی دنیا کی طاقت تمہاری مددگار نہیں بن سکتی۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ وہاں توکل صیغہ واحد میں محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا یہاں مومنوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ اس مثال کے بعد ہو کیسے سکتا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور پر توکل کرو یا خدا پر توکل نہ کرو۔ تم نے اپنے سامنے ایک توکل کرنے والے کا حال دیکھا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اعلان عام فرما دیا کہ اللہ متوکلوں سے محبت کرتا ہے اور محبت کا ثبوت لحہ لحہ اس کی زندگی میں تمہارے سامنے ہے۔ پس اس سارے ماجرے کے بعد جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو خدا تم سے یہی توقع رکھتا ہے۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ کہ اللہ ہی پر تمام توکل کرنے

والے توکل کریں۔

آنحضرتﷺ کی زندگی میں جو مشوروں کے واقعات ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کا وقت تو نہیں مگر ہر قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ کہیں آپ نے ایک خاتون سے مشورہ کیا ہے، کہیں چند صحابہؓ سے مشورہ کیا، کبھی پوری جماعت سے مشورہ کیا ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت پوری جماعت سے مشورہ کیا اور پوری جماعت کے فیصلے کو ردّ فرما دیا۔ سب نے متفق علیہ یہ فیصلہ کیا اور مشورہ دیا کہ اہل مکہ اجازت دیں یا نہ دیں، تلواریں چلتی ہیں تو چلیں، خون بہتا ہے تو بہے لیکن حج کے ارادے سے ہم نکلے ہیں حج کر کے چھوڑیں گے یہ ہمارا مشورہ ہے، یا رسول اللہﷺ! آگے قدم بڑھائیں ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں یہ نہیں ہوگا۔ آپؐ اللہ کی منشاء کو زیادہ سمجھتے تھے۔

پس اللہ پہ توکل کا ایک یہ بھی معنٰی ہے کہ خدا کی منشاء پر نظر رکھا کرو اور جو فیصلہ بھی تم رضائے باری تعالیٰ کی خاطر کرو گے اور انسانی رضا کو چھوڑ دو گے اور اکثریت کو رد کرنے کی طاقت اپنے اندر رکھتے ہو گے محض اس لئے کہ اللہ کی رضا دوسری طرف ہو تو اللہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا اور صلح حدیبیہ میں یہ اس کی مثال ہے۔ خلفاء کے زمانے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال ہے کہ آنحضورؐ کے وصال کے بعد جب ارتداد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، اس کا نام طوفان ارتداد ہے مگر دراصل وہ ٹیکس چوری کا مسئلہ تھا۔ وہاں التحیات للّٰہ کی بحث نہیں تھی وہاں یہ بحث تھی کہ خدا نے جو سٹیٹ کے لئے اور قومی کاموں کے لئے بطور فرض زکوٰۃ مقرر کی ہے اس سے وہ انکار کر بیٹھے تھے کہ ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع پر ایک حیرت انگیز عزم کا مظاہرہ کیا ہے جو انسانی تاریخ میں انبیاءؑ کے بعد آپ کو اور کہیں دکھائی نہیں دے گا۔

اس موقع پر ایک لشکر ایسا تھا جس کی سرداری ایک غلام ابن غلام حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کے سپرد کی گئی تھی اور یہ لشکر شام کے لئے روانہ ہونے والا تھا اور خود آنحضرتﷺ نے اس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا تھا اور اس کی منزل بہت دور تھی۔ اتنی دور کہ اگر پیچھے کوئی خطرناک واقعہ ہوتا تو کانوں کان بھی ان کو خبر نہ ہوتی کہ پیچھے کیا ہو گیا ہے، مدد کے لئے واپس لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ تمام صحابہؓ نے بالاتفاق حضرت ابوبکرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ اس موقع پر نہ بھیجیں بہت خطرناک حالات ہیں، کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے جوان اور آزمودہ سپاہی ہم سے نکل جائیں اور پھر ہم باقیوں

کا مقابلہ کرسکیں گے۔ بہت خطرناک حالات ہیں اس کو Postpone کر دیں، ٹال دیں اس کے وقت کو۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو جواب دیا حیرت انگیز ہے۔ فرمایا ابن ابی قحافہ کی مجال کیا ہے کہ جو فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ کا آخری فیصلہ ہو، آپؐ کی کرسی پر بیٹھ کر میں پہلا فیصلہ اس فیصلے کو منسوخ کرنے کا کروں۔ میں ہوتا کون ہوں۔ اس پر آپؓ قائم رہے اور سارے صحابہؓ کا فیصلہ رد کر دیا۔

اگر مجلس شوریٰ کا یہ تصور ہوتا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو تو اختیار تھا مگر آپؐ کے مسند پر بیٹھے ہوئے، آپؐ کے غلاموں کو اختیار نہیں ہے، تو صحابہؓ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ کہتے ابوبکرؓ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کے اس فوقیت رکھنے والے حق کو تو تسلیم کر لیا تھا، مگر تیرے حق کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہمارا سوچا سمجھا اکثریت کا فیصلہ ہے، تجھے ماننا ہوگا۔ کبھی ایک موقع پر بھی ایسا نہیں ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ چلا اور آپؓ نے اس کے ساتھ جو الفاظ بیان فرمائے، اس سے آپؓ کا توکل ظاہر ہوتا ہے۔ کیسے میں اس فیصلے کو بدلوں۔ اگر تم کہتے ہو کہ نقصان ہے تو خدا کی قسم اگر مدینے کی گلیوں میں مسلمان عورتوں کی لاشیں بھی کتے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں یہ فیصلہ نہیں بدلوں گا، کیونکہ میرے آقا و مولا محمد رسول اللہ ﷺ کا آخری فیصلہ تھا۔ ایسے لوگ ہیں جو توکل کرتے ہیں خدا پر اور ایسے لوگ ہیں جن کے توکل کو خدا سچا کر دکھاتا ہے۔

پس یہ روح لے کر مجلس شوریٰ کو ہمیشہ زندہ رکھیں، اسی روح کے ساتھ مجلس شوریٰ زندہ رہے گی۔ متقی لوگوں کو چنیں۔ ان لوگوں کو چنیں جو خدا کے حضور محبت کے ہدیئے پیش کرتے ہیں۔ جن کی نہ جانیں اپنی رہیں نہ ان کے مال اپنے رہے وہ تمام تر خدا کے ہو گئے۔ پھر نہ دنیا کی پرواہ کریں، نہ دنیا کی خیریتوں کی پرواہ کریں محض اللہ کی خاطر فیصلے کریں اور یہ فیصلہ جب منظور ہو تو تمام تر آپ کی جانیں آپ کے دل اس کی منظوری کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ جب یہ فیصلہ رد ہو تو تمام جان اور تمام دل کے ساتھ اور اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کے رد کرنے پر اکٹھے ہو جائیں۔ یہ وہ طبعی مجلس شوریٰ ہے جس کے بعد پھر دل پھٹ نہیں سکتے۔ امتِ واحدہ کو پھر کوئی ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ نہیں کرسکتا۔ اور لِنْتَ لَهُمْ کے اندر اس کی جان ہے۔ آپ بھی آپس میں محبت رکھیں اور پیار کے رشتوں پر کسی نفرت کے رشتے کو غالب نہ آنے دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو اور اللہ تعالیٰ جماعت کی اس مجلس شوریٰ کو ہمیشہ زندہ رکھے کیونکہ اس شوریٰ ہی میں جماعت احمدیہ کی جان ہے۔

اب میں کچھ اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ انسانی زندگی بھی شب و روز کی طرح سیاہ وسفید کے دھاگوں میں بٹی ہوئی ہے۔ رات اور دن دو سفید اور سیاہ دھاگے ہیں۔ انسانی زندگی میں غم اور خوشی، کامیابیاں اور بعض پہلوؤں سے ناکامیاں یہ دورر ہے ہیں جن کے ساتھ انسانی زندگی بٹی ہوئی ہے۔ پس بیک وقت غم کی بھی خبر ہوتی ہے خوشی کی بھی خبر ہوتی ہے مومن کا کام یہ ہے کہ راضی برضا رہتے ہوئے اپنے قدم ہمیشہ آگے بڑھاتا رہے۔ نہ کسی غم کی وجہ سے اس کے قدم رکیں، نہ کسی خوشی کی وجہ سے اس کے اندر سہل انگاری پیدا ہو اس کے اندر جھوٹے فخر و مباہات کے زہر اس کے عزم کو کمزور نہ کر سکیں۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے ہمیں سمجھنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے میں جماعت احمدیہ یو۔ کے کے لئے اور ان کے حوالے سے سب دنیا کے لئے یہ خوش خبری پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مسجد کی زمین جس کے متعلق بہت جھگڑے اٹھے، بہت مخالفتیں ہوئیں، کوشش کی گئی کہ ہمیں اس حق سے محروم کر دیا جائے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ وہ آخری Deel طے ہوگئی ہے، پیسے ادا ہو گئے، امیر صاحب نے آج آ کر خبر دی ہے کہ وہ قبضہ لے آئے ہیں ماشاء اللہ۔ بہت ہی اہم جگہ ہے شہر کے اندر گھری ہوئی اور بہت وسیع جگہ، بہت بڑی عمارت ہے، حفاظتی انتظامات خدا کے فضل کے ساتھ سارے ہیں، ایسی مضبوط چاردیواری ہے جسے اگر عام جگہ لی جاتی تو کونسل نے ہمیں ایسی بنانے کی اجازت ہی نہیں دینی تھی کیونکہ انڈسٹری وہاں تھی اس لئے اس کی حفاظت کے لئے کونسل مجبور تھی اور پھر خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ تمام حفاظتی نظام جو بہت قیمتی نظام اس کمپنی نے قائم کیا ہوا تھا وہ سب کل پرزے ہر چیز ہمارے سپرد کر کے وہ الگ ہو گئے ہیں۔ ہمیں تو اللہ کی حفاظت ہی ہے مگر جو دنیا کا نظام ہے حفاظت کا وہ بھی خدا کے فرمان کے مطابق ہمیں اختیار کرنا ہوتا ہے۔ پس اللہ کے فضل سے بہت ہی اچھا سودا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور تمام دنیا کی جماعتوں کو بھی مبارک کرے۔ اس کے ساتھ جو خدشات لاحق ہیں، اگر کوئی ہیں، تو اللہ خود ہی ان سے نپٹے اور جماعت کو ہرگز ند سے محفوظ رکھے اور جو اچھی باتیں اور امید افزاء باتیں وابستہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہماری توقعات سے بھی زیادہ بڑھا دے۔

جو غم کی خبر ہے وہ اکثر پہنچ ہی چکی ہوگی دوستوں کو، ہمارے زندہ بھائیوں میں سے سب سے بڑے بھائی کی بیگم اور زندہ بھابیوں میں سب سے بڑی بھابھی کا کل انتقال ہوا ہے۔ حضرت سیدہ آمنہ، سیدہ ان معنوں میں کہ عزت کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں ورنہ وہ ذات کے لحاظ سے پٹھان

تھیں۔آمنہ طیبہ ان کا نام تھا۔ میری چھوٹی پھوپھی جان کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ ہمارے دوسرے بھائی حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کی اہلیہ تھیں۔ان کا رشتہ ازدواجی تقریباً پچاس سال سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے اور مثالی رشتہ تھا یعنی سارے خاندان میں اگر کسی کو کوئی مثالی رشتہ پیش کرنا ہوتو ان کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔میاں بیوی کے آپس میں تعلقات بگڑتے بھی ہیں یعنی وقتی طور پر رنجشیں بھی پیدا ہوتی ہیں مگر ان کی رنجشیں کبھی دکھائی نہیں دیں۔ بہت ہی گہرے فہم کے ساتھ اور باہم افہام تفہیم کے ساتھ اگر کوئی کبھی آپس میں رنجش ہوئی ہے تو خود ہی اندر ہی طے کر لیا گیا لیکن جہاں تک ایک مثال کا تعلق ہے مجھے آج تک کبھی یاد نہیں کبھی بھی میں نے ان کو ملتے ہوئے اس طرح دیکھا ہو یعنی دعوتوں میں یا باہر گھروں میں یا ہمارے وہاں جانے پر یا ان کے ہمارے ہاں آنے پر کہ ان کے چہروں پر کبھی بھی کوئی رنجش کے آثار ہوں۔اس پہلو سے بہت مثالی رشتہ تھا۔اور ان کا نام آمنہ تھا اور طیبہ اور امر واقعہ یہ ہے کہ آمنہ حقیقی معنوں میں آمنہ تھیں۔طیبہ حقیقی معنوں میں طیبہ تھیں۔شاید ہی کوئی بیوی ایسی ہو جس کے متعلق انسان اس وثوق کے ساتھ کہہ سکے کہ اس نے اپنے خاوند کی ہر امانت کا حق ادا کیا ہے اور ہر طیب بات، کسی بھی طیب بات میں وہ چوکی ہو۔عقل کا مجسمہ، بہت ہی سلجھی ہوئی طبیعت اور حضرت چھوٹی پھوپھی جان کی تمام خوبیوں کی وارث اور حضرت چھوٹے پھوپھا جان نواب محمد عبداللہ خان صاحبؓ کی خوبیوں کی بھی وارث تھیں۔آخری دنوں میں یعنی پچھلے عرصے سے یہ تشویشناک خبر مل رہی تھی کہ ان میں کمزوری بہت پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے گرنے لگ گئی تھیں اور اس کی وجہ سے بہت تشویش تھی کہ خدانخواستہ کہیں ایسی حالت میں گریں کہ ہڈی ٹوٹ سکتی ہے۔تو جہاں تک زندگی کے ان لمحات کا تعلق ہے آپ کے لئے تو یہ وقت خدا تعالیٰ نے جس وقت واپس بلایا ہے یہ بہر حال رحمت ہی تھا اور خدا کا کوئی فیصلہ بھی ایسے لوگوں کے لئے رحمت کے بغیر نہیں ہوا کرتا مگر جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کے لئے بہت بڑا ابتلاء ہے۔ خاص طور پر ہمارے بھائی کے لئے، ان کے لئے دعا کریں ان کی مجھے بہت فکر ہے کیونکہ بے حد محبت کی بات نہیں تھی، ایک دوسرے پر ایسا سہارا تھا کہ ناممکن تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر رہ سکیں۔یہی کیفیت ان کی ہے وہ بے اختیار ہیں اس معاملے میں۔ بڑے صابر ہیں، حوصلے والے ہیں، صاحب عزم ہیں مگر وہی بات محبت کے اوپر بس کس کا ہے، بے اختیاری کے معاملات ہیں۔ان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ان کے بچوں کو

اللہ تعالیٰ ان میں بھی وہ ساری خوبیاں جاری کرے اور ان کا خود رفیق ہو بھائی صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کا۔ ان کا ساتھی بنے ان کا رفیق ہو اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کی باقی زندگی صحت و عافیت کے ساتھ اور اپنے بچوں کی طرف سے آنکھیں ٹھنڈی رکھتے ہوئے گزارے۔

اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی ایسے جنازے ہیں جن کے متعلق کچھ کی درخواست تھی، کچھ کے متعلق میرے دل میں خود ہی خواہش پیدا ہوئی اور جن کی درخواستیں تھیں یہ، وہ وہ درخواستیں ہیں جو میرے منع کرنے سے پہلے آ چکی تھیں اس لئے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انہوں نے میرے منشاء کو جاننے کے باوجود پھر بھی درخواستیں بھیجی ہیں۔ پس ان کے جنازے بھی اس جنازہ غائب کے ساتھ جو آج عصر کی نماز کے بعد پڑھا جائے گا۔ جنازہ غائب میں ان کو بھی شامل کیا جائے گا جس کی لسٹ میں سناتا ہوں۔ مکرمہ امۃ الحمید بیگم صاحب اہلیہ مکرم خان ثناء اللہ خان صاحب مرحوم عمر 96 سال۔ حضرت مولوی شیخ محمد صاحب آف لاہور صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیٹی تھیں اور ہمارے امیر صاحب یو۔ کے آفتاب احمد خان صاحب کی والدہ تھیں۔ آخر وقت تک ان کے ذہن اور دل ایسے روشن تھے کہ ادنیٰ سا بھی عمر کا سایہ اس پر نہیں آتا تھا، کسی وقت بھی، ہمیشہ حاضر دماغ، روشن دماغ خدا تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر قلبی اور ذہنی صحت عطا فرمائی تھی۔

دوسری بلقیس بیگم صاحبہ اہلیہ ڈاکٹر میر مشتاق احمد صاحب مرحوم۔ یہ موصیہ تھیں۔ ڈاکٹر میر مشتاق احمد صاحب کا نام بھی بہت جماعت میں معروف ہے، بہت بزرگ انسان تھے۔ مکرمہ امۃ الرحمٰن صاحبہ والدہ مکرم عطاء الرحمٰن صاحب غنی آف لاہور، میاں اٹو کہتے تھے ہم میاں عطاء الرحمٰن کو۔ بہت ہی پیاری شخصیت، بہت محبت کرنے والی اور ساری اولاد ہی بہت نیک اور نیک مزاج ہے۔ ان کی والدہ امۃ الرحمٰن بھی خدا کے فضل سے لمبی عمر پا کر فوت ہوئی ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی نواسی تھیں۔ حکیم فضل الرحمٰن صاحب کی بیوی سے آپ حضرت خلیفۃ المسیح اولؓ کی نواسی تھیں۔

ایک اور نام ہے زبیدہ پروین، پروین تو میں نے پہلی دفعہ سنا ہے آپا زبیدہ کہتے تھے ہم ان کو۔ میجر سردار بشیر احمد خان صاحب کی بیگم، مالیر کوٹلے کے خاندان سے، مگر ان کا جو اصل اعزاز ہے وہ اس بات میں ہے کہ محمد خان صاحبؓ جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ ان سے نرم سلوک کیا جائے اور ان سے بہت ہی محبت اور پیار کا سلوک فرمایا، ان کو اہل بیت میں سے

ہونے کا خطاب دیا۔ یہ ان کی صاحبزادی تھیں اور ہمارے چھوٹے بھائی مرزا اظہر احمد کی ساس بھی تھیں۔ (مرحومہ دراصل مکرم مرزا اظہر احمد صاحب کی ساس کی ہمشیرہ تھیں۔ خطبہ جمعہ میں سہواً حضور کی زبان سے ساس کا لفظ ادا ہوگیا۔ اس بارہ میں حضور نے بعد کے ایک خطبہ میں وضاحت فرمائی ہے۔ مرتب)

اور ایک حمید احمد صاحب لائلپوری جولندن کے ہیں ان کا وصال غالباً پچھلے جمعہ سے پہلے بدھ کو ہوا ہے یا منگل کو ہوا ہوگا۔ مجھے پیغام ان کی طرف سے ملا تھا کہ میرا جمعہ کے دن جنازہ پڑھانا۔ تو آج اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دل کی خواہش اس طرح پوری ہورہی ہے کہ جمعہ کے دن ہی نماز جنازہ ہورہی ہے اس میں میں ان کو بھی شامل کررہا ہوں۔ یہ عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ غائب ہوں گے۔

آج جمعہ اور عصر کو جمع کرنے کا آخری دن ہے اس سردیوں کا۔ آئندہ سے یاد رکھیں چونکہ وقت بدل جائیں گے اور گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا ہوگا اس لئے جمع کرنے کی کوئی جائز مجبوری نہیں۔ تو اس جمعہ کے بعد آئندہ جمعہ اپنے وقت پہ جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا تھا جمعہ کی نماز جمعہ کی رہے گی اور عصر کی نماز اپنے وقت پر بعد میں ادا کی جائے گی۔

خطبہ ثانیہ کے بعد حضور انور نے فرمایا۔

ایک منٹ ٹھہریں، ایک اور اعلان ہونے والا ہے۔ جو MTA ہے اس کے متعلق۔ چونکہ مضمون نے وقت لے لیا اور جیسا کہ حق تھا مضمون کا وقت لینا ہی چاہئے تھا ابھی بہت سی باتیں رہ بھی گئیں اس لئے زائد دوسری باتوں کا وقت نہیں مل سکا۔ انشاء اللہ کل یا پرسوں سے غالباً کل ہی سے ہمارا MTA انٹرنیشنل کا جو دوسرا نظام ہے وہ پورے عالمی نظام کے طور پر شروع ہو جائے گا۔

امریکہ سے بھی رابطہ بحال ہو جائے گا، چوبیس گھنٹے کا نظام ہوگا لیکن میں یہ آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ شروع میں جیسا کہ Teething problems ہوتی ہیں دانت نکالنے کی ایک مہینہ، ڈیڑھ مہینے تک زیادہ سے زیادہ کچھ مشکلات درپیش ہوں گی۔ مثلاً اب جب یہ شروع ہورہا ہے تو باوجود اس کے کہ وہ بڑا ڈش انٹینا جس سے ہم نے اس پروگرام کو اٹھانا تھا وہ تیار تھا، آرہا تھا مگر کسی قانونی دقت کی وجہ سے اس کو یہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہو جائے گی دو تین دن اور لگیں گے۔ اس عرصے میں جو موجودہ نظام ہے اس کے انٹینا کو ہی غیر معمولی طاقت دے کر اور جو عالمی کمپنی سیٹلائیٹ کی ہے

اس نے یہ تعاون کیا ہے کہ وہ ان سیٹلائیٹس کو بھی زیادہ سے زیادہ طاقت دیں گے اس لئے اس وقتی خلا کو پر کرنے کی خاطر یہ انتظام ہے کہ جب تک اصل انٹینا جو ہونا چاہئے وہ نہیں پہنچتا موجودہ انٹینا سے ہی پروگرام اٹھایا جائے گا۔ اس لئے اہل امریکہ ہوں یا دوسرے لوگ وہ جب اگر اس میں کوئی ہلکی سی دھند پائیں یا کوئی خرابی دیکھیں تو صبر سے کام لیں۔

چند دن کی بات ہے انشاء اللہ پھر جب اصل انٹینا آجائے گا تو بہت واضح تصویریں آئیں گی اور ابھی بھی انہوں نے ہمیں امید یہی دلائی ہے کہ اگر نقص ہے تو معمولی ہوگا بہت زیادہ قابل فکر نقص نہیں ہوگا اور وہ جو پاکستان کے لئے چوبیس گھنٹے کا نظام ہے اس کا سیٹلائیٹ ہمیں دراصل پوری طاقت کا مئی میں ملے گا، ایشیا کے لئے میرا مطلب ہے۔ اس سے پہلے عارضی طور پر ہمیں دو ہیمی بیمز Hemi-Beams مل چکی ہیں۔ چند دنوں تک وہ بھی شروع ہو جائیں گی تو افریقہ کا جو حصہ کٹا ہوا تھا وہ بھی اس کی وجہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ان پروگراموں میں پوری طرح شامل ہو جائے گا۔

بہر حال یہ اپریل اور مئی یہ دو مہینے ہیں جو اس پہلو سے خدا کے فضل سے غیر معمولی برکتیں لے کے آئیں گے اور جماعت کو دعا میں یاد رکھنا چاہئے کہ جو بھی عارضی روکیں یا مستقل بعض دفعہ روکیں بنتی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دور فرما دے اور کل عالم کو ہم بہترین پیغام پہنچا سکیں۔ اتنا خدا کے فضل سے اس کا Impact ہو رہا ہے دنیا پر، خاص طور پر عربوں پر کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ ایسے ایسے حیرت انگیز خط مل رہے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اتفاقاً MTA دیکھنے لگے اور اب تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے اور بعض لکھتے ہیں کہ ہمیں پتا نہیں بیعت کس طرح کی جاتی ہے مگر آپ ہمیں احمدی سمجھیں اور ہمیں بتائیں کہ کس طرح ہم نے باقاعدہ داخل ہونا ہے۔ ایک خاتون نے لکھا ہے کہ میں حاضر ہوں اگر بیعت کے لئے لندن پہنچنا ضروری ہے تو میں لندن پہنچوں گی مگر اب میں بیعت کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ تو یہ بہت ہی غیر معمولی برکتیں ہیں اور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہی کی برکتیں ہیں اسی لئے کل عالم پر برس رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا فیض سارے زمانے پر عام کر دے اور ہمارے مشکلات کو دور فرمائے۔ آمین

دعاؤں کے سہارے سے اپنے نفس کے اندھیروں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 5/اپریل 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۗ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ (الجاثیہ: 24، 25)

پھر فرمایا:

یہ آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے۔سورۃ الجاثیہ کی چوبیسویں اور پچیسویں آیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے ایسے شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے۔جس نے خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنالیا ہو، اپنے نفس کی خواہش کو اِلٰهَهٗ اپنا معبود بنالیا ہو۔ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ اور اللہ تعالیٰ نے اسے خاص علم کی بناء پر گمراہ ٹھہرایا ہو اور ایک دوسرا ترجمہ جو اس پہلے مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے یا دونوں کو برابر بھی سمجھیں تو بیک وقت دونوں جائز بھی ہیں اور اس مضمون سے گہرا تعلق رکھنے والے تراجم ہیں وہ یہ ہیں۔ عَلٰى عِلْمٍ اپنے علم کے باوجود اس کو اندھا کر دیا ہو یعنی ایسا شخص جس نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنالیا وہ علم کے باوجود اندھا ہوتا ہے۔ دیکھتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا، سنتے ہوئے سن نہیں سکتا اور اس کے

دل و دماغ کی حالت یہ ہے کہ ویسے وہ غور کرنے کی قابلیت تو رکھتے ہیں مگر الٰہی مضامین پر اور روحانی مضامین پر غور سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔

فرمایا اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ اور اس کی شنوائی پر بھی مہر لگا دی۔ وَقَلْبِهٖ اور اس کے دل پر بھی وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک پردہ ہے یا پردہ ڈال دیا فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ پس کون ہے جو اللہ کے بعد اس کو ہدایت دے۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وہ لوگ جن کی تعریف کی گئی ہے یعنی جن کی صفت بیان فرمائی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا ہماری زندگی تو بس یہی کچھ ہے جو ہمارے سامنے ہے جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔ نَمُوْتُ وَنَحْيَا ہم یہیں مرتے اور یہیں جیتے ہیں۔ مر کر دوبارہ جینے کی بات نہیں کرتے۔ کہتے ہیں یہی ہمارا مرنا، یہی ہمارا جینا ہے۔ وَمَا يُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ کوئی خدا نہیں ہے جو ہمیں موت دے گا زمانہ موت دیتا ہے۔ گزرتا ہوا وقت ہے جس کے نتیجے میں بالآخر ہر ایک نے مرنا ہی ہے۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ان کو حقیقت میں اس بات کا علم نہیں ہے کہ موت کا نظام ہے کیا اور کیسے موت آتی ہے اور کس طرح کام کرتی ہے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ یہ محض اندازے لگا رہے ہیں۔ ان کے خیالات ہیں کہ ایسا ہوتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موت کا فلسفہ بھی بہت گہرا فلسفہ ہے۔ اسے سمجھنا، اس کے عوامل پر غور کرنا، اس کے محرکات کو جانچنا اور علم رکھنا کہ موت کی راج دہانی کتنی وسیع ہے، کیسے کیسے کام کرتی ہے، کون سے قوانین اس راج دہانی میں جاری ہیں، ان کا ان کو کچھ علم نہیں ہے۔ صرف ایک اندازہ ہے کہ زمانے کے نتیجے میں مرورِ زمانہ سے لوگ مر ہی جایا کرتے ہیں۔ تو کہتے ہیں ہم بھی اسی طرح اس دنیا میں رہیں گے اور اسی دنیا میں مر جائیں گے اور گویا پھر دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔ یہ وہی مضمون ہے جو میں اس سے پہلے دوسری آیات کے حوالے سے شروع کر چکا ہوں اور ان کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اور ایک دوسرے پر یہ مزید روشنی ڈالنے والی آیات ہیں۔

پہلی آیت جس کا حوالہ میں نے دیا تھا یا جس سے بات شروع کی تھی وہ تھی۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ (النور: 40) وہ لوگ جو کافر ہوں جو خدا کا انکار

کر دیں ان کے اعمال ایسے ہی ہیں جیسے ایک چٹیل میدان ہو اس میں دور کہیں پانی کا دھوکہ ہو جسے سراب کہتے ہیں اور زندگی بھر یہ لوگ اس پانی کی تلاش میں اس کے پیچھے سرگرداں دوڑے چلے جاتے ہیں اور بالآخر پیاس نہیں بجھتی۔ پس دنیا کی زندگی میں جو لوگ مگن ہیں جو کہتے ہیں یہی ہماری زندگی ہے ان کی یہی مثال ہے۔ عمر بھر وہ ایک ایسی پیاس کی طلب میں سرگرداں رہتے ہیں جس کی پیاس کبھی زندگی میں بجھ سکتی ہی نہیں۔ کوئی شخص بھی جو دنیا کی خواہشات کی پیروی کرنا اپنا مقصد بنا لے اس کو کبھی عمر بھر وہ لمحے نصیب نہیں ہوتے کہ وہ کہے کہ ہاں میری تمنائیں پوری ہو گئیں، میری سب پیاس بجھ گئی۔ بلکہ جس قدر بجھتی ہے اس سے زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔ سمندر کا پانی پینے والی بات ہے یا پھر سراب کی پیروی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ جوں جوں پانی قریب آتا دکھائی دیتا ہے اور جوں جوں انسان اس کی پیروی کرتا ہے وہ اور بھی پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے اور اس مقام کو پھر کبھی انسان نہیں پہنچ سکتا جہاں اسے پانی میسر آ جائے اور پیاس بجھ جائے ہاں اللہ تعالیٰ کا حساب کا نظام اسے پہلے آ لیتا ہے اور موت ایسی حالت میں واقع ہوتی ہے کہ ابھی اس کی پیاس تو بجھی نہیں مگر جو کچھ بھی اس نے کیا اس کا حساب دینے کے لئے تقدیر الٰہی اسے وہاں موجود دکھائی دیتی ہے۔

یہ جو مثال تھی میں نے کہا تھا یہ نفس کے اندھیروں کی مثال ہے جو انسان کے نفس کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں مگر دیکھنے میں نظر کام کرتی ہے، نظر کے لئے روشنی جو ضروری ہے وہ بھی بظاہر موجود ہوتی ہے اور سب کچھ ہونے کے باوجود پھر دکھائی نہیں دیتا۔ ورنہ سراب تو چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ دکھائی دیتا ہے جب ایسی تیز روشنی ہو کہ نظریں چندھیا جایا کرتی ہیں۔ تو اسے اندھیرا قرار دینا یہ معنوی لحاظ سے اور آخری مقصد کے لحاظ سے ہے یعنی تیز روشنی ہے اور پھر بھی صحرا کو انسان پانی سمجھ رہا ہے، تپتی ہوئی ریت کو انسان پانی سمجھ رہا ہے اور روشنی ہوتے ہوئے بھی اندھا ہے۔

چنانچہ یہ جو میں نے ترجمہ کیا تھا اس آیت کا جو میں نے تلاوت کی ہے کہ عَلٰى عِلْمٍ کا مطلب ہے اپنے علم کے باوجود وہ نہیں دیکھ رہا۔ اس کا اس آیت سے قطعی طور پر ایک تعلق ہے جو کھلم کھلا دکھائی دینے لگا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے شخص کی مثال ایسی ہی ہے جو جو اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ کہ اسے اللہ نے گمراہ اس طرح کیا ہے کہ علم ہے بھی اور پھر بھی گمراہ ہے ورنہ صاحب علم کو تو گمراہ نہیں کہا جاتا اور اس گمراہی کی جو تفصیل ہے وہ اسی آیت کے مضمون کو آگے بڑھا

کر دکھا رہی ہے۔اس آیت کی تشریح میں ایک اور آیت میں نے آپ کے سامنے رکھی تھی جس میں بتایا تھا کہ وہ اندھیرے جو نفس سے پیدا ہوتے ہیں، جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ ان اندھیروں کی تین حصوں میں تقسیم کر کے خدا تعالیٰ نے ایک اور آیت میں اس مضمون کو ہم پر خوب کھول دیا ہے۔وہ ایک اندھیرا ہے لعب اور لہو کا۔انسان کا دل بہلاوا خواہ وہ معصوم کھیلوں کی وجہ سے ہو یا نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے جنسی تعلقات وغیرہ قسم کی چیزیں اور جوّا بازی، یہ تمام لہو کے اندر چیزیں آتی ہیں جس سے انسان اپنے نفس کی پیاس کسی ذریعے سے بجھانے کی کوشش کرتا ہے،ایک بھڑکی سی لگی ہوتی ہے کہتا ہے میں کسی طرح اسے پورا کرلوں۔

لیکن دوسری قسم ہے زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ ۔اب لعب اور لہو والی جو قسم ہے اندھیرے کی اس کا زینت و تفاخر والی قسم سے کوئی براہ راست جوڑ نہیں ہے۔ یہ دو الگ الگ بیماریاں ہیں۔کئی ایسے لوگ ہیں جو کھیل کود میں مصروف اور نفسانی خواہشات کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہوتے ہیں مگر ان کو زینت اور تفاخر کی ہوش نہیں ہوتی کیونکہ زینت اور تفاخر میں اپنے نفس کو ہمیشہ سجا کر رکھنا ہے۔کوئی ضروری تو نہیں کہ ایک جوئے باز جس کی ھوىٰ ہی جوا ہو وہ ہمیشہ سج دھج کر رہے یا ایک ایسا شخص جو کھلاڑی ہو وہ ہمیشہ بہت خوب صورت بن کے رہے۔کئی کھلاڑی ہیں ان کو اپنے جسم،اپنے لباس کی ہوش ہی کوئی نہیں ہوتی مگر کھیل کے لئے وقف ہوتے ہیں تو دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جن کو اپنے آپ کو ہمیشہ سجا کر رکھنا پیارا لگتا ہے وہ غریب بھی ہوں تو غریبانہ سجاوٹ کریں گے اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔عورتوں میں سجاوٹ کا ایک طبعی مادہ ہے لیکن ہر عورت میں نہیں ہے۔کئی ایسی ہیں جو سارا دن نہ گھر صاف کرتیں، نہ جسم صاف رکھتیں، نہ بال بناتی ہیں اور خاوند واپس آتے ہیں تو عجیب حالت میں وہ گھر کو پاتے ہیں گھر والی بھی اسی طرح بے ہنگم اور گھر بھی اسی طرح بے ہنگم اور بال بھی بکھرے ہوئے۔بعض ایسی عورتوں کو یہ بھی ہوش نہیں ہوتی کہ باہر نکلیں تو پھر بھی ٹھیک ہو جائیں لیکن تفاخر والا جو مضمون ہے وہ زیادہ اہم ہے۔

زینت ہر انسان کی تمنا ہے۔ ہر مرد کی بھی اور عورت کی بھی لیکن ہر ایک میں نمایاں نہیں ہوتی۔ یہ آیت جو بیان فرما رہی ہے۔ یہ ان لوگوں کا حال بیان فرما رہی ہے جو زینت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔گھر میں رہیں یا باہر ہمیشہ ان کو سجنا دھجنا اچھا لگتا ہے۔بعض بچوں میں فطری طور پر یہ بات

پائی جاتی ہے۔ایک ایسا بچہ تھا جسے بچپن سے ایسا شوق تھا صاف ستھرا رہنے کا کہ اگر اس کے جسم پر ایک معمولی سا چھینٹا بھی کسی چیز کا پڑ جائے۔مثلاً کھانا کھاتے ہوئے سالن کا،تو بھاگ کر وہ اپنے کمرے میں چھپ جاتا تھا۔جب تک ماں اس کے کپڑے نہ بدلائے وہ روتا رہتا تھا۔ایک دفعہ میں گیا تو وہ لپک کر پیچھے چھپ گیا۔میں حیران تھا کہ ہوا کیا اس کو۔تو اس کی اماں نے بتایا کہ اس کے کپڑوں پر ایک چھوٹا سا داغ پڑا ہوا ہے اور اچانک آپ آ گئے ہیں تو اس نے یہ سمجھ کر کہ اگر میں نے دیکھ لیا تو اس کا کیا بد اثر مجھ پر پڑے گا۔تو شرم کے مارے وہ چھپ گیا ہے۔اب اس میں بناوٹ کوئی نہیں تھی،تفاخر کوئی نہیں تھا لیکن زینت کی ایک لگن تھی جو طبعی طور پر دل میں موجود تھی۔تو مختلف انسان مختلف حالتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔بعضوں کو زینت کا شوق ہے۔بعضوں کو پرواہ ہی کوئی نہیں اکھڑے پکھڑے حال میں رہتے ہیں،نہ لباس کی ہوش اور ویسے بڑے صاحب علم،صاحب وقار،صاحب مرتبہ،بڑے بڑے سائنس دان ہیں،بڑے بڑے فلسفی ہیں۔جن کو اپنے لباس کی کوئی ہوش نہیں تو الگ الگ فطرت کے تقاضے ہیں اور قرآن کریم نے ان سب تقاضوں کو جوڑے جوڑے کر کے ہمارے سامنے رکھ دیا۔

مگر زینت سے اگلا قدم ہے تفاخر کا۔اپنے نفس میں کوئی انسان اپنے آپ کو اچھا بنا کے رکھے یہ منع نہیں ہے بلکہ زینت کی تو خدا تعالیٰ تعریف فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کا دفاع کرتے ہوئے فرماتا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف:33)۔

آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تو کہہ دے کہ کون ہے جو اس زینت کو حرام قرار دیتا ہے۔الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وہ زینت جسے خدا نے اپنے بندوں کی خاطر بنایا ہے،اپنے خاص بندوں کے لئے جو اسی کے ہوتے ہیں۔وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ اور کھانے پینے کی چیزوں میں سے جو اچھی چیزیں ہیں کون ہے جس نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو نیک بننے کی خاطر یا اپنے آپ کو نیک دکھانے کی خاطر بُرے لباس پہنتے ہیں،بے ہنگم لباس پہنتے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں کہ یہ تو بڑا ہی پہنچا ہوا اور درویش ہے،اس کو تو ہوش ہی کوئی نہیں کہ کپڑے کیسے ہوتے ہیں اور اچھا کھانا دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ جی ہمیں نہیں ان کھانوں سے کوئی دلچسپی،گھر میں جا کے کھا لیں گے،لوگوں کے سامنے اچھا کھانا نہیں کھانا،یہ بھی تفاخر کی قسمیں ہیں۔

پس زینت کو غیر معمولی طور پر اختیار کرنا بھی ایک اندھیرا ہے اور زینت سے جہاں جائز ہو

وہاں منہ پھیرنا بھی ایک اندھیرا ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ کون ہے جو یہ کہتا ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو زینت بنائی ہے وہ حرام ہے یا اچھے کھانے پیدا کئے ہیں تو نیک آدمی اس کو پسند نہیں کرتے۔ فرماتا ہے هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا صرف آخرت میں نہیں اس دنیا میں بھی یہ دونوں چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کی خاطر پیدا کی ہیں اور خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ لیکن قیامت کے دن صرف انہی کے لئے ہوں گی۔ وہ لوگ جو دنیا کی زینتوں میں، دنیا کے اعلیٰ کھانوں میں ان کے ساتھ یہیں شریک ہیں ان کے لئے، خدا نے پیدا نہیں کیا مگر نیک بندوں کا صدقہ وہ بھی کھا رہے ہیں۔ بنایا اپنے بندوں کے لئے ہے مگر وہ جو رفتہ رفتہ شیطان کے بندے بن جاتے ہیں وہ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں ان سے بلکہ نیک بندوں سے زیادہ چھین کے لے جاتے ہیں۔ مگر فرمایا مرنے کے بعد ان کو کچھ نہیں ملے گا پھر۔ یہ چیزیں خالصۃً زینت اور اچھا طعام ان کے لئے ہوگا جو خدا کے حقیقی بندے ہیں۔ تو دیکھیں منع نہیں ہے زینت اور خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے اس بات کو کہ زینت کو حرام قرار دیا جائے مگر وہاں اس آیت میں اندھیروں کی مثال کے طور پر زینت کو بھی پیش فرمایا۔ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وہ زینت جو مقصود بن جائے وہ گناہ ہے وہ زینت جو ایک دوسرے پر فخر کا موجب بنے یا ایک دوسرے پر فخر کی وجہ سے اختیار کی جائے وہ منع ہے۔

اور اگلا حصہ آیت کا ہے۔ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ مال میں اور اولاد میں بڑھنا اور تَكَاثُرٌ، ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا۔ اب مال کی تمنا بھی اپنی ذات میں منع نہیں ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (الحشر: 9) وہ اللہ کے فضل یعنی یہاں مال مراد ہے، دنیاوی رزق کے لئے اللہ کی طرف جھکتے ہیں اور اسی سے رضوان چاہتے ہیں۔ اولاد کی بھی خواہش منع نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسی عورتوں سے شادی کرو جو خوب بچے پیدا کریں تاکہ میری اُمت بڑھے اور یہاں بھی مقصد تفاخر نہیں ہے۔ تَكَاثُرٌ ان معنوں میں نہیں کہ لوگوں کے بچے کم ہو جائیں اور مر جائیں اور میری اُمت کے بڑھیں، مراد یہ ہے کہ نیک لوگ بڑھیں۔ اُمت محمدیہ تو وہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے پیچھے چلنے والی ہے۔ یہاں نام کی اُمت ہرگز مراد نہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ نام کی اُمت کا تو آنحضور ﷺ سے

کوئی بھی تعلق نہیں وہ تو شرم کا موجب ہیں۔اُمت محمد یہ سے مراد وہ حقیقی امت ہے جو اللہ کے عباد ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے توسط سے حقیقی عباد بن گئے۔آپؐ کی برکت سے لوگوں کو عبداللہ بننے کے گُر آ گئے، ایسے عباد اللہ ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں ان کو بڑھانے کے لئے آنحضرت ﷺ نے بھی دعا مانگی اور امت کو ہدایت بھی کی۔تو یہ ساری باتیں جو تین جوڑوں کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو اپنی ذات میں گناہ ہو۔ ہر چیز وہ ہے جو فطرتاً، طبعاً انسان کے اندر رکھی گئی ہے اور اس کی حرمت فی ذاتہٖ کوئی بھی نہیں لیکن حرمت بنتی کب ہے۔وہ آیت ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے اس میں یہی تین مضمون ہیں جیسے وہاں تین امور کا ذکر کر کے متنبہ فرمایا گیا تھا اس میں بھی تین باتیں بیان ہوئی ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے غور کیا ایک ایسے شخص کے اوپر جو اپنے نفس کی خواہشات کو معبود بنا بیٹھے، اس کے تابع ہو جائے، اس کا غلام بن جائے۔ایسی صورت میں لعب بھی حرام ہو جائے گی، لہو بھی حرام ہو جائے گی، ایسی صورت میں ہر قسم کی زینت بھی حرام ہو جائے گی اور زینت کے ساتھ تفاخر بھی حرام ہو جائے گا۔مال کی زیادہ کی خواہش بھی حرام اور اولاد کی زیادہ خواہش بھی حرام۔یہ ساری چیزیں تب حرام ہوتی ہیں جب قرآن کی اس آیت کی رو سے یہ معبود بن جائیں اور ھـــوٰی کا معبود بننا یہ سب سے بڑا اندھیرا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ایسے شخص کو علم ہو بھی تو اندھا ہوتا ہے، گمراہ ہو جاتا ہے۔ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ کان ہیں لیکن سننے کے کان نہیں ہیں۔دل ہے مگر غور کرنے کے قابل دل نہیں ہے۔آنکھیں ہیں مگر پردہ پڑا ہوا ہے تو تین اندھیرے ہی تو ہیں۔

ہمارے اندر روشنی کے داخل ہونے کے یہی تین رستے ہیں۔یعنی سماعت کی روشنی، علم کی روشنی جو سننے سے تعلق رکھتی ہے اور بصر کی روشنی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے بعد غور کرنے کی صلاحیت، یہ وہ اندرونی روشنی ہے جو مختلف ان علوم کو جو کانوں کے ذریعے یا آنکھوں کے ذریعے انسان کے دماغ تک پہنچتے ہیں اور دماغ انہیں آپس میں جس طرح جانور جگالی کرتا ہے اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر، الٹ پلٹ کے ان سے نئے مضامین کے رس نکالتا ہے۔یہی تین ذریعے ہیں جو اس کو اندھیروں سے روشنی میں لاتے ہیں اور یہ سارے ذرائع اگر بند ہو جائیں تو

انسان روشنیوں سے اندھیرے میں چلا جاتا ہے۔ پس وہ تین اندھیرے جن کا ذکر پہلی آیت میں گزرا تھا وہی تین اندھیرے دوسری آیت میں اور طریق سے بیان کر کے دکھائے گئے، انہی تین اندھیروں کا ذکر اسی آیت میں ملتا ہے اور ان کی آخری صورت ہے کہ ان کو اپنا معبود نہ بنا بیٹھنا۔

اور پھر اس آیت میں ایک اور حسن یہ ہے کہ جو آیت میں نے آپ کے سامنے پہلے پڑھی تھی کہ جو تین حصے فرمائے گئے ہیں وہ انسانی زندگی کے تین مشاغل کی قسمیں ہیں جن میں انسانی زندگی ہمیشہ منہمک رہتی ہے۔ لہو ولہب تو ظاہر بات ہے جو Social Pursuits ہیں انسان کی اپنی ذات کو خوش رکھنے کے لئے جو مختلف قسم کے بہانے انسان نے تراشے ہوئے ہیں، ذرائع اختیار کئے ہوئے ہیں، ہر قسم کی زائد دلچسپیاں جو کھانے پینے کے علاوہ محض زندہ رہنے سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ زندگی کو ایک شغل میں ہمیشہ غرق کر دینے سے تعلق رکھتی ہیں۔ لعب میں غرق رہے یا لہو میں غرق رہے انسان ایک قسم کا ڈرگ (Drug) کا Adict ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی سوائے اپنے آپ کو سکون بخشنے کے اور کچھ نہیں رہتی یا سکون کی تمنا میں ہمیشہ دوڑتے چلے جانے کے سوا اور کچھ نہیں رہتی۔

دوسرا مضمون ہے زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ اس میں ہر قسم کے زیب و زینت کے سامان جتنی کاسمیٹک انڈسٹری ہے، مکانوں میں صرف ضرورت کی خاطر اضافے نہ کرنے بلکہ محض اس لئے کہ فلاں کے مکان سے زیادہ خوب صورت ہو اور اس سے زیادہ اونچا دکھائی دے اس طرح ایک دوسرے سے دوڑ شروع ہو جائے۔ یہ جو دوڑ ہے یہ بھی انسانی زندگی کو خاص مقاصد کے لئے وقف کر دیتی ہے اور ایسے لوگوں کو دوسری چیزوں کی ہوش نہیں رہتی۔

اور تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ دراصل سیاسی غلبے سے تعلق رکھنے والا مضمون ہے کیونکہ قرآن کریم نے اموال اور اولاد کو دوسری آیات میں سیاسی غلبے سے باندھا ہے اور بڑے بڑے بادشاہوں کو، جب ان کے تکبر کا حال بیان فرمایا اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ان کا فخر یہی تھا کہ ہماری اولاد زیادہ ہے، ہمارے اموال زیادہ ہیں۔ اموال والوں نے اپنے آپ کو سمجھا کہ ہم اموال کے ذریعہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ صاحب اولاد لوگوں نے سمجھا کہ اولاد کے ذریعے ہمارا غلبہ باقی رہے گا۔ تو نفس کی انا جو حکومت چاہتی ہے جو سیاست کے ذریعے یا حربی ذرائع سے ایک شخص یا ایک قوم کو دوسروں کا آقا بنا دیتی ہے۔ یہ وہ تمنا ہے جس کا تعلق اموال اور اولاد کی کثرت سے ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بارہا یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو ان کے اموال اور اولاد کی کثرت نے اندھا کر دیا اور اس کے نتیجے میں وہ قہری بادشاہ بن کے ابھرے اور انصاف کا خون کرنے والے ہوئے کہ ان کی غرض سوائے حکومت کے اور کچھ نہیں تھی۔ تو اولاد سے مراد یہاں قوم کی کثرت ہے، اپنی اولاد صرف نہیں، وہ تو ہے ہی لیکن اس مضمون میں اولاد کا تعلق جمعیت سے ہے اور اولاد کا تعلق ایسے مالی ذرائع سے ہے جن کے نتیجے میں انسان ہمیشگی کی برتری حاصل کر لیتا ہے۔ وہ قومیں جو زیادہ مال دار ہوں وہ سمجھتی ہیں اب ہمیں دنیا میں کوئی مٹا نہیں سکے گا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۙ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ (الھمزہ: 2 تا 4) هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ جو لوگ ہیں یہ تفسیر پر دوبارہ جانے کی ضرورت نہیں ایسی قوم کا بیان ہے یا ہر ایسے شخص کا بیان ہے جو مال جمع کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مَالَهُ أَخْلَدَهُ کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے گا۔

اب لوگ جانتے ہیں کہ مال سے ذاتی طور پر تو ہمیشہ کی زندگی نہ ملتی ہے، نہ کوئی سوچ سکتا ہے لیکن مال کے ذریعے قومی غلبہ ضرور ہوا کرتا ہے اور دولت مند قومیں سمجھتی ہیں کہ اب ہمیں دنیا میں کوئی مٹا نہیں سکتا کوئی انقلاب ایسا نہیں آ سکتا کہ ہم سے طاقت چھین کر نسبتاً غریب قوموں کے سپرد کر دی جائے۔ تو یہ بھی ایک طبعی حالت کے حد سے زیادہ تجاوز کر جانے کی وجہ سے بیماری بنتی ہے اور خلاصہ اس کا قرآن کریم نے یہ نکالا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا، جس کسی نے بھی اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا اس کے تینوں علم کے رستے بند ہو جاتے ہیں اور اس سے بڑا اندھیرا اور کیا ہے کہ ایک اندھیرے کے بعد دوسرا، نہ کان سے سن سکے، نہ آنکھ سے دیکھ سکے، نہ دماغ اور دل سے غور کر سکے۔ تو وہ جو ظلمات ثلاث ہیں، کچھ باہر کی ہیں کچھ جسم کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں اور ان پر آپ غور کر کے اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں تو ہر ایسا موقع جس سے اندھیرا پیدا ہوتا ہے، ہر اس موقع سے روشنی بھی پیدا ہوتی ہے اور وہاں صحیح طریق اختیار کرنے کا نام ہی اندھیرے سے روشنی میں آنے کا نام ہے۔

پس یہ نفس کے اندھیرے ہیں اور ان اندھیروں سے متعلق خدا تعالیٰ نے دوسری جگہ بھی ہمیں یہی سمجھایا کہ جو ان اندھیروں میں مبتلا ہو جائے اللہ کے سوا پھر اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کیونکہ عَلٰی عِلۡمٍ یہ لوگ دیکھنے کے باوجود اندھیروں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو کیا دکھاؤ گے اور کیا سمجھاؤ گے؟ ان کی مزید تعریف یہ فرمائی کہ وہ کہتے ہیں کہ یہی دنیا کی زندگی ہے اسی میں ہم نے رہنا ہے، یہیں ہم نے مرنا ہے۔

پس آج کل خصوصیت سے جہاں مادّیت کا دور ہے جماعت احمدیہ کو اپنی تبلیغ کی راہ میں بھی سب سے بڑی مشکل یہی درپیش ہوتی ہے۔ غریب ملک ہو یا امیر ملک ہو جہاں مادہ پرستی اور سیاسی غلبہ اور زیادہ اموال اور ایک دوسرے پر تفاخر کرنا اور لہو ولعب میں مبتلا ہونا یہ تینوں قسم کے اندھیرے قوم کے افق کو ڈھانپ لیں اور کوئی کسی طرف سے بھی روشنی کی امید دکھائی نہ دے ایسی قوم کو راہ حق کی طرف بلانا سب سے بڑا مشکل کام ہے کیونکہ ان کے دل کی آواز یہ ہوتی ہے کہ یہی تو زندگی ہے جس میں ہم نے رہنا ہے، سب کچھ یہی ہے، یہیں رہنا ہے یہیں مرنا ہے تو ہم کیوں ایک فرضی موت کے بعد کی زندگی کی خاطر اس دنیا کی لذّتوں کو چھوڑیں۔ ایک فرضی موت کے بعد کی دنیا کے تصور میں اپنا یہاں محاسبہ شروع کریں اور بدیوں سے احتراز اور نیکیوں کی طرف رغبت کریں جو قربانی چاہتی ہیں۔ عمر ضائع کرنے والی بات ہے۔ اس لئے یہیں کھیلو، کودو، کھاؤ، پیو، مر جاؤ یہی کچھ تو ہے ہمارے مقدّر میں۔ ایسے لوگوں کو آپ نیکی کی طرف بلا نہیں سکتے کیونکہ اس کے آخر پر خدا نے یہی نتیجہ نکالا فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ جو اس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہو جائیں ان کو اللہ کے بعد ہدایت دے کون سکتا ہے؟

اور دوسری اس دعا میں جو ہمیں آنحضرت ﷺ کی طرف سے سکھائی گئی اور جمعہ کے وقت بھی ہم وہ دعا پڑھتے ہیں وہ دعا ہے۔ **ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا** اے خدا ہم تیری پناہ میں آتے ہیں۔ **من شرور انفسنا** اپنے نفس کے شرور سے **ومن سيات اعمالنا** اور خود اپنے ہی اعمال کی بدیوں سے۔ اب یہاں باہر کے خطرات کا کوئی ذکر نہیں حالانکہ باہر سے بھی خطرات انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔ وہ پہلی آیت جس کی میں نے تلاوت کی تھی اس کے بعد والی آیت سے تعلق رکھتے ہیں اس کی طرف میں ابھی نہیں آ رہا۔ جہاں نفس کے اندھیروں کا تعلق ہے اس کے تعلق میں ہمیں یہ دعا سکھائی گئی **ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا** اگر ایسا نہ ہو تو کیا ہے **ومن يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له** جسے اللہ ہدایت دے

اسے پھر کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ ومن یضللہ فلا ھادی لہ جسے خدا گمراہ ٹھہرادے پھر اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

یہ لا ھادی لہ والا مضمون ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا ہے جو ایسا شخص ہو کہ اَضَلَّہُ اللّٰہُ جسے اللہ نے گمراہ ٹھہرا دیا ہو ان حرکتوں کی وجہ سے فَمَنۡ یَّھۡدِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰہِ تو اللہ کے بعد ہے کون جو پھر اس کو ہدایت دے سکے۔ تو ایسی دنیا جہاں مادہ پرستی کے اندھیروں نے قوم کو ڈھانپ لیا ہو اور ہر طرف سے مادہ پرستی اور اس کے مشاغل میں انسان اپنی ساری زندگی کھویا رہا ہو، اس کے سوا کچھ دکھائی نہ دے، ان سے آپ مذہب کی باتیں کریں مرنے کے بعد کے قصے سنائیں یہ بالکل بے کار بات ہے دیوار سے باتیں کرنے والی بات ہے۔ ان کے کانوں میں تو پڑ ہی کچھ نہیں سکتا۔ ان کا کیا علاج ہے؟ ان کا علاج یہ ہے کہ ان کے لئے دعا لازم ہے۔ جب تک دعا کے ذریعے خدا تعالیٰ سے مدد طلب نہ کریں اس وقت تک ان کی آنکھیں کھل نہیں سکتیں۔ اس لئے وہاں بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا ہے اللہ کے سوا کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، تمہیں اختیار نہیں ہے، تم ان کی آنکھیں نہیں کھول سکتے، لیکن اللہ کھول سکتا ہے۔

اسی تعلق میں ان ماں باپ کو میں نصیحت کرتا ہوں جو اپنے بچوں میں سے بعض کے متعلق سخت مایوس ہو جاتے ہیں۔ کوئی ذریعہ نہیں ان کے پاس رہتا وہ سمجھا کے بلا سکیں۔ ان کے ہاں پیدا ہوئے، نیک باتیں سنیں اور بعض ایسے بدنصیب نکلتے ہیں کہ اچانک ان سب باتوں سے ایمان اٹھ جاتا ہے اور وہ مادہ پرستی کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں، اسی سے متأثر ہو جاتے ہیں، اسی سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور پھر مائیں کہتی رہتی ہیں ویلک تجھے کیا ہو گیا ہے، کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہے، خدا کی طرف آ۔ کوئی توجہ نہیں دیتے کیونکہ ان کی آنکھیں بھی اندھی ہو چکی ہیں ان کے کان بھی بہرے ہو چکے ہیں ان کے دل سوچنے کی طاقت سے عاری ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دعا کرنی چاہئے اور دعا اگر سنجیدگی سے ہو اور توکل کے ساتھ ہو تو غیر معمولی طاقت رکھتی ہے کیونکہ پھر آپ کی تدبیر، تقدیر کے ساتھ آسمان سے اتری ہے ورنہ دنیا کی تدبیر آسمانی تقدیر کے خلاف کچھ بھی کر نہیں سکتی، کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاتھ میں ہدایت موجود ہے، ابھی تک پر تمہارے ہاتھ میں نہیں رہی تمہارے بس کا روگ نہیں رہا۔ یہ لوگ اگر کبھی ہدایت پائیں

گے تو خدا کے فضل سے پائیں گے ورنہ نہیں۔

پس مردوں کو زندہ کرنا اس کو کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، وہ صدیوں سے جو قبروں میں دبے پڑے تھے وہ زندہ ہو گئے۔ وہ کیا بات ہوئی، کیا ماجرا گزرا، فرمایا ایک فانی فی اللہ کی دعائیں ہی تو تھیں۔ وہاں یہ نہیں فرمایا کہ تعلیم، کتاب تھی یا حکمتیں بیان کرنے کا طریق تھا جس کی وجہ سے وہ گڑے مردے جو صدیوں سے مرے پڑے تھے وہ زندہ ہو گئے۔ دیکھیں ایک عارف باللہ ہی ایک عارف باللہ کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو فرمایا وہی حق ہے اس کے سوا اور کوئی حق نہیں کہ نہ نصیحت کام آئی، نہ دلائل کام آئے اور نہ تلوار نے کام کیا جیسا کہ مودودی کو دکھائی دیا۔ اگر کام آئیں تو دعائیں کام آئیں۔ فرمایا یہ جو عجیب معجزہ تم نے بیابان عرب میں رونما ہوتے دیکھا وہ ایک فانی فی اللہ کی دعائیں ہی تو تھیں۔

پس جہاں تک ہماری اگلی نسلوں کا تعلق ہے جو ان اندھیروں میں مبتلا ہو چکی ہیں جن کا قرآن کریم میں ذکر ہے، یہ اللہ کا احسان ہے کہ نسبتاً بہت کم ہیں، مگر مغربی دنیا میں خاص طور پر دنیا کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر ایک غیر معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوئے یہاں کے ٹیلی ویژن وغیرہ کے نظام سے متاثر ہو کر بعض دفعہ یہاں پیدا ہونے والے بچے اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ان کی آنکھیں اندھی ہوں لازم ہے کہ ان کی فکر کی جائے اور محسوس کیا جائے کہ بیماری کیا ہے اور کہاں تک پہنچی ہے۔ اندھے ہونے سے پہلے پہلے ان کو روکنا ہمارے بس میں ہے۔ اگر اندھے ہو ہی چکے ہوں تو پھر یہ بھی سوال ہے کہ کیا تینوں رستے بند ہو گئے ہیں۔

اب دیکھیں قرآن کریم کی حکمت کا بیان کہ تین رستوں کے لئے الگ الگ بیماریاں بیان فرمائی ہیں۔ کان کا رستہ ایک نور کا رستہ ہے۔ آنکھ کا رستہ ایک نور کا رستہ ہے اور تذکیر کی قوت اور فکر کی قوت جو ماحصل کو آپس میں ملا کر نئے نتائج پیدا کرتی ہے اس کو دل کی قوت کہا جاتا ہے، وہ بھی ایک نور کا رستہ ہے۔ ورنہ ایک شخص جس کے دماغ میں نتائج اخذ کرنے کی قوت نہ ہو وہ دیکھتا بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سنتا بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض بیمار ایسے ہیں ان کی اطلاع دیتے ہیں کہ آنکھیں تو کھول لی ہیں، آواز بھی آ رہی ہے مگر کچھ پتا نہیں کہ کیا سن رہا ہے اور کیا دیکھ رہا ہے۔

تو خدا کے کلام کی شان دیکھیں کس طرح ان تینوں کو آپس میں اکٹھا کر کے ایک واحد مضمون پیدا فرمایا ہے۔ فرمایا ہے روشنی کے یہ تین رستے ہیں ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی روشنی۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو کمی آ جائے گی۔ مگر کوئی بھی نہ ہو تو پھر تمہارا کیا بس ہے کہ تم اسے ٹھیک کر لو۔ اسی کو موت کہتے ہیں۔ جب مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ صدیوں کے گڑے ہوئے مردے زندہ کر دیئے تو یہ موت کی علامتیں پیدا ہو چکی تھیں اس عرب میں جس میں آنحضرت ﷺ کا نور ظاہر ہوا ہے۔ اندھیروں میں آپؐ نے قدم رکھا ہے اور اندھیروں کو روشنیوں میں تبدیل فرمایا ہے۔ وہ ذاتی کوشش سے، علم کی کوشش سے، تقریری کوشش سے، تحریری کوشش سے ممکن نہیں تھا۔ فرمایا ایک **فانی فی اللہ** کی راتوں کی دعائیں ہی تو تھیں۔

پس وہ لوگ جو اس مضمون کی انتہائی ظلمت کے کنارے تک جا پہنچے ہیں ان کو بھی ہم نے بلانا ہے خواہ وہ ہمارے علاوہ ہوں یا ہمارے اندر کے بسنے والے لوگ ہوں، ہمارے گھر کے بچے ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر یہ حالت پہنچ گئی ہے سنتے بھی نہیں ہیں اور سوچتے بھی نہیں ہیں اور دیکھنے سے ویسے ہی عاری ہو چکے ہیں تو آپ کیسے ان کو ہدایت دیں گے۔ میرے سامنے مسئلے لاتے ہیں، میں کہتا ہوں یہ وقت گزر چکا ہے اب، تمہیں جلدی ہوش چاہئے تھی۔ اس وقت بیمار کو لے کے آئے ہو جب آنکھیں کھلی ہیں مگر دکھائی نہیں دے رہا، کان موجود ہیں مگر سنائی نہیں دے رہا، قوت فکر سے خالی ہو گیا، موت اور کہتے کس کو ہیں پھر؟ تو موت کا تو کوئی علاج نہیں۔ مردہ کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا مگر اللہ اور ظاہری مردے تو وہ اس دنیا میں زندہ نہیں کرتا مگر روحانی مردوں کو ضرور زندہ کرتا ہے ورنہ قرآن کریم کے یہ مضامین اور بارہا اس کے تذکرے بالکل بے معنی اور لغو ہو جائیں گے اور ہو نہیں سکتا کہ قرآن کریم کسی مضمون کو محض لغو قصوں کے طور پر بیان فرمائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابراہیمؑ نے بھی تو سوال کیا تھا۔ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (البقرہ:261) اے میرے خدا! بتا مردوں کو تو کیسے زندہ کرے گا یہ مردے کیسے زندہ ہوں گے؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ایک طریق سکھایا جس کے متعلق میں پہلے اس سے ایک خطبے میں روشنی ڈال چکا ہوں۔ اب وہ ظاہری مردے مراد نہیں تھے روحانی مردے تھے اور وہ مردے ایسے ہیں جو ایک صاحب فہم، صاحب عقل انسان دیکھ کر یہی فیصلہ کرتا ہے کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

آج ہمارے اردو کے سوال و جواب کے موقع پر بھی یہی سوال اٹھایا گیا ایک دوست کی طرف سے کہ تبلیغ پہ آپ نے بڑا زور دیا ہے مگر یہ بتائیں کہ جس سے بات کرو جس کو دنیا کی ہوش اور لالچ کے سوا دلچسپی کوئی نہ ہو اس کو کس طرح ہم بلائیں، کیسے سمجھائیں، کون سی آواز دیں جو اس کے کانوں کے پردوں کے پار اتر سکے جہاں مہریں لگی ہوئی ہیں۔تو ان کو بھی میں نے ایک جواب دیا۔اب میں اس مضمون کو خاص طور پر اس حوالے کی وجہ سے زیادہ اٹھا رہا ہوں کیونکہ آج صبح کی ابھی چند گھنٹے پہلے کی یہ تازہ تازہ بات ہے۔اس کا اصل علاج دعا ہے۔یا فیصلے میں جلدی سے پہلے آپ غور کریں کہ کیا سارے نور کے رستے بند ہو چکے ہیں یا کچھ کچھ رمق باقی ہے۔اگر رمق باقی ہو تو وہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔رمق باقی ہو تو اس سے فائدہ اٹھا کر اس کے بچنے کے، اس کی شفا کے سامان کئے جا سکتے ہیں۔ پس اول دعا کا ذریعہ ہے اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔جس میں دلچسپی ہو اور اپنوں کا چونکہ زائد حق ہوتا ہے دوہرا تہرا حق ہوتا ہے، اپنوں کے لئے خصوصیت سے یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان اندھیروں کی مار سے بچائے کہ روشنی کی کوئی بھی راہ باقی نہ رہے، دیکھتے دیکھتے زندوں سے یہ مردوں میں نکل جائیں اور اگر نکل بھی جائیں تو مایوسی نہیں کرنی چاہئے۔رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کی دعا کو یاد کرو۔یاد کرو کہ کس طرح ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے ہاتھوں یہ معجزہ دکھا دیا۔کس طرح ایک نبیؑ نے ایک اجڑی ہوئی بستی کو دیکھا اور یہی سوال دہرایا کہ اے خدا یہ مرے ہوئے کیسے زندہ ہوں گے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ خدا کے ایک نبی عزرا اس بستی سے گزرے جسے یروشلم کہا جاتا ہے، اس حالت میں گزرے جب کہ ایک بادشاہ نے اسے کلیۃً برباد کر دیا تھا، کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا تھا۔ Soloman's Temple بھی Completely Destroy ہو کر یعنی کلیۃً منہدم کر دیا گیا اور ایک ملبے کا ڈھیر بن گیا۔چھتیں گر پڑیں، کھوکھلی دیواریں کھڑی تھیں۔اس نے دیکھا اس نے کہا اے خدا تو نے زندہ تو کرنا ہے ان کو، تیرے وعدے ہیں، مگر کیسے زندہ ہوں گے۔تب اللہ تعالیٰ نے اسے سو سال کی خواب دکھائی اور عجیب لطف کی بات ہے قرآنی فصاحت و بلاغت ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک نہایت شاندار مضمون سے ایک نہایت بدزیب مضمون لوگ نکال لیتے ہیں۔فرمایا خود اسے سو سال کی موت دی، پتا لگے کہ زندہ ہوتے کیسے ہیں سو سال میں اور اس نیند کی حالت میں تمام

سوسال کے واقعات جو گزرنے تھے اور جس کے بعد ایک عجیب انقلاب برپا ہونا تھا، ان لوگوں نے جی اٹھنا تھا، اس بستی نے دوبارہ زندہ ہو جانا تھا، وہ اسے سمجھائے اور سمجھانے کے بعد پھر یہ غلط فہمی دور کرنے کی خاطر کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ واقعۃً سوسال کے مرے ہوئے جئیں گے۔ فرمایا اپنے گدھے کو دیکھ لے اسی طرح کھڑا ہے کچھ بھی نہیں ہوا اس کو۔ اپنے کھانے کو دیکھ اگر واقعۃً سوسال ہوتے تو سڑ بُس جاتا۔ اسی طرح تازہ کا تازہ ہے۔ تو جو ہم تجھے سمجھا رہے ہیں یہ تمثیلات ہیں۔ یہ مری ہوئی بستی ضرور زندہ ہوگی جیسا کہ تجھے رؤیا میں دکھایا گیا اور واقعہ یہ ہوا کہ اس واقعہ کے سوسال کے اندر اس عظیم بادشاہ نے جس کے متعلق بائبل میں ذکر ملتا ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو دوبارہ زندہ کر دینا تھا جس نے اس اجڑے ہوئے شہر کو آباد کرنا تھا۔ خورس بادشاہ تھا جس کا ذکر یسعیاہ میں ملتا ہے جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ تم میں سے نہیں ہے مگر میں اس سے کلام کروں گا اور اس کا ملہم ہونا قرار دیا اور یہ بتایا کہ اس کے ذریعے جو اسرائیل کی اجڑی ہوئی رونق ہے وہ دوبارہ قائم کی جائے گی۔ بنوکدنضر کے برعکس یہ بادشاہ خدا ترس تھا۔ غیر معمولی طور پر بنی نوع انسان کی خیر خواہی کرنے والا تھا۔ ایسا بادشاہ تھا جس کی ایسی تعریف مؤرخین نے کی ہے کہ اس کی کوئی مثال کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک بادشاہ ہے جس میں ہر پہلو سے وہ تعریف دیکھتے ہیں، ایک بھی گند نہیں نکال سکے۔ یہ وہ خورس ہے۔ تو خورس نے اس کے سوسال کے بعد اس کو آباد کر دیا اور اس کی کھوئی ہوئی رونقیں واپس آ گئیں Soloman's Temple دوبارہ بنایا اور بائبل کی از سر نو تدوین ہوئی اس کے نتیجے میں۔ خورس کے زیر اثر ایسے اہل ایران کے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے آپ کو بائبل کے ترجموں کے لئے وقف کیا اور ایسی زبان میں جو فارسی اثر کے تابع Hebrew کے ساتھ مل کر ایک نئی زبان بنی تھی اس میں تراجم کئے گئے، بہت بڑی خدمت ہوئی ہے۔ مگر یہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی بات ہو رہی ہے اور ان معنوں میں خدا زندہ کیا کرتا ہے۔ جہاں سب امیدیں خطا ہو جائیں کوئی امید کی راہ باقی نہ رہے ایک قوم کے متعلق کہہ دیا جائے کہ مرگئی، کھپ گئی، ختم ہوگئی، پھر بھی خدا زندہ کر سکتا ہے اور ایسے معجزے پہلے دکھا چکا ہے۔

پس آنحضرت ﷺ کی امت جس کے نبی کو خدا تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے والا قرار دیتا ہے، جس کی تعریف یہ فرمائی گئی کہ اے دنیا کے مُردو جب یہ تمہیں اپنی طرف بلائے کہ تمہیں زندہ کرے تو تم

اٹھ کھڑے ہوا کرو اس کی آواز پر لبیک کہا کرو۔ ایسے نبی کی امت کے متعلق جب یہ حالات پیدا ہو جائیں تو ہرگز مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ پس پہلے تو میں آپ کو مغربی دنیا میں تبلیغ کے متعلق توجہ دلاتا ہوں کہ وہاں بھی خواہ کس حال کو یہ لوگ پہنچ چکے ہوں یاد رکھیں کہ دعاؤں کی برکت سے مردے پہلے بھی زندہ ہوئے، آج بھی ہو سکتے ہیں، کل بھی ہوں گے۔

اور جہاں تک امت مصطفی ﷺ کا تعلق ہے خواہ وہ نام ہی کی کیوں نہ ہو، منسوب محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہوتے ہیں ان کے متعلق آج کل یہ عام چرچا ہے کہ وہ تو گئے اور احمدی کی بات نہیں غیر احمدی دانشور بڑے بڑے لکھنے لگے ہیں کہ کوئی زندگی کے آثار باقی نہیں رہے، آئے دن ایسے مضامین چھپتے ہیں کیا باقی رہا ہے سوائے نام کے۔ ان کے متعلق بھی کسی احمدی کو زیب نہیں دیتا کہ ان سے مایوس ہو جائے اور یہ کہہ دے کہ ان کے دن گنے گئے اور یہ ہمیشہ کے لئے مٹی میں غرق ہو گئے۔ اگر بنی اسرائیل کے سو سالہ گڑے مردوں کو خدا اٹھا سکتا ہے، اگر عرب کے مشرکوں کے سینکڑوں سال کے گڑے ہوئے مردوں کو خدا زندہ کر سکتا ہے تو آنحضرت ﷺ سے دعاؤں کے گُر سیکھتے ہوئے، ان کے لئے دعائیں کریں اور بڑے الحاح اور یقین سے دعائیں کریں تو دیکھو یہی جی اٹھیں گے، ان کے کان سننے لگیں گے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے لگیں گی، ان کی زبانیں بولنے لگیں گی، ان کے دلوں میں غور و فکر کی صلاحیتیں جاگ اٹھیں گی اور قوم کے دن پھر سکتے ہیں اور پھریں گے انشاء اللہ۔ مگر پہلے اپنے دن پھیریں۔ اپنی آنکھوں سے ان پردوں کو دور کریں جن کا ذکر قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔ اپنے کانوں سے ان بوجھوں کو نکالیں جو آپ کی سماعت پر بد اثر ڈال رہے ہیں اور اپنے دلوں سے ان مَیلوں کو دھوئیں جو مَیلیں آپ کے دلوں میں سوچنے اور سمجھنے کی طاقتوں کو مدھم کر دیتی ہیں یا دھندلا دیتی ہیں یا بعض دفعہ ایسا اُلجھا دیتی ہیں کہ تاریکی ہی تاریکی رہ جاتی ہے، حقیقی سوچ کا مادہ دل سے نکل جاتا ہے۔

یہ جو دوسرا حصہ ہے اس آج کے خطبے کا اس کے متعلق میں انشاء اللہ اگلے خطبے میں کچھ مثالیں دے کر آپ پر بات کھولوں گا۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ اپنی آنکھوں سے پردے ہٹاؤ، اپنے کانوں سے بوجھ نکالو۔ مثالیں دے کر، روزمرہ کی زندگی کے تجربے آپ کے سامنے رکھ کر بتانا ہوگا کہ یہ بدیاں ہیں جو ہمارے اندر راہ پا رہی ہیں ان سے اپنے آپ کو چھڑائیں ورنہ یہ تین قسم کی

بدیاں، تین صلاحیتوں کے اوپر حملہ آور ہیں۔لہوولعب، زینت اور تفاخر اور کثرت اموال اور اولاد کی تمنائیں جب یہ معبود بن جائیں تو پھر یہ اندھیرے ہیں جو ان تینوں صلاحیتوں پر چھا جاتے ہیں۔ پھر آپ کے دیکھنے کی طاقت بالکل سلب ہو جاتی ہے کچھ بھی آپ نہیں کر سکتے اسی کا دوسرا نام موت ہے۔ پس دعائیں کریں ان کے لئے جن کو آپ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ دعائیں ان کے لئے کریں جن کے معاشرے میں آج بہت سے احمدی اپنے وطن کو چھوڑ کر آ بسے ہیں اور ان کے اندھیروں کے رحم وکرم پر پڑے ہوئے ہیں۔ روشنی دکھائی دے رہی ہے اور عَلٰی عِلْمٍ ہونے کے باوجود وہ اندھیرے ہیں ان سے سب سے زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے۔ ان سے ڈرنا سب سے اہم ہے کیونکہ وہ روشنی کے اندھیرے ہیں، یہ میں آپ کو سمجھانے کی بات کر رہا ہوں۔ عَلٰی عِلْمٍ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے یہ برائیاں ہیں پھر بھی آپ کو وہ روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

تو اس سلسلے میں جب آپ تبلیغ کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مایوسی کے کئی مراحل سامنے آتے ہیں جب سمجھتے ہیں کہ آگے رستہ ہی کوئی باقی نہیں رہا۔ان باتوں کو یاد رکھیں کہ یہ سارے مراحل دعا کے ذریعے طے ہوں گے اور رکی ہوئی نبضیں پھر چل پڑیں گی ایسے دوست جن سے آپ کو کلیۃً مایوسی تھی وہ از خود جاگ اٹھیں گے اور یہ بات حقیقۃً دنیا کے مختلف کونوں سے جہاں داعی الی اللہ نئے جوش کے ساتھ اٹھ رہے ہیں لوگ مجھے لکھ رہے ہیں۔ ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں۔ بارہا یہ باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں شخص تھا اس پر ہم نے اس طرح توجہ دی، یہ کوشش کی، بالکل پتھر کی طرح تھا جس سے سر ٹکرانے سے اپنے آپ کو نقصان پہنچے اور اس پتھر پہ کوئی اثر نہ پڑے لیکن ہم نے دعائیں کیں اور اب یہ واقعہ ہوا ہے اور حیرت ہوتی ہے دیکھ کر کہ کس طرح خدا نے اس شخص کا دل بدلا ہے۔ کس طرح اس کی تقدیر جاگ اٹھی اور اچانک وہ جو دشمن تھا وہ احمدیت کا فدائی دوست بن گیا۔ یہ دعاؤں کی برکت سے ہوا ہے۔ ایک دفعہ نہیں بارہا یہ ہو چکا ہے اور بارہا اس کی قطعی واضح اطلاعیں مجھے ملتی ہیں اس لئے میں کوئی فرضی کہانی آپ کے سامنے نہیں رکھ رہا بلکہ تجربے میں آئی ہوئی، یہ مجرب نسخہ ہے جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ تو دعائیں کریں اور دعاؤں کے دامن میں، دعاؤں کے سہارے سے دعوت الی اللہ کے میدان میں آگے بڑھیں۔

پھر جو ابھی آپ کو کھوئے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت کے نونہال آپ کو ضائع ہوتے دکھائی دے رہے ہیں ان کی فکر کریں۔ یہ نہ ہو کہ دوسروں کو زندہ کر رہے ہوں اور اپنے ہاں قبرستان بن رہے ہوں۔ بہت ضروری ہے کہ ان کی فکر کریں اور پھر سب سے زیادہ اُمت محمدیہ کی فکر کریں جو کم سے کم نام کے ساتھ تو آنحضرت ﷺ سے وابستہ ہیں ان کی زندگی کی دعائیں مانگیں، ان کی زندگی کے لئے جو چارہ آپ کے بس میں ہو کریں اور پھر آخر پر اپنے اندر بھی نگاہ ڈالیں۔ غور کریں کہ آپ کی ذات جو آپ کو روشن دکھائی دے رہی ہے اس میں کہیں اندھیرے تو نہیں لپٹے ہوئے۔ تب آپ کو سمجھ آئے گی کہ روشنیوں کے لباس میں اندھیرے لپٹے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بصیرت عطا فرمائے، سمجھ اور غور کی طاقت بخشے، ہمارے کان بھی سننے والے ہوں، ہماری آنکھیں بھی دیکھنے والی ہوں، ہمارے دل بھی غور کرنے والے ہوں اور ہم حقیقت میں مردوں کو زندہ کرنے کا ذریعہ بن جائیں اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جماعت کی طاقت کا راز اس اطاعت میں ہے جو فرشتوں نے دکھائی تھی۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 12 / اپریل 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الجاثیہ: 24)

پھر فرمایا:

گزشتہ دو خطبوں سے یہ مضمون چل رہا ہے کہ اگر نفس کے اندھیروں کو نفس سے دور نہ کیا جائے تو روشنی وہاں جگہ نہیں بنا سکتی۔ اس میں بظاہر ایک تضاد بھی ہے۔ روشنی ہی تو ہے جو اندھیروں کو دھکیل کے باہر کرتی ہے مگر قرآن کریم نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ ایسا ہے کہ نفس کے اندھیرے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب روشنی کے رستے بند کر دیئے جائیں۔ روشنی کی جو راہیں اللہ نے بنائی ہیں ان سے اگر داخل بھی ہو تو وہ ادراک کی قوت جو آخری صورت میں ہر آنے والے پیغام کو سمجھتی ہے اور اس کا تجزیہ کرتی ہے اس سے ایک آخری شکل نکالتی ہے وہ اس لائق نہ ہو کہ اس پیغام کو سمجھ سکے۔ پس کوئی تضاد نہیں ہے اس بات میں۔ روشنی میں طاقت تو ہے کہ وہ اندھیروں کا ازالہ کرے مگر وہ پردے جو روشنی کی راہ میں حائل کر دیئے جائیں پھر جو اندھیرے پیدا ہوتے ہیں ان کے وجود میں روشنی کا کوئی قصور نہیں۔

پس یہ جو مثال دی اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کہ وہ شخص جو اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لے اس کی مثال ایسی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ گمراہ قرار دے دے اور باوجود علم

کے گمراہ ہو یعنی روشنی ہو تو سہی مگر ایسی روشنی نہ ہو جس سے وہ فائدہ اٹھا سکے اور یہ کس صورت میں ممکن ہے فرمایا خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ اس کے کانوں پر بھی مہر کر دے یعنی قوت شنوائی پر وَقَلْبِهٖ اور اس کے دل پر بھی مہر لگا دے۔ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً اور اس کی آنکھوں پر پردہ تان دے۔ یہ اگر صورت پیدا ہو تو روشنی خواہ وہ سمعی روشنی ہو یا بصری روشنی ہو وہ پردوں سے ٹکرا کرنا کام واپس لوٹ جائے گی اور اندھیروں کو روشنی میں تبدیل نہیں کر سکے گی اور یہ جو صورت حال ہے یہ ایک انسان کی اندرونی بیماری سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بیماری باہر سے نہیں آتی کیونکہ خدا نے تو کہیں نہیں فرمایا کہ اپنے نفس کو اپنا معبود بنا لو۔ اللہ تعالیٰ نے تو بار بار یہی فرمایا اور اسی طرف توجہ دلائی کہ میں ہی تمہارا ایک معبود ہوں اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس وہ شخص جو جان بوجھ کر سنتے ہوئے بھی نہ سنے، دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھے اور خدا کو چھوڑ کر اپنے نفس کی خواہشات کو معبود بنا لے اس پر اگر یہ پردے اترتے ہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے ہر انسان کا اپنا اختیار ہے۔ اگر خدا کو معبود بنائے گا تو روشنی بغیر تردد کے، بغیر روک کے سارے وجود کو روشن کر دے گی اور اگر نہیں بنائے گا، اپنے نفس کو معبود بنائے گا تو وہ پردے حائل رہیں گے۔

یہ پردے کیا ہیں یہ دراصل نفس کی غلط فہمی کے پردے ہیں اور اس غلط فہمی کو سمجھے بغیر آپ ان پردوں کو اتار نہیں سکتے یا آخری تجزیہ کو اگر پیش نظر رکھیں تو جب تک اپنے نفس کو خدا کے تقاضوں پر ترجیح دیتے رہیں گے یہ پردے آپ کی آنکھوں، آپ کے کانوں، آپ کے دل پر سے اتر نہیں سکتے، ناممکن ہے۔ چنانچہ فرشتوں کی مثال اور شیطان کی مثال نے یہی بات ہم پر کھولی فرشتوں پر کوئی انا کا پردہ نہیں تھا اور شیطان پر انا کا پردہ تھا۔ شیطان نے اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھا اور اپنے نفس کو خدا بنا لیا اپنی ''ھویٰ'' کو خدا بنایا ہوا تھا فرشتوں اور شیطان میں یہی فرق ہے۔ فرشتوں نے خدا کو خدا بنایا تھا اس لئے جب خدا نے فرمایا کہ اس کو سجدہ کرو تو اس کے سامنے جھک گئے کیونکہ اللہ کا حکم تھا اور معبود خدا تھا۔ پس خدا کے حکم کے تابع اگر کسی کی اطاعت کی جائے تو وہ انسان کی اطاعت نہیں ہے وہ اس وجود کی اطاعت نہیں ہے بلکہ اللہ کی اطاعت ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے کس کے سامنے کس کو جھکا دے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ہمیشہ اس کا اپنا نفس ہوتا ہے جس کو وہ خدا سمجھتا ہے۔

اور اس آیت کی تفسیر اور اس کی ساری روئداد آدم کی تخلیق اور فرشتوں اور شیطانوں کے اس

حکم پر رد عمل میں ہمارے سامنے ہے جو قرآن کریم نے محفوظ فرمایا۔ حکم ہوا سجدہ کر دو، فرشتوں نے کہا حاضر ہیں ہم سجدہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھا کہ یہ کیا چیز ہے ہمارے مقابل پر اس کی کیا حیثیت ہے لیکن تھا ضرور خیال۔ اگر خیال بھی نہ ہوتا تو یہ نہ کہتے کہ کیا تو اس کو بنائے گا زمین میں اپنا خلیفہ، اس کو بنائے گا جس سے فساد برپا ہوں گے جس سے خون خرابہ ہوگا، زمین خون سے رنگی جائے گی۔ اس لئے یہ غلط بات ہے کہ انہوں نے لاعلمی میں خدا کے حکم کے سامنے سر جھکایا ہے۔ علم تھا اور ایسی بات کا علم تھا کہ جو واقعۃً ہو کے رہنے والی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ آدم کے وجود کے نتیجے میں جب اس کو اختیار ملے گا۔ نیک و بد میں فیصلہ کرنے کا، چاہے تو نیکی اختیار کرے، چاہے تو بدی اختیار کرے تو اپنی سرشت کے اعتبار سے یہ ایسا ہے کہ خودسری بھی کرے گا مخالفتیں بھی ہوں گی آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے اٹھیں گے حسد کارفرما ہوگا۔ جو بھی باتیں ہوں اس وجود نے تو ضرور دنگے فساد کرنے ہیں اور خون خوب بہائے گا فساد برپا کرے گا اور خدا کہہ رہا ہے کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ مگر فرشتے جانتے تھے کہ ہم خدا کی عبادت کرنے والے ہیں اس لئے خدا جس کے سامنے کہے ہم اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ تو کوئی بے وقوفی کا فیصلہ نہیں تھا لاعلمی کے نتیجے میں، لاعلمی تھی تو عرفان کی کمی کی وجہ سے۔ جو عرفان خدا نے ان کو عطا نہیں فرمایا اس کے فقدان کی وجہ سے ان کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے مگر ان وسوسوں کے باوجود اطاعت کی ہے اس میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ نفس کے اندھیرے وسوسوں سے پیدا ہوتے ہیں اور وساوس ہی ہیں جو یقین کو شک میں بدل دیتے ہیں۔ پس وہ شخص جو اپنے وسوسوں کا شکار نہ ہوا اور اس آخری حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھے کہ جسے خدا نے مامور بنایا ہے اس کے سامنے میں سر جھکاؤں گا، جسے خدا نے ایک امارت بخشی ہے ایک حکم بخشا ہے میں نے تو خدا کی عبادت کرنی ہے اس بندے کی تو کوئی حیثیت نہیں۔ اگر میں نے خدا سے روگردانی کی تو میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا اور جتنا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنے سے چھوٹا دیکھے اور پھر بھی سر جھکائے اتنی ہی بڑی اس کی عظمت ہے۔ وہاں جھکنا عظمت کی دلیل ہے وہاں سر اٹھانا ذلت کا نشان ہے۔ اب دیکھو فرشتوں کو کیسا مرتبہ اور مقام حاصل ہوا انہوں نے آدم کو ایک معمولی حقیر چیز دیکھتے ہوئے بھی اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا فیصلہ کیا کیونکہ خدا کا حکم تھا اور فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے ہر الزام سے پاک رکھا لیکن

شیطان نے کیا کہا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۔

تو پہلا پردہ جو انسان کو اندھیروں میں مبتلا کرتا ہے وہ انانیت کا پردہ ہے اور یہی اس آیت کی تفسیر ہے۔ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وہ جو اپنی خواہشات کو، اپنے نفس کو، اپنے طبعی میلانات کو اپنا معبود بنا بیٹھے وہ مجسم شیطان ہے اور اس کے لئے کوئی روشنی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی اندھی ہوں گی اس کے کان سنتے ہوئے بھی بہرے ہوں گے اس کا دل ان پیغامات کو آخری صورت میں ترتیب نہیں دے سکتا جس ترتیب کے ساتھ انسان کو خیالات سمجھ آتے ہیں اور حقائق کی پہچان ہوتی ہے، جس ترتیب کے ساتھ ایک پاک دل اپنی شنید کو اور اپنی بصر کے پیغامات کو مرتب کرتا ہے اور نتائج نکالتا ہے۔ پس واقعات تو وہی رہتے ہیں جو ہیں، اب ان کو کیسے سمجھنا ہے ان کے کیا نتائج نکالنے ہیں ان باتوں میں فرق ہے۔ اب دونوں باتیں درست تھیں جو خدا کے حکم کے بعد فرشتوں کی طرف سے بطور عذر پیش ہوئیں اور شیطان کی طرف سے بطور عذر پیش ہوئیں۔ اب یہ بھی ایک بہت دلچسپ حقیقت ہے کہ ایک کو روشنی کیوں قرار دیا دوسری کو اندھیرا کیوں قرار دیا۔ ایک روشنی کی راہ میں پردہ نہ بنی اور دوسرا عذر جو فی الواقعہ درست تھا روشنی کے سامنے پردہ بن گئی۔ ان دونوں کا اگر آپ تجزیہ کریں اور تفریق کریں تو پھر اس حکمت کی سمجھ آجاتی ہے پھر اسے اپنے روزمرّہ حالات پر آپ چسپاں کریں تو آپ کے لئے، اپنے لئے روزانہ صحیح فیصلے کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

فرشتوں نے جو کہا تھا کہ فساد کرے گا زمین میں اور خون خرابہ ہوگا یہ ضرور کہا لیکن ہوا بھی ایسا ہی۔ جب سے نبوت دنیا میں ظاہر ہوئی ہے نبوت کے انکار کے نتیجے میں فساد برپا ہوئے ہیں اور فساد برپا کرنے کی ذمہ داری ہمیشہ نبوت کے دشمنوں کے سر پر رہی۔ تو فرشتوں نے بات ٹھیک کی مگر نتیجہ ٹھیک اخذ نہیں کر سکے کیونکہ ان کو ان چیزوں کا علم نہیں تھا جو خدا تعالیٰ نے ابھی ان پر ظاہر نہیں فرمائی تھیں۔ اس لئے ان کے اندھیرے لاعلمی کے اندھیرے تھے انا کے اندھیرے نہیں تھے اور لاعلمی کے اندھیرے جب علم آتا ہے تو اندھیروں کو روشنی میں بدل دیتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو مضمون سکھایا اور سمجھایا کہ دیکھو اصل بات یہ ہے تو انہوں نے کہا پاک ہے تو ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا، تو ہمیں یہ پہلے بتا دیتا تو ہم یہ بات ہی نہ کرتے۔ اب تو نے فرمایا تو بالکل ٹھیک ہے یہی مضمون ہونا چاہئے اور شیطان نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ اب بہتر ہونے کا نتیجہ نکالنے کا اس کا کیا حق تھا

جب کہ حکم وہ دے رہا تھا جو اس سے بہتر تھا۔ جانتا ہے کہ حکم دینے والا مجھ سے بہتر ہے اور اس بات کو بھلا کر اپنے نفس کی خاطر دلیل کو نیچے سے شروع کر کے نیچے ہی ختم کر دیتا ہے کہتا ہے تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اس میں کون سا جھوٹ ہے آگ ہی سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا یہ بھی بالکل سچ ہے اور اس کے باوجود خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ ناراض اس لئے ہوتا ہے کہ اہلیت کو اصل مقام پر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک ایسی ضمنی بحث میں مبتلا ہو گیا جس ضمنی بحث کا اس حکم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خدا بہتر ہے کہ نہیں، یہ بحث تھی۔ صاحب امر کون ہے۔ اگر انسان صاحب امر ہوتا اور خدا کہتا یہ صاحب امر ہے تو پھر دلیل اس کے خلاف قائم کی جاسکتی تھی یہ جو کمزور ہے نالائق ہے یہ مجھ پر کیسے حکومت کرے گا لیکن اگر خدا صاحب امر ہے تو پھر یہ بحث ہی بے کار اور بے معنی ہے اس کی مثال مذہبی تاریخ میں طالوت اور جالوت کی مثال ہے۔ جب قوم کے مطالبے پر اس وقت کے نبی نے طالوت کو نمائندہ بنایا اور ان پر بادشاہ مقرر کیا تو انہوں نے یہ اعتراض اٹھایا کہ نہ اس کے پاس دولت نہ علم ہم سے زیادہ۔ ان دونوں باتوں میں اور اس کے کیا اعتراض ہیں دو! بہر حال جو اس وقت میرے ذہن سے فوری طور پر دماغ منتقل ہو تو وہ مضمون پوری وضاحت سے سامنے نہیں رہتا، اعتراض وہ اٹھایا جو اس سے ملتا جلتا تھا کہ ہم بہتر ہیں اور طالوت ہمارے مقابل پر کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس کو وہ مرتبہ حاصل نہیں اس کو وہ عزت حاصل نہیں جو ہمیں حاصل ہے تو مرتبہ اور عزت کا جو اعتراض ہے یہ وہی ہے جو شیطان نے اٹھایا تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کو علم اور جسم میں ہم نے تم پر فضیلت بخشی ہے اور جس مقصد کے لئے ہم اس کو امارت بخش رہے ہیں اس مقصد کو پورا کرنے والی یہ دو چیزیں ہیں۔

پس اس پہلو سے مطالب کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں اگر سوال اٹھتے ہیں، اگر انانیت کی وجہ سے نہیں اٹھتے تو وہ منع نہیں ہیں۔ اگر انانیت کی وجہ سے اٹھتے ہیں تو وہ گناہ بن جاتے ہیں اور اس کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب آزمائش کا موقع آتا ہے۔ پس اس موقع پر خدا تعالیٰ نے ساری قوم کو مردود نہیں قرار دیا جیسا کہ شیطان کو کہا کہ تو اب مردود ہو گیا ہے، تیری دلیل ہی جھوٹی اور گندی ہے۔ تو نے میرے خلاف بغاوت کی ہے اور بہانہ بنا رہا ہے کہ میں نے آدم کے خلاف بغاوت کی ہے کیونکہ میں نے اسے مقرر کیا تھا۔ اس کے ساتھ اس واقعہ کا موازنہ کریں خدا نے وہاں فیصلہ نہیں دیا خدا نے کہا

نہیں یہی بہتر ہے جو میں نے بنایا ہے لیکن بعد میں آزمائش ہوئی اور آزمائش اس طرح ہوئی کہ ایک دریا کو پار کرنے کے بعد مقابلہ ہونا تھا اور دشمن سے جو بہت بڑا اور طاقتور تھا۔ اس سے اس قوم کی لڑائی ایک ایسی سرزمین میں تھی جو دریا پار تھی اور وہاں سے گزرتے ہوئے ان لوگوں کو پیاس بہت لگی ہوئی تھی۔ اس پر خدا تعالیٰ کے حکم سے طالوت نے ان کو کہا کہ ایک دو گھونٹ یا ایک دو اوک یعنی چلو میں جتنا بھی پانی آتا ہے وہ پی لو تو اور بات ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ اب ان کو یہ بھی حکمت سمجھ نہیں آئی۔ انہوں نے کہا نہیں یہ تو ہماری عقلیں مانتی نہیں۔ اکثر ان میں سے وہ تھے جنہوں نے پی لیا اور جو تھوڑے تھے وہ بچ گئے اس بات سے، اب لطف کی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنے والے وہ بھی تھے جو اس امتحان میں پورا اترے انہوں نے اپنی عقل کو استعمال کیا مگر فیصلہ خدا کا مانا اور وہ بھی تھے جو پہلے بھی اپنی عقل کو برتری دے رہے تھے، فضیلت دے رہے تھے بعد میں جب موقع پیش آیا تو اس امتحان میں اسی لئے ناکام رہے کہ اپنے عقلی فیصلے پر قائم رہے۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ اس پانی میں ضرور کوئی زہر تھا یا کوئی تاثیر تھی ہوسکتا ہے گندہ پانی ہو جس کے نتیجے میں اسہال بھی لگ جاتے ہیں، پیچش بھی ہو جاتی ہے کئی قسم کے مخفی معاملات ہیں جن کا خدا کو علم ہے بندوں کو نہیں کئی ایسی بیماریاں لگ جائیں جس سے ہمت جواب دے جائے تو وہ جو بڑے لڑاکے بن کے نکلے تھے وہ کہتے تھے طالوت سے ہم زیادہ قابل ہیں ان سب نے یہ عذر رکھ کر لڑنے سے جواب دے دیا کہ دشمن بہت بڑا اور طاقت ور ہے اور ہم تھوڑے ہیں اور جو تھوڑے تھے جو خدا والے تھے وہ اور بھی تھوڑے رہ گئے اگر وہ سارے بھی لڑتے تب بھی تھوڑے تھے مگر جو لڑے وہ اور بھی تھوڑے رہ گئے اور اس وقت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً (البقرہ:250) جس کا حکم ہے وہ کر کے دکھاتا ہے وہ طاقت ور ہے۔ دیکھو کئی بار ایسا ہوا کہ تھوڑی سی معمولی جماعت نے ایک بڑی اور طاقتور جماعت کو شکست دے دی اور یہ ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب امر الٰہی کو فوقیت دو اور اپنے نفس کو اس کے نیچے کر دو، اس کے بغیر نہیں۔ مذہبی قوموں میں بھی غلبے کی جان اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں اور چمٹے رہتے ہیں۔ جہاں اس سے سرکنے لگتے ہیں وہیں ان کی موت کا آغاز شروع ہو جاتا ہے۔

بسا اوقات میں نے ایسے بعض لوگوں پر جو پرانے خدمت کرنے والے بھی تھے اس وجہ سے سختی

کی کہ انہوں نے امیر کے ایک حکم کو ٹالا اور اس کے مقابل پر ایک اڈہ بنایا اور یہ بحث شروع کی کہ ہم زیادہ صحیح کہہ رہے ہیں تم غلط کہہ رہے ہو اور بعض دفعہ ایسے لوگوں کے معاملے کو خطبوں میں بھی مجھے خوب کھولنا پڑا اور بتانا پڑا کہ یہ بہت ہی نا قابل برداشت حرکت ہے۔ کسی قیمت پر بھی میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ امیر مقرر ہو اور اس کی اطاعت سے تم بہانے بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ بحث بے تعلق ہے کہ اس کی بات درست ہے کہ تمہاری بات درست ہے۔ اگر تمہیں اختلاف ہے تو ہر وقت اس کے خلاف اپیل کر سکتے ہو۔ آپس میں باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، آپس میں مشوروں کی کوئی اجازت نہیں۔

اگر خلیفہ وقت کا بنایا ہوا امیر ہے تو لازم ہے کہ اس امیر کے متعلق اگر کسی حکم سے اختلاف ہو تو بالا افسروں یا خلیفہ وقت کو مطلع کرو اور جب تک اوپر سے فیصلہ نہ آ جائے اس کی اطاعت کرو۔ یہ وہی پہلا سبق ہے جسے گزرے ہوئے چھ ہزار سال گزر گئے ہیں۔ اس چھ ہزار سال میں حضرت داؤدؑ کا زمانہ بھی گزر گیا، نبیوں کے بعد نبی آئے مگر بعض انسان ایسے جاہل ہیں کہ ہمیشہ اسی مقام پر ٹھوکر کھاتے ہیں جہاں سب سے پہلے شیطان نے کھائی تھی۔ یہ وہ اندھیرا ہے جو دیکھنے بوجھنے کے باوجود اور عَلٰی عِلْمٍ ہے اور علم ہی کا اندھیرا ہے۔ ہمیشہ یہ سرکش لوگ کہتے ہیں ہمیں زیادہ علم ہے امیر تو بے وقوف آدمی ہے اس کی تو تعلیم ہی کوئی نہیں۔ ہم لوگ صاحب علم لوگ ہیں ہم جانتے ہیں۔ ہم دانشور ہیں یہ پاگل جیسا آدمی آپ نے بنا دیا امیر ہمارے اوپر، اس کو کیا پتا کہ معاملات کیا ہوتے ہیں اس لئے ہمارے پیچھے لگے گا تو ہم مانیں گے ورنہ نہیں اور وہی دلیل ہے جو شیطان نے دی تھی اور ردّ کر دی گئی اور کبھی بھی ان کا کچھ نہ بنا۔ ایسے لوگوں کو نہ دنیا میں کبھی کامیابی ہوئی نہ آخرت میں کبھی کامیابی ہو سکتی ہے اگر اس طرز عمل کو جماعت میں برداشت کر لیا جائے تو ساری جماعت ظلمات کا شکار ہو جائے گی اندھیروں میں مبتلا ہو جائے گی۔

جماعت کی طاقت کا راز اس اطاعت میں ہے جو فرشتوں نے دکھائی تھی۔ جانتے تھے کہ یہ وہ وجود آنے والا ہے جس کے نتیجے میں خوب خون خرابہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں فسادات سے زمین بھر جائے گی۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ کیوں بھرے گی یہ معاملہ بعد میں ان پر کھلا جب شیطان نے بغاوت کی اور خدا کو یہ چیلنج دیا کہ میں تیرے بندوں کو کھینچ کر اپنی طرف لے جاؤں گا اور اس طرح ان پر حملہ آور ہوں گا کہ ان کو کچھ دکھائی نہیں دے گا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں۔ ان کے دائیں سے بھی

حملہ کروں گا بائیں سے بھی حملہ کروں گا آگے سے بھی پیچھے سے بھی اوپر سے بھی نیچے سے بھی اور تو دیکھے گا کہ سارے یہ لوگ بکھر گئے اور تجھے چھوڑ کر میرے پیچھے لگ گئے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیری یہ بات بھی جاہلانہ ہے جیسے پہلی بات جاہلانہ تھی ۔ جو میرا بندہ ہے اس پر تیرا کوئی اثر نہیں ہے ۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ اس لئے یہ خیال کہ انسان پیدا ہونے کے بعد خدا کا بندہ بن جاتا ہے یہ خیال ہی غلط ہے ۔ کثرت سے لوگ پیدا ہو رہے ہیں ، بندے وہی ہیں جو كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ کے ہیں جن کے مقصد میں لکھ دیا گیا ہے کہ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً وہ تھوڑے ہونے کے باوجود ضرور غالب آئیں گے ، ان میں غلبے کی طاقتیں بخشی گئی ہیں اور یہ بات امرِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے اس کے بغیر نہیں ۔

پس سب سے بڑا اندھیرا نفس کا یہ اندھیرا ہے جو میں سمجھ رہا ہوں یہ اگر خدا کے منشاء سے ٹکراتا بھی ہو اور نظام جماعت سے مختلف فیصلہ بھی ہو تب بھی میں ٹھیک ہوں اور نظام جماعت غلط ۔ اس اندھیرے نے ہمیشہ لوگوں کو ہلاک کیا اور کچھ عرصے کے بعد یہ ٹولے جو بڑے بڑے سر اٹھانے والے تھے ، جتھے بنانے والے ، سازشیں کرنے والے ، ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا ۔ جس طرح دودھ سے مکھی کو نکال کے باہر پھینک دیا جاتا ہے خدا تعالیٰ نے ان کی برائیوں سمیت ، ان کی انا سمیت ، ان کے بڑے بڑے دعاوی سمیت ان کے ٹولوں سے جماعت کو صاف ستھرا کر کے نتھار لیا اور اب ان کا حال دیکھو کہاں پہنچے ہیں ۔ کوئی ہے جو جماعت کے مقابل پر فتنے کے سر اٹھانے کے بعد اس سر کو اپنے وجود پر قائم رکھ سکا ہو ۔ ان کی سرداریاں ہی ختم ہو گئیں ۔ وہ سب سرداریاں جماعت کی برکت تھی ، جماعت ہی کی وجہ سے عطا ہوئی تھیں اور ان ظالموں کو پتا نہیں لگا کہ ہم ہیں کیا ، ہماری حیثیت کیا ہے ۔ یہ جماعت کی برکت ہے جو ہمیں کچھ لوگ عزت سے خطاب کرتے ہیں اور ان عزتوں کو جماعت کے بعد ہم زندہ نہیں رکھ سکیں گے اور نہ کبھی رکھ سکے ۔ تو عزتوں کا معاملہ ہے تو قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (یونس:66) عزت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ انانیت سے کوئی عزت نصیب نہیں ہو سکتی ۔

تو نفس کو ” ھویٰ “ بنانے کی ایک وجہ اور اول اور غالب وجہ انانیت ہے یا اپنے نفس کی عزت اور اسی کی ایک شکل تکبر ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ تکبر بھی اور یہ انانیت بھی دراصل ہمیشہ احساس کمتری سے پیدا ہوتے ہیں اگر چہ نظر یہ آتے ہیں کہ یہ احساس برتری ہے ۔ وہ شخص جو جانتا ہے کہ

اصل مالک خدا ہے اگر اس کے دل میں ایک خلش سی ہے کہ میرا پھر کیا ہے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں وہ خدا کی اطاعت میں بھی مخلص نہیں ہے۔ وہ آزادی چاہتا ہے۔ اس وجہ سے جب بہانہ ملتا ہے تو خدا کو تو رد نہیں کر سکتا مگر اس کے بنائے ہوئے کو ردّ کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کے نفس میں جو کمتری کا احساس تھا کہ اچھا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے۔ یہ بات وہی ہے جیسے جنگ احد میں ظاہر ہوئی آنحضرت ﷺ نے جو فیصلے فرمائے ان پر عمل ہوا اور اس کے بعد منافقین نے یہ باتیں شروع کر دیں کہ گویا کہ سارے فیصلے انہی کے ہاتھ میں ہیں ہمارے پاس کیا رہا ہمارے پاس امر میں سے کچھ بھی نہیں رہا تو دیکھیں ہے وہی شیطان پرانا، امر کا مطالبہ کر رہا ہے، میرے ہاتھ میں امر ہونا چاہئے اور وہی قلت اور کثرت والی بات بھی پھر دوبارہ پیدا ہوتی ہے۔

پہلے ہی وہ صحابہؓ جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے یا وہ جمعیت جو آنحضور ﷺ کے ساتھ تھی تعداد میں تھوڑی تھی، دشمن ان سے بہت زیادہ تعداد میں بڑا اور طاقت میں بھی زیادہ تھا لیکن منافقوں کا ٹولہ یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ اگر ہماری بات مانی ہی نہیں جانی ہمارے مشوروں پر عمل ہی نہیں ہونا تو ہمیں کیا ضرورت ہے آپ کے ساتھ رہنے کی، ہماری آپ کی جدائی اور وہ لوگ چھوڑ کر الگ ہو گئے اور دیکھیں کس شان سے دوبارہ خدا کا یہ کلام ظاہر ہوتا ہے۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً تھوڑی تعداد نے بڑی کے چھکے چھڑا دیئے اور پھر جب خدا کے فرمان کی اطاعت میں کمزوری واقع ہوئی تو بھاگے ہوئے دوبارہ واپس آئے اور پھر غالب آنے لگے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی عزت رکھی اور انہیں بخش دیا اور پھر تھوڑوں کو بڑوں پر غلبہ عطا کر دیا۔ اس ادلنے بدلنے نے، اس زیر و بم نے ثابت کر دیا کہ خدا کا کلام ہی سچا کلام ہے اور اس میں کسی اتفاق کا کوئی دخل نہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کو اس طرح ایک نشے میں مبتلا کر دیا گیا تھا جیسے بعض دفعہ بعض لوگ جھوٹے دعاوی کے ذریعے بھی ایک قربانی کا نشہ پیدا کر دیا کرتے ہیں۔

اس سے پہلے اسلامی تاریخ میں بھی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ حسن بن صباح کا واقعہ ہے۔ اس نے بھی ایک مذہبی دیوانوں کی جماعت تیار کی تھی اس نے بھی یہ کوشش کی تھی کہ اس مذہبی دیوانگی کے برتے بڑی بڑی حکومتوں پہ غالب آ جائے۔ Assassins تیار کئے ان کو دھوکے دینے کے لئے کئی طریق اختیار کیئے گئے مگر کہاں گیا وہ۔ اس کی جماعت، وہ جو اس نے حکومت قائم کی تھی

تھوڑے ہی عرصے میں دیکھتے دیکھتے اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔عبرت کے لئے وہ تاریخ کی کتابوں میں تو ملتا ہے مگر حقیقت کے طور پر اس کی بنائی ہوئی جماعت کی کوئی حیثیت، کوئی وجود کہیں دکھائی نہیں دیتا۔پس بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ فرضی طور پر کسی کو ایک کہانی میں مبتلا کر دیا جائے خواہ وہ سچی نہ بھی ہو۔بعض دفعہ کہانی کی دھن ہے جو انسان کے جسم و دماغ اس کے قویٰ پر قبضہ کر لیتی ہے فرضی باتوں کے نتیجے میں بھی انسان بڑی بڑی قربانیوں کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔مگر فرضی باتوں میں ہر ادلتے بدلتے حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔وہ اونچ نیچ جو زمانے کے ہیں ان کے ساتھ ساتھ ان کی فرضی باتیں ہمیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں اور ان کا کبھی کچھ نہیں رہتا۔پس فرضی باتوں نے فرضی جنون تو پیدا کئے ہیں مگر وقتی، عارضی طور پر کچھ عرصے کے لئے تماشہ دکھایا اور چلے گئے لیکن ایک دائمی تبدیلی پیدا کر دیں اور دائمی غلبہ پیدا کر دیں یہ ناممکن ہے، کبھی بھی ایسا نہیں ہوا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ہر اس احتمال کو دور کر کے دکھا دیا کہ آنحضرت ﷺ کو غلبہ کسی انسانی تدبیر کے نتیجے میں ہوا۔جنگ احد کا واقعہ اب جیسا کہ میں نے بتایا ہے، تھوڑے تھے اور بہت بڑی اور غالب جماعت جس میں بڑے بڑے چوٹی کے سپہ سالار تھے ان کے آناً فاناً چھکے چھڑا دیئے۔جب پہاڑی پر نگران، جو رسول کریم ﷺ کے حکم سے ایک وفد یا کہنا چاہئے ایک جماعت کام کر رہی تھی غالباً تیس چالیس یا اس کے لگ بھگ ہوں گے، جتنی بھی وہ جماعت تھی انہوں نے اس درّہ کی حفاظت کا کام نہایت بہادری سے سرانجام دیا اور بڑے زبردست تیرانداز تھے اور دشمن جانتا تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے اس درّہ سے ہم گزر کر مسلمانوں کے عقب سے حملہ نہیں کر سکتے اور جب وہ فتح نصیب ہوگئی اور وہ امر سے نکل گئے اور نیچے اتر آئے تو پھر دشمن نے دیکھا کہ وہ خلاء پیدا ہوا ہے اور وہ اس طرف سے حملہ آور ہوئے اور ایک دفعہ اس فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا گیا۔صاف ثابت ہوا کہ امر کے نتیجے ہی میں دراصل غلبہ تھا لیکن جب خدا نے فیصلہ کیا کہ پھر اس شکست کو فتح میں بدلا جائے تو ایک حیرت انگیز چیز ہے۔انتہائی زخم خوردہ، انتہائی تھکاوٹ سے چور، بے سروسامان ایسے جن کے کثرت سے شہداء تھے جن کو سنبھالنا مشکل ہوا ہوا تھا کثرت سے زخمی تھے ان کو خدا نے فرمایا کہ تم عزم کرو اور ان کا پیچھا کرو اور آنحضرت ﷺ انہی زخمیوں کو لے کر اس غالب جماعت کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔دنیا کی تاریخ میں کبھی یہ واقعہ نہیں ہوا کہ قسمت سے جان بچی ہو اتفاق سے پھر انسان اس خطرے کے منہ

میں خود چھلانگ مارنے کے لئے لپکے اور پیروی کرے اور آوازیں دے کہ آؤ ہمیں ختم کرو ہم ابھی باقی ہیں اور حیرت انگیز رعب ہے جو ان کے دلوں پر چھا گیا، وہ واپس نہیں لوٹ سکے، حملہ نہیں کر سکے۔ جانتے تھے کہ یہی وہ ہیں جن کو کل ہم نے مار مار کران کی ساری طاقت کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ اب وہی زخمی، مارے ہوئے، کوٹے ہوئے جن میں کوئی نیا آدمی شامل نہیں، کچھ بھی کمک نہیں ہے، تعداد میں کم ہوئے ہوئے پہلے سے اور طاقت میں کم یعنی زخموں سے چور وہ پیچھا کر رہے ہیں اور بیٹھتے ہیں وہ ایک جگہ غور کرتے ہیں فیصلے ہوتے ہیں کہ کیوں نہ اب ان پر حملہ کر کے ان کو ختم کر دیا جائے لیکن توفیق نہیں ملتی۔

یہ خدا بتانا چاہتا ہے کہ میرے ہی امر کا کام ہے کہ وہ تمہیں طاقت بخشے۔ میرا ہی امر ہے جو تمہاری پشت پناہی کرتا ہے۔ میرا ہی امر ہے جو تمہیں دشمن کے غلبے سے بچاتا ہے اور تمہاری اقلیت کو بڑی بڑی طاقتوں پر غالب کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک مستشرقین حل نہیں کر سکے۔ سر ٹکراتے ہیں، ان کی وہ عبارتیں وہاں پڑھیں، شروع میں تو بڑے فخر کی عبارتیں ہیں کہ اس طرح پھر کافروں نے مار مار کے اڑا دیا مسلمانوں کو یہ حال ہوا رسول اللہ ﷺ کا یہ حال ہوا، فلاں کا یہ حال ہوا، درّہ میں پناہ لینی پڑی اور جب آگے چلتے ہیں تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ عقل پہ لگتا ہے لرزہ طاری ہو گیا ہے۔ کئی ایک نے سوال اٹھایا کہ کیا ہو گیا تھا ان کو، بڑے بڑے دانشور بنے پھرتے تھے کیوں نہیں پلٹے اور ایک دفعہ صفایا کر دیا ہمیشہ کے لئے ہم اسلام سے نجات پا جاتے۔ وہ تھے کون؟ کیونکہ خدا کا امر تھا جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پشت پناہی کر رہا تھا اس لئے آپؐ کی یعنی زندہ روحانی جماعتوں کی طاقت کا راز امر الٰہی میں مضمر ہے یہاں سے آپ ٹلے تو آپ کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا اور پھر سارے اندھیرے آپ کو گھیر لیں گے کیونکہ جب امر الٰہی سے واسطہ ٹوٹتا ہے تو ہزار قسم کے دوسرے امر سر اٹھاتے ہیں اور ایک کی غلامی سے نکل کر آپ کو اربوں کی غلامی اختیار کرنی پڑتی ہے لا متناہی خدا اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نفس کا الٰہ بناتے ہی ایک الٰہ نہیں رہتا بلکہ ہر چیز معبود بن جاتی ہے۔ اس کو سیاست میں دیکھیں۔ اس کو تجارت اور اقتصادیات میں دیکھیں۔ اس کو معاشرتی امور میں دیکھیں۔ ہر پہلو سے ہمیشہ آپ کو تمام اندھیروں کی جڑ اس امر الٰہی سے انحراف میں نظر آئے گی۔ اس وقت جب اپنی خواہش کو معبود بنا لیں گے۔ یہ جتنی بے راہ روی ہو رہی ہے، عورتوں پر ظلم ہو رہے ہیں، بچوں

پر ظلم ہو رہے ہیں، معصوم انسانوں کو شہوت کا شکار بنا کر اور ذبح کر دیا جاتا ہے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اور اتنے دردناک واقعات ہوتے ہیں کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی قوم ذلت کی اس انتہاء کو پہنچ سکتی ہے جہاں کوئی جانور دنیا کا ایسی کمینگی نہیں دکھا سکتا جتنا انسان دکھاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے امر الٰہی میں آنکھ کھولی اور امر الٰہی سے انکار کر دیا۔ پھر **اسفل سافلین** اس کا مقدر ہو گیا اور خدا کی یہ بات ضرور پوری ہونی تھی کہ ہم نے تمہیں بڑے کاموں کے لئے بنایا تھا، مسلسل لامتناہی ترقی کے لئے پیدا کیا تھا اور یہ ایسا سفر ہے جو اندھیروں سے روشنی کی طرف سفر ہے اور نہ اندھیروں کی کوئی انتہا ہے، نہ روشنی کی کوئی انتہا ہے۔ اگر تم اس سفر پہ جاری نہ رہے تو تمہارا رخ واپسی کی طرف پلٹے گا۔ ہر اس اندھیرے میں واپس جاؤ گے جس سے نکل کر تم روشنی کی طرف آئے تھے۔

پس اب جو انسانی شہوات کی دنیا ہے قرآن کریم نے اس میں جو دوسری مثال دی ہے اس میں لہو ولعب کو پیش کیا ہے اندھیروں کی ایک شکل میں۔ اب لہو ولعب میں انسان کو جنسی خواہشات، اس کے عیش و عشرت کے سامان کی تمنا، اس کا دل بہلاوے کے سامان کرنا خواہ جنسی نہ بھی ہوں یہ ساری چیزیں اس دائرے میں آتی ہیں۔ جو لوگ اپنے نفس کو خدا بناتے ہیں ان کا خدا ان کو ان ساری چیزوں میں مبتلا رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بے شمار ایسے احتمالات ہیں جو اس کے سامنے جگہ جگہ سے اٹھتے رہتے ہیں۔ وہ ہر احتمال گویا ایک فرضی بت ہے جو اس کے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ایک انسان کہتا ہے کہ میں اس معاملے میں اگر صحیح راہ اختیار کروں تو میرے ہاتھ میں ایک آئی ہوئی چیز ہے مگر مجھے حق نہیں ہے اس لئے کہ میرا معبود اور ہے اس نے اجازت نہیں دی میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یہ ایک خیال ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مقابل پر نفس کا شیطان اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ تم نے کس کو معبود بنا لیا ہے میں تمہارا معبود ہوں اس لئے جو ہاتھ میں ہے اسے استعمال کرو قطع نظر اس کے کہ خدا کیا چاہتا ہے۔ تو ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے خدا کے سامنے سر جھکانا پڑا اور یہ وہ خدا ہے جو ہمیشہ دھوکہ دیتا ہے اور اس کے امر کے نتیجے میں کبھی بھی فائدہ نصیب نہیں ہوا اور جب اس پیروی کے نتیجے میں انسان دکھوں میں مبتلا ہوتا ہے تو لوٹتا خدا ہی کی طرف ہے مدد کے لئے۔ اس وقت شیطان یعنی اس کے نفس کا شیطان کہتا ہے کہ میں نے تو تمہیں دھوکہ دیا تھا اس طرف چلانے کے لئے۔ اب میں ایک طرف اور تم ایک طرف اب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا

اور اس وقت پھر خدا ہی کو پکارتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے جانتا ہے کہ معبود اور ہے اور اس کے باوجود دیدہ دانستہ جھوٹے معبودوں کی پیروی کرتا ہے یہ ہے۔ عَلٰى عِلْمٍ حقیقت میں علم ہے یہ خدا نہیں ہے۔ حقیقت میں ہر نفس کا ضمیر اسے تنبیہہ کرتا ہے اسے جگاتا ہے، اسے جھنجھوڑتا ہے کہ دیکھو یہ غلط رستہ ہے۔ تو ہر جگہ غلط خدا کو معبود بنالینا یہ تو زندگی کو عذاب بنادینے والی بات ہے اور اسی سے بنی نوع انسان کی زندگی آج کی دنیا میں جہنم بن گئی ہے اور بنتی چلی جارہی ہے۔

اب اس سے اگلا جو معاملہ ہے اس میں ہے زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ۔ اب زینت اور تفاخر کے لحاظ سے آپ دیکھیں کہ کس طرح ہماری روزمرہ کی زندگی میں زینت اور تفاخر نے کتنی بڑی تباہی پھیلا رکھی ہے۔ ہماری شادی بیاہ کے موقع پر، ہمارے تعلقات میں، ہم جب ایک دوسرے کو دعوتوں پر بلاتے ہیں، کسی کی ضروریات پوری کرنے کے بہانے اپنی انا کو دنیا پر ظاہر کرتے، اپنی انا کے دکھاوے کی خاطر بظاہر نیکی کے کام کرتے ہیں یہ زینت اور تفاخر ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر زینت اور تفاخر کو آپ نکال لیں تو اکثر شادی بیاہ ناکامی سے بچ سکتے ہیں اور وہی اندھا پن جو آدم کے وقت سے شروع ہوا ہوا ہے آج بھی جاری ہے یعنی دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں لیکن اندھے ہیں اور بہرے بھی ہیں اور سوچنے کی طاقتوں سے محروم ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ یہ وہی کہانی ہے جو شروع سے آخر تک چلتی ہے کیونکہ شیطان نے قیامت تک مہلت مانگی تھی اور قیامت تک یہی کہانی ہے جو آپ کے سامنے بار بار ظاہر ہوگی۔ پہچانیں تو سہی اس کو کہ ہو کیا رہا ہے۔

اب لوگ قرض اٹھا لیتے ہیں شادیوں کی خاطر یا اپنے دکھاوے کے لئے کوئی دعوتیں کر رہے ہیں بڑی بڑی، مہمان نوازی میں غلو کر رہے ہیں۔ جو بھی خرچ ہیں ان میں اگر نفس خدا ہے تو خرچ ایک تو بے محل ہوگا اور دوسرے ضرورت سے زیادہ ہوگا اور یہ جو ضرورت سے زیادہ کا شیطان ہے اسے خدا تعالیٰ نے شیطان ہی قرار دیا ہے اور اس کے نتیجے میں بہت بڑی تباہی ہوتی ہے، معاشرے کا سکون برباد ہوتا ہے اور انسانی رہن سہن پر ایک بہت بڑی تباہی وارد ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (بنی اسرائیل:27) کہ دیکھو جب خدا نے تمہیں خرچ کا حکم دیا ہے تو خدا کی خاطر خرچ کرنا ہے۔ اگر تم خرچ تو کرو مگر اپنی خاطر کرو تو پھر تم خدا کی عبادت نہیں

کررہے کسی اور کی عبادت کرو گے۔ اللہ تعالیٰ تو تمہیں یہ فرماتا ہے کہ اٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ جو اقرباء ہیں ان کا حق ادا کرو۔ کتنے ہی ہیں جو امیر ہو گئے اور اقرباء کا حق بھول گئے اور اپنی دولتیں اکٹھی کرنے، اپنے دکھاوے میں مگن رہے، یہ نہیں دیکھا کہ فلاں قریبی، فلاں عزیز کس حال میں زندگی بسر کررہا ہے۔ وَ الْمِسْكِيْنَ اور جو قریب نہیں بھی ہے ویسے مسکین ہے بے چارہ گرا پڑا اس کی ضرورتوں کا خیال کر کے جو خدا نے تمہیں زائد عطا فرمایا ہے اس میں اس کو شریک کرنے کی کوشش کرو۔ یہ تب ہوسکتا ہے اگر خدا معبود ہو۔ وَابْنَ السَّبِيْلِ اور راستہ چلتے کا بھی خیال رکھو۔ اب دیکھیں خدا تعالیٰ نے انسانی برادری کو کتنی وسعت عطا فرمادی اور نفسانیت کے ہر پہلو کا ازالہ فرمادیا۔ اقرباء کے ساتھ تعلق بعض جگہ بہت ملتا ہے یعنی ہر جگہ ایک ہی بیماری نہیں ہے۔ بعض جگہ تو اقرباء سے تعلق تعصّبات کی شکل میں ڈھل جاتا ہے، اتنا زیادہ تعصب کہ غیر کے حقوق کا خیال ہی نہیں رہتا اور ٹولے بنائے جاتے ہیں جتھے بنائے جاتے ہیں کہ جی ہم اقرباء کے حقوق کا خیال رکھ رہے ہیں۔ قرآن کریم نے اس مضمون کو اتنا متوازن کر دیا ہے کہ ایک تعلق دوسرے کی راہ میں حائل ہو ہی نہیں سکتا۔ فرمایا اقرباء کا حق ادا کرنا ہے مگر مسکین کے حق کو پیش نظر رکھنا ہے۔ یہ نہیں کہ مسکین کا حق لے کے اقرباء کو دیدو اور وہ بے یارو مددگار لوگ ترستے رہ جائیں اور جو کچھ بھی ہے تمہارے اپنے ٹولے کے اندر ہی پھرتا رہے اور فرمایا مسکین بھی صرف وہ نہیں جو تمہاری آنکھوں کے سامنے مسکین ہے اور اس سے تمہارے دل میں ایک جذبہ پیدا ہوا ہے۔ وَابْنَ السَّبِيْلِ مسافر کا کیا ہے آیا اور چلا گیا اور اس کے ساتھ کون سے رابطے ہونے ہیں۔ مسکین تو اگر مقامی ہے وہ ہمیشہ آپ کے احسان کو یاد رکھے گا۔ بسا اوقات جتنا احسان ہے اس سے بھی زیادہ مسکین شکریے کے جذبے سے مجبور ہو کر آپ کی خدمتیں کرتا ہے۔ اب ہمارے معاشرے میں یہ جو بے چارے نسبتاً غریب لوگ کمی کاری کہلاتے ہیں ان پر کون سا احسان زمیندار کرتے ہیں۔ یہی احسان کرتے ہیں نا کہ شادی کے موقع پر ہمارے آ کے برتن مانجھو، ہماری چارپائیاں درست کرو، ہمارے شامیانے لگاؤ اور خدمتیں کرو اور مٹھیاں چاپیاں کرو یہ احسان ہے اور بعد میں کچھ دے دیا اور دیا تو خیرات کے طور پر کہ دیکھو ہم کتنے سخی لوگ ہیں ہم تمہیں دے رہے ہیں۔ کام لینا بھی احسان اور محنت کا بدلہ دینا بھی احسان۔ ایسے ذلیل معاشرے میں خدا کہاں سے داخل ہو جائے گا۔ یہ جو معاشرہ ہے یہ مسکین سے اپنے نفس کی عبادت کرواتا ہے۔

اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کا مضمون یہاں بھی کارفرما ہے۔مگر ابْنَ السَّبِیْلِ بھی ہے تو اس کا بھی خیال رکھو ہر مسافر کا تم پر حق ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا کہ جتنی طاقت ہے اس سے آگے نہیں بڑھنا کیونکہ اگر تم نے طاقت سے بڑھ کر خرچ کیا تو خدا کی خاطر یہ خرچ نہیں ہوگا یہ نفس کی خاطر ہوا کرتا ہے۔ جو خدا کی خاطر خرچ کرتے ہیں وہ اپنی طاقت سے بڑھ کر نہیں کیا کرتے کیونکہ خدا تعالیٰ نے قانون بنایا ہے کہ جتنا میں تمہیں دیتا ہوں اس سے زیادہ میں مانگتا ہی نہیں۔تو اگر خدا کا قانون یہ ہے کہ جتنا میں تمہیں دوں اس سے زیادہ میں مانگتا ہی نہیں تو آپ کون ہیں جو خدا کے دیئے ہوئے سے بڑھ کر اسے دینے کی کوشش کریں۔اس لئے ہر وہ خرچ جو طاقت سے بڑھ کر ہے وہ شیطان کی راہ کا خرچ ہے اور وہ ثابت کر دیتا ہے کہ خدا کا یونہی نام تھا اصل میں نفس کی خاطر خرچ ہو رہا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا دیکھو حد سے زیادہ اسراف سے کام نہ لینا کہ کھلے خرچ کرتے پھرو،اس بہانے کہ خدا نے فرمایا ہے اقرباء کے لئے خرچ کرو مسکینوں کے لئے خرچ کرو مسافروں کے لئے خرچ کرو بعض لوگ سبیلیں لگوا دیتے ہیں اور کئی قسم کے ایسے کام کرتے ہیں۔اگر یہ تمہاری توفیق سے بڑھ کر ہوا اور حد سے زیادہ ہوا اور توازن بگڑ گئے تو فرمایا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل: 28) پھر تو شیطان کے دھوکے میں آ گئے اس کے چنگل میں پھنس گئے کیونکہ مبذر شیطان کا بھائی ہوتا ہے۔ اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ یعنی کئی قسم کے شیطانوں کا بھائی ہوتا ہے۔

اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اسی آیت میں ایک جگہ شیطان فرمایا ہے ایک جگہ شیاطین فرمایا ہے۔اس میں کیا حکمت ہے؟ وہ شیاطین اچانک ایک شیطان کیسے بن گئے کیونکہ فرماتا ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔مبذر یعنی اسراف کرنے والے،حد سے زیادہ بڑھنے والے یہ تو شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا تھا۔تو دراصل شیطان کی تمثیل پر جو انسان پیدا ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نفس کی خاطر خرچ کرنے والوں کو گھیر لیا کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ خائب و خاسر رہتے ہیں، بدانجام کو پہنچتے ہیں۔وہ جوان کے ماں باپ نے محنت سے کمائے تھے وہ سب چیزیں ضائع کر بیٹھتے ہیں تو ایک

شیطان نہیں کئی شیاطین لگ جاتے ہیں۔ان کے اردگرد جوٹولہ ہے وہی ان کی بڑی تعریفیں کر رہا ہوتا ہے۔کہتا ہے واہ جی واہ کوئی خرچ سیکھے تو آپ سے سیکھے۔کیا بات ہے آپ نے تو مہمان نوازی کی حد ہی کر دی اور اس طرح آپ نے خرچ کیا اور بڑی شہرت ہوئی۔آپ نے جو اپنی بیٹی کی شادی کی ہے بہت ہی مشہور ہوئی ہے کتنے لوگ باتیں کر رہے ہیں۔کہتے ہیں بلے بلے شادی ہو تو یوں ہو اور اس طرح پاگل بنا بنا کے ان کی جائیدادیں بکوا دیتے ہیں، ان پہ قرضے چڑھوا دیتے ہیں اور جب سب کچھ ہاتھ سے جاتا ہے تو آپ بھی ہاتھ سے چلے جاتے ہیں۔پھر وہ اگر ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے تو دوسرے دروازے سے باہر نکل جائیں گے۔یہ شیاطین ہیں۔

اور شیطان کی جہاں خصلت کی بات کی گئی ہے وہاں اکیلا شیطان استعمال فرمایا۔ایک شیطان ہوں یا دو ہوں یا دس ہزار ہوں شیطان کی خصلت یہ ہے کہ اپنے رب کا ناشکرا ہوا کرتا ہے۔ اور کسی چیز کو محل پر نہ خرچ کرنا یہ بھی ناشکرا پن ہے۔بے محل استعمال کرنا یا جتنی طاقت ہے اس سے بڑھ کر استعمال کرنا یہ بھی ناشکرا پن ہے۔شیطان نے جتنی صلاحیتیں خدا نے اس کو دی تھیں ان کو بے محل استعمال کیا یہ اس کا ناشکرا پن تھا ورنہ صلاحیتیں بہت تھیں۔تھا تو آگ سے پیدا ہوا ہوا لیکن یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں تو ساری دنیا پر اپنے دھوکے کے ذریعے اتنا بڑا کنٹرول، اتنا عروج کیسے حاصل کر لیتا۔اکثر خدا کے بندے جو اصل میں اس کے بندے نہیں تھے ان پر قبضہ کر بیٹھا ہے اور دنیا کو فساد سے بھر دیا ہے اور فرشتوں بے چاروں کا صرف اتنا قصور تھا کہ فساد سے شیطان نے بھرنا تھا، فرشتے سمجھ رہے تھے آدم بھرے گا۔انہوں نے دنیا کو فساد سے بھرنا تھا جنہوں نے آدم کی اطاعت سے انکار کرنا تھا اور آدم نے تو دوبارہ اس حالت کو بدلنے کی ایک کوشش کرنی تھی۔وہ جو منکرین ہیں جو ناشکرے ہیں انہیں واپس اقرار اور شکر کے مقام پر لا کے کھڑا کرنا تھا۔

تو یہ کہانی جو ازل سے چلی آرہی ہے ازل (ازل کا لفظ سہواً بولا گیا ہے غالباً **ابد** مراد ہے) تک اسی طرح جاری رہے گی۔جب تک دنیا، زمین و آسمان قائم ہیں یہی کچھ ہم ہوتا دیکھتے آئے ہیں، یہی کچھ ہوتا رہے گا اور یہ اندھیرے علم کے اندھیرے ہیں اور روشنیوں کے اندھیرے ہیں۔وہ شخص جو اسراف کر رہا ہے آنکھیں اس کی کھلی ہیں وہ دیکھ رہا ہے کہ کتنا مجھے مزہ آرہا ہے، کتنی میری شہرت ہو رہی ہے، کتنی میری ناموس بڑھ رہی ہے۔کیوں اس کا مزہ آرہا ہے؟ نفس کی عبادت ہو رہی

ہے۔ وہ سمجھتا ہے یہ سارے میرے نفس کے سامنے سر جھکا رہے ہیں۔ تو وہ دراصل اپنی عبادت کا مزہ اٹھا رہا ہے اور جو اپنی عبادت کرواتا ہے اور اپنی عبادت کرتا ہے اس کے مقدر میں ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی بہت سی شکلیں ہیں جو میں انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ خطبے میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اور یہ بہت اہم مضمون ہے اندھیروں کی نوعیت کو سمجھنا اور ان کی نشاندہی کرنا۔ اگر آپ اندھیرے دیکھنے لگ جائیں تو روشنی کیوں نظر نہیں آئے گی آپ کو اندھیرے سمجھ آئیں گے تو پھر روشنی سمجھ آئے گی۔ ان سے بچ سکتے ہیں تو پھر روشنی کی طرف رخ کریں گے۔ پتا لگے گا کہ کون سے پردے پڑے ہوئے ہیں جو کانوں پر بھی ہیں، آنکھوں پہ بھی، دل کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر آپ کو تدبیر سمجھ آئے گی کہ کیسے ان سے نجات حاصل کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یہ مضمون بظاہر باریک ہے مگر باریک نہیں بہت موٹا مضمون ہے۔ پہلی کہانی کے خدوخال ہی ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ قرآن کریم اٹھالیں کہانی ہی آدم اور شیطان اور فرشتوں کی باتوں سے شروع ہوتی ہے لیکن عجیب کہانی ہے چند لفظوں میں بیان ہوئی اور ساری انسانی تاریخ کو ڈھانپ لیا اور ہمیشہ ہمیش کے لئے ساری انسانی تاریخ پر حاوی ہوگئی۔ یہ ہے وہ کہانی جس سے بہتر کبھی کوئی کہانی نہ بنائی گئی، نہ بنائی جا سکتی ہے اور حقائق پر مبنی کہانی ہے اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کی بظاہر جو باریکیاں ہیں ان کو ایسے دیکھیں جیسے آنکھوں کے سامنے کھڑی دکھائی دے رہی ہیں۔ آمین

اب اندھیرے بھی کئی قسم کے ہیں۔ نفس انسان کو بعض باتیں بھلا دیتا ہے اور اس کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے شیطان نے بھلا دیا۔ میں نے پہلے بھی بتایا تھا انبیاءؑ کو شیطان نہیں بھلایا کرتے وہاں شیطان سے مراد نفس کے اندر جو بشری کمزوریاں ہیں وہ مراد ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ بھی بھولتے رہے۔ ثابت ہے قطعی طور پر۔ مگر کوئی شیطان نہیں تھا جو آپؐ پر غالب آ سکتا۔ آپ کے تو نفس کا شیطان بھی مسلمان ہو چکا تھا۔ اس لئے وہاں شیطان سے مراد صرف اتنی ہے کہ نفس کے اندر مخفی جو خدا تعالیٰ نے بعض کمزوریاں رکھی ہیں بھول چوک مثلاً، ایک بات پوری طرح نہ دیکھ سکے، بعض دفعہ غلطی سے لوگوں کے کہنے پر غلط فیصلے بھی ہو جاتے ہیں تو یہ سارے وہ شیطان ہیں جو گناہ

والے شیطان نہیں ہیں، یہ مجبوریوں کے شیطان ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب گزشتہ خطبے میں نماز جنازہ کے وقت میں نے یہ کہا تھا کہ ہماری آپا زبیدہ مرحومہ جن کی میں نے نماز جنازہ پڑھائی تھی یہ مرزا اظہر احمد صاحب ہمارے بھائی کی ساس ہیں تو یہ بھی ایک قسم کی ایک غلطی تھی۔ ان کی ساس تو آپا حمیدہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ دونوں بہنیں تھیں۔ اور مجھے پتا ہے لیکن چونکہ خطبے میں دماغ ایک خاص مضمون میں الجھا ہوا ہوتا ہے اچانک اس سے نکل کر دوسری طرف جا کر پوری طرح اس کو دیکھ لینا یہ بسا اوقات ممکن نہیں ہوتا۔ تو خیالات کو ایک دم تبدیل کر کے دوسرے مضمون کو فوکس کر کے دیکھ لینا ایک طبعی مجبوری ہے کہ بعض دفعہ نہیں ہوتا۔ تو مجھے اچھا بھلا پتا تھا آپا حمیدہ بہت شفقت کرنے والی تھیں اور ہمارے گھر تو ان کا بہت ہی آنا جانا تھا کیونکہ میری والدہ سے تعلق کی وجہ سے وہ بہت ہم سے پیار کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی ہیں ہماری قیصرہ بیگم جو میاں اظہر کی بیوی ہیں اور ان کے دو بھائی اور بھی ہیں شہزادا اور انیس، انیس تو کینیڈا میں ہے اور کرنل شہزاد پتا نہیں امریکہ میں ہیں یا کہاں ہیں۔ مگر بہرحال یہ ساری اولاد ہی اللہ کے فضل سے جماعت سے گہرا تعلق رکھنے والی ہے۔ آپا زبیدہ ان کی چھوٹی بہن تھیں جو بیگم سردار بشیر احمد صاحب مالیر کوٹلوی تھیں۔

اس خاندان کا تعارف میں نے پہلے اس غرض سے کروایا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہاماً ان کے بعض مراتب بتائے گئے اور فرمایا گیا کہ یہ بھی اپنے اخلاص میں اتنی غیر معمولی ترقی کر چکے ہیں کہ گویا اہلِ بیت میں سے ہیں اور ان کی دل جوئی کی جائے، ان کا خیال رکھا جائے۔ تو ان کے جو دادا تھے محمد خان صاحب انہی کی خاطر چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خودنرمی کے سلوک کا حکم دیا ہے اس لئے جہاں بھی موقع مل سکے ان کا ذکر خیر چلانا یہ بھی کارِ ثواب ہے۔

یہ عبدالمجید خان دو ہیں۔ ایک محمد خان صاحب کے بیٹے اور ایک عبدالمجید خاں ویرووال والے۔ عبدالمجید خاں صاحب جو ویرووال والے ہیں یہ آپا طاہرہ صدیقہ کے والد اور اسی طرح نصیر خان صاحب مرحوم کے والد اور عبدالمجید خان صاحب کے خسر بھی عبدالمجید خاں تھے اور عبدالمجید خان صاحب کے خسر جو عبدالمجید خان تھے وہ محمد خان صاحب کے صاحبزادے تھے۔ تو وہ پہلی بیوی تھیں یعنی عبدالمجید خان صاحب ویرووال والے جن کو ربوہ کے تو اکثر لوگ جانتے ہیں باہر کے بھی جانتے ہیں پروفیسر نصیر خاں صاحب کے والد ان کی شادی محمد خاں صاحب کی پوتی سے ہوئی تھی اور

عبدالمجید خان صاحب کے خسر کا نام بھی عبدالمجید خان تھا۔ان کی صاحبزادی امتہ اللہ بیگم پروفیسر نصیر خاں صاحب کی والدہ تھیں۔اس لئے یہ اگر رشتہ کی صاف سمجھ نہ بھی آئی ہو تو میں نے چونکہ ذکر چھیڑا تھا میں ایک دفعہ کھول دوں۔

نصیر خاں صاحب بہت مشہور انسان ہیں پروفیسر کے طور پر علمی لحاظ سے بھی،شاعر کے لحاظ سے بھی، بحیثیت ایک نہایت اعلیٰ درجے کے انسان اور مجلسوں کی رونق ہونے کے لحاظ سے بھی۔کم انسان ہیں جو ایسے مزّین ہوتے ہیں جیسے پروفیسر نصیر خاں صاحب مرحوم تھے۔تو ان کے والد بزرگوار عبدالمجید خان صاحب ویرووال والے بھی بہت بڑے مرتبے کے بزرگ تھے اور ان کی جو والدہ تھیں اس طرف سے بھی بہت بڑا مرتبہ انہوں نے پایا کیونکہ وہ ان کی والدہ محمد خاں صاحب کی پوتی تھیں۔ان کی اور بھی اولاد ہے خدا کے فضل سے۔جن کو میں جانتا ہوں وہ تو بڑے مخلص ہیں دونوں خاندانوں کے۔جن کو میں نہیں جانتا وہ اس لئے نہیں جانتا کہ وہ غائب ہو گئے تو دعا کریں اللہ ان کو بھی غائب نہ رہنے دے۔آمین

اللہ کی یہ تقدیر خوب کھل کر ظاہر ہوگئی ہے کہ آج دنیا کی تقدیر جماعت احمدیہ سے وابستہ ہو چکی ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 19 /اپریل 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنۡ يَّهۡدِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ۝۲۴ (الجاثیہ: 24)

پھر فرمایا:

گزشتہ خطبہ جمعہ پہ میں نے اسی آیت کی تلاوت کے بعد چند ایسی انسانی غفلتوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو اس کی ذات کے اندھیرے ہیں۔ وہ غفلتیں جو انسان کی ذات پر اندھیرے بن کے چھا جاتی ہیں اور اسے حصول مقصد سے بے خبر رکھتے ہیں اس کی پہچان سے ہی ناآشنا رکھتے ہیں وہ سب سے خطرناک اندھیرے ہیں جن سے آگے پھر ہر قسم کے گناہ پھوٹتے ہیں اور قرآن کریم نے ایک بڑی ترتیب کے ساتھ اور ایک تدریج کے ساتھ اول معمولی ابتدائی حالتوں کا ذکر فرمایا پھر ان سے پھوٹنے والی زیادہ سخت اور زیادہ خطرناک حالتوں کا ذکر فرمایا پھر آخری نتیجہ نکالا کہ اگر یہ مضمون اسی طرح تدریجاً بڑھتا رہے تو اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے ایک روئیدگی شروع میں تو نظر کو بھلی لگتی ہے سرسبز و شاداب کونپلیں جب پھوٹ رہی ہوتی ہیں تو انسان کی نظر کو بہت پیاری لگتی ہیں اور ان کے حُسن سے استفادہ ایک معصوم سی چیز دکھائی دیتی ہے لیکن پھر وہی کھیتی لہلہانے لگتی ہے اور خوب تموج اختیار کرتی ہے، ہواؤں کے ساتھ ناچتی ہے، رقص کرتی ہے اور پھر اس کے بونے والوں کے دل کو

خوش کر دیتی ہے لیکن انجام کار پھر اس پر ایک ایسا دور آتا ہے وہ زرد رو ہونے لگتی ہے اور خشک ہو کر ایسے چُورے کی طرح جو پاؤں تلے روندا جاتا ہے اس حالت میں وہ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ یہ وہ مثال ہے جس کے متعلق میں اس آیت کے پہلے حصے کے مختلف امور پر یا مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد پھر متوجہ ہوں گا۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ اول ہے لَعِبٌ اور لَهْوٌ ،اسی سے ہر قسم کی دنیاداری کا آغاز ہوتا ہے۔ کھیل کود تماشہ ایک معصوم سی چیز دکھائی دیتی ہے انسانی فطرت کے ساتھ اس کا ایک گہرا تعلق ہے بچے بھی اپنا دل کھیل کود ہی میں بہلاتے ہیں۔ لیکن جوں جوں جوانی کے ساتھ ساتھ کھیل کود انسانی مزاج پر غلبہ پانے لگتے ہیں تو ان کے اندر گناہوں کی آمیزش ہونے لگتی ہے۔ کھیل کود کا انسانی مزاج پر غلبہ اس کو اعلیٰ مقاصد سے غافل کرتا چلا جاتا ہے اور توجہات کو تمام تر اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے جو زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اس پہلو سے میں نے متوجہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو بھی اس پہلو سے بروقت متنبہ کرتے رہا کریں۔ جہاں ان کی دلچسپیاں کھیل کود میں اتنی بڑھ جائیں کہ ان کی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں حائل ہونے لگیں، جہاں پڑھائی اور تعلیم ثانوی ہو جائے اور زندگی کے دنیا کے تماشے جو ہیں یہ بنیادی اور اصل مقصد بن جائیں ایسے بچے ایسی جوان نسل میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے اپنی منزل کھو دیتی ہے اور غلط سمت میں روانہ ہو جاتی ہے۔ یہ اگلا قدم جو تھا اس کے متعلق میں نے گزشتہ خطبے میں روشنی ڈالی یہ پھر زینت اور تفاخر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دیکھیں لَهْوٌ اور لَعِبٌ کا اپنی ذات سے تعلق ہے۔ ایک انسان کسی چیز کو پسند کرے اس میں کھویا جائے کوئی بیٹھا اپنا ٹیلی ویژن دیکھ رہا ہے تو کسی کا کیا لیتا ہے۔ اس کا کسی اور کے ساتھ کوئی تصادم نہیں، کوئی ٹکراؤ نہیں، کوئی مقابلہ نہیں۔ ایک انسان جوان باتوں میں مثلاً میوزک ہے اس میں بھی مگن رہتا ہے تو وہ کہتا ہے تمہیں اس سے کیا میں اپنا وقت خرچ کر رہا ہوں اپنا پیسہ لگا رہا ہوں اور اگر شور پڑتا ہے تو اپنے کان میں وہ ٹوٹیاں دے دیتے ہیں اور جہازوں میں بھی بجائے اس کے کہ ان پر یہ اعتراض ہو تم نے سب کا امن برباد کر رکھا ہے شور ڈالا ہوا ہے وہ آرام سے اپنی ٹوٹی اپنے کان میں لگا لیتے ہیں اور جہاز والوں نے بھی اب سب کو ٹوٹیاں مہیا کر دی ہیں۔ ٹیلویژن دیکھنا ہے،

میوزک سننی ہے اپنی مرضی کے پروگرام دیکھو لیکن ساتھ والوں کو نقصان نہ پہنچے۔ پس لَهْوٌ اور لَعِبٌ کا جو آغاز ہے وہ نفسانی، ذاتی خواہشوں سے تعلق رکھتا ہے اور دوسروں سے متصادم نہیں ہے پھر یہ چیز پھوٹ کر باہر نکلتی ہے اور زینت اور تفاخر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

زینت کا اختیار کرنا یہ بھی ہر انسان کی فطرت میں ہے لیکن جب وہ زینت دکھاوا بن جائے تو پھر تفاخر کے رنگ میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ ہر وہ نعمت جو خدا تعالیٰ نے ایسے انسانوں کو دی ہے وہ خدا کا شکر کرنے کی بجائے انہیں اپنا فخر دوسروں پر ظاہر کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور خدا کے سامنے سر جھکانے کی بجائے وہ لوگ لوگوں کے سامنے سر اٹھانے لگتے ہیں تو یہ تفاخر ہے یعنی جس ذات نے دی تھیں، جو نعمتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے میسر آئیں بجائے اس کے کہ ان نعمتوں کے شکر پر سر اس کے حضور جھکتا چلا جائے اس کے عاجز اور کمزور بندوں پر اٹھتا چلا جاتا ہے اور یہ تفاخر جو ہے یہ ہمیشہ نچلوں پر ہے۔ یہ لفظ تفاخر میں ایک داخل بات ہے جو اپنے سے بڑے ہوں ان کے سامنے کوئی تفاخر کیسے کر سکتا ہے ان کی مجلس سے تو دور رہے گا تا کہ ان کے سامنے سبکی نہ ہو۔ جو غریب لوگ، نسبتاً کمزور لوگ ہیں ان کے سامنے دکھاوے ہوتے ہیں یا برادری کے لئے بھی دکھاوے ہوں تو جب تک ان سے زیادہ خرچ کر کے ان سے زیادہ دکھاوا نہ ہو اس وقت تک ان کا سر اونچا ہو ہی نہیں سکتا۔

پس اپنا جھوٹا سر اونچا کرنے کی خاطر وہ اپنی آئندہ اولادوں کے سر ہمیشہ کے لئے نیچے کر دیتے ہیں۔ قرضوں میں جکڑے جاتے ہیں، جائیدادیں بک جاتی ہیں بجائے اس کے کہ دنیا ان کی تعریف کرے کہ واہ واہ انہوں نے خوب کیا چند دن کی اس تعریف کے بعد پھر لعنتیں پڑنے لگتی ہیں کہ اس نے تو جو کچھ ورثے میں پایا تھا وہ بھی گنوا دیا کچھ بھی باقی نہ رکھا تو یہ بھی ایک اندھیرے کی بڑی خوفناک قسم ہے مگر جب یہ آگے بڑھتی ہے تو سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ آخری شکل جو اس کی بنتی ہے وہ ہے تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (الحدید:21)۔

اب تدریج دیکھیں کیسی عمدہ اور متناسب تدریج ہے۔ ایک نفس کے اندھیرے نے نفس کو ایک سایہ مہیا کیا اور اس سائے تلے نفس نے آرام پایا لیکن جب وہ گہرا ہو گیا تو رستہ دیکھنے کی صلاحیت سے بھی اس کو عاری کر دیا۔ پھر وہی چیز آگے بڑھی تو اپنی نعمتوں کو دکھانے پر منتج ہو گئی اور اکیلا اپنی ذات میں انسان سکون پا ہی نہیں سکتا پھر جب تک دوسروں کے اوپر وہ فخر نہ کر لے جب تک

دوسروں سے زیادہ اپنے آپ کو دکھا نہ لے اس وقت تک اس کے نفس کو تسکین نہیں ہو سکتی۔ اب یہ Social evil میں تبدیل ہوگئی ہے۔ جو پہلے ذاتی نقص تھا اب یہ تمدنی اور سوشل نقص میں تبدیل ہو گیا اور ان کی جو دو باتیں ایک بریکٹ میں بیان فرمائی گئی ہیں ان کا تعلق انسانی اقتصادیات اور سیاست سے ہے۔ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کا تعلق انسانی اقتصادیات سے ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ایسا رابطہ رکھتی ہیں کہ گویا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ جوڑے بھی خوب بنائے ہیں ایسے جن کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا ہی نہیں سکتا۔ جب سیاست انسانی دماغ پر قابض ہو جائے، جب قوموں کے اجتماعی دماغ پر قبضہ کر لے تو یہ سیاست محض اپنے رعب کو دنیا پر قائم کرنے کے لئے نہیں، اپنی بڑائی کو قانونی طور پر اپنے اہل وطن پر مسلط کرنے کے لئے نہیں بلکہ ہر قسم کی دولت کمانے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور یہی سیاست جب بین الاقوامی سطح پر سر اٹھاتی ہے تو اس کے ساتھ دولت کا کمانا ایک لازمی جزو ہے اس کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ انگریزوں سے یعنی انگریزی حکومت سے آزادی کا گُر ان لوگوں کو کسی کو بھی علم نہیں جو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور انگریزوں کے خلاف نفرت کی تعلیم دیتے ہیں کوئی ہتھیاروں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں کوئی عدم تعاون کے ساتھ جیسے گاندھی جی کی تحریک تھی ان کو اپنے ملک چھوڑنے پر مجبور کرنے کی تحریک کرتے ہیں۔ آپؓ نے فرمایا ایک ہی طریق ہے کوئی دنیا کی قوم اپنی سیاست کو دوسری قوم پر غالب کر کے محض یہ لطف نہیں لیا کرتی کہ ہم حاکم ہیں جب تک اس کے نتیجے میں اس ملک کی دولت ان کے ملک میں منتقل نہ ہو۔ اگر کسی ملک کی دولت کسی ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونا بند کر دے تو کوئی پاگل نہیں ہے کہ وہاں جا کر کوئی سیاسی نظام اپنا جاری کرے اور محض اس وجہ سے کہ ہماری سلطنت بڑی ہوگئی ہے سیاسی غلبے کو جاری رکھنے کی فطرت اجازت ہی نہیں دیتی کیونکہ کچھ دیر کے بعد یہ مصیبت بن جاتی ہے۔ نظم و ضبط قائم رکھنا، اپنے خرچ پر قائم رکھنا، کسی اور جگہ جا کر ایسی قوم پر اپنی حکومت جتانا جس قوم کو تمہاری حکومت پسند نہیں ہے اور نتیجۃً مالی لحاظ سے کوئی بھی فائدہ نہیں۔ کبھی بھی دنیا میں ایسی سیاست زیادہ دیر چل نہیں سکتی تو میں خود ہی اپنا بوریا بستر لپیٹتی ہیں اور ایسے ملکوں کو چھوڑ دیتی ہیں۔

پس حضرت مصلح موعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا اور کئی دفعہ جو نجی مجالس میں بھی آپؓ ان باتوں کا ذکر چھیڑا کرتے تھے تو اس میں بھی یہ باتیں آتی رہیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ اصل نجات کا راز تحریک جدید کی اس سکیم میں ہے جس کے انیس نکات ہیں۔ وہ تحریک جدید کی سکیم ایسی ہے کہ اگر کسی قوم میں رائج ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوم بھی وہاں سے مالی فائدہ نہیں اٹھاسکتی۔ جو قوم اپنی زندگی کے رہن سہن کو سادہ اور غریبانہ بنالے، جس کو نہ بدیشی کپڑوں میں دلچسپی رہے، نہ بدیشی زیورات میں دلچسپی رہے، نہ بدیشی کھانوں میں دلچسپی رہے، جن کو روزمرّہ کی ساگ اور روٹی گھر میں میسر آجائے اسی پہ راضی رہیں، جو اپنا کپڑا کاتیں اور اس کھدر پہ راضی رہیں۔ جن کو دکھاوے کے لئے کسی سے قرض لینے کی ضرورت نہیں کسی بینک کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں وہاں کا بینکنگ نظام بھی زیادہ دیر نہیں چل سکتا یعنی ان کے خون نہیں چوس سکتا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایسی قوم ہی ہے جو درحقیقت دنیا میں آزادی کے سانس لے سکتی ہے اور غیروں کو اس میں دخل دینے کا کوئی موقع ہی میسر نہیں آسکتا۔

آپؓ نے فرمایا کہ جرم بھی ان چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ جتنے جرائم ہیں وہ اخلاقی کمزوریوں سے وابستہ ہیں اور جس قوم کی اخلاقی حالت درست ہو جائے جرائم اس کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جیسے صحت مند بدن کو جراثیم چھوڑ دیتے ہیں۔ موجود ہیں فضا میں وہی سانس ہم سب لے رہے ہیں جو بیمار لوگ بھی لیتے ہیں مگر جراثیم سانس سے اندر جاتے ہیں اور باہر نکل آتے ہیں ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے اس بدن میں جو صحت مند ہو۔ ہاں جہاں بیماری کے آثار دیکھیں گے وہاں ان کے اڈے بنیں گے وہاں ان کا Foot Hold یعنی قدم جمانے کی جگہ بن جاتی ہے اور پھر آگے وہاں سے وہ باقی علاقوں کی فتوحات کے انتظام کرتے ہیں۔ تو حضرت مصلح موعودؓ نے بڑی گہری فراست کے ساتھ تحریک جدید کو جاری فرمایا تھا تا کہ جماعت کے اندر جو لَهْوٌ وَلَعِبٌ کی دلچسپیاں ہیں اور اس کے نتیجے میں پھر ایک دوسرے پر تفاخر ہے ان سے آزادی ملے تو ان قوموں کو جماعت پر حکومت کرنے کا شوق ہی باقی نہیں رہے گا، مصیبت لگے گی ایسی جماعت پر حکومت کرنا جن قوموں کا مقصد تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ہے اور سیاست کا اس سے اعلیٰ نچوڑ دو لفظوں میں بیان ہو ہی نہیں سکتا اموال کی کثرت اور اولاد کی کثرت۔

یہاں قرآن کریم کا محاورہ اولاد محض بچوں کے زیادہ پیدا کرنے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ

قرآن کریم نے خوب اس مضمون کو کھولا ہے، بار بار کھولا ہے کہ وہ قومیں جو دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہیں ان کو عددی قوت میں دلچسپی ہوتی ہے اور اولاد یہاں بمعنی عددی قوت ہے یعنی جسمانی غلبہ جو فوجی غلبہ بھی کہلا سکتا ہے۔ بہر حال ایک قوم کو دوسرے پر جو فوجی یا عددی برتری حاصل ہو قرآن کریم نے ایسی قوموں کے حوالے کے ساتھ جن کا ذکر قرآن کریم میں تاریخی طور پر ملتا ہے ہمیشہ ان کی اموال کی کثرت اور اولاد کی کثرت کے طور پر اسے پیش فرماتا ہے۔ پس یہ آیت قرآنی محاورہ ہے اور قرآنی محاورے کی مدد ہی سے اس کو حل کیا جا سکتا ہے جو دوسری جگہ کثرت سے کھلے کھلے طریق پہ استعمال فرمایا گیا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ لہو ولعب جب زینت اور تفاخر میں بدلتے ہیں تو انسان ضرور اپنی توفیق سے بڑھ کر خرچ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی غلامی کا یہ پہلا قدم ہے۔ پہلا اندھیرا جو اس کی ذات پر چھا جاتا ہے اور اس سے دیکھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔ ایسے لوگ جب مجبور ہوتے ہیں تو قرض اٹھاتے ہیں جو جانتے ہیں کہ واپس نہیں کر سکتے۔ وہ ایسی تجارتوں کی سکیمیں بناتے ہیں جن میں ہوتا کچھ بھی نہیں ہے اور لوگوں کو دھوکے دے کے ان کے پیسے کھا جاتے ہیں کیونکہ کسی طرح سے اب نفس کی اس حرص کو پورا کرنا ہے اور دوسری شکل اس کی بنتی ہے وہ ہوشیار لوگ جن کو کمانا آتا ہے اور کمانے کے بعد وہ اعلیٰ مقاصد پر خرچ کرنے کی بجائے پیسہ اکٹھا کرتے ہیں اور محض دولت میں کسی دوسرے پر فوقیت لے جانا ان کے لئے ایک روحانی یا جو بھی اس کا نام رکھیں ایک قلبی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے لیکن یہ قلبی تسکین کا ذریعہ درحقیقت ان کے لئے دھوکہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب تک ایک شخص کا پیسہ دوسرے کے مقابل پر بڑھتا رہے اس کو یہ معلوم ہو کہ اب میں ایک ملین سے دو ملین میں داخل ہو گیا Millionaire کے دائرے سے Billionaire میں داخل ہو گیا تو دائرے جب تک وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں کسی حد تک سکون ملتا ہے لیکن جونہی یہ دائرہ اپنی حد استطاعت پر پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے وہاں وہ نفس کی بے قراری، مزید کی طلب، سینے کی آگ کہ میں اور کیا کروں، کس طرح بڑھاؤں اور بڑھانے کی بجائے جب وہ چیز گھٹنی شروع ہو جاتی ہے تو اس کی بالکل وہی مثال ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا۔ (الحدید: 21) وہ چیز جو اس کے سامنے نشو ونما پاتے ہوئے بڑی ہوئی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور یوں معلوم

ہوا جیسے اب اس کو پھل لگنے کے وقت آ گئے ہیں تو پھل کچھ بھی نہیں لگتا۔ یہ جو حرص ہے یہ اور بڑھ جاتی ہے۔ طلب کی کوئی حد نہیں ہے اور بالآخر ایسے انسان ہمیشہ محروم دنیا سے جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ آتی کہ ہم کیا کریں۔ کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو اپنی دولت کو پھر سیاست پر استعمال کرتے ہیں اور تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہاں جا کر یہ دونوں مجرم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پھر آگے بڑھنا شروع کرتے ہیں۔ یہ جو گٹھ جوڑ ہے سیاست اور دولت کا آج کی دنیا میں تمام ملک جن سے امن اٹھ چکا ہے ان کا آخری نقطہ یہی ہے کہ وہاں دولت نے سیاست سے سمجھوتہ کر لیا ہے یا دولت سیاست کو غلام بنائے ہوئے ہے یا سیاست دولت پر غالب آ گئی ہے اور دولت کھینچنے کا ذریعہ بنا کر حکومت ہو رہی ہے۔ جن جن ممالک میں یہ بات ہوئی پھر ان کے سنبھلنے کا بعد میں کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ ہر قسم کی کرپشن، بددیانتیاں اور جرائم پھر بڑی سطح پر وہاں پرورش پاتے ہیں۔

اور بدقسمتی ہے اب مغربی دنیا میں جہاں سیاست نسبتاً زیادہ صاف اور پاک تھی، ابھی بھی ہے نسبتاً دولت کی آمیزش کے نتیجے میں گندی ہو رہی ہے۔ دن بدن یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ سیاست کو دولت کمانے کا ذریعہ کیسے بنایا جائے اور باوجود اس کے کہ یہ لوگ پکڑے بھی جاتے ہیں، عوام کے سامنے ان کو ذلیل اور رسوا بھی کیا جاتا ہے مگر جس نہج پر ایک دفعہ قوم کا مزاج چل پڑے پھر رک نہیں سکتا۔ پس تَكَاثُرٌ ایک بیماری ہے یعنی پیسہ بڑھانا ایسی بیماری ہے جو از خود اپنے آپ سے ضرب کھاتی رہتی ہے، سیاسی طاقت بڑھانا ایک ایسی بیماری ہے جو از خود اپنے آپ سے ضرب کھاتی رہتی ہے۔ پس تَكَاثُرٌ سے بہتر اسے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا اور قرآن کریم نے تَكَاثُرٌ کے مضمون کو اور جگہ بھی خوب عمدگی سے کھولا ہے اور بعض اور مثالوں کے ساتھ بھی اسے واضح فرمایا ہے اور اس انجام کو ہمارے سامنے ننگا کر کے دکھا دیا ہے۔

فرماتا ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۲﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۳﴾ (التکاثر: 2، 3) کہ اے انسان! تجھے تو ایک دوسرے سے بڑھنے، یہاں تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ نہیں فرمایا۔ تَكَاثُرٌ اے انسان! تجھے بڑھتے چلے جانے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے یعنی اموال میں اور طاقت میں سبقت لے جانے نے بالکل اندھا کر دیا ہے۔ الھٰـی معنٰی غافل کر دیا یا ہلاک کر دیا دونوں معنٰی

اس مضمون میں یہاں پائے جاتے ہیں۔ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جنون تم پر سوار ہو چکا ہے اس نے تمہیں اپنے مفادات سے، اپنے مقاصد سے بالکل غافل کر دیا ہے اور ہلاک کر دیا ہے۔ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کرنے لگے۔

اب جو قبروں کی زیارت کرنا ہے یہ بھی بہت ہی دلچسپ محاورہ ہے اس میں دونوں معنیٰ بیک وقت پائے جاتے ہیں یعنی کم سے کم دو معنی بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنے اموال اور اولاد، اپنی طاقت، سیاست اور اپنی اقتصادیات کو ترقی دینے کی خاطر اتنے گر چکے ہو کہ قبروں سے بھی مانگنا پڑے تو نہیں رکو گے اور قبروں سے بھی مانگو گے اور امر واقعہ یہ ہے کہ ان معنوں میں بعینہٖ یہی صورتحال تیسری دنیا پر مسلط ہو چکی ہے۔ مذہب چاہے اسلام ہو یا ہندو ہو یا جو مذہب کا نام رکھ لیں۔

ان میں بعضوں میں عقیدہ، بعضوں میں توہمات کے رنگ میں مردہ پرستی شروع ہو چکی ہے، مردوں سے مانگنے کا رجحان ہے اور یہ جو مردہ پرستی ہے اس نے جاپان کو بھی خالی نہیں چھوڑا اور کوریا کو بھی اور چین کو بھی خالی نہیں چھوڑا۔ آباؤ واجداد کی روحوں کے سامنے سر جھکانا اور ان سے امیدیں وابستہ کرنا اب یہ روزمرّہ کا بڑھتا ہوا فیشن ہے اور ہمارے ملک میں آپ دیکھیں داتا کے دربار پہ پہنچ جاتے ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں خدا کے حضور سر ٹیکنے کا موقع نہیں ملتا، جو راتوں کو اٹھ کے اس کے حضور سجدہ ریز ہونا جانتے ہی نہیں، وہ دن کی روشنی میں لوگوں کے سامنے داتا کے دربار پہنچتے ہیں اور دو مقاصد اپنی طرف سے حاصل کرتے ہیں۔ اول اپنے لئے اموال ان سے طلب کرتے ہیں دوئم اپنے لئے اولاد ان سے طلب کرتے ہیں۔ اپنی سیاست ان سے مانگتے ہیں اور اس دکھاوے کے ذریعے کہ ہم نے داتا کے دربار پر چادر چڑھائی ہے عوام سے بھی اپنی ہردلعزیزی کی بھیک مانگتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تم نے ہم میں اور کچھ نہیں دیکھا تو یہ تو دیکھو کہ وہ مردے جن سے تم مانگتے ہو ہم بھی انہی سے مانگ رہے ہیں اور اتنا احترام ہے تمہارے مذہبی جذبات کا ہمیں کہ آگے پیچھے کبھی توفیق ملے نہ ملے مگر اب ہم جب کہ حکومت پر قابض ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ تو دیکھو حضرت داتا کے دربار پر جا کر ان کے سامنے ماتھے ٹیک رہے ہیں ان پر چادریں چڑھا رہے ہیں تو بھیک ہے، سوائے خدا کے ہر طرف بھیک ہی بھیک۔ دائیں طرف بھی بھیک، بائیں طرف بھی بھیک، عوام سے بھی بھیک، بڑے لوگوں سے بھی بھیک، اور مردوں سے بھی۔ تو زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کا اس سے بہتر نقشہ اور کیا ہوسکتا

ہے ایسے پاگل ہو گئے ہو تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں کہ قبروں کی زیارت کرنے لگے ہو۔

اور دوسرا معنی جو آخری اور بہت ہی پُر جلال معنی ہے کہ تم تو قبروں کے کنارے تک جا پہنچے ہو۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کیا تمہیں اپنا انجام دکھائی نہیں دے رہا تمہارے سامنے مقبرے پھیلے پڑے ہیں تم سے پہلے ایسے ہی لوگ تھے جیسے تم ہو جن کو اس ظلم نے مقبروں تک پہنچا دیا وہ دفن ہیں زیرِ زمین دفن ہیں ان کو دیکھو اور ہوش کرو کہ تم نے اپنا کیا انجام بنا رکھا ہے۔ پس وہ جو حُطَامًا ہو کر وہ کھیتی جس سے توقع تھی کہ بہت بار آور ثابت ہوگی، گھر ہمارے غلوں سے بھر دے گی۔ اگر بار آور ہونے سے پہلے اس پر کوئی ہوا چل پڑے اور وہ زرد ہو جائے اور زرد ہو کر پارہ پارہ ہو جائے اور زمیندار کو اس میں کوئی دلچسپی نہ رہے۔ ہوائیں، آندھیاں چلیں رگیدتی ہوئی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، مٹی میں ملا دیں اور پھر اس پر پاؤں پڑنے لگیں۔ یہ جو نقشہ ہے یہ وہ آخری نقشہ ہے جو تَكَاثُرُ کا نقشہ ہے، مَقَابِرُ تک پہنچے کا یہ نقشہ ہے جو کھینچا گیا ہے تو فرمایا اس کی خاطر تم اپنی زندگیاں برباد کرتے ہو۔

اب آپ دیکھ لیں کہ سیاست نے مال کے ساتھ مل کر دنیا میں کیا تباہی مچائی ہے اور انسان نے خود بھی ذاتی طور پر اموال کی طلب میں اور جو سیاسی طاقت ہے اس کی خواہش میں دنیا میں کتنے مصائب برپا کر رکھے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تیسری دنیا میں ہر جگہ قریباً یہی کچھ ہو رہا ہے انسانی زندگی کی قیمت ہی کوئی نہیں رہی انسانی عزت کی کوئی توقیر باقی نہیں رہی اور ہر دفعہ جب آپ سوال کریں کیوں؟ تو یا پیسے کی خاطر یا سیاست کی خاطر۔ یہ دو چیزیں ایسی غالب آجاتی ہیں پھر اور انسانی دماغ پر ایسا قبضہ کر لیتی ہیں کہ دیکھنے کی ہوش ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ آخری طبعی لازمی نتیجہ ہے جس سے انسان بچ نہیں سکتا اور ہوتا ہے روزانہ گھروں میں۔ آپ کی اولاد میں اس کے آثار نمایاں ہو کر آپ کی آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ آپ کی بیویوں میں، آپ کی بچیوں میں، آپ کے لڑکوں میں یہ آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اگر متوجہ ہوں تو وہ وقت ہے کہ آپ ان کی بیخ کنی کریں ورنہ بعد میں پھر پچھتاتے رہ جائیں گے اور کچھ بھی آپ کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

عورتیں ہیں مثال کے طور پر، ان کو ہم پردے کے متعلق تاکید کرتے رہتے ہیں لیکن سو عذر ہیں جن میں جائز بھی بہت ہیں۔ کہتے ہیں ہم نے کمانا ہے، ہم نے باہر نکلنا ہے، تعلیم حاصل کرنی ہے

بچیوں نے ،اب ہم کیسے بند ہو کے گھروں میں بیٹھ رہیں۔ ہم ان کو کہتے ہیں بالکل گھروں میں بند ہو کر نہ بیٹھو لیکن اپنی عزتوں کو بند رکھو، ان کو کھلی چھٹی نہ دو، ان کو سرِ عام بے راہروی کی اجازت نہ دو تو پھر پردے کی جو بھی شکل ہے وہ ٹھیک ہے لیکن اجازت مانگتے ہو کسی اور بہانے سے اور اجازت کو استعمال کرتے ہو کسی اور غرض کے لئے اور وہ غرض زینت اور تفاخر ہے۔ پس ہر وہ بظاہر نیک اور شریف عورت، بظاہر ان معنوں میں کہ اس کے اندر کوئی ایسی بدی نہ آپ دیکھیں گے کہ جس پہ اس کو ملزم کر سکیں، اس کو مجرم دکھا سکیں لیکن ایک کمزوری اس کی آپ کو دکھائی دیتی ہے اور اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں رہتی وہ جب باہر نکلتی ہے تو صرف ضرورت پوری کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس طرح بن ٹھن کر نکلتی ہے اس ارادے کے ساتھ اپنے آپ کو تیار کرتی ہے کہ غیر نظروں کو اپنی طرف کھینچے اور اپنے حسن کو نمایاں کرے۔ جب کہ قرآن کریم نے پردے کی جو تعریف فرمائی ہے اس کی مرکزی تعریف یہ ہے کہ اپنی زینت کو غیر آنکھوں کے سامنے ابھارا نہ کرو۔

پس وہ ضرورت کیسی ضرورت ہے جس کی خاطر اجازت لے کر اس کو بے محل استعمال کرو اور اپنے ہی خلاف استعمال کرو اور اپنی اولادوں کے خلاف استعمال کرو۔ تو یہ جو زینت ہے، یہ تو قوموں کی عصمت برباد کر دیتی ہے۔ ان کو اعلیٰ مقاصد کے لئے خدمت کی توفیق ہی باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس وہ بچیاں بھی ہیں، خواتین بھی ہیں جو زیادہ اس طرح کا پردہ نہیں کرتیں جیسے برقع پوش ہوں لیکن آپ ان کو خدمت دین پر مامور دیکھیں گے۔ دیکھیں کتنی سادگی ان کے اندر خود بخود آ جاتی ہے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ تیار ہو کے باہر نکلیں MTA کا وقت ہو رہا ہے، ان کو اور گھر کے کام بھی کرنے ہیں، ناشتے بھی تیار کرنے ہیں، بچوں کو رخصت کرنا ہے افراتفری میں جس حال میں ہیں دوڑی دوڑی مسجد آ کر وہ خدمت دین میں مصروف ہو جاتی ہیں اور ان کو دیکھ کر کوئی بیمار نظر بھی اگر پڑے تو صحت مند ہو سکتی ہے مزید بیمار نہیں ہو سکتی ان سے دل پاک ہوتے ہیں۔ یہ وجود ہیں جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ سوسائٹی میں ایک مضبوط قوی حصہ جو بھرپور زندگی میں حصہ لیتا ہے اور کسی زندگی کی جائز ضرورت سے محروم نہیں رہتا۔ مگر نسوانیت کو لوگوں کی رجولیت ضائع کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

نسوانیت کے خاص مقاصد ہیں جس ماحول میں وہ مقاصد ہیں وہاں اس کو ابھارنا، اس کی

زینت سے فائدہ اٹھانا قرآن کریم اس کی اجازت دے رہا ہے اس کی حد بندی کر رہا ہے اس کے اردگرد خطوط کھینچ رہا ہے۔ دیکھو تمہارے بچے ہیں جن کے سامنے اچھی دکھا کرو یہ نہیں کہ جھاٹے پھلا کر بچوں کے سامنے آجاؤ اور مارکیٹ میں جانا ہو تو خوب بال سنوار کر بلکہ ابھار کر اور بکھیر کر اس طرح نکلو کہ تمہارے پیچھے ان کی جھالریں لہراتی ہوئی چل رہی ہوں۔ یہ غلط طریق ہے۔ تم اپنے گھر میں اپنے بچوں کے سامنے پیاری کیوں نہیں بنتیں۔ اپنے بھائیوں، اپنی ماؤں، اپنے باپوں کے سامنے کیوں اچھی نہیں بنتیں۔ ان کی نظر میں چونکہ پاکیزگی ہے اس لئے جب تک تم ان کے سامنے اچھی نہیں بن سکتیں جب تک تمہاری نظر میں پاکیزگی کی قیمت نہ ہو۔ پس زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ میں یہ سارے پیغام ہمارے سامنے رکھ دیئے اور امر واقعہ یہ ہے آپ انسانی نفسیات پر غور کر کے دیکھیں کہ انسان کی نیتیں قیمتوں سے طے پاتی ہیں اور انسان کی نظر میں جس چیز کی قیمت ہے وہی فیصلہ کرتی ہے کہ نیت کیسی ہوگی اور اس نیت کو کس شکل میں عملی دنیا میں ڈھالا جائے گا۔ پس اگر نیت میں پاکیزگی نہ ہو تو جہاں پاکیزہ آنکھیں ہیں وہاں دکھانے کا شوق ہی کوئی نہیں رہتا۔ اپنی بلا سے ہوں یا نہ ہوں جیسی وہ آنکھیں ہوں ویسی وہ آنکھیں نہ ہوں۔ مزہ کیا کہ جو نظر پڑتی ہے، پاکی سے پڑتی ہے ہاں ذرا سا تھوڑا سا ہیجان پیدا ہو جائے، جہاں نظر میں طلب پیدا ہونی شروع ہو جائے، جہاں ہمیں محسوس ہو کہ ہماری پوجا کی جارہی ہے۔

اب وہ عورتیں جن کے متعلق میں نے کہا ہے بظاہر آپ ان میں کوئی جرم نہیں دیکھیں گے اپنی ذات کی حفاظت کرتی ہیں مگر قرآن کریم نے جو یہ تعریف فرما دی کہ اس نے اپنی ھـــــوىٰ کو اپنا معبود بنالیا ہے یہ بیماری شروع ہو چکی ہے اور جب تک کوئی نظر عبادت نہیں کرتی اس وقت تک پورا سکون نہیں ملتا اور یہ نظروں کی عبادت کروانا بہت ہی خوفناک اور مہلک بیماریوں پر منتج ہو جایا کرتا ہے اور یہ مرض آگے بڑھتا ہے اور پھر اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ وہ نسلیں جو دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے ماں باپ میں زینت اور تفاخر ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان قدروں کو اپناتے ہوئے بڑے نہ ہوں۔ ان کو اپناتے ہوئے بڑے ہوتے ہیں، وہی چیزیں ان کے اندر سموئی جاتی ہیں اور پہلے سے زیادہ نشو و نما پاتی ہیں۔ یہ صورت حال اگر اسی طرح جاری رہنے دی جائے تو پھر ان چیزوں سے بھی لذّت یابی کی طاقت ختم ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد دل خشک ہو جاتے ہیں اور خالصۃً اپنی بڑائی یعنی معبود ہونے کی

آخری منزل جہاں دنیا کا سر اپنے سامنے جھکاؤ اپنے اموال کو زیادہ کر کے یا اپنی طاقتوں کو بڑھا کر اس حد تک تمہیں چین نصیب نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ بعض دفعہ زینت اور تفاخر کے دائروں سے نکل ہی چکے ہوتے ہیں۔

بعض آپ سیٹھوں کو دیکھیں گے کہ ان کو قطعاً کوئی ہوش نہیں اپنے کپڑوں کی بلکہ بال بکھیرے ہوئے برے حال میں بٹن کھلے ہوئے وہ تجوریوں پر بیٹھے ہوتے ہیں مگر جانتے ہیں کہ یہ ہے ہماری شان، ہمارے پاس دولت ہے ان لوگوں کے پاس دولت نہیں ہے اور بغیر زینت کے بھی وہ اپنی بڑائی خود محسوس کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی نظر دولت میں مزہ دیکھ رہی ہے۔ تو ہر انسان جو معبود بن کر ابھرتا ہے وہ کسی نہ کسی خاص اپنی نفسانی الٰہی غرض کے ساتھ معبود بنتا ہے۔ جس کی نظر زینت پر زیادہ ہے وہ زینت کا معبود، دکھاوے کا بت بن جاتا ہے۔ جس کی نظر دوسروں پر اپنی تمدنی برتری حاصل کرنے کا شوق ہے وہ پھر رسم و رواج کے بت کو اپناتا ہے اور رسم و رواج کا خدا بن کر ابھرتا ہے اور آخری صورت اس کی یہ ہے کہ دولت کے سرچشموں پہ قبضہ کر لے اور طاقت کے سرچشموں پر قبضہ کر لے جب یہ معبود بن جائے تو دنیا کی ہر دوسری قدر اپنی قیمت کھو دیتی ہے۔ کوئی اس راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا اس کا سر توڑ دیا جائے گا۔ خواہ ان لوگوں کے بچے اغواء کر کے آپ اپنی سیاسی طاقت کو بحال رکھیں، خواہ معصوم آدمیوں کا قتل عام کروا کر اپنا رعب قائم رکھیں کہ ہم ہیں صاحب اولاد ہم جتھے والے لوگ ہیں تم کیا چیز ہو تم ہماری مخالفت کرنے کی جرات کیسے کر سکتے ہو اور پھر اموال کے تمام ذریعوں پر قابض ہونے کے ذریعے، وہ جو سرچشمے ہیں اقتصادی دولت کے ان پر قابض ہونے کے ذریعے وہ اپنی بڑائی کو جاری رکھتے ہیں اور اس کو دائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خلاصہ ہے ساری انسانی زندگی کا۔

اب آپ دوبارہ ان باتوں کو سن کر اور سمجھ کر جب بھی پاکستان کا کوئی اخبار اٹھائیں گے یا ہندوستان کا کوئی اخبار اٹھائیں گے یا دوسرے ملکوں کے اخبار اٹھائیں گے آپ کو ہر جگہ یہی خلاصہ نظر آئے گا۔ ساری افراتفری، سب دوڑ، سب چکر اسی مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔ تو تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ اور تَكَاثُرٌ فِي الْاَوْلَادِ ہے اور ساری دنیا کو مصیبت، دیکھیں کتنی ڈالی ہوئی ہے اس نے۔ تمام دنیا کا امن جہنم میں تبدیل ہو چکا ہے اور وہ لوگ جو دکھاوے کی راہ سے ان چیزوں تک

پہنچتے ہیں ان کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دنیا میں حقیقتاً وہ انسان کی یا اپنی قوم کی خدمت کرتے ہیں کہ نہیں۔ ان کو اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ دنیا ان کو خدمت گار کے طور پر دیکھ رہی ہے کہ نہیں یا ان کی قوم ان کو اپنے خادم کے طور پر اگر دیکھتی نہیں تو کم سے کم دل میں گمان کرتی ہے کہ یہ ہمارے خادم ہیں۔ یہ تأثر قائم کرنے پر سارا زور رہتا ہے اور اس سے نیچے اس تأثر کو قائم کرنے کی جہاں تک ٹھوس بنیادوں کا تعلق ہے اس میں ان کو ذرّہ بھر بھی دلچسپی نہیں رہتی۔

مومن ان چیزوں کے بالکل برعکس ہے۔ مومن ان سب اندھیروں سے آزاد ہے۔ وہی ہے جو دیکھتا ہے اور وہی ہے جو نیک انجام کو پہنچتا ہے۔ وہی ہے جس کی آخرت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ پس قرآن کریم نے ان تمام انسانی کمزوریوں کا ذکر فرماتے ہوئے انہیں کلیۃً رد نہیں فرمایا کہ ان کے اندر کچھ بھی تمہارے لئے باقی نہیں۔ تو اس پہلو کے ساتھ اگر آپ اپنے اعمال کا اپنے نفس کا جائزہ لینا شروع کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا کا نجات دہندہ بنا سکتا ہے اور نجات دہندہ بننے کے لئے پہلے اپنے نفس کو نجات دینی ضروری ہے اور اس کے لئے سب سے اعلیٰ، سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی نظر میں رکھیں اور یہ فیصلہ کریں کہ اسی نظر کی ہمارے نزدیک قیمت ہے باقی کسی نظر کی قیمت نہیں۔ اس نظر کا عجیب حال ہے بعض دفعہ آپ کو دولت مند دیکھ کر خوش ہوگی بعض دفعہ غریب دیکھ کر خوش ہوگی۔ اس لئے اگر اس نظر کو خوش کرنا ہے تو اس کی خاطر غربت اختیار کرنا بھی آپ کے لئے لذّت پیدا کرے گا کیونکہ اس کی رضا کے تابع ہے۔ پس ایسے انسان کی زندگی کی کایا پلٹ جاتی ہے، اس کی زندگی کے قوانین بدل جاتے ہیں، اس کا اٹھنا بیٹھنا لوگوں میں رہنا سہنا، ان سے معاملات کرنا، ایک نئے رنگ پر آ جاتا ہے جس کا عام انسانوں سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔

اب جن کو تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ کا جنون ہو وہ اس لئے ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کی پرستش کرنی ہے اور اگر وہ خدا کی پرستش کرنے لگیں تو اسی تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ میں ان کو کوڑی کی بھی دلچسپی نہیں رہتی۔ پھر وہ مال جو خرچ کرتے ہیں اس کو خدا کی راہ میں لٹانے میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور جتنا مزہ ایک کمانے والا کما کر اکٹھا کرنے میں محسوس کرتا ہے اس سے بہت زیادہ مزہ خدا کے بعض بندے اس کمائی کو خدا کے بیان کردہ شرائط کے تابع حقوق کا خیال رکھتے ہوئے، متوازن طریق پر خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور لذّت پاتے ہیں۔ کبھی آپ کسی چندہ دینے والے احمدی کو جو اس

وجہ سے چندہ دیتا ہے کہ میں نے اپنے رب کو راضی کرنا ہے چندہ دینے کے بعد مغموم نہیں پائیں گے۔ٹیکس دینے کے بعد تو آپ کئی چہرے دیکھیں گے وہ چہرے اتر گئے مصیبت پڑی۔ کیوں جی کیا ہوا؟ آج تو جی بڑی چٹی پڑ گئی وہ ٹیکس جو ہم نے اتنی دیر سے چھپایا ہوا تھا وہ ننگا ہو گیا پکڑے گئے آج ہمیں دینا پڑا ہے لیکن کبھی کسی چندے دینے والے کو آپ سر پھینک کر چلتے ہوئے مغموم نہیں دیکھیں گے کہ کیوں جی کیا ہوا کہ جی آج اتنا چندہ دینا پڑا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ناممکن ہے۔ ہاں ایسے مغموم لوگ ضرور دیکھیں گے جو چندہ نہیں دے سکے اور ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں میں نے خود دیکھے ہیں بارہا دیکھے ہیں آتے ہیں تھوڑی رقم پیش کرتے ہیں اور اس قدر بے چینی محسوس کرتے ہیں اتنا دکھ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ کی توفیق نہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ زیادہ دیں دعا کریں کہ اللہ ہماری حسرتیں پوری کرے۔ایسی دنیا بھی آپ نے کہیں اور دیکھی ہے جو جماعت احمدیہ کی دنیا ہے۔ پس یہی وہ مضمون ہے ان کے ہاں تَكَاثُرُ کی تمنا ہے خدا کی خاطر خرچ کرنے کی خاطر، ان کے ہاں تَكَاثُرُ کی تمنا ہے تا کہ اپنے غریب رشتے داروں کی ضرورتیں پوری کرسکیں اپنے دکھی ہمسایوں کی، اپنے بیمار ساتھیوں کے لئے کچھ شفا، کچھ صحت کے لئے، کچھ ان کے پیٹ بھرنے کے سامان کرسکیں ان کو لگی ہوتی ہے کہ خدا ہمیں اور دے تو ہم اور خرچ کریں اور کئی ایسے ہیں جنہوں نے مجھے دعا کے لئے اس طرح بارہا لکھا کہ ہمارے دل میں ہر وقت ایک آگ سی سلگتی رہتی ہے کاش ہمیں توفیق ہو تو ہم فلاں غریب رشتے داروں کی مدد کرسکیں، فلاں مصیبت زدہ کی مدد کرسکیں دعا کریں اللہ ہمیں توفیق دے اور پھر خدا ان کو توفیق دیتا ہے اور وہ خرچ کرتے ہیں اپنے وعدوں پر قائم رہتے ہیں فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (الاحزاب: 24) یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اپنے دلوں میں قربانیوں کی راہ میں اپنا جان مال فدا کیا اور دیکھو کیسے مطمئن ہو گئے۔ قَضٰى نَحْبَهٗ مدتوں کی آرزوئیں پوری کرلیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو انتظار میں بیٹھے ہیں کب خدا ہماری حسرتیں پوری کرنے کے سامان کرے گا۔تو دیکھو تَكَاثُرُ تو تَكَاثُرُ ہی ہے مگر نیتوں نے ان دونوں تَكَاثُرُ کی قسموں میں کتنا زمین آسمان کا فرق ڈال دیا۔ایک تَكَاثُرُ ہے نیک ارادوں کی خاطر، نیک راہوں پر خرچ کرنے کے لئے۔اسی طرح اولاد کا حال ہے۔آنحضرت ﷺ

نے بھی اپنی امت کے لئے کثرت کی دعا مانگی بلکہ نصیحت فرمائی کہ ایسی عورتوں سے شادی کرو جو وَلُودًا وَدُودًا ہوں محبت بھی بہت کریں تم سے اور بچے بھی بہت پیدا کریں۔ اس لئے بسا اوقات جب فیملی ملاقات میں مَیں اچھے خوش جوڑوں کو دیکھتا ہوں ان سے کہتا ہوں اور بچے پیدا کرو۔ وہ سمجھتے ہیں میں مذاق کر رہا ہوں حالانکہ مذاق و ذاق نہیں، میرے ذہن میں ہمیشہ یہی رسول اللہ ﷺ کی نصیحت ہے اور مجھے بھی خوشی ہوتی ہے احمدی بچے پیدا کر کے بھی بڑھیں اور تبلیغ کے ذریعے سے بھی بڑھیں اور خوب نشوونما پائیں کیونکہ یہی تو ہیں جن کے ساتھ دنیا کا امن وابستہ ہو چکا ہے دنیا کا نیک انجام اب ان پر اپنی بناء رکھتا ہے۔ یہ قائم رہیں گے تو دنیا کا نیک انجام قائم رہے گا، اس کی امیدیں قائم رہیں گی۔ اگر یہ کمزور ہو گئے یہ مٹ گئے تو دنیا کے نیک انجام کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔

پس اپنی قدروں کو جو اس آیت کے حوالے سے میں نے آپ پر کھولی ہیں ان کو پہچانو اور ہر وہ اندھیرا جس کا ان آیات میں بیان ہوا ہے اس کے قلع قمع کرنے، اس کو اپنے سینے سے نوچ پھینکنے کی کوشش شروع کر دو اور یہ تفصیل اس لئے میں بیان نہیں کر سکتا بعض پہلے خطبوں میں میں نے بسا اوقات تفصیل سے بھی یہ بیماریاں بیان کی ہیں اس لئے کہ اگر ایک دفعہ شروع ہو جائے تو یہ سلسلہ پھر ختم ہی نہیں ہوگا۔ انسان کس کس قسم کی اندرونی روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے کیسی کیسی غلط فہمیاں اپنی ذات کے متعلق رکھتا ہے اپنی اولاد کے متعلق رکھتا ہے، اپنے پیاروں سے جو امیدیں وابستہ کر لیتا ہے، اپنے دشمنوں کے متعلق کیا کیا غلط رویے اختیار کرتا ہے، ایسا مضمون ہے جو ساری انسانی زندگی پہ محیط ہے۔ کس کس کو بیان کروں اور کس کس کو چھوڑوں۔ اس لئے اصولاً میں نے آج آپ کے سامنے وہ خلاصہ پیش کر دیا ہے جو قرآن کریم نے نکالا ہے۔ تین قسم کے اندھیرے ہیں جو اگر تم پر چھا گئے تو تمہارے کانوں پر بھی مہر لگ جائے گی، تمہارے دلوں پر بھی مہر لگ جائے گی اور تمہاری آنکھوں پر پردے پڑ جائیں گے۔ پھر دیکھ بھی نہیں سکو گے کہ تمہارا مفاد ہے کس چیز میں۔ دیکھو گے بھی تو غلط فیصلے کرو گے کیونکہ قوت ادراک بیمار ہو چکی ہوگی۔ دل وہ قوت ادراک ہے جو ان پیغامات کو پرکھتا ہے اور ان سے نتائج اخذ کرتا ہے جو آنکھ یا کان کے سوراخ سے انسان کے اندر داخل ہوتے ہیں اور بھی ذرائع ہیں مگر یہی دو ہیں جن پر بناء ہے، اصل ہے فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا

(الدھر:3) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سب سے بڑا احسان جو انسانی نفس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ دیکھو تم ماں کے پیٹ میں کس حیثیت میں تھے اندھے۔ تین قسم کے اندھیروں میں گھرے ہوئے۔ اب وہاں بھی دیکھو تین اندھیروں کا ذکر ملتا ہے اور اچانک کیا دیکھتے ہو کہ تم ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہو۔ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا اس بچے کو ہم نے سمیع بھی بنا دیا اور بصیر بھی بنا دیا۔ وہ سننے بھی لگ گیا اور دیکھنے بھی لگ گیا اور سمیع کو پہلے رکھا ہے اور بصیر کو بعد میں۔ اس میں اور بھی حکمتیں ہیں مگر ایک یہ بھی ہے کہ ماں کے پیٹ سے بچہ پہلے سننا شروع کرتا ہے بعد میں دیکھنے لگتا ہے اور شروع میں ماں کے پیٹ میں بچے کا بیرونی دنیا سے رابطہ صرف کان کے ذریعے ہے اور جب باہر نکلتا ہے پھر آنکھیں کھلتی ہیں ورنہ پیٹ میں تو آنکھیں ہوں بھی تو دکھائی کچھ نہیں دیتا اندھے کا اندھا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا باہر آیا تو ہم نے اسے سننے والا بھی بنا دیا اور دیکھنے والا بھی بنا دیا اور آواز کے ذریعے ماں کے پیٹ میں پیغام دینے کا نظام خدا تعالیٰ نے جاری فرمایا ہے اسی لئے اس زمانے میں دعاؤں کا ذکر ہے ذکرِ الٰہی کا ذکر ہے کیونکہ بچہ ان باتوں کو سنتا ہے اور بسا اوقات جو ماحول میں شور پڑ رہا ہے اس سے بداثر قبول کرتا ہے۔ ماحول میں پُرسکون باتیں ہو رہی ہیں اس سے سکون حاصل کرتا ہے اور اب تو سائنس دانوں نے اس کی تحقیق کر کے اسے واہمے کا حصہ نہیں بلکہ ایک حقیقت میں سائنسی دریافت کا حصہ بنالیا ہے، قطعی طور پر ثابت شدہ حقیقت ہے۔

تو سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ہے یہ دو چیزیں ہیں جن کے ذریعے انسان تمام ماحول، گرد و پیش بلکہ بہت دور دور کی باتیں بھی اخذ کرتا ہے اور لیکن اگر اندر اس کے تجزیے کے لئے دماغ نہ ہو تو آنکھیں کھلی ہیں، کان موجود ہیں لیکن کہتے ہیں جی اس کا دماغ Dead ہو گیا ہے آکسیجن جانی بند ہو گئی اور وہ دماغ جس نے ساری کمپیوٹنگ کرنی تھی وہ کرنے سے عاری ہو گیا حالانکہ آنکھ دیکھ رہی ہے کان سن بھی رہے ہیں ان کا نتیجہ کوئی نہیں نکل رہا۔ وہی آنکھ اندھی نہیں ہوئی ہوتی بلکہ جو دیکھتی ہے اس کا پیغام اندر نہیں پہنچتا جو وہ کان سنتے ہیں اس کا کوئی مقصد دماغ حاصل نہیں کرتا کہ کیا سنا جا رہا ہے۔ یہی نقشہ ہے قرآن کریم نے جو کھینچا ہے کہ پھر ایسے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اندھے ہو جاتے ہیں، وہ بہرے ہو جاتے ہیں، ان کے دل مہر زدہ ہیں ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ جو کچھ گرد و پیش میں دیکھ رہے ہیں اس سے استفادہ کر سکیں۔

پس ان خطرات کے خلاف آپ بیدار ہو جائیں اپنے آپ کو ان پیغامات کے سمجھنے کی صلاحیت کے ساتھ زندہ رکھیں کیونکہ اگر یہ صلاحیت مرگئی تو آپ مر جائیں گے۔ وہ پیغامات جو آپ کے کان سنتے ہیں وہ پیغامات جو آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں ان دونوں صلاحیتوں کو زندہ رکھیں تو لازم ہے کہ آخر پر جو ان سے نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ نتیجہ نکالنے کی صلاحیت کو بھی زندہ رکھا جائے ورنہ فائدہ کچھ نہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز کچھ لوگ دیکھتے ہیں دو مختلف نتیجے نکالتے ہیں اور وہاں دل کی مہر کی بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ بہت سے بچے ہیں جن کے مزاج اس لئے بگڑے ہیں کہ انہوں نے ٹیلی ویژن کے اوپر جرائم دیکھے ہیں اور قتل و غارت دیکھا ہے اور فخر دیکھا ہے کہ اس طرح کسی نے کسی کو مارا اور پھر فخر کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ وہ بچے ایسے بھی ہیں، اکثر آج کل کی دنیا میں ایسے بچے ہیں جو اس کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیتے ہیں کیونکہ ان کو روزمرّہ اپنے گھر میں تفاخر کی عادت ہوتی ہے چھوٹے بچے کو Bully بنانے کی عادت پڑی ہوئی ہوتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بغلیں بجانے کی عادت پڑی ہوئی ہوتی ہے۔

پس وہ بیج جو بچپن ہی سے گھر میں بیمار بن کر اٹھ رہا ہے اس سے جب کونپلیں پھوٹیں گی تو ضرور بیمار پھوٹیں گی۔ بارش تو ایک ہی طرح کی ہے مگر بعض جگہ زہریلے پودوں کی نشوونما کو بڑھاتی ہے بعض جگہ اچھے پودوں کی، صحت مند پودوں کی نشوونما کو بڑھاتی ہے۔ پس ایسے بچے جب وہ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں اچھا یہ بات ہوئی اور اگر وہ پکڑا گیا بے ایمان تو کہتے ہیں ہم نے یہ چالاکی کرنی ہے، ہم نہیں پکڑے جائیں گے اور ارادے کر کے بچپن سے ہی دلوں میں جرموں کی تمنائیں پالنے لگتے ہیں اور جب بڑے ہو کر باہر نکلتے ہیں تو پھر ان سے یہی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ کچھ ایسے شریف النفس بچے بھی ہیں جن کے گھر کا ماحول پاکیزہ ہے اور پیارا ہے وہ ان کو دیکھ کر متنفر ہوتے ہیں ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگر ہمیں توفیق ملے تو ہم ایسے ذلیل لوگوں کو پکڑ کر ان کو کیفر کردار تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ جو جوابی کارروائی کرنے والی طاقتیں ہیں ان کا دل ان کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ گھروں میں ہو رہا ہے۔ آپ نے جس طرح اپنے بچوں کو پالا ہے آپ ہی اگلی قوم کے اگلے حصے کی تقدیر بنا رہے ہوتے ہیں ٹیلی ویژن وغیرہ تو بعد میں آئیں گے۔

بچپن سے آپ کے رجحانات کو بچے جو پڑھتے ہیں آپ کی اداؤں کو جو دیکھتے ہیں یہ جانتے

ہیں کہ آپ کا حقیقی لطف کس چیز میں ہے۔ دنیا کی دولت میں ہے یا اچھی پیاری باتوں کے تذکرے میں ہے۔ خدا اور رسولؐ کے ذکر میں آپ کو مزہ آ رہا ہے یا بے ہودہ باتوں میں۔ ایسے لوگ اپنے بچوں کی تقدیر بنا دیتے ہیں خواہ ان کا ارداہ ہو یا نہ ہو خود بخود بنتی ہے۔ اب یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ ہماری نئی نسل کے لئے اللہ تعالیٰ نے MTA کا نظام جاری فرما دیا اور اب وہ بگڑے ہوئے ماں باپ جن کی دلچسپیاں دوسری ہیں اپنے بچوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں یعنی منفی رنگ میں اثر انداز ہونے کی اور بچوں کو عادت پڑ گئی ہے احمدیہ ٹیلی ویژن کی۔ اب ماں باپ دوسری لگانے لگیں تو کہتے ہیں نہیں بالکل نہیں لگانی ہم نے تو یہی دیکھنی ہے اور بعض ماں باپ کی اصلاح بچے شروع کر چکے ہیں۔ تو یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے جب عالمی ذمہ داریاں ہم پر ڈالی ہیں تو عالمی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنے کے سامان بھی وہ خود فرما رہا ہے۔

اور میں تو محض قرآن کریم کی نصیحتوں کی طرف اشارے کر کے آپ کو بار بار متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں مگر مجھے دل میں یقین ہے کہ خدا کے ہاں آسمان پر یہ فیصلے ہو چکے ہیں۔ اللہ کی یہ تقدیر خوب کھل کر ظاہر ہو گئی ہے کہ آج دنیا کی تقدیر جماعت احمدیہ سے وابستہ ہو چکی ہے اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کے دین اور آپؐ کی سنت کا غلبہ اب اگر دنیا میں ہوگا اور ضرور ہوگا تو جماعت احمدیہ ہی کی خاطر ہوگا جماعت احمدیہ کے وسیلے سے ہی ہوگا۔ پس اپنے دل کو ہر قسم کی ظلمات سے پاک وصاف کر لیں تا کہ محمد مصطفی ﷺ کا نور جو آپ نے تمام تر خدا سے پایا ہے وہ ہمارے سینوں کو روشن کر دے، منور کر دے اور ہمیشہ کے لئے وہاں اپنی جگہ بنا لے تا کہ ظلمات پھر ان سینوں میں جھانک بھی نہ سکیں۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جب بھی خدا کے لئے خرچ کریں اپنے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں اس میں کتنی محبت پھوٹی ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 26 /اپریل 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۲﴾

(ابراہیم: 32)

پھر فرمایا:

آج چھبیس (26) اپریل ہے اور چند دن پہلے شیخ ناصر احمد صاحب سوئٹزرلینڈ والے جو ہمارے سلسلے کے پرانے مبلغ رہے ہیں اور ساری عمر خدمت دین میں انہوں نے صرف کی ہے ان کو بہت سی باتیں ایسی ہیں جو یاد رہتی ہیں اور وقت پر یاد دلاتے بھی رہتے ہیں چنانچہ ان کا خط آیا کہ وہ 26 اپریل کا دن طلوع ہونے والا ہے جو منحوس بھی تھا اور بہت مبارک بھی تھا اور واقعۃً یہی ہے کہ اس دن کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ ایک ایسا منحوس دن طلوع ہوا جو بہت ہی مبارک ثابت ہوا مگر بیک وقت بعضوں کے لئے منحوس اور بعضوں کے لئے مبارک۔

آج جمعہ کا دن ہے اور چھبیس (26) اپریل کا وہ دن ہے جب 1984ء کو ضیاء الحق پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر نے ایک ظالمانہ آرڈیننس کے ذریعے جماعت احمدیہ کی آزادیاں چھینیں اور ان آزادیوں کی چوٹ آزادی ضمیر پر تھی۔ اصل میں پیغام حق سنانے پر ضربیں لگائی گئی تھیں۔ ہر ممکن کوشش کی گئی تھی کہ جماعت احمدیہ کو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کا اعلان

کرنے سے روک دیا جائے اور زبان کی حد تک یہ پابندیاں نہیں لگائی گئیں بلکہ یہاں تک بھی اس آرڈیننس میں ان پابندیوں کو سخت کرنے اور احمدیوں کو جکڑنے کا خیال رکھا گیا کہ کوئی احمدی اپنی طرز سے بھی، اگر بولے نہ بھی محض اپنی طرز زندگی ہی سے مسلمان دکھائی دے تو یہ بھی اس کا جرم ہوگا تا کہ احمدیت کا اسلام سے تعلق کلیۃً ہر پہلو سے کاٹ دیا جائے صوتی لحاظ سے بھی اور تصویری لحاظ سے بھی۔ یہ اس آرڈیننس کا آخری مقصد تھا اور اس کے بعد جو حالات رونما ہوئے ہیں اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ سب سے منحوس دن ثابت ہوا ہے۔ اس دن کے بعد پھر پاکستان کی ساری برکتیں ایک ایک کر کے اٹھائی گئیں۔ ہر اچھی بات پاکستان سے رخصت ہوئی جیسے پرندہ گھونسلے کو چھوڑ دیتا ہے ویسے ہی ہر نیکی، ہر خوبی، ہر اعلیٰ قدر پاکستان کو چھوڑنے لگی اور اب وہ فسادات کا ایک ایسا اکھاڑہ بن گیا ہے کہ نہ دوست کو دوست پر اعتبار رہا ہے نہ دشمن سے کسی خیر، کسی انسانی قدر کی کوئی دور کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔ کوئی قانون حائل نہیں رہا، کوئی انسانی قدر کا ضابطہ حیات ایسا نہیں جو پاکستان کے عوام کو دوسرے عوام کے حقوق سلب کرنے سے باز رکھ سکے۔

ہر ایک کی کوشش ہے اور کھلی کوشش ہے ایک انگریزی محاورہ ہے Free for all اب آئے دن اخباروں میں یہ خبریں شائع ہوتی ہیں کہ حکومت کی غنڈہ گردی ہے یا عوام کی غنڈہ گردی ہے یا کسی سیاسی پارٹی کی غنڈہ گردی ہے یا بعض مفاد پرستوں کی غنڈہ گردی ہے کسی نہ کسی ایک کی غنڈہ گردی کے الزام تو آپ کو ملتے ہیں اور حقیقت میں اس کے دفاع میں کبھی بھی کوئی قطعی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ سب کی ہے، سارے ملوث ہیں۔ Free for all ہے اور مظالم کی داستان ایسی بھیانک ہے کہ اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں پر مظالم، ناموس کی حفاظت کرنے والے اداروں کا غریبوں اور بے کسوں کی ناموس سے کھل کھیلنا اور ایسے ظالمانہ طریق پر ان کی عصمتوں کو پامال کرنا کہ دنیا کے کسی ملک میں جہاں جنگ جاری نہ ہو عام امن کے حالات ہوں ایسے واقعات آپ کو دکھائی نہیں دیں گے۔ ساری دنیا کے جغرافیہ پر نظر ڈال کر دیکھ لیں اس طرح آئے دن ان اداروں کی طرف سے جو اس بات پر مامور ہیں کہ وہ انسانوں کی عزت، مال، جان، مکان کی حفاظت کریں گے ان کی طرف سے عزت، جان، مال اور مکان پر ایسے حملے ہو رہے ہوں بلکہ ان سے بڑھ کر معصوم عورتوں کی ناموس پر ایسے حملے ہو رہے ہوں کہ کھلم کھلا بازاروں اور گلیوں میں شیطانی

ناچ ناچے جائیں اور کوئی نہ ہو جو ان کو روک سکے۔ یہ ساری نحوستیں اس دن کی نحوستیں ہیں اور مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ کوئی تحریک ان کو روک نہیں سکتی، کوئی عدالتی کوشش ان کو روک نہیں سکتی، کوئی قانونی کوشش ان کو روک نہیں سکتی، کوئی سیاسی پروگرام ان بدبختوں کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایسے انسان، ایسے بدبخت دل کی کمائی ہوئی بدبختیاں ہیں جس نے خدا کی ناراضگی مول لی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی قوم کی قوم مول لے لے، صرف ایک شخص نہیں اس کی متابعت میں ساری قوم قبول کرلے تو اس کو پھر کوئی بچانے والا نہیں۔

پس آج کے دن سب سے پہلی جو تنبیہ ہے اور ضروری ہے کہ اس تنبیہ کو بار بار دہرایا جائے وہ یہی ہے کہ میں اپنی قوم کو متنبہ کرتا ہوں، ان کے دانشوروں کو، جن میں کچھ دانش باقی ہے کہ غور کر کے دیکھیں تو سہی کہ ان سارے ظلموں کی جڑ ہے کہاں؟ 26/اپریل کے دن جو منحوس فیصلہ ہوا ہے ان تمام نحوستوں کی جڑ اس فیصلے میں ہے اور اس کا ایک قطعی ثبوت یہ بھی ہے کہ جس نے خدا کے نام پر اور اسلام کی محبت کا دعویٰ کر کے اور ایک خادم اسلام کا روپ دھار کر یہ کارروائی کی خدا کی تقدیر نے اس کے پرخچے اڑا دیئے اس کی خاک اڑ گئی اس کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ ایک بھیانک آواز کے ساتھ وہ آسمان پر پھٹا ہے اور اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر بگولوں کی نظر ہوگیا۔ ایک جبڑے کا نشان ہے مگر وہ بھی مصنوعی ہے جس کو ڈنچر کہتے ہیں اس کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی محبت میں قربانیاں پیش کرنے والے، اپنے دین کے دفاع کے لئے عظیم کارنامے کرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کیا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی انگلی نے تو نشاندہی کر دی ہے، دکھا دیا ہے کون بدبخت تھا، کس کی نحوست ہے جو آج تک ساری قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ جب تک اس فیصلے کو تبدیل نہیں کرو گے تمہارے دن پھر نہیں سکتے ناممکن ہے۔

مگر یہ ایک بابرکت دن بھی تھا اور اس کی برکتیں اسی آسمان سے نازل ہو رہی ہیں جس آسمان نے اس ظالم کی خاک اڑا دی اور دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ یہ MTA جسے ہم کہہ رہے ہیں یہ حقیقت میں وہ آسمان سے نازل ہونے والی برکتیں ہیں جو نور کی صورت میں اتریں اور اتر رہی ہیں اور تصویروں میں ڈھل رہی ہیں اور آوازوں میں ڈھل رہی ہیں اور دن بدن زمین کے کناروں تک یہ تصویریں اور یہ آوازیں پہنچتی چلی جارہی ہیں۔ پہلے سے زیادہ عمدگی اور قوت کے

ساتھ ان کے پہنچانے کے انتظامات ہو رہے ہیں اور اب تو خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جیسا کہ یورپ میں چوبیس گھنٹے MTA کا نظام جاری ہوا اور ہر لمحہ جب بھی کوئی احمدی اپنا ٹیلی ویژن On کرے گا یعنی کھولے گا اسے اسلام کی حمایت میں کوئی نہ کوئی آواز اٹھتی ہوئی دکھائی دے گی، کوئی نہ کوئی دینی پروگرام ضرور دکھائی دے گا۔

آج کے دن میں اہل پاکستان اور اہل ہندوستان اور اہل بنگلہ دیش اور دیگر ایشیائی ممالک کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ آج کے دن ایشیا کا پروگرام بھی چوبیس گھنٹے کا کیا جا چکا ہے۔ رات بارہ بجے جب کہ مغربی دستور کے مطابق، جمعہ کا دن طلوع ہو رہا تھا وہ دن احمدیہ MTA کے چوبیس گھنٹے تک مشرق میں جاری رہنے کی خوشخبری لے کر طلوع ہوا ہے یعنی سورج کے لحاظ سے طلوع نہیں بلکہ دن کے حساب کے لحاظ سے وہ دن چڑھا ہے عین بارہ بجے اور اس وقت سارے مشرق میں خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ احمدی MTA کا پروگرام چوبیس گھنٹے کا ہو چکا ہے۔ جو اس وقت پاکستان میں میری آواز سن رہے ہیں یا ہندوستان میں یا بنگلہ دیش میں اس غلطی سے اپنے ٹیلی ویژن بند نہ کریں کہ ساڑھے تین گھنٹے میں یہ پروگرام ویسے ہی ختم ہو جائے گا۔ اب رات کے جس حصے میں بھی چاہیں صبح کے جس لمحے میں بھی ان کے دل میں خواہش اٹھے صرف وہ اپنا سوئچ On کریں اور ان کو خدا تعالیٰ کے فضل سے MTA کے پروگرام دکھائی دے رہے ہوں گے۔

امریکہ میں بھی یہ ہو چکا ہے اور ایک حصہ کچھ باقی ہے یعنی افریقہ کا وہ حصہ جس کے لئے ہمارا، جس کو کہتے ہیں عالمی نظام جس کے تحت افریقہ میں بھی اور باقی دیگر ممالک میں بھی یکساں آسمان سے نور کی بارش اترنی ہے اس میں ابھی کچھ تاخیر تھی اس وجہ سے افریقہ کو ہم نے ابھی شامل نہیں کیا لیکن یہ جو کوشش کی گئی کہ عارضی طور پر افریقہ بھی شامل ہو جائے اس کے رستے میں کچھ روکیں پڑتی رہیں اور بالآخر یہی بات بہتر نظر آئی کہ افریقہ کو عارضی انتظام میں شامل نہ کیا جائے لیکن میں امید رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ اس جلسہ سالانہ سے پہلے پہلے آپ کو یہ خوش خبری بھی سنا سکوں گا کہ وہ عالمی نظام جس کو وہ گلوبل ٹرانسمشن کہتے ہیں یعنی ایسا Transponder جو پورے گلوب پر اپنی روشنی پھینکتا ہے اور وہ ہے بھی اس موجودہ نظام سے بہت طاقتور، اس گلوبل نظام کے ذریعے یعنی کرۂ ارض پر یکساں نور اتارنے کے لئے جب انشاء اللہ تعالیٰ MTA پاکستان اور ہندوستان میں دکھائی دے گا تو

افریقہ کے ممالک میں بھی دکھائی دے گا اور آسٹریلیا میں بھی دکھائی دے گا اور جاپان میں بھی دکھائی دے گا، انڈونیشیا میں بھی بالکل صاف اور واضح دکھائی دے گا۔ غرضیکہ شاید ہی کوئی ایشیا یا افریقہ کا ملک ایسا رہ جائے جہاں وہ عام ڈش انٹینا پر صاف دکھائی نہ دے جہاں نہیں دے گا وہاں ذرا ڈش انٹینا کا سائز بڑا کرنے کی ضرورت ہوگی اور وہاں بھی وہ دکھائی دینے لگے گا۔

مگر اب تک جتنے بھی ایسے نظام جاری ہیں خدا تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو جو عطا کیا ہے وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے اور کوئی نظام موجود ہی نہیں ہے جو ہم لے سکتے اور پھر آئندہ ساڑھے پانچ سال تک کا معاہدہ ہو چکا ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اب آئے دن کی یہ سر دردی کہ Transponder بدلا ہے یا سیٹلائیٹ بدلا ہے اس لئے اب اپنی ڈشوں کے رخ بدلیں اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہ نظام انشاء اللہ اس صدی کے آخر تک بھی چلے گا اور اگلی صدی کا پہلا حصہ بھی دیکھے گا۔ چنانچہ اگلی صدی میں دو سال تک بلکہ اڑھائی سال تک یہ نظام جاری رہے گا۔ تو اس لئے میں آپ کو یہ خوشخبری دیتا ہوں اور سمجھا رہا ہوں کہ خدا کی تقدیر بعض دنوں کو بیک وقت منحوس بھی بناتی ہے اور بابرکت بھی بناتی ہے اور ایک ہی دن کا منحوس ہونا، ایک ہی دن کا مبارک ہونا، بعضوں کے لئے منحوس ہونا، بعضوں کے لئے مبارک ہونا یہ صداقت کا ایک ایسا عظیم الشان نشان ہے جس پہ انسان کا بس نہیں ہے، اسے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ تقدیر ہی ایسے دن تراشا کرتی ہے۔ آسمان ہی سے وہ طاقتیں اترتی ہیں جو بعض گھروں اور بعض ملکوں پر نحوستیں بن کر اترتی ہیں اور بعض گھروں اور بعض ملکوں پر خدا تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں بن کر اترتی ہیں۔

اب دیکھنے والے کی آنکھ ہے جیسا بھی دیکھے یہ نشان تو کھلے کھلے ہیں روز روشن کی طرح بات ظاہر ہوگئی ہے۔ مگر جس نے نہ دیکھنا ہو اس کی آنکھیں اندھی رہتی ہیں۔ دعا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نور بصیرت عطا فرمائے، دعا ہی ہے کہ اللہ ان کے دلوں کے تالے کھولے کیونکہ اس کے بغیر دیکھیں گے بھی تو اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ سنیں گے بھی تو پیغام کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکیں گے۔ پس ایک تو یہ خوش خبری تھی جو میں نے آپ کو سنانی تھی۔ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ اب ہم پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور دیگر مشرقی ممالک میں چوبیس (24) گھنٹے کا پہلا ٹیلی ویژن سٹیشن پیش کر رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی وہاں نہیں ہوا۔ بڑی بڑی حکومتیں ہیں، بڑے بڑے نظام جاری

ہیں مگر چوبیس (24) گھنٹے مسلسل ٹیلی ویژن جو چوبیس (24) گھنٹے اللہ کا ذکر کرے، چوبیس (24) گھنٹے دینی پروگرام پیش کرے اس کی کوئی مثال دنیا میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

وہ سیٹلائیٹ کے ڈائریکٹر جن سے گفت وشنید ہو رہی تھی ان سے ہم نے درخواست کی تھی کہ ہمیں جو آپ نے وقت دیا ہے اس سے پہلے کر دیں کیونکہ لوگوں کے شوق بڑے بڑھے ہوئے ہیں اور بھوک اتنی تیز ہوگئی ہے کہ اب ان سے برداشت نہیں ہوتا اور آئے دن خط ملتے ہیں کہ بس کرو، جلدی کرو اور جلدی کرو کب تک انتظار کراؤ گے۔ انہوں نے ایک خوشخبری یہ دی کہ یہ انتظام تو مکمل ہوگیا ہے اور دوسری خوشخبری یہ دی کہ وہ جو عالمی نظام تھا جس کو یہ کہتے تو ہیں کل کُرّہ کا لیکن عالمی نظام سے مراد صرف اتنا ہے کہ ایک طرف کا نصف کُرّہ زمین پورے کا پورا اس نظام میں شامل ہو جاتا ہے۔ پس اس کی بھی ساتھ انہوں نے یہ خوش خبری دی اور کہا کہ مزید خوش خبری یہ ہے کہ آپ سے جو ہم نے وعدہ کیا تھا کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو یہ پروگرام شروع کریں گے ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ غیر معمولی حالات میں ہمیں توفیق ملی ہے کہ ایک مہینہ پہلے شروع کر دیں گے۔ اب اس پر پیغام سننے والے نے کہا میں آپ کا بے حد ممنون ہوں بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں آپ نے اتنی اچھی خبر سنائی مگر مجھے اپنے بڑے ڈائریکٹر کا پتا دیں تا کہ میں ان کو شکریے کا خط لکھوں۔ انہوں نے جواب دیا شکریے کا خط ان کو کیا لکھو گے، جو ہمیں دکھائی دے رہا ہے یہ تمہارے اللہ نے تمہارے لئے کیا ہے اس لئے شکریہ ادا کرنا ہے تو اپنے خدا کا کرو۔ ایک عیسائی جس کو دنیا میں بظاہر مذہب میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس سے معمولی سا واسطہ جماعت کا ہے وہ بار بار ایسے نشان دیکھ رہا ہے کہ اس کا دل یقین سے بھر گیا ہے کہ اللہ اس جماعت کے ساتھ ہے۔ پس اس کی طرف سے یہ پیغام اتنا پیارا لگا کہ میری آنکھیں جذبہ تشکر سے لبریز ہوگئیں، دل میں تو تھا ہی آنکھوں سے امڈنے لگا کہ اللہ کی شان دیکھیں ایک عیسائی ڈائریکٹر امریکہ سے جہاں احمدیت کا کوئی خاص تعارف بھی نہیں ہے وہ اس موقع پر کہ ہم چاہتے ہیں اس کے بڑے ڈائریکٹر کا شکریہ ادا کریں ہمیں بتا رہا ہے کہ ڈائریکٹر وائریکٹر کی کوئی بات نہیں ہے اپنے اللہ کا شکریہ ادا کرو جو تمہاری حمایت کر رہا ہے غیر معمولی حالات میں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔

پس آج ہی کے مبارک دن یہ خوشخبری بھی ہمیں ملی کہ خدا تعالیٰ دنیا کی آنکھیں کھول رہا ہے۔ ان کو دکھا رہا ہے مگر ’’جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے‘‘ جن کو نظر آنا چاہئے ان کو نہیں دکھائی دے

رہا۔ بالکل اندھے کے اندھے بنے بیٹھے ہیں۔

پس آج کے دن میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے لئے وہ جو پاکستانی ہیں دنیا میں جہاں بھی بستے ہوں پاکستان کی بقاء کی خاطر ان کے لئے دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہوش کی آنکھیں کھولے کیونکہ دن بدن یہ ملک اب ہلاکت ہی کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان کو دکھائی نہیں دے رہا۔ ان کو پتا نہیں لگ رہا کہ ہماری قوم کر کیا رہی ہے۔ اتنی مجرم ہو چکی ہے کہ نیکی، عدل، احسان کا تصور ہی اب اٹھ چکا ہے اور بے حیائی کے ساتھ عام باتیں ہوتی ہیں اس میں۔ اخباروں میں چرچے ہوتے ہیں اور کسی کو کچھ فکر نہیں۔ قاری صاحب ہیں قرآن کریم پڑھنے بچی آتی ہے اس کو اغوا کر کے دوڑے پھرتے ہیں ادھر ادھر اور واپس آ کے جب لوگ پوچھتے ہیں کہ جناب قاری صاحب یہ کیا ہوا انہوں نے کہا کہ بس شیطان غالب آ گیا اتنی سی بات ہے کچھ بھی نہیں کوئی ایسا بڑا واقعہ نہیں ہوا یعنی ساری قوم پر ہی شیطان غالب آ رہا ہے تو وہاں ناموس رہے گی کیا۔ مگر اس دن کو میں اپنے ملک کے حالات کھولنے کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہتا وہ تو روز اخبار میں کھلتے ہی ہیں وہ پردہ دری جو خدا کر رہا ہے اس میں کسی مزید انسانی کوشش کی ضرورت نہیں ہے، دن بدن پردہ دری ہو رہی ہے اور دن بدن پردہ پوشی بھی ہو رہی ہے۔ یہ بھی ایک خدا تعالیٰ کی جاری تقدیر ہے کہ کہیں ستاری کے پردے ڈالتا ہے کہیں سے ستاری کے پردے اٹھا لیتا ہے۔

اور یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے پڑھ کر سنائی۔ اس میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً کا۔ اس تعلق میں اس آیت کے ترجمے کے بعد میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس عظیم MTA کے عالمی نظام کے لئے جو مالی قربانی جماعت احمدیہ نے پیش کی ہے اور جس ولولے کے ساتھ آگے بڑھ بڑھ کر قربانی کی ہے اور جس تاکید کے ساتھ اپنے ناموں کو چھپانے کی درخواستیں کی ہیں۔ اس کی بھی کوئی مثال آپ کو دنیا کے پردے پر کہیں دکھائی نہیں دے گی۔ لوگ دس روپے کا نوٹ دیتے ہیں تو اونچا کر کے دکھا کے دیتے ہیں اور اگر کہیں کیمرہ ہو تو کیمرے کے سامنے اس کو کرتے ہیں کہ نظر آ جائے کہ اس نے دس روپے کا نوٹ پھینکا ہے اور لاکھ لاکھ ڈالر دینے والے بڑی منت سے درخواست کرتے ہیں کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ آپ چندہ ادا کر دیں اور ہمیں مطلع کر دیں بس یہی بہت کافی ہے۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ اس نے کیا دیا ہے۔ لاکھ لاکھ پاؤنڈ دینے والے دے کر چلے جاتے

ہیں۔ مجھے ملتے ہیں مجھ سے بھی ذکر نہیں کرتے کہ یہ رقم ہم نے دین کی خاطر پیش کی ہے اور ہم آپ کو بتا دیں کہ ادائیگی کر چکے ہیں۔ بعد میں جب باقاعدہ عام رپورٹ ملتی ہے تو میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ ابھی کل پرسوں تو یہ لوگ مل کر گئے تھے کوئی اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا اور کھاتوں میں دبی ہوئی یہ رپورٹ نظر آ گئی ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟۔

قرآن کریم نے اسی مضمون کو یہاں پیش فرمایا ہے۔ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کہہ دے کہ اے میرے بندو! الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وہ لوگ جو ایمان لائے ہو۔ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ نماز کو قائم کرو اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے ان کو عطا کیا ہے۔ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً چھپ چھپ کر اور ظاہری طور پر بھی مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ اس دن سے پہلے جس دن سب سودے بند ہو چکے ہوں گے۔ تجارتوں کے دفتروں کو تالے لگ جائیں گے۔ جیسے چھٹی کا دن آ جاتا ہے اور بینک بند ہو جاتے ہیں وہی نقشہ اللہ تعالیٰ کھینچ رہا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے اس دن سے پہلے پہلے کر لو جب بینکوں کے دروازے مقفل ہو جائیں گے جب خدا کی راہ میں پھر کوئی تجارت قبول نہیں کی جائے گی اور کیسے خرچ کرو؟ مخفی ہاتھ کے ساتھ بھی اور کھلم کھلا بھی، چھپ کر بھی اور علانیہ بھی۔

پس MTA کا نظام جو خاموش کہانی بتا رہا ہے ایک یہ کہانی بھی ہے کہ آج بھی خدا کے وہ بندے ہیں اور کثرت کے ساتھ ہیں اور دنیا کے ہر خطے میں ہیں جنہوں نے اتنا بڑا مالی بوجھ اٹھایا ہے مگر ایک آواز بلند نہیں کی کہ ہم ہیں جو یہ چندے دے رہے ہیں۔ ایک فہرست شائع نہیں ہوئی، ایک اعلان نہیں کیا گیا اور اس کے باوجود مسلسل وعدے آتے چلے جاتے ہیں، قربانیاں پیش ہوتی چلی جاتی ہیں، عورتیں ہاتھوں سے زیور اتارتی ہیں، گلوں کے زیور نوچ پھینکتی ہیں اور خدا کی راہ میں پیش کرتی ہیں کہ ہمیں ان میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہی اور کوئی شور نہیں، کوئی مطالبہ نہیں بلکہ تاکید ہے کہ خاموش رہیں۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ یہ بندے پیدا ہو گئے ہیں جن کی خدا نے اس قرآن کریم میں یہ خوشخبری دی تھی اور محمد رسول اللہ ﷺ کو فرمایا تھا کہ اے محمد ﷺ ان سے کہہ دو اے میرے بندو یا عِبَادَ اللّٰهِ نہیں فرمایا عبادی فرمایا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی عظیم تفسیر فرمائی ہے فرماتے ہیں آنحضرت

ﷺ کا ایک عجیب مرتبہ ہے خدا کی کامل نمائندگی کا حق آپ کو دیا گیا اور چونکہ تمام عبادت کے حق، تمام عبادت کے اسلوب بنی نوع انسان نے آپؐ سے سیکھے اس لئے خدا کی نمائندگی میں کہتے ہیں۔ یٰعِبَادِیَ اے میرے بندو! محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت پر چل کر ان کے بندے بنو گے تو خدا کے بندے بنو گے یہ اس میں پیغام ہے اور دوسرا یہ پیغام بھی ہے کہ اگر میری غلامی اختیار کرتے ہو تو میں تو ایسا ہوں کہ خدا کی راہ میں سِرًّا بھی خرچ کرتا ہوں علانیہ بھی کرتا ہوں، دن کو بھی کرتا ہوں رات کو بھی کرتا ہوں، مقصد اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ تم بھی اپنی قربانیوں کو یہ رنگ دے دو پھر تم میرے عباد کہلاؤ گے۔

پس اس آیت کا مضمون آج سب دنیا پر حیرت انگیز صداقت کے ساتھ جماعت احمدیہ کی قربانی کی صورت میں پیش ہو رہا ہے اب یہ ماضی کی باتیں نہیں رہیں آج بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے ایسے عباد ہیں جو آپ کے نقشِ قدم پر چل کر وہ رنگ سیکھ گئے ہیں جو آپؐ کے رنگ تھے۔ آج بھی کروڑ ہا کی قربانیاں پیش کرنے والے ایسے خاموش ہیں کہ ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی مگر سارے عالم میں اللہ اور محمدؐ کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ یہ وہ قربانی کا رنگ ہے جو اسلام نے ہمیں سکھایا۔ پس اس سے زیادہ پیارا، اس سے زیادہ عظیم، اس سے زیادہ دائمی حسن والا مذہب اور کوئی دنیا میں نہیں ہے جو ہر وقت، ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا ہے اور محض تاریخی قصوں کے طور پر اپنی عظمتیں بیان نہیں کرتا مستقبل کے متعلق بھی بتاتا ہے کہ ایسا ہوگا آخرین میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے اور ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کے تعلق میں میں آپ کو اب یہ بھی سمجھانا چاہتا ہوں کہ خدا کی خاطر خرچ کرنا اور خاموش رہنا یہ آتا کیسے ہے اور کیسے اس اعلیٰ قدر کی حفاظت کی جانی چاہئے۔ وہ کیا کرنا چاہئے جس کے نتیجے میں ہماری یہ صفت دائمی ہو جائے اور اس میں پھر کوئی تنزل نہ آئے۔ سوال یہ ہے کہ جب بھی کوئی انسان اپنے عزیز مال کو کسی بات پر خرچ کرتا ہے تو کوئی مقصد اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ صرف پاگل ہے جو اسے پھینکتا ہے ورنہ کوئی ادنیٰ سودا کرتا ہے کوئی اعلیٰ سودا کرتا ہے کوئی کم قیمت لے لیتا ہے کوئی زیادہ قیمت لے لیتا ہے مگر قیمت کے بغیر انسان مال خرچ نہیں کرتا۔ ہاں ایک قیمت ہے جو تحفے کا رنگ رکھتی ہے وہ قیمت ہے جس میں محبت ملتی ہے اور کوئی مادہ چیز ہاتھ نہیں بدلتی ورنہ تجارتوں میں ورنہ دوسرے سودوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مادی قدر ہے جو روپے خرچ کرنے کے بدلے میں ملتی

ہے آپ کہیں گے ٹیکس جب ہم دیتے ہیں تو کیا قدر ملتی ہے جب ٹیکس دیتے ہیں تو ساری قوم کی طرف سے جو تحفظ ملتا ہے جو بنی نوع انسان کے فائدے کے، رفاہ عامہ کے کام کئے جاتے ہیں ملکوں میں جو حفاظت کا نظام قائم ہے فوج اور پولیس کے ذریعے اور عدلیہ کے ذریعے ان کے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ وہی جو ہم ٹیکس دیتے ہیں اس کی قیمت ہے۔ پس یہ وہم ہے کہ ہم بغیر قیمت کے اپنا روپیہ پھینک سکتے ہیں سوائے ایک سودے کے جو محبت کا سودا ہے جو عشق کا سودا ہے اور اگر محبت اور عشق کا سودا خدا سے ہے تو پھر دنیا کو دکھانے کا کوئی تصور بھی ذہن میں نہیں آنا چاہئے، نہ آ سکتا ہے کیونکہ وہ محبت کا تحفہ جو دنیا کو دکھا کر دیا جائے جس کو پیش کیا جاتا ہے اس کے ہاں قبول کے لائق ہی نہیں رہتا، اسے ردّ کر دیتا ہے کیونکہ ایک چیز کی آپ دو مختلف سمتوں سے قیمت وصول نہیں کر سکتے۔ جس کو بیچا ہے اس سے قیمت وصول کر سکتے ہیں لیکن ارد گرد کھڑے ہوئے گاہکوں سے آپ اس کی قیمت وصول کر لیں اور بیچیں کسی اور کو یہ ناممکن ہے۔ پس جب بھی آپ خدا کی راہ میں چندہ دیتے ہیں تو یاد رکھیں یہ چندہ اگر خدا کی خاطر اور اس کی محبت کی وجہ سے نہیں دیا جا رہا تو آپ کا مال ضائع ہو گیا۔ یہ ایک ایسا سودا ہے جو پاگل کا سودا ہے اس نے روپیہ پھینکا اور اس کے بدلے میں اسے کوئی قدر بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اسی لئے قرآن کریم ایسے لوگوں کو سب سے زیادہ گھاٹا پانے والا بیان فرماتا ہے۔ بڑے بیوقوف لوگ ہیں جس کے منہ کی خاطر یہ قربانی کی وہ منہ تو جیتا نہیں۔ اس منہ کا فیض تو پایا نہیں اور دنیا کی نظر میں وہ مال دکھا کر ان سے کچھ بھی ان کو نہ ملا سوائے اس کے کہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم قابلِ تعریف ہو گئے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ دکھاوا کرنے والا کبھی بھی قابلِ تعریف نہیں ہوتا۔

یہ عجیب بات ہے خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ایک ایسا قانون بنا دیا ہے کہ دکھاوے کرنے والے کو کبھی بھی کوئی جزا نہیں ملتی کیونکہ وہ لوگ جو دکھاوے کو دیکھتے ہیں دکھاوے کو سمجھتے بھی ہیں اور جہاں دل میں یہ شک گزرا کہ کوئی دکھاوا کر رہا ہے وہاں اس کی پہلی عزت، پہلی قدر و منزلت بھی دل سے اتر جاتی ہے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ بے وقوفی میں سمجھ رہا ہے کہ میں نے اپنی بڑی شان کمائی ہے آج میں نے لوگوں کو دکھا کر ایک ہزار روپیہ خدا کی راہ میں پھینکا اور لوگ جو ہیں وہ منہ دوسری طرف کر کے یا ہنستے ہیں یا حقارت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں یا گھروں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں بڑا بے وقوف آدمی ہے یہ بھی کوئی طریق ہے چندہ دینے کا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ریاکاری ہے،

دکھاوا ہے، دنیا کے کھیل ہیں اس سے زیادہ کوئی بھی حقیقت نہیں۔ پس نہ دنیا کمائی جاتی ہے نہ دین کمایا جاتا ہے نہ انسان کی محبت جیتتا ہے ایسا شخص نہ اللہ کی محبت حاصل کرتا ہے:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

(مرزا صادق شرر)

یہ شعر ہے جو ایسے لوگوں کے حال پر صادق آتا ہے پس اللہ تعالیٰ بار بار قرآن کریم میں سِرًّا کے ساتھ علانیہ کا بھی ذکر فرماتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر سِرًّا ہی ضروری ہے اور اس قدر کی حفاظت کے لئے لازم ہے کہ ہم چھپا کر پیش کریں تا کہ ہمیں یقین رہے کہ خدا دیکھ رہا ہے اور یہی کافی ہے۔ اگر اس یقین سے ہمارے دل سرور سے بھر جاتے ہیں تو پھر ہمیں علانیہ کا حق ہے ورنہ نہیں اگر ہمارے مخفی ہاتھ کی قربانی ہمیں پوری لذت عطا نہیں کرتی بلکہ خلا سا محسوس کرتے ہیں تو پھر اگر ہم نے علانیہ قربانی کی تو مخفی قربانی میں جتنا نیکی کا حصہ تھا وہ بھی ضائع ہو جائے گا کیونکہ علانیہ پھر جب جائے گا وہ نیت کے اندر ایک بیماری کا کیڑا ہے جو بالآخر نیت کو کھا جاتا ہے۔ پس قرآن کریم نے سِرًّا کو اس لئے پہلے رکھا ہے اور عَلَانِيَةً کو اس لئے بعد رکھا ہے کہ یاد رکھو مخفی قربانی اصل ہے۔ خدا کی خاطر، صرف خدا کی خاطر قربانی کرو کوئی اور دیکھے نہ دیکھے تمہاری بلا سے کوڑی کا بھی فرق نہ پڑتا ہو۔ ہاں کبھی یہ فرق ضرور پڑ جائے کہ دیکھے تو تمہیں تکلیف محسوس ہو، کسی کو علم ہو تو تم بے چینی محسوس کرو۔ یہ سِرًّا کی قربانی ہے اور ایسی قربانی کرنے والوں کی علانیہ قربانی ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتی ہے بلکہ بعض زائد فائدے اپنے اندر رکھتی ہے۔ پھر ایسے لوگ جو کمزور ہیں جن کو پتا نہیں کہ لوگ بڑھ بڑھ کر کیسی قربانی کر رہے ہیں ان کے اندر جو استباق کی روح ہے وہ بیدار نہیں ہوتی۔

علانیہ کے نتیجے میں دو باتیں پیدا ہو سکتی ہیں اوّل دکھاوے کی خاطر قربانیاں کرنا۔ اس کو تو خدا ردّ ہی کر چکا ہے جب سِرًّا کا ذکر پہلے کر دیا تو دکھاوے کا دور کا بھی تصور اس آیت کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ پھر علانیہ کا دوسرا فائدہ کیا ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک دوسرے سے نیکیوں میں بڑھنے کا جو حکم قرآن کریم نے دیا ہے وہ حکم انسان کو جھنجھوڑ کے جگا دیتا ہے۔ انسان کہتا ہے میں تو غفلت میں پڑا رہا، میرا فلاں بھائی خدا کی راہ میں اتنا آگے بڑھ گیا۔ اس نے یہ قربانی پیش کر دی وہ قربانی پیش کر دی۔ تو

دکھاوے کی خاطر نہیں بلکہ اپنی سابقہ سستی اور غفلت کے ازالے کی خاطر ایسا شخص بیدار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے کثرت کے ساتھ ایسے لوگ پیدا ہونے لگتے ہیں کہ جب وہ بیدار ہوتے ہیں تو پھر دکھاوے کی خاطر علانیہ قربانی سے بات شروع نہیں کرتے بلکہ مخفی قربانی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مخفی قربانی میں لذّت پاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو پھر خدا بعد میں علانیہ کی بھی توفیق بخشتا ہے۔ مگر اگر اعلان ہی نہ ہو، اگر پتا ہی نہ ہو قوم میں کیسے کیسے قربانی کے مظاہرے ہو رہے ہیں تو قوم کا ایک بڑا حصہ اپنی لاعلمی اور غفلت میں سویا رہے گا اور اسے خدا کی راہ میں قربانی پیش کرنے کی تحریک ہی نہیں ہوگی۔

یہ وہ حکمت ہے جس کے پیشِ نظر قرآن کریم نے سِرًّا کے ساتھ عَلَانِيَةً کا مضمون لگایا اور آنحضرت ﷺ کے حوالے سے ایسا کیا۔ قُلْ لِعِبَادِيَ میں یہ مضمون ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اعلان کریں لوگوں میں کہ اے میرے بندو! میں اسی طرح کرتا ہوں تم بھی ایسا کرو۔ عبــادی کہہ کر ’’میں ایسے کرتا ہوں‘‘ کا مضمون بیچ میں شامل کر دیا۔ تم نے مجھے آقا مانا ہے، مجھے مالک بنا بیٹھے ہو۔ اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا ہے میرے ہاتھ پر اپنی ہر چیز کا سودا کر لیا ہے تو پھر جیسے میں کرتا ہوں ویسا تم بھی تو کرو۔ میں ایمان لایا خدا پر، نماز کے حق کو قائم کیا اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہوں مخفی طور پر بھی اور کھلے طور پر بھی۔ پس آنحضرت ﷺ کا ایک مخفی ہاتھ تھا اور وہ ایسا مخفی ہاتھ تھا کہ حدیثوں میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا کیسے وہ ہاتھ چلتا تھا، سوائے اللہ کے کسی کو خبر نہیں لیکن اگر وہ کھلا ہاتھ لوگوں کے سامنے نہ آتا تو صحابہؓ کی کثیر جماعت قربانیوں سے محروم رہ جاتی۔ وہ ہاتھ جو آج تک ہمیں دعوت فکر دے رہا ہے اور قربانی کی دعوتیں دے رہا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ہمیں بلاوے بھیجتا ہے۔ اکثر وہ کھلا ہاتھ ہے جو ہمیں دکھائی دے رہا ہے اور نبوت سے پہلے بھی آپؐ کا کھلا ہاتھ اسی طرح چلتا تھا۔

حضرت خدیجہؓ سے جب آپؐ کا عقد ہوا ہے تو جو کچھ دولت حضرت خدیجہؓ کی تھی وہ آپؐ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دی اپنے لئے کچھ بھی نہیں رکھا اور جو کچھ آپؐ نے حاصل کیا وہ تمام تر ضرورت مندوں اور غرباء میں تقسیم کر دیا اور نہ اپنے پاس کچھ رہنے دیا نہ خدیجہؓ کے ہاتھ میں کچھ رہنے دیا۔ ہاں وہ فن تجارت تھا جو وقتاً فوقتاً دولت کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سے خدا تعالیٰ نے پھر اور برکتیں ڈالیں مگر یہ ایک علانیہ خرچ تھا یہ کوئی بندھا ہوا چھپا ہوا خرچ نہیں تھا۔ یہ وہ خرچ ہے جس کی یاد آج تک دلوں کو کسمساتی رہتی ہے، اس کے اندر مزید قربانیوں کی تحریک پیدا کرتی

چلی جاتی ہے لیکن اس کے علاوہ جو کھلا ہاتھ چلتا تھا جس کا ذکر رمضان کے مہینے کے خطبات میں مَیں نے کیا صحابہؓ کہتے ہیں اس طرح خرچ کرتے تھے جیسے ایک تیز چلنے والی ہوا آندھی بن جائے۔ بہت ہی حیرت انگیز قربانیاں، مالی قربانیوں کے نمونے آپؐ دکھایا کرتے تھے لیکن دکھاتے تھے خدا کی خاطر، بندے کی خاطر نہیں۔ آپؐ کا دل سِرًّا میں تھا اسی لئے راتوں کا اکثر حصہ جاگتے تھے جب کوئی آنکھ آپؐ کو نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی۔ پس سِرًّا کا ذکر نماز کے بعد کرنا ایک یہ بھی معنی رکھتا ہے۔

اوّل تو عبادت کو ویسے ہی انفاق سے پہلے کا حق ہے یعنی مرتبہ اس کا ایسا ہے کہ انفاق سے پہلے ہی اس کا بیان ہونا چاہئے تھا مگر جس کی عبادتیں ایسی ہوں کہ جو سِرًّا بھی ہوں اور عَلَانِیَةً بھی ہوں راتوں کو اٹھ کر بھی ہوں اور دن کی روشنی میں بھی ہوں اس کو حقیقت میں انفاق فی سبیل اللہ کا سلیقہ بھی سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً آتا ہے اور وہ کر سکتا ہے۔ جس کی نمازیں صرف دکھاوے کی ہوں وہ بے چارہ کہاں خدا کی راہ میں مخفی خرچ کر سکے گا۔ پس جس نے اپنی راتوں کو چھپ کے جگایا ہو اس کی مخفی قربانی واقعۃً خدا کی خاطر ہے اور کسی سوچ و بچار، کسی منطقی فارمولے کا نتیجہ نہیں بلکہ دل کا کاروبار ہے اور یہ بھی ایک خاص بات قابل توجہ ہے کہ محبت کے کاروبار اپنے اندر اخفاء رکھتے ہیں اور اخفاء کو پسند کرتے ہیں۔ پس ایسا تحفہ کسی کو دیا جائے کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہو اور اس کی رضا انسان جیت جائے اور کسی کو پتا ہی نہ ہو کہ کیسے جیتی گئی۔ یہ محبت ہی کا کرشمہ ہے، اس کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ پس یہ وہ بات ہے جو میں آج آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں، ذہن نشین کروانا چاہتا ہوں اس کو کبھی نہ بھولیں ورنہ یہ ہمارے اطوار یہ اعلیٰ نمونے جو خدا نے ہمیں عطا کئے ہیں یہ رفتہ رفتہ ہمارے ہاتھوں سے ضائع ہو جائیں گے۔ جو بھی مالی قربانی کرتے ہیں اللہ کی محبت کے نتیجے میں کریں، محض ذمہ داری ادا کرنے کی خاطر نہیں یا محض ثواب حاصل کرنے کی خاطر نہیں۔ ایک انفاق فی سبیل اللہ ثواب کی خاطر بھی ہوتا ہے۔ اس انفاق فی سبیل اللہ کو اللہ تعالیٰ تجارت کہہ کر بیان فرماتا ہے۔ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (الصّف: 11) وہ تجارت کے سودے ہیں جس میں یہ سودا ہے کہ عَذَابٍ اَلِيْمٍ سے بچایا جائے اور اس میں انسان غور کرتا ہے فکر کرتا ہے کہتا ہے دیکھو خدا کی خاطر قربانی کا وقت ہے میرے گناہ بخشے جائیں گے میری کمزوریاں دور ہوں گی۔ کئی قسم کے ایسے ذہن میں مفادات رکھتا ہے جن کو قربانی سے وابستہ کرتا ہے یہ ہے تو

تجارت ہی مگر مقبول تجارت ہے وہ تجارت ہے جسے اللہ محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

مگر جس سودے کی بات میں کر رہا ہوں وہ خالصتاً محبت کا سودا ہے جیسے مائیں اپنے بچوں کے لئے کرتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض عاشق اپنے محبوبوں کے لئے کرتے ہیں ان کو کوڑی کی بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ دنیا میں کسی کو علم ہوا ہے کہ نہیں ہوا۔ ہاں یہ فکر ہوتا ہے کسی اور کو علم نہ ہو جائے۔ پس یہ محبت کا سودا ہے جو خدا سے کریں تو پھر آپ کو سِرًّا قربانی کا لطف عطا ہوگا اور یہ لطف آپ کو ہمیشہ کے لئے ایسی قربانی کا Adict کر دے گا۔ اس کا ایسا عادی بنا دے گا کہ اس نشے سے پھر آپ کو چھٹکارا مشکل ہو جائے گا۔ پس خدا کے لئے جو کچھ بھی کریں اس کی محبت میں کریں اور اگر محبت کا جذبہ اس وقت موجزن نہیں ہوتا تو فکر کریں کہ آپ کی قربانی کو دوام کیسے ملے گا۔ اس کے لئے ایک دعا ہے جو آنحضرت ﷺ نے ہمیں سکھائی ہے اسے آپ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ عربی زبان میں تو سب کے لئے بلکہ اکثر کے لئے یاد کرنا مشکل ہے مگر مضمون اس کا اتنا سادہ سا، پیارا سا ہے کہ ہر شخص کو وہ اپنی زبان میں آسانی سے یاد ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اے خدا مجھے اپنی محبت عطا کر۔ ان لوگوں کی محبت عطا کر، جن کی محبت مجھے تیری طرف لے جائے، ان لوگوں کی محبت عطا کر جن سے تو محبت کرتا ہے، ان چیزوں کی محبت عطا کر جو مجھے تیری محبت کی طرف کھینچ لے جائیں اور ایسی محبت عطا کر کہ شدید پیاسے کو ٹھنڈے پانی سے جو لطف آتا ہے مجھے اس سے زیادہ تیری محبت میں لطف آنے لگے۔ یہ دعا اگر آپ کریں گے تو وہ چیز جو بظاہر ہمارے ہاتھ میں نہیں، ہمارے بس میں نہیں ہے وہ ممکن ہو جاتی ہے۔ پھر انسان ایک نئی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو مذہب پر محبت کے نتیجے میں عمل کرتا ہے وہی ہے جو بقا اختیار کر جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دوسری دنیا کا انسان بن جاتا ہے اور اسے کوئی خطرہ نہیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا ذکر اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ کر کے فرمایا ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کچھ لوگ ہیں جو خدا کی خاطر استقامت دکھاتے ہیں ان کا ذکر الگ فرمایا ہے وہاں بھی لاخوف اور لاحزن کی بات ہے مگر اس آیت کی شان ہی الگ ہے فرماتا ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ خبردار سنو! جو اللہ کے دوست بن جاتے ہیں ان کو کوئی غم نہیں، کوئی حزن نہیں ان سب باتوں سے بالا ہو جاتے ہیں۔

پس محبت کی قربانی سے بہتر کوئی دنیا میں قربانی نہیں سب سے محفوظ قربانی یہ ہے اور یہی وہ قربانی ہے جو اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہونے کا اول حق رکھتی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ دن آنے والا ہے جب کہ یہ دفتر بند ہو جائیں گے۔ یہ قربانیوں کے سلسلے، یہ خدا کی خاطر خرچ کرنا چند روزہ زندگی ہی کے لئے ہے اس کے بعد یہ سب سلسلے ختم ہیں۔ اس سے پہلے پہلے کرلو اور خدا کو راضی کرلو خدا سے وہ محبت کے سودے کرو جو پھر ہمیشہ ہمیش تمہارے کام آئیں گے کوئی دنیا کا کھاتہ اس دنیا میں تبدیل نہیں ہوسکتا مگر یہ کھاتہ جس کا قرآن کریم ذکر فرمارہا ہے ضرور تبدیل ہوگا۔ پس اس نقطۂ نظر سے جب آپ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو وہ خرچ کرنا ایک عجیب لطف پیدا کرتا ہے اس خرچ میں قطعاً ذرہ بھر بھی دل پر بوجھ نہیں پڑتا بلکہ حیرت انگیز سرور پیدا ہوتا ہے اور انسان اس دنیا میں دوام کے لمحات حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ازل کا مزہ آنے لگتا ہے کہ ازل ہوتی کیا ہے۔

وہ لطف جو خدا کی محبت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اس کے اندر ایک ازلیت پائی جاتی ہے۔ وہ نہ ختم ہونے والا ہے، ہمیشہ ہمیش کا ساتھ دینے والا ہے۔ پس اس پہلو سے آپ جو قربانیاں پیش کرتے ہیں اور کر رہے ہیں ان میں اور نکھار پیدا کرلیں۔ کرتے تو خدا ہی کی خاطر ہیں اگر خدا کی خاطر نہ کرتے تو شور پڑتا اور MTA اس بات کے لئے وقف رہتی کہ فلاں نے اتنے روپے دے دیئے اللہ اکبر فلاں نے اتنے روپے دے دیئے اللہ اکبر۔ اشارۃً بھی کسی کا نام نہیں لیا جارہا۔ ان کا ذکر ہی نہیں وہ فہرست ہی موجود نہیں۔ ہاں اللہ اکبر کے نعرے ہیں جو بلند ہورہے ہیں۔ اس لئے کرتے تو آپ خدا کی خاطر ہیں مگر خدا کی خاطر جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں نئے رنگ بھرے جاسکتے ہیں، اسے نئے حسن کے ساتھ نکھارا جاسکتا ہے اور یہ وہ حسن کا طریق ہے جو محسن بننے کا طریق ہے جو میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اپنے اپنے رنگ میں، اپنی اپنی مالی قربانیوں یا خدا کی خاطر جو وقت آپ خرچ کرتے ہیں اس پر بھی آپ نگاہ رکھیں اور اپنے نفس کا یہ امتحان لیتے رہیں کہ اس کے نتیجے میں آپ کو کتنا سرور حاصل ہوا ہے۔ بوجھ پڑا تھا یا مزہ آیا تھا اور اگر مزہ آیا تھا تو محبت کے بغیر آ نہیں سکتا۔ پھر خدا کے فضل سے آپ کو کم سے کم آشنائی ہوگئی ہے اس طریق کی اور اگر بوجھ پڑتا ہے اور طبیعت میں ایک قسم کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ کب تک میں یہ کام کھینچ سکتا ہوں ایسے لوگ اپنی قربانیوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور

ان کو مزید قربانیوں کی توفیق نہیں رہتی پھر۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں بھی بعض ایسے لوگ تھے جن سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام بہت زچ ہوتے تھے۔ ایک موقع پر آپؑ نے فرمایا کہ بعض لوگ یہ لکھتے ہیں کہ ٹیکس کے بعد ٹیکس نکلتا چلا آ رہا ہے اور آج بھی ایسے ہیں کہ کیا تم نے ٹیکسوں کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے ایک قربانی دوسری قربانی۔ ابھی MTA بند نہیں ہوئی تھی تو مسجد لندن کی بات شروع کر دی اور پھر یہ مسجد برمنگھم آ گئی اور فلاں آ گئی بوسنیا کا فنڈ آ گیا ایمنسٹی کی خاطر جو ہم نے بنائی ہے ہیومینیٹی فرسٹ Humanity First کیا کیا سلسلے شروع کر رکھے ہیں، اوپر سے انصار اللہ، خدام الاحمدیہ، لجنہ اماء اللہ، چندہ عام، وصیت، تحریک جدید، وقفِ جدید۔ ایک آدمی نے مجھے واقعۃً لکھا کیا دفتر کھل گئے ہیں بند کریں ان کو، ایک کر دیں سب کچھ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی اس طرح لوگ بعض دفعہ لکھ دیا کرتے تھے بڑا زچ ہو کے آپؑ فرماتے ہیں کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تو احسان ہیں اللہ تعالیٰ کے جو تم پر جاری ہوئے ہیں۔ کون ہے اور قوم جس پر خدا نے ایسے احسان فرمائے ہوں کہ آئے دن ان کے لئے خدا کی محبت کی راہیں کھولی جا رہی ہوں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو تو صرف محبت کی راہیں دکھائی دیتی تھیں اور ہیں بھی محبت ہی کی راہیں۔ اس طرح ان کو شناخت کریں گے تو دل دوڑے گا اگر جسم کو توفیق نہیں ملے گی اور واقعہ یہ ہے کہ جب محبت کی راہیں کھلتی ہیں تو جسم کو توفیق ملے نہ ملے دل دوڑتا اور اڑتا چلا جاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔

جسمی یطیر الیک من شوقٍ علا

کہتے ہیں جسم ہیں مگر دل کی بات ہے اصل میں

جسمی یطیر الیک من شوقٍ عَلا

یا لیت کانت قُوة الطیران

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 594)

اے میرے محبوب آقا! میرا تو جسم ہر لحظہ تیری طرف پرواز میں ہے لیکن جسم نہیں، دل ہے کیونکہ کہتے ہیں۔

یــا لیـت کــانـت قُوۃ الـطـیـران

اگر جسم ہی ہوتا تو یہ کیوں کہتے کہ مجھے کاش اڑنے کی طاقت نصیب ہوتی۔ مراد یہ ہے کہ دل اس طرح اڑتا چلا جا رہا ہے گویا جسم بھی ساتھ ہی لپٹا ہوا ہے۔ اتنا ولولہ ہے اتنا جوش ہے مگر اے حسرت! کاش مجھے طاقت ہوتی میں واقعۃً اسی طرح اڑتا ہوا تیرے حضور حاضر ہو جاتا۔ یہ عشق کے سودے ہیں۔ پس عشق میں جو رستے کھلتے ہیں وہاں جسم کو آگے بڑھنے کی توفیق ہو یا نہ ہو دل بڑھتے چلے جاتے ہیں روحیں لپکتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔

پس جتنی بھی قربانی کی راہیں آپ کو دکھائی جاتی ہیں اگر آپ یہی جذبہ اپنے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی طرح **لبیک اللھم لبیک** کہنا چاہتے ہیں جو اب حج کے دنوں میں تمام دنیا سے صدائیں بلند ہوں گی تو محبت کے سودے کریں۔ حج بھی محبت ہی کا سودا ہے۔ اول سے آخر تک محبت کی کہانی ہے جو اس حج میں دہرائی جائے گی۔ سر منڈا کر ایک بے سلے کپڑے میں لپٹے ہوئے، دیوانہ وار ننگے پاؤں لوگ طواف کریں گے بیت اللہ کا۔ **لبیک اللھم لبیک** کی آوازیں بلند کرتے ہوئے **لا شریک لک لبیک لک الحمد** اور پھر **و النعمۃ** ہے ایک لفظ اور میرے ذہن سے اتر گیا ہے مگر بہر حال یہ جو تلبیہ ہے بار بار اس کی آوازیں بلند ہوں گی یہ محبت کے سودے ہیں۔ سارا نقشہ ہی محبت کا ہے۔ تو دین کا انجام محبت ہے دین کا آغاز محبت ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو سر منڈا دیا جاتا ہے پیدا ہوتا ہے تو ایک کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا ہے جب اس کو دوبارہ روحانی ولادت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ سر منڈا کر ایک کپڑے میں لپٹا ہوا خدا کے حضور حاضر ہو کر **لبیک اللھم لبیک** کی آوازیں بلند کرتا ہے۔

یہ ہے دین کا خلاصہ جس کی تعریف عشق کے سوا ممکن ہی نہیں ہے۔ کوئی دنیا کا فلسفہ عشق کے سوا اس کی اور کوئی تعبیر نہیں کر سکتا۔ پس خدا کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کریں محبت اور عشق کے جذبے سے خرچ کریں۔ اس کا ایک بہت بڑا فائدہ آپ کو یہ پہنچے گا کہ کبھی دل میں کسی قسم کا تکبر پیدا نہیں ہوگا کیونکہ جو عشق کی خاطر خرچ کرتا ہے وہ قبولیت پر بہت ممنون ہوا کرتا ہے۔ وہ قبولیت پر احسان نہیں جتاتا بلکہ اس کی خدمت، اس کا تحفہ قبول ہو تو زیر احسان ہو کر اس در سے لوٹا کرتا ہے۔ پس خدا کے حضور جو محبت سے قربانیاں آپ پیش کریں گے ہمیشہ احسان کے جذبے سے لدے ہوئے اور

دہرے ہوتے ہوئے واپس لوٹیں گے کہ اللہ کی شان اس نے ہماری حقیر قربانی کو قبول فرمالیا اور اگر عشق کا جذبہ نہ ہوا تو بسا اوقات شیطان آپ کے دل میں رعونت پیدا کر دے گا۔ آپ کہیں گے ہم نے اتنی قربانیاں کیں، ہم نے فلاں وقت اتنے چندے دیئے آج جماعت ہم سے یہ سلوک کر رہی ہے، آج ہم نے کوئی نادانی کی تو ہمیں بھی سزا دی جاتی ہے حالانکہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے کیا کیا چندے دیئے تھے کتنی بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ یہ تکبر ہے جو کلیۃً ہر نیکی کو اس طرح چٹ کر جاتا ہے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ نیکی کو تو چٹ کر جاتا ہے مگر اپنے گند پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور جتنی بیماریاں ہیں وہ ان کیڑوں کے پیچھے چھوڑے ہوئے گند کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ میں بیمار ہو گیا لیکن اس کو پتا نہیں کہ دکھ ہے کس بات کا۔ کیڑوں کے داخل ہو کر اس کے خون کے ذروں کو کھانے کا دکھ نہیں ہوتا۔ اس وقت تو انسان کو پتا ہی نہیں ہوتا مجھ سے کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ کیڑے اپنا گند جسم میں پھینکتے ہیں، جب وہ ٹوٹتے ہیں اور ان کے گندے ذرّات بکھرتے ہیں تو اس غلاظت کا دکھ ہے جو انسان کا دکھ ہے جو انسان محسوس کرتا ہے بخار کی صورت میں یا اور جسمانی دردوں کی صورت میں۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو یہ نقشہ کھینچا ہے کہ اگر تمہارے اندر محبت کے سوا کوئی اور کیڑا داخل ہو گیا اور ریاء کے ذریعے تم نے خرچ کرنا شروع کیا تو یہ ایسا بدبخت کیڑا ہے کہ تمہاری ہر نیکی کو چاٹ جائے گا کچھ بھی اس میں باقی نہیں رہنے دے گا۔ مگر میں نے اسی مضمون پر سوچا تو مجھے خیال آیا کہ ہاں ایک چیز وہاں باقی رہے گی ان کیڑوں کے ٹوٹے ہوئے بدن، ان کی گندگی، ان کا زہر جو سارے مالی وجود میں تعفن پیدا کرے گا اور بیمار مرتے ہوئے مریض پیچھے چھوڑ جائے گا۔

پس اپنی بقاء کی خاطر، اپنے ہر اس مفاد کی خاطر جو انسان کی روحانی زندگی سے وابستہ ہے، جس مفاد کا آپ کی اولاد سے بھی تعلق ہے، آپ کے حال سے بھی تعلق ہے، آپ کے مستقبل سے بھی تعلق ہے، اُس دنیا سے بھی تعلق ہے اور اس دنیا سے بھی تعلق ہے ہر اس مفاد کی خاطر محبت کے محفوظ قلعے میں داخل ہو جائیں۔ جو بھی خدا کے لئے خرچ کریں، جب بھی خدا کے لئے خرچ کریں اپنے محبت کے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں اس میں سے کتنی محبت پھوٹی ہے۔ یہ آبِ زمزم ہے جو آپ کا آبِ حیات بن جائے گا۔ یہ ایڑیاں رگڑنے سے پیدا ہوتا ہے اور محبت

میں بھی ایڑیاں رگڑ رہی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون کو سمجھنے اور اس کو اپنے وجود میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ایک دفعہ پھر میں اہل پاکستان، اہلِ بنگلہ دیش، اہل ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کو چوبیس (24) گھنٹے تک مسلم ٹیلی ویژن احمدیہ کے اجراء کی خوشخبری دیتے ہوئے ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ہم سب کی طرف سے آپ سب کو مبارک ہو۔ اللہ وہ دن بھی جلد دکھائے جب کہ عالمی رابطے کے ذریعے ہم زیادہ شان کا پروگرام آپ کے سامنے چوبیس (24) گھنٹے مسلسل پیش کرسکیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ آمین۔

ہم نے اپنے معاشرے کو، تہذیب کو اور تمام دنیا کی جماعتوں کو جھوٹ سے پاک کرنا ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 3 رمئی 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۹﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۰﴾ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۱﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۲﴾

(الحج: 29 تا 32)

پھر فرمایا:

ابھی حج کو یا عید کو جو حج کے ساتھ آتی ہے گزرے ہوئے چند دن ہی ہوئے ہیں اور حج ہی کا مہینہ چل رہا ہے۔ آج کے خطبے کے لئے میں نے انہی آیات سے مضمون کو ترتیب دی ہے جو حج سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے ذہن میں MTA کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کا مضمون تھا اور ایک خاص پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا جب اس تعلق میں قرآنی آیات پر نظر ڈالی تو یہی وہ آیات

تھیں جو اس مضمون سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور کئی طرح سے تعلق رکھتی ہیں، ایک ہی نہیں بلکہ مختلف جہتوں سے یہ اس مضمون سے بہت ہی گہرا رابطہ رکھتی ہیں۔ پس ان آیات کی تلاوت کی غرض دراصل ایم۔ ٹی۔ اے کے تعلق میں پیدا ہونے والے بعض خطرات کی نشان دہی کرنا تھی اور ان آیات میں اس مضمون کو اس طرح مربوط طور پر بیان فرمایا گیا کہ اور بھی بہت سے پہلو ہیں جو ذہن میں نہیں تھے وہ ان آیات کی تلاوت کے بعد سامنے ابھر آئے۔

ان کا ترجمہ یہ ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ تا کہ وہ اپنے منافع کو پہچانیں "لِّيَشْهَدُوْا" کا لفظی ترجمہ تو ہے دیکھیں، مگر اس طرح دیکھنا کہ گواہ بن جائیں اس میں مضمون کو پہچاننے کا معنٰی بھی شامل ہوتا ہے، وہ اچھی طرح اس سے واقف ہو جائیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے ان منافع کو دیکھ کر ان سے استفادہ کریں۔ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ اور اللہ کا نام لیں، اللہ کا نام پڑھیں ان چند دنوں میں عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ اس پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو مویشیوں میں سے مختلف چوپائے عطا فرمائے ہیں۔ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ۔ پس اس میں سے کھاؤ اور تکلیف میں مبتلا اور فقیر کو دونوں کو جو تکلیف میں مبتلا ہوں یا ناداری کا شکار بن کر فقیر کی حد تک پہنچ گئے ہوں ان کو اس میں سے حصہ دو ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ پھر تا کہ یہ ہو کہ وہ اپنی میلوں کو دور کریں جو میل ان کے بدن کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں اور ان کی روح کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ اور اپنی مانی ہوئی منتوں کو یا نذروں کو پورا کریں۔ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ اور اس قدیم ترین گھر کا طواف کریں۔ ذٰلِكَ یہ اسی طرح ہے جو بات بیان کی گئی ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ اور جو اللہ تعالیٰ کے محرمات یعنی قابل عزت، قابلِ تعظیم نشانات کی عزت کرتا ہے ان کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ حُرُمٰتِ میں حرام کا ایک مضمون منفی معنوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن یہاں حُرُمٰتِ میں ایک عزت اور احترام کا مضمون ہے اور اس کا بھی حرام کے عرف عام والے مضمون سے ایک گہرا تعلق ہے۔ حرام چیز کو انسان ہاتھ نہ لگائے یہ اس کی حرمت کے مضمون میں داخل ہے اور عزت کے مقام پر بھی ہاتھ نہ ڈالے اور خدا کا تقویٰ اختیار کرے۔ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر زبان کھولنا، ان پر تخفیف کے ساتھ ان کا

ذکر کرنا یا بدتمیزی کرنا خدا کے حضور بہت بڑا گناہ بن جاتا ہے تو ان معنوں میں حُرُمٰتِ کا مضمون ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے شعائر جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حرمتیں وابستہ فرمادی ہیں وہ خواہ زندہ وجود ہوں، خواہ نشانات ہوں جن کو زندہ وجودوں نے عزت بخشی اور عظمت عطا کی، دونوں صورتوں میں ان کا احترام لازم ہے۔ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اور تمہارے لئے انعام حلال کر دیئے گئے ہیں۔ اب اس مضمون کا حرمت کا جو دوسرا پہلو تھا یہ تعلق قائم کر دیا اور قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کی یہ شان ہے کہ دو مختلف مضامین کو اس طرح ایسے لفظوں سے باندھ دیتا ہے جن لفظوں میں دونوں مضامین کے ساتھ ایک طبعی تعلق ہوتا ہے۔ پس حرمت کا مضمون جہاں عزت اور احترام کا ہے وہاں شعائر سے مراد اور صاحب حرمت جگہ سے مراد بیت اللہ اور خانہ کعبہ ہے اور جہاں حرام چیزوں سے اس کا تعلق ہے وہاں یہ فرمایا اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ان چیزوں کے سوا جو تم پر پڑھ دی گئی ہیں جن کے متعلق تمہیں تعلیم دی جاتی ہے، ان کے سوا باقی تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۔ پس کھانے پینے کی اور استعمال کی چیزوں میں بھی بعض حرام چیزیں ہیں ان سے بھی بچنا ہے مگر ان دونوں مضامین میں لفظ حرمت واحد ہونے کے باوجود ان دونوں مضامین میں بعد المشرقین ہے۔ یعنی ایک جگہ حرمت سے مراد عزت کی وجہ سے اس کا ذکر احترام سے کرنا ہے، بات کرتے ہوئے خوف کھانا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حضور جب صحابہ حاضر ہوتے تھے ان صحابہؓ کا ذکر محبت اور پیار سے ملتا ہے جو ادب سے اپنی آواز کو دھیما کر لیتے تھے اور جو بلند آواز سے پکارتے تھے اور حجرات سے پرے آوازیں دیتے تھے ان کا قرآن کریم نے ناراضگی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ اور خانہ کعبہ کے گرد گھومنا، وہاں اس تقدس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذکرِ الٰہی کرنا یہ اس کی عزت کا تقاضا ہے اور کسی قسم کی گندگی کو ساتھ نہ لے جانا اور پاک وصاف رہنا اور اپنی روح کو بھی ہر قسم کے گندے خیالات سے پاک رکھنا یہ بھی اس کی حرمت کا تقاضا ہے اور اس حرمت کے تقاضے کو گندگی دور کرنے سے جس طرح پورا کیا جاتا ہے اسی طرح ان گندی چیزوں سے دور رہنا بھی لازم ہے جو گندگی کا کوئی بھی مضمون رکھتی ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حرام کے دو انتہائی معنی یہاں اکٹھے کر دیئے اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کے لئے لفظ حرمت کو گویا پُل کے طور پر استعمال فرمایا۔

ایک خانہ کعبہ کی حرمت ہے اور شعائر اللہ کی حرمت ہے جو ان کے تقدس کی وجہ سے ہے اور ان سے احتیاط کا معاملہ ہے۔ ایک خبیث اور گندی چیزوں کی حرمت ہے ان سے بچنا اس حرمت کا تقاضا ہے اور ان سے دور رہنا اس حرمت کا تقاضا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو یہاں تم روح کی بالیدگیوں اور گندگیوں سے پاک صاف ہو کر پہنچے ہو اور تمہیں ایک روحانی رزق مل رہا ہے۔ تمہیں جسمانی رزق بھی اسی حوالے سے عطا کیا جا رہا ہے اور جسمانی رزق جو عطا کیا جا رہا ہے اس میں پاکیزگی پیش نظر رکھی گئی ہے۔ تمہارے لئے صرف وہ چیزیں حلال کی گئی ہیں جو پاکیزہ ہیں۔ جو گندگی کا پہلو رکھتی ہیں ان کو تمہارے لئے حرام فرما دیا گیا اور گند کے مضمون کو جو جسمانی گندگی سے تعلق رکھتا ہے روحانی گندگی کے مضمون کی طرف منتقل فرماتے ہوئے فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔

(اس موقعہ پر حضور کی خدمت میں اطلاع دی گئی کہ مواصلاتی رابطہ کے ذریعہ خطبہ کی تصویر باہر نہیں جا رہی۔ حضور نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو ہمارے سامعین اور ناظرین ہیں دنیا بھر میں ان کو آواز تو صاف جا رہی ہے اور وقتی طور پر تصویر نہیں دیکھ سکتے، وہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا تصویر بھی دیں گے اور دوبارہ اس خطبے کی وڈیو دکھائی جائے گی تو آواز اور تصویر کے ساتھ وہ اکٹھا دیکھ بھی سکیں گے اور سن بھی سکیں گے۔ اس کے بعد حضور نے خطبہ کے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:۔)

میں یہ بیان کر رہا ہوں کہ قرآن کریم نے حج کے مضمون میں حرمت کے لفظ کو اس طرح مضمون کے ایک پہلو سے دوسرے پہلو کو باندھا ہے اور اس سے پھر دوسرا پہلو یا تیسرا پہلو نکال لیا ہے۔ ایک ایسا دھاگہ ہے حرمت کے مضمون کا جو ہر بدلتے ہوئے مضمون میں مشترک ہے اور بظاہر الگ الگ باتیں ہو رہی ہیں لیکن بنیادی طور پر یہی بات ہے جو آگے جاری وساری ہے۔ اس تعلق میں میں نے بیان کیا کہ اللہ کی طرف سے جن چیزوں کو محرم کر دیا گیا ہو ان کی عزت لازم ہے اور اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو محرم فرما دیا اور بیت اللہ سے تعلق والی بہت سی اور باتیں ہیں جو محرمات میں شامل ہو گئیں۔ حرمت کا دوسرا معنی ہے گندی اور ناپاک چیزوں سے اجتناب، تو پہلے معنوں کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس محرم گھر میں کوئی گندی چیز داخل نہ ہو، کوئی ناپاک چیز نہ ہو اور قربانیاں جن کا گوشت تمہارے لئے حلال فرمایا گیا ہے اللہ تعالیٰ تسلی دیتا ہے کہ وہ پاک چیزیں ہیں اسی لئے خانہ کعبہ تک ان

کی رسائی بھی ہے۔مگر ان کی پاکیزگی صرف بدنی پاکیزگی نہیں بلکہ روحانی معنوں میں بھی ان کو پاکیزگی نصیب ہونی چاہئے۔ وہ صرف اس طرح ہوسکتی ہے کہ ان کو پیش کرتے ہوئے غیر اللہ کا کوئی تصور نہ آئے اور خالصةً للہ، نہ کہ اصنام کے نام پر، ان کو ذبح کیا جائے۔اس سے جو رجس کی انتہائی بدترین صورت ہے یعنی شرک وہ ناپاکی جس سے پاک کرنے کے لئے خانہ کعبہ بنایا گیا وہ ناپاکی تم سے دور ہو جائے گی۔اگر تم اپنی کھانے کی چیزیں بھی پاک کرو گے اپنے بدن کو بھی پاک کرو گے اور اپنی روح کو ہر قسم کی گندگی سے پاک کرو گے جس کی انتہا شرک ہے اور شرک کہنے کے بعد فرمایا وَقَوْلَ الزُّوْرِ اور یاد رکھو جھوٹ جو ہے یہ سب برائیوں کی جڑ ہے۔سب سے بڑی گندگی جھوٹ ہے جو شرک پر منتج ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ جھوٹ ہو اور انسان مشرک نہ بنے۔شرک کے ہر پہلو کا جھوٹ سے تعلق ہے۔ پس یہ جو چھوٹی سی آیت ہے اس میں اتنے مضامین اس طرح پیک (Pack) کر دیئے گئے ہیں، اکٹھے کر دیئے گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ایک ایک مضمون پر اگر آپ گفتگو شروع کریں تو ایک ایک پورا خطبہ اس مضمون کی وضاحت پہ خرچ ہوسکتا ہے۔مگر میرے پیش نظر یہ مضمون تھا کہ اس کا MTA کے نظام سے کیا تعلق ہے اور یہ آیات میرے ذہن میں جو مضمون تھا اس مضمون کو واضح کرنے میں کس حد تک اور کن معنوں میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

اس مضمون کے تعلق میں میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بیت اللہ کا قبلے سے بھی ایک تعلق ہے۔توحید کا ہر قسم کی گندگی سے پاک ہونے کا تعلق ہے۔ جب آپ کا قبلہ بدلتا ہے تو شرک ہوتا ہے اور جب شرک ہوتا ہے تو نجس پیدا ہوتی ہے یا دل گندہ ہو تو شرک پیدا ہوگا ورنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر قسم کا خبث، ہر قسم کی گندگی، ہر قسم کی غلاظت جو ہے وہ شرک پر لازماً منتج ہوگی اور اوثان اٹھ کھڑے ہوں گے۔خدائے واحد کی بجائے بت سامنے آجائیں گے اور بت پیدا ہو جائیں گے اور یہ عجیب ایک توارد ہے کہ MTA نے اپنا قبلہ ان دنوں میں تبدیل کیا ہے اور اس قبلے سے کلیةً احتراز کر لیا ہے جس قبلے پر گندے پروگرام آتے ہیں اور رجس ہے۔ چنانچہ جب ہم نے اس کو بدلا تو بعض دوستوں نے ہمیں یہ لکھا کہ اسے پھر وہ لوگ نہیں سن سکیں گے آپ نے بدل تو دیا ہے جو مشہور اور ہر دل عزیز پروگرام سننے کے لئے اسی سمت میں اپنے ڈش انٹینا کو سیٹ کئے بیٹھے تھے۔ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ تو گندگی کی خاطر اس سمت میں انٹینا کو Fit کئے بیٹھے ہیں۔ وہاں اگر شرک کی بجائے

توحید کا مضمون چلا اگر گندگی کی بجائے نفس کی پاکیزگی کا مضمون جاری ہوا تو ان کی بلاء کو بھی دلچسپی نہیں ہوگی۔ ہاں وہ لوگ جو اس ٹیلی ویژن کے ذریعے اچھی باتیں سنتے ہیں، اچھی باتیں دیکھتے ہیں ان کو اور ان کی اولادوں کو ہمیشہ خطرہ رہے گا کہ اسی زاویے، اسی سمت، اسی قبلے سے گندگی کو بھی دیکھیں اور رفتہ رفتہ گندگی ان کو کھینچ کر دوسری سمت میں لے جایا کرتی ہے۔ یہ وہ مضمون تھا جو میرے پیش نظر تھا اور یہ بعینہٖ ان آیات کے مضمون کے دائرے میں ہے۔

پس ہم نے جو قبلہ بدلا ہے یہ صحیح قبلہ ہے۔ یہ اس رخ کا قبلہ ہے جہاں گندگی چلتی ہی نہیں اور یہ وہ سیٹلائیٹ سسٹم ہے جہاں تمام اہم سنجیدہ پروگرام جاری ہوتے ہیں کیونکہ یہ حکومتوں کے حکومتوں سے رابطے اور بین الاقوامی خبروں کے رابطوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور براہ راست عوام الناس کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں اس لئے Institutions اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور عوام الناس اس قسم کے انٹینے لگاتے ہی نہیں کہ وہ اس پروگرام کو دیکھ سکیں، ان کو دلچسپی کوئی نہیں۔ پس ہم نے اپنا قبلہ وہاں اس طرف معین کرلیا ہے جہاں ایک ہی ٹیلی ویژن ہے جو لوگوں کے گھروں تک بھی پہنچے گا اور پاک باتیں بیان کرے گا، اسلام کی سچی اور پاکیزہ تصویر کھینچے گا، توحید کے گیت گائے گا اور اس میں کوئی گندگی نہیں ہوگی۔

پس یہ جو تبدیلی ہے یہ بہت ہی اہم اور بابرکت تبدیلی ہے اور اس تبدیلی نے ہمیں ایک اور بھی فائدہ پہنچا دیا۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ جب بھی کسی چیز کا قبلہ تبدیل ہو تو کچھ لوگ جو اعلیٰ مقصد سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ محض جسمانی طور پر یا رسمی طور پر اس طرف منہ کئے بیٹھے ہوتے ہیں اور اصل دلچسپی ان کی توحید میں نہیں ہوتی، اصل دلچسپی ان کی اللہ تعالیٰ کی ذات میں نہیں ہوتی۔ جب قبلے تبدیل ہوں تو پھر وہ لوگ پیچھے رہ جایا کرتے ہیں اس وقت وہ ننگے ہو جاتے ہیں۔ وہ مضمون قرآن کریم نے خود کھول کر بیان فرمایا ہے اگرچہ اس موجودہ مضمون کے مقابل پر وہ ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کا مضمون ہے لیکن آنحضرت ﷺ اور قرآن کریم کے مضامین کے سائے میں ہی آگے چھوٹے چھوٹے مضمون، انہی کی مطابقت میں پیدا ہوتے ہیں۔ پس آج کا جو یہ مضمون ہے تحویل قبلہ کے سائے کے تلے ہے، اسی کے تابع ہے۔ MTA نے جو اپنا قبلہ بدلا تو گندگی سے دور ہٹا اور اعلیٰ مقاصد کی طرف مائل ہوا اور اپنے پروگراموں کو گندگی سے اور بھی زیادہ دور کر دیا جتنے وہ پہلے دور تھے۔

یعنی احتمال کے طور پر بھی کوئی گندہ پروگرام اس چینل پر سنائی نہیں دے سکتا، دکھائی نہیں دے سکتا۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ جب تحویل قبلہ کیا گیا تو اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جن کے نفس بیمار ہیں وہ الگ ہو جائیں، وہ ننگے ہو جائیں، وہ پہچانے جائیں۔ وہ جو اخلاص میں کامل ہیں جن کو اللہ کی توحید سے اور محمد رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے ان کے لئے قبلے کی تبدیلی ذرا بھی گراں نہیں گزرتی کیونکہ اصل مقصد کے ساتھ وابستہ رہتے اور چمٹے رہتے ہیں۔ ان کو تکلیف ہوتی ہے جن کے مقاصد کے حصول میں فرق پڑ جاتا ہے۔ پس یہ وہ مضمون تھا جو میرے ذہن میں آیا جس کے لئے مجھے قرآن کریم کی آیات کی تلاش تھی تو حج کی جو آیات ہیں وہ بعینہٖ اس مضمون پر چسپاں ہوتی دکھائی دیں۔ فرمایا ہے رجس سے اوثان پیدا ہوتے ہیں۔ گندگی سے بت بنتے ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو اطلاعیں پاکستان سے مجھے ملی ہیں اس سے نہایت ہی خوفناک تصویر اس بات کی ابھری ہے کہ لوگ گندگی میں مبتلا ہو کر ٹیلی ویژن کے ذرائع کو ایسے ناپاک استعمال میں لے آئے ہیں کہ جس کے نتیجے میں گھر گھر میں گندگی داخل ہوگئی ہے اور گھر گھر میں بت داخل ہو گئے ہیں۔

اس کے متعلق ایک پاکستانی رسالے نے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں اس وقت سیٹلائٹ پر موجود کم و بیش 136 چینلوں کو مختلف ڈشوں سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں 136 چینلز کو مختلف ڈشوں سے دیکھا جاتا ہے جن میں صرف انڈیا کے 36 چینلز ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے 17، برطانیہ کے 9، فرانس کے 5 اور چین کے 17 چینل شامل ہیں۔ ایک ہفتے میں سات چینلوں کے ذریعے جس کا انہوں نے حساب کیا ننانوے (99) بھارتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک ہفتے میں ننانوے فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور بھارتی فلمیں جو دکھائی جاتی ہیں سراسر گند سے بھری ہوتی ہیں۔ اوپر سے نیچے تک نہ صرف گندی بلکہ کھوکھلی اور روزمرّہ کے مذاق کو تباہ و برباد کر دینے والی۔ نہ ادب کا کچھ رہنے دیتی ہیں، نہ شعریت کا کچھ باقی رہنے دیتی ہیں۔ محض بے ہودہ، گندگی اور پھر ایسے توہمات میں مبتلا کرنے والی ہیں جن کا توحید کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہیں بلکہ ان توہمات کے ساتھ توحید مٹنے لگتی ہے۔ یعنی جب وہ توہمات دل پہ قبضہ کریں تو ایسا رجس ہے، ایسی ناپاکی آ جاتی ہے جس کے ساتھ توحید پھر اکٹھی رہ نہیں سکتی تو توحید اپنے ڈیرے ان دلوں سے اٹھا لیتی ہے۔

یہ وہ خطرناک صورتحال ہے جس کے پیشِ نظر آج کے خطبے میں مَیں خصوصاً جماعت احمدیہ کو نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ احمدی اس گندگی میں بالکل ملوث نہیں کیونکہ بعض اطلاعیں مجھے ملتی ہیں اور اس سے میرے دل کو گہری تکلیف پہنچتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ملوث ہیں بہت سے گھر بلکہ بعض لوگ رت جگے مناتے ہیں انڈین فلمیں دیکھنے کے لئے، کہ ایک کے بعد دوسری آئے گی دوسری کے بعد تیسری آئے گی ان کے دن اور رات کے اوقات ہی بدل گئے ہیں اور پاکستان میں تو کثرت سے ہے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدیوں میں بہت کم مگر ہے ضرور اور خصوصیت سے بڑے شہروں میں ہے کراچی میں ہے، لاہور میں ہے اور شاید پنڈی میں بھی ہو یا اسلام آباد میں۔ مگر بالعموم جو خبریں ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ بہت بھاری رجحان جماعت احمدیہ کا نئے ڈشوں کے ذریعے ہمارے MTA سیٹلائٹ کے نئے پروگرام دیکھنے کی طرف ہے اور جو اطلاع مل رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب سے چوبیس گھنٹے کا پروگرام شروع ہوا ہے اور خصوصیت سے جب سے نئے ڈش کے ذریعے ہم نے جو بہت بڑا ڈش ہے اس کے ذریعے پروگرام کو اٹھایا ہے وہاں پکچر کی کوالٹی بہت بہتر ہوگئی ہے۔ تصویر بالکل صاف آنے لگ گئی ہے۔ بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں تو مقامی ٹیلی ویژن اور اس میں کوئی بھی اب فرق دکھائی نہیں دیتا۔ آواز بھی صاف ہے، تصویر بھی صاف ہے۔ جب سے یہ ہوا ہے جو لوگ سیٹلائیٹ کا کاروبار کرتے ہیں ان کی اطلاع یہ ہے کہ اچانک اتنے آرڈر بڑھ گئے ہیں کہ ہم سے سنبھالے نہیں جا رہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعت کی اکثریت کا قبلہ درست ہی ہے لیکن جن کا ٹیڑھا ہے انہوں نے بہت ہی خطرناک اقدام کئے ہیں۔ ان کو اور ان کی نسلوں کو یہ بات بالکل ہلاک کر دے گی۔ ناممکن ہے کہ وہ روحانی طور پر اس گندگی کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں جہاں یہ بات بڑھ رہی ہے اور بہت بڑھ رہی ہے ان کی جو تصویریں مجھ تک مختلف خطوں کے ذریعے پہنچتی ہیں وہ یہ شکل ہے کہ بعض گھر ڈش انٹینا کے ذریعے دن رات ہندوستانی فلموں میں مگن رہتے ہیں ان کی اولادوں کی شکلیں بدل چکی ہیں، ان کی روزمرّہ کی طرزِ کلام میں فرق پڑ چکا ہے، ان کے ہاں ہیرو کا تصور ہی بدل گیا ہے اور گندگی، بے حیائی اور بے غیرتی یہ نئی نسل کا طرّہ امتیاز بنتا جا رہا ہے اور نہ عبادت کی ہوش، نہ کسی اور اعلیٰ مقصد کی یہاں تک کہ یہ لوگ اب اعلیٰ درجے کے لٹریچر سے بھی بالکل

بے بہرہ ہو گئے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں میں ادبی لحاظ سے بھی ایسی مکروہ چیزیں ہیں اور زبان کا معیار اتنا گرا ہوا ہے کہ جس قوم کو اپنی زبان سے پیار ہو، جس کو اپنی اعلیٰ قدروں کا خیال ہو وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ ان کی نئی نسلیں اپنا کلچر، اپنا ادب، اپنی شعریت، اپنا مذہب، اپنی روحانی، اخلاقی قدریں ساری کی ساری ہندوستانی فلموں کی نذر کر دیں۔ یہ جب گندگی مزید بڑھتی ہے تو آپ حیران ہوں گے یہ دیکھ کر کہ ان گھروں میں ہندو ایکٹروں کی، ہندو ایکٹرسوں کی تصویریں بڑی بڑی چارٹ کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ بعض لڑکیوں اور لڑکوں کے کمروں میں، لڑکوں کے کمروں میں ایکٹرسوں کی تصویریں اور لڑکیوں کے کمروں میں ایکٹروں کی تصویریں اور بڑے فخر سے لگاتے ہیں اور ماں باپ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں بڑے ہوشیار بچے ہیں، کہاں سے تصویر حاصل کی تم نے، خوب گھر سجایا ہے۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن کریم کی اس آیت نے چودہ سوسال پہلے اعلان کر دیا تھا کہ رجس جو ہے یہ بتوں میں ضرور تبدیل ہوگا۔ یہ بد بخت بت تم نے اپنے گھر میں پال لئے ہیں۔ ان لوگوں کے کردار کو نزدیک سے دیکھو تو کوئی شریف آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے ساتھ آنا جانا رکھے، ان کو اپنے گھروں میں بلائے، ان کے گھروں میں جائے ان کی دنیا ہی اور ہے صرف مادہ پرستی ہے، صرف بے حیائی کو ترغیب دیتا ہے، صرف بناوٹ ہے، سچائی تو قریب تک نہیں پھٹکی اور یہ جو بناوٹ ہے یہ جھوٹ، جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ دیکھیں قرآن کریم کی آیات نے اتنی صفائی کے ساتھ اس مضمون کے ہر پہلو کو کھول دیا تھا۔ فرمایا دیکھو فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ تم رجس سے تو بچ رہے ہو، تمہیں بیت اللہ نے یہ تعلیم دے دی کہ رجس کے ساتھ یہاں نہیں آنا۔ رجس کو ترک کرو اور ہمیشہ کے لئے صاف کر وا اپنے بدن سے، اپنی روح سے اور یاد رکھو خاص طور پر بچو الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ایسے رجس سے جو لازماً بتوں کی طرف لے جائے گا۔ بت پرستی کے رجس سے بچو۔ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ اور جھوٹ سے بچو۔

تو ہندوستانی فلموں کی پرستش کرنے کے نتیجے میں، ان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی پرستش شروع ہو چکی ہے، جو خود اپنی ذات میں ایک جھوٹ کا ملمع ہیں، جھوٹ کا مجسمہ ہیں۔ ایکٹنگ ہے ہی جھوٹ۔ ان کے بیانات آپ پڑھ لیں، ان کے متعلق اخباروں میں ان کے تبصرے پڑھ لیں، ساری

زندگی جھوٹ ہے۔ ایک مصنوعی کھوکھا سا بنا ہوا ہے اس کے اندر کچھ بھی نہیں اور ان کے متعلق باتیں اس فخر سے بعض لوگ اپنے اخباروں میں اچھالتے ہیں، پاکستان کے مسلمان اخبار، اور اس طرح ان کی تصویریں روزانہ شائع کرتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان کو کوئی ہوش ہی نہیں کہ کتنا زندگی میں تضاد پیدا ہو چکا ہے اور یہ بت روزانہ اخبار بھی ان کو مہیا کرتے ہیں، وہ پھر کاٹ کاٹ کے بچے اپنے ڈرائنگ روم میں سجاتے، اپنی دیواریں ان سے کالی کرتے ہیں۔ تو ایک طرف یہ رجس ہے جو ٹیلی ویژن کے ذریعے گھروں میں داخل ہو گیا ہے اور ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کا وہ قبلہ بن چکا ہے ان کی طبیعتوں پر گراں ہے یہ بات کہ ہم نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔ کبھی کبھی وہ دونوں طرف قدم رکھ لیا کرتے تھے۔ اکثر گند دیکھ لیا کبھی وہ اس طرف بھی نگاہ ڈال لیا کرتے تھے کہ دیکھیں یہاں کیا آ رہا ہے۔ کس حد تک ہم میں بور ہونے کی طاقت ہے۔ تو دم گھٹ کر جس طرح انسان غوطے مار لیا کرتا ہے ایسے گھروں میں یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ دم گھٹ کر ٹیلی ویژن، MTA کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ اپنے گند کو صاف کرنے کا انتظام کر لیا کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ تو پھر اس نظام پر راضی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو اس جھوٹ پر اس گند پر راضی ہوں اللہ اس کو بڑھا دیا کرتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وہ لوگ جن کے دل بیمار ہو گئے ہوں خدا کی یہ تقدیر ہے کہ ان کے رجس پر اور رجس کا اضافہ کرتا ہے ان کے دل کے خبث، ان کے دل کی گندگی، ان کی دنیا پرستی پھر کم نہیں ہوا کرتی وہ بڑھتی رہتی ہے اور یہی وہ صورت حال ہے جو نہایت بھیانک طریق پر پاکستان کے امیر خاندانوں کو مکمل اپنے پنجے میں جکڑے ہوئے ہے، شکنجے میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ پاکستان اتنی خوفناک تہذیبی خودکشی کر چکا ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی بس نہیں، کوئی اس کا توڑ نہیں۔ اس لئے توڑ نہیں کہ اگر ایسی قوم جس کا ذوق بدہو چکا ہو جو کھلے عام گندگی کرے اور دعوتیں دے اپنے دوستوں اور حلقہ احباب کو کہ آؤ فلاں رات ہم ساری رات ٹیلی ویژن پر ہندوستانی فلمیں دیکھیں گے آ جاؤ اور شامل ہو جاؤ تو قوم کا باقی کیا رہے گا۔ ایک طرف مولویت ہے جو بپھر رہی ہے اور زور مار رہی ہے۔ مولویت کا سارا زور اس بات پر ہے کہ صرف اس ایک ٹیلی ویژن کو بند کر دیا جائے جو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی طرف بلائے۔ ایک طرف یہ اعلان ہو رہے ہیں کہ اتنے چینل 136

چینلز گندگی کی طرف بلا رہے ہیں اور اس ایک چینل کے ذکر سے بھی اس مولوی کا جس نے یہ مضمون لکھا ہے طبیعت گھبراتی ہے۔ جو ایک ہے جو صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بلا رہا ہے اور وہ MTA ہے۔ اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں، کہتے ہیں جب تک اس کو نہ مٹا دیں گے ہمیں چین نہیں آئے گا۔ پاکستان ہوتا کون ہے خدا اور اس کے رسولؐ کا ذکر سننے والا۔ وہ غرق ہو جائیں بدبختیوں میں، ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ دن رات ہندو ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی پرستش کریں اور واقعۃً پرستش ہے، تصویریں لگا کر دیکھنا ان میں مگن ہونا، اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا اور پرستش کس کو کہتے ہیں۔ پرستش کا نام ہے عبادت اور عبادت کا لفظ غلامی سے تعلق رکھتا ہے۔ تم جس کو اپنا معبود بناؤ گے اس کی غلامی کرو گے اس کے انداز سیکھو گے ویسی شکلیں بناؤ گے۔ پس جب یہ شروع ہو جائے تو اس کا نام عبادت ہی ہے کوئی اس میں مبالغہ آمیزی کا کوئی سوال نہیں اور یہ عبادت جو وہاں ہو رہی ہے جھوٹ کی عبادت ہے کیونکہ ایکٹنگ اور جھوٹ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ پس قرآن کریم کی اس آیت کا اطلاق ایسی وضاحت کے ساتھ پاکستان کے معاشرے کی خرابیوں کے ہر جزو پر اطلاق پا رہا ہے۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا جب تک یہ آیت نظر کے سامنے نہ آئی اس وقت تک میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اتنا واضح نقشہ اس بیماری کا کھینچا گیا ہے جس کے تعلق میں مجھے قرآن کریم کی کسی آیت کی تلاش تھی تا کہ اس کے حوالے سے میں خطبہ دے سکوں۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ حالت اگر احمدی گھروں میں بھی داخل ہو جائے اور چاہے ہزار میں سے ایک میں ہو گئی ہو، ہو چکی ہے بعض جگہوں پہ، تو ہماری اگلی نسلوں کا کیا بنے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ دن بدن توجہ MTA کی طرف بڑھ رہی ہے اور جہاں جہاں یہ آواز پہنچی ہے جہاں جہاں یہ تصویر پہنچی ہے اس نے دلوں کی پاکیزگی کا سامان شروع کر دیا ہے۔ سب سے بڑی خوشی کی خبر یہ ہے کہ ہمارے بچے تو اس شدت کے ساتھ اس سے وابستہ ہو چکے ہیں کہ جیسے انہیں Addiction ہو گئی ہو اور ہر جگہ سے یہی اطلاع ملتی ہے۔ بعض جگہ بڑوں کو بچے مجبور کرتے ہیں کہ ہم نے اور کچھ نہیں دیکھنا ہمیں یہ دکھاؤ۔ یہ اللہ کی شان ہے اس نے اپنے فضل سے اس ٹیلی ویژن کی محبت دلوں پر نازل فرما دی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو آپ بتائیں کہ ہم جماعت کی تربیت کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اتنے بڑے ملک میں بلکہ اتنے وسیع علاقوں میں جس میں ہندوستان بھی شامل

ہے، بنگلہ دیش بھی شامل ہے اور دیگر مشرقی ممالک شامل ہیں جن سب پر یہ ہندوستان سے پیدا ہونے والی ٹیلی ویژن کی گندگی کا اثر پڑ چکا ہے اور بڑھتا جارہا ہے، اتنا بڑھتا جارہا ہے کہ ملائشیا میں جن کو اردو نہیں بھی آتی وہ بھی یہ گندی فلمیں دیکھتے ہیں، انڈونیشیا میں جن کو اردو نہیں بھی آتی وہ بھی یہ گندی فلمیں دیکھتے ہیں، وہاں ان کو سنبھالنے کے لئے کر کیا سکتے تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ ہم گھروں میں داخل ہو کر ان کے بچوں، ان کی بچیوں پر اثر انداز ہوتے اور ان کو اس غلاظت سے بچانے کی کوئی کوشش کر سکتے۔ اوّل تو ایسے لوگ پھر نمازوں سے بھی تعلق توڑ بیٹھے ہیں۔ کبھی جمعہ پر جو رابطے ان کے ہو جایا کرتے تھے اس کی بھی توفیق نہیں ملتی اور رفتہ رفتہ دین سے سرک کر اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ پھر ان تک آواز پہنچنا ہی ممکن نہیں رہتا۔ کیسے ان تک آواز پہنچائیں کہ واپس آجاؤ۔

پس MTA ایک بہت ہی بڑا احسان ہے، اتنا بڑا احسان ہے کہ ناممکن ہے کہ ہم اس کا شکر ادا کر سکیں اللہ تعالیٰ کے حضور۔ سارے عالم میں جو جماعت نے ہم پر تربیت کی ذمہ داری ڈالی اور وہ بڑھ رہی ہے، تبلیغ کے تقاضوں کے بڑھنے کے ساتھ یہ ضرورت اور زیادہ بڑھتی چلی جارہی ہے ہم کیسے ادا کر سکتے تھے۔ ناممکن تھا اور لاکھوں بنا کر ان کو پھر اندھیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یہ کون سی حکمت کی بات تھی۔ اب اللہ کے فضل سے جماعت احمدیہ میں یہ استطاعت ہے کہ یہ نظام مسلسل چوبیس (24) گھنٹے تمام دنیائے احمدیت میں ہر جگہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتیں پہنچائے گا اور دنیا میں کوئی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جو اس نور سے خالی ہو۔ پس جس قدر بھی خدا کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

پاکستان کی جماعتوں کو خصوصیت سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ جائزے لیں کہ کہاں کہاں یہ گندگی ہے اور ان کو سمجھا کر منتیں کر کے ان کو بچانے کی کوشش کریں۔ بعض معین گھروں کے متعلق مجھے علم ہوا ہے کہ رات دو تین بجے تک جاگنا ان کا دستور بن چکا ہے کیونکہ وہ ایک فلم کے بعد دوسری گندی فلم نہ دیکھنے کی زحمت برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ اس گند کے بعد اگلا کیا گند ہے، اس کے بعد پھر اور کیا گند آئے گا، یہاں تک کہ بدن ٹوٹ جاتا ہے تو اس وقت ان کو نیند آتی ہے جب کہ خدا کے بندوں کے جاگنے کا وقت ہوتا ہے۔ تہجد کا سوال ہی کوئی نہیں، صبح کی نماز بھی ضائع جاتی ہے اور ایسے لوگوں کو رفتہ رفتہ ذوق عبادت رہتا ہی کوئی نہیں کیونکہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جہاں رجس ہو جائے وہاں پھر ضرور بت قبضہ کیا کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ توحید وہاں بیٹھی رہے۔ جس کی تم بے حرمتی کرو گے وہ

پھر تمہارے پاس نہیں رہے گی۔ پس ایک ہی ذریعہ ہے کہ ایم۔ ٹی۔ اے کی طرف ان کو واپس لایا جائے اور اب اللہ کا فضل ایسا ہے کہ اس کا رخ اتنا بدل گیا ہے ان گندے پروگراموں سے کہ ان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر روز بار بار اس کا رخ تبدیل کریں۔

پس یہ اللہ کا احسان ہے اور جوں جوں وقت گزرے گا انشاء اللہ ہمارے پروگرام اور بہتر بھی ہوں گے اور اور متنوع بھی ہوتے چلے جائیں گے۔ ابھی ابتدائی دقتیں بہت زیادہ ہیں۔ بڑی بڑی مشینیں ہیں جن کا سمجھنا ہی بہت پر پیچ کام ہے اور اس کے لئے والنٹیئر ز (Volunteers) کا دن رات اس پر نگران رہنا اور بر وقت صحیح کل کو دبانا اور غلط کل کو روک دینا، یہ بھی حیرت ہوتی ہے دیکھ کر ان نو جوانوں کو جب میں سٹوڈیو میں دیکھتا ہوں کہ کس طرح ان کی انگلیاں ٹھیک چلی جاتی ہیں تو لگتا ہے ایک بڑا جھنجھٹ ہے جیسے کوئی پائلٹ بہت ہی جدید قسم کا ہوائی جہاز اڑا رہا ہو پائلٹ اس کو جس طرح بڑے وسیع علم کی ضرورت ہے ورنہ اس کا ہاتھ صحیح Knob کی طرف جا ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح یہ نظام بھی بہت پیچیدہ نظام ہے۔ اس کا توازن قائم رکھنا اس کی اور بہت سی ایسی ضروریات ہیں جن کو گنا نہیں جا سکتا عام مجلس میں، کیونکہ وہ ٹیکنیکل تفاصیل ہیں کہ ان کو سمجھے بغیر، ان پر عبور حاصل کئے بغیر ہم اس نظام کو پوری طرح برمحل استعمال نہیں کر سکتے۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے جوں جوں وقت آگے بڑھے گا ہمارے والنٹیئر ز (Volunteers) اور تیار ہوتے چلے جائیں گے اور خدا کے فضل سے عارضی روکیں جو تھیں وہ دور ہو جائیں گی۔

اب آخری پہلو آخری امر جس کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دلچسپی کا انسانی فطرت سے ایک گہرا رابطہ ہے کہ محض یہ کہہ کر کہ گندگی سے بچو آپ ان کے رخ پاکیزگی کی طرف پھیر نہیں سکتے۔ تحویل قبلہ کے وقت جو رخ بدلے ہیں وہ اللہ اور رسولؐ کی محبت کی وجہ سے بدلے ہیں ورنہ پرانی رسموں کو انسان اچانک چھوڑ نہیں سکتا۔ وہ محبت اتنی قوی تھی کہ جیسے طاقتور مقناطیس کم طاقتور مقناطیس سے اس سوئی کا منہ چھین لیتا ہے جو کسی کم طاقت ور مقناطیس کی طرف مڑی ہوئی ہو۔ اس بیماری کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں میں دنیا کی گندگی کا مقناطیس زیادہ طاقتور ہے اور وہ لوگ جو پاک ہیں ان کے دل میں تو ہمیشہ ہی ایک مقناطیس ہے دوسرا ہے ہی کوئی نہیں۔ ان کا قبلہ تو ہمیشہ درست رہے گا۔ جو بیچ کے لوگ ہیں ان کے لئے ہمارا بھی فرض ہے کہ اپنے مقناطیس کی طاقت کو

اس طرح بڑھائیں کہ کچھ ان کی دلچسپیاں بیچ میں شامل ہو جائیں۔ کچھ تو ایسے سامان ہوں کہ جس کے نتیجے میں وہ دیکھیں تو پھر نظریں ٹکی رہ جائیں اور رفتہ رفتہ ان کے ذوق درست ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ ان کو ہمارے پروگراموں سے محبت ہونے لگے۔

اس سلسلے میں مَیں نے دنیا بھر کی جماعتوں سے اپیل کی تھی کہ صرف تقریروں کے پروگرام ہمیں نہیں چاہئیں، دلچسپ پروگرام بنا کے بھیجیں۔ مختلف ملکوں کی مختلف ایسی جو جغرافیائی یا نباتاتی یا تمدنی یا معدنیاتی یا زندگی سے تعلق رکھنے والی ایسی خصوصیات ہیں جن میں فی ذاتہٖ انسان کو دلچسپی ہوتی ہے ان کو اس طرح پیش کرنا کہ ایک انسان خواہ اس کو نیکی سے محبت ہو بھی یا نہ ہو وہ اس چیز کو دیکھے تو انسان کی عالمی توجہ کی دلچسپی ہوتی ہے ان باتوں میں، اس ذریعے سے وہ اس کے ساتھ وابستہ ہو جائے، اس کے ساتھ اس کا دل لگ جائے، یہ ہمارا فرض ہے۔ بیچ بیچ میں جو خالص نیکی کے پروگرام آئیں گے ان سے بھی پھر ان کی محبت بڑھنی شروع ہو جائے گی کیونکہ ذوق پیدا ہو جائے گا۔ پہلے ذوق کو درست کرنا پھر اس کو بڑھانا، اس کی تربیت کرنا یہ بہت ہی وسیع کام ہے جو محض مشینوں سے نہیں ہوسکتا، محض چوبیس (24) گھنٹے کے ٹیلی ویژن سے نہیں ہوسکتا اس کے لئے ذہن اور فدائی دماغوں کی ضرورت ہے۔ وہ تجربے کریں اور ہر ملک میں باقاعدہ نگرانی میں ایسے پروگرام بنیں جو کثرت کے ساتھ اپنے ملک کے ایسے حالات کو نمایاں طور پر پیش کرسکیں جس میں غیروں کو دلچسپی ہو، صرف احمدیوں کو نہیں، انسان کو بحیثیت انسان دلچسپی ہو۔

اب افریقہ ہے، ہم سمجھتے ہیں افریقہ ایک اندھیری جگہ ہے حالانکہ افریقہ کے اندر بڑے نور ہیں۔ بہت ہی خدا تعالیٰ کے فضل سے عظیم خوبیاں ہیں اس ملک میں رہنے والوں کی، ان کے علاقوں کو خدا تعالیٰ نے بڑی بڑی نعمتوں سے نوازا ہے، ان کے حالات، پھر ان کے سابقہ رسم و رواج کا بیان کرنا، پھر کس طرح ان پر عیسائیت نے قبضے کئے، کس طرح اللہ تعالیٰ نے احمدیت کو ان کو اس چنگل اور پھر شرک کے چنگل سے نجات دینے کی توفیق بخشی اور اس تعلق میں خدا تعالیٰ کی طرف سے جو اعجاز ظاہر ہوتے رہے ہیں ان کا بیان ایک ایسا بیان ہے جو دہریہ کے لئے بھی بالآخر دلچسپی کا موجب بن جاتا ہے۔ کئی مجھے ایسے خط ملے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو بالکل دہریہ اور بے تعلق تھا اس نے جماعت احمدیہ کے MTA کے پروگرام دیکھے تو محض اس وجہ سے اس کو دلچسپی پیدا ہوئی

کہ اس کو نظر آیا کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور اس کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ جو دہریہ تھا وہ نہ صرف باخدا ہوا بلکہ اس نے پہچان لیا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں خدا ملے گا۔ پس باخدا لوگوں کے تجارب بھی تو دنیا کے سامنے پیش کرنے ہیں اور ہر ملک سے پیش ہونے چاہئیں۔ ہر جگہ خدا کے فضل ایسے نازل ہور ہے ہیں جہاں یہ تجارب بڑی قوت کے ساتھ لوگوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ سچ ہیں۔

پس سچائی کی طاقت ہے جو توحید کی تائید کے لئے آپ کے کام آئے گی۔ جھوٹ اور مکر کی طاقت ہے جو مشرکین کے کام آرہی ہے۔ تو یہ ٹکر ہے اور اس چیلنج کو ہم نے قبول کیا ہے اور کریں گے اور توحید کی خدمت کے تمام تقاضے پورے کریں گے۔ ہم ان بزدلوں میں سے نہیں ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دشمن بڑا طاقت والا ہے، پیٹھ دکھا سکیں۔ ہم توحید کے لئے سینہ سپر ہو کر آخری دم تک کوشش کرنے والے لوگ ہیں۔ کبھی دنیا ہمیں پیٹھ دکھاتے ہوئے نہیں دیکھے گی۔ پس اس کے وہ طریق اختیار کریں جو خدا تعالیٰ نے ہمیں سکھائے ہیں قرآن کریم میں اور اسی آیت کے اندر یہ مضمون ہے کہ تم اگر سچائی سے چمٹ جاؤ گے تو یہ توحید کا نشان ہے اور یہ شرک کو اجازت نہیں دے گا کہ تمہارے اندر داخل ہو جائے۔ اب یہ سچائی کا مضمون بھی بہت پھیلا پڑا ہے وہ لوگ جو گندگی اختیار کرنے والے ہیں آپ ان کے معاشرے میں جا کر دیکھیں، ان کی باتیں سنیں اکثر جھوٹ کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے بچے ان کے بڑے بات بات پہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ ان کی مجالس میں اکثر جھوٹ کی بکواس کو مذاق سمجھا جاتا ہے اور کوئی عار ہی نہیں رہتی جھوٹ ہے۔ تو وہ جو کلام کا جھوٹ سے وہ ان کی زندگی کا جھوٹ بن جاتا ہے۔ وہ زہر ان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ منحوس تصویریں ابھرتی ہیں جو دنیا کے ایسے ہیروز کی، ایسے اداکاروں کی پرستش کرنے لگتی ہیں جن کو دنیائے اداکاری میں بھی کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ جن کے سکرپٹ لکھنے والے بے ادب لوگ یعنی ادب سے عاری اور بے ادب۔ وہ شعریت کے نام پر شعریت کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ ایسا بھونڈا مذاق ہے کہ کوئی شریف انسان جس میں ذرا بھی ذوق کی قدر ہو وہ تھوڑی دیر بھی یہ پروگرام دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن مذاق بگاڑ دیئے گئے ہیں۔

تو ایک بات یاد رکھیں کہ ہم نے اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب کو اور تمام دنیا کی جماعتوں کو جھوٹ سے پاک کرنا ہے اور جھوٹ سے پاک کرنے کی مہم جاری ہونی چاہئے اور اگر طبیعت میں سچائی

پیدا ہو جائے تو ساری دوسری بدیوں کا ازالہ کر دیتی ہے۔ تو ایک طریق تو یہ ہے کہ اس رجس سے ان کو چھڑائیں جو لازماً جھوٹ پر منتج ہوگا اور بت پرستی کے ذریعے داخل ہوگا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ایسے رجس سے پناہ مانگو، دور ہٹو جو ضرور بتوں تک پہنچا دے گا اور یاد رکھو قَوْلَ الزُّوْرِ سب سے خطرناک بت جھوٹی بات ہے، جھوٹ کا قول ہے، جھوٹ کی عبادت ہے۔ تو بعض دفعہ ایک سرے سے مہم چلائی جاتی ہے، بعض دفعہ دوسرے سرے سے چلائی جاتی ہے۔ اب وقت ہے کہ ہر سمت سے مہم چلائی جائے۔ منتیں کر کے جس طرح بھی ہو، سمجھا کر ان لوگوں کو اس گندگی سے نکالنے کی کوشش کریں اور ان کو سمجھائیں کہ ان لغویات سے منہ موڑو اور اپنا قبلہ سیدھا کرو۔ خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک عظیم الشان زندگی بخش نظام جاری فرما دیا ہے۔ اس میں اگرچہ ویسے گندے پروگرام تو نہیں جو ہر انسان کو اس کی نفسانی لذّات کی وجہ سے فوراً ویسے ہی کھینچ لیں مگر ایسے پاکیزہ پروگرام ہیں جو ذوق کو بلند کریں گے اور ایسا لطف دیں گے جو باقی رہنے والا ہے۔ اس کے بعد کوئی سر دردی اور کوئی نفس کی ملامت نہیں ہوتی ورنہ یہ لوگ جس گندگی سے لطف اٹھاتے ہیں ساری رات کے بعد وہ سارے دن کی سر دردی بنا رہتا ہے۔ اچھے کاموں سے محروم، صحیح مطالعہ سے محروم، اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے دور ہٹتے ہوئے اور لطف اٹھاتے ہوئے ایسی بے چینی دل میں محسوس کرتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ساری گندگی ہم اپنے اندر داخل کر لیں اس سے چمٹ جائیں اور وہ چیزیں جو دور سے اچھی دکھائی دیتی ہیں ہمارے قریب آجائیں تو حسرتیں پیدا ہوتی ہیں جن کو پورا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ ایکٹر اور ایکٹرسیں جو ان کی زندگی کا مرکز بن گئے ہیں ان کی تعداد اگر ان کے حواری و حواشی مواشی سارے اکٹھے کر لو تو زیادہ سے زیادہ بیس تیس ہزار ہوگی، ایک لاکھ بھی بنا لو تو ان کے پہلے دعوے دار تو ہندوستان کے ایک ارب باشندے ہیں یا ایک ارب کے لگ بھگ۔ وہ ایک لاکھ ایک ارب میں کیسے تقسیم ہوں گے اور کتنے بچیں گے کہ پاکستان کے دس بارہ کروڑ کے ہاتھ آئیں اور ہو کیسے سکتا ہے کہ ان سے وہ اپنی نفسانی لذّت، بھوک کی تسکین کر سکیں۔ اس کا نام سراب ہے۔ جس کو قرآن کریم میں دوسری جگہ یوں بیان فرمایا کہ بے وقوف اندھے دن کی روشنی میں اندھیروں کی پیروی کر رہے ہیں، ایسی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو ہاتھ آ ہی نہیں سکتیں۔ پیاس کو بڑھاتی ہیں مگر پیاس کو بجھانے کی ان میں صلاحیت ہی

نہیں ہے۔صلاحیت اس لئے نہیں کہ وہ تھوڑے لوگ ہیں اور ہر انسان کی پہنچ سے بہت دور ہیں اور اگر دس بارہ کی پہنچ میں ہوں تو ان کے لئے ناممکن ہے کہ دس بارہ کی تسکین بھی پوری کرسکیں، اپنی نہیں ہوتی ان کی۔خودکشیاں کر لیتے ہیں اپنی عمروں کے بعد کیونکہ جتنے پرستار ہیں وہ بھی جھوٹے نکلتے ہیں۔

اوران کے جو Confessions ہیں وہ آپ پڑھیں جو انگلستان اور یورپ کے ایکٹرز سے تعلق رکھنے والے ہیں مستند مل جاتے ہیں۔ بڑی بڑی ایسی معبودائیں، جو جھوٹی معبودائیں تھیں، ان کا انجام یہ ہوا کہ خودکشی کر کے مرگئیں۔ بڑے بڑے ایکٹرخودکشی کر کے مرگئے کہ تم ہمیں دور سے دیکھ کر پرستش کر رہے تھے اندر دیکھو تو سہی کہ آگ کے سوا ہے ہی کچھ نہیں۔پس ان بتوں کی پرستش کر کے تمہیں ملے گا کیا۔ساری رات عبادت کرو گے، سارا دن ان کی بدمزگی میں مبتلا رہو گے، دل میں امنگیں بھڑک اٹھیں گی اس کو بھی حاصل کرلو اس کو بھی حاصل کرلو۔نہ یہ حاصل ہوگا نہ وہ حاصل ہوگا۔صرف تصویروں کی پرستش کر سکتے ہو،اس کو سینے سے لگا سکتے ہو،اس کو چمٹ سکتے ہو،اسے پیار کر سکتے ہو،اسے خوب صورت فریموں میں جکڑ سکتے ہو،اس سے زیادہ تمہارے کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔مگر کیا تصویر بھی کبھی دل بہلا سکتی ہے۔متحرک تصویر بھی نہیں بہلا سکتی، کھڑی تصویر بھی نہیں بہلا سکتی۔ہاں تصویر سے وابستہ مضامین بعض دفعہ تسکین بخشتے ہیں۔مگر ان تصویروں سے وابستہ تو کوئی مضمون بھی ایسا نہیں جو دل کی تسکین کا موجب بن سکے۔صرف آگ بھڑکانے والے مضامین ہیں اور ہر شخص جانتا ہے، جس کو یہ تجربہ ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ میں جھوٹ کی پرستش کر رہا ہوں۔ایک بھڑکی لگی رہتی ہے جو بجھتی نہیں سمجھ نہیں آتی کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔جتنا آگے بڑھتے ہیں پیاس بڑھتی چلی جاتی ہے۔یہ سمندر کے پانی پی کر پیاس بجھانے والے جاہل سوائے اس کے کہ ہلاکتوں کی طرف بڑھ رہے ہوں اور ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

تو معاشرے کو نگران ہو جانا چاہئے۔احمدی نظام کو ہر جگہ مستعد ہو جانا چاہئے۔ جہاں جہاں یہ بیماریاں داخل ہو رہی ہیں ان کا دائرہ کرلیں کیونکہ وہ فحشاء کی بیماریاں ہیں جو پھیلنے والی ہیں۔ایسی بیماریاں ہیں جو آگے لگیں گی اور پھر سارے معاشرے کو بے کار کر دیں گی۔اس لئے ان کے گرد گھیرے ڈال لیں تا کہ ان کا گند آگے دوسرے پاک گھروں میں منتقل ہی نہ ہو سکے۔ بائیکاٹ اس طرح نہ سہی مگر جو جانے والے ہیں ان کو سمجھائیں تو سہی۔ جب بھی وہ ایسا گند دیکھیں اٹھ کر آجائیں

وہاں سے کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تم نے یہ کرنا ہے تو ہمارا آنا جانا تمہارے گھر میں منقطع ہو جائے گا۔ جو بھی ذریعے اختیار کریں نیچے سے اوپر کی طرف سفر کریں یعنی رجس سے پاک کریں۔ آخری مقام یعنی جھوٹ کے قلع قمع کرنے کے ذریعے سے سفر اختیار کریں اور معاشرے سے جھوٹ کی بیخ کنی کے پروگرام بنائیں۔ کسی بچے کا جھوٹ برداشت نہ کریں چاہے وہ مذاق میں ہو۔ یہ وہ ایک صورت ہے جس کے نتیجے میں یہ جو بہت بڑی اور بھیانک جنگ ہمارے سامنے ہے، معاشرتی خباثتوں سے اپنے خاندانوں کو اگلی نسلوں کو پاک اور محفوظ رکھنا، یہ نصیب ہوگی تو پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے MTA کا فیض بھی عام ہونا شروع ہو جائے گا اور جب ذوق درست ہوں گے تو پھر اس مضمون میں بھی لوگوں کو دلچسپی ہوگی جو MTA کا مضمون ہے یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتیں اور معلومات جو حق پر مبنی ہیں اور مصنوعی نہیں ہیں، جو سر تا پا سچ ہیں۔

ایسا ایک نظام ٹیلی ویژن کا جس میں اداکاری کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے یہاں تک کہ جب ایک عرب عورت نے ایک خبر پڑھنے والے کو اس طرح دیکھا کہ اس نے ایک پاؤں موٹر کے اوپر رکھا ہوا تھا ایک باہر تھا تو مجھے احتجاج کا خط لکھا۔ ابھی وہ احمدی نہیں ہوئی تھیں اب خدا کے فضل سے مخلص احمدی بن چکی ہیں۔ اس نے کہا مجھے تو آپ کے پروگرام سے محبت اس لئے تھی کہ محض سچ ہے اس میں کوئی بھی اداکاری نہیں۔ جب آپ کھانا کھا رہے ہوتے ہیں جب بیٹھے ہوئے بچوں کے چہرے مہرے اور زبان پر ہو جو آپ کے ارد گرد بیٹھے ہوتے ہیں۔ کہتی ہیں میں تو Fascinate ہو جاتی ہوں ان باتوں سے، کہ شکر ہے خدا کا کہ ایک ٹیلی ویژن تو ایسا ہے جو سچ پر مبنی ہے۔ کہتی ہیں جب میں نے اس خبریں پڑھنے والے کو دیکھا جو مصنوعی اداکاروں کی نقل کر رہا ہے اور اپنی طرف سے خبروں کا معیار بڑھا رہا ہے تو اسی وقت میرا دل بے قرار ہو گیا، میں نے کہا ابھی آپ کو لکھتی ہوں کہ خبروں کا معیار بڑھا نہیں رہا، گرا رہا ہے۔ آپ کی خبروں کا معیار تو سچائی سے اونچا ہوتا ہے۔ آپ کے ٹیلی ویژن کا تو لطف ہی یہ ہے کہ اس میں کوئی اداکاری کا دخل نہیں۔ پس جوں جوں آپ سچ کی خدمت کریں گے، سچ کا ذوق بڑھائیں گے MTA کو اللہ تعالیٰ نئی وسعتیں عطا فرمائے گا، نئے افق عطا فرمائے گا اور جوں جوں MTA کے ساتھ لوگوں کا تعلق بڑھے گا انشاء اللہ تعالیٰ وہ اسلام کی قدروں کے دائرے میں آجائیں گے اور پھر ان کو باہر نکلنے کا وہم بھی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ یہ وہ دائرہ

ہے جو دن بدن ان کو بڑی قوت کے ساتھ خدائے واحد اور محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف کھینچ لے گا۔ اللہ کرے کہ ہمیں ان تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا ہو۔ آمین

مذہب کے نام پر کسی دوسرے انسان کا حق سلب کرنے کی دنیا کا کوئی مذہب اجازت نہیں دے سکتا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 10 رمئی 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

(الرعد: 10 تا 12)

پھر فرمایا:

یہ وہ آیات کریمہ ہیں جن کی گزشتہ خطبہ میں بھی میں نے تلاوت کی تھی اور انہی کے حوالے سے جھوٹ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے جھوٹ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ آج کے جمعہ کے لئے بھی میں نے انہی آیات کو عنوان کے طور پر چنا تھا تا کہ اس مضمون کے وہ پہلو جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقتباسات کے حوالوں سے میں نے پیش کرنے تھے اور گزشتہ جمعہ پہ رہ گئے تھے ان کو انہی حوالوں سے دوبارہ بیان کروں یعنی مضمون تو وہی ہوگا مضمون دوبارہ ہوگا مگر وہ پہلو دوبارہ نہیں ہوں گے، وہ نئے پہلو ہیں جو آپ کے سامنے آئیں گے۔

اس دوران یعنی گزشتہ خطبہ اور اس جمعے کے دوران مختلف جگہوں سے ایسے خطوط آنے

شروع ہوئے کہ جو اگلا جمعہ ہے وہ Friday The 10 th ہے یعنی مئی کی دس تاریخ ہوگی اور جمعہ ہوگا اس لئے Friday The 10 th کے حوالے سے دیکھیں کیا ہوتا ہے اور زیادہ تر رجحان اس طرف تھا کہ میں اسی کو جمعہ کا موضوع بناؤں اور جہاں تک گردوپیش پر نظر ڈالنے کا تعلق ہے مجھے کوئی ایسی نئی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی جس کو Friday The 10 th کی اہمیت کے ساتھ باندھ کر میں پیش کرسکوں۔ اس لئے کوئی ارادہ بھی نہیں تھا کہ اس پر گفتگو کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون پہلے بارہا روشن کیا ہے۔ بارہا ایسے جمعہ آئے ہیں جو دسویں جمعہ تھے اور خدا تعالیٰ نے کئی قسم کے نشان دکھائے اور انذار بھی جاری فرمائے۔ تو یہ ضروری نہیں کہ قیامت تک اب Friday The 10 th کا کشف جو ہے وہ ضرور اس جمعہ کو ہمیشہ اسی طرح پورا ہوتا رہے۔ بعض اوقات ایک خوشخبری آتی ہے یا ایک انذار جو ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ پورا ہوا یا پھر وقفے کے بعد، لمبے انتظار کے بعد ایک دفعہ پھر بھی پورا ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کئی ایسے الہامات ہیں جو یہ رنگ رکھتے ہیں۔ اس لئے اوّل تو جماعت کا یہ خیال کر لینا کہ گویا کیونکہ مجھے خدا تعالیٰ نے کشفاً Friday The 10 th کو دکھایا اور بار بار چمکتے ہوئے دکھایا اس لئے ضرور ہر Friday The 10 th کو کوئی نشان ہوگا یہ درست نہیں ہے۔

لیکن ایک اور پہلو بھی ہے کہ سب سے پہلا Friday The 10 th جو خدا تعالیٰ کی طرف سے دکھائے جانے والے اس کشف کے بعد آیا تھا اس میں دو بڑے نمایاں انذاری نشان تھے اور بسا اوقات انذار کے ساتھ تبشیر بھی وابستہ ہوتی ہے، بشارتیں بھی وابستہ ہوتی ہیں اور اس وقت میں نے اس مضمون پر روشنی ڈالی تھی کہ انذار کی کوکھ سے بھی بسا اوقات بشارتیں جنم لیا کرتی ہیں اور اس پہلو سے انذار محض کوئی ڈرا کر جان نکالنے والا مضمون نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر انذار سے فائدہ اٹھاؤ گے تو بہت سے نقصانات سے بچ سکو گے اور اگر باز نہیں آؤ گے تو جن کے لئے یہ انذار کا نشان ہے وہ تو مٹا دیئے جائیں گے مگر جن کے حق میں یہ نشان ہے ان کو بشارتیں عطا ہوں گی۔ اب دیکھیں حضرت نوحؑ کا جو سیلاب کا واقعہ ہے یہ بھی تو ایک انذاری نشان تھا مگر ایسا انذاری نشان جس نے ایک طرف تو ایک قوم کی صف لپیٹ دی۔ دوسری طرف آنے والی سب قوموں کا باپ نوحؑ کو بنا دیا اور دور دراز تک بہت وسیع علاقوں میں حضرت نوحؑ کے فیض کو جاری فرمایا یہاں تک کہ چین میں بھی حضرت نوحؑ کی طرح کے ایک بزرگ کا ذکر ملتا ہے جسے خدا تعالیٰ نے سیلاب کا نشان دیا تھا اور ہندوستان میں بھی

ایسے ایک سیلاب کا ذکر ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انذار جتنا بڑا ہو اس کے ساتھ تبشیر بھی اتنی ہی بڑی وابستہ ہوا کرتی ہے۔

آج میں نے کیوں یہ مضمون چھیڑا ہے جب کہ میں نے بیان کیا کہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ آج کی خبروں میں ہندوستان میں رونما ہونے والے بعض واقعات جب صبح میں نے دیکھے تو معاً میری توجہ اس پہلو پر گئی کہ یہ ایک بہت بڑا انذاری نشان ہے جو مسلمانوں کو ہوش دلانے کے لئے اور اپنے اعمال کو درست کرنے کے لئے دکھایا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں ایک پارٹی جس کا نام بھارتیہ جنتا پارٹی ہے، ابھی حالیہ انتخاب جو ہوئے ہیں آج صبح اخبارات میں جو ان کے نتائج میں نے دیکھے تو اس وقت میری توجہ اچانک اس طرف مبذول ہوئی کہ آج کے دن یہ بھی ایک انذاری نشان کا رنگ رکھنے والا واقعہ ہے۔ کبھی بھی بھارت میں ایسے نہیں ہوا تھا کہ تشدد پرست، یعنی لوگوں کی نظر میں تشدد پرست اور اپنے آپ کو وہ کہتے ہیں تشدد سے پاک ہیں، ایک خالصتاً مذہبی جماعت جو ہندومت کے نام پر ابھری ہو اسے اکیلی کو باقی سب جماعتوں پر اکیلے اکیلے اگر مقابلہ کیا جائے تو اکثریت حاصل ہوگئی ہے یعنی ہندو جنتا پارٹی کو بحیثیت پارٹی ہندوستان میں سب سے زیادہ ووٹ ملے ہیں اور کانگریس بھی پیچھے رہ گئی ہے اور نیشنل پارٹی بھی پیچھے رہ گئی ہے اور آزاد ممبران اور متفرق چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بھی پیچھے رہ گئی ہیں۔

یہ ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور اس کے اثرات ہندوستان تک محدود نہیں رہیں گے۔ لازماً اس کا اثر گردوپیش کے ممالک پر بھی پڑے گا اور خصوصیت سے پاکستان اور کشمیر پر یہ بات اثر انداز ہوگی اور کچھ تعلقات کے دائرے بدلیں گے، کچھ ایسے واقعات رونما ہوں گے جن کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے دونوں طرف اللہ تعالیٰ عقل و فہم عطا کرے اور اپنے مذہبی جنون کو مناسب حد اعتدال تک لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو انذار کے اندر سے تبشیر کے نکل سکتے ہیں۔ مگر کیا ہوتا ہے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ جن آیات کی میں نے تلاوت کی ہے ان کا ان حالات پر بھی بعینہٖ اسی طرح اطلاق ہو رہا ہے جیسے دوسرے مضمون پر ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ وہی ایک خدا ہے جو عٰلِمُ الْغَيْبِ بھی ہے اور عٰلِمُ الشَّهَادَةِ بھی ہے۔ وہ اس کو بھی جانتا ہے جو غیب میں ہے لیکن

اس کو بھی جانتا ہے جو سامنے ہے اور ہم اس کو بھی نہیں جانتے جو ہمارے سامنے ہے۔ جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کو پڑھنے والے سیاسی پنڈت بڑے بڑے مضامین لکھیں گے لیکن امر واقعہ ہے کہ سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ اس کے کیا اثرات رونما ہوں گے لیکن اگر یہ استنباط درست ہے کہ Friday The 10 th کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو میں جماعت کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ جو بھی اثرات رونما ہوں گے جماعت احمدیہ کے حق میں بہتر ثابت ہوں گے اور جو ابتلا آئے گا ہمارا فرض ہے کہ اس ابتلا میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے خصوصیت سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو عقل اور فہم عطا کرے اور اگر اس میں کوئی ان کے لئے آزمائش ہے سر بلندی کے ساتھ گزرنے کی توفیق بخشے۔

الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو ظاہر ہو یا مخفی ہو جو خدا تعالیٰ کے کبر پر منفی رنگ میں اثر انداز ہو سکتی ہو۔ اس کے متعال ہونے پر منفی رنگ میں اثر انداز ہو سکتی ہو۔ ہر قسم کے حالات، ہر قسم کے انقلابات میں سے خدا کبیر اور اکبر کے طور پر ہی ابھرے گا اور اس کی سر بلندی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہ رفعتوں والا ہے وہ متعال ہے وہ رفعتوں والا ہی رہے گا اور متعال رہے گا۔ پس وہ جو اپنا تعلق ایسے خدا سے جوڑ لیں جیسا کہ ہم بھی جوڑے بیٹھے ہیں یعنی جو کچھ بھی ہے ہمارا خدا ہی ہے۔ اس کے سوا دنیا کی نہ کوئی طاقت ہمیں سہارا دینے والی ہے، نہ کسی طاقت کے سہارے کی ہم پرواہ کرتے ہیں تو اس لئے ہمارے لئے تو ایک دوہری یقین دہانی ہے کہ کیسے بھی انقلاب برپا ہوں بالآخر وہ انقلاب ہمارے خدا کے غلبہ پر ہی منتج ہوں گے اور ہم بھی اس غلبہ سے خدا کی وجہ سے فیض پائیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ۔ اب یہ دونوں طرف پاکستان کی طرف سے بھی اور ہندوستان کی طرف بھی ایک اَسَرَّ الْقَوْلَ کا مضمون ظاہر ہوگا اور ایک جَهَرَ الْقَوْلَ کا مضمون بھی ظاہر ہوگا۔ اَسَرَّ الْقَوْلَ کا مطلب ہے وہ اپنی بات کو بتائیں گے، اونچی کر کے سنا کر جتلائیں گے اور دونوں طرف سے یہ دعوے ہوں گے کہ ہم تو صداقت پر قائم ہیں، ہم تو انصاف کے قائل ہیں، ہماری طرف کسی قسم کی بدنیتی منسوب نہیں کی جاسکتی اور اس پارٹی نے ابھی سے یہ اعلان کرنے شروع کر دیئے ہیں کہ لوگ خواہ مخواہ ہمیں بدنام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مذہبی انتہا پسند جماعت ہے اس لئے مسلمانوں پر ظلم ہوں گے، اس لئے

ہم اور بھی خونی انقلاب برپا کریں گے، کہتے ہیں بالکل غلط ہے۔آپ دیکھنا کہ کانگرس سے بھی بڑھ کر ہم انصاف پسند ثابت ہوں گے۔حالانکہ کل تک ان کے اعلانات یہ تھے کہ ہندوستان میں صرف ہندو کی جگہ ہے، مسلمان کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ باہر سے آ کر آباد ہونے والی قوم ہیں ان کو اپنے گھر واپس چلے جانا چاہئیے ۔یا رہنا ہے تو ہمارے سامنے گردنیں جھکا کر رہنا ہوگا، مجال نہیں کہ کوئی ہمارے سامنے گردن اٹھا کے یہاں پھرے۔تو ویسا ہی اعلان ہے جیسا پاکستان میں جماعت احمدیہ کے متعلق پہلے کیا جا چکا ہے۔

''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے''

وہی رسم جو یہاں جاری تھی وہ ہندوستان میں بھی اب جاری کی جا رہی ہے۔مگر احمدی بطور خاص نشانہ نہیں، تمام کے مسلمان اس کا نشانہ بنائے جائیں گے۔ یہ ان کا (فیض احمد فیض) اَسَرَّ الْقَوْلَ ہے یعنی اَسَرَّ الْقَوْلَ سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔ اَسَرَّ تو ماضی کا صیغہ ہے، مطلب ہے جس نے اپنے قول کو چھپایا مگر آیت میں چونکہ اَسَرَّ کا لفظ آیا ہے اس لئے میں اس کے اشارے سے آپ کو سمجھا رہا ہوں۔سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ تم میں سے جو بھی خواہ بات کو چھپائے خواہ اسے ظاہر کرے۔سَوَآءٌ مِّنْكُمْ خدا کے نزدیک سب برابر ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کہہ کیا رہے ہو، اندر سے کیا نیتیں ہیں۔تو دیکھیں اس عنوان کو بدلنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔اسی کے تابع یہ مضمون بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اور قطعی رشتوں کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

جو انقلاب برپا ہو رہا ہے اس میں دعاوی تو کچھ وہ تھے جو پہلے تھے، فتح سے پہلے، وہ تو یہ تھے کہ ہم ہندوستان سے اسلام کا نام مٹا دیں گے۔مسلمان اگر ہماری تہذیب اختیار کر کے، ہمارے رنگ اختیار کر کے اپنی گردنیں ہمارے سامنے جھکا کر رہے گا تو رہے گا ورنہ اسے اس ملک سے باہر نکال دیا جائے گا اور ہندو مذہب کے اوپر عمل ہوگا۔اس بات میں اہل فکر و نظر کے لئے ایک بہت بڑی نصیحت ہے اور بہت بڑا عبرت کا سامان ہے کیونکہ میرے نزدیک اس انتہا پرستی کا ذمہ دار پاکستان کا ملاں ہے۔اگر پاکستان کا ملاں نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ ہندوستان میں مذہبی جاہلیت اس زور کے ساتھ سر اٹھاتی۔امر واقعہ یہ ہے کہ 1953ء کے فسادات کی تحقیق کے دوران اس وقت جو تحقیقی کمیشن کے

دو بڑے منصف تھے جن کا تعلق پاکستان کی سپریم کورٹ سے تھا یعنی جسٹس منیر اور جسٹس کیانی، یہ دونوں بہت بلند عالمی شہرت کے مالک اور ایسے جج تھے جن کے متعلق تمام دنیا میں ان کی قانون دانی ہی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا بلکہ ان کی ذات کی عظمت، ان کی شرافت، ان کی بلند اقدار کی بھی ہمیشہ عزت کی گئی ہے۔ کبھی ان کے اوپر کوئی طعن کا داغ آپ لگتا ہوا نہیں دیکھیں گے۔ بڑے صاحب فراست تھے اور عدلیہ کے مضمون کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے جو 1953ء کے فسادات کی تحقیق کا مطالعہ کیا تو یہ سمجھ گئے کہ ملاں بہت بڑے فساد کی طرف ہمیں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کو بھی لے جا رہا ہے۔ چنانچہ معین طور پر ہر مولوی سے یہ سوال کیا گیا کہ دیکھو تم کہتے ہو اسلام کی بالا دستی کے نام پر تمہیں حق ہے کہ شریعت کو جیسا تم سمجھو، خواہ اس شریعت کو قبول کرنے والا اس سے اختلاف بھی رکھتا ہو اور قرآن ہی کے حوالے سے شریعت کو کچھ اور سمجھتا ہو، مگر تمہیں حق ہے کہ تم جیسا شریعت کو خود سمجھتے ہو دوسرے پر اسی شریعت کو ٹھونسو خواہ وہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف بات ہو۔ انہوں نے کہا ہاں بالکل ہمیں حق حاصل ہے۔ ایک نے بھی نہیں کہا کہ نہیں ہمیں حق حاصل نہیں۔ ہر ایک کی شریعت کا تصور مختلف تھا۔ ہر ایک نے یہ اقرار کیا اور بڑے زور اور فخر کے ساتھ سر بلند کر کے کہا ہاں ہمیں اختیار ہے ہم شریعت کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں خدا کے نام پر اسے جاری کرنے کا ہمیں حق ہے اور یہ ہمارا دستوری اور جمہوری حق ہے، صرف مذہبی حق نہیں۔

اس کے جواب میں ہمیشہ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر یہ جمہوری اور بنیادی حق ہے، محض اسلام سے اس کا تعلق نہیں تو کیا آپ ہندوستان کے ہندوؤں کو یہ حق دیں گے کہ وہ اپنے مذہب میں خصوصیت سے منوسمرتی کے حوالے سے وہ قوانین مسلمانوں پر جاری کریں جو ہر غیر ہندو پر جاری کرنے کا ان کا مذہبی حق ہے اور ان تمام بنیادی حقوق سے مسلمانوں کو محروم کر دیں جو ہندو مذہب کی انتہا پسند کتابیں مسلمانوں کو دینے پر آمادہ نہیں ہیں یا کسی غیر ہندو کو دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ہر مسلمان مولوی کا یہ جواب تھا **''ہاں یہ حق حاصل ہے۔''** اس پر انہوں نے کہا کہ تمہیں کوئی خدا کا خوف نہیں ہے، ذرا بھی حس نہیں کہ کروڑوں مسلمان تم ہندوستان میں پیچھے چھوڑ کے آئے ہو۔ یہاں تم ایسا ظالمانہ مؤقف اختیار کرو گے تو کل ان پر کیا بنے گی۔ ان کے خون کی ہولی کھیلی جائے گی اور تم ذمہ دار ہو گے کیونکہ تم نے جو اپنی ٹیڑھی سوچ کو شریعت کے نام پر پاکستان میں نافذ کرنے کی کوشش کی ہے

یہی کوشش کل ان پر ایک مذہبی جنون طاری کر دے گی اور تمہیں جو مذہبی آزادی کا تصور ہے کہ تم آزاد ہو اور ہر دوسرا غلام ہو یہی مذہبی آزادی کا تصور لے کر ہندو اٹھیں گے اور ہندوؤں کے سوا ہر دوسرا شہری ہندوستان کا ان کا غلام ہو جائے گا اور ایسے ظلم کئے جائیں گے جو تمہاری شریعت میں تصور بھی نہیں کئے جاسکتے۔ مودودی صاحب نے، مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ جواب دیا ہاں میں خوب سمجھتا ہوں اور اس کے باوجود میں اس مؤقف پر قائم ہوں۔ بے شک کریں ان کا حق ہے۔ ہمارا بھی ایک حق ہے، ان کا بھی حق ہے۔

یہ باتیں ہیں جو 1953ء میں دانشور، چوٹی کے عدلیہ کو سمجھنے والے وہ جسٹس، وہ جج جن کا مرتبہ تمام ہندوستان میں مانا گیا انہوں نے اس وقت محسوس کر لیا تھا کہ انتہا پسند ملاں صرف پاکستان ہی کو نہیں پورے ہندوستان کو کس سمت میں لے جارہے ہیں اور آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ تو آج دسویں تاریخ کو جمعہ کو جو یہ اعلان ہو رہے ہیں یہ لازماً کوئی گہرا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ان کو معمولی سمجھ کر ایک اتفاقی ہونے والا الیکشن سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب میں نے یہ خبریں پڑھیں تو سارا پسِ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا جس سے میں واقف تھا کہ اس طرح مولوی کی سازش سے اسلام کے نام پر ظلم کئے جانے تھے اور ان مظالم کی بازگشت کی صدا لازماً ہندوستان سے آنی تھی اور اس کے ذمہ دار یہ لوگ ہیں اور جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے چوٹی کے ججوں نے اس زمانے میں اس بات کو بھانپ لیا اور گویا ایک پیشگوئی کر دی کہ تم ایسا کرو گے تو پھر اس کے لئے تیار رہو۔

آج وہ دن چڑھا ہے جس میں ہندوستان کے مسلمان کو یہ ظلم کا دور دیکھنے کی بدنصیبی بھی نصیب ہوئی ہے۔ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمان پر بہت ظلم ہوتے رہے ہیں، ابھی بھی ہو رہے ہیں لیکن جب یہ ظلم مذہب کے نام پر قانون بن کر کئے جائیں تو بظاہر انفرادی طور پر بھیانک نہ بھی دکھائی دیں قوموں کی روح کچلی جاتی ہے۔ ایک بڑے وسیع پیمانے پر قوم قتل کی جاتی ہے۔ اب یہ جو قومی قتل ہے یہ انفرادی قتل اور انفرادی ظلم سے بہت زیادہ سنگین بات ہے۔ ہندوستان میں مسلمان پہلے ہی اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جب ان کی تمام تہذیبی اقدار کو یکسر پامال کر دیا جائے گا اور اس قانونی حق سے محروم کر دیا جائے گا کہ اسلام ایک مذہب ہے جسے اختیار کرنے کی جیسا کہ مسلمان سمجھتے ہیں ان کو اجازت نہیں۔ تو پھر جو بھیانک نقشہ نمودار ہوگا اس کا آپ اس وقت تصور

بھی نہیں کر سکتے۔احمدی اس دور سے گزر رہے ہیں۔احمدی جانتے ہیں کہ پھر ایسے دلوں پر کیا گزرتی ہے جن کے بنیادی مذہبی حقوق ان سے چھین لئے جائیں اس نام پر کہ ہم جو مذہب کا مطلب سمجھتے ہیں ہمیں حق ہے کہ اس کے مطابق عمل کریں تم جو مذہب کا مطلب سمجھتے ہو تمہیں حق نہیں ہے کہ اس کے مطابق عمل کرو کیونکہ تم ایک اقلیت ہو۔

بالکل یہی دلیل ہے سو فیصد، جس کے نتیجے میں اس پارٹی نے بعض دوسری باتوں سے تو توبہ کی ہے مگر اس بات سے توبہ نہیں کی اور فتح کے بعد بھی قائم ہے اس بات پر اور الیکشن میں قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو جو حقوق اپنے مذہب پر عملدرآمد کے دیئے گئے تھے ہم وہ سارے حقوق واپس لے لیں گے کیونکہ ایک ملک میں دو مذہبی حکومتیں جاری نہیں ہوسکتیں۔تو یہ تو ابھی آغاز ہے آگے آگے دیکھئے کہ ہوتا کیا ہے۔پس بہت ہی تاریخ ساز دور میں ہم داخل ہوئے ہیں جو تاریخ ساز بھی ہے اور جس کا آغاز بہت ہی بھیانک ہے اور بہت ہی دل پر ایک لرزہ طاری کرنے والا آغاز ہے۔لیکن جن کی آنکھیں ہیں وہ دیکھیں گے جن کی آنکھیں نہیں ہیں وہ اندھے مارے جائیں گے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کو اب بھی یہ ضرورت ہے کہ اپنے حالات پر نظر ثانی کرے۔مذہب کے نام پر ظلم اوّل تو بہت بڑی جہالت ہے مگر چونکہ خدا کے نام پر کیا جاتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ کبھی ایسے لوگوں کو بے سزا نہیں چھوڑا کرتا۔لمبے عرصے تک ایسی قوموں کو سزائیں ملتی ہیں اور وہ ان سزاؤں میں پیسے جاتے ہیں۔

یورپ کی تاریخ میں سپین کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔سپین میں عیسائیت کے نام پر اور عیسائیت کی سر بلندی کے نام پر پہلے مسلمانوں پر ظلم کئے، پھر یہود پر ظلم کئے، پھر عیسائیت کے دوسرے فرقوں پر ظلم کئے اور اس دن کے بعد سے یہ عظیم ملک جو پہلے بہت عظیم تھا ایسا تاریکی میں ڈوبا ہے کہ آج بھی یورپ کا سب سے پیچھے رہ جانے والا ملک ہے۔یہ سوال اٹھتے رہے ہیں، دانشور اس پر گفتگو کرتے رہے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سپین کی قسمت میں ایک بدنصیبی گویا لکھ دی گئی ہے۔سارا یورپ ترقی کر رہا ہے اور یہ سب سے پیچھے رہ گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ سپینش اثر جہاں جہاں پہنچے ہیں اُن سب کو ہی یہ ملک لے ڈوبا ہے۔Latin America جس کو کہتے ہیں وہ دراصل سپینش امریکہ ہے۔یعنی سپین کے نفوذ والا وہ جنوبی امریکہ جس پر شروع سے ہی سپین کا تسلط رہا اور اب بھی

وہاں سپینش طرزِ فکر کی حکومت ہے اور معدنیاتی ذرائع کا جہاں تک تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ نے جنوبی امریکہ کو شمالی امریکہ سے کم عطا نہیں فرمائے۔ بہت ہی غیر معمولی طور پر زرخیز بھی ہے اور معدنیاتی دولتیں بھی اس کو عطا فرمائی گئی ہیں لیکن دنیا کے غریب ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ اس پہلو سے کہ جتنا قرضہ سارے جنوبی امریکہ نے عالمی بینک اور دوسرے اداروں کا دینا ہے اگر ان کی ساری زمینیں بھی بک جائیں تو وہ قرض ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کی Re-Servicing میں ان کی ساری دولت خرچ ہو رہی ہے یعنی جو Debt Re-Servicing کہلاتی ہے، قرضہ اتارنے کے لئے توفیق نہیں ہوتی بالآخر سود دینے کی بھی توفیق نہیں رہتی۔ جنوبی امریکہ کی حکومتیں وہ قرضے کا سود اتارنے میں ہی اس وقت مصروف ہیں اور ان کو اصل زر اتارنے کی توفیق ہی کوئی نہیں، نہ ہو سکتی ہے، نہ کوئی نظر آتی ہے۔ لوگ جو دانشور اس سوال پر غور کرتے ہیں اپنی کتابوں میں لکھ چکے ہیں کہ بنیادی وجہ اس کی یہ ہے کہ سپین نے اس دور میں جو مظالم کئے تھے خصوصیت سے وہ مسلمانوں کے مظالم کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہود پر جو مظالم کئے تھے وہ ان کو بہت مہنگے پڑے ہیں لیکن ظلم خواہ یہود پر ہو یا ہنود پر ہو یا مسلمان پر ہو ظلم، ظلم ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ ظالم کو ضرور اس کے ظلم کی سزا دیتا ہے، جلد پکڑتا ہے یا بدیر پکڑتا ہے پکڑتا ضرور ہے۔ پس یہ جو تاریخی جرائم ہیں ان کا جرائم کا دور بھی لمبا ہوا کرتا ہے اور پکڑ کا دور بھی بعض دفعہ بہت دیر میں آتا ہے۔ بعض دفعہ قومیں ان واقعات کو بھول بھی جاتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نہیں بھولتا۔

قرض ہے واپس ملے گا تجھ کو یہ سارا ادھار

(درثمین: 151)

یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو اعلان ہے یہ قرآنی صداقتوں پر مبنی ہے۔ پس جب تم نے ایک ظلم کا دور، خدا کے نام پر ظلم شروع کیا اور خدا کے ان بندوں کو جن کو سب سے زیادہ اسلام سے محبت تھی سب سے زیادہ عشاق محمد مصطفیٰ ﷺ تھے اسلام کے دشمن اور رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرنے والوں کے طور پر مجرم بنا بنا کر عدالتوں میں پیش کیا تو کیسے تم خدا کی پکڑ سے اور اس کے غیظ سے بچ سکتے ہو۔ یہ قانون بن گیا ہے۔ انفرادی طور پر تو احمدیت کو عادت ہے ہمیشہ ہی مظالم دیکھتی رہی ہے اور کبھی کسی جگہ کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ہم جانتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں انفرادی طور پر مذہبی جماعتوں کو مظالم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، قربانیاں دینی

پڑتی ہیں۔ شروع سے ہی ہم دیتے آئے ہیں۔ مگر جب حکومت قانون سازی کے ذریعے ظلم شروع کرتی ہے تو پھر قوموں کے قبضہ اختیار میں یہ بات نہیں رہتی۔ اس وقت ان کی قوم کی زندگی اور سلامتی پر حملہ ہوتا ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جو فرعون کے حوالے سے قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور کسی اور حوالے سے اس طرح بیان نہیں فرمایا۔ فرعون نے قانون سازی کر کے بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لئے زندگی کے حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی تھی اور قانون سازی کے ذریعے ان کی قومی صلاحیتوں کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ ان کے مردوں کو عورتیں بنا دیا تھا یعنی وہ مردانہ صفات جو مقابلہ کی طاقتیں ہیں ان کو کچل کے رکھ دیا، ان کے اندر کوئی دم خم باقی نہیں رہنے دیا۔ یہی وہ کوشش تھی جس کے جواب میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیاب جدو جہد کے بعد بالآخر الٰہی تقدیر سے فرعونیت ناکام ہوئی ہے، نہ کہ انسانی تدبیر سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں میں تو کوئی طاقت نہیں تھی۔

پس اللہ تعالیٰ نے پاکستان میں جماعت کو جو سرخروئی عطا فرمائی ہے۔ بڑی کامیابی اور ہمت کے ساتھ ان حملوں کو پسپا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، ان قوانین کو نامراد رکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ تمام تر حکومت کی کوششوں اور سخت مظالم کے باوجود احمدیت کا نام مٹانے کی بجائے احمدیت کو پاکستان میں پہلے سے زیادہ پیوستہ کر گئے ہیں۔ یہ وہ توفیقات ہیں جو خدا کی طرف سے اترا کرتی ہیں۔ بندوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ورنہ دنیاوی تاریخ میں تو جب بھی ممالک نے قانون سازی کے ذریعے بعض قوموں کو کچلنے کی کوشش کی ہمیشہ کچل دیا۔ ناٹسی جرمنی کے سامنے ان یہود کی کیا حیثیت تھی جو ہٹلر کی قانون سازی سے پہلے تمام جرمنی پر ایک غیر معمولی طاقت اور رعب رکھتے تھے۔ تمام جرمنی کی اقتصادیات ان کے قبضے میں تھیں۔ تمام جرمنی کی سیاست سے وہ کھیل رہے تھے اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہود کی آئندہ تاریخ جرمنی سے وابستہ ہو چکی ہے۔ جرمنی کے ذریعے یہ تمام دنیا پر قبضہ کریں گے لیکن جب ایک حکومت اٹھی ہے اور قانون سازی کی ہے تو دیکھیں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ ساری طاقتیں ان کی ٹوٹ گئیں۔ سائنس پر قبضہ تھا تو سائنس دانوں کو نکال کر باہر پھینکا اور کوئی پرواہ نہیں کی۔ آرٹ پر قبضہ تھا، میوزک پر قبضہ تھا، تصویر کشی، بت بنانے پر بھی انہی کا قبضہ تھا اور بتوں کی تصویریں کھینچنے پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔ وہ جو فائن آرٹس کہا جاتا ہے اس پر بھی یہی قوم قابض تھی۔ فلسفے

پر یہ قوم قابض تھی۔سیاست پر یہ قوم قابض تھی۔تمام تعلیمی اداروں پر ان کا قبضہ تھا۔تمام Professions پر ان کا قبضہ تھا۔ڈاکٹر بھی یہی چوٹی کے تھے۔سرجن بھی یہی چوٹی کے تھے۔ سائنس دان بھی یہی تھے اور اقتصادیات کے ماہرین بھی یہی اور اقتصادی دولتوں پر قابض بھی یہی تھے لیکن دیکھیں حکومت کے سامنے کچھ پیش نہیں گئی۔تو قانون سازی ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ اور جب قانون سازی کے ذریعے کسی قوم پر مظالم کئے جائیں تو پھر اس کا کوئی جواب اس قوم کے پاس نہیں رہتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو اور وہ ان کی حمایت میں کھڑا ہو جائے۔

پس ہندوستان میں اب یہ ہوا ہے۔ایک ایسی حکومت کے آنے کا احتمال پیدا ہو گیا ہے جو حکومت قانون سازی کے ذریعے مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔وہ قانون سازی کے ذریعے اسلام کے سارے تاریخی نشان مٹا دینے کا تہیہ کر کے آ رہی ہے۔وہاں وہ سابقہ باتیں جو کسی زمانے میں بعض مسلمان بادشاہوں کی یادگاریں تھیں ابھی بھی ان کو نظر انداز کر کے فضائی پولوشن (Pollution) کا نشانہ بننے دیا گیا ہے ان کے حُلیے بگاڑ دئے گئے ہیں۔مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں۔

جو میں دیکھ رہا ہوں آگے آنے والی باتیں اگر بی۔جے۔پی کو حکومت نصیب ہو گئی جو ابھی تک تو لٹکا ہوا معاملہ ہے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا،تو پھر دیکھیں کہ وہاں کس تیزی سے کیسے گہرے اور دیر پا اثر کرنے والے واقعات رونما ہوں گے اور اس پہلو سے مسلمانوں کو ہر جگہ اپنے کردار، اپنے اعمال،اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنی چاہئے ۔مذہب کے نام پر کسی دوسرے انسان کا حق سلب کرنے کی دنیا کا کوئی مذہب اجازت نہیں دے سکتا۔اگر دیتا ہے تو جھوٹا ہے۔تو اسلام کو جھوٹے مذاہب کی صف میں کیوں لا کھڑا کیا ہے۔اسلام تو انصاف کا ایسا علم بردار ہے کہ دنیا کی کسی مذہبی الٰہی کتاب میں انصاف کی حمایت میں ایسے عظیم الشان احکام موجود نہیں ہیں،ایسی واضح تعلیمات موجود نہیں ہیں جیسی قرآن کریم میں ہیں۔مذہبی حکومت، مذہبی حکومت کا شور ڈالا ہوا ہے ان مولویوں نے اور قرآن کریم پڑھ کے دیکھیں وہاں کسی مذہبی حکومت کا ذکر ہی نہیں ملتا۔صرف ایک مذہبی حکومت کا تصور ہے اس کے سوا سارے قرآن میں دوسری مذہبی حکومت کا کوئی تصور نہیں۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔اے مسلمانو! تمہارے لئے ایک ہی قانون ہے حکومت کا اس کے سوا اور کوئی نہیں۔اگر تم حکومت میں آ جاؤ اگر حکومت کی باگ

ڈور تمہارے سپرد کی جائے ۔ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ عدل سے حکومت کرنا ہوگی۔ عدل کے تقاضوں کو چھوڑ نہیں سکتے ۔ اب عدل تو توازن کو کہتے ہیں۔ عدل کے تصور کے ساتھ یہ تصور اکٹھا بیک وقت زندہ رہ ہی نہیں سکتا کہ عدل کے تقاضے ایک مذہب والے کو زیادہ سیاسی یا اقتصادی حقوق دیں اور دوسرے مذہب والے کو کم سیاسی یا اقتصادی حقوق دیں۔ Civil Rights تو تمام شہریوں کا برابر کا حق ہے اور عدل اور Civil Rights یعنی شہری حقوق میں تفریق، بیک وقت یہ دو چیزیں رہ ہی نہیں سکتیں۔ تو ایسے جاہل لوگ ہیں جو اس وقت ہمارے مذہب کی سیاست پر قابض ہیں کہ خدا کے نام پر ناانصافی کی تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں اسلام کی یہ تعلیم ہے، اسلام مسلمانوں کو حق دیتا ہے کہ اپنے لئے جتنے حقوق چاہے اسلام کے نام پر لے اور دوسرے کو جتنے حقوق سے چاہے محروم کرے مگر ہو اسلام کے نام پر، دنیا کے نام پر نہیں۔ یہ تو ناجائز بات ہے۔ خدا کے نام پر جتنے مظالم کرنے ہیں کرلو، جب وہ کھلی چھٹی دیتا ہے تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔ قتل و غارت کرو، خون بہاؤ، گھر لوٹو، لوگوں کو اپنے وطن سے بے وطن کرو، جیلوں میں ٹھونسو، جھوٹے مقدمات بناؤ مگر دیکھو یاد رکھنا خدا کے مقدس نام پر بنانا ورنہ خطرناک بات ہے۔ تو اس تقدس کی حفاظت جس قوم کو نصیب ہو جائے جس کا تصور ہی تقدس سے خالی ہے تو ایسی جاہلانہ مذہبی حکومت ظاہر ہوتی ہے جس کے ساتھ ملک کا تمام امن و امان اٹھ جاتا ہے اور ملک کی گلی گلی سے ناانصافی کے واویلوں کی آوازیں سنائی دیں گی۔ یہ کر بیٹھے ہو اپنے ملک میں اور تمہاری بدبختی ابھی تمہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ کچھ کر بیٹھے ہو یہاں اور اب اگلے ملک میں کروانے کے انتظام کروا رہے ہو۔ تم ذمہ دار ہو اور خدا کے حضور تم ذمہ دار ہو، تم نے خدا کے نام پر اور اسلام کے نام پر سب سے زیادہ اسلام پر، خدا پر ظلم کئے اور اس کے بندوں پر ظلم کئے۔ اب یہی طریق کار مظالم کے تمہاری ہمسایہ قوم نے سیکھ لئے ہیں جو تعداد میں تم سے زیادہ ہے اور وہاں ابھی بھی اتنی تعداد میں مسلمان موجود ہیں کہ تقریباً پاکستان کی آبادی کے برابر ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد ہے۔

تمہیں تو کچھ نصیب ہوگا یا نہیں اور میں جانتا ہوں کہ کچھ نصیب نہیں ہوگا مگر ان کے نصیب مارے گئے جو تمہارے ہم مذہب، اسی خدا کو ماننے والے، اسی رسولؐ کے عشاق تو ضرور ہیں خواہ عشق کے تقاضے پورے کریں یا نہ کریں جس خدا کو تم مانتے ہو جس رسولؐ کے عشق کا تم دم بھرتے ہو۔ ان

کے ساتھ اگر کوئی ظلم ہوا تو تم ذمہ دار ہو اور اس ذمہ داری میں مرنے کے بعد تو جو ہوگا وہ تو اللہ جانتا ہے کہ تم سے کیا سلوک ہوگا مگر تاریخ بھی تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہمیشہ اگر ہندوستان پر لعنتیں ڈالی گئیں تو ہندوستان سے گزر کر تم پر پڑیں گی کہ تم وہ بد بخت لوگ ہو جنہوں نے ان مظالم کا آغاز کیا تھا۔اس لئے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جو آج ہوا ہے۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک آئندہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا آغاز ہے۔ایسی تبدیلیاں ہیں جن کی داغ بیل رکھی جا چکی ہے۔

اور اس وقت اس صورت حال میں جماعت احمدیہ پر سب سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ محض اپنی برتری دکھانے کے لئے کہ دیکھو خدا نے ہمیں سچا کر دکھایا ہرگز کمینگی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ہماری قدر مشترک ہے۔اسلام کی تہذیب، اسلام کے تمدن، اسلام کی طرز زندگی پر حملہ ہونے والا ہے۔ یہاں کسی مسلمان یا کسی مولوی کی بات نہیں ہو رہی۔ وہ حملہ ہے جو مجھے دکھائی دے رہا ہے اور اس میں جماعت احمدیہ کو قربانیوں کی صف میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ہر قیمت پر اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی، اپنے ملک میں بھی اور اس دوسرے ملک میں بھی۔ دونوں جگہ اگر کوئی عقل اور نصیحت کی بات کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ جماعت احمدیہ ہے۔اس لئے کہ سچی جماعت ہے۔اس لئے کہ اخلاص کے ساتھ بات کرتی ہے۔ انصاف کے ساتھ بات کرتی ہے اور اخلاص اور انصاف میں اگر آغاز میں طاقت نہ بھی ہو تو اس کی ذات میں یہ طاقت ہے کہ وہ بڑھتا جاتا ہے۔اس کی ذات میں غلبے کی طاقت موجود ہے۔

پس اس پہلو سے جماعت احمدیہ کو سب سے پہلے دعاؤں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور پھر یہ یقین ہمیشہ اپنے دل میں قائم رکھنا چاہئے کہ انقلاب جو بھی رونما ہوں گے ضرور ہے کہ دکھوں سے ہم گزریں اور ابتلاؤں میں گھیرے جائیں۔مگر جماعت احمدیہ کا جہاں تک تعلق ہے ہمارا خدا کبیر بھی ہے اور متعال بھی ہے اور انجام کار ہمارے لئے ہرگز نہ مایوسی ہے، نہ ناکامی ہے۔مگر رستوں کی تکلیفیں تو بہر حال رستے میں آئیں گی۔ سر بلندیوں کے دعویٰ کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم چڑھائیاں چڑھو اور تمہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ چڑھائیوں کے اپنے کچھ آزار ہوا کرتے ہیں ان آزار میں سے تو گزرنا پڑتا ہے۔ پس اس پہلو سے دعائیں کرتے ہوئے آگے بڑھیں اور نصیحت کے ذریعے قوم کو دکھانا شروع کریں کہ کیا ہو رہا ہے۔

ہندوستان کے احمدیوں کا فرض ہے کہ تمام سیاسی سطح پر خواہ وہ مقامی ہو یا وہ ملکی ہو، ضلعی ہو یا صوبائی ہو، ہر سطح پر دانش وروں سے ملاقاتیں کریں، ان کو بتائیں کہ کیا کیا ظلم ہونے والے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے جو اقتصادی حالات ہیں وہ اس قسم کے ظالمانہ دور کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ سب کچھ مٹ جائے گا۔ نہ ہندو کو فتح ہوگی نہ مسلمان کو ہوگی۔ سوائے بربادی کے مذہبی انتہا پسندی نے کبھی بھی دنیا کو کچھ نہیں دیا۔ ان کو سمجھائیں کہ پاکستان سے نصیحت پکڑو عبرت حاصل کرو دیکھتے نہیں وہاں کیا ہوا ہے اور کس حال میں قوم پہنچ گئی ہے۔ بھائی بھائی سے الگ ہو گیا، گھر گھر ڈاکے پڑنے لگے۔ نہ عورت کی عزت محفوظ، نہ بچیوں کی عزت محفوظ، نہ بیٹوں کی، نہ باپوں کی، گلی گلی ظلم کے ناچ ہونے لگے اور کسی گھر میں کوئی امن باقی نہیں رہا۔ پولیس کی وردیوں میں ڈاکو نکلتے ہیں اور جو پولیس کی وردیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی ڈاکوؤں سے کم نہیں ان کا بس چلے تو سب کچھ لوٹ لیتے ہیں۔ ایسی خوفناک صورتحال ہے اخلاقی لحاظ سے کہ جو رپورٹیں بھی مجھے ملی ہیں قتل کے مقدمات کے تعلق میں وہ کہتے ہیں کہیں قتل ہو سہی پھر دیکھو تھانے داروں کی کیسی چاندی ہوتی ہے۔ سارا جو عملہ ہے تھانے کا اس میں ایک سنسنی سی ہو جاتی ہے گویا عید کی خبر آئی ہے اور پھر وہ دونوں فریق سے زیادہ سے زیادہ لوٹنے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور اگر کوئی غریب اس موقع پر جہاں بے چاروں پر پہلے ہی قتل پڑ چکا ہے، اگر جھوٹا قتل پڑا ہوا ہے پولیس کی پوری خدمت نہ کریں تو پھر وہ ان پر ایسا پکا قتل کا مقدمہ باندھتے ہیں کہ معصوم گردنیں پھانسیوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں اور کسی کو کوئی حس نہیں ہے۔ یہ ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں، سینکڑوں مرتبہ پاکستان میں ہو چکا ہے کہ پولیس کو خوش نہ کر سکے تو ایک معصوم آدمی کی گردن پھانسی کے حوالے کر دی گئی اور جو ظالم ہے اس کو تو پیسے دینے کی عادت ہی ہے۔ اسے تو جو رشوت خور ہے بہت خوش رہتا ہے کیونکہ جو جائیدادیں بیچ کر دیتے ہیں ان کو پتا لگتا ہے کہ کیا تکلیف ہے رشوت دینے کی۔ جو جائیدادیں غصب کر کے رشوت دیتے ہیں ان کو کیا تکلیف ہے۔ آج ایک جائیداد لوٹی ہے کل پولیس کی مدد سے دوسری جائیداد لوٹ لیں گے اور ان کے ہاں کمی نہیں آتی۔ سیاست میں بھی جب سیاست گندی ہو جائے یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہ خرچ کرتے ہیں، بڑا بڑا خرچ کرتے ہیں، مگر جانتے ہیں کہ سارے خرچ ہم نے، ایک دفعہ سیاست میں کامیاب ہو جائیں تو انہی لوگوں سے نکالنے ہیں۔ وہ جو انتخاب سے پہلے منتخب ہونے

والے امیدواروں سے پیسے لیتے ہیں یہ تو چند دن کی بات ہوتی ہے۔ پھر عرصہ انتخاب پانچ سال ہے تو پانچ سال ان لوگوں کو منتخب کو پیسے دینے پڑتے ہیں اور کئی کئی گنا واپس کرنے پڑتے ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کام کسی بے چارے کو نکل آتا ہے، کبھی پٹواری سے نکل آیا، کبھی تھانے دار سے نکل آیا، کبھی افسر مال سے نکل آیا، کبھی ڈپٹی کمشنر سے اور اس منتخب امیدوار کے گھر کے دروازے کھٹکتے ہیں اور ہر خدمت کی قیمت ہوتی ہے اور قیمت کے بغیر خدمت لی ہی نہیں جاسکتی۔ تو جہاں اقتدار کو دولت کا ذریعہ بنالیا جائے، جہاں اقتدار کو ظلم کا ذریعہ بنالیا جائے ایسے ملک میں امن کیسے ہوسکتا ہے اور اسلام وہاں کیسے گھس سکتا ہے۔ اسلام تو ایسے ملک میں جھانکتا تک نہیں اور نام اسلام کا لے رہے ہیں۔

اگر یہ نصیحتیں نہیں سنی، اگر ان پر عمل نہیں کرنا جو میں تمہیں دکھا رہا ہوں، تم جانتے ہو کہ سچ ہے، ایک ایک لفظ سچ ہے۔ اگر یہ دیکھنے کے باوجود اپنے اخلاق میں اور اپنے اعمال میں تبدیلی نہیں کرنی تو خدا کے واسطے خدا کا نام لینا تو چھوڑ دو۔ جھک مارنی ہے تو کسی اور نام پر مارو، اسلام کے نام پر نہ مارو۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے نام پر ظلم نہ کرو۔ یہ سب سے بڑا ظلم ہے جو میں نے کہا تھا کہ رسولؐ پر بھی کر رہے ہیں اور خدا پر بھی کر رہے ہیں اور اس کی سزا ضرور ملے گی۔ کس طرح ملے گی اللہ بہتر جانتا ہے۔ کچھ تو مل رہی ہے وہی اتنی زیادہ ہے کہ جو جاتے ہیں وہ پر پھڑ پھڑاتے ہوئے پاکستان سے نکلتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم نے جو دیکھا تھا کچھ اور تھا یہ تو کچھ اور ہی بن چکا ہے۔ نہایت ہی بھیانک نقشے لے کر آتے ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ یہ قوم پھر کس طرح زندہ ہے۔ غربت کا حال یہ ہے کہ دن بدن دولت جو ہے چند نہیں بلکہ چند سو یا چند ہزار خاندانوں میں اکٹھی ہو رہی ہے اور جو سڑکوں پر پلنے والا غریب ہے اس کا کوئی حال نہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور غریب کو تو قیمتوں کے خلاف احتجاج کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے۔ اگر طاقت ہے تو ان کو جن کے پاس اپنی غربت کو دور کرنے کے لئے دوسرے ذرائع بڑی کثرت سے موجود ہیں۔

یہ عجیب واقعہ ہوا ہے ابھی کہ پاکستان کے کلرکوں نے احتجاج کیا اور سڑکوں پر نکل آئے اور بھوک کے خلاف احتجاج تھا اس لئے قمیضیں اتار کر باہر نکلے اور آپ حیران ہوں گے دیکھ کر اتنے موٹے موٹے پیٹ ہیں ان تصویروں میں کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ بھوک کے خلاف ایسا احتجاج کبھی انسانی تاریخ میں نہیں کیا گیا ہوگا۔ بڑے بڑے موٹے پیٹ والے کلرک سڑکوں پہ نکلے ہوئے

ہیں، پیٹ سے کپڑے اٹھائے ہوئے کہ دیکھو جی ہم بھوکے۔ وہ بھوکے نہیں بھوکا بنانے والے لوگ ہیں۔ ہر کام جو کرتے ہیں غریب کا پیسے لے کر کرتے ہیں۔ پیٹ کے کپڑے تو ان غریبوں کو اٹھانے چاہئیں جن کو گھروں سے نکلنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ گولیوں کا نشانہ بنائے جائیں تو کوئی ان کا حامی و ناصر نہیں، کوئی ان کے ظلموں کا حساب لینے والا نہیں ہے یعنی ان پر ظلم کرنے والوں کا حساب لینے والا نہیں ہے۔ یہ ملک اس حال کو پہنچا ہوا ہے اوپر سے لڑائی کی تیاریاں۔ اوپر سے ہندوستان میں آنے والے مذہب کے نام پر نئے انقلابات اور مذہبی شریعت جو ان کی ہے اس کے تصور سے بھی آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اگر اس شریعت پر صحیح عمل کروایا جائے تو اگر کہیں کوئی پنڈت وید پڑھ رہا ہو اور کوئی مسلمان شودر پاس سے گزرے کیونکہ ہر غیر مذہب والا پھر شودر ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس کے کان میں اس وید کی آواز آجائے تو ویدک وفاداروں کا فرض ہے کہ پگھلا ہوا سیسہ اس کے کان میں ڈالیں کہ تم بدبخت ہوتے کون ہو اس مقدس کلام کو سن کر اس کو ناپاک کرنے والے۔ یہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہندو گیتا اور ویدک تعلیم ہے تو یہ بھی ظلم ہے۔ یہ ویدک تعلیم حقیقت میں نہیں ہے۔ یہ پنڈت کی تعلیم ہے جو ہندو ملاں ہے اور اس نے ویدوں پر پہلے ظلم کیا اور پھر بنی نوع انسان پر ظلم کیا اور یہ جو ویدک تعلیم ہے یہ تو پاکستان میں بھی مل رہی ہے۔

کوئی احمدی کلمہ **لا الہ الا اللّٰہ** پڑھ دے تو کہتے ہیں اس کی زبان نوچ لو اس نے کلمہ کو ناپاک کر دیا ہے۔ کسی کے گھر سے **بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم** لکھی ہوئی نکلے تو اس کو جیلوں میں ٹھونسو اور جوتیاں مارتے ہوئے تھانوں میں لے کے جاؤ کہ اس کے گھر سے **بسم اللّٰہ** دریافت ہوئی ہے۔ یہ بدبخت ہوتا کون ہے **بسم اللّٰہ** کو اپنے گھر میں رکھ کر اس کو ناپاک کرنے والا۔ تو یہ ویدک تعلیم بھی خدا کی تعلیم نہیں تھی، نہ ویدک میں تھی۔ یہ تعلیم جو میں بیان کر رہا ہوں پاکستان کی یہ کب قرآن اور سنت میں ہے۔ اس لئے جیسا ظلم اپنے تاریک زمانوں میں وید کے پجاریوں نے اپنے مذہب پر کیا تھا وہ قرآن کے ماننے والے خود اپنے دین پر آج کل ہی کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں۔ تو اگر مقابلہ ہوگا تو دو جہالتوں کا بڑا سخت مقابلہ ہوگا۔ اسلام بھی یہاں سے اپنے، جس طرح کہتے ہیں بوریا بستر لپیٹ کر اٹھ کھڑا ہوگا اور ویدک دھرم بھی ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ نہ وہاں وید کے نام پر جنگ ہو رہی ہوگی، نہ قرآن کے نام پر جنگ ہوگی۔ ملائیت یعنی مسلمان ملائیت، ہندو ملائیت

سے ٹکرائے گی اور بہت ہی بھیانک مناظر ابھریں گے اوران مظالم کا شکار تمام اعلیٰ انسانی اقدار ہو جائیں گی۔ مظلوم مارے جائیں گے اور ظالم، مظلوم پر پھبتیاں اڑاتے پھریں گے۔

پس ایسے ملک میں جہاں خدا کے نام پر مظالم ہوں، ایسے ملک میں جہاں رام کے نام پر مظالم ہوں، جہاں برہمو کے نام پر مظالم ہوں تو نہ خدا، نہ رام، نہ برہمو، کوئی بھی نہیں ملتا۔ سب ان ملکوں سے نکل چکے ہوتے ہیں تب یہ توفیق ہوتی ہے۔ ان کا حال تو ویسا ہی ہو چکا ہے جیسے کہتے ہیں کہ ایک ایسے چرچ میں جو سفید فاموں کا چرچ تھا ایک کوئی بڈھا سیاہ فام عیسائی اندر داخل ہو گیا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ یہ سیاہ فام ہو کر سفید فام لوگوں کے چرچ میں آ گیا ہے تو انہوں نے مار کے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ انہوں نے کہا تمہاری یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عیسائیت جو بھی تھی وہ محبت ضرور رکھتا تھا عیسائیت سے۔ وہ باہر نکل کر ساری رات اس چرچ کی سیڑھیوں پر روتا رہا کہ اے یسوع! میں تو تیری محبت اور پیار میں یہاں آیا تھا۔ مجھے اس چرچ سے دھکے دے کر نکال دیا گیا ہے۔ اس کو اسی حالت میں اونگھ آ گئی اور رؤیا میں حضرت یسوع دکھائی دئے۔ اس نے کہا تجھے کیا ہو گیا ہے کیوں رو رہا ہے۔ اس نے جب بتایا۔ اس نے کہا دیکھو میں تو دو ہزار سال ہو گئے ہیں ایسے چرچوں میں میں نے گھس کر بھی نہیں دیکھا۔ تمہیں تو آج دیس نکالا ملا ہے چرچ سے، مجھے دو ہزار سال سے دیس نکالا ملا ہوا ہے۔ اگر میں رؤوں تو میری بقیہ ساری عمر روتے روتے کٹ جائے گی۔ تم میرے ساتھ ہو خوش نصیب ہو۔ پس ایسے ملکوں میں جہاں اسلام کے نام پر ظلم ہوں یا ہندومت کے نام پر ظلم ہوں یا عیسائیت کے نام پر ظلم ہوں اگر کوئی نہیں ہوتا تو خدا نہیں ہوتا باقی سب چیزیں پھر چلتی ہیں اور پنپتی ہیں۔

دعا کریں کہ اللہ ان کو ہوش دے ان کو عقل اور ہوش کے ناخن دے مگر وہ ناخن لوگوں کو چھیلنے والے نہ ہوں۔ ظلم کے ناخن نہ ہوں۔ اللہ ان کو عقل دے، ایسی عقل نہ دے جو گھاس چرتی ہے۔ ایسی عقل دے جو جانوروں کو انسان بنانے والی عقل ہوا کرتی ہے نہ کہ انسانوں کو جانور بنانے والی۔ پس دعائیں سب سے بڑی طاقت ہیں۔ اپنی دعاؤں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کرو اور نصیحت کو ان مقاصد کے لئے استعمال کرو۔ اپنے گردو پیش درد کے ساتھ، دل کی گہرائی کے ساتھ، ان حق کی آوازوں کو بلند کرو اور پھر انتظار کرو۔ میں تمہیں ایک یقین ضرور دلاتا ہوں اور آج تک کبھی میرا یہ یقین متزلزل نہ ہوا ہے، نہ مرتے دم تک ہوگا کہ تم ضرور سرفراز ہو گے۔ تمہاری قسمت میں ناکامی کا

خمیر نہیں ہے۔تم خدا کے عاجز بندے ہو۔کبیر اور متعال کے بندے ہو اسی کے بندے بنے رہو تو کبھی دنیا کے انقلابات تم پر کوئی منفی اثر پیدا نہیں کر سکیں گے۔اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔آمین

دنیا اور اس کی چیزیں اس کی نظر میں فنا ہو جاتی ہیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 17 رمئی 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ
وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ
مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ
اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

(الرعد: 10 تا 12)

پھر فرمایا:

یہ آیات کریمہ جن کی میں نے تلاوت کی ہے سورۃ الرعد کی دسویں تا بارہویں آیات ہیں اور پہلے بھی دو گزشتہ خطبات کے موقع پر میں انہی کی تلاوت کرتا رہا ہوں۔ آج خصوصیت سے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان اقتباسات کے حوالے سے میں نے ان کی تلاوت کی ہے جن کے متعلق میں نے وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقتباسات جو اس آیت کی تفسیر میں آپؑ نے لکھے اور بیان فرمائے ہیں وہ آپ کے سامنے رکھوں گا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وہ غیب کا بھی عالم ہے اور شہادت کا بھی۔ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ کبیر ہے اور متعال ہے۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کا ایک تعلق اس کے الْكَبِيْرُ اور اس کے الْمُتَعَالِ ہونے سے ہے جس کے متعلق میں نے پہلے ذکر کیا تھا لیکن اس طرز بیان میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہی ہے جو ظاہر کو بھی جانتا ہے اور وہی ہے جو غیب کو بھی جانتا ہے۔ بندوں کو نہ تو ظاہر کا

کچھ علم ہے نہ غیب کا کچھ علم ہے اور چونکہ علم سے ہی کبر اور علم ہی سے بلندی عطا ہوتی ہے۔ تمام سر بلندی علم کے نتیجہ میں ہے تمام عظمت علم کے نتیجہ میں ہے۔ اس لئے نہ انسانوں میں کوئی کبیر ہے نہ انسانوں میں کوئی متعال ہے۔ اگر کبیر ہے تو اللہ کی ذات ہے۔ اگر متعال ہے تو وہ اللہ ہی کی ذات ہے اور جہاں تک بندوں کا تعلق ہے وہ جو کچھ چھپاتے ہیں اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں، جو ظاہر کرتے ہیں اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ سب برابر ہیں اس کی نظر میں۔ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ۔

خواہ وہ بلند آواز میں اونچی اونچی باتیں کرے اور اپنے بلند بانگ ارادوں کا اظہار کرے یا دعاوی کرے یا کوئی مخفی باتیں دل میں چھپائے پھرتا ہو۔ فرمایا خدا کی نظر میں سب برابر ہیں۔ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ اور جو رات کے پردوں میں چھپتا پھرے اور دن کو کھلم کھلا باہر نکلے ان دونوں کی حقیقت کو بھی وہی جانتا ہے اور ان سب کے لئے ہر حال میں خدا ہی کی تقدیر کے تابع مقرر کردہ ایسے محافظ ہیں جو ان کی حفاظت فرما رہے ہیں اور اگر خدا کی حفاظت نہ ہوتی تو نہ رات کو زندگی کا قیام ممکن تھا، نہ دن کو زندگی کا قیام ممکن تھا۔ تو اللہ کی حفاظت کی تقدیر کے تابع یہ جو آگے پیچھے، دائیں بائیں ان کے ساتھ جاری ہے ان کو ہر لحظہ موت سے بچا رہی ہے۔

(اس موقعہ پر مسجد کے لاؤڈ سپیکر کی آواز میں خرابی کی وجہ سے کچھ دیر کے لئے حضور نے خطبہ روک دیا اور اس ضمن میں ضروری ہدایات جاری فرمائیں۔ اس نظام کی درستگی کے بعد حضور انور نے خطبے کے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا)

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ قرآن کریم میں جہاں عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کا مضمون ہے وہاں یہ بھی ہے کہ تمہیں جب کسی حال کا علم نہیں، نہ ظاہر کا، نہ غیب کا۔ تم اپنی حفاظت کا کیا انتظام کر سکتے ہو، کچھ بھی نہیں اور جو اندرونی خطرات ہیں اور اکثر اندرونی ہیں اور جو مخفی خطرات ہیں اور اکثر مخفی ہیں ان سے انسان کے اندر مقابلے کی طاقت ہی نہیں کیونکہ علم کے بغیر مقابلہ ممکن نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے جہاں جس جس پہلو سے کسی انسان کو علم سے محروم رکھا ہے وہاں اس کی نگرانی کی ذمہ داری خود سنبھالی ہے۔ پس یہ تعلق ہے اس مضمون کا لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کہ انسان کے آگے اور پیچھے خدا کے حکم سے ایسے کارندے چلتے ہیں جو

اس کی تقدیر سے، اسی کے حکم سے حفاظت کر رہے ہیں۔ ورنہ موت کی تقدیر بھی خدا ہی کی ہے زندگی کی تقدیر بھی خدا ہی کی ہے۔

اس تعلق میں نیکی کو چھپ کر کرنا اور نیکی کو اعلانیہ کرنا یہ وہ مضمون ہے جس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روشنی ڈالی ہے اور بہت ہی گہری پُر حکمت نصائح پر مشتمل مضمون ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس آیت کریمہ کے بہت سے پہلو ہیں بے شمار ایسے ہیں جن پر ایک وقت میں اکٹھے روشنی ڈالنا تو درکنار اس کا ذکر بھی ممکن نہیں ہے۔ بہت ہی وسیع مضامین پر پھیلی ہوئی یہ آیات ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نیکی کے چھپانے اور نیکی کے ظاہر کرنے کے مضمون کو خصوصیت سے پیش نظر رکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

> پس مومنوں کو بھی دو ہی قسم کی زندگی بسر کرنے کا حکم ہے سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً (ابراہیم:32) (یا وہ مخفی زندگی بسر کریں گے یا کھلی کھلی علانیہ زندگی) بعض نیکیاں ایسی ہیں کہ وہ علانیہ کی جاویں اور اس سے غرض یہ ہے کہ تا اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی تحریک ہو۔

یعنی علانیہ نیکی میں ایک حکمت یہ ہے تا کہ لوگوں کو بھی تحریک ہو ورنہ مخفی نیکیاں ہر انسان کی ذات میں ڈوبی رہیں گی اور معاشرے میں عموماً نیکی میں آگے بڑھنے کی طرف توجہ پیدا نہیں ہوگی۔

> اس سے غرض یہ ہے کہ تا اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی تحریک ہو اور وہ بھی کریں۔ جماعت نماز (یعنی باجماعت نماز) علانیہ ہی ہے اور اس سے غرض یہی ہے کہ تا دوسروں کو بھی تحریک ہو اور وہ بھی پڑھیں اور سِرًّا اس لئے کہ یہ مخلصین کی نشانی ہے جیسے تہجد کی نماز ہے۔ یہاں تک بھی سِرًّا نیکی کرنے والے ہوتے ہیں کہ ایک ہاتھ سے خیرات کریں اور دوسرے کو علم نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر اخلاص مند ملنا مشکل ہے (کہ نیکی کو عمداً اتنا چھپائے گویا اس کے وجود کے دوسرے حصے کو بھی اس نیکی کی خبر نہ ملے) انسان میں یہ بھی ایک مرض ہے کہ وہ جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگ بھی اسے سمجھیں۔

"لوگ بھی اس کو سمجھیں" سے مراد یہ ہے کہ اس کے خرچ کے معاملات پر لوگوں کی بھی نظر

ہو۔ سمجھیں کا مضمون یا تو کوئی غلط لکھا گیا ہے یا حضرت مسیح موعودؑ بعض دفعہ بعض الفاظ کو زیادہ وسیع معنوں میں استعمال فرماتے ہیں جو روزمرّہ کے استعمال سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ جو الفاظ یہاں لکھے ہوئے ہیں یہی ہیں۔

یہ بھی ایک مرض ہے کہ جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگ بھی اسے سمجھیں۔

شاید مراد یہ ہو کہ لوگ بھی اسے کچھ سمجھیں، اس کو عزت دیں، اس کو مرتبہ دیں۔

''مگر میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں'' یہ وہ اصل بات جس کی طرف توجہ دلانے کے لئے میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس عبارت کو چنا ہے۔ آپ سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کیا توقع ہے اور آپ کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کتنی گہری دلی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔

مگر میں خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ میری جماعت میں ایسے بھی لوگ ہیں کہ جو بہت خرچ کرتے ہیں مگر اپنا نام تک ظاہر نہیں کرتے۔ بعض آدمیوں نے مجھے کئی مرتبہ پارسل بھیجا ہے اور جب اسے کھولا ہے تو اندر سے سونے کا ٹکڑا نکلا ہے یا کوئی انگشتری نکلی ہے اور بھیجنے والے کا کوئی پتا ہی نہیں۔ کسی انسان کے اندر اس مرتبہ اور مقام کا پیدا ہونا چھوٹی سی بات نہیں اور نہ ہر شخص کو یہ مقام میسر آتا ہے۔ یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر ایمان لاتا ہے اور اس کے ساتھ اسے ایک صافی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ دنیا اور اس کی چیزیں اس کی نظر میں فنا ہو جاتی ہیں۔ (ملفوظات جلد 4 صفحہ 665)

یہ ہے سِرًّا کا مضمون جو بہت ہی گہرائی میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا ہے۔ بسا اوقات انسان نیکی کرتا ہے اسے دکھاوے کا تو خیال نہیں ہوتا لیکن بالارادہ اخفاء کا بھی کوئی طریق اختیار نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں پر کوئی حرف نہیں کیونکہ چھپانا بھی ایک زحمت ہے اور کوشش کر کے کسی چیز کو چھپانا کسی غیر معمولی ارادے کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا ورنہ یہ نارمل نہیں ہے یہ عام انسانی طریق نہیں ہے۔ ایک انسان ریا سے پاک نیکی کرے اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی وہ دیکھتا ہے یا

نہیں دیکھتا اور اسی تعلق میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے خود اپنا بھی ایک تجربہ بیان فرمایا ہے۔ کسی نے آپؑ سے پوچھا کہ آپ جب نماز پڑھتے ہیں اور خاص کیفیت طاری ہوتی ہے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں تو آپ کو کبھی خیال نہیں آتا کہ وہ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا جیسے انسان طویلہ میں نماز پڑھے اردگرد گھوڑے بندھے ہوں تو کسی کو خیال آئے گا کہ گھوڑے دیکھ رہے ہیں؟ وہم وگمان میں بھی نہیں یہ بات آتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے کیونکہ میری نماز کا ان سے تعلق ہی کوئی نہیں۔ جس کے ساتھ ہے وہ دیکھ رہا ہے اور اسی کا خیال ایسا غائب ہو جاتا ہے کہ کسی اور طرف توجہ جاتی ہی نہیں ۔تو ضروری نہیں کہ ہر نماز کو چھپا کر ہی پڑھا جائے تو وہ ''سری'' نماز بنے گی ورنہ علانیہ ہو جائے گی ۔ یہ مضمون بھی سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر چیز جو ظاہر ہے وہ ظاہر نہیں ہے بعض دفعہ ''سر'' ہی ہوتی ہے اور اس کے اندر ''سر'' ہوتے ہیں پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی جو نماز لوگ دیکھتے تھے اور وہ نمازیں جو دوسروں کی دیکھتے تھے بظاہر تو ان میں فرق نہیں تھا۔ اگر خشوع وخضوع ہے تو بعض دفعہ غیروں میں بھی بڑے زور سے خشوع وخضوع پیدا ہوتا ہے مگر یہ ''سری'' کیفیت کہ پرواہ ہی کوئی نہیں کوئی دیکھ رہا ہے کہ نہیں دیکھ رہا ان کی حیثیت، حقیقت ہی کوئی نہیں ۔جس نے دیکھنا تھا وہ جانتا ہے اور وہی میرے لئے کافی ہے۔ یہ بھی ایک ''سر'' ہے جو علانیہ نمازوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے اور نیکی کا بھی یہی حال ہے۔ بعض دفعہ ایک انسان چندے لکھواتا ہے چندے ادا کرتا ہے اس کے نام رسیدیں کٹتی ہیں اور اکثر یہی ہوتا ہے کیونکہ ہم نے چندے کے نظام کی بھی حفاظت کرنی ہے ۔مگر دیکھنے والے کے ذہن میں کسی طرح بھی، کسی قسم کا کوئی ریاء کا پہلو نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود کچھ ایسے بھی ہیں جو محنت کر کے اپنی نیکی کو خود اپنی ذات سے بھی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ جو فرمایا کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی یہ بہت اہم مضمون ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آمیزی نہیں ہے۔ ورنہ لفظاً تو ایک ہاتھ سے آپ نیکی کریں تو دوسرے ہاتھ کو ضرور خبر ہوگی کیونکہ آپ ایک ہی وجود کے حصے ہیں۔ مگر یہ جو مضمون حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے عشاق کے حوالے سے بیان فرمایا کہ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ ایسے ایسے بھی ان میں ہیں کہ جو مجھ تک سے نام چھپاتے ہیں اور مومن کا اپنے آقا سے اتنا بھی فرق نہیں ہوتا جتنا ایک ہاتھ کا دوسرے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ پس ایک ہاتھ سے نیکی کرنا اور دوسرے ہاتھ سے چھپانا اس سے بہتر انداز میں ظاہر نہیں فرمایا جا سکتا کہ

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی لوگ بعض دفعہ زیورات بھیجتے تھے اور خود آپ پر بھی نام ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن بہت سے ایسے تھے جو آپ پر ضرور ظاہر کرتے تھے اور دونوں باتیں اخفاء میں ہیں۔جس نے نہیں ظاہر کیا اس نے اپنے پر اعتماد نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتماد نہیں تھا۔اس نے اپنے اوپر اعتماد نہیں کیا اس کو یہ یقین نہیں تھا کہ اگر میں نے مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی نام ظاہر کر دیا تو شاید میں اپنے نفس کی انا کی پیاس بجھانے کے لئے ایسا کر رہا ہوں اور دل چاہتا تھا کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اپنی نیکی کو ظاہر کروں تا کہ دعائیں بھی حاصل کروں لیکن دعاؤں کے ساتھ جہاں نفس کی ملونی کا خطرہ ہو وہاں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو خود اپنے اوپر اعتماد نہیں تھا اور اعتماد نہ ہونے کے نتیجے میں اس نے اپنے ہاتھ سے اپنی انا کی گردن پر چھری پھیری ہے۔گویا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ میری انا کسی طرح بھی خوش ہو سکے اس لئے یہ قربانی تو ضرور خالصتاً اللہ کے لئے ہوگی۔ یہ وہ مضمون ہے جو حضرت مسیح موعودؑ نے ایک ہی تحریر میں ایک بات بیان فرما کر اس کا ایک پہلو روشن فرمایا اور اس بات سے پردہ اٹھا دیا کہ کیسے ایک ہاتھ کی نیکی کی دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہیں ہوتی۔

پھر ایسے بھی ہیں جو یہ اس غرض سے کرتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرے اور خدا کے درمیان ایسا تعلق قائم ہو جائے کہ اس کے اندر کسی انسان کا کوئی واسطہ نہ رہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب نام چھپاتے تھے تو کسی تکبر کی بناء پر نہیں کہ میرا خدا سے براہ راست تعلق ہے بلکہ خدا کی توجہ اپنی طرف پھیرنے کے لئے کہ میں بھی ایک تیرا بندہ ہوں میری نیکی براہ راست تجھ تک پہنچے اور کسی اور کا دخل نہ ہو۔ یہ مضمون ہے جو عین ایسے باریک کنارے پر کھڑا ہے کہ غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی ہو سکتا ہے۔اگر غلط ہو تو ایسا آدمی ٹھوکر کھا کے گر بھی سکتا ہے۔اگر صحیح ہو تو بہت بلند مقام تک اس کو پہنچا دیتا ہے اور گرتا ہے تو خدا کی جھولی میں گرتا ہے۔پس اس پہلو سے ''سر'' کا مضمون بہت ہی گہرا اور باریک ہے اور جب تک ہم اس مضمون کو نہ سمجھیں زیادہ ترقیات نہیں کر سکتے کیونکہ ''سر'' کے اندر جو اندھیرے ہیں وہ اپنی ذات کی راہ میں بھی حائل ہوتے ہیں۔''سر'' کو پہچاننا بہت مشکل کام ہے اس لئے جو اپنی نیتوں کو ٹٹولتا رہتا ہے اسے رفتہ رفتہ وہ بصیرت عطا ہوتی ہے جیسے اندھیرے کمرے میں رہنے کے عادی کی آنکھوں کو عطا ہوتی ہے۔وہ آنکھیں رفتہ رفتہ کھل

جاتی ہیں اور بہت مدھم روشنی بھی ہو تو اس میں کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ گویا جن کی آنکھیں ہمیشہ باہر ہی کھلی رہیں ان کو نفس کے اندھیروں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ نیتوں کا آغاز انا سے ہوا تھا یا رضائے باری تعالیٰ کی خاطر قربانی سے ہوا تھا۔

پس یہ وہ ''سر'' کا پہلو ہے جس پر جماعت کو غور کرتے رہنا چاہئے اور جب تک یہ محاورہ نہ ہو جائے کہ ہم اپنی نیتوں کو خوب پہچان لیں اور ہماری نیتوں کے گرد لپٹے ہوئے کوئی پردے حائل نہ ہوں، ہماری نظر اور اس نیت کے درمیان اس وقت تک قلب کی صفائی ممکن نہیں ہے۔ جب صفائی ہو جائے پھر وہ مقام آتا ہے جس کا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکر فرمایا ہے کہ اب یہ باتیں ختم ہو چکی ہیں، پرانی باتیں رہ گئی ہیں۔ کوئی دیکھتا ہے کہ نہیں دیکھتا ان سے میری توجہات کا مضمون بہت بالا ہو چکا ہے۔ پس وہاں تک پہنچنے کے لئے بیچ کی منازل ہیں اس لئے ہر انسان کو اپنی نیتوں پر نظر رکھنا خواہ وہ عبادت کے تعلق میں ہوں، خواہ وہ مالی قربانی کے تعلق میں ہوں یا وقت کی قربانی اور خدمات کے تعلق میں ہوں نہایت ضروری ہے اور خطرات اس وقت تک درپیش ہوتے ہیں جب غیر کی تحسین کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ وہی وقت ہے جو ایک قسم کی طمانیت کا وقت بھی ہے اور خطرات کا وقت بھی ہے اور یہ بھی ایک ایسا مضمون ہے جو یہاں اس سے مفر کوئی نہیں، بھاگ سکتے ہی نہیں۔ اب ہم جتنے بھی خدمت کرنے والے ہیں ان پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں اور امراء بھی نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ شکریوں کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور مجھے بھی ساتھ بھیجتے ہیں۔ امیر صاحب UK کی بہت سی چٹھیاں میرے پاس آتی ہیں جو نقول ہیں ان لوگوں کے نام لکھی ہوئی چٹھیوں کی جن کو یہ لکھا گیا کہ آپ کی مالی قربانی جس انداز سے آپ نے کی، جس پیار اور خلوص سے کی وہ ہم تک پہنچی اور درج ہوئی اور میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے بدلے دین و دنیا کی حسنات سے نوازے۔ غرضیکہ اسی قسم کا مضمون ہے جو سب لکھنے والے لکھتے ہیں اور مجھے چٹھی بھیج دیتے ہیں اور مجھے جو چٹھی بھیجنا ہے اس نیت سے نہیں کہ دیکھو ہم کتنی عمدگی سے اور فوری کام کر رہے ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس غرض سے بھیجتے ہیں کہ جو دعائیں ان کے دل سے ایک اچھے خدمت کرنے والے کے لئے اٹھی ہیں وہ میرے دل سے بھی اٹھیں۔ اب لکھتے ہیں ہم تو تک بھی آواز پہنچتی ہے کہ میری نیکی محسوس کی گئی ہے۔ ان کے نفس کو بھی ایک طمانیت نصیب ہوتی ہے اور یہ طمانیت ہے جو خطرے پر بھی منتج ہو سکتی

ہے اور یہاں لازم ہے کہ ہم اس خدا کی پناہ مانگیں جس کی طرف سے مُعَقِّبٰتٌ مِّنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ مقرر ہیں کہ ہمیں ہر قسم کے خطرات سے بچاتے رہیں۔ تو نیکی کا مضمون جتنا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے اتنا ہی زیادہ باریک سے باریک تر ہوتا چلا جاتا ہے اور بہت رفعتوں میں جا پہنچتا ہے یعنی جتنی گہرائی ہے اتنی ہی رفعتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس پر ان رفعتوں کے سمجھنے کے نتیجے میں پھر انسان کو رفعتیں نصیب ہوتی ہیں۔ ان کو سمجھے بغیر نیکی کے عام پھل تو اسے ملیں گے مگر وہ پھل جو لامتناہی ہیں وہ پھل ان کے حصے میں آتے ہیں جن کی نیتیں لامتناہی طور پر خدا کے لئے وقف ہو چکی ہوں۔

پس خرچ تو ہم نے کرنے ہی کرنے ہیں جس نے دس روپے چندہ دینے کی توفیق پائی ہے اپنی توفیق کے مطابق وہ دس ہی دے سکتا ہے جس نے لاکھ یا کروڑ کی پائی ہے اس نے بھی توفیق کے مطابق ایسا کیا۔ مگر نہ دس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے ہاں غیر معمولی مقبولیت پا گیا، نہ کروڑ کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں غیر معمولی مقبولیت پا گیا۔ خدا کے ہاں ہندسے ختم ہو جاتے ہیں اور وہ آخری نیت ہے جس پر خدا کی نظر ہوتی ہے۔ غربت اور امارت کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ ہر پیش کرنے والا برابر ایک صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ پس ان معنوں میں وہ آیت ایک مضمون پیش کر رہی ہے سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَمَنۡ جَهَرَ بِهٖ اب خدا کے حضور تم سب برابر ہو گئے ہو خواہ تم نے بڑھ بڑھ کے پیش کئے چھپ چھپ کے کئے لازم نہیں کہ چھپا ہوا آگے بڑھ گیا ہے کیونکہ چھپے ہوئے کی نیکیوں میں بعض چھپی ہوئی بدیاں بھی داخل ہو جاتی ہیں اور علانیہ نیکی کرنے والے کے اندر بھی بعض اخفاء کے ایسے پہلو ہیں جن پر خدا کے سوا کسی کی نظر نہیں۔ پس یہ عجیب مضمون ہے کہ امیر اور غریب، ظاہر اور مخفی سب برابر ہو جاتے ہیں خدا کی نظر میں اور وہی ایک ہے جو جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے، کس حد تک ہے اور اگر ہم محنت کر کے اپنی نیکیوں کو خدا کے لئے خالص کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو یہ زندگی بھر کا سفر ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ آج آپ کے دل میں خیال اٹھا اور کل وہ بات ختم ہو گئی۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ زندگی کے ہر شعبہ پر یہ مضمون حاوی ہے اور تمام زندگی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر روز ہم کچھ نہ کچھ کرتے ہیں اور جو بھی کرتے ہیں اس میں ہماری نیتیں شامل ہوتی ہیں خدا کے یا غیر اللہ کے کام کرنے کی۔ اپنے بچوں کو پالتے ہیں، اپنی بیویوں کی

ضروریات پوری کرتے ہیں ،اپنے دوستوں کا خیال رکھتے ہیں ،تعلقات کے دائرے میں جکڑے ہوئے ہم آگے چلتے ہیں اور ہر تعلق کے دائرے کے اندر خدا تعالیٰ موجود ہے جو ہمیں دکھائی نہیں دیتا ۔اگر اس کی طرف دھیان جاتا ہے اور وہ ایک موجود حقیقت کے طور پر ہر تعلق کے دائرے میں دکھائی دینے لگتا ہے تو یہ وہ ہے جو اس دنیا میں بقاء نصیب ہو جاتی ہے اور باقی اور لا فانی سے ایک تعلق شروع ہو جاتا ہے اور پھر ہر تعلق کے وقت انسان اس انسان سے بہتر جس نے یہ باتیں محسوس کی ہیں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے خدا کی موجودگی کو کیسا پایا۔کیا خدا کی موجودگی کے نتیجہ میں اسے کوفت ہوئی اور طبیعت مکدر ہوئی اور اس کا جو لطف تھا وہ کچھ بک بکا سا ہو گیا یا خدا کی موجودگی کے خیال سے اس کے لطف میں مزید چمک پیدا ہو گئی اور اس کا لطف ایک آسمانی نوعیت کا نا قابل بیان لطف بن گیا۔

یہ دو انتہائیں ہیں جن کے درمیان ہر مومن کا قدم یا ایک انتہا کے قریب ہے یا دوسری انتہا کے قریب ہے اور یہ منازل لامتناہی ہیں ایک مبتدی جو سفر کرتا ہے وہ پہلی حالت ہے اس کے قریب رہتا ہے یعنی خدا کا تصور تو بار بار اٹھتا ہے لیکن گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے کہ یہ میرے دنیا کے تعلقات اس کے مزے میں اب میں خدا کا مضمون داخل کروں تو یہ مزا کر کرا ہو جائے گا۔سوتے جاگتے ،اٹھتے بیٹھتے ،کھاتے پیتے ،گفتگو میں یا خاموشی میں ہر حال میں انسان پر یہ کیفیت طاری ہوسکتی ہے کہ وہ خدا کی ہستی کا تصور باندھے اور وہ تصور یا اجنبی لگے یا ایسا تصور ہو جس کی تلاش تھی جو ایک خلاء کو بھر دینے والا ہو۔یہ جو آخری بات ہے یہ آسان نہیں ہے اور محض یہ کہہ دینا کہ خدا سب سے پیارا ہے بالکل غلط ہے جب تک پیارا بن کے نہ دکھائے اور پیار یونہی پیدا نہیں ہو جایا کرتے۔انسان سے ہمارے پیار جو ہیں وہ تعلقات کے نتیجے میں لمبے عرصے میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنائیت ہو کر جب دوئی مٹتی ہے تو پھر تعلق ایک اور منزل پہ جا پہنچتا ہے ایک اور بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

تو خدا تعالیٰ کی ذات اور انسان کی ذات میں اتنا بُعد ہے کہ انسان سے تعلق میں بھی اگر بیچ کی منازل بہت ہیں اور وہ آخری یک جان ہونے کی منزل بہت بعد میں آتی ہے تو خدا کے تعلق میں تو بہت ہی مشکلات ہیں اور دعا کے بغیر یہ مضمون حل ہو ہی نہیں سکتا یہ سفر طے ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ شروع میں تو انسان کی طبیعت یہ اجنبیت محسوس کرتی ہے کہ جب میں انسان سے پیار کرتا ہوں

،انسان کی خوبصورتی کو دیکھتا ہوں ،اس کے احسانات کو دیکھتا ہوں تو یہ ساری باتیں قرب سے معلوم ہورہی ہیں اوراس میں ہم جنس ہونے کی وجہ سے کوئی بعد نہیں ،کوئی اجنبیت نہیں ،ایک طبعی چیز ہے۔ مگراس تعلق کواہمیت نہ دوں اس کوادنیٰ سمجھوں اور واقعی دل کے ولولوں کے ساتھ اپنی محبتوں کا مرکز خدا کو بنالوں یہ جب تک حقیقتاً اس کو سمجھ نہ آئے اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ یہ آسان کام ہے ہی نہیں کیونکہ جو یکسانیت ہے جب تک وہ نہ ہواس وقت تک محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔سب سے بلند تر محبت وہ ہے جو یکسانیت سے پیدا ہوتی ہے اس میں پھر کبھی کوئی دوری نہیں ہوتی۔ جو محبتوں کا سفر کرتے ہیں آغاز میں جو محبت بہت ہی غیر معمولی طور پر طاقتور دکھائی دیتی ہے جب بھی اس میں رخنہ پڑتا ہے یکسانیت کے فقدان سے پڑتا ہے۔میاں بیوی خواہ کیسے ہی پیار سے زندگی کا سفر شروع کریں جوں جوں وقت کے ساتھ مختلف صورت حال پر ردعمل میں اختلاف دکھائی دیتا ہے۔جوں جوں نظریات کے اختلاف جو ہیں وہ روزمرّہ کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔وہ جو دخل اندازی ہے وہ محبتوں کے اندر ایک رخنہ ڈالنے والی دخل اندازی ہوتی ہے جو یکسانیت کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی چیز جو پہلے خوبصورت دکھائی دیتی تھی اس کی خوبصورتی کے باوجود اس میں وہ دلچسپی باقی نہیں رہتی۔دل پیچھے ہٹ جاتے ہیں حالانکہ جسم وہی رہتے ہیں۔تو اس وجہ سے در حقیقت محبت کا فلسفہ ہی یکسانیت ہے اور جب تک یکسانیت پیدا نہ ہو اگر جنسیں بھی الگ الگ ہوں تو محبت کا پیدا ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اسی لئے وہ بزرگ جن کا میں ذکر کیا کرتا ہوں بابا عبدالستار صاحب ’’بزرگ صاحب‘‘ کہتے تھے،عبدالستار خاں۔قادیان میں ایک پٹھان مہاجر تھے جن کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی عشق تھا اور خدا پرست ایسے تھے کہ جو دل سے دعا اُٹھتی تھی بہت جلد اس کا جواب ملتا تھا اور سادہ انسان مگر بہت گہرا اور باریک مزاج۔چنانچہ ان کا جو واقعہ میں نے پہلے بھی بارہا آپ کے سامنے رکھا ہے وہ اس موقع پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔انہوں نے ایک دفعہ یہ دعا شروع کر دی کہ اے خدا میں نے تو ملکہ وکٹوریہ کو دیکھا نہیں ہے ان کا نام سنا ہے۔نہ اس کے ساتھ میرا کوئی قومی تعلق ہے،نہ جسمانی طور پر کوئی تحریک میرے دل میں اس کے لئے پیدا ہوسکتی ہے،ہاں اس کی نیکی کے تذکرے سنے ہیں کہ اچھا بادشاہ ہے۔تو اگر کوئی مجھے کہے کہ ملکہ وکٹوریہ سے عشق شروع کر دو میں کیسے

کرسکتا ہوں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے، میری طاقت میں نہیں ہے اور پھر عرض کیا کہ اے خدا پھر جنسوں کا بھی تو اختلاف ہے۔ اب کہاں میرا اور ملکہ وکٹوریہ کا فرق، کہاں میرا اور تیرا فرق۔ کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ تو جہاں قدر مشترک ہی کوئی نہیں وہاں کیسے میں تجھ سے محبت کروں مجھے یہ سمجھا دے۔ یہ دعا کرتے ہوئے کشفی حالت طاری ہوگئی اور اس کشفی حالت میں ان کو ایک شعر الہام ہوا کہ

عشقِ اوّل دردلِ معشوق پیدا می شود
تا نسوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

کہ عشق تو پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر شمع جلے نہیں تو پروانے کو کیا پاگل پن ہے کہ وہ شمع پر، بجھی ہوئی شمع پر جا کر اپنی جان نچھاور کرے۔ حوالہ:۔۔۔ پروانہ جلتا تو ہے مگر پہلے شمع جلتی ہے۔ معشوق پہلے جلتا ہے عاشق بعد میں جلتا ہے۔ عجیب جواب تھا یہ اور چونکہ وہ بہت ہی گہرے عارف باللہ تھے وہ اس مضمون کو سمجھ گئے کہ دراصل خدا سے محبت خدا ہی کی محبت کے نتیجہ میں پیدا ہوسکتی ہے اور ساری کائنات میں خدا کی محبت کے مظاہر بکھرے پڑے ہیں۔ کوئی بھی زندگی کا سانس ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے لطف و احسان کا مظہر نہ ہو۔ وہ ہماری طلب کر رہا ہے، وہ ہمیں بلا رہا ہے۔ تو اس مضمون کو سمجھیں تو پھر ایک یکسانیت کے مضمون کا آغاز شروع ہوجاتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ ہے ویسا بننے کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے اور اگر خدا محسن ہے اور بندہ محسن بنتا ہے اور خدا کے احسانات کا دائرہ جو لامحدود ہے اس پر نظر رکھ کر محسن بننے کی کوشش کرتا ہے تو خدا سے ایک قسم کی یکسانیت پیدا ہونے لگتی ہے اور پھر خدا کا فضل ہے جو اس کی اس دل کی تمنا کے تیل پر آسمان سے اپنی محبت کا شعلہ برساتا ہے اور نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ بن کر وہ انسان جو خدا سے کوئی بھی نسبت نہیں رکھتا محبت میں اس کا شریک ہوجاتا ہے۔ تو شمع پہلے جلتی ہے پروانہ بعد میں، یہ مضمون ہے کہ وہ شمع روشن ہے اور اس کی روشنی ساری کائنات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (النور:36) اس پر غور تو کرو جب تم اس کے نور کے پردوں کو دیکھتے ہو جو پردوں کے پیچھے ہے لیکن پردے چمک اٹھے ہیں تو دراصل تمہیں اسی سے تو محبت ہو رہی ہے۔ ان کو بیچ میں حائل کیوں رہنے دیتے ہو۔ حسن خواہ انسان کا ہو پھولوں کا ہو، خواہ پہاڑوں کا ہو، ندی نالوں کا ہو یا صحراؤں کا حسن وہ بھی تو ایک حسن ہے۔ صحراؤں کا حسن ہو، ہر حسن پر جب انسان غور کرتا ہے تو اس کے پیچھے اللہ

تعالیٰ کا حسن کارفرما ہے۔

اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

چشمِ مستِ ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے
ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

(درثمین:10)

یعنی ہمیں تو خوبصورت آنکھیں بھی تیری ہی طرف لے جاتی ہیں اور ان کی زلفیں خمدار ہوں بھی تو ان کا ہاتھ تیری ہی طرف اٹھتا ہے۔ یہ ساری نظر اسی مضمون کی مظہر ہے کہ کس طرح خدا کا حسن روشن ہو چکا ہے اور جگہ جگہ ذرّے ذرّے پہ روشن ہے اور جدھر بھی نظر ڈالو تمہیں خدا کی محبت کی راہیں دکھائی دیں گی لیکن پہلے یہ شعور تو پیدا کرو کہ حسن ہے کیا اور کس کا ہے۔ اس مضمون میں جب تم داخل ہوتے ہو تو ہر قدم پر اذن اللہ کی ضرورت ہے۔ اللہ کے اذن کے بغیر اگلا قدم اٹھانے کی توفیق نہیں۔ ورنہ اس مضمون میں بھی ہر قدم پر وہ خطرات ہیں جن سے بچانے کے لئے آیت کے اس حصے کی ضرورت پڑتی ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ کیونکہ یہ مضمون بسا اوقات حقیقت سے مجاز کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کو مجاز ہی میں غرق کر دیتا ہے اور جتنے قدم خدا کی طرف بڑھنے کے ہیں اتنی ہی ٹھوکریں اس راہ میں حائل ہیں۔ ہر قدم پر ایک ٹھوکر بھی ہے اور آگے بڑھنے کے امکانات بھی ہیں۔ تو جس کو سب کچھ دکھائی دے رہا ہے اس کی طرف کیوں نہ توجہ دی جائے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ اس کے پاس ایسے معقبات ہیں جو تمہاری حفاظت کر سکتے ہوں، تمہارے آگے اور پیچھے چلیں تمہاری نیتوں پر نگران ہو جائیں۔ مگر اگر اس سے مدد مانگتے ہوئے آگے بڑھو گے تو یہ نصیب ہوگا ورنہ نصیب نہیں ہوسکتا۔ باقی جتنے دعویٰ کرتے ہیں سب جھوٹے ہیں کہ ہم نے تو خدا کی محبت کو پالیا ہے، ہم سمجھ گئے ہیں، ہم نے قربانی خدا کی خاطر کر دی ایک آدھ دفعہ نیت صاف کر کے خدا کی خاطر چھپ کر ضرور ہوگی اور بسا اوقات انسان کو توفیق ملتی ہے۔ مگر ایک قدم ہی تو سفر کا نام نہیں۔ خدا کی طرف سفر تو لامتناہی ذات کی طرف سفر ہے۔ اس کا تو ہر قدم ایک مشکل قدم بھی ہے اور قدم بھی لامتناہی ہیں، نہ ختم ہونے والے قدم ہیں۔ تو ایک آدھ نیکی کر کے اس پر خوش ہو کے بیٹھ جانا اور یہ سمجھ لینا کہ ہم نے سب کچھ پالیا، یہ انتہائی بے وقوفی ہے اور اس کے نتیجے میں جو کچھ

پایا ہے وہ بھی کھویا جاتا ہے۔

ایسے ایسے لوگ بھی آپ دیکھیں گے جنہوں نے کچھ پایا اور اس پانے کے تکبر نے ہی ان کو ہلاک کر دیا۔ بڑے بڑے سر اونچا لئے پھرتے ہیں۔ کوئی ایک راز اتفاقاً مل گیا جو معمولی بات ہے۔ عارف باللہ کو تو روزانہ خدا تعالیٰ بے شمار نکات عطا فرماتا ہے اور وہ جھک کر قبول کرتا ہے، وہم وگمان میں بھی نہیں آتا کہ میری کوئی چالاکی ہے لیکن ایسے ایسے بے وقوف بھی آپ کو نظر آئیں گے جو ایک بات پکڑ کے بیٹھ گئے ہیں اور بار بار وہ پوچھتے پھرتے ہیں لوگوں سے کہ اس کا جواب دو۔ گویا میرے سوا کوئی اس کا جواب نہیں جانتا۔ وہ چھوٹا سا کوئی چٹکلہ بے حقیقت، بے معنی اور اسی چٹکلے کے تکبر میں مبتلا ہو کر اگر کوئی نیکی تھی بھی تو وہ بھی برباد کر بیٹھتے ہیں۔ کئی ایسے آدمی میرے علم میں ہیں بعضوں سے میری گفتگو ہوئی، بعضوں کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ انہوں نے یہ سوال کیا ہم نے بہت پھرا ہے بہت دیکھا ہے اس سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ مراد یہ نہیں کہ سوال کے جواب کی تلاش ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ ہمیں پتہ ہے تمہیں کچھ پتا نہیں اور آپ لاکھ ان کو سمجھانے کی کوشش کریں وہ سر ہلاتے رہیں گے کہ نہیں۔ اصل بات بتائیں گے نہیں کیونکہ وہ بات ہوتی کچھ نہیں، بے حقیقت سی بات ہوتی ہے اور سر پھیر کے چلے جاتے ہیں کہ ہمیں یہاں سے بھی جواب نہیں ملا۔

ایسے ایک دو آدمیوں سے واسطہ پڑا اور اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ ان کی نفسانی حالت کو سمجھتے ہوئے ان کو لوگوں کے سامنے بہر حال لاجواب کر دیا۔ وہ سر اٹھا کے نہیں واپس جا سکا اور اتنی بھی توفیق نہیں ملی کہ کہہ دے کہ ہاں میری تسلی ہوگئی ہے۔ تو تسلی بھی خدا کا کام ہے وہ بھی بندے کے بس کی بات نہیں۔ حضرت مصلح موعودؓ کی خدمت میں بھی ایک ایسا صوفی پہنچا تھا ایک بار اور بڑے اس نے تکبر کے ساتھ کہا کہ میں چند سوال لے کے آیا ہوں میرے جواب دیں آپؓ فوری طور پر۔ آپؓ نے فرمایا بتاؤ۔ اس نے کہا کہ یہ بتائیں اگر کوئی کشتی پر سفر کر رہا ہو اور کنارہ آجائے اور کنارے پر پہنچنے کے بعد کشتی میں بیٹھا رہے اس کو آپ کیا سمجھیں گے۔ اس کو آپ بے وقوف اور پاگل کہیں گے یا دانا سمجھیں گے۔ حضرت مصلح موعودؓ نے فرمایا میرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ لامتناہی سمندر میں سفر کر رہا ہے تو جہاں کنارہ سمجھ کے اترا وہیں ڈوبا اور اچانک وہ سمجھ گیا۔ جس مسئلے کا جواب اس کو دنیا میں کہیں نہیں ملا تھا وہ بے اختیار بول اٹھا کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ صوفیوں کا ایک فرقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ جب خدا کو

پالیا تو عبادتوں کی کیا ضرورت ہے۔خواہ مخواہ پانچ وقت کی نمازیں اور شریعت کی پابندی یہ چیزیں تو خدا کے حصول اور اس کی تلاش کے لئے ہیں۔ جب ہم نے پاہی لیا تو پھر کیا ہے۔مگر حضرت مصلح موعودؓ بات کو سمجھ گئے اور کیسا عمدہ جواب دیا کہ تم اس کو پانے کا دعویٰ کر رہے ہو جو لامحدود ہے اور تم محدود ہو۔ اس لئے جہاں یہ دعویٰ کیا وہیں غرق ہو جاؤ گے۔تو تکبر ہے جو انسان کو غرق کر دیتا ہے اور تکبر بھی اندھیروں کی پیداوار ہے۔ کبیــر کہلانے کا حق صرف اس کا ہے جو جانتا ہے۔پس دیکھیں اس آیت کے ہر لفظ کو ہر لفظ کے ساتھ خدا نے ایسے رشتوں میں باندھا ہے کہ وہ ظاہری طور پر بھی دکھائی دیتے ہیں اور گہرائی میں بھی مسلسل چلتے ہیں۔

پس اگر تم کوئی بلندی چاہتے ہو،اگر عظمت چاہتے ہو تو اللہ کے علم میں غرق ہو جاؤ اس کے علم کو اپنا لو،اس کے علم کے سائے تلے چلو تب تمہارے لئے بچنے کا امکان ہے اور پھر تمہاری حفاظت ہوگی۔اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہاری نہ نیکی کی کوئی قیمت ہے نہ بدی کی کوئی حیثیت سب کچھ خدا کی نظر میں برابر ہی ہیں۔یکساں دنیاوی زندگی بسر کر رہے ہو کبھی نیکی کے نام پر کبھی بدی کے شوق میں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے پھر فرماتے ہیں:

> یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر ایمان لاتا ہے اور اس کے ساتھ اسے ایک صافی تعلق پیدا ہوتا ہے۔دنیا اور اس کی چیزیں اس کی نظر میں فنا ہو جاتی ہیں۔

(ملفوظات جلد 5 صفحہ 665)

یعنی اخفاء کی انتہا جو ہے یہ تب ہی نصیب ہوتی ہے کہ سب دنیا نظر سے غائب ہو جائے کوئی دیکھ ہی نہ سکے یہی میں آپ کو سمجھا رہا تھا کہ یہ وہ حالت تھی جس کو مسیح موعود نے پایا اور ایک اور سوال کے جواب میں اس کو ظاہر فرما دیا۔یہاں آپ غائبانہ حوالے سے باتیں کر رہے ہیں اپنا مضمون نہیں بتا رہے۔اس کو بھی اخفاء میں رکھا ہوا ہے کہ میں خود اس تجربے سے گزرا ہوں۔میں جانتا ہوں کہ اس کے بغیر یہ بات نصیب ہو ہی نہیں سکتی کہ اللہ کا تعلق اتنا بڑھ جائے اور اس کی ہمہ وقت حاضری اس کے سامنے یا آپ کی خدا کے حضور ہمہ وقت حاضری یہ مضمون ساری زندگی کے ہر پہلو پر اتنا غالب آجائے کہ باقی گویا کچھ بھی نہیں رہا،ہر دوسری چیز فنا ہوگئی ہے پیچھے ہٹ گئی ہے۔اس وقت پھر خدا تعالیٰ

اس آخری مقام کی نیکی کی توفیق بخشتا ہے جو اسرار میں سب سے بڑھ کر سر ہے یعنی دنیا سے چھپا ہوا اور خدا کے تعلق کا وہ سر جس کا اس بندے کے سوا جس کا خدا سے وہ تعلق ہے کسی کو علم نہیں ہوتا۔

پس یہاں ''سر'' دو معنوں میں ہے ایک یہ کہ دنیا کی نظر سے جب وہ غائب ہو جاتا ہے یا دنیا کو غائب کر دیتا ہے تو ایک راز ہے جو کسی کو معلوم ہو ہی نہیں سکتا۔ جس نے مسیح موعود علیہ السلام سے بھی اپنی نیکی چھپائی جیسا کہ مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے اب اس کے دفاع میں بیان فرما رہے ہیں کہ میں اس کے اس فعل کو تکبر نہیں سمجھتا بلکہ اس کی ایک حالت ہے اور اس حالت کے بغیر اگر ایسا کرو گے تو یہ بھی ریا کاری ہے اور یہ بھی اپنے نفس سے چھپنے کی بات ہے۔ اس لئے طبعی حالتوں کے ساتھ ان نیکیوں کو ادا کرو یہ بھی بڑا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ آج میرا خطبہ سنا تو کل مجھ سے چھپا چھپا کے کریں اور سمجھیں کہ آپ نے اس مقام کو پالیا ہے۔ کسی بت بنانے سے بت کی شکل کا وہ انسان تو نہیں بن جایا کرتا یہ وہ گہری حقیقتیں ہیں جو زندہ حقیقتیں ہیں۔ بت بنانے سے ان بتوں میں جان نہیں پڑ سکتی۔ اس لئے یہ حقیقتیں آپ کو بھی تب زندہ کریں گی اگر یہ خود زندہ ہوں گی۔

تو جہاں تقویٰ کے ساتھ سچائی کے ساتھ دل کا ایک جذبہ مختلف امکانات سے گزرتا ہوا آخر ایک فیصلہ تک پہنچتا ہے اور وہ ایک ایسے اخفاء کا فیصلہ ہے جس میں اور کوئی دنیا کا انسان اس سے باخبر نہیں ہوتا یہ وہ سر ہے جو اس کی نیکی کو حاصل ہوا جو ہر چیز سے چھپ گئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں یہ اس شخص کو زیبا ہے اور اسی کو اس کی توفیق ہے جس کی نظر میں ہمہ وقت خدا موجود ہے۔ یہ ہے وہ اہم نکتہ جس کو سمجھے بغیر آپ اس نیکی کی نقل بھی ماریں گے تو نیکی کو ضائع کر دیں گے۔ اگر انسان کلیتہً اپنی نیکی کو ہر دوسرے وجود سے چھپالے تو اس سے بڑا پاگل پن کوئی نہیں سوائے اس کے کہ اس وجہ سے چھپایا گیا ہو کہ جس کی خاطر ہے جو ہمہ وقت حاضر ہے اس کی نظر میں آچکی ہے اور مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ اب کوئی اور اس کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ پس ہمہ وقت خدا کے وجود کا تصور اور اس کی حاضری ہی ہے جو سر کو نیکی بنا دیتی ہے اور یہ سر جب نیکی بنتا ہے تو ایک سر نہاں بن کر جو اللہ کے عشق اور اللہ کی محبت کا سر ہے اس کے دل کو روشن کر دیتا ہے۔ اچانک اس سر میں سے ایک اور سر جاگ اٹھتا ہے وہ اللہ کی ایسی محبت کا سر ہے جو خدا کو اس سے ہے، اس کو خدا سے ہے۔ دنیا میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں، کسی کو علم نہیں ہوتا کہ یہ محبت کیسے پیدا ہوئی، کیا ہے، کیا اس کی حقیقت ہے

اور کس عالی مرتبہ تک خدا اس محبت کے ذریعے اس کو پہنچا دے گا۔ یہ جو صورت حال ہے یہ چند مالی پیسوں کی قربانی کے تعلق میں بیان ہو رہی ہے لیکن آپ دیکھیں اس کا کتنا وسیع مضمون ہے۔ زندگی کی ہر نیکی کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ ہر انسانی جذبہ پر یہ بات چھائی ہوئی ہے۔

اس کے ساتھ ایک صافی تعلق پیدا ہو جاتا ہے (یہ الفاظ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں) دنیا اور اس کی چیزیں اس کی نظر میں فنا ہو جاتی ہیں اور اہل دنیا کی تعریف یا مذمت کا اسے کوئی خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ نہیں کہ دکھاوے کی خاطر تعریف سے بھی چھپتا پھرتا ہے اس کی بلاء سے ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی۔ ہوتی ہے تو معنٰی کوئی نہیں۔ بسا اوقات ایسا انسان کو تجربہ ہوتا ہے کوئی شخص جس نے کسی کے ساتھ نیکی کی ہو بعض دفعہ وہ اس کی تعریف میں خط لکھتا ہے تو جس نے واقعۃً اللہ کے لئے کی ہوتی ہے اس کو پرواہ کوئی نہیں ہوتی۔ یہ الفاظ اس کے دل میں کوئی کسی قسم کی بھی تحریک نہیں پیدا کرتے جو تعریف کو کرنی چاہئے کیونکہ وہ اپنی تعریف خدا سے وصول کر چکا ہوتا ہے۔ اس لئے دوسری دفعہ وہ وہی سودا کسی اور کو نہیں بیچتا۔ تو اس طرح انسان اپنی نیکیوں پر نظر رکھ سکتا ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باریک باریک مقامات پر نظر رکھتے ہوئے آپ کی رہنمائی فرمائی ہے۔

''غرض بدیوں کے ترک پر اس قدر ناز نہ کرو (اب ایک اور مضمون شروع ہو گیا) غرض بدیوں کے ترک پر اس قدر ناز نہ کرو۔ جب تک نیکیوں کو پورے طور پر ادا نہ کرو گے اور نیکیاں بھی ایسی نیکیاں جن میں ریاء کی ملونی نہ ہو اس وقت تک سلوک کی منزل طے نہیں ہوتی۔''

یعنی بعض ترک شر پر ہی نازاں ہوتے ہیں ہم نے فلاں بدی چھوڑ دی ہم نے فلاں بدی چھوڑ دی۔ فرمایا بدی چھوڑنا تو کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کس نیکی نے اس بدی کی جگہ لی ہے؟ یہ ہے اصل مضمون۔ اگر آپ صفائی کر کے بیٹھ جائیں اور کچھ بھی وہاں نہ لگائیں وہ خلاء کی خلاء ہی رہے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ صفائی اس لئے کی جاتی ہے کہ گندگی پھینکی جائے اور اچھی چیز اس کی جگہ رکھی جائے یا اچھوں کو وہاں آنے کی دعوت دی جائے۔ اگر خالی صفائی ہی ہے، نہ اچھا سامان، نہ اچھے آنے والے لوگ تو اس صفائی کا کیا فائدہ۔ فرمایا نیکیوں سے اپنے دلوں کو بھرنا یہ وسعت بناؤ اگر نیکیوں سے دلوں

کو نہیں بھروگے تو سلوک کی کوئی منزل طے نہیں ہوگی۔ پس بدیوں کا ترک نیکیوں کے استقبال کا ذریعہ ہے اور جب تک نیکیاں حاصل نہ ہوں خدا کی طرف آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھانے کی توفیق نہیں مل سکتی۔

آگے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

یاد رکھو کہ ریاء حسنات کو ایسے جلا دیتی ہے جیسے آگ خس و خاشاک کو

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 665،666)

اور جو نیکیاں ہیں ان کی حفاظت کے لئے پھر ایک اور مشکل بدیاں دور کرو اور نیکیاں اختیار کرو اور ریاء کا ڈاکو ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ ہر قدم پر دکھاوے کا جو شیطان ہے وہ ابتلا لے کر آتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ تو ایسے ہے جیسے خشک گھاس پھوس کو آگ دکھا دی جائے اس طرح یہ نیکیاں جل جاتی ہیں۔ دراصل اس میں ایک اور گہرا مضمون ہے وہ یہ ہے کہ نیکی جس کے ساتھ دکھانے کی تمنا ہو وہ ہری ہوتی ہی نہیں وہ ہوتی ہی خشک گھاس کی طرح ہے اور ریاء بس وہ تیلی بنتی ہے جو خشک گھاس پھوس کو دکھا دی جاتی ہے اس نے تو پھر بھڑکنا ہی ہے، اس کے مقدر میں جل جانا ہے۔ ورنہ نیکیوں میں گیلی مٹی کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر طراوت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ روئیدگی ہوتی ہے، سبزی اس سے نکلتی ہے اس کو تو تیلی جلا نہیں سکتی اور تیلی کا دماغ میں تصور بھی نہیں آتا اس کے ساتھ۔ پس وہ جس کو لوگ نیکی سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً ان کے جلانے کا انتظام بھی کرتا رہتا ہے یہ قانون قدرت ہے۔ جیسے گھاس پھوس کسی باغ میں زیادہ اکٹھا ہو جائے تو مالی ایک طرف کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر اس ڈھیر کو ایک دن تیلی دکھا کر اس خس و خاشاک سے اپنے چمن کو پاک کر لیتا ہے۔

تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی کا سفر کرنے والوں کا حال ہے جو ان کے ریاء کی باتیں ہیں شیطان ان کو تیلی لگاتا ہے اور وہ جل کر خاک ہو کر جو اگر باقی کوئی نیکی رہ گئی ہے تو وہی رکھیں گی باقی سب باتیں اس دنیا میں خاک ہو کر اڑ جاتی ہیں۔ تو کوئی پتا نہیں کہ ہم کتنی نیکیاں لے کر خدا کے حضور حاضر ہوں گے۔ اب اس مضمون پر نظر رکھیں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے ہم نے بظاہر پھل پھول اکٹھے کئے کتنے ہی سرو وسمن سے اپنے نیکی کے چمن کو سجایا اور سمجھتے یہ رہے کہ یہ لہلہاتا ہوا باغ ہے لیکن وہ تھا خشک گھاس پھوس۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں یا سوکھی ہوئی ٹہنیاں تھیں اور ریاء کے ہر

شیطان نے ہر موقع پر اسے تیلی دکھائی اور آگ لگادی اور اگر آخر پر جا کر یہ آنکھ کھلے اور انسان کو پتہ چلے کہ مضمون کیا ہے تو مڑ کر دیکھے گا تو جلے ہوئے چمن کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

پس اس حال میں خدا کے سامنے پہنچنا ہے کہ کچھ لے کر پہنچیں اور یہ وہ بات ہے جس کے لئے مسلسل تیاری، ہمہ وقت نگرانی کی ضرورت ہے اور وہ جماعت جو مالی قربانیوں میں اس قدر عظیم بلند منازل طے کر رہی ہے اس کے لئے تو اور بھی زیادہ حفاظت کی ضرورت ہے۔ پس وہ سارے جو خدا کی خاطر ایک آنہ پیش کرتے ہیں یا کروڑوں روپے پیش کر رہے ہیں وہ اپنی قربانیوں کی نگرانی کریں اور اس نگرانی کے تعلق میں جو طریق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سکھایا ہے اس کے ذریعے ان کو باقی نیکیوں کی حفاظت کی بھی توفیق ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(آج کیونکہ میں نے ایک جماعتی سفر پر جانا ہے اس لئے نماز جمعہ کے بعد اس کے ساتھ ہی عصر کی نماز یہاں جمع ہوگی۔)

نگرانی و بیدار مغزی کے ساتھ جھوٹ سے اپنے معاشرے کو پاک کرنا آپ پر لازم ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 24 رمئی 1996ء بمقام ''بادکروئس ناخ'' Badkreuz Nach، جرمنی)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٣﴾

(الفرقان:73)

پھر فرمایا:

آج مجلس خدام الاحمدیہ جرمنی کا سالانہ اجتماع شروع ہو رہا ہے اور آج کے خطبہ ہی میں مجھے خدام سے بھی افتتاحی خطاب کرنا ہے۔اس سلسلے میں میں نے آج کے خطبہ کا موضوع یہ آیت چنی ہے جس کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفات بیان فرماتے ہوئے جو رحمان خدا کے بندے ہیں فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے یا جھوٹ کی زیارت نہیں کرتے۔ يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کے دونوں معانی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں رمضان کے مہینہ کے متعلق فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ جس نے اس رمضان کے مہینہ کا منہ دیکھا وہ یہ کرے۔تو لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کا جو عام معروف ترجمہ ہے وہ تو یہ ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔مگر اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ جو مضمون بیان ہے اس میں یہ ترجمہ کرنا بدرجہ اولیٰ ہوگا کہ وہ جھوٹ کا منہ تک نہیں دیکھتے۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اور جب وہ لغوبات سے گزرتے ہیں تو عزت اور وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔تو چونکہ لغوبات بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے اس لئے

جھوٹ کو دیکھتے تک نہیں کا مضمون اس آیت کے سیاق وسباق میں بالکل صحیح بیٹھتا ہے۔

آج خصوصیت کے ساتھ مشرقی قومیں جھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں اور اگر چہ مغرب میں بھی یہ بیماری داخل ہورہی ہے مگر عملاً دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ ہمارے ملک پاکستان میں بھی اور ہمسایہ ملک ہندوستان میں بھی، بنگلہ دیش میں بھی اور افریقہ کے اکثر ممالک میں بھی جھوٹ اب ایک روزمرّہ کی عادت بن چکا ہے اور دنیا میں سب سے بڑی تباہی مچانے والی کمزوری جھوٹ ہے جو ایک عام کمزوری بن کے شروع ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تمام بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے جھوٹ سے باز رکھنے کے لئے جو نصائح فرمائی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ

''کیا میں تمہیں گناہوں میں سے بڑے گناہوں کے متعلق نہ بتاؤں؟ یعنی ایسے گناہ جو بہت بڑے ہیں ان میں وہ جو بہت ہی بڑے بڑے ہیں ان کے متعلق میں تمہیں نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا، ضرور بتائیں یارسول اللہ ﷺ۔ تو آپؐ نے فرمایا اللہ کا شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا۔ یہ دونوں باتیں بیان فرمانے کے بعد آپؐ تکیے کا سہارا لئے ہوئے تھے جوش میں آکر بیٹھ گئے اور بڑے زور سے فرمایا **الاوقول الزور، الاوقول الزور، الاوقول الزور، الاوقول الزور** سنو خبردار! جھوٹ نہ بولنا، جھوٹ نہ بولنا، جھوٹ نہ بولنا، جھوٹ نہ بولنا۔ آپؐ نے اس بات کو اتنی دفعہ دہرایا کہ ہم نے چاہا کہ کاش حضورؐ خاموش ہو جائیں۔'' (بخاری کتاب الادب، باب عقوق الوالدینمن الکبائر)

اگر چہ جھوٹ کا ذکر تیسرے نمبر پر آیا مگر سب سے زیادہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے جھوٹ پر آکر جوش کا اظہار فرمایا اور بے اختیار بار بار یہ نصیحت فرماتے رہے کہ خبردار! جھوٹ کے قریب تک نہ جانا۔ وجہ یہ ہے کہ جھوٹ سب گناہوں کی جڑ ہے۔ شرک بھی جھوٹ ہی کا نام ہے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا بھی ایک جھوٹ ہے۔ درحقیقت جھوٹ کا جتنا بھی آپ تجزیہ کریں آپ اسی حد تک یہ معلوم کریں گے کہ ہر بدی کی جڑ جھوٹ کی سرزمین ہے۔ جھوٹ کی زمین سے ہی تمام بدیاں

پھوٹتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے جھوٹ کا ذکر فرماتے ہوئے بار بار یہ تاکید فرمائی کہ خبردار جھوٹ سے پرہیز کرو، جھوٹ سے پرہیز کرو، جھوٹ سے پرہیز کرو۔ جھوٹ کے متعلق جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے یہ ہر بیماری کی جڑ ہے اور شرک بھی جھوٹ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور جھوٹ ہی درحقیقت سب سے بڑا شرک ہے کیونکہ آپ اپنی روزمرّہ کی زندگیوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کر کے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر جھوٹ جو بولا جاتا ہے وہ کسی جھوٹے معبود کی خاطر بولا جاتا ہے اور فی ذاتہٖ انسان کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمیشہ سچ بولنا فطرت کے مطابق ہے اور ایک انسان سچی بات کرنا ہی پسند کرتا ہے مگر اس کے باوجود جتنا روزمرّہ کی زندگی میں جھوٹ داخل ہوا تنے ہی جھوٹے خدا انسان کی زندگی میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں اور جھوٹ ہمیشہ ایک فرضی معبود کی عبادت کی خاطر بولا جاتا ہے مثلاً آپ کو روزمرّہ کی باتیں کرتے ہوئے کوئی ایسی بات بیان کرنا ہو جس سے آپ اپنے کسی جرم پر پردہ ڈالنا چاہیں، وہ خواہ شہادت کے دوران ہو یا بغیر شہادت کے ہو، تو اس وقت آپ جھوٹ کا سہارا لے کر حقیقت سے دنیا کی نظر پھیر دیتے ہیں یعنی جب اپنی نظر حقیقت سے پھیرتے ہیں تو دنیا کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور ایک مقصد حاصل کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت اس سے تمام خوبیاں، تمام نیکیاں، تمام اچھی باتیں حاصل کرنے کی خاطر کی جاتی ہیں وہ لوگ جن کی زندگیوں سے خدا نکل چکا ہو وہ یہی کام جھوٹ سے لیتے ہیں اور ہر مقصد کو جھوٹ کے ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جھوٹ کا کاروبار اتنا چل پڑتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیاست جھوٹی ہو جاتی ہے، تجارت جھوٹی ہو جاتی ہے، میاں بیوی کے تعلقات جھوٹے ہو جاتے ہیں، ماں باپ اور بچوں کے تعلقات جھوٹے ہو جاتے ہیں۔ دوستوں کے تعلقات جھوٹے ہو جاتے ہیں۔ زندگی محض ایک دکھاوا بن کے رہ جاتی ہے اور اس ساری زندگی میں انسان جھوٹ کی عبادت کرتے کرتے دم توڑ دیتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ میں ایک مشرک کے طور پر اپنے خدا کے حضور حاضر ہونے والا ہوں۔

وہ جھوٹ جو فائدہ نہ دے وہ بولا ہی نہیں جاتا۔ یہ بنیادی حقیقت ہے جسے آپ یاد رکھیں اور روزانہ جتنی مرتبہ آپ کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو اتنی مرتبہ ہی آپ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ پس ہر انسان کی توحید کا معیار اس کے جھوٹ اور سچ سے پہچانا جائے گا۔ ہاں اس میں ایک استثناء بھی ہے

اور یہ کہ بعض لوگوں کو جب جھوٹ کی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر وہ عادت ان کو روزمرّہ ایسے جھوٹ بولنے پر بھی مجبور کرتی ہیں جس کا کوئی واضح مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔اس لئے آپ اسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی بامقصد جھوٹ کی عبادت کی گئی ہے۔جیسے نیک لوگ بھی جب نمازوں کے عادی ہوجاتے ہیں تو بعض دفعہ یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔بے خیالی میں بھی نماز تو پڑھتے ہیں کہ وہ عادت ہے لیکن بسا اوقات بالارادہ نماز پڑھی جاتی ہے اور جو بالارادہ نماز ہو وہ سچی عبادت ہے۔جو عادت کی نماز ہو وہ فرض تو پورا کر دیتی ہے مگر حقیقت میں عبادت کی روح نہیں رکھتی۔پس منفی طور پر جھوٹ کی بھی یہی کیفیت ہے۔کبھی تو یہ مخلصانہ غیر اللہ کی عبادت بن جاتا ہے۔کبھی یہ روزمرّہ کی عام عبادت بن جاتا ہے جس میں وہ عبادت کا مفہوم کم رہ جاتا ہے اور عادت کا مفہوم زیادہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم نے اسی مضمون سے متعلق فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہیں تمہاری قسموں سے متعلق پکڑے گا مگر لغو قسموں کو نظر انداز فرمادے گا۔جو لغو قسمیں ہیں یعنی جھوٹی، بے ہودہ قسمیں ان پر خدا تمہاری پکڑ نہیں کرے گا۔یہ بھی اس کا احسان ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ قسمیں عادتاً کھائی گئی ہیں یعنی جو جھوٹ بولا جارہا ہے یہ عادتاً بولا جارہا ہے،اس میں حقیقت کچھ نہیں لیکن آنحضرت ﷺ نے عادتاً جھوٹ بولنے کو بھی ایک نہایت ہی خطرناک بات قرار دیا ہے کیونکہ آپؐ فرماتے ہیں کہ رفتہ رفتہ جھوٹ بولنے سے ہی عادت بنتی ہے اور جب عادت بنتی ہے تو ایسے انسان کو یہ عادت لازماً جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں:

”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے تمہیں سچ بولنا چاہئے کیونکہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت میں لے جاتی ہے۔انسان سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حضور صدیق لکھا جاتا ہے۔(یعنی یاد رکھیں ”سچ بولتا ہے“ کے ساتھ آپؐ نے فرمایا کہ سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے اور کوشش کرنے کے بعد فرمایا یہاں تک کہ وہ خدا کے حضور صدیق لکھا جاتا ہے پس اس میں ہمارے لئے ایک بہت ہی بڑی خوش خبری ہے کہ اگر ہم فوری طور پر اپنے آپ کو جھوٹ سے کلیۃً پاک نہ بھی کرسکیں۔اگر خدا کی خاطر دل

میں ارادہ باندھیں اور مسلسل توجہ کے ساتھ محنت کرتے چلے جائیں اور جھوٹ سے چھٹکارے کی کوشش اور سچ بولنے کی عادت کو اپنانے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔اس حالت میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا وقت آتا ہے کہ وہ خدا کے حضور صدیق لکھا جاتا ہے۔یعنی جب سچا ہو جاتا ہے اور یہ محنت ضائع نہیں جاتی اس کے برعکس فرمایا) اور تمہیں جھوٹ سے بچنا چاہئے کیونکہ جھوٹ فسق وفجور کا باعث بن جاتا ہے اور فسق وفجور آگ کی طرف لے جاتے ہیں ۔ایک شخص جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ کا عادی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں کذّاب لکھا جاتا ہے۔

(بخاری کتاب الادب ،باب قول اللہ تعالی اتقو االلہ و کونوامع الصادقین)

پس اگرچہ جھوٹ کا عادی انسان بعض دفعہ بے خیالی میں بھی جھوٹ بولتا ہے مگر آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ عادت ایک لمبے عرصے کی بدیوں کی وجہ سے پختہ ہوئی ہے۔اس کا مزاج بن گیا ہے اور ایسے شخص کو خدا تعالیٰ کذّاب لکھ دیتا ہے یعنی انتہائی جھوٹ بولنے والا اور کذّاب کے لئے جہنم مقدر ہے وہ جنت کا منہ نہیں دیکھے گا۔

پس لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں جو شہادت بیان فرمائی گئی ہے وہ درحقیقت اسی غرض سے ہے کہ اگر آپ جھوٹ کا منہ نہیں دیکھیں گے تو آپ جہنم کا منہ بھی نہیں دیکھیں گے۔اگر آپ جھوٹ کا منہ دیکھیں گے تو جنت کا منہ نہیں دیکھیں گے۔یہ دو چیزیں اکٹھی نہیں چل سکتیں۔اس کے باوجود ہم جھوٹ سے بہت بے پرواہ ہیں اور بسا اوقات ایک کام کرنے سے پہلے ہی جھوٹ کا ارادہ باندھ کر گھر سے چلتے ہیں۔کوئی تجارت ہو یا کوئی معاہدہ کرنا ہو یا کسی ملک میں داخل ہونا ہو، پاسپورٹ کا ناجائز استعمال کرنا ہو یا کوئی اور غرض پیش نظر ہو بسا اوقات انسان دل میں یہ ارادہ باندھ کر گھر سے نکلتا ہے کہ میں جھوٹ بولوں گا اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب میرے کام بن جائیں گے کیونکہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جھوٹ سے فائدہ اٹھاؤں گا۔یہ جو اطمینان قلب ہے جو جھوٹ کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے یہ شرک ہے اور یہ پکی علامت ہے کہ یہ انسان مشرک ہے، بت پرست ہے، اگرچہ اپنا نام اس نے موحد رکھا ہے۔عبادت کرتا ہے خدا کی بظاہر، سجدے کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے

حضور لیکن اس کی ساری فطرت، ساری روح جھوٹ کے حضور جھکی رہتی ہے اور اسی کو سجدے کرتی ہے۔

پس یاد رکھو کہ جھوٹ کوئی معمولی بیماری نہیں۔ یہ ایسی بیماری ہے جو ہر شرک کی جڑ اپنے اندر رکھتی ہے۔ ہر ناشکری کی جڑ اپنے اندر رکھتی ہے۔ پس توحید کے منافی ایک ایسا گناہ ہے جو توحید کے ہر پہلو سے اس کی حقیقت کو چاٹ جاتا ہے، کچھ بھی باقی نہیں رکھتا اور احسان مندی، احسان کے خیال یا شکر گزاری کے جذبات کو بھی کلیتہً چٹ کر جاتا ہے۔ جھوٹے لوگ نہ اپنے ماں باپ کے ہوتے ہیں، نہ خدا کے ہوتے ہیں اور ماں باپ کا ذکر خدا کے بعد اس تعلق میں بیان فرمایا گیا ہے، اس نسبت سے بیان فرمایا گیا ہے کہ سب سے بڑا رشتہ تخلیق کا رشتہ ہے۔ خدا چونکہ خالق ہے اس لئے سب سے زیادہ اس کا حق ہے اور خدا کے بعد چونکہ ماں باپ تخلیق کے عمل میں بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں، تمام رشتوں میں سب سے زیادہ تخلیقی عمل میں حصہ لینے والے ماں باپ ہوتے ہیں اس لئے خدا کے بعد اگر کسی کا حق ہے تو ماں باپ کا ہے اور جھوٹ ان دونوں حقوق کو تلف کر دیتا ہے۔ دوستیوں کے حقوق کو بھی تلف کر دیتا ہے کیونکہ وہ نسبتاً ادنیٰ ہیں۔ میاں بیوی کے حقوق کو بھی تلف کر دیتا ہے کیونکہ وہ نسبتاً ادنیٰ ہیں۔ قومی حقوق کو بھی تلف کر دیتا ہے کیونکہ وہ نسبتاً ادنیٰ ہیں اور حکومت کی اطاعت، فرمانبرداری اور انصاف کے ساتھ اس سے معاملہ کرنے کو بھی تلف کر دیتا ہے کیونکہ یہ بھی لوگوں کے نزدیک ایک بہت ہی معمولی بات ہے۔ پس یہ دیکھیں کہ جھوٹ آپ کی مجالس میں پلتا کیسے ہے؟ آپ کے گھروں میں کس طرح بار بار استعمال ہوتا ہے اور کیوں آپ کی طبیعت پر اس کا برا اثر نہیں پڑتا؟ جب تک یہ احساس بیدار نہیں کریں گے آپ جھوٹ کی بیماری سے شفایاب نہیں ہو سکتے۔

آپ ایک ایسی قوم میں آئے ہیں، ایک ایسے ملک میں آپ نے پناہ ڈھونڈی ہے جو اس پہلو سے بالعموم آپ سے بہتر نمونے دکھانے والا ملک ہے بلکہ جہاں تک میں نے جائزہ لیا ہے اور اس میں رعایت مقصود نہیں بلکہ حقیقت حال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ تمام یورپ میں میرے نزدیک جرمن قوم سب سے زیادہ سچ بولنے والی ہے۔ اللہ کرے یہ ان کی نیکی اور سچائی ان کو بالآخر توحید کی طرف لے جائے۔ خدا کرے یہ نیکی قائم رہے اور جیسا کہ آج دنیا میں سچ زائل ہو رہا ہے اس قوم میں یہ بیماری داخل نہ ہو جو عموماً ترقی یافتہ ملکوں میں بھی داخل ہو چکی ہے اور یہ قوم اپنے سچ کی حفاظت کر سکے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد

میں نے یہ حقیقت معلوم کی ہے، دریافت کی ہے یہ بات، کہ تمام یورپین یا مغربی قوموں میں سب سے زیادہ فطرتاً سچی قوم جرمن قوم ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ لوگ ان کو اکھڑ سمجھتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سخت مزاج ہیں حالانکہ ان کے اندر سچائی کی وجہ سے ایک ڈسپلن پیدا ہو گیا ہے اور اسی بناء پر بعض معاملات میں یہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں اس کی وجہ طبیعت کا اکھڑ پن نہیں ہے کیونکہ اس کے برعکس میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ قوم سچ کی قدردان بھی ہے اور جہاں یہ سچے لوگ دیکھتے ہیں وہاں ان سے طبعاً ان کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے اور دنیا کی سچی قومیں ہی ہیں جو سچوں سے محبت کرتی ہیں یا کر سکتی ہیں۔

پس آپ کے لئے یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ آپ ایک ایسے ملک میں آئے ہیں جہاں کم سے کم آپ کے سچ پر کوئی ابتلاء نہیں آیا اور آپ سچ بولنا چاہیں تو ان کے مزاج کے موافق رہیں گے ان کے مزاج کے برعکس بات نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود اگر آپ اپنی پرانی گندی عادتوں کو ساتھ لے کر یہاں داخل ہوں اور ان سے جھوٹ کا معاملہ کریں تو بہت ہی بڑا گناہ ہے، بہت ہی بڑی ناشکری بھی ہے۔ پس جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کے مضمون کے ساتھ ناشکری کے مضمون کو باندھا ہے یاد رکھیں یہاں بھی آپ کا یہی معاملہ ہے۔ اگر آپ جھوٹ بولیں گے اس ملک میں رہ کر تو اس قوم کی مہمان نوازی، اس کے اعلیٰ اخلاق کی بھی ناقدری اور ناشکری کرنے والے ہوں گے۔ وہ فوائد جو یہ آپ کو ویسے دیتے ہیں اگر آپ جھوٹ کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تو محض یہی نہیں کہ آپ ان کے ناشکر گزار ہوں گے، آپ خدا کے ناشکر گزار ہوں گے اور آپ کا کوئی نیک اثر اس قوم پر پھر قائم نہیں ہو سکتا۔ نہ آپ کا، نہ آپ کے دین کا، نہ آپ کی قوم کا۔ پس آپ جھوٹ کے ایمبیسیڈر بن کر، جھوٹ کے سفیر بن کر اگر غیر قوموں میں یا دوسری قوموں میں زندگی بسر کرتے ہیں تو حقیقت میں شیطان کے سفیر بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اللہ کے سفیر تو سچ کے علمبردار ہوتے ہیں، سچ کے نقیب بنا کرتے ہیں اور آپ کو خدا تعالیٰ اگر سچائی کا موقع عطا فرمائے تو بہت تیزی کے ساتھ آپ اس قوم کے دلوں کو فتح کر سکتے ہیں۔

پس اگر آپ نے اپنی میزبان قوم کے دلوں کو فتح کرنا ہے تو اس کی چابی بھی سچائی میں ہے۔ سچ بولیں، سچا کردار بنائیں، سچ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں۔ آپ کے چہروں سے سچائی ظاہر

ہو۔آپ کے اطوار سچے ہوں ۔آپ کی طرز گفتگو سچی ہواور جھوٹ کا تصور تک آپ کے قریب نہ آئے۔ یہ وہ مضمون ہے جس کے متعلق پھر کہا جاسکتا ہے کہ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ احمدی وہ لوگ ہیں جو جھوٹ کا منہ تک نہیں دیکھتے ۔اگر آپ یہ کریں تو آپ زندہ رہیں گے ۔آپ کی بقاء کی قطعی ضمانت دی جاسکتی ہے کیونکہ جو سچا ہو خدائے واحد و یگانہ اس کی حفاظت فرماتا ہے اور خدا اس کی پشت پناہی فرماتا ہے۔ ہر خطرے سے اس کو بچاتا ہے کیونکہ اس نے جھوٹ کا سہارا موجود ہونے کے باوجود جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ پس یہ بندہ رحمان خدا کا بندہ بن جاتا ہے اور وہ اس کی حفاظت کرنا خود اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں ادنیٰ بھی شک نہیں ۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے اکثر دنیا منہ پھیرے بیٹھی ہے ۔پس آپ نے ایک بہت ہی بڑی ذمہ داری اس قوم میں ادا کرنی ہے اور وہ اسلام اور احمدیت کا نقیب بننا ہے اور یہ ایک ایسی ہم آہنگی ہے جس کے نتیجے میں آپ دونوں کے درمیان گفت وشنید میں کچھ فاصلے دکھائی نہیں دیں گے۔ سچے سچوں سے ملتے ہیں تو ان کے اندر ایک فطری اور طبعی لگاؤ ہوتا ہے جو ان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے۔

اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ اکثر داعی الی اللہ وہی کامیاب ہیں جن کے اندر سچائی پائی جاتی ہے کیونکہ وہ سچی بات کرتے ہیں خواہ تھوڑی کریں۔ سچی بات کرتے ہیں خواہ زیادہ دلائل نہ بھی جانتے ہوں ۔ان کی بات میں وزن پیدا ہو جاتا ہے اور وزن سچائی کا نام ہے چالاکیوں کا نام نہیں ۔ایک چھوٹی سی بات بھی جو سچی ہو بعض دفعہ غیر معمولی وزن اختیار کر لیتی ہے۔اس کے مقابل پر ہزار دلائل بھی کام نہیں کرتے اور بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ یہاں جو خاص کامیاب داعی الی اللہ ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کو جرمن زبان بھی بہت تھوڑی آتی ہے ۔ایسے ہی ایک داعی الی اللہ سے ملاقات کے دوران میں نے پوچھا کہ بتائیں آپ کیا کرتے ہیں ۔تو انہوں نے بڑی سادگی سے کہا کہ دو ہی باتیں ہیں جو میں جانتا ہوں ۔ایک یہ کہ مجھے کوئی علم نہیں زبان بھی نہیں آتی اور اس کا ایک ہی توڑ ہے کہ میں لوگوں کو دعوت دے کر اپنے گھر مہمان بلا لیتا ہوں اور جس حد تک بھی جو کچھ مجھے کہنا آتا ہے سادہ لفظوں میں ان کو کہتا ہوں اور اس مہمان نوازی کے نتیجے میں وہ چند منٹ جو میرے پاس بیٹھتے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے بہت قریب آرہے ہیں اور وہ مجلس ختم نہیں ہوتی مگر ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہوتے ہیں۔تب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ پسند کریں تو میں

آپ کو کچھ لٹریچر دوں۔ تو اکثر وہ کہتے ہیں ہاں ہمیں ضرور دیں اور جب میں لٹریچر دیتا ہوں تو وہ بسا اوقات مثبت نتائج ظاہر کرتے ہیں اور صرف اتنی سی میری تبلیغ ہے جس کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کے فضل سے مجھے ایک سال میں تیس احمدی مل چکے ہیں جو بہت مخلص اور فدائی ہیں اور پوری طرح جماعت کے نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔

دوسری بات مجھے انہوں نے یہ بتائی کہ دوسرا راز یہ ہے کہ میری بیوی بہت مہمان نواز ہے۔ وہ کہتے ہیں بیوی مہمان نواز نہ ہوتی تو مجھے جرات ہی نہ ہوتی کہ اس طرح وقت بے وقت گھروں میں مہمان لے آتا۔ کوئی پہلے سے طے شدہ پروگرام تو ہوتا نہیں۔ رستہ چلتے کسی سے باتیں شروع ہوئیں، تھوڑی سی ہم آہنگی دیکھی اور اس سے پوچھا کہ کیوں جی آپ پسند فرمائیں گے کہ تھوڑا سا پاکستانی کھانا چکھ لیں۔ اکثر تعجب کی وجہ سے یا انوکھی بات سمجھ کر وہ کہتے ہیں ہاں ٹھیک ہے۔ کہتے ہیں میں اس یقین کے ساتھ گھر میں آتا ہوں کہ کوئی بھی وقت ہو، کسی قسم کی بھی مشکل ہو میری بیوی ضرور میرا ساتھ دے گی اور ہمیشہ دیتی ہے۔ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے وہ اس طرح ان کو Welcome کرتی ہے کہ اپنے مہمانوں کو، جو ذاتی مہمان ہوں ان کو بھی شاید اس طرح شوق سے کوئی Welcome نہ کر سکے کیونکہ اس کی زبان پر سبحان اللہ ہوتا ہے۔ کہتی ہے اللہ کے مہمان آئے ہیں اور اس وجہ سے خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ غیر معمولی جوش اور ولولے کے ساتھ وہ مہمان نوازیاں کرتی ہے اور کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ اس نے کہا یہ دو باتیں ہیں جن کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے مجھ پر یہ فضل فرمایا اور میرے جاہل اور لاعلم ہونے کے باوجود مجھے، میری دعوت الی اللہ کو پھل لگائے اور ہمیشہ لگاتا ہے۔

اس شخص کی طرز گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا اور بالکل واضح تھا یہ کہ اصل میں اس کی سچائی کا اثر ہے۔ بات کرنے کا طریقہ بالکل سادہ مگر بالکل سچا اور وہ ایسی بات تھی جو میرے دل پر اثر کر رہی تھی کیسے ممکن تھا کہ یہ بات دوسرے دلوں پر اثر انداز نہ ہو۔ پس یاد رکھیں اگر آپ نے کامیاب داعی الی اللہ بننا ہے تب بھی آپ کو سچ کی طرف آنا پڑے گا اور سچائی کی راہ میں بہت روکیں حائل ہیں۔ جو قومیں بچپن سے اپنے گھروں میں جھوٹ بولتی پل کے جوان ہوئی ہوں، جس کے جھوٹ بولنے کی عادت جس کے ہاں اعزاز سمجھی جاتی ہے۔ جتنا بڑا جھوٹا اور لپاٹی ہوا اتنا ہی مجلسوں کا وہ ہیرو بنتا ہو، ایسے

بیمار کا اس بیماری سے نجات پانا ایسا ہی ہے جیسے کسی گہرے کینسر کے مریض کا کینسر کی بیماری سے شفاء پا جانا اور جھوٹ واقعتہً ایک کینسر بن جایا کرتا ہے۔ وہ رگ وریشہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سے اکھیڑیں تو دوسری طرف کسی اور جگہ اپنی جڑیں گاڑ دیتا ہے۔ پس یاد رکھیں کہ بڑی نگرانی اور بیدار مغزی کے ساتھ جھوٹ سے اپنے معاشرے کو پاک کرنا آپ پر لازم ہے اور اگر آپ یہ مہم شروع کریں گے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنا مشکل کام ہے۔ کہنے میں آسان ہے مگر کرنے میں بے انتہا مشکل کیونکہ آپ صبح اٹھ کر جب اپنا پروگرام شروع کرتے ہیں تو ہر قدم پر آپ کے سامنے سچ اور جھوٹ کی دوراہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور ہر قدم پر بسا اوقات آپ سچ کی عبادت کی بجائے جھوٹ کی عبادت پر اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں اور جب عادت بن جائے تو پتا بھی نہیں چلتا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

بعض دفعہ جھوٹ بولنے والے سے آپ کہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو اللہ کی قسمیں کھا کے کہے گا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا اور اتنا جوش ہوتا ہے اس کی قسموں میں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کو میں جانتا تھا کہ سخت جھوٹا ہے اس نے عدالت میں نظام جماعت کے سامنے قضا میں جھوٹی گواہی دی اور اس پر اسے بڑا جوش آیا کہ میرے خلاف فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا کہ آپ تو مجھے جانتے ہیں کہ میں کتنا سچا ہوں۔ اس لئے میری اپیل ہے آپ کی عدالت میں کہ قضا نے جو مجھے جھوٹا قرار دیا ہے اس کو صاف کریں اور میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹا ہے لیکن اتنے یقین سے اس نے مجھے لکھا کہ میں حیران رہ گیا۔ اس کی عادت میں اتنا جھوٹ تھا کہ ہر بات میں جھوٹ تھا اور یہی وہ جھوٹ ہے جب عادت بن جائے تو انسان کو چاروں طرف سے لپیٹ لیا کرتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پھر ایسا شخص خدا کے ہاں کذّاب لکھا جاتا ہے۔ اپنے بچوں میں دیکھیں، اپنے عزیزوں میں دیکھیں، اپنی بیویوں میں دیکھیں، بیویاں اپنے خاوندوں میں دیکھیں کہ روزمرّہ کتنی بار آپ لوگ بے تکلفی سے جھوٹ بولتے ہیں اور اگر یہ عادت اسی طرح جاری رہی تو آپ کے دین کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا اور خدا کے ساتھ آپ کا تعلق قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

یاد رکھیں اللہ سے سچا تعلق صادق کا ہی قائم ہوا کرتا ہے۔ کاذب کا نہیں ہوا کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی کاذب اپنا نام صادق رکھ لے۔ کوئی کاذبہ اپنا نام صادقہ رکھ لے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ خدا کی نظر میں سب کچھ ہے اور خدا کا تعلق سچے سے ہوتا ہے جھوٹے سے نہیں ہوتا۔ اگر دنیا کی

زندگی میں بھی آپ کا یہی تجربہ ہے کہ سچوں سے آپ کا تعلق بڑھتا ہے خواہ جھوٹے بھی ہوں تو خدا جو جھوٹا نہیں ہے، خدا جو سچ کا سرچشمہ ہے وہ کیسے جھوٹوں سے تعلق قائم کرے گا۔ اللہ تعالیٰ سب گناہوں سے بڑھ کر ظلم اور جھوٹ سے نفرت کرتا ہے اور ظلم اور جھوٹ یعنی شرک اور جھوٹ دراصل ایک چیز کے دو نام ہیں۔ پس اپنے حالات پر غور کریں، جائزہ لیں۔ میں نے جو کہا کہ آپ اگر جھوٹے بھی ہوں تو سچے کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے یہ بالکل درست بات ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ پاکستان کی عدالتوں میں جج خواہ کیسا بھی تھا اس کے سامنے جب ایک آدمی نے وقار کے ساتھ سچائی بیان کی تو وہ اس سے متاثر ہوا اور اس نے صاف لکھ دیا کہ یہ شخص جھوٹ بولنے والا نہیں ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اس کے حق میں فیصلہ کیا۔

تو انسان کی فطرت میں گہری بات، گہرا تعلق دراصل سچائی ہی سے ہے کیونکہ انسان سچائی کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ کی تخلیق ہے اور اللہ کی صفات کی چھاپ اس کی ہر تخلیق پر ہوتی ہے۔ پس آپ نے اگر جھوٹ کا سفر اختیار کیا ہے، جھوٹ کو اپنی زندگی کی عادت بنایا ہے تو فطرت کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔ ایک بچہ عام حالات میں کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ جب بھی جھوٹ شروع کرے گا کسی سزا کے ڈر سے شروع کرے گا۔ جب بھی جھوٹ شروع کرے گا کسی لالچ سے متاثر ہو کر کرے گا۔ مگر عام طور پر جس گھر میں جھوٹ نہ بولا جائے وہاں بچے لالچ کے باوجود بھی جھوٹ نہیں بولتے اور خوف کے باوجود بھی جھوٹ نہیں بولتے اور سچے گھروں کا یہ طرہ امتیاز ہوتا ہے کہ ان کے بچے بالکل صاف اور سچی بات کرنے والے ہوتے ہیں۔

پس اس منزل سے اپنی سچائی کی حفاظت شروع کریں۔ اپنے بچوں پر نگاہ ڈالیں ان کی عادتیں دیکھیں۔ اپنے میاں بیوی کے تعلقات پر نظر ڈالیں۔ اپنے بہن بھائیوں کے تعلقات پر نظر ڈالیں۔ بیوی کے تعلق جو اس کی بہو سے ہیں یا بیوی کا تعلق جو اپنے داماد سے ہے اور اسی طرح داماد اور بہوؤں کا تعلق اپنی ساسوں سے ہے، یہ سارے زندگی کے ایسے رشتے ہیں جن کو جھوٹ کی ملونی گدلا کر دیتی ہے اور زہریلا کر دیتی ہے۔ تمام انسانی فساد کی جڑ جھوٹ ہے۔ ہر جگہ ظلم اور ستم جھوٹ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایک انسان خواہ کتنا ہی مجرم کیوں نہ ہو یہ قطعی فیصلہ کر لے کہ جو کچھ بھی ہوگا میں نے بہر حال جھوٹ نہیں بولنا تو اسی دن اس کے جرائم کی جان نکلنی شروع ہو جائے گی۔ ان

میں کوئی زندگی باقی نہیں رہے گی۔ پس اپنا غور سے جائزہ لیں اپنا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ نفس کا اندرونی سفر اپنے جھوٹ کی تلاش میں شروع کریں تو پہلے دن ہی آپ کو بہت سے جھوٹ دکھائی دیں گے اور عجیب بات ہے کہ جب آپ ان کو صاف کرلیں گے تو اس کی تہہ میں پھر کچھ اور بھی جھوٹ دکھائی دیں گیا اور یہ سفر بہت لمبا اور صبر آزما ہے۔

سچے لوگ بھی جن کو آپ بہت اعلیٰ درجے کا سچا سمجھتے ہیں جھوٹ کے خلاف نگرانی کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی پہلو سے چھپا ہوا دشمن کسی تہہ میں ضرور موجود ہوگا۔ پس نیتوں کے بننے کی آماجگاہ جو دل کی گہرائیاں ہیں یا روح کی گہرائیاں ہیں ان تک جھوٹ کی رسائی ہو جاتی ہے اور جب وہاں جھوٹ پہنچ جائے تو اسی بیماری کا نام دراصل کینسر ہے جو تہہ بہ تہہ درجہ بدرجہ نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ پس اپنے سب پہلوؤں، سب گوشوں کو صاف کریں اور اس کے لئے آپ کو بیدار مغزی کے ساتھ، ہوشیاری کے ساتھ، بہت باریک نظر سے جائزہ لینا ہوگا۔ روزمرّہ کاموں میں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو میں باتیں کر رہا ہوں جب تک آپ تجربہ نہ کریں گے آپ کو تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔

خدام الاحمدیہ کے کاموں میں آپ مصروف ہیں وہاں بھی کئی بار جھوٹ بول جاتے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے کیوں جی لیٹ کیوں ہوگئے تو بے اختیار دل سے ایک عذر نکل آتا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو پتا چلے گا کہ وہ عذر پورا سچا نہیں تھا۔ اس میں کوئی نہ کوئی پہلو جھوٹ کا موجود تھا۔ کوئی سوال کیا جائے آپ سنی سنائی بات آگے پہنچا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کی جو تعریف فرمائی ہے اس میں اسے جھوٹ قرار دیا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ ایک انسان کے لئے یہ جھوٹ کافی ہے جیسا کہ فرمایا:

’’**کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ماسمع** کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جو سنے وہ آگے چلا دے‘‘

(مسلم باب النھی عن الحدیث بکل ماسمع)

اب یہ بات جو ہے جو سنے اور آگے چلا دے اس کو جھوٹا کہنا یہ آنحضرت ﷺ کا مرتبہ اور مقام تھا کیونکہ آپؐ کو شافی مطلق نے اپنی نمائندگی میں تمام بنی نوع انسان کی ہر بیماری کی شفاء کے

لئے بھیجا تھا۔ پس دیکھیں کیسی گہری نظر ہے آپ ؐ کی ۔ جو کوئی بات سنتا ہے اسے آگے چلا دیتا ہے فرمایا یہ جھوٹ ہے اور یہ جھوٹ اس کی بربادی کے لئے کافی ہے۔ جب تک کسی بات کے متعلق آپ کو یقین نہ ہو، آپ تحقیق نہ کرلیں، اسے آگے چلانا گناہ ہے اور بعض دفعہ یہ جھوٹ بہت بڑی بڑی معاشرتی خرابیوں پر منتج ہوجاتا ہے۔ ایک بہن نے اپنی بہن کے متعلق کوئی بات سنی، اگر اس کے دل میں اس کی محبت نہیں ہوگی تو وہ اس بات کو کچا جانتے ہوئے بھی آگے بیان کرے گی۔ ایک بھائی جب اپنے بھائی کے خلاف کوئی بات سنتا ہے اگر اس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو بلکہ معمولی سی پرخاش ہو اور نفرت ہو تو وہ بہت جلد اس کے خلاف بات کو لوگوں میں پھیلائے گا اور اکثر معاشرتی خرابیاں اسی سے پیدا ہوتی ہیں لیکن جہاں اپنے دوست کے متعلق اپنے عزیز کے متعلق کوئی انسان بات سنتا ہے تو اسے آگے نہیں چلاتا اور آگے نہیں پھیلاتا بلکہ اس پر مٹھی کس کر بیٹھ رہتا ہے کہ آگے بات نکلے نہیں اور یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں باتیں سچی بھی ہوسکتی ہیں اور جھوٹی بھی ہوسکتی ہیں۔ مگر اگر آپ نے اپنی نفرت کی وجہ سے کسی کے خلاف بات کو اچھال دیا تو یہ بھی ایک جھوٹ ہے اور اگر محبت کی وجہ سے اس بات کی تحقیق ہی نہ کی اور اس سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ رہے تو یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ پس آنحضرت ﷺ نے جو فطرت پر بہت گہری اور باریک نظر رکھتے تھے ہر پہلو سے ہمارے گناہوں کو کھنگال کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور ہر خطرے سے ہمیں متنبہ فرمادیا ہے۔ اب یہ عادت اگر آپ اپنے معاشرے سے دور کردیں تو منافقوں کو منافقت پھیلانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہے گا۔ جتنی قومیں منافقتوں سے ہلاک ہوا کرتی ہیں ان کی ہلاکت کا راز اس بات میں ہے کہ جو بات سنی آگے چلا دی اور اس سے رفتہ رفتہ قوموں کے کردار تباہ ہوجاتے ہیں، ان کی ہمتوں کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

فحشاء بھی اسی لئے جھوٹ کی ایک بدترین قسم ہے۔ جب آپ بری بات کسی جگہ سنتے ہیں اور سنتے ہی اسے آگے بڑھا دیتے ہیں تو اس سے صرف یہی نہیں کہ آپ جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ وہ معاشرہ جس میں ایسی باتیں عام ہونے لگیں وہاں وہ بدیاں بھی جڑیں پکڑنے لگتی ہیں اور انسان فطرتاً یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ باتیں چل رہی ہیں، فلاں بھی ایسا کررہا ہے یا فلاں بھی ایسا کررہی ہے تو ہم

بھی کرلیں تو کیا فرق پڑتا ہے اور جھوٹ کی جرأت بدکاری کی جرأت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ایک گناہ دوسرے گناہ پر منتج ہو جاتا ہے۔پس آپ اگر اپنے معاشرے کی خرابیوں پر نظر رکھیں تو بلا مبالغہ آپ یقین کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اکثر بیماریاں، اکثر گناہ جھوٹ کی سرزمین پر پرورش پاتے ہیں اور جھوٹ کے پانی ہی سے سیراب ہوتے ہیں۔

پس جھوٹ کا قلع قمع کریں، اپنی زندگیوں کو سچا بنائیں اور اگر آپ اپنی زندگیوں کو سچا بنالیں تو اس دنیا میں جنت حاصل کرلیں گے۔جو سچ میں تسکین دینے کی طاقت ہے وہ دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں۔سچائی طمانیت بخشتی ہے۔سچائی سادگی پیدا کرتی ہے۔سچائی قناعت پیدا کرتی ہے۔سچائی نہ ہوتو دکھاوے کی زندگی آپ کو طرح طرح کے قرضوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔طرح طرح کے مصنوعی ایسے طریق اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے جس کی آپ کو استطاعت نہیں ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹ نہیں ہے حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔سچ صرف یہ ہے کہ خدا نے جو آپ کو دیا ہے وہی آپ کا ہو اور جو آپ کے پاس نہیں ہے دنیا دیکھ لے کہ آپ کے پاس نہیں ہے چونکہ آپ دنیا کی نظر سے ڈرتے ہیں اور دنیا کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں اس لئے دینے والا آپ کو کچھ اور دیتا ہے اور جس کو آپ نے دکھانا ہے اس کا اور تقاضا ہے۔آپ پھر قرض لے کر بھی اپنی زندگی کا معیار مصنوعی طور پر بنا لیتے ہیں۔مانگ کر بھی اپنی عزت پر داغ ڈال لیتے ہیں۔قرض لے لے کر اس نیت سے لینا کہ واپس نہیں کروں گا یہ بھی ایک بہت گندی قسم کا جھوٹ ہے۔تو آپ کسی بھی بیماری کا تجزیہ کریں جو روزمرّہ ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے تو پہلے اگر آپ کا دھیان اس طرف نہیں بھی گیا تو یہ جھوٹ تھا جس میں آپ زندگی بسر کر رہے تھے تو اب میرے بتانے پر، نشان دہی پر جب آپ دوبارہ غور کریں گے تو آپ اس کو جھوٹ ہی پائیں گے۔

ایک سادہ آدمی جو جھوٹا نہ ہو وہ قانع ضرور ہوا کرتا ہے۔ایک آدمی کے گھر میں کچھ بھی نہیں اگر کوئی مہمان آتا ہے تو یہ بالکل جھوٹا خیال ہے کہ اگر آپ اس کی کچھ خاطر نہ کرسکیں تو آپ اس کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے۔اگر ایک سچا آدمی اپنی غربت کی وجہ سے کسی مہمان کی عزت نہیں کرسکتا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ مہمان اس کی عزت دل میں لے کر واپس جایا کرتا ہے۔کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اسے ذلیل سمجھے یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔اس کی سادگی، اس

کی سچائی ایک چادر ہے، جو ہے وہی بچھا دی کہ آؤ اب بیٹھ جائیں۔ٹھنڈا پانی نلکے سے نکال کر پلا دیا۔ یہ ان باتوں میں بہت گہری طاقت ہے اس کے مقابل پر کہ آپ کسی کے گھر دوڑے جائیں اور وہاں سے لسّی یا چائے مانگ کرلائیں اور مانگے ہوئے برتنوں میں آپ مہمان کی خدمت کر رہے ہوں ۔افراتفری گھر میں آئی ہو۔آپ کو وہم ہے کہ مہمان پہچانتا نہیں ہے وہ خوب جانتا ہے،خوب پہچانتا ہے۔

سادگی ہے جو دراصل سچائی سے پیدا ہوتی ہے اور سچائی سادگی کو طاقت بخشتی ہے۔جو کچھ ہے، جو کچھ خدا نے آپ کو دیا ہے وہی کچھ بنے رہیں،اس سے زیادہ بننے کی کوشش نہ کریں۔ایسے موقعوں پر کتنی مصیبتیں حل ہوجاتی ہیں، کتنے جھنجھٹوں سے آپ کو چھٹکارامل جاتا ہے۔کئی لوگ لکھتے ہیں کہ ہماری اتنی بچیاں ہیں، اتنے بچے ہیں ان کی شادیاں کرنی ہیں کچھ بھی نہیں ہے دعا کریں۔میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں اور صرف یہ دعا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرورتیں پوری فرمائے بلکہ یہ بھی کرتا ہوں کہ خدا ان کو قناعت بخشے اور جیسا سادہ زندگی کے ساتھ آنحضرتﷺ ان ضروریات زندگی کو پورا کیا کرتے تھے اسی سادہ زندگی سے ان کو بھی توفیق ملے لیکن ان کی راہ میں ایک مشکل پیدا ہوجاتی ہے۔حضرت اقدس محمد رسول اللہﷺ کے زمانے میں تو آنحضرتﷺ کے نیک نمونے کے نتیجے میں اکثر معاشرہ اصلاح پذیر تھا اور وہاں تکلّفات تھے ہی نہیں۔وہی حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں بھی معاشرے میں پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں یہ فرائض آسان ہوگئے۔کوئی تکلف بھی انسان کی روزمرّہ کی ضرورتوں کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا تھا۔

آپ میں سے اکثر کو شاید علم نہ ہو کہ حضرت اماں جانؓ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے بعد جب اپنی بیٹی امتہ الحفیظ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جو سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں رخصت کیا تو پتا ہے کیسے رخصت کیا۔بیٹی کو کپڑے پہنائے صاف ستھرے اور یکہ لیا اور نواب محمد علی خان صاحبؓ کے گھر جن کے بیٹے نواب عبداللہ خانؓ سے شادی ہونی تھی،ان کے گھر بیٹی کو پہنچا دیا کہ لو جی اپنی امانت سنبھالو، میں چلتی ہوں، یہ شادی تھی۔اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیٹی کی یہ شادی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عزت اور آپؑ کے خاندان کے وقار کے منافی نہیں تھی بلکہ اس کی عزت اور وقار کو چار چاند لگانے والی تھی تو پھر مسئلہ کیا ہے۔پھر کیا مشکل درپیش ہے۔اگر یہی سادہ معاشرہ جو سچائی کا معاشرہ ہے، جو کچھ ہے اسی طرح کرنا ہے، جو کچھ نہیں ہے اس کے متعلق تصور بھی

نہیں کرنا۔ یہ سچا معاشرہ ہے جو دنیا میں ایک جنت پیدا کر دیتا ہے۔اس کے بغیر زندگی کا ہر مرحلہ کٹھن ہو جاتا ہے۔ ہر انسانی تعلق عذاب بن جاتا ہے۔مگر مشکل جیسا کہ میں نے بیان کیا یہ ہے کہ بعض غرباء ایسے ہیں جو خود سادہ ہونا چاہیں بھی تو دوسرے فریق ان کو سادہ رہنے نہیں دیتے ،مطالبے شروع ہو جاتے ہیں اور تقاضے شروع ہو جاتے ہیں ۔مطالبے بعض دفعہ ظاہری طور پر ہوتے ہیں ۔بعض اشاروں سے ،بعض دفعہ بعد کے ردعمل سے نظر آتے ہیں۔مثلاً ایک غریب نے غریبانہ طور پر اپنی بیٹی رخصت کی تو ساری عمر اس پر لعن طعن کی جاتی ہے،اس کو طعنے دیئے جاتے ہیں،اس سے نوکرانیوں کی طرح کام لئے جاتے ہیں کہ تم گھر سے لائی کیا ہو۔ یہ وہ ہمارے معاشرے کی لعنت ہے جو جھوٹ کی پرورش کرنے والی اور سچائی کی مخالف ہے۔

حالانکہ جب رشتے کئے جاتے ہیں تو آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ دین کو اہمیت دو، دوسری کوئی بات نہ دیکھو،اور دین سے مراد محض کسی کا نمازیں پڑھنا نہیں بلکہ اس کا رہن سہن،اس کی طرز زندگی کی شرافت ہے۔ایک انسان دین دار ہو اور آپ اس سے شادی کر دیں تو یقیناً یہ شادی دنیا میں بھی اس بچی کے لئے جنت کا موجب بن سکتی ہے۔اگر آپ خاندانی پس منظر دیکھیں، دنیا کی دولت دیکھیں، علم دیکھیں اور آدمی اپنی ذات میں بدخلق ہو، بدتمیز ہو تو ایسی بچی کی زندگی آغاز ہی سے جہنم بن جائے گی اور کبھی اسے زندگی میں سکون کا سانس نصیب نہیں ہوگا۔

پس جتنی بھی تفصیل کے ساتھ آپ کے معاشرے پر اور روزمرہ زندگی کے تعلقات پر نظر ڈالیں یہ یقین پہلے سے بڑھ کر آپ کے دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جائے گا ،جگہ بناتا چلا جائے گا کہ ہر مشکل کا حل سچائی ہے۔ ہر زندگی کا سکون اور طمانیت سچائی سے ملتی ہے۔جھوٹ ایک لعنت ہے جس نے ہمارے معاشرے کو ہر پہلو سے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ایسی قومیں ہیں جن کو خدا نے بہت کچھ دیا لیکن محض جھوٹ کی وجہ سے ان کا سب کچھ برباد ہو گیا۔

آج ہی اس وقت یوگنڈا میں مثلاً خدام الاحمدیہ کا اجتماع ہو رہا ہے اور انہوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ میں اپنے خطبہ میں ان سے بھی کچھ کہوں اور یہ جو میں نے مثال دی ہے اس میں سب سے پہلے یوگنڈا میرے ذہن میں آیا تھا۔ بہت ہی خوش نصیب ملک ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ کی عطا کا تعلق ہے ۔وہاں کے موسم،وہاں کی زمین کی شادابی ،وہاں کے پھول اور پھل کے اندر جو

خدا تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتیں رکھی ہیں اس کی وجہ سے اور پھر وہ بڑی جھیل Lake وکٹوریہ، جس میں بے شمار ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو دنیا بہت زیادہ قیمت دے کر بھی خریدنا پسند کرتی ہے۔ تمام نعمتیں، تمام معدنیات ہر قسم کی، تمام وہ قدرتی وسائل جو ایک قوم کو خوشحال بنا سکتے ہیں یوگنڈا کو میسر ہیں لیکن انتہائی ناگفتہ بہ حال ہے کیونکہ اتنا جھوٹ آ گیا ہے اس کی زندگی میں کہ جھوٹ نے ان کی ہر چیز برباد کر دی ہے۔ جھوٹ کے نتیجے میں چوری پیدا ہوئی ہے۔ چوری کی عادت نے تمام تجارتوں کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ کوئی تجارت پنپ ہی نہیں سکتی کیونکہ ہر شخص جب اس کو موقع ملے گا جھوٹ بولے گا اور چوری کرے گا اور علاوہ ازیں ایڈز کی بیماری جتنی یوگنڈا میں ہے اتنی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ بعض حصے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بیج سے خالی ہو جائیں گے اس تیزی کے ساتھ انسانوں کو بعض خاص خاص حصوں میں ہلاک کر رہی ہے اور وجہ یہ ہے کہ جہاں جھوٹ ہو وہاں چوری ہوگی اور جہاں جھوٹ ہو اور چوری ہوں وہاں انسانی تعلقات مکمل طور پر جھوٹے ہو جاتے ہیں۔ نہ بیوی خاوند سے وفادار رہتی ہے، نہ خاوند بیوی سے وفادار رہتا ہے۔ نہ بہن بھائی سے نہ بھائی بہن سے۔ تمام رشتے گندے ہو جاتے ہیں اور اس وقت پھر یہ بیماریاں اپنا (Tool) ٹول لیتی ہیں یعنی خراج وصول کرتی ہیں۔

پس جھوٹ کی بیماری بہت ہی گہری بیماری ہے، بہت ہی وسیع اثر رکھنے والی بیماری ہے۔ قوموں کو خدا تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا ہے، جو کچھ بھی نعمتیں عطا کی ہوں ان کے باوجود اکیلا جھوٹ کافی ہے کہ ان تمام نعمتوں سے جو خداداد ہیں اس قوم کو محروم کر دے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کو خدا تعالیٰ نے ظاہر نعمتیں عطا فرمائی ہیں یوگنڈا ایک ایسا ملک ہے جس میں عام طور پر اس کے باشندے زیادہ ذہین اور روشن دماغ ہیں۔ وہاں ایک زمانے میں تعلیم کا معیار اتنا اونچا تھا کہ تمام افریقہ میں یوگنڈا کے تعلیمی معیار کو سب سے اونچا قرار دیا جاتا تھا اور اسے سارے افریقہ کے لئے ایک نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود آج ان کا یہ حال ہے کہ وہی حسن عقل ایک عقل کی بدزیبی بن چکا ہے کیونکہ اس عقل کی تیزی کو وہ اپنی بدیوں کے لئے استعمال کرنے لگے ہیں۔ جھوٹ کے لئے استعمال کرنے لگے ہیں۔ ایسی ہوشیاری سے جھوٹ گھڑتے ہیں کہ بسا اوقات ان کے جھوٹ کو پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے اور چوری جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے یہ تو عام روزمرّہ زندگی کا حصہ ہے۔

لیکن یوگنڈا کے متعلق جب میں یہ کہہ رہا ہوں تو اس لئے نہیں کہ وہ ایک اور قوم ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یوگنڈا کی کوئی بھی ایسی بیماری نہیں جواب پاکستان میں یوگنڈا سے کم ہو۔وہاں بھی جھوٹ سے آغاز ہوا ہے اور ہر چیز جھوٹ ہوگئی ہے۔جھوٹ کی عبادت واقعۃً بعض اوقات انسان کو جھوٹے خداؤں کے سامنے جسمانی طور پر بھی سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا کرتی ہے کیونکہ جھوٹ کے بعد پھر کسی چیز کا اعتماد نہیں رہتا۔خدا سے تعلق ہے کوئی نہیں۔انسانوں سے لینا ہے جو کچھ لینا ہے۔اگر زندہ انسانوں سے نہیں ملتا تو مردہ انسانوں سے مانگیں گے۔چنانچہ کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ اسلام آباد مشرکوں کی آماجگاہ بن گیا ہے اور اسلام کا کیپیٹل اسلام آباد ایک ایسی جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ بت پرست رہتے ہیں کیونکہ جھوٹ کی عبادت کرنے والے،جھوٹ سے مانگنے والے،قبروں کے سامنے سجدے کرنے والے،ان کو چادریں پہنانے والے،مردوں سے مانگنے والے،تمام وہ لوگ جھوٹے پیروں فقیروں کے آگے جا کر اپنے ماتھے رگڑتے ہیں کہ ہمیں کچھ دلوا دو یہ سب بت پرست ہیں اور اس خوفناک سفر کا آغاز جھوٹ سے شروع ہوا ہے۔

پس جتنا بھی آپ جھوٹ کی برائی سوچ سکتے ہیں اس سے زیادہ جھوٹ میں موجود ہے۔یہ غلط ہے کہ آپ جھوٹ کی برائی کا سوچیں اور وہ اس میں نہ ہو۔میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا تصور پیچھے رہ جائے گا اور جھوٹ کی برائیاں ہیں جو آپ کے تصور کی حد سے آگے جا چکی ہوں گی۔یہی وجہ ہے کہ اس جھوٹ کی تلاش اپنی ذات میں مشکل ہے۔اپنی ذات کے حوالے سے جب آپ جھوٹ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں تو آج جس حد تک آپ جھوٹ کو پہچانتے ہیں کل اس سے زیادہ پہچاننے کی استطاعت پیدا ہوگی اور پھر رفتہ رفتہ آپ کے دل میں ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہو جائے گی۔اگر آپ یہ سفر اختیار کریں گے تو آپ پھر یہ سوچنے لگیں گے کہ ہمارا کوئی عمل ایسا ہے بھی کہ خدا کے حضور پیش کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ہر نیکی کے پیچھے بھی ایک جھوٹ تھا،ایک دکھاوا تھا،ایک دنیا داری تھی،ایک ذاتی طلب تھی،ایک ضرورت تھی جس کے ساتھ نیکی کو ملا دیا گیا۔آواز اچھی ہے تو تلاوت اس غرض سے کی جارہی ہے کہ داد ملے۔کوئی پڑھنا اچھا آتا ہے تو اس غرض سے پڑھا جارہا ہے کہ اس کی داد ملے۔ہر چیز میں انسان سے داد طلب کی جاتی ہے،یہ بھی ایک جھوٹ ہے کیونکہ ایک ہی ہے جو داد دیتا ہے تو سچی داد دیتا ہے وہ اللہ ہے اور ایک ہی ہے جس کی داد کی قیمت ہے اس کے سوا

سب جھوٹ ہے۔تو اتنا بڑا گھیرا ڈال رکھا ہے جھوٹ نے ہماری زندگی اور معاشرے کا کہ اس سے بچنا اور بچ نکلنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

پس میں آپ کو بار بار یہی نصیحت کرتا ہوں یہ نہ سمجھیں کہ میں ایک بات کو دہرا رہا ہوں حالانکہ آپ سمجھ چکے ہیں۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ جتنی دفعہ بھی دہراؤں ابھی بھی آپ میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کو سمجھ نہیں آئی اور جن کو کم سمجھ آئی ہے وہ زیادہ جھوٹے ہیں کیونکہ ان کو اپنے جھوٹ کی پہچان ہی نہیں ہے۔ان کو پتا ہی نہیں کہ وہ روزمرّہ کے معاشرے میں اس حد تک جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور ان کی عادات میں جھوٹ داخل ہے ان کی نیتوں میں جھوٹ داخل ہے۔

پس جماعت جرمنی کو خصوصیت کے ساتھ اور مجلس خدام الاحمدیہ کو اس سے بھی بڑھ کر اپنی اہم تعلیمی ذمہ داری یہ بنا لینی چاہئے کہ وہ جھوٹ کے خلاف ایک جہاد شروع کریں گے۔خدام الاحمدیہ اس لئے کہ اطفال ،خدام الاحمدیہ کے سپرد ہیں اور اطفال کی منزل پر ہی دراصل جھوٹ کی بیخ کنی کی جاسکتی ہے۔اگر اطفال کی منزل پر آپ جھوٹ کی بیخ کنی نہیں کرسکیں گے تو بڑے ہو کر یہ ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔

اب یہ بات سننے کے بعد جب آپ گھروں میں جائیں گے اور روزمرّہ اپنے دوستوں کی مجالس میں بیٹھیں گے تو کوشش تو کر کے دیکھیں کہ آپ چتس کریں کہ کس حد تک آپ میں یہ بیماری پائی جاتی ہے۔یا آپ کے دوستوں میں یہ بیماری پائی جاتی ہے۔تب آپ کو پتہ چلے گا کہ صورت حال کتنی بھیانک ہے۔باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعت احمدیہ دوسری تمام مسلمان جماعتوں میں سب زیادہ سچ بولنے والی ہے اور سب سے کم جھوٹ کا سہارا لینے والی ہے لیکن یہ بیرونی نظر کا مطالعہ ہے۔میں اندرونی نظر سے دیکھتا ہوں۔جس نے گھر کی صفائی کرنی ہو وہ اس بات پر مطمئن نہیں ہوا کرتا کہ اس کے گند چھپے ہوئے ہیں۔باہر سے آنے والا مطمئن ہوسکتا ہے۔اگر گھر میں پردوں کے پیچھے اور دروازوں کی اوٹ میں ،کونے کھترے میں ،دریوں کے نیچے گند پڑے ہوئے ہوں تو باہر والا آدمی آکر شاید محسوس نہ کرے اور وہ خوش ہو کر وہاں سے چلا جائے کہ گھر صاف ہے۔مگر گھر کا مالک یہ نہیں کرسکتا۔اگر اس میں شرافت ،کوئی حیاء ہے تو جب تک اس کے گھر میں گند ہے ناممکن ہے کہ وہ اس سے آنکھیں بند کرلے۔

پس میں جو اتنے اصرار کے ساتھ بات کر رہا ہوں ،نعوذ باللہ یہ مراد نہیں کہ میں خواہ مخواہ بے وجہ جماعت کی بدنامی کرا رہا ہوں ۔میں جماعت کی نیک نامی چاہتا ہوں اور بڑے گہرے درد کے ساتھ یہ باتیں محسوس کر کے آپ کو بتا رہا ہوں کہ آپ جھوٹ سے پاک نہیں ہوئے ۔آپ کے گھروں کے کونوں کھتروں میں، آپ کے دلوں میں ،کواڑوں کی اوٹ میں ابھی جھوٹ کے گند پڑے ہوئے ہیں ۔ان ڈھیروں کو اٹھا کر باہر نکالیں ۔خدا کے حضور گر کر ،گریہ وزاری سے اپنے آنسوؤں سے اپنے باطن کی صفائی کریں، اپنے باطن کو ہر گندگی سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔اللہ تعالیٰ نے بہت فضل فرمائے ہیں ہم پر اور جماعت جرمنی بطور خاص ان فضلوں کا مظہر بنی ہوئی ہے۔

دو باتیں ایسی ہیں جماعت جرمنی کی جن کی وجہ سے خصوصیت سے اس جماعت کے لئے میرے دل میں محبت بھی ہے اور دعائیں بھی نکلتی ہیں ۔ایک یہ کہ جب بھی میں نے کوئی نیک کام کہا اتنی سنجیدگی کے ساتھ ،اتنی محنت اور کوشش کے ساتھ ساری جماعت جُت جاتی ہے کہ تناسب کے لحاظ سے مجھے اور کہیں یہ تناسب دکھائی نہیں دیتا۔ بہت سے ممالک میں بہت اچھے اچھے کام ہو رہے ہیں۔آپ کی طرح بہت اچھی ٹیمیں کام کر رہی ہیں مگر جس نسبت سے جماعت جرمنی کے افراد ان نیک کاموں میں با قاعدہ منظّم طور پر حصہ لیتے ہیں اس تناسب کے متعلق میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ تناسب آپ کو باقی سب جماعتوں سے زیادہ حاصل ہے۔

دوسرا یہ کہ دعوت الی اللہ کے معاملے میں جس ہمت اور صبر اور استقلال کے ساتھ اور حکمت کے ساتھ با قاعدہ مضبوط اور مربوط ٹیمیں بنانے کے ساتھ آپ لوگوں نے محنت کی ہے ایسی محنت مجھے دنیا کی کسی اور جماعت میں دکھائی نہیں دیتی ۔ ہاں افریقہ میں ضرور یہ ہو رہا ہے اور آپ کے مقابل پر زیادہ پھل لگ رہے ہیں ۔مگر ان افریقی جماعتوں میں احمدی بحیثیت احمدی افراد کے ہرگز اس نسبت سے خدمت دین میں ملوث نہیں ہیں جس طرح آپ ہیں ۔وہاں کا نظام اور ہے ۔وہاں مربی چند ٹیمیں اپنے ساتھ بنا لیتے ہیں اور چونکہ اس قوم میں ایک خاص قسم کی سعادت پائی جاتی ہے اس لئے بعض دفعہ ایک ایک وقت میں دس دس ،بیس بیس ہزار آدمی بھی جب ان کے مقامی لیڈر بات مانتے ہیں تو وہ بھی ساتھ مان جاتے ہیں ۔ یہاں یہ صورت حال نہیں ۔مگر جہاں تک افراد جماعت کی نسبت کا تعلق ہے میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ تناسب کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کے

فضل سے جماعت جرمنی کو جو دعوت الی اللہ میں حصہ لینا نصیب ہوا ہے دوسرے ممالک میں اگر ہے تو میرے علم میں نہیں ہے۔ پس یہ دو آپ کی خاص باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ کے لئے میرے دل میں محبت کے جذبات ہیں۔ آپ کے لئے میں دعائیں کرتا ہوں اور اسی جذبے کے ساتھ میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ آپ کے اندر جو جھوٹ موجود ہے اس کو ختم کریں۔ اس لئے موجود ہے کہ آپ جن جگہوں سے آئے ہیں، جن دیہاتی علاقوں سے آئے ہیں، جس قسم کی سوسائٹی سے آپ اکھڑ کر پہنچے ہیں وہاں ہمارے ملک میں جھوٹ خصوصیت کے ساتھ جاگزیں ہو چکا تھا۔ اس معاشرے میں اب جھوٹ بولنا بالکل بھی، کسی پہلو سے بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے وہ عورتیں خصوصیت سے اور وہ نسبتاً بڑی عمر کے لوگ جن کی ساری زندگی اس معاشرے میں جھوٹ کو معمولی بات سمجھتے ہوئے گزری ہے ان کے لئے اس بیماری کو اکھیڑ پھینکنا بہت مشکل کام ہے اور چونکہ ان کے لئے مشکل ہے اس لئے ان کی اولاد کے لئے بھی مشکل ہے۔ گھر میں جو کچھ بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں ویسے ہی بچے سیکھتے ہیں۔ اسی صورت پر وہ جوان ہوتے ہیں۔

پس یہ ایک جہاد ہے، تیسرا جہاد ہے۔ جس طرح آپ نے میری ہر بات کو مانا ہے اور پورے اخلاص اور محبت اور محنت کے ساتھ لبیک کہا میری دعا ہے کہ اس پر بھی آپ اسی طرح لبیک کہیں۔ نئے عزم اور ارادے کے ساتھ اب واپس لوٹیں کہ آپ جھوٹ کے خلاف ایک عظیم جہاد شروع کریں گے اور اس کی بیخ کنی کر دیں گے۔ اس کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں گے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کوشش ہے مگر یہ کوشش کامیاب ہوگی کیونکہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ جو سب سچوں سے بڑھ کر سچے تھے آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ کوشش کرتا ہے میں اسے خوش خبری دیتا ہوں کہ ایک دن ضرور آئے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور صدیق لکھا جائے گا۔ پس کیوں آپ بھی اس خوش خبری سے محروم رہیں۔ دیانت داری سے کوشش کریں، اخلاص کے ساتھ کوشش کریں، ارادے باندھ لیں اور دن رات اپنے شعور کو بیدار رکھیں، نگرانی کریں۔ تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ صدیقیت کے مقامات بھی آپ کو عطا ہوں گے اور آپ کے اندر ایک نئی طاقت پیدا ہو جائے گی۔ آپ کے اندر ایک نیا وقار پیدا ہو جائے گا۔

ابھی بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ احمدیوں کے گرد و پیش جو جرمن اہل وطن ہیں اور وہ قریب

سے احمدی کو دیکھتے ہیں ابھی بھی وہ ان سے فرق محسوس کرتے ہیں اور نسبتاً ان سے باقی مشرقی مہاجرین کے مقابل پر زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ روزمرّہ میرے تجربے میں یہ بات آتی رہتی ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بیان کیا ہے اگر آپ اسلامی نمونے کے خدا کے سفیر بن جائیں تو اس طرح آپ ان کے دلوں میں گھر کر جائیں گے کہ ان کے لئے ناممکن ہوگا کہ آپ کے محبت کے پیغام کو رد کرسکیں۔ پس اللہ کرے کہ ہمیں اس کی توفیق نصیب ہو۔

اب چونکہ دیر زیادہ ہوچکی ہے میں خود دیر سے اس لئے پہنچا ہوں کہ ہماری مجبوری تھی۔ سارا راستہ ایسا رش ملا ہے کہ اس سے پہلے جو آنا جانا تھا اس میں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ چنانچہ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ پینتالیس منٹ کا رستہ ہے اگر گھنٹہ پہلے بھی چل پڑیں تو آرام سے پہنچ جائیں گے اور وہ پینتالیس منٹ کی بجائے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر بن گیا۔ پس یہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہاں کسی عذر یا بہانے کی بات نہیں واقعۃً ایسا ہی ہوا ہے۔تو میں معذرت خواہ ہوں دیر سے شروع کرنے پر لیکن اب مجھے یہاں اس خطاب کو ختم کرنا ہے اس وجہ سے نہیں کہ میں وقت کی کمی کی وجہ سے افراتفری کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی ہے تو وقت عین مناسب ہے۔

میں جو کہنا چاہتا تھا وہ میں نے کہہ دیا ہے۔قرآن وحدیث کے حوالے سے کہہ دیا ہے۔اپنے زندگی کے تجربے کے لحاظ سے کہہ دیا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو سننے والے کان عطا کرے۔اذن واعیہ عطا کرے۔ جو کان سنتے ہیں اور پھر ان حکمت کی باتوں کو خزانہ بنا کر اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں۔ آیئے اب ہم اس کے بعد افتتاحی دعا میں شریک ہو جائیں۔اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔اس اجتماع کے دوران ایک دوسرے سے محبت اور اخلاص کے معاملات کریں۔کسی قسم کی بدمزگی نہیں ہونی چاہئے۔ کسی قسم کی بدکلامی نہیں ہونی چاہئے۔ احتیاطیں کریں کہ کھیل کے میدانوں میں جہاں تک ممکن ہو احتیاط ہو اور کسی خادم کو چوٹ نہ آ جائے۔اللہ کرے کہ نہایت پاکیزہ ماحول میں آپ ذکر الٰہی کرتے ہوئے اپنے دلوں کو ذکر الٰہی سے شاداب رکھتے ہوئے یہ وقت گزاریں۔اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔خیریت سے آئے ہیں، خیریت ہی سے واپس لوٹیں۔کسی قسم کی کوئی دکھ کی خبر نہ ملے۔آمین۔ دعا کر لیجئے۔

(اس موقع پر حضور دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے والے تھے کہ عرض کی گئی کہ جمعہ کا خطبہ ثانیہ ابھی باقی ہے۔اس پر حضور نے فرمایا) میرے ذہن میں اجتماع کا خطاب رفتہ رفتہ غالب آ گیا۔ یہ یاد بھی نہیں رہا

کہ اصل میں تو یہ خطبہ ہے۔ مجھے تو ابھی خطبہ ثانیہ کہنا ہے۔ پھر حضور نے فرمایا۔ افتتاحی دعا جیسا کہ کی جاتی ہے اس کی ضرورت نہیں۔ نماز جمعہ کے اندر ہی ہمیں اپنے اجتماع اور اپنی ساری زندگیوں کی کامیابی کے لئے دعا کرنی چاہئے۔

کوئی دنیا کی طاقت عدل پر قائم نہیں ہو سکتی اگر خدا کے حضور اس کی گردن جھکی ہوئی نہ ہو۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 31 رمئی 1996ء بمقام بیت النور نن سپیٹ ہالینڈ)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ (النحل: 76)

فرمایا:

آج جماعت احمدیہ ہالینڈ کا سترھواں (17) جلسہ شروع ہو رہا ہے اور یہی جمعہ کا خطاب ہی ان کے اس جلسے کا افتتاحی خطاب بھی ہے۔ اس موقع پہ جماعت ہالینڈ کو اور جماعت ہالینڈ کی وساطت سے باقی تمام دنیا کی جماعتوں کو نصیحت کرنے کے لئے میں نے اس آیت کا انتخاب کیا ہے جس کی ابھی تلاوت کی ہے۔ یہ سورۃ النحل کی چھہترویں (76) آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا اللہ ایک ایسے مملوک غلام کی مثال پیش کرتا ہے جو کسی چیز پر بھی کوئی قدرت نہیں رکھتا پھر ایسے شخص کی وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ جس کو ہم نے اپنی طرف سے احسن رزق عطا فرمایا۔ فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا پس وہ اس میں چھپ کر بھی خرچ کرتا ہے اور کھلم کھلا بھی هَلْ يَسْتَوٗنَ کیا وہ دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ بلکہ اکثر لوگ جانتے نہیں۔

اس آیت میں جو غلام کی مثال دی ہے اس کے مقابل پر ایک ایسے بندے کی جو خدا سے رزق پاتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ غلام بھی تو خدا کا بندہ تھا جسے کسی نے غلام بنالیا اور اس کا بظاہر تحقیر سے ذکر قرآن کریم میں کیا معنے رکھتا ہے۔وہ قرآن کریم جس کی تعلیم نے آقا اور غلام سب کو برابر صف میں کھڑا کر دیا۔وہ قرآن کریم جس نے حقیقت میں غلامی کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایسے ذرائع پیش کئے کہ ان کی کوئی مثال دنیا کے کسی مذہبی یا غیر مذہبی تحریک میں دکھائی نہیں دیتی۔وہ اسلام جس نے حضرت محمد ﷺ کا نمونہ غلاموں کے حق میں ان سے پیار کا پیش کیا اور ایسا نمونہ پیش کیا کہ اس کی مثال تاریخ انبیاءؑ میں دکھائی نہیں دیتی۔وہ اسلام جس کے ابتدائی مومنین میں سے وہ غلام بھی تھا جس کو خلفائے وقت سیدنا بلالؓ کہا کرتے تھے۔اتنی عظمتیں ہیں غلامی کے لئے۔وہ اسلام جو فتح مکہ کے وقت آنحضرت ﷺ کے ذریعے اس شان کے ساتھ ظاہر ہوا کہ بلالؓ کا ایک جھنڈا ابھی اس دن گاڑا گیا اور وہ آزاد لوگ جو اس غلام پر ظلم کیا کرتے تھے ان کو جان بچانے کے لئے اسی جھنڈے کی پناہ لینے کا حکم دیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ جو بھی اس غلام کے جھنڈے تلے آئے گا اس کی جان بخشی جائے گی،اس کو کوئی نقصان نہیں ہے۔

تو ایک طرف یہ سارے امور ہیں جو غلامی کے متعلق ایک حیرت انگیز اعلیٰ اور نفیس اور پاکیزہ تعلیم پیش کرتے ہیں اور پھر غلامی کی تعلیم میں جو تفصیل میں خدا تعالیٰ نے بار بار غلام آزاد کرنے کا حکم فرمایا اور پھر اس سے حسن سلوک کا حکم فرمایا اور آنحضرت ﷺ نے جس طرح غلاموں پر ظلم کرنے والوں کی نہایت سختی سے تنبیہ فرمائی۔یہاں تک کہ

> عبداللہ بن مسعودؓ کو جب وہ ایک غلام کو مار رہے تھے اس طرح ڈپٹ کر اس سے روکا ہے کہ بلا تاخیر انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میں اس کو آزاد کرتا ہوں۔آپؐ نے فرمایا ٹھیک ہے۔اگر نہ کرتے تو جہنم تمہاری سزا تھی۔

(جامع الترمذی ، أبواب البر و الصلة ، باب النھی عن الضرب الخدم و شتمھم)

تو ایک طرف غلامی کا یہ عظیم مرتبہ ہے اور دوسری طرف یہ آیت ہے جو کہہ رہی ہے

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا

گویا یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ہیں ہی الگ الگ چیزیں۔یہاں دراصل دنیا کے مملوک غلام کا

ذکر چل رہا ہے اور اس کے مقابل پر اس کا جسے رِزْقًا حَسَنًا عطا کیا جاتا ہے۔ مَّمْلُوْكًا کا لفظ، حالانکہ غلام مملوک ہی ہوا کرتا ہے، زائد طور پر یہ بتانے کے لئے ظاہر فرمایا گیا کہ وہ شخص جو دنیا کا غلام ہو جائے، دنیا کا بندہ بن جائے وہ ہر پہلو سے مملوک، یعنی اس کی آزادیاں ہر طرح سلب ہو چکی ہوتی ہیں۔ کسی ایک پہلو سے بھی وہ کوئی آزادی کا سانس نہیں لے سکتا، سو فیصدی دنیا کا غلام بن کے رہتا ہے اور اسے بھی تو خدا رزق دیتا ہے مگر اس رزق پر اس کا اپنا اختیار کوئی نہیں ہوتا۔ اپنی مرضی سے خرچ بھی نہیں کر سکتا اور شیطان اور دنیا کی غلامی اس پر بھی قابض ہو جاتے ہیں اور اس کے رزق پر بھی قابض ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ایسی منحوس چیز بن جاتا ہے کہ جہاں بھی جائے اچھی خبر کبھی نہیں لاتا بلکہ اس کے ہر کام میں نحوست اور بے برکتی ہوتی ہے۔ یہ دنیا کا غلام ہے جس کی بات ہو رہی ہے اور جو پوری طرح غلامی کے بندھنوں میں جکڑا جائے اسے عبد مملوک فرمایا گیا ہے۔ اس کے مقابل پر اپنے بندوں کا ذکر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عبد کا لفظ جب خدا کے تعلق میں بولا گیا ہے تو سب سے اعلیٰ ایک اعزاز ہے جس سے اوپر اعزاز کبھی کسی نبی یا غیر نبی کو نہیں دیا گیا۔ عبادالرحمٰن بھی ہیں اور بھی عباد کا ذکر ملتا ہے مگر آنحضرت ﷺ کو جب عبداللہ کہا گیا تو یہ ایک لقب تھا اور اس لقب سے بڑھ کر کبھی کسی نبی کو کوئی لقب عطا نہیں کیا گیا۔ تو دیکھیں ایک وہ عَبْدًا مَّمْلُوْكًا ہے جس کا تحقیر سے ذکر ہے، بالکل ظاہر بات ہے اور ایک وہ عبد ہے جو تمام دنیا کا سردار ہے۔

پس یہاں دنیا کے غلام اور اللہ کے غلام کا موازنہ ہو رہا ہے۔ عام غلام کی بات نہیں ہو رہی اور وہ جو اللہ کا غلام ہو جائے جو بھی خدا اس کو رزقِ احسن عطا فرماتا ہے پھر وہ اپنا ہوتے ہوئے بھی اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ ایک وہ دنیا کا غلام ہے جس کو اپنے مال پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے، کوئی اس کو دسترس نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکے۔ ایک وہ ہے جسے مالک خود دیتا ہے اور بہت دیتا ہے۔ پاکیزہ رزق عطا فرماتا ہے اور کہتا ہے یہ تیرا ہو گیا اور وہ پھر اس کی راہ میں پیش کر دیتا ہے۔ تو ایک مجبوری کی غلامی ہے، ایک طوعی غلامی ہے اور طوعی غلامی کے یہ انداز ہیں۔ جو محبت کے بندھن میں باندھے ہوئے غلاموں کے اطوار ہیں، جو ان کے طریق، ان کے اخلاق ہیں وہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت میں ہمیں دکھائی دیتے ہیں اور دراصل یہاں انہی کا ذکر چل رہا ہے۔

فرمایا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا وہ چھپ کر بھی اس رزق سے جو خدا اسے

عطا فرماتا ہے، اس کا رب اسے عطا کرتا ہے خرچ کرتا ہے اور کھلے بندوں سرعام بھی خرچ کرتا ہے۔ هَلۡ يَسۡتَوٗنَ کیا وہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں۔ کسی پہلو سے بھی کیا ان میں کوئی برابری ہوسکتی ہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لیکن اکثر ان میں سے جانتے نہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُۙ اَيۡنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ‌ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَۙ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ‌ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ۝ (النحل:77)

اس مضمون کو خوب کھول دیا ہے کہ اب یہاں دراصل دنیا کے غلاموں اور خدا کے غلاموں کے درمیان ایک موازنہ کر کے دکھایا جارہا ہے اور بتایا یہ جارہا ہے کہ کوئی موازنہ کا پہلو موجود ہی نہیں ہے۔ ایسا غیر برابر موازنہ ہے کہ کوئی ایک چیز بھی ان دونوں کے درمیان مشابہ نہیں ہے۔ پس يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ تو بالبداہت حضرت محمد ﷺ کی صفات ہیں۔ سب سے بڑا عدل کی تعلیم دینے والا پیمبر آپؐ تھے، سب سے بڑا صراط مستقیم پر چلنے والا رہنما آپؐ تھے۔ پس میرے نزدیک دنیا کے غلاموں کی حیثیت پہلے ایک طرح بیان فرمائی گئی۔ اب دوسری طرح بیان فرمائی جارہی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اَبۡكَمُ ہے، گونگا ہے اور لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ وہ اپنے مالک پر بھی ایک بوجھ ہے۔ اَبۡكَمُ دراصل علم و حکمت سے عاری ہونے کے لئے فرمایا گیا ہے۔ گونگا وہ شخص جسے کچھ بیان کرنے کی مقدرت نہ ہو اور آنحضرت ﷺ اُمّی ہونے کے باوجود سب سے زیادہ علموں کے خزانے لٹانے والے تھے۔ پس آپؐ کے مقابل پر وہ شخص جو بظاہر عالم بھی ہو اگر وہ دنیا کا غلام ہے تو اس سے کوئی بھی فیض دنیا کے لئے جاری نہیں ہوتا۔ گویا کہ وہ گونگا ہے۔ اس کے پاس کچھ بتانے کے لئے ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو بیان نہیں کرسکتا۔ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ جو بھی اس کا مالک ہے اس پر وہ بوجھ ہے یعنی جس چیز کا وہ غلام ہے اس کے لئے وہ بوجھ ہے۔ یہ بہت ہی گہرا اور دلچسپ مضمون ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا دار لوگ جو دنیا کے ہو جاتے ہیں اور اس حد تک وہ دنیا پر جھک جاتے ہیں کہ ان کا مالک بھی ان پر اعتماد نہیں کرسکتا اور جو کام ان سے لیتا ہے اس کا فیض ان کو نہیں پہنچتا اور رفتہ

رفتہ ایسے لوگ خود دنیا کی نظر میں جس کے کیڑے بن چکے ہوں اپنی عظمت اور قدر کھو بیٹھتے ہیں۔

پس ایسا خوفناک نقشہ دنیا کی غلامی کا جو دو مختلف مثالوں میں بیان فرمایا گیا ایک طرف ہے اور دوسری طرف اللہ کے غلاموں کا نقشہ ہے جو ہر آزاد سے بڑھ کر قابل تعریف اور ہر آزاد سے بڑھ کر آزادی کا متحمل ہے اور حقیقت میں خدا کی غلامی کے سوا آزادی کا تصور ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ پہلو جو ہے اس کو میں آپ کے سامنے کھول کر رکھنا چاہتا ہوں۔ جو علامتیں ہیں وہ واضح ہیں۔ اگر کسی شخص میں دنیاداری کا اتنا رجحان ہو کہ وہ ہر طرح اپنے مال و دولت جس کی خاطر جیتا ہے اس کا غلام ہو کر رہ جائے تو ایسا شخص خدا کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا اور اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ نہ چھپ کر خدا کی راہ میں خرچ کر سکتا ہے نہ ظاہر ہو کر خرچ کر سکتا ہے اور پھر دنیا بھی اسے قبول نہیں کرتی اور دنیا میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ جس کام پر ہاتھ ڈالتا ہے وہ اس کے لئے، اس کی اولاد کے لئے، اس کی دنیا کے لئے، اس کی عاقبت کے لئے دراصل خیر و برکت سے عاری ہوا کرتا ہے۔

پس آپ کے لئے دو ہی رستے ہیں یا دنیا کی غلامی قبول کریں یا خدا کی غلامی میں آجائیں اور خدا کی غلامی جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ہر دوسرے بندھن سے آزاد کرتی ہے اور اس میں ایک ادنیٰ بھی مبالغہ نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جو اللہ کا غلام ہو وہ ہر بات میں فیصلہ خدا سے چاہتا ہے اور ہر فیصلہ اس کی رضا کی خاطر کرتا ہے اور دنیا کی رضا یا ان کی خاطر بیچ میں سے بالکل نکل جاتی ہے پس وہ نہ بادشاہ کی خاطر کچھ کرتا ہے، نہ اپنے ملک کے سربراہ کی خاطر یعنی اس سے ڈر کر۔ نہ اپنے عزیزوں سے ڈر کر یا ان کی خاطر۔ جو بھی بھلائی کرتا ہے، جو بھی خیر کرتا ہے اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھتا ہے۔ تو جو شخص ہر دوسرے کی رضا سے آزاد ہو جائے، جو ہر دوسرے کے خوف سے آزاد ہو جائے اس سے بڑا آزاد کوئی دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی سوچیں آزاد ہو جاتی ہیں۔ اس کی نیتیں آزاد ہو جاتی ہیں اور چونکہ اللہ کی غلامی ہے اس لئے اس کی ہر بات میں ایک برتری، ایک بالادستی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ کی رضا کے اندر ایک غیر معمولی طاقت ہے اور اللہ کی رضا سچائی ہی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ کی رضا ہی سے عدل پیدا ہوتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے اس مضمون کا آخری نچوڑ یہ نکالا کہ وہ شخص جو خدا کا غلام ہے اس غلام کے مقابل پر اس کی شان دیکھو کہ وہ عدل کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے یعنی اس کے اندر ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

عدل اللہ کے تصور کے بغیر پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔کوئی دنیا کی طاقت خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو عدل پر قائم نہیں ہوسکتی اگر خدا کے ہاں اس کی گردن نہ جھکی ہوئی ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کبھی دنیا میں کسی نے نہ تبدیل کیا نہ آئندہ کوئی تبدیل کرسکتا ہے۔آج کی دنیا کو عدل کے متعلق احساس ہو چلا ہے کہ بہت اہم چیز ہے۔ بڑے بڑے سیاستدان بھی بات کرتے ہیں کہ عدل ہونا چاہئے مگر خدا سے تعلق کے بغیر عدل قائم ہو نہیں سکتا۔ یہ وہم ہے کیونکہ اللہ کے تعلق میں دو باتیں ہیں اس کی محبت اور اس کا خوف اور محبت اور خوف کے درمیان جو توازن ہے وہ عدل کے قیام کا ذمہ دار ہے اس کے بغیر عدل پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ جو میں باتیں کہہ رہا ہوں بظاہر ایک دعویٰ ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ بہت گہری سوچ اور بہت تفصیلی جائزوں کے بعد میں قطعی نتیجے پر پہنچا ہوں اور اس کو تفصیل کے ساتھ اگر بیان کیا جائے تو ایک لمبا مضمون ہوگا۔مگر انسانی زندگی کے ہر پہلو پر یہ بات صادق آتی ہے کہ جو پہلو بھی خدا کے خوف سے باہر ہو جائے ،خدا کی محبت سے باہر ہو جائے ،وہ عدل سے خالی ہو جاتا ہے۔اس میں یا ایک طرف جھکاؤ ہو جائے گا یا دوسری طرف جھکاؤ ہو جائے گا۔

پس دنیا والے بھی جو عدل کرتے ہیں بعض عدل ان کے میکینکل عدل ہیں۔ان کے اندر ان کی روح کی گہری لطافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ان کی روح کی گہری لطافت تب پیدا ہوسکتی ہے اگر خدا سے تعلق ہو۔ورنہ جو ظاہری عدل ہے بعض دفعہ ایک جج بھی جو دنیا دار بلکہ دہریہ ہے وہ بھی عدل کرتا ہے۔مگر اس کا عدل اور چیز ہے اور خدا کا عدل اور چیز ہے۔اس کے عدل کے اندر ایک بے اختیاری ہے۔وہ مالک نہیں ہے کسی چیز کا اور ملازم ہے ایک ایسے منصب پر جہاں اس کے فرائض میں عدل داخل ہے اس لئے وہ عدل کرتا ہے لیکن وہ شخص جو مالک بھی ہو، جسے اختیار بھی ہو، مواقع بھی میسر آئیں کہ عدل کروں یا نہ کروں وہ اگر عدل کرتا ہے تو وہ اسلامی عدل کے تصور کے نسبتاً زیادہ قریب ہے۔ پھر ایسے جج بھی ہیں جو عدالت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں ،عدل کرتے ہیں۔ جب گھر آتے ہیں تو بیوی سے عدل نہیں کرسکتے۔اپنے دوستوں سے عدل نہیں کرسکتے۔اپنے ماتحتوں سے عدل نہیں کرسکتے۔اپنے ماتحتوں سے جو گھر کے ملازم ہیں ان سے عدل نہیں کرسکتے اور اپنے ملنے جلنے والوں سے ،اپنے رشتہ داروں سے،اپنے بیوی بچوں تک سے عدل نہیں کرسکتے۔تو عدل کا مضمون کوئی معمولی مضمون نہیں۔ یہ ساری زندگی کے ہر پہلو پر چسپاں ہونے والا ایک باریک مضمون ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے سے عدل نہیں کرسکتے۔

اپنے سے عدل کی تفصیل میں اگر آپ جائیں تو آپ کو انسان کی جسمانی صحت اور روحانی صحت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ وہ شخص جو اپنی ذات سے عدل کرتا ہے اس کے لئے ایک ایسی با قاعدہ زندگی ہونی ضروری ہے کہ جہاں وہ آرام کے وقت آرام کرے گا اور محنت کے وقت محنت کرے گا اور یہ وہ عدل ہے جس سے بعض دفعہ خدا کے بندے بھی جو بہت بلند مرتبہ والے ہیں کسی حد تک عاری ہو جاتے ہیں۔ پس اللہ کے سوا کسی کو نہ کامل عدل کی توفیق ہے، نہ وہ اپنے سے عدل کرسکتا ہے، نہ غیر سے عدل کرسکتا ہے۔ مگر ہاں جو خدا والے ہوں ان کو کم سے کم غیروں کے معاملے میں عدل کرنے کی ضرور توفیق مل جاتی ہے۔ پس ایک ہی موقع ہے جہاں خدا کے بندے عدل سے عاری دکھائی دیتے ہیں وہ اپنی ذات کے معاملے میں عدل ہے۔ اس پہلو سے وہ ظالم کہلاتے ہیں مگر ان کے ظلم میں ایک احسان کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں عدل کا فقدان ایک بدصورتی کی بجائے ایک خوبصورتی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے عام دنیا میں ماں بچے سے پیار کے نتیجہ میں اپنے سے عدل نہیں کرتی۔

اب عدل نہ کرنا ایک خرابی ہے۔ جو انسان اپنی طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھالے اس کو اس کا نقصان پہنچے گا اور یہ عدل کے فقدان کی ایک طبعی سزا ہے جو قانون قدرت میں جاری ہے، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تو ایک ماں جب اتنا جاگتی ہے کہ اس کے بدن میں طاقت نہیں ہے اتنا جاگنے کی، اتنا غم دل پہ لے لیتی ہے کہ اس کے اعصاب میں طاقت نہیں کہ وہ غم برداشت کر سکے۔ اس کی سزا تو اس کو ضرور ملتی ہے۔ مگر یہ گناہ کی سزا نہیں یہ خطا ہے جس کا بدلہ دیا جاتا ہے۔ پس عدل کے فقدان میں بعض دفعہ خطا ہوتی ہے، بعض دفعہ گناہ بن جاتا ہے یعنی عدل کا فقدان گناہ بن جاتا ہے۔ پس وہ عدل کا فقدان جو کسی پر احسان کے نتیجہ میں ہوا سے گناہوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ وہ عدل کا فقدان جو احسان کے نتیجہ میں ہوا سے ایک بشری کمزوری کہا جاتا ہے۔ یا حسن میں اتنا بڑھ جانا اور احسان میں اتنا آگے نکل جانا کہ اپنے بدن کو قربان کئے بغیر انسان وہ خدمت نہیں کرسکتا۔

اس پہلو سے حضرت اقدس محمد ﷺ کے لئے جہاں بھی ظلم کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں آپؐ کے بے انتہا احسان کو ظاہر کرنے کے لئے ہوا ہے۔ اب وہ آیت کریمہ جس کی بار بار آپ کے سامنے تلاوت کی جاتی ہے میں کئی دفعہ حوالے دے چکا ہوں۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا

يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (الشعراء:4) کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر لے گا اس غم میں کہ وہ مومن نہیں ہوتے، وہ ایمان نہیں لاتے۔ اب ظاہر بات ہے کہ عدل کا فقدان تو ہے یعنی اپنے نفس کا جو حق ادا کرنا تھا وہ ادا نہیں کیا جارہا اس لئے کہ دوسرے بچ جائیں اور یہ غم جن دعاؤں میں ڈھلتا ہے وہ دعائیں ان کو بچالیں۔ تو طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھایا گیا ہے اور جس طرح مائیں جب طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھاتی ہیں تو یہ عذران کا پیش نہیں جاتا کہ ہم نے تو بچے کی خاطر، نیکی کی خاطر قربانی کی تھی اس لئے قانون قدرت کو اپنا ہاتھ روک لینا چاہئے۔ قانون قدرت کا جو عدل ہے وہ سب سے بالا ہے اور وہ اللہ کا عدل ہے۔ وہ اپنے انبیاءؑ پر بھی چلتا ہے اور ان پاکبازوں پر بھی چلتا ہے جو خدا کی خاطر عدل سے گریز کر رہے ہیں بظاہر۔ تو دیکھو کتنا باریک مضمون ہے۔

میں نے آپ کو جو مثال دی تھی وہ یہی سمجھانے کے لئے کہ آپ یہ سن کر کہ جی عدل بڑا ضروری ہے سب جگہ ہونا چاہئے ہرگز اطمینان نہ پائیں کہ آپ کو اس مضمون کی سمجھ آگئی ہے۔ بہت ہی گہرا اور بہت ہی لطیف مضمون ہے۔ پس حضرت اقدس محمد ﷺ نے جب اپنی جان پر بوجھ اٹھایا اور زیادہ اٹھایا اور اللہ نے نصیحت فرمائی کہ کیا تو ان ظالموں کی خاطر اپنے پاک نفس کو ہلاک کر لے گا تو اس کا نتیجہ بھی نکلا اور وہ یہ تھا کہ آپ کے بال عمر سے پہلے ہی سفید ہو گئے اور بالوں کا سفید ہونا بعض دفعہ گہرے غم کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ پس لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کا مضمون تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو ہود قوم نے بوڑھا کر دیا۔ وہ ہود قوم جس کے لئے سورہ ہود نازل ہوئی۔ کیسا گناہ انہوں نے کیا، کیسا ظلم کمایا کہ پوری قوم صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی۔ کتنی دیر پہلے، ہزاروں سال پہلے کا ایک واقعہ رسول اللہ ﷺ کے دل پر اتنا گہرا اثر ڈال دیتا ہے کہ وہ ہود کے غم میں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں تمہیں تو اور چیزوں نے بوڑھا کیا ہوگا شَيَّبَتْنِي هود مجھے تو سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے۔ (جامع الترمذی ،أبواب تفسير القرآن ،باب ومن سورة الواقعة) مگر بوڑھے ہوئے تو ہوئے، بال تو سفید ہوئے قانون قدرت نے اپنا ہاتھ نہیں روکا۔

تو دیکھیں عدل کا مضمون جب ایک دوسرے کے متقابل آتا ہے تو کتنے نئے رنگ دکھاتا ہے۔ اللہ کا عدل ہے جس نے کہا کہ میرا قانون ہر انسان پر برابر چلے گا اور سب سے زیادہ محبوب نبی ﷺ کے اوپر بھی اس وقت اثر دکھا رہا ہے جب وہ خدا کی خاطر کر رہا ہے۔ فرمایا اس کی قیمت تو تمہیں دینی

پڑے گی۔ یہ میرا قانون قدرت، عام قانون کا عدل ہے اور جہاں تک تمہاری قربانی کا تعلق ہے وہ میرے ذمہ ہے۔اس کا اتنا بدلہ ہوگا کہ اس کا تصور بھی عام انسان نہیں کرسکتا۔تو احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ جاری ہے۔عدل کا بدلہ عدل کے ساتھ جاری ہے اور پھر عدل کرنے والوں کے اندر بھی بڑا فرق دکھایا گیا ہے۔کچھ اپنے نفس کی خاطر عدل کرتے ہیں، کچھ اور مقاصد کی خاطر عدل کرتے ہیں، کچھ حسن و احسان کی خاطر عدل کرتے ہیں۔اسی عدل کی ایک عجیب مثال ایک بزرگ کے واقعہ میں یا اس کی کہانی میں بیان کی گئی ہے جس میں حسن اور عدل کا موازنہ کیا گیا ہے یا حسن و احسان اور عدل کا موازنہ کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں ایک بزرگ جنگل میں بیٹھا اللہ تعالیٰ کی یاد میں محو تھا کہ اتنے میں ایک ڈری ہوئی، پھڑ پھڑاتی ہوئی فاختہ اس کی گود میں آ گری، جو زندہ تھی لیکن جیسے گھبرا کر کسی خطرے سے بھاگتے ہوئے اس کے اندر مزید دم نہیں رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ سکے اور اس نے اس کو اپنی جھولی میں لیا اور پیار سے اس کو سنبھالا تو اتنے میں ایک باز اس کا پیچھا کرتا ہوا وہاں پہنچا۔اب یہ کشفی نظارہ اس نے دیکھا کہ باز اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ یہ خدا نے میرے لئے شکار بنایا ہے اور قانون قدرت ہے۔تم مجھے ظالم نہیں کہہ سکتے۔جس نے میری غذا یہ مقرر کی ہے وہ جانتا ہے کہ کیوں ایسی غذا مقرر کی گئی ہے۔مگر یہ میری غذا ہے اور میں نے بڑی محنت کی، میں اچک لیتا اس کو مگر تم بیچ میں حائل ہو گئے ہو۔تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ اس پرندے کو مجھ سے روک لو کیونکہ مجھے تو خدا نے یہی رزق عطا فرمایا ہے اور اب عدل اس کا للکارا گیا اور عدل کے تقاضے کے پیش نظر اسے وہ فاختہ بہر حال واپس کرنی تھی۔مگر احسان اس فاختہ کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس بزرگ نے اس پرندے کو یعنی باز کو اس کشفی حالت میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں خدا نے گوشت رزق کے طور پر بخشا ہے۔لیکن کہیں خدا نے یہ قانون نہیں بنایا کہ فاختہ ہی کا گوشت ہوگا۔انسانی گوشت اس سے بھی بہتر ہے۔پس میں اپنے جسم کا ایک ٹکڑا اتنا کاٹنے کے لئے تیار ہوں جتنا تمہارا پیٹ بھر جائے اور یہ کہہ کر اس نے چاقو نکالا اور اپنی ران سے ایک گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر اس پرندے کو دے دیا۔یہ احسان اور عدل کا ایک عجیب موازنہ ہے جو کشفی صورت میں پیش کیا گیا کہ ایک شخص جب احسان کرتا ہے تو پھر اسے قربانی کرنی پڑتی ہے۔عدل کو پھر بھی قائم رکھنا ہوگا مگر وہاں عدل کا قیام اس کی ذاتی قربانی چاہتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جہاں بھی عدل سے گریز فرمایا ہے اپنی قربانی دے کر عدل سے گریز کیا ہے، اپنے خلاف عدل سے گریز کیا ہے۔ کسی دوسرے کے خلاف نہیں۔ کسی دوسرے کی خاطر کیا ہے اور اس قربانی میں آپؐ کی بدنی قربانی ضرور شامل ہوئی اور اس وجہ سے خدا تعالیٰ نے صرف نظر نہیں فرمایا۔ تو ان تمام باتوں کو سمجھتے ہوئے سب سے پہلے تو آپ کو معاشرے میں عدل کا قیام کرنا ہے، اپنے تعلقات میں اور اپنے گھر میں، اپنی اہلیہ سے، اپنے بچوں سے، اپنے عزیز و اقارب سے، اپنی حکومت سے، نظام جماعت سے، جو ان کے حقوق ہیں وہ ان کو ادا کرنے ہیں۔ جو ان کے تقاضے ہیں وہ آپ نے پورے کرنے ہیں۔ عدل پر قائم ہوں گے تو پھر اگلا قدم احسان کا شروع ہوگا اس سے پہلے ناممکن ہے۔ جرمنی کے اجتماع میں بھی میں نے خدام کو کچھ عدل کے متعلق سمجھایا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ مضمون بہت ہی وسیع ہے اس لئے آج آپ کے اجتماع میں جو جماعت کا اجتماع ہے اسی مضمون کے بعض دوسرے پہلوؤں کو روشن کرتا ہوں۔

نظام جماعت میں عدل کے تقاضے بعض دفعہ بہت باریک ہو جاتے ہیں اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک انسان ان کو پوری طرح نہ سمجھنے کے نتیجے میں کئی دفعہ نظام جماعت کی بےحرمتی پر اتر آتا ہے اور اس کی سزا اس کو ضرور ملتی ہے کیونکہ خدا کے نظام سے جو شخص ٹکرائے اسے کبھی صحیح سالم بچتا ہوا نہیں دیکھا گیا۔ یہ بالکل الگ بحث ہے کہ وہ سچا تھا یا جھوٹا تھا۔ نظام ایک ایسی چیز ہے جیسے قانون قدرت ہے۔ کوئی شخص اپنا حق سمجھتے ہوئے اگر آگ میں ہاتھ ڈالے گا اور اس کی کوئی چیز اس میں گری ہوئی ہے وہ کہے کہ میرا حق ہے میں ضرور نکالوں گا تو آگ اسے ضرور جلائے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ خدا کے نظام کے اوپر کوئی غالب آسکے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ اس کی میں مثال آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ پس نظام جماعت کوئی معمولی نظام نہیں ہے۔ یہ قانون قدرت کی مثال ہے جس کے اوپر خدا تعالیٰ نے روحانی نظام جاری فرمائے ہیں اور جیسے قانون قدرت آپ کی بقا کے لئے لازم ہے اور اس کے بہت سے پہلو ہیں اسی طرح نظام جماعت بھی آپ کی انفرادی بقا کے لئے لازم ہے۔ اگر نظام جماعت نہ ہو تو کسی کی روحانی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

باقی لوگوں کا حال دیکھو کیا ہوا ہے۔ کس طرح تتر بتر ہو کر بکھر گئے ہیں۔ کیسے اجتماعیت بٹ کر آخر انفرادیت میں بدل گئی اور ہر شخص آزاد ہے اور وہ اس آزادی کے مزے لے رہا ہے یعنی بظاہر

وہ سمجھتا ہے کہ میں آزاد ہوں اور احمدی غلام ہیں اور ہر وقت کی مصیبت ۔ یہ بات ہو تو نظام سے پوچھو، بیٹھنا ہو تو نظام سے پوچھو، کیا مصیبت ہے یہ۔ کہاں یہ اور کہاں ہم جو مرضی کریں ۔ سکھ سے شادی کریں ،عیسائی سے کریں ،کسی دہریہ سے کرلیں ۔رسمیں منانی ہوں تو منائیں ۔کون ہے جو ہمارے معاملے میں دخل دے ۔شراب خانے کھولیں ،ان کے اوپر ختم قرآن کروائیں ۔لوگ آئیں اور شوق سے حصہ لیں ۔مجال ہے کسی کی جولب کھولے کہ تم نے کیوں ایسا کیا۔ ایک یہ وہ آزادی ہے اور ایک طرف نظام جماعت ہے جس نے دیکھو کتنا پابند کر رکھا ہے لیکن مملوک وہ ہے جس کا اپنا کچھ بھی نہ رہا، کلیۃً اس کی ہر چیز دنیا کے لئے ہوگئی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں آزاد ہوں حالانکہ وہ ہر پہلو میں، ہر بات میں غلام بن گیا ہے رسم ورواج کا ،لوگوں کے دیکھنے کا ،ریا کاری کا اور نفسانی خواہشات کا۔ پس جو اپنے نفس کا غلام بن جائے ، جو دنیا کی نظروں کا غلام ہو جائے ،جس کا اٹھنا بیٹھنا خدا کے سوا دوسرے مقاصد کے لئے ہو جائے وہ مملوک ہوتا ہے اور وہ شخص انصاف سے عاری ہو جایا کرتا ہے لیکن جماعت احمدیہ کا جو نظام ہے اب میں نظام کی بات کر رہا ہوں ۔نظام جماعت ایک ایسا نظام ہے جو قانون قدرت کی طرح آپ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اب کوئی شخص کہہ سکتا ہے دنیا میں کہ عجیب قدرت ہے مصیبت پڑی ہوئی ہے ۔آگ میں ہاتھ نہ ڈالو اور زیادہ ٹھنڈی ہوا نہ کھاؤ ، کپڑے گرم پہنو سردیوں میں ،گرمیوں میں ٹھنڈے کپڑے پہنو اور بھوک لگے تو یہ کرو، بھوک نہ لگے تو فلاں کام کرو، اٹھو، بیٹھو، سوؤ، جاگو مگر توازن رکھو۔ کھانا کھاؤ مگر بھوک ختم ہونے سے پہلے ہاتھ روک لو یعنی وہ قانون قدرت جو تقاضے کرتا ہے۔ عیش کرو مگر ایک حد تک ۔ جاگو مگر ایک حد تک ۔ دیکھو پابندیاں ہیں کہ نہیں اور یہ وہ پابندیاں ہیں جو خدا تعالیٰ نے خود کہہ کر عام بندوں پر نہیں لگائیں مگر تمام دنیا کا نظام برابر ہر انسان پر پابندی لگائے ہوئے ہے اور جہاں بھی اس پابندی کے تقاضے سے بچ کر کوئی انسان نہیں چلتا وہاں ضرور اس کو سزا ملتی ہے۔ کئی لوگ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں ۔ کئی لوگ ہیں جو پہلے اپنی امارت کی وجہ سے خوب کھاتے ہیں ،خوب عیش کرتے ہیں مگر کچھ دیر کے بعد معدے بھی جواب دے جاتے ہیں، دوسرے اعضاء بدن کے جواب دے دیتے ہیں اور ساری زندگی پھر رونے پیٹنے اور مصیبتوں میں صرف ہوتی ہے۔ تو قانون قدرت اپنی سزا دیتا ہے اور اس نے پابند رکھا ہوا ہے ۔مگر جو قانون قدرت کا پابند رہتا ہے دیکھو کتنی آزادی سے سانس لیتا

ہے۔وہ دوڑتا پھرتا ہے، صحت اس کی اچھی، اس کے سانس ہلکے، وہ ہر اچھے کام میں حصہ لے سکتا ہے شوق سے۔اس کا سونا آرام دہ ہے۔اس کا جاگنا آرام دہ ہے۔اس کے روزمرہ کے کاموں میں کوئی تکلیف نہیں۔نہ گھٹنوں میں دردیں ہیں نہ کوہنیوں میں۔ہر بدن کا حصہ ہلکا پھلکا اور ہر کام کے لحاظ سے متوازن ہے۔تو ایک طرف غلامی ہے دوسری طرف اسی غلامی کے نتیجے میں ایک آزادی نصیب ہوتی ہے اور جہاں قانون قدرت کی یعنی خدا کے نظاموں کی غلامی ہو وہاں اس کے مقابل پر ضرور آزادی ملتی ہے۔بعینہٖ یہی حال الٰہی مذہبی نظام کا ہے اور خدا تعالیٰ واضح فرماتا ہے کہ دیکھو یہ ہے غلامی ہی مگر دراصل یہ ہر آزادی سے بہتر غلامی ہے۔

چنانچہ آنحضرتﷺ دنیا کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔(مسلم، کتاب الزهد و الرقائق) اب دیکھو خدا کے رسولﷺ نے اس دنیا کو قید خانہ بتا دیا ہے اور مومن کی ساری زندگی قید خانے میں بسر ہوگی اور کافر کے لئے جنت قرار دیا ہے اس کو۔مگر وہ جو مومن بھی ہوں اور آزاد بھی ہوں پھر وہ کس شمار میں آئیں گے۔پس مومن کے ساتھ نظام جماعت کی قید و بند ایک لازمہ ہے اس کے بغیر آپ آنحضرتﷺ کی بیان کردہ مومن کی تعریف میں داخل ہی نہیں ہوتے لیکن ایک دفعہ داخل ہو جائیں وہ پابندیاں قبول کر لیں تو آپ کا روحانی بدن اتنا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے، اتنے مزے کی زندگی بسر ہوتی ہے کہ کسی قسم کی عقوبت کا خوف نہیں رہتا، کچھ چھپانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً میں ایک یہ بھی مضمون ہے کہ جو کچھ چھپاتے ہیں وہ ظاہر بھی کر سکتے ہیں۔جو ظاہر کر سکتے ہیں وہ چھپا بھی سکتے ہیں۔وہ وقت اور محل کی بات ہے ورنہ اپنی ذات میں جوان کا سِرًّا ہے اگر ظاہر ہو تو ان کے لئے ایک بے حیائی اور شرمندگی کا موجب نہیں بن سکتا۔وہ جب چاہیں اسے ظاہر کریں وہ ظاہر ہوگا تو حسن میں اضافہ ہی کرے گا، اس میں کمی نہیں لائے گا۔پس عجیب و غریب ایک یہ بظاہر متضاد مضمون ہے مگر ہے بالکل سچا کہ جو دنیا کا غلام ہے اس کا اپنا کچھ بھی نہیں۔وہ ہر چیز سے عاری ہے اور حقیقت میں اس کے باوجود وہ آزاد محسوس کرتا ہے اپنے آپ کو۔دنیا کا غلام ہونے کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ میں جنت میں ہوں اور امر واقعہ یہ ہے کہ جنت میں نہیں ہوتا اور جو دنیا کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے جو خدا کا غلام بن جاتا ہے اس کے اوپر پابندیاں

تو ہیں لیکن وہ پابندیاں اس کو دکھ نہیں دیتیں کیونکہ وہ پابندیاں نظام قدرت کی پابند ہیں۔ نظام قدرت کی کوئی پابندی آپ کو دکھ نہیں دیتی۔ نظام قدرت آپ کو یہی بتائے گا نا کہ آگ میں اپنے ہاتھ نہ ڈالو، پانی میں ڈوبو نہیں اور زیادہ دیر دھوپ میں نہ بیٹھو۔ اب یہ پابندیاں ہی تو ہیں مگر دیکھو کتنی فائدہ مند پابندیاں ہیں۔ ضرورت سے زیادہ نہ جاگنا اور جو بدنی عیش کی خدا نے تمہیں طاقت بخشی ہے وہ توفیق کے مطابق رکھنا۔ جہاں زیادتی کرو گے وہاں سب کچھ گنوا بیٹھو گے۔ تو یہ پابندیاں ہیں جن کے اندر آزادیاں مضمر ہیں۔

پس آپ اگر نظام جماعت کے ساتھ عدل کریں گے اور اس عدل کے تمام باریک تقاضے پورے کریں گے تو آپ کو آزادی کے سانس نصیب ہوں گے۔ آپ کو چین اور گہری طمانیت کے سانس نصیب ہوں گے۔ پس اس پہلو سے آپ نظام جماعت کی حفاظت پر مستعد ہوں اور اس کے سامنے سر جھکائیں کیونکہ یہ خدا کے سامنے سر جھکانا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں نظام کیا چیز ہے یونہی خواہ مخواہ بنایا ہوا ہے نظام۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نظام خدا تعالیٰ کا قائم کردہ ہے، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا قائم کردہ ہے اور یہ جو بیعت ہے نظام کی خاطر کی جاتی ہے۔ ورنہ آنحضرت ﷺ کو ماننے والے جو آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر کے بیٹھے تھے انہیں ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بیعت میں جو اطاعت کا اقرار ہے اور پھر اس پر اصرار ہے اور بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم ضرور اطاعت کریں گے یہ صاف بتا رہا ہے کہ محض دین عقائد کا نام نہیں ہے یا شریعت کے عام فرائض کو پورا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ جو شخص با قاعدہ نظام کا جزو بن کر اس کے سامنے سر نہیں جھکاتا وہ عملاً دین سے باہر رہتا ہے۔

پس آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا، قرآن کو سچا سمجھنا اپنی جگہ الگ مضمون تھا اور آپؐ کی بیعت میں داخل ہونا ایک الگ مضمون تھا۔ پھر آپؐ کے وصال کے بعد وہ بیعت کام نہیں آئی حالانکہ محمد رسول اللہ ﷺ سے کی ہوئی بیعت سے بڑھ کر اور کون سی بیعت ہو سکتی تھی۔ ہر شخص کو مجبور کر دیا گیا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرے اور جب آپؓ کا وصال ہوا تو حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت پر مجبور کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کا وصال ہوا تو عثمانؓ کے ہاتھ پر۔ آپؓ کا وصال ہوا تو حضرت علیؓ کے ہاتھ پر۔ رضوان اللہ علیہم۔ وہ لوگ جب نظام کا نمائندہ بنے ہیں تو ان کے سامنے تمام مسلمانوں

کی جماعت کو سر جھکانے پر مجبور کیا گیا ہے۔ یہ نظام ہے جس کی غلامی میں آنا آپ کے لئے آزادی کا پیغام ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کا آغاز ہی فرشتوں کو اس حکم سے ہوا تھا جب میں آدم کو ٹھیک ٹھاک کرلوں، جب میں اس میں روح پھونک دوں تو سجدہ کر دینا۔ اب لفظ سجدہ بڑا بھاری لفظ ہے۔ بہت سے علماء کو مصیبت پڑی ہوئی ہے یہ مسئلہ حل کرنے میں کہ سجدہ غیر اللہ کو اور حکم اللہ دے رہا ہے۔ اگر کسی اور کا حکم ہوتا تو وہ کہہ بھی دیتے کہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اللہ حکم دے رہا ہے کہ اے فرشتو! جو بظاہر دنیا کی سب سے بلند مخلوق ہو جب آدم کو میں برابر کرلوں۔ اب دیکھیں ''سوی'' کا جو مضمون ہے وہ عدل کا ہے۔ تو جب آپ قرآن کریم کی سچی تفسیر کرتے ہیں تو ہر آیت اس کی تائید میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے ایک مضمون دوسری آیتوں کو دعوت دے کے بلاتا ہے کہ آؤ میرے حق میں گواہی دو۔

پس عدل وہ ''سوی'' کا مضمون ہے جس کے بعد آسمان سے امر اترتا ہے اور عدل کے بغیر کسی کو مامور بنایا جا ہی نہیں سکتا کیونکہ عدل اور ماموریت کا ایک ازلی تعلق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ یہ آدم ہے جب اس کے اخلاق درست ہو جائیں، جب اس کے اندر توازن پیدا ہو جائے، جب اس کا بدن درست ہو جائے، جب اس کی روح درست ہو جائے، اس کا مزاج درست ہو جائے پھر میں اس میں اپنی روح پھونکوں گا۔ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ (الحجر:30)۔ جب میں اپنی روح پھونک دوں پھر تمہارا فرض ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ پس لفظ سجدہ پر جو مفسرین کو اور علماء کو مصیبت پڑ گئی ہے کہ یہ خدا نے کیا کر دیا کہ غیر اللہ کے سامنے فرشتوں کو حکم دے دیا کہ سجدہ کریں۔ تو امر واقعہ یہ ہے کہ سجدہ میں جو کامل اطاعت کا مضمون ہے وہ یہاں پیش نظر ہے کیونکہ جو شخص سر ٹیک دیتا ہے زمین پر، جس کے ہاتھ بھی سامنے بندھے ہوئے، جس کے پاؤں بھی ایسی حالت میں ہیں کہ کلیۃً نہتا ہو جاتا ہے، اپنے دفاع کی کچھ بھی طاقت نہیں رکھتا اور وہ فیصلہ کرنے کی بھی کوئی طاقت نہیں رکھتا کیونکہ اس کو کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا سوائے مٹی اور زمین کے، جس مٹی سے وہ نکلا تھا وہی مٹی اس کی آنکھوں کے سامنے ہے اگر انسان ہو تو۔ تو اس سے بڑھ کر بے اختیاری اطاعت کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر خدا نے حکم دیا ہے۔

پس وہ نظام کا قیام ہے جس کی حفاظت حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے اس حد تک فرمائی

کہ فرمایا

”(من أطاعنی فقد أطاع الله ومن عصانی فقد عصی الله
ومن أطاع أمیری فقد أطاعنی ومن عصی أمیری فقد
عصانی) کہ جو میرے امیر کی اطاعت کرے گا اس نے میری اطاعت کی
اور ومن عصی امیری فقد عصانی ومن عصانی فقد عصی الله“

(مسلم کتاب الأمارة ،باب وجوب طاعة الأمراء فی غیر امعصیة و تحریمها فی المعصیة)

جس نے میرے مقرر کردہ امیر کا انکار کیا اس نے میرا انکار کیا ہے، جس نے میرا انکار کیا اس نے خدا کا انکار کر دیا۔ تو اب بتائیں نظام جماعت کی کتنی اہمیت نکلتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی براہ راست اطاعت سے باہر جانے کا تو کوئی مومن تصور بھی نہیں کر سکتا ہے اور حیرت انگیز اس تشریح میں رفعت بھی ہے اور انکساری بھی ہے۔ فرمایا کہ میری خاطر بیعت نہ کرنا، میری اطاعت نہ کرنا۔ میں تو کچھ بھی نہیں اگر خدا میرا نہ ہو۔ اگر خدا کا امر مجھ پر نازل نہ ہو تو میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پس جس کو میں امیر مقرر کرتا ہوں اس کی حیثیت بھی نہ دیکھنا اس کی تو حیثیت بنتی اس بات سے ہے کہ میں اسے کچھ کہتا ہوں۔ ویسی ہی بات ہے جیسے غالب کہتا ہے۔

ہوا ہے شہہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(دیوان غالب:279)

کہ بادشاہ کا مصاحب ہو گیا، بادشاہ نے اس کو عظمت بخشی، اس پر رحم کیا، اسے اپنے قریب آنے کی توفیق دی تو دیکھو گلیوں میں بھی بڑے اتراتے ہوئے پھرتا ہے اور بڑی شان سے قدم اٹھاتا ہے کہ میں بادشاہ کے پاس سے ہو کر آیا ہوں۔ ورنہ غالب کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔ کوئی عزت نہیں، کچھ بھی نہیں تو نبی کی عزت خدا کی مصاحبت سے پیدا ہوتی ہے اور اگر چہ وہ اتراتا تو نہیں پھرتا مگر دل میں جانتا ہے کہ خدا کے قرب کی وجہ سے اس نے سب عزتیں پائی ہیں۔ پھر جب وہ کسی کو اپنا نمائندہ بنائے تو اس کو بھی کچھ ملتا ہے اس کی اطاعت میں، اس کی غلامی میں، اس کی مصاحبت کے نتیجے میں ہی ملتا ہے ورنہ اپنی ذات میں تو کوئی آبرو نہیں۔

پس وہ لوگ جو امراء سے بدتمیزیاں کرتے ہیں، جو امراء کے خلاف سر اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کیا امیر ہے۔ اس نے فلاں بات کی، فلاں بات غلط ہوئی، فلاں بات غلط ہوگئی، اس کی بات سن لی، اس کی نہیں سنی، ان لوگوں کو مذہب کی الف ب کا بھی نہیں پتا اور یہ عدل کا فقدان ہے نظام جماعت سے جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کر رہا ہوں اور ہالینڈ میں خصوصیت سے اس کی ضرورت ہے یا ضرورت تھی اور خدا کرے کہ اب نہ رہی ہو اور اسی طرح ڈنمارک کی بات ہے وہاں میں نے ابھی ایک وفد بھیجا تھا۔ وہ ملک بھی بیمار ہے کئی پہلو سے اور بیماری کی جو بنیاد ہے اصلی آخری نقطہ یہی ہے کہ جو بھی امیر مقرر کیا جائے اس کے نقص نکالتے اس سے بدتمیزی کرتے ہیں اور ایک کے بعد دوسرے کو استعمال کر لیا جائے لیکن ان کے چال چلن میں کوئی فرق نہیں۔ بوڑھے کو کیا، تب اس کی عزت نہ کی، جوان کو کیا، تب اس کی عزت نہ کی، صاحب علم کو کیا، تب اس کی عزت نہ کی ایک عام آدمی مگر منکسر مزاج کو مقرر کیا تو تب بھی اس کی عزت نہ کی۔ تو اگر ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دین پر قائم ہیں اور نظام جماعت کیا چیز ہے، معمولی سی حیثیت ہے، ہم اس کا اگر نوٹس بھی نہ لیں، اس کو کسی خاطر میں نہ لے کے آئیں تو ہماری احمدیت تو اپنی جگہ ہے۔ ہم چندے بھی دیتے ہیں، ہم نماز بھی پڑھتے ہیں، ہم نے خلیفہ وقت کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی ہے ہمیں اور کیا ضرورت ہے۔ یہ امیر اس کی کیا حیثیت ہے، یہ تو جاہل آدمی ہے۔ کبھی اس کی سنتا ہے، کبھی اس کی سنتا ہے، ہماری بات تو سنتا ہی نہیں۔ اس قسم کے نفس کے بہانے ہیں جو انسان کو طرح طرح کے دھوکے دیتے ہیں اور ایسا شخص عدل سے گر جاتا ہے۔

عدل کا یہی تقاضا ہے کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ نے جو حق جس کو دیا ہے اس کا حق سمجھو اور اس کے سامنے پوری محبت سے جھکو۔ اب اس کی ایک اور مثال ہے کہ دیکھیں ماں باپ کے متعلق فرمایا کہ اگر بوڑھے ہو جائیں تو ان کے سامنے اف بھی نہیں کرنی۔ اف نہ کرنے کا مطلب صاف ہے کہ انہوں نے کوئی زیادتی کی ہے، کوئی سختی کر بیٹھے ہیں۔ یا روزمرّہ کی عادتیں ایسی ہیں جو تنگ کرتی ہیں۔ تو فرمایا ان کے سامنے اف بھی نہ کرنا اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کے متعلق فرمایا کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ، رشتہ داروں، عزیزوں سب سے زیادہ پیارا یہ وجود نہیں ہے اس کو ایمان کا پتا ہی کچھ نہیں۔ جس کے دل میں سب سے زیادہ قدر محمد رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہے وہ جانتا ہی نہیں کہ ایمان کیا

ہوتا ہے۔تو دیکھو نظام کا نمائندہ چونکہ خدا کے نظام کے آپ نمائندہ ہیں آپ کا یہ مقام اور مرتبہ اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے۔پس زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے نا کہ ایک امیر نے جو درجہ بدرجہ، سلسلہ بہ سلسلہ آخر حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ ہی کا تو نمائندہ ہے ورنہ اس کی امارت کی کچھ بھی حیثیت نہیں ہے۔اگر یہ سلسلہ وہاں سے شروع نہ ہوتا تو نہ خلیفہ کی کوئی اہمیت، نہ امیر کی کوئی اہمیت، نہ کسی عہدیدار کی سب بے معنی مٹی کے مادھو بن جاتے کیونکہ ان میں امر نہ رہتا۔ان میں وہ روح نہ پھونکی جاتی جو آسمان سے اترتی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے وسیلے سے پھر آگے نظام جماعت کے کل پرزوں کو نصیب ہوتی ہے۔

پس اس پہلو سے یاد رکھیں کہ وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کی نمائندگی میں آپ پر مقرر ہے اگر وہ زیادتی بھی کرتا ہے تو یہ کیوں نہیں یاد کرتے کہ ماں باپ کے متعلق تو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے اف بھی نہیں کرنی۔تو اگر یہ زیادتی کرتا ہے تو اس کی شکایت کا ہمیں حق ہے لیکن بدتمیزی کا کیا حق ہے۔اف نہ کرنے کا کم سے کم اتنا مطلب تو لیں کہ اس کے سامنے آواز اونچی نہ کریں۔ادب اور پیار کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کریں کہ دیکھیں آپ نے مجھ پہ زیادتی کی ہے اور اگر وہ نہیں مانتا تو پھر جیسا کہ نظام جماعت آپ کو اجازت دیتا ہے آپ اس کی شکایت بالا افسروں تک کر سکتے ہیں اور پھر سارا نظام عدل پر مبنی ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کی شکایت کا ازالہ ہو اگر وہ عدل کے اوپر مبنی شکایت تھی۔

لیکن دوسری ناانصافی پھر یہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ جس کو بھیجا جائے اگر اس کا فیصلہ کسی ایک کے خلاف ہو اور کسی دوسرے کے حق میں ہو تو ہمیشہ بلا استثناء یہ چٹھی لکھتے ہیں کہ آپ کے نمائندوں نے عدل سے کام نہیں لیا، انصاف سے کام نہیں لیا اور بعض ایسی جماعتیں ہیں دنیا میں جہاں تیس تیس، چالیس چالیس سال سے یہی جھگڑا چلا آرہا ہے۔وہ ناسور ایسا ان کے اندر داخل ہوا ہے کہ کینسر بن کے سارے بدن میں پھیل گیا ہے۔کبھی آج تک ایسا نہیں ہوا میں پرانی یاد سے جب میرا خلافت سے ایک محض غلامی کا، اب بھی غلامی کا تعلق ہے مگر اور رنگ کا ہے، پہلے بھی غلامی کا تعلق تھا۔اس وقت وقف جدید کی حیثیت سے یا خدام الاحمدیہ کی حیثیت سے میں جماعتوں کے دورے کرتا تھا اور ان جماعتوں کو دیکھتا تھا، جانتا ہوں، ابھی بھی جانتا ہوں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ہر کوشش آپ نظام جماعت کر دیکھے۔ایسے لوگوں کو بھی چنے جو ان کے نمائندے ہوں۔ان سے کہا جائے کہ جناب

اب آپ اپنا نمائندہ مقرر کریں اور وہ ان کے خلاف فیصلہ دے تو کہتے ہیں دیکھا ناانصافی کر گیا ہے یہ شخص۔ فلاں کی روٹی کھا گیا تھا، فلاں نے اس وقت ایک دفعہ اس پر یہ احسان کیا تھا۔ کم عقل آدمی ہے ہماری پوری بات سنی نہیں دوسرے کی باتوں میں آ گیا۔

تو وہ لوگ جو یہ عذر رکھتے ہیں کہ نظام عدل نہیں کرتا ان سے بڑا جھوٹا کوئی نہیں کیونکہ وہ خود نظام سے عدل نہیں کر رہے کیونکہ نظام سے عدل کا مطلب ہے کہ وہ جب بھی کوئی فیصلہ کرے پھر اس کے سامنے سر جھکاؤ۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ اپنے متعلق فرماتے ہیں اگر میں بھی کسی چرب زبان انسان کی دلیل سن کر اس بات میں مطمئن ہو جاؤں کہ کوئی جائیداد اس کی ہے دوسرے کی نہیں تو اگر وہ اسے لے لے گا تو آگ کا ٹکڑا ہے جو وہ قبول کرے گا اور آگ کا ٹکڑا ہے جو وہ کھائے گا۔ اس لئے اسے چاہئے کہ وہ اسے واپس کر دے۔ مگر یہ احتمال ایک کھول دیا، ایک ایسا احتمال کھولا جو عملاً آپ کی ذات میں ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ آنحضرت ﷺ سے زیادہ صاحب فراست اور باریک اور لطیف نظر سے دیکھنے والا کبھی دنیا میں نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ تعریف کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، سب سے زیادہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر صادق آتی ہے۔ اس کے باوجود آپؐ کا یہ کہنا کہ میں بھی غلط فیصلہ کر دوں تو قبول ضرور کرنا ہوگا لیکن از خود پھر غلط فیصلے کو درست کرنے کی خاطر جو حق تمہیں دیا گیا ہے، جب کہ تمہارا حق نہیں تھا، اسے شوق سے خود واپس کرو لیکن تعمیل ضرور ہوگی۔ یہ نکتہ لوگ نہیں سمجھتے یعنی حضور اکرم ﷺ تو غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتے مگر فرماتے ہیں اگر میں بھی کروں۔ حضرت فاطمہؓ سے متعلق چوری کا کوئی دور کا تصور بھی ممکن نہیں مگر فرماتے ہیں کہ میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹوں گا۔ یہ عدل ہے، حیرت انگیز عدل ہے اور انسانی بشری کمزوری کے حق کو اپنی ذات میں تسلیم کرنا دراصل عدل کا تقاضا تھا۔ آپؐ یہ کہہ سکتے تھے کہ میں نبی اللہ ہوں، نبیوں کا سردار ہوں، مجھ سے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ عدل کے خلاف ہوتا کیونکہ آپؐ بشر بھی تھے اور ایک بشر لاعلمی میں بعض دفعہ کوئی بات سن کر ایک غلط نتیجہ نکال بھی سکتا ہے۔ پس عدل کا عجیب مضمون ہے وہ بڑوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے، چھوٹوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے، ہر زندگی کے پہلو پر مختلف بھیس بدل کر آتا ہے مگر اسے پہچاننا ہوگا کیونکہ عدل ہی میں ہماری زندگی ہے اور عدل ہی کے نتیجہ میں پھر امر پیدا ہوتا ہے اور اگر آپ امر سے عدل نہ کریں تو یہ سب سے بڑا گناہ

ہے۔ صاحب امر سے عدل کرنا لازم ہے اور اس عدل کا یہ تقاضا ہے کہ آپ اس کے فیصلے کے سامنے سر جھکائیں اور پھر اگر آپ کا کوئی حق ہے تو یا بالا نظام سے مانگیں یا خدا کے سپرد کر دیں۔

اور وہ لوگ جو سچے دل سے خدا کے قائم کردہ امر کے سامنے سر جھکاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا کبھی کوئی نقصان نہیں ہونے دیتا۔ اگر وہ ایک غلط فیصلے کو غلط سمجھتے ہوئے بھی قبول کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ آسمان سے ان کی کمی پوری کرتا اور اس کثرت سے ان کو نعمتیں عطا فرماتا ہے کہ اگر ان کو شعور ہو تو اس تصور سے بھی وہ شرم سے پانی پانی ہو جائیں کہ ہم اپنے آپ کو بڑا کوئی تیس مار خان سمجھ رہے تھے کہ ہم نے دیکھو عدل کی خاطر ایک غلط فیصلے کو قبول کر لیا۔ معمولی سا ایک قصہ ہے جو دنیا میں ہر روز کرتے ہی ہیں۔ اب دیکھو دین کے معاملے میں کتنے نخرے شروع ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سر دیکھو کتنا بلند ہونے لگتے ہیں۔ عام عدالتوں کے سامنے مجال ہے ان کی یہ بات کہیں کہ تم نے عدل کے خلاف بات کی ہے اس لئے ہم یہ بات نہیں مانیں گے۔ حکومت جوتیاں مار کے ان سے بات منوائے گی۔ مگر چونکہ خدا کی جوتی دکھائی نہیں دیتی اس لئے چھوٹی سی بات کے اوپر سر اٹھاتے اور زبانیں دراز کرتے اور کہتے ہیں دیکھو امیر نے عدل نہیں کیا اس لئے ہم بکلی آزاد ہیں۔ ہم پابند نہیں ہیں کہ اس کی بات کو مانیں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ کی سوٹی یا اللہ کی جوتی دکھائی نہ بھی دے تو موجود ضرور ہے اور وہ ضرور گرتی ہے اور ضرور سرکوبی کرتی ہے ایسے باغیوں کی جو خدا کے قائم کردہ اس کے ایسے نمائندوں کو جو اس کی طرف سے صاحب امر بنائے جاتے ہیں ان کو حقیر سمجھتے اور اس کی شان میں گستاخی سے پیش آتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا تو کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے لیکن اس بے چارے نے کیا بگاڑنا ہے جس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی تو حیثیت بنی ہی اس وقت تھی جب اس کو کوئی امارت سونپی گئی۔ اس سے پہلے عام شہری آپ کی طرح چلتا پھرتا تھا اس کو کسی کو کچھ کہنے کا اختیار ہی نہیں تھا۔ تو جس نے سب کچھ خدا کی خاطر قبول کیا ذمہ داری کے لئے اور دراصل امر ایک مصیبت ہے۔ امر ان معنوں میں مصیبت ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری آپڑی ہے بیٹھے بٹھائے ایک انسان کے اوپر کہ اس کے مقابل پر جو بے امر کا روزمرّہ پھرنا ہے وہ بہت زیادہ آسان اور دلکش دکھائی دیتا ہے لیکن یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امر آ گیا ہے اچھا جی بڑا ہی اونچا چڑھ گیا ہے یہ شخص، ہم پر حکومتیں جتانے لگا ہے، ہمیں حکم دیتا ہے۔ حالانکہ اس بے

چارے غریب کے دل کا یہ حال ہوگا کہ اسے یہ بھی مصیبت ہوگی کہ کسی بھائی کو کسی معاملے میں مجبور کرے اور خدا کے نام پر اس سے تعاون کی درخواست کرے۔تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ آپ لوگ نظام جماعت سے عدل سیکھیں اور عدل کے مضمون پر غور کرتے رہیں ۔ابھی تو میں نے آپ کو ہزارواں حصہ بھی وہ نہیں بتایا جو خدا تعالیٰ نے مجھے عدل کے مضمون کے اوپر نظر ڈالنے کی توفیق بخشی ہے۔زندگی کے ہر شعبے پر گہری نظر ڈال کر آپ کو عدل کے ایسے لطیف مظاہر دکھائی دیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان خدا کی عظمت کے سامنے ورطۂ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔

پس آپ بھی ان باتوں پر غور کیا کریں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے عدل کے مضمون کو جتنا سمجھیں گے، جتنا اس کا عرفان ہوگا اتنا ہی آپ کو عدل کرنے کی توفیق ملے گی۔ورنہ موٹا موٹا عدل ہے جو آپ کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جوں جوں انسان ترقی کرتا ہے موٹے عدل کا مضمون پیچھے نیچے رہ جاتا ہے۔اوپر کی ترقی باریک عدل کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے ۔درجے وہیں کھڑے ہو جائیں گے جہاں موٹے عدل کا مقام آ گیا ہے اور باقی ساری ترقیاں باریک عدل کے تقاضوں کے پورا کرنے سے آتی ہیں ۔پس خدا کے قرب کے مزے لوٹنے ہیں ،روحانی لذّتیں حاصل کرنی ہیں، بلند فضاؤں میں اڑنا ہے تو عدل کو اختیار کریں لیکن عدل کو سمجھیں گے تو اختیار کریں گے۔اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے اور آپ کے حوالہ سے میں دنیا کی تمام جماعتوں کو بھی اس مضمون کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ایک دو جماعتوں کے میں نے نام لئے ہیں مجبوراً کیونکہ بعض کی طرف سے بہت دیر سے تلخیاں پہنچ رہی ہیں۔صرف ان کو سمجھانے کے لئے کہ اب خدا کا خوف کرو ورنہ پھر نظام عدل تم سے کچھ اور سلوک کرے گا اور باقی اور بھی ہیں جن کا نام نہیں لیا گیا مگر میں جانتا ہوں۔مختلف ملکوں میں کئی ایسے گڑھ ہوتے ہیں جہاں ایک دو یا چند بیمار ایک بیماری کی گھٹلی بنا لیتے ہیں۔اردگرد کا بدن صحت مند بھی ہو تو وہ گھٹلی اکیلی ہی اس کو کمزور کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ہر وقت زہر اس گھٹلی سے گھل گھل کر سارے بدن کو دکھوں میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔پس یہ میں نہیں کہتا کہ جن جماعتوں کا میں نے حوالہ دیا ہے ان میں سارے ہی بیمار ہیں مگر یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ گھٹلیاں ضرور ہیں اور ساری گھٹلیاں ظلم کی گھٹلیاں ہیں،عدل کے فقدان کی گھٹلیاں ہیں،تکبر کی گھٹلیاں ہیں۔یا تو ان کو کچل کے باہر نکال کے پھینکا جائے یا ان کو کاٹ کر باہر پھینکا

جائے یا پھر وہ سارے بدن میں زہر سرایت کر گیا ہے تو اس کا علاج تو پھر یہی ہے کہ اس سارے بدن سے قطع تعلقی اختیار کر لی جائے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ مگر میں امید رکھتا ہوں کہ جو فکر کرنے والے لوگ ہیں اس مضمون کے اوپر غور کریں گے اور نظام جماعت کی پابندی خدا کی خاطر اس کی رضا کے لئے، نہ کہ بندوں کے منہ دیکھ کر کریں گے۔ اگر ایسا کریں گے تو خدا تعالیٰ آپ پر بے شمار برکتیں نازل فرمائے گا اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، انفرادی طور پر بھی اور جماعتی طور پر بھی۔ پس نظام عدل ہی سے ہماری زندگی اور ہماری ترقیاں وابستہ ہیں۔ اللہ ہمیں اس کو قائم رکھنے اور اس کی وفا کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اپنی تبلیغ میں وہ کردار پیدا کریں جس کردار کو آپ الٰہی صفات کی جھلک قرار دے سکتے ہیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 7/جون 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ (حٰمٓ سجدہ:34)

پھر فرمایا:

اوراس شخص کے قول سے زیادہ خوب صورت کس کا قول ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف بلائے مگر شرط یہ ہے کہ خود نیک اعمال بجالانے والا ہو اچھے اعمال کے نمونے دنیا کے سامنے پیش کرے پھر یہ کہے وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اور کہے میں تو مسلمان ہوں، مسلمانوں میں سے ہوں۔

یہ وہ آیت کریمہ ہے جس کے متعلق میں نے ہالینڈ کی جماعت کے سالانہ اجلاس سے خطاب کیا تھا اور یہ وہ آیت کریمہ ہے جس کے پہلو لامتناہی ہیں، جو ختم ہوتے ہی نہیں۔اس پر آپ جتنا غور کرتے چلے جائیں آپ کو مزید اس کے گہرے راز دکھائی دینے لگتے ہیں اور وہ موتیوں کی طرح چمکتے ہیں اور ماحول کو روشن کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور اس آیت کا تعلق ہی ماحول کو روشن کرنے سے ہے۔دعوت الی اللہ کے مقاصد بھی بیان ہوئے ،اس کے طریق بھی بیان ہوئے ،اس کے سربستہ راز بھی اس میں کھولے گئے اور ہر اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کی ایک داعی الی اللہ کو ضرورت پیش آتی ہے۔آج کل چونکہ دعوت الی اللہ کا کام دنیا میں زوروں پر ہے کیونکہ اس دعوت کا نتیجہ ہمارے جلسہ سالانہ UK کے اختتامی دن میں نکلتا ہے اور پچھلے کچھ عرصے سے یہ روایات بن

رہی ہیں کہ جتنے بھی تمام نئی بیعت کر کے جماعت میں داخل ہوتے ہیں ان کو اس آخری روز یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ ٹیلی ویژن کے ذریعے عالمی بیعت میں شامل ہو جائیں اور یہ درست ہے کہ سب کے لئے تو ناممکن ہے مگر ان کے نمائندے ضرور دنیا کی ہر قوم میں سے، ہر ملک میں سے، ہر فرقے میں سے نمائندگی کے ذریعے بیعت کرتے ہیں اور یہ بیعت واقعۃً کل عالم میں ہو رہی ہوتی ہے اور ان کی اپنی اپنی زبان میں ہو رہی ہوتی ہے۔

پس یہ ایک ایسا خوب صورت نظارہ ہے اور ایسا روح پرور نظارہ ہے جس کی مثال اس سے پہلے سوائے بائبل کی پیشگوئی کے اور کسی جگہ دکھائی نہیں دیتی۔ عہد نامہ جدید میں پیش گوئی کے رنگ میں تو یہ بات بتائی گئی تھی مگر واقعۃً جو بات بیان کی گئی وہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں کبھی رونما نہیں ہوئی اس لئے آئندہ مسیح کے متعلق پیشگوئی تھی اور اس کو چونکہ پیشگوئی سے تصدیق حاصل ہے اس لئے اس سنت کو کوئی بدسنت قرار نہیں دے سکتا۔ ایک ایسی سنت حسنہ ہے جس کی دو ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے بنیاد رکھی تھی اور پیشگوئی کے ذریعے اس پر صاد فرمایا تھا کہ ایک بہت عظیم واقعہ ہونے والا ہے کہ بے شمار زبانیں بولی جائیں گی، بے شمار زبانوں میں خدا کی تسبیح و تحمید کی جائے گی اور لوگوں کو یہ عجیب دکھائی دے گا کہ وہ زبانیں جو وہ جانتے نہیں ہیں وہ کچھ نہ کچھ پیغام کسی نہ کسی سننے والے کو ضرور دے رہی ہیں یعنی سننے والے کے اگر وہ اردو جانتا ہے تو اردو میں تو پیغام مل رہا ہے باقی شور سنائی دیتا ہے۔ اگر وہ انگریزی جانتا ہے تو اردو بھی شور میں شامل ہو جاتی ہے اسے صرف انگریزی کی سمجھ آتی ہے۔ اگر وہ کوئی غانین زبان جانتا ہے تو وہی معنی خیز آواز بن کر اس کے کانوں میں پڑتی ہے باقی سب زبانیں انگریزی اردو ہر چیز محض ایک شور بن جاتی ہے۔ تو یہ جو واقعہ ہے یہ الٰہی تائید یافتہ واقعہ ہے۔ اس لئے یہ جب جلسے کے دن قریب آتے ہیں تو میں جماعت کو یاد دہانی کراتا ہوں کہ امسال پھر کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جو جماعت کو اس سے پہلے چند سالوں میں توفیق بخشی ہے کہ ہر سال عالمی بیعت کی تعداد دگنی ہو رہی ہے تو خدا تعالیٰ امسال بھی اسے دگنا کر دے۔ مگر جب دگنا کرے تو اس کے تقاضے بھی ہیں جو پورے کرنے پڑتے ہیں اس لئے گزشتہ سال چونکہ ایک ایسی جگہ تعداد پہنچ چکی تھی جہاں دگنے کے تصور سے جہاں لطف آتا تھا وہاں خوف بھی پیدا ہوتا تھا۔ اس لئے میں نے جماعت سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ یہ دعا کریں کہ اے اللہ اگر یہ دگنا پھل ہمیں سنبھالنے کی توفیق

ملنی ہے تو پھر دگنا کر دے ورنہ پھر ہماری توفیق بڑھا۔ جب تک توفیق نہ بڑھائے پھل سمیٹنے کی طاقت ہی انسان کو نہیں ہوسکتی ۔اس لئے پھل پیدا کرنا تو اس کا کام ہے ۔پھل سمیٹنے کی توفیق تو ہماری توفیق ہے ۔ جب تک ہمیں عطا نہیں کرے گا اس وقت تک ہم ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتے جو آنے والے مہمانوں کی ذمہ داریاں ہیں ۔

پس یہ جلسہ جو آنے والا ہے یہ کچھ مہمان تو لے کے آئے گا، کچھ کل عالم میں آنے والے خدا کے مہمان ہیں جو اس پہلو سے عزت کے لائق بھی ہیں ،خدمت کے حقوق بھی رکھتے ہیں مگر تربیت کے بھی محتاج ہیں اور تربیت کے پہلو سے جماعت احمدیہ پر اس کی اولین ذمہ داری ہے ۔ یہ آیت کریمہ جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس میں یہ تربیت کا راز بھی سکھا دیا گیا۔ فرمایا بات تو بہت خوب صورت ہے کہ خدا کی طرف بلاتے ہو اور ہر بلانے والا جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے خدا ہی کی طرف بلاتا ہے لیکن اس قول کی خوب صورتی تمہارے عمل کے حسن سے تعلق رکھتی ہے ۔ اگر تمہارا کردار حسین ہے تو پھر بلانے والا بھی حسین دکھائی دے گا اور جس طرف بلایا جا رہا ہے وہ بھی حسین دکھائی دے گا اور پھر اس بات میں حسن پیدا ہوتا ہے ۔مگر بلاؤ اس نام پر کہ وہ بہت ہی پیارا اور کامل خدا ہے تمام قدرتوں کا مالک ہے ،سب حسن کا منبع ہے اور تم خود بدیوں کے منبع بنے ہو،تم سے بداخلاق پھوٹ رہے ہیں ،تمہاری ادائیں ناپسندیدہ ہوں،تمہارا معاشرے میں کردار ناپسندیدہ ہو،تمہارا گھر میں کردار ناپسندیدہ ہو،تمہارا دوستوں سے لین دین میں معاملات میں کردار ناپسندیدہ ہو اگر یہ حالت ہے تو خدا کی طرف بلانے کا تمہیں حق بھی کیا پہنچتا ہے اور اگر بلاؤ گے تو ناواقف سمجھیں گے کہ ایسے خدا کا مرید ہے جیسا یہ آپ ہے اور اس خدا میں کس کو دلچسپی پیدا ہوگی ۔ پس لازم ہے کہ تم بلانے کے ساتھ اپنے کردار کو شایانِ شان بناؤ۔ جس ذات کی طرف بلا رہے ہو اس کی کچھ صفات اپنے اندر جلوہ گر کرو اور کوئی سننے والا تمہاری دعوت پر کان نہیں دھرے گا جب تک اس کی آنکھیں تمہاری ذات میں وہ حسن نہیں دیکھتیں جو حسن اس خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے جو کل عالم کا خالق ہے۔

پس یہ وہ مضمون ہے **عَمِلَ صَالِحًا** والا جس کی طرف توجہ دلانا اس لئے بھی مقصود ہے کہ تربیت کے لئے یہ بہت ضروری ہے ۔ دنیا میں تربیت کے لئے قول اور عمل یہ دو ہی چیزیں ہیں جو کام کیا کرتی ہیں ۔مگر ہر وہ قول جو عمل کی تائید سے خالی ہو وہ تربیت میں بھی ناکام رہتا ہے اور تبلیغ میں

بھی نا کام رہتا ہے۔ پس تبلیغ کی کامیابی کا راز بھی جہاں ایسے عمل میں ہے جو خوب صورت قول کی تائید کرنے والا ہے وہاں تربیت کی کامیابی کا راز بھی اس نیک عمل میں ہے جو خوب صورت قول کی تائید کرنے والا ہے۔ یہ جب کرو پھر تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ کہو میں مسلمان ہوں۔ اب اس میں دیکھیں آج کی دنیا کی کتنی خرابیوں کا حل موجود ہے جو عالم اسلام کے راہنماؤں کی طرف سے دنیا میں پھیل رہی ہیں۔ جو مرضی کردار ہو، قتل و غارت کی تعلیم دے رہے ہوں، دنیا کے امن برباد کر رہے ہوں اور بڑے زور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر عمل بد ہوں تو کم سے کم چھپانے ہی کی کوشش کرو۔ حیا کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت اپنے رشتے ظاہر نہ کرو۔ وہ لوگ جو جرموں میں پکڑے جاتے ہیں بسا اوقات اپنے ماں باپ کا نام نہیں بتاتے اگر ان کو علم ہو کہ ماں باپ کی عزت کو خطرہ ہے۔ ان کا بڑا نام جو ہے وہ گلیوں میں رسوا ہو جائے گا تو اس سے آپ لاکھ پوچھیں وہ کہے گا نہیں میں نے کچھ نہیں بتانا۔ جو احمق ہیں وہ ماں باپ کے اونچے نام کی حفاظت میں آنے کی خاطر اپنی بدیوں کے وقت بھی ان کو استعمال کر لیتے ہیں۔

تو دیکھنا یہ ہے کہ تمہاری تبلیغ کیا رنگ رکھتی ہے۔ کیا تم خدا کے نام کے اندر، اس کی حفاظت میں اپنی بدیاں لا رہے ہو اور خدا کا نام لے کر، اس کی طرف دعوت دے کر اپنے اعمال سے دنیا کی نظروں میں پوشیدہ ہو رہے ہو یا دنیا کی نظروں سے اپنے اعمال پوشیدہ کر رہے ہو کہ یہ تو خدا کی طرف بلانے والا ہے یہ تو اچھا ہی ہوگا۔ اگر یہ بات ہے تو یہ منافقت ہے۔ اس کا حقیقت سے سچائی سے اور آپ کے خدا کی طرف دعوت دینے سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے بلکہ ایسے معاملات ہمیشہ دین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لئے تبلیغ کے ساتھ ساتھ یا دعوت الی اللہ کا جو معاملہ ہے۔ دعوت الی اللہ ہی کے ساتھ ساتھ میں کہوں گا، تربیت کے وہ تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے جو آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے جو آنے والوں کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے جن کے نتیجہ میں آنے والے آتے ہیں۔ وہ تقاضے پورے نہ ہوں تو آتے ہی نہیں۔ پس یہ وہ تین پہلو ہیں عَمِلَ صَالِحًا کے جو میں ایک دفعہ پھر اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

وہ تقاضے جو بلانے والے تقاضے ہیں ان میں یاد رکھیں کہ تب تک کسی تبلیغ میں کسی سننے

والے کو دلچسپی پیدا نہیں ہوتی جب تک تبلیغ کرنے والے کی ذات میں دلچسپی پیدا نہ ہو۔ذات میں دلچسپی ضروری ہے اور اگر ایسا کوئی شخص جو بداعمالیوں میں مشہور ہے تو اس کی ذات میں بھی دلچسپی لینے والے ہوں گے اور جو نیکیوں میں شہرت پا جاتا ہے اس کی ذات میں بھی دلچسپی لینے والے ہوتے ہیں لیکن ''کند ہم جنس با ہم جنس پرواز'' ایک تھیلی کے چٹے بٹے ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جایا کرتے ہیں۔پس خدا کی طرف بلانے والے کے لئے اگر وہ خدا کی صفات سے عاری ہے کامیابی سے تبلیغ کرنے کا کوئی بھی امکان نہیں ہے کیونکہ جب تک کوئی شخص خدا کی صفات کسی ذات میں جلوہ گر نہ دیکھے اس کو خدا کی طرف توجہ نہیں ہوسکتی اور اگر صفات کو جلوہ گر دیکھے گا تو وہ لوگ جو بد ہیں وہ اس طرف رخ بھی نہیں کرسکیں گے۔سوائے ان بدوں کے جن کے دلوں میں اس کے حسن کردار کی وجہ سے ایک انقلاب برپا ہو رہا ہے۔پس سب سے پہلے تو تبلیغ Selective ہو جاتی ہے اور یہ بہت ہی اہم کام ہے۔ورنہ لوگ عمل کی تائید کے بغیر جو تبلیغ کرتے ہیں تو اینٹ پتھر روڑے کو بھی تبلیغ کرتے چلے جاتے ہیں اور کہیں اتفاق سے اچھی زمین بھی مل جاتی ہے اور وہ بیج پتھریلی زمینوں پر بھی پھینکتے رہتے ہیں اور عام بیج کو قبول کرنے والی زمینوں پر بھی کبھی کوئی بیج پڑ جاتا ہے۔مگر انہیں تمیز کوئی نہیں ہوتی اور کوئی ذریعہ تمیز ان کو میسر نہیں ہوتا۔اگر ایک احمدی سوسائٹی میں اس طرح مل جل کر رہ رہا ہے کہ اسے کوئی وجہ امتیاز نصیب نہیں ہوئی،اس کے عمل کی خوبی نے اسے اپنی ذات میں ایک Class بنا کر،ایک پہچان بنا کر اسے ابھارا نہیں ہے تو اس کے گرد ہر قسم کے لوگوں کا اجتماع ویسے ہی رہے گا جیسے ہر شخص کے گرد روزمرّہ کے کاموں میں کچھ نہ کچھ لوگوں کا اجتماع ہو ہی جایا کرتا ہے۔دفتر میں جاتا ہے،سکول میں جاتا ہے،کالج میں جاتا ہے جیسا بھی زندگی بسر کر رہا ہے وہ لوگوں میں سے ایک انسان ہے اور نیک و بد ہر قسم کے اس کے گرد موجود رہیں گے۔اب وہ تبلیغ کرے گا تو نیک و بد سب کو ہی کرے گا اور چونکہ اس کی ذات میں نہ نیک کو دلچسپی ہے نہ بد کو دلچسپی ہے اس لئے سارے ہی سنی ان سنی کریں گے اور خصوصیت کے ساتھ جو بد ہیں وہ پھر بسا اوقات ایسے شخص کی کوششوں میں روک ڈالنے کے لئے شرارت بھی شروع کر دیتے ہیں لیکن یہ پہلو وہ ہے جو میں ایک دفعہ پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔پیش نظر یہ ہے کہ اگر ایک انسان کا کردار اچھا ہو اور نمایاں طور پر اچھا ہو تو لازماً معاشرے کے بہترین لوگ اس کے گرد اکٹھے ہونے لگتے ہیں اور وہ لوگ جو عملاً

اصلاح شدہ نہ بھی ہوں مگر دل میں نیکی کا بیج ہے وہ بھی اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ دیکھو گند کی مکھی گند ہی کی طرف جاتی ہے اور شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوستی ہے۔ یہ فطری تقاضے ہیں جوان دونوں کی ان آماجگاہوں کی تفریق کرتے ہیں جہاں انہیں جا کر اترنا ہے اور وہاں سے کچھ پھل یا گندگی کا رس چوسنا ہے۔ تو اس پہلو سے پہلی تفریق تو آپ کے اعمال اس طرح کریں گے کہ آپ کے گرد اگر آپ اچھے ہیں تو اچھے لوگ اکٹھے ہوں گے۔ اگر بد ہیں تو بدلوگ اکٹھے ہوں گے اور بد کے لئے تو تبلیغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب نیک انسان اچھے ماحول میں نیک لوگوں کو تبلیغ کرتا ہے تو اس کے لئے پھل لگنے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ پس ایک نیک عمل کا یہ نتیجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ باوجود نیک ہونے کے لوگوں کو عملاً آج کی دنیا میں خدا میں دلچسپی نہیں رہی اور اس عدم دلچسپی کی وجہ محض ذاتی بدی نہیں ہے نیکوں میں بھی عدم دلچسپی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا ان کے لئے ایسی حقیقت ہے جو دنیا سے دور ہٹ چکا ہے۔ اس کا دنیا کے روزمرہ کاموں سے تعلق نہیں رہا اور تمام مذاہب میں یہ بدبختی آچکی ہے کہ ان کے رہنما عقائد کے لئے تو بھڑتے ہیں اور فرقوں کو فرقوں سے اور مذاہب کو مذاہب سے لڑا دیتے ہیں مگر نیک اعمال کے لئے ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی ،کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا، کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ ایسے فرقے جہاں نیکی پر اس قدر زور ہو کہ اگر کوئی شخص اصلاح نہ کرے تو ایک پورا نظام اس کے ساتھ اس کے اوپر اپنے آپ کو وقف کر دے، اس کا گھیرا لے لے، اس کی برائیاں دور کرنے کی کوشش کرے۔

ایسے فرقے کہاں ہیں سوائے جماعت احمدیہ کے۔ صرف جماعت احمدیہ ہے جہاں یہ ایک نظام کے طور پر کل عالم میں کام ہو رہا ہے کہ بدی کی بیخ کنی کرنی ہے، نیکی کو نافذ اور ثابت کرنا ہے اور نیکی کی نشوونما کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوششیں کرنی ہیں۔ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں ان کے ماننے والے اکیلی اکیلی بھیڑوں کی طرح ہیں جو ایک ہی جنگل میں ملتی ہیں۔ مگر کوئی ان بھیڑوں کا نگہبان نہیں ہے، کوئی گڈریا نہیں ہے جو ان کی حفاظت کرے۔ پس اس پہلو سے لوگوں کے اندر عملاً نیکی اور نیکی کے منبع یعنی خدا تعالیٰ کی ذات میں دلچسپی کم ہوتے ہوتے تقریباً مٹ چکی ہے۔ پس جن لوگوں کو میں نے نیک کے طور پر تعارف کروایا تھا میری مراد عرف عام کی نیکیاں ہیں۔ عرف عام میں نیکیاں طبیعت کا حصہ ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ایسے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں جہاں سلیقے والی مائیں، سلیقے

والے باپ ان کو میسر آتے ہیں، خاندانی روایات ہیں جو بڑی دیر سے بعض اخلاق کی حفاظت کر رہی ہیں اور ان کو خود بخود بڑے ہو کر نیک ہو جانا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں اور نہ ان کے خدا رسیدہ ہونے کی علامت ہے۔ پس نیکیوں میں بھی ضروری نہیں کہ خدا رسیدگی پائی جائے نیکیوں میں بھی ایک ایسی کیفیت پائی جاسکتی ہے جو نیکیاں دنیا کے اتفاقات کے نتیجہ میں معاشرے کے از خود پیدا ہونے والے امن کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور ان کا مذہب اور خدا سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ تو ایسے نیک لوگ بھی آپ کو دکھائی دیں گے جن کو آپ تبلیغ کریں گے تو نیکی کی وجہ سے، مزاج کی ہم آہنگی کی وجہ سے آپ کی طرف آئے تو ہیں لیکن جب آپ تبلیغ کریں گے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہم تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہیں اور تم ہمیں کیا بنالو گے۔ جھوٹ ہم نہیں بولتے، کسی کا مال نہیں کھاتے۔ جہاں تک خدمت کا تعلق ہے بنی نوع انسان کی جو خدمت ہے وہ ہم کرتے ہیں اور اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ تمہارے خلاف بھی جب کوئی بدتمیزی یا غلط بات کرے تو ہم ہمیشہ تمہاری حمایت کرتے ہیں تو اور انسانیت کیا ہے۔ پس یہ سب کچھ ہم میں ہے۔

مگر خدا تعالیٰ نے جو نیکی کی تعریف کی ہے وہ محض عمل تک محدود نہیں رکھی دعوت الی اللہ کو اس میں شامل کر دیا ہے۔ پس نیکی کا ایک اور مضمون اس سے ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص جو خدا سے نیکیاں پاتا ہے اسے تو ایک جنون سا لگ جاتا ہے کہ اتنی حسین ذات ہے اور اتنی دلکشی اس میں پائی جاتی ہے کہ میں نے جو کچھ پایا اس سے پایا ہے، میں لوگوں کو بھی اس کی طرف بلاؤں۔

اب اس مضمون کو سمجھ کر حضرت مسیح موعودؑ کے کلام کی آپ کو سمجھ آئے گی ورنہ اس کا کوئی شعور آپ کو میسر نہیں آسکتا۔ درثمین اردو پڑھیں یا فارسی پڑھیں یا عربی پڑھیں بے اختیار دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ اس قدر بے اختیار ہیں اور نثر میں بھی کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان تڑپ رہا ہے بے چینی سے کہ جو کچھ میں نے پایا ہے میں لوگوں کو کیوں نہ دکھاؤں۔ وہ دوا کہاں سے لاؤں جو کانوں کو شفا بخشے کہ وہ آوازوں کو سن سکیں۔ اس قسم کے غیر معمولی قوت کے جذبے کہ سب کچھ ہم نے خدا سے پایا ہے، ہم اس خدا کو تمام دنیا سے روشناس کرادیں یہ وہ دعوت الی اللہ ہے جو نیک عمل کے ساتھ ملحق ہو جاتی ہے اور چونکہ نیک عمل اللہ کا ممنون احسان ہے، اللہ کے نتیجہ میں ہے اس لئے ایسا نیک عمل کرنے والا ضرور خدا کی طرف بلائے گا اور اس کے اعمال کا اور عام دنیادار کے اعمال کا یہ فرق ہوگا کہ

دنیا دار کی نیکیاں کسی خدا کے تصور کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتیں اور ان کی نیکیاں ان کی ذات کے ساتھ مر جاتی ہیں اور ان میں بقاء اور استحکام کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ایک یہ بھی فرق ہے جس کا تعلق استقرار اور استحکام سے ہے۔

خدا کی طرف سے جو نیکیاں آتی ہیں چونکہ خدا کی ذات کو دوام ہے اور ہمیشگی پائی جاتی ہے اس لئے انسان کی وہ نیکیاں جو خدا سے سیکھتا ہے ان میں بھی ایک دوام ہے اور ایک استقلال پایا جاتا ہے۔ انفرادی ہوں یا قومی ہوں، حالات گردوپیش خواہ کیسے ہی بدلتے رہیں ان کی نیکیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی لیکن وہ قومیں جو دنیا میں نیکیاں دنیا کے اطوار سے سیکھتی ہیں یا اپنی خاندانی روایات سے سیکھتی ہیں ان کی نیکیوں میں کوئی استقلال نہیں ہوا کرتا۔ جب قومی ابتلا آتے ہیں تو ان میں سے سچے سے سچا بھی جھوٹ بولنے لگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے قوم کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہے۔ وہ جو عام دنیا میں روزمرّہ کے کاموں میں کسی شخص کو دھوکہ نہیں دیتا جب قوم کی کسی مسند پر براجمان ہو اور باقی دنیا کے ساتھ معاملات میں دھوکے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا دھوکہ نہ دینا قوم سے دھوکہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ غیر قوموں کو دھوکہ نہیں دیتا تو اس کی قوم اسے دھوکے باز کہے گی کہ اس نے قوم کے حقوق کو جیسا کہ ادا کرنے کا حق تھا ادا نہیں کیا۔ تو ساری تعریفیں بدل جاتی ہیں اور نیکی کے ساتھ استقلال کا کوئی جوڑ دکھائی نہیں دیتا۔ صرف ایک ذات ہے جس سے پیدا شدہ نیکی میں استقلال اس شان کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ کائنات الٹ پلٹ جائے تب بھی نیکی کی تعلیم وہی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اس کی بہترین مثال ہیں۔ ان کی نیکیاں وقت سے آزاد ہیں اور حالات سے بالا ہوتی ہیں۔ وہ امن کے حالات ہوں یا جنگ کے حالات ہوں ان کی سچائی ہمیشہ سچائی رہے گی۔ سچائی ان کے خلاف جائے گی تب بھی سچ ہی بولیں گے اور یہ خدائی نیکی کی پہچان ہے اس لئے تبلیغ کے دوران ایسے لوگوں سے جب آپ گفتگو کرتے ہیں جو نیک مزاج کی وجہ سے آپ کے گرد اکٹھے ہوئے ہیں تو آپ کو یہ فرق ان کو دکھانا ہوگا۔ ورنہ ان کو خدا میں کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوگی۔ ان کو بتانا ہوگا کہ تمہارے اور میرے درمیان یا تمہارے اور خدا والوں کے درمیان ایک فرق ہے اور بڑا نمایاں فرق ہے اور جب تک وہ فرق پیدا نہ ہو کسی انسان کی نیکی، کسی معاشرے کی نیکی بھی بنی نوع انسان کو بچانے کے کام نہیں آسکتی۔

پس دیکھئے انبیاءؑ کا آغاز ہی ایک ایسی نیکی سے ہے جس کے ساتھ جتنا تعلق جوڑیں ان کے خلاف جاتی ہے۔ سچائی کا اعلان کرتے ہیں۔ توحید کامل کا اعلان کرتے ہیں اور یہ نیکی کا اعلان ہی ہمارے لئے ابتلاء کا موجب بن جاتا ہے۔ جس نے سچائی کی خاطر ہر مصیبت سہیڑ لی اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی نیکی عارضی تھی اور وقت بدلنے کے ساتھ بدل سکتی تھی اور یہی انبیاءؑ کی اپنی صداقت کا ایک ثبوت ہے اور خدا کی ہستی کا ثبوت ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی ہستی کو ثابت کرنے کے لئے ایک نیک وجود کا ہونا ضروری ہے۔ انبیاءؑ کے بغیر کوئی دنیا کی دلیل خدا تعالیٰ کی ہستی کو اس طرح لوگوں کے دلوں میں جانشین نہیں کر سکتی یعنی حقیقت کے طور پر جانشین نہیں کر سکتی کہ جو ان کے اعمال اور اخلاق کی کایا پلٹ دیں۔ یہ ایمان جو خدا کی ذات پر پیدا ہوتا ہے اس کے لئے ثبوت ضروری ہے اسی لئے خدا تعالیٰ نے حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ قرار دیا ہے اور ہر شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا کا قائل ہوں اور وسیلے کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے، جھوٹا ہے کیونکہ سچے خدا کا یقینِ کامل اسی ہستی کے ذریعے ممکن ہے جس کی سچائی کو بار بار زلزلے درپیش آئے ہوں، ہر قسم کے جھٹکے ملے ہوں اور وہ سچائی یوں لگے جیسے ان کی جان لے کر رہے گی اور وہ جان دینے پر آمادہ رہے مگر سچائی کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ وہ سچائی اگر آسمان سے تعلق رکھتی ہے تو آسمان بھی ایک حقیقت بن کے آپ کو دکھائی دینے لگے گا اگر اخروی دنیا سے تعلق رکھتی ہے تو اخروی دنیا بھی ایک حقیقت بن کے آپ کو دکھائی دینے لگے گی۔ انہی معنوں میں شہید کو شہید کہا جاتا ہے۔ گواہی وہ جس میں غائب کی خاطر حاضر کو قربان کر دیا جائے۔ اس سے بڑی قوی گواہی اور ممکن ہی نہیں ہے۔ ورنہ تمام دنیا کا تجربہ یہ ہے اور دنیا کی حکمتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو ہاتھ میں آجائے وہی حق ہے اور جو ہاتھ میں نہیں ہے اس کی خاطر خواہ وہ ہزار بھی ہو ہاتھ میں آئے ہوئے ایک کو بھی نہیں چھوڑو کیونکہ جو موجود ہے وہ غیر موجود کے لئے قربان نہیں کیا جا سکتا اور اگر کیا جاتا ہے تو یا تو وہ شخص سب سے بڑا پاگل ہے یا وہ شخص سب سے زیادہ سچا ہے۔ اس نے کچھ ایسی بات دیکھ لی ہے جس کے نتیجہ میں موجود کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ غیر موجود زیادہ یقینی ہے اور ان معنوں میں زیادہ یقینی ہے کہ موجود کے اوپر تو کبھی بھی موت وارد ہو سکتی ہے اور ہونی ضروری ہے لیکن وہ دنیا جو لامحدود ہے وہ غیر فانی ہے۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ اس فانی کیفیت کو جو مجھے نصیب ہے اس لافانی کیفیت پر قربان کرنا عقل اور میرے ذاتی منافع کا طبعی تقاضا ہے۔ پس جسے

لوگ بے غرضی سمجھتے ہیں وہ حقیقت کی دنیا میں سب سے بڑی خودغرضی یعنی معقول خودغرضی ہے۔ایک شخص کو جہاں فیصلہ کرنا ہو کہ یہ ایک لاکھ کی رقم وصول کرنی ہے یا ایک روپیہ لینا ہے تو ظاہر بات ہے اگر اسے واقعۃً دکھائی دے رہا ہے ایک لاکھ تو ایک لاکھ ہی لے گا روپے کو چھوڑ دے گا مگر روپیہ اس کی جیب میں ہے تو جیب سے نکال کر پھینکنا ہوگا یہ شرط ہے پھر وہ لاکھ بھی ملے گا۔لیکن اگر لاکھ دکھائی نہ دے رہا ہو اور لوگوں کو بھی دکھائی نہ دے رہا ہو اور ایک شخص ایک چھوڑ کر ہزار بھی پھینک دیتا ہے جیب سے نکال کے تو اس سے بڑا یقینی گواہ اس لاکھ کے حق میں میسر نہیں آسکتا۔عدم ہونے کے باوجود اتنا حقیقی ہو گیا کہ جو موجود چیزیں تھیں وہ اس کی خاطر قربان کر دی گئیں۔

پس انبیاءؑ کی امتیں جب اخروی دنیا کی شہادت اس طرح دیتی ہیں کہ وہ زندگی جو ہاتھ میں ہے جو رگوں میں دوڑ رہی ہے اسے اس یقین پر کہ ہم نے لازماً زندہ ہونا ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ ہونا ہے اس طرح نکال کر پھینک دیتے ہیں جیسے کوئی گلی سڑی چیز کو اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو شہید کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اخروی دنیا کو دیکھ لیا ہے اور ان کی گواہی قابل قبول ہوگی ۔اب دیکھیں نبی نے بھی جو کچھ قربان کیا ہے وہ ایک غیر مرئی ذات کی خاطر کیا ہے اور وہ لوگ جو اس سے مقابلہ کر رہے ہیں وہ دیکھی ہوئی چیزوں کو اور دیکھی جانے والی چیزوں کو اس غیر مرئی چیز پہ ترجیح دیتے ہیں۔سورج کی عبادت کرنے والے ہیں، چاند کی عبادت کرنے والے ہیں، دنیا کے بتوں اور دنیا کے بڑے بڑے طاقتور انسانوں کی عبادت کرنے والے ہیں ،وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سب چیزیں ہمارے پاس ہیں،موجود ہیں ان کی ایک حقیقت ہے ۔یہ کس طرف بلا رہے ہیں وہ غیر مرئی ذات جس کو نہ چھو سکے، نہ سونگھ سکے، نہ چکھ سکے، نہ دیکھ سکے، نہ ہاتھ ملا سکے،اس کی خاطر پاگل اپنے ان مفادات کو قربان کر رہا ہے جو سب اس کو میسر ہیں اور جو میسر نہیں ہیں وہ دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ دیکھو تمہیں ہم دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے سربراہ بنانے پر آمادہ ہیں۔دنیا کی سب سے خوب صورت عورت مہیا کرنے کے لئے تیار ہیں۔تمہیں دنیا کا سب سے زیادہ مال دار انسان بنانے پر تیار ہیں مگر یہ پاگلوں والا ذکر چھوڑ دو کہ کوئی غیر مرئی چیز ہے اس کی خاطر ہم اپنے ہاتھ میں آئی ہوئی چیزوں کو قربان کر دیں لیکن وہ ان سب کو ردّ کر دیتا ہے۔پس ایسا شخص ہی ہے جو حقیقت میں خدا کی ہستی کا قائل ہے اور ایسا شخص ہی ہے جو پھر یہ حق رکھتا ہے کہ خدا

کی طرف بلائے کیونکہ جس کی طرف بلایا اس کے وجود کے متعلق اس نے اپنی تمام قربانیوں کے ذریعے ثابت کر دیا کہ اس کا یقین درست ہے اور فرضی اور وہمی یقین نہیں ہے۔

اور بلایا ہے پھر یہ کہہ کر اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ میں تو مسلمان ہو چکا ہوں۔ میں نے تو اپنی فرمانبرداری کی گردن اس رب کے حضور جھکا دی ہے جس کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں۔ اس لئے میرا حق ہے اب تمہیں بھی اس طرف بلاؤں۔ آؤ اور پھر کیسے اس کو پاؤ گے۔ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ میں جو مسلمان ہوں، تمہیں مجھ جیسا بننا ہوگا۔ اگر مجھ جیسا بننے میں دلچسپی ہے تو پھر دعوت کو قبول کرو ورنہ نہ کرو۔ تو وسیلے کی اہمیت جو انبیاءؑ کے تعلق میں ہے وہی اہمیت ہر داعی الی اللہ کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ وسیلہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو دعوت الی اللہ کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ پس آپ جب مجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہماری دعوت کو پھل نہیں لگ رہے۔ لوگ دلچسپی نہیں لے رہے، لوگ دنیا دار ہو گئے ہیں تو اپنی ذات سے کیوں نہیں پوچھتے کہ آپ کی ذات میں کیوں دلچسپی نہیں لیتے۔ جب آپ کوئی دنیا کا فن حاصل کرتے ہیں اور ایسی چیز میں کمال حاصل کرتے ہیں جو دنیا کو دکھائی دیتی ہے تو ضرور آپ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ تو انبیاءؑ نے وہ کیا کر کے دکھایا جس سے غیر مرئی، مرئی سے بھی بڑھ کر حیثیت اختیار کر گیا۔ انہوں نے خدا کی صفات کو اپنی ذات میں جاری کیا ہے اور ان صفات کی طاقت ہے جو ایک وجود میں دکھائی دینے لگتی ہے اور وجود سے دوسرے وجودوں پر اثر پذیر ہو جاتی ہے۔

پس اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کے دعوے تک پہنچنے سے پہلے عَمِلَ صَالِحًا کی جو منزل ہے اس میں سے گزرنا پڑتا ہے اور جب اس میں سے گزرتے ہیں تو آپ میں خدائی صفات کا جلوہ گر ہونا لازم ہے اور صفاتِ باری تعالیٰ ضرور طاقت رکھتی ہیں۔ ان میں صلاحیت ہے کہ وہ دوسرے پر غالب آسکیں۔ تبلیغ میں میرا تجربہ، میرے گردوپیش جو تبلیغ کرنے والے تھے ان کا تجربہ، جن اداروں سے میں منسلک رہا ہوں، جو تبلیغ کے لئے وقف تھے ان کا تجربہ، مسلسل بلا استثناء یہی ہے کہ وہ لوگ جو حقیقت میں کچھ خدائی صفات کو اپنا کر باعثِ کشش بن جاتے ہیں خواہ وہ ان پڑھ ہوں، خواہ سادہ لباس رکھنے والے ہوں، غریب ہوں، ضعیف ہوں، بات کرنے کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو، ان کے اندر، ان کی تبلیغ میں لوگ زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور وہ جو علم کی شوخیاں دکھانے والے ہیں

اور اچھے لباس پہن کر یا اپنی دولت کے برتے پر خدمتیں کرتے ہیں تبلیغ کی خاطر لیکن اندر سے وہ صفاتِ باری تعالیٰ سے عاری ہوتے ہیں ان کی ان سب کوششوں کو خدا رائیگاں کر دیتا ہے۔ اس کو کوئی بھی پھل نہیں لگتا چنانچہ ضیافت کرنے والے دو قسم کے میں نے دیکھے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے تو مہمان نوازی کی بھی حد کر دی، بڑا خرچ کیا ان لوگوں پر، بڑی خدمتیں کی ہیں، کوئی سنتا ہی نہیں، کسی کو دلچسپی ہی نہیں ہے۔ ایک صاحب جن کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں ان پڑھ یا قریباً ان پڑھ اپنے آپ کو کہتے تھے میں تو کورا چٹا بالکل لیکن غیر قوموں کو جن کی زبان بھی وہ نہیں جانتے ان کو کامیابی سے تبلیغ کرنے والے یہاں تک کہ ایک سال میں خدا تعالیٰ کے فضل سے تیس پھل انہوں نے جماعت کی خدمت میں پیش کر دئے۔ بڑے مخلص اور باعمل اور نیک لوگ۔ ان سے میں نے پوچھا کیا بات آپ کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا آتا جاتا مجھے کچھ نہیں صرف پیار کے ساتھ کہتا ہوں جی بات سچی سن لو، ہماری بات۔ یہ کہہ دیتا ہوں مجھے بات نہیں آتی ہماری ویڈیو دیکھ لو ہمارے گھر کھانا کھا لو یہی میری تبلیغ ہے۔ لیکن چونکہ ان کے اندر نیکی اور سچائی ہے اس لئے ان دو تین باتوں کا اتنا گہرا اثر پڑ جاتا ہے ان لوگوں پر کہ وہ گھر کا کھانا کھاتے ہیں تو دراصل وہ اسلام کی غذا کھا رہے ہوتے ہیں۔ ویڈیو دیکھتے ہیں تو وہ اسلام کو جلوہ گر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ورنہ دیکھنے والے غلط نظریں لے کر آئیں تو وہی ویڈیو ان کو اور متنفر کر دیتی ہے۔ غلط ذوق لے کر آئیں تو وہی کھانا ان کو دھکیل دیتا ہے کہ یہ کیسا کھانا پکا ہوا ہے اس میں مرچوں نے میرا ستیاناس کر دیا۔ مگر وہاں کے جو لوگ ہیں جن کو مرچوں کی عادت نہیں پیار سے پیش کئے ہوئے کھانے کو بڑی محبت سے کھاتے ہیں اور پھر بہت تیزی کے ساتھ ان کی دعوت الی اللہ ان کے دل پر اثر کرنے لگتی ہے۔

پس وسیلہ بننے کے لئے ظاہری اخلاق کام نہیں آتے وہ گہرے اخلاق کام آتے ہیں جو ذات باری تعالیٰ سے تعلق رکھتے ہوں اور خدا تعالیٰ کے تصور میں ان کی جڑیں ہوں اور ظاہراً ان کی تمیز کرنا، ان کا فرق کرنا الفاظ میں ممکن نہیں ہوتا۔ ایک آدمی ''جی آیاں نوں'' کہہ کے بات کرتا ہے۔ ''حاضر سائیں'' کہتا ہے۔ ایک دوسرا بھی کہتا ہے۔ ایک کے کہنے میں تصنع دکھائی دیتا ہے، بناوٹ کی بات نظر آتی ہے اور انسان ذرا بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ بعض بڑے بڑے لفاظیاں کرنے والے، بڑے بڑے جھک کر کلام کرنے والے ایسے ہمارے ملک میں موجود ہیں جن

کا وہ جھکنا، جن کا کلام کرنا ہی نہایت ہی کراہت پیدا کرتا ہے اور دل متنفر ہو جاتا ہے کہ ان کی صحبت سے کسی طرح نجات ملے۔ بات بات پہ وہ حضور کہیں گے۔ کہیں گے ہم حاضر ہیں، ہم خدمت کے لئے، ہم حقیر چیز ہیں ہمارا کچھ بھی نہیں ہے جناب ہی جناب ہیں، جناب والا ہی کی سرکار ہے آپ کا ہی حکم چلتا ہے اور جتنا وہ کہتے ہیں اتنا دل متنفر ہوتا چلا جاتا ہے کناروں تک بھر جاتا ہے اور لگتا ہے قے کر دے گا آدمی اور کچھ لوگ سادہ سی ایک آدھ بات کرتے ہیں جی جیسا فرمائیں گے۔ اتنی اس میں طاقت ہوتی ہے کہ انسان جانتا ہے کہ اگر ان سے جان پیش کرنے کا کہیں گے تو جان ہی پیش کریں گے ۔ اب کہاں ان کی بات، کہاں ان پہلوں کی بات زمین وآسمان کا فرق ہے ان کے نتائج میں اور اخلاق کی تعریف سچائی کے سوا ممکن ہی نہیں ہے اور سچائی کی تعریف خدا کے حوالے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔

پس ہر وہ خلق سچا ہے جو سچائی اپنے اندر رکھتا ہے اور ہر وہ خلق سچا ہے جس کی سچائی کا خدا کی ذات سے تعلق ہے۔ وہ سچائی غیر مبدل ہے اس سچائی کو کسی اور کی لالچ نہیں۔ اس کا استغناء بھی اپنے اندر ایک عجیب شان رکھتا ہے۔ ورنہ کوئی شخص آپ سے مستغنی ہو جائے تو آپ کو اس میں دلچسپی نہیں رہے گی ۔ مگر خدا مستغنی ہے اور پھر بھی دلچسپی ہے۔ وہ مستغنی ہے آپ کے ظلموں سے، آپ کی بدکرداریوں سے۔ آپ ٹھوکر والی بات بھی کرتے ہیں تو وہ پھر بھی احسان کا سلوک جاری رکھتا ہے۔ تو استغناء کیا ہے؟ اس کی حقیقی تعریف بھی اللہ کے حوالے سے ہی سمجھ آتی ہے ۔ بعض لوگ آپ سے زیادتی کرتے ہیں آپ اس کے باوجود ان سے حسن سلوک کرتے چلے جاتے ہیں اور دکھاوے کی خاطر نہیں بلکہ آپ کے مزاج میں یہ بات داخل ہے۔ میرے سامنے بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ لوگ حیران ہوتے ہیں ہمیں غصہ آتا ہی نہیں جتنا وہ کوشش کر لیں وہ ہمیں چھیڑتے ہیں کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں ۔ تمہیں غصہ کیوں نہیں آتا۔ تو ان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ ہمارے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات رکھی ہی نہیں ہوئی۔ ہم ہنس کر برداشت کر لیتے ہیں، بے عزتی بھی برداشت کر جاتے ہیں اور ایسے لوگ پھر ہر دلعزیز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پس آپ کی ذات میں جو دلچسپی ہے حسن خلق سے تو ہے لیکن اس حسن خلق سے جو اللہ کی طرف بلانے والے کے اندر ہونا چاہئے۔ جس ذات کی طرف سے کوئی آیا ہے، اس کا پیمبر بن کے آتا ہے اور اس کا پیمبر بنتا ہے تو پھر اس کے ہر حسن کی جس کی وہ تعریف کرتا ہے کوئی جھلک اس کی ذات میں ملنی چاہئے اور وہ جھلک جو ہے وہ دنیا کے حسن سے ممتاز

اور بالکل الگ ہے، کوئی ان میں اشتباہ نہیں ہوسکتا۔ پس وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ دنیا میں بھی بڑے نیک لوگ موجود ہیں وہ کیوں ہم سے افضل یا بہتر نہیں ہیں جبکہ وہ بعض خوبیوں میں ہم سے بڑھ گئے ہیں تو ان کو علم نہیں ہے کہ ان کا حسن ایک خالی حسن ہے جس کے اندر خدا کے نور کی سچائی نہیں ہے اور اگر خدا کے نور کی سچائی نصیب ہو جائے تو ضرور وہ چمک اٹھیں گے۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں۔

پس اپنی تبلیغ میں وہ کردار پیدا کریں جس کردار کو آپ الٰہی صفات کی جھلک قرار دے سکتے ہیں۔ الٰہی صفات کا پوری طرح جلوہ گر ہونا تو آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر کوشش کرنا آپ کے بس کی بات ہے۔ یہ کہہ دینا کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نہیں بن سکتے یہ کہنا نیکی بھی ہوسکتا ہے اور ظلم اور گناہ بھی بن سکتا ہے۔ بعض لوگ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ ہر بدی کے لئے ایک Licence حاصل کر لیں۔ آپ ان سے کہیں کہ دیکھو رسول اللہ ﷺ تو یوں کیا کرتے تھے کہ چھوڑو جی کون رسول اللہ بن سکتا ہے اور تم کون سے بن گئے ہو۔ یہ بات محبت کی نہیں بے ادبی کی ہے۔ اس بات میں گہری گستاخی پائی جاتی ہے اور استغناء ہے وسیلے سے۔ یہ مستغنی اور ہے اور خدا کی ذات کے حوالے سے مستغنی بننے والا بالکل اور شخص ہوا کرتا ہے۔ ایسے شخص کو جب محمد رسول اللہ ﷺ کے کردار کا حوالہ دیا جائے جو حقیقت میں آپ سے پیار اور محبت رکھتا ہے تو وہ اس حوالے کے بعد یہ کبھی نہیں کہے گا کہ جی کون رسول اللہ ﷺ بن سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے سامنے آبدیدہ ہو جائے ہوسکتا ہے، راتوں کو اٹھ کے روئے اور عرض کرے کہ اے خدا میں بننا تو چاہتا ہوں مگر میری مجبوری ہے، بے اختیاریاں ہیں، تو میری مدد فرما کہ میں ویسا بن سکوں۔ یہ وہ شخص ہے کہ وہ جتنا بھی بنتا ہے اتنا ہی خدا اسے زیادہ مقبول بناتا چلا جاتا ہے۔ حسن کی تھوڑی جھلکی بھی اگر سچائی کی خاطر قبول کی جائے، سچائی سے قبول کی جائے اس میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

پس ہر داعی الی اللہ اگرچہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نہیں بن سکتا مگر اگر دل کی گہرائی سے بننا ضرور چاہتا ہے تو پھر اس کا تھوڑا بننا بھی بہت ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے تھوڑے میں بھی بہت برکت رکھ دیتا ہے۔ پس اس پہلو سے آپ کو دعوت الی اللہ کی حکمتوں کو تو سمجھنا ہوگا اس کے بغیر آپ کیسے دعوت الی اللہ کر سکیں گے۔ حکمتیں سمجھیں، ان کو اپنانے کی کوشش کریں۔ ان کو اپنی ذات میں جاری کریں اور پھر یہ دیکھیں کہ آپ کے اندر کوئی ایسی تبدیلی پیدا بھی ہوئی ہے کہ نہیں کہ آپ کی بات

میں کشش پیدا ہو جائے۔ اگر گھر میں ہی نہیں ہو رہی تو باہر کیسے ہوگی۔ حلقہ احباب اگر محسوس نہیں کرتے تو دوسرے کیسے محسوس کریں گے۔ اس لئے تبدیلی ہونا ایک فرضی قصہ نہیں ہے یہ روزمرّہ کے حساب کی بات ہے۔ وہ مومن جو اپنی ذات میں تبدیلی کرتا ہے وہ ہر وقت دیکھتا رہتا ہے، پرکھتا رہتا ہے۔ اس کی برائیاں کھل کر اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ جو نہیں ہوتیں ان کی تلاش میں رہتا ہے، ان کی کھوج میں رہتا ہے اور پھر وہ ان کو اپنے سامنے رکھتا ہے کہ اس سے بھی میں نے نجات حاصل کرنی ہے ،اس سے بھی حاصل کرنی ہے۔ پھر ان بُھدے نقوش کو دور کر کے ان کی جگہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، ان داغوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے، دھوتا چلا جاتا ہے اور یہ جو زندگی بھر کا کام ہے یہ ہے وہ دعوت الی اللہ جس کا قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

عَمِلَ صَالِحًا میں ہرگز یہ مضمون نہیں کہ کامل عمل صالح پر اسے اختیار نصیب ہو گیا ہے۔ دعوت الی اللہ دے کر عمل صالح کی طرف توجہ کرنا اور کرتے چلے جانا یہ وہ مضمون ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ عَمِلَ صَالِحًا کو پہلے رکھتا اور پھر کہتا کہ دعوت الی اللہ دے رہا ہے۔ پھر ہم سمجھتے کہ دعوت الی اللہ دینے کا حق اس وقت قائم ہوگا جب آپ عمل صالح کا حق ادا کر چکے ہوں گے۔ مگر اس طرح تو پھر دنیا کی اکثریت دعوت الی اللہ سے محروم ہو جائے گی۔ دعوت الی اللہ عمل صالح کا احساس اور شعور بیدار کرتی ہے اور جب یہ شعور بیدار ہوتا ہے تو اس کی آواز پر لبیک کہنے والے وہ ہیں جو عَمِلَ صَالِحًا کا تعریف میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اس شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ آپ کی ذات میں ایک ارتقائی عمل شروع ہو جاتا ہے اور جب آپ اس عمل کے نتیجے میں اپنے آپ کو ایک خوبی پر پوری طرح مستحکم دیکھتے ہیں تو دل کی بے اختیار یہ آواز نکلتی ہے اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کہ میں تو مسلمانوں میں سے ہو گیا ہوں۔ پس اس کیفیت کے ساتھ دعوت الی اللہ کو سمجھ کر آپ تبلیغ کریں تو پہلے اپنی تربیت کی توفیق ملے گی پھر دعوت الی اللہ کی توفیق ملے گی، پھر وہ جو دعوت الی اللہ میں آپ کی آواز پر لبیک کہہ کر آئے ہیں ان کی تربیت کی بھی آپ کو توفیق ملے گی۔ یہ وہ تیسری بات ہے جس سے میں نے آغاز کیا تھا مگر پہلی دو باتیں سمجھائے بغیر اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔

نئے آنے والے کثرت سے آرہے ہیں اور ان کی تربیت کے تقاضے پھیلتے جا رہے ہیں اور

سب سے زیادہ مشکل وہاں ہے جہاں قومیں داخل ہورہی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ خدا تعالیٰ کے فضل سے احمدیت کی طرف رجوع کررہے ہیں۔ان سب کو عمل صالح کی تلقین کرنا محض تلقین کے طور پر کافی نہیں۔ وہ نیک نمونہ جس نے ان کو کھینچا تھا اس نیک نمونے کو ان میں جاری کرنا اور ان کے لئے اس نمونے کو ان کا ''عرضہ'' بنا دینا وہ مقصود بنا دینا، جو اس کی پیروی کریں یہ ضروری ہے۔مگر انفرادی تبلیغ میں تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا ہے اگر ایک انسان نیت رکھتا ہو۔لیکن اجتماعی تبلیغ میں مشکل پیش آجاتی ہے اور اس وقت میرے پیش نظر صرف انفرادی تبلیغ نہیں بلکہ وہ دنیا کے علاقے ہیں جو امریکہ میں تو ابھی نہیں مگر افریقہ میں کثرت سے ہیں اور بعض مشرقی ممالک میں بھی پیدا ہورہے ہیں یعنی غیر افریقی ممالک میں بھی اور یورپ میں بھی بعض علاقے ایسے ابھر رہے ہیں جہاں خدا تعالیٰ کے فضل سے بکثرت لوگ احمدیت کی طرف رجوع کررہے ہیں۔جن کا رجوع فوج درفوج کہلا سکتا ہے۔ان کی تربیت کا کیا طریق ہے؟ کیونکہ ان تک تو آواز پہنچانے والے چند تھے اور ان چند کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اپنے نمونے ان سب کو عملاً دکھا کر ان کا مزہ ان کو چکھا سکیں اس لئے وہ ان کی نظر میں اجنبی رہتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں البانیہ ہم نے ایک وفد بھجوایا اور اسی غرض سے کہ وہاں کے تبلیغی اور تربیتی تقاضوں کو زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو پتا چلا کہ اکثر لوگ جو ہیں وہ احمدیت کو قبول تو کر چکے ہیں لیکن ان کے سامنے وہ احمدیت کا عملی زندہ نمونہ موجود نہیں ہے جو دراصل اب ان کو سنبھالنے کے لئے ضروری ہے۔سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس مسئلے کا کیا حل پیش فرماتا ہے۔اس مسئلے کا حل قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ تم ان تک پہنچتے رہو گے تو یہ کافی نہیں ہوگا۔اب ان کا فرض ہے یا تمہارا فرض ہے کہ یہ انتظام کرو کہ وہ تم تک پہنچیں اور انہی میں سے کچھ لوگ پیدا ہوں جو نیک اعمال کے نمونے دکھا سکیں اور پھر نیکی کی طرف بلا سکیں۔ یہ وہ حیرت انگیز نظام ہے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے اور جہاں تک میرا مذہب کا مطالعہ ہے مجھے کہیں اور دکھائی نہیں دیا کہ باہر سے لوگ آئیں، وفود کی صورت میں آئیں ،تمہارے پاس ٹھہریں ،تربیت حاصل کریں اور پھر واپس اپنی قوم کی طرف جا کر ان کے سامنے وہ پختہ باتیں دکھائیں جن کی تائید ان کے عمل کررہے ہوں۔ یہ وہ طریق ہے۔ایک یہ طریق ہے جو آج جماعت احمدیہ کے کام آسکتا ہے۔چنانچہ اس طریق پر عمل کروانے کے لئے گزشتہ سال

جن جماعتوں کو میں نے ہدایت دی ان میں سے جنہوں نے عمل کیا وہ حیران رہ گئے کہ کتنا حیرت انگیز پاک نتیجہ ظاہر ہوا اور دہشت زدہ ہو گئے یہ دیکھ کر کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہماری تبلیغ ساری بے حقیقت ثابت ہو جاتی۔ بعض علاقے تھے جہاں ستر ہزار، ایک علاقے کے لوگ ہیں جنہوں نے اکٹھے احمدیت کو قبول کر لیا اور جماعت یہ سمجھی کہ الحمدللہ بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ چونکہ واقعۃً وہ احمدی ہوئے تھے اس لئے اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا کوئی مبالغہ نہیں تھا، رپورٹ بھیجنے کا حق بھی تھا لیکن جب یہ نصیحت میں نے کی کہ ان کے آدمی بلائیں اور ان کی تربیت کا انتظام کریں پھر ان کو سکھائے ہوئے پرندوں کی طرح جو ابراہیمی طیور ہیں واپس اپنی جگہ بھیج دیں پھر وہ ہمیشہ آپ کے رہیں گے۔ پھر جب آپ ان کو بلائیں گے تو ضرور لبیک کہیں گے اور جہاں جہاں جا کر ٹھہریں گے وہاں اپنے جیسے پاک نمونے پیدا کریں گے۔ جب یہ انتظام شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی خود آنکھیں کھل گئیں کہ یہ لوگ جو تربیت کے لئے آئے تھے اور وہ تھے جو چنیدہ تھے، جو اپنی قوم میں سے خاص اچھے سمجھے گئے تب ہی ان کو بلایا گیا تھا اکثر خالی تھے ان کو بعض بنیادی باتوں کا علم ہی کوئی نہیں تھا اور پھر نظام جماعت کے آداب کا علم نہیں تھا کیونکہ نظام جماعت کے آداب کا علم تمام نیکیوں کی حفاظت کے لئے ضروری ہے، تقویٰ کی حفاظت کے لئے ضروری ہے اور مستقل تسلیم و رضا کے نظام کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اس کا فقدان بہت ہی خطرناک فقدان ہے۔ جب وہ آئے تو اس کے بعد دیکھتے دیکھتے رپورٹوں سے پتا چلا کہ ان کی تو کایا پلٹ گئی، ان کے آثار ہی بدل گئے اور واپس اس حال میں جا رہے تھے کہ اچھلتے کودتے۔ اب مزہ آئے گا ہمیں تبلیغ کرنے کا۔ اب ہمیں لوگوں کی تربیت کا لطف آئے گا پہلے تو ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔

چونکہ یہ بھی اب ممکن نہیں رہا کہ ہر ملک کے مرکز میں تمام ایسے لوگوں یا قوموں کے نمائندوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا سکے جنہوں نے واپس جا کر پھر قرآن کے بیان کے مطابق یا قرآن کے سکھائے ہوئے طریق کے مطابق اپنی اپنی قوم کی تربیت کرنی ہے۔ اب ہم نے یہ حل نکالا ہے کہ ہر علاقے میں ایک مرکز بنایا جائے اور وہ احمدیت کا مرکز ہو جہاں ہمہ وقت تربیت کے دور چلتے چلے جائیں۔ وہاں کچھ لوگ ایسے تربیت یافتہ بٹھا دئے جائیں جن کا کام ہی یہ ہو کہ لوگ باہر سے آئیں، ان کے پاس رہیں، پندرہ پندرہ دن، بیس بیس دن کے لئے مہینہ دو مہینہ ٹھہر سکتے ہیں تو اور بھی

بہتر ہے۔ان کی رہائش کا انتظام ہو، ان کے کھانے کا انتظام ہو اور وہ تربیت حاصل کر کے پھر اپنی قوم کی طرف لوٹیں ۔ ورنہ آپ کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ افریقہ کے ممالک میں رسل و رسائل کی کیا حالت ہے اور ایک علاقہ جس کو میں ستر ہزار کا علاقہ کہتا ہوں وہ ایک جگہ نہیں ہے، وہ پھیلا پڑا ہے جنگلوں میں۔ان میں سے ہر گاؤں ہزار بارہ سو یا آٹھ سو افراد پر مشتمل ہے وہ آپس میں کئی کئی میل کے فاصلے پر بھی ہو سکتا ہے اور دشوار گزار رستے ہیں ان کو باہر سے جانے والا طے بھی نہیں کر سکتا آسانی سے اور پھر رستے کے خطرات کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح احمدی ہوئے کہ ان کے لیڈرز ایک جگہ اکٹھے ہوئے تھے اور بات سنی اور پورے اطمینان سے احمدیت کی تائید کی اور اپنے سارے علاقے سے پوچھا اور ان کے نمائندے بلوائے اور ان سے پوچھا اور سب نے جب توثیق کی تب وہ احمدی شمار ہوئے لیکن تربیت کے لئے اب احمدی مبلغین جو تربیت یافتہ ہیں ان کی تعداد کیا ہے اور حیثیت کیا ہے ۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ وہ اتنے بڑے قافلوں کے کام آ سکتا ہے؟ وہ اتنی بڑی فوجوں کی بھوک مٹا سکتا ہے؟ ممکن ہی نہیں ہے۔ مگر قرآن نے یہ مضمون سکھا کر کتنا آسان کر دیا۔ فرمایا ان کو کہو وہ آئیں اور ان کے لئے مراکز قائم کرو۔ وہ تربیت پائیں اور پھر واپس جائیں ۔ وہ جانتے ہیں اپنی قوم کے اسلوب کو، اپنی قوم کی زبان کو، اس کے اطوار کو، وہ جانتے ہیں کہ ان کے اندر کیا کیا برائیاں ہیں ۔ وہ اگر ان کی برائیاں کہیں کہ یہ برائیاں ہیں تو وہ مان جائیں گے اور بسا اوقات تم کہو گے تو وہ برا منائیں گے۔

پس ان وفود کو بلا کر یہ بھی تجربہ ہوا کہ بڑے بڑے نیک لوگ جو بڑے اخلاص سے احمدی ہونے والے تھے جب بعض رسموں کے خلاف ان سے بات کی تو بھڑک اٹھے ابتداء میں، کہ نہیں نہیں یہ غلط ہے ہمیں تو یہی سکھایا گیا ہے، یہی اسلام ہے کہ جب کوئی فوت ہو تو اتنے بکرے لوگوں کو کھلاؤ اور اتنے پیسے آئمہ کو تقسیم کرو اور ساتویں دن یہ کرو اور بارھویں دن یہ کرو۔ یہ سارے قصے اپنے اپنے خیالات کے مطابق مختلف ملکوں میں رائج ہیں اور بعض ظالمانہ ایسی رسوم بھی ہیں جو محض یہ نہیں کہ سنت نہیں ہے بلکہ سراسر سنت کے مخالف ہیں۔ تو ان کی تربیت میں وہاں پتا چلا جب وہ چند تھے کہ اگر ان کی قوم کے اندر رہتے ہوئے ان سے یہ ساری بات کی جاتی تو ساری قوم نے ان کی تائید میں اٹھ کھڑے ہونا تھا اور ہرگز بعید نہیں تھا کہ یہ تربیت ارتداد کا موجب بن جاتی۔ مگر چونکہ احمدی ماحول جو

مرکزی ماحول تھا اس کے غلبے کے اندر آئے ہوئے تھے، مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، اپنی حدود کو سمجھتے تھے اور سارا ماحول جو اردگرد تھا جو ان کی کلاسوں میں آیا بھی کرتا تھا جن سے روز ملاقاتیں ہوتی تھیں اور سارے انہی عقائد کے قائل تھے جو جماعت ان کو سکھا رہی تھی تو اس سے وہ مرعوب ہو گئے اور زیادہ پھر اصرار نہیں کیا بدیوں پر۔ جب ان لوگوں نے جا کر ان کو سکھایا کہ ہم یہ سیکھ کر آئے ہیں ہم واقعۃً غلط سمجھتے تھے تو ان کی باتوں کا نیک اثر ہوا۔

اور قرآن کریم جب یہ تعلیم دیتا ہے تو اس کی مثالیں بھی ہمارے سامنے رکھتا ہے اور عجیب کامل کتاب ہے۔ کوئی بھی ایسی تعلیم نہیں جس کی ایک نہایت ہی اعلیٰ اور پاکیزہ مثال ہمارے سامنے نہ رکھ دی ہو۔ اس مضمون کی مثال ان جنوں کے واقعات میں دی گئی جو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعض لوگ انہیں جنوبی عرب کے قبائل قرار دیتے ہیں مگر زیادہ مستند تحقیق یہ ہے کہ وہ افغانستان کا ایک وفد تھا اور پٹھان قبائل تھے چونکہ یہ روایت سارے افغانستان میں تمام قبائل میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ہمارا ایک وفد مخفی طور پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور انہوں نے واپس آ کر جب تعلیم دی تب ہم مسلمان ہوئے ہیں۔ اب یہ اگر ایک فرضی روایت ہوتی تو چند قبائل کی ہو سکتی تھی ساری قوم کی متفق علیہ گواہی نہیں بن سکتی تھی اور قرآن کریم نے جو ذکر فرمایا ہے وہاں یہ بات بطور خاص ہے کہ ان کی Identity مخفی رکھی گئی، ان کے تشخص کو ظاہر نہیں فرمایا گیا۔ یہاں تک آنحضرت ﷺ ایک صحابیؓ کو ساتھ لے کر چلے تو اسے دور کھڑا کر دیا کہ اب یہاں سے آگے تم نے قدم نہیں رکھنا۔ میں اکیلا جاؤں گا اور پھر ساری رات ان سے تبلیغ کی ہے۔ وہ زبان سمجھنے والے ہوں گے، کوئی ایسے مترجمین ان کے ساتھ ہوں گے۔ جو بھی صورت تھی وہ جب واپس گئے ہیں تو قرآن کریم فرماتا ہے یہ باتیں کر رہے تھے کہ ہم بھی کیسے پاگل تھے یہ یہ رسمیں، یہ یہ خیالات ہم میں پائے جاتے تھے۔ اب عرب وفد اگر کوئی جا کے افغانستان میں جن کے آغاز ہی سے شدید مزاج ہیں باتیں کرتا تو شاید زندہ بچ کے واپس نہ آتا۔ مگر قوم نے جو وفد بھیجا تھا جب وہ سیکھ کر واپس گیا ہے تو قرآن کہتا ہے کہ بڑے عزم کے ساتھ وہ یہ کہتے ہوئے واپس جا رہے تھے کہ ہاں ہم جا کے قوم کی اصلاح کریں گے۔ بتائیں گے کہ پاگل تھے وہ ہمارے آباؤ اجداد جو یہ یہ باتیں کیا کرتے تھے یہ یہ سوچا کرتے تھے، اصل حقیقت یہ ہے اور اسی وقت، انہی

باتوں کے درمیان ختم نبوت کا مسئلہ بھی حل کر جاتے ہیں۔ وہ جو بیوقوفیاں آباؤاجداد کی تھیں ان میں ایک یہ بھی بیان کرتے ہیں۔ عجیب بے وقوف لوگ تھے کہتے تھے اب نبی کبھی خدا نہیں بھیجے گا اور دیکھو نبی سے مل کر آ رہا ہے۔ تو یہ ختم نبوت کا عقیدہ ہے مولوی جھوٹ بولتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے بعد جاری ہوا۔ قدیم سے اس قسم کے عقیدے مختلف رنگوں میں قوموں میں پائے جاتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس کی تردید فرمائی اور یہ بات اپنے پلے باندھ کر وہ واپس لوٹے کہ اس قسم کی ختم نبوت کوئی چیز نہیں کہ جس کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے ہدایت دینے والے ہی بند ہو جائیں۔ نئے مذہب کی بات اور ہے مگر ہدایت دینے والے خدا کی طرف سے آنے لازم ہیں۔

تو دیکھو وہ وفد کا طریق جو خدا نے ہمیں سکھایا اس کی ایک سچی حقیقی مثال ہمارے سامنے تاریخ اسلام سے رکھ دی کہ اسی طرح تم سے بھی ہوگا۔ تم اس طرح تربیت کے انتظام کرو گے تو پھر یہ لوگ بڑے اعتماد کے ساتھ واپس جا کر اپنی قوم کی بدیوں کو دور کریں گے۔ الحمدللہ غانا نے بڑی ہی سعادت مندی سے اس سکیم پر عمل کیا ہے اور ان کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ حیرت انگیز فائدے پہنچے ہیں۔ پس باقی دنیا کی جماعتوں کو بھی خواہ وہ مغرب کی ہوں یا مشرق کی ہوں میں یقین دلاتا ہوں کہ دعوت الی اللہ اگر آپ ڈھب سے کریں گے تو جب تک قرآن کے بیان کردہ طریق پر آنے والوں کی تربیت کا انتظام نہیں کریں گے ہوسکتا ہے کہ جو بیج آپ بوتے چلے جائیں وہ اُگ بھی جائے تو پیچھے جانور اسے چر جائیں یا پرندے کھا جائیں آپ کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ پس یہ وہ منظّم مربوط نظام ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ جو بقیہ وقت ہے ہمارا تبلیغی سال پورا ہونے میں اس میں جماعتیں پورے زور سے کوشش کریں گی اور افراد بھی اور افراد کی ذمہ داری اس لئے اہم ہے کہ جب تک وہ اپنے اخلاق اور اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کریں گے جماعت میں طاقت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جماعت نام ہے افراد کے مجموعے کا اور جو اجتماعی حسن ہے اس میں بڑی طاقت پیدا ہو جاتی ہے مگر وہ حسین قطروں سے بن کر بنا کرتا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کسی امارت پر فائز ہونے پر بہت گہرے تقاضے ہیں انہیں لازماً پورا کرنا ہوگا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 14 / جون 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

گزشتہ خطبات میں جرمنی کے سفر کے دوران بھی اور بعد ازاں بھی میں نے جماعت کو امارت کی عزت اور احترام کی طرف توجہ دلائی اور جماعت کو نصیحت کی کہ اپنی اطاعت میں محبت اور خلوص کا رنگ پیدا کریں کیونکہ یہی سچی اور حقیقی اطاعت ہے جو انسان کو ابتلاؤں سے بچاتی ہے۔ اگر محض میکانیکی یعنی مکینیکل اطاعت ہو تو ایسی اطاعت بعض دفعہ ٹھوکر کے مقام پر انسان کو سہارا نہیں دے سکتی اور معمولی عذر پر بھی انسان اپنی اطاعت کا تعلق توڑ کر خود سری کی طرف مائل ہو جاتا ہے یعنی جہاں محبت اور ادب کے رشتے ہوں وہاں یہ دونوں رشتے اطاعت کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے اندر ایک وارفتگی سی پیدا کر دیتے ہیں، ایک ایسا رجحان جس کے بعد انسان اطاعت کی سختیوں کو برداشت کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں کو جو تربیت میں مرتبہ اور مقام حاصل ہے اتنا کسی اور رشتے کو نہیں کیونکہ ماں کی سختیاں بسا اوقات ردعمل کے بغیر بچہ جھیلتا ہے اور جہاں ردعمل دکھاتا ہے وہاں ماں کا کوئی قصور ہوا کرتا ہے۔ وہ ماں جو فطری تقاضے پورے کرتی ہے، بچوں سے پیار اور محبت کے تعلق قائم رکھتے ہوئے ان کی اصلاح کا خیال رکھتی ہے اس ماں کے بچے سختی کے وقت بھی دکھ تو محسوس کریں گے، بغاوت نہیں کریں گے۔

پس جہاں جماعت کو میں نے توجہ دلائی ہے وہاں اب میں امراء کو بھی نصیحت کرنا چاہتا ہوں بلکہ ہر جماعتی عہدیدار کو کہ اس نے اگر خدمت لینی ہے اور اطاعت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے ہیں تو

خوداس کے لئے لازم ہے کہ اول وہ اطاعت کا اعلیٰ نمونہ بنے۔ یعنی اپنے سے بالا، اس پر نظر رہے اور وہ بہترین اطاعت کا ایک نمونہ بن جائے اور دوسرے جس طرح آنحضرت ﷺ کے لئے اطاعت کا حکم ہے آپ کے لئے اگر ہے تو اس کے تابع ہی ہے مگر اس کے ہم مرتبہ نہیں ہوسکتا۔ گو منطقی نقطہ نگاہ سے ہم کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں آپ کے مقرر کردہ امراء کی اور غلاموں کی اطاعت بھی داخل فرمادی گئی ہے اس لئے ان سب امراء کو جو نظام جماعت کے نمائندہ ہیں یا صدر ہیں یا قائدین ہیں یا زعماء ہیں یا لجنہ کی صدرات ہیں ان سب کو اطاعت کا اپنے منصب کے لحاظ سے ایک حق حاصل ہو گیا ہے اور اس میں ان کی ذات کا کوئی دخل نہیں۔ یہ نصیحت جہاں میں کر رہا ہوں وہاں یہ بھی سمجھانا چاہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ سب سے زیادہ اہم ترین اطاعت کا حکم حضرت محمد ﷺ ہی کے لئے ہے اور آپؐ ہی کی ذات کے حوالے سے پھر آگے یہ حکم پھیلا ہے۔ مگر آپؐ کے متعلق بھی قرآن کریم نے متنبہ فرمایا کہ اگر تجھے وہ رحمت کا دل نہ دیتے جو ہر وقت ان پر جھکا رہتا ہے، ہر وقت ان کے خیال میں مگن رہتا ہے، ان کی تکلیف تجھ پر مصیبت بن جاتی ہے عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبہ:128) جو دکھ اٹھاتے ہیں تجھے بھی مصیبت پڑ جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا اس قسم کی کیفیات تو تیری اعلیٰ عظمت اور تیرے متعلق خدا تعالیٰ کے اعلیٰ فرمان بھی ان کو اکٹھے نہ رکھ سکتے اس لئے کہ تو تو صحت مند ہے یہ سارے صحت مند نہیں اور جو اعلیٰ صحت اطاعت کے لئے درکار ہے جو ہر ٹھوکر سے بالا ہو جاتی ہے، ہر ابتلاء سے ثابت قدم گزرتی ہے وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی اور وہ صحابہ اکرام جو آنحضرت ﷺ کی صحبت میں قریب تر رہتے تھے ان کا ایک الگ مرتبہ تھا۔ ان کے متعلق اس آیت میں ہرگز یہ نہیں فرمایا گیا کہ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 160) انہوں نے تو رہنا ہی تھا ساتھ۔ ان پر تو یہ مضمون صادق آتا تھا کہ ’’ہمیں تو راہرووں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا‘‘ یعنی محبوب کی گلیوں میں۔ اس لئے قرآن کریم کی ہر آیت کو اس کے موقع محل کے مطابق چسپاں کرنا چاہئے لیکن ایک بڑی جماعت ایسی تھی جو تربیت میں وہ مرتبہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر لمحہ دلداری کے محتاج تھے اور دلداری کے رستوں سے وہ رفتہ رفتہ محمد رسول اللہ ﷺ کے قریب آتے رہے، قریب تر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ پھر اس مرتبہ اور مقام پہ پہنچے کہ جس کے متعلق قرآن کریم نے ان کے ثبات قدم کی گواہیاں دیں۔ پس وہ جو مضمون ہے وہ عمومی تربیت

کا مضمون ہے کہ جو امیر مقرر ہو اور خاص طور پر جو خدا تعالیٰ کی طرف سے امیر مقرر ہو اس کے اوپر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت کو نظر انداز کر کے محض اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے مامور بنا دیا ہے وہ یہ سمجھے کہ اب ہر شخص کا فرض ہے میری اطاعت کرے اور اطاعت میں حد کمال کو پہنچ جائے مگر میں بس صرف مامور بن کر بیٹھا رہوں گا میرا کام اطاعت قبول کرنا ہے اس سے بڑھ کر نہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ فطرت انسانی کے خلاف بات ہے اور قرآن فطرت کے مطابق ہے۔

اور قرآن یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خدام میں جو اطاعت کے بے مثال نمونے تم دیکھتے ہو اس میں تم ان کے لئے جتنی بھی دعائیں کرو بے شک کرو مگر یاد رکھو کہ اس کا اصل کریڈیٹ، اس کا اصل سہرا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سر پر ہے کیونکہ آپؐ نے اپنے پیار، محبت، مغفرت، عفو اور ان کی خاطر تکلیفیں اٹھا کر خود ایک مقام پیدا کر لیا اور ایک ایسا مقام پیدا کیا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات نہ ہوتیں تو ان میں جو نمونے تم دیکھتے ہو وہ نظر نہ آتے۔ پس یہ ان کی ذاتی خوبی نہیں۔ یہ اطاعت بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حسن کا ہی ایک عکس ہے۔ تو یہ آیت کریمہ ہمیں اس طرف بھی متوجہ کر رہی ہے کہ ہر وہ شخص جو مامور ہے کسی پہلو سے خواہ محدود دائرے میں ہو، ایک زعیم بھی جو انصار اللہ کا زعیم ہے وہ بھی محدود دائرے میں ایک مامور ہے، ایک زعیم بھی جو خدام الاحمدیہ کا زعیم ہے وہ بھی تو اپنے دائرے میں اور محدود دائرے میں ایک مامور ہے۔ تو ہر شخص جس کا حکم مانا جائے اسے مامور کہا جاتا ہے یعنی اس کی بات مانی جائے گی۔ ان معنوں میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی منصب ماموریت عطا فرمایا ہے جو انبیاءؑ کو دیا جاتا ہے، یہ الگ مضمون ہے۔ مگر مامور کا عام معنی یہی ہے کہ اپنے دائرے میں صاحب اختیار ہو، صاحب امر ہو۔ اس پہلو سے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اسے یاد رکھنا ہوگا کہ جن لوگوں پر مامور ہے ان کے دل جیتنے میں اسے لازماً محنت کرنی ہوگی اور ان کے طبعی فطری تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ پس وہ امیر جو امیر بن کر یہ اہم اور بنیادی نکتہ نظر انداز کر دیتا ہے وہ بیوقوف بھی ہوگا اور ایک قسم کا اس میں تکبر بھی پایا جائے گا۔ بیوقوف اس لئے کہ جو مرکزی نکتہ قرآن کریم نے بار بار سمجھایا جس کے بغیر امارت مکمل ہو ہی نہیں سکتی اسے نظر انداز کر بیٹھا ہے اور تکبر ان معنوں میں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے متعلق قرآن یہ فرماتا ہے کہ اگر یہ صفات تجھ میں نہ ہوتیں تو انہوں نے بھاگ جانا تھا، اپنے متعلق وہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ مجھ میں نہ بھی ہوں تو فرق کوئی نہیں پڑتا انہوں نے ماننی ہی

مانی ہے۔ اگر وہ مانتے ہیں تو پھر تمہاری وجہ سے نہیں بلکہ عمومی نظام جماعت کی برکت سے مانتے ہیں اور وہ بھی آنحضرت ﷺ کی خاطر مانتے ہیں۔ وہ دہرے ثواب کماتے ہیں اور تم مجرم بن جاتے ہو۔

پس کسی امارت پر فائز ہونا کوئی معمولی امر نہیں ہے، اس کے بہت گہرے تقاضے ہیں، انہیں لازماً پورا کرنا ہوگا۔ مگر جہاں تک نافرمانی والے کا تعلق ہے اس کا یہ عذر کبھی قبول نہیں ہوسکتا کہ چونکہ اس نے مجھ سے حسن سلوک نہیں کیا تھا اس لئے میں نافرمانی کا حق رکھتا ہوں۔ یہ بات بھی یاد رکھیں۔ قرآن کریم نے ان کو جو رسول اللہ ﷺ کی اگر سختی کی وجہ سے دور ہٹے ہوں ہرگز یہ حق تسلیم نہیں کیا کہ ان کو ہٹنے کا حق تھا۔ ان کی ایک نفسیاتی کمزوری بیان فرمائی ہے۔ ورنہ جو اطاعت کا اعلیٰ حق ہے اس میں کسی شخص کی ذاتی کمزوری یا ذاتی صفات کا کوئی بھی دخل ہونا نہیں چاہئے۔ اطاعت کے زاویے سے دیکھیں یعنی مطیع کے زاویے سے دیکھیں تو پھر یہ مضمون یوں نکلے گا کہ مطیع کو اگر اس کا مطاع یعنی جس کو امر کا اختیار دیا گیا ہے باوجود اس کے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتا اپنے دائرہ اختیار میں حکم دیتا ہے تو مطیع کا فرض ہے کہ لازماً قبول کرے اور یہ عذر نہیں رکھے کہ چونکہ اس نے مجھ سے حسن سلوک نہیں کیا اس لئے میں حق رکھتا ہوں کہ اس کی اطاعت سے باہر چلا جاؤں۔ یہ حق قرآن کریم نے کہیں بھی کسی کو نہیں دیا۔

جہاں تک مومن کا تعلق ہے ان کی ایک ہی آواز بیان فرمائی ہے جو حضرت محمدؐ رسول اللہ کی آواز کے تابع اٹھی اور یک جان ہو کر اٹھی ہے اور یہ آواز تھی سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۟ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (البقرۃ: 286) ہمیں تو اس کے سوا کچھ نہیں پتا۔ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ جو سنا اس پر عمل کیا۔ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۟ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ اور سننے اور اطاعت ہی میں اے رب ہمیں تیری غفران کی حرص ہے۔ ہم جو سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں تو اس غرض سے نہیں کہ جس کی اطاعت کرتے ہیں اس سے کوئی فیض ہمیں پہنچے گا یا اس کی محبت بذات خود ہمارا مطمع نظر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس لئے ہے کہ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا تا کہ تو ہم سے مغفرت کا سلوک فرمائے۔ وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ہم نے آخر تیرے حضور پہنچنا ہے۔ سارا حساب کتاب تیرے حضور پیش ہوگا۔

تو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کا مضمون ایک وہ ہے جو آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کے خدا تعالیٰ کی جانب رخ سے ہمیں معلوم ہوا۔ جب خدا کی طرف اپنا رخ فرمایا تو ہر وہ شخص جو اللہ کی

طرف سے تھا اس کے متعلق یہ اعلان ہوا ہے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ہمارا اور کوئی کام نہیں ہے لیکن جہاں جس کو مامور بنایا گیا ہے اس کے رخ سے دیکھیں تو اسے سمع اور اطاعت کی روح پیدا کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آرام کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ وہ تمام نفسیاتی تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں جن کے نتیجہ میں پھر یہ ایسی جماعت پیدا ہو۔ تو ایک طرف سے مضمون کو دیکھا جائے تو مضمون بعض دفعہ بگڑ جاتے ہیں اور غلط استدلال پیدا ہو جاتے ہیں اور لوگ غلط استدلال کے نتیجہ میں خود اپنی ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ اب یہی صورت حال اگر آج کل کے حالات پر جو جماعتوں میں رونما ہوتے رہتے ہیں چسپاں کر کے تفصیل سے دیکھیں تو آپ کے سامنے یہ مسئلہ خوب کھل کے آجائے گا۔ ایک امیر ہے جو اپنی رحمت اور شفقت کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ ذاتی تعلقات کو محض اس لئے نہیں بڑھاتا کہ خدا کی خاطر اب وہ مجبور ہے اور برداشت اور حوصلہ پیدا نہیں کرتا اور اس فکر میں نہیں رہتا کہ جس طرح بھی ممکن ہے مجھ سے محبت اور احسان کے رشتوں میں یہ لوگ باندھے جائیں۔ وہ امیر اپنی جماعت میں ویسی اطاعت کے نمونے نہیں دیکھ سکتا۔ ناممکن ہے بلکہ بسا اوقات وہاں ٹھوکر کے واقعات کثرت سے دکھائی دیں گے۔ چھوٹی سی بات ہوئی اور لوگ ناراض ہو کے بھاگ گئے۔ امیر سے نہیں بھاگے اپنی عاقبت سے بھاگ گئے۔ اپنی آخرت تباہ کر لی۔ لیکن اس صورت میں دونوں یکساں ذمہ دار نہیں ہیں تو کم سے کم کچھ نہ کچھ ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ برابر کا لفظ کہنا مشکل ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ بعض دفعہ ایک ذمہ داری کسی پر کم کسی پر زیادہ مگر ذمہ دار دونوں ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ان لوگوں کی بدنصیبی ہے جو ایسے امیر کی امارت میں ہیں جو ان سے رحمت اور شفقت کا سلوک نہیں کرتا اور اس امیر کی بھی بدنصیبی ہے جو کرتا بھی ہو تو کچھ خود سروں کا امیر بنایا گیا ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ امیر کے قصور کی وجہ سے خود سری نہیں آتی بعض جماعتوں میں کچھ گھٹلیاں بن جاتی ہیں۔ کچھ شریروں کی گھٹلیاں جن کا شغل ہی یہ رہتا ہے کہ کچھ ایک گروہ یہاں بنا لیا ایک گروہ وہاں بنا لیا اور تاک میں رہتے ہیں کہ امیر سے جو بھی ہو جب بھی کوئی غلطی ہو اس کو پکڑیں اور بلند آواز سے کہیں کہ یہ دیکھو یہ حرکتیں کر رہا ہے ہم اس کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ موقع ملے تو دھمکیاں بھی اس کو دیں۔ ایسے ظالموں کی کینسر کی گھٹلیاں بھی کئی جگہ موجود ہیں اور جہاں یہ موجود ہیں وہاں امیر کو ہم نے بدل بدل کے دیکھ لیا۔ انتہائی رافت کرنے والا، شفقت

کرنے والا امیر بھی بھیجیں تو اس کے ساتھ وہی بدتمیزی کا سلوک ہوگا بلکہ بعض دفعہ نسبتاً سخت امیر کے سامنے یہ لوگ جھک جاتے ہیں اور بعض دفعہ اس نیت سے سخت امیر مقرر کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ لوگ نیکی اور شفقت اور رحمت کی زبان سے بالکل نابلد ہو جاتے ہیں۔ان کو پتا ہی نہیں یہ زبان ہوتی کیا ہے۔وہ دوسری زبان کسی حد تک سمجھتے ہیں۔کوئی مضبوط امیر ہو جو بدتمیزیاں برداشت نہ کرے اور آگے سے اسی طرح دوٹوک جواب دے سکے تو وہ ماحول تو نہیں ہے جو اسلامی ماحول ہے اس کو تو میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔مگر بیماروں کی دنیا میں صحت مند قانون چلا بھی تو نہیں کرتے۔وہاں پھر یہ مضمون صادق آتا ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔روح ہی بد ہے تو فرشتے بھی تو ویسے ہی سخت گیر ہوں گے۔چنانچہ قرآن کریم نے اس مضمون کو جہنم کے تعلق میں بیان فرمایا ہے۔کہتا ہے جہنم کے فرشتے بھی بڑے سخت گیر ہیں۔کوئی رحم نہیں جانتے۔وہ جہنمی چیختے چلاتے رہتے ہیں کہ اے جہنم کے داروغے ہمارے لئے خدا سے کچھ مانگ۔وہ کہتا ہے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اوران کی سخت گیری جو ہے وہ اٹل ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔تو جیسی روح ویسے فرشتے کا مضمون محض محاورہ نہیں۔قرآن سے ثابت ہے کہ جیسے جیسے لوگ ہوں ویسے ویسے ہی فرشتے ان پر مسلط کئے جاتے ہیں۔چنانچہ مرتے وقت کے فرشتے آتے ہیں۔جو نیک لوگوں کے فرشتے ہیں وہ ان کے لئے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں ان کو محبت اور پیار سے تیار کرتے ہیں اپنے رب کے حضور حاضر ہونے کے لئے اور خوشخبریاں دیتے ہیں کہ تم ایک تکلیف کے مقام سے ایک آرام کے مقام کی طرف منتقل ہو رہے ہو اور جو سخت گیر فرشتے ہیں وہ ان لوگوں پر آتے ہیں جو ظالم ہیں۔ساری عمر انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کئے ہوں۔ان کو کہتے ہیں خود اپنی جانیں نکال کر باہر لاؤ۔اب اس قسم کا سخت منظر ہے کہ اس کو قرآن کریم میں پڑھتے ہوئے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔تو اس لئے یہ کہنا کہ بعض دفعہ لوگ سخت گیر مزاج کے مستحق ہو جاتے ہیں یہ قرآنی مضامین سے مختلف نہیں۔مگر اسے مثالی ماحول بہر حال نہیں کہا جا سکتا۔

مثالی ماحول تو وہی ہے جو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو اور آپؐ نے اپنی تمام زندگی میں اطاعت کو قائم کرنے میں جو نمونے دکھائے ہیں ان نمونوں کی پیروی کر رہا ہو۔اگر سو فیصدی نہیں تو کوشش ضرور ہو کہ ویسے نمونے پیدا ہوں۔جہاں یہ صورت حال ہو وہاں حضرت مسیح موعودؑ کی جماعت میں یہ خوبی ہے کہ وہ پھر اپنی جان بھی ایسے امیروں پہ نچھاور کرنے لگتی ہے۔صدر ہو خدام الاحمدیہ

کا، قائد ہو، زعیم ہو ان سب سے قطع نظر اس کے کہ ان کا کوئی رشتہ کوئی دوستی کا تعلق، کچھ مزاج میں ہم آہنگی ہے کہ نہیں وہ لوگ گہری محبت کا سلوک کرتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو قبول کر کے ہر پہلو سے اس پر عمل درآمد کی کوشش کرتے ہیں۔

پس اس پہلو سے جماعت کی تاریخ میں بہت سی بڑی بڑی جماعتوں کی ایسی مثالیں ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ کسی ایک امیر نے ایسا سلوک کیا تو آج تک ان جماعتوں کو اسی امیر کا فیض نصیب ہو رہا ہے اور اس کی نیکیوں کا پھل آج تک کھا رہے ہیں۔ اس کے لئے دعائیں نہ کریں تو ان کی بے پرواہی ہے، ناشکری ہے۔ مگر جو شخص نیک روایات پیچھے چھوڑ جائے، جس نے عرق ریزی کے ساتھ اور اپنا خون بہا کر محنت کر کے وہ پاکیزہ ماحول بنایا ہو جو بہترین اسلامی ماحول ہے جس میں امیر اپنے ماتحتوں پر فدا اور ماتحت اپنے امیر پر فدا، اس کی رضا پر نظر رکھنے والے ہوں یہ ماحول پھر بعض دفعہ نسلاً بعد نسلٍ ان لوگوں پر احسان کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض شریر اس کو بدلنے کی کوشش کریں، اس کے مزاج کو بگاڑ دیں۔ پس یہ وہ باریک باتیں ہیں جن میں سے ہر بات پر نظر رکھنی ہوگی۔

جماعت کو سمجھنا چاہئے کہ ہمارا دائرہ اختیار کیا ہے۔ اطاعت کہتے کس کو ہیں اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اطاعت تو اصل وہ ہے کہ مرضی کے خلاف ہو اور جان کی قربانی پیش کرنی پڑے۔ امیر، بحیثیت امیر جماعت کے تصور میں نہیں وہ بھی، جو بھی جس کو خدا نے کسی حکم پر فائز فرمایا ہو، جس دائرے میں بھی ہو، اس سے اگر غلطی بھی ہو جاتی ہے تو اس غلطی کو نظر انداز کر کے اپنے اطاعت کے فرائض میں کوئی رخنہ نہ پیدا ہونے دیں اور اس مضمون کو یاد رکھیں کہ میں اپنی جان، مال، عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا۔ یہ اطاعت کا وہ مضمون ہے جس کو حضرت مصلح موعودؓ نے اس عہد کی صورت میں ہمیں سمجھایا کہ اطاعت محض خشک اطاعت کا نام نہیں ہے کہ مرضی کی بات ہو تو اطاعت کرو، جہاں تکلیفیں اور آزمائشیں سامنے آئیں وہاں اطاعت سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ جان، مال عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لئے تیار رہوں گا۔ بعض لوگوں کو تو میں نے دیکھا ہے کہ یہ بھی لکھتے ہیں اس امیر نے لمبی باتیں کیں، ہمارا وقت ضائع کیا۔ فلاں بات کی ہمارا وقت ضائع کر دیا۔ اگر وہ ٹھیک ہے تو میرا فرض ہے کہ اس امیر کو سمجھاؤں اور اگر اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو وہ سرزنش کا

سزاوار ہو گیا ہے لیکن آپ کا یہ کام نہیں کہ امیر پر روزمرہ اٹھ کر ایسی باتیں کریں تم مجلسوں میں لمبی باتیں کرتے ہو ہمارا وقت ضائع کرتے ہو، بلایا ہے کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔ یہ دل کی بدتمیزیاں ہیں۔ ان کو حقوق قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ماتحت کے حقوق ہیں۔ ماتحت کا حق ہے تو امیر پر ہے کہ ان کے حقوق کا خیال رکھے لیکن ماتحت اس قسم کی باتیں خود نہیں کہا کرتا۔

آنحضرت ﷺ کو اپنے غلاموں کا اتنا خیال تھا کہ نماز سے بڑھ کر اور کون سا لمحہ ہے جو آپ کے دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہو مگر ایک بچے کے رونے کی آواز آپؐ کو نماز چھوٹی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس خیال سے کہ اس کی دردناک آواز اس کی ماں کے دل پر کیا اثر کرتی ہوگی نماز جلدی ختم کر دی لیکن کہیں ہم نے نہیں سنا کہ مائیں چیخ اٹھی ہوں کہ اے خدا کے رسول ﷺ تجھے نمازوں کی فکر پڑی ہوئی ہے ہمارے بچے رو رہے ہیں اور تجھے پرواہ ہی کوئی نہیں۔ یہ جہالت تھی اگر ہوتی۔ لیکن یہ شانِ محمد مصطفی ﷺ ہے کہ ایسا موقع آنے کا سوال ہی نہیں پیدا کبھی ہوا۔ وہ شخص جو دوسروں سے بڑھ کر ان کی تکلیفوں کا خیال رکھتا ہو اس کے اوپر جائز حملہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ تم نے بے پرواہی کی ہے اور اس پہلو سے آنحضرت ﷺ کی ساری زندگی میں ایک مرتبہ بھی کسی مسلمان کو یہ کہنے کا حق نہیں ملا کہ آپ نے ہم سے بے پرواہی کی اس کے نتیجہ میں ہم سے یہ واقعہ ہو گیا کیونکہ آپؐ سب کی ضرورتوں پر اپنی ضرورتوں کو قربان کر دیا کرتے تھے اور اس حد تک کرتے تھے کہ تعجب ہوتا ہے کہ انسان میں اتنی طاقت کیسے ہے، ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

بعض دفعہ بعض چیزیں اچھی بھی لگتی ہیں لیکن انسان اس حد تک ان پر عمل کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کے سارے نظام کے اندر، اس کے اندرونی نظام کے اندر گہری تبدیلیاں واقع نہ ہوں۔ پس آنحضرت ﷺ کے بعض کردار ایسے ہیں جن کو دیکھ کر ان کی عظمت کی وجہ سے سر سے ٹوپی گرتی ہے۔ اتنے بلند ہیں۔ مکارم الاخلاق پر آپؐ کو فائز کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بھی درست ہے کہ ہم پر لازم ہے کہ ان کی پیروی کریں لیکن یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تو یہ کیا تھا تم نے تو بالکل ویسا نہیں کر کے دکھایا۔ اخلاق کے مضمون میں اور انصاف کے مضمون میں ایک فرق ہے۔ انصاف کے تقاضے اگر امیر پورا نہیں کرے گا تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کو پکڑوں لیکن قربانی کے وہ نمونے نہ دکھا سکے جو آنحضرت ﷺ نے دکھائے ہیں تو صرف یہ نظر ہوگی کہ کوشش کرتا ہے کہ

نہیں۔اسے نصیحت تو کی جاسکتی ہے کہ تم یہ بھی تو کر سکتے تھے۔اس طرح بھی دل جیت سکتے تھے۔یہ قربانی،اس قربانی کا مظاہرہ کر سکتے تھے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے سرزنش کی جائے اور سختی کی جائے کیونکہ دو الگ الگ مضمون ہیں۔

آنحضرت ﷺ صرف فرائض کی دنیا تک نہیں رہے۔آپ کا قدم احسان کی طرف بلند ہوا ہے اور احسان سے ایتاء ذی القربیٰ میں جا کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بلندیوں میں آپ ﷺ کا وجود ہماری نظر کی رسائی سے بھی آگے نکل چکا ہے۔اس لئے ہر ایسی کوشش جو آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے وہ بھی تجزیہ کے لحاظ سے مختلف مراتب رکھتی ہے۔بعض جگہ وہ کوشش فرض میں داخل ہے۔بعض جگہ وہ کوشش نوافل میں داخل ہے لیکن نوافل کہہ کہ اسے نظرانداز کرنے والا بھی فرض کو نظر انداز کر رہا ہے۔اب بظاہر اس بات میں تضاد ہے لیکن کوئی تضاد نہیں ہے۔ایک فرائض کی دنیا ہے اس میں امیر کا فرض ہے کہ ان سب تقاضوں کو پورا کرے جو امیر کے اوپر لازماً عائد ہوتے ہیں اور جماعت سے ایک خاص رنگ کا سلوک جس کی تفصیل میں آپ کو بتاؤں گا اس طرح وہ سلوک کرے اور کسی سے کوئی امتیاز نہ کرے لیکن کس حد تک وہ ان کی بدتمیزیوں کو برداشت کرے گا،کس حد تک ان کے دکھوں پر شکوہ نہ کرتے ہوئے دعا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ان کی مدد چاہے یہ وہ احسان والا مضمون ہے جس کے متعلق ہر شخص کے اپنے اپنے حالات ہیں،اپنی اپنی صلاحیتیں ہیں۔ان صلاحیتوں کے علاوہ ہر شخص کا پس منظر الگ الگ ہے،اس کا خاندان الگ الگ ہے۔جس خاندان میں وہ پل کر بڑا ہوا ہے اس کے روزمرّہ کے معاملات کے طریق اس پر اثرانداز ہیں،اس کی طبیعت پر ایک چھاپ لگ گئی ہے۔یہ خیال کر لینا کہ حضور اکرم ﷺ کی سنت کا حوالہ دے کر اچانک اس کو نرم رُو بنا دو گے یہ ممکن نہیں ہے۔لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میں چونکہ سخت رُو ہوں اور میں نے اپنے ماں باپ سے یہ سختیاں سیکھی ہوئی ہیں اس لئے مجھے حوالہ نہ دو سنت کا یہ اس کی فرض ناشناسی ہوگی بلکہ گستاخی اور بدتمیزی ہوگی۔اس کا صرف یہ کام ہے کہ ہاں میں نے سن لیا،میں ادب کرتا ہوں،احترام کرتا ہوں جو تم نے حوالہ دیا ہے بہت بڑا ہے۔میری مجال نہیں ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکوں مگر تم بھی دعا کرو میں بھی کوشش کروں گا کہ آئندہ اس پہلو سے بہتر نمونہ دکھا سکوں۔

پس جو فرائض جس جس پر عائد ہوتے ہیں،جو جو حسن و احسان کے تقاضے جس جس پر عائد

ہوتے ہیں ان کی کوشش کرنا اور دیانتداری سے کوشش کرنا نظام جماعت کی حفاظت کے لئے اور اس کے استحکام کے علاوہ اس کی بقاء اور ہمیشہ ہمیش جاری رکھنے کے لئے بڑا ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔ یہ باریک پہلو ہیں جن کے اندر نظام جماعت کی جان مضمر ہے۔ ان باریک پہلوؤں سے نظر اٹھائیں گے تو اسی حد تک نظام جماعت بیمار پڑنا شروع ہو جائے گا۔ اس کے اندر ایسی کمزوریوں کی علامتیں ظاہر ہو جائیں گی جو رفتہ رفتہ پھر ایسے نظاموں کو پارہ پارہ کر دیا کرتی ہیں۔ تو میں جن باتوں کی طرف آپ کو توجہ دلا رہا ہوں ان کو معمولی نہ سمجھیں۔ میری نظر آئندہ لمبے عرصے تک ہے۔ **میری یہ تمنا ہے کہ جماعت احمدیہ ان اعلیٰ اخلاق پر اور ان اقدار پر اتنی مضبوطی سے قائم ہو جائے کم سے کم ان اقدار پر جو نظام جماعت کے لئے لازم ہے کہ پھر ہم اطمینان کی حالت میں اپنی جانیں خدا کے حضور سپرد کر سکیں۔** ہم کہہ سکیں کہ اے خدا جہاں تک ہم میں طاقت تھی، جہاں تک کوشش تھی ہم نے تیرے نظام کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی زندگیوں کی قربانیاں پیش کر دی ہیں اور ہم خوشی سے تیرے حضور آ رہے ہیں یہ کہتے ہوئے، جانتے ہوئے کہ یہ جماعت اب ایک نسل میں تباہ ہونے والی جماعت نہیں رہی۔ نسلاً بعد نسلٍ ان کی خوبیاں تیرے قائم کردہ آسمانی نظام کی حفاظت کے لئے ہمیشہ قربانیاں پیش کرتی رہیں گی۔ یہ وہ روح اور جذبہ ہے جس کی خاطر میں آپ کو یہ باتیں سمجھاتا ہوں اور ان کی آزمائش کا وقت آپ پر روز نہ آتا ہے اور اس وقت اگر آپ بیدار مغزی سے اپنے حالات کا جائزہ لیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ آپ کتنی دفعہ کامیاب ہوئے ہیں، کتنی دفعہ ناکام ہوئے ہیں تو اس وقت تک آپ کو یہ باتیں سننے کے باوجود بھی عمل کی توفیق نہیں مل سکتی۔ روزمرہ اپنی زندگی کے حالات میں ان کو جاری کر کے دیکھیں۔

اب میں واپس آتا ہوں امیر کی ذمہ داریوں کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے۔ جہاں تک امیر کے فرائض کا تعلق ہے اس پر لازم ہے کہ وہ سب سے یکساں ہو جائے اور سب سے یکساں ہونے کے لئے ایک اور اس میں خوبی پیدا ہونا ضروری ہے کہ وہ چند لوگوں کو اپنے اوپر قبضہ نہ کرنے دے۔ یہ فطری کمزوری کا رجحان ہے جو ہمیں دنیا میں ہر نظام میں ملتا ہے جو بالآخر اس نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھٹو صاحب جب برسرِ اقتدار آنے والے تھے اور ان کی مجلس لگی ہوئی تھی ایک ہوٹل میں تو میرا چونکہ ان کے ساتھ آنا جانا تھا، تعلقات تھے، میں بھی ان کو مبارکباد دینے گیا۔ تو

انہوں نے مجھے یہ کہا کہ ملتے رہا کرو آئندہ بھی۔ مطلب یہ تھا کہ اب میں حکومت میں آ گیا ہوں لیکن یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے تعلقات کو اس وجہ سے قربان کردوں کہ میں کوئی بڑا آدمی بن گیا ہوں۔ شاید ان کے ذہن میں یہ تھا یا کچھ اور بات ہوگی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو آئندہ ملنے جلنے کا وعدہ لینے کے لئے نہیں آیا۔ یہ بتانے آیا ہوں کہ اب ملنا جلنا ختم ہو گیا ہے۔ اچانک ساری مجلس پر ایک سناٹا سا چھا گیا کہ کیسی عجیب بات کر گیا ہے یہ اور بھٹو صاحب نے ایک دم سب باتیں چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو کے سوال کیا، کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ یہ کہنے آئے ہو کہ اب تم مجھ سے ملنا جلنا بند کر دو گے۔ میں نے کہا ہاں میں یہی کہنے آ رہا ہوں۔ کہتے ہیں کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا مطلب یہ ہے کہ میں نے سیاست کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوا ہے اور مشہور جو بڑی بڑی شخصیتیں ہیں ان پر میری نظر رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اچھے سے اچھا سیاست دان بھی نیک سے نیک نیتیں لے کے بھی جب اوپر آتا ہے تو اس کے اردگرد جو جھوٹی تعریفیں کرنے والے اس کی طاقت میں Share کرنے کی خاطر، اس میں حصہ ڈالنے کی خاطر اس سے چمٹ جاتے ہیں جیسے مکھی گڑ پہ بیٹھ جائے آ کے۔ وہ ہیں جو اس گڑ کو ناپاک کر دیتے ہیں پھر اور بڑے بڑے سیاست دان جو بڑی نیک اور پاک نیتیں لے کے آئے تھے جب طاقت پر قابض ہوئے تو ان ظالموں نے جو اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں انہوں نے ان کو خراب کر دیا اور میں جھوٹی تعریف لے کر کبھی کسی سے نہیں مل سکتا اور سچی بات پھر حاکم کو بری لگتی ہے اور سیاست دان برداشت کر لیتا ہے جب تک وہ حاکم نہ ہو۔ اب آپ صرف سیاست دان ہی نہیں رہے آپ حاکم ہو گئے ہیں اور میں وہی ہوں مجھ پر کوئی تبدیلی نہیں۔ نہ مجھے آپ سے کوئی حرص، نہ کوئی لالچ اور ملنا نہ ملنا اس پہلو سے برابر ہے۔ تو مجھے خطرہ ہے کہ اب میں ملا اور میں نے سچی باتیں کیں تو پھر آپ کو تکلیف پہنچے گی تو بعد میں جو تعلق توڑنے ہیں ابھی کیوں نہ توڑ لئے جائیں۔ یہ باقی جو باتیں ہیں اس کو میں چھوڑتا ہوں۔

میں مثال دے رہا ہوں کہ یہ جو مضمون ہے کہ ایک صاحب اقتدار کو لوگ گھیرے میں لے لیتے ہیں یہ ایک دائمی مضمون ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ پر اس کا برابر اطلاق ہوتا ہے اور اس تاریخ کا محض سیاست سے تعلق نہیں۔ اقتصادیات سے بھی تعلق ہے اور دوسرے انسانی زندگی کے دائروں سے بھی تعلق ہے۔ جہاں کسی آدمی کو بڑا ہوتے دیکھیں وہاں پرانے رشتے یاد آ جاتے ہیں۔ پرانے

تعلقات کے حوالے سے انسان اس کے گرد اکٹھا ایک جمگھٹ شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مجھے یاد ہے مجھے اس پہ ہنسی بھی بہت آئی مگر واقعہ ہے جو انسانی فطرت کی کمزوری کو ظاہر کرنے کے لئے دلچسپ ہے۔ ایک احمد نگر کی خاتون تھیں ان کے بیٹے نے ذکر کیا کہ ضیاء الحق صاحب کا یہ حال ہے دیکھو ذرا اخلاق۔ میری ماں نے فون کیا تو فون ہی نہیں اٹھایا اس کا اور ہونے ہی نہیں دیا حالانکہ وہ بھی آرائیں ہم بھی آرائیں۔ اب آرائیں کا رشتہ اور وہ بھی جالندھر کے یہ بھی جالندھر کے تھے یہ اتنا پکا ہو گیا کہ پہلے ساری عمر تو ضیاء کا خیال نہیں آیا ان کو، وہ حکومت پہ آیا تو آرائیت جاگ اٹھی اور اس خیال سے اس کے گرد اکٹھے ہونے لگ گئے۔

یہ گرد اکٹھے ہونے والے بعض دفعہ بہت ہی خطرناک نتیجے پیدا کرتے ہیں اور جماعت میں یہ نہیں ہونے دینا چاہئے کسی قیمت پر بھی۔ اگر آپ کے گرد کچھ لوگوں نے ایسا گھیراؤ کر لیا جو آپ کو جماعت سے الگ کر دیں ان معنوں میں کہ جماعت کے تمام تاثرات ان سے فلٹر ہو کر آپ تک پہنچیں اور براہ راست جماعت میں یہ اعتماد نہ رہے کہ آپ ان کے اسی طرح برابر ہیں اور ان کے خلاف اسی طرح بات سننے کے لئے تیار ہیں جیسے ان کی بات سنتے ہیں تو پھر آپ کی امارت اسی حد تک کمزور پڑ جائے گی۔ اس لئے بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں نے جنہوں نے خدمتیں کرنی ہیں انہوں نے اکٹھے ہونا ہی ہونا ہے لیکن اب یہ آپ کا کام ہے کس کو اکٹھے کرنا ہے۔ کس کو اکٹھے اپنے گرد جمع نہیں ہونے دینا اور اگر ہوتے ہیں تو اس کو اپنے مرتبے اور مقام پہ رکھیں۔ ان کی مجال نہیں ہونی چاہئے کہ آپ کے ان معاملات میں دخل انداز ہوں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد فرائض منصبی کے طور پر کئے ہیں۔ ایسی صورتوں میں صرف یہ جماعت کے دوسرے افراد کا تعلق نہیں۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ بیویوں کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور فرائض ہیں امارت کے یا صدارت کے اور بیوی کے جو تعلقات ہیں دوسری عورتوں سے وہ تعلقات اس کے فرائض منصبی پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہے فلاں جو عورت ہے نا اس کا خاوند تو بہت بے ہودہ ہے اور وہ ایسا ہے یا فلاں عورت جو ہے وہ بیچ میں سے آپ کو پسند نہیں کرتی۔ فلاں ماحول میں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ کچے کانوں والا خاوند، وہ زنخوں کی طرح اپنے فیصلے پر چلنے کی بجائے اپنی بیوی کے تابع چلتا ہے جب کہ یہ دلداری اور اخلاق نہیں ہیں۔ یہ بزدلی اور نامردی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ نظام جماعت سے

بے وفائی ہے۔ کسی عورت کا کوئی کام نہیں ہے کہ جس منصب پر اس کا خاوند فائز ہوا ہے اس منصب سے تعلق میں کسی طرح بھی اس پر اثر انداز ہو۔ سوائے مغفرت رحم اور شفقت کے۔ یہ الگ مضمون ہے۔ شفقت اور رحمت اور مغفرت کی استدعا کرنا یہ تو بالکل اور بات ہے مگر پولیٹیکل Issue بنا لینا اس کو کہ چونکہ میرا خاوند ایک مامور ہے کسی منصب پر اس لئے میں اس کو بتاؤں کہ فلاں اچھا ہے، فلاں برا ہے، فلاں یوں کرتا ہے، فلاں یوں کرتا ہے۔ یہ باتیں بالکل ناجائز ہیں، کسی قیمت پر قبول نہیں ہونی چاہئیں۔

اس پہلو سے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ میں نے جو اپنی بیوی سے تعلق رکھا ہمیشہ صرف ایک دفعہ ایک واقعہ ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح نے کچھ ناراضگی کا اظہار کیا مجھ پر تو میری بیوی کے دل پہ چوٹ لگی تو اس نے کچھ لفظ کہے۔ اس دن میں نے ان کو کہہ دیا کہ آج کے بعد پھر یہ نہیں ہوگا۔ کبھی ہوا تو تم سے کاٹا جاؤں گا اور خلیفۂ وقت کا ہو کے رہوں گا۔ چاہے وہ مجھے جوتیاں ماریں چاہے مجھے غلام رکھیں مجھے تمہاری محبت پسند نہیں ہے اس غلامی کے بدلے جس پر تمہارے الفاظ کا منفی اثر میں نے دیکھا ہے۔ وہ دن اور موت کا دن ایک دفعہ بھی کبھی ساری عمر انہوں نے میرے فرائض کے تعلق میں کبھی اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں صدر خدام الاحمدیہ رہا، میں وقف جدید میں رہا، میں انصار اللہ میں بھی رہا اشارۃً یا کنایۃً بھی انہوں نے مجھے کبھی کوئی بات نہیں کہی اور یہی حال ہمارے گھر کے ماحول کا تھا ہمارے نوکروں، ہمارے بچوں کا۔

بعض دفعہ لوگ ایسے بے وقوف ہیں اور ایسے کچی فطرت کے لوگ ہوتے ہیں، کچی عادتوں کے، کہ وہ اپنی عادتیں دوسرے کی طرف اس طرح منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک لکھنے والے نے مجھے لکھا کہ وہ جو ساری عمر آپ کے گھر نوکر رہی ہے وہ آپ کے اوپر چونکہ اثر انداز ہو جاتی ہے باتیں کر کے اس لئے آپ نے بعضوں کے متعلق اچھی رائے قائم کر لی ہے بعضوں کے متعلق نہیں۔ اس بے چاری کا تو یہ حال ہے کہ اس کے داماد کو میں نے جماعت سے خارج کیا اور مجال نہیں کہ اشارۃً بھی کبھی کوئی زبان پہ حرف لائی ہو۔ وہ جانتی ہے اس کی تربیت میرے گھر میں ہوئی ہے اس کو پتا ہے کہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جماعتی معاملات میں اسے زبان کھولنے کی اجازت دی جائے گی۔ پس یہ میں اس لئے مثالیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ میں ان تجربوں سے گزرا ہوا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ

کوششیں ہوتی ہیں اور مہلک ہوتی ہیں اور جو لوگ پھر قریبی بن جائیں، مصاحب بن کے رہیں جماعت میں، وہ سارے تقویٰ کا نظام بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں کیونکہ پھر لوگوں کی نظر اللہ پر نہیں بلکہ ان کو خوش کرنے پر ہوتی ہے۔ یہ کوئی معمولی مصیبت نہیں ہے یہ تو ایک عذاب ہے جو امیر یا عہدیدار سہیڑ لے گا اگر وہ لوگوں کی باتوں میں آئے اور لوگوں کی باتیں سنے۔ یہ درست ہے کہ اگر نہ بھی سنیں گے تو الزام تو لگنے ہی ہیں جیسا کہ میں نے اپنے متعلق بتایا ہے الزام لگانے والے نے لگا دیا۔ مگر اس الزام تراشی سے تو محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی الگ نہیں رکھا گیا، میری کیا حیثیت ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر بھی لوگ بدتمیزی سے زبانیں دراز کرتے ہیں اذن ہے یہ تو۔ یہ تو کان ہے لوگوں کی باتیں سنتا، ان پر عمل کرتا۔ فرمایا اذن خیر لکم۔ اذن تو ہے مگر اچھی باتوں کا اذن ہے۔ جہاں تمہاری بھلائی دیکھتا ہے اس کا کان جھک جاتا ہے اس طرف قبول کر لیتا ہے۔ جہاں برائی کا سوال ہے وہاں سوال ہی نہیں، ہرگز ممکن نہیں کہ آپ اس رسولؐ کو اذن کہہ سکیں کسی پہلو سے بھی۔ ہر بات کی تحقیق کرتا ہے، جائزہ لیتا ہے، انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے، پھر تسلیم کرتا ہے ورنہ سنی سنائی باتوں کو نہیں مانتا۔ تو خیر کے حق میں سنی سنائی بھی قبول کر لیتا ہے۔ جہاں بھلائی پہنچنی ہو وہاں ضروری نہیں کہ پہلے سو فیصدی ثابت ہو جائے کہ اتنا اچھا ہے اس لئے اس کو انعام دیا جائے۔ کسی نے اچھا کہا تو انعام کے لئے طبیعت کھل گئی اور انعام کا سلسلہ جاری بھی ہو گیا۔ یہ اذن خیر ہے۔ کسی نے کسی کی بھلائی کی اچھی بات کہی تو فوراً دل پر قبول کر لیا کیونکہ اس سے پہلے ہی محبت ہے اور تعلق ہے۔ یہ نظام جو ہے اذن کا یہ مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں انسانی زندگی میں جاری ہے۔

تو بعض لوگ اذن سیئہ ہوتے ہیں اذن خیر کی بجائے۔ یعنی برائی کے کان ہو جاتے ہیں اور بھلائی کے کان نہیں رہتے۔ ایسے لوگوں کو پھر جتنی بھی آپ برائیاں پہنچائیں گے وہ قبول کرتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ برائی کی بات سننا ان کا چسکا بن جاتا ہے اور اس عادت نے محض نظام پر بعض دفعہ برے اثر نہیں ڈالے بلکہ اکثر گھروں کے امن کی تباہی کی یہی وجہ بنتی ہے۔ اگر گھر کے بڑے، خاوند یا بیوی یا ساس یا سسر یا ماں باپ جس حیثیت سے بھی آپ ان کو دیکھیں ان کے اندر یہ عادت ہو کہ برائی سنیں اور اسے قبول کریں اور اسے قبول کرنے میں لطف اٹھائیں اور یہ سمجھیں کہ اب ہمیں فلاں کے خلاف ایک بات ہاتھ آ گئی ہے۔ یہ جو ہاتھ آنے والا مسئلہ ہے اور یہ مزہ کہ

ہمیں پتہ لگ گیا ہے کہ فلاں میں کیا برائی ہے یہی انسانی زندگی میں ایک تباہی مچا دیتی ہے انسانی زندگی کا امن لوٹ لیتی ہے۔ مگر نظام جماعت میں تو اگر داخل ہوگی تو اس کے بہت ہی بداثر پیدا ہوں گے اور دیر تک، دور تک اس کے اثرات جائیں گے۔ اس لئے ہم نے اگر نظام جماعت کی حفاظت کرنی ہے تو ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔

کسی امیر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ چند لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جائیں یا چند لوگوں کے گھیرے میں اس طرح دکھائی دے کہ دوسری باقی جماعتوں پر یہ تاثر ہو کہ یہ ہم سے الگ ہو گیا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے۔ ایسی صورت میں پھر میرا تجربہ ہے کہ لوگ پھر امیر کو نہیں ان لوگوں کو باتیں سناتے ہیں اور ان سے تعلقات بڑھاتے ہیں ان کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں اپنی جہالت کی وجہ سے کہ اس کو خوش رکھیں گے تو ہماری باتیں ہوں گی۔ تو تقویٰ کہاں باقی رہا؟ تقویٰ تو خدا کو خوش کرنے کا نام ہے اور ایسی صورت میں فیصلے سارے ہی غلط ہوتے ہیں اور اس مزاج کے لوگ اگر امیر کو براہ راست خوش کرنے کی کوشش کریں گے وہ بھی تقویٰ سے خالی بات ہوگی کیونکہ ان کو پتا نہیں کہ امیر کا مزاج اور خدا کا مزاج ہم آہنگ ہیں۔ اگر ہم آہنگ ہوں تو کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر امیر کے مزاج پر ان کی نظر ہے اور وہ صحیح جانتے بھی نہیں کہ امیر کا مزاج ہے کیسا تو اس مزاج کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں بسا اوقات وہ اللہ کی رضا کے خلاف ہوتے ہیں اور امیر کو خوش کرنے کی خاطر خدا کو ناراض اور بعض دفعہ امیر کو بھی ناراض کرتے ہیں کیونکہ امیر کا مزاج غلط سمجھے ہوتے ہیں۔ اپنی ٹیڑھی سوچ کو ایک بچارے امیر کی طرف منسوب کر دیا اور پھر اس سوچ کی خدمت کرتے ہوئے، اس کی مطابعت کرتے ہوئے غلط کام کر بیٹھے اور جب ناراضگی ہوئی تو پھر ان کے لئے اور مصیبت اور ٹھوکر کا موجب۔

تو یہ جو میں عمومی حوالے دے رہا ہوں یہ فرضی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو بات بھی میں کہہ رہا ہوں اس کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ میرے سامنے لمبے ذاتی تجارب ہیں اور ہر بات کے پیچھے ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ اپنی بات میں نے ذاتی تجربے کے طور پر تو بیان کر دی مگر اب سب کا حال کھولنا اس لئے بھی مناسب نہیں کہ بعض باتیں جب میں بیان کروں گا تو آپ میں سے بعض جماعتوں کے لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ فلاں کے متعلق بات ہو رہی ہے، یہ فلاں کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ پھر اور بھی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر تقویٰ کو فوقیت دیں اور امیر

کا یہ فرض ہے کہ ایسے تاثرات کو اپنے سے زائل کرنے کی کوشش کرے اگر اس میں کچھ بھی جواز ہے اور اگر جواز نہیں ہے تو پھر بھی ظالم لوگ تو ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں پھر اس کا فرض ہے مستغنی ہو جائے اور یہ ایک دوسری صفت ہے جو امیر میں ہونی ضروری ہے جو حضرت رسول اللہ ﷺ میں تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس صفت کو بڑے پیار کے ساتھ نہ صرف قبول فرمایا بلکہ اسے فروغ دینے کے لئے قرآن کریم میں آپ کے اس مزاج کو صادر فرما دیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جو بہت ظالمانہ بہتان لگا ہے۔اس بہتان کے تعلق میں سب سے زیادہ صدمہ تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو تھا لیکن آپؐ نے اس ذاتی صدمے کی وجہ سے ان ظالموں سے خیر کے سلوک کو بند نہیں کیا، نہ پسند کیا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق روایت ہے آپؓ نے بعض ایسے لوگوں سے جو اس ظلم میں بالواسطہ شریک ہو گئے تھے احسان کا سلوک بند کر دیا، جو خدمت کیا کرتے تھے ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اس سے ہاتھ روکا تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔آپ نے فرمایا کہ وہ انسانی ضرورتیں اور محتاجیاں الگ مسئلہ ہے۔اس وجہ سے ایسا فعل نہ کرو۔تو دیکھیں قرآنی تعلیم سنت محمد یہ ﷺ میں ڈھل کر کیسے عظیم نمونے پیدا کر رہی ہے جن کی کوئی تصویر سارے جہان میں نیکوں کے اندر بھی دکھائی نہیں دیتی۔ بہت باریک لطائف ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ کردار کی باتیں، جو نظام جماعت سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں صرف ان پر میں کہتا ہوں اگر نظر رکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔

خدا تعالیٰ بار بار بیان فرما رہا ہے کہ فلاں شخص منافق ہے، دھوکے باز ہے، قسمیں کھاتا ہے تجھ پر ایمان لایا مگر نہیں لایا۔مگر اس کے باوجود آنحضرت ﷺ اپنے روزمرّہ کے کردار میں اور اپنے نظام کے فرائض کی ادائیگی کے تعلق میں ان سے قطعاً ادنیٰ بھی ناانصافی کا سلوک نہیں کرتے۔ یہ خدا نے راز کی بات بتائی ہے۔ یہ اللہ کی مرضی ہے جس پر جس کا عیب چاہے کھول دے۔مگر جہاں تک دنیا کے تقاضے ہیں اس علم کے باوجود آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ جب تک انصاف کے پورے تقاضے انسانی سطح پر پورے نہ ہوں کوئی قانونی ردعمل دکھانے کا حق نہیں ہے۔ کچھ مزاج ہی ایسا تھا مگر مزاج کے علاوہ بھی عدل کے اعلیٰ مضامین کو اور اعلیٰ اصولوں کو جس باریکی سے آنحضرت ﷺ سمجھتے تھے دنیا میں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔پس اس پہلو سے آپ کا جو نمونہ ہے وہ یہاں بھی تو جاری ہونا چاہئے۔

اب بعض لوگ امیر کے متعلق بعض باتیں کہتے ہیں اور وہ اُس تک پہنچ جاتی ہیں۔ اِس کے متعلق پہلا ردعمل تو یہ ہونا چاہئے کہ اگر اس نے واقعی سنجیدگی سے بات کو لینا ہے تو فرض ہے کہ وہ تحقیق کرائے اور پوری تحقیق انصاف سے کروائے۔ اس وقت تک جب تک تحقیق نہ ہو ایسے شخص سے اپنے تعلقات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے اور اگر تحقیق کروالے تو پھر یہ دیکھے کہ کس حد تک اس میں عفو کا حوصلہ ہے، مغفرت کا حوصلہ ہے اور یہ دیکھے کہ کس حد تک عفو اور مغفرت ان کی اصلاح کا موجب بن سکتے ہیں۔ تو پھر اپنے عفو اور مغفرت کی جھولی میں ہاتھ ڈالے اور ان سے وہ احسان کا سلوک کرے جو ان کی اصلاح کا موجب ہوسکتا ہے۔ اس طرح جو بگڑے تگڑے جیسے کہتے ہیں محاورے میں، بگڑے تگڑے لوگ جو ہیں وہ بھی ٹھیک ہونے لگتے ہیں اور دن بدن سرکشوں اور بدوں کے دائرے تنگ ہونے لگتے ہیں اور یہ نہ ہو تو پھر ان کے دائرے رفتہ رفتہ بڑھنے لگ جاتے ہیں۔

اور یہی ہے جو مجھے فکر لاحق ہے کہ امارت کے حقوق ادا کرنے کی طرف تو میں نے جماعت کو توجہ دلائی اگر امیر کو اپنے حقوق ادا کرنے کی طرف تفصیل سے توجہ نہ دلائی تو جماعت میرے تعلق میں اس اعلیٰ تقویٰ پر قائم ہو تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور قرآن کے فرمان کے پیش نظر عمل درآمد کرے گی بھی تو اس میں جان نہیں ہوگی۔ سچی جان پڑ ہی نہیں سکتی اور پھر اس حالت کو کوئی بقا نصیب نہیں ہوسکتی۔ کوئی ایسا وقت آ سکتا ہے بیماری کا جیسے موسم بدلیں تو بعض بیماریاں سر اٹھا لیتی ہیں۔ کوئی ایسے حادثے پیش ہو سکتے ہیں ایسی جماعتوں میں کہ جہاں دبی ہوئی ناانصافی کے احساس اس وقت سر اٹھا لیں اور ایک باغیانہ رجحان پیدا ہو جائے۔ تو بعض کمزوریاں ایسی ہیں جن کے بیج بعض دفعہ باقی رہتے ہیں اور بیج ان کے کلیتہً مٹائے جا ہی نہیں سکتے۔ اصل میں صرف دیکھنا یہ ہے کہ بیج نشوونما پا کر بڑھ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں یا پھیلے ہوئے سکڑنے لگ گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنے تنے تک آ گئے اور تنے سے بھی ٹوٹ کر، مرجھا کر پھر وہ جڑوں تک پہنچ گئے ہیں اور جڑیں بھی پھر مرجھانے لگیں۔ یہ دو ہی رجحان ہمیں قدرت میں ملتے ہیں۔ اب دیکھیں بعض موسموں میں بعض درخت کس طرح زور کے ساتھ پتے نکالتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ وہ جو دور ہٹے ہوتے ہیں راستوں کے کناروں پر رفتہ رفتہ راستوں پر قبضہ کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ کھلے راستوں سے بھی گزرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی شاخیں ہر طرف سے آ کر خالی جگہوں پر قابض ہو جاتی ہیں اور جب ان

پر بُرے دور آتے ہیں تو وہ سکڑنے لگتے ہیں، ان کی شاخیں ہٹتی ہیں پھر ٹوٹنے لگتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی اصل جگہ پر پہنچیں تو سڑک ساری کھلی کھلی صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ تو اسی طرح جماعتوں میں منافقوں کا حال ہے اور بدکاروں کا حال ہے۔ باغیوں کا حال ہے۔ وہ فضا ان کے لئے پیدا نہ کریں کہ ان کی شاخیں آگے بڑھیں اور صراط مستقیم پر قبضے کرنے لگیں۔ اگر آپ نے توجہ نہ کی تو یہ خطرہ ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ ان کے لئے وہ ماحول رکھیں کہ ان کو صراط مستقیم میں داخل ہو کر راہرووں کے لئے مشکل پیدا کرنے کا وہم و گمان بھی باقی نہ رہے۔ بیماریاں پالے ہوئے بیٹھے ہیں تو بیٹھے رہیں، اپنے دلوں میں سکیڑے رہیں۔ مگر امارت کا اور نظام جماعت کا یہ کام ہے کہ ان کی بیماریوں کی نشوونما کے حق میں کوئی فضا پیدا نہ ہونے دیں۔

جو امیر ان فرائض کو اس طرح سمجھ کر اپنی جماعت کی عمومی صحت پر نظر رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ وہاں یہ مریض سکڑنے لگتے ہیں، ان کے اردگرد بیٹھنے والے کم ہونے لگتے ہیں، ان کی مجلسیں اجاڑ ہونے لگتی ہیں یہاں تک کہ بعض دفعہ وہ اکیلے اکیلے رہ جاتے ہیں یا دو تین ساتھ کے اور ان سے لوگ خود ہی تعلق توڑ لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم تنہا چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ بے چین ہوں گے تو اپنی جگہ ہوتے رہیں مگر جماعت کی صحت پر وہ کبھی بد اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ اب اپنے تجربے سے آپ جن جن جماعتوں کو، جن جن حالات کو جانتے ہیں اس مضمون کو سمجھنے کی کوشش کریں اور نظر دوڑائیں تو آپ کو سب کچھ دکھائی دینے لگ جائے گا کہ ہر جگہ یہی ہوتا رہتا ہے۔ بعض جگہ بیماریوں کے اڈے بڑے بڑے ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے ایک عام فتنہ آ گیا، ایک زلزلہ برپا ہو گیا، اس طرح لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ بعض دفعہ اس کا برعکس منظر ہے۔

لیکن یہ مضمون چونکہ لمبا ہے ابھی۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں وقت ہو گیا ہے۔ سردست یہاں اس کو ختم کرتا ہوں۔ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نوٹ کر لیں جہاں سے بات ختم کی تھی تا کہ پھر آئندہ خطبے میں انشاء اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو آگے بڑھاؤں گا۔ مگر آئندہ خطبہ یہاں نہیں دیا جائے گا وہ کسی اور ملک میں ہوگا اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ براہ راست وہاں سے یہاں آپ اسے سن سکیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ توفیق بخشے گا تو جن کے پاس یہ ڈش انٹینا نہیں ہیں وہاں جماعتوں کو چاہئے ان کے لئے انتظام کریں کہ جماعتی مراکز میں اکٹھے ہو کر وہ اس خطبہ کو براہ راست سن سکیں۔ باقی آخر پہ دعا

کی درخواست ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ یہ سفر ہر پہلو سے، ہر لحاظ سے اپنوں اور دوسروں سب کے لئے مبارک فرمائے۔ آمین

ہر صاحب امر کو اپنے ماتحتوں سے محبت، شفقت اور رحمت کا سلوک کرنا چاہئے

(خطبہ جمعہ فرمودہ 21 / جون 1996ء بمقام بیت السلام ٹورانٹو۔ کینیڈا)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (الشعراء: 214 تا 221)

پھر فرمایا:

ان آیات کے مضمون سے متعلق کچھ گزارشات کرنے سے پہلے میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ آج خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ جماعت احمدیہ کینیڈا کو اپنا بیسواں جلسہ منعقد کرنے کی توفیق عطا ہو رہی ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ گزشتہ جتنے جلسے ہیں ان میں ہر سال قدم ترقی کی طرف آگے بڑھتا رہا ہے اور ہر سال کوئی نہ کوئی نیا سنگ میل رکھنے کی توفیق ملتی رہی ہے۔ امسال کا جلسہ سالانہ اپنے ساتھ ایک اور قسم کی خوش خبری بھی لایا ہے جس کا تعلق صرف جماعت کینیڈا سے نہیں بلکہ بطور خاص جماعت انگلستان سے بھی ہے اور عموماً تمام دنیا کی جماعتوں سے ہے۔ اب تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے ٹیلی ویژن کے ذریعے مرکزی پیغام اور مرکزی مجالس تمام دنیا میں دیکھی اور سنی جاسکتی تھیں۔

گزشتہ ایک موقع پر میں نے جماعت سے یہ گزارش کی تھی کہ میں امید رکھتا ہوں کہ وہ دن بھی آئیں گے جب ہم دوطرفہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ پس آج کے مبارک جمعہ سے اس دن کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس وقت انگلستان میں مختلف مراکز میں بیٹھے ہوئے احمدی دیکھ رہے ہیں اور ان کی تصاویر یہاں پہنچ رہی ہیں اور بیک وقت ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر جو منتظمین Mix کرنے پر مقرر ہیں ان کو یہ خیال کیوں نہیں آرہا کہ جب میں یہ کہہ رہا ہوں تو وہ بھی دکھا دیں جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب یہ بھی دکھائے ہیں تو شیخ مبارک احمد صاحب دکھائے ہیں جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب سامنے، اب دیکھ لیجئے امام مسجد فضل لندن عطاء المجیب راشد وہ ہمیں سامنے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں، میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ ان کے پیچھے جو مختلف احباب جماعت لندن کھڑے ہیں وہ بھی ہاتھ ہلا رہے ہیں اور بیک وقت ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں اور مجھے سن رہے ہیں لیکن ان کے دل کی دھڑکنیں مجھے بھی سنائی دے رہی ہیں۔ یہ دراصل ایک عظیم پیش گوئی تھی جو ایک پہلو سے تو بارہا پوری ہو چکی اب ایک نئے پہلو سے بھی پوری ہو رہی ہے۔

حضرت امام صادقؒ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ بہت بڑے بزرگ، بہت پائے کے امام تھے اور عارف باللہ تھے اس میں قطعاً ایک ذرّے کا بھی شک نہیں۔ آپ نے فرمایا ہمارے امام القائم کے زمانے میں یعنی حضرت مسیح موعودؑ مہدی موعودؑ کے زمانے میں مشرق میں رہنے والا مومن مغرب میں رہنے والے اپنے دینی بھائی کو دیکھ سکے گا، اسی طرح مغرب میں بیٹھا ہوا مومن اپنے مشرق میں مقیم بھائی کو دیکھ سکے گا۔

جہاں تک دوطرفہ روایت کا تعلق ہے وہ تو بالبداہت درج ہے اور بعینہٖ اسی طرح آج ہو رہا ہے لیکن جہاں تک آواز کا تعلق ہے یہ پیش گوئی نہیں تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو سن بھی سکیں گے۔ پس ایک طرف سے تو یہ آواز بھی پہنچ رہی ہے اور تصویر بھی اور دوسری طرف سے تصویریں بھی پہنچ رہی ہیں اور یہ ابھی آغاز ہے۔ آگے انشاء اللہ ایسے دن آئیں گے کہ مشرق و مغرب کی جماعتیں ٹیلی ویژن کے ذریعے اعلیٰ انتظامات کے ذریعے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکیں گی۔ ایک ایسا عالمی جلسہ ہوگا جس کی کوئی نظیر کبھی دنیا میں پیش نہیں کی جاسکتی، نہ کی جا سکے گی۔ اب بھی اللہ تعالیٰ کے فضل اتنے ہیں اور اتنے برس رہے ہیں کہ بارش کے قطروں کی طرح ان کا شمار ممکن نہیں رہا لیکن

اس کے باوجود جو عشق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ سے تھا اس میں بارش کے قطروں کے ان گنت ہونے سے ذرّہ بھر بھی اظہار محبت میں کمی نہیں آتی تھی بلکہ آنحضور ﷺ کے متعلق یہ پختہ مصدقہ روایت ہے کہ بعض دفعہ بارش ہوتی تو بارش کا پہلا قطرہ اپنی زبان نکال کے زبان پہ لے لیا کرتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے گیت گاتے۔ وہ بارش جو بے انتہا ہوتی ہے جس کے قطروں کا شمار ممکن نہیں اس میں پہلے قطرے کو زبان پر لے لینا ایک بے انتہا عشق کا اظہار ہے۔

پس جتنی بھی بارشیں فضلوں کی ہم پر ہوں ہمارا فرض ہے کہ ہر قطرے کو اپنی زبانوں پر، اپنے دل کی زبانوں پر لیں اور حمد کے گیت گاتے رہیں اس سے زیادہ شکر کا اظہار ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اور جہاں تک شکر کے اظہار کا اعمال سے تعلق ہے وہ ایک الگ مضمون ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اظہار تشکر محض زبان سے نہیں ہوا کرتا تھا۔ آپؐ کی ساری زندگی ایک تشکر کے جذبات میں ڈھل چکی تھی۔ ساری زندگی تشکر کے جذبات میں اس طرح ڈھل چکی تھی کہ شکر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان کوئی فرق کہیں بھی ممکن نہیں رہا۔ اس پہلو سے حضور اکرم ﷺ نے جو پاک نمونے ہمارے سامنے پیش کئے اب بھی ہمارے لئے وہی راہنما ہیں اور ان نمونوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں آپؐ کے قدموں کو چومتے ہوئے نقشِ پا کو چومتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ اس مضمون سے متعلق ایک خطبات کا سلسلہ لندن میں شروع ہوا، سلسلہ اس لئے کہ وہ ایک خطبہ میں بات ختم نہیں ہوسکتی تھی اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ باقی بات میں اگلے خطبہ میں بیان کروں گا۔ اگلے خطبہ میں بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ بات ختم نہیں ہوسکتی کیونکہ مضمون نسبتاً لمبا ہے اس لئے غالباً دو تین یا ہوسکتا ہے چار خطبوں میں یہ مضمون مکمل کرنے کی کوشش کروں۔

یہ مضمون ہے امام اور ان کو جو اطاعت کرتے ہیں، جو مقتدی ہیں، ان کا رابطہ، ان کا تعلق۔ ان کے درمیان کیا وہ اسلوب ہونا چاہئے تعلقات کا جو آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور آپ کی سنت پر مبنی ہو۔ اس پہلو سے جہاں تک ان کا تعلق ہے جن کو خدا تعالیٰ نے اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے ان کے متعلق میں نے گزشتہ خطبہ جمعہ میں روشنی ڈالی تھی اور بتایا تھا کہ اطاعت کے مضمون میں کیا کیا خطرات درپیش ہیں، کیسے کیسے نفس سر اٹھاتا ہے اور خود اپنے خلاف فتوے دیتا چلا جاتا ہے۔ ایسی ہدایت دیتا جاتا ہے جو انسان کو ہلاکت میں ڈالنے والی ہو اور انانیت کا سر جب اٹھتا ہے تو اس کے

خطرے سے بچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ انانیت کا ہی سر ہے جو شیطان کہلاتا ہے اور ہر نفس میں موجود ہے، ہر نفس میں ہمیشہ ہر لحظہ اپنے نفس کو ڈسنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس پہلو سے میں نے جماعت کو نصیحت کی تھی کہ اطاعت سے کبھی بھی قدم باہر نہ نکالیں اور اطاعت میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق نہیں رہتا کیونکہ اطاعت محض خدا کی خاطر ہوتی ہے اور اللہ کے حکم کے تابع ہی انسان اطاعت پر مجبور فرمایا گیا ہے۔ پس وہ اطاعت جو للہ ہوگی اس میں نہ بڑے کا کوئی فرق رہے گا، نہ چھوٹے کا۔ نہ اعلیٰ نبی کا نہ ادنیٰ نبی کا۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرۃ:286) کا اقرار کرتے ہوئے مطیع جماعت ہمیشہ اطاعت کے رستوں پر آگے قدم بڑھاتی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ جن کی اطاعت کرنا ہے ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ ان کے بھی تو کچھ فرائض ہیں۔ وہ اگر ان فرائض کو ادا نہیں کریں گے تو ناممکن ہے کہ جماعت حقیقی معنوں میں سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق اطاعت کے حق ادا کر سکے۔ اس ضمن میں میں نے وہ آیت کریمہ پیش کی تھی کہ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تو ان لوگوں کے لئے نرم نہ ہوتا، اگر تیرے دل میں ان لوگوں کی محبت اور پیار نہ پیدا ہوتے تو پھر تو ان لوگوں کو کبھی بھی اکٹھا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اطاعت کے لئے محض امر کافی نہیں ہوا کرتا، اطاعت کے لئے ایک گہرا قلبی تعلق ہے جس پر قائم ہونا ضروری ہے۔ پس میں نے جماعت کو سمجھایا کہ اگر حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے لئے بھی آپؐ کی رحمت کو، آپؐ کی شفقت اور رافت کو موجبِ اطاعت قرار دیا گیا اور فرمایا کہ اے مومنو! تم میں اپنے ایمان کے لحاظ سے اتنی استطاعت ہی نہیں کہ اطاعت کر سکو۔ تمہاری اطاعت بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی ممنون احسان ہے۔ آپؐ شفقت نہ فرماتے، آپؐ رحمت کا سلوک نہ فرماتے تو تمہیں اطاعت کی توفیق بھی نہیں مل سکتی تھی۔

یہ وہ مضمون ہے جو ہمیشہ ہمیش کے لئے ہر اس امیر پر اطلاق پاتا ہے جو ملک کا امیر ہو یا صوبے کا یا علاقے کا یا ضلع کا یا شہر کا یا اس کے تابع اور صاحب امر لوگ ہوں جو اپنی امارت کے اختیارات اوپر سے لیتے ہیں۔ ان میں سے چھوٹے سے چھوٹا صاحب امر بھی اسی مضمون کے تابع ہے اور **جماعت احمدیہ کے لئے لازم ہے کہ ہر شخص جس کو کوئی امر کا اختیار بخشا گیا ہے وہ اپنے ماتحتوں سے محبت اور شفقت اور رحمت کا سلوک کرے اور جس طرح ان لوگوں کی اطاعت میں اس کی ذات**

پیش نظر رہتی ہے، اس کے ساتھ اختلافات اس کی اطاعت میں حائل نہیں ہو سکتے اور ما اور تو کا تفرقہ مٹ جاتا ہے، اسی طرح لازم ہے کہ ہر شخص جس کے سپرد کوئی امر فرمایا گیا ہو وہ اپنے ماتحت لوگوں سے قطع نظر اس کے کہ ان سے اس کے پہلے کیسے تعلقات تھے قطع نظر اس کے کہ شریکے کے لحاظ سے یا اور تعلقات کی نسبت سے ان کے درمیان ایک طبعی یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ ایک قسم کی دوری ہے پھر بھی اللہ کی خاطر لازم ہے کہ وہ ہر ایک سے برابر شفقت کا سلوک کرے اور سب پر اپنی رحمت کے پر جھکائے۔

اس ضمن میں جن آیات کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں اس مضمون کو آگے بڑھایا گیا ہے اور اس کے علاوہ چند اور آیات بھی ہیں جن کے حوالے سے میں اس مضمون پر مزید روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پہلے جو ہے فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ہر بات توحید سے چلتی ہے اور توحید کے سوا مذہب کا کوئی مضمون بھی نہیں جاری ہوتا۔ ہر بلندی کا چشمہ توحید ہے۔ ہر عجز کا چشمہ بھی توحید ہے۔ ان معنوں میں رفعتیں بھی توحید سے وابستہ ہیں اور جو انسان کے نفس کی پستیاں ہیں وہ بھی توحید ہی سے وابستہ ہیں۔ اگر توحید سے تعلق نہ ہو تو رفعتیں بھی ذلتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اگر توحید سے تعلق نہ ہو تو پستیاں بلندیوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ ہر نماز میں سجدے میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم نے اگر للہ سجدہ کیا تو پھر یہ دعا **سبحان ربی الاعلیٰ ،سبحان ربی الاعلیٰ ،سبحان ربی الاعلی۔**

اس موقع پر سپیکر کے نظام میں ایک نقص کی طرف توجہ دلائی گئی تو اس پر حضور نے فرمایا:

لندن والے کہتے ہیں کہ مائیکروفون ذرا نیچے کر دیں اور یہ مائیکروفون میں اونچا کر دوں۔ رفعتوں اور پستیوں کا یہ بھی ایک مضمون ہے کوئی چیز نیچے کی جاتی ہے اور کوئی چیز اونچی کی جاتی ہے۔

پھر مضمون کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

اب **سبحان ربی الاعلیٰ** کا مضمون اس وقت ہے جب انسان کا سر انتہائی پستی کی حالت میں خدا کے حضور جھکا ہوا ہوتا ہے اور اسے یاد دلایا جا رہا ہے کہ تمہاری رفعتیں، تمہاری پستیوں سے وابستہ ہیں کیونکہ تم خدائے واحد کے حضور جھکے ہو جب کہ ہر دوسرے کی غلامی سے تم آزاد کئے جا رہے ہو۔

اور تمام رفعتیں اس پستی میں ہیں جو خدا کی خاطر قبول کی جاتی ہے پس کہو **سبحان ربی الاعلیٰ** ۔ پاک ہے میرا رب جو بہت اعلیٰ ہے اور ربنا نہیں **ربی الاعلیٰ** فرمایا گیا ہے۔ ہر شخص کا رب اس پر اپنی رفعتوں کے ساتھ اس کی پستیوں کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ جب بھی خدا کا بندہ عجز اختیار کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان تک اٹھالیتا ہے اور زنجیر کے ذریعے سے لپیٹ کر اوپر لے جایا جاتا ہے۔ اب استدلال کے طور پر ہم اسے غیر احمدیوں کے سامنے جو رفعت کا معنی نہیں سمجھتے یہ پیش کیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں اس موقع پر میں کسی بحث کی خاطر نہیں بلکہ ایک عرفان کے نکتے کے طور پر آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ تو وہ زنجیر جو اترتی ہے اس سے مراد درجہ بدرجہ انسان کی پستی خدا کے حضور اور درجہ بدرجہ اس پستی کی نسبت سے رفعت ہے۔

ساتویں آسمان سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہر شخص جو خدا کے حضور جھکتا ہے اسے سیدھا ساتویں آسمان تک رفعت دی جاتی ہے۔ ساتویں آسمان تک کی رفعت اس کا انتہائی مقام ہے۔ جتنا تذلل اختیار کرے گا اتنا اس کی رفعت کے سامان خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں گے یعنی یہ پستیاں بذاتِ خود رفعتوں میں تبدیل نہیں ہوا کرتیں اس لئے آسمان سے زنجیر اترنے کا ذکر فرمایا یعنی تم تذلل اختیار کرو مگر یہ وہم بھی نہ کرنا کہ تمہارا تذلل ہی تمہیں کچھ عطا کر دے گا۔ تمہارے تذلل کو رفعتوں میں بدلنے کے لئے آسمان سے ایک زنجیر کا اترنا لازم ہے اور وہ اترے گی تو تمہارے تذلل کے متعلق فیصلہ کرے گی کہ کس حد تک اس میں رفعت کی طاقت موجود ہے اور اسی نسبت سے تمہیں اٹھایا جائے گا۔ ساتویں آسمان سے آگے ذکر نہیں ملتا کیونکہ اس سے آگے جانے والا صرف ایک ہی وجود ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں جن کا خدا کے حضور تذلل اس ہر انتہاء سے آگے بڑھ گیا جس انتہاء کو کبھی کسی انسان کا تذلل پہنچ سکا یا پہنچ سکے گا۔ پس آپ کا جو سلسلہ ہے وہ اس عام قانون سے بالا سلسلہ ہے اور اس سلسلے کا ذکر یہاں مذکور نہیں۔

پس اس پہلو سے یاد رکھیں کہ ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ تم جتنا جھکو گے اگر وہ خدا کی خاطر ہوگا، اگر خدا کی خاطر تم نے تذلل اختیار کیا ہے تو بسا اوقات ممکن ہے کہ یہ تذلل کسی انسان کے سامنے دکھائی نہ دے کیونکہ صاحب امر ایک غیر بھی ہوسکتا ہے یعنی ہوگا ہی غیر کیونکہ خدا تعالیٰ براہ راست تو ہر ایک کو حکم نہیں دیا کرتا۔ مراد یہ ہے کہ الف، ب، ج، د، جو بھی ان کا نام رکھیں جو صاحب امر ہے جس

کے سامنے آپ سر جھکا رہے ہیں اس کا وجود ایک دکھائی دے رہا ہے۔ مگر آپ کے لئے یہ ہدایت ہے کہ اس وجود کو نظر سے ہٹا دو کیونکہ تمہارا تذلل للہ ہونا چاہئے اور اپنے رب کی خاطر ہونا چاہئے۔ جب اپنے رب کی خاطر ہو تو کسی غیر کے سامنے جھکنا نشان ذلت نہیں بلکہ نشان عظمت بن جاتا ہے۔ ایک بڑا آدمی ایک چھوٹے کے سامنے جھک رہا ہے محض اس لئے کہ خدا نے اسے اس معاملے میں مامور فرمایا ہے اس لئے اس کا جھکنا ذلت کا نشان نہیں بلکہ رفعت کا نشان بن جاتا ہے اور جس حد تک اس کے نفس کی قربانی اس میں داخل ہوتی ہے اسی قدر وہ رفعتوں سے نوازا جاتا ہے۔

لیکن ایک اور جھکنا بھی ہے جو اپنے غلاموں کے سامنے جھکنا ہے، اپنے غلاموں پر جھکنا ہے۔ اس مضمون کا اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اے میرے حضور جھکنے والے تو ان پر بھی جھک جو تیرے حضور جھک رہے ہیں اور میری خاطر جھک رہے ہیں اور اپنی رحمت اور شفقت کا پر ان پر جھکا۔ دیکھیں کتنا عظیم مضمون ہے جو اس آیت کریمہ میں ایسی رفعتوں تک اس مضمون کو پہنچا رہا ہے جن تک عام انسان کے تصور کی رسائی ممکن نہیں۔ محض خدا کا کلام ہے۔ سوائے خدا کے کلام کے کوئی کلام اس شان کا کلام نہیں ہوسکتا کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کو ان پر جھکنے کی تاکید فرمائی جن کی گردنیں ان کے حضور جھکا دی گئی تھیں۔ اس سے پہلے فرماتا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اپنے قریبیوں کو بھی ڈراؤ۔ اب پیشتر اس کے کہ میں وَاخْفِضْ والے مضمون کو دوبارہ اٹھاؤں اور مزید تفصیل بیان کروں میں چاہتا ہوں کہ پہلی آیت کے بعد دوسری آیت کے تعلق کو بیان کردوں پھر اس کے بعد بات آگے بڑھے گی۔

توحید سے ہر مضمون شروع ہوتا ہے، توحید کے بغیر دنیا میں کوئی بھی سچائی نہیں۔ سب جھوٹ اور بے معنی اور بے حقیقت باتیں ہیں۔ توحید کے نتیجے میں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ فرمایا گیا۔ دیکھو تمہارا تعلق اللہ سے ہے اور تمہارے اقرباء، تمہارے قریبی نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں اس لئے ان کو ڈراؤ اور ان کو متنبہ کرو اور ہرگز اس بات کو خوف نہ کرو کہ اپنے اقرباء کو بھی ڈرا دھمکا کر اگر تم نے پرے پھینک دیا تو تمہارا کیا بنے گا۔ اب اس مضمون کے حوالے سے پڑھیں کہ اگر تو نرم دل اور رحم دِل اور صاحب شفقت نہ ہوتا تو یہ لوگ تجھ سے بھاگ جاتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دو باتوں میں تضاد ہے؟۔ تضاد نہیں بلکہ وہ باریک تقویٰ کی راہیں ہمیں

دکھائی جارہی ہیں جن پر ہر صاحبِ امر کا چلنا ضروری ہے اس کے لئے لازم ہے کہ ان باتوں سے نصیحت پکڑے۔ وہ نرم ہوتا ہے تو دل کی کمزوری کی وجہ سے نرم نہیں ہوتا۔ وہ شفقت کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ لوگ اگر میں شفقت نہیں کروں گا تو مجھے چھوڑ دیں گے اور پھر میں اکیلا رہ جاؤں گا۔

اس لئے یہ وہم دل سے نکال دینا لازم ہے کہ آنحضرت ﷺ کی شفقت ان کا دل، ویسے محاورے میں تو ہے دلربائی کے لئے تھا یا دل چوری کرنے کے لئے کیونکہ اردو میں تو آنحضرت ﷺ کے تعلق میں تو یہ محاورہ منہ سے نکلتا نہیں ،تو ان کے دل کو اپنے قدموں سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کرنے کی خاطر تھا۔ آنحضورؐ کے ذہن میں کسی شفقت کے وقت کبھی بھی یہ پہلو نہیں آیا کہ میں اس لئے شفقت کروں کہ لوگ میرے گرویدہ ہو جائیں ،لوگ مجھ سے محبت کرنے لگیں کیونکہ آپؐ کا ہر فعل تو اللہ کی رضا کی خاطر تھا۔ پس اگر اللہ کی خاطر آپ کا ہر فعل تھا تو آپ کی شفقت کا تعلق اپنے غلاموں کے دل جیتنے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ پس یہ جو مضمون ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ یہ اس تعلق میں آپ سمجھیں تو بات روشن ہو جائے گی کہ ایسا شخص جب خدا کی خاطر ڈراتا ہے تو قطع نظر اس کے کہ اس ڈرانے کا کیا اثر پڑے گا چونکہ رضائے باری تعالیٰ اس کے پیش نظر ہے اس لئے وہ بے خوف ہو کے ڈرائے گا۔ ورنہ جو صاحبِ خوف ہے وہ ڈرا بھی نہیں سکتا اور ایسی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک شخص دنیا کے ڈر کے مارے انذار بھی نہیں کرسکتا۔ وہ کہتا ہے اگر میں نے انذار کیا تو یہ لوگ مجھے ماریں گے پس آنحضرت ﷺ کا انذار توحید سے پھوٹا تھا اس لئے پہلے توحید کا ذکر فرمایا۔ پھر فرمایا اپنے جتنے تیرے قریبی ہیں ان سب کو ڈرا دے اور جب ڈرایا تو سارے بدک کے بھاگ گئے۔

اب بتائیں یہ کیسا حیرت انگیز مضمون ہے۔ لیکن اس کے ساتھ فرمایا ہاں جو اس کے باوجود تجھ پر ایمان لے آئیں اور تیرے قریب آئیں۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تو جو بھی ان میں سے تجھ پر ایمان لائیں اور تیری پیروی کریں تو ان پر جھک جا یعنی تیرے دل میں کوئی سختی نہیں ہے۔ تو ڈراتا ہے تو ان لوگوں کی خاطر ڈراتا ہے۔ ڈراتا ہے تو رضائے باری تعالیٰ کی وجہ سے ڈراتا ہے۔ پس جب وہ تجھے قبول کرلیں تو پھر رحمت کے پر ان پر جھکا دے لیکن اس وجہ سے نہیں پھر کہ مومن ہیں، مان گئے ہیں اب یہ نہ کہیں ہاتھ سے نکل جائیں۔ باقیوں کو تو ڈرا دھمکا کے دور کر دیا اب یہ جو قریب آئے ہیں یہ نہ کہیں جاتے رہیں۔ فرمایا ہرگز یہ بات نہیں۔ فَاِنْ

عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ اگر یہ سب تیری نافرمانی کریں گے تو کہہ دے میں اس سے بری الذمہ ہوں جو تم کرتے ہو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہاری ذات سے میرا تعلق نہیں ہے۔ ان اعمال سے میرا تعلق ہے جو خدا کی خاطر تم بجالا رہے ہو۔ وہ اعمال نہیں ہوں گے تو تم میری رحمت کے حق دار نہیں رہو گے، میری شفقت کے حق دار نہیں رہو گے۔

پس یہ وہ مضمون ہے جو ہر صاحب امر کے لئے سمجھنا ضروری ہے وہ جب کسی سے پیار کرتا ہے اپنے ماتحتوں پر جھکتا ہے تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں آنا چاہئے کہ میں ان پر اس لئے جھک رہا ہوں کہ یہ میری تائید کرنے والے لوگ ہیں۔ اس لئے جھک رہا ہوں کہ یہ میرا عشیرہ ہے، میرے اقربین ہیں کیونکہ اقربین سے تو بات شروع ہوئی تھی۔ فرمایا ان کو تو ڈرا دے تو مانیں گے حق پر چلیں گے حق پر قائم رہیں گے تو پھر تیری رحمت ان پر ہوگی ورنہ تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ پس وہ امیر جو اس وجہ سے بعض لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ ان کے زیادہ قریب ہیں ان کے حق میں باتیں کرنے والے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جو بھی میں کہوں گا اس کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوں گے وہ جانتے نہیں کہ توحید کے مضمون کے یہ بات خلاف ہے اور جو بات بھی توحید کے برخلاف ہو وہ خدا تعالیٰ کے نظام میں کہیں بھی کوئی مقام نہیں رکھتی۔ وہ نظام اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے اس میں ہر پہلو کا توحید سے تعلق ہے۔ پس باریک راہیں ہیں مگر ان باریک راہوں کا اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ جماعت کے تقویٰ کی زندگی ان راہوں سے وابستہ ہو چکی ہے۔ ان راہوں کو چھوڑ دیں گے تو آپ بھی کبھی نیک انجام نہیں ہو سکتے، آپ کے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

پس ہر امیر کے لئے ان آیات سے میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتا ہوں لازم ہے کہ جھکے اور رحمت کے ساتھ سب لوگوں سے انکساری کے ساتھ، عجز کے ساتھ تعلق قائم کرے۔ اپنے مرتبے کا خیال نہ کرے۔ اس کا مرتبہ بڑا ہے تو محض اس لئے کہ خدا نے اسے ایک مقام پر فائز کیا ہے۔ مگر جس مقام پر فائز کیا ہے اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خود نیچے اتر آئے۔ اب یہ خود نیچے اترنے والا مضمون ہے۔ یہ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ سے نکلتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی سیرت ان پر خوب روشنی ڈال رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے متعلق روایات اور کثرت سے روایات بتاتی ہیں کہ آپؐ مومنوں کے لئے ایسی شفقت رکھتے تھے اور ایسے منکسر المزاج تھے کہ اگر رستہ چلتے

کسی عورت نے بھی آواز دی تو کھڑے ہوجایا کرتے تھے۔ پوری توجہ سے اس کی بات سنتے تھے۔ ایک غلام اور بے حیثیت آدمی کبھی آپؐ کو مدد کے لئے کہتا تھا تو اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا کرتے تھے۔ ایک یتیم بچہ کبھی آپ کو بلاتا تھا تو آپ اس کے ساتھ روانہ ہوجایا کرتے تھے۔ حیرت انگیز وجود تھا جس کی نہ رفعتیں ہماری پہنچ میں ہیں، نہ اس کی خدا کے حضور پستیاں ہماری پہنچ میں ہیں۔ دونوں طرف کے کنارے ہماری عقل کے دائرے سے باہر ہیں لیکن وہ ایسا ہی تھا جس کو خدا نے ساتویں آسمان سے بھی بلند کر دیا۔ جب وہ جھکا تو ان لوگوں پر جھک گیا جو پستیوں کی انتہا تک پہنچے ہوئے تھے۔ مومنوں پر بھی جھکا اور غیروں پر بھی جھکا لیکن مومنوں کے متعلق تو اس کے دل کی کیفیت ہی اور تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جو مصطفوی حقیقت ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم کی جان ہے۔

پس اس پہلو سے ہر امیر کا کام ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے نرمی اور محبت اور عجز کا سلوک کرے اور ان کی خاطر نہیں بلکہ محض اللہ کی خاطر۔ ان کی خاطر تو کرے گا مگر خدا کی خاطر۔ اب یہ ایک اور سلسلہ بیچ میں داخل ہوجاتا ہے۔ بندوں سے پیار ہے بندوں کی خاطر، مگر بندوں سے بندوں کی خاطر جو پیار ہے اس کا آغاز اللہ کے پیار سے ہوا اور یہ وہ مضمون ہے جسے قرآن کریم کی ایک اور آیت بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرما رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ﴿۹﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (النجم: 9، 10) کہ محمد رسول اللہ ﷺ عظیم الشان وجود ہیں دَنَا وہ خدا کی طرف بڑھا اور اتنا قریب ہوگیا کہ اس سے زیادہ قرب الٰہی ممکن نہیں رہا۔ اتنے قرب کے باوجود وہ ٹھہر نہیں گیا۔ فَتَدَلّٰى پھر وہ نیچے اترا اور بنی نوع انسان کو اس قرب، اس عظیم ذات کے لئے بلانے کے لئے نیچے اترا۔ وہ عظمتیں اور رفعتیں جو اس نے اپنے رب سے حاصل کیں اپنے آپ تک محدود نہیں رکھیں بلکہ اس کی خاطر اس کے بندوں میں تقسیم کرنے کے لئے وہ رحمتیں بانٹنے کے لئے نیچے اترا اور اس کی مثال ایسی ہوگئی۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى جیسے دو قوسیں ہوں یعنی کمانیں جن کا ایک ہی وتر ہو، ان کے درمیان ایک ہی تنی ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمانیں کس شکل کی ہوسکتی ہیں؟ عام طور پر اس کی جو شکل بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف کمان نیچے سے آرہی ہے اوپر کی طرف، ایک اوپر سے کمان اتری ہے اللہ کی محبت کی اور بیچ میں ایک ہی وتر ہے۔ وہ تنی ایک ہی ہے۔ یہ مضمون بھی بہت باریک اور

لطیف ہے لیکن میں جو سمجھتا ہوں وہ اس سے مختلف ہے۔اس کو غلط نہیں سمجھتا کیونکہ قرآن کریم کے بہت سے بطون ہیں۔مگر میرے نزدیک ان دونوں کمانوں کا رخ ایک ہی طرف ہے یعنی ان کا جو بیچ کا دھاگہ یا تنی ہے اس سے ایک کمان محمد رسول اللہ ﷺ کی کمان اور ایک خدا کی کمان ہے وہ اس طرح ایک سمت میں ہیں کہ ناممکن ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی کمان چلے اور خدا کی کمان میں حرکت نہ آئے۔ناممکن ہے کہ اللہ کی کمان کو کھینچا جائے اور وہ نچلی کمان اس کے ساتھ حرکت میں نہ آئے کیونکہ دونوں کا ایک ایسا گہرا اٹوٹ رشتہ قائم ہو چکا ہے کہ جب ایک کو کھینچا جائے دوسری کھینچ جاتی ہے جب دوسری کو کھینچا جائے تو پہلی کھینچ جاتی ہے اور اس تنی سے جو تیر نکلتا ہے وہ بیک وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نکلا ہوا تیر بھی ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے نکلا ہوا تیر بھی ہوتا ہے۔

اس تفسیر کی تائید کرنے والی میرے نزدیک وہ آیت کریمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:18) اگر کمانوں کو برعکس سمت میں رکھا جائے تو وہ دونوں کا چلایا ہوا تیر ایک دوسرے کی طرف جائے گا۔اگر تیر چلانے کا مضمون اس سے نکالا جائے تو سوائے اس کے ممکن ہی نہیں کہ جو نقشہ میں نے ذہن میں رکھا اور آپ کے سامنے پیش کیا اسے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی تائید میں سمجھا جائے تو بات یہ بنے گی کہ آنحضرت ﷺ کی کمان سے چلا ہوا ہر تیر اللہ کی کمان سے چلا ہوا تیر تھا۔اللہ کی کمان سے جو تیر چلتا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے چلتا تھا۔پس اس پہلو سے دَنَا فَتَدَلّٰى کا مضمون یہ بنا کہ اتنا وہ قریب ہو گیا کہ جس سے زیادہ ممکن نہیں تھا اور فَتَدَلّٰى پھر وہ جھک گیا اور اس جھکنے کے نتیجے میں وہ قَابَ قَوْسَيْنِ ہو گیا۔اب قَوْسَيْنِ کا مضمون یہاں ایک اور معنے اختیار کر جاتا ہے۔فرماتا ہے انسانیت کے ساتھ اس کا تعلق اس کے جھکنے کے نتیجہ میں خدا کے تعلق کے ساتھ ایسا مدغم ہو گیا کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔اس کی بشریت نور ہو گئی، اس کا نور بشریت بن گیا۔پس اس پہلو سے وہ بندوں پر جب جھکا ہے تو خدا کا نور بن کر اپنے ہم جنسوں پر تو جھک گیا اور اس کی بشریت نے وہ علاقہ قائم کر دیا۔جیسے ایک تنی دو کمانوں کے درمیان علاقہ بن جاتی ہے۔پس رسول اللہ ﷺ کا بنی نوع انسان پر جھکنا ان کی خاطر تھا مگر خدا کی خاطر ان کی خاطر ہوا۔یہ وہ مشکل فقرہ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا اس کی تشریح ہے۔ورنہ بندے کی خاطر بھی ایک انسان رحمت کا سلوک کرتا ہے اور

آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے ذاتی شفقت سے لوگوں پر اسی طرح جھکا کرتے تھے۔ مگر جب نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ (النور:36) ہوئے تب کیفیت بدل گئی۔ اس کے بعد ہر رأفت، ہر شفقت، ہر رحمت خدا کے تعلق سے اوپر سے اترا کرتی تھی اور بنی نوع انسان سے آپؐ کی محبت کو الٰہی محبت کی تائید حاصل ہوگئی اور آپؐ کی الٰہی محبت بنی نوع انسان کی محبت میں تبدیل ہونے لگی۔ یہ وہ پہلو ہے جو امارت کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے قرآن کریم نے ہمارے سامنے رکھا ہے اور اسی پہلو کو ہر صاحب امر کو سمجھنا ضروری ہے۔

میں جب امیر کہتا ہوں تو ہر گز مراد یہ نہیں کہ محض وہ امیر جو ملکوں یا شہروں یا محلوں کے بنائے جاتے ہیں۔ امیر سے مراد ہر وہ شخص جسے کچھ بھی امر سونپا جائے اور خدا کی خاطر سونپا جائے اور خدا کے نام پر سونپا جائے۔ اس کی تربیت کے لئے یہ مضامین ہیں جو قرآن کریم نے ہم پر کھولے ہیں۔ فرمایا کہ تم امیر ہو مگر اب یاد رکھنا کہ اللہ کی خاطر جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ ان پر جھک گئے تھے جن کے سر خدا کی خاطر ان کے سامنے جھکائے گئے تھے تم بھی ان پر جھک جانا اور ان کی خاطر نہیں، للّٰہ کیونکہ ان کی خاطر جھکو گے تو تمہارے اندر شرک کے شائبات داخل ہو جائیں گے۔ شرک کے خطرات تمہیں ہوسکتا ہے واقعۃً ہلاک کردیں کیونکہ جب بھی انسان کسی سے رحمت کا تعلق رکھتا ہے یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں جو پیار اور محبت کا سلوک اس سے کیا جاتا ہے وہ ان دونوں کو ایسے رشتوں میں باندھ دے کہ خدا کا مضمون بیچ میں سے غائب ہو جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے ہمیں خوب اچھی طرح وضاحت کے ساتھ یاد کرایا۔ میرے وہ بندے جو میری خاطر بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہیں اور ان سے محبت کا سلوک کرتے ہیں جب ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر:10) کہ کیا کر رہے ہو ہم تو خدا کی خاطر تم سے پیار کر رہے تھے تم شکریہ ادا کر کے ہمارے پیار کو کیوں میلا کرتے ہو۔ ہمیں تم سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ یعنی توقع سے مراد یہ ہے کہ چاہتے نہیں ہیں کہ تم ہم سے کوئی سلوک کرو، ہماری نیکی محض اس کی خاطر تھی جس کی ہماری نیکی پر نظر ہے۔ اسی سے ہم پیار چاہتے ہیں۔ اسی کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ پس شکریہ ادا کر کے ہماری نیکی کو میلا نہ کر دینا۔

اور پھر قرآن کریم نے اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ یوں بیان فرمایا وَلَا تَمْنُنْ

تَسۡتَكۡثِرُ (المدثر:7) تو اس وجہ سے کسی پر احسان نہ کر کہ اس کے بدلے میں تجھے زیادہ دیا جائے گا۔ پس نہ ان کی نیت میں کچھ زیادہ لینا شامل ہوتا ہے نہ ان کی نیت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ خدا کی رضا کی بجائے کسی اور کی خاطر ان پر جھکیں اور جب کلیۃً خدا کی خاطر جھکتے ہیں تو ان کا احسان، ان کا شکریہ، ان کا تشکر بجائے دل کو ایک غذا دینے کے لئے اندر ایک قسم کا ایک زلزلہ طاری کر دیتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ہم تو بہت بالا قیمت چاہ رہے تھے۔ ہم نے تو اپنے اللہ کی خاطر یہ کیا تھا۔ ان کے شکریے کہیں ہمارے نفس کو موٹا نہ کر دیں۔ تو واقعۃً ان کے دل پر ایک زلزلے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ گھبراتے ہیں اور لازم نہیں کہ وہ اس بات کو ظاہر کریں۔ مگر قرآن کریم نے ان کی زبان سے ظاہر کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس سوسائٹی میں ہمیشہ یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ ہر وہ شخص جس کا شکریہ ادا کیا جائے وہ آگے سے انہی الفاظ میں جواب دیا کرتا تھا۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو صحابہؓ کے دل میں وارد ہوتی تھیں اور اللہ کے پیار کی نظر ان پر پڑتی تھی اور وہ آنحضرت ﷺ پر روشن کر دیا کرتا تھا کہ اے میرے پاک غلام، غلام کامل تو نے آگے بھی دیکھو کیسے کیسے پیارے غلام پیدا کر دیئے ہیں۔ تیرے ہی رنگ میں رنگین ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا جائے تو ان کا دل آوازیں دیتا ہے کہ نہ نہ ہمارا شکریہ ادا نہ کرو ہم تو محض خدا کی خاطر ایسا کرتے تھے۔

پس اگر وہ خدا کی خاطر ہی یعنی ہر صاحب امر خدا کی خاطر اپنے ماتحتوں سے پیار اور محبت کا سلوک کرتا ہے تو ان کے شکریے کی نہ تو اسے توقع ہوتی ہے اور نہ اسے پرواہ ہوتی ہے۔ جب توقع نہیں تو اس کے برعکس پہلو بھی ہے اور وہ ہے پرواہ بھی کوئی نہیں۔ اس لئے کہ اگر جب ذاتی تعلق ان سے نہیں تھا جس کی خاطر ان پر رحمت کی جارہی تھی تو اللہ سے اگر وہ دور ہٹیں گے تو یہ شفقت کرنے والا اسی حد تک ان سے دور ہٹ جائے گا اور ان کی اس بارے میں کچھ بھی پرواہ نہیں کرے گا کہ وہ اس سے کیسا پیار کا تعلق رکھتے تھے۔ بے انتہا محبت اور فدائیت کا اظہار کرنے والے بھی جب ایسی روش اختیار کرتے ہیں جس سے خدا ناراض ہو تو جن کو پیار دیا جاتا ہے ان کو اس بات کی کوڑی کی بھی پرواہ نہیں رہتی کہ یہ تو مجھ سے محبت کرنے والا تھا۔ وہ اسی طرح جیسا کہ خدا کی آنکھ انہیں دیکھتی ہے انہیں ناراضگی سے دیکھتا ہے اور ان کے چھوڑ کے چلے جانے کی ادنیٰ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ پس توحید کا یہ مضمون بالآخر توکل پر منتج ہو جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم اس کے بعد فرماتا ہے فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ تمہیں کیوں وہم ہو گیا ہے کہ میں تم پر رحمت سے جھکا ہوا تھا اس لئے کہ تم مجھے ذاتی طور پر پیارے لگتے ہو۔ وہ تو اللہ کی خاطر تھا۔ اگر تم خدا کی نافرمانی کرو گے یہاں عَصَوْكَ میں محمد رسول اللہ ﷺ پیش نظر ہیں لیکن آپ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نافرمانی ممکن ہی نہیں کہ انسان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے نافرمانی کرے اور وہ آپ کی نافرمانی ہو، خدا کی نہ ہو۔ اس مضمون کو قرآن بھی کھول چکا ہے بار بار رسول اللہ ﷺ خود بھی اس مضمون کو کھول چکے ہیں اس لئے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مزید دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک مسلمہ غیر مبدل حقیقت ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی لازماً خدا کی نافرمانی ہے اور اس کے سوا اس نافرمانی کو کوئی اور معنے نہیں پہنائے جا سکتے۔ فَاِنْ عَصَوْكَ میں اس لئے مخاطب ''تجھے'' کہہ کر رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں پر جھک رہے تھے، آپ لوگوں سے رحمت کا سلوک فرما رہے تھے، یہ گواہی دینا مقصود ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رأفت، آپ کی شفقت اللہ کی خاطر تھی، ان کی خاطر نہیں تھی۔ فرمایا پس جب یہ تیری نافرمانی کریں تو ان کی پہلی اطاعتوں کی، ان سے پہلے تعاون کی کچھ بھی پرواہ نہ کر۔ تو کہہ دے میں تم سے بیزار ہوں۔ تم یہ جو حرکتیں کر رہے ہو یہ میرے محبوب آقا کی مرضی کے خلاف ہیں اس لئے تم بھی میری مرضی کے خلاف ہو گئے ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو ان کے چھوڑ جانے کا تمہیں کوئی بھی غم نہیں ہونا چاہئے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ جب تو یہ کرے تو یاد رکھ اللہ جو عزیز ہے، اللہ جو رحیم ہے، جو غالب اور بزرگی والا ہے، جو بار بار رحم فرمانے والا ہے اس پر توکل رکھ۔ وہ تجھے کبھی نہیں چھوڑے گا کیونکہ جس سفر کا آغاز توحید سے ہوا، جس کا بنی نوع انسان سے تعلقات کا آغاز اس طرح ہوا کہ خدا کی خاطر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر دور کر دیا، جو قریب آئے ان کو بھی جب بھی وہ خدا سے دور ہوئے اپنی ذات سے دور کر دیا جب یہ سلوک ہو تو پھر توکل علی اللہ کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اس کے سوا کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔

پس ہر وہ صاحب امر جو اس اسلوب پر چل پڑے حضرت رسول اللہ ﷺ کی اس سنت کو اپنا لے اس کو کوئی بھی خطرہ نہیں۔ وہ جب سزا دے گا تو خدا کی خاطر دے گا، جب تعلق بڑھائے گا تو خدا کی خاطر بڑھائے گا اور ان لوگوں کا اس تعلق کی پرواہ نہ کرنا یا نہ کرنا اس کی نظر میں کوئی بھی حقیقت

نہیں رکھے گا اور یہ وہ امارت ہے جو غیر متزلزل ہے کیونکہ اس کو کلیۃً اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوگی اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ اس امارت کا تعلق ایک چھوٹے سے، معمولی افسر کے حکم سے بھی ہو جو کسی خاص معین کام پر مامور کیا گیا ہے۔ اگر اس کی نافرمانی کرو گے تو یاد رکھو یہ سلسلہ آخر خدا تک پہنچے گا اور جہاں تک اس شخص کی ذات کا تعلق ہے اس کو سمجھنا چاہئے کہ بڑے بڑے لوگ جو میرے سامنے جھک رہے ہیں اس میں میری تو کوئی بڑائی نہیں، میری تو کوئی بھی حیثیت نہیں، خدا کی خاطر میری طرف جھک رہے ہیں۔ پس اسے مزید خدا کے حضور جھکنا چاہئے اور پھر نافرمانی کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔

دنیا کی مثالوں میں اس کی وہ مثال ہے جو حضرت مصلح موعودؓ بارہا پیش کیا کرتے تھے اور میں بھی کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں لیکن وہ مثال ہی ایسی عظیم ہے اور اس موقع پر ایسی چسپاں ہوتی ہے کہ بے اختیار اسے بارہا پیش کرنے کو دل چاہتا ہے۔ زار جب صاحب سطوت تھا، جب اس کا رعب بہت کثرت سے وسیع ممالک پر طاری تھا یہاں تک کہ سلطنت برطانیہ کے بعد اگر کوئی حقیقت میں سلطنت کہلاتی تھی تو وہ زارِ روس کی سلطنت تھی۔ اس زمانہ میں ایک دفعہ زار کسی بہت ہی اہم کام میں مصروف ہوا اور اس نے اپنے اردلی کو یا فوجی سپاہی کو بلا کر یہ تاکید کی کہ کسی کو بھی تم نے میرے کمرے میں نہیں آنے دینا خواہ کوئی بھی ہو کیونکہ میں اتنا مصروف ہوں کہ میں اس وقت کسی قسم کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا درست اور یہ کہہ کر، یہ بات سن کر وہ باہر دروازے کی حفاظت پر مامور ہو گیا۔ اب خدا تعالیٰ نے، دیکھیں کیسے اس کی اطاعت کو عظیم نعمت کے، رحمت کے پھل لگائے، ایسی عظیم جزاء کے پھل لگائے اور ہمارے سامنے کیسا عظیم نمونہ اطاعت کے مضمون کا رکھ دیا اور اس کی گہرائی کو سمجھانے کے لئے یہ واقعہ آج مذہبی دنیا میں بھی بار بار دہرایا جا رہا ہے۔

بادشاہ کے یہ کہنے کے بعد جب وہ مصروف ہو گیا کام میں، تو بادشاہ کا ایک بیٹا، ایک شہزادہ، وہ اپنے باپ سے ملنے آیا تو وہ معمولی حیثیت کا سپاہی سامنے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا کہ شہزادے آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ اس کا تو غصے سے پارہ چڑھ گیا۔ اس نے کہا تم کون ہوتے ہو، تمہاری حیثیت کیا ہے۔ میں اپنے باپ سے ملنے جا رہا ہوں۔ اس نے کہا آپ کے باپ ہوں یا نہ ہوں، اس سے بحث نہیں۔ مجھے حکم ہے کہ کسی شخص کو میں اندر نہ جانے دوں پس میں آپ کو

اندر نہیں جانے دوں گا۔ اس پر وہ شہزادہ آپے سے باہر ہو گیا، اس نے اپنا کوڑا نکالا اور اس پر برسانا شروع کیا یہاں تک کوڑے مار مار کے اسے ادھ موا کر دیا۔ اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا مگر اس طرح چھاتی تانے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے کہا شہزادے آپ مارنا ہے جتنا چاہے مار لیں مگر میں بادشاہ کی حکم عدولی نہیں کروں گا میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ جب یہ شور سنا اور کوڑوں کے برسنے کی آواز اندر گئی تو بادشاہ باہر نکلا۔ اس نے کہا یہ کیا ہو رہا ہے۔ شہزادے نے کہا اے میرے باپ اس نے میری گستاخی کی ہے بہت بے ادبی کا سلوک کیا ہے۔ کیا ہوا؟ میں اندر آنا چاہتا تھا آپ سے ملنے کے لئے اور اس کمترین انسان کو دیکھیں میرے سامنے کھڑا ہو گیا کہ میں تمہیں اندر نہیں جانے دوں گا۔ بادشاہ جان کے بھولا بنا اور اس سپاہی سے پوچھا کہ بتاؤ یہ کیا بات ہے کیوں تم اس کو اندر نہیں آنے دیتے تھے۔ اس نے کہا بادشاہ سلامت آپ کا حکم تھا۔ آپ کے حکم کی اطاعت کی خاطر میں نے یہ قربانی دی ہے۔ بادشاہ نے کہا اچھا یہ بات ہے، تو نے اسے بتایا تھا۔ اس نے کہا ہاں میں نے اسے بتایا تھا۔ اس نے بیٹے سے کہا جب تم نے سنا تھا کہ بادشاہ کا حکم ہے تو تم نے کیوں نافرمانی کی۔ اس نے سپاہی کو نام لے کر مخاطب کیا اور کہا یہ کوڑا اٹھا اور اس بیٹے کو اسی کوڑے سے اسی طرح مار جس سے اس نے تجھے مارا تھا۔ اس پر شہزادے کی غیرت بھڑکی اور روس کا قانون اس کی مدد کے لئے آیا۔ اور اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ بادشاہ سلامت یہ ملک روس کا قانون ہے کہ کوئی غیر افسر سپاہی اپنے افسر کو مار نہیں سکتا، جب کہ میں فوج میں ایک بڑا افسر ہوں اور یہ شخص ایک عام سپاہی ہے۔ اس لئے آپ کا قانون اس حکم کی، جو آپ نے حکم دیا ہے اس کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا ہاں قانون نہیں ٹوٹے گا۔ سپاہی کو مخاطب کر کے اسے فوج کا ایک بڑا رتبہ عطا کرتے ہوئے کہا۔ اے جرنیل یا اے کرنیل جو بھی تھا اس سانٹے کو اٹھا اور میرے بیٹے کو مار۔ اس پر شہزادے کو ایک اور قانون یاد آ گیا۔ اس نے بادشاہ سے کہا بادشاہ سلامت ایک یہ بھی قانون ہے کہ کوئی غیر شہزادہ کسی شہزادے کو نہیں مار سکتا۔ بادشاہ نے کہا ہاں اس قانون کا بھی احترام کیا جائے گا۔ اس نے کہا اے شہزادے! فلاں سانٹا اٹھا اور میرے بیٹے کو مار۔ چنانچہ اپنے سامنے اس نے اس بیٹے کو سانٹے لگوائے کیونکہ اطاعت کی عظمت کو وہ سمجھتا تھا اور اطاعت کی خاطر قربانی دینے والوں کی حفاظت کے لئے وہ کھڑا تھا۔

تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ اس بادشاہ سے کم اپنے غلاموں کی غیرت رکھتا ہے۔ خدا کی قسم

خدا کے نام پر، اس کی اطاعت کی خاطر اپنی چھاتیاں تان دیں اور خدا کی خاطر اگر آپ کسی سے ناراض ہوں گے یا کسی کی ناراضگی مول لیں گے تو ایک کوڑی کی بھی پرواہ نہ کریں۔ جو سانٹے آپ پر برسائے جائیں گے آسمان سے وہی سانٹے اس شخص پر برسائے جائیں گے جو محض اس لئے آپ کا دشمن ہوا ہے کہ آپ نے اطاعت کی خاطر اس سے دشمنی مول لے لی۔ ایسی الٰہی جماعت کو دنیا کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کی تو کوئی حیثیت نہیں۔ آج مرے کل دوسرا دن لیکن اللہ کی بادشاہت تو دائمی ہے۔ اس سلطنت میں کبھی کوئی زوال نہیں آسکتا۔ پس وہ امراء جو محبت سے جھکتے ہیں تو خدا کی خاطر جھکتے ہیں وہ امراء جو ناراض ہوتے ہیں اور ناراضگی مول لیتے ہیں تو ان پر بڑی بڑی طعن کی زبانیں دراز کی جاتی ہیں، ان کے خلاف اڈے بنائے جاتے ہیں محض اس لئے کہ انہوں نے رضائے باری تعالیٰ کی خاطر ایک کڑوا فیصلہ کیا ہے ان کو ان نافرمانیوں کی بھی، ان بدتمیزیوں کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہونی چاہئے۔ خدا کی خاطر وہ ڈٹے رہیں اور یاد رکھیں کہ خدا کا وعدہ ہے وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ کہ تو پھر اللہ پر توکل رکھ جو عزیز ہے۔ وہ غالب ہے اور فائق ہے ہر دوسری چیز پر۔ صاحب عزت وعظمت ہے اور رحیم ہے اور بار بار رحم فرمانے والا بھی ہے۔

تو تمام دنیا کے امراء جو جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتے ہیں اگر وہ امارت کے ڈھنگ اختیار کریں گے تو یاد رکھیں کہ جماعت ایسے عظیم رشتوں میں منسلک ہو جائے گی جہاں جماعت کا ہر بڑا اپنے ماتحتوں کے لئے چھوٹا ہو جائے گا اور جماعت کا ہر چھوٹا اپنے افسروں کے لئے بڑا بن جائے گا۔ یہ وہ وحدت کا ایک نمونہ ہے جو اس دنیا میں توحید کی برکت سے پیدا ہوسکتا ہے ورنہ ناممکن ہے۔ پس وہ توحید جو ہم آسمان کی بلندیوں پر دیکھتے ہیں وہ ہماری خاطر نیچے اترتی ہے اور ہمیں ایک ایسے عظیم رشتے میں منسلک کر دیتی ہے کہ جہاں چھوٹا خدا کی خاطر بڑا ہو رہا ہے جہاں بڑا خدا کی خاطر چھوٹا ہو رہا ہے، اس سے زیادہ مساوات کا، اس سے اعلیٰ اور پاکیزہ مساوات کا کوئی تصور دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ پس آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ فرمایا اور پھر دیکھیں کیا فرماتا ہے الَّذِي يَرٰىكَ حِينَ تَقُومُ اے میرے بندے تو میری خاطر لوگوں کو ناراض کرتا ہے پھر کیا ڈر ہے وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ جس کی خاطر تو توکل کر رہا ہے الَّذِي يَرٰىكَ حِينَ تَقُومُ وہ خدا جو تجھے دیکھتا ہے جب تو کھڑا ہوتا ہے، اس کی نظر تجھ پر پڑ رہی ہوتی ہے ایک لمحہ بھی وہ

تیرے حال سے غافل نہیں ہے۔ پس زار کو تو اس کی آواز ہو سکتا ہے نہ بھی پہنچتی، ہو سکتا ہے یہ واقعہ ایک فاصلے پر ہوتا اور اس کی نظر بھی نہ پڑتی بعد میں اس سے جو سلوک ہوگا اس کا بھی زار کو کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ہر حال تجھ پر کھڑا ہے۔ **سبحان من یرانی** کا مضمون ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ کے اس شعر میں جو آپ بار بار سنتے ہیں **سبحان من یرانی**، **سبحان من یرانی** تو ایک صاحب عرفان کا کلام ہے جو جانتا ہے کہ ہر لحہ میرے خدا کی مجھ پر نظر ہے۔ اس سے کوئی حال بھی میرا غافل نہیں۔ نہ میرا نہ ان لوگوں کا جو میرے ساتھ کوئی معاملہ کرتے ہیں پس فرمایا توکل اس ذات پر تو نے کرنا ہے جو ہمیشہ تجھ پر نگران کھڑا ہے اس کی پیار کی نگاہیں تجھ پر پڑتی ہیں بلکہ وہ اس حد تک تیرے حال سے واقف ہے **وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ** (الشعراء:220) وہ سجدہ کرنے والوں میں تیرے تقلب کو بھی دیکھ رہا ہے۔

اب دیکھیں کتنا عظیم مضمون ہے جس کا پہلے مضمون سے کیسا حیرت انگیز تعلق ہے۔ تقلب کا یہ مضمون بعض مفسرین نے بلکہ اکثر نے یہ بیان کیا ہے کہ جب مومن سجدہ کرتے ہیں تو ان کے درمیان تیرا پھرنا اللہ دیکھتا ہے کیونکہ تقلب کا ایک معنی ہے پھرنا لیکن تقلب کا یہ معنی اس صورت حال پر اطلاق نہیں پاتا۔ سجدے کے وقت تو سب سے آگے سجدہ ریز محمد رسول اللہ ﷺ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت آپؐ کے **تقلب** کا کیا مطلب۔ یہاں **تقلب** کا جو میں معنی سمجھتا ہوں وہ یہی ہے کہ آپؐ کا سجدے میں خدا کے حضور گریہ وزاری کے ساتھ کروٹیں بدلنا اور سجدے میں بے چینی سے جب انسان دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہوتا ہے جب لوٹتا پوٹتا ہے تو **تقلب** کا معنی ہی لوٹنا پوٹنا ہے۔ تو تیری بے قراریاں خدا کے حضور، سجدہ ریز لوگوں کے حضور، خدا کی نظر میں رہتی ہیں۔ پس چونکہ سجدے کا مضمون ہی چل رہا ہے اطاعت ہی کا مضمون چل رہا ہے تو فرماتا ہے کہ تیرے خدا کی تجھ پر اس وقت بھی نظر ہوتی ہے جب سجدہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ بے قرار سجدہ تیرا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ اللہ کی محبت میں گوندھا ہوا اور اللہ کی محبت میں تڑپتا ہوا تیرا سجدہ ہے۔ پس تقلب سے مراد وہ تڑپنا ہے سجدے کا جو آنحضرت ﷺ کو نصیب تھا اور فرمایا تجھے پھر کیا پرواہ۔ میں تجھے دیکھ رہا ہوں، ہر حال میں دیکھ رہا ہوں اور تیرے **تقلب** پر بھی نظر ہے۔ جو دکھ تجھے پہنچتا ہے وہ سجدوں میں تو میرے حضور پیش کر دیتا ہے۔ تیری بے قراریاں میری نظر کے سامنے رہتی ہیں۔ **اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ**

الْعَلِيْمُ جان لے کہ وہ بہت سننے والا اور بہت جاننے والا ہے۔ تو نہ بھی کہتا تو وہ جانتا تھا لیکن جب تو گریہ وزاری خدا کے حضور پیش کرتا ہے تو وہ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ہے۔ وہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔

پس مومن اگر یہ رنگ اختیار کرنے کی کوشش کرے گا جو آقاؐ کے رنگ ہیں یعنی حضرت محمد مصطفیٰؐ کے رنگ تو اس کی اطاعت میں بھی رفعتیں ہیں، اس کے مطاع ہونے میں بھی رفعتیں ہیں۔ ہر حال میں وہ سر بلند ہے لیکن اس حالت میں سر بلند ہوگا جب خدا کے حضور اس کا سر جھکا رہے گا۔ جب سجدوں میں تقلب نصیب ہوگا اور جب بنی نوع انسان کے سامنے اس کی انکساری خدا کی خاطر ہوگی نہ کہ نفس کی عزت کی خاطر۔ اللہ کرے ہمیں یہ توفیق نصیب ہو اور جماعت کینیڈا کو بھی اللہ تعالیٰ یہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اب چونکہ وقت ختم ہو رہا ہے مگر میں ایک بات جماعت کینیڈا کو خصوصیت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس اطاعت کے مضمون کو سمجھ کر یاد رکھیں۔ میں سال ہا سال سے آپ کو تبلیغ کی طرف توجہ دلا رہا ہوں اور ہر طرح جس حد تک مجھے خدا نے توفیق بخشی بلند آواز سے بھی، آہستہ بھی، خطوں میں لکھ لکھ کر بھی، پیار سے بھی سمجھا کر، کبھی ناراضگی کا اظہار کر کے بھی آپ کو بتا رہا ہوں کہ دیکھو یہ زمانہ وہ آ گیا ہے کہ جب تبلیغ کے تقاضے ہر دوسرے تقاضے سے بالا ہو گئے ہیں۔ اب قوموں کی تقدیریں پلٹنے کا زمانہ آ گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم وہ ہیں جن کے ہاتھوں میں قوموں کی تقدیروں کی باگ ڈور تھما دی گئی ہے۔ اگر ہم اس فریضے کو ادا نہیں کریں گے تو پھر اور کوئی کبھی اس فریضے کو ادا نہیں کرے گا اب تو دوسروں کی طرف سے آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ ابھی پرسوں کینیڈا کے ایک مخلص احمدی جو ابھی حال ہی میں احمدی ہوئے ہیں مجھ سے ملنے آئے اور کہا کہ میں شکریہ بھی ادا کرنے آیا ہوں اور شکوہ بھی کرنے آیا ہوں۔ شکریہ اس بات کا کہ مجھے وہ نعمت نصیب ہوئی جس کے لئے میرا دل ہمیشہ بے قرار رہتا تھا اور ایک پیاس تھی جو بجھتی نہیں تھی۔ صرف احمدیت میں آ کر وہ پیاس بجھی ہے اور شکوہ اس بات کا کہ آپ لوگ پہلے کہاں رہے ہیں کیوں ہم تک اپنی آواز نہیں پہنچائی۔ اس نے کہا آپ کو پتا نہیں کہ لاکھوں روحیں ہیں میری طرح جو بے تاب ہیں۔ ان کے کان ترس رہے ہیں آپ کی آواز سننے کو اور آپ خاموش بیٹھے ہیں۔ کون اس کا ذمہ دار ہے۔ میں نے جس حد تک ممکن تھا سمجھانے کی کوشش کی

مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو بھی آپ کے ساتھ مل کر ایک مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ جو حق تھا جیسا کہ حق تھا ہم نے ادا نہیں کیا۔

اور امر واقعہ یہ ہے کہ مغربی دنیا میں کینیڈا کو ایک خاص سعادت نصیب ہوئی ہے۔ جس کا ذکر میں ہمیشہ کرتا چلا آیا ہوں۔ ان لوگوں میں ایک بھولا پن ہے، ایک سادگی ہے جو باقی مغربی دنیا میں اس حد تک نہیں ہے۔ جرمن قوم کی بھی میں تعریف کرتا ہوں اور قوموں کی بھی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے تعریف کرتا ہوں لیکن ان کا ایک الگ انداز ہے سادگی اور بھولے پن کا جو اس قوم کا ایک خصوصی نشان بن چکا ہے۔ ان کو باوجود اس کے کہ یہ دنیا داریوں میں پھنس گئے ہیں اور دن بدن ان کی توجہات لذّت کی پیروی میں منعطف ہو چکی ہیں لیکن ابھی ان کے دل میں ایک پیاس موجود ہے اچھے ہونے کی، بھلائی کی، بنی نوع انسان کی خدمت کی۔ پس یہ قوم آپ کو بلا رہی ہے اور اگر آپ نے ان تک پہنچ کر ان کی اس طبعی پیاس کو نہ بجھایا تو پھر آپ خدا کے حضور کیا جواب دیں گے۔ **آپ کوثر کے مالک تو بن بیٹھے مگر کوثر کی تقسیم کا حق ادا نہ کیا۔ پس آپ کی مثال تو ایسی ہی ہوگی جو زندگی کے چشمے پر قبضہ کر لے اور کسی کو اس سے سیراب نہ ہونے دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو آنحضرت ﷺ کے کوثر کا ساقی بنا دیا ہے اس ساقی بننے کے حق کو ادا کریں اور چین سے نہ بیٹھیں جب تک آپ کینیڈا کی سعید روحوں کو احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی طرف دعوت نہ دیں** اور پھر ان کی تربیت نہ کریں، ان کو اپنائیں نہیں، ان کو پیار نہ دیں۔ یہ ایک اور مضمون ہے جس کا میں انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر ذکر کروں گا۔ سر دست اتنا ہی پیغام دینا کافی سمجھتا ہوں۔ آپ کی وساطت سے چونکہ دنیا ساری براہ راست اس وقت اس خطاب کو سن رہی ہے اور کینیڈا کی جماعت کو یہ توفیق ملی ہے کہ یہ دو طرفہ تعلقات کے رشتے قائم کر دیئے ہیں۔ اس لئے میں اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دفعہ پھر دعوت الی اللہ کی طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی امارت کا دور سب سے اعلیٰ تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 28/جون 1996ء بمقام بیت الرحمٰن واشنگٹن۔ امریکہ)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کی:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ (التوبہ: 128 تا 129)

پھر فرمایا:

آج جماعت ہائے احمدیہ یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ (USA) کا تین (3) روزہ اڑتالیسواں (48) جلسہ سالانہ شروع ہو رہا ہے اور آج ہی جماعت احمدیہ گوئٹے مالا کا بھی تین (3) روزہ ساتواں (7) جلسہ سالانہ شروع ہو رہا ہے پس اس موقع پر جبکہ خدا تعالیٰ نے ہمارے عالمی روابط قائم کر دئے ہیں میں دونوں جلسوں کے مبارک آغاز کا آج جمعہ کے دن اعلان کرتا ہوں۔ جہاں تک آج کے خطبہ کے موضوع کا تعلق ہے یہ وہی موضوع ہے جو آج سے پہلے دو تین خطبوں میں جاری ہے۔

جماعت احمدیہ کو خدا تعالیٰ اس کثرت سے پھیلا رہا ہے اور اس تیزی سے نئی قومیں اور نئے ممالک کے بسنے والے جماعت احمدیہ میں داخل ہو رہے ہیں کہ میرے نزدیک اب سب سے بڑا اہم مسئلہ ان کی تربیت کا ہے اور تربیت کے تعلق میں سب سے اہم مضمون اطاعت کا مضمون ہے کہ آنے

والوں کو اطاعت کے آداب سکھائے جائیں اور وہ جنہوں نے انہیں دین سکھانا ہے انہیں اطاعت کروانے کے آداب سکھائے جائیں۔ ورنہ بہت سی غلط فہمیاں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں جو نئے آنے والوں کو اسلام اور اسلام کے نظام سے متنفر کردیں یا کم سے کم سخت غلط فہمیوں میں مبتلا کردیں۔ علاوہ ازیں جماعت میں پرانے داخل ہونے والوں کو بھی اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ بار بار ان کے سامنے اس مضمون کو تازہ کیا جاتا رہے۔

اطاعت کے تعلق میں گزشتہ دو خطبوں سے پہلے ایک خطبات کا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں اطاعت کے تمام پہلوؤں پر قرآن کریم اور سنت کے حوالے سے روشنی ڈالی تھی۔ اب میں ان لوگوں کے فرائض کا یا ان ذمہ دار افسروں کے فرائض کا ذکر کر رہا ہوں جو اطاعت لینے پر مامور کئے گئے ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ وہ شخص جس کی اطاعت کا حکم دیا جاتا ہے اسے خود بھی اپنے اندر بعض صلاحیتیں پیدا کرنی ہیں جن صلاحیتوں کے بغیر وہ حقیقت میں کسی کو اطاعت کے آداب سکھا ہی نہیں سکتا، نہ کسی مطیع سے اس رنگ کی اطاعت کروا سکتا ہے جو اطاعت اسلام چاہتا ہے۔ چنانچہ سب سے اعلیٰ نمونہ جو اطاعت لینے والے کا نمونہ ہے وہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کا نمونہ ہے۔ سب سے زیادہ جس کی اطاعت فرض تھی سب سے زیادہ اطاعت لینے کے گُر اسی نے سکھانے تھے اور اسی نے سکھائے اور آنحضرت ﷺ کے انداز امارت میں اتنی دلکشی ہے اور اتنا گہرا جذب حسن ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ امارت سے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے بلکہ غیر معمولی طاقت اور جذب کے ساتھ لوگوں کو اطاعت کی طرف کھینچتا ہے۔ یہی وہ مضمون ہے جو کچھ عرصے سے میں نے جاری کیا ہے۔ اب اسی کے کچھ پہلو ہیں جو آج انشاء اللہ میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

اطاعت جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے دنیا میں اگر کبھی کسی کی ہمیشہ کے لئے فرض ہوئی ہے تو وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے کیونکہ قیامت تک آپ کی امارت کا دور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس پہلو سے آپ حقیقتاً وہ زندہ رسول ہیں جن کی اطاعت سے سرِ مو بھی انحراف کی طاقت نہیں ہے اور اجازت نہیں ہے۔ ان غیر معمولی امارتوں کی صلاحیتوں کے ساتھ جو آنحضرت ﷺ کو فطرتاً نصیب تھیں اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً وحی کے ذریعے آپ پر امارت کے اسلوب روشن فرمائے اور وہی آیات ہیں جن کے حوالے سے میں اس مضمون کو جماعت پر کھول رہا ہوں۔ آج کے لئے جس آیت

کا میں نے انتخاب کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ دیکھو تم میں ایک رسولؐ آیا جو تم ہی میں سے ہے اور وہ شخص جو تم ہی میں سے ہے اس کی اطاعت تم پر لازم کر دی گئی ہے لیکن تم میں سے ہونے کے باوجود وہ کچھ مختلف صفات رکھتا ہے۔ ایسی عظیم الشان صفات ہیں جو اسے تم میں سے ہونے کے باوجود تم سے جدا بھی کر رہی ہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ جب بھی تمہیں کوئی دقت پیش آئے جب بھی تم کسی مشکل میں مبتلا ہو اس پر یہ بات شاق گزرتی ہے۔ ہر اس شخص کی تکلیف جس کا آپؐ کو مطاع بنایا گیا آپؐ کے دل پر چوٹ لگاتی ہے اور آپؐ کے اندر کرب کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ صرف انہی کی نہیں جو آپؐ کے غلام ہوئے بلکہ ان کی بھی جن تک آپؐ کا پیغام پہنچنا تھا اور جن تک پیغام پہنچانے کے باوجود یہ مقدر تھا کہ وہ انکار کر دیں گے ان کے انکار کا تصور بھی آپ کو اذیت پہنچاتا ہے۔

پس یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ہر امیر کو اپنے دل اور اپنے نفس میں ٹٹولنا چاہئے کہ موجود ہے بھی کہ نہیں اور یہ وہ بنیادی صفت ہے جو اسلامی اطاعت کے تصور کو ڈکٹیٹر شپ کے تصور سے بالکل جدا کر دیتی ہے۔ لوگ حضور اکرم ﷺ کی اطاعت کے رنگ دیکھ کر بسا اوقات غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو غیر ہیں اور بعض مستشرقین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے تو ایک بہت ہی خطرناک اور مکمل ڈکٹیٹر شپ کا نظام پیش کیا ہے۔ دیکھو جیسی اطاعت حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی آپ کے زمانے میں کی گئی اور جس طرح ہر فرد بشر اپنے آپ کو آپؐ کے حکم کے تابع سمجھتا تھا اتنی سخت اطاعت تو دنیا کی کسی ڈکٹیٹر شپ میں نہ دیکھی گئی، نہ سنی گئی۔ پس گویا اسلام ایک شخصی حکومت کی اور ایسی شخصی حکومت کی بنیاد ڈال رہا ہے جس کی نظیر انسانی شخصی حکومتوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ایک محض سطحی اعتراض ہے اس کی کوئی بھی حقیقت نہیں اور یہ وہ اعتراض ہے جس کو آج پیش نظر رکھ کر میں وضاحت کے ساتھ ڈکٹیٹر شپ اور اسلامی نظام امارت میں فرق کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔

کچھ امور تو وہ ہیں جن کا قرآن کریم نے یہاں ذکر فرمایا یعنی وہ شخص جو ہمہ وقت اپنے پیچھے چلنے والوں، اپنے مطیع افراد جماعت کے لئے بے چین رہے اور بے قرار رہے، ایک ادنیٰ سی تکلیف ان کی اسے ہمیشہ گہری تکلیف میں مبتلا کر دے اس شخص کے متعلق ڈکٹیٹر شپ کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں۔ کوئی دنیا کا ڈکٹیٹر دکھائیں تو سہی جسے ان لوگوں کے تعلق میں جن پر اسے حکومت نصیب ہوا ایسی

لگن لگ جائے ان کی تکلیفوں کے احساس کی کہ کوئی دور کسی جگہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو تو یہاں وہ خود بے قرار ہو جائے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے وہ توقعات رکھیں جو آپؐ اپنے دل میں، اپنی ذات میں محسوس فرمایا کرتے تھے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جو خود تھے ویسا ہی دوسروں کو بھی دیکھنا چاہتے تھے اور بسا اوقات آپؐ کا یہ انداز تھا کہ نیکی کی باتیں اپنی ذات سے منسوب کرنے کی بجائے مثالوں کی صورت میں بیان فرمایا کرتے یا صحابہؓ سے توقعات کی صورت میں بیان فرمایا کرتے۔ مثلاً یہ کہنے کی بجائے کہ میں وہ ہوں جس کے متعلق خدا نے یہ کہا آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت، مومنوں کی جماعت کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک بدن ہو اور سب ایک بدن کے اعضاء ہوں۔ اگر کسی کے پاؤں کے انگلی کے کنارے پر بھی کانٹا چبھے تو سارا بدن اس سے اذیت محسوس کرے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یہ مثال جب تک حضرت اقدسؐ کی اپنی ذات کی نہ ہو آپؐ آگے بیان فرما ہی نہیں سکتے تھے اور سب سے زیادہ یہ مثال خود آپؐ کی ذات پر چسپاں ہوتی تھی۔ کسی مومن کی کوئی تکلیف آپؐ کے لئے قابل برداشت نہیں تھی۔ پس آپؐ نے جب خود اپنے متعلق کھول کر بات بیان نہ فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی ذات کے متعلق کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ تمہیں بسا اوقات خیال بھی نہیں ہوگا کہ تم تکلیف میں مبتلا ہو اور کوئی تمہارے لئے بے قراری سے راتوں کو جاگ کر دعائیں کر رہا ہے لیکن محمد مصطفیٰ ﷺ جیسا مطاع تمہیں نصیب ہوا ہے کہ تمہاری خاطر، تمہاری تکلیفوں میں مبتلا رہتا ہے۔ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ تمہارے لئے حریص ہے یعنی صرف تمہاری تکلیف کے احساسات میں شدت نہیں رکھتا بلکہ تمہاری بھلائی کے خیال میں ایک حریص کی طرح اس کی حالت ہے۔ حریص ایسے شخص کو کہتے ہیں جسے ایک طلب کی لگن لگ جائے جو اور چاہے، اور چاہے اور پھر بھی اس کی پیاس نہ بجھے۔ تو فرمایا تمہارے متعلق خیر کی ایسی تمنا اس کے دل میں ہے کہ جتنی بھی تمہیں خیر عطا ہو اس سے بڑھ کر یہ تمہارے لئے چاہتا ہے۔ پس تکلیف کا یہ احساس اور خیر کی یہ تمنا کیا کبھی دنیا کے کسی ڈکٹیٹر میں ایسی یا اس سے کروڑواں حصہ بھی دکھائی دی ہے۔

ڈکٹیٹر اگر کچھ تعلق اپنی ذات کا رکھتے ہیں تو ان لوگوں سے جو ان کی سچی جھوٹی ہر بات مان کر ان کے مظالم میں ان کے شریک اور ان کی حکومت کی بقاء کے لئے ہر دوسرے پر ہر ظلم کرنے کے

لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کی امارت کا اس بات سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

پھر فرمایا حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ یہاں عَلَيْكُمْ کے لفظ نے یہ بتادیا کہ آپؐ کا یہ رجحان تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے کیونکہ جہاں تک مومنوں کا تعلق ہے ان کے متعلق الگ مضمون بیان فرمایا گیا ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ یعنی اس آیت کا خطاب دراصل تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اے بنی نوع انسان تم ہی میں سے ایک رسولؐ مبعوث ہو چکا ہے، مبعوث فرمادیا گیا ہے۔ وہ تمہاری ہر تکلیف کے لئے پریشان رہتا ہے۔ تمہاری ہر تکلیف محسوس کرتا ہے اور تمہارے لئے خیر کا اتنا خواہاں ہے کہ گویا اسے حرص لگ گئی ہے اور جہاں تک مومنوں کا تعلق ہے رؤف رحیم ہے۔ رؤف خدا کا نام ہے، خدا کی صفت ہے اور رحیم بھی خدا کی صفت ہے۔ یہ وہ خاص موقع ہے جہاں صفات باری تعالیٰ سے آنحضرت ﷺ کو مخاطب فرمایا گیا ہے یا آپؐ کی ذات میں ان صفات کا اطلاق دکھایا گیا ہے۔ حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے بھی اس آیت کے حوالے سے اس مضمون پر بہت روشنی ڈالی کہ یہ ایک غیر معمولی آیت ہے جو خدا کی صفات رَءُوْفٌ اور رَّحِيْمٌ کو حضور اکرم ﷺ کی ذات میں جاری دکھاتی ہے یعنی مومنوں کا جہاں تک تعلق ہے اس کی رأفت گویا خدا کی رأفت ہے۔ مومنوں کا جہاں تک تعلق ہے اس کی رحمت گویا خدا کی رحمت ہے لیکن اس لگن میں جو مومنوں کی تکلیف کے خیال کی لگن بھی ہے اور ان کی بھلائی دیکھنے کی لگن بھی ہے ایک ادنیٰ سا بھی تعلق اپنے نفس کا شامل نہیں۔ کوئی غرض یہ نہیں ہے کہ اگر میں اس طرح سلوک کروں گا تو میری اطاعت کی جائے گی۔ جہاں تک آپؐ کی اطاعت کا تعلق ہے آپؐ جانتے ہیں کہ محض خدا کی خاطر میں اطاعت کا حق دار ہوں اور میری رأفت اور رحمت کا اطاعت حاصل کرنے سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں اس سے بے نیاز ہیں۔ چنانچہ فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا پس اگر یہ لوگ پھر جائیں اور تیری طرف پیٹھ پھیر کر چلے جائیں فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تم پر اس لئے مہربان تھا، اس لئے رؤف اور رحیم تھا کہ تمہاری اطاعت چاہوں اور مجھ سے ذاتی تعلق کی وجہ سے تم میرے زیادہ مطیع ہو جاؤ۔ فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ اللہ میرے لئے بہت کافی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ پس میں ہر جھوٹے معبود کا انکار کرتا ہوں۔ مجھے اور کسی پر نہ توکل ہے، نہ کسی کی ضرورت ہے

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ اسی پر میں توکل کرتا ہوں وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ اور وہ بڑے عظیم عرش کا رب ہے۔

اب عظیم عرش کا رب کہنے میں یہاں کون سی حکمت ہے جو اس مضمون کے ساتھ اس بیان کو باندھ رہی ہے۔ اصل میں عرش تخت کو کہتے ہیں اور اطاعت کروانے کا مضمون تخت سے تعلق رکھتا ہے۔ شہنشاہی کے تصور کے ساتھ امارت کا تعلق ہے جو اٹوٹ تعلق ہے۔ جہاں بھی آپ بڑے عظیم شہنشاہ یا بادشاہ یا جابر کی بات کرتے ہیں وہاں اس تخت کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جس پر بیٹھ کر وہ حکومت کرتا ہے۔ فرمایا کہ میں تمہاری چند لوگوں کی اطاعت پر کیسے نازاں ہوسکتا ہوں تم کرو یا نہ کرو میرا اس ذات سے تعلق ہے جو رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ہے۔ جس کی تخت گاہ کائنات میں ہر چیز پر حاوی ہے اور کوئی ادنیٰ ذرّہ بھی کائنات کا اس کی اطاعت اور اس کی عظمت سے باہر نہیں ہے۔ پس میں اگر تمہارا مطاع بنایا گیا ہوں تو اپنی ذات کی وجہ سے نہیں رب عرش عظیم کے تعلق کی وجہ سے بنایا گیا ہوں۔ تمہاری خاطر میں قربانیاں دوں گا، قربانیاں دیتا ہوں، تم پر مہربان ہوں، مہربانی کا سلوک کرتا رہوں گا مگر اس وجہ سے نہیں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔ اس لئے کہ میں رب عرش عظیم کا نمائندہ ہوں۔

یہ وہ پہلو ہے امارت کا جس کو ہمیں ہر احمدی امیر میں دیکھنا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر وہ لوگ جو اطاعت کرتے ہیں انہیں نہ اطاعت کا سلیقہ عطا ہوسکتا ہے، نہ حوصلہ مل سکتا ہے، نہ ان کا دل ہر قسم کی نفسانی ملونی سے پاک ہوسکتا ہے۔ اطاعت کرنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ ہر انسان اپنی انا کا غلام ہے اور جب اس کی انا کسی اور کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو ہمیشہ انا دل میں ایک کہرام مچا دیتی ہے۔ ہر اطاعت کے وقت اس کا دل چاہتا ہے کہ میں آزاد ہوں ہر قسم کی غلامی سے باہر نکل آؤں۔ پس یہ جو آزادی کا پیغام انا دیتی ہے وہ ہر دوسرے کی اطاعت سے متصادم ہو جاتا ہے اور جہاں تک دنیا کی اطاعتوں کا تعلق ہے یہ انا ضرور سر اٹھاتی ہے مگر اندر ہی اندر بڑبڑاتی رہتی ہے اگر زور نہ چلے اور جب بس چلے وہ اطاعت کا جوا اتار پھینکنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔

پس یہ بھی ایک فرق ہے جو ڈکٹیٹر شپ کی اطاعت اور اللہ کی طرف سے ماموروں کی اطاعت کا فرق ہے۔ وہاں انا کو دبانے کے لئے تمام بیرونی سامان مہیا ہوتے ہیں تمام بیرونی طاقتیں

ڈکٹیٹروں اور جابروں کے ہاتھوں یا دست قدرت کو نصیب ہوتی ہیں۔ وہ جو چاہے کریں جیسے چاہیں کریں اور جتنا بڑا ڈکٹیٹر کوئی ہوا اتنا ہی زیادہ مطیع کے دل میں بغاوت کے جذبات بھڑکتے رہتے ہیں اور جب ایک ڈکٹیٹر اپنی کرسی کو چھوڑتا ہے خواہ وہ مر کے چھوڑے یا کسی اور ذریعہ سے تو وہ نفرت کے دبے ہوئے جذبات یک دم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر جس اطاعت کا ذکر میں کر رہا ہوں یعنی اللہ کی طرف سے ماموروں کی اطاعت، مامور من اللہ کی اطاعت اس اطاعت کا بالکل برعکس حال ہے۔ وہاں ان صفات کا انسان جن کا بیان ان آیات میں کیا گیا ہے وہ نہ تو اطاعت لینے کی خاطر ان پر مہربان ہوتا ہے اور نہ ان کے عدم اطاعت کے جذبات سے ایک ذرّہ بھر بھی متاثر ہوتا ہے۔

اور ایک اور بڑا فرق یہ ہے کہ اس کی اطاعت باوجود اس کے کہ سب سے زیادہ سخت ہے پھر بھی ایک آزادی کا پہلو بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ جو چاہے اس کی اطاعت سے جب چاہے پھر کر، پیٹھ پھیر کر الگ ہو جائے اور اس کا اختیار ہر اطاعت کرنے والے کو دیا گیا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف:30) میں یہ مضمون بیان ہوا، فرمایا کہ تجھ میں جو اطاعت کروانے کی غیر معمولی طاقتیں پائی جاتی ہیں اس کے باوجود ہم نے تیری اطاعت کرنے والوں کو کھلی اجازت دی ہے جب چاہیں وہ تیری طرف پیٹھ پھیر کر تجھ سے الگ ہو جائیں اور اس اجازت کے نتیجہ میں جو لوگ تجھے چھوڑیں گے ان کے متعلق ہماری ہدایت یہ ہے کہ تو نے ذرا بھی غم نہیں کرنا کیونکہ یہ خدا کے کام ہیں اور تیری طرف پیٹھ پھیر کر جانے والے حقیقت میں اللہ کی طرف پیٹھ پھیر کر جاتے ہیں۔ ان کا حساب اللہ پر ہے۔ تجھے نہ ان کی فکر ہے نہ ان کے لئے تو جوابدہ ہوگا۔ پس آنحضرت ﷺ کی بطور اللہ کی طرف سے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کے جو مضامین ان آیات میں بیان ہوئے ہیں وہ کلیۃً اللہ کی خاطر اطاعت کے مضمون کو غیر اللہ کی اطاعت کے مضمون سے جدا کر دیتے ہیں ان میں کوئی بھی آپس میں باہمی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ کا مضمون پہلے بھی ایک آیت میں بیان ہوا اور وہ یہی امارت کے تعلق والی آیت تھی۔ اس سلسلے میں اب میں احمدی امراء کو اور ہر اس شخص جو کسی پر کسی کام میں، کسی دائرے میں امیر بنایا گیا ہے کچھ نصیحتیں کرنی چاہتا ہوں۔ بہت سے نئے آنے والے جماعت میں داخل ہوں گے۔ آپ ان سے توقع رکھیں گے کہ وہ نظام جماعت کا ایک اٹوٹ انگ بن جائیں۔ ایک نہ جدا

ہونے والا حصہ ہو جائیں۔ وہ نظام جماعت کی اطاعت کریں اور ایک دن کا وہ منظر جو آنحضرت ﷺ نے ہمارے سامنے پیش کیا وہ کسی ایک قوم سے تعلق نہ رکھے بلکہ دنیا کی تمام قومیں ایک بدن بن جائیں اور ایک بدن جہاں اپنے ہر عضو کی تکلیف میں تکلیف کا احساس رکھتا ہے وہاں اس کا ہر عضو اس کی مرکزی قیادت کی اطاعت بھی کرتا ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں اور اطاعت کا جہاں تک تعلق ہے یعنی بدن کی اطاعت کا اس کا تعلق حسیات سے ہے۔ اس حوالے سے میں اس مضمون کو مزید کھولنا چاہتا ہوں۔

جب حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ مومنوں کی جماعت سے مجھے توقع ہے کہ وہ ایک بدن کی طرح ہو جائیں۔ انگلی پر بھی زخم آئے یا گزند پہنچے تو سارا بدن اس کے لئے بے قرار ہو جائے۔ اس مضمون کا تعلق زودحسی سے ہے اور زودحسی کے بغیر نہ تکلیف ساری جماعت میں یکساں محسوس ہوسکتی ہے اور نہ خوشی سب جماعت میں برابر تقسیم ہوسکتی ہے۔ پس اس امر کے لئے زودحسی پیدا کرنا ضروری ہے جس کا جذبات سے تعلق ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کی اطاعت میں جذبات کو ایک گہرا دخل ہے اور یہ مضمون ہے جو ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ جذبات پیدا کرنا یہ امیر کا کام ہے وہاں سے جذبات شروع ہونے چاہئیں۔ اگر امیر ہمدرد ہے اگر امیر دوسرے کی تکلیف پر بے چین ہو جاتا ہے اگر ہر تکلیف پر اس کا ذہن از خود کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح میں اپنے زیرنگیں یعنی خدا کی خاطر زیرنگیں لوگوں کی بھلائی کے لئے تدبیریں سوچتا رہوں تو یہ وہ سچا امیر ہے جو آنحضرت ﷺ کے نقش قدم پر ہے اور ایسے امیر کے لئے محبت پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایسے امیر کی جس کا نقشہ یہاں کھینچا گیا ہے اطاعت ایک خشک منطقی اطاعت ہو۔

خشک منطقی اطاعت کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ خشک منطقی اطاعت ہے جو ڈکٹیٹروں سے تعلق رکھتی ہے وہ دنیا کے بادشاہوں اور حکومتی نظاموں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں جہاں انسان چاہے جہاں بس چلے وہ اطاعت سے فرق کرے گا اطاعت سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا اور وہاں کی اطاعتیں مجبوری کی اطاعتیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کی اطاعت مجبوری تو رکھتی ہے مگر وہ ایک دل کی مجبوری ہے اور ان دو مجبوریوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک شخص کو اجازت ہو کہ وہ ایک چیز کو اختیار کرے یا دوسری کو اختیار کرے اور پھر ایک کٹھن راہ کو اختیار کرلے تو یہ محبت کے تعلق

کے بغیر ممکن نہیں ۔ جب آسان راہ بھی کھلی ہو اور مشکل راہ بھی کھلی ہو تو دنیا کی حکومتیں تو مشکل راہ پر ڈنڈے کے زور سے چلاتی ہیں اور سزا کے خوف سے وہ اپنی اطاعت کا سکہ منواتی ہیں ۔ مگر حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی یہ بات ہر وہ رستہ کھلا رکھتی تھی جس رستے پر چل کر اطاعت کرنے والے ہر قسم کی تکلیف سے بچ سکتے تھے اور امن کی راہیں ان پر ہمیشہ کشادہ رہتی تھیں ۔ جب چاہتے حضور اکرم ﷺ سے تعلق توڑ کر وہ اپنی تکلیفوں میں کمی کر سکتے تھے بلکہ ان سے نجات حاصل کر سکتے تھے ۔ پس اس اختیار کے باوجود جہاں اطاعت سے نکلنے کا رستہ بھی کھلا ہو اور اس رستے کے ذریعے ہر قسم کی تکلیفوں سے نجات کا رستہ بھی کھلا ہو پھر اطاعت کے رستے پر قائم رہنا اور تکلیفوں کو برداشت کرنا اور خوشی سے برداشت کرنا یہ محبت کے تقاضے ہیں ، اس میں کوئی میکانکی حالت نہیں پائی جاتی ۔

پس ڈکٹیٹر شپ کا اس قسم کی اطاعت کے ساتھ کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ۔ کوئی پاگل ہو گا جو یہ وہم کرے کہ یہ اطاعت جس کا نقشہ اسلام کھینچ رہا ہے یہ ڈکٹیٹر شپ کی اطاعت ہے ۔ چنانچہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے زمانے میں بعض صحابہؓ کو دشمنوں نے دھوکے سے گھیر کر ان کو یا تو ایک ٹیلے پر ہی ہلاک کر دیا تیروں کے ذریعے یا بعض کو پکڑ لیا اور جن جن قبیلوں کو کوئی شکوہ تھا کہ کسی شخص نے جہاد کے دوران ان کے قبیلے کے کسی آدمی کو مارا تھا یہ فیصلہ کیا گیا کہ جو شخص بھی قیدی ہاتھ آئے اسے اس قبیلے کے سپرد کیا جائے ، وہ اپنا انتقام لے ۔

چنانچہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے ایک صحابیؓ ایک ایسے ہی قبیلے کے ہاتھ آئے جو اپنی دشمنی کا انتقام لینا چاہتا تھا ۔ جب ان کے قتل کا فیصلہ ہو گیا تو ان سے سوال کیا گیا کہ اب بتاؤ موت سے پہلے اگر تمہیں یہ اختیار دیا جائے کہ تمہاری جگہ محمد رسول اللہ ﷺ ہوں اور وہ پکڑے جائیں اور تمہیں آزادی مل جائے تو بتاؤ تمہارا فیصلہ کیا ہو گا ۔ اس نے کہا خدا کی قسم یہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔ میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا ، میں تصور نہیں کر سکتا کہ میری زندگی کے بدلے محمد رسول اللہ ﷺ کو مدینے کی گلیوں میں ایک چھوٹا سا کانٹا بھی چبھ جائے ۔ یہ وہ اطاعت ہے جو محبت کی اطاعت ہے جس کا ڈکٹیٹر شپ کی اطاعت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں اور پھر ان قیدیوں میں سے ایک نے آخری خواہش کا یہ اظہار کیا کہ مجھے دو نفل پڑھ لینے دو ، میری دلی آخری تمنا یہی ہے کہ میں خدا کے حضور عبادت کرتا ہوا حاضر ہوں ۔ پس دو نفل انہوں نے پڑھ لئے اور نیزہ ان کی چھاتی سے آر پار گزرا تو ایک ہی لفظ ، ایک

ہی نعرہ تھا جوان کے منہ سے نکلا فزت برب الکعبة، فزت برب الکعبة رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا، رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔ اب یہ اطاعت کیا ڈکٹیٹرشپ کی اطاعت ہے!

ہم نے جس اطاعت کے مضمون کو آج سب دنیا کو سمجھانا اور سکھانا ہے وہ یہ اطاعت ہے جس کی میں باتیں کررہا ہوں قرآن وحدیث اور سنت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابی کی سنت کے حوالے سے آپ کو سمجھا رہا ہوں اور یہ اطاعت ممکن نہیں جب تک اطاعت کروانے والا حضور اکرم ﷺ کے اسوہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے مطیعوں کی محبت میں مبتلا نہ ہوجائے۔ میں جب کہتا ہوں، مبتلا نہ ہو جائے تو یہ ایک بے اختیار کیفیت ہے اور حضور اکرم ﷺ اس کیفیت میں مبتلا تھے اس کے سوا آپؐ کے پاس چارہ کوئی نہیں تھا۔ آپؐ ان لوگوں کے غم میں بے قرار ہوجایا کرتے تھے جن کی ہلاکت کے فیصلے آسمان پر ہوتے تھے اور اتنے بے قرار ہوتے تھے کہ آسمان سے خدا آپؐ کو مخاطب کر کے فرماتا تھا کہ اے میرے بندے کیا تو ان دشمنوں کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا۔ یہ ہی وہ کیفیت ہے، وہ آسمانی راز ہے جو کبھی بھی حضور اکرم ﷺ خود نہ کھولتے مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان آیات کے ذریعے ان مضامین کو ہم پر روشن فرمایا۔

لیکن اس کے باوجود ایک ادنیٰ بھی خوف اپنے ماننے والوں یا وہ جن کے لئے مامور تھے ان کے پیٹھ پھیر کر چلے جانے کا، آپؐ کے دل میں لاحق نہیں تھا اور قرآن کریم کی دوسری آیت اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتی ہے وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ (المدثر:7) اے محمد ﷺ کیونکہ آپؐ اولین مخاطب ہیں آپؐ کے حوالے سے دوسرے بھی مخاطب ہیں مگر اولین مخاطب آپؐ ہیں تو کبھی بھی اس غرض سے احسان نہ کر کہ اپنا رسوخ بڑھا۔ تَسۡتَكۡثِرُ یہاں اس تعلق میں یہ ہے۔ ہرگز اس خیال سے کسی پر احسان نہ کر کہ تو اپنا رسوخ بڑھا۔ تجھے اپنا رسوخ بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ خدا تیرے لئے کافی ہے اور وہی ہے جو ہمیشہ تیرا رسوخ بڑھاتا رہے گا۔ پس عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ کا مضمون اس بات کو کھول رہا ہے کہ اطاعت میں، اطاعت کروانے میں جذبہ محبت کا ہے جو کام کرے گا۔ جذبہ فدائیت کا ہے جو کام کرے گا لیکن ایسی فدائیت ہے جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انسان اس میں مبتلا ہوگیا ہے اس کا بس ہی کوئی نہیں۔

لوگ جب ماؤں کو کہتے ہیں کہ اپنے بچے کی تکلیف میں غم چھوڑ دے یا اپنے فوت شدہ بچے کے لئے اس قدر اندوہناک نہ ہو تو وہ نصیحت کرنے والوں کو محبت اور احسان کی نظر سے تو نہیں

دیکھتی۔ وہ شکوے اور تکلیف کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے تمہیں پتا کیا ہے کہ محبت ہوتی کیا ہے۔ تم کیا جانتے ہو کہ اپنے پیاروں کے دکھ کو انسان کس مشکل سے برداشت کرتا ہے۔ پس یہ سمجھانے کے قصے نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جب بھی حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ سمجھایا گویا سمجھایا کہ یہ نہ کر تو ہرگز مراد یہ نہیں تھی کہ آپؐ کو باز رکھا جا رہا تھا۔ یہ ایک محبت اور پیار کا اظہار ہے۔ محض اس بات کا اظہار ہے کہ میری تیرے دل پر ہمیشہ نظر رہتی ہے اور یہ کبھی ایسا نہیں ہوا اور ایک بھی اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ ایسی دو آیات جو نازل ہوئیں جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ دشمنوں کے لئے اپنے آپ کو ہلاک نہ کر ان آیات کے نزول کے بعد آپؐ نے غم چھوڑ دیا ہو۔

سورۃ ہود کے متعلق فرمایا اس نے تو مجھے بوڑھا کر دیا ہے کیونکہ یہ غم بناوٹ کا غم نہیں تھا۔ جو بناوٹ کا غم نہ ہو جو بے اختیار ہو اس پر نصیحت کا کوئی اثر ویسے ہی ممکن نہیں ہے کیونکہ دل کے معاملات میں نصیحت کا کیا تعلق۔ پس وہ غلط سمجھتے ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے گویا آپ کو حکم دیا کہ آج کے بعد غیروں کی فکر کرنا چھوڑ دے۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی فکر ہی تو تھی جس نے دنیا کی کایا پلٹی ہے۔ اس فکر مند اور بے قرار کی دعائیں ہی تھیں جس نے ایک عظیم انقلاب برپا کر کے دکھا دیا۔ پس حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں کہ درحقیقت جو انقلاب عرب میں رونما ہوا جو حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا کہ صدیوں کے مردے جاگ اٹھے اور قبروں سے باہر آ گئے۔ یہ انقلاب محمد مصطفیٰ ﷺ کی دعاؤں کا انقلاب تھا۔ پس خدا کیسے آپؐ کو بے قرار دل کی دعاؤں سے باز رکھ سکتا تھا، باز کرتا یہ خیال ہی بالکل باطل اور بے حقیقت ہے۔ بعض پیار کے اظہار ہوا کرتے ہیں۔ یہ محض اللہ کے پیار کا اظہار ہے کہ میری تجھ پر نظر ہے۔ تو لوگوں کے لئے بے قرار ہے میں تیرے لئے بے قرار ہوں اور ان معنوں میں خدا کا بے قرار ہونا ایک محاورہ ہی نہیں حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے یہ ثابت ہے کہ جس رنگ میں بھی یہ ممکن ہے، ہم نہیں جانتے کہ کیسے ممکن ہے بعض دفعہ اپنے بندوں کی خوشی پر اللہ خوش ہوتا ہے اپنے بندوں کی ہنسی کے ساتھ اللہ ہنستا ہے اپنے بندوں کے غم میں خدا گویا مبتلا ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث جس کا میں بار بار ذکر کر چکا ہوں کہ خدا تعالیٰ اپنے بعض بندوں سے پوچھے گا کہ جب میں مصیبت میں مبتلا تھا تم نے کیوں میری فکر نہ کی۔ جب میں بھوکا تھا تو نے مجھے کیوں کھانا نہ کھلایا۔ جب میں ننگے بدن تھا تو نے مجھے کیوں کپڑے نہ پہنائے۔ اس مضمون

کی تفصیلی حدیث ہے۔ ہر ایسے موقع پر وہ بندہ جسے خدا مخاطب ہوگا بے قرار ہو کر جواب دے گا کہ اے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو کب بھوکا تھا۔ کیسے ممکن ہے کہ تو بھوکا ہو۔ تو کب ننگے بدن تھا۔ کیسے ممکن ہے کہ تو ننگے بدن ہو۔ کب تجھے بھوک اور پیاس نے تڑپایا کہ میں تیری خدمت کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ یہ جواب دے گا کہ جب میرا ایک غریب بندہ ننگے بدن تھا تو میں ننگے بدن تھا۔ تم نے کیوں اس کا خیال نہ کیا۔ پس یہ جو اختیار رہے نیک و بد کا اس سے بعض بڑے کریہہ مناظر پیدا ہوتے ہیں تکالیف کے مگر یہ بھی خدا تعالیٰ کے ایک عظیم پر حکمت نظام کا حصہ ہیں لیکن یہ خیال کر لینا کہ اللہ رحیم نہیں ہے ورنہ وہ ان تکلیفوں کو دور کر دیتا ایک جاہلانہ خیال ہے یہ حدیث ان خیالات کا بطلان کرتی ہے۔ اللہ کو اپنے سب بندوں کا احساس ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس تکلیف کے بدلے جو انہیں عارضی طور پر دنیا میں پہنچے گی انہیں وہ اتنا خوش کر سکتا ہے، اتنا خوش کرے گا کہ وہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ جو کچھ ہمیں نصیب ہو رہا ہے اس کا، ہمارے دکھوں سے اس کی کوئی بھی نسبت نہیں۔ وہ دکھ ان کو حقیر محسوس ہوں گے بے معنی دکھائی دیں گے کیونکہ جب ایک معمولی تکلیف کا بہت بڑا انعام دیا جاتا ہے تو تکلیف بالکل کالعدم ہو جایا کرتی ہے۔ پس اس پہلو سے جب میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے جب یہ کہتا ہے کہ اے میرے بندے بے قرار نہ ہو تو یہ کہنا ہرگز جائز نہیں کہ دراصل یہ پیغام ہے کہ اے میرے بندے میری خاطر تو دنیا کے دکھوں سے بے قرار ہو رہا ہے اس طرف نظر کر کہ تیرے لئے آسمان پر بے قرار ہوں۔ ورنہ یہ نصیحت کبھی خدا تعالیٰ نہ فرماتا۔ یہ وہ جذبہ ہے جو ایک حیرت انگیز لافانی اطاعت کی روح پیدا کرتا ہے اور اطاعت امارت سے شروع ہوتی ہے۔

پس آپ میں سے ہر وہ شخص جس کے سپرد کسی قسم کے امارت کے مناصب سونپے جائیں وہ یاد رکھے کہ ایک ہی اطاعت کروانے کا رنگ ہے اور وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا رنگ ہے۔ اس رنگ کو اپنائیں گے تو خدا کے رنگ اپنائیں گے۔ اگر اس رنگ کو نہیں اپنائیں گے تو آپ اس بات کے اہل ہی نہیں ہیں کہ آپ کی کسی معنے میں بھی اطاعت کی جائے۔ اس تعلق میں بعض اور آیات بھی ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ مگر چونکہ وقت کم ہے اس لئے صرف ایک سورہ مدثر کی بعض آیات ہیں انہی پر میں قرآن کریم کے حوالے کو ختم کروں گا۔ پھر احادیث کے حوالے سے چند اور امور آپ کے سامنے رکھوں گا۔

فرمایا يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (المدثر: 2) اے فرغل پہنے ہوئے یا کوٹ پہنے ہوئے، جو اوپر کا کوٹ

ہے کھڑے ہونے والے قُمۡ فَاَنۡذِرۡ (المدثر:3) کھڑا ہو جا اور ڈرا وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ (المدثر:4) اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر وَثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ (المدثر:5) اور اپنے کپڑوں کو پاک کر۔ یہاں جو امیر کے فرائض ہیں ان میں ایک بہت اہم فریضہ اپنے ساتھیوں کا پاک کرنے کا فریضہ ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا وَثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ جہاں تک شفقت اور رحمت کا تعلق ہے یہ کوئی نفسانی کمزوری کی شفقت اور رحمت نہیں ہے۔ پس اگر کوئی امیر یا کوئی شخص کسی معنوں میں بھی مامور بنایا گیا ہو وہ سمجھے کہ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ لوگوں کے لئے مہربان ہو تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ بعض دفعہ دل کی کمزوری کی مہربانی فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتی ہے جو مہربانی حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی مہربانی تھی اس مہربانی کے بہت گہرے فرائض تھے اور وہ مہربانی محض پیار کی بات تک محدود نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کے دنیا اور آخرت کے عظیم فوائد تک ممتد تھی۔ اس پہلو سے آپ کے فرائض کو بطور مطاع کے یوں بیان فرمایا گیا۔ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ۔ اوّل تو اَلۡمُدَّثِّرُ کا معنی کپڑے میں لپٹے ہوئے یا وہ جس نے اپنے اوپر ایک اوپر کا کوئی لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ یہ سمجھنے والی بات ہے۔ مراد یہ ہے کہ جیسے بارانی کوٹ سے انسان بارش اور موسم کے بد اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی تعریف فرما رہا ہے کہ تو ہر قسم کے بد اثر سے بالکل پاک اور محفوظ ہے۔ کوئی دنیا کا بد اثر تیری ذات میں سرایت نہیں کر سکتا بلکہ تیرے کپڑوں تک جو تیرے بدن سے چمٹے ہوئے ہیں وہ سرایت کرنے کی توفیق نہیں پائے گا۔ تو ہر وقت غیر اللہ کے اثرات سے محفوظ ہے اور خدا کی حفاظت میں لپٹا ہوا ہے۔ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ اس حالت میں کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ اور محض اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ کسی دنیا کے ملاحظے کی خاطر یا دنیا کو خوش کرنے کی خاطر غیر اللہ کی تعریف کا تو حضور اکرم ﷺ کے لئے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پس جہاں یہ حکم دیا گیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے رسول اللہ ﷺ اس فریضے سے غافل تھے مراد یہ ہے کہ اپنے رب کی تکبیر کرتا چلا جا۔

اس کا ڈرانے سے یہ تعلق ہے کہ جب تو ڈرائے گا تو لوگ تجھ پر، تیرے خلاف انتقامی کروائی کر سکتے ہیں لوگ تجھ سے دور بھاگ سکتے ہیں۔ مگر اس کے نتیجہ میں رب کی تکبیر کرنا اس کی بڑائی بیان کرنا تیرا ایک جاری فریضہ رہنا چاہئے۔ تجھے ذرا بھی متاثر اس بات سے نہیں ہونا چاہئے کہ لوگ کیا اثر لیتے ہیں۔ اثر قبول کرتے ہیں یا ردعمل دکھاتے ہیں۔ وَثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ اور اپنے کپڑوں کو پاک کر۔ اب سوال یہ ہے کہ جو پہلی آیت کا مضمون ہے وہ اس آیت سے متضاد کیوں ہو گیا

یعنی بظاہر دیکھنے میں متضاد دکھائی دیتا ہے۔ پہلے تو یہ صفت بیان فرمائی کہ تو ایسے لبادے میں ملبوس ہے جس پر کوئی بداثر بیرونی اثر کا پڑ ہی نہیں سکتا بلکہ وہ تیرے بدن اور اندرونے کو کلیتہً غیر اللہ کے اثر سے محفوظ رکھ رہا ہے۔ اب وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ سے کیا مراد ہے پھر۔ ثیاب کا ایک معنی ہے ساتھ اور اسی پہلو سے مرد کو عورت کا لباس اور عورت کو مرد کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا تیرا پاک ہونا اور تیری پاکیزگی کی حفاظت اور ضمانت ہونا کافی نہیں ہے۔ تجھے اس لئے قائم نہیں فرمایا گیا کہ تو محض اپنے بدن کی حفاظت اور پاکیزگی کا خیال کرے۔ تجھ پر یہ فریضہ ہے کہ اپنے اردگرد اپنے ماحول کو پاک اور صاف کرتا رہ۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور شرک اور ناپاکی کو کلیتہً چھوڑ دے۔ اب یہ بھی ایک عجیب مضمون ہے کہ خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو فرما رہا ہے کہ رجز کو پوری طرح چھوڑ دے حالانکہ رجز تو آپ کے قریب تک نہیں پھٹکا تھا۔ تمام موحد انبیاءؑ میں سب سے بلند مرتبہ آنحضرت ﷺ کا تھا۔ توحید کی خاطر تو آپ نے سب کچھ لٹا دیا۔ تو خدا کی نصیحت کیا معنے رکھتی ہے کہ شرک کو چھوڑ دے۔ اس کا حوالہ ''ثیـــاب'' کی طرف ہے اور چھوڑ دے کا معنیٰ ہجرت سے تعلق رکھتا ہے جو قرآن کریم میں بھی بیان ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی روشنی ڈالی۔ فرمایا وہ کپڑے جن کو تو نے پاک کرنا ہے اگر وہ شرک سے آلودہ ہو گئے ہوں یعنی وہ لوگ جو تیرے اردگرد رہتے ہیں اگر ان میں تو شرک کے آثار دیکھے تو ان سے ہجرت کر جا۔ ان کو قریب تک نہ پھٹکنے دے۔ ہجرت کرنے کا یہ مضمون ہے۔ تیرے ماحول میں محض موحد بندے رہنے چاہئیں۔ ہر قسم کے مشرکوں سے اپنے آپ کو پاک کر لے۔ مراد یہ نہیں کہ آپؐ کے اندر شرک ہے جس سے **نعوذ بالله من ذلک** علیحدگی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ آپؐ کے اردگرد بسنے والوں میں اگر کوئی شرک کے آثار ہوں تو ان سے علیحدہ ہو جا۔

اور یہ وہ مضمون ہے جس کا سمجھنا امارت کے تعلق میں بہت ہی لازم ہے، بہت ہی ضروری ہے کیونکہ ہر وہ شخص جس کو امارت کے اختیارات سونپے گئے ہوں اس کے اردگرد لازماً ایسے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں جو اس کی بڑائی کے گیت گانے لگتے ہیں۔ جو اسے بڑا بتاتے ہیں اور اس پہلو سے اس کی امارت میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ جو ایک طبعی انسانی فطرتی کمزوری ہے جس کی طرف خدا تعالیٰ نے یہاں توجہ دلائی ہے ورنہ دنیا کے بادشاہ اور صاحب امر لوگ تو ہمیشہ ان لوگوں کے گھیرے میں آجایا کرتے ہیں۔ جو ان کی بڑائی بیان کرے وہ اس کو بڑا سمجھتے ہیں اس کو اور زیادہ

قریب کرتے ہیں اور جتنا ان کو قریب کرتے ہیں اتنا عوام الناس ان سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے ہمیں یہ فرمایا ہے کہ تمہارے اردگرد جو لوگ ہیں انہیں پاک رکھنا تمہاری امارت کی ذمہ داریوں میں سے ہے اور ان کی کمزوریوں سے صرف نظر کی تمہیں اجازت نہیں۔ یہ وہ پہلو ہے جس میں میں کئی صاحب امر لوگوں کو ملوث پاتا ہوں۔ ایسی کمزوری ہے جو بسا اوقات دکھائی دیتی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہوتا ہے جہاں تک میرا بس چلتا ہے انہیں سمجھا کر اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن پھر بھی مخفی طور پر یہ فطری کمزوری اندر سے سر اٹھا لیتی ہے اور امارت کو اس طریق سے کئی طرح سے نقصان پہنچا دیتی ہے۔

بہت سے امیر ہیں جو میرے پیش نظر ہیں جب میں یہ بات کر رہا ہوں کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں مگر بہت سے متقی امراء بھی ایسے ہیں جن کے اندر یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ چند لوگوں کے ہاتھ میں وہ گویا کھلونے بن جاتے ہیں اور اپنی طرف سے وہ تقویٰ کے ساتھ یہ فیصلہ کرتے ہیں اور اپنی طرف سے اس وجہ سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے مددگار، ان کی تائید کرنے والوں میں یہ لوگ سب سے آگے آگے ہیں اور اس بات کو بھلا دیتے ہیں کہ ایسے ہی لوگوں میں مریض بھی شامل ہو سکتے ہیں اور ان کے مرض کی شناخت شرک کے ذریعے ممکن ہے اس کے سوا کوئی ممکن نہیں۔ پس جہاں بھی کوئی شخص کسی کے اچھے بھلے فیصلے کی تائید کرتا رہے اور ہمیشہ تائید کرے اور اس کے برعکس جب بعض لوگ اس سے اختلاف کریں تو اس بات کو بھلا دے کہ اختلاف کرنے والے سچے ہیں یا غلط ہیں اور یہ سمجھے کہ میری اطاعت کا تقاضا ہے کہ میں امیر کی ہر بات کی ہاں میں ہاں ملاؤں یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل میں شرک پیدا ہو چکا ہے اور امراء کو نصیحت ہے کہ وہ ایسے شرک کی تلاش میں رہیں۔ گہری نظر سے مطالعہ کریں اور ایسے لوگوں کو اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں جو ہر اچھے بھلے میں ان کی تائید کرتے ہیں بلکہ ان سے متنبہ ہو جائیں اور ان سے فاصلہ اختیار کریں۔ جس حد تک ان میں تقویٰ کی کمی دیکھیں اسی حد تک ان سے اپنے آپ کو الگ کر لیں۔ یہ معنی ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ جہاں شرک کے آثار دیکھو گے ان لوگوں سے ہجرت کر جاؤ ان سے اپنا تعلق ہی توڑ لو۔ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ تمہارے ماحول میں رہیں۔

پس اس نظر سے جب آپ اپنے ماحول کی شناخت کرتے ہیں تو اس وقت آپ کو حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ آپ کس حد تک خدا کی خاطر لوگوں سے اطاعت کے خواہاں ہیں اور کس حد تک

اپنے نفس کی خاطر اطاعت کے خواہاں ہیں کیونکہ شرک کا مضمون دوطرفہ ہے جہاں کوئی امیر ایسے لوگوں کی باتوں سے خوش ہوتا ہے جو دکھائی دے دینا چاہئے کہ محض خوشامد کی خاطر اس کی بڑائی کرتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں وہاں وہ خود بھی شرک میں شریک ہو گیا اور شرک ایک ایسی لعنت ہے کہ شرک کرنے والا بھی پوچھا جائے گا اور جس کو شریک ٹھہرایا جائے گا وہ بھی پوچھا جائے گا اور دونوں ہی لعنتیں ہیں۔ پس اگر چہ یہ شرک خفی ہے۔ اس کے بہت باریک پہلو ہیں۔ مگر ہم نے جو دنیا کو اطاعت کے اسلوب سکھانے ہیں اور آنحضرت ﷺ کی امارت کے رنگ دکھانے ہیں ہمیں لازماً اپنی ذات میں یہ باریک تبدیلیاں پیدا کرنی ہوں گی ورنہ نظام جماعت کی حفاظت کی کوئی ضمانت ممکن نہیں ہے۔ ہر آنے والے کو سمجھانا ہے اور یہاں امریکہ میں بھی اس کی ضرورت ہے اور ان میں بھی ضرورت ہے جو آج سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ کئی قسم کے میں افریقن احمدی دیکھتا ہوں جو امریکہ میں آباد ہو کر اب امریکن افریقن احمدی ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ان شکوک میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو امارت کی باتیں ہو رہی ہیں جو اطاعت کی باتیں ہو رہی ہیں گویا ایک حاکم کے بدلے تم اور حاکم بیرونی ہم پر نافذ کر دئے گئے ہو اور کیوں ہم آخر اس طرح اطاعت کریں۔ یہ جوان کے ایمان کی کمزوری ہے یہ دراصل فہم کی کمزوری سے ایمان کی کمزوری پیدا ہوئی اور اس فہم کی کمزوری میں ان لوگوں کا دخل ہے اور وہ ذمہ دار ہیں جن کا فرض تھا کہ ان کو اسلامی اطاعت کی روح سکھائیں اور بتائیں کہ امارت کی اطاعت کیوں ہوتی ہے اور کس کی خاطر ہوتی ہے۔ پس اگر اطاعت اللہ کے لئے ہے جیسا کہ ان آیات میں آخر پر مضمون کو اپنے انتہائی نقطہ عروج تک پہنچایا گیا ہے تو پھر اگر وہ اس بات کو سمجھ لیں کہ اطاعت رب کی ہے، بندے کی نہیں ہے تو وہ اس فکر سے آزاد ہو جائیں گے، اس احساس کمتری کا شکار نہیں رہیں گے۔

چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ان سب پر جن کا ذکر گزرا ہے ان پر اس غرض سے احسان نہیں کرنا کہ تیرا اثر اور رسوخ بڑھے کیونکہ اگر شرک کو تو نے برداشت کر لیا اپنی ذاتی بڑائی کو پسند کیا اور ان کمزور لوگوں پر جو بیمار ہو گئے ہیں ان کو اپنے اردگرد رہنے دیا تو اس بیماری کا اثر تیرے گردوپیش پر پڑے گا۔ تمام دائرے کو یہ بیماری بیمار کر سکتی ہے جن کا تیری امارت سے تعلق ہے اور امر واقعہ ہے کہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ جہاں لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا امیر ان پر نافذ کیا گیا

ہے جو خوشامد کو پسند کرتا ہے یا محض تائید کو دیکھتا ہے اور یہ نہیں پہچانتا کہ تائید برحق اور مناسب ہے یا ناحق ایک قسم کی جنبہ داری کے تعلق میں ہے تو وہ خود بھی مریض ہو جاتا ہے اور ساری جماعت میں یہ مرض پھیل جاتا ہے کہ جی اچھی بات کہو تو فائدہ ہوگا۔ تعریفیں کرو گے تو تمہیں کچھ حاصل ہوگا ورنہ تم جماعت کے پسندیدہ دائرے سے باہر نکال کر پھینک دیئے جاؤ گے۔

جہاں تک اس اعتراض کا حق ہے خدا تعالیٰ یہ اعتراض کا حق کسی کو نہیں دیتا۔ یہ ایک الگ مضمون ہے اس کی طرف میں پھر آؤں گا لیکن جہاں تک امیروں کو ہدایت دینے کا تعلق ہے فرمایا ہے تم نے ہرگز اپنے رسوخ کو بڑھانے کی خاطر کوئی احسان نہیں کرنا۔ اگر کوئی مریض ہے تو اسے کاٹ کر الگ کر دو اور اس معاملے میں احسان کو عدل کی راہ میں حائل نہ ہونے دو۔ یہ وہ مضمون ہے جس کی باریکی کو سمجھنا ہمارے لئے انتہائی ضروری ہے اور ہر سطح پر اس کی باریکی کو سمجھنا ضروری ہے۔ احسان عدل سے اوپر کا مرتبہ ہے مگر عدل کو احسان پر ہمیشہ یہ فوقیت حاصل ہے کہ جب احسان عدل سے ٹکراتا ہے تو احسان گر جاتا ہے عدل باقی رہتا ہے۔ پس ایک احسان کا تقاضا ہے جو رؤف رحیم میں بیان ہوا ہے۔ ایک عدل کا تقاضا ہے جو گندے اور مشرک لوگوں کو اپنے سے ہٹا کر باہر دور پھینک دینے کا تقاضا ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ غالب رہے گا اور کوئی احسان بھی عدل کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔

آنحضرت ﷺ نے اس مضمون کو اپنے حوالے سے یوں کھولا کہ ایک موقع پر جب ایک سردار کی بیٹی کے ہاتھ کاٹے جانے تھے اس وقت کسی نے حضرت اسامہؓ بن زید کو اس خیال سے کہ آپؐ کو اپنے غلام کا بیٹا بہت پیارا ہے سفارش کے لئے بھیجا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اسامہ ہی تھے مگر کوئی اور بھی ہوسکتا ہے۔ جو بھی تھا اسے اس خیال سے کہ رسول اللہ ﷺ کو بڑا پیارا ہے سفارش کے لئے بھیجا اور یہ کہا کہ آنحضورؐ سے عرض کرو کہ یہ وہ عورت جس کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیا گیا ہے یہ ایک بہت بڑے رئیس اور صاحب اختیار انسان کی بیوی یا اس کے خاندان سے تعلق رکھنے والی ہے۔ اگر اس کے ہاتھ کاٹے گئے تو ہوسکتا ہے اس سارے قبیلے پر ابتلا آئے۔ جب آپؐ نے یہ بات سنی تو جلال سے آپؐ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس کا نام بھی فاطمہ تھا اور آپؐ کی بیٹی کا نام بھی فاطمہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا اس فاطمہ کی تم سفارش کرتے ہو، خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کے ہاتھ کاٹنے کا بھی اسی طرح حکم دیتا۔ یہ عدل ہے۔

(صحیح مسلم ، کتاب الحدود ، باب قطع السارق الشریف وغیرہ ،والنھی عن الشفاعۃ فی الحدود)

سب سے زیادہ احسان کا تعلق آپؐ کو امت کے علاوہ اقرباء سے تھا کیونکہ قرآن کریم نے اقرباء کا حق زیادہ بتایا ہے اور اس مضمون کو جگہ جگہ کھولا ہے۔ پس اپنے اہل سے جو رحمت اور شفقت کا تعلق تھا وہ اسی الٰہی ہدایت کے تابع تھا کہ ساری امت سے تیرا تعلق ہے مگر اقرباء کا پھر بھی ایک فائق حق ہے جس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے۔ تو مثال فاطمہ کی دی اپنی پیاری بیٹی کی جو ایک پاکیزگی کا بھی مجسمہ تھی اگر یہ بھی چوری کرتی تو میں ہرگز اپنے احسان کو عدل کی راہ میں حائل نہ ہونے دیتا۔ پس یہاں عدل کی بحث ہے اور عدل کے اوپر جب احسان کو غالب کیا جائے تو شرک شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں ہمیشہ کوئی مخفی خوف ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان عدل سے باز آتا ہے۔ یاد رکھو عدل کے قیام میں ہمیشہ شرک روک بنتا ہے۔ آپ جتنی گہرائی سے اس مضمون کا جائزہ لیں اس کے سوا کوئی نتیجہ نکال ہی نہیں سکتے کہ عدل کی راہ میں ہمیشہ شرک حائل ہوگا۔

تو فرمایا کہ تو نے کمال عدل سے کام لینا ہے۔ رجز کو چھوڑنا ہے بہر حال چھوڑنا ہے اور تیرا احسان اس راہ میں حائل نہ ہو اور یہ خیال دل میں جاگزیں نہ ہو کہ اس طرح تیرا رسوخ کم ہو جائے گا۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر:8) اور جو کچھ کرنا ہے اپنے رب کی خاطر کرنا ہے اور اپنے رب کی خاطر صبر سے کام لینا ہے۔

اب ایک اور مضمون ایسا بیان ہو گیا جس کا دنیا کی ڈکٹیٹر شپ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ڈکٹیٹر اور صبر کا کیا تعلق ہے۔ جو ڈکٹیٹروں کے ماتحت ہوتے ہیں وہ بے چارے صبر کرتے کرتے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جانیں دے دیتے ہیں مگر ڈکٹیٹر کے لئے تو صبر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنحضرت ﷺ کو اس موقع پر جو یہ فرمایا وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ یہ ایک بہت گہرا اور وسیع مضمون ہے جس کو سمجھ کر اپنی ذات سے جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ فَاصْبِرْ سے مراد ایک تو یہ ہے کہ دشمنوں کی ایذا رسانی، دشمنوں کی تکلیف پر جو عدل کے نتیجے میں ضرور عادل کو پہنچا کرتی ہے تو نے صبر سے کام لینا ہے۔ دوسرے یہ کہ عدل کے اجراء میں صبر سے کام لینا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ جب خدا کی خاطر کوئی فیصلہ فرمایا کرتے تھے تو ہمیشہ اس کا دکھ محسوس کرتے تھے اور کبھی بھی کوئی تلخ فیصلہ غصے اور نفرت کے جذبے سے نہیں کیا بلکہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ عدل سے ڈرے ڈرے جہاں تک ممکن

ہے اس فیصلے کا اطلاق نہ ہو جو آپؐ کے دل پر شاق گزرا کرتا تھا۔

ایک موقع پر ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے وہ گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں مجھے سنگسار کرنے کا حکم ہونا چاہئے۔ آپؐ نے بات سنی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ شخص دوسری طرف سے آیا اور پھر یہی بات عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے وہ گناہ سرزد ہوا ہے جس کے نتیجہ میں مجھے سنگسار کرنے کا حکم جاری فرمائیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ ابھی وہ آیت نازل نہیں ہوئی تھی جس میں سنگساری کی بجائے سو کوڑے کی سزا مقرر فرمائی گئی۔ آپ نے پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔ پھر وہ دوبارہ اس طرف سے آیا پھر آپ نے منہ پھیر لیا۔ پھر جب چوتھی بار آیا تو آپ نے فرمایا اس کو لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔ اب یہ تین مرتبہ انحراف اور چوتھی بار توجہ فرمانا صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کے دل میں یہ بات بہت گراں گزرتی تھی کہ عدل کی خاطر ہی سہی مگر کسی کو سزا دی جائے اور دل نے یہ ایک جائز عذر اس وقت تراشا جو جائز تھا کہ اسلام نے چار گواہیوں کا حکم دیا ہے اس لئے جب تک یہ چار دفعہ اقرار نہ کرے میں اس کو سزا نہیں دوں گا۔ کتنا عظیم خیال ہے، کتنا لطیف خیال ہے۔ ایک عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ محبت میں مبتلا کا قصہ ہے۔

''مجھ سے بڑھ کر میری بخشش کے بہانوں کی تلاش''

اس کو کہتے ہیں۔ مجرم حاضر ہے کہ مجھے قتل کیا جائے، مجھے دفنا دیا جائے زندہ درگور کر دیا جائے۔ آپؐ اس سے احتراز کر کے دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں۔ کیا محبت کے بغیر یہ ممکن ہے اور جب حکم دیا تو اس وقت بھی دل بے قرار رہا مگر عدل کی خاطر یہ مجبوری تھی۔ قیام عدل پر ایک بالا تقاضا تھا لیکن اس کے بعد ایک اور واقعہ ہوتا ہے۔ وہی شخص جب اس پر پتھر برسائے جانے لگے تو پہلے تو وہ بڑی بہادری سے کہتا تھا مجھے سنگسار کیا جائے اس وقت تکلیف سے اٹھ دوڑا اور بعض صحابہؓ نے اس کا پیچھا کیا اور ایک نے اس کو پکڑ لیا اور پھر اسے سنگسار کر دیا۔ جب یہ واقعہ فخر سے محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا گیا تو آپؐ کو بے انتہاء تکلیف پہنچی۔ آپؐ نے کہا بھاگتا تھا تو بھاگنے دیتے۔ تمہیں کیا مصیبت پڑی ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے پڑ کے اسے پکڑ کے پھر ذبح کرتے۔

(صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی)

یہ ہے احسان اور عدل کا ایک ایسا رابطہ جس سے بلند تر رابطہ ممکن نہیں ہے۔ نہ پہلے انبیاءؑ میں کوئی اس کی مثال دکھائی دیتی ہے، نہ آئندہ کبھی کسی انسان میں اس کی مثال دکھائی دے سکتی ہے۔

اور یہ امر واقعہ ہے کہ خدا کی خاطر جب انسان سزا دیتا ہے اگر واقعتہً خدا کی خاطر دیتا ہے تو ضرور اس کا دکھ محسوس کرتا ہے۔ میں ایک حقیر، عاجز، ادنیٰ غلام ہوں محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا کی خاطر مجھے کسی کو سزا دینی پڑے اور میں خود تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔ بعض دفعہ ساری ساری رات میں بے چین رہا ہوں کہ کیوں مجھے اتنا سخت اقدام کرنا پڑ رہا ہے لیکن دشمن اعتراض سے باز نہیں آتے کہتے ہیں دیکھو تم نے جاری کر دی سزا۔ تمہارے دل میں کوئی رحم نہیں ہے۔ میں ان کو جواب دیتا ہوں کہ دیکھو رحم اور عدل کا ایک ایسا رشتہ ہے جسے محمد رسول اللہ ﷺ سے ہم سیکھیں گے اور محمد رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر عدل اور احسان کا کوئی رشتہ استوار ہو ہی نہیں سکتا۔ پس اپنی تکلیف کو میں خدا پہ چھوڑتا ہوں اور تمہارے اعتراض کو بھی میں خدا پہ چھوڑتا ہوں مگر احسان کے نام پر مجھ سے عدل کے تقاضوں سے بے اعتنائی کی کبھی توقع نہ رکھنا کیونکہ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ نے کبھی ایسا نمونہ نہیں دکھایا۔

پس یہ وہ امارت کے حقوق ہیں جو آپ سب کو ہم سب کو ادا کرنے ہیں اور یہ معنی ہے وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ان کی تکلیفیں بھی خدا کی خاطر برداشت کر اور خدا کی خاطر جو تجھے تلخ فیصلے نافذ کرنے پڑتے ہیں ان کا دکھ بھی خدا کی خاطر برداشت کر۔ یہ وہ صبر عظیم ہے جس کا ذکر آنحضرت ﷺ کے حوالے میں بعض دفعہ نام لے کر، کھلے اشارے میں، بعض دفعہ مخفی اشاروں میں ہمیں قرآن کریم میں ملتا ہے اور یہ وہ حظ عظیم ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا اور جس کے نتیجہ میں پھر دشمن دوست بنائے جاتے ہیں۔ پس ایسے ہی امیر کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔ پہلے یہ حدیث آپ کے سامنے رکھتا ہوں، وقت تھوڑا ہے، دو حدیثیں شاید پیش کرسکوں گا۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو نہیں مارا نہ کسی عورت کو، نہ خادم کو یعنی آپؐ کی قلبی کیفیت یہ تھی۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے رستے میں آپؐ نے خوب جہاد کیا۔ آپؐ کو جب کسی نے تکلیف پہنچائی آپؐ نے کبھی اس سے انتقام نہیں لیا ہاں جب اللہ تعالیٰ کے کسی قابل احترام مقام کی مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں خدا کی طرف سے معزز، محترم چیزیں قرار دی گئی ہیں ان

کی ہتک ہوئی اور ان کی بے حرمتی کی گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی خاطر آپؐ نے ضرور ان سے انتقام لیا۔

(صحیح مسلم ، کتاب الفضائل ،باب مباعدتهؐ للاثم واختياره من المباح ، أ سهله و انتقامه لله عند انتهاك حرماته)

آنحضورﷺ اطاعت کے دائرے کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ متنبہ فرماتے ہیں کہ امیر کی اطاعت کرو، میری خاطر اطاعت کرو اس لئے کہ میرے نظام کا وہ ایک حصہ ہے اور خدا سے تعلق میں وہ تمہیں اطاعت کا حکم دیتا ہے یا بعض باتوں سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔فرمایا اس تعلق میں یاد رکھو کہ کبھی غیر اللہ کی اطاعت نہیں کرنی۔ یہ محض اللہ کی اطاعت ہے جس کی خاطر تم بندے کے سامنے سر جھکا رہے ہو۔پس اس کی پہچان یہ ہوگی کہ اگر وہ کبھی معصیت کا حکم دیتا ہے تو ہرگز اس کی امارت کے نام پر اس کی معصیت میں اور اس کے سامنے سر نہیں جھکانا اور کبھی معصیت کے کام میں خدا تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی کے معاملے میں کسی بندے کی اطاعت نہیں کرنی۔

اس کی ایک مثال حضرت علیؓ یوں بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرتﷺ نے ایک لشکر روانہ فرمایا اور اس کو اطاعت کی ہدایت فرمائی۔ایک موقع پر اس امیر نے جو کم فہم تھا لوگوں کی اطاعت کو آزمانے کی خاطر آگ جلوائی اور حکم دیا اور پوچھا کہ اگر میں تمہیں اس آگ میں کود جانے کا حکم دوں تو کیا تم میری بات مانو گے۔تو بعض سادہ لوح لوگوں نے عرض کیا ہاں آپ ہمارے امیر ہیں۔آپ اگر ہمیں آگ میں کود جانے کا حکم دیں گے تو ہم مان جائیں گے اور بعض نے کہا کہ معصیت میں امیر کی کوئی اطاعت نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے جس فعل سے منع فرمایا ہے اس میں ہم ہرگز تمہاری اطاعت نہیں کریں گے۔ جب واپسی پر یہ معاملہ آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا اگر یہ لوگ آگ میں کود جاتے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم امیر کی اطاعت کی خاطر کود جائیں گے تو ہمیشہ اس آگ میں جلتے رہتے کیونکہ امیر کی اطاعت محض معروف اور جانے پہچانے اچھے امور میں ہے۔کھلی معصیت والے کاموں میں امیر کی کوئی اطاعت نہیں۔

(صحیح مسلم ، کتاب الأمارة ،باب وجوب طاعة الأمر فى غير معصية، وتحريمها فى المعصية)

پس دیکھو خدا تعالیٰ نے آپ کو بندے کی اطاعت سے کیسے آزاد فرما دیا ہے۔امیر کی اطاعت جتنی بھی کامل ہے وہ محض خدا کی اطاعت ہے اور جہاں بھی امیر خدا کی اطاعت کے دائرے سے سر مو بھی فرق کرتا ہے آپ کی گردنیں اس کی اطاعت سے آزاد فرما دی گئی ہیں ۔اس اطاعت کا نام

ڈکٹیٹر شپ رکھنا اس سے بڑی جہالت اور کیا ہو سکتی ہے۔

پس ہم نے تمام دنیا میں اسلامی اطاعت کی روح پیدا کرنی ہے، اس کے نمونے دکھانے ہیں اور تمام دنیا میں اسلامی اطاعت حاصل کرنے کے سلیقے حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بتلانے ہیں اور تمام ملکوں میں جہاں کثرت سے اس وقت احمدیت پھیل رہی ہے ہمیں اس کی شدید ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم فریضے کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وہ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمیشہ ہم اسلام کے نظام اطاعت کو جاری و ساری رکھ سکیں اور اس کے اعلیٰ تقاضوں کو پورا کر سکیں کیونکہ اسی میں ہماری زندگی ہے اور اسی میں ہمارا اطمینان ہے اور اسی میں ہماری صلاحیت ہے۔

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ بہترین وہ لوگ ہیں جن کے امیر اپنے ماتحتوں کو دعائیں دیتے رہیں۔ یہ وہ بہترین اطاعت ہے جو اسلامی اطاعت ہے۔ اللہ ہمیں اس اطاعت کے نمونے دنیا میں قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

چار بجے چونکہ وقت ختم ہو جاتا ہے کیونکہ دو طرفہ تعلق ہمارا رابطہ کٹ جاتا ہے اس لئے جلدی میں مجھے بعض اہم امور چھوڑنے بھی پڑے اور آپ نے دیکھا ہوگا میرے طرز بیان میں کچھ تھوڑی سی افراتفری پائی جاتی تھی وہ وقت کی طرف خیال جاتا تھا تو طبیعت میں ایک جلدی پیدا ہو جاتی تھی۔ کوشش کرتا تھا کہ کوئی قابل ذکر امر رہ نہ جائے۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے جونہی چار بجے ہیں اس وقت تک میں اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ اگر کوئی ٹکڑا تھوڑا سا رہ بھی گیا ہو تو انشاء اللہ بعد میں انگلستان سے جب ہم اسی خطبہ کو اٹھا کر عالمی روابط کے ذریعے دنیا میں پھیلائیں گے تو سب تک پہنچ جائے گا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ابھی چند منٹ اوپر دیئے گئے ہیں اور یہ بات جاری ہے تو آخر پر میں تمام دنیا کی جماعتوں کو جو اس وقت یہ خطبہ سن رہی ہیں امریکہ کے اس اجتماع کے لئے اور اس کی کامیابی کے لئے دعا کی تحریک کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ امریکہ کی جماعت بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور ہر پہلو سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ ابھی تربیت کی بہت حد تک کمی ہے اور خصوصاً ان بچوں میں کمی ہے جو یہاں پیدا ہوئے اور ان نومبائعین میں کمی ہے جو بڑی عمر میں آ کر جماعت میں شامل ہوئے ہیں۔ یہ بہت ہی اہم ذمہ داری کے تقاضے ہیں جو ہمیں پورے کرنے ہیں اور اطاعت کے مضمون پر جو میں

نے زور دیا ہے وہ خالصۃً اس خاطر دیا ہے کہ سب قومیں خدا کی مہمان بن کر ہمارے اندر داخل ہورہی ہیں۔ان کی کمزوریوں پر ہمیں نظر رکھنا ہے۔ان کے رجز کو ہر طرح پاک کرنا ہے اور اپنی کمزوریوں کو ان سے دور رکھنا ہے اور پوری کوشش کرنی ہے کہ ہماری کمزوریاں ان میں منتقل نہ ہوجائیں ورنہ آئندہ قوموں کی خرابیوں کے ہم ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔پس جہاں خدا تعالیٰ انعامات کی کثرت سے بارش فرمارہا ہے۔نئی نئی قومیں لکھوکھہا کی تعداد میں احمدیت میں داخل ہورہی ہیں۔ وہاں ہمارے ثواب کے مواقع بھی بڑھ رہے ہیں اور ہماری سزا کے احتمالات بھی بڑھ رہے ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے امارت کے تعلق میں متنبہ فرمایا ہے کہ ہر امیر اپنے ماتحت جو بھی ہیں ان کے بارہ میں پوچھا جائے گا۔اگر وہ ان کے اوپر شفقت کا حق ادا کرے گا تو اس کی جزا اس کو نصیب ہوگی اور اگر وہ اس حق سے غفلت کرے گا تو خدا کے حضور وہ اس سے پوچھا جائے گا۔مگر ایک اور دوسرے موقع پر آپؐ نے اس مضمون کے اس پہلو کو بھی خوب کھول دیا کہ تم سے جو پرسش ہوگی اس میں تمہاری بے اختیار کمزوریوں کو خدا تعالیٰ نظر انداز فرمادے گا۔اس لئے ایسے ذمہ دار کاموں کو قبول کرنے سے احتراز نہ کرنا اس ڈر سے کہ تم ہوسکتا ہے اس کے فرائض کا حق ادا نہ کرسکو۔آپؐ نے فرمایا کہ اسلام میں امارت کا نظام اس طرح قائم ہوا ہے کہ جو شخص بھی پوری دیانتداری کے ساتھ جاری کرنے کی کوشش کرے گا اس کا دوہرا ثواب خدا اس کو دے گا اور اگر پوری دیانتداری سے کوشش کے باوجود کوئی اچھا فیصلہ جاری نہ کرسکے اور غلطی کا مرتکب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک جزا دے گا اس کی۔

پس اگر نیتوں کے دائرے میں ہم پاک صاف ہوجائیں، محض للہ نیتیں ہوں تو ہماری کامیابیاں بھی باعث ثواب میں اور ہماری ناکامیاں بھی باعث ثواب ہیں۔اس لئے الٰہی سلسلے کے اندر ہر پہلو سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

محبت کی راہیں سیکھنی ہیں تو آنحضرت ﷺ ہی سے سیکھی جائیں گی۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 5 رجولائی 1996ء بمقام بیت الرحمٰن واشنگٹن۔امریکہ)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(آل عمران:32)

پھر فرمایا:

آج میرا خیال تھا کہ محبت الٰہی کے تعلق میں ہی ایک مضمون کو جو میں پہلے شروع کر چکا ہوں آگے بڑھاؤں گا لیکن بیچ میں کچھ اور باتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔مثلاً مجھے مرکز سے یہ اطلاع ملی ہے کہ ہمارا پہلا مالی سال ختم ہو کر دوسرا شروع ہو رہا ہے اور نئے سال کا آغاز جولائی کے پہلے ہفتے ہی میں کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں مَیں پچھلی دفعہ بھی یہ گزارش کر چکا ہوں کہ اب ہم نے کچھ طریق کار بدلا ہے۔اگرچہ اگلے مالی سال کا اعلان تو آج ہی ہوگا لیکن مالی تفاصیل اور مختلف ممالک کے چندوں کے موازنے آج نہیں ہوں گے بلکہ جلسہ سالانہ کی جو اعداد و شمار کی تقریر ہوا کرتی ہے جس میں سارے سال کے کوائف پیش کئے جاتے ہیں اسی دوران انشاء اللہ اس سال بھی وہ کوائف پیش کئے جائیں گے۔صرف ربوہ سے آئے ہوئے اعداد و شمار کی لاج رکھتے ہوئے پاکستان کی تین بڑی جماعتوں کا موازنہ آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے سارے پاکستان میں اہل ربوہ کو مالی سال میں سب سے زیادہ بجٹ ادا کرنے کی توفیق ملی ہے اور جماعت ربوہ کراچی سے بھی آگے بڑھ گئی ہے اور لاہور سے بھی اور

جماعت لاہور کراچی سے آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ جو پیچھے رہ جانے والی جماعتیں ہیں ان کو اپنی فکر کرنی چاہئے۔ مگر جہاں تک نیکی کی دوڑ کا تعلق ہے اس میں جو بھی آئے وہ خدا ہی کا گھوڑا ہے جو اول آرہا ہے۔ وہ ایک کہہ لیں یا دو کہہ لیں یا تین کہہ لیں مگر ہیں تو سب خدا ہی کے گھوڑے، سب پر خوشی ہوتی ہے۔ وہ جو مثال عرب گھوڑوں والی میں نے پہلے بھی آپ کے سامنے رکھی غالباً اس سے پہلے دو تین دفعہ اس کا ذکر کر چکا ہوں مگر ہے بہت پیاری اور چندوں کے مقابلوں کے تعلق میں وہ بیان کر دی جائے تو دلوں میں ایک تحریک پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک عرب کو اپنا ایک گھوڑا بہت پیارا تھا جو کبھی کسی گھوڑے سے ہارا نہیں تھا اور جتنے بھی عرب میں مقابلے ہوئے ان میں ہمیشہ وہی اول آتا تھا۔ ایک اسی کا نمبر دو گھوڑا تھا جو نمبر دو آیا کرتا تھا۔ چوروں کو بھی بڑے فن آتے ہیں اور جو مویشیوں کے چور ہیں وہ تو بڑے ماہر ہوتے ہیں اپنے فن کے۔ ہم چونکہ جھنگ میں آباد ہیں، ربوہ جھنگ میں آباد ہے جو چوروں کا گڑھ ہے خاص طور پر مویشی چوروں کا، تو مجھے پتا ہے بڑے بڑے ماہر فن لوگ ہیں یہ۔ تو ایک چور نے اس کا نمبر ایک گھوڑا چرا لیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت تک وہ اس گھوڑے پر سوار ہو کر آگے جا چکا تھا۔ اس نے اپنے نمبر دو گھوڑے کو پکڑا اور اس کے پیچھے بھگایا چونکہ وہ گھوڑوں کے مزاج کا واقف تھا اس لئے باوجود اس کے کہ گھوڑا نمبر دو تھا اس مالک کے اشاروں کو زیادہ سمجھتا تھا اس لئے وہ پہلے گھوڑے کے قریب آ گیا۔ جب وہ اس کو پکڑنے لگا تو اس کو خیال آیا کہ او ہو میرا گھوڑا تو کبھی کسی سے نہیں ہارا۔ کیا آج یہ میرے نمبر دو گھوڑے سے ہار جائے گا۔ تو چور کو کہا جا اسی خاطر میں تجھے چھوڑتا ہوں کہ میں اپنے گھوڑے کو بے عزت نہیں کرنا چاہتا، اس کا ریکارڈ نہیں توڑنا چاہتا کہ وہ کبھی کسی سے نہیں ہارا۔

تو جب جماعتیں مجھے لکھتی ہیں کہ ہمارے لئے دعا کرو کہ ہم اوّل آئیں اور ہم اپنی اوّلیت کو برقرار رکھیں تو مجھے یہ لطیفہ یاد آجاتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سارے ہی گھوڑے خدا کے گھوڑے ہیں۔ سارے اس کو پیارے ہیں۔ جو بھی آئے ہمیں اس کی خوشی میں شریک ہونا چاہئے لیکن آپس میں بہرحال ان کی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ جو عالمی مقابلے ہو رہے ہیں مال کے ان میں انشاء اللہ میں جماعت امریکہ کے کوائف بھی آپ کے سامنے رکھوں گا۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے ان جماعتوں میں ہے جو بڑی تیزی سے مالی قربانی میں آگے بڑھ رہی

ہیں۔سردست مختصراً میں اس سال کے دو سالانہ جلسوں پر تبصرہ کرتا ہوں ۔ایک کینیڈا کا اور ایک جماعت یونائیٹڈ سٹیٹس کا۔

کینیڈا کا جلسہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے ہر پہلو سے بہت کامیاب رہا۔انتظامات میں کچھ نقائص جو پیدا ہوتے رہے اس میں بعض مجبوریاں بھی درپیش تھیں مگر جہاں تک کارکنوں کا تعلق ہے بہت ہی اخلاص سے انہوں نے کام کئے ہیں ۔ایک بھی واقعہ کسی بدمزگی کا نہیں آیا اور ہر ایک نے اطاعت کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے۔اس پہلو سے کینیڈا کا جلسہ خاص طور پر طبیعتوں پر اثر انداز تھا۔دوسرا پہلو جو کینیڈا کا خصوصی ہے جس میں کینیڈا ہمیشہ ہی امریکہ سے آگے بڑھا ہے وہ ایسے غیروں سے روابط ہیں جن پر وہ سارا سال نیک اثر ڈالتے ہیں اور جب وہ ہمارے جلسوں میں شریک ہونے کے لئے آتے ہیں تو پہلے ہی دل ان کے جماعت کی طرف مائل ہوئے ہوتے ہیں۔اس کے نتیجہ میں جلسے میں شامل ہو کر ان کے اندر بڑی تیزی سے پاک تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر ہمیشہ اپنے تعلق کو نبھاتے ہیں۔

اس پہلو سے امریکہ کے جلسے میں اگرچہ غیر بھی آئے ،متأثر بھی ہوئے لیکن ان کی بڑی تعداد وہ تھی جن سے تمام سال تعلق نہیں رکھا گیا بلکہ ان میں ایک اجنبیت سی تھی اور شاید یہ امریکہ کے مزاج کی بات ہے کہ دوستی جلدی کر بھی لیتے ہیں اور جلدی بھلا بھی دیتے ہیں۔مگر وہ جو ایک مستقل تعلق کی لہریں ہیں وہ ان کے دلوں سے نکلتی ہوئی محسوس نہیں ہوئیں۔جبکہ کینیڈا میں غیر معمولی انسانی جذبے کے ساتھ ان کے دلوں سے لہریں نکلتی ہیں جو دلوں کو گرماتی ہیں اور ان کو میں نے اس پہلو سے مبارکباد بھی دی ہے کہ آپ نے جو نیکی کی باتیں جب بھی سنی ہیں بڑی غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ ان پر لبیک کہا ہے اور باقی ممالک میں کم ہیں جن کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کو نیک مشورے دیئے جائیں تو وہ واقعۃً سنجیدگی سے ان کا جواب دیں۔اس پہلو سے ان کو ایک فوقیت حاصل ہے کہ ان کے سیاست دانوں میں انکسار پایا جاتا ہے کوئی رعونت میں نے نہیں دیکھی ۔جب بھی اور بارہا ایسا ہوا ہے جب بھی ان کو کوئی ایسا مشورہ دیا جو ان کے لئے اور انسانیت کے لئے مفید ہے تو بڑھ چڑھ کر انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ ہاں ہم اس بات کو نوٹ کر رہے ہیں اور اس پر عمل کریں گے اور بعد میں ان کی تقاریر سے اور جو پروگرام انہوں نے اپنی قوم کے لئے تجویز کئے ان سے صاف کھل جاتا تھا کہ محض منہ کی باتیں نہیں تھیں دل کے جذبے سے وہ ایسا کہا کرتے تھے۔یہاں تک کہ ان میں

مرکزی وزراء بھی ایسے ہیں اور جو ایک صوبہ کے وزیراعلیٰ بنے ان کا بھی یہی حال ہے۔ جب میرا خطاب ختم ہوا تو مجھے اٹھ کر انہوں نے کہا کہ دیکھیں آپ نے جو باتیں کہی ہیں میرے دل پہ نقش ہوگئی ہیں اور آئندہ ہم اس پر عمل کریں گے اور واقعۃً پھر انہوں نے جو پروگرام بنایا اس میں انہوں نے اسی طرح اُس وعدے کو پورا کیا اور اس لئے کہ ان کے حق میں تھا۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اچھی بات جہاں سے ملے اسے قبول کرنا انسان کی بڑائی کے خلاف نہیں بلکہ بڑائی کی نشانی ہے اور یہی وہ مضمون ہے جسے آنحضرت ﷺ نے مومن کو سکھایا کہ

''الحكمة ضآلة المؤمن''

(سنن ابن ماجه ،كتاب الزهد ،باب الحكمة)

کہ حکمت کی بات تو مومن کی گمشدہ اونٹنی ہے جہاں بھی ملے اپنی سمجھ کے لے لے۔ اوپرا پن محسوس نہ کرے کہ غیر سے میں نے حکمت سیکھی تو گویا میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ جس کی اپنی چیز گمی ہوئی ملے وہ اس کو حاصل کرنے سے ذلیل تو نہیں ہوا کرتا۔ پس حکمت تمام بنی نوع انسان میں سانجھی ہے اور خصوصیت سے مومنوں کا خاصہ ہے کہ وہ پرحکمت باتیں کریں اور پرحکمت باتوں کو اپنائیں۔

پس اس حوالے سے میری امریکہ کو یہ نصیحت ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت ترقی ہے لیکن اب ایسے پروگرام بنائیں کہ جب اہل امریکہ سے آپ لوگوں کے ذاتی روابط سنجیدگی سے اور اخلاص کے ساتھ آگے بڑھیں یہاں تک کہ وہ آپ کا اثر قبول کرنے لگیں اور جب تک ہم امریکہ پر اثر انداز نہیں ہوتے تمام بنی نوع انسان پر اثر انداز ہونا بہت مشکل کام ہے۔ اس دفعہ جب کینیڈا کو میں نے بعض باتیں سمجھائیں تو ان کو یہی کہا تھا کہ آپ اگر ان باتوں پر عمل کریں تو تمام دنیا کی سیاست کے لئے ایک اچھی مثال قائم ہوگی مگر دوسرے سیاست دان ممالک ضروری نہیں ہے کہ کینیڈا کی پیروی کریں لیکن امریکہ اس پہلو سے ایک فوقیت رکھتا ہے اور بھاری امکان ہے کہ جو لوگ امریکہ سے متأثر ہیں اور بڑی بڑی حکومتیں امریکہ سے متاثر ہیں اگر یہاں کے سیاست دان سنور جائیں تو وہ بھی اپنے انداز تبدیل کرلیں گے۔ وہ تو ایسے عاشق ہیں امریکہ کے کہ اس کی ہر برائی کو قبول کرنے پر بھی تیار ہیں۔ اگر خوبیاں بھی پیدا ہو جائیں تو کیوں ان خوبیوں کو نہیں اپنائیں گے۔

امریکہ کے جلسے کی حاضری اللہ تعالیٰ کے فضل سے حیرت انگیز طور پر خوشکن ثابت

ہوئی۔ امیر صاحب نے مجھے بتایا کہ گزشتہ سال اجتماع پہ تقریباً تین ہزار (3000) مہمان تشریف لائے تھے یعنی کل حاضری تین ہزار (3000) تھی باہر سے آنے والوں سمیت اور اس سال انہوں نے اندازہ لگایا کیونکہ میری آمد متوقع ہے اس لئے ڈیڑھ ہزار (1500) کا اضافہ کر دیا جائے اور ساڑھے چار ہزار (4500) کے اندازے پر انہوں نے کھانوں کے سامان خریدے اور تیاریاں کیں اور کھانا کھانے والوں کی آخری حاضری سات ہزار تک پہنچ چکی تھی خدا کے فضل سے اور یہ جو حاضری ہے یہ قطعی اور یقینی ہے۔ اس میں اضافہ ہوسکتا ہے کمی نہیں کیونکہ وہ لنگر جہاں سالن تقسیم ہوتے ہیں اور روٹیاں دی جاتی ہیں وہاں بعض دفعہ ایک کی بجائے دو یا تین حاضریاں بھی لکھوا دی جاتی ہیں۔ بعض ہمارے زمیندار بہت کھانے والے بھی ہیں وہ پانچ پانچ چھ چھ حاضریاں لکھوا کر اپنا پیٹ بھرتے تھے اور یہ گناہ نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے تمہاری دو روٹیوں سے ہمارا کیا بنے گا اس لئے سات آدمیوں کا کھانا دو تو پھر ہمارا پیٹ بھرے گا تو ہم دے دیتے تھے مگر تعداد بڑھ جایا کرتی تھی اور ہمیشہ یہ خطرہ رہتا تھا کہ جو تعداد لنگر کی پرچی کی ہے اصل مہمانوں کی اس سے کم ہوگی لیکن یہاں تو کوئی ایسا سوال نہیں۔ یہاں برعکس صورت ہوتی ہے۔ بعض دفعہ مہمان یہاں کھانا نہیں کھاتے ان کے اپنے انتظامات ہوتے ہیں وہاں چلے جاتے ہیں۔ پس اس پہلو سے بہت ہی خوشکن حاضری تھی۔ سات ہزار کی حاضری امریکہ کے لئے ایک نیا سنگ میل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسے اور آگے بڑھانے کی توفیق بخشے اور آگے بڑھانے میں یاد رکھیں تبلیغ کے ذریعے آگے بڑھیں۔ پیدائش کے ذریعے تو آپ بڑھتے ہی ہیں۔ جو نہیں بڑھتے ان کو میں ملاقات کے دوران سمجھا دیتا ہوں اور حوالہ دیتا ہوں ایسا جس کا انکار کر نہیں سکتے۔

> آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم شادی کیا کرو تو ولوداً وودوداً عورتوں سے شادی کیا کرو۔ ایسی عورتیں جو ودود بھی ہوں یعنی بہت پیار کرنے والی ہوں اور ولود ہوں جو بچے بھی بہت دیں تا کہ میری امت بڑھے۔

(سنن أبی داؤد، کتاب النکاح ،باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء)

یہ بہت ہی ایک پیاری توقع ہے۔ پس جب میں کچھ بے چینی کے آثار دیکھتا ہوں تو یہ حوالہ دے دیتا ہوں اور اللہ کے فضل سے باقی کام یہ حوالہ کر دیتا ہے تو بڑھیں بے شک اور وہ تو بڑھنا ہی ہے

انشاء اللہ یعنی اولاد کے ذریعے ۔مگر جو تبلیغ کے ذریعے بڑھنا ہے وہ آج وقت کی ضرورت ہے۔سب سے زیادہ بڑی ضرورت تبلیغ کے ذریعے بڑھنا ہے اور اس سال خدا کے فضل سے امریکہ میں اس پہلو سے ترقی کے آثار دکھائی دیئے ہیں اور بہت سے نئے چہرے جو افریقن امریکنوں کے بھی تھے اور سفید امریکنوں کے بھی، وہ سارے خدا کے فضل سے احمدیت کے رنگ میں رنگین ہو چکے تھے۔ان میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی تھی۔ بہت ہی محبت وخلوص کے ساتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھرتے تھے تو یہ تمام عالم کو ایک بنانے کا نسخہ ہے جو احمدیت کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہے۔اللہ کرے اس پہلو سے آپ امریکہ کو بھی ایک قوم بنادیں اور امریکہ کے حوالے سے ہم کل عالم کو ایک قوم بنانے میں کامیاب ہوسکیں۔

اب میں اس مضمون کی طرف آتا ہوں جو آنحضرت ﷺ کے تعلق میں قرآن کریم نے ہمارے سامنے رکھا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ تو کہہ دے کہ اگر تم واقعۃً اللہ سے محبت کرتے ہو تو پھر محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروی کرو۔یعنی خدا مخاطب ہوتا ہے محمد رسول اللہ ﷺ سے اور فرماتا ہے کہ تو کہہ دے بنی نوع انسان سے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنے کے دعوے دار ہو، واقعۃً محبت کرتے ہو تو پھر میری پیروی کرو تب اللہ تم سے محبت کرے گا ورنہ تمہاری محبت رائیگاں جائے گی۔پس آنحضرت ﷺ کے حوالے سے اللہ کی محبت کو سمجھنا ہمارے لئے ضروری بھی ہے اور اس محبت کو نہایت ہی آسان اور پر لطف بنا دینے والا ہے۔

اس میں فَاتَّبِعُوْنِيْ کا جو چیلنج ہے وہ محض اس لئے نہیں کہ جیسے فخر میں کہا جاتا ہے کہ میری پیروی کر کے دکھاؤ۔آنحضرت ﷺ کا جو مزاج ہے خدا تعالیٰ آپؐ کو خطاب کرتے ہوئے ہمیشہ اس مزاج کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔آپؐ کے مزاج میں کوئی تفاخر نہیں تھا۔جب بھی آپؐ ان انعامات کا ذکر فرماتے تھے جو اللہ نے آپؐ پر نازل فرمائے تو ساتھ ساتھ فرماتے تھے۔ولا فخر، ولا فخر، ولا فخر، ولا فخر ایک موقع پر بار بار ان عظیم مناقب کا ذکر کیا جن میں آپؐ تنہا تھے۔کل عالم میں سوائے آپؐ کے اور کسی کو وہ فضیلت نہیں ملی لیکن ساتھ ساتھ فرماتے جاتے تھے ولا فخر۔مجھے اس پر فخر کوئی نہیں ہے۔فخر اس لئے نہیں، قابل فخر بات پر اگر کہا جائے فخر نہیں ہے تو مراد یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کمائی نہیں ہے یہ اللہ کا احسان ہے۔یہ بھی ایک غیر معمولی آنحضرت ﷺ کا

انداز انکساری ہے جو آپ ﷺ کو خدا سے اور بھی زیادہ قریب کر دیتا ہے اور آپؐ کی محبت کا ایک ذریعہ ہے۔

ہم دنیا کے تجربہ میں یہ دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات شعری ذوق سے انسان پہچانا جاتا ہے۔اگر کسی سے پیار ہو تو جس انداز کا پیار ہو اسی انداز کے شعر پسند آتے ہیں اور اگر ایک انسان خشک مزاج کا ہے تو اسے خشک مزاج کے گرامر کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کے بنے ہوئے شعر اچھے لگتے ہیں۔غرضیکہ ہر شخص کا مزاج اس کے شعروں کے انتخاب پر اثر انداز ہوتا ہے۔اسی پہلو سے ایک شاعر نے کہا ہے کہ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

(دیوان غالب صفحہ:232)

میرا حال تو نہیں کھلنا تھا مگر میرا شعروں کا انتخاب ایسا تھا جس نے دل کی بات کہہ دی۔تو آئیے اب میں آنحضرت ﷺ کی پسند کا شعر آپ کو سناتا ہوں تاکہ آپؐ کے دل کا معاملہ بھی ہم پر کھلے کیونکہ یہ معاملہ کھلے بغیر ہمارے دلوں کو حقیقت میں اللہ کی محبت نصیب نہیں ہو سکتی۔

حضرت ابو ھریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے لبید شاعر کے متعلق یہ فرمایا کہ بہت سے شاعر بہت کچھ کہتے ہیں مگر جو بات لبید نے کہہ دی کوئی اور شاعر ویسی بات نہیں کہہ سکا۔لبید کے شعروں کو ایسا خراج تحسین بلکہ دنیا کے کسی شاعر کے شعروں کو ایسا خراج تحسین کبھی نہیں نصیب ہوا جیسے آنحضرت ﷺ نے لبید کو دیا۔فرماتے ہیں، وہ شعر کیا ہے۔

اَلا کل شیی ء ماخلا اللّٰہ باطل

(صحیح بخاری، کتب مناقب الأنصار،باب أیام الجاھلیة)

سنو ہر چیز خدا کے سوا باطل ہے۔اب یہ شعر آنحضرت ﷺ کے دل میں اس لئے جاگزین ہوا ہے کہ دل کی بات تھی۔جو بات دل میں ہو اور کوئی دوسرا کہہ دے تو ایسے دل میں جا کے ڈوبتی اور ٹک جاتی ہے کہ اپنی محسوس ہوتی ہے۔جیسا کہ غالب کہتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ، جو اس نے کہا

؎ میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(دیوان غالب صفحہ:242)

مگر اس معاملے میں لبید کا شعر جو آنحضورؐ کے دل پر اثر انداز ہوا ہے یہ اس لئے نہیں کہ جو اس نے کہا وہ بھی دل میں ہے۔ بلکہ جو آپؐ کے دل میں تھا وہ اس کی زبان سے جاری ہوا ہے اور معاملہ برعکس ہے۔ پس آنحضرتﷺ کو اس لئے یہ شعر پسند آیا اور یاد رکھیں کہ محبت الٰہی میں جو نمونے آنحضرتﷺ نے پیش کئے ہیں ان کا ایک نمایاں فرق دنیا کی محبت سے دکھائی دیتا ہے۔

دنیا میں جنسی محبتیں بھی ہوتی ہیں اور غیر جنسی محبتیں بھی۔ جنسی محبت کا یہ خاصہ ہے کہ جس سے محبت ہو اگر کوئی اور اس سے محبت کرے تو اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب قصہ ہے جتنا آپ کسی کو چاہیں اتنا ہی کسی اور کی محبت دخل انداز ہوتی ہے اور آپ کو بری لگتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ بس آپ اتنا ہی چاہیں۔ مگر روحانی محبت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ جسے چاہتے ہیں، جتنا چاہیں دل چاہتا ہے سب ہی اسے چاہیں، ہر شخص اس کے عشق میں دیوانہ ہو جائے۔ یہ وہ نمونہ ہے جو آنحضرتﷺ نے پیش فرمایا اور حیرت انگیز طریق پر دلوں کو چھیڑا کہ ہر دل اللہ تعالیٰ کی محبت میں مبتلا ہو جائے اور ویسے ہی مبتلا ہو جائے جیسے آپؐ ہیں۔ پس یہ وہ مزاج ہے جسے اس آیت کریمہ نے کھول کر بیان فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اے محمدﷺ! تیرے دل کی بات یہ ہے تو بتانا چاہتا ہے کہ اگر تم محبت کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے سیکھو اور مجھ سے سیکھو گے تو تمہاری محبت آسان ہو جائے گی مجھ سے سیکھو گے تو تمہاری محبت کو پھل لگنے لگیں گے۔

اس لئے جو بے اختیار گہری تمنا ہے کہ سب اللہ تعالیٰ کو ویسا چاہیں جیسے آنحضرتﷺ نے چاہا یہ اسی جذبے کا اظہار ہے جسے خدا تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اے محبت کے دعویدارو تمہیں کیا پتا کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ آؤ اور میرے پیچھے چلو، محبت کی ساری راہیں میں تم پر آسان کر دوں گا۔ محبت ایک بوجھ نہیں ہو گی بلکہ ایک ایسا پر لطف جذبہ ہو جائے گا جو ایک غیر معمولی طاقت اور جذب کے ساتھ تمہیں کھینچے گا اور تمہارا ہر قدم محبت کی راہ میں آسانی سے اٹھے گا۔ یہ وہ محبت کی کیفیت ہے جو آنحضرتﷺ کو نصیب تھی اور آپؐ ہی نے ہمیں سکھائی اور آپؐ ہی سے ہم سیکھیں گے کیونکہ اس سے بڑھ کر خدا کی

محبت سکھانے والا اور کوئی نہیں اور بہت ہی باریک راز آپ ﷺ محبت کے متعلق بیان فرمایا کرتے تھے جن میں ہمیشہ ڈوب کر بہت ہی گہرا فلسفہ محبت کا معلوم ہوتا تھا اور بظاہر وہ جواب ایک الگ سا جواب ہے لیکن جب آپ غور کریں تو حیرت انگیز وہ عارفانہ کلام ہے۔

ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ایسا کام بتائیں کہ میں اسے کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے۔ اب یہ سوال وہی ہے جو اس آیت سے تعلق میں ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے۔ وہاں یہی تو مضمون ہے کہ دنیا کو بتا دو کہ اگر محبت کرنی ہے تو پھر میرے پیچھے چلو تب اس محبت کو پھل لگے گا، تب اللہ تم سے محبت کرے گا۔ تو اس نے بعینہٖ یہی سوال کیا کہ مجھے ایسا کام بتائیے کہ جب میں اسے کروں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت کرنے لگے۔ اب آیت کریمہ کے مضمون کے مطابق جواب ہونا چاہئے اس لئے اس جواب کو اس آیت کے حوالے کے بغیر سمجھا جا ہی نہیں سکتا۔ یہ کوئی خشک جواب نہیں ہے بلکہ اپنے دل کی واردات کو آپؐ نے اس کے سامنے کھول دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہی طریقہ سکھایا ہے کہ جیسے میں کرتا ہوں تم بھی ویسے ہی کرو تو خدا تم سے ضرور محبت کرے گا۔ تو فرمایا ”دنیا سے بے رغبت اور بے نیاز ہو جاؤ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا“ اور جہاں تک بنی نوع انسان کی محبت کا تعلق ہے فرمایا ”جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس کی خواہش چھوڑ دو لوگ تجھ سے محبت کرنے لگیں گے“۔ اب یہ دو بڑی گہری حکمت کی باتیں ہیں۔ تعلق باللہ اور تعلق بالناس یعنی ہم جنس لوگوں سے تعلق بڑھانا ہو تو یہ طریق ہے اور خدا سے تعلق بڑھانا ہو تو وہ طریق ہے۔ خدا کے تعلق میں یہ نہیں فرمایا کہ جو خدا کا ہے اسے مانگنا چھوڑ دو، اس کی حرص ترک کر دو بلکہ وہاں کچھ اور بات فرمائی ہے جس کی طرف میں واپس آتا ہوں۔ بنی نوع انسان کے پاس جو کچھ ہے اس کی حرص چھوڑ دو اور یہ خدا اور بنی نوع انسان کے رجحانات کے اندر جو نمایاں فرق ہے یہ اس کو ظاہر کرنے والی بات ہے۔ اگر آپ کی نظر کسی کی دولت، کسی کے محل، کسی کے مکان، کسی کی عورت پر لگ جائے تو وہ ہمیشہ آپ کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرے گی کیونکہ انسان فطرتاً کنجوس ہے اور یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی چیز پر کسی اور کی نظر لگ جائے۔

بعض دفعہ نوکریوں پر جب لوگوں کی نظر لگ جاتی ہے تو کئی قسم کی شرارتیں اور فساد کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں پھر ایک جوابی نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ہر شخص جو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے

ہر ایسے شخص سے جو اس کی چیزوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور حرص کی نگاہ سے اس کی ملکیت کو دیکھتا ہے اس کو طبعاً اس سے ایک خطرہ محسوس ہوتا ہے اور خطرے کے مطابق ایک قسم کی بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے یا نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بنی نوع انسان میں تو یہ طاقت نہیں ہے کہ تم ان کی چیزیں چاہو اور وہ پھر بھی تم سے پیار کریں۔ اس لئے ان چیزوں کو دیکھنا ہی چھوڑ دو اور پھر بنی نوع انسان تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کا پہلے جواب سے تعلق کیا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ ایک ہی بات کے دو پہلو بیان ہوئے ہیں۔ اگر آپ بنی نوع انسان کی چیزوں سے، بنی نوع انسان کی مملوک سے، جن کے وہ مالک ہیں ان سے غیر معمولی حرص کا تعلق توڑ لیتے ہیں تو ساری حرص کا تعلق توڑ لیتے ہیں اور یہی پہلا جواب تھا کہ تم دنیا سے حرص کا تعلق توڑ لو، بے نیاز ہو جاؤ تو خدا تمہارا ہو جائے گا۔ وہ تم سے پیار کرنے لگے گا۔ لیکن وہ تعلق توڑنا جو ہے اس کی ترکیب ہی ایسی بتائی کہ انسان بھی محبت کرنے لگے اور خدا بھی محبت کرنے لگے۔

سوال چھوٹا سا تھا لیکن جواب بہت عظیم ہے۔ سوال میں ایک دائرے کی محبت پوچھی گئی تھی جواب میں ہر دائرے کی محبت شامل فرما دی گئی اور بنی نوع انسان سے تعلق توڑنے کا نہیں کہا یہ ایک اور حکمت کی بات ہمیں سمجھائی گئی۔ یہ نہیں فرمایا کہ بنی نوع انسان سے تعلق توڑ لو تو خدا تمہارا ہو جائے گا۔ جو بنی نوع انسان سے تعلق توڑتے ہیں خدا ان کا نہیں ہوا کرتا۔ ہاں لوگوں کی ملکیتوں سے وہ نعمتیں جو خدا نے ان کو عطا فرمائی ہیں ان نعمتوں سے حرص کا تعلق کاٹ لو یہ بے نیازی ہے۔ پس بے نیازی ایک عظیم دولت ہے اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بے نیازی سے زیادہ متمول کرنے والی اور کوئی چیز نہیں اور بے نیازی میں غیر کی چیز کو غیر کا سمجھنا اور اس پہ جلن محسوس نہ کرنا یہ سب سے پہلی سچی علامت ہے کہ آپ کو واقعۃً اس کی حرص نہیں ہے۔ اب جتنے بھی دنیا میں شریکے ہیں اور شریکوں کے مقابلوں میں مصیبتیں دنیا میں پڑی ہوئی ہیں۔ قوموں کی قوموں سے ایک قسم کی جلن پیدا ہو جاتی ہے، حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کو انسانوں سے، عورتوں کو عورتوں سے، مردوں کو مردوں سے، بچوں کو آپس میں جلن اور حسد اور اس سب کی بنیادی وجہ وہی ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے کی چیزوں کو حرص سے دیکھتے ہیں وہ تب ہی حرص سے دیکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس ہے، ہمارے پاس نہیں ہے اور جتنی ہم چاہتے ہیں وہ ہمارے پاس نہیں وہ اس کے پاس

ہے۔ یہ حسد کا جذبہ پیدا کرنے والا ایک خیال ہے جس کے نتیجہ میں نفرتیں پھیلتی ہیں اور اگر ہر شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ جو کچھ میرا ہے وہ میرا ہے اور میرا بھائی اس کو پسند کرتا ہے، اس پر غصہ نہیں کرتا تو اس سے ضرور محبت کرے گا اور یہ روز مرّہ کا تجربہ ہے۔ اگر ایک انسان کسی بھائی کی دولت پر، اس کے اچھے مکان پر، اس کے اچھے مویشیوں پر، اس کے اچھے فن پر، اس کے ذوق و ادب پر خوش ہوتا ہے تو ثابت ہوگا کہ اس کو اس سے کوئی حسد نہیں ہے اور اس حدیث کا مضمون اس پر پوری طرح صادق آئے گا کہ تم تمام انسانوں کی مخلوقات سے، جو کچھ خدا نے ان کو عطا فرمایا ہے ان سے اس حد تک بے نیاز ہو کہ ان کو جو خدا نے نعمتیں بخشی ہیں اس سے تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے بلکہ خوشی نصیب ہو۔ پس اپنے جب کوئی چیز حاصل کرتے ہیں تو دیکھیں آپ کتنا خوش ہوتے ہیں۔ ایک بچے کو کامیابی نصیب ہوگئی سارا گھر خوش ہو جاتا ہے۔ ایک عزیز نے کوئی بڑی نوکری حاصل کر لی سارا گھر خوش ہو جاتا ہے۔ کسی کو کوئی اعزاز مل جائے تو سارا گھر خوش ہو جاتا ہے بلکہ دور والے جو پہلے زیادہ تعلق نہیں بھی رکھتے تھے مگر دل میں تھا وہ ایسے موقعوں پر پہنچ جاتے ہیں مبارکباد دینے کے لئے۔ کچھ جھوٹے بھی چلے جاتے ہیں یہ دکھانے کے لئے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ جو سچی محبت ہے اس میں اپنے پیارے کو جو ملے گا وہ اپنے آپ کو ملتا ہے اور اس پہلو سے ایک انسان صرف بے نیاز ہی نہیں ہوتا بلکہ متمول ہو جاتا ہے۔

وہ شخص جو سب کی خوشیوں میں شریک ہے اس کی عجیب زندگی ہے۔ جہاں اسے خوشی کی خبر ملتی ہے اس کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ وہ جو ہر ایک کے ماحصل کو ناپسندیدگی سے دیکھتا ہے ہر بات پہ جلتا ہے ساری زندگی وہ آگ میں جلتا رہتا ہے۔ پس وہ لوگ جو اس دنیا میں اپنے لئے آگ جلائے رکھتے ہیں اور اس پر جلتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں انہیں جنت اور طمانیت کی خوش خبری دی جائے۔ یہاں ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنی جہنم بنانی ہے، اپنی جنت بنانی ہے اور اس پہلو سے یہ نسخہ جو حضور اکرم ﷺ نے بیان فرمایا بہت گہرا ہے اور آپؐ کی قلبی کیفیات کا مظہر ہے کیونکہ جواب اس آیت کا جواب ہے جو میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ اس نے پوچھا تو آیت کا حوالہ تو نہیں دیا۔ پوچھا یہی تھا کہ بتائیں کہ اللہ مجھ سے کیسے محبت کرے میں تو کرتا ہوں۔ تو اپنے دل کی کیفیات ہیں جو کھولی ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے غلاموں کی ہر کامیابی پہ خوش ہوتے تھے

اور اپنے غلاموں کی کسی کامیابی پر آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کا جو قلبی احساس تھا اس میں تمام صحابہؓ کو جو کچھ ملتا تھا اس کے ساتھ میں ایک لذّت کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔

پس دیکھو کتنی عظیم کامیابی ہے۔ پہلا طریق وہ ہے جس پہ ہر وہ شخص جو آپ کے قریب نہیں ہے جب اس کو کچھ ملتا ہے آپ کے لئے ایک عذاب بن جاتا ہے۔ اس کا ملنا آپ کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ یہ دوسری صورت میں جو کچھ آپ کے عزیزوں، اقرباء کو یا جاننے والوں کو ملتا ہے آپ کے لئے ایک لذّت کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو اس دنیا میں ایک جنت بنا دیتی ہے اور زندگی کو کتنا آسان کر دیتی ہے۔ اب اسی بات کو جواب کے پہلے حصے کے تعلق میں ہم مزید دیکھتے ہیں۔ فرمایا اگر تم دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ سوال یہ ہے کہ کس دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ۔ جو اللہ کی دنیا ہے اس سے تو بے نیازی ممکن نہیں ہے۔ دنیا سے بے نیازی کا مطلب ہے غیر اللہ سے بے نیازی۔ ورنہ جو اللہ کی چیز ہے اس سے تو انسان کو پیار ہوتا ہے اگر اللہ سے پیار ہے۔ یہ مضمون آنحضور ﷺ نے دوسری جگہ خوب کھول کر بیان فرمایا ہے۔

پس بے نیازی سے مراد دو ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا اگر تمہیں تکلیف پہنچاتی ہے اور اس تکلیف کو تم خدا کی خاطر برداشت کرتے ہو اور پرواہ نہیں کرتے کہ دنیا نے تمہیں کیا کہا ہے اور تم سے کیسا سلوک کیا ہے ایسے موقع پر اللہ تم سے ضرور محبت کرے گا اور یہ جو مضمون ہے یہ گہرا انسانی فطرت میں رچا بسا مضمون ہے۔ آپ دیکھیں آپ کے بچے بھی بعض ایسے ہیں جو خود جواب دیتے ہیں دوسرے کی باتوں پر بہت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خاموش ہو جاتے ہیں اور صبر سے برداشت کر جاتے ہیں۔ ماں باپ کی نظر ان کے چہروں پر رہتی ہے اور ان کی تکلیف کو زیادہ محسوس کرتے ہیں، ان سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ پس دنیا سے بے نیازی اگر ان معنوں میں ہے کہ دنیا خدا کی خاطر تکلیفیں پہنچاتی ہے اور آپ خدا کی خاطر خاموش ہو جاتے ہیں اور صبر کرتے ہیں تو یہ وہ بے نیازی ہے جو لازماً اللہ کی محبت کو کھینچے گی۔

دوسرے بے نیازی اللہ کے تعلق کے حوالے سے ہے۔ اگر آپ کو دنیا سے ایسا پیار ہے کہ خدا کے پیار کے رستے میں حائل ہو جاتا ہے تو اسے دنیا سے بے نیازی نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا سے بے نیازی اللہ کے تعلق میں صرف یہ معنے رکھتی ہے کہ جہاں بھی دنیا خدا سے ٹکراتی ہے اور خدا کے تعلق اور

دنیا کے تعلق کے درمیان ایک فیصلہ کرنے کا وقت آتا ہے ہر ایسے موقع پر دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ۔ مگر آپ نے یہ نہیں فرمایا ہر ایسے موقع پر بے نیاز ہو جاؤ۔ آپ فرماتے ہیں دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ۔ یہ اس لئے ہے کہ ہر ایسے موقع پر بے نیاز ہی ہے جو کامیابی سے اس امتحان سے گزرتا ہے۔ بے نیازی ایک دائمی کیفیت کا نام ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس موقع پر سوچ کر یہ فیصلہ کرو کہ اللہ کو لینا ہے اور دنیا کو چھوڑنا ہے۔ آپ نے ایک دائمی کیفیت کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک انسان کے دل میں ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ جذبہ مرتسم ہو جائے، اس پر لکھا جائے، چھپ جائے کہ خدا کے سوا مجھے کسی چیز سے پیار نہیں ہوگا اگر وہ خدا سے ٹکراتی ہے۔ لیکن اللہ کے حوالے سے غیروں سے پیار کرنا یہ فطرت کے خلاف نہیں ہے بلکہ فطرت کے عین مطابق ہے۔

پس اس دوسرے پہلو کی طرف بھی میں آنحضرت ﷺ کے حوالے سے روشنی ڈالوں گا کیونکہ گزشتہ خطاب کے بعد مجھے ایسے پیغامات ملے ہیں جس میں کچھ لوگ بے چارے پریشان سے ہو کے رہ گئے ہیں۔ کہتے ہیں آپ نے تو کہا ہے اور قرآن اور حدیث کے حوالے سے کہا ہے کہ خدا کی محبت کے سوا باقی سب کچھ فانی، جھوٹ ہے۔ سب قصہ ہے اس کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ تو ہمیں تو اپنے ایمانوں پر شبہ پڑ گیا ہے۔ ہم تو اپنے ماں باپ سے بھی محبت کرتے ہیں، اپنے پیاروں سے بھی محبت کرتے ہیں، بیویاں خاوندوں سے محبت کرتی ہیں، خاوند بیویوں سے محبت کرتے ہیں۔ ہم کہاں جائیں گے اگر یہ سب شرک ہی کی نشانی ہے۔ اگر ان محبتوں کے نتیجہ میں ہم خدا کی محبت سے محروم ہو جائیں گے تو ہمیں سمجھائیں کہ پھر کیا علاج ہے۔ ہم کیسے اس مقصد کو پالیں جو آپ نے اللہ کی محبت کے حوالے میں بیان فرمایا۔ تو میں پھر اس مضمون کی طرف لوٹوں گا مگر سرِ دست ایک حدیث آپ کے سامنے رکھتا ہوں جو دل کے اوپر ایک غیر معمولی، ایک بہت ہی گہرا اثر کرنے والی حدیث ہے۔ دل پہ قابض ہو جاتی ہے لیکن یہ ایک ایسی حدیث ہے جسے سمجھنا آسان بھی نہیں ہے۔ کئی غلط فہمیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی جنگی قیدی لائے گئے جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ ان عورتوں میں سے ایک عورت جس کسی بچے کو دیکھتی اس کو دودھ پلانا شروع کر دیتی، اس سے محبت کا اظہار کرتی اور لوگ سمجھتے تھے کہ دیوانی ہوگئی ہے۔ اس کیفیت کو

جب دیکھا تو آنحضرت ﷺ نے ہمیں فرمایا۔ ہاں اس کا قصہ یہ تھا کہ اس کا بچہ کھویا گیا تھا اور چونکہ بچے سے پیار تھا اس لئے اس کے حوالے سے ہر بچے سے پیار ہو گیا۔ ہر بچہ اپنا دکھائی دینے لگا اور یہی مضمون ہے جو ایک عرب شاعر نے اس حوالے سے بیان کیا ہے کہ میرا بھائی جس مقام پر دفن ہے وہ اگرچہ الگ مقام ہے لیکن مجھے تو جہاں بھی کوئی قبرستان دکھائی دیتا ہے اس کا نام وہی لگتا ہے جو میرے بھائی کے مدفن کی جگہ کا نام ہے۔ میں ہر قبر پر اسی طرح گریہ وزاری کرتا ہوں جیسے اپنے بھائی کی قبر پر گریہ وزاری کرتا تھا کیونکہ یاد رکھو کہ ایک غم دوسرے غم کو ابھار دیا کرتا ہے، ایک محبت دوسری محبت کو چھیڑ دیتی ہے۔ پس یہی کیفیت اس عورت کی تھی کہ جس بچے کو دیکھتی اسے سینے سے لگا لیتی، اسے دودھ پلاتی، اس سے پیار کا اظہار کرتی۔ آنحضرت ﷺ نے اس عورت کو دکھا کر صحابہؓ سے پوچھا کہ بتاؤ کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں پر اس عورت کے اپنے بچے پر رحم کرنے سے زیادہ رحم کرنے والا ہے وہ کیسے بندوں کو آگ میں پھینک دے گا۔

(صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب رحمة الولد و تقبیله و معانقته)

اب یہ جو مضمون ہے یہ بہت ہی لطیف ہے بہت ہی دل پر اثر پیدا کرنے والا ہے مگر اس کی حکمت سمجھنی ضروری ہے ورنہ یوں معلوم ہوگا جیسے قرآن کریم کے ان تمام وعید کو آنحضرت ﷺ غلط قرار دے رہے ہیں جہاں جہنم کی باتیں ہیں اور بڑے یقین اور تحدی کے ساتھ فرمایا جا رہا ہے کہ لازماً یہ بات ہو کے رہے گی اور خدا کی طرف سے ایک ''حقاً'' وعدہ ہے جو ٹل نہیں سکتا کہ لازماً جہنم کو بد لوگوں سے بھر دیا جائے گا۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ حدیث اس کے مقابل پر کیا معنے رکھتی ہے اور حدیث بھی ایک عام کتاب کی نہیں بلکہ بخاری کتاب الادب سے لی گئی ہے جو مستند کتابوں میں سے ایک اہم مستند کتاب ہے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ یہاں اس مضمون کی چابی لفظ بندے میں ہے۔ وہ بچے جو ماؤں کے بچے بن کے نہیں رہتے جو ماؤں کے بچے ہوتے ہوئے بھی غیروں کے ہو جاتے ہیں بسا اوقات مائیں ان کو بد دعائیں بھی دے دیتی ہیں اور خود میرے سامنے ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ایک عورت نے بستر مرگ پر اپنے بچے کو بد دعا دی صرف اس لئے کہ اس کا خدا سے تعلق ٹوٹ گیا تھا اور چونکہ اس

عورت کا خدا سے گہرا تعلق تھا اس لئے اس نے بددعا دی اور میں حیران رہ گیا لیکن اس وقت میں سمجھا کہ خدا کا عشق اس پر اتنا غالب ہے کہ اپنے بیٹے کو بددعا دے رہی ہے کیونکہ اس کا خدا سے تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ پس یہ چیز حقیقۃً ممکن ہے اور انسانی فطرت میں بھی اس کے نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا بیان کرتے ہوئے شیطان کے ساتھ ایک گفتگو کو ایک تمثیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

جب شیطان نے یہ کہا تو یہ جو مخلوقات ہیں آدم کی اولاد ان پر مجھے اپنا اثر ڈالنے کے لئے قیامت تک کے لئے چھٹی دیدے اور پھر دیکھ کہ کتنے ہیں جو تیرے ساتھ رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا چھٹی ہے۔ تو اپنے گھوڑے بھی چڑھالا ان پر، اپنے پیادے بھی لے آؤ۔ ان کے آگے سے، پیچھے سے دائیں اور بائیں سے ان پر حملے کرو اور جو کچھ بن سکتا ہے بناؤ اور ان بندوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرو مگر یہ یادرکھو جو میرے بندے ہیں ان پر تجھے کوئی دسترس نہیں ہوگی۔ جو تیرے ہیں تو ان کو لے جاوہ تو میرے نہیں ہیں اور پھر قیامت کے دن میں تجھے بھی اور ان کو جنہوں نے تیرا ساتھ دیا تھا جنہوں نے مجھ سے بندگی کے تعلق توڑ لئے تھے آگ میں پھینک دوں گا۔ تو یہ جو حدیث ہے یہ قرآن کریم کی اس آیت کے حوالے سے حل ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ تم اگر خدا کا بندہ بننا سیکھ جاؤ اگر اس کے بندے ہو جاؤ اور عباد الرحمٰن والی صفات اپنے اندر پیدا کرو تو خدا کی قسم خدا تمہیں کبھی آگ میں نہیں ڈالے گا۔ ناممکن ہے کہ تمہیں آگ چھوئے اور اسی مضمون کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ

ع آگ ہے پر آگ سے وہ سب بچائے جائیں گے
جو کہ رکھتے ہیں خدائے ذوالعجائب سے پیار (درثمین اُردو: 154)

اور اس دنیا میں بھی اس مضمون کو اطلاق فرمایا ہے۔ فرمایا بڑے بڑے ابتلا آئیں گے دنیا میں خوفناک جنگیں ہوں گی بڑی بڑی ہلاکتیں ہیں جو تمہارے سامنے منہ پھاڑے کھڑی ہیں لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آگ تو ہے مگر جو خدائے ذوالعجائب سے محبت کرتے ہیں ان پر آگ حرام کر دی جائے گی۔ پس اس دنیا کی جہنم سے بچنے کا بھی یہی طریق ہے کہ ہم اللہ کے بندے بن جائیں اور بندہ بنے بغیر یہ توقع رکھنا کہ خدا کا رحم غالب ہے یہ حماقت ہے کیونکہ قرآن کریم نے اس

مضمون کو خوب کھول کر الگ الگ بیان فرما دیا ہے۔اس میں کوئی جذباتیت نہیں ہے، گہرے حقائق ہیں جو قرآن اور احادیث ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔

پھر آنحضرت ﷺ کے اظہار محبت کے متعلق کہ کیسے آپؐ خدا کی محبت اور پیار اور جلال کے احساس سے لرزاں ہو جایا کرتے تھے ایک حدیث ہے۔ یہ مسند احمد بن جنبل سے لی گئی ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ آیت پڑھی وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الزمر:68) کہ آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہیں یا لپیٹے جائیں گے۔پاک ہے وہ ان باتوں سے جو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفی ﷺ نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں بڑی طاقتوں والا اور نقصان کی تلافی کرنے والا ہوں میرے لئے ہی بڑائی ہے۔میں بادشاہ ہوں۔میں ایک بلند شان والا بادشاہ ہوں۔تمام بادشاہوں میں سب سے بڑھ کر اور میرے لئے ہی بڑائی ہے۔اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی ذات کی مجد اور بزرگی بیان کرتا ہے۔آنحضرت ﷺ خدا کے مجد اور بزرگی کے اس بیان کو اس طرح دہرانے لگے اور ایسے وجد میں آئے کہ راوی بیان کرتا ہے کہ سارا منبر لرزنے لگا اور اس قوت اور شان کے ساتھ اس گہرے جذبہ عشق کے ساتھ آپؐ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے لگے اور یہ فقرے بار بار دہرانے لگے کہ ہمیں ڈر تھا کہ منبر اس لرزش سے ٹوٹ کر کہیں آپ کو بھی ساتھ نہ لے گرے۔یہ وہ کیفیت تھی جو بنائے نہیں بنا کرتی، ایک بے اختیار کیفیت ہے۔

پس اس پہلو سے اگر ہم اپنی محبت کو جانچنا چاہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا اللہ کے ذکر پر ہمارے دل پر ایک زلزلہ طاری ہوتا ہے کہ نہیں۔کیا ہمارے بدن اور روئیں روئیں میں خدا کا پیار دوڑنے لگتا ہے یا نہیں اور اگر ایسا نہیں ہے اور وہ ذکر محض ایک ذکر ہے جو زبان پر جاری ہو کر دوسرے کانوں تک تو پہنچتا ہے مگر دل تک نہیں پہنچتا تو پھر یہ محبت نہیں ہے۔اس کا جو چاہیں نام رکھ لیں یہ محبت نہیں۔**خدا کا نام تو اتنا پیارا نام ہے کہ جب وہ محبت کرنے والے کے دل پر پڑتا ہے تو اس سے بڑی میوزک اور کوئی نہیں۔اس سے اعلیٰ درجے کا پرسرور نغمہ ممکن نہیں ہے**۔ذکر الٰہی اپنی ذات میں ایک ایسا نغمہ ہے جس کی کوئی مثال دنیا کے نغموں میں نہیں ملتی اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس ذکر الٰہی کے متعلق فرماتا ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ (الزمر:24) یہ ذکر تو ایک ایسی شان رکھتا ہے کہ خدا سے محبت کرنے والوں کے

بدن پر ان کی جلدوں پر جھرجھریاں طاری ہو جاتی ہیں اور واقعۃً جب کسی سے محبت کا جذبہ بھڑ کے تو کئی دفعہ انسان کانپ جاتا ہے اور ایک جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ پس یہ وہ محبت کا انداز ہے جو آنحضرت ﷺ نے ہمیں سکھایا۔ اس محبت کے بغیر ہماری زندگیاں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ ہم حقیقت میں اللہ کی محبت کے دعوے تو کریں گے مگر محبت کی حقیقت کو نہیں پا سکیں گے۔

حضرت مسیح موعودؑ اس محبت کے اظہار کو جس طرح، جس جس طریق سے بیان فرماتے ہیں اس کی کوئی مثال اس زمانے میں ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔ درثمین کے حوالے سے جو میں نے مضمون شروع کیا تھا انشاء اللہ میں آئندہ کسی وقت اس کو آگے بڑھاؤں گا۔ چونکہ آج ہمیں باہر بھی جانا ہے اور وقت تھوڑا رہ گیا ہے اس لئے حضرت مسیح موعودؑ کے حوالے ہی سے ایک اور نظم سے میں چند شعر آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

تیرے کُوچے میں کن راہوں سے آؤں
وہ خدمت کیا ہے جس سے تجھ کو پاؤں

اللہ تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ بتا میں کن رستوں سے تیرے کوچے تک آؤں۔ کون سی خدمت ہے جو مقبول ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کے دل سے یہی سوال اٹھتے رہے جن کے جواب قرآن کریم میں نازل ہوتے رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق بھی آتا ہے۔ آپ نے عرض کیا وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا (البقرۃ:130) اے اللہ ہم چاہتے ہیں کہ تیری راہ میں وہ قربانیاں پیش کریں جو تجھے پسند ہیں مگر جانتے نہیں کہ وہ کیا ہیں۔ اس لئے تو ہمیں دکھا کہ یہ بھی قربانی کی راہ ہے جو مجھے پسند ہے۔ وہ بھی قربانی کی راہ ہے جو مجھے پسند ہے۔ تو راہیں کھول اور پھر ان راہوں میں آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ یہی جذبہ ہے جو حضرت مسیح موعودؑ کے دل سے اٹھتا ہے:

تیرے کُوچے میں کن راہوں سے آؤں
وہ خدمت کیا ہے جس سے تجھ کو پاؤں
محبت ہے کہ جس سے کھینچا جاؤں
خدائی ہے خودی جس سے جلاؤں

ایک ہی رستہ دکھائی دیا ہے کہ محبت کروں اور خدا کے نام سے اپنی خودی کو جلا دوں ۔تو جو بے نیازی کا مضمون ہے وہ بھی محبت کے ذریعے نصیب ہوسکتا ہے ورنہ ناممکن ہے کہ انسان دنیا سے بے نیاز ہو جائے ۔

اب یہ نکتہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہمیں سمجھایا کہ آنحضرت ﷺ جب فرماتے ہیں کہ بے نیازی کرو تو کس چیز سے، جب تک کسی اور سے اس سے بڑھ کر محبت نہ ہو، بے نیازی نہیں ہوسکتی ۔ یہ قانون قدرت ہے جس پر لازماً عمل درآمد ہوگا ۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ۔کتنا ہی کسی سے پیار ہوا گر وہ اس کی گستاخی کرتا ہے جس سے زیادہ پیار ہے، اس کے رستے میں حائل ہوتا ہے جس سے آپ زیادہ محبت کرتے ہیں تو اچانک وہ بالکل بے حیثیت اور بے حقیقت ہو کے دکھائی دے گا ۔اس کی ساری محبت زائل ہو جائے گی ۔ پس فرمایا:

خدائی ہے خودی جس سے جلاؤں

خدا کو اپنے اوپر طاری کر دوں اور اپنی نفسانیت کے ہر پہلو کو خاکستر دوں ۔

محبت چیز کیا کس کو بتاؤں
وفا کیا راز ہے کس کو سناؤں
میں اس آندھی کو اب کیونکر چھپاؤں
یہی بہتر کہ خاک اپنی اڑاؤں (درثمین اردو: 54)

فرمایا میرے دل میں تو آندھی چل پڑی ہے اللہ کی محبت کی ۔ کیسے چھپاؤں؟ ۔ میرا جسم خاک ہو کے اڑ جائے اس آندھی سے تو یہ بھی مجھے منظور ہے ۔ مگر کاش دنیا کو پتا چلے کہ محبت الٰہی ہوتی کیا ہے ۔

پس محبت کی راہیں سیکھنی ہیں تو آنحضرت ﷺ سے ہی سیکھی جائیں گی اور اس دور میں اس محبت کے عنوان کو دوبارہ جس نے زندہ کیا ہے وہ حضرت اقدس مسیح موعودؑ ہیں ۔ پس آنحضور ﷺ کو دیکھنا ہے تو حضرت مسیح موعودؑ کی آنکھ سے دیکھیں اور خدا کو دیکھنا ہے تو محمد ﷺ کی آنکھ سے دیکھیں ۔ یہی ایک رستہ ہے جو محبت الٰہی پیدا کرنے والا ہے، اس کے علاوہ سب قصے اور کہانیاں ہیں ۔

MTA کے ذریعہ لوگوں تک علم الأدیان و علم الأبدان پہنچنے چاہئیں۔

MTA کے لئے متنوع پروگراموں کی تیاری سے متعلق تفصیلی ہدایت

(خطبہ جمعہ فرمودہ 12 /جولائی 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ کینیڈا اور امریکہ کے دورے کی توفیق ملی اور اگرچہ مصروفیات بہت زیادہ تھیں مگر حسب توفیق ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائی۔ مگر کمزوریاں بھی رہ جاتی ہیں جو بشری کمزوریاں بھی ہیں اور بعض دفعہ اتفاقات کی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض انتظامات کے نقص ہیں جو بے اختیاری کے عالم میں ہوتے ہیں، بعض بھول چوک کے نتیجے میں تو یہ تو ممکن نہیں کہ ایسے جلسوں میں جہاں ملک کے طول وعرض سے احباب خلوص کے ساتھ تشریف لائے ہوں ان کی تمام ضروریات کا پوری طرح خیال رکھا جا سکے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ جذباتی تکلیفیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور ان کا علم بعد میں ہوتا ہے اس لئے ان کا ازالہ کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ مگر وہ جلسے جو گزرے ہیں ان کے بعد ایک اور جلسہ آنے والا ہے جو بہت قریب آ رہا ہے اور اس کے پیش آثار جو پہلے ظاہر ہونے والے آثار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس مسجد میں بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ انگلستان میں مسجد کے اردگرد اور بازاروں میں بھی وہ چہرے دکھائی دیتے ہیں جو محض للہ بڑے دور کے سفر کر کے اس جلسے میں شمولیت کے لئے تشریف لائے ہیں۔

سب سے پہلے تو میں دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ ان سب کو جو آ گئے اور ان سب کو بھی جو آنے والے ہیں اور ان سب کو بھی جو آ نہیں سکے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ان انتظامات کے سلسلے میں جو بشری کمزوریاں رونما ہوں ان سے صرفِ نظر فرمائیں اور جہاں تک ہو سکے عفو کا سلوک کریں اور بخشش کا

سلوک کریں کیونکہ انسان جو اپنے بھائیوں سے عفو اور بخشش کا سلوک کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی عفو اور بخشش کا سلوک فرماتا ہے۔ پس عفو اپنی ذات میں ایک بہت اعلیٰ خلق ہے اور بخشش بھی اپنی ذات میں ایک بہت اعلیٰ خلق ہے لیکن اگر خدا کے حوالے سے کئے جائیں تو یہ دوہرا فائدہ ہے دنیا کا بھی اور دین کا بھی کیونکہ جو اللہ کی خاطر عفو کیا جائے، اللہ کی خاطر مغفرت کی جائے اس میں اللہ تعالیٰ اپنے اوپر یہ حق بنالیتا ہے کہ ایسے بندے سے میں بھی عفو کا سلوک فرماؤں اور مغفرت کا سلوک فرماؤں۔ تو بہت ہی اچھا موقع ہے کہ بظاہر ایک تاریکی سے نور نکال لیا جائے اور یہ جو Blessing in Disguise کہا جاتا ہے انگریزی میں، دنیا میں تو صحیح معنوں میں اس محاورے کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں مگر دین میں تو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ بعینہٖ اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہر بدی سے جو بدی دکھائی دیتی ہے اللہ تعالیٰ نے بھلائی نکالنے کے پہلو خود ہمیں سمجھا دیئے ہیں اور ان کی ذمہ داری خود ادا فرماتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں جو جلسہ کینیڈا اور امریکہ ہے اس کے حوالے سے ایک دو باتیں اور کہوں گا اور پھر ایک ایسی بنیادی ضرورت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا جس کے متعلق پہلے بھی بارہا کہہ چکا ہوں مگر ابھی تک میرے اس منشاء کو پوری طرح جماعتیں سمجھ نہیں سکیں اس لئے بعض دفعہ تکرار کرنی پڑتی ہے۔ ایک بات آمنے سامنے بھی سمجھائی جائے بٹھا کر تو تب بھی بسا اوقات وہ پوری طرح سمجھ نہیں آتی۔ انسان سمجھتا ہے میں نے ابلاغ کا حق ادا کر دیا مگر سننے والا اس مفہوم کو صحیح سمجھتا نہیں۔ اس لئے اس پر عمل درآمد کے وقت نقص رہ جاتے ہیں اور یہ جو نقائص ہیں یہ MTA سے تعلق رکھنے والے نقائص ہیں جن کی طرف میں آپ کو متوجہ کروں گا۔

کینیڈا اور امریکہ کے جلسوں میں جو خصوصیت سے میں نے بات محسوس کی بہت سے لوگ جو بہت دور سے تشریف لائے تھے ان کو ملاقات کا موقع نہیں مل سکا یعنی ذاتی ملاقات کا موقع نہیں مل سکا اور اس کے لئے دونوں ممالک نے کچھ قوانین اپنے لئے بنالیے تھے کہ اس دفعہ ان کو موقع دیا جائے جن کو کبھی بھی ملاقات کا موقع نہیں ملا اور اس پہلو سے اگرچہ ہزارہا ملاقاتیں ہوئیں لیکن جو خاص طور پر دور سے ملاقات کی نیت سے آئے تھے اور اپنا حق کسی پہلو سے بالا سمجھتے تھے ان کو اس ملاقات نہ ہونے کے نتیجہ میں ٹھوکر لگی، صدمہ پہنچا۔ بعض نے اظہار کیا، بعض کے اظہار ان کے چہروں پر لکھے ہوئے، رستہ چلتے دکھائی دے رہے تھے مگر تکلیف کا بہر حال ایک موقع تھا۔ تو میں ان سب

سے معذرت خواہ ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اتنی بڑی ملاقاتوں میں یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص سے ملاقات ناممکن ہے اور جب ہوتی ہے تو پھر اتنی مختصر ہوتی ہے کہ بعض دفعہ ملاقات کے بعد جانے والے بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں کہ اچھا وقت ختم بھی ہو گیا ہے۔ ہم تو پندرہ سو میل سے آئے تھے یا دو ہزار میل سے آئے تھے تو آپ نے بس اتنا سا ہی وقت رکھا تھا۔ تو میں ان سے گزارش کرتا ہوں کہ وقت میں کہاں رکھتا ہوں، وقت تو اللہ نے رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے چوبیس (24) گھنٹے کے دن کی بجائے اڑتالیس (48) گھنٹے کا دن دے دیں تو پھر میں آپ کے وقت کو بھی بڑھا دوں گا اور اپنی خدمت کے وقت کو بھی بڑھا دوں گا مگر یہ بے اختیاریاں ہیں۔

ایک طرف یہ مطالبہ کہ ہر ایک سے ملاقات ہو دوسری طرف یہ مطالبہ کہ ہر ملاقات سیر حاصل ہو تو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا، ناممکن ہے اور جب میں دیکھتا ہوں بعض خاندان بے چارے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے ہیں تو مجھے خود تکلیف ہوتی ہے اور شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ یہ بے چارے صرف دو منٹ کی ملاقات کے لئے بیٹھے ہیں۔ مگر وہ دو منٹ کو بڑھانا میرے قبضہ قدرت میں نہیں کیونکہ ایک طرف جب بڑھاؤں گا تو دوسرے بچوں کی دل آزاری ہوگی جوان کو اور بھی لمبا بیٹھنا پڑے گا اور ان کی ملاقات کا وقت اور بھی مختصر ہو جائے گا۔ اس لئے میں آپ کا وقت بانٹتا ہوں اصل میں۔ میرا وقت تو آپ کے لئے حاضر ہے۔ مگر جو وقت آپ سب کا مشترک ہے اس کو مجھے جس حد تک ممکن ہے انصاف سے بانٹنا پڑتا ہے۔ اب جو آنے والے ہیں وہ بھی اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ ملاقاتوں کا جو سلسلہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت بڑھ چکا ہے اور میں نے دو خلفاء کا زمانہ پہلے دیکھا ہے اور حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے وقت کے حالات بھی ہمارے سامنے ہیں جو سلسلہ کے لٹریچر میں موجود ہیں، انفرادی طور پر اس طرح فیملی ملاقات کی جو توفیق خدا تعالیٰ نے اس دور میں مجھے بخشی ہے اس کی کوئی مثال آپ کو پہلے دکھائی نہیں دے گی۔ ان کے وقت مجھ سے زیادہ مصروف رہے ہیں، زیادہ عمدہ نیکی کے کاموں میں وہ مشغول رہے ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ **نعوذ بالله من ذالک** انہوں نے اپنے وقت کو بچا لیا، اپنی ذات کے لئے بچایا، صرف یہ مراد ہے کہ اب جماعت کے تقاضے اور طرح کے ہو گئے ہیں اور تربیت کے حقوق میں ملاقات بھی ایک اہم جزو کے طور پر داخل ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں جتنے احمدی تھے ان کو قریب رہنے کا موقع مل جایا کرتا

تھا، جلسوں میں شامل ہو کر قریب بیٹھنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ اب تو یہ دُور درشن کے زمانے آ گئے ٹیلی ویژن کے ذریعے پھیلے ہوئے خطبات اور تصویروں کے ذریعے دیکھنا یہ دور بدل گیا ہے اور اگر اس دور میں انفرادی طور پر خاندانوں سے تعلق قائم نہ کیا جائے تو ان کے اندر وہ گہرا ذاتی رابطہ خلافت سے قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ جو تعلق ہے دور سے دیکھنے سے یا سننے سے اس میں وہ مضبوطی نہیں جو اس تعلق میں ہوتی ہے جو میں نے بیان کیا ہے اور پھر اگلی نسل کو سنبھالنے کے لئے یہ بہترین ذریعہ ہے کیونکہ چھوٹے بچے جب مل کے جاتے ہیں تو بسا اوقات ان کی طرف سے خطوط ملتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ بچے پھر اپنے ماں باپ کو سنبھالتے ہیں اور اگر وہ ٹیلی ویژن کسی اور جگہ لگانا چاہیں تو کہتے ہیں نہیں ہم نے احمدیہ پروگرام دیکھنا ہے اور ملاقات کی یادیں ان کے دلوں پر ہمیشہ کے لئے نقش رہتی ہیں۔ تو یہ بے اختیاریاں ہیں ملنا تو ہے بہر حال ملنا ہے مگر ہر ملاقات کو لمبا نہیں کیا جا سکتا اور ہر ملنے والے کی خواہش کو پورا کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔

ایک اور بات پیش نظر رکھیں کہ ملاقات کوئی ایسا معاملہ نہیں جو انصاف کے دائرے سے تعلق رکھتا ہو، جس میں لازم ہو کہ ہر ملاقات کی خواہش والے کو ملاقات کا وقت دیا جائے۔ جو وقت کی مجبوری ہے اس کے علاوہ بھی بعض ذاتی تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اگر ایک کو وقت دیا گیا اور وہ پہلے سال بھی مل چکا تھا اور دوسرے کو اس بناء پہ وقت نہیں دیا گیا کہ وہ پچھلے سال مل گیا تھا تو یہ ناانصافی ہے۔ ملاقات ایک ذاتی حق ہے اور قرآن کریم نے اس حق کو تسلیم فرمایا ہے اور قرآن کریم نے اس حق کو ہر مومن کے لئے تسلیم فرمایا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حق خدا تعالیٰ ہر مومن کو دے خلیفہ کو اس سے محروم کر دے اور اس پہ لازم ہو جائے کہ ہر ملاقاتی سے ضرور ملے اور اگر خود اس کو خواہش ہو کسی سے ملنے کی تو وہ اس وجہ سے نہ ملے کہ پھر دوسروں کی دلآزاری ہوگی۔ یہ تو بالکل ایک غلط بات ہے اور قرآن کریم تو یہ فرماتا ہے کہ اگر تم کسی سے ملنے جاؤ دروازہ کھٹکھٹاؤ، السلام علیکم کہو اگر اجازت ملے تو ملو ورنہ بغیر دل پر میل لئے واپس لوٹ جاؤ۔ تو ہر شخص کو اگر یہ ملاقات کا حق ذاتی طور پر خدا عطا نہ فرماتا تو ان آیات کے کیا معنی ہیں۔ پس اگر میں ذاتی طور پر کسی سے ملتا ہوں تو اس کو بعد میں طعن آمیزی کا ذریعہ بنانے کا کسی کو حق نہیں ہے کیوں ملتا ہوں، اللہ بہتر جانتا ہے۔ بعض دفعہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ بعضوں کے مشورے کی ضرورت پڑتی ہے اور، اور بھی بہت سے ایسے ملاقات کے

اسباب ہیں جن کا اس وقت احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔مگر متفرق ضروریات ہیں انسان کی اوران وجوہات سے ملنا پڑتا ہے۔کسی کو زیادہ وقت دینا پڑتا ہے تو اس میں شکوے کا کوئی حق نہیں۔جن سے ملاقات ہوجاتی ہے وہ چونکہ محض للّٰہ ہے اس پر بھی شکریے کا محتاج نہیں ہوں۔میں نے بھی محض للّٰہ کیا، آپ نے بھی محض للّٰہ کیا۔نہ میں آپ کا ممنون، نہ آپ میرے ممنون مگر شکوؤں کا بھی مضمون کوئی نہیں ہے یہاں۔جو نہیں ملنے آتا مجھے کبھی بھی اس سے شکوہ نہیں ہوا۔سرسری ملاقات ہو جائے تو وہ بھی بہت ہے۔جلسوں کے وقت جو ملاقاتیں ہوتی ہیں وہاں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ملاقات نہیں ہے۔حالانکہ یہ بھی تو ایک ملاقات ہے اور بڑی اہم ملاقات ہے۔جب سوال و جواب کی مجالس میں ہم اکٹھے بیٹھتے رہے اور بار بار بیٹھتے رہے، ہر ایک کو موقع تھا اٹھ کر سوال کرتا انہوں نے جب اپنی ذاتی باتیں کہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ان کو بھی موقع دیا گیا ہاں آپ کہیں شوق سے، اپنی ضروریات بتائیں۔تو اگر یہ ملاقات نہیں تو پھر اور کیا ہے اور اس ملاقات سے تو بہتر ہے جو ٹیلی ویژن کے ذریعے ہوتی ہے۔وہاں تو یک طرفہ ہے، وہاں ایک طرف سے انسان بات کرسکتا ہے اور دوسری طرف سے ایک بے اختیاری ہے۔تو یہ کہنا کہ ملاقات سب سے نہیں ہوئی یہ بھی غلط ہے۔ہوتی رہی ہے، بار بار ہوتی رہی ہے، رستہ چلتے ہوتی رہی ہے، آتے جاتے مسجد میں اور دوسرے مقامات پر ایک دوسرے کو ہم دیکھتے، ایک دوسرے کے لئے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے رہے تو یہ بھی ملاقاتیں ہی ہیں۔پس اس پہلو سے آئندہ جلسے پہ آنے والوں کو میں نصیحت کررہا ہوں حوالہ امریکہ اور کینیڈا کا دے رہا ہوں لیکن مخاطب وہ بھی ہیں جو اس جلسے پر تشریف لائیں گے۔اس مضمون کو پیش نظر رکھیں دعا کریں اللہ تعالیٰ وقت میں برکت دے اور زیادہ سے زیادہ دوستوں سے ملنے کی توفیق بخشے لیکن اگر نہ ہوسکے تو پھر جلسے کی ملاقات ہی کو ملاقات سمجھیں۔گھنٹوں جب آپ کے سامنے میں کھڑا ہوتا ہوں، باتیں کرتا ہوں تو وہ ملاقات ہی کی ایک صورت ہے۔

اب میں ایک اور بات امریکہ کے ایک خطبہ کے حوالے سے یہ کرنی چاہتا ہوں۔ملک لال خان صاحب کینیڈا نے خط لکھا ہے جو مجھے کل ملا، اس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ نے جب آنحضرت ﷺ کی پسند کے شعر کی بات کی تو وہ ایک تمہید تھی جو بہت ہی دلچسپ اور پرلطف تھی جس سے حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے ذوق میں جو دل کی کیفیت تھی جھانکنے کا موقع ملا لیکن غالباً

آپ اگلا مصرعہ پڑھنا بھول گئے اور شاید وہ مصرعہ پڑھ کر مضمون مکمل ہونا تھا۔ اس لئے ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ مصرعہ بھی پڑھا جائے تو بات مکمل ہوگی۔ اس میں میرے بھولنے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بھول تو میں جایا کرتا ہوں وہ قصور اپنی جگہ ہے لیکن اس موقع پر میری بھول چوک کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس حدیث میں ایک ہی مصرعہ تھا تو میں حدیث کی طرف دوسرا مصرعہ کیسے منسوب کر دیتا۔ میں شاعر کی نمائندگی تو کر ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے جذبات کی نمائندگی کر رہا تھا۔

الا کل شیء ما خلا اللّٰہ باطل یہ مصرعہ تھا جس کا ذکر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا ہی پیارا شعر ہے لیکن اگلا مصرعہ جو ہے وہ ان کو پسند آیا لکھنے والے کو، اچھا مصرعہ ہے لیکن حدیث میں موجود نہیں۔ ''**وکل نعیم لا محالۃ زائل**'' ہر نعمت لامحالہ، بے شک ضرور زائل ہو جائے گی اور باقی نہیں رہے گی۔ تو یہ مصرعہ تو اچھا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے کیا عمداً اسے نظر انداز فرمایا اور ایک ہی مصرعہ کو پسند کیا یا راوی نے پورا شعر یاد نہیں رکھا اور صرف ایک مصرعہ بیان کر کے آنحضور ﷺ کی تحسین کا ذکر فرما دیا۔ میرے نزدیک راوی کی یادداشت کا قصور نہیں ہے کیونکہ یہ ایک معروف شعر تھا جس کے متعلق اور بھی واقعات بیان کئے جاتے ہیں اور عرب تو شعر یاد رکھنے میں تمام دنیا پر فوقیت رکھتے تھے۔ بعض ایسے عرب تھے جو ایک ایک لاکھ شعر یاد رکھتے تھے یا جن کو یاد ہوتے تھے۔ بڑے لمبے لمبے قصیدے یاد ہوتے تھے۔ اس لئے وہ مصرعہ حضور اکرم ﷺ نے نظر انداز فرمایا ہوگا یہ میرا رجحان ہے اور اس کی ایک وجہ ہے۔ **وکل نعیم لا محالۃ زائل** میں ایک ایسا مضمون ہے جس کا مذہب سے تعلق نہیں ہر انسان کی ایک بے ساختہ مجبوری ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ ہر نعمت ہر شخص کو پیاری لگتی ہے اور نعمت کے زائل ہو جانے کے شکوے ہر زبان پہ رہتے ہیں خواہ وہ دہریہ شاعر ہو یا غیر دہریہ ہو۔ تو وہ چیز جو ہر انسان کی بے اختیاری سے تعلق رکھتی ہے وہ تو آنحضورؐ کو پسند نہیں آئی۔ جس چیز نے دل پر اثر کیا ہے وہ پہلا مصرعہ ہی تھا۔ **الا کل شیء ما خلا اللّٰہ باطل** خبردار خدا کے سوا کوئی چیز بھی سچی نہیں، صرف ایک ہی سچا ہے۔ ایک ہی ہے جو اپنی ذات میں حق ہے باقی ہر چیز باطل ہے۔ اب یہ مصرعہ ایسی بلند شان کا ہے کہ دوسرا مصرعہ اس کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتا۔ شعری مضمون کے لحاظ سے تو مناسبت رکھتا ہے لیکن عرفان کے اعتبار سے یہ اس مصرعہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔ پس اس پہلو سے میرا یہ تصور ہے جو میں نے غور کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے عمداً اس کو چھوڑا

ہوگا اور اس مصرعہ کو بیان فرمایا ہوگا۔

اب رہا MTA کے تعلق میں جو میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون بھی ایسا ہے جو میں بارہا بیان کر چکا ہوں اور مختلف مواقع پر مثلاً جرمنی میں، ہالینڈ میں، کینیڈا میں، اور پھر امریکہ میں بھی جماعت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ چوبیس (24) گھنٹے MTA کو ایسے وڈیوز سے بھرنا، ایسے پروگراموں سے بھرنا کہ وہ سارے دلکش بھی ہوں اور معلومات سے بھی لبریز ہوں اور رجحانات کو مادہ پرستی سے دین کی طرف مائل کرنے والے ہوں یہ ہمارا ایک بہت عظیم چیلنج ہے جو ہم نے قبول کرلیا ہے اسے نبھانا ہے۔ اب اس کے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے اور بہت عقل اور فہم کے ساتھ پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ کیسے پروگرام بنائے جائیں۔ یہ وہ تفاصیل ہیں جو میں پہلے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے جرمنی میں، ہالینڈ میں اور کینیڈا اور امریکہ میں کسی حد تک بیان کر چکا ہوں اور ان کے خلاصے تیار کروا کے افریقہ میں تمام جماعتوں کو بھجوا دیئے تھے تا کہ جو افریقہ کا دن ہم منائیں اس میں ان کی طرف سے ایسی وڈیوز مل جائیں جو میری خواہش کے مطابق دلچسپ بھی ہوں اور معلوماتی بھی ہوں۔ دینی رنگ ان میں غالب ہو اور ایک جشن کی کیفیت بھی ہو لیکن جو وڈیوز آئیں اور آپ نے دیکھیں ان میں مشکل سے چند ایسے مقامات دکھائی دیئے جو ان کوائف پر پورے اترتے ہیں جو میں نے پیش کئے ہیں اور بڑی افراتفری میں جہاں سے بھی کوئی ٹکڑا ایسا ملا جو دلچسپ بھی ہو اور کچھ دوسرے فوائد بھی رکھتا ہو وہ نکال کر آپ کے سامنے رکھا گیا۔

ہوسکتا ہے کہ لمبے عرصے کے انقطاع کی وجہ سے وہاں کے ہمارے مختلف ممالک کی جو جماعتیں ہیں انہیں میری پہلی ہدایات پہنچی نہ ہوں اور جو خلاصے لکھے گئے وہ پوری طرح واضح نہ ہوں۔ مگر اکثر ممالک جیسا کہ منشاء تھا اس کے مطابق وڈیو نہیں بنا سکے۔ اگر یہ عذر ہو کہ ان کے پورے سامان نہیں ہیں تو پہلے خط کے جواب میں ان کو لکھنا چاہئے تھا۔ پھر ہمارا فرض تھا کہ جب ان سے توقع رکھتے ہیں تو اس کے ذرائع بھی مہیا کریں لیکن وہ نہ لکھنا اور ذہن پر یہ اثر رہنا کہ وہ سامان موجود ہوں گے اور پھر وہ چیز نہ بنے تو اس سے بہت کوفت ہوتی ہے اور دنیا جو توقعات رکھ رہی تھی وہ پوری نہ ہوں تو احمدی، غیر احمدی ہر قسم کے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کے اوپر ایک احمدیت کی Efficiency کا، اس کی کارکردگی کا اچھا اثر نہیں پڑتا۔ پس اس پہلو سے آپ یاد رکھیں وہ پروگرام جو میں نے بیان

کئے ہوئے تھے وہ ہم نے بہر حال بنانے ہیں۔

اور افریقہ کے حوالے سے خصوصیت سے میں چند مثالیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں مثلاً یوگنڈا کی بات تھی۔ یوگنڈا کو چاہئے تھا کہ اپنے تاریخی اہم واقعات کو ٹیلی ویژن میں پیش کرنے کے لئے اس کا کوئی طریقہ اختیار کریں۔ اپنے جغرافیائی اہمیت کے مقامات کو پیش کرنے کے لئے اور ایسے مقامات جہاں تاریخ اور جغرافیہ دونوں مدغم ہو جاتے ہیں ان کے متعلق بڑے دلچسپ پروگرام پیش کئے جاسکتے تھے۔ وہاں کی اقتصادیات، وہاں کا رہن سہن، وہاں کی قوموں کے اختلافات اور تاریخ میں یوگنڈا نے کیا کردار ادا کیا اور وہ زمانہ جب کہ سارے افریقہ میں تعلیم کے لحاظ سے سب سے اونچا ملک یوگنڈا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پیداوار کیا کیا ہے؟ وہاں Lake Victoria کیا کردار ادا کرتی ہے اور دریائے نیل کا دہانہ کیا ہے اور اس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے کیا فرمایا تھا اور کس شان کے ساتھ اس زمانے میں وہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ یہ ساری باتیں ایسی دلچسپ ہیں کہ اگر کبھی کوئی خوب صورت مناظر دکھائے جائیں پھر کچھ تبصرے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو بہت لمبا مضمون ہے وڈیوز کا جو یوگنڈا سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

احمدیت وہاں کب آئی؟ کون تھے احمدیت لانے والے؟ وہ کہاں دفن ہیں؟ ان کی قربانیاں، ان کے کتبے دکھائے جانے، کس سن میں آئے تھے، کیا کیا قربانیاں کیں؟ ان کے خاندان اب کہاں پھیل گئے ہیں؟ اور سیاست کے لحاظ سے یوگنڈا کن کن ادوار سے گزرا ہے۔ اس پر غیر قوموں نے کب قبضہ کیا۔ اس سے پہلے کیا کیفیت تھی۔ اتنے مضامین ہیں کہ وہ اگر حقیقت میں اچھی فلموں میں ڈھالے جائیں تو ساری دنیا کے لئے بے حد باعث کشش بھی ہیں اور علم میں اضافہ کرنے والے بھی ہیں۔ مبلغین کی تاریخ مبلغ پہلے کون آیا تھا پھر کون آیا؟ کن حالات میں انہوں نے وہاں گزارے کئے ہیں، کس تنگی ترشی سے انہوں نے وقت گزارے ہیں اور دین کی خدمت میں کیا کیا بہادری کے کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہاں کے مقامی خاندان، اولین کون تھے، کیسے آئے، انہوں نے کیا کیا دکھ دیکھے، کن کن مصیبتوں پہ صبر دکھایا۔ وہاں کے معاندین کے حالات اور جب خوب جوش کے ساتھ مقابلے ہوئے ہیں تو کس طرح اللہ تعالیٰ کی تائید ظاہر ہوئی ہے اس شان کے ساتھ کہ مخالف کو نامراد اور ناکام بنا کے دکھا دیا اور خدا تعالیٰ نے اپنے پاک بندوں کی تائید فرمائی۔ یہ یوگنڈا

کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے واقعات ہیں۔ ان کو سجا کر ایسی دلکشی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے کہ کوئی انسان بھی یہ نہ سمجھے کہ تقریر ہو رہی ہے۔ اب جب بھی وڈیو کی توقع کی جاتی ہے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک آدمی آ کے بیٹھ جائے اور تقریر شروع ہو جائے۔ تقریریں تو بہت ہوتی ہیں ہمارے ہاں اور احمدیوں میں تقریر سننے کا حوصلہ بھی بڑا ہے۔ چھ چھ سات سات گھنٹے بیٹھ جانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔ دنیا میں ہے کون جو اتنے صبر کے ساتھ تقریریں سن سکے۔ مگر یہ تو نہیں کہ اب صبر کا امتحان ختم ہی نہ ہو اور یوں صبر پر بوجھ ڈالیں کہ یہاں تک کہ صبر ٹوٹ جائے۔ اس لئے یاد رکھیں ٹیلی ویژن کا مقابلہ دوسرے دنیا کے ٹیلی ویژنز کے ساتھ ہے۔ وہاں بہت بڑے بڑے دلچسپ ایسے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں جو اکثر مخرب الاخلاق ہیں، اکثر اخلاق کو برباد کرنے والے ہیں اور کوئی بھی ٹیلی ویژن خواہ وہ دینی کہلائے یا غیر دینی جب تک میوزک نہ پیش کرے اس وقت تک اس کی بات نہیں بنتی۔ جب تک لغو اشتہار نہ دکھائے اس وقت تک اس کا گزارا نہیں ہوتا۔ تو ہم ایک ہی وہ ٹیلی ویژن کا نظام پیش کر رہے ہیں جو سب سے مستثنیٰ، سب سے الگ ہے اور اس میں جان ڈالے رکھنا یہ ہمارا فرض ہے اور اپنی جان ڈالنی پڑتی ہے۔ ہم کوئی خدا تو نہیں کہ ہمارے امر کے ساتھ جان پڑ جائے۔ ہر بندہ جو محنت کرتا ہے، دل لگا کے محنت کرتا ہے فی الحقیقت تو اپنی جان ہے جو اپنے پروگراموں میں، اپنی تخلیق میں ڈالتا ہے۔

اس پہلو سے ایسی ٹیموں کی ضرورت ہے جو ہر ملک میں طوعی طور پر اپنے سپرد ذمہ داریاں کر لیں اور جب وہ پروگرام بنائیں تو اس سے پہلے پروگرام بنانے کے تعلق میں جتنی میں نے نصیحتیں کی ہیں ان سب کو یکجائی صورت اپنے پاس رکھیں اور ان کو غور سے سنیں یا تحریریں ہیں تو ان کو غور سے پڑھیں تاکہ یہ نہ ہو کہ پروگرام بنائیں اور بعد میں پتا چلے کہ یہ ہمارے مقصد کا نہیں اس میں یہ نقص رہ گئے ہیں۔ تو پروگرام کا تجربہ یہ بھی تو ایک لمبا عرصہ چاہتا ہے۔ اس لئے کچھ بنانے تو شروع کریں اور ہر پہلو سے اپنے اپنے ممالک کی تصویر کو اس طرح پیش کریں کہ ایک سننے والے کی تشنگی دور ہو اور امکانات جو ہیں اس ملک کے ان کو بھی کھول کر سامنے رکھیں۔

اب یوگنڈا کی بات ہو رہی تھی اسی حوالے سے یوگنڈا میں تجارت کے کیا کیا امکانات ہیں۔ کون سی انڈسٹری لگ رہی ہے۔ اس کا کیا حال ہے، اس کی مشکلات کیا کیا ہیں۔ اگر بددیانتی

عام ہے، اگر چوری کی عادت ہے، اگر جھوٹ کی عادت ہے تو باہر سے آنے والے مفادات کی کیسے حفاظت کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کا MTA پر ذکر آنا ضروری ہے تا کہ تمام دنیا میں سننے والے اپنے اپنے حالات کے مطابق یہ جائزہ لیں کہ کیا وہ بھی اس ملک سے روابط میں حصہ لے سکتے ہیں کہ نہیں؟ ایکسپورٹ ، امپورٹ ہے، انڈسٹری کا قیام ہے۔ وہاں سے چیزیں منگوانا ہے یہ بھی ایک پہلو ہے جو MTA میں تمام عالم کی خدمت کے طور پر پیش ہو سکتا ہے اور پھر اگر وہاں جماعت کی وساطت سے بعض تصدیقات حاصل کی جا سکتی ہیں تو یہ بتانا چاہئے کہ یہاں ہمارا یہ مرکز ہے جس نے معلومات حاصل کرنی ہوں وہ یہاں سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

ملکی زبانیں ہیں ان کا تعارف ہونا چاہئے ۔ پھر شعراء ہیں ملک کے ان کا تعارف ہونا چاہئے ۔ ادیب ہیں ان کا تعارف ہونا چاہئے ۔ ہر ملک میں کچھ لکھنے والے موجود ہیں ضروری تو نہیں کہ صرف انگریزی میں ہی یا عربی یا اردو میں ہی لکھنے والے ہوں ۔ ہر ملک کی زبان ایک فصاحت و بلاغت کا رنگ رکھتی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے سکھائی ہے اس لئے ہر زبان جو طبعی ہو، جس میں ملاوٹ نہ ہو اس میں حیرت انگیز طور پر فصاحت و بلاغت کے امکانات رہتے ہیں اور مقامی شعراء ان پڑھ بھی ہوں تو عظیم فصیح و بلیغ کلام کہنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ کس مضمون میں ان کی دلچسپی تھی اس پر بھی اگر روشنی ڈالی جائے تو بہت حد تک اس ملک کی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آ جائے گی اور یہ ایک ایسی سیر ہے جو بسا اوقات ملکوں میں جانے والے بھی نہیں کرتے ۔ اکثر جا کر ظاہری صورتیں دیکھ کر واپس آ جاتے ہیں اور بعد میں آ کر ان کو پتا چلتا ہے کہ وہ جو چیز ہم نے دیکھی تھی اس کے اندر تو یہ بات مخفی ہے اس کے پیچھے یہ تاریخ ہے، تو پہلے تاریخ ہو پھر آپ موقع پر جائیں تو ایک اور لطف ہے۔

MTA میں دونوں چیزیں اکٹھی نظر آنی چاہئیں ۔ مناظر کے ساتھ اس کے پس منظر بھی اور تاریخ بھی اور معلوماتی خبریں جو سیاست سے بھی تعلق رکھتی ہوں ۔ ان کی کھیلیں، ان کے بچوں کے مشاغل، ان کے کھانے کے طریق، پھل کون کون سے ہیں، کیا کیا نعمتیں خدا نے عطا فرمائی ہیں، ان کی کاشت کاری کے طریقے ۔ بے شمار معلومات ہیں جو فلمائی جا سکتی ہیں اور ان میں دلچسپی تو ہے، کوئی بد پہلو نہیں ہیں یعنی ایسا لطف ہے جس کے بعد کوئی سر دردی نہیں ہوتی بعد میں اور علم کے بڑھنے کا جو لطف ہے اگر کسی کو یہ عادت پڑ جائے تو یہ عادت ایسی ہے جو چھٹ نہیں سکتی، سب سے بڑا نشہ یہی

ہے۔تب ہی صاحب علم لوگ دنیا کی لذّتوں کے محتاج ہی نہیں رہتے ۔ایسے سائنسدان ہیں جو صبح پو پھوٹنے سے پہلے اپنی لیبارٹریز میں پہنچتے ہیں اور رات بارہ کا گھنٹہ وہ اپنی لیبارٹریز میں سنتے ہیں اور ان کے ذکر محفوظ ہیں۔ان کو سوائے اس علم کے جس کی ان کو جستجو ،دل میں ایک لگن کے طور پر لگ گئی کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہتی۔نیوٹن کا بھی یہی حال تھا،دوسرے بڑے بڑے سائنسدان جنہوں نے ایجادات کی ہیں اور ہمیشہ کے لئے علم کی دنیا میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا گیا،ان مٹ حروف سے لکھا گیا ان کا مطالعہ کریں ان کو کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ اتنا وقت اپنے خاندان سے کٹ کر اپنے کاموں میں لگائیں۔مجبوری صرف یہ تھی کہ علم میں ایک نشہ ہے۔علم میں ایک ایسی لذّت ہے جس سے انسان کے اندر وسعتیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ جو انا کا ایک مطالبہ ہے کہ میں پھیلوں،علم اسے عطا کرتا ہے اور اعلیٰ رنگ میں عطا کرتا ہے۔ایک انا کا مطالبہ ہے کہ میں پھیلوں،وہ سیاست کے ذریعے پورا ہوتا ہے،خدا کے بندوں پر حکومت کے ذریعے پورا ہوتا ہے اور اکثر اس صورت میں ظلم کرتا ہے انسان،اکثر حقوق تلفی کرتا ہے اور سیاست کے ذریعے جو اپنی قوت اور اپنی انا کو پھیلانے کا مضمون ہے یہ نقصانات سے خالی نہیں ہے بلکہ اکثر اس کے نقصانات اس کے فوائد سے بہت زیادہ ہیں اور علم ایک ایسی چیز ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے۔تب ہی آنحضورﷺ نے سیاسی رسوخ کے ذریعے اپنی شخصیت بڑھانے کا کہیں ذکر نہیں فرمایا لیکن علم کے متعلق فرمایا کہ علم حاصل کرو خواہ چین بھی جانا پڑے۔اس زمانے میں چین عرب سے بعید ترین جگہ تھی،اس سے زیادہ بعد کا تصور نہیں باندھا جاسکتا تھا۔فرمایا چین کی مسافت بھی طے کرنی پڑے تو وہاں بھی جاؤ اور علم سیکھو۔

تو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ علم میں اپنی ذات میں ایک ایسی کشش ہے کہ اس کے ذریعے انسان کی شخصیت پھیلتی ہے اور اس کا فائدہ لوگوں کو پہنچتا ہے،نقصان کوئی نہیں اور اگر علم کی لذّت دل میں جاگزیں ہوجائے تو اس سے کردار کی عظمت بھی پیدا ہوتی ہے۔صاحبِ علم میں از خود ایک کردار کی عظمت پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہے۔وہ اپنی ذات میں غنی بنتا چلا جاتا ہے یعنی لوگوں کا ہمدرد بھی ہو تو لوگوں کی ستائش سے بالا ہوتا چلا جاتا ہے۔اس کو پھر اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ کوئی دیکھتا ہے مجھے کہ نہیں دیکھتا۔کسی کو میں اچھا لگ رہا ہوں یا بد لگ رہا ہوں تو علم کا نشہ ہے اس میں وہ اپنی مصروف زندگی کے وقت گزار دیتا ہے۔تو MTA علم کی طاقت سے دنیا کے دلوں پر قبضہ کرے گا اور

وہ علوم جو دین کے بھی ہیں اور دنیا کے بھی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جو علم کی تعریف فرمائی کہ **العلم علمان علم الادیان و علم الابدان۔** (موضوعات الصغانی،رقم الحدیث 20)

میرے ذہن میں جو MTA کا تصور ہے وہ بعینہ اس تعریف کے مطابق ہے کہ علم الادیان بھی ہم لوگوں تک پہنچائیں اور علم الابدان بھی پہنچائیں۔ علم الابدان کا جو یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ صحت کا علم، یہ غلط تو نہیں مگر یہی ترجمہ نہیں ہے۔ ابدان سے مراد سائنس کا علم ہے Matter کا علم اور دو ہی چیزیں ہیں یا خدا نے روحانی دینی کائنات پیدا فرمائی یا مادی جسمانی کائنات پیدا فرمائی۔ تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ باقی جو کہانیاں اور اس قسم کے شعر و شاعری کے قصے ہیں یہ تو ایک غیر حقیقی قسم کا علم ہے۔ اصل علم وہ ہے جو سچا ہو۔ علم الادیان بھی سچا علم ہے اور علم الابدان بھی سچا علم ہے۔ جہاں مادے کی حرکتیں اور اس کی صفات، اس کے آپس کے تعلقات، ایک دوسرے سے مل کر وہ کیا نئی صفات پیدا کرتے ہیں، جہاں یہ مضمون چلے، یہ علم الابدان ہے اور اس پہلو سے سائنس کی ترقی مسلمانوں سے بطور خاص وابستہ ہونی چاہئے کیونکہ کوئی دنیا کا نبی ایسا نہیں جس نے اپنی قوم کو علم کے متعلق ایسی اعلیٰ صفت، ایسی اعلیٰ تعریف میں متوجہ فرمایا ہو۔ اس سے بہتر تعریف علم کی ممکن نہیں اور متوجہ فرمایا کہ یہ تمہاری زندگی کے مشاغل ہیں۔ تمہیں یا علم ادیان حاصل کرنا ہے یا علم ابدان حاصل کرنا ہے۔

تو MTA کا کام بھی یہی ہے کہ اپنے ملک کے علم الابدان بھی بتائے۔ وہاں کس قسم کے بڑے بڑے سائنس دان پیدا ہوئے، اگر ہوئے اور ان کے جو اقتصادی حالات، ان کے معاشرتی حالات، ان کے ادب کی تاریخ یہ اگرچہ بعینہ علم الابدان تو نہیں مگر اس مضمون کو جب وسعت دیں تو علم کے کسی نہ کسی دائرے میں تو بہرحال آتے ہیں۔ تو علوم میں دلچسپی کے لئے ان کو داخل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آنحضور ﷺ خود شعروں کو نہ سنتے۔ حالانکہ قرآن کریم نے شاعر کے متعلق جو فرمایا ہے اس کے باوجود آنحضور ﷺ اشعار کو سنتے بھی تھے اور صحابہؓ کو بھی بکثرت اشعار یاد تھے۔ پس اگرچہ براہ راست علم الابدان تو نہیں ہے یہ مگر علم کی وسیع تر تعریف میں یہ باتیں بھی داخل ہیں۔ اس لئے میں یہ بھی نصیحت کرتا رہا ہوں کہ اپنے ملک کے سائنس دانوں ہی کا نہیں بلکہ ادیبوں کا تعارف بھی کروائیے اور شعراء کا تعارف بھی کروائیے۔ ڈرامہ نگاروں کا تعارف بھی کروائیے۔ وہ کہانیاں جو بہت شہرت پا گئیں ان کا تعارف بھی کروائیے۔

یہ علوم جو ہیں یہ بے فائدہ بہر حال نہیں ہیں کیونکہ ان میں بہت سے حکمت کے موتی بکھرے ہوئے آپ کو ملیں گے۔ ہر قوم کے لکھنے والے نے حکمت کی باتیں کی ہیں ورنہ اسے وہ مرتبہ حاصل ہی نہ ہوتا جو اسے ادب کی دنیا میں حاصل ہوا۔ تو ان کو ابھارا جائے، ان کی لغویات کو بے شک دبی زبان سے ذکر کر کے چھوڑ دیں مگر جو اعلیٰ پائے کی باتیں مختلف قوموں کے شعراء اور ادیبوں نے لکھی ہیں اور کہی ہیں ان کا تعارف تو کروائیے۔ اپنے ملک کے لطائف بتائیں اور کھیلوں کے ساتھ وہ لطائف کی مجلس بھی لگ سکتی ہے۔ ہر ملک کا اپنا ذوق ہے، بعض ان کے لطائف پر آپ کو شاید ہنسی نہ بھی آئے مگر ان کو تو آئے گی بہر حال اور ہمارے علم میں تو اضافہ ہوگا کہ ان لوگوں کا ذوق کیا ہے۔ کس قسم کی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ پھر قومی تعارف میں یہ ضروری ہے کہ یہ بھی بتایا جائے کون سی چیزیں ناپسند کرتے ہیں اور یہ ہمارے مبلغین کے لئے اور ویسے تبلیغ کرنے والوں کے لئے بڑی ضروری بات ہے۔

بعض دفعہ ایک بات کا کچھ اور معنیٰ لے لیا جاتا ہے۔ ایک ملک کے ایک دوست نے مجھے ایک دفعہ بتایا کہ پاکستان میں یہ رواج ہے اور ہندوستان میں بھی کہ جب ملتے ہیں تو پیار سے پیچھے تھپکی بھی دیتے ہیں۔ اول تو چھوٹا اگر بڑے کو دے تو یہ ایک بے وقوفی کی بات ہے لیکن یہاں بغیر دیکھے یہی رواج چلتا ہے اور دوسرا یہ کہ بعض ملکوں میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے، اس کو ایک گندی علامت سمجھا جاتا ہے اور وہاں اگر دیں تو وہ بھڑک اٹھتے ہیں لوگ۔ اب اس بے چارے کو کیا پتا کہ میں نے تو بہت پاکیزہ محبت کا اظہار کیا تھا اس نے کیا سمجھا ہے۔ تو اس لئے ہر قوم کے رسم و رواج کا علم بھی ضروری ہے اور ایک تبلیغ کرنے والی جماعت کے لئے یہ علم کا انتشار کل عالم میں اس طرح ہونا چاہئے کہ ہمیں ہر قوم کے مزاج، ان کی عادات، ان کی پسند، ان کی ناپسند کا علم ہوتا کہ ہم عالمی حیثیت سے ایک داعی الی اللہ کے طور پر ابھر سکیں۔ اس لئے یہ باتیں بھی بیان کرنی ضروری ہیں۔ پھر جب آپ شعراء کا ذکر کرتے ہیں تو ضروری تو نہیں کہ محض تقریر میں ہی ان کے شعراء کی بات ہو۔ بچے اچانک وہ نغمہ شروع کر دیں، کہیں بڑے اس آواز کو اٹھا لیں اور پھر آپ اس کے ترجمے بیان کریں۔

اور اس کے برعکس اپنی زبانوں میں بھی پروگرام بنائیں۔ یہ پہلو جو ہے اب تک بالکل تشنہ پڑا ہے اب ہم جب کہتے ہیں کہ ہم افریقہ کے لئے دو گھنٹے، کم از کم دو گھنٹے اس طرح ریزرو کرنا چاہتے ہیں کہ افریقن زبانوں ہی کی باتیں ہوں اور غیروں کے لئے ان کے ترجمے پیش ہوں۔ بجائے اس

کے کہ اصل مضمون اردو یا انگریزی میں ہو اور ترجمے دوسری زبانوں میں ہوں۔ تو ان زبانوں میں اگر آپ پروگرام بنائیں گے نہیں تو ہم کیسے آپ کو دکھا سکیں گے۔ اب یوگنڈا کی جو زبانیں مشہور ہیں، جو زیادہ کثرت کے ساتھ سنی اور سمجھی جاتی ہیں، بولی جاتی ہیں یا لکھی جاتی ہیں ان زبانوں میں ہمیں پروگرام ملنے چاہئیں لیکن ابھی تک یورپ کی طرف سے بھی پورے پروگرام نہیں مل رہے۔ سب سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ اگر کام ہوا ہے تو جرمنی میں ہوا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ناروے کو توفیق ملی ہے کہ وہ اس معاملے میں کافی سنجیدگی سے، دیانتداری سے پروگرام بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ فرانسیسی زبان میں ہمارے نوید مارٹی صاحب کو توفیق ملی ہے اور اب ہمارے جہانگیر صاحب جو مبلغ سلسلہ ہیں وہ بھی اس کام کو بڑھا رہے ہیں لیکن اکثر زبانوں میں ایک خلاء ہے، ایک تشنگی کا احساس ہے۔

پس نہ صرف یہ کہ ہمیں ایسی زبانوں میں پروگرام دیں جو انٹرنیشنلی (Internationally) سمجھی جانے والی زبانیں ہیں جہاں زیادہ تر احمدی ہیں مثلاً اُردو اور انگریزی میں اور اپنے ملک، اپنے ملک کی تاریخ، اپنے ملک کے ادب، اپنے ملک کے دینی حالات، ملک کی دینی جماعتیں، ملک کے علماء کا حال اور دینی تعلقات کے معاملات، اخلاقی حالات، یہ سارے مضامین ہیں جو بہت وسعت رکھتے ہیں۔ پھر جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے انڈسٹری، اقتصادیات، ان کی اخلاقی حالتیں، بین الاقوامی تجارتیں اور یہ سارے امور ہیں ان کے ذریعے آپ اپنے ملک کو باہر روشناس کرائیں گے مگر باہر کی دنیا کا علم آپ کو بھی تو پہنچنا چاہئے۔ جب تک آپ اپنی زبانوں میں باہر کی دنیا کا تعارف نہیں بنائیں گے اس وقت تک یوگنڈا میں براہ راست MTA سے وہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی جو اپنی زبان میں سن کر پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح سواحیلی ہے اس کا بہت وسیع اثر ہے اور سواحیلی میں ہمیں بکثرت پروگرام چاہئیں۔ اب وہاں تنزانیہ نے اللہ کے فضل سے اچھا دلچسپ پروگرام بنایا تھا مگر بالکل چھوٹا سا اور نہ کوئی احمدی مسجد دکھائی، نہ مبلغ کے آنے کا ذکر کیا، نہ وہ مراکز جہاں جماعت پھیلی ہے، نہ وہاں کے مبلغین اور ان کی خدمت کا کوئی تذکرہ، تو ملکی لحاظ سے تھوڑی سی چیزیں دکھا دینا کافی نہیں ہے۔ مراد یہ تھی کہ وسیع تر تعارف ہو اور ہو دلچسپ طریق پر۔ اب سیرالیون کے جو پروگرام ملے یا دوسری جگہوں کے ان میں وہ بات نہیں ہے جو میں نے خود جا کر وہاں دیکھی تھی۔ وہاں جب میں گیا ہوں تو ان کے بچے، وہاں کے بڑے از خود وارفتگی کے ساتھ جو اپنے دل کی خوشیوں کا اظہار، اپنے

جذبات کا اظہار کرتے تھے اس میں ایک ایسی زندگی تھی کہ وہ حیرت انگیز طور پر دل پر اثر انداز ہو جاتی تھی۔ان کا ناچنا وہ مغربی تہذیب کے ناچنے کی طرح نہیں ہے۔ان کا ناچنا اس کے زیادہ مشابہ ہے جیسا کہ مصلح موعودؓ کی پیش گوئی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا خوشی سے اچھلو اور کودو۔تو یہ سوچ لینا کہ ناچنا کودنا ہے ہی حرام بالکل ناجائز بات ہے، یہ بے وقوفی ہے۔ناچنا کودنا کیسا ہے۔کیا دکھاوے کا اور نفسانی خواہشات کے اظہار کا ہے یا بے ساختہ اچھی باتوں پر ایک خوشی کا پھوٹتا ہوا چشمہ ہے۔جیسے چشمہ ابلتا ہے،اس میں زیروبم پیدا ہوتے ہیں،اونچ نیچ ہوتی ہے۔اسی طرح انسانی بدن بھی بعض دفعہ خوشیوں کے ساتھ،خوشیوں کے جذبے کے مطابق اچھلتے بھی ہیں،کودتے بھی ہیں، پیچ وخم بھی کھاتے ہیں مگر اس میں بناوٹ نہیں ہوتی۔یہ بے ساختگی اور بناوٹ سے پاک ناچنا مجھے سب سے زیادہ افریقہ میں دکھائی دیا ہے۔وہاں قطعاً کوئی بھی جنسی پہلو اس میں نہیں ہے یعنی احمدیت کی دنیا جو افریقہ میں میں نے دیکھی ہے وہ اپنے اس طبعی شوق اور جذبے کو جو ان کی فطرت میں ودیعت ہے کہ آواز کے ساتھ بدن میں ضرور حرکت پیدا ہو اس عمدگی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں کوئی گندا پہلو نہیں مگر حسن کا پہلو بہت نمایاں ہو کے ابھرتا ہے۔مثلاً خوش آمدید میں آپ بعض دفعہ ہاتھ اونچے کر دیتے ہیں مگر رومال کو لہراتے وقت بدن بھی ساتھ لہراتے جائیں اسی طرح اور پتا بھی نہ ہو لہرانے والے کو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔یہ نظارے جو ہیں ساتھ اس کے نغمے الاپے جارہے ہوں اور ان کی لے کے مطابق رومال بھی حرکت کریں،بدن بھی حرکت کریں اب کوئی اس کو ناجائز نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ ایک طبعی فطرت کے پاکیزہ اظہار ہیں اور اگر یہ ان کو وہ نہ کریں تو پھر دوسرا گند رہ جائے گا باقی۔

افریقن میوزک کا اور بدن کی حرکت کا ایسا عاشق ہے اور اس طرح بے ساختہ اس کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اسے دبایا جا ہی نہیں سکتا۔صرف یہ سوال ہے کہ اس رستے پر چلایا جائے یا اس رستے پر چلایا جائے۔تو جو دین کا رستہ ہے اس پر چلیں اور وہاں بھی جس حد تک ممکن ہے کچھ ان کی تادیب ہو، کچھ ان کو ادب سکھایا جائے کہ اتنا زیادہ بھی نہ کیا کرو۔عورتیں اگر کرتی ہیں تو ان کو کہا جائے کہ ایک حد ہے اس سے زیادہ نہ نکلو۔مگر یہ کہ اس جذبے کو ختم کر دیا جائے یہ ممکن نہیں ہے۔کوئی دنیا کی طاقت یہ نہیں کر سکتی۔یہ بعض قوموں کے فطری جذبے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرما رکھے ہیں۔ان کو ان سے کھینچ کر نکالا نہیں جا سکتا۔پس ان کا اظہار کہیں دکھائی نہیں دیا یعنی یوگنڈا

کی فلم میں سکول ہی دکھایا جارہا ہے، لیبارٹری دکھائی جارہی ہے۔ کیا یوگنڈا اسے اچھی لیبارٹری اور کہیں موجود نہیں ہے۔ اس میں کیا دلچسپی ہے ہمیں۔ ہاں سرسری طور پر بتا دیتے کہ یہ لیبارٹری باقی سب سے بہتر ہے اور خدا نے احمدیت کو توفیق بخشی، بات ختم کرتے۔ یوں لیبارٹری میں داخل کیا ہے باہر نکلنے کا رستہ ہی نہیں دکھایا یہاں تک کہ میں نے کہا کہ آئیے ہم کہیں اور چلتے ہیں۔

پس جب فلم بناتے ہیں تو سوچا تو کریں۔ یہ سوچا کریں کہ آپ پر اگر یہ فلم ٹھونسی جائے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ ایسی فلم بنائیں کہ جب آپ اسے دیکھنے لگیں تو پھر نظریں الگ نہ ہوسکیں، اٹھ نہ جائیں اور ہر تعلیم میں دلچسپی کا پہلو پیدا کرنا یہ ہمارا اوّلین فریضہ ہے ورنہ دنیا کے مقابل پر ہم مات کھا جائیں گے اور اللہ کے فضل سے بہت حد تک خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ توفیق بخشی ہے کیونکہ جب غیر مجھے لکھتے ہیں کہ ہم نے MTA دیکھنا شروع کیا تو پھر نظر الگ نہیں ہوتی تھی اور اب اس کی عادت پڑ گئی ہے تو وہ جو احمدی نہیں جو مسلمان بھی نہیں جو عیسائی ہیں یا بعض ہندو بھی ان میں شامل ہیں جب وہ یہ باتیں لکھتے ہیں تو پھر یہ ایک تصدیق ہے کہ واقعۃً ہمارے پروگرام میں کوئی نہ کوئی جذب ضرور ہے اور وہ جذب اصل میں سچائی کا جذب ہے۔ پروگراموں میں لطف پیدا کرنے کے وقت بناوٹ نہ آنے دیں جہاں آپ کے پروگراموں میں بناوٹ آ گئی وہاں یہ پروگرام مر جائیں گے اور اکثر لوگ یہ تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ہم کیوں ان پروگراموں کو پسند کر رہے ہیں کیوں دوسروں کو نہیں کرتے یا کرتے ہیں تو دل اتر گیا ہے ان سے۔

اصل بنیادی وجہ یہ ہے کہ احمدیت کے پروگرام جو MTA پر دکھائے جاتے ہیں ہماری کوشش یہ ہے کہ وہ سارے زندہ ہوں اور ہر طرح کی بناوٹ سے پاک ہوں۔ غلطیاں بھی ہوں تو غلطیوں کی معافی مانگ لی جائے۔ اگر تصحیح بھی کرائی جائے تو سب کے سامنے کروائی جائے۔ پس آپ نے کئی دفعہ دیکھا ہوگا پروگرام میں بیٹھا ہوں ساتھ کہہ رہا ہوں جی اچھا یہ نہ کرو وہ کرو۔ کبھی دنیا میں ایسے پروگرام کہیں اور بھی دیکھے ہیں آپ نے کہ ٹیلی ویژن جاری ہے اور وہاں تصحیح ہو رہی ہے اور ادائیں بتائی جارہی ہیں یہ نہیں کرنا وہ کرنا ہے لیکن اس میں اپنا ایک مزہ ہے اور یہ وہ مزہ ہے جو کہیں اور آپ کو نہیں ملے گا کہ سچائی جس طرح پھول کھلتا ہے اس طرح کھل رہی ہے۔ اس کا ہر پہلو دکھائی دے رہا ہے اور پھولتا ہوا پھیلتا ہوا، پھولتا، پھلتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں MTA کی جو

آپ کے تمام پروگراموں میں ہمیشہ باقی رہنی چاہئیں اور ان کے بغیر MTA دنیا کے دل جیت نہیں سکتی مگر جیت رہی ہے خدا کے فضل سے حالانکہ خامیاں بھی بہت ہیں۔ میری دعا یہ ہے کہ آپ سب کو تمام دنیا کے احمدیوں کو اپنے اپنے ملک اور علاقوں کے پروگرام بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اب چین میں بھی ہمارے احمدی بس رہے ہیں ان سے میں نے کہا تھا جماعت آپ کو کہاں کیمرے لے لے کے دے گی ہر جگہ سے۔ آپ میں کھاتے پیتے لوگ ہیں اپنا کیمرہ خود خریدیں اور ہم سے یہ پوچھ لیں کہ کون سا خریدا جائے۔ اب مجھے اطلاع ملی ہے کہ میری اس نصیحت کے بعد کیمرہ خریدا گیا ہے اور تجربے کریں۔ مگر چین جیسے ملک میں تو بے شمار واقعات ہیں جو ماضی میں پھیلے پڑے ہیں۔ ان کے ماضی کو ہی اگر ٹیلی ویژن پر ان کے باقیات کے حوالے سے دکھایا جائے تو بہت عظیم الشان مضمون ہے۔ دیوار چین کب بنی، کیسے بنی، اس کے مناظر کہاں سے کہاں تک پھیلے ہیں۔ کبھی آپ کو جنوب میں دکھائی پڑے گی۔ کبھی شمال میں دکھائی پڑے گی اور اندازہ کریں کہ وہ تین ہزار میل کے قریب لمبی دیوار ہے۔ اتنی چوڑی کہ اس کے اوپر بگھیاں دوڑتی ہیں اور مسلسل چلتی چلی جاتی ہیں اور پہاڑیوں کی بلندیوں پہ چڑھتی ہے، کھڈوں کی گہرائیوں میں اترتی ہے اور مسلسل جاری ہے اور اتنی مضبوط ہے کہ دشمن پھر اس کو توڑ کر چین پر حملہ آور نہیں ہوسکا۔

اب یہ جو مضمون ہے اپنی ذات میں اس کا ایک تاریخی پہلو بھی ہے اور اس مضمون کو اس دیوار کے ساتھ بھی لگایا جاسکتا ہے جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے کہ یاجوج ماجوج کے خطرے سے بچنے کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک بادشاہ کو توفیق عطا فرمائی تھی اور وہ کون بادشاہ تھا۔ حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں خورس تھا، دارا نہیں تھا اور جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے ایک ذرّہ بھی مجھے شک نہیں کہ وہ خورس ہی تھا اور خورس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ جس کی اتنی تعریف بائبل میں کی گئی ہو اور اس کی عظمتوں کے ذکر کے ترانے غیر مذہب کی کتاب گا رہی ہے جس کا اس کے ساتھ تعلق نہیں ہے اور پھر خدا اس کو توفیق بھی بخشتا ہے اسرائیل کی خدمت کرنے کی اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس نے بہت دور دور کے سفر کئے اس نے بھی دیواریں بنائی ہیں۔ تو یہ تحقیق کہ آیا چین کی دیوار پر کیا اس کا بھی کوئی اثر تھا کہ نہیں۔ جہاں تک زمانے کا تعلق ہے یہ دیوار اتنی پرانی ہے کہ ممکن تو ہے کہ اسی کے دور میں بنی ہو لیکن براہ راست یا بالواسطہ اس کا اثر تھا کہ نہیں یہ بھی ایک تحقیق طلب امر ہے۔

تو ہر ٹیلی ویژن کے پروگرام کے پیچھے ایک تحقیق ہونی چاہئے اور صرف ظاہری نظاروں پر اس کو کھڑا نہ کریں۔ میں نے ملکوں سے درخواست کی تھی جہاں جہاں میں گیا کہ اپنے بچوں، بچیوں کو لڑکوں کو بڑوں کو بعض تحقیقات کے لئے وقف کریں اور ان کو معین کام دیں کہ یہ ٹیلی ویژن ہم نے بنانی ہے، ٹیلی ویژن کے لئے یہ پروگرام بنانا ہے اور اس کے لئے ہمیں اس اس تحقیق کی ضرورت ہے اور اس میں جب میوزیم آپ دکھاتے ہیں تو جب تک پتا نہ ہو کہ یہ میوزیم کن کن چیزوں کو سمیٹے ہوئے ہے، ان کا پس منظر کیا تھا آپ کا محض تصویریں دکھا دینا تو کوئی کام کی بات نہیں ہے۔ پس گھر بیٹھے دنیا کے ہر احمدی کو تمام دنیا کی وہ باتیں معلوم ہوں جن کا معلوم ہونا انسان کے علم میں بھی اضافہ کرتا ہے اور اس کے لطف میں بھی اضافہ کرتا ہے اور اسے ایک بہتر داعی الی اللہ بنانے میں بھی مددگار ہوتا ہے۔

یہ پروگرام ہیں جو صرف انگلستان کے خدمت کرنے والے پورے نہیں کر سکتے۔ لازم ہے کہ تمام دنیا کی جماعتیں مددگار ہوں اور ہر جگہ لوگ یہ اپنے آپ کو لگن لگا بیٹھیں کہ ہم نے بہترین، دلچسپ اعلیٰ درجے کے معلوماتی پروگرام اور پھر نغماتی پروگرام دنیا کے سامنے پیش کرنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔ اب جلسے سے پہلے وقت تو تھوڑا رہ گیا ہے مگر چونکہ براہ راست سب سن رہے ہیں کوئی نہ کوئی نمونے کی فلم ضرور بنا کے لائیں۔ وہ دو چار دن میں بھی بن سکتی ہے تا کہ وہ آپ کی طرف سے ہم پیش کریں اور پھر آپ کو بتا سکیں کہ اس میں کیا کیا نقائص ہیں۔ آئندہ جب آپ وڈیو تیار کریں تو ان باتوں کا خیال رکھیں۔ پس جو تحفہ لانا ہے ان میں سے ایک یہ تحفہ ضرور ہو۔ بیعتوں کا تحفہ تو اول ہے لیکن نمبر دو یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی وڈیوز آپ کے ملک کی نمائندگی کرتی ہوئی آپ کے ساتھ آئیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جماعت احمدیہ میں مہمان نوازی کا ایک ایسا جذبہ ہے جس کی نظیر دنیا میں کوئی جماعت پیش نہیں کرسکتی۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 19 / جولائی 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٥﴾ إِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٦﴾ فَرَاغَ إِلٰٓى أَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٧﴾ فَقَرَّبَهٗٓ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُوْنَ ﴿٢٨﴾

(الذاریات: 25 تا 28)

پھر فرمایا:

جلسہ سالانہ UK کے دن بہت قریب آگئے ہیں اور یہ وہ جلسہ سالانہ ہے جو ایک عالمی نوعیت اختیار کر چکا ہے۔ سب جلسے بہت اچھے ہوتے ہیں محض اللہ کی خاطر دور دور سے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں بہت سے فوائد باہمی محبت کے ذریعے بھی بڑھتے ہیں اور دیگر روحانی اور آسمانی برکات بھی بکثرت نازل ہوتی ہیں۔ جرمنی کا جلسہ بھی بہت غیر معمولی نوعیت اختیار کر چکا ہے کینیڈا کا بھی اپنا رنگ رکھتا تھا امریکہ کا بھی، دور دور سے مہمان آتے ہیں اور ان سے مل کر محبتیں تازہ ہوتی ہیں پرانی یادیں پھر تازہ ہو جاتی ہیں اور آئندہ کے لئے گویا زادراہ مل جاتا ہے۔ بعض جلسے ایسے ہیں اتنا روحانی زاد چھوڑ جاتے ہیں ایسی غذا پیچھے چھوڑ جاتے ہیں کہ سارا سال یادوں میں ان کو کھایا جاتا ہے اور وہ ختم نہیں ہوتیں۔ مگر UK یعنی United Kingdom کا جو جلسہ ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ اس کثرت سے دور دراز سے، مشرق و مغرب، شمال و جنوب سے دنیا کے کسی جلسے میں لوگ اس

طرح اکٹھے نہیں ہوتے جیسے انگلستان کے جلسے میں آتے ہیں اس لئے اس پہلو سے اسے ایک مرکزیت حاصل ہوگئی ہے اور وہ آتے ہیں جن کا انتظار رہتا ہے۔ بعض چہرے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ خاص طور پر اپنے مظلوم بھائی ،مظلوم بہنیں ،مظلوم بچے جو پاکستان سے آتے ہیں۔ اترے ہوئے ،دکھے ہوئے چہرے آتے ہیں تو کھلکھلا اٹھتے ہیں۔ نئی زندگی ،نئی تازگی پیدا ہوتی ہے۔ خوشیاں بھی لاتے ہیں غم بھی لاتے ہیں اور بیک وقت ایسی کیفیت میں وقت گزرتا ہے کہ اس کا بیان ممکن نہیں لیکن جلسے کی عادت یہ ہے کہ مدتوں انتظار کراتا ہے راہ دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ جب آتا ہے تو ایسے گزر جاتا ہے جیسے پلک جھپکنے میں نکل گیا۔ یہ وصل کی کیفیت کا حال ہے اور محبت کے طبعی تقاضے ہیں۔ ایک ایسی ہی کیفیت کو بیان کرنے کے لئے میں نے ایک دفعہ، اپنے ایک شعر میں یوں کوشش کی تھی کہ

لمحات وصل جن پہ ازّل کا گمان تھا
چٹکی میں اڑ گئے وہ طُیورِ سُرورِ شب

(کلام طاہر: 111)

یعنی وہ لمحات وصل کے جب تھے تو لگتا تھا کہ ازل آ گئی ہے، وقت ٹھہر گیا ہے اور جب گزرے تو یہ رات کے پرندے لگتا تھا کہ چٹکی میں اڑ گئے۔

تو امر واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ کیفیت ہے جو بعض ازلی صداقتوں کی طرف انسان کے ذہن کو منتقل کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس مضمون پر غور کرتے ہوئے مجھے جنت کی ازل کی حقیقت سمجھ آ گئی اور جہنم تھوڑے وقت کے ہونے کے باوجود کیوں لامتناہی دکھائی دے گی اور کیوں جہنم کو بھی ابدی کہا گیا ہے وہ راز بھی سمجھ میں آ گیا۔ جنت کا ہمیشہ ہمیش کے لئے ہونا ایک لازمی حقیقت ہے جس کے سوا چارہ نہیں ہے کیونکہ اگر دنیا میں انسانی وصل کے تجارب اتنا گہرا اثر انسان پر چھوڑتے ہیں کہ آنے والوں کی موجودگی میں تو وقت لگتا ہے ٹھہر گیا ہے، ہمیشہ کے لئے یہی وقت ہے اس سے زیادہ آگے اور پیچھے کا کوئی دھیان باقی نہیں رہتا اور جب گزرتا ہے تو یوں لگتا ہے آناً فاناً گزر گیا ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہرا۔ اگر وصل الٰہی ،جس کو دنیا کے وصل کے مقابل پر ایک لامتناہی عظمت حاصل ہے اس کی رفعتوں کا انسان تصور نہیں کر سکتا، اس کا سوچیں اگر وہ کسی محدود عرصے کے لئے جنت ہوتی تو وہ جنت

جو لطف لاتی جب جاتی تو جتنے دکھ دے جاتی اس کا کوئی تصور بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ایک دنیا کے محبوب کی جدائی سے دیکھو کتنا دکھ پہنچتا ہے۔ چند لمحے کے وصل کی گھڑیاں جو سکھ لاتی ہیں وہ بعض دفعہ عمر بھر کا دکھ پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔

یہ وہ فلسفہ ہے ازل اور ابد کا جس کی حقیقت ہمیں قرآن کریم کے **مابعد الموت** کے پیش کردہ مناظر سے سمجھ آتی ہے۔ جتنا بڑا دکھ ہو جتنی شدید تکلیف ہوا تنا ہی وقت لمبا ہو جاتا ہے اور اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔بعض دکھ کی راتیں لگتا ہے ساری زندگی پر محیط ہوگئی ہیں اور سُکھ کی زندگیاں جب ختم ہوتی ہیں تو انسان کہتا ہے:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کچھ بھی نہیں رہا چند دن کی باتیں تھیں اور پھر بعض شعراء خدا کو (خواجہ میر درد)

طعنے دیتے ہیں:

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے (فیض احمد فیض)

یہ دو چار دن کی زندگی یہی دی تھی نالیکن جب گزر گئی تو دنیا کے عیش کی کچھ سمجھ نہیں آتی کہاں چلا گیا سوائے ان بداثرات کے جو باقی رہ جائے کچھ پیچھے چھوڑ کر نہیں جاتا۔

تو ازل کی محبت اور ازلی محبوب سے یہ دو لازم وملزوم چیزیں ہیں۔اس لئے جنت لامتناہی بھی ہوگی تو وہ بور نہیں کر سکتی اس سے انسان اکتاہٹ محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اصل اکتاہٹ کا فلسفہ تعلق کی کمی میں ہے اور جو شخص بھی تعلق رکھنے کے باوجود پرانا ہو جائے اور اس کی جاذبیت ختم ہو جائے وہ شخص اکتاہٹ پیدا کرنے لگتا ہے۔ایک اللہ کی ذات ہے جس کا تعلق نہ صرف یہ کہ بے انتہا لذتیں لاتا ہے، لامتناہی سرور بخشتا ہے جیسے قرآن کریم فرماتا ہے تم اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے، ناممکن ہے۔مثالیں ہم دیتے ہیں مگر تمہارے لئے ممکن نہیں کہ سوچ سکو کہ وہ چیز کیا ہے۔نعماءِ جنت کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا۔وہ دراصل محبت کی جنت ہے اور اس محبت کا دائمی ہونا ایک لازمی نتیجہ تھا۔پس اس پہلو سے جنت کے ازلی ہونے کی سمجھ آگئی اور پھر یہ کہ جب محبوب اپنے حسن میں بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہو پھر تو کسی جگہ اس کا انقطاع ممکن نہیں۔غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (حٰم السجدہ:9) کے سوا کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔پس یہی ہے اللہ تعالیٰ نے جو نتیجہ نکالا کہ یہ وہ جنت ہوگی تمہاری جزا کی جو غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ہے۔وہ کاٹی جا ہی نہیں سکتی۔جہاں بھی کاٹی

جائے گی تمہیں یوں لگے گا جیسے آناً فاناً گزر گئی۔

لیکن جہنم کا ابدی ہونے کے باوجود ابدیت کا معنی اور ہے۔ جہاں ایک ایک لمحہ ایک عذاب دکھائی دے اور یوں محسوس ہو کہ ساری عمر دکھ ہی کاٹے ہیں۔ چنانچہ بہت سی ناشکری عورتیں خاوند کے ہاتھوں اگر کوئی ظلم دیکھ لیں تو کہتی ہیں ہم نے تو ساری عمر دکھ ہی کاٹے ہیں۔ ہوسکتا ہے مبالغہ بھی ہو لیکن ہوسکتا ہے ایک طبعی مجبوری کی کیفیت کا نام ہو۔ وہ طبعی مجبوری کی کیفیت یہ ہے کہ دکھ کا زمانہ لمبا لگتا ہے اور احسان کا زمانہ چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ اس مضمون پر غور کرتے ہوئے اس طرف بھی توجہ جاتی ہے کہ ہم خدا کے احسان کا شکریہ ادا کرنے کی کما حقہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ نہیں اور اس کے احسان تو اتنے محیط ہیں کہ ان کے محیط ہونے کی وجہ سے وہ نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں اور یاد کرانا پڑتا ہے ایک ایک لمحے کی یاد دلانی پڑتی ہے اور ان کا شکر ادا نہ کرنے کا رجحان انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک حد تک تو یہی نفسیاتی مجبوری ہے کہ جو انسان بعض احسانات میں ڈوب جائے وہ رفتہ رفتہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا روزمرّہ زندگی کا حق ہے۔ ہاں جب احسان کا ہاتھ کھینچا جاتا ہے تب سمجھ آتی ہے کہ احسان کس کو کہتے ہیں۔

ایک صاحب تشریف لائے کل، بیماریوں کے سلسلے میں لوگ آتے رہتے ہیں کہ رات گردے کی بہت تکلیف تھی، رات ہی نہیں کٹتی تھی۔ کسی کو دانت کی تکلیف ہوئی تو ساری رات عذاب میں گزری، زمانہ ٹھہر گیا۔ تو دکھ بھی ٹھہر جاتے ہیں مگر تھوڑے ہوں تب بھی بہت لمبے دکھائی دیتے ہیں۔ جب گزرتے ہیں تو ان کی یاد کا دکھ ختم نہیں ہوتا اور سرور کی اور کیفیت ہے۔ پس ہمارے جلسے بھی اسی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیکھا بھی نہیں تھا کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا، گزر گیا۔ پس جتنے بھی لمحات ہیں ان کی قدر کریں اور جو مقامی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت خدمت کرتے ہیں، غیر معمولی اور مجھے کبھی جماعت U.K سے یہ شکوہ نہیں ہوا کہ انہوں نے جو خدمت کا حق تھا اس میں کمی کی یا عمداً ان سے کوتاہی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود مہمان کا دل نازک ہوتا ہے اور مہمان کی عظمت کا اور اس کی عزت کا جو تصور قرآن کریم نے پیش فرمایا ہے اس کا ذکر چند آیات میں ملتا ہے جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی تھیں۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ کیا تجھ تک ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔ وہ معزز تھے مگر فرمایا قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ اجنبی لوگ تھے۔ تو مہمان اپنی

اجنبیت میں بھی معزز ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو قرآن کریم کا یہ بیان ہمیں سکھا گیا اور حضرت ابراہیمؑ کا حال دیکھیں فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ یہ نہیں پوچھا کھانا کھانا ہے کہ نہیں، بھوکے ہو کے نہیں۔ اجنبی مہمانوں سے یہ سلوک ہے۔ جو اپنے پیارے جن کا انسان منتظر ہو وہ آئیں تو پھر کتنا اس سے بڑھ کر دل کے طبعی جوش سے ان کا اعزاز ہونا چاہئے۔ یہ پتا ہی نہیں کیا کہ تم ہو کون لوگ اجنبی لوگ تھے جا کے بچھڑا تیار کیا، ذبح فرما دیا اور فَقَرَّبَہٗٓ اِلَیْھِمْ پیش کیا اور حیرت سے پوچھا اَلَا تَاْکُلُوْنَ کھاؤ گے نہیں تم۔

اب یہاں مُّنْکَرُوْنَ کا معنی ایسا اجنبی جس سے انسان خوف کھاتا ہو اس جگہ درست نہیں ہے کیونکہ ان کی وہ خوف والی اجنبیت کا علم بعد میں ہوا ہے۔ پہلی اجنبیت تھی وہ ان کی ذاتی اجنبیت تھی، ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ان سے آشنائی نہیں تھی اور تھے وہ مُّنْکَرُوْنَ۔ تب ہی بسا اوقات میں مغرب کے خطبات میں یہ نہیں کہتا کہ معزز مہمانو اور دوسرے مہمانو! میں کہتا ہوں تم سارے معزز مہمان ہو کیونکہ قرآن کریم کی اصطلاح میں مہمان کے لئے معزز ہی کا لفظ ہے اپنا ہو یا پرایا ہو، اجنبی ہو یا دیکھا بھالا ہو سب مہمان معزز ہیں۔ اس پہلو سے جس حد تک بھی ممکن ہے مہمانوں کی خدمت کرنا لازم ہے مگر یہ خیال کہ ہم نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ یہ کافی نہیں ہے کیونکہ بعض مہمان اپنی نزاکتیں ساتھ لے کے آتے ہیں اور جتنا وہ خود مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ کی اپنے لئے توقع رکھتے ہیں۔ پھر بہت سے ایسے مہمان ہیں ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دیکھو ہم کتنی دور سے چل کے آئے ہیں، کتنی محنتیں کیں، کتنے کتنے دن ویزوں کے لئے گزار دیئے، انتظار میں Que میں لگے بیٹھے رہے تو یہ ان کی یادیں واقعۃً ان کے اندر صحیح جذبہ پیدا کرتی ہیں کہ ہم ایسے مہمان نہیں کہ ہمیں یونہی السلام علیکم اور جزاک اللہ کہہ کے ٹال دیا جائے، ہماری پوری عزت ہونی چاہئے۔ محض للّٰہ آئے ہیں اور اس پہلو سے اللہ کے مہمان ہیں اور اللہ کے مہمانوں کا حق باقی مہمانوں سے زیادہ ادا ہونا چاہئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا، مہمانوں کے انتظام میں مہمان نوازی کی نسبت یہ فرمایا:

''میرا ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کسی مہمان کو تکلیف نہ ہو بلکہ اس کے

لئے ہمیشہ تاکید کرتا رہتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے مہمانوں کو آرام دیا جائے۔ مہمان کا دل مثل آئینہ کے نازک ہوتا ہے اور ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔‘‘

یہ ہے وہ مہمان کی خصوصیت اور اس کے لئے ایک نفسیاتی وجہ موجود ہے۔ وہ اپنے گھر نہیں ہوتا دوسرے کے گھر ہوتا ہے اور اپنے گھر کی تکلیفوں کو وہ روزمرّہ کا اپنا ایک معمول سمجھتا ہے لیکن جب دوسرے کے گھر جائے تو یہ ایک نفسیاتی خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں بے طلب کا مہمان تو نہیں، کہیں میں ایسا مہمان تو نہیں جس کو یہ چاہتے نہیں تھے۔ اس لئے وجہ بے وجہ نفس بہانے ڈھونڈ لیتا ہے، اس کو ڈراتا ہے کہ دیکھا تم یہاں پسندیدہ مہمان نہیں ہو۔ تمہاری جو خدمت ہونی چاہئے تھی وہ نہیں کی جارہی، معلوم ہوتا ہے تمہیں چاہتے نہیں یہ لوگ۔ تو جو خوف ہیں نفسیاتی خوف وہ طرح طرح کے قصے گھڑ لیتے ہیں۔ پس یہ بھی وجہ ہے اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جس کی وجہ سے مہمان کی عمومی صفت یہ ہے کہ وہ نازک دل ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں شیشے کی طرح نازک ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

’’۔۔۔اس سے پیشتر میں نے یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ خود بھی مہمانوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا مگر جب سے بیماری نے ترقی کی اور پرہیزی کھانا کھانا پڑا تو پھر وہ التزام نہ رہا۔ ساتھ ہی مہمانوں کی کثرت اس قدر ہوگئی کہ جگہ کافی نہ ہوتی تھی اس لئے بمجبوری علیحدگی ہوئی۔ ہماری طرف سے ہر ایک کو اجازت ہے کہ اپنی تکلیف کو پیش کر دیا کرے۔ بعض لوگ بیمار ہوتے ہیں ان کے واسطے الگ کھانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔‘‘ (ملفوظات جلد سوم:292)

یہ جو مضمون ہے اس پر غور کرنا چاہئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں کتنے مہمان ہوا کرتے تھے۔ چند تھے مگر اپنے گھر میں رکھنے کے شوق میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑتے تھے اور پھر وہ کثرت ایسی ہوئی کہ اپنے گھر میں نہیں رکھے جا سکے تو مہمانوں میں پہنچتے تھے اور مہمان خانوں میں بھی پہنچنے کے باوجود حضرت مسیح موعود علیہ السلام ذاتی توجہ نہیں دے سکتے تھے ہر ایک کی طرف۔ اس لئے اب تو یہ معاملہ بہت آگے جا چکا ہے لیکن اللہ کے فضل سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعاؤں کی قبولیت کا نشان ہے اور آپؑ نے جس رنگ میں مہمان نوازی

میں تربیت فرمائی کہ جو کچھ آپ چاہتے تھے اب ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ساری دنیا میں جماعت میں مہمان نوازی کا ایک ایسا جذبہ ہے کہ جس کی کوئی مثال دنیا میں کوئی جماعت پیش نہیں کرسکتی۔حیران کن ہے۔اتنی تکلیفیں اٹھاتے ہیں مہمان کی آمد کے انتظار میں اوراس کی سہولت کی خاطر کہ جب میں ان کے وقار عمل دیکھتا ہوں، جب بچوں کو دیکھتا ہوں بڑوں کو،عورتوں کو،مردوں کو بعض کئی کئی مہینے سے مسلسل اپنے آنے والے مہمانوں کے انتظار میں وہ خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو احتیاطاً ان کو تکلیف سے بچانے کے لئے اور آرام پہنچانے کے لئے کرنی پڑتی ہیں۔وہ انتظامات خود اپنے ہاتھ سے درست کرتے ہیں۔ہاتھ سے اس لئے کہ ہمارے پاس مہمان نوازی کے لئے جذبے تو بہت ہیں لیکن پیسہ اتنا زیادہ نہیں کہ ہر کام پیشہ وروں سے کرواسکیں اوراگر وہ ہوتا تو اچھا نہ لگتا کیونکہ جو لطف اپنے ہاتھ سے مہمان کی خدمت کا ہے وہ پیشہ وارانہ کام سے ممکن ہی نہیں ہے۔اس لئے شروع شروع میں تو یہی دقت شاید ہو مگر میں نے تجربے سے محسوس کیا ہے کہ خدا کی تقدیر یہ ہے۔جن کاموں میں روپے کی ضرورت پڑے بے شمار عطا فرماتا ہے۔تو وہ ہمیں اسی طرح دیکھنا چاہتا ہے کہ مہمان کی خدمت کے لئے روپے پر انحصار نہ ہو، ذاتی قربانی پر انحصار ہو اور جو لطف اس خدمت کا ہے وہ کسی اور خدمت میں ممکن نہیں ہے۔میں نے دیکھا ہے مہمان نوازی کے تعلق میں اگر کسی مہمان سے تعلق ہو تو گھر والی خود صفائیاں کرتی پھرتی ہے۔نوکر ہوں بھی تو اعتماد نہیں کرے گی۔وہ ایک ایک چیز کو خود دیکھے گی،خود سلیقے سے لگائے گی اور چند لمحے ہیں مہمان نوازی کے جو آیا اور گزر بھی گیا لیکن اس کی دیکھیں تیاریاں کیسی کی جاتی ہیں اور یہ محبت کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور محبت کے علاوہ اس سلیقے کے نتیجہ میں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہمیں بخشا ہے مہمان نوازی کے لئے آپؑ کی مثالیں حیرت انگیز ہیں کس طرح آپ مہمان نوازی کیا کرتے تھے۔بعض دفعہ پڑھتے وقت آنکھوں سے جذبات کا سیلاب اُمڈ جاتا ہے۔سردی کی راتیں،اتنی سخت راتیں کہ مہمانوں کے لئے وہ راتیں برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔مطالبے آرہے تھے کہ یا حضرت وہاں تلائی کم ہوگئی وہاں رضائی کم ہوگئی وہاں کمبل کی ضرورت ہے آپ گھر سے سب کچھ بانٹتے چلے گئے۔آخر ایک دفعہ ایک اطلاع دینے والے نے آکر کمرے میں دیکھا تو آپ اپنا جبہ لے کر کرسی پر پڑے ہوئے تھے کوئی چیز گھر میں سونے کے لئے اپنے اوپر اوڑھنے کے لئے نہیں تھی۔آپؑ نے فرمایا کہ یہی کچھ ہے۔اللہ کا

کتنا احسان ہے کہ اسی میں مجھے آرام اور سکون مل رہا ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مہمان نوازی کی لطافتیں آپ دیکھیں تو عقل حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔کیسی لطافت تھی کیسی باریکیاں تھیں اس مہمان نوازی کی۔

پس وہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جذبے ہیں جو آسمان سے اب احمدیوں پر فضلوں کی صورت میں نازل ہو رہے ہیں اور دنیا میں ایک ایسی جماعت رونما ہوئی ہے جس کے متعلق انسان یقین سے کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم مہمان نوازی میں اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔موسم بدلتے ہیں تکلیفیں آتی ہیں کبھی اچھے موسم، کبھی برے موسم، کبھی سردیاں زیادہ، کبھی گرمیاں زیادہ، کبھی آندھی، کبھی جھکڑ چل رہے ہیں مگر احمدی مہمان نوازی پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔وہ ہر بدلتے ہوئے وقت کی تکلیفیں خود اپنے اوپر لیتا ہے اور مہمان کی خدمت میں ہمیشہ، ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔ان روایتوں کو آپ زندہ رکھیں کیونکہ یہ وہ روایتیں ہیں جن کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ پرانے انبیاءؑ کی باتیں محض عام نصیحتوں کے لئے نہیں بلکہ بعض محبت کے جذبوں کی وجہ سے بھی محفوظ فرماتا ہے اور جن انبیاءؑ سے زیادہ پیار ہے ان کے ذکر میں بسا اوقات محبت کے تذکرے زیادہ چلتے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ بات لمبی ہو رہی ہے ضرورت کیا تھی اتنی لمبی بات کی لیکن جب محبت ہو تو پھر باتیں لمبی کی جاتی ہیں۔حضرت موسیٰؑ کے ساتھ دیکھیں بات ختم ہوئی ایک دفعہ کہہ دی لیکن اللہ تعالیٰ اس کو کرتا چلا جاتا ہے کہ اس نے یوں کیا، پھر اس نے یوں کیا، پھر اس طرح ڈرا، پھر ہم نے اس طرح بلایا۔وہ پیار کے قصے ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی اکثر پیار کے طویل نقشے ہیں جو کھینچے گئے ہیں اور اس آیت میں بھی یہی مضمون ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھ کے سنایا۔خدا کے پیار کی نظر اس پہ پڑی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پیار کی نظر صرف انبیاءؑ پہ نہیں پڑتی عامۃ الناس کے سلوک پر بھی پڑتی ہے۔آنحضرت ﷺ نے اس کے متعلق بہت سے واقعات میں بعض دفعہ مثالیں دے کر مہمان نوازی کا ذکر فرمایا ہے، بعض دفعہ نصیحتیں کر کے، بعض دفعہ نصیحت پر عمل جس طرح ہوا اس پر خدا تعالیٰ نے جو آپؐ کو خبریں دیں ان کا ذکر فرما کر مہمان نوازی کی عزت افزائی فرمائی۔

یہ واقعہ آپ کو کئی دفعہ سنایا جا چکا ہے مگر بعض واقعات ہیں جن کی لذّت کم ہو ہی نہیں سکتی۔جتنی دفعہ چاہیں سنیں وہ زندہ واقعات ہیں اور جس طرح ایک انسان زندہ ہو اور محبوب ہو آپ یہ

تو نہیں کہتے کہ تم کل بھی آئے تھے، پرسوں بھی آئے تھے اب پھر کیا کرنے آ گئے ہو، وہ جب بھی آتا ہے اچھا لگتا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ کی زبان سے مہمان نوازی کے پیارے واقعات کبھی پرانے ہو ہی نہیں سکتے، کم سے کم میرے دل پہ تو کبھی بھی انہوں نے یہ اثر نہیں ڈالا کہ ہم نے کئی دفعہ سنا ہے اب کیا ضرورت ہے۔ پس میں جب تکرار کیا کرتا ہوں تو مجبوراً کرتا ہوں مجھے پتا ہے کہ جس طرح مجھے لطف آ رہا ہے سب کو آئے گا اس لئے ایسی تکرار اچھی لگتی ہے۔ یہ واقعہ بھی ویسا ہے جو چاہیں لاکھ بار آپ سنائیں اور سنیں اس کی لذّت ختم نہیں ہو سکتی۔

بخاری کی حدیث ہے کتاب مناقب الانصار سے باب **ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصتہ** وہ اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں **ولو کان بھم خصاصتہ** خواہ ان کو خود بھوک کی تنگی مشکلات میں مبتلا کئے ہوئے ہو۔ خصاصہ ایسی حالت کو کہتے ہیں جب خرچ کرنے کے لئے کچھ نہ ہو، کچھ دینے کے لئے نہ ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ خود وہ تنگی محسوس کر رہے ہوں پھر وہ دوسروں پر اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں۔

حضرت ابوھریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مسافر حضور ﷺ کی خدمت میں آیا۔ آپؐ نے گھر کہلا بھیجا کہ مہمان کے لئے کھانا بھجواؤ۔ جواب آیا کہ پانی کے سوا گھر میں کچھ نہیں۔ اس سے آنحضرت ﷺ کے روز مرہ کی زندگی کے حالات کا بھی تصور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت دیتا تھا لیکن جس رفتار سے آتا تھا اسی رفتار سے آپؐ آگے چلا دیا کرتے تھے۔ اس لئے بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ گھر میں اور کچھ نہیں تھا مگر یہ مطلب نہیں تھا کہ آنحضور ﷺ اپنے اہل وعیال کو بھی ان کی خواہش کے بغیر مشکل میں ڈالتے تھے۔ بعض لوگ یہ حدیثیں پیش کر کے یہ تصور باندھتے ہیں، یہ تأثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ اپنے اہل وعیال کو مشکل میں ڈالتے تھے۔ یہ درست نہیں ہے۔ آپؐ بے حد خیال فرماتے تھے مگر بعض واقعات بعض ایسے زمانوں میں بھی ہو سکتے ہیں جبکہ بہت زیادہ تنگی کا دور تھا اور بعض مہینوں بلکہ سال ایسے آئے ہیں جبکہ سارے مسلمان بھوک میں مبتلا رہتے تھے اور آنحضرت ﷺ کیونکہ سب سے زیادہ ایثار کرنے والے تھے اور اس دور میں یقیناً آپؐ نے اپنی تنگی کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو بھی شامل فرمایا مگر ان کے جذبے اور شوق ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے، یہ نہیں کہ ان پر مجبوراً کوئی چیز ٹھونسی گئی ہو۔ اس کی بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر اس

وقت اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

یہ واقعہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ گھر کہلا بھجوایا مہمان کے لئے کچھ لاؤ۔ عرض کیا گیا پانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس پر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا اس مہمان کے کھانے کا بندوبست کون کرے گا؟ ایک انصاری نے عرض کیا حضور میں انتظام کرتا ہوں۔ اب یہ جو واقعہ ہے میرے اس نتیجہ کی تائید کر رہا ہے۔ ایک عام دور تھا تنگی کا اس زمانے کی بات ہو رہی ہے اور صحابہؓ میں سے ایک شخص نے کہا میں کرتا ہوں اور لوگ سمجھے ہوں گے کہ اس کے پاس بہت زیادہ کھانا ہے اس لئے اس نے کہا لیکن کیسے کیا؟ اس کا حال سنئے۔ چنانچہ وہ گھر گیا اپنی بیوی سے کہا آنحضرت ﷺ کے مہمان کی خاطر مدارت کا انتظام کرو۔ بیوی نے جواباً کہا آج گھر میں تو صرف بچوں کے لئے کھانا ہے۔ نہ میرے لئے نہ تمہارے لئے۔ انصاری نے کہا اچھا تو کھانا تیار کرو پھر چراغ جلاؤ اور جب بچوں کے کھانے کا وقت آئے تو ان کو تھپتھپا کر، بہلا کر سلا دو۔ چنانچہ عورت نے کھانا تیار کیا چراغ جلایا، بچوں کو بھوکا سلا دیا پھر چراغ درست کرنے کے بہانے اٹھی اور جیسے پلو لگ جاتا ہے اس طرح گویا حادثے کے طور پر چراغ بجھا دیا۔ پھر دونوں مہمان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے اور آوازیں منہ سے ایسے نکالتے رہے جیسے چٹخارے لے رہے ہوں حالانکہ وہ بچوں کا کھانا بھی معلوم ہوتا ہے اتنا نہیں تھا کہ بچوں کا بھی پیٹ بھر سکے کیونکہ بمشکل ایک مہمان کے کام آیا اور مہمان یہ سمجھتا رہا کہ میزبان بھی میرے ساتھ کھانا کھا رہے ہوں گے۔ منہ سے چٹخاروں کی آوازیں سن رہا تھا۔ جب صبح وہ انصاری حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ہنس کے فرمایا تمہاری رات کی تدبیر سے تو اللہ تعالیٰ بھی آسمان پر ہنس پڑا۔ ایک روایت یہ بھی میں نے سنی ہے کہ خدا بھی چٹخارے لینے لگا جب تم چٹخارے لے رہے تھے۔

یہ پاک باطن، ایثار پیشہ لوگ کس طرح اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ اللہ کا احسان دیکھیں کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ حالت کی قربانی کو بھی خدا نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ جیسے قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کی مہمان نوازی کے ذکر کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا اور اس طرح محفوظ کیا کہ جب بھی پڑھیں دل اس طرح پگھل جاتا ہے حضرت ابراہیمؑ کی محبت میں اور اس واقعہ کو آنحضرت ﷺ کی زبان سے محفوظ فرما دیا اور الہاماً آپؐ کو خبر دی کہ اے محمد ﷺ! تیرے غلاموں میں یہ پیدا ہوئے ہیں۔ پس

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:10) کے سردار تو خود محمد رسول اللہ ﷺ تھے اور دوسری مثالیں جو میں پہلے بھی بار بار دے چکا ہوں دل تو چاہتا ہے کہ ہمیشہ دہرائی جائیں مگر وقت کی کمی کی وجہ سے میں نہیں پیش کر سکتا۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے پاک نمونے کے ذریعے مہمان نوازی کا ایسا لطیف جذبہ صحابہؓ میں سرایت کر دیا کہ وہ انبیاءؑ کی شان کو چھونے لگا۔ آسمان سے خدا کی تحسین کی نگاہیں اس پر پڑنے لگیں اور وحی کے ذریعے محمد رسول اللہ ﷺ کو مطلع فرماتا ہے۔

یہ وہ مرتبہ ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بے شمار درود ہوں کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں پہلے اپنی ذات میں زندہ کیا پھر ہم میں زندہ کر دیا۔ جتنا بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احسان پر آپؑ کے لئے دعائیں کی جائیں کم ہوں گی۔ دیکھو چودہ سو سال پہلے کے واقعات مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں تیرہ صدیاں گزر چکی تھیں۔ کئی تاریک صدیاں ان کے درمیان حائل ہو چکی تھیں۔ حضرت مسیح موعودؑ نے ان میں سے ایک ایک کو پکڑا اور آنحضور ﷺ، اپنے محبوب آقا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک ایک روایت کو زندہ کیا ہے اور پھر اپنے صحابہؓ، اپنے غلاموں میں اس جذبے کو کس شان کے ساتھ جاری فرما دیا۔ سو سال سے زائد ہو گئے لیکن یہ جذبہ کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا ہے۔ یہ نیکی کا حسن ہے، یہ زندگی کی علامت ہے۔

زندگی ہمیشہ بڑھا کرتی ہے اور وقت کے گزرنے سے کم نہیں ہو جایا کرتی۔ یعنی وہ لوگ جو زندہ ہوں مر بھی جائیں تو وہ نشو و نما کے ذریعے اپنے پیچھے اپنی مثالیں چھوڑ جایا کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کی صفت ہے کہ وہ بڑھتی ہے اور جب تک خدا تعالیٰ نے اس کے بڑھنے کے دائرے مقرر فرمائے ہیں وہ نشو و نما پاتی چلی جاتی ہے اور پھر جب اس دائرے کو پہنچتی ہے تو اگلی نسل میں اس کی زندگی کی نشو و نما اسی طرح پھولنے پھلنے لگتی ہے، اسی طرح رونما ہونے لگتی ہے۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک زندگی آج دیکھو کروڑ زندگیوں میں بدل چکی ہے۔ آپؑ کی مہمان نوازی کا ہر لطیف جذبہ احمدیوں کے دلوں میں کیسی لطافتیں اور رس گھول رہا ہے اور جو مہمان نوازی کی لذت سے

آشنا ہو جائیں ان کو پھر اس سے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پس اس جذبے سے آپ بھی مہمان نوازی کریں۔ آنے والوں کی عزت اور وقار کا خیال رکھیں اور ان کے لئے ہر قربانی پیش کریں۔

لیکن مہمانوں کے لئے بھی ایک نصیحت ہے۔ بسا اوقات مہمان ضرورت سے زیادہ اور سنت کی اجازت سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جہاں میزبانوں کو نصیحتیں فرمائی ہیں وہاں مہمانوں کے لئے بھی تو نصیحتیں فرمائی ہیں۔ مثلاً تین دن سے زیادہ اپنا مہمانی کا حق نہ سمجھو۔ اس سے زیادہ اگر ہے تو وہ آپس کے تعلقات کے سلسلے ہیں۔ مگر تین دن کی حد مقرر کر دینا یہ ایک بہت بڑا احسان ہے امت پر۔ ورنہ وہ لوگ جن کی سرشت میں یہ داخل کر دیا گیا ہو کہ تم نے ایثار کرنا ہے ان کا تو کچھ بھی نہ رہے۔ دن رات ایسے لوگ جو بے حسی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ دوسروں کے گھروں پہ قبضے کر جائیں اور ان کے لئے نہ کوئی اپنا وقت چھوڑیں نہ اپنا ساز و سامان لینے دیں۔ اس عرب کے مہمان والا قصہ ہو جائے جو ایک بدو کے گھر ٹھہرا تو چند دن کے اندر اندر اس کا سب کچھ چٹ کر گیا۔ نہ بھیڑیں رہیں نہ بکریاں اور اونٹ بھی ذبح ہونے لگے۔ آخر ایک دن اس نے پوچھا کہ یا حضرت سر آنکھوں پر لیکن کیا ارادہ ہے۔ مطلب تھا کہ اس کو اگر یہ سفر پر جا رہا ہے تو سفر یاد کراؤں لیکن عربوں میں مہمان نوازی دیکھیں کتنی غیر معمولی تھی۔ اس مہمان نوازی کو محمد رسول اللہ ﷺ نے چمکایا ہے اور کیسے بلند تر ارفع مقامات تک پہنچا دیا۔ چنانچہ مہمان نے جواب دیا کہ مشکل یہ ہے کہ میرا معدہ خراب ہے، بھوک نہیں رہی اور سنا تھا کہ کوئی بہت بڑا حکیم ہے جو بھوک پیدا کرنے کا ماہر ہے اور میں اس کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ تب اس مہمان نواز نے کہا:

یَا ضَیفنا ان زرتنا لوجدتنا
نحن الضیوف وانت رب المنزل

کہ اے میرے معزز مہمان اب کہ اگر لوٹے تو میں تمہارا مہمان اور تم گھر کے مالک ہو جاؤ گے۔ تو یہ بھی مہمان نوازی کی قسمیں ہیں۔ مگر میزبانوں کے علاوہ مہمانوں کی قسمیں بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھیں کس طرح اس کو محدود فرما دیا۔

اب سنت کے حوالے سے مہمان مجبور ہو گیا ہے کہ تین دن تک حق سمجھے اور اس کے بعد کہے کہ مجھے اجازت دیں اور پھر وہ آثار میں بھی دیکھے کہ اجازت نہ دیتے ہوئے بھی کوئی میزبان تکلیف

میں ہے تو اس کا اخلاقی فرض ہے کہ لفظوں کے بہانے نہ ڈھونڈے۔جس طرح حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مہمان سے نہیں پوچھا تھا کہ کھانا کھاؤ گے کہ نہیں اس میں ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔اگر مہمان سے پوچھا جائے کہ کھانا کھاؤ گے کہ نہیں تو بسا اوقات وہ کہتا ہے نہیں ضرورت نہیں ہے۔جن لوگوں میں جھوٹ کی عادت ہے وہ بعض دفعہ جھوٹ بولتے ہیں کہ جی کھا کے آئے ہیں۔ جہاں سچ پر زور دیا جاتا ہے وہ کوئی اور بہانہ چالاکی سے بات کو ٹالتے ہیں اور ہمارے تجربے میں خدا کے فضل سے یہ بات بہت زیادہ دیکھی جاتی ہے یعنی ایک مہمان جو جھوٹ بول نہیں سکتا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا وہ ادھر ادھر کے بہانے بنائے گا اور سیدھا بات کا جواب نہیں دیتا۔

میزبان کا بھی یہی حال ہے۔ یہ یک طرفہ قصہ نہیں ہے۔ جب آپ میزبان سے اجازت مانگیں گے تو وہ یہی کہے گا کہ نہیں نہیں ٹھہریں بڑے شوق سے، آپ کا اپنا گھر ہے اور اگر اسی طرح رہے تو اس کا گھر کہاں رہے گا، بے چارے کا وہ تو آپ کا گھر بن جائے گا۔اس لئے **نحن الضیوف و انت رب المنزل** والا مضمون بھی یاد رکھیں۔ جب آپ تین دن دیکھیں پورے ہو گئے اور جلسے کی خصوصی ضرورت کے دوران ہم نے چودہ دن تک بھی اس بات کو ممتد کر دیا ہے یعنی جماعتی مہمان نوازی۔اس کے بعد آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اور ٹھہروں کہ نہ ٹھہروں۔آپ اجازت چاہیں اور اصرار کریں کہ اب مجھے جانا چاہئے یا میں اپنا انتظام کروں گا۔اگر میزبان بضد ہو اور آپ کو دکھائی دے کہ وہ مصر ہے کہ آپ اپنے قیام کو لمبا کریں تو اس کو تکلیف نہیں ہوگی تو پھر شوق سے آپس کے سلسلے ہیں، اس میں کوئی حکم نہیں ہے کہ لازماً تین دن کے بعد جدائی اختیار کی جائے یا چودہ دن کے بعد جدائی اختیار کی جائے۔مگر اب نیتوں کا حال ہے اپنی نیتوں کو ٹٹولا کریں اور نیتوں کو صاف رکھیں گے تو پھر کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔اگر نیتوں میں بھی ٹیڑھا پن آ گیا تو پھر آپ کے نکالے ہوئے سب نتیجے غلط ثابت ہوں گے۔

دوسری باتیں جو اور کرنے والی تھیں وقت تو تھوڑا ہے اور جو بھی احادیث کے یا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے میں نے اکٹھے کئے تھے وہ آئندہ ایسے موقعوں پہ کام آتے رہیں گے۔اب میں ایک اور بات کی نصیحت آپ کو کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس جلسے میں اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ پہلے سے بھی بڑھ کر غیر معمولی فضلوں کو نازل ہوتا دیکھیں گے اور ان فضلوں

کے دیدار کی جو خدا نے توفیق عطا فرمائی ہے اس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ یہ دن ذکر الٰہی میں گزاریں اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں پر اس کے احسانات کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے وقت کو کاٹیں اور اس جنت سے لطف اندوز ہوں۔ جو شکر کی جنت ہے ویسی کوئی جنت نہیں۔ شکر ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ شکر گزار بندہ جو ہے وہ واقعۃً اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے تلے اس دنیا میں ہی جنت پا جاتا ہے اور اس کے عظیم فوائد ہیں جو اپنی ذات میں الگ خطاب کو چاہتے ہیں۔ مگر اتنا میں آپ کو کہوں گا کہ خدا کے فضلوں کا شکر کیسے ممکن ہوگا جو بارش کی طرح برس رہے ہوں، ان گنت ہوں، ناممکن ہے کہ آپ ان کا احاطہ کرسکیں۔

تو جہاں تک ہمارا فرض ہے ہمیں چاہئے کہ جس حد تک ممکن ہے خدا کے فضلوں پر نظر کریں اور خدا کے احسان کا بدلہ تو انسان اتار ہی نہیں سکتا۔ ناممکن ہے۔ ایک ذریعے سے وہ احسان کا بدلہ اتارنے کا احساس اور شعور بیدار کرسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ:4) جتنا خدا عطا فرماتا ہے اتنا ہی وہ آگے بنی نوع انسان پر اور نیک کاموں پر خرچ کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو احسان کا جو سلسلہ ہے وہ جو آسمان سے اترتا ہے وہ نیچے ہی کی طرف بہتا ہے۔ مگر جب خدا کے نام پر خرچ کیا جائے تو یہ ایک احسان کے شعور کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایک کوشش تو ہے۔ انسان یہ تو کہہ سکتا ہے کہ اے خدا تیرے احسانات کا بدلہ تو ممکن ہی نہیں، تجھے ضرورت کوئی نہیں ہے مگر تیرے بندوں کو تو ضرورت ہے۔ تیرا دین آج جس حالت میں ہے اس دین کو تو ضرورت ہے تو میں تیرے احسان کا حقیقی شکر ادا کرتے ہوئے ان باتوں پر میں خرچ کرتا ہوں، اپنا وقت بھی زیادہ خرچ کریں۔

اور وہ احسانات جو خدا تعالیٰ کے فضل سے تمام دنیا میں بکثرت احمدی ہونے کے ذریعے نازل ہو رہے ہیں ان کا حق ادا کرنے کے لئے لازم ہے کہ اپنی تربیت بھی کریں اور دوسروں کی تربیت کے لئے اپنا پہلے سے زیادہ وقت دیں۔ ان کو کسی نہ کسی نے تو سنبھالنا ہے۔ جو ہزاروں آیا کرتے تھے اب لاکھوں ہیں اور لاکھوں سے بھی اب ملین سے بھی اوپر نکل چکے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ ان کو کیسے سنبھالنا ہے۔ ان کو سنبھالنے کے لئے آپ کو اپنے گھروں کی صفائی کرنی ہے، اپنے باطن کی صفائی کرنی ہے، دلوں کی صفائی کرنی ہے اور ہر جگہ ان کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتے ہوئے ہاتھ دکھائی دیں۔ پھر اگر مہمان نواز تھوڑے بھی رہ جائیں تو مہمان جانتا ہے کہ مجبوری کے قصے ہیں لیکن ہر

طرف سے اسے لبیک لبیک کی آوازیں آنی چاہئیں۔

اس دفعہ جب امریکہ اور کینیڈا کے نومبائعین سے میری ملاقاتیں ہوئی ہیں وہ جو واقعۃً حقیقۃً احمدی ہوئے تھے، بعض تھوڑی دیر میں کچے توڑے گئے تھے ان کی شکل بتادیتی تھی کہ ان کی کیا کیفیت ہے مگر اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ پہلے کسی دورے میں مجھے اتنے مخلص اور واقعۃً صمیم قلب کے ساتھ ہوتے ہوئے احمدی دکھائی نہیں دیئے تھے۔ یہ جو عام دور چل پڑا ہے تبلیغ عام یعنی دعوت الی اللہ، دعوت الی اللہ کے چرچے چل رہے ہیں یہ امریکہ جیسے مادہ پرست ملک میں بھی ایک ہنگامہ برپا کرنے لگے ہیں اور اتنا اثر ہے اس کا لوگوں پر کہ جو بھی ملنے والے آتے رہے ہیں انہوں نے اس بات کا ذکر اگر سب نے نہیں کیا تو اکثر نے کیا کہ ہم تو جب سے آئے ہیں لگتا ہے کہ ہم سب سے زیادہ معزز مہمان ہیں۔ ہر احمدی ہم سے محبت کرتا ہے اور حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیسے ہوگئی۔ پتا چلتا ہے نومبائع ہیں تو بے اختیار ان کے دل اچھلتے ہیں سینوں سے اور ہمارے دلوں کو لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں استقبال کے لئے۔

یہ وہ مضمون ہے جو تربیت کے تعلق میں ہر احمدی کو یاد رکھنا چاہئے۔ اب آنکھیں بند کر کے اور منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھنے کے وقت نہیں رہے۔ اب تو آپ کو کھل کر لبیک کہنا پڑے گا اور آگے بڑھ کر جس اجنبی کو دیکھیں قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ کا خیال کریں۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اجنبی دیکھا تھا اور دیکھیں کیسا ان کی مہمان نوازی کا انتظام فرمایا۔ یہ اجنبی لوگ جو آرہے ہیں ان کو زیادہ دیر اجنبی نہ رہنے دیں تیزی سے اپنے اندر ملائیں تا کہ پھر یہ مہمان نواز بن جائیں اور زیادہ دیر تک یہ مہمان نہ رہیں جلد جلد مہمان نوازوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو بڑھتے ہوئے تقاضوں کو ہم پورا نہیں کر سکیں گے۔

عظیم انقلاب برپا ہو رہا ہے جس کا آج سے دس سال پہلے مثلاً کوئی آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا خود میرے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے بڑی چھلانگ لگائی تھی تو میں نے سوچا تھا کہ ایک سال میں ایک لاکھ احمدی ہو جائے تو کتنا مزہ آئے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ بعض دفعہ بے اختیار بے سوچی سمجھی سکیم کے الفاظ منہ پہ ایسے جاری کر دیتا تھا کہ میں خود بھی حیران تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن یقین کے ساتھ خدا کی قسمیں کھا کھا کر میں جماعت کو

بتا رہا تھا کہ میں بکثرت فوج در فوج لوگوں کو احمدیت میں داخل ہوتا دیکھ رہا ہوں۔اس کثرت سے آئیں گے ہر طرف سے کہ آپ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے۔ایسے ہی ایک خطاب کے موقع پر ایک ہندو پنڈت جو باہر سے آیا ہوا تھا اس نے ایک احمدی سے کہا کہ آج تو مجھے لگتا ہے میں نے کرشن دیکھ لیا ہے کیونکہ جس یقین کے ساتھ اس نے خدا کی باتیں کی ہیں وہ سچے انسان کے سوا کوئی کرنہیں سکتا۔

اور لوگ کہتے تھے یہ کیسے ہوگا۔مانتے تو تھے،دل بھی چاہتا تھا مان جائیں مگر آثار نہیں تھے۔اب دیکھو کیسا خدا نے موسم بدل دیا ہے،کایا پلٹ گئی ہے۔وہ جماعتیں جن کے متعلق سالہا سال کی کوششیں بے کار گئیں ان میں زندگی کے آثار پیدا نہ ہو سکے۔اب وہ جب خبریں بھیجتے ہیں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے تو ان سے اتنی توقع نہیں رکھی تھی یہ اس سے آگے نکل گئے ہیں۔پھر میں ان کو کہتا ہوں اچھا غلطی ہوگئی اب آپ کا ہم ٹارگٹ بڑھا رہے ہیں اور اس پہ وہ ناراض نہیں ہوتے۔وہ کہتے ہیں اچھا دعا کریں ہم یہ ٹارگٹ بھی پورا کریں،اس سے بھی آگے نکلیں اور اللہ کے فضل سے یہ بھی ہو جاتا ہے۔تو دن ایسے آ رہے ہیں یعنی پھل پک رہے ہیں اور خدا پکار رہا ہے،موسم لے آیا ہے۔ہماری کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے،ہمیں کوششوں کی توفیق بھی خدا نے بخشی ہے۔اس بات کا جتنا میں قائل ہوں کوئی مجھ سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا کیونکہ میں تو جوانی کے آغاز سے ہی تبلیغ تبلیغ کی رٹ لگائے رکھتا تھا خدام الاحمدیہ میں بھی ،وقف جدید میں بھی جہاں بھی میری پوسٹنگ ہوئی جہاں جاتا تھا تبلیغ کرو تبلیغ کرو،اٹھو اور دعوت دو۔مجلسیں لگاتا تھا ہر جگہ سوال و جواب کی گویا ایک جنون کی سی کیفیت خدا تعالیٰ نے خود میرے دل میں ڈالی تھی۔میری اس میں قطعاً کوئی خوبی نہیں تھی۔اب میں سمجھا ہوں کہ مجھے تیار کیا جا رہا تھا اور اب دیکھیں باوجود ان سب کوششوں کے کبھی بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ان معنوں میں کہ میں کوئی انقلاب ہوتا دیکھوں،واقعۃً لوگ تبلیغ شروع کر دیں۔یہی مسجد لندن ہے یہاں کے امام صاحب کو میں چٹھیاں لکھتا تھا تو جواب آتا تھا کہ یہاں حالات اور ہیں آپ نہیں سمجھتے۔جرمنی والوں کو کہتا تھا تو کہتے تھے یہاں تو کوئی نہیں سنتا۔یہ دنیا ہی اور ہے آپ کس دنیا میں بسے ہوئے ہیں۔امریکہ والے ہوں یا غیر،دوسرے ملکوں کے ہوں۔اب وہاں حالات ایسے پلٹ گئے ہیں جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس یقین سے دن بدن میرا دل بھر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہنے

کی بھی توفیق بخشی ہے اور جب اثر ڈالنا تھا تو آسمان سے اثر اترا ہے۔ ورنہ میری زبان تو وہی تھی کوئی مزید اضافے تو مجھے مضمون نگاری کے معلوم نہیں ہو سکے۔ اسی طرح کہتا رہا مگر جب خدا نے فضل اتارا اور جب پھل پکنے کے وقت آئے ہیں تو اب سنبھالنے کی فکر ہوگئی ہے۔ اس لئے سنبھالنے کے تعلق میں میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ بھی ایک مہمان نوازی ہے اس کا بھی حق ادا کریں اور اس کے لئے آپ کو تیاری کرنی ہوگی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کے صحابہؓ نے اپنے نفوس کو جھاڑو دے دے کے صاف کیا ہے۔ تو آپ بھی نفسوں میں جھاڑو دیں۔ اپنی ان کمزوریوں کو دور کریں جو آنے والوں کے اوپر بعض دفعہ بداثرات چھوڑ جاتی ہیں، ان کے جذبوں کو بجھا دیا کرتی ہیں۔

پس اس موقع پر ہم سب ہی مہمان نواز ہیں جو مہمان ہیں وہ بھی مہمان نواز ہیں اور جو میزبان ہیں وہ بھی مہمان نواز ہیں۔ کیونکہ بہت سے اجنبی ایسے بھی آئیں گے جن کا جماعت سے تعلق نہیں ہے اور ان کے لئے پہچاننا بھی ضروری نہیں، پوچھنا بھی ضروری نہیں۔ وہ سب آپ کے معزز مہمان ہیں۔ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ بھی ہیں اور ضیوف مکرمین بھی ہیں۔ ایسے ضیوف ہیں جو مکرم ہیں یعنی ان کی عزت کی جاتی ہے۔ پس ہر ایک پر عزت کی نگاہ ڈالیں، ہر ایک سے محبت سے پیش آئیں اور اس بڑھتے ہوئے تعلق کے نتیجہ میں ایک اور تقاضا ہے جو طبعاً خود بخود پورا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ خدا کے فضلوں کے نتیجہ میں حسد بھی بہت بڑھ رہا ہے۔ اتنا بڑھ رہا ہے کہ لگتا ہے لوگ اپنے غیظ وغضب کی آگ میں جل کے مر جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس مضمون کو یوں فرمایا گیا ہے مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (آل عمران:120) یہی سلسلہ ہے تو مرجاؤ اپنے غیظ میں لیکن یہ خدا کی طرف سے ہے ارشاد یعنی مومن کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ تم نہیں مرو گے ان کے غیظ سے یہ مریں گے لیکن احتیاطی تدابیر کے متعلق دعائیں سکھا دیں وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (الفلق:6)۔ تو اسے از خود جاری ہونے والی ایسی تقدیر نہ سمجھیں جس میں آپ کو زبان ہلانے کی ضرورت نہیں ہے یا دعاؤں کے ذریعے مدد مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ دیکھیں کیسا عجیب مضمون ہے شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ بعض طبیعتیں حاسد ہوا کرتی ہیں اور ہر حاسد طبیعت ہر وقت حسد نہیں کر رہی ہوتی بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ جب حاسد حسد کے لئے بھڑک اٹھتا ہے اور غیر

حاسد حسد نہیں کرتا۔ تو انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ ہیں جو حاسد ہیں اور ایک ہیں جو دوسروں کی خوشیوں سے خوش ہوتے ہیں یہی مومن ہیں۔ یہی وہ سچے خدا کے بندے ہیں جن کے لئے آسمان سے حقیقت میں دائمی برکتیں اتاری جائیں گی ،مگر حاسد بھی ہیں۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا کہ پہلے اپنے نفس کو صاف کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں جہاں آپ لوگوں سے ملیں گے وہاں نظر بھی رکھیں کہیں کوئی حسد جماعت کو نقصان پہنچانے والا تو نہیں۔ ایک نگرانی کی آنکھ کے ساتھ بھی دیکھیں مگر ادب اور احترام کے ساتھ۔ شک کی نظر اور ہے اور احتیاط کی نظر اور ہے۔ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر احتیاط کی نظر کوئی نہیں رکھتا تھا اور آپؐ سے بڑھ کر شک کے خلاف کسی نے تعلیم نہیں دی۔ ایک عجیب حسین توازن ہے ان دونوں باتوں کے درمیان۔ تو آپ نے ناحق بدظنیاں تو نہیں کرنی مگر احتیاط کے وہ سارے تقاضے پورے کرنے ہیں جو آنحضرت ﷺ نے ہمیں سکھائے اور قرآن کریم کی اس آیت نے ان کی طرف متوجہ کر کے ہمیں ہمیشہ دعا کرتے رہنے کی طرف ہدایت فرمائی۔ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اور گھر صاف کرنے کا جہاں تک مضمون ہے، اپنے دل کو ٹٹولیں کہ آپ کہیں حاسد تو نہیں۔ ہم میں بھی حاسد مزاج کے لوگ ہیں۔ وہ جب بھی نظام پہ تنقید کرتے ہیں بھلائی کی خاطر نہیں، حسد کی وجہ سے کرتے ہیں۔ کوئی اور آگے بڑھ گیا تو ان کو آگ لگ جاتی ہے اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم نیک نصیحتیں کر رہے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دیکھیں برا نہ منانا ہم تو سچی بات کریں گے لیکن اللہ بہتر جانتا ہے اور وہ بھی اگر چاہیں تو پہچان سکتے ہیں اپنی ذات میں ڈوب کر اگر اس کی جڑ تلاش کریں کہ کہاں تھی تو مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ کا مضمون ان کو دکھائی دے گا وہ فطرتاً حاسد ہیں اور ایسا حسد عورتوں میں بدقسمتی سے زیادہ ملتا ہے۔

اب MTA کے تعلق میں مجھے پتا چلتا ہے بعض دفعہ کسی کی بچیاں زیادہ آگئیں تو اس پر بھی حسد شروع ہو گئے اور یہ نصیحتیں ہوتی ہیں کہ بعض لوگوں کو بار بار زیادہ نہیں دکھانا چاہئے اور اس سے لوگ بور ہوں گے۔ اب لوگوں کے لئے نام لئے اور اپنے دل کی تکلیف کا اظہار کر دیا اور پردے کی بات کی تو اس وجہ سے نہیں کہ پردے کی محبت ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی اور کی بچی سے بے احتیاطی ہو جائے تو یہ اب موقع ہے اس کو زخم پہنچانے کا۔ آپ نے اس کو موقع دے دیا دیکھیں ذرا ٹیلی ویژن پہ آئی تھی تو پردے کی احتیاط ہی کوئی نہیں تھی سب دنیا دیکھ رہی تھی۔ اب یہ باتیں اگر دل کے درد کے

ساتھ مخفی طور پر مجھے پہنچائی جائیں تو میں اسے یہ نہیں کہوں گا کہ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ لیکن اگر عورتوں میں بیٹھ کے عورتیں باتیں کریں تو اس کے سوا اس کا کوئی نام نہیں رکھا جاسکتا کہ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ تو جو خدمت کرنے والے ہیں وہاں بھی وہ حاسدین کی نگاہ میں آسکتے ہیں۔ بعض لوگ خدمت کے ایسے مقام پہ ہوتے ہیں زیادہ قرب ان کو ملتا ہے، زیادہ آگے آتے ہیں بعض دوسرے ان کے متعلق تکلیف محسوس کرتے ہیں اور حاسد کی آنکھ کئی طرح سے نقصان پہنچا دیا کرتی ہے۔ پس اللہ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔ جماعت کے حاسدوں سے بھی بچنے کی کوشش کریں اور محبت کے نتیجہ میں جب آپ قرب کو حاصل کریں گے تو احتیاط کی نظر کو نہ بھولیں۔ محبت کی نظر بعض دفعہ غافل بھی کر دیا کرتی ہے مگر مومن غافل نہیں ہوا کرتا۔ آنحضرت ﷺ سے زیادہ مومنوں سے اور کون محبت کیا کرتا تھا۔ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ:128) لیکن باریک سے باریک ان کی فطرت کے وہ خطرات جو ان کے اپنے نفس کے خلاف تھے ان سے آپ آگاہ فرماتے تھے۔ وہ جانتے بھی نہیں تھے لیکن آنحضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بات یوں نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یوں کرنی چاہئے تھی۔

پس یہ جلسہ بھی پہلے جلسوں کی طرح ہمارے لئے ایک عمومی عالمی تربیت کے پیغام بھی لایا ہے۔ مواقع بھی لایا ہے۔ دعائیں کرتے رہیں اللہ تعالیٰ ہمیں سب تقاضے پورے کرنے کی توفیق بخشے۔ سب مہمان ہم سے خوش جائیں ہم مہمانوں سے خوش رہیں اور اب یہ جلسہ آیا تو گیا۔ اب اس کے جانے کا خوف دل کو لاحق ہو گیا ہے۔ میرا بھانجا بی اس کو کہتے تھے اس کی بات مجھے ہمیشہ یاد آتی ہے بہت پیاری لگتی تھی۔ یہاں انگلستان ہی میں جب وہ بالکل چھوٹا تھا اس کی والدہ میری ہمشیرہ ہیں میر داؤد احمد صاحب مرحوم کی بیگم تو وہ ایک خاص کیفیت تھی وہ مجھے بھی بلا لیا کرتی تھیں کہ دیکھو اس کو اب انڈا شروع ہوتے ہی رونے لگ جاتا تھا۔ کیا اچھا نہیں لگا؟ کیا بات ہے؟ کہ نہیں کھیم ہو جائے گا یعنی ختم بھی نہیں کہہ سکتا تھا کھیم ہو جائے گا۔ تو اب تو وہی آنسو ہیں جو میری آنکھوں سے بھی بہنے لگے ہیں۔ جلسہ آیا تو ہے مگر ختم ہو جائے گا۔ اللہ خیر و عافیت سے ختم کرے، فضلوں کی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور ان جلسوں میں ہمیشہ ہمیں پہلے سے بڑھ کر خدا کے فضلوں کی زیارت کی توفیق ملے اور اس کے احسانات کا شکر ادا کرنے کی توفیق ملے۔ آمین

ہم دنیا میں توحید کا قیام نہیں کر سکتے جب تک اپنے نفس میں توحید کا قیام نہ کریں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 26 / جولائی 1996ء بمقام اسلام آباد، ٹلفورڈ برطانیہ)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (آل عمران: 19)

پھر فرمایا:

الحمد للہ کہ آج یونائیٹڈ کنگڈم (U.K) کے سالانہ جلسہ کا پہلا روز ہے جو جمعہ سے شروع ہو رہا ہے۔ آج جمعہ کا خطبہ الگ ہوگا اور اس کے بعد افتتاحی اجلاس کچھ عرصے کے بعد اس سے الگ ہوگا لیکن دونوں کا مضمون جو میں نے آج کے لئے اختیار کیا ہے ایک ہی ہے یعنی توحید باری تعالیٰ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسائل کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سب دنیا شرک میں ڈوب چکی ہے اور تمام مرضوں کا آخری مرض، وہ جڑ جس سے سب مرضیں پھوٹ رہی ہیں وہ شرک ہے اور شرک کے سوا اور کچھ نہیں۔ توحید کے نام لیوا بھی مشرک ہو چکے ہیں اور وہ جو مشرک ہیں وہ تو مشرک ہیں ہی اور ہر مذہب اس وقت عملاً خدا کے سوا دوسرے خداؤں کی پوجا کر رہا ہے اور سب سے بڑا بت جو آج دنیا کے سامنے سر اٹھا کر خدا کا دعوے دار بن کے نکلا ہے وہ انا کا بت ہے۔ درحقیقت انسان خود اپنی ہی پرستش کر رہا ہے۔

اس پہلو سے آج کا یہ مضمون توحید کا اختیار کرنے میں میرے پیش نظر یہ تھا کہ خطبہ کے دوران آپ کو اپنی ذات میں توحید قائم کرنے کی طرف متوجہ کروں اور افتتاحی اجلاس میں توحید کے جو

تقاضے ہم نے کل عالم میں پورے کرنے ہیں، حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس طرح ان کو سمجھا اور جس طرح پیش فرمایا آپؑ کے حوالے سے توحید کا وہ مضمون آپ کے سامنے رکھوں۔ خطبہ میں توحید کے مضمون کا تعلق ہر احمدی کی ذات سے ہے اور خود میری ذات سے بھی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہم دنیا میں توحید کا قیام کر ہی نہیں سکتے جب تک اپنے نفس میں توحید کا قیام نہ کریں اور قیام توحید کا قسط سے ایک گہرا اور اٹوٹ تعلق ہے۔ قسط سے مراد ہے انصاف۔ انصاف کے لئے اگرچہ مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن قسط اس مضمون میں ایک خاص مناسبت رکھتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ قسط کو اختیار فرمایا۔

قرآن کریم فرماتا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ اور ملائک بھی یعنی فرشتے اور صاحبِ علم لوگ بھی اسی طرح خدا کے ساتھ گواہی دے رہے ہیں۔ مگر ان کی گواہی اللہ کے ذیل میں آ کر کام دکھاتی ہے اپنی ذات میں اس کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ بعد میں یہ نہیں فرمایا قائمین بالقسط یہ سب کے سب انصاف کو قائم کرنے والے ہیں بلکہ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ کہہ کر فرمایا کہ اللہ کی گواہی سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل قبول ہے کیونکہ وہ قسط پر قائم ہے اور قسط کو قائم کرنے والا ہے۔ قسط سے مراد جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے عرف عام میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انصاف ہے اور کوئی گواہ بھی جب تک انصاف پر مبنی نہ ہو اس کا انصاف پر قدم نہ ہو اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ پس ملائکہ اور اُولُوا الْعِلْمِ اس لئے قابل قبول ہیں کہ خدا ان کو اپنی گواہی کے ساتھ شامل فرماتا ہے اور اس کے قسط کی ذیل میں ملائکہ بھی آ جاتے ہیں اور اُولُوا الْعِلْمِ بھی آ جاتے ہیں۔ مگر اصل گواہی خدا ہی کی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی گواہی ممکن نہیں ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے الْعَزِيْزُ وہ غلبے والا اور بزرگی والا ہے الْحَكِيْمُ اور حکمت والا ہے۔

پس ساری کائنات میں یہ گواہی پھیلی پڑی ہے اور جب خدا کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں تو ہم اس وجہ سے نہیں مانتے کہ ہمیں آواز آ رہی ہے قرآن کی طرف سے کہ اللہ نے گواہی دے دی۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ میں اس گواہی کی عظمت اور اس کا وقار اور حکمت سب بیان ہو گئیں گویا تمام کائنات پر نظر ڈال کے دیکھو اس میں ایک عزیز اور حکیم خدا کا ہاتھ دکھائی دے گا۔ پس جب

عزیز اور **حکیم** ہونے میں کائنات کی ہر چیز خدا کی عزت اور اس کی حکمت پر گواہ ہے تو اللہ کی گواہی خود عدل پر قائم ہے۔ اگر محض اس وجہ سے خدا اپنی گواہی لوگوں سے منوائے کہ میں غالب ہوں میری گواہی مان لو تو یہ گواہی اپنی ذات میں بھی عدل کے خلاف ہو جائے گی لیکن اگر کوئی منصف یہ کہے کہ میری گواہی مانو کیونکہ میں علم کے زور سے اور حقیقت کے زور سے غالب ہوں نہ کہ جبر کے زور سے عزیز میں اور جابر میں یہی بڑا فرق ہے۔ عزیز اس ذات کو کہتے ہیں جو علم کی طاقت سے عزت والا غلبہ حاصل کرے اور بزرگی پائے اور صاحب علم کی بزرگی میں کوئی جبروت نہیں کوئی زبردستی نہیں کوئی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے بلکہ علم اپنی ذات میں ایک طاقت بھی ہے اور عزت بھی ہے اور پھر اس کے ساتھ اگر حکمت بھی آجائے، ہر علم کے پیچھے جو حکمتیں ہیں تہہ بہ تہہ نہ ختم ہونے والی حکمتوں کا سلسلہ ہے۔ وہ بھی اگر اس بات پر گواہ ٹھہرے کہ یہ گواہی دینے والا جس نے یہ کائنات بنائی صرف اس کائنات میں ایک ہی وجود کا ثبوت ملتا ہے جو **عزیز** ہے اور جو **حکیم** ہے۔ پس اس پہلو سے اس گواہی میں ایک بڑی عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر جس تعلق میں خاص طور پر میں آپ کے سامنے یہ آیت رکھ رہا ہوں وہ آپ کی ذات کا تعلق ہے اور میری ذات کا تعلق ہے۔ ہم جب کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری گواہی کے حق میں ہمارے اندر کون سے ایسے شواہد ہیں یعنی گواہی کے حق میں کون سے گواہ ہمارے اندر موجود ہیں جو دنیا کو یقین دلا سکیں کہ ہم اس گواہی میں سچے ہیں۔ وہ گواہی کردار کی گواہی ہو سکتی ہے اور علم کی گواہی ہو سکتی ہے اور حکمت کی گواہی ہو سکتی ہے۔ علم اور حکمت کی گواہی سے مراد یہ ہے کہ ہم جب گواہی دیتے ہیں مثلاً روزانہ نماز میں پانچ وقت یہ پڑھتے ہیں **اشھدان لا الٰه الا اللّٰه وحده لا شریک له و اشهد انّ محمداً عبده ورسوله** تو کبھی ہم نے غور کیا کہ ہم گواہی کس برتے پر دے رہے ہیں۔ ہمیں خدا کا کیا ذاتی علم ہے اور خدا کی حکمتوں سے ہم نے کس حد تک حصہ پایا ہے۔ آج کون سا نیا مضمون لے کے ہم اٹھے ہیں کہ از سر نو گواہی کو دہرا رہے ہیں **اشھدان لا الٰه الا اللّٰه وحده لا شریک له و اشهدانّ محمداً عبده ورسوله** اگر یہ گواہی خالی ہو، نہ ہمیں خدا کا علم ہو، نہ خدا کی حکمتوں سے واقف ہوں۔ خدا کا علم مکمل تو ناممکن ہے اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ عطا فرماتا ہے مگر عطا انہی کو فرماتا ہے جو اس میں جستجو کرتے ہیں اور حکمتوں پر بھی کوئی محیط نہیں ہو سکتا وہ

لامتناہی سلسلہ ہے۔ مگر ہر روز خدا نئے علم کے ساتھ اپنے بندوں پر ظاہر ہوتا ہے نئی حکمتوں کے ساتھ مگر اپنے بندوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ پس ہم کس حد تک خدا کے بندے بن رہے ہیں بالارادہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہمارا قدم اٹھ رہا ہے اور کیا ہر صبح ہم یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ہاں ایک ہی خدا ہے اور کوئی خدا نہیں اور اس گواہی کے حق میں ہمارا کون سا علم ہے جو بطور دلیل کے ہم دنیا کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اپنی ذات پر آپ غور کر کے دیکھیں تو روزانہ صبح سے رات تک اور پھر رات کو سوتے وقت بھی آپ کی خوابیں آپ پر گواہ بن جاتی ہیں۔ صبح سے شام تک ہونے والے واقعات اور ان واقعات میں وہ فیصلے جو آپ کرتے ہیں وہ آپ پر گواہ بن جاتے ہیں اور آپ کی شخصیت کو خود آپ سے ہی تعارف کرواتے رہتے ہیں آپ کی خوابیں بھی وہی کردار ادا کرتی ہیں۔

پس سوتے اور جاگتے ہم اپنی ذات سے متعارف ہو رہے ہیں اور اس تعارف کے نتیجہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم جب **التحیات للّٰہ** میں خدا کے حضور جو **تحیہ** پیش کرتے ہیں اس **تحیہ** میں سچائی ہے بھی، کہ نہیں اور جب ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ آج ہم گواہی دے رہے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو کس برتے پر گواہی دیتے ہیں۔ کون سا نیا علم ہم نے خدا کی ذات کے تعلق میں حاصل کیا، کون سی ایسی حکمت کی بات ہمیں معلوم ہوئی جس پر ہم کہہ سکیں کہ ایک ہی خدا ہے اور کوئی خدا نہیں۔ تو محض **اشھد** کہہ کر انگلی اٹھا دینا اور گواہی دے دینا یہ ہماری نجات کا موجب نہیں بن سکتا نہ ہی یہ گواہی کسی کے لئے قابل قبول ہوسکتی ہے کیونکہ ایسی ہی گواہی دینے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض اوقات ایک گواہی دیتا ہے جیسا کہ سورۃ المنافقون میں آیت دو تا چار میں ذکر ہے۔ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (المنافقون:2) جب منافق تیرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں، وہی **اشھد** جو ہم پڑھتے ہیں، وہ کہتے ہیں نَشْهَدُ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ کہ تو اللہ کا رسولؐ ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ اب وہی علم کا مضمون یہاں اس گواہی کے تعلق میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسولؐ ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں یعنی گواہی سچی ہونے کے باوجود جھوٹی ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت پر اگر آپ آگاہ نہ ہوں اگر آپ شعوری طور پر یہ سوچیں نہیں کہ آپ کی گواہیاں

اپنے مضمون کے اعتبار سے سچی بھی ہوں تو آپ بطور جھوٹے گواہ لکھیں جائیں گے تو اس وقت تک آپ کو ایک گھبراہٹ پیدا نہیں ہوگی، اپنے دل میں ایک پریشانی اور انتباہ کی کیفیت محسوس نہیں کریں گے۔ پریشانی اس بات پر کہ ہم منہ سے جو کہتے ہیں ہمیں پتا ہی نہیں، ہم کہہ کیا رہے ہیں اور واقعۃً جو کہتے ہیں وہ دل میں ہے بھی کہ نہیں اور اگر سچ سمجھ کے بھی کہہ رہے ہیں تو اس کے حق میں ہمارے پاس کیا ثبوت ہیں اور انتباہ ان معنوں میں کہ اگر یہ صورت حال غفلت کی اسی طرح رہے اور اسی حال پر انسان جان دے دے تو تمام عمر کی نمازوں کی ہر گواہی جھوٹی لکھی جائے گی۔

آج جو دنیا میں بدکرداری کا دور ہے جس کی طرف میں نے شروع ہی میں اشارہ کیا کہ شرک ہی شرک پھیلا ہوا ہے اس میں یہی تو ہو رہا ہے۔ کتنے مذاہب ہیں جو یہ گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے یا ایک سے زیادہ بھی مانیں تو ایک خدا کے حق میں بھی گواہی دیتے ہیں مگر عملاً ان کے کردار پر اس گواہی نے کیا اثر ڈالا اور ان کا کردار اس گواہی کے حق میں کیا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ پس اس پہلو سے ہم نے جو تمام دنیا کو توحید پر اکٹھے کرنا ہے اور تمام دنیا کو شرک سے نکال کر توحید کی پناہ گاہ میں لانا ہے ہم پر کس حد تک یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا تصور کیجئے کہ ہم توحید کا سفر اپنی ذات سے شروع کریں۔ اگر غفلتوں کی حالت میں ہم نمازیں پڑھتے رہے تو نہ ہم موحد بن سکیں گے نہ دنیا کو موحد بنا سکیں گے کیونکہ توحید کا مضمون سچائی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے علم سے تعلق رکھتا ہے جو معزز علم ہے جو عزت لاتا ہے اور غلبہ لاتا ہے اور پھر حکمت سے تعلق رکھتا ہے۔ تو اس تعارف کے ساتھ میں آپ کے سامنے یہ مضمون نسبتاً زیادہ کھولتا ہوں، روزمرّہ کی زندگی کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

ہم اگر سارا دن جھوٹ بولتے ہوں، سارا دن بدکلامیاں کرتے ہوں، جہاں اپنی ذات کا تعلق ہو وہاں انصاف کا گز اور طرح کا بنائیں، جہاں غیر کی ذات کا تعلق ہو وہاں انصاف کا گز اور طرح کا بنالیں، پیمانے بدلتے رہیں اور روزمرہ کی زندگی میں جھوٹ کی اتنی عادت ہو چکی ہو کہ جو سچے ہیں وہ بھی اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر ضرور پھسل جاتے ہیں اور سچائی اس حد تک اپناتے ہیں جس حد تک اس کا اپنانا ہمیں نقصان نہیں پہنچاتا اور جہاں سچائی اور نقصان آمنے سامنے کھڑے ہوئے وہاں کب اور کس حد تک ہم سچائی کو پکڑتے اور جھوٹ کو ترک کر دیتے ہیں، مردود کر دیتے ہیں یہ وہ سوال ہے جو پہلے نفس میں اٹھنا چاہئے اور روزانہ اٹھنا چاہئے۔ اگر ہماری یہی کیفیت رہے کہ ہمیشہ

جب بھی ہمارا مفاد سچائی سے ٹکرائے تو سچائی اس مفاد سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہم اس دن نمازیں، ہر نماز میں یہ گواہی دیں **اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و اشھد ان محمداً رسولہ** تو خدا آسمان سے یہ گواہی دے گا کہ میں جانتا ہوں کہ میں ایک ہوں اور میں جانتا ہوں کہ محمد ﷺ میرا رسولؐ ہے اور میرا عبد ہے لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو کیونکہ اس یقین اور علم کے بعد کہ خدا ایک ہے اور اس یقین اور علم کے بعد کہ خدا کے بندہ محمد رسول اللہ ﷺ اس کا بندہ بھی ہیں اور رسولؐ بھی ہیں پھر ہم اپنی ذات میں ایک تضاد قائم رکھیں اور روزمرّہ کی زندگی میں جہاں بھی توحید کو اختیار کرنا ہو اور غیر اللہ کو چھوڑنا ہو بلا تردد غیر اللہ کو اختیار کر لیں اور توحید کو چھوڑ دیں تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔

یہ محض ایک تقریر کا فقرہ نہیں کہ خدا آسمان سے گواہی دے تقریروں میں ایسے فقرے آجاتے ہیں۔ مگر میں نے اس فقرہ کی بناء اس گواہی پر رکھی ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ جب بھی منافق تیرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسولؐ ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ تو اللہ کا رسولؐ ہے۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اب وہ منافق تو خدا جانے کتنی دفعہ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوں گے۔ ہر روز تو ان کو توفیق نہیں ملتی ہوگی۔ کبھی کبھار ہفتے میں ایک یا دو بار شاید جب ملتے ہوں اور ملتے ہوئے یہ گواہی دیتے ہوں مگر خدا کے سامنے ہم روز حاضر ہوتے ہیں۔ پانچ نمازوں میں حاضر ہوتے ہیں، ہر نماز میں ایک ایسا قعدہ بھی آتا ہے جس میں ہمیشہ ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ اے خدا ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ایک ہے تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اب وہ خدا جو ان منافقوں سے یہ سلوک کرتا ہے وہ اگر صاحب قسط ہے جیسا کہ گواہی دیتا ہے تو اس کے قسط کا، اس کے انصاف کا تقاضا ہے کہ جب بھی توحید کے بارے میں یا آنحضرت ﷺ کی صداقت کے بارے میں کوئی جھوٹی گواہی دے تو آسمان سے خدا اس گواہی کا انکار کرے اور اعلان کرے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔

کیا ہم نمازوں میں اس قسم کی لعنتیں تو نہیں سمیٹ رہے؟ پس قرآن کریم جن نمازوں کے متعلق فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (الماعون:5) اس مضمون پر غور کر کے اس ویل کی سمجھ آجاتی

ہے، ہلاکت ہو نماز پڑھنے والوں پر، لعنت ہو نماز پڑھنے والوں پر، اب **نعوذ باللہ من ذٰلک** نماز پڑھنے والوں پر تو لعنت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا لیکن یہ خدا کا کلام ہے اور قرآن کی عظمت کا نشان ہے۔ تمام دنیا کی الٰہی کتابوں میں آپ تلاش کر کے دیکھ لیں وہاں نمازیوں پر لعنت نہیں ڈالی جائے گی مگر بعض نمازیوں پر قرآن لعنت ڈالتا ہے اور وہ لوگ جنہوں نے قرآن سے یہ مضمون سیکھا ہے وہ بزرگ اور صوفیاء بھی ایسے نمازیوں کا ذکر کرتے ہیں اور لعنت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں مگر اصل اعلان قرآن کا اعلان ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (الماعون: 5,6)۔ وہ نماز پڑھنے والے جو نماز سے غافل ہیں ان پر لعنت ہو اور ان کی غفلت کی سب سے بڑی پہچان یہ گواہی ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے: **اشھد انّ لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ و اشھدانّ محمداً عبدہ و رسولہ** میں گواہی دے رہا ہوں کہ خدا ایک ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ یہ صرف ایک ایسا اقرار نہیں ہے جو ساکت اور جامد ہو۔ جو خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ بات ہے کہ یہ ایک جاری اعلان ہے اور ہر نماز اور ہر دو نمازوں کے درمیان آپ کا ضرور خدا تعالیٰ کے متعلق کچھ علم بڑھنا چاہئے۔ ورنہ ایک ہی گواہی آپ دیتے چلے جائیں اور دیتے چلے جائیں اور اس کا تجربہ کچھ نہ ہو یہ ایک بے معنی سی بات بن جائے گی۔ لوگ کہتے ہیں نماز میں جب ہم ایک ہی جیسی باتیں دہراتے ہیں اور ہر نماز میں دہراتے ہیں اور دہراتے چلے جاتے ہیں تو کیا یہ بات اکتاہٹ پیدا نہیں کرتی اور بعض معترضین یہ سوال اٹھاتے ہیں جس کو بوریت کہتے ہیں تو کیا نماز آپ کو بور نہیں کر دے گی ہر نماز میں وہی باتیں۔ مگر اس مضمون پر ایک دفعہ میں نے پہلے تفصیل سے روشنی ڈالی تھی ہر نماز کی وہ باتیں برتن ہیں جو ہر روز نئے مشروب سے بھرتی ہیں۔ وہ باتیں چاہے ایک ہی ہوں مگر وہ تو محض ظروف کا کام دیتی ہیں، برتنوں کا کام دیتی ہیں اور ان برتنوں میں ضرور آپ نے کچھ بھرنا ہے اور وہ کچھ ہے جو آپ لے کر پیش ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان برتنوں کو خالی رکھیں کوئی نئی بات اس میں نہ بھریں تو لازم ہے کہ آپ بور ہوں گے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ آپ ہزار مرتبہ کہیں اور حمد کا ایک ہی معنی دماغ میں رہے، ربوبیت کا ایک ہی معنی رہے اور اپنے ربوبیت کے تجارب کو آپ اَلْحَمْدُ کے ساتھ وابستہ نہ کریں، اگر آپ اپنے ربوبیت کے تجارب کو اَلْحَمْدُ کے ظرف

میں نہ بھریں اور رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہتے ہوئے جب حمد کہتے ہیں تو آپ کو یہ علم نہ ہو کہ آج آپ کیوں رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہنے کے مستحق ہیں۔ آج کیا نئی بات آپ نے دیکھی جس کی وجہ سے آپ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ ہی رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔ یہ جو نئی باتیں ہیں ان کا تعلق علم اور حکمت دونوں سے ہے۔ علم کی رو سے آپ کا جوں جوں علم بڑھتا ہے کائنات پر آپ غور کرتے ہیں نظام کائنات کو دیکھتے ہیں، اس کے ربوبیت کے نشان دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں کہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے ربوبیت کا جو ختم ہونے میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کی ربوبیت کا نظام کب سے جاری ہوا کب تک جاری رہے گا انسان اس کے تصور میں اگر ساری زندگی گزارے اور نسل انسانی، ایک کے بعد دوسری نسل مسلسل اس تصور میں، اس کھوج، اس جستجو میں اپنی زندگیاں لٹا دے تو تب بھی خدا تعالیٰ کی ربوبیت کے علم پر حاوی نہیں ہو سکتی اور یہ جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ میں ہی نہیں کہہ رہا دنیا کے تمام سائنس دان جو اس مضمون سے واقف ہیں وہ یہی کہتے ہیں۔ ابھی تک ہمیں یہ بھی پتا نہیں چلا کہ ہماری کائنات میں جو ربوبیت کے لئے سامان رکھے گئے کب کب، کیسے رکھے گئے اور اب تک جو دریافت ہوئے ہیں ان کے علاوہ اور کتنے باقی ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے یعنی زمانے کے لحاظ سے اگر ہمارا دنیا کا دور ساڑھے چار ارب سال ہو تو زمانے کے لحاظ سے اگر یہ کہیں کہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ انسان کو درخت کی لکڑی جلانا بھی نہیں آتا تھا اور بے شمار لکڑی اس کے لئے پڑی ہوئی تھی۔ اس کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کائنات، اس زمین پر کیا کیا چیزیں میری خاطر پیدا کی گئی ہیں، ان کی صفات کیا ہیں، کون سی میرے کھانے میں کام آئیں گی، کون سے زہر ہیں جو میرے کھانے کے کام تو نہیں آئیں گے مگر میرے علاج میں کام آ سکتے ہیں اور اگر میری ربوبیت براہ راست نہیں کرتے تو کسی اور وجود کی براہ راست ربوبیت کر رہے ہیں۔ ایسے ایسے زہریلے مادے ہیں کہ انسان ان کو چکھنے کا تصور نہیں کر سکتا مگر ان میں زندگیاں چل رہی ہیں۔ بے شمار زندگی کی قسمیں ہیں جو ان سے استفادہ کرتی ہیں اور پھر وہ آپ کے کام آتی ہیں۔

ربوبیت کا ایسا حیرت انگیز نظام ہے کہ اس کا مختصر تعارف کروانا بھی ممکن نہیں ہے میں نے بارہا اپنی مجالس میں اس تعارف کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر کچھ دیر مضمون کو آگے بڑھا کر بالکل بے طاقت ہو جاتا ہوں۔ ناممکن ہے کہ وہ شعبے ہی گنوا سکوں اور وہ شعبے جن پر میں نظر ڈالتا ہوں اور

میری روح حمد میں ڈوبتی ہے۔ مگر میرا علم محدود ہے اور اتنا محدود ہے کہ سائنس نے اب تک ان امور پر جو روشنی ڈالی ہے اس کا ایک بہت ہی معمولی حصہ ہے جس کو میں جانتا ہوں اور سائنس اس مضمون میں آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا ایک جگہ میں نے ایک جھیل پہ جو بہت ہی گندے پانی کی جھیل تھی ایسی کہ اس سے گزرتے ہوئے بدبو آتی تھی اور طبیعت چاہتی تھی کہ جلدی سے جس حد تک ممکن ہو سانس روک کر انسان آگے نکل جائے وہاں میں نے گل بکاؤلی کھلتے ہوئے دیکھا ہے اور اتنے خوبصورت پھول تھے ایسا سبزہ تھا ایسی اس پہ شادابی تھی کہ عقل دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ جس گندگی کو ہم حقارت سے دیکھ رہے ہیں اسی گندگی سے تو اللہ حسن نکال رہا ہے اور اس کی ربوبیت کی عجیب شان ہے کہ گندگی کا کوئی پہلو بھی نہ ان پتوں میں جاسکا، نہ ان پھولوں میں ظاہر ہوا۔ انتہائی بدبودار چیز سے بہت ہی خوشبودار پھول، لہلہاتے ہوئے اور خوشبودار پھول نکلے اور اتنے بڑے اور چوڑے کہ انسان حیران ہو جاتا ہے جیسے تھالیاں لگائی گئی ہوں، حسن اور رنگ کی تھالیاں لگا دی گئی ہوں اور ان میں خوشبو پیش ہو رہی ہو۔ میں نے کہا انسان کتنا جاہل ہے گندگی کو بھی تکبر سے دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ بھی تو گندگی ہی سے نکلا ہے اور گندگی سے نکلی ہوئی چیزیں ہی اس کی بقا کا موجب ہیں۔

اب یہ ایک پہلو ہے ربوبیت کا جس کی طرف توجہ پھرتی ہے تو انسان خدا تعالیٰ کی قدرتوں کے سمندر میں اپنے آپ کو ایک قطرے سے بھی کم سمجھتا ہے یعنی قطرہ دیکھنے والا نہیں کیونکہ اس سمندر میں وہ بھی تو ایک قطرہ ہے جو عجائبات کا ایک سمندر ہے۔ پس یہ عجیب مضمون ہے کہ جو دیکھنے والا ہے وہ بھی تو اسی قدرتوں کے سمندر کا ایک معمولی سا ذرّہ ہے مگر ایسا ذرّہ جس پر کوئی دنیا میں محیط نہیں ہوسکتا ، خود انسان کا علم انسان نہیں پاسکتا۔ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ (البقرة:256) اللہ تعالیٰ کے علم پر کون ہے جو احاطہ کر سکے۔ صرف اسی حد تک احاطے کی توفیق ملے گی جس حد تک خدا خود توفیق دے گا اور وہ احاطہ ایک نسبتی احاطہ ہے اور وہ احاطے کے ایسے دائرے ہیں جو دائرہ در دائرہ پھیلتے چلے جاتے ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ میں نے احاطہ کر لیا اور پھر پتا چلتا ہے کہ احاطہ کہاں کیا تھا۔ اس احاطے کے اندر سے اور دائرے پھوٹ رہے ہیں جن تک میری رسائی نہیں۔ آج تک سائنس کسی ایک جستجو میں بھی اور یہ میں

بلا مبالغہ پورے یقین کے ساتھ آپ کو بتا رہا ہوں آج تک سائنس کسی ایک جستجو میں بھی یہ نہیں کہہ سکی کہ ہم نے آخری کنارے کو پالیا ہے۔ جس کو وہ آخری کنارہ سمجھتے ہیں اس کنارے سے اور کنارے پھوٹ جاتے ہیں جیسے پانی پہ پتھر پھینکیں تو جو پہلی لہر اٹھتی ہے وہ کم دائرے کی ہوتی ہے، تھوڑے دائرے میں محدود ہوتی ہے مگر وہ لہر در لہر پھیلتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے اور کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اگر اس کا دائرہ محدود نہ ہو جس میں وہ سمٹی پڑی ہے یعنی وہ سمندر تو جو لہر اٹھے گی اگر دوسرے عوامل اس کو ختم کرنے کے لئے مقابل کی کوشش نہ کریں تو اپنی ذات میں جو لہر اٹھتی ہے وہ پھیلتی چلی جائے گی اور اس کے دائرے وسیع تر ہوتے چلے جائیں گے۔

پس خدا کی کائنات کا یہ علم تو لامتناہی ہے۔ مگر ہر ذرّے کا علم لامتناہی ہے یہ ہے مضمون جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں کائنات کا جس میں آپ خدا کے علم پر محیط ہو سکیں اور ربوبیت کے تعلق میں جب آپ غور کریں تو وسیع علمی غور اگر نہ بھی کر سکیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اپنے انفس میں تو دیکھو۔ دو ہی ذریعے ہیں خدا کو پانے کے یا آفاقی نظر پیدا کرو اور ساری کائنات پر نظر دوڑاؤ یا پھر اپنے نفوس میں سمٹ جاؤ، اپنی ذات میں ڈوبو اور وہاں تلاش کرو کہ تم میں خدا تعالیٰ نے ربوبیت کے کیسے کیسے عظیم الشان راز پنہاں کر دیئے ہیں۔ ایسے راز ہیں جن کا سلسلہ ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ بھی توفیق نہیں تو یہ تو دیکھو کہ خدا نے روزانہ تمہارے لئے کیا کھانے پینے کا انتظام کیا ہوا ہے اور ہر بندے کے لئے جو زندہ ہے کچھ نہ کچھ اس کی غذا کا انتظام موجود ہی ہے اور ہر پرندے کے لئے موجود ہے ہر چرندے کے لئے موجود ہے۔

آج صبح جب میں سیر پہ گیا تو ایک چھوٹا سا پرندہ بہت ہی خوبصورت گھاس پر کچھ چگ رہا تھا۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ کیا کھا رہا ہے لیکن اس کی باریک نظر اس کو بتا رہی تھی کہ فلاں جگہ چونچ مارو اور اس کی چونچ ہمیشہ بھری ہوئی نکلتی تھی۔ اب اس کو سکھایا کس نے۔ یہ پہلو جو ہے یہ بھی تو عزیز حکیم سے تعلق رکھتا ہے۔ صرف کھانا رکھ دینا کافی نہیں، کھانے تک پہنچنے کی استطاعت پیدا کرنا بھی تو کام ہے اور ہر وجود کو پتا ہے کہ میرا کھانا کہاں ہے۔ وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا (ھود: 7) وہ جانتا ہے کہاں میں عارضی قرار پکڑوں گا اور کہاں میں نے لوٹ کر جانا ہے۔ پس آج میں اس پرندے کو دیکھتا دیکھتا ظاہری سیر کو بھول کر ایک اور ہی سیر میں ڈوب گیا۔ میں نے سوچا کہ اللہ کی شان دیکھو

ان سب کو خدا نے علم بخشا ہے اس گھاس میں، اس مٹی میں تمہارے لئے غذا موجود ہے اور کہاں ہے اور کس طرح تم نے حاصل کرنی ہے اور وہ روزانہ صبح اس یقین کے ساتھ نکلتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان ہر قسم کے جانوروں کی غذا ہم نے اپنے اوپر رکھی ہے تم تو نہیں پیدا کرتے۔ اے انسان تم کہاں ان کو پال رہے ہو اور ہر چیز کی غذا موجود ہے۔ ایک چیز کا گند ہے دوسرے کی غذا بن جاتا ہے اور وہی گند صاف اور ستھرا ہو کر ایک اور پاکیزہ غذا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

پس اس پرندے کو دیکھ کر میں نے جب نظر دوڑائی تو ہر قسم کے پرندے اپنے اپنے مقصد کی جستجو میں مصروف دیکھے۔ کہیں کوئی جس کو لکڑ ہارا کہتے ہیں وہ ٹک ٹک کر کے ایسے درخت جو کھائے ہوئے ہوں، جو اندر سے کھوکھلے ہوں ان کے اوپر چونچیں مارتا اور اندر سے اپنی غذا کے نکلنے کی انتظار میں ہوتا ہے۔ اب کس نے اس کی عقل میں یہ بات ڈالی ہے؟ یہ سب ربوبیت کی تو باتیں ہیں۔ جوں جوں آپ کا علم بڑھتا ہے آپ ہر دفعہ جب کہتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو عجیب شان اور ذوق کے ساتھ آپ کے دل سے بے ساختہ آواز نکلتی ہے سب حمد اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور وہ لکڑ ہارا جس کی میں بات کر رہا ہوں اس کو لکڑ ہارا اردو میں کہتے ہیں مگر انگریزی میں وڈ پیکر Woodpecker وہ پرندہ ہے جس کے اوپر مزید تحقیق ہوئی تو مزید خدا کی قدرت کے عجائب سامنے آئے۔ وڈ پیکر بہت تیزی کے ساتھ چونچ مارتا ہے درخت کے تنوں کے اوپر اور ہم سمجھتے ہیں ٹک ٹک ٹک ٹک کی دو چار آوازیں ہیں۔ سائنس دانوں نے جب بہت ہی حساس کیمروں کے ذریعے جو بہت تیز رفتار تھے اس کی چونچوں کی ٹک ٹک کو دیکھا تو حیران رہ گئے کہ جو ایک ٹک ہے اس کے اندر سینکڑوں بار وہ سر نیچے اترتا ہے اور اس تیزی سے وہ ٹکر مارتا ہے کہ ہماری آنکھ کو ایک یا دو یا تین حرکتیں دکھائی دیتی ہیں مگر تیزی کی وجہ سے وہ حرکتیں مل جاتی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں ایک اب اس نے گردن جھکائی اور ایک ٹکر ماری پھر دوسری ٹھوکر ماری تیسری ماری، اس کے اندر سینکڑوں دفعہ وہ ٹھوکر مار چکا ہوتا ہے یعنی درخت سے اپنی چونچ ٹکرا چکا ہوتا ہے اور کیوں کرتا ہے اس لئے کہ اس کو خدا نے یہ علم بخشا ہے کہ ان کھائے ہوئے درختوں کے اندر وہ کیڑے ہیں جو تمہارے لئے بہترین غذا ثابت ہوں گے اور جب تک تم ان کو بیدار نہیں کرو گے وہ باہر نہیں نکلیں گے اور جب تم بار بار اپنی چونچ ٹکراؤ گے تو پھر وہ باہر نکلیں گے اور جب وہ باہر نکلیں گے تو تم اس غذا کو کھا لینا۔ اب اس کے اندر بھی عجائبات

ہیں۔Evolution کے ذریعے یعنی ارتقاء کے ذریعے اس پرندے کو کیسے سمجھ آئی کہ تیز رفتار سے میں جب چونچیں ماروں گا تو کیڑے نکلیں گے ورنہ نہیں نکلیں گے اور کتنے لاکھ سال اس ارتقاء کو چاہئے تھے۔اس سے پہلے وہ کیسے زندہ رہتا تھا لیکن صرف یہی بات نہیں وہ حرکت اتنی طاقت ور ہوتی ہے وہ چونچ اس زور سے لگتی ہے کہ سائنس دان کہتے ہیں کہ دماغ پھٹ جائے اس کا اگر اس کا کوئی خدا تعالیٰ نے دفاع مقرر نہ کیا ہو۔پس یہ ایک ہی پرندہ ہے جس کی چونچ اور اس کے دماغ کے درمیان خدا تعالیٰ نے ایک کشن Cushion رکھ دیا ہے اور جب وہ چونچ مارتا ہے تو وہ کشن دبتا ہے اور دماغ کو ٹھوکر سے بچا لیتا ہے۔

اب آپ دیکھیں کہ کیا کوئی بھی ارتقاء کا نظریہ اس مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔اگر زور کی ٹکر مارنا ان کیڑوں کو نکالنے کے لئے ضروری ہے تو دو چار ٹکروں میں ہی وہ پرندہ پاگل ہو کے مر چکا ہوتا اور وہ کشن بنانے میں کتنی دیر لگی اور کون سے ارتقاء کے طبعی تقاضے ہیں جنہوں نے وہ کشن بنایا اس کا Mechanism پیدا کیا۔اس پر آپ غور کریں تو یہی ایک پرندہ انسان کی عقل کو حیرت کے سمندر میں ڈبونے کے لئے کافی ہے اور پھر وہ کس طرح جا کر اپنے بچوں کو یہ خوراک دیتا ہے اور روزانہ اسی پہ پل رہا ہے۔کس نے اس کو سکھایا کہ تمہاری غذا کہاں کہاں ہے۔کوئی بھی ایسا پرندہ نہیں جس کو علم نہ ہو کہ میری غذا کہاں ہے اور وہ بچہ جو پہلے دن مثلاً گھوڑے کا بچہ پیدا ہوتا ہے یا ہرن کا بچہ پیدا ہوتا ہے یا بکری کا بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اٹھتا ہے اور ماں کے تھن کی طرف دوڑتا ہے اور انسان کا یہ حال ہے کہ اسے سکھائیں بھی تو بسا اوقات وہ سیکھ نہیں سکتا۔بعض بچوں کو دودھ پلانا بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔مگر اکثر خدا تعالیٰ کی طرف سے اتنا علم یافتہ ضرور ہوتے ہیں کہ ماں کا دودھ چوسنا ان کو آجاتا ہے۔کیوں آتا ہے؟ کیسے پتا چلتا ہے کہ یہ میری غذا ہے؟ یہ ساری وہ باتیں ہیں جو جب تک دماغ کے اندر کندہ نہ ہوں اس وقت تک انسان کی اپنے رزق تک رسائی ہو نہیں سکتی۔پس رزق کا پیدا ہونا الگ مضمون ہے۔یہ علم کہ یہ میرا رزق ہے یہ ایک الگ مضمون ہے۔ہر وہ پھل یا پھول جو ہمیں دکھائی دیتا ہے ہمیں علم نہیں کہ اس میں غذا کون سی ہے، بڑے لمبے تجربہ کے بعد ہمارا علم کچھ بڑھا ہے لیکن ہر جانور کو پتا ہے کہ فلاں جو پھل ہے میں نے کھایا تو میں اس سے مر جاؤں گا۔فلاں پھول کا رس میرے لئے زہر ثابت ہوگا۔ہر ایک کو اپنی اپنی غذا کا علم ہے اور کیسے حاصل کرنی ہے؟ کیسے اس تک رسائی ہونی ہے

لیکن عجیب بات ہے کہ جب اس لکڑ ہارے کے چونچ ٹکرانے کے مضمون پر آپ غور کریں تو آپ کو یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ اس کی چونچوں کے ٹکرانے سے جو قارعہ پیدا ہوتی ہے وہ چھوٹے چھوٹے ایسے کیڑے مکوڑے بھی جو دماغ کے لحاظ سے یا رکھتے ہی نہیں یا نہایت معمولی دماغ رکھتے ہیں وہ بیدار ہو جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہمیں اذن ہے باہر نکلنے کا اور وہ باہر نکل آتے ہیں۔ مگر انسان کی کیا حالت ہے کتنی دفعہ خدا کی قارعہ اسے جگاتی ہے کیسے بار بار اس کی چھاتی پر خدا کی طرف سے وہ چوٹیں پڑتی ہیں جو اسے جگانے کے لئے اور خدا تعالیٰ کا شعور بیدار کرنے کے لئے بعض دفعہ ایک ابتلا کے طور پر ماری جاتی ہیں۔ کتنے غم ہیں جو چوٹیں مار جاتے ہیں اور کتنی چوٹیں ہیں جو ہمیں بیدار کرتی ہیں؟ یہ ہے سوال۔ کیڑے تو اٹھ جاتے ہیں، سنڈیاں اٹھ جاتی ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ ہمیں حکم ہے باہر نکلنے کا مگر انسان اپنی جہالت کے قید خانے میں اسی طرح پڑا رہتا ہے اور آئے دن ہمیں بیدار کرنے کے لئے آسمان سے اور زمین سے بھی نشان ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پس اگر ان نشانوں پر ہم غور کریں تو پھر ہماری نماز زندہ ہو گی پھر ہم خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ اے خدا ہم گواہی دیتے ہیں **کہ تو ایک ہے اور تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ جہاں بھی رزق دیکھا تیرا ہی دیکھا ہے۔ جہاں بھی پناہ پائی تیری ہی پناہ پائی ہے۔ نہ تیرے سوا کوئی رازق ہے، نہ تیری پناہ کے سوا کوئی پناہ ہے۔ تو ہی ہے جو پالتا ہے تو ہی ہے جو دردوں کو ٹالتا ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں ہے** اور یہ جو ''نہیں ہے'' کی گواہی ہے یہ وہ گواہی ہے جو ہر روز انسان جھوٹی گواہی دیتا ہے کیونکہ اگر اس کو یقین ہو کہ خدا ہی ہے اور کائنات میں دیکھتا ہے تو خدا ہی دکھائی دیتا ہے، ساری کائنات کا علم گواہ بن جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی رازق ہے اور وہی پالنے والا ہے، وہی ہر چیز کی پناہ گاہ ہے پھر بھی جب اپنے لئے پناہیں ڈھونڈتا ہے تو غیر اللہ کے لئے پناہیں ڈھونڈتا ہے۔ اپنے لئے جب رازق تلاش کرتا ہے تو جھوٹ کو رازق بناتا ہے اور بددیانتی کو رازق بناتا ہے۔ کسی کا حق تلف کرنے کو رازق بناتا ہے۔ تو یہ وہ وجہ ہے کہ قسط کا مضمون میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

قسط کے بغیر گواہی سچی ہو ہی نہیں سکتی۔ پس ایک اندرونی انصاف اپنے اندر پیدا کریں جب تک آپ اپنے نفس کے خلاف گواہی دینے پر تیار نہ ہوں اور پورے یقین اور قوت کے ساتھ ہر روز اپنے نفس کو جھوٹا قرار دینے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اس وقت تک آپ کا نفس سچ سیکھ ہی نہیں

سکتا اور یہ تجربے ہر روز بے شمار ہوتے ہیں اور ہرگز یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہر نماز میں، ہر تشہد کے وقت جب آپ کہیں اشھدانّ لا الہ الا اللّٰہ تو آپ واقعۃً بعض باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ کہیں کہ ہاں ہم نے ایک اور راز پالیا ہے جو توحید کا راز ہے۔ آج ہم نے ایک اور راز دریافت کیا وہ بھی توحید کا راز ہے اور ہر انگلی جو اٹھتی دیکھی اے خدا وہ تیری ہی طرف اٹھتی ہے۔ یہ وہ گواہی ہے جو تجارب سے حاصل ہوتی ہے، جو مشاہدے سے ملتی ہے اور اس کے سوا اس تشہد کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ جب فرماتے ہیں:

چشم مست ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے
ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خم دار کا

(درثمین اردو: 10)

تو یہ تصور کیوں پیدا ہوا۔ یہ تصور ایک عارف باللہ کے ذہن میں آ سکتا ہے اور وہ سارا نظم کا مضمون ہی ایسا ہے جو ذاتی مشاہدے اور عرفان کے بغیر ایک شاعر کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتا۔ ہر بات پر غور کیا اور کہا کہ ہاں اے خدا ہر انگلی تیری طرف اٹھتی دیکھی ہے ہم نے:

چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بے کل ہو گیا
کیونکہ کچھ کچھ تھا نشاں اس میں جمالِ یار کا

(درثمین اردو: 10)

اب یہ گواہی دیتے وقت بھی دیکھیں کیسی احتیاط برتی جارہی ہے ”کچھ کچھ تھا نشاں“ اور گواہی سچی ہے۔ دنیا کے عاشق جب باتیں کرتے ہیں اور چاند کے حوالے سے کریں یا سورج کے حوالے سے تو ایسا مبالغہ کرتے ہیں کہ اپنی گواہی کو خود جھوٹا بنا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں چاند کو دیکھا تو اس میں تو کچھ بھی نہیں تھا، پھیکا پڑ گیا تھا، تیرے اس نور کے سوا کوئی نور رہے ہی نہیں۔ چاند میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اب دیکھو کتنا بڑا جھوٹ ہے بعض ایسے محبوبوں کی تعریف کر رہے ہیں جو اندھیرے میں دکھائی بھی نہ دیں۔ ان میں جگنو جتنی روشنی بھی نہیں ہے مگر چاند کو اس کے مقابل پر پھیکا اور بے معنی اور بے حقیقت دکھاتے ہیں۔

اور حضرت مسیح موعودؑ چاند کے نور کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک بھی جگہ آپؑ کے عشق میں مبالغہ نہیں۔ ایک بھی جگہ آپؑ کے عشق میں جھوٹ کی ادنیٰ سی بھی آمیزش نہیں ہے۔ تھا تو سہی ”کچھ

کچھ تھا نشاں'' ہم نے چاند سے تجھے دیکھا میرے آقا لیکن اس کے نور میں کچھ معمولی سی جھلک تھی تیری روشنی کی، اس روشنی نے ہمیں تیرا دیوانہ بنایا اور تیری تلاش میں چاند سے پرے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ وہ مضمون ہے جو اس ساری نظم کی جان ہے، ہر مصرعے کی جان ہے اور ذرے پر غور کیا ان کے خواص پر غور کیا ایک ایسا جہان پایا جو نہ ختم ہونے والا جہان ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے تعارف حاصل کریں تو پھر بھی آپ کو پتا چلے گا کہ یہ گواہی کیسے دی جاتی ہے کہ ''**اشھدانّ لا الہ الااللّٰہ و اشھدانّ محمداً عبدہ ورسولہ**''۔

ہر روز جو آپ کے لئے خدا تعالیٰ نشان دکھاتا ہے اور ہر شخص کے لئے کچھ نہ کچھ نشان خواہ وہ دہریہ بھی ہو ضرور ظاہر ہوتے ہیں اس کو وہ اتفاقات کے حوالے کر دیتا ہے۔ کہتا ہے اتفاقاً میری جان بچ گئی، اتفاقاً یہ واقعہ ہو گیا۔ اگر بارش اتنے دن کے بعد نہ ہوتی تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ اس بے وقوف کو علم نہیں کہ ہر چیز کے اندازے ہیں اور پہلے سے مقدر ہیں۔ ہر چیز ایسے اندازوں پر چلائی جارہی ہے جو اپنے وقت پر ظاہر ہونے والے اندازے ہیں۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:22) وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ فرمایا کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو تم سوچ سکتے ہو مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور خَزَآئِنُهٗ میں جو تصور ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ لامتناہی، لامحدود خزانوں کی بات ہو رہی ہے وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ اس چیز کو جس کے خزانے ہیں ہم اتارتے ہیں اندازوں کے ساتھ ساتھ اور اندازے میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے تمہارے اندر وہ ظرف پیدا ہو چکا ہے کہ نہیں، کہ ان خزانوں کو استعمال کر سکو۔ اب جس بچے کے دانت نہ نکلے ہوں اس کے منہ میں آپ اچھا بھونا ہوا مرغا ڈال دیں تو اسے جان سے مارنے والی بات ہوگی۔ ہر شخص کا اپنا ایک ظرف ہے اس ظرف کے مطابق خدا تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی غذا ضرور بنا رکھی ہے اور انسان کا بھی ایک ظرف ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس بڑھتے ہوئے ظرف کے مطابق خدا تعالیٰ اپنے خزانے اس پر اتارتا چلا جا رہا ہے۔ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (الذاریات 48) کا یہ مضمون ہے جو ہمیں لامتناہی کائنات پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے آج تک کب وہ دن چڑھا کہ انسان کا دماغ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں سے آگے بڑھ گیا ہو۔ اسے ضرورت ہو کسی چیز کی، اپنے دماغ کے نتیجے میں یعنی دماغی صلاحیتوں کے نتیجے میں اس نے کچھ ایسی باتیں دریافت کی

ہوں جنہیں وہ عمل میں پورا کرنا چاہتا ہو اور کائنات میں اس کے پاس اس کا مصالحہ موجود نہ ہو وہ مادہ موجود نہ ہو۔ایک بھی دن ایسا نہیں چڑھا۔ جب انسان اتنے درجہ حرارت پر قابو پانے کے خواب دیکھنے لگا جو اس کی ضرورت بن گیا تھا یعنی لاکھوں درجے کی گرمی کی اس کو ضرورت پیش آ گئی اور کوئی ایسا مادہ نہیں تھا اس کے ہاتھ میں جس مادے سے وہ برتن بنا سکے جس برتن میں وہ اس درجہ حرارت کی چیز کو سنبھالے اور اس پر تجربے کر سکے تو اس کی آنکھیں کھلیں اور خدا نے ایک اور خزانہ اس پر اتارا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا (یعنی خدا تعالیٰ) گویا فرما رہا ہے کیونکہ اللہ کے اذن سے ہی یہ خزانے نکلتے ہیں کہ تم مقناطیس کا برتن بناؤ اور مقناطیس کی قوت سے اس قسم کا مضبوط برتن بناؤ کہ مقناطیس کا برتن جو نہ دکھائی دینے والا ہے اس کے اندر لاکھوں کروڑوں درجہ حرارت کی چیزیں پگھل رہی ہوں اور کھول رہی ہوں اور ایک دوسرے سے عمل دکھا رہی ہوں لیکن وہ گر نہ سکیں کیونکہ مقناطیس کے برتن کو کوئی گرمی پگھلا نہیں سکتی اور مقناطیس میں یہ طاقت موجود ہے کہ اگر اس کا خول بنایا جائے تو اس خول کے اندر چیز ٹھہر جائے۔اب ہم بھی تو مقناطیس کی طاقت ہی سے یعنی زمین کے مقناطیس کی طاقت سے زمین پر لگے ہوئے ہیں۔ساری دنیا جو گھوم رہی ہے ساری کائنات جو ایک دوسرے سے متصل ہے وہ نہ نظر آنے والے ستون جن پر یہ کائنات قائم ہے یہ سب کچھ اس غیر مرئی زمین کی کشش ہی سے تو پیدا ہو رہی ہے یہ طاقت۔ہم جو کائنات کو اور اتنے درجۂ حرارت کے ستاروں کو ہوا میں معلق دیکھ رہے ہیں جس درجۂ حرارت کا تصور باندھنا بھی ممکن نہیں اور جب میں یہ کہتا ہوں تو ایک درست بات کہہ رہا ہوں۔سائنس دان کو اس دنیا میں جتنی درجۂ حرارت کی ضرورت پیش آتی ہے وہ تو اس درجۂ حرارت کے مقابل پر کچھ بھی نہیں ہے جو ایک سمٹتے ہوئے ستارے سے پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی تمام گرمی اور تپش کے باوجود وہ فضا میں اسی طرح معلق ہے جس طرح باقی ستارے معلق ہیں۔کون سا برتن ہے جس نے اسے تھاما ہوا ہے۔کون سے ستون ہیں جسے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے اٹھایا ہوا ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی نظر اس طرف پھیر دی کہ ممکن ہی نہیں تمہارے لئے کہ تم اپنے شعور کو کسی ایسی چیز کے لئے بیدار کرو جو ہم نے تمہیں اصل میں سکھائی ہے لیکن تمہیں علم نہیں کہ کون سکھا رہا ہے اور پھر تمہیں مناسب حال برتن نہ ملیں ،مناسب حال اوزار نہ ملیں۔تمام مناسب حال برتن ،تمام مناسب حال اوزار اسی دنیا میں موجود پاؤ گے اور ہم ان کی طرف تمہاری نشان دہی کریں گے۔

پس خزانہ محض خزانے کے طور پر نہیں اترتا۔ خزانہ عقلوں کی روشنی لے کر اترتا ہے۔ وہ آسمان سے نور جب تک نہ اترے کہ خزانے کو کیسے استعمال کرنا ہے اس وقت تک خزانہ بھی بے کار ہے۔ پس یہ وہ رب ہے جس کے حق میں ہمیں ہر روز اپنی نماز میں گواہی دینی ہے۔ مگر اگر آفاق کے حوالے سے نہیں دے سکتے تو نفس کے حوالے سے تو دے کے دیکھیں۔ اپنے آپ کو تو سچا بنائیں۔ یہ تو دیکھیں کہ خدا کے رزق میں اگر چہ ہم اس کے شکر کا حق ادا کر ہی نہیں سکتے اس کے ادا کردہ رزق سے ہم نے کیا فائدہ اٹھایا۔ کس حد تک ایسا استعمال کیا کہ اس کی رضا کے تابع ہو۔ اب جہاں رزق کمانے کی میں نے بات کی ہے وہاں رزق کے خرچ کی بات بھی تو ہے۔ اگر انسان رزق کماتا بھی حرام کے ذریعے سے یا جائز بھی کماتا ہے اور حرام کا موقع ملتے ہی حرام کے موقع پر بھی ضرور منہ مارتا ہے تو اس کا سارا رزق گندا ہو جاتا ہے۔ پھر جب خرچ کرتا ہے اگر اس کے اندر طاقت ہو کہ اس کی انا کا بت اس سے پل سکے۔ اگر یہ کیفیت ہے تو پھر لآ الٰہ الا اللّٰہ کی گواہی اسے کب زیب دیتی ہے۔ بہت ہی دردناک منظر ہے، بہت ہی دل دہلا دینے والا مضمون ہے۔ پس ہر نماز ہمیں جھنجھوڑتی ہے ہم سے گواہی مانگتی ہے ہم دے کر چلے جاتے ہیں اور سوچتے بھی نہیں کہ ہماری ہر گواہی آسمان سے جھٹلا دی گئی ہے۔

پس اے امت محمدیہ! تم اگر محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام ہو اگر تم یہ گواہی دیتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسولؐ اور اس کے بندے تھے تو اس گواہی کو اس طرح دو جس طرح اس رسولؐ اور اس بندے نے گواہیاں دی تھیں۔ ایک بھی گواہی جو محمد رسول اللہ ﷺ نے دی وہ ایسی نہیں تھی جس کا آپؐ کو ذاتی طور پر علم نہ ہو۔ اب دیکھیں علم سے اس کا کتنا گہرا تعلق ہے۔ بے علم کی گواہی بھی جھوٹ ہوتی ہے، ظن کی گواہی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 158) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس گواہی کا کیا حال ہے جو عیسائی دیتے ہیں یا یہود دیتے ہیں۔ جب علم ہی کچھ نہیں تو ظنی باتیں ہیں۔ تو یہ بات ہم پر لازم کرتی ہے، ہر نماز ہم پر لازم کرتی ہے کہ اپنا علم بڑھائیں اور ہر قسم کا علم بڑھائیں۔ اس میں مذہبی علم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ کوئی بندش نہیں ہے کہ ہم صرف مذہبی علم بڑھائیں کیونکہ اللہ جس کائنات کا خدا ہے جس کائنات کا رب ہے اس کی تخلیق میں مذہب اور غیر مذہب کے درمیان حقیقت میں کوئی تفریق ہی نہیں رہتی۔ جو مذہبی لوگ اس کی کائنات پر غور کرتے ہیں وہ دنیا کا علم ان کے لئے دنیا کا علم نہیں، دین کا علم بن جاتا ہے اور جو صاحب عقل دنیا کے علوم پر

غور کرتے ہیں وہ لازماً خدا کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ پس اس پہلو سے بھی وہاں کوئی تضاد نہیں کوئی دو آوازیں نہیں ہیں، کوئی دو سمتیں نہیں ہیں۔ ایک ہی سمت ہے وہ توحید کی سمت ہے جہاں قرآن اور کائنات ایک ہی ہو جاتے ہیں۔

پس اس مضمون کو اپنے دلوں میں، اپنی روحوں میں جاری کریں کیونکہ ہم نے تمام دنیا کو توحید کی طرف بلانا ہے اور توحید کے کچھ اور تقاضے ہیں جو انشاء اللہ میں افتتاحی اجلاس میں آپ کے سامنے رکھوں گا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالوں سے آپ کو سمجھاؤں گا کہ ہمیں توحید کے میدان میں ابھی کیا کچھ کرنا ہے اور کیسی کیسی زمینیں ہم نے سر کرنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے مگر یاد رکھیں کوئی زمین، کوئی مملکت، کوئی جہان آپ سر نہیں کر سکتے جب تک اپنے نفس کو سر نہ کرلیں۔ آمین۔

نظام جماعت میں اطاعت کی بقاء
تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى پر منحصر ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 2 /اگست 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٣﴾ (المائدہ:3)

پھر فرمایا:

اس آیت کریمہ میں جو نصائح فرمائی گئی ہیں ان میں سے ابتدائی نصائح کا تعلق تو حج سے تعلق رکھنے والے مناسک اور محرمات اور حرمات سے ہے۔ جو عزت کے لائق ہیں ان کی عزت کرو، ان کی عزت کے حق ادا کرو اور ہرگز کسی پہلو سے بھی کوتاہی نہ کرو اور حج کے فریضے کے وقت جن جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ان سے رُکے رہو، یہ عمومی نصیحت ہے جو فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد آیت کا وہ آخری حصہ جس کے پیش نظر میں نے اس آیت کا آج انتخاب کیا ہے وہ تعاون سے تعلق رکھتی ہے۔ فرمایا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو اور اس سے پہلے اس آیت کا جو حصہ ہے وہ یہ ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا یہ وہ لوگ جنہوں نے مذہب کی دشمنی میں تمہیں حج بیت اللہ سے باز رکھا، روکے رکھا اور اس لحاظ سے انہوں نے تم پر ظلم کیا ان کی یہ دشمنی بھی تمہیں ان سے انصاف کرنے سے مانع نہ بنے۔ جہاں تک انصاف کے تقاضے ہیں ان کے معاملے میں پورے کرو لیکن صرف انصاف کے تقاضے پورا کرنا ہی تمہاری شان نہیں ہے۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ان سے تقویٰ اور نیکی میں تعاون بھی کرو۔

یہ عظیم الشان عالمگیر تعلیم ہے جس کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں بہت سے مسلمان علماء بعض دوسری آیات سے ایسا استنباط کرتے ہیں جو ان آیات کے واضح مضامین سے متصادم ہے، بیک وقت دونوں اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔ پس قرآن کریم میں جو محکمات ہیں ان کے تابع متشابہات کی تاویل کی جاتی ہے نہ کہ متشابہات کے تابع محکمات کی۔ یہ وہ آیت ہے جو محکمات میں سے ہے۔ نہایت ہی اہم فرائض بلکہ تمام امت مسلمہ کے فرائض میں سے سب سے مرکزی فریضہ جو حج کا ہے اس کے متعلق تعلیم دی جارہی ہے۔ قطعیت کے ساتھ یہ محکمات میں داخل آیت ہے اور اس تعلق میں دو نصیحتیں جو فرمائی گئی ہیں ایک یہ کہ تم جب صاحب اختیار بنو تو ہرگز ایسی قوم سے بھی ناانصافی سے پیش نہ آؤ جو تم سے ناانصافی سے پیش آتی رہی ہو اور تمہارے دینی فرائض میں بھی مخل رہی ہو ان کے تعلق میں بھی یاد رکھو کہ تم نے مضبوطی کے ساتھ عدل کا دامن پکڑے رکھنا ہے اور مزید برآں اگر وہ نیک کام کریں تو ان سے نیک کام میں تعاون کرو اور تقویٰ میں تعاون کرو۔ اب اکثر وہ تقویٰ سے تو عاری ہوتے ہیں اس لئے یہاں تقویٰ کا کیا مضمون ہے۔ تقویٰ کا جو مضمون یہاں پیش نظر ہے وہ ابتدائی، بنیادی انسانی فطرت میں ودیعت شدہ تقویٰ ہے یہ بات غلط ہے کہ ہر قوم کلیۃً تقویٰ اللہ سے عاری ہو چکی ہوتی ہے۔ مشرکین بھی بعض کام اللہ کے تقویٰ سے اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ہندو مشرکین میں داخل ہیں ان میں ایسے لوگ بھی بت پرست ہیں جو محض خدا کی خاطر اور اللہ کے خوف کی خاطر صرف بنی نوع انسان میں سے ضرورت مندوں کی مدد نہیں کرتے بلکہ جانوروں کو بھی روٹی ڈالتے اور دانے پھینکتے ہیں۔ ایک موقع پر ایک ایسے ہی مشرک نے جو اپنے شرک کے زمانے میں پرندوں کو روٹی ڈالا کرتا تھا یا دانے پھینکا کرتا تھا یا گوشت پھینکتا تھا، چیلیں اٹھا کے لے جائیں، اس نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ باتیں جو میں خدا کی خاطر اس زمانے میں کیا کرتا تھا ان کا بھی کوئی اجر

ہے۔آپؐ نے فرمایا اجر تو مل گیا تمہیں۔تم جو ہدایت پا گئے تو اور اجر تمہیں کیا چاہئے۔یہ انہی نیکیوں کا اجر ہے۔پس تقویٰ ان میں بھی ہوتا ہے جو مشرک ہوں مگر محدود تقویٰ ہے اور تقویٰ کے جو ابتدائی معنی ہیں، ان میں آپ کو تقویٰ کی جھلکیاں دکھائی دیں گی اور دنیا میں کوئی انسان بھی نہیں ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے تقویٰ کے مضمون پر عمل نہ کرتا ہو۔بعض دہریہ ہیں لیکن تقویٰ کا وہ مضمون جو سچائی سے تعلق رکھتا ہے وہ ان کے اندر بھی آپ کو دکھائی دے گا۔تقویٰ کے بغیر کوئی ہدایت نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ مغربی قومیں جو خدا کے تصور کے بغیر ایک تحقیق کا سفر اختیار کئے ہوئے ہیں کیوں ان کو جزا مل رہی ہے، کیوں ان کی تحقیقات کو بے شمار پھل لگ رہے ہیں۔اس لئے کہ وہاں بھی جب تک یہ تقویٰ پر قدم رکھتے ہیں ان کو پھل ملتا ہے، جہاں تقویٰ سے ہٹ جاتے ہیں ان کو کوئی پھل نہیں ملتا۔چنانچہ ایک لمبا عرصہ انہوں نے سائنس کی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے اپنے تصورات کی متابعت کرتے ہوئے دولتمند بننے کی کوششیں کی ہیں۔جس طرح ہمارے ملک میں کیمیا گری کی تلاش رہی ہے مغربی قوموں میں بھی کئی قسم کے نسخے استعمال ہوا کرتے تھے اور مذہب کے غلط تصورات کے نتیجہ میں یہ جستجو کیا کرتے تھے کہ کس طرح ہم جلد سے جلد اپنے مقصد کو حاصل کرلیں۔ان میں منفی مقاصد بھی ہوتے تھے اور مثبت بھی لیکن کبھی کسی کو کوئی پھل نہیں لگا۔ان میں بعض دفعہ یہ بھی رواج تھا کہ اپنے دشمن کو مارنے کے لئے یہ اس کے بت بناتے ،موم کے بت بناتے اور عین اس کے دل میں سوئیاں پیوست کر دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اب یہ سوئی جو ہے یہ اس کے دل میں چبھے گی۔اب یہ ساری جہالت کی باتیں ہیں تقویٰ سے عاری ہیں یعنی تقویٰ کے ان معنوں سے بھی عاری ہیں جو بنیادی طور پر ہر انسان کو کسی نہ کسی حد تک نصیب ہوا ہے۔

دراصل تقویٰ دل کی سچائی کا دوسرا نام ہے اور اگر دل سچا ہو تو پھر خدا تعالیٰ سے ہٹ کر الگ راہ اختیار نہیں کرسکتا۔اسی لئے قرآن کریم نے ہدایت کے آغاز میں ہی یہ فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرة:3) کتاب میں تو کوئی شک نہیں ،اس میں ایک ذرہ بھی شک نہیں کہ کتاب اللہ کا کلام ہے۔اس میں ایک ذرہ بھی شک نہیں کہ یہ الکتاب ہے یعنی کامل ہدایت ہے اور اس میں ذرّہ بھی شک نہیں کہ اس میں ہدایت کے سوا اور کچھ بھی نہیں لیکن هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہدایت متقیوں کو ہی دے گی۔جن میں تقویٰ نہیں ان کو کوئی ہدایت نہیں بخشے گی۔پس یہاں بھی وہی تقویٰ کا ابتدائی معنیٰ

ہے کہ اگر دل میں سچائی ہے تو پھر یہ ہدایت دے گی اگر دل میں سچائی نہیں ہے تو ہدایت نہیں دے گی۔تو یہ سچائی کا مضمون تقویٰ کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔بغیر سچائی کے تقویٰ قائم نہیں ہوسکتا اور اگر تقویٰ کا خدا کے حوالے سے مضمون پیش نظر نہ بھی ہو تو ہر انسان کی سچائی اس کا تقویٰ بن جاتی ہے کیونکہ تقویٰ کا مطلب بنیادی طور پر یہ ہے کہ ٹھوکروں کی جگہ سے بچ کر چلنا، جہاں نقصان ہو اس سے ہٹا کر قدم رکھنا اور ان معنوں میں تقویٰ کا سب سے عام معنی یہی ہے کہ انسان سچائی کو اختیار کرے سچائی کی روشنی میں آگے بڑھے اور جہاں جہاں ٹھوکر کا مقام ہے اس سے بچے۔پس اس پہلو سے ہر انسان کا تقویٰ کوئی نہ کوئی مفہوم رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے اور جتنی انسانی ترقی ہدایت کی طرف ہوئی ہے خواہ وہ مادی ترقی ہی کیوں نہ ہو وہ تمام تر تقویٰ پر مبنی ہے۔جہاں انسان نے جھوٹ کی پیروی کی وہاں اس کو کوئی بھی پھل نہیں ملا محنت کا۔

پس یہاں جو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى اور ان قوموں سے تعاون خاص طور پر پیش نظر ہے جنہوں نے شرک اختیار کیا، جنہوں نے ظلم کیا ہے اس لئے تقویٰ کا وہ معنیٰ لینا پڑے گا جو سب سے عام اور وسیع تر معنی ہے۔ان لوگوں سے بھی اچھی باتیں ہوتی ہیں ان میں ان سے تعاون کرو۔حلف الفضول کی مثال وہ مثال ہے جو مشرکین کے دور میں تقویٰ سے تعلق رکھتی ہے۔اس زمانے میں بھی ان میں نیک لوگ تھے اور مظلوم کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس حمایت کے جذبے ہی نے ان کو مجبور کیا جو تین فضل نامی اشخاص تھے کہ ایک معاہدہ کی بنیاد ڈالیں جس میں شامل ہونے والے خواہ ان کے نام فضل ہوں یا نہ ہوں، جو بھی شامل ہوں یہ عہد کریں کہ ہم ضرور مظلوم کی حمایت کریں گے۔تو یہ تقویٰ ہے جس پہ آنحضرت ﷺ نے رسالت سے پہلے بھی تعاون فرمایا اور یہ وہ تعاون ہے جس کی امت کو تعلیم دی جارہی ہے اور اس میں مذہب کا فرق مٹا دیا گیا ہے۔بد قوموں سے بھی، مشرک قوموں سے بھی نیکیوں میں تعاون کرو۔

یہ اتنی اہم تعلیم ہے کہ اگر اس کو ہم سمجھ لیں تو کسی اطاعت کے جذبے پر زور دینے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ تعاون میں طوعی مضمون داخل ہے۔نیک کام ہو رہا ہے دیکھتے ہو تو آگے بڑھو اس میں حصہ لو۔تو جو لوگ نیکیوں میں تعاون کرتے ہوں اور یہ نہ پوچھتے ہوں کہ کیوں کریں، آخر کس کا حکم ہے، ان لوگوں کو جن کو اس سوال کی عادت نہ رہے نیکی اپنی طرف کھینچے اور

بے اختیار اچھی بات ہوتی دیکھیں تو آگے بڑھ کر اس میں حصہ لینے کی کوشش کریں ان کو کیا ضرورت ہے کہ ان کو زور سے کہا جائے اطاعت کیا کرو کیونکہ اطاعت تو ہے نیکی میں۔ جن کو تعاون کی روح سے نیکیاں اختیار کرنے کا جذبہ ہو، وہ اس میں بے اختیار پائیں اپنے آپ کو وہ نیکی میں حصہ لئے بغیر رہ نہ سکیں ان کی اطاعت کامل ہو جایا کرتی ہے، ناممکن ہے کہ وہ اطاعت سے پیچھے ہٹیں۔

پس آپ جماعت کے نظام پر غور کر کے دیکھیں اطاعت سے باز رہنے والے وہی ہیں جن کو نیکیوں میں تعاون کی عادت نہیں ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کیوں کریں؟ کس نے آپ کو اتھارٹی دی ہے؟ حالانکہ جو نیک کام میں تعاون کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس میں کسی اتھارٹی کا ذکر نہیں۔ نیک کام میں تعاون کی مثال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر پہلو سے اپنے ماتحتوں سے ان کے کاموں میں تعاون فرمایا کرتے تھے۔ رستہ دکھانے میں تعاون، بوجھ اٹھانے میں تعاون، گھر کے کاموں میں، مشاغل میں تعاون، کوئی سوال کرنے والی بڑھیا آ کے سوال کرتی تھی تو تعاون کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ کسی بچے کا پیغام آ گیا کہ مجھے آپؐ کی ضرورت ہے اٹھ کے اس کے گھر روانہ ہوئے۔ جو سب سے زیادہ مطاع بنایا گیا جس سے بڑھ کر مطاع کا مضمون کسی کی ذات میں تصور نہیں کیا جا سکتا یعنی آنحضرت ﷺ ہر نیکی کے مضمون میں، ہر الٰہی مضمون سے تعلق رکھنے والے معاملات میں سب کے سردار بنائے گئے اور سب کو آپؐ کے تابع فرما دیا گیا۔ وہ آدم کو فرشتوں کا سجدہ کرنا جس کا قرآن کریم میں ذکر ملتا ہے وہ خلیفہ کے سامنے سجدہ تھا، خلیفۃ اللہ کے سامنے اور وہ اپنے اعلیٰ معانی کے طور پر حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ ہی تھے حالانکہ اس سے پہلے تمام انبیاءؑ بھی خلفاء ہی ہیں یعنی براہ راست اللہ کے خلیفہ اور ان کے ساتھ نیکیوں میں تعاون کرنے کا تمام کائنات کو حکم دیا گیا ہے۔ اس میں فرشتہ صفت لوگ بھی شامل ہیں، فرشتے بھی شامل ہیں۔ جب فرشتے شامل ہو جائیں تو کائنات کا سارا نظام داخل ہو جایا کرتا ہے۔ اس لئے بسا اوقات آپ جو اعجازی نشان دیکھتے ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ قانون قدرت کو توڑا گیا ہے۔ قانون قدرت کو توڑا نہیں جاتا بلکہ فرشتوں کے سجدے کا ایک یہ بھی مضمون ہے کہ خدا تعالیٰ کے قوانین میں جہاں جہاں گنجائشیں موجود ہیں وہاں خلیفۃ اللہ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ان کو استعمال کرو اور وہ انسان جو ابھی سائنسی لحاظ سے ترقی کی ادنیٰ منازل پر ہو وہ اپنے وقت میں اس مضمون کو سمجھ نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے معجزہ ہو گیا۔ معجزہ تو

ہوا لیکن قانون قدرت کو توڑنے کا معجزہ کبھی نہیں ہوا کرتا کیونکہ وہ قانون دان جو قانون بناتے وقت ضرورت کا خیال نہ رکھے اور اسے علم نہ ہو کہ کبھی میرا قانون نا کافی ہو جائے گا اور میرے مقاصد کی راہ میں حائل ہو گا اس کو توڑے بغیر میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتا وہ قانون ناقص ہے۔

پس اللہ کا قانون قدرت کامل قانون ہے اس میں ادنیٰ بھی آپ تضاد نہیں پائیں گے۔ جتنا چاہیں نظر دوڑائیں، نظر تھکی ہوئی واپس آ جائے گی اور کوئی تضاد نہیں پائے گی یہ مضمون ہے قانون کے کمال کا۔ تو نبیوں کے لئے قانون توڑنے کا کیا مطلب ہے۔ اس لئے نبیوں کے لئے جو قانون ٹوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ہمیں اپنے وقت کی معلومات کے لحاظ سے ان کی کمی کے پیش نظر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے قانون توڑا گیا ہے۔ بعض لوگ آگ پر چلتے ہیں، قانون نہیں ٹوٹتا کیونکہ ایسے مادے موجود ہیں جن کو اگر استعمال کیا جائے اور پاؤں پر اچھی طرح ان کو مل لیا جائے تو انسولیشن پیدا کر دیتے ہیں اور جلنے والے احساسات کو وہ ختم کر دیتے ہیں، ان کی قوت سلب ہو جاتی ہے، ایک قسم کی فالجی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اول تو جلنے کی راہ میں وہ مادے روک بن جاتے ہیں اور دوسرے احساس میں کمی آنے کی وجہ سے ایک انسان کوئلوں پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور البانیہ میں یہ بہت رواج ہے کہ بعض صوفی اپنا رعب ڈالنے کی خاطر وہ لوگوں کو یہ تماشے دکھاتے ہیں کہ دیکھو آگ کے کوئلے سلگاؤ ہم اس پر چل کر دکھائیں گے ہم خاص خدا والے لوگ ہیں اس لئے ہر معاملے میں ہماری اطاعت کرو۔ یہ بالکل جھوٹ ہے اور فرضی بات ہے۔

مگر آگ ٹھنڈا کرنے کے قوانین خدا نے خود بنائے ہوئے ہیں۔ ان قوانین کا علم ہو جائے تو پھر آپ کے لئے آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا قانون ایک بالا قانون ہے اور تعاون کے ذریعے جب انسان نیکیوں میں تعاون کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے قوانین کی تائید ہوتی ہے، ان کی مخالفت نہیں ہوتی اور تعاون کے ذریعے انسان قوانین کی اطاعت کے لئے پہلے سے بڑھ کر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جو بتایا گیا ہے یعنی اگر مشرک سے تمہیں تعاون کرنے میں باک نہ رہے تو کیا نیک بندوں سے تعاون میں تمہیں باک ہوگی۔ آنحضرت ﷺ نے جو عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ الفاظ بیچ میں رکھے کہ ہم معروف میں آپ کی اطاعت کریں گی تو معروف سے مراد یہی تعاون کی باتیں ہیں۔ دراصل ہر بات کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار نہیں دیا۔ بہت سی نیکیاں ہیں، راہ چلتے آپ

ان نیکیوں سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں مگر ہر انسان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ رستہ چلتے ہوئے ضرور کھڑا ہو اور ہر آدمی کی ضرورت پوری کئے بغیر آگے نہ بڑھے۔ اگر یہ ہو تو ساری دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے لیکن کچھ نہ کچھ کو ضرور توفیق ملنی چاہئے۔

پس تعاون کا مضمون عام بھی ہے اور Selective بھی ہے یعنی حسب ضرورت تم میں روح ہونی چاہئے۔ جہاں تمہاری ضرورت ہو تم سمجھو کہ تمہاری ضرورت کے بغیر کوئی نیک کام ہونے سے رہ جائے گا وہاں اُمت محمدیہ سے یہ اللہ تعالیٰ کو توقع ہے کہ یہ پوچھے بغیر کہ یہ کس نے کہا ہے، کیوں ہم تعاون کریں، کس کا حکم آیا ہے فرمایا تمہاری فطرت کے اندر خدا نے داخل فرما دیا ہے نیکی کے کاموں میں تعاون کرنا ہے یہاں تک کہ بدوں سے بھی تعاون کرنا ہے، مشرکوں سے بھی تعاون کرنا ہے۔ **یہ فطرت ثانیہ بنالو تو نظام اسلام کو پھر کبھی کوئی ٹھوکر نہیں لگ سکتی کیونکہ نظام اسلام تو نیکیوں کے رائج کرنے کا نام ہے۔** حاکم اور محکوم کے جھگڑے مٹا دیتا ہے تعاون اور وہ احساس کمتری جو بسا اوقات اطاعت کی راہ میں حائل ہوتا ہے وہ احساس کمتری تعاون کرنے والوں میں ہوتا ہی نہیں۔ اگر ہے تو وہ تعاون نہیں کر سکیں گے۔ ایک انسان جب ایک غریب آدمی کے کاموں میں اس کا مددگار بنتا ہے تو اس کو جھکنا پڑتا ہے اور جو احساس کمتری کا شکار ہو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ اگر میں نے کام کیا، اس کے لئے اگر میں جھکا تو گویا میری عزت میں فرق آ جائے گا لیکن جسے کوئی احساس کمتری نہ ہو وہ ہر ایک کا کام کرتا ہے اور شرم محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ کام کرنے سے اپنے نفس میں ایک عزت پاتا ہے۔ وہ احساس عزت اس کا مقصود نہیں ہوتا مگر جزا کے طور پر ملتا ہے۔

اور ہر انسان جو نیکیوں میں تعاون کرنے والا ہو وہ معزز سے معزز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ لوگ صاحب اکرام ہو جاتے ہیں اور نبوت کا بھی یہی رستہ ہے جس رستے سے بالآخر نبوت تک بھی انسان پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے جب آنحضرت ﷺ کو وحی کے بعد بہت ہی دردناک حالت میں پایا اور آپؐ نے زملونی زملونی کہہ کر یہ متوجہ کیا کہ میں تو نفسیاتی لحاظ سے شدید بحران کا شکار ہو چکا ہوں مجھے سخت سردی لگ رہی ہے۔ یہ ایک سردی کا لگنا جیسے ملیریا بخار میں لگتی ہے یا Septic بخاروں میں لگتی ہے اس کا ایک تعلق اندرونی نفسیاتی بحران سے بھی ہے۔ بعض دفعہ جب کسی کو اچانک صدمہ پہنچے یا اچانک گھبراہٹ کی خبر ملے تو اچانک اسی طرح بہت تیزی کے ساتھ ہاتھ

پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔کوئی ایسی خبر ہو جس کی توقع نہ ہو جس کو انسان اپنے متعلق سوچ بھی نہ سکتا ہو۔پس جتنا شدید حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کا بحران تھا اتنا ہی آپؐ کی سچائی پر گواہ تھا اور آپؐ کی انکساری پر گواہ تھا۔ یہ وہم وگمان میں بھی نہیں آپ کے آسکتا تھا میں خدا کا نمائندہ بن کے بنی نوع انسان کو مخاطب ہوں گا۔اگر نفس میں ادنیٰ بھی یہ خواہش ہوتی تو وہ بحران پیدا ہونا ناممکن تھا۔اس حالت میں جب آپؐ کی بے قراری دیکھی تو حضرت خدیجہؓ نے تسلی دینے کے لئے یہ الفاظ عرض کئے کلا و اللہ ما یخزیک اللہ ابدا ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کا نام ہے یہ وہ رشتے جو قریب کے رشتے ہیں ان کو جوڑنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے آپس کی خاندانی محبتیں بڑھیں اور ہر ایک کے ذمے یہ کام ہے نہیں کہ گویا فرض ہے اس کے لئے۔اپنے معاملے میں تو حقوق ادا کرنا فرض ہے مگر ایسے کام کرنا کہ رشتے جڑتے چلے جائیں اور رحمی تعلقات آپس میں مضبوط تر ہوں یہ وہ نیکی کا کام ہے جو وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ ہے۔کمزوروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں۔اب کس پر یہ فرض ہے کہ ہر وقت کمزوروں کے بوجھ اٹھاتا پھرے اور شریعت تو ابھی نازل بھی نہیں ہوئی تھی۔آنحضرت ﷺ شریعت کے نزول سے پہلے مفلوک الحال، غریب لوگوں کے لئے ایک رحمت تھے، مجسم رحمت تھے۔ان کا ہر دکھ بانٹا کرتے تھے۔ان کی ہر مصیبت کو دور کرنے کے لئے کوشاں رہا کرتے تھے اور معدوم اور ناپید نیکیاں کماتے ہیں۔وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کی مثالیں دیکھیں کیسی عجیب مثال ہے۔

عام نیکیاں جو معروف ہیں ان کو کرنا بھی تعاون ہی ہے لیکن جو نیکیاں ناپید ہو چکی ہوں، انسانی نظر سے غائب ہوگئی ہوں ان کو دوبارہ زندہ کر دیں اور پھر ان پر عمل کر کے دکھائیں۔انہوں نے عرض کیا آپ میں تو یہ باتیں ہیں اور مہمان نوازی کرتے ہیں۔جو پھر تعاون کا معنیٰ ہے ورنہ مہمان نوازی کب فرض ہے۔اگر فرض ہوتا تو زبردستی کوئی حکومت، کوئی مذہب لوگوں کے گھروں میں مہمان داخل کر لیتا۔یہ تعاون کا مضمون ہے۔تبھی حضور اکرم ﷺ کے جب مہمان آتے تھے تو مسجد میں بعض دفعہ اعلان کیا کرتے تھے کون ہے جو میری مدد کرے گا۔یہ تعاون مانگنے کا ایک طریق تھا۔حکم دے سکتے تھے مگر نہیں دیتے تھے۔جانتے تھے کہ مہمان نوازی کا دائرہ حکام کے

دائرے سے الگ ہے۔ پس جب بھی آپ آواز بلند کرتے ضرور لبیک کی آوازیں اٹھا کرتیں اور ضرورت حقہ میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں یعنی وہ تمام ضروریات حقہ جو جائز ضروریات ہیں ان میں آپ کا جہاں تک بس چلے آپ مدد کرتے ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جن کو خدا کبھی ضائع نہیں کرسکتا اور جس وجہ سے آپ گھبرا رہے تھے اس کا جواب اسی میں ہے۔ اس سے بہتر کون ہے جو خدا کی طرف سے مامور کیا جائے۔ جس میں یہ صفات پائی جائیں وہی تو مطاع بننے کے اہل ہے۔ جو خود سب کا مطیع ہو گیا، تمام نیک کاموں میں ہر ایک کے سامنے جھک گیا وہی اس لائق ہے کہ اسے مطاع بنایا جائے اور یہی وہ مضمون ہے جس کی طرف میں آپ کو آج خصوصیت سے توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

آپ دنیا میں دعوت الی اللہ کا پیغام لے کے نکلیں ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ لوگ آپ سے نہ صرف تعاون کریں گے بلکہ آپ کو اپنا سردار مانیں گے۔ جو آپ کہیں گے کہ دین یہ ہے وہ آپ کی بات تسلیم کریں گے۔ جس طرف بلائیں گے آپ کے پیچھے چلیں گے۔ تو اس سے پہلے ایک نبوت کا مرتبہ حاصل کرنا ضروری ہے یعنی نبوت کا وہ مرتبہ جو نبوت کے انعام سے پہلے صفات کی صورت میں عطا کیا جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ کی پیروی اور غلامی کے لئے لازم ہے کہ ان تمام صفات کو اختیار کیا جائے جو حضرت اقدس کی نبوت سے پہلے بھی تھیں اور جن کو تفصیلاً بیان فرمائے بغیر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى اور اس میں مشرکوں سے تعاون بھی تھا۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے آنحضرت ﷺ کو جب بعد ازاں، نبوت کے بعد حلف الفضول کا حوالہ دے کر ابوجہل سے کسی کا حق دلوانے کے لئے بلایا گیا تو آنحضور ﷺ اسی وقت روانہ ہو گئے یعنی مشرکوں سے تعاون اور مشرکوں سے تعاون لے رہے ہیں اور یہ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کی بہترین مثال ہے۔

دوسری بات وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى میں یہ بھی داخل ہے یعنی علیٰ کا جو صلہ ہے یہ دو معنی پیدا کرتا ہے۔ نیک کاموں میں تعاون کرو اور تقویٰ میں تعاون کرو اور نیکی کی بناء پر تعاون کرو اور تقویٰ کی بناء پر تعاون کرو۔ یہ جو مضمون ہے یہ دوسرے دنیا کے بہت سے تعاون کرنے والے مضامین سے اس مضمون کو الگ کر دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہوں گے دنیا میں نیک کاموں کے لئے تعاون غیر قوموں میں بھی ملتا ہے مگر اللہ کی خاطر تعاون اور نیکی سے محبت کی بناء پر تعاون دو چیزیں اکٹھی کم ملتی ہیں۔ ملتی تو ہیں لیکن شاذ کے طور پر، ایک قومی کردار کے طور پر نہیں ملتیں۔ بسا اوقات یہ جو تحریکات ہیں غریبوں کی ہمدردی

کی، بہت اچھی تحریکات ہیں ان میں گہرے انسانی جذبات ہی کارفرما ہوتے ہیں مگر اللہ کا خوف دامن گیر ہو یہ لازم نہیں ہے۔ بعض دہریہ بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ بہت سی ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو افریقہ کے مظلوموں کی مدد کر رہی ہیں۔ جہاں پانی نہیں ملتا ان کے لئے پانی کی اپیلیں ہیں۔ آپس کی جنگوں میں اور فسادات میں جو لوگ مجروح ہو جاتے ہیں، مظلوم ہوتے ہیں، ان کی مدد کے لئے یہ محض انسانی ہمدردی سے تعاون ہوتا ہے مگر لازم نہیں کہ وہ خدا کی خاطر ایسے کرتے ہوں۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے میں جانتا ہوں بہت سے ان میں ایسے ہیں جن کا عیسائیت سے بھی کوئی خاص تعلق نہیں رہا صرف بنی نوع انسان کی ہمدردی ان کا مذہب بن جاتا ہے۔ تو تقویٰ کا وہ مضمون جو اللہ سے ملاتا ہے وہ اس سے خالی ہوتے ہیں۔ تو مومن کو نصیحت فرمائی گئی کہ ''بـر'' وجہ سے صرف نہ کرو، ''تـقـویٰ'' کی وجہ سے بھی کرو۔ اگر تقویٰ کی وجہ سے کرو گے تو تمہاری یہ نیکی دونوں جہان کی سعادتیں دلوانے کا موجب بن جائے گی۔ اگر محض نیکی کی خاطر کرو گے یعنی دل کی ہمدردی سے تو اس کی جزا تو پاؤ گے مگر وہ اعلیٰ جزا جو تمہیں مل سکتی ہے اس سے محروم رہ جاؤ گے۔ اب ظاہر بات ہے کہ تقویٰ کا یہ معنی بلند تر معنی ہے اس معنی سے جو میں نے پہلے بیان کیا تھا۔

اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ آپ کوئی کام کریں اور کسی کی خاطر کرتے ہوں اور اس کو علم ہو کہ یہ تکلیف میری خاطر اٹھا رہا ہے تو کام خواہ نیکی کا ہو خواہ عام کام ہو مگر جس کی خاطر آپ کرتے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر اس کا ایک قسم کا احسان ہو گیا ہے۔ یہ اگر احسان نہیں رکھا جا سکتا تو کم سے کم اس نے تو میری محبت کی خاطر یہ تکلیف اٹھائی ہے اعلیٰ اخلاق کا تقاضا ہے کہ میں بھی اس کی خاطر کچھ ایسا کام کروں جو میرے لئے کرنا فرض نہ ہو یعنی فرض سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی خدمت کروں۔ پس اللہ تعالیٰ کے احسانات کو کھینچنے کے لئے یہ آیت کریمہ ایک بہت ہی عمدہ گر ہمیں بتلاتی ہے۔ بنی نوع انسان کی ہمدردی تو جس کے دل میں ہوگی اس نے تو کچھ کرنا ہی کرنا ہے اگر رضائے باری تعالیٰ پیش نظر ہو اور اس کی خاطر آپ تعاون کریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ کے پیار کی نگاہیں آپ پر پڑیں گی، آپ کی ہر نیکی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا موجب بن جائے گی۔ جس کی دنیا سنواریں گے اس کا دنیا سنوارنا آپ کی دنیا بھی سنوار جائے گا اور آپ کی عاقبت بھی سنوار جائے گا۔ یہ وہ دوسرا پہلو ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کا جسے ہمیں لازماً پیش نظر رکھنا چاہئے۔

پھر یہ تو عام نصیحت ہے جو وسعت کے لحاظ سے تو بہت ہے یعنی انسانی زندگی کے ہر دائرے پر محیط ہے مگر مضمون کے تحکم کے لحاظ سے، لازم ہونے کے اعتبار سے یہ ایک نرم آیت ہے۔ یعنی مثبت پہلو میں اس میں ایک نرمی پائی جاتی ہے۔ نہ بھی کرو تو تمہارا گزر ہو جائے گا اس کے نتیجہ میں تمہیں جہنم نہیں ملے گی لیکن اعلیٰ خوبیوں سے، اعلیٰ مراتب سے محروم رہ جاؤ گے۔ اس کی ایک مثال ایک ایسے شخص کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے جو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے نیکیوں کی تعریف پوچھی کہ کیا کیا باتیں ہیں۔ جب اس کو پتا چلا کہ فرائض بھی ہیں اور نوافل بھی ہیں اس کے علاوہ نوافل کو حسین بنا کر اس رنگ میں کرنا کہ گویا نیکی کرنے والا محسن ہو گیا۔ تو اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھ میں ان باتوں کی طاقت نہیں ہے، مجھے تو صرف فرائض بتائیں۔ جتنے فرائض ہیں وہ میں کرلوں گا اس سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے اگر تم اس عہد پر قائم رہو تو تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ تعاون کا مضمون طوعی ہے۔ اگر یہ لازم ہوتا تو پھر ان معنوں میں لازم کہ گویا اگر نہ کریں گے تو سزا ملے گی تو اس پہلو سے آنحضرت ﷺ اس کو نوافل سے آزاد نہ کرتے۔

مگر اگلا پہلو اس آیت کا وہ قطعیت رکھتا ہے۔ وہ تھوڑے دائرے پر اطلاق پاتا ہے لیکن بڑی شدت کے ساتھ اطلاق پاتا ہے اور وہ یہ ہے **وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** جہاں گناہ کا تعلق ہو اور جہاں بعض لوگ بعضوں پر زیادتی کر رہے ہوں وہاں ہرگز تعاون نہیں کرنا۔ وہاں اگر تعاون کرو گے تو تم یاد رکھو **إِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ** اللہ تعالیٰ سخت پکڑنے والا ہے، سخت عذاب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی سخت پکڑ سے بچو۔ تو بعض دفعہ مثبت مضمون نرم ہو جاتا ہے اور منفی مضمون زیادہ شدید ہو جاتا ہے یہ اس کی ایک مثال ہے اور نیکیوں میں تعاون کرنا ہے، بدیوں میں ہرگز نہیں کرنا اس کی ایک مثال آنحضرت ﷺ ایک تمثیل کے طور پر پیش فرماتے ہیں۔ **بخاری** کی یہ حدیث ہے **کتاب الشرکة** (باب هل يقرع في القسمة والاستهام فيه) اس کا ترجمہ بہر حال پیش کر دیتا ہوں۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا اس شخص کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم کرتا ہے اور اس شخص کی مثال جو ان حدود کو توڑتا ہے ان لوگوں کی طرح ہے جنہوں

نے ایک کشتی میں جگہ حاصل کرنے کے لئے قرعہ ڈالا۔ کچھ لوگوں کو اوپر کا حصہ ملا اور کچھ کو نیچے کی منزل میں جگہ ملی۔ جو لوگ نیچے کی منزل میں تھے وہ اوپر والی منزل میں سے گزر کر پانی لیتے تھے۔ بظاہر آپ سمجھتے ہیں کہ الٹ ہونا چاہئے، اوپر والوں کو پانی کے قریب آنے کے لئے نیچے آنا چاہئے مگر اگر چاروں طرف سے دیواریں اٹھی ہوئی ہوں اور پانی کو اندر آنے کی راہ نہ ہو تو آپ کیسے نیچے کی منزل سے پانی لے سکتے ہیں۔ تو جہاں کشتی کا اوپر کا کنارہ ہے وہاں سے ڈول پھینکا جاسکتا ہے اندر سے ڈول نہیں پھینکا جاسکتا۔ تو یہ مضمون ہے کہ نیچے کی منزل والوں کے لئے ضروری تھا کہ اوپر جائیں اور اوپر جا کر وہاں سے ڈول ڈالیں اور اپنا پانی حاصل کریں اور اوپر کی منزل والوں کو یہ آرام تھا کہ اوپر بیٹھے بیٹھے وہ پانی حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اس پر جو نیچے کی منزل والے تھے ان میں سے ایک بیوقوف نے یہ مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم یہیں سوراخ کر لیں اور سوراخ کر کے اپنا پانی نیچے سے حاصل کر لیں۔ اب وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی مثال رسول اللہ ﷺ پیش فرمارہے ہیں۔ اوپر کی منزل والوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگر وہ یہ خیال کر کے کہ ان کا کام ہے یہ جو مرضی کرتے پھریں ہمیں کیا اس سے، اس میں دخل نہ دیں تو یہ لوگ خود بھی غرق ہوں گے اور اوپر والوں کو بھی غرق کر دیں گے۔ اس لئے یہاں اوپر والوں کا فرض ہے کہ ان کو ان کے اس بظاہر حق سے محروم کر دیں کیوں کہ یہ بدی کر رہے ہیں اور بدی میں کوئی تعاون نہیں ہے۔ پس اس پہلو سے جب **نہی عن المنکر** کی بات ہوتی ہے تو یہ مراد ہے کہ بدیوں سے روکنا ہے لیکن اگر بدیوں سے روکنا اس مرتبے تک جا پہنچے کہ ساری قوم کی ہلاکت کا موجب بنے تو پھر خدا تعالیٰ اسی حد تک دخل اندازی کا بھی حق دیتا ہے اور اگر انسان یہ کہے کہ یہ تو تعاون کی روح کے خلاف ہے، ہم کیوں نہ ان سے تعاون کریں، ان کو کرنے دیں جو وہ کرتے ہیں تو یہ جہالت ہوگی۔ فرمایا کہ اگر وہ ان کو نہیں روکیں گے تو تمام غرق ہو جائیں گے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے، یہ ترمذی ابواب الفتن باب **امر بالمعروف ونھی عن المنکر** سے لی گئی ہے۔ یہ چونکہ ہم اب تعاون کی گفتگو کرتے ہوئے **امر بالمعروف** اور **نھی عن المنکر** کی بات شروع کر بیٹھے ہیں تو اس مضمون پر ایک حدیث میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ

قدرت میں میری جان ہے یا تو تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سخت عذاب سے دوچار کرے پھر تم دعائیں کرو گے لیکن وہ دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔

پس یہ اہمیت ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی، جس کو اگر آپ ذہن نشین کرلیں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ آپ کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ پس بظاہر تعاون کرنا ایک نفلی کام ہے مگر جب اس پر غور کریں تو پتا چلے گا کہ یہ نفلی کام ایسا ہے جو آپ کی قومی بقاء کے لئے ضروری ہے اور اگر آپ نیکیوں میں تعاون کرنا سیکھ جائیں اور برائیوں سے روکنے کی عادت ڈال لیں خواہ آپ کو امارت نصیب ہو یا نہ ہو لیکن عادت بنالیں کہ جہاں اچھا کام ہے آپ نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی کوشش کرنی ہے جہاں بری بات ہو رہی ہے وہاں کچھ اور نہیں تو زبان سے روکیں۔ پس یہ تصور جو مولویوں والا ہے کہ کسی نے سر پہ دوپٹہ نہیں رکھا ہوا تو اس کو تھپڑ مارو اور اس کے سر پہ زبردستی دوپٹہ پہنا دو یہ ہرگز اس آیت کا مضمون نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی مسلمان عورت کو زبردستی برقعہ نہیں پہنایا۔ قرآن کریم میں نصیحتیں آتی رہی ہیں۔ یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ مگر ایک بھی واقعہ ایسا نہیں کہ کوئی عورت آنحضورؐ کی خدمت میں گھسیٹ کے لائی گئی ہو کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ پردہ نہیں کر رہی تھی ٹھیک طریقے سے، نہیں کر رہی تھی تو خدا اس کے ساتھ نپٹے گا لیکن پردے کی نصیحت کرنا یہ سوسائٹی کا شیوہ تھا۔ نیک باتوں کی تاکید کرنا بری باتوں سے روکنا یہ وہ مضمون ہے جو قرآن کریم وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کی آیت میں اور معروف کے حکم اور بدی کے روکنے کے مضمون میں ہمارے سامنے کھولتا ہے۔

پس یہ اپنی عادت بنائیں کہ اچھی بات میں اس لئے تعاون کریں کہ اچھی بات ہے۔ آپ نے اچھی بات کو اپنا کر اس کے لئے ایسی کوشش کرنی ہے جیسے اپنی چیز ہے اور جب برائی سے روکتے ہیں تو اس وقت آپ کو اختیار ہے طاقت کے استعمال کا جب خدا تعالیٰ آپ کو اس پر مامور کرتا ہے اور جب ایسے معاملات میں کوئی شخص بعض احمقانہ فیصلے کر کے ان پر عمل کر رہا ہے جس سے ساری قوم کی بربادی لازم ہو جاتی ہے اس صورت میں قوم کو اجازت ہے، انفرادی طور پر ہر شخص کو یہ اجازت ہی نہیں کہ وہ بیچ میں دخل اندازی کرتا پھرے۔

بہر حال یہ عمومی مضمون ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں جماعت کو یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو جب میں کہتا ہوں کہ اطاعت کریں، اطاعت کی روح اختیار کریں، چھوٹے سے چھوٹے عہدے دار کی بھی اطاعت کریں تو یاد رکھیں وہ چھوٹے سے چھوٹے عہدے دار کی اطاعت کا اختیار کرنا آپ کے تعاون کی روح سے تعلق رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نیک کاموں میں تعاون مانگا کرتے تھے۔ بسا اوقات صحابہؓ سے سوال کیا کرتے تھے کون ہے جو اس معاملے میں میرا مددگار ہوگا۔ قرآن کریم میں حضرت مسیحؑ کے تعلق میں یہ بیان ہوا ہے اور کسی نبی کے تعلق میں اس طرح بیان نہیں ہوا کہ اس نے یہ اعلان کیا ہو مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ (آل عمران:53) کون ہے جو اللہ کی خاطر میرا مددگار ثابت ہو یعنی تعاون مانگا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ کے تعلق میں اس کا بیان کرنا دراصل جماعت احمدیہ کے لئے ایک پیغام رکھتا ہے کہ تم اگر واقعی سچے مسیح ثانی کے غلام ہو تو اس بات کو یاد رکھنا کہ وہ جب نیکی کے کاموں کے لئے تم سے خدا کی خاطر تعاون مانگے تو ضرور تعاون پیش کرنا ہے اور اس تعاون کے ساتھ اطاعت جب وابستہ ہو جائے تو اطاعت میں ایک لذّت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے احساس کمتری کا ہر شائبہ نکل جاتا ہے۔ جو شخص یہ پوچھے بغیر تعاون کرتا ہے کہ کوئی حاکم ہے بھی کہ نہیں، جو شخص آنحضرت ﷺ کی غلامی میں اپنے غلاموں سے تعاون کرتا ہے، اپنے نوکروں سے تعاون کرتا ہے، اپنے بچوں سے تعاون کرتا ہے، اس شخص کے لئے یہ کہاں کا موقع ہے کہ جب اس کو خدا کے نام پر کچھ کہا جائے اطاعت کرو تو کہے میں کیوں کروں۔ نیکی سے محبت، نیکی سے تعاون اس کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے اور جب وہ کرتا ہے تو پھر دراصل اپنی ہی اطاعت پوری کرتا ہے، غیر کی اطاعت اڑ جاتی ہے اور تقویٰ کا مضمون بتاتا ہے کہ اللہ کی خاطر وہ اپنے نفس کی نیک باتوں کی اطاعت کرتا ہے، اپنے نفس کی بد باتوں سے رک جاتا ہے۔ تو یہ ایک بہت ہی عظیم الشان مضمون ہے جو تمام انسانی زندگی پر محیط ہو جاتا ہے اگر قرآن کریم کی نصائح پر غور کرے ان کو سمجھے اور آنحضرت ﷺ کی ذات اور آپؐ کی صفات کے حوالے سے اس مضمون پر عمل کرے نہ کہ کسی مولویانہ تفسیر کے تابع اس پر عمل کرے۔

پس جماعت کو تعاون اختیار کرنا، ایک دوسرے سے تعاون کرنا حرز جان بنا لینا چاہئے یعنی ایسی بات کہ ان کی زندگی کی گہرائی تک، پاتال تک اتر چکی ہو۔ ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہو۔ ان کی

فطرت ثانیہ نہیں، فطرت اولیٰ جاگ اٹھے کیونکہ یہی تو فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ ہر اچھی بات میں تعاون کرو، ہر بات جو خدا سے تعلق والی ہو جو خدا چاہتا ہے، تقویٰ کا مضمون یہ ہے جو اللہ چاہتا ہے ویسا ہی کرو تو پھر جھگڑے اٹھ جاتے ہیں کون حاکم ،کون محکوم ۔تمام حاکم اور تمام محکوم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ ایک عظیم مساوات ہے جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی اور انسان کسی کے سامنے گردن جھکانے پر کسی پہلو سے بھی عار محسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری گردن تو خود میرے اندر کی نیکیوں کے سامنے خم ہو چکی ہے۔ میں تو اپنے دل کی نیک آوازوں کے خلاف سر اٹھا ہی نہیں سکتا تو جب باہر سے وہ آواز آئے کیسے میں اس کی مخالفت کروں گا۔

پس اگر اس پہلو کے پیش نظر ہم اپنی تمام زندگی کو تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى کے تابع کر لیں گے تو جماعت کو پھر کسی قسم کے کوئی خطرات درپیش نہیں ہوں گے اور جماعت کی بقاء کا راز اس میں ہے کیونکہ نظام جماعت کی بقاء اطاعت پر منحصر ہے اور اطاعت کی بقاء وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ پہ منحصر ہے۔ یہ وہ مزاج ہے جو اطاعت کی روح پیدا کرتا ہے۔ پس اس پہلو سے اگر آپ اطاعت کو اختیار کریں تو جماعت کی ساری زندگی میں ہر جگہ ایک حیرت انگیز دلکشی پیدا ہو جائے گی۔ ایک آدمی آپ کو بلاتا ہے آؤ یہ کام کریں، یہ پوچھے بغیر کہ اسے بلانے کا اختیار ہے کہ نہیں اگر اچھی بات کی طرف بلا رہا ہے آپ دوڑے ہوئے چلے جائیں گے۔ مشرک بلاتا ہے تو چلے جاتے ہیں تو مومن بلاتا ہے کیوں نہیں جائیں گے۔ ہر اچھے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے سے بڑھ کر آپ تعاون اختیار کرنا شروع کریں گے اور یہ جو جذبہ ہے اس سے قوموں کی تقدیر بدل جائے گی۔ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ آپ دنیا میں عظیم روحانی انقلاب برپا کر سکیں۔

آنے والے آرہے ہیں آپ کو دیکھ رہے ہیں اور سب سے زیادہ ان کی ذات پر آپ کا یہ اندرونی تعاون ہے جو اثر انداز ہوتا ہے۔ جلسہ سالانہ کے موقع پر البانیہ کے آئے ہوئے ایک عالم نے یہ بیان کیا کہ میں تو جب آپ کو ایک ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں، وہ یہ بیان نہیں کر سکا کہ کیا بات ہے وہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ تھا جس کو وہ دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے، بچے، جوان ہر نیکی کی آواز پر آگے بڑھے اور لبیک کہا اور ہر بوجھ اٹھا لیا۔ حالانکہ ان پر فرض نہیں تھا، کوئی زبردستی نہیں تھی، کوئی طاقت نہیں تھی نظام کے پاس کہ زبردستی ان کو اِن کاموں پہ مامور کرے کس نے ان کو کہا تھا کہ اپنے دفتروں

سے چھٹیاں لیں، کس نے سکول کے بچوں اور کالج کے طالب علموں کو کہا تھا کہ اپنی پڑھائیاں ایک طرف کردو آج اور دوڑتے ہوئے خدمت دین کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ کوئی حکم ایسا نہیں تھا جس کی پابندی ان پر لازم ہوتی۔ جو نہیں تھے ان کو کبھی کوئی سزا نہیں ملی۔ سینکڑوں ہیں جو محروم رہے ہیں کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا کہ تم کون لوگ ہو۔ اگر دیکھا ہے تو رحم کی نظر سے دیکھا ہے کہ بے چارے محروم رہے مگر غصے کی نظر کبھی کسی پہ نہیں ڈالی گئی۔ یہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى تھا جس نے ان کو حیرت زدہ کر دیا اور انہوں نے کہا کہ اب میں سمجھا ہوں یہ صداقت ہوتی کیا ہے۔ اب میں سمجھا ہوں کہ سچائی کس کا نام ہے اور اس اقرار کے بعد انہوں نے فوراً بیعت کر لی اور یہ عہد کر کے واپس گئے ہیں کہ اب میں اپنی ساری قوم کو جب تک احمدی نہ بنا لوں میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

تو تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى تو ایک عظیم الشان نعمت ہے اس کے ایسے پھل ہیں جو پھر آگے پھل پیدا کرنے والے درخت بن جایا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ ابھی کل ہی اس کی ایک اور مثال میرے سامنے آئی جب سینیگال کا وفد مجھے آخری دفعہ جانے سے پہلے ملنے کے لئے آیا تو ان کے ساتھ گیمبیا کے ایک بہت بڑے چیف بھی تھے جو احمدی نہیں تھے۔ نہ چلتے وقت احمدی تھے نہ یہاں پہنچ کر انہوں نے احمدیت کا کوئی اظہار کیا، بالکل خاموش رہے ہیں۔ مسئلہ بھی کوئی نہیں پوچھا لیکن ان کی خواہش تھی میں بھی جاؤں دیکھوں کیا ہوتا ہے تمہارے ہاں، ان کو بلا لیا گیا۔ جب وفد سے میری باتیں ختم ہوئیں اس میں مضمون یہی چل رہا تھا جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ اس طرح اب آپ نے اپنی قوم کے لوگوں کو سچائی کی طرف بلانا ہے کیونکہ آپ کو اللہ نے یہ نعمت عطا کی ہے۔ آپ پر فریضہ تو نہیں ہے ان معنوں میں کہ آپ نہ کریں تو ہم آپ کو پوچھ سکتے ہیں مگر اس کو اپنے دل کا جذبہ بنالیں۔ ایسا جذبہ بنائیں کہ آپ بے اختیار ہو جائیں، آپ سے ہو نہ سکے کہ لوگوں کو دعوت الی اللہ کے بغیر آپ چین سے بیٹھ سکیں۔

یہ جب باتیں میں کر رہا تھا تو ان کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ پہلے ہی اس کے لئے تیار بیٹھے تھے اور ان کے دل کی آواز تھی جو میری زبان سے نکل رہی تھی۔ جب ہماری باتیں ختم ہوئیں تو گیمبین چیف نے ہاتھ اٹھایا کہ میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیں۔ انہوں نے بتایا کہ دیکھیں میں چلتے وقت احمدی نہیں تھا میرا احمدیت قبول کرنے کا کوئی دور کا بھی خیال نہیں

تھا اور امیر صاحب نے جو ان کے ساتھ تھے بتایا کہ وہاں یہ ہم سے تعاون کرتے تھے مگر صاف کہتے تھے کہ احمدی میں نے نہیں ہونا۔ ان کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ تو اب یہ دیکھیں ایک تعاون ایک اور نیکی پر منتج ہوتا ہے اور پھر اس شخص کو جو تعاون کے نتیجہ میں نیکی پاتا ہے کس طرح ہدایت کی طرف گویا پکڑ کر لے جاتا ہے، ہاتھ پکڑ کر وہاں پہنچا دیتا ہے۔ انہوں نے کہا یہاں جب میں نے آ کے دیکھا تو آپ لوگوں کو میں نے عجیب پایا۔ محض نیکی کی خاطر اس طرح کیڑیوں کی طرح دن رات کام ہو رہا تھا۔ سب خوش تھے، سب ایک دوسرے سے محبت کر رہے تھے۔ ہر ایک کو دوسرے سے تعاون کے لئے دل کے جذبے تھے جو مجبور کر رہے تھے، میں نے کوئی بیرونی دباؤ ایسا نہیں دیکھا جس کے نتیجہ میں یہ ہوا ہو۔ انہوں نے کہا کہ یہ دیکھنے کے بعد میں غیر احمدی کیسے رہ سکتا ہوں۔ آج میں ابھی اعلان کرتا ہوں کہ نہ صرف یہ کہ میں احمدی ہوں بلکہ واپس جا کر چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنی ساری قوم کو احمدی نہ بنالوں۔

اب اس کے نتیجہ میں دیکھیں میں آپ کو ایک ایسی مثال دے رہا ہوں جس طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے شرک کے زمانے کی نیکیاں ہی تو تھیں جو تمہیں ہدایت تک لے آئی ہیں اور کیا جزاء چاہتے ہو۔ تو ان کے تعاون کی جزاء تھی جو ان کو خدا نے یہاں پہنچنے کی توفیق بخشی اور تعاون ہی تھا جسے دیکھ کر ان کے دل کی کایا پلٹ گئی اور جو ایمان افروز نظارہ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ ممبر پارلیمنٹ جو سینیگال سے آئے ہوئے تھے اس بات کو سن کر اتنا خوش ہوئے کہ اس کے ہاتھ پکڑ پکڑ کے چومنے لگے کہ تم نے ہمارے دل کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ یہ جذبہ بنائے نہیں بن سکتا۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور تعاون ہی کے پھل ہیں۔ پس بر اور تقویٰ پر تعاون کو آگے بڑھاتے رہیں۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے جب مجھے امریکہ اور کینیڈا کے جلسے میں شامل ہونے کی توفیق ملی تو شروع ہی میں میں نے ان کو چند نصیحتیں کی تھیں جو جلسہ سالانہ کے آغاز پر کی جاتی ہیں اور انہوں نے اس طرح اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا کہ خود وہاں کے جو شرکاء کار تھے انہوں نے مجھ سے ملاقات کے دوران کہا کہ آج تک ہم نے اتنی حیرت انگیز تعاون کی روح پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بچہ بچہ، بوڑھا، جوان اس طرح تعاون کر رہا تھا کہ یہ فرق ہی مٹ گیا تھا کہ کیوں کوئی کام کرے۔ حاکم اور محکوم کے تفرقے مٹ گئے تھے۔ ایک آواز اٹھتی تھی نیکی کے لئے سارے دوڑے چلے آتے تھے اور یہ جو تعاون ہے پہلے آپ کو

گھروں میں کرنا ہوگا۔ اس بات کو ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ جب ہم قومی باتیں کرتے ہیں تو ان باتوں کا آغاز گھروں سے ہوا کرتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں میرا ساری زندگی کا تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ ان سے آپ نیکی کے معاملات میں تعاون کریں اور تحکم کی بجائے تعاون لیں تو کبھی وہ معصیت نہیں کریں گے۔ کبھی آپ کی نافرمانی کا تصور بھی ان کے دماغ میں نہیں آسکتا۔

اور یہ ہر اس گھر کا جائزہ بتاتا ہے جہاں بچوں کی تربیت اس رنگ میں کی گئی ہے کہ ماں باپ ان کے کاموں میں ان کے لئے جھکتے ہیں، ان سے تعاون کرتے ہیں اور حکم دیئے بغیر تعاون چاہتے ہیں اس وقت بچوں کی نگاہیں اپنے ماں باپ کی رضا پر لگی رہتی ہیں۔ ان کو ہرگز ڈانٹنے کی کوئی ضرورت نہیں، کسی سزا کی ضرورت نہیں، آپ کی نظروں میں ذرا سی مایوسی کے آثار پائیں بے قرار ہو جاتے ہیں، تڑپ اٹھتے ہیں۔ جب تک وہ آپ کے چہرے پہ خوشی کے آثار نہ دیکھ لیں ان کو چین نہیں ملتا۔ ایسے بچے نافرمان کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایسے بچے آپ کی اطاعت کے دائرے سے دور کیسے جا سکتے ہیں۔ تو جہاں اپنے گھر میں یہ تجربہ نہ کیا ہو وہاں جماعت میں بھی یہ تجربہ نہیں ہوگا۔ گھروں کو تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کی آماجگاہ بنا دیں۔ یہاں یہ تعاون کی روح پرورش پائے پھر جب گھروں سے نکل کر گلیوں میں جائے گی تو اسی طرح تعاون کی روح ماحول کو تعاون کرنے پر مجبور کرتی چلی جائے گی۔ یہ طاقتور اور غالب آنے والی روح ہے اور لازماً اس کو غلبہ نصیب ہوتا ہے۔

پس میں امید رکھتا ہوں کہ اس تعلق میں خواہ جلسوں کے انتظام ہوں، مہمانوں کا تعلق ہو، یہاں بھی آپ نے دیکھا ہر آنے والے سے تعاون کیا گیا ہے خواہ وہ جرمنی جماعت تھی یا Belgium کی جماعت تھی یا اکیلا کہیں سے آنے والا تھا۔ قطع نظر اس کے کون آیا، کہاں سے آیا، اس کا حق کیا بنتا ہے؟ خدا کے فضل سے UK جلسے کی انتظامیہ نے ہر ایک سے تعاون کیا اور جرمنی میں بعینہٖ یہی ہوتا ہے، ایک ذرہ بھی فرق نہیں Belgium میں بعینہٖ یہی ہوتا ہے، ہالینڈ میں بالکل اسی طرح ہوتا ہے، ناروے میں اسی طرح ہوتا ہے۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس پہلو سے میں جماعت کو بہت مستعد پاتا ہوں کہ ہر آنے والے کے ساتھ نیکی کی وجہ سے تعاون ہو رہا ہے اس سے کوئی غرض نہیں، کچھ دینا نہیں، تکلیف اٹھا کے بھی تعاون کیا جاتا ہے۔

پس اس میں ہماری زندگی کا راز ہے ہماری بقاء کا راز ہے اور قوموں میں جس اصلاح کے

لئے ہم مامور کئے گئے ہیں وہ اصلاح تب ہی ممکن ہوگی اگر ہم تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کی روح پر قائم ہوں۔ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کی ہدایت پیش نظر رکھیں۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بہترین اطاعت امر بالمعروف ونہی عن المنکر، جبکہ بہترین دعوت الی اللہ دعوت الیٰ الخیر ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 9 راگست 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (آل عمران:105)

پھر فرمایا:

قرآن کریم کی جس آیت کو میں نے گزشتہ خطبہ کا عنوان بنایا تھا وہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدہ:3) والی آیت تھی یعنی وہ آیت جو نصیحت کرتی ہے کہ اچھی باتوں میں نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور بری باتوں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کیا کرو۔ قرآن کریم بہت سے مضامین کو جوڑوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ ایک آیت کا جوڑا ایک اور جگہ ملتا ہے اور دونوں جوڑے ایک دوسرے کے مضمون کو تقویت دیتے ہیں۔ تو تعاون سے مراد کیا ہے؟ صرف تعاون سے مراد یہ نہیں کہ جس چیز کی تمہیں ضرورت ہے وہ مانگو اور وہ دوسرا فریق تعاون کرتے ہوئے چیز تمہیں دے دے۔ تعاون کا اصل حقیقی مضمون اس آیت کریمہ میں بیان ہوا ہے جو میں نے آج تلاوت کی ہے اور اسی لئے گزشتہ خطبہ کے آخر پر حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے وہ ارشادات بھی آپ کے سامنے رکھے جن کا تعلق نیکیوں کا حکم دینے اور بدیوں سے روکنے سے ہے۔

پس تعاون کس بات پر کرو۔ اگر آپ کسی کو کچھ کہیں تو پھر تعاون کا سوال پیدا ہوتا ہے کسی بات سے روکیں پھر تعاون کا سوال پیدا ہوتا ہے اور ہر جگہ کسی طاقت کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم اس پہلو سے ساری امت کو ہی صاحبِ امر بنا دیتا ہے۔ اب حقیقت میں صاحب امر ہونے کا راز اس میں ہے ان دو آیات کے مضمون کو سمجھ لیں تو آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ اسلام میں کوئی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے۔ جہاں اطاعت کا حکم ہے وہ پابند ہے نیکی کی باتوں کے ساتھ، اتنا پابند ہے کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی عورتوں کو بیعت لیتے وقت جو الفاظ وحی کے ذریعے سکھلائے گئے جو قرآن کریم میں موجود ہیں ان میں یہ ہے کہ ان سے بیعت کے وقت یہ عہد لیا کرو کہ معروف باتوں میں تیری اطاعت کریں گی۔ میں نے پہلے ایک دفعہ اس مضمون پر روشنی ڈالی تھی کہ معروف باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ **نعوذ باللہ من ذٰلک** حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ غیر معروف باتوں کا حکم دے سکتے تھے۔ معروف باتوں سے مراد آپؐ کے دائرہ حکم کو محدود کرنا نہیں بلکہ بڑھانا اور وسعت دینا ہے۔

قرآن کریم میں جو اوامر اور نواہی ہیں جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کرتے ہیں یا مومنین کو مخاطب کرتے ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سی نیکی کی باتیں ہوتی ہیں جو ان کی تشریحات سے تعلق رکھتی ہیں اور براہ راست تشریح کا حوالہ دے کر کی جائے یا نہ کی جائے ہر اچھی بات کی بنیاد قرآن کریم میں موجود ہے اور یہ بحث اٹھانے کی ضرورت نہیں کہ قرآن کریم کی فلاں آیت میں یہ بات اس طرح ہے اس لئے اس کے تعلق میں تمہیں میری ہدایت پر عمل کرنا چاہئے۔ پس آنحضرت ﷺ تو تمام تر وحی کی بات فرمایا کرتے تھے پھر یہ جو فرمایا گیا کہ معروف میں میری اطاعت کرو گی اس سے مراد یہ ہے کہ عورتوں میں اس بات کا کوئی واہمہ تک نہ رہے کہ جب بھی ہمیں حکم ملے ہم یہ پتا کریں کہ قرآن کریم میں موجود ہے کہ نہیں۔ معروف تو ایسی چیز ہے جو ہر زمانے کے ہر انسان پر، خطہ ارض کے ہر انسان پر برابر اطلاق پاتی ہے۔ معروف بات وہ ہے جو عرف عام میں دیکھنے سے اچھی معلوم ہو۔ اس کے لئے حکم کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب امر کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو مراد یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھنے والی بات ہو خواہ واضح طور پر قرآن کریم کے اوامر اور نواہی میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو تم پھر بھی اطاعت کرو گی اور اوامر و نواہی میں اطاعت کے لئے تو لازم ہے کہ ہر مومن جو بیعت کرتا ہے وہ ضرور

اطاعت کرے کیونکہ اس کی بیعت ہی اللہ کے ساتھ ہے وہ سب کچھ بیچ بیٹھتا ہے خدا کے حضور۔ پس یہ جو مضمون ہے معروف میں اطاعت کا یہ اطاعت کے دائرے کو تنگ نہیں کرتا بلکہ بہت وسیع کر دیتا ہے۔

جو بات میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تمام امت کو صاحب امر بنایا گیا ہے اور قرآن کریم کی مختلف آیات سے پتا چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ امتوں کو اپنا جانشین بنایا کرتا ہے۔ آیت استخلاف میں بھی آنحضرت ﷺ کے تمام نیکو کار غلاموں کو جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ ہم تمہیں اپنا خلیفہ بنائیں گے یا زمین میں خلیفہ بنائیں گے جیسا کہ پہلوں کو بنایا۔ یہ تفصیل تو بہت لمبی ہے۔ میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ جب ایک صاحب امر کے ذریعے کسی قوم کے سپرد دنیا کی اصلاح کی جائے تو اس قوم کا ہر فرد صاحب امر ہو جاتا ہے اور اس پہلو سے بڑے اور چھوٹے حاکم اور محکوم کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔ اس کی شرط یہ ہے کہ ہر شخص **امر بالمعروف** کرے اور **نھی عن المنکر** کرے۔ ہر شخص اچھی باتوں کا حکم دے اور نیکیوں کی طرف بلائے۔ اب نبی اور کیا کرتا ہے۔ یہی تو کرتا ہے لیکن نبی ان معنوں میں بھی مامور ہے کہ اس کے سامنے بات سمجھ آئے یا نہ سمجھ آئے انسان کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کر سکتا، کوئی پس و پیش نہیں کر سکتا۔ مگر عامۃ المسلمین کے لئے صاحب امر بننے کے لئے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی اچھی باتیں کریں ایسی بری باتوں سے روکیں کہ جس کے لئے کوئی شخص حوالہ مانگے ہی نہیں اور قرآن کریم کی نیکیاں دراصل تمام تر اسی نوع سے تعلق رکھتی ہیں مگر بعض اپنی نوع کے اندر ایسا مقام حاصل کر لیتی ہیں کہ ہر کہنے والے کو یہ سمجھانے کی طاقت نہیں ہوتی کہ یہ کیوں تمہارے لئے مفید ہے۔ جھوٹ کے متعلق تو کہہ سکتا ہے کہ جب میں تمہیں کہتا ہوں جھوٹ نہ بولو اور سچ بولو تو سب دنیا جانتی ہے کہ اچھی بات ہے۔ مگر پانچ وقت نماز اس طرح ادا کرو اور اس طرح نہ کرو یا سورج ڈھلے پر کس طرح کی عبادت کر سکتے ہو یا نہیں کر سکتے کتنی دیر بعد اور کتنی دیر پہلے اور روزمرّہ وضو کیسے کرنا ہے نماز کے لئے کیسے کھڑا ہونا ہے اس کے لئے صاحب امر ہی ہے جو آنحضرت ﷺ ہیں جن پر قرآن نازل ہوا۔ ان کا صرف یہی حوالہ کافی ہے کہ صاحب امر کو اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا اور یہ ہدایتیں دی ہیں اور تم پر اس کا ماننا فرض ہے۔

پس ان معنوں میں بھی مومن حقیقت میں صاحب امر بن جاتا ہے۔ جب وہ قرآن کا حوالہ

دے گا تو اس وقت یہ سوال اٹھ ہی نہیں سکتا کہ تمہیں کیا خدا نے الہام کیا تھا۔ وہ کہے گا جس کو اپنے اس زمانے کے لئے یا ہر زمانے کے لئے خدا نے مامور بنایا ہے اس کو تو الہام کیا تھا اب میں وہی باتیں تمہیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن یہ جو نصیحت ہے یہ مومنوں کے دائرے تک محدود رہتی ہے اور ان میں بھی ہر مومن صاحب امر ہے اور ہر روکنے والا خدا تعالیٰ کے نواہی کے دائرے میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اختیار رکھتا ہے کہ روکے۔ پس یہ جب مضمون وسعت کے ساتھ سمجھ آتی ہے تو نظام اسلام میں کسی ڈکٹیٹرشپ کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ کو جب یہ علم ہوا کہ کسی شخص نے اپنی امارت کا رعب جمانے کے لئے یا دیکھنے کے لئے کہ میری امارت کا حق ادا کرتے ہیں کہ نہیں آزمانے کی خاطر کہا کہ میں تمہیں کہتا ہوں تم سمندر میں چھلانگ لگا دو یا آگ میں کود جاؤ، آگ کا موقع تھا وہ خاص طور پر، تو جب یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر وہ آگ میں کود جاتے تو جہنم میں کود جاتے۔ پس امر کے نام پر کسی مومن کو یہ کھلا اختیار ہی نہیں دیا قرآن کریم نے کہ جو چاہے اس کا امر دے دے۔ اوامر اور نواہی کھلے کھلے ہیں اور ہر بات کھول کر واضح طور پر بیان فرمادی گئی ہے۔ ہاں متشابہات کی دنیا ایسی ہے جس میں ہر شخص کو پتا نہیں چلتا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے۔ **امر بالمعروف** میں جہاں عہد بیعت لیا گیا ہے وہاں بہت سا حصہ متشابہات سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں واضح طور پر یہ نہیں فرمایا گیا کہ عورت اس طرح پردہ کرے۔ اگر آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں اس طرح پردہ کرو تو جنہوں نے بیعت کی تھی ان کا فرض ہے کہ وہ اسی طرح پردہ کریں۔

تو یہ وہ وسیع مضمون ہے جس میں تمام کی تمام امت خلیفہ بن جاتی ہے اور صاحب امر ہو جاتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ نیکی کی بات کرے اور برائی سے روکے۔ شرط یہ ہے کہ بھلائی کی طرف بلائے اور یہ وہ مضمون ہے جو مومن اور غیر مومن سب پر یکساں اطلاق پا جاتا ہے۔ کوئی دنیا کی قوم ایسی نہیں جس کو آپ نیکی کی تعلیم دیں اور آگے سے وہ کہے کہ تم کون ہوتے ہو تمہیں کس نے مقرر کیا ہے کسی حکومت کا کوئی پروانہ تو لا کے دکھاؤ جس نے تمہیں مقرر کیا ہو کہ ہمیں نیکیوں کی تعلیم دو۔ بے بس ہو جائے گا، نہیں کرے گا، زیادہ سے زیادہ عمل نہیں کرے گا مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم ہوتے کون ہو مجھے اچھی باتیں کہنے والے۔ کسی کو آپ کہیں دھوپ سے اٹھو، سائے میں بیٹھو گرمی زیادہ ہے، پاگل ہی ہوگا

جو کہے گا کہ تم کون ہوتے ہو، تمہیں کس نے ٹھیکیدار بنایا ہے میرا۔ پس ٹھیکیدار تو نبی بھی نہیں ہوتا لیکن ٹھیکیدار نہ ہونے کے باوجود اس کے حکم میں اتنی طاقت ہے کہ اس کا انکار کرنے والا پاگل ہوگا کیونکہ وہ سچائی پر مبنی حکم دیتا ہے وہ معروف کے حکم دیتا ہے بدیوں سے روکتا ہے۔ تو دراصل طاقت مضمون میں ہوتی ہے اور جو مضمون کوئی شخص اختیار کرتا ہے اسی لحاظ سے یا وہ طاقتور ہو جاتا ہے یا وہ کمزور ہو جاتا ہے۔

اچھی بات اور سچی بات میں ایک طاقت ہے اور جو بھی سچی اور اچھی بات اختیار کرے گا وہ لازماً طاقتور ہوگا۔ خواہ خدا تعالیٰ نے اس کو مامور کیا ہو یا نہ کیا ہو پھر بھی وہ مامور ہوگا۔ لیکن خدا اسے مامور کرتا ہے کیونکہ یہ باتیں جو سچائی اور نیکی کی باتیں ہیں یہ ہر مذہب کا خلاصہ ہیں۔ پس خدا نے جب بھی کبھی کسی مذہب کو نازل فرمایا اس میں اچھی باتوں اور سچی باتوں پر مامور کیا گیا اور ہر شخص آزاد ہے جب چاہے جتنا چاہے اپنا دامن ان سے بھر لے اور جتنا سچائی اور بھلائی سے وہ اپنا دامن بھرتا چلا جاتا ہے وہ مامور ہوتا چلا جاتا ہے، صاحب امر ہوتا چلا جاتا ہے۔ **پس یہ وقت ہے کہ جماعت احمدیہ کو صاحب امر بننا ہوگا اور ان شرائط کے ساتھ بننا ہوگا جو قرآن کریم نے پیش فرمائی ہیں** کیونکہ دعوت الی اللہ کا صاحب امر ہونے سے بہت گہرا تعلق ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی اس مضمون پر بہت ہی دل پذیر رنگ میں جو دلوں کو کھینچنے والا رنگ ہے اس سے روشنی ڈالی ہے اور حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے کلام کا جو جذب ہے اس کی کوئی مثال آپ کو کہیں دکھائی نہیں دے گی۔ چند فقروں میں اتنی گہری باتیں فرما جاتے ہیں، اتنی دلوں کو کھینچنے والی باتیں ہیں کہ اس کا کوئی توڑ نہیں کسی کے پاس، مجبور ہے کہ کھنچا چلا آئے۔

پس اس حوالے سے میں نے اس مضمون کو سمجھانے کی خاطر حضرت رسول اللہ ﷺ کی کچھ احادیث آج کے لئے چنی ہیں اور اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کچھ اقتباسات ہیں جو اسی مضمون پر قرآن اور سنت کے لحاظ سے روشنی ڈال رہے ہیں۔ ترجمہ سورہ آل عمران کی اس آیت کا جو نمبر 105 آیت ہے یہ ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ لازماً تم میں ایک امت ایسی رہنی چاہئے يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ جو بھلائی کی طرف بلاتی رہے اور اس امت کی تعین نہیں ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ہر فرد بشر خیر کی طرف بلانے کی طاقت رکھتا ہو۔ اپنی ذہنی قلبی صلاحیتوں کے اعتبار سے، اپنے دائرہ اثر کے لحاظ سے، اپنی دیگر مصروفیات کے لحاظ سے، صحت اور

بیماری کے لحاظ سے ہر شخص کی طاقتیں الگ الگ ہیں لیکن ایک صالح امت میں ایک بڑا حصہ ایسا ضرور موجود رہتا ہے جو اپنے آپ کو بھلائی کی طرف بلانے پر وقف کر دے اور یہی وہ ہدایت ہے جو اس آیت کے آغاز میں دی گئی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وہ وقف ہو جائے اس بات پر کہ بھلائی کی طرف بلاتے رہیں اور بھلائی کی طرف بلانا اور يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ میں ایک فرق کیا گیا ہے۔ بھلائی کی طرف بلانا ایک دعوت عام ہے جس کا دراصل تعلق دعوت الی اللہ سے ہے کیونکہ قرآن کریم نے جہاں دعوت الی اللہ کا پیغام دیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا سب سے اچھی بات، سب سے پیاری بات ہے وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا (حٰمٓ السجدہ:34) اس سے زیادہ خوبصورت بات کیا ہوگی جو خدا کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرتا ہو، جس کے اعمال اس کی اس دعوت کو سچا کر دکھائیں۔ تو یہ خیر جو ہے یہ دراصل خدا کی طرف بلانا ہے اور نیک کاموں کی طرف بلانا ایک ہی بات بن جاتا ہے۔ نیک کاموں کی طرف بلانے کا مطلب لازم نہیں کہ خدا کی طرف بلایا جائے مگر خدا کی طرف بلانے کا لازماً یہ مطلب ہے کہ نیک کاموں کی طرف بلالیا جائے۔ پس خدا کی طرف بلانا حاوی ہے ہر نیکی کے اوپر۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ دعوت اور امر میں دیکھیں کیسا فرق کر کے دکھا دیا۔ اگر خیر عام معروف ہوتی تو اس کے لئے بھی امر کا لفظ استعمال ہونا تھا۔ پھر دعوت ایک ایسی چیز ہے جسے اگلے ردّ بھی کر لیتے ہیں قبول بھی کر لیتے ہیں مگر امر میں ان کو اختیار نہیں ہے ردّ کرنے کا۔ تو فرمایا تم خدا کے رستوں کی طرف بلاؤ خواہ لوگ مانیں یا نہ مانیں بلاتے چلے جاؤ ان کو اختیار ہے قبول کریں یا نہ کریں لیکن جب تم نیک کاموں کی طرف بلاؤ جو عرف عام میں نیک ہیں تو تم صاحب امر ہو جاؤ گے۔ پھر وہ خدا کو نہ بھی مانیں تو تمہاری باتوں کو انہیں ماننا پڑے گا کیونکہ اچھی باتوں کا انکار پاگل پن ہے اور کبھی بھی کوئی شخص اچھی باتوں کے تعلق میں حوالے نہیں مانگا کرتا کہ تمہیں کس نے اختیار دیا تھا۔ پس يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ایک عام حکم ہے نیکی کا جسے جماعت کو اختیار کرنا لازم ہے۔

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور بدیوں سے روکتے چلے جائیں۔ ان باتوں میں بہت سی

نصیحتیں ہیں اور بہت سے فوائد مضمر ہیں۔اول تو میں نے جیسا کہ گزشتہ خطبہ میں بیان کیا تھا وہ قوم جسے نیکی کی باتیں کہنے کی اور نیکی کی باتوں میں تعاون کرنے کی عادت ہو کیونکہ دوسرا جوڑ اس آیت کا وہ ہے کہ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى تمہیں جب نیکی کی طرف بلایا جائے تو تعاون کیا کرو پیچھے نہ بیٹھ جایا کرو۔فرمایا جن کو یہ توفیق ہو وہ لوگ اطاعت کے گویا مرقع بن جاتے ہیں کیونکہ اطاعت کا مضمون اوپر سے نیچے تک نیکیوں سے تعلق رکھتا ہے۔جن کو یہ پوچھے بغیر اطاعت کی عادت پڑ جائے کہ تم مامور ہو بھی کہ نہیں کیسے ممکن ہے کہ جن کو خاص کاموں پر مامور کیا جائے ان کی اطاعت کے متعلق سوال اٹھائیں۔

پس بہترین اطاعت وہ ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے شروع ہوتی ہے اور بہترین دعوت الی اللہ وہ ہے جو دعوت الی الخیر سے شروع ہوتی ہے۔یہ تین باتیں ہیں اگر جماعت احمدیہ مضبوطی سے پکڑ لے تو جماعت احمدیہ کی ہمیشہ کی بقاء کے لئے جب تک وہ ان باتوں پر قائم رہے یہ ضمانت ہو جائے گی۔یہ تین باتیں اگر جماعت مضبوطی سے پکڑ لے تو ان کی دعوت الی اللہ میں بھی غیر معمولی طاقت پیدا ہو جائے گی اور بنی نوع انسان ان کو اپنا سچا ہمدرد سمجھنے پر مجبور ہوں گے لیکن ایک اور فائدہ جو میرے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے ساتھ جب یہ فرمایا وَعَمِلَ صَالِحًا تو اس کا تعلق صرف دعوت الی اللہ سے نہیں بلکہ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ سے بھی ہے کیونکہ قرآن کریم یہ بات خوب کھول رہا ہے کہ اگر تم بدکردار ہو تو تمہیں نیکیوں کی طرف بلانے کا حق نہیں رہتا۔اگر تم جھوٹے ہو تو تم سچائی کی طرف بلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

بعض دفعہ ایک کمزور آدمی بھی مجبور ہے ان اوامر کی طرف بلانے پر جو قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں اوامر کے طور پر لیکن جتنا وہ ان اوامر پر خود عمل نہ کرتا ہو، ان احکامات پر جس حد تک ہو خود عاری ہو عمل کرنے سے اس حد تک اس کی طاقت کم ہو جاتی ہے اور ضروری نہیں کہ ایک شخص جب تک کمال درجے کی نیکی کی انتہاء تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک کسی کو نیکی کی طرف بلائے نہ۔یہ تو ناممکن ہے کیونکہ اس صورت میں سب نیکی کی طرف بلانے والے ہار کے بیٹھ رہیں گے۔اگر وہ اپنی بدیوں پر نظر ڈالیں اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھیں تو کوئی بھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھے گا کہ وہ لوگوں کو نیکی کی

طرف بلا سکے۔ پس مراد یہ ہے کہ توجہ رکھنا اس بات کی طرف ،تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جب تم بلاؤ تو اپنے نفس کی بھی نگرانی کرو۔ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے تمہاری بات میں طاقت تب ہی پیدا ہوگی اگر دنیا کو کم سے کم یہ معلوم ہو کہ جن باتوں کی طرف تم بلاتے ہو تم دیانت داری سے ان کو قبول کرتے ہو، جہاں تک توفیق ہے ان پر عمل کی کوشش کرتے ہو۔

یہ جو شرط ہے ''جہاں تک توفیق ہے'' یہی وہ شرط ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیعت میں داخل فرما دی۔ بیعت کے الفاظ میں داخل فرما کر ہر ایسے شخص کو ایک قسم کی جرأت تو نہیں کہنا چاہئے ایک قسم کا حوصلہ دے دینا جو اتنا بڑا عہد کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مجھ سے ایک دفعہ ایک غیر مسلم نے جو بیعت کا ارادہ کر چکا تھا یہی سوال کیا کہ دل تو میرا بہت چاہ رہا ہے مگر اتنا بڑا وعدہ ہے جس کے لئے ہمت نہیں پڑتی۔ تو میں نے کہا تم الفاظ پر غور کرو اس میں یہ ہے کہ میں کوشش کرتا رہوں گا۔ کیا تم دیانت داری سے نیکی کی کوشش بھی نہیں کرو گے تو فوراً اس کو شرح صدر نصیب ہو گیا۔ اس نے کہا نیکی کے جس مقام پر بھی ہو کوشش تو کرنی ہی کرنی ہے اور بدی سے چھٹکارے کی بھی کوشش ہی ہوتی ہے۔ مگر کوشش میں اور کوشش میں جو فرق ہوتا ہے۔ ایک کوشش وہ ہے جو خالص نیت کے ساتھ اس پختہ ارادے کے ساتھ کی جاتی ہے کہ جب تک طاقت ہے میں یہ ہمت نہیں چھوڑوں گا، یہ کوشش نہیں چھوڑوں گا کہ بدیوں کو ترک کروں اور نیکیوں کو اختیار کروں۔ ایک کوشش کا مطلب ہے کہ خیال ہے کہ ہاں چھوڑ دیں گے لیکن باہمت ارادہ پیدا نہیں ہوتا اور باہمت عمل اس کے پیچھے نہیں آتا۔ ایسی کوشش بے معنی ہے۔ پس نیکی اور بدی کا آخری فیصلہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے وہ اس بات پر ضرور نگاہ رکھتا ہے اور احادیث نبویہ سے یہ قطعاً ثابت ہے کہ کوشش میں سچائی تھی کہ نہیں اگر کوشش سچی ہے تو عہد بیعت سچا ہے اگر کوشش سچی ہے تو آپ کو خیر کی طرف بلانے کا حق ہے۔ اگر کوشش سچی ہے تو معروف کی طرف بلانے کا حق ہے چاہے آپ میں خامیاں بھی موجود ہوں۔ کوشش سچی ہے تو بدیوں سے روکنے کا حق ہے چاہے آپ میں خامیاں موجود ہوں۔ مگر خامیوں کو پالتے ہوئے، ان کو اس طرح قبول کرتے ہوئے گویا وہ آپ کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں پھر جب آپ یہ کام کریں گے تو اس کو منافقت کہتے ہیں اور منافقت میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ پس آپ نے اپنی کمزوریوں کے باوجود دعوت الی اللہ کرنی ہے۔ آپ نے اپنی کمزوریوں کے باوجود نیکیوں کی طرف یا معروف باتوں کی طرف بلانا ہے اور بد باتوں سے روکنا ہے اور آپ نے پوری کوشش کرنی ہے کہ آپ

میں نفاق نہ ہو۔نفاق تب پیدا ہوتا ہے اگر انسان ایک چیز کو قبول کر کے اس پر قائم ہوتے ہوئے راضی ہوکر پھر یہ دکھاوا کرے کہ میں تو روک رہا ہوں، میں تو نہیں ایسا۔اگر اس پہلو سے کوئی شخص کرتا ہے تو وہ بہت بڑا جرم ہے جو کفر سے بھی بڑھ جایا کرتا ہے۔اس لئے ان احتیاطوں کو پیش نظر رکھیں کیونکہ نیکی کا مضمون احتیاط کے تقاضے رکھتا ہے اوران تقاضوں کا مثبت جواب ہمیں دینا ہوگا۔ بہت باریک محنت کا مضمون ہے، باریک نظر کا مضمون ہے۔اس لئے میں امید رکھتا ہوں جماعت احمدیہ ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے **امر بالمعروف** اور **نهى عن المنكر** کے حق ادا کرنے کی کوشش کرے گی۔

اس کے ساتھ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس کی اصلاح لازم ہے جب بھی ایک شخص کہتا ہے یہ کام نہ کرو تو اگر اس کا ضمیر زندہ ہے تو اسے خود بخود بتائے گا، ہیں ہیں تم کس بات سے روک رہے ہو تم تو یہی کام کرتے ہو۔ پھر اگر وہ مجبور ہے دعوت دیتے چلے جانے پر تو اس کے اندر ایک عجز پیدا ہوگا، ایک انکساری پیدا ہوگی، ایک غم پیدا ہوگا دعاؤں کی طرف متوجہ ہوگا۔ وہ کہے گا اے خدا مجھے تو نے مامور کر دیا میں بے اختیار ہوں میری بدیاں بھی مجھ پر قابو پائے ہوئے ہیں تو ہی ہے جو مجھے ان سے نجات بخشے۔تو اس احساس کے ساتھ نیکی کے حصول کے لئے ایک ایسی گہری تڑپ پیدا ہو جاتی ہے اور دعاؤں کے ذریعے اس تڑپ کو ایک تقویت نصیب ہوتی ہے۔ایک اندرونی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اس تڑپ میں جس کی وجہ سے بالآخر نیکیوں کو غلبہ مل جاتا ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جو مثبت فوائد نصیحت کرنے والے کے لئے رکھتا ہے اور نیکی کی طرف بلانے والے کے لئے رکھتا ہے۔ بدیوں سے روکنے والے کے لئے رکھتا ہے۔

اگر اس طریق پر آپ اس آیت کریمہ پر عمل کریں تو ایک مسلسل اصلاح کا نظام جاری ہوگا۔آپ صاحب امر ہوں گے دوسروں کے لئے تو اپنے لئے بھی صاحب امر ہوں گے اور وہی امر کا مالک ہے جو اپنی دنیا پر بھی حکومت کرتا ہے اور غیر کی دنیا پر بھی حکومت کرتا ہے اور غیر پر امر کی طاقت اپنے پر امر کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔اسی کا نام قوت قدسیہ ہے۔ورنہ قوت قدسیہ کا اور کوئی مضمون نہیں ہے، کوئی مفہوم نہیں بنتا۔آپ جتنی سچائی کے ساتھ اپنے آپ کو نیکیوں کے حکم دیں گے اور اپنے وجود کو بدیوں سے روکنے کی کوشش کریں گے جوں جوں آپ کا قدم آگے بڑھے گا آپ میں ایک قوت قدسیہ پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ پھر جب آپ غیروں کو روکیں گے اور غیروں کو بلائیں گے کسی اچھی

بات کی طرف تو آپ کی آواز میں طاقت پیدا ہو جائے گی، کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

یہ طاقت آنحضرت ﷺ میں اس درجہ بڑھ گئی کہ آپؐ کا قرب ہی نیک کر دیتا تھا۔ آپؐ کا محض تلاوت کرنا ہی اتنی بڑی طاقت پیدا کر دیتا تھا کہ کسی سمجھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ کسی حکمت کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اپنی ذات میں آپ زندہ کرنے والے وجود بن گئے تھے، مردوں سے زندہ کر دیتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی مضمون کو آپ کے حوالے سے کھولا اور بیان فرمایا کہ یہ فرق ہے پہلے انبیاءؑ میں جن کے مطیع دوسرے انبیاءؑ ہوا کرتے تھے اور اس نبی میں جس کا مطیع آج میں ہوں۔ عیسیٰؑ نہیں کہہ سکتا، نہ اس نے کبھی کہا کہ اے موسیٰؑ تجھ پر سلام تو نے مجھے زندہ کر دیا مگر میں اپنے آقا پہ سلام بھیجتا ہوں دن رات درود بھیجتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں اور کامل یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہاں اے میرے آقا تو نے مجھے زندہ کر دیا اگر تو نہ ہوتا تو میں بھی نہ ہوتا اور فرمایا یہ قوت قدسیہ تیرہ سو سال میں بھی کمزور نہیں پڑی۔ آج بھی اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے جیسے اس وقت رکھتی تھی جب حضور اکرم ﷺ اس دنیا میں موجود تھے اور قیامت تک یہ زندہ کرتی رہے گی۔

پھر جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں ان میں بھی درجہ بدرجہ یہ قوت آتی ہے اور آ سکتی ہے اگر ان نصائح پر عمل کیا جائے جو قرآن کریم نے پیش فرمائیں ہیں اور جن کی تشریحات احادیث نبویہ سے ملتی ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے اور یہ حدیث مسند حضرت امام اعظم کتاب الادب سے لی گئی ہے۔ **حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نیک باتوں کا بتانے والا ان پر عمل کرنے والوں کی طرح ہوتا ہے۔** اب دیکھیں کیسا پیارا کلام ہے، حیرت انگیز، عام طور پر لوگ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں صرف کہ جو نیک باتوں کی طرف بلاتا ہے اس کو بھی ثواب ملے گا گویا اس نے عمل کر لیا حالانکہ یہ مضمون زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا میری امت کے نیکی کی طرف بلانے والے عمل میں بھی نیک ہوتے ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ نیکی کی طرف بلائیں اور خود نیک نہ ہوں۔

اور پھر دوسرا وعدہ بھی اس میں شامل ہو گیا تمہارے بلانے کی وجہ سے اگر نیک عمل پیدا ہوں گے تو ان کا ثواب بھی تمہیں ملے گا۔ تھوڑے سے کلام میں کتنے حیرت انگیز مضامین کے سمندر آنحضرت ﷺ سمو دیا کرتے تھے۔ ان کتابوں میں جب آپ دیکھیں گے تو ساتھ ہی یہ لکھا ہوتا ہے

یعنی عمل کرنے والے کا ثواب بھی اس کو ملے گا اور اصل بات بھول جاتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ میری امت میں مجھ سے نیکی سیکھنے والوں میں یہ بات ناممکن ہے کہ کسی نیک عمل کی طرف بلا رہے ہوں اور اس نیک عمل کی ان کو توفیق نہ ہو۔ پس اس پہلو کو مدنظر رکھ کر ہم نے داعی الی اللہ بھی بننا ہے اور **امر بالمعروف اور نھی عن المنکر** بننا ہے۔ یعنی معروف باتوں کی طرف بلانے والا، ان کی ہدایت کرنے والا اور بدیوں سے روکنے والا۔

حضرت زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس وقت تک انسان کی ضرورتیں پوری کرتا رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ،باب الزّای ،من اسمہ زید، زید بن ثابت الانصاری ،رقم الحدیث :4663)

اب اس حدیث کو میں نے عمداً یہاں رکھا ہے حالانکہ بظاہر اس مضمون سے تعلق نہیں ہے۔ کسی بھائی کی حاجت روائی کرنا ایک نیکی ہے جو کسی اور کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اللہ اس کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ پس اگر کوئی محض اللہ کی خاطر کسی کی نیکی کی ضرورتیں پوری کرر ہا ہو اسے بدیوں سے روک رہا ہو اور لِلّٰہ کرر ہا ہو اور اس کے اندر کمزوریاں ہوں اور نیت پاک ہو تو یہ حدیث اس کے لئے بھی ایک خوش خبری ہے کہ جب تک وہ خدا کی خاطر بھلائیوں کی تعلیم دیتا ہے اور بدیوں سے روکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اندر بھلائیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور بدیوں سے اس کو روکتا چلا جاتا ہے۔

اور یہ میرا ساری زندگی کا تجربہ ہے مختلف تنظیموں میں میں نے کام کیا ہے وہ کام کرنے والے جو لِلّٰہ ان باتوں پر مامور ہو جایا کرتے ہیں، مقرر کر دیئے جاتے ہیں ہمیشہ ان کے اخلاق، ان کے اعمال میں ترقی ہوتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک شخص خدام الاحمدیہ کے کسی چھوٹے سے عہدے سے کام شروع کرے اور اس میں کمزوریاں ہوں اور اوپر تک جاتے جاتے وہ ساری کمزوریاں اسی طرح رہیں یا خوبیاں کم ہوں اور پھر بھی کم خوبیوں کے ساتھ وہ اوپر بڑھتا چلا جائے، کم خوبیوں کے ساتھ ہی وہ اوپر ترقی کرتا جائے۔ اس کا ہر دن بدلتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کے اندر پاک اخلاق پیدا ہوتے ہیں اس کی شخصیت میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور لازماً اگر وہ اخلاص کے ساتھ خدمت کرتا ہے تو بالآخر نیک انجام کو پہنچتا ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مدد ہے جو فطری تقاضوں کے طور پر بھی ہے اور غیر معمولی بیرونی مدد کے طور پر بھی آتی ہے اور صاحب تجربہ جانتے ہیں

کہ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس کی کمزوریاں دور کرنے کے لئے ایسے سامان پیدا کرتا چلا جاتا ہے کہ اچانک اس کو نصیحت آتی ہے۔ بعض دفعہ ٹھوکریں کھاتا ہے، بعض دفعہ محبت اور پیار کے رستے سے اس کی تربیت فرماتا ہے۔ مگر جب تک وہ دوسروں کی تربیت میں ہے خدا ضرور اس کی تربیت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ یہ وعدہ ہے جو آنحضرت ﷺ نے ہمیں دیا۔

ایک اور حدیث ہے جو حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ہے مسلم کتاب الذکر (و الدعاء و التوبة والاستغفار) میں باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر، یہ عنوان ہے اس حدیث کا۔ **حضرت ابوھریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی مسلمان کی دنیاوی بے چینی اور تکلیف کو دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی بے چینیوں اور تکلیف کو اس سے دور کرے گا۔** جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ عمل جس کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ محض دنیا کی اصلاحوں سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس دنیا کی زندگی میں جو باتیں ٹھیک ہونے سے رہ بھی جائیں، ان کی اصلاح نہ بھی ہو سکے خدا تعالیٰ اتنا اجر عطا فرماتا ہے نیکی کی طرف بلانے والے اور بدیوں سے روکنے والے کو کہ اس کی وہ بے چینیاں دور کر دیتا ہے جو ان اعمال کے نتیجہ میں ہیں جو اصلاح پذیر نہ ہو سکیں، ان کمزوریوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جن کی اصلاح نہ ہو سکی، جن کو دور نہ کیا جا سکے۔ تو اللہ تعالیٰ کا اجر کا معاملہ اس دنیا سے بھی تعلق رکھتا ہے اس دنیا سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

اس سے زیادہ عظیم نصیحت کرنے والا کب دنیا میں کسی نے دیکھا۔ ناممکن ہے۔ ساری کائنات میں مصلحین پر نظر ڈال کر دیکھ لیں محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر، گہرائی میں اتر کر نصیحت کرنے والا اور ایسی نصیحت کرنے والا جو کھینچ لے بڑی قوت کے ساتھ۔ کبھی آپ کہیں دنیا میں نہیں دیکھیں گے نہ ہو سکتا تھا، نہ ہوا ہے، نہ آئندہ ہوگا مگر آپ جو ہیں آئندہ کسی الگ ناصح کی اس لحاظ سے ضرورت نہیں کہ جو ناصح بھی اٹھے گا آپ ہی کی نصیحتیں لے کے اٹھے گا۔ حضرت مسیح موعودؑ نے کب اپنی طرف سے کچھ مزید اضافہ کیا وہی کاروبار ہے جسے لے کر چلے ہیں اور اسی میں طاقت ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نصیحت کو یا نصائح کو غور سے دیکھیں اور ان میں جوڑ ملائیں اور معلوم کریں کہ یہ کس مضمون سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ جب آپ ان کو سمجھیں گے تو حیرت کے سمندر میں غرق ہو جائیں گے یہ کتنا عظیم نبی ہے۔

اور اب اصلاح کی طرف بلانے کے لئے دیکھیں کتنی پیاری بات ہے کہ تمہارا اس سے بہتر سودا اور کیا ہوسکتا ہے۔تم نیکیوں کی طرف بلا رہے ہو خدا کی خاطر کرو تمہاری کمزوریاں ہیں جنہیں تم دور کرنے کی کوشش کرو گے تو تمہاری نیکیوں کی آواز میں طاقت پیدا ہو جائے گی اور جو تمہاری طاقت نہیں ہے وہ آسمان سے اترے گی اور اللہ تمہارا مددگار بن جائے گا۔تمہاری کمزوریاں دور کرتا رہے گا اور تمہاری نصیحت پر جو نیک عمل کرے گا اس کے اجر بھی تمہیں دیتا رہے گا اور اگر کمزوریوں سمیت تم مر گئے اور اس سفر کا ابھی انجام نہیں تھا یعنی اس کی آخری منزل نہیں پہنچی تھی اور تم پہلے مر گئے تو اللہ تعالیٰ اس بات کا بھی ضامن ہے کہ تمہاری کمزوریوں کے نتیجہ میں جو بے چینیاں اور کرب تمہیں آخرت میں ستانے تھے ان کو دور فرما دے گا۔کتنا عظیم سودا ہے، کتنا عظیم الشان وعدہ ہے جو ایک چھوٹی سی بات سے تعلق رکھتا ہے کہ خلوص نیت سے نیکی کی طرف بلائیں، خلوص نیت اور پیار کے ساتھ بدیوں سے روکنے کی کوشش کریں۔

اس حدیث کی آگے تفاصیل ہیں۔ان کو براہ راست اس مضمون سے اگر نہ بھی باندھا جائے تو پھر بھی وہ بہت ہی گہرا اثر رکھنے والی نصیحتیں ہیں اس لئے میں وہ ساری آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔فرمایا جس شخص نے کسی تنگ دست کو آرام پہنچایا اس کے لئے آسانی مہیا کی اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کے لئے آسانیاں مہیا کرے گا۔اب تنگ دست کے لئے آسانی مہیا کرنا جو شخص ایسا کرتا ہے وہ نصیحت بھی تو کرتا ہے۔اس لئے کلیۃً بے تعلق بات نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد:18) مومن وہ ہیں جو کمزوروں اور مجبوروں کو صبر کے ساتھ نصیحت کرتے ہیں اور آگے رحمت کی نصیحت کرتے ہیں کہ تم بھی لوگوں سے رحمت کا سلوک کرو اور سب سے زیادہ غریبوں کی ضرورت پوری کرنے کی طرف رسول اللہ ﷺ نے توجہ دلائی ہے۔تو آپؐ بتا تو نہیں رہے کھل کے کہ تم سب کی نیکیوں کا اجر خدا مجھے بھی دے گا مگر آپ کو سمجھانے کی خاطر آپ کے نفس کے حوالے سے وعدے دے رہے ہیں کہ تم اگر کرو گے تو تمہارے دائرہ کار میں جہاں جتنی جتنی بھی نیکی پھیلے گی اللہ اس کا اجر دے گا، جتنے دکھ دور ہوں گے خدا تمہیں ان کا اجر دے گا۔

پھر فرماتے ہیں جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔اب یہ جو نصیحت ہے اس کا ہمارے معاشرے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔پردہ پوشی کا مضمون

بہت اہم ہے۔انفرادی کمزوریاں جو ہیں ان میں پردہ پوشی کا ہی حکم ہے لیکن وبائی کمزوریوں میں پردہ پوشی کا حکم نہ صرف یہ کہ نہیں ہے بلکہ ایک جرم بن جاتی ہے۔ ہر وہ معاملہ جس کا دین کی بقاء سے تعلق ہو ہر وہ معاملہ جس کا اسلامی معاشرے کی حفاظت سے تعلق ہو اگر کوئی ایسی بات کرتا ہے جو اس معاشرے میں رخنہ ڈالنے والی ہو جو نظام کو کمزور کرنے والی ہو اس کے متعلق پردہ پوشی کا کہیں کوئی حکم نہیں ہے۔ بلکہ قرآن فرماتا ہے لازم ہے کہ وہ تم اولوالامر لوگوں کی طرف پہنچایا کرو۔ جب ایسی باتیں سنو تمہارا فرض ہے کہ وہ جن کو خدا نے عقل اور فہم عطا کیا ہے، جو جانتے ہیں کہ پیچھے کیا کیا محرکات کام کر رہے ہیں جو تجزیہ کر سکتے ہیں یعنی اس کی بدیوں سے جماعت کی حفاظت کر سکتے ہیں فرمایا ان تک ضرور پہنچاؤ اور وہاں صرف رسول اللہ ﷺ تک پہنچانے کا حکم نہیں بلکہ سب ایسوں کی طرف پہنچانے کا حکم ہے۔یعنی جمع کا صیغہ ایسا استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں اگر ایک جگہ کوئی امیر ہے اس کے چھوٹے دائرے میں بھی کوئی ایسی حرکت ہو رہی ہے تو پردہ پوشی کے نام پر آپ کہیں کہ اس نے بات تو ایسی کی تھی جس سے جماعت کو نقصان پہنچتا تھا۔جس سے جماعت کے وقار کو ٹھوکر لگتی تھی ،جس سے لوگوں کے اخلاص کو صدمہ پہنچتا تھا مگر ہم نے دیکھو پردہ پوشی کر لی، یہ پردہ پوشی نہیں ہے۔ یہ بے وفائی ہے سلسلہ کے اعلیٰ مفادات سے اور جماعت سے بے وفائی ہے جس کو نقصان پہنچے گا۔

مگر ایک شخص کمزوری چھپ کے کرتا ہے، وہ خدا کی آنکھوں سے تو چھپ نہیں سکتا بنی نوع انسان سے کم سے کم شرم تو کرتا ہے،آپ اس کی کمزوری پر اطلاع پاتے ہیں اور اس کا چرچا کر دیتے ہیں یہ پردہ پوشی کے خلاف ہے۔آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا اپنی ستاری کا پردہ تم سے بھی اٹھا لے گا اور اگر خدا کی ستاری نہ رہے تو ہر انسان ننگا ہے۔ یہ تو وہ حمام ہے جس میں سب کی نظر ہے۔شیشے کا حمام ہے ہر کوئی دیکھ لے گا اگر خدا کی طرف سے ستاری کا پردہ نہ ہو۔ ہر لمحہ خدا کی ستاری کے اندر چھپے ہوئے ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔اگر یہ نہ ہوتا تو یہ زندگی دنیا ہی میں جہنم بن جاتی۔تو اس لئے یہ مضمون اچھی طرح سمجھ لیں جب حضور اکرم ﷺ پردہ پوشی کا حکم دیتے ہیں تو وبا والی بیماریوں سے پردہ پوشی کا حکم نہیں دیتے۔جس شخص میں وبائی بیماری ہے اور آگے پھیلا سکتا ہے اس کی اطلاع اولوالامر کو کرنا جہاں جہاں بھی وہ اولوالامر ہو لازم ہے اور جہاں اس کی ذاتی کمزوری ہے اور

اس کمزوری کے علم سے کسی کو فائدہ نہیں ہوگا بلکہ نقصان کا خطرہ ہے ایسی صورت میں اگر کوئی پردہ دری کرتا ہے تو اپنا نقصان کرے گا، اپنی عاقبت خراب کرے گا اور قوم کو نقصان پہنچائے گا۔ قوم کو نقصان اس طرح پہنچتا ہے کہ مثلاً بعض جماعتوں کی طرف سے مجھے بعض لوگ لکھتے ہیں کہ فلاں امیر صاحب ہیں ان میں یہ یہ کمزوریاں ہیں اور ہم نے جب یہی بات کی تھی تو لوگ ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہمارا کیا جرم ہے؟ سچ بولا ہے ہم نے۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے متعلق بھی اگر سچ بولے جائیں اس طرح تو تمہارا کیا حال رہے گا؟ تمہاری بیوی بچوں کے متعلق ایسے سچ بولے جائیں تو تمہارا کیا حال رہے گا؟ اگر وہ ایسی کمزوریاں ہیں جو منظر عام پر نکلی ہیں تو پھر بھی تمہارا فرض یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو بتاؤ۔ پھر تم پر لازماً یہ فرض بن جاتا ہے کہ بالا افسران تک اس کو پہنچاؤ یا اس کو مل کر نصیحت کرو۔ اگر وہ کام نہیں کرتی تو بالا افسران تک پہنچاؤ۔ اگر وہاں شنوائی نہیں ہوتی تو اوپر پہنچاؤ جہاں تک بندوں میں تمہاری رسائی ہے تمہارا فرض ہے کہ پہنچاتے چلے جاؤ کیونکہ اب یہ کمزوری ذاتی نہیں رہی بلکہ فحشاء بن گئی ہے۔ مگر ذاتی کمزوریوں کا جہاں تک تعلق ہے قرآن حدیث میں پردہ پوشی کا ہی حکم ہے اور اللہ بھی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ پس ایسے لوگ جو لوگوں کے پردے کھینچتے ہیں اللہ ان کے پردے کھینچ لیا کرتا ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ قیامت کے دن بھی یہی حیاء کا پردہ ہے جو آپ اپنے لئے رکھتے ہیں اور اپنے بھائی کے لئے بھی رکھتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی ستاری کا پردہ بن جائے گا۔ اگر اس دنیا میں آپ یہ حیاء کا پردہ چاک نہ کردیں، نہ اپنے لئے رکھیں نہ غیر کے لئے رکھیں تو قیامت کے دن بھی آپ کے لئے کوئی ستاری کا پردہ آپ کی بدیوں کو ڈھانپنے کے لئے نہیں اترے گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہ حوالہ دیا ہے جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا کلام، حیرت انگیز ہے۔ کوئی اپنی طرف سے بنانے والا جس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے آسمان سے روشنی نہ اتری ہو اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتا۔ وہ نقد نقد سودے کی باتیں کرے گا۔ وہ کہے گا تم پردہ پوشی کرو تمہاری بھی پردہ پوشی ہوگی لیکن آخرت کا حوالہ دے کر اس مضمون کو بہت وسعت دے دی ہے۔ فرمایا اس دنیا کی پردہ پوشی نہ بھی ہو تو اتنا فرق نہیں پڑتا مگر اس بھری دنیا میں جو پردہ دری ہو رہی ہو جبکہ اگلے پچھلے سب جمع ہوں اور وہ کیسے ہوگی اللہ بہتر جانتا ہے ورنہ ہماری محدود عقل میں ان صلاحیتوں کا تصور ہی نہیں کہ آغاز سے لے کر انجام تک کے

انسان اکٹھے ہوں اوران کی باتوں پہ کہیں پردے ڈالے جارہے ہیں کہیں پردہ دری ہورہی ہے اور ہر انسان سمجھ رہا ہے ۔ یہ وہ مضمون ہے جو صلاحیتوں کے تیز ہونے سے تعلق رکھتا ہے، حسیات کے دائروں کے پھیلنے سے تعلق رکھتا ہے اور قرآن کریم یہی وعدے فرمارہا ہے کہ قیامت کے دن تمہیں تیز حسیں عطا کی جائیں گی کہ جن باتوں کا تم پہلے کوئی شعور نہیں رکھتے تھے وہ شعور تمہیں نصیب ہوجائے گا۔پس ہوگا ضرور۔جو بات آنحضرت ﷺ نے فرمائی لازماً ہوکر رہنے والی بات ہے ۔پس ڈراتے ہیں کہ تم آخرت کی پردہ دری سے ڈرو۔ یہاں اگر تم اپنے بھائی کی پردہ پوشی کروگے تو یادرکھو قیامت کے دن یا قیامت کے بعد جب آخری حساب فہمی ہوگی اللہ تعالیٰ تم سے بھی پردہ پوشی کا سلوک فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس بندے کی مدد کے لئے تیار رہتا ہے جو اپنے بھائی کی مدد کیلئے تیار ہو۔اب ان سب باتوں میں جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا وَتَوَاصَوْا کا مضمون داخل ہے۔اس لئے آپ اگر یہ سمجھیں کہ یہ بے تعلق باتیں ہیں،کلیۃً بے تعلق نہیں ہیں۔مومن وہ ہے جو نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے نیکیوں میں ایک دوسرے کا مددگار بنتا ہے اور یہ دونوں باتیں اکٹھی ہوکر وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ کی نصیحت بن جاتی ہیں ۔پس بظاہر یہاں تعاون کی بات ہورہی ہے۔اپنے بھائی سے تعاون کرو،اس کی ضرورتیں پوری کرو،اس کی پردہ پوشی کرو اس کے حوائج جتنے بھی ہیں اس کو پورا کرتے ہوئے تمہیں تکلیف بھی اٹھانی پڑے تو تکلیف اٹھاؤ۔معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کا نصیحت سے تعلق نہیں مگر قرآن کریم فرماتا ہے کہ جو کام تم نیک کرتے ہو اس کی نصیحت بھی کیا کرو۔غریبوں سے ہمدردی کرو تو ہمدردی کی نصیحت بھی کیا کرو ۔پس اس مضمون کا نصیحت کے ساتھ از خود تعلق قائم ہوجاتا ہے۔

پس آنحضور ﷺ کی نصیحت کا انداز بھی درجہ بدرجہ آگے بڑھتا ہے۔ پہلے ان بنیادی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں جن کے بغیر انسان اعلیٰ مضامین کی طرف بڑھ ہی نہیں سکتا اور پھر ان مضامین کا ذکر کرتے ہیں تو بے اختیار روح سے آنحضرت ﷺ کے لئے درود کی آوازیں اٹھتی ہیں ۔دعائیں تو سوچ کر کی جاتی ہیں مگر اگر آنحضورؐ کے احسانات پر آپ نظر ڈالیں تو بے اختیار آپ کی روح سے آوازیں اٹھیں گی ناممکن ہے کہ ان آوازوں کے ساتھ درد کی چیخیں شامل نہ ہوں کیونکہ ایک محسن کا احسان جب غلبہ کر لیتا ہے، جب چھا جاتا ہے اس کی روح پر تو اس وقت بے اختیار ان آوازوں میں ایک

درد پیدا ہو جاتا ہے، ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ آوازیں لازماً آسمان کی بلندیوں تک پہنچتی ہیں۔ پس آنحضورﷺ پھر علم کا مضمون سکھا کر پھر درس و تدریس کی روحانی تربیت کی باتیں فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے سکینت عطا فرمائے گا اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کو ڈھانپ لے گی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے ڈھانپے رکھتی ہے، فرشتے اسے گھیرے رکھتے ہیں جب تک کہ وہ ان باتوں میں مصروف رہتا ہے۔ پھر رسول اللہﷺ فرماتے ہیں دیکھیں ترقی کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے۔ اب ایسا شخص جو علم کو خدمت دین کے لئے، خدمت بنی نوع انسان کے اعلیٰ تقاضوں کی خاطر استعمال کرے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے مقربین میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ اس دنیا میں آپ باتیں کر رہے ہیں نیکی کی اور آپ کا ذکر اوپر کی مجلسوں میں چل رہا ہے۔ غالب تو کہتا ہے:

گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے بایں ہمہ
ذکر میرا، مجھ سے بہتر ہے کہ، اس محفل میں ہے (دیوان غالب: 242)

برائی کے باوجود اگرچہ برا ہی ذکر ہے مجھے خوشی ہے کہ میرا ذکر اس محفل میں ہے۔ مگر آنحضرتﷺ جو ان محافل کے راز دان ہیں، آپؐ فرماتے ہیں کہ تمہارا بھلائی سے ذکر چلے گا اور اللہ اپنے مقربین میں تمہارا پیار سے ذکر کرے گا۔

جو شخص عمل میں سست رہے اس کا نسب اور خاندان اس کو تیز نہیں بنا سکتا یعنی وہ خاندانی بل بوتے پر جنت میں نہیں جا سکے گا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو ہر شخص کے لئے برابر یکساں مہیا ہیں اور حسب نسب کا اس کا کوئی دور سے بھی تعلق نہیں، قومیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سب کے لئے دعوت عام ہے۔ تم اس پر عمل کرو اور یہ ساری بلندیوں کے وعدے جو تم سے کئے گئے ہیں یہ سب رفعتیں جن کے تمہیں وعدے دئے جا رہے ہیں یہ تمہیں عطا کی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کامل یقین کے ساتھ دنیا کو ہدایت کی طرف بلانا ہے اور کامل یقین کے بغیر ہدایت کی طرف بلانا بے کار ہو جایا کرتا ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 16 راگست 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسرائیل:85)

پھر فرمایا:

قرآن کریم کی بعض آیات کے حوالے سے میں نے گزشتہ خطبات میں وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدہ:3) کے مضمون پر روشنی ڈالی تھی کہ نیکیوں کے معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور بدیوں کے معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔ اسی تعلق میں اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے دعوت الی اللہ کا مضمون بیان کیا تھا۔ دعوت الی اللہ بھی دراصل وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے نتیجے میں طبعاً پیدا ہوتی ہے اور اس پہلو سے میں مضمون کے کچھ حصے کو بیان کر سکا تھا کچھ باقی تھا کہ وقت ختم ہو گیا۔ آج میں نے اس مضمون کے ایک اور پہلو کو اٹھایا ہے جو دراصل بعض ذہنوں میں ایک اشتباہ پیدا کرتا ہے اس کی وجہ سے وضاحت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا کہ تو کہہ دے کہ ہر شخص اپنی تخلیق، اپنی تشکیل کے مطابق کام کرتا ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے، وہی جانتا ہے جو تمہارا رب ہے کہ تم میں سے کون زیادہ صحیح رستے پر تھا یا زیادہ صحیح رستے پر ہے۔ دوسری طرف قرآن کریم یہ فرماتا ہے کہ جو بت پرست ہیں، جو شرک

کرنے والے ہیں ان پر بھی تم تحکم نہ کرو اور اس یقین کے باوجود کہ خدا ایک ہے ان کے بتوں کو بھی گالیاں نہ دو۔ وجہ کیا ہے: كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام:109) کیونکہ ہم نے اس طریق پر ہر شخص کو اس کا مسلک خوب صورت کر کے دکھایا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں ہی ٹھیک ہوں۔ ہاں جب تم مرجاؤ گے ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ ان لوگوں کا، سب کا جب رجوع خدا کی طرف آخر پہ ہوگا تو وہ فیصلہ کرے گا کہ کون صحیح تھا اور کون غلط تھا۔

ان دو آیات کے پیش نظر کیا دعوت الی اللہ کرنا درست بھی ہے کہ نہیں۔ کیا ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ بھی سکتے ہیں کہ نہیں کہ ہم حق پر ہیں؟ کیا ان آیات کا مضمون اس زعم سے متصادم تو نہیں کہ ہر انسان کہے کہ میں حق پر ہوں؟ زیادہ گہرائی سے جب ان آیات کے مضمون پر غور کیا جائے تو یہ متصادم نہیں ہے بلکہ بالکل اور مضمون ہے جو بیان ہو رہا ہے۔ جہاں یہ فرمایا: كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ جب یہ فرمایا فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا وہاں ساتھ یہ بھی تو اعلان فرمایا عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف:109) کہ میں اور میرے ماننے والے تو بصیرت پر قائم ہیں، دن کی روشنی کی طرح صداقت کو دیکھ رہے ہیں اور پہچان رہے ہیں اور تم اندھیروں میں بھٹک رہے ہو تو چونکہ قرآن کریم کی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے ٹکراتی نہیں ہے اس لئے بظاہر متصادم آیات کو اکٹھا دیکھ کر ایسا نتیجہ نکالنا پڑے گا جو ان تینوں کے اندر تصادم نہیں پیدا کرتا بلکہ تعاون پیدا کرتا ہے اور تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کا ایک یہ بھی مضمون ہے۔

تو نیکی کے حصول کے لئے تم خود جیسے دوسروں سے تعاون کرتے ہو، تعاون چاہتے ہو قرآن کریم کی آیات بھی ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ تم قرآن کریم کی متعلقہ آیات کو اکٹھا دیکھو اور ان کو متصادم پاؤ کیونکہ ایک آیت جب دوسرے سے متصادم ہو تو ان کے مصنف کے دماغ میں خلل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ تمام حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے یہ یقینی اور قطعی حقیقت ہے، اٹل بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کبھی بھی متضاد کلام نازل نہیں ہوسکتا، نہ ہوا ہے۔ پس جہاں تصادم دکھائی دے وہاں مومن کا فرض ہے، اس کے تقویٰ کا تقاضا ہے کہ تصادم کے پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے تعاون کا رنگ نکالے اور جب آیات ایک دوسرے سے

تعاون کریں گی تو مضمون بالکل کھل جائے گا۔ پس اس پہلو سے جہاں تک اپنے اشتباہ کا تعلق ہے میں اس کی طرف واپس آتا ہوں۔

یہ خیال کر لینا کہ ان آیات کا یہ معنی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کسی قطعی حقیقت کا علم ہو نہیں سکتا یہ غلط ہے۔ یہ اگر مضمون ہو تو سارا نظامِ دین درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے یہاں ایک اور بات کی بحث چل رہی ہے وہ بنیادی حقوق کی بحث ہے۔ انسان کے خدا پر بھی حقوق ہیں، بندوں پر بھی حقوق ہیں اور خدا کے انسان پر بھی حقوق ہیں اور بندوں پر بھی حقوق ہیں۔ یہ مضمون قرآن کریم کی رو سے کامل عدل پر قائم ہے اور عدل کا جو نظام ہمیں ان حقوق کے معاملات میں ملتا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ چنانچہ جو مضمون ان دو آیات کے حوالے سے میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے یعنی ہر شخص شَاكِلَتِهٖ پر کام کرتا ہے اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون صحیح ہے اور ہر شخص کو اپنی چیز اچھی دکھائی دیتی ہے اور قیامت کے دن جب تم خدا کی طرف لوٹ جاؤ گے تو وہ فیصلہ کرے گا۔

ان باتوں میں کہیں تضاد تو نہیں۔ یہ مضمون ہے جو میں آپ کے سامنے کھول رہا ہوں۔ کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک ایسا مضمون بیان ہو رہا ہے جو انسان کو بشریت کے تقاضے سکھاتا ہے، اس کو عجز کی اعلیٰ تعلیم دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سے خدائی کے حق کو چھینتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ تم اپنی عقل پر بھروسہ کرنے کے باوجود خدائی اختیارات اپنے قبضے میں لینے کے اہل نہیں ہو، نہ تمہیں یہ دیئے جائیں گے۔ یعنی دو آیات ہیں جو انسان اور انسان کے درمیان ایک بنیادی عدل کی تعلیم دینے والی ہیں۔ پس ہر شخص جو کسی بات کو حق سمجھے خواہ وہ حق ہو یا نہ ہو، یہ قرآن کریم نہیں کہہ رہا کہ ہر بات جو انسان سمجھتا ہے وہ حق ہی ہوتی ہے، یہ بحث یوں ہے کہ اگر ایک انسان کسی بات کو حق سمجھتا ہے تو یہ فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ واقعۃً وہ حق سمجھ بھی رہا تھا کہ نہیں، جھوٹا تو نہیں تھا اور اگر وہ سچا ہو حق سمجھنے میں تو اس کو سزا مل ہی نہیں سکتی۔ پس سزا کا تعلق لازماً اس احساس کے ساتھ ہے جو انسان کو مجرم کرتا ہے اور اس کا ضمیر ہے جو ہمیشہ اس کو مجرم کرتا ہے۔ پس جہاں تک دنیا کے دیکھنے کا تعلق ہے، دنیا اس کے ضمیر کی آواز تو نہیں سنتی، اس کو پتہ ہی نہیں کہ اس کے اندر کیا کیا آوازیں اٹھتی رہیں اور کیوں یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کو اپنی غلطی کا چاہے تو علم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (القیامہ: 16،15) کہ یہ کہہ دینا

کہ ہم کسی کو ہر بات اس کو اچھا کر کے دکھاتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہر شخص جو جھوٹا ہو غلط کار ہو وہ جائز طور پر اس بات کو اچھا دیکھتا ہے اور اس کا یہ اچھا دیکھنا اسے سزا سے بری کرتا ہے۔ یہ دو الگ الگ مضمون ہیں چونکہ باریک ہیں اس لئے میں آپ کو سمجھانا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ روزمرہ زندگی میں ان کا سمجھنا ضروری ہے۔

ہر چیز کو اچھا دیکھنا یہ نفس کے اندر جو دھوکہ دینے کی صفت ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ ہم دکھاتے ہیں سے مراد یہ ہے کہ ہم نے نفس کو اس طرح تشکیل دیا ہے کہ ہر انسان اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا رہتا ہے ہمیشہ۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اسے یہ طاقت بخشی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے اندر کی خرابیوں کو دیکھے، جانچے، پہچان لے اور معلوم کر لے کہ وہ غلط ہے۔ یہ بصیرت والے مضمون کے وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ والے مضمون کے علاوہ یہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے بھی ثابت شدہ مضمون ہے۔ قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ انسان جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس کے اندر خدا تعالیٰ نے طاقت رکھی ہے کہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (الرحمان: 5،4) بیان کا معنی بعض لوگ صرف اظہار بیان کی طاقت سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ بیان کا تعلق بینہ سے ہے اور بینہ ان صداقتوں کو کہا جاتا ہے جو لازمی اور حقیقی اور دائمی ہیں۔ وہ صداقتیں جو انسان کی ضمیر پر کندہ ہیں۔ ہر انسانی فطرت ان صداقتوں کے خمیر سے اٹھائی گئی ہے اور ان کو پہچاننا اور ان کے مقابل پر بدی سے ان کی تمیز کرنا یہ بیان ہے یعنی کھرے کھوٹے کی تمیز کی طاقت، صحیح کو غلط سے جدا کرنا۔ پس بیان اگر اندر ہو تو پھر وہ بیان بن سکتا ہے۔ باہر کوئی انسان بھی جو اپنے مضمون پر پورا عبور نہ رکھتا ہوا سے پتا نہ ہو کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ اس مضمون پر بات نہیں کر سکتا۔ پرچہ دینے والا طالب علم پرچہ بھی نہیں دے سکتا کیونکہ بیان کا ایک اندرونی تعلق ہے اور ایک بیرونی تعلق ہے۔ جس شخص کو اندرونی طور پر اپنی کیفیات کا قطعیت سے علم ہو، جس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہے اس کے سب پہلوؤں پر حاوی ہو وہ جب بیان کرے گا تو کھل کر بیان کرے گا۔ جب یہ علم نہ ہو تو پھر اس کو مضمون بیان کرتے وقت الجھن محسوس ہوتی ہے۔ وہ کبھی ادھر بھٹکتا ہے کبھی ادھر بھٹکتا ہے۔ الفاظ کی تلاش کرتا ہے وہ صحیح ملتے نہیں۔ غرضیکہ اس کا سارا بیان ہی الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تب ہی غصے کی حالت میں بیان کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور

قرآن کریم سے صاف پتا چلتا ہے کہ غصے کی حالت میں جب غلبہ ہو کسی وقت کسی جنون کا اس وقت انسان بیان کرنے کی طاقت سے محروم ہو جاتا ہے۔ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (الزخرف:19) اور غصے کا مضمون خصام کے لفظ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ فرمایا جب یہ عورتیں جھگڑا کرتی ہیں تو کھل کر بات نہیں کر سکتیں یا انسان جو بھی ہوں سب پر یہ برابر مضمون آتا ہے کہ جب وہ جھگڑنے کے موڈ میں ہوں تو چونکہ غصے کی حالت میں جھگڑا پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ بیان کی طاقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ تو بیان کو صرف ظاہری کلام پر محمول کرنا غلط ہے۔ بیان اس اندرونی طاقت کا نام ہے جو کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرتی ہے اور اگر یہ طاقت ہے تو ہر انسان کو قطعیت سے معلوم ہو جانا چاہئے کہ میرا مسلک درست ہے کہ غلط ہے۔ اگر نہیں ہوتا تو نفس کا بہانہ ہے اور نفس کا بہانہ ہے جو چیز کو خوب صورت دکھاتا ہے اور نفس کے بہانوں کے باوجود انسان اپنی غلطی کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ ہے تمام مضمون جو ان آیات کے باہمی تعاون سے ابھرتا ہے۔ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ کے مضمون کو آپ دیکھ لیں اور پھر یہ دیکھیں کہ باوجود اس کے کہ نفس بہانے بناتا ہے پھر بھی انسان پہچان سکتا ہے تو اس کے بعد زَيَّنَّا کا معنی پھر ایسا کرنا جو اس آیت سے متصادم ہو جائز ہی نہیں ہے۔ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان ایک غفلت کی حالت میں زندگی بسر کرتا ہے، کھوئی کھوئی حالت میں رہتا ہے، جو کچھ کرتا ہے اسے اچھا دکھانے میں یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اچھا دیکھے اور اچھا دکھائے۔ اس وجہ سے وہ بسا اوقات صداقتوں پہ بھی پردے ڈال لیتا ہے لیکن چاہے تو اپنے نفس کو معلوم کر سکتا ہے اور وہ لوگ جو صداقت پر ہیں یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ یہ اعلان کرتے ہیں کہ یقیناً ہم کھلی کھلی واضح روشن صداقت پر قائم ہیں۔ فیصلہ تو مرنے کے بعد ہوگا لیکن یقین اس دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ دوسرا جب کہتا ہے مجھے بھی اسی طرح یقین ہے پھر بحث اٹھتی ہے کہ کس کو کیا اختیار ہے۔

اب یہ مضمون اس منزل میں داخل ہو جاتا ہے جہاں دو دعوے دار آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک نے کہا تم کہتے ہو ہم بصیرت پر ہیں، ہم بھی یقین سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم بصیرت پر ہیں۔ تم کہتے ہو تمہیں کامل یقین ہے تم سچے ہو، ہم بھی کہتے ہیں ہمیں کامل یقین ہے کہ ہم سچے ہیں۔ اب وہاں انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی ضمیر کی آزادی کے ساتھ جو خدا نے انصاف فرمایا ہے

اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو جھوٹا قرار دے کر سزا دینے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تو جو مضمون ہے ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمۡ مَّرۡجِعُهُمۡ اس میں یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اس دنیا میں جھوٹے تو ہیں بہر حال، یہ تو نہیں کہ سارے سچے ہیں۔ ہر ایک کو یہ بھی حق ہے کہ کہہ لے کہ ہم سچے ہیں۔ ہر ایک اپنی بات کو اچھا دیکھ بھی لیتا ہے اگر کچھ منفی اور غفلت کی آنکھوں سے دیکھے لیکن اس میں یہ طاقت ضرور موجود ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے نفس کو ٹٹو لے اور صداقت معلوم کر لے۔ اگر یہ طاقت نہ ہوتی تو قیامت کے دن اس کو سزا دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اب یہی آیت جو زَیَّنَّا والی آیت ہے جب یہ کہتی ہے کہ جب ہمارے سامنے پیش ہو گے تو ہم پھر برے اعمال کے مطابق اس کو سزا دیں گے تم نہیں دے سکتے یعنی اے انسان ہم کریں گے یہ کام۔ تو صاف ثابت ہوا کہ سزا کا جواز موجود ہے اور وہ جواز اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہر انسان اپنے ضمیر کی آواز کو سنتا ہو یا ایک لمبے عرصے تک سنتے سنتے جب اس کو نظر انداز کر دے تو بہرا ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنے خلاف یہ ثابت کر چکا ہو کہ میں جھوٹا ہوں اور صحیح آوازیں مجھے ملی تھیں اور میں نے ان کو ردّ کر دیا تھا۔ یہ وہ حتمی فیصلہ ہے جو اس دنیا میں ہر انسان کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے۔ پھر جو حالتیں ہیں وہ دھوکے کی حالتیں ہیں، وہ بے ایمانی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں، دہریت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں، نفس کے غلبے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں لیکن جب یہ پیدا ہو جائیں تو پھر خدا کیا حق دیتا ہے یہ سوال ہے جو اٹھایا جا رہا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ہر بندے سے یہ حق لے لیتا ہے کہ دنیا میں خدا بنے اور معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ کہتا ہے تم وہیں کھڑے ہو جاؤ جہاں دوسرا کہتا ہے میں بھی سچا ہوں۔ تم اپنی طرف سے دلائل دے بیٹھے اس نے انکار کر دیا اور کہہ دیا نہیں میں کامل یقین سے کہتا ہوں کہ میں سچا ہوں۔ پھر معاملہ حوالہ بخدا کرو پھر تمہیں اختیار نہیں ہے کہ قانونِ خداوندی کو اپنے ہاتھ میں لو اور اس کی سزا کا، دنیا میں سزا کا فیصلہ کرو۔

یہ بات کہ دنیا میں سزا کا فیصلہ کرنا انسان کو خدا تعالیٰ نے اختیار دیا ہی نہیں یہ بات اس مضمون کو مزید کھول دیتی ہے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے اور اسی آیت میں وہ دلیل موجود ہے جس سے آپ ثابت کر سکیں کہ آپ سچے ہیں اور فلاں جھوٹا ہے کیونکہ جب اختلاف پیدا ہوں اور خدا کے اس فیصلے کے خلاف کوئی فریق یہ اعلان کرے کہ چونکہ میں تمہیں جھوٹا دیکھتا ہوں اس لئے میرا

حق ہے کہ تمہاری گردن ماروں۔ میں تمہیں جھوٹا سمجھتا ہوں اس لئے میرا حق ہے کہ تمہیں سزائیں دوں، تمہیں تمہارے بنیادی حقوق سے محروم کروں تو وہیں اس کا جھوٹا ہونا اس دنیا میں ثابت ہوگیا کیونکہ قرآن کریم کے اس بیان سے وہ متصادم ہوگیا۔ اللہ فرماتا ہے کہ میرا حق ہے کہ میں فیصلہ کروں اور جب تم میری طرف لوٹائے جاؤ گے تب میں فیصلہ سناؤں گا۔ ایک مولوی کہتا ہے کہ میرا حق ہے کہ میں فیصلہ کروں اور میں اتنا سچا ہوں کہ مجھے نظر آرہا ہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور میں پوری استطاعت رکھتا ہوں کہ اس کے دل کے حالات بھی پڑھ لوں اور فیصلہ کردوں کہ یہ جھوٹا ہے اور میں سچا اور اتنا سچا ہوں کہ مجھے مالکیت کے اختیار بھی مل گئے ہیں۔ اتنا سچا ہوں کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں اس انتظار کی کہ مریں گے تو خدا فیصلہ کرے گا۔ زندگی میں میں فیصلہ کرسکتا ہوں مجھے طاقت ہے میں مار سکتا ہوں میں کیوں نہ ماروں۔ جوں ہی وہ یہ موقف اختیار کرتا ہے اس آیت کی رو سے وہ جھوٹا ثابت ہوگیا۔ پس یہ آیات جو ہیں وہ اپنے اندر استدلال رکھتی ہیں اور یہ غلط ہے کہ کوئی کہہ دے کہ عَلٰى بَصِيْرَةٍ ہو ہی نہیں سکتا۔ جوں ہی آپ کے سامنے کوئی یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ نہ صرف میں سچا ہوں بلکہ تمہیں جھوٹا ہونے کی سزا دینے کا بھی اختیار رکھتا ہوں وہیں وہ جھوٹا ثابت ہوگیا اور جھوٹا بھی اور جھوٹا خدا بھی۔ نہ اس کا دین رہا نہ اس کی دنیا رہی ہر حالت سے وہ ذلّت اور تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

اور عَلٰى بَصِيْرَةٍ کا دعویٰ یہاں سے شروع ہوتا ہے وہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور سب دنیا دیکھ لیتی ہے کہ یہ آدمی سچا ہے کیونکہ اپنے انسانی دائرے سے آگے نہیں بڑھتا۔ اپنے اختیارات کے دائرے میں رہتا ہے، خدا کے اختیارات پر قبضہ نہیں کرتا۔ پس دنیا بھی دیکھ سکتی ہے کہ وہی سچا ہے لیکن مذہبی جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے فسادات سے انسان کو بچانے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے یہ عدل کا قانون جاری فرمادیا کہ تم میں سے ہر ایک خواہ اپنے آپ کو سچا سمجھے بھی، یقین کا بھی اظہار کرے اسے اپنے یقین کے نتیجہ میں دوسرے کو اس دنیا میں گمراہی کی سزا دینے کی اجازت نہیں ہے۔ سب گمراہ خدا کی خدمت میں لوٹائے جائیں گے اور یہ فیصلے مرنے کے بعد ہوں گے کہ کون حقیقت میں سچا تھا، کون حقیقت میں جھوٹا تھا اور کس کے ساتھ خدا کو کیا سلوک کرنا ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب میں آپ کو سمجھاتا ہوں آپ کا حق ہے اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ

رَبِّكَ (النحل:126) پر عمل کریں کیونکہ آپ نے جب یقین کے ساتھ سمجھ لیا کہ آپ سچ پر قائم ہیں تو پھر خدا تعالیٰ کی راہ کی طرف بلانا آپ کا حق ہے اور اس وہم کی ضرورت نہیں کہ چونکہ مرنے کے بعد فیصلے ہونے ہیں اس لئے میں کیوں خواہ مخواہ اس دنیا میں مصیبت مول لے بیٹھوں۔ پس فیصلہ ہی اللہ نے کرنا ہے تو ہوسکتا ہے میں جھوٹا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں کا مضمون سچے مومن کی ذات سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ اس کے نفس نے، کبھی کوئی بہانہ تراشا نہیں ہے۔ وہ نفس کے تقویٰ پر قائم ہوتا ہے اور اپنے نفس کو بھی پہچانتا ہے اس کے حالات پر نظر رکھتا ہے اور وہ بصیرت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے وہ دوسرے کے نفوس کو بھی پہچاننے لگتا ہے۔ اگر وہ تعدی نہیں کرتا اور تعلّی نہیں کرتا تو خدا کے ڈر سے ایسا نہیں کرتا ورنہ بالکل صاف دیکھ رہا ہوتا ہے کہ حقیقت حال کیا ہے اور اس کی ساری زندگی اس کی سچائی کی گواہ بن جاتی ہے۔ پھر خدا کی تائیدات ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ کو یہ حکم فرمایا گیا کہ اعلان کر دو کہ میں اور میرے ماننے والے بصیرت پر قائم ہیں وہاں یہ مضمون ساتھ شامل ہے کہ اللہ کی تائید ہمارے ساتھ ہے اور وہ گواہ ہے کہ ہم بصیرت پر قائم ہیں۔ پس اگر دنیا میں یہ گواہیاں خدا نہ دیتا تو قیامت کے دن ان لوگوں کو مجرم کیسے قرار دے دیتا۔ اگر یہ مضمون سمجھا جائے کہ ہر ایک دھوکے میں مبتلا ہے پتا ہی نہیں لگ سکتا کسی کو میں سچا ہوں کہ جھوٹا ہوں، مرنے کے بعد پتا چل جائے گا تو جزاء سزا کا نظام ہی سارا درہم برہم ہو جائے گا اور اگر پھر بھی خدا سزا دے گا تو عدل کے تقاضوں کو چھوڑ کر سزا دے گا جو ناممکن ہے۔ پس ہر شخص کو پتا ہے وہ اپنی حقیقت سے، اپنی کمزوری سے آگاہ ہوتا ہے، اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کا اپنے آپ دھوکہ دینا چونکہ انا کی فطرت میں داخل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسے اچھا بنا کے دکھایا ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ میں اچھا ہوں لیکن تلاش کرنا چاہے اپنے ضمیر کو کرید ے تو اس کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

پس آپ کامل یقین پر ہیں، آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بے شمار تائیدات ہیں جو بڑے زور اور طاقت کے ساتھ ایک سو سال سے زائد عرصے پر پھیلی پڑی ہیں۔ ایک لمحہ بھی احمدیت کا ایسا نہیں جب خدا کی غیبی تائیدات نے آپ پر آپ کا سچا ہونا ثابت نہ کر دیا ہو اور محض نفس کے خیال کا جو پہلو ہے وہ اس کے مقابل پر ایک معمولی پہلو رہ جاتا ہے۔ جس کی پوری تاریخ اللہ کی تائیدات سے بھری ہوئی ہو اور روشن ہو چکی ہو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی شک کے اندھیروں میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ پس آپ

نے کامل یقین کے ساتھ دنیا کو ہدایت کی طرف بلانا ہے اور کامل یقین کے بغیر ہدایت کی طرف بلانا بے کار ہو جایا کرتا ہے۔ کامل یقین کے بغیر بلانے والا وہ طاقتیں ہی حاصل نہیں کرتا جو بلانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص مذاق سے کہہ دیتا ہے یعنی بعض لوگوں میں رواج ہے وہ سمجھتے ہیں مذاق میں جھوٹ بولنا جائز ہے کہ آگ لگ گئی گھر میں۔ لوگ سمجھتے ہیں شاید یہ کہہ رہا ہے تو لگ گئی ہوگی لیکن ایک دو دفعہ کے جھوٹ سے پتا چل جاتا ہے کہ اس آواز میں وہ بات ہی نہیں تھی لیکن جب سچ مچ کی آگ لگے اس وقت جو آواز نکلتی ہے وہ بالکل اور طرح کی آواز ہوتی ہے۔ ڈرانے کے لئے تمہارے پیچھے سانپ ہے ایک آواز اٹھ سکتی ہے، وقتی طور پر ایک انسان اس سے مرعوب بھی ہو جاتا ہے۔ مگر جو سچ مچ کا سانپ ہے وہ نکلے تو وہ خود بھی ایسا اچھلتا ہے اور اس کی آواز میں ایسی طاقت آجاتی ہے کہ ہر پہچاننے والا پہچان لیتا ہے کہ یہ سچی آواز ہے اور یہ بیان کی ایک مثال ہے۔ انسانی فطرت میں خدا تعالیٰ نے بیان کرنے کی صلاحیت رکھی ہوئی ہے اور اسی وجہ سے دھوکے کی آوازیں اگر وقتی طور پر مرعوب کریں تو لمبا عرصہ نہیں کرتیں۔ جو سچ کی آواز ہے وہ اس طاقت کے ساتھ اٹھتی ہے کہ اس کے نتیجہ میں دوسرے کے لئے پہچاننا مشکل نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ ایک اور مضمون ہے جو اس کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے جو ہر داعی الی اللہ کو سمجھنا چاہئے اور اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا تمہاری اور میری مثال تو ایسی ہے جیسے تم آگ کے گڑھے کی طرف تیزی سے دوڑے چلے جا رہے ہو میں تمہارے پیچھے آوازیں دیتا بھاگ رہا ہوں خبردار و کو رو کو اپنے قدم کیونکہ تم آگ کے گڑھے میں گرنے والے ہو اور تم میری کچھ نہ سن رہے ہو یہاں تک کہ میں تمہاری کمر پہ ہاتھ ڈالوں، تمہارے کندھوں سے پکڑوں، تمہارے بدن کو گھسیٹنے کی کوشش کروں کہ کسی طرح باز آجاؤ اور آگ کے گڑھے میں نہ گرو یہ کیفیت کامل یقین کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ (بخاری کتاب الرقاق باب الانتهاء عن المعاصی)

انبیاءؑ جو وارفتگی کے ساتھ ایک جنون کی کیفیت کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں وہ اس کامل یقین کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے کہ ہم سچے ہیں اور ہمارا منکر لازماً ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے گا۔ اب دعوت الی اللہ کرنے والا اگر اس یقین سے دعوت الی اللہ نہیں کرتا تو اس کی آواز میں طاقت ہی نہیں پیدا ہوگی۔ وہ گھبراہٹ اور بے چینی کہ یہ لوگ ہلاک ہو رہے ہیں اور میں نے لازماً ان کو بچانا ہے یہ

ایک غیر معمولی قوت ہے جو یقین سے اٹھتی ہے اور صاحب فہم لوگ اس کو پہچانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس آواز میں سچائی ہے۔ اگر وہ نہ بھی مانیں تو اپنی دوسری مجبوریوں کی وجہ سے اس کو ردّ کرتے ہیں لیکن آواز کی شوکت ان کو ضرور بتا دیتی ہے کہ بلانے والا کچھ مختلف ہے۔

چنانچہ بعض بیعت کرنے والوں نے مجھے یہی بات بتائی کہ ہم نے ایک احمدی کی بات پر جو کان دھرا ہے وہ اس وجہ سے کہ اس کی آواز میں وہ غیر معمولی صداقت کا نشان تھا کہ جب ہمیں بلاتا تھا تو اس کے اندر ایک بے چینی پائی جاتی تھی کہ اگر ہم نہیں جائیں گے تو نقصان ہوگا۔ اس لئے ہم مسلک کو سمجھ کر احمدی نہیں ہوئے۔ مسلک کو بعد میں سمجھا ہے۔ پہلے جو احمدیت کی طرف ہمیں کسی چیز نے مائل کیا ہے وہ بلانے والے کی آواز کی سچائی اس کی شوکت تھی اور ایسا ایک دفعہ نہیں بارہا میرے علم میں آچکا ہے کہ کامیاب داعی الی اللہ وہی ہے جس کی آواز یقین سے بھری ہوئی ہو اور وہ یقین اسے بے چین رکھے اور آخری وقت تک بے چین رکھے۔

اس کی ایک مثال ہمارے ایک ایسے سلسلے کے خادم مربی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے جو دو دن پہلے سپین میں وفات پا گئے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ بھی بعد میں پڑھاؤں گا لیکن میں آپ کو ان کے ذکر خیر میں اس مضمون کو واضح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کی زندگی اور یہ مضمون ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔ دعوت الی اللہ کا ان کو ایسا جنون تھا کہ کبھی میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں آیا جو اس طرح دعوت الی اللہ کے جنون میں مبتلا ہو چکا ہو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، آتے جاتے، سیر پر جائیں، کہیں تفریح ہو رہی ہو انہوں نے اپنے بعض دفعہ جیبوں سے، بعض دفعہ بیگ سے پمفلٹ ضرور نکالنے ہیں۔ ادھر ہم ایک جگہ ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہیں اور اچانک اٹھے اور سارے پمفلٹ تقسیم کرنے شروع کر دئے۔ بیرا آیا تو اس کو کہا کہ ٹھہرو یہ لے لو اور یہ پڑھو۔ بعض دفعہ تعجب ہوتا ہے اور کچھ وقتی طور پر Embarrasment جس کو کہتے ہیں وہ بھی محسوس ہوتی تھی کیونکہ دعوت الی اللہ کا جنون تو ہے اور بہت اچھا ہے مگر حکمت کے بھی تقاضے ہیں۔ قرآن کریم نے دعوت الی اللہ سے پہلے حکمت کا مضمون باندھا ہے۔ ایک موقع پر میں نے ان کو سمجھایا کہ آپ کی یہ بات بہت ہی پیاری ہے کیونکہ میں آپ کو جانتا ہوں سچائی ہے، آپ کے دل میں جنون ہے لیکن آپ نے حکمت کے تقاضے چھوڑے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارا کھانا بھی خراب کیا اور اردگرد مہمانوں کے

کھانے بھی خراب کئے۔ کئی خاندان ہیں جو سیر کی خاطر بڑی دور سے خرچ کر کے آئے ہیں وہاں آپ زبردستی ان کو مذہب کی طرف لا رہے ہیں ان کا بالکل دل نہیں چاہ رہا، ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ گھبرا رہے ہیں صرف شرافت کی وجہ سے آپ کو کچھ نہیں کہتے۔ بیرا بے چارہ گھبرا گیا۔ یہ کیا ہو گیا میں نے تو کھانے کی پلیٹ رکھی ہے تو اس نے آگے سے ایک پمفلٹ پکڑا دیا ہے۔ تو حکمت کے لحاظ سے آپ بے شک یہ کہہ سکتے ہیں کہ بسا اوقات وہ اپنے جنون کی وجہ سے حکمت کے تقاضے بھی بھول جاتے تھے اور مجھے ان کو سمجھانا پڑا اور اس وجہ سے چونکہ میں ان کے ساتھ سفر کر چکا تھا، میں دیکھ چکا تھا، مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ اتنا بے شمار پمفلٹ کا خرچ کیوں ہو رہا ہے کیونکہ سپین میں اتنے احمدی نہیں تھے جتنے پمفلٹ چل رہے تھے۔ تو ان کا یہ شغل تھا زندگی میں۔ بازار میں چلتے پھرتے ہر جگہ وہ پمفلٹس کے بیگ انہوں نے اٹھائے ہوتے تھے وہ خالی کر کے واپس آیا کرتے تھے۔ تو میں نے پھر ان کو سمجھایا میں نے کہا دیکھیں خرچ سے کوئی عار نہیں ہے، خرچ پر مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر برمحل تو ہونا چاہئے کیونکہ مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہ ادھر پمفلٹ دے کے گئے ادھر لوگوں نے پھینک دئے اور بعض دفعہ پھر وہ قدموں تلے روندا بھی جاتا تھا۔ تو جب میں نے ان کو پیار سے یہ باتیں سمجھائیں تو سمجھ گئے اور اس کے بعد پھر انہوں نے اپنے طرز تبلیغ میں کچھ تبدیلی کی جو مناسب حال تھی لیکن تبلیغ آخری دموں تک کرنے کا ایسا جنون تھا کہ وفات سے چند منٹ پہلے چوٹی کا ڈاکٹر ان کو دیکھنے آیا کہ کیا حالت ہے اور اسی حالت میں منہ میں آکسیجن لگی ہوئی ہے یا ہٹا کر یا کچھ زور لگا کر اپنی بیوی کو کہا فوراً اسلامی اصول کی فلاسفی اس سرجن کو دے دو۔ ان کی بیگم سے جب میں نے تعزیت کا فون کیا تو انہوں نے کہا سرجن مجھے کہتا تھا یہ کیا شخص ہے۔ زندگی آخری دموں تک جا پہنچی ہے، جان لبوں پر آ گئی ہے اور میں اس کی طبیعت پوچھنے آ رہا ہوں یہ مجھے کہتا ہے فلاں کتاب پڑھو اور ہر ایک سے یہی حال تھا۔ سارے اردگرد کے مریض اس وقت ان کی تبلیغ کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور بہت نرم دل سے لوگوں سے ملتے تھے، اپنے خاندان کے جو افراد ملنے آتے تھے صرف ایک دفعہ غصہ آیا وہ اس بات پر کہ انہوں نے کہا تھا کہ فلاں لٹریچر دو لٹریچر تھا نہیں، کہا کہ میری عیادت کرنے کیا تم آئے ہو۔ اگر لٹریچر ہی نہیں لے کے آتے تو اس عیادت کا کیا فائدہ۔ ان کی ایک بیٹی امریکہ ہے اس نے فون کیا اور یہ آخری دموں کی بات ہے کچھ یعنی آخری چند دنوں کے اندر اس کو خیال تھا کہ پتا نہیں ابا ابھی زندہ بھی

ہیں کہ نہیں۔گھبراہٹ میں اس نے فون کیا تو فون پہ کہا ہاں ہاں میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ بتاؤ تبلیغ کرتی ہو کہ نہیں۔ وہ حیران کہ اچھا مریض ہے، میں پوچھ رہی ہوں حالت کیا ہے ابا کی اور پھر کہا دیکھو فرض کرلو اپنے اوپر ایک احمدی ضرور بنانا ہے۔ یہ وعدے لیتے لیتے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو دعوت الی اللہ کا جو ایسا جنون کہ ساری زندگی پہ قبضہ کرلے یہ خدا کا خاص انعام تھا جوان پر تھا۔ مسلسل پچاس سال انہوں نے سپین میں دعوت الی اللہ کا کام کیا ہے اور شوق ایسا تھا کہ جب ایک زمانے میں جماعت کی غربت کی وجہ سے 1947ء کی بات ہے یہ چھیالیس میں وہاں گئے ہیں اور ایک سال کے اندر اندر جو مبلغ باہر بھجوائے گئے تھے جماعت کے پاس پیسے نہیں تھے کہ ان کو ان کے روزمرہ کی زندگی کے اخراجات دے سکے، بڑی تنخواہوں کی تو بحث ہی نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہ بات چلتی تھی کہ روزمرّہ زندہ رہنے کے لئے جو کم از کم ضرورتیں ہیں وہ جماعت پوری کرسکتی ہے کہ نہیں۔ آخر حضرت مصلح موعودؓ نے بادل نخواستہ یہ فیصلہ کیا کہ بہت سے مبلغوں کو واپس بلا لیا جائے یا ان کو کہہ دیا جائے کہ اب ہم تمہیں کچھ نہیں سپورٹ کر سکتے اس لئے فارغ ہو۔تو جب ان کو یہ پیغام ملا تو انہوں نے فوری طور پر رابطہ کیا اور کہا کہ میں تو کسی قیمت پر فارغ نہیں ہوسکتا۔گزارے کی بات ہے میں اپنا گزارہ خود کروں گا اور حضرت مصلح موعودؓ اتنا متاثر ہوئے اس سے کہ بعد میں ایک خطبہ کے دوران فرمایا کہ دیکھو ہمارا ایسا بھی مبلغ ہے اس نے کہا میری پرواہ نہ کریں میں اپنا گزارہ کروں گا بیوی بچوں کا کروں گا لیکن تبلیغ نہیں میں نے چھوڑنی، خدا کے لئے مجھے فارغ نہ کریں۔ جب ایک موقع پر میں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کو (بہت بیمار بھی ہو گئے تھے) ریٹائر کر دیا جائے تو ان کا بڑا دردناک خط ملا کہ ریٹائر نہ کریں جس طرح بھی ہے میں گزارہ کروں گا مجھے اسی حالت میں رہنے دیں۔

چنانچہ پچاس سال مسلسل، ستائیس سال کی عمر میں سپین گئے تھے، وہاں رہے اور اس عرصے میں ایک بڑا عرصہ وہ تھا جب جماعت سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا، عطر بیچتے تھے خود ہی عطر بنانے سیکھے اور پولیس آتی تھی، حملے کرتی تھی، پکڑتی تھی، پھر چھوڑ بھی دیا کرتی تھی۔ یہ مسئلہ نہیں سمجھ آرہا تھا کہ پولیس نے قید کیوں نہیں کیا اور چھوڑ کیوں جایا کرتی تھی۔ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ ایک بڑے سینئر پولیس افسر نے ان کے بیٹے سے بعد میں بیان کیا کہ ہم اسے اس لئے چھوڑ دیتے تھے کہ ہمیں خطرہ تھا کہ جیل میں سب کو احمدی بنالے گا۔اس لئے کوئی احسان نہیں تھا، مجبوری تھی۔ ڈرانے دھمکانے کے

لئے پکڑا، قید خانے میں ڈالا اور دوسرے دروازے سے باہر نکال دیا کیونکہ جاتے ہی تبلیغ شروع کر دیتے تھے۔ تو اس حالت میں انہوں نے زندگی بسر کی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے ساتھ اور مجھے بھی موقع ملا ہے ان کو تبلیغ کرتے ہوئے دیکھنے کا۔ عطر چھڑکنا اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کو اس طرف بلانا کہ ایک ایسا عطر ہے جس کی خوشبو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس عطر کے سوا جو میں نے تم پر چھڑکا ہے وہ بھی ایک عطر ہے اگر کہو تو میں تمہیں بتاؤں۔ تو جو تجسس کا ہر انسان کے اندر مادہ ہے لوگ پوچھتے تھے ہاں ہاں بتاؤ تو اسی وقت وہ تبلیغ شروع کر دیتے تھے تا کہ یہ ثابت کر سکیں میں نے نہیں کی تھی انہوں نے پوچھا تو میں نے تبلیغ شروع کی۔ بہر حال بہت لمبا عرصہ تک بہت شاندار، عظیم الشان خدمت کی توفیق پائی۔ کامل وفا کا نمونہ تھے، کامل اطاعت کا نمونہ تھے۔ کبھی اطاعت سے سرمو بھی فرق نہیں کیا اور اپنی اولاد کی بہت اچھی تربیت کی۔ ساری اولاد خدا کے فضل سے خدمت دین پر مامور رہی ہے۔ جس حالت میں بھی ہے لیکن وہ اطاعت شعار ہے اور دین سے محبت کرنے والی ہے۔ تو ان کی نماز جنازہ ہوگی اور میں امید رکھتا ہوں دنیا بھر میں احمدی اس نماز جنازہ میں تو شامل نہیں ہو سکتے لیکن دعا میں شامل ہوں اور اپنے اپنے ہاں ان کی نماز جنازہ پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت عطا فرمائے کیونکہ واقعی عجب آزاد مرد تھا۔ دنیا کے دھندوں سے آزاد اور خدمت دین پر جتا ہوا۔

اب میں واپس اسی مضمون کی طرف آتا ہوں۔ یہ بھی واپس کیا، یہی مضمون ہے جو جاری ہے یہ مثال دی ہے دعوت الی اللہ کی۔ اس رنگ میں آج آپ کو دعوت الی اللہ پہ وقف ہو جانا چاہئے اور تعاون کے رنگ میں ایسا کریں، تحکم کے رنگ میں نہ کریں۔ کامل یقین کے باوجود اس انکسار پر قائم رہیں جو قرآن کریم کی آیات ہمیں سکھاتی ہیں کہ کامل یقین کے باوجود تحکم کا رنگ اختیار نہ کرو اور حکمت کے ساتھ پیغام کو پہنچاؤ اور عجز کے ساتھ اصولوں پر قائم رہو کہ فیصلہ خدا کرے گا لیکن پیغام دینا ہمارا کام ہے اور پیغام دو تو دل کا اضطراب لوگوں کو دکھائی دینے لگے۔ وہ اضطراب جس کا ذکر آنحضرت ﷺ نے اپنی تبلیغ میں آپ کے سامنے پیش فرمایا ہے یعنی میں کیسا تبلیغ کا جذبہ رکھتا ہوں وہ اضطراب کامل یقین کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ اضطراب نصیب ہو جائے تو پھر آواز میں ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

آج جبکہ احمدیت تبلیغ کے ایک بالکل نئے دور میں داخل ہو گئی ہے جس کا وہم و گمان بھی کوئی نہیں

کر سکتا تھا۔اس وقت ابھی بہت سے احمدی افراد ایسے ہیں جو ابھی تبلیغ میں داخل نہیں ہوئے۔اس لئے جب آپ دیکھتے ہیں کہ سولہ لاکھ ہو گئے تو یہ نہ سمجھیں کہ سارے احمدیوں کی اجتماعی کوشش سے جو خدا نے قبول فرمائی سولہ لاکھ ہوئے۔ یہ بعض علاقوں کے بعض احمدیوں کی کوشش سے ہوئے ہیں۔ جرمنی میں اگر تیس ہزار ہوئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساری جرمن جماعت ہی مشغول ہے۔ان کا ایک حصہ فعال ہے اور ایک حصہ دوسروں کی مدد بھی کرتا ہوگا، بیویاں خاوندوں کی مدد کرتی ہیں، بچے بھی ماں باپ سے تعاون کرتے ہیں مگر ابھی ایک تعداد ہے اور میرے نزدیک خاصی تعداد ہے جو براہ راست تبلیغ میں ملوث نہیں ہوئی۔انگلستان کی حالت آپ کے سامنے ہے۔یہاں پہلے کی نسبت بہتری ہے مگر ابھی بھاری تعداد U.K کے احمدیوں کی ایسی ہے جو براہ راست تبلیغ کا سلیقہ ہی نہیں جانتی پتا ہی نہیں کہ ہوتی کیا ہے اور وہ چند جو مستعد ہیں ان کا پھل ساری جماعت اپنی طرف منسوب کر رہی ہے کہ جماعت U.K نے ایک سو ستر کی بجائے اس سال دوسوستر احمدی بنائے اللہ کے فضل کے ساتھ، مگر دوسوستر کتنوں نے بنائے؟ چھ ہزار میں سے چھ ہزار نے بنائے یا چالیس پچاس نے یا بیس پچیس نے بنائے۔تو جو بنائے ہیں وہ بیس پچیس کے دائرے میں ہی ہیں باقی تو صرف کریڈٹ لینے کے لئے U.K جماعت کے ممبر بنے ہوئے ہیں۔اگر چہ کریڈٹ سے مراد یہ نہیں کہ بالا رادہ وہ دھوکہ دے رہے ہیں **نعوذ باللہ من ذالک**۔مراد یہ ہے کہ کریڈٹ ملتا ہے تو کیوں نہ لے لیں، ہاں ہم U.K کی جماعت کے ہیں اور ہماری تبلیغ پہلے سے بڑھ رہی ہے۔ چندوں میں حصہ لیتے ہیں، وقارِعمل میں حصہ لیتے ہیں، دوسروں کی خدمتوں میں آگے ہیں مگر یہ پہلو ذرا لنگڑا ہے۔

پس آج وقت ہے کہ ساری جماعت پوری طاقت کے ساتھ اپنے غیر فعال ممبروں کو یا جماعت کے وہ وجود جو ابھی تک فعال نہیں ہو سکے ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں اور نظام جماعت وقتاً فوقتاً نگرانی کرتا رہے، معلوم کرتا رہے کہ اس تبلیغ میں حصہ کتنوں نے لیا تھا اور جنہوں نے حصہ نہیں لیا ان کی طرف متوجہ ہو۔ یہ وہ طریق ہے جو میں نے چندوں کے نظام میں آزما کے دیکھا ہے اور غیر معمولی برکت پڑی ہے۔اس سے اور یہی طریق تبلیغ کے نظام میں بھی کارآمد ہوگا کیونکہ ایک ہی بات ہے۔نظام کا جہاں تک تعلق ہے اس کی نوعیت کا، اس کی فعالیت، اس کی مستعدی کا، وہ دونوں طرف ایک ہی طرح کے اصول کارفرما ہوتے ہیں۔اپنی تبلیغ کو منظّم کرنا زیادہ سے زیادہ احمدیوں کو اس میں جھونک کر

ان کو فعال داعی الی اللہ بنانا اور پھر ان کو جو چندہ، یعنی ان کی بیعتیں ان کا چندہ ہے، اس کا حساب رکھنا یہ نظام جماعت کا کام ہے۔

اس پہلو سے بار بار سمجھانے کے باوجود ابھی مزید سمجھانے کی ضرورت ہے۔ میں نے چندے کے نظام کے متعلق یہ جماعتوں کو نصیحت کی کہ جو دے رہے ہیں ہر دفعہ انہی پر نہ توجہ دئے جائیں۔ جب تحریک ہو آپ انہی کے پاس پہنچتے ہیں جو پہلے دے رہے ہیں۔ جو نہیں دے رہے ان کا بھی تو کھاتہ بنائیں، کوئی رجسٹر تیار کریں کہ جو نہ دینے والوں کا رجسٹر ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ کتنے ہیں ان کا تناسب کیا ہے اور ان میں سے آپ نے کتنوں کو نادہندہ رجسٹر سے دہندہ کے رجسٹر میں منتقل کیا ہے۔ جب عملاً بعض جماعتوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر عمل کیا تو ان کے مالی نظام میں حیرت انگیز برکت پڑی ہے اور اس پہلو سے امریکہ کی جماعت کی مثال بھی خدا کے فضل سے بڑی نمایاں ہے۔ انہوں نے جب بھی میں نے ہدایت دی اسی طرح سنجیدگی کے ساتھ لفظاً لفظاً عمل کی کوشش کی اور دیکھتے دیکھتے ان کا مالی نظام کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ اب میں ان کو یہ بھی سمجھا رہا ہوں کہ دعوت الی اللہ کا پروگرام بھی تو اسی طرح ایک اہم پروگرام ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کے لئے دست و بازو ہیں اور دو بازوؤں کا جس طرح آپس میں تعلق بھی ہوتا ہے اور تعاون بھی ضروری ہے ویسا ہی آپ کا فرض ہے کہ دعوت الی اللہ کے کام کو بھی مالی نظام کے پہلو بہ پہلو کم سے کم اتنی سنجیدگی کے ساتھ لیں اور دونوں کو آگے بڑھائیں۔ اس کے نتیجہ میں خدا کے فضل سے تبدیلیاں تو ہیں لیکن ابھی بہت ضرورت ہے۔

یہ جو مختلف نظاموں کا آپس کے تعاون کا مضمون ہے یہ ہر زندہ جماعت کے اندر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسا نافذ فرما دیا گیا ہے کہ جماعت کی کثرت کے باوجود ایک جسم دکھائی دیتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے جب مومنوں کی جماعت کی تعریف ہی یہ فرمائی کہ خواہ کثرت سے ہوں دکھائی ایک جسم دیں اور جب تک ایک عضو دوسرے عضو سے تعاون نہ کرے جسم بن ہی نہیں سکتا۔ اگر آنکھ، آنکھ سے تعاون نہ کرے تو ایک ادھر دیکھ رہی ہوتی ہے ایک ادھر دیکھ رہی ہوتی ہے اور ٹیڑھی نظر ہو جاتی ہے۔ ٹانگ، ٹانگ سے تعاون نہ کرے تو ایک ٹانگ دائیں طرف اٹھ رہی ہے ایک بائیں طرف اٹھ رہی ہے اور آدمی لڑکھڑا کے گر جاتا ہے یا کھڑا ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اس مضمون پر روشنی ڈالتے

ہوئے تعاون کی بعض لطیف مثالیں ہمارے سامنے رکھی ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

۔۔۔ یہ دستور ہونا چاہئے کہ کمزور بھائیوں کی مدد کی جاوے اور ان کو طاقت دی جاوے یہ کس قدر نامناسب بات ہے کہ دو بھائی ہیں ایک تیرنا جانتا ہے دوسرا نہیں۔ تو کیا پہلے کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے کو ڈوبنے سے بچاوے یا اس کو ڈوبنے دے۔ اس کا فرض ہے کہ اس کو غرق ہونے سے بچائے۔ اسی لئے قرآن شریف میں آیا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (کہ نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کرو) کمزور بھائیوں کا بار اٹھاؤ۔ عملی، ایمانی اور مالی کمزوریوں میں بھی شریک ہو جاؤ۔ بدنی کمزوریوں کا بھی علاج کرو۔ کوئی جماعت، جماعت نہیں ہو سکتی جب تک کمزوروں کو طاقت والے سہارا نہیں دیتے۔۔۔''

تو جو دل کے غریب ہیں ان کو مالی قربانی میں آگے بڑھانا، ان کو سہارا دینا ہے۔ جو تبلیغ میں کمزوری دکھاتے ہیں ان کو قدم قدم ساتھ چلاتے ہوئے ان کی رفتار بڑھانا اور ان کو طاقت دینا یہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تشریح کے عین مطابق تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ کی مثال ہے۔ پھر آپ اس مضمون کا دوسرا پہلو بیان کرتے ہیں۔ جو نہیں ہونا چاہئے۔

''۔۔۔ دیکھو وہ جماعت جماعت نہیں ہو سکتی جو ایک دوسرے کو کھائے۔۔۔''

اگر مالی معاملات میں جماعت میں حرص پیدا ہو جائے بعض لوگوں میں اور وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو کھانے لگیں تو تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کا مضمون غائب ہو جائے گا اور نفرتیں پھیل جائیں گی، اعتماد اٹھ جائیں گے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے تابع اس کے باریک پہلو بیان فرمائے ہیں جو جماعت کو سمجھنے چاہئیں کیونکہ جب تک ایک جماعت نہ بن جائے اس وقت تک تبلیغ کے میدان میں غیر معمولی کامیابیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔ جب چار مل کر بیٹھیں تو ایک اپنے غریب بھائی کا گلہ کریں

اور نکتہ چینیاں کرتے رہیں اور کمزوروں اور غریبوں کی حقارت کریں اور ان کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ایسا ہرگز نہیں چاہئے بلکہ اجماع میں چاہئے کہ قوت آجاوے اور وحدت پیدا ہو جاوے جس سے محبت آتی ہے اور برکات پیدا ہوتے ہیں۔۔۔کیوں نہیں کیا جاتا کہ اخلاقی قوتوں کو وسیع کیا جاوے اور یہ تب ہوتا ہے کہ جب ہمدردی، محبت اور عفو اور کرم کو عام کیا جاوے اور تمام عادتوں پر رحم، ہمدردی اور پردہ پوشی کو مقدم کر لیا جاوے۔ذرا ذرا سی بات پر ایسی سخت گرفتیں نہیں ہونی چاہئیں جو دل شکنی اور رنج کا موجب ہوتی ہیں'' (ملفوظات جلد دوم صفحہ 264-263)

پھر حضورؑ فرماتے ہیں:

''منجملہ انسان کے طبعی امور کے جو اس کی طبیعت کے لازم حال ہیں ہمدردی خلق کا ایک جوش ہے،قومی حمایت کا ایک جوش بالطبع ہر ایک مذہب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اکثر لوگ طبعی جوش سے اپنی قوم کی ہمدردی کے لئے دوسروں پر ظلم کر دیتے ہیں۔گویا انہیں انسان نہیں سمجھتے تو اس حالت کو خلق نہیں کہہ سکتے۔یہ فقط ایک طبعی جوش ہے'' (اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 363)

تو جہاں تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ کی تلقین فرمائی، ایک دوسرے کو سہارا دینا اور کمزوروں کو اٹھا کر اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرنا ایک دعوت الی اللہ کی روح کے طور پر ہمارے سامنے رکھا اور فرمایا کہ اسے اختیار کرو گے تو ایک جماعت بنو گے۔ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ ایک جماعت کے بعض نقصانات بھی ہیں یعنی ایک جماعت بننے کے اگر اس میں عصبیت آجائے۔اگر وحدت ملی کے نتیجہ میں دوسروں سے نفرت اور دوسروں پر برتری کے جذبات پیدا ہو جائیں تو یہ وحدت ملی توحید کی مظہر نہیں بلکہ شیطان کی مظہر بن جاتی ہے۔دنیا میں اکثر مظالم وحدت ملی کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اگر قومی کردار بگڑا ہوا ہو، جتنا وہ اکٹھے ہوں گے اتنا ہی نقصان پہنچے گا۔

پس اس پہلو کو کھول رہے ہیں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں سب اچھی باتیں ہیں ہمدردی خلق، جوش، اپنے بھائی کو برابر کر کے اپنے ساتھ شامل کر لینا مگر جو لوگ اس کے نتیجہ میں دوسری قوموں پر ظلم کرتے ہیں۔گویا انہیں انسان نہیں سمجھتے سو اس حالت کو خلق نہیں کہہ

سکتے یہ فقط ایک طبعی جوش ہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حالت طبعی کوّوں وغیرہ پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک کوّے کے مرنے پر ہزار ہا کوے جمع ہو جاتے ہیں لیکن یہ عادت انسانی اخلاق میں اس وقت داخل ہوگی جب یہ ہمدردی انصاف اور عدل کی رعایت سے محل اور موقع پر ہو۔اس وقت ایک عظیم الشان خلق ہوگا جس کا نام عربی میں مؤاخات اور فارسی میں ہمدردی ہے۔اسی کی طرف اللہ جل شانہ قرآن کریم میں اشارہ فرماتا ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

پس جب قوم کا ایک فرد کسی دوسری قوم پر ظلم کرتا ہے اور آپ قومی حمیت کی وجہ سے اس کی مدد کرتے ہیں اس کی رعایت کرتے ہیں، اس کے پہلو پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہ آیت کے دوسرے حصے وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ سے بغاوت ہوتی ہے۔پس ان دونوں کے درمیان ایک حسین اور کامل توازن پیدا کرنا ضروری ہے اور اندرونی عادتوں میں جو آپ کی نیکی کی عادتیں ہیں ان میں بھی ایک توازن پیدا کرنا ضروری ہے جیسا کہ مالی اخراجات کے وقت آپ کے دل کھل چکے ہیں خدا کے فضل کے ساتھ، وہاں وقت کے خرچ پر اگر نہیں کھلے تو یہ عدم تعاون کی ایک مثال ہے۔آپ کی صلاحیتیں آپ کی دوسری صلاحیتوں سے پورا تعاون نہیں کر رہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کی مثال یوں دیتے ہیں:

> ”ہمارے ہاتھ اور پاؤں اور کان اور ناک اور آنکھ وغیرہ اعضاء اور ہماری سب اندرونی اور بیرونی طاقتیں ایسی طرز پر واقع ہیں کہ جب تک وہ باہم مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں تب تک افعال ہمارے وجود کے علی مجری الصحت ہرگز جاری نہیں ہو سکتے اور انسانیّت کی کل ہی معطّل پڑی رہتی ہے جو کام دو ہاتھ کے ملنے سے ہونا چاہئے وہ محض ایک ہی ہاتھ سے انجام نہیں ہو سکتا“

(براہین احمدیہ حصہ دوم، روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 59)

پس صلاحیتوں کا آپس کا تعاون اور انسان کی اندرونی صفات کا ایک دوسرے سے تعاون حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے جوارح کے تعاون کی مثال سے ہمارے سامنے کھول دیا۔آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ مومن ایک بدن کی طرح ہیں جیسے ایک بدن کے اعضاء

ہوں۔حضرت مسیح موعودؑ اسی مضمون کے ایک اور پہلو کو ہمارے سامنے کھولتے ہیں کہ بایاں ہاتھ اور دایاں ہاتھ جب ضرورت ہوگی از خود تعاون کرتے ہیں ۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ بایاں ہاتھ کوئی کام میں مشغول ہو اس کو ضرورت ہو اور دایاں ہاتھ بے اختیار اس کی مدد کو نہ لپکے۔ یا دائیں ہاتھ میں کمزوری واقع ہو اور بایاں ہاتھ بے اختیار اس کی مدد کو نہ لپکے۔بعض مریض میں نے دیکھے ہیں جن کا بدن کا ایک حصہ فالج میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ بایاں ہاتھ اگر مفلوج ہے تو دایاں ہاتھ ہر وقت اس ہاتھ کو اٹھائے پھرتا ہے یعنی اپنے بھائی کی خدمت پر مامور رہتا ہے ۔ یہ وہ تعاون کی روح ہے جو اندرونی طور پر مضبوط ہو تو بیرونی طور پر بھی اپنے جلوے دکھائے گی۔ پھر تبلیغ میں صرف زبانی نصیحت اور ہمدردی نہیں رہے گی۔اگر ہمدردی کی وجہ سے تبلیغ ہے جو تبلیغ کا اصل ہے تو جب ایسا شخص ضرورت محسوس کرے گا، جب تنگی میں ہوگا، جب بیمار ہوگا، جب پریشان ہوگا تو آپ لازماً از خود اس کی ظاہری عملی مدد پر آمادہ ہو جایا کریں گے اور یہ بات جب پیدا ہو جائے داعی الی اللہ میں تو اس کی آواز میں ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور خدمت خلق کرنے والوں کی دعوت الی اللہ بہت زیادہ پھول اور پھل لاتی ہے بہ نسبت ان کے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم تمہاری مدد میں یہ کام کر رہے ہیں مگر ضرورت کے وقت اس کی ہمدردی ان کے دل سے، ان کے اعضاء سے ظاہر نہیں ہوتی۔

پس میں امید رکھتا ہوں کہ ان مضامین کے ان باریک پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے جماعت احمدیہ اپنی دعوت الی اللہ کے مضمون کو تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے تابع رکھتے ہوئے اس میدان میں آئندہ مزید بلند منازل کی طرف قدم بڑھانے پر مستعد ہو جائے گی۔ یہ جو خدا تعالیٰ نے اب تک ہم سے فیض کا سلوک فرمایا ہے کہ ہر سال ہم دگنے ہو رہے ہیں، اب منزل ایسی آ گئی ہے یہ یقین نہیں آتا کہ اب کیسے دگنے ہو جائیں گے لیکن یہ یقین کا نہ ہونا بھی ایک اندرونی بے ایمانی پر دلالت کرتا ہے، بے ایمانی اس طرح نہیں کہ جیسے خوفناک بے ایمانی ہوتی ہے۔ مطلب ہے ایمان میں کچھ کمزوری۔ گویا ہم اپنی طاقت سے بڑھے تھے اور ہماری طاقت اپنی آخری منزل کو پہنچ گئی ہے۔ہم تو اپنی طاقت سے بڑھے ہی نہیں۔ ہمارے خلوص کو خدا نے قبول فرما لیا اور ہمارے بدن کو خود تھام لیا ہے۔اسی نے یہ پھل پیدا کیا ہے ہم نے اپنی طاقت سے نہیں کیا، نہ کر سکتے تھے، نہ پہلے کبھی کیا۔اس لئے آئندہ بھی اگر اسی نے کرنا ہے تو اپنی امیدوں کا سر بلند رکھیں۔ اپنی اطاعت کا سر ہمیشہ

خدا کے حضور جھکائے رکھیں لیکن امیدوں کے سر بلند رکھیں اور بیک وقت یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہونی چاہئیں۔ پس بے دھڑک ہو کر یہ فیصلہ کریں کہ آپ نے اس سال پھر دگنا ہونا ہے اور خدا کے فضل سے اگر یہ فیصلہ یقین اور سچ پر قائم ہے اور آپ کا عمل آپ کے اس حوصلے سے تعاون کرے گا تو میں کامل یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ ضرور دگنے ہوں گے۔ کوئی دنیا کی طاقت آپ کو دگنا ہونے سے روک نہیں سکے گی۔ **انشاء اللہ تعالیٰ**

جس خدا نے دنیاوی ہجرت کے نتیجہ میں اپنے وعدے پورے فرمائے وہ تمہاری روحانی ہجرت کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 23 راگست 1996ء بمقام مئی مارکیٹ من ہائم۔ جرمنی)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾ (التوبہ: 111)

پھر فرمایا:

یہ آیت کریمہ جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس میں توبہ کا بھی مضمون ہے اور ہجرت کا بھی اور جہاد فی سبیل اللہ کا بھی۔ ان تین پہلوؤں سے اس کا اطلاق آج دنیا کی ان تمام جماعتوں پہ خصوصیت سے ہو رہا ہے جو اللہ کی خاطر ہجرت اختیار کرنے کے بعد پھر اللہ ہی کی خاطر ایک دوسری ہجرت بھی کر رہی ہیں اور اس دور میں ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جس کا تعلق بدنی ہجرت سے نہیں بلکہ روحانی ہجرت سے ہے اور اس سلسلہ میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کریمہ کو جسے میں نے آپ کے سامنے پیش کیا، آیت توبہ بھی سمجھا ہے اور آیت ہجرت بھی اور اس کی

ایک ایسی تشریح فرمائی ہے کہ اس کی کوئی نظیر کہیں آپ کو اسلامی لٹریچر میں نہیں ملے گی مگر یہ تمام تشریح قرآن اور حدیث پر مبنی ہے اس سے باہر نہیں۔ پس آج جماعت جرمنی ہی کے حالات کے پیش نظر میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس اقتباس کو چنا ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا یہ نصیحت اس آیت کریمہ پر مبنی اور ان احادیث کے مضامین پر مبنی ہے جن کا تعلق ہجرت سے ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ہجرت کا جو مضمون بیان فرمایا ہے اس پر میں تفصیلی روشنی پہلے ڈال چکا ہوں اور وہ حدیث جس کا ہجرت سے تعلق ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جب ہجرت کرتا ہے تو اس کی ہجرت بدنی ہوتی ہے اور ایک نیت اور روح کی ہجرت ہوتی ہے۔ جو بدنی ہجرت ہے وہ خواہ کوئی بھی رخ اختیار کرے اللہ کے ہاں وہی ہجرت مقبول ہوتی ہے اور وہی ہجرت کا رخ معین ہوتا ہے جو نیت کا رخ ہو جس طرف نیت نے ہجرت کی ہو۔ اس تعلق میں آنحضرت ﷺ نے اور بھی نصائح فرمائیں۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں اور یہ مسلم کتاب **البر والصلة** سے حدیث لی گئی ہے۔ حضرت ابوھریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو نہیں دیکھتا اور نہ تمہاری صورتوں کو کہ خوب صورت ہو یا بد ہو بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے کہ ان میں کتنا خلوص اور حسن نیت ہے۔ (مسلم کتاب البر والصلة والأدب باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه و ماله)

پس ہر وہ عمل جو مومن سے صادر ہوتا ہے اس کا مرکزی نقطہ اس کا دل اور اس کی نیت ہے اور اللہ تعالیٰ بدنوں اور جسمانی حسن یا بدزیبی سے قطع نظر دل کے اس حسن پر نظر ڈالتا ہے جس کا نیت سے تعلق ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون پر جو نصیحت فرمائی ہے وہ میں اب آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے تمام خطبے کا مضمون اور اس افتتاحی خطاب کا جو جرمنی کے اس سالانہ اجتماع کے موقع پر دے رہا ہوں اور یہاں خطبہ اور افتتاح دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں اسی اقتباس سے ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اقتباس میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ میرے ذہن میں پہلے بھی اسی قسم کا مضمون تھا لیکن جب تک حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ اقتباس سامنے نہ آیا اس کے تمام پہلو ذہن پر روشن نہیں ہو سکے تھے۔ اب جب اقتباس کا جو میں آپ کے سامنے رکھوں گا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو میں حیران و ششدر رہ گیا کہ ہجرت اور توبہ کے

مضمون پر کبھی اسلامی لٹریچر میں اس سے زیادہ مفصل سیر حاصل اور گہری گفتگو نہیں فرمائی گئی یا قلم نہیں اٹھایا گیا جیسے حضرت مسیح موعودؑ نے یہ قلم اٹھایا ہے۔

وہ آیت کریمہ جس کی میں نے تلاوت کی تھی اس کا بنیادی تعلق بیعت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لی ہیں وَاَمْوَالَهُمْ اوران کے اموال بھی خرید لئے ہیں اور یہ سودا اس بات پر ہے کہ ان کو جنت عطا کی جائے گی۔ اب یہ جانوں اور اموال کا سودا کیا چیز ہے؟ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسے حقیقی توبہ قرار دیتے ہیں ۔فرماتے ہیں توبہ کا اصل مضمون وہی ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے توبہ کے نتیجہ میں جو سچی توبہ ہو انسان اپنا سب کچھ خدا کے حضور پیش کر دیتا ہے اور اس کے بدلے اپنی جان بخشواتا ہے۔ جو اس کے اعمال گزشتہ میں سرزد ہوئے جو کچھ وہ کارروائیاں کرتا رہا جب توبہ کرتا ہے اور خدا سے عہد بیعت کرتا ہے تو گویا اپنا سب کچھ خدا کے حضور پیش کر کے اپنی جان کی بخشش چاہتا ہے اور یہ وہ مضمون ہے جو اس دنیا میں تو ممکن ہے مگر مرنے کے بعد پھر یہ ممکن نہیں ہوگا کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ لوگ جو پکڑے جائیں گے وہ چاہیں گے کہ اپنا سب کچھ خدا کے حضور پیش کر دیں۔ یہاں تک کہ مائیں اپنی بیٹیاں، اپنی اولاد بھی پیش کریں گی لیکن کچھ بھی مقبول نہیں ہوگا کیونکہ وہ وقت گزر چکا ہے۔ پس وہ وقت جو مرنے کے بعد آنا ہے جب ہم سے ہماری ملکیت واپس لے لی جائے گی یا خدا اپنی ملکیت ہم سے واپس لے لے گا اس وقت کوئی توبہ نہیں ہے۔ زمین وآسمان تمام کائنات کا سب کچھ بھی دے کر ہم اپنی جانوں کو چھڑا نہیں سکیں گے۔ آج اس دنیا میں، اس زندگی میں یہ وقت ہے کہ ہم ایسا کریں اور اس کے متعلق خدا تعالیٰ کا قطعی وعدہ ہے فرماتا ہے تم یہ کرو اور تمہاری توبہ قبول کرنا تمہیں بخشنا میرا ذمہ ہے۔ یہ قطعیت کے ساتھ وعدہ اس آیت میں دیا گیا ہے۔ اس سے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں

> ”بیعت میں جاننا چاہئے کہ کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی ضرورت ہے؟ جب تک کسی شئے کا فائدہ اور قیمت معلوم نہ ہو۔ تو اس کی قدر آنکھوں کے اندر نہیں سماتی۔۔۔“

فرمایا تم بیعت تو کرتے ہو اور قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ اسی بیعت کی طرف بلا رہی ہے

جو حقیقی اور اصلی اور آخری بیعت ہے لیکن اگر تمہیں اس کی قدر و قیمت معلوم نہ ہو تو تمہاری یہ بیعت تمہیں فائدہ نہیں دے گی اور اس بیعت کی تم حفاظت نہیں کر سکتے۔فرماتے ہیں جس چیز کی قدر و قیمت معلوم ہو انسان اسی نسبت سے اس کی حفاظت کرتا ہے پس بیعت کی قدر و قیمت معلوم ہونی چاہئے۔فرماتے ہیں آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔فرماتے ہیں:

''جیسے گھر میں انسان کے کئی قسم کے مال و اسباب ہوتے ہیں مثلاً روپیہ، پیسہ، کوڑی، لکڑی وغیرہ تو جس قسم کی جو شئے ہے اسی درجے کی اس کی حفاظت کی جاوے گی۔ایک کوڑی کی حفاظت کے لئے وہ سامان نہ کرے گا جو پیسہ اور روپیہ کے لئے اسے کرنا پڑے گا اور لکڑی وغیرہ کو تو یونہی ایک کونہ میں ڈال دے گا۔علیٰ ھذا القیاس جس کے تلف ہونے سے اس کا زیادہ نقصان ہے اس کی زیادہ حفاظت کرے گا۔۔۔''

پس تم معلوم کرو کہ تمہاری جتنی بھی قیمتی اشیاء ہیں جو سب سے زیادہ تمہیں عزیز ہیں ان میں سب سے بیش قیمت سب سے بالا قیمت وہ کیا چیز ہے۔فرمایا وہ عہد بیعت ہی ہے پس اگر تمہیں معلوم ہو کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے تو تم اس کی سب سے زیادہ حفاظت کرو گے اور قدر و قیمت کے نہ معلوم ہونے کے نتیجے میں انسان اپنے عہد بیعت کی سب سے کم حفاظت کرتا ہے اور بسا اوقات انسانوں کی اکثریت ایسی ہے جو بیعت کرنے کے باوجود اس کی حفاظت پر نگاہ ہی نہیں رکھتے اور بنیادی مرکزی وجہ جو انسانی فطرت پہ گویا مرتسم ہے، لکھی ہوئی ہے وہ اس کی قدر و قیمت کا نہ جاننا یا اس کی قدر و قیمت کے احساس کی کمی ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

''۔۔۔اسی طرح بیعت میں عظیم الشان بات توبہ ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں توبہ اس حالت کا نام ہے کہ انسان اپنے معاصی سے جن سے اس کے تعلقات بڑھے ہوئے ہیں اور اس نے اپنا وطن انہیں مقرر کر لیا ہوا ہے گویا کہ گناہ میں اس نے بودو باش مقرر کر لی ہوئی ہے (تو توبہ کے معنے یہ ہیں کہ) اس وطن کو چھوڑنا اور رجوع کے معنے پاکیزگی کو اختیار کرنا۔۔۔''

پس ایک انسان ظاہری طور پر بھی اپنے وطن کو چھوڑتا ہے۔فرمایا ہے جب تم بیعت کرتے ہو تو

یادرکھوایک وطن کو چھوڑتے ہواوراسی کا حقیقی نام توبہ ہےاوررجوع اس وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن کی طرف ہجرت کا نام ہے۔پس چونکہ جماعت جرمنی دنیا کی سب ہجرت کرنے والی جماعتوں سے تعداد میں زیادہ ہےاوراللہ تعالیٰ کے فضل سے ان میں ہجرت کی پاک علامتیں بھی ظاہر ہورہی ہیں اس لئے آپ کے اس اجتماع کے لئے اوراس خطبہ کے لئے بھی میں نے اسی مضمون کواختیار کیا ہے۔فرماتے ہیں:

”۔۔۔اب وطن کو چھوڑ نا بڑا گراں گزرتا ہے اور ہزاروں تکلیفیں ہوتی ہیں۔ایک گھر جب انسان چھوڑتا ہے تو کس قدر اُسے تکلیف ہوتی ہے اور وطن کو چھوڑنے میں تو اُس کو سب یار دوستوں سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔۔۔“

اب دیکھیں آپ میں سے کتنے ہیں جن کے عزیز پیارے رشتہ دار سال ہا سال سے ان سے جدا ہیں،بعضوں کی مائیں وفات پا گئیں۔ان کی جدائی میں،بعضوں کے باپ فوت ہو گئے تو ہجرت کا جو ظاہری مضمون ہے اس کو آپ سے زیادہ اور کون بہتر جانتا ہے۔بہت بڑی بڑی تکلیفیں جذباتی تکلیفیں ایسی کہ بعض خاندان مجھے ملتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ آٹھ سال ہو گئے ہیں نہ ماں باپ کا منہ دیکھ سکے،نہ بیوی بچوں کا اور یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھرا جاتی ہیں،بہت لمبا تکلیف کا زمانہ ہے جو انہوں نے دیکھا ہے۔پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس ظاہری ہجرت کے حوالے سے آپ کو روحانی ہجرت کے راز سکھا رہے ہیں:

”۔۔۔ایک گھر جب انسان چھوڑتا ہے تو کس قدر اسے تکلیف ہوتی ہے اور وطن کو چھوڑنے میں تو اُس کو سب یار دوستوں سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے اور سب چیزوں کو مثل چارپائی،فرش و ہمسائے،وہ گلیاں کوچے،بازار سب چھوڑ چھاڑ کر ایک نئے ملک میں جانا پڑتا ہے۔۔۔“

دیکھیں کتنی تفصیل سے آپ نے ہجرت کے مضمون پر روشنی ڈالی ہے۔گلیاں،کوچے،چارپائیاں تک بیان فرما دیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ وہ جن کو ہجرت کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ گھر کی چارپائیاں خواہ کیسی بوسیدہ ہی کیوں نہ ہوں وہ گلیاں بازار خواہ کیسے ہی غریبانہ کیوں نہ ہوں جن میں ان کا بچپن کھیلتے ہوئے گزرا وہ پیاری رہتی ہیں اور ہمیشہ پیاری رہتی ہیں،کبھی بھول نہیں سکتے۔یہ وہ تعلقات ہیں جن کا ذکر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہوئے پھر آپ کا رخ روحانی ہجرت کی طرف موڑیں گے۔

''۔۔۔یعنی اس سابقہ وطن میں کبھی نہیں آتا۔۔۔''

فرمایا یہ وہ مضمون ہے۔ پھر جب اس کو چھوڑتا ہے تو اس سابقہ وطن میں پھر کبھی نہیں آتا۔ یہ جو دوسرا پہلو ہے یہ صرف روحانی پہلو ہے۔ دنیا کے وطن میں تو یہ امید لگی رہتی ہے کہ ہم کبھی کسی دن ملکی قوانین اجازت دیں گے یا اقتصادی حالات اجازت دیں گے تو پھر اپنے وطن میں جائیں گے، ان گلیوں میں گھوم پھر کر دیکھیں گے، ان گھروں میں جائیں گے جہاں ہم رہا کرتے تھے لیکن روحانی ہجرت کا اور اس میں ایک فرق ہے۔ روحانی ہجرت اور دنیاوی ہجرت کا فرق زندگی اور موت کا فرق ہے۔ موت کے وقت جو ہجرت ہوتی ہے اس سے واپسی نہیں ہوا کرتی۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ سمجھا رہے ہیں کہ جب تم روحانی ہجرت کرتے ہو تو وہ موت ہی کی طرح ہے اور اس ہجرت میں پھر کبھی واپسی ممکن نہیں ہے۔ یہ ہجرت کرو گے تو تمہاری توبہ، توبہ سمجھی جائے گی۔ یہ ہجرت کرو گے تو توبہ قبول ہوگی جس کی قبولیت پر تمہاری آئندہ زندگی کا دارو مدار ہے۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔جو توبہ کرتا ہے اسے بڑا حرج اٹھانا پڑتا ہے اور سچی توبہ کے وقت بڑے بڑے حرج اس کے سامنے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے وہ جب تک اس کل کا نعم البدل عطا نہ فرمادے نہیں مارتا۔۔۔''

کتنا عظیم الشان کلام ہے، کتنا گہرا عارفانہ کلام ہے۔ فرماتے ہیں تم نے خدا کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا لیکن یاد رکھو ہجرت کے ساتھ ایک وسعت کا بھی وعدہ ہے اور وہ وسعت ہم نے دنیا کی ہجرتوں میں دیکھی ہے۔ ہم جانتے ہیں، آپ سب جانتے ہیں کہ جب خدا کی خاطر کچھ چھوڑ کر وطن سے نکلے تو اللہ نے اس سے بہت بہتر اس سے زیادہ دیا۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں وہ توبہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، (یعنی) مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام، جو اس زندگی میں تم کرتے ہو اور اپنے گناہوں کے وطن کو چھوڑ کر خدا کی طرف ہجرت کرتے ہو یہ سچی توبہ تب ہوگی جب دوبارہ پھر اس پرانے وطن کی طرف جانے کا خیال دل سے نکال دو گے جسے چھوڑ کر خدا کی خاطر تم ایک نئی روحانی دنیا میں آئے ہو تو خدا تمہیں نہیں مارے گا جب تک ہر تکلیف کی جزا نہ دے دے گا۔ جو کچھ تم نے چھوڑا ہے جب تک اس سے بہتر تمہیں عطا نہ کر دے گا تم پر موت وارد نہیں ہوگی۔ یہ ایک حیرت انگیز مضمون ہے جو اس سے پہلے آپ نے کبھی کہیں نہیں سنا ہوگا کہ خدا تعالیٰ سچی توبہ کرنے

والے کو صرف آخرت کا وعدہ نہیں کرتا اس دنیا میں بھی وعدہ پورا فرما دیتا ہے اور سچی توبہ کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ اس دنیا میں جن جن لذّتوں سے اس نے روگردانی کی ہوتی ہے جن چیزوں کو خدا کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اس سے بہتر لذّتیں اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتا ہے اس سے بہتر تسکین کی چیزیں اس دنیا میں اس کو عطا کرتا ہے اور یہ روحانی لذّتیں جو جزا کے طور پر آتی ہیں یہ دائمی ہوتی ہیں۔ یہی وہ جنت ہے جس کو وہ سمیٹ کر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور اگلی دنیا میں اس سے بڑھ چڑھ کر اسی جنت کو پاتا ہے۔ پس فرماتے ہیں:

''۔۔۔وہ جب تک اس کل کا نعم البدل عطا نہ فرمادے نہیں مارتا، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (البقرہ:223) میں یہی اشارہ ہے'' (اللہ تعالیٰ جو فرماتا ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے) یہی اشارہ ہے کہ وہ توبہ کر کے غریب بے کس ہو جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس سے محبت اور پیار کرتا ہے اور اسے نیکوں کی جماعت میں داخل کرتا ہے۔ دوسری قومیں خدا کو رحیم کریم خیال نہیں کرتیں (یعنی یہ جو مضمون ہے خدا رحیم وکریم ہے یہ حقیقی طور پر مسلمانوں پر ہی روشن ہوا) عیسائیوں نے خدا کو تو ظالم جانا اور بیٹے کو رحیم کہ باپ تو گناہ نہ بخشے اور بیٹا جان دے کر بخشوائے۔۔۔''

فرماتے ہیں عیسائیوں کے مذہب میں بھی ایک رحیم وکریم کا تصور ہے مگر خدا کو رحیم نہیں جانتے بیٹے کو رحیم جانتے ہیں۔ باپ تو بغیر سزا دیئے بخشے نہ اور بیٹا اپنی جان دے کر بخشوائے۔ فرمایا دیکھو کون زیادہ رحیم وکریم ہوا؟ باپ کہ بیٹا؟۔ والد مولود میں مناسبت اخلاق عادات کی ہوا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔بڑی بے قوفی ہے کہ باپ بیٹے میں اتنا فرق ہو والد مولود میں مناسبت اخلاق، عادات کی ہوا کرتی ہے مگر یہاں تو بالکل ندارد۔ اگر اللہ رحیم نہ ہوتا تو انسان کا ایک دم گزراہ نہ ہوتا۔ جس نے انسان کے عمل سے پیشتر ہزاروں اشیاء اس کے لئے مفید بنائیں تو کیا یہ گمان ہوسکتا ہے کہ توبہ اور عمل کو قبول نہ کرے۔۔۔''

پھر فرماتے ہیں توبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے گناہ کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔گناہ کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ گناہ کو پیدا کرے اور پھر ہزاروں برس کے بعد گناہ کی معافی سوجھے جیسے مکھی کے دو پر ہیں ایک میں شفا اور دوسرے میں زہر۔۔۔''

فرمایا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس قسم کا جاہلانہ تصور نہ باندھو کہ گویا خدا تعالیٰ نے گناہ پیدا کر کے تمہیں پہلے ملوث کر دیا اور پھر ہزاروں سال کے بعد خیال آیا او ہو یہ تو غلطی ہوگئی چلو اب ان کی معافی کا بھی کوئی سامان کیا جائے۔فرمایا یہ تو مکھی کے پروں کا کھیل ہوگیا۔کہا جاتا ہے کہ مکھی کے دائیں پر میں شفا ہے اور بائیں پر میں بیماری ہے۔جب وہ دودھ پر بیٹھتی ہے تو بایاں پر یعنی بیماری کا پر جھکا دیتی ہے اور دودھ گندا ہو جاتا ہے۔اگر اسے ڈبو دیں اور دایاں پر بھی ڈوب جائے تو اسی پر میں اس بیماری والے پر کے خلاف شفا کی طاقت ہوتی ہے اور وہ اس کا دایاں پر اس کی شفا کا موجب بن جاتا ہے۔فرماتے ہیں کہ اپنے خدا کو وہ مکھی تو نہ سمجھو جس کے دو پر ہیں ایک پر میں بیماری یعنی گناہ اور دوسرے میں شفا، پہلے وہ عادتاً گویا اپنا دایاں پر ہی دودھ میں ڈالے گا تو تمہاری زندگی کو بائیں پر کے جھکنے سے گندا کر دے گا اور جب تم گناہ میں ملوث ہو جاؤ گے تو پھر اگر اس مکھی کو خیال آ گیا تو آ گیا ورنہ کوئی اور اسے غوطہ دے دے تو اس کا بایاں پر بھی اندر ڈوب جائے گا۔فرمایا یہ تو جاہلانہ تصور ہے اس کو خدا کی طرف منسوب نہ کرو۔فرماتے ہیں:

''۔۔۔اسی طرح انسان کے دو پر ہیں ایک معاصی کا دوسرا خجالت، توبہ، پریشانی کا۔یہ ایک قاعدہ کی بات ہے جیسے ایک شخص جب غلام کو سخت مارتا ہے تو پھر اس کے بعد پچھتاتا ہے گویا کہ دونوں پر اکٹھے حرکت کرتے ہیں۔۔۔''

یہ جو مضمون ہے اس کا پہلے مضمون سے تعلق ہے مگر اب انسان کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو تو نعوذ باللہ من ذالک مکھی کی طرح سمجھنا اس کی گستاخی ہے لیکن انسان میں اس کی فطرت میں یہ بات ضرور داخل ہے کہ اس میں یہ دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں وہ غلطی بھی کرتا ہے اور بائیں پر کو پہلے جھکاتا ہے اور پھر معاً توبہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور دائیں پر کو جھکاتا ہے۔پس یہ جو تمثیل ہے یہ خدا پر نہیں، بندوں پر عائد ہوتی ہے اور اگر بندوں میں یہ صفت موجود ہے کہ گناہ کر کے، غلطی کر کے پشیمان ہوتے ہیں اور پھر خود اپنی غلطیوں کے ازالے کی کوشش

کرتے ہیں تو اگر خدا تعالیٰ کو تم اس سے بھی عاری سمجھو تو خدا تعالیٰ کی مثال تو بدتر ہوگی یعنی ایسا خدا ہے جو گناہوں کی بخشش کے لئے کوئی طاقت ہی اپنے اندر نہیں رکھتا، صلاحیت ہی نہیں پاتا۔ انسان تو گناہ کے ساتھ پشیمانی کے ذریعے گناہ کے ازالہ کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن خدا ایسا ہے کہ **نعوذ باللہ من ذالک** جس میں یہ صفت بھی نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تریاق کے ساتھ زہر بنایا کیوں؟۔ اگر یہ بات درست ہے اور روزمرّہ کے تجربے میں آتی ہے کہ جہاں زہر ہیں، جہاں گندگی ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے شفا کا نظام بھی جاری فرمایا ہے۔ اس سے ایک چیز جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اخذ فرمائی اور جس کی طرف ہمیں متوجہ فرمایا وہ سمجھنے والا نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندوں میں جہاں کمزوری کا مادہ رکھ دیا ہے کہ اگر چاہیں تو کمزوری اختیار کریں وہاں ہر کمزوری کے لئے نجات کی راہ بھی خود ہی خدا نے کھولی ہے اور ہر زہر جو پیدا فرمایا ہے اس کا ایک تریاق بھی پیدا فرما دیا ہے۔

پس اس پہلو سے اللہ تعالیٰ کو مغفرت سے عاری سمجھنا اس کی کائنات کی سکیم کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں ہے۔ خدا تعالیٰ نے جس نہج پر، جس فلسفے پر اس تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اس پر غور کرو تو تمہیں سمجھ آجائے گی کہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں گناہ کا اختیار تو دیا ہو لیکن گناہ سے بچنے کے سامان پیدا نہ کئے ہوں اور گناہ کرنے کے باوجود ان گناہوں کے بداثرات کو دھونے کے سامان نہ کئے ہوں۔ یہ وہ مضمون ہے جو چل رہا ہے، ٹھہر ٹھہر کر آپ کو سمجھانا پڑتا ہے کیونکہ بہت سے یہاں ایسے ہیں جن کو دینی امور کا زیادہ علم نہیں اور ذہنی اور تعلیمی لحاظ سے بھی ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو بار بار بات سمجھانے کے محتاج ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریرات چونکہ بہت ہی گہری اور عارفانہ ہیں اس لئے عام تعلیم یافتہ آدمی کو بھی سمجھانے کے لئے انہیں ٹھہر ٹھہر کر دہرانا پڑتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ’’۔۔۔اب سوال یہ ہے کہ زہر کیوں بنایا گیا؟ (اللہ تعالیٰ نے آخر زہر بنایا ہی کیوں تھا اگر تریاق بنا کر اس کو شفا دینی تھی) تو جواب یہ ہے کہ گو یہ زہر ہے مگر کُشتہ کرنے سے حکم اکسیر کا رکھتا ہے۔۔۔‘‘

اب یہ بھی ایک عظیم نکتہ ہے اور حیرت انگیز ہے اس لحاظ سے، میرے لئے تو دوہرے معنوں میں حیرت انگیز ہے کیونکہ ہومیوپیتھی کا تو بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے کہ ہر زہر اگر کُشتہ کر دیا جائے یعنی

اس کا زہریلا مادہ ختم کر دیا جائے اور خفیف کر دیا جائے تو اسی زہر میں شفا ہو جاتی ہے۔تو فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی تخلیق کائنات کے فلسفے پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کوئی زہر بھی ایسا نہیں جو اپنی ذات میں شفا کا مادہ نہ رکھتا ہو مگر اس میں شفا کا مادہ تب پیدا ہوتا ہے اگر اسے کچل کر خاکستر کر دیا جائے اور یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر رکھی ہے کہ اپنے گناہوں سے وہ نیکی پالے، اپنی بدیوں میں سے نجات تلاش کر لے لیکن شرط یہ ہے کہ جیسے حکیم زہر کا کچلہ بناتا ہے اور اس کے زہریلے مادے کو بے اثر کر دیتا ہے تب اس میں شفا کا ایک مادہ پھوٹتا ہے۔اسی طرح انسان کے اندر جو گناہ کے میلانات ہیں یہ محض ہلاکت کے لئے نہیں بلکہ انہی میلانات پر اگر انسان قابو پالے، ان کے خلاف ایک جہاد کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہو تو حیران ہو جائے گا کہ انہی گناہوں میں دراصل اس کی نجات پنہاں تھی، اس کی نجات چھپی ہوئی تھی۔فرماتے ہیں:

’’۔۔۔اگر گناہ نہ ہوتا تو رعونت کا زہر انسان میں بڑھ جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتا۔۔۔‘‘

ایک اور لطیف پہلو یہ ہے کہ گناہ کے نتیجے میں انسان کے اندر ایک انکساری پیدا ہوتی ہے اور اگر گناہ نہ کرتا یعنی تمام انسان اس بات کی طاقت پاتے کہ گناہ نہ کریں تو انسان جیسا کہ خودسر ہے وہ خدا بن بیٹھتا اور گناہ ہی ہے دراصل جو اگر قابو میں رکھا جائے اور اس سے توبہ کی جائے اور اسے کچل کر بالآخر خاک بنا دیا جائے تو گناہ ہی میں انسان کی نجات ہے کیونکہ اس سے انکسار پیدا ہوتا ہے اور اگر گناہ نہ ہو تو رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس مضمون کو بعض حکایات کی صورت میں پیش فرمایا ہے کہ وہ نیکی جو انسان کے علم میں محض نیکی ہی ہو اور اس کی اپنی کمزوریوں کی طرف اس کی نظر نہ ہو وہی نیکی اس کو ہلاک کرنے کا موجب بن جاتی ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں وہ رعونت اختیار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں پاک ہوں اور باقی سب بد ہیں اور گویا ایک قسم کی خدائی کا دعویدار بن بیٹھتا ہے۔فرماتے ہیں:

’’۔۔۔کبر اور عُجب کی آفت سے گناہ انسان کو بچائے رکھتا ہے (کبر اور عُجب۔کبر کا مطلب ہے اپنی بڑائی، عُجب پسند کو کہتے ہیں اور پسند کے نتیجہ میں ایک فخر کا اظہار اس کو عُجب کہتے ہیں) جب نبی معصوم ستر بار استغفار

کرے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔۔۔‘‘ (ملفوظات جلد اول صفحہ:3،2)

فرمایا یہ بھی یاد رکھو کہ جن کو تم معصوم جانتے ہو اور واقعۃً معصوم بھی ہوتے ہیں ان کے اندر کبر اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی باریک در باریک غلطیوں پر نظر رکھتے ہیں اور ہلکے سے داغ کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ وہ بشری کمزوریاں جو ان سے سرزد ہوتی ہیں وہ بھی ان کو تمہارے گناہ کبائر کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ پس حضرت محمد مصطفی ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر نبی ستر بار استغفار کرتا ہے تو اپنا حال سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ تمہاری تو ساری زندگی استغفار میں ڈھل جانی چاہئے اور وہ استغفار ایک فرضی استغفار نہیں ہے بلکہ عارفانہ استغفار ہے اور اس پہلو پر میں پہلے بھی آپ کو متوجہ کر چکا ہوں۔ انبیاءؑ کے متعلق یہ خیال غلط اور جھوٹا ہے کہ وہ تصنع سے استغفار کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ وہ معصوم ہیں اور پھر بھی استغفار کرتے ہیں۔ انبیاءؑ کا کوئی زندگی کا ایک لمحہ بھی جھوٹا نہیں ہوا کرتا، ان کی ہر حالت سچی ہوتی ہے۔ پس انبیاءؑ جب اپنے حال پر نظر کرتے ہیں تو جس بلندی سے وہ اپنے حال کو دیکھتے ہیں انہیں اپنے حال کی ہر پستی اور ہر گہرائی جو بشریت کی پستی اور بشریت کی گہرائی ہوا کرتی ہے وہ دکھائی دیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو گناہگار سمجھتے ہیں۔ بسا اوقات جو نیکیاں کرنا چاہتے ہیں جتنی چاہتے ہیں، ہمیں تو علم نہیں کہ وہ کتنی چاہتے ہیں، مگر اتنی زیادہ چاہتے ہیں کہ ان کے بس میں نہیں ہوتی۔ اگر ان کا دل چاہے جیسا کہ دل چاہتا ہے تو آناً فاناً ساری دنیا کو سچا مسلمان بنا دیں اس کے لئے تڑپتے ہیں، بے قرار ہوتے ہیں اور وہ مواقع جو ان کے ہاتھ سے جاتے رہے ان پر نظر ڈالتے ہیں گویا کہ ہر کام جو نیکی کا کام ہے جس کو کرنے سے وہ عاجز آ گئے وہ اپنی فہرست میں گناہوں میں داخل سمجھتے ہیں۔

پس انبیاءؑ کا ستر بار استغفار ایک بہت گہرا اور بہت اعلیٰ مضمون ہے۔ بلند مضمون بھی ہے اور گہرا مضمون بھی ہے۔ اس کو سمجھانے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ رنگ اختیار فرمایا۔ پہلے کہا کہ گناہ نہ ہوتا تو انسان متکبر ہو جاتا۔ پھر فرمایا کہ نبی تو معصوم ہوتا ہے اس کے متعلق غور کرو کہ وہ اس لئے معصوم ہے کہ متکبر نہیں ہوتا اور اس کا انکسار، اس کا اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھنا جب اس کو ستر بار تک استغفار پر آمادہ کرتا ہے تو یہ استغفار ہے جو اس کے لئے متکبر ہونے کا کوئی دور کا امکان بھی باقی نہیں رہنے دیتا۔ پس عام انسان جب گناہ کو اس طرح دیکھے اور اس سے بچنے کے لئے ویسی کوشش کرے جیسے انبیاءؑ کرتے ہیں تو یہی وہ سچی توبہ ہے جو انسان کو انکسار سکھاتی ہے اور بلندیاں

بھی عطا کرتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک اور مضمون پر حیرت انگیز روشنی ڈالتے ہیں جو حدیث میں آیا ہے اور جس سے عموماً لوگ ناواقفیت کی وجہ سے غلط نتیجہ نکالتے اور نیکی اختیار کرنے کی بجائے بدیوں پر جرأت کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ خدا کے بعض بندے ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **اعمل ماشئت فقد غفرت لک** کہ اے میرے بندے جو چاہے کرتا پھر، میں نے تجھے بخش دیا ہے۔(صحیح مسلم ، كتاب التوبة ، باب قبول التوبة من الذنوب و أن تكررت الذنوب و التوبة)

کئی ایسے علماء بھی جو اپنی دانست میں بڑے بڑے عالم ہوتے ہیں اس حدیث سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ہر گناہ کی چھٹی دے بیٹھتا ہے اور فرماتا ہے کہ اب تم آزاد ہو میں نے تمہیں بخش دیا ہے اب ساری زندگی گناہوں میں ملوث رہو، ڈوبے رہو، غرق ہو جاؤ، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں اور تمہیں بھی کوئی پرواہ نہیں ہونی چاہئے کیونکہ میں تمہیں بخش چکا ہوں۔ یہ مضمون بالکل غلط اور جھوٹا ہے جو اس طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ

> ''۔۔۔جب انسان بار بار رو رو کر اللہ سے بخشش چاہتا ہے تو آخر کار خدا کہہ دیتا ہے کہ ہم نے تجھے بخش دیا اب تیرا جو جی چاہے سو کر۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دل کو بدل دیا اور اب گناہ اسے بالطبع بُرا معلوم ہوگا۔۔۔''

فرمایا جب اللہ کہتا ہے کہ میں نے بخش دیا ہے تو اسے بخشا ہے جسے بخشنے کی پہلے اسے اہلیت عطا کر دیتا ہے۔ بخشا اس کو ہے جو گناہوں سے پاک ہو چکا ہو، جسے وہ خود گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ اس لئے بخشش کا یہ مطلب نہیں کہ گناہوں میں ملوث رکھتے ہوئے کہتا ہے میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔ پہلے اس کا دل گناہوں سے دھو دیتا ہے اور پھر فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بخش دیا ہے۔ اب جو چاہے کر یعنی سوائے اس کے اب تو کچھ نہیں کرے گا جو میری رضا ہوگی۔ اب میں نے تیرے دل کی کایا پلٹ دی ہے۔ یہ بخشش کا مضمون ہے جو ایک عارف باللہ کے سوا کسی دوسرے کے دل پر روشن نہیں ہو سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کا نشان مانگنے والوں کو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹیاں اتار کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام پڑھیں تو

بعض دفعہ ایک فقرے کا ایک حصہ ہی بلاشبہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کو روز روشن کی طرح ثابت کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اب یہ مضمون جو ہے وہ کسی گنہگار کے دل پر نہیں اتر سکتا۔ ناممکن ہے ایک ایسا شخص جو خدا سے دور ہو وہ آنحضور ﷺ کے اس ارشاد کے یہ معنی پالے۔ کوئی بہت ہی جاہل اور فطرتی طور پر پیدائشی اندھا ہوگا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس کلام کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالے کہ اتنا عارفانہ مضمون ایک خدا اور نبیؐ سے دور انسان کے دل پر روشن ہو گیا۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔اب گناہ اسے بالطبع بُرا معلوم ہوگا جیسے بھیڑ کو میلا کھاتے دیکھ کر کوئی دوسرا حرص نہیں کرتا کہ وہ بھی کھاوے۔۔۔''

فرمایا بھیڑ جب گندگی پر منہ مارتی ہے تو وہ شخص جس کے دل کو خدا تعالیٰ نے پاک کیا ہو یعنی انسانی صفات حسنہ اس کو عطا کی گئی ہوں کیا تم سوچ سکتے ہو کہ بھیڑ گند پر منہ مارے اور کسی انسان کا سخت دل چاہے کہ میں بھی کھاؤں اسی طرح جو گند بھیڑ کھا رہی ہے میں بھی اسی پر منہ ماروں۔

''۔۔۔مسلمانوں کو خنزیر کے گوشت سے بالطبع کراہت ہے حالانکہ اور دوسرے ہزاروں کام کرتے ہیں جو حرام اور منع ہیں تو اس میں حکمت یہی ہے کہ ایک نمونہ کراہت کا رکھ دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ اسی طرح انسان کو گناہ سے نفرت ہو جاوے۔۔۔''

پس وہ شخص جسے خدا فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بخش دیا اب جو چاہے کرتا پھر، مراد یہ ہے کہ اب مجھے تجھ پر کامل یقین ہے اب میں تیری ڈور ڈھیلی چھوڑتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ جسے میں نے بخش دیا ہو وہ کبھی گناہ کی طرف کسی غفلت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا، معمولی نگاہ سے بھی گناہ کو چاہت اور پیار سے نہیں دیکھے گا بلکہ جب دیکھے گا نفرت سے دیکھے گا، جب دیکھے گا کراہت کے ساتھ دیکھے گا۔ پس وہ کھلی چھٹی یہ ظاہر کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں پر جو بخش دیئے گئے ہوں کامل اعتماد کا اظہار کیا جاتا ہے اور مرتے دم تک وہ اس اعتماد کو ٹھیس نہیں لگاتے اور یہی بقاء کا مضمون ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ عالم بقاء میں چلے جاتے ہیں۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے وہ جنت کی زندگی پا لیتے ہیں۔ جس طرح جنت میں گناہ کا کوئی تصور نہیں جب یہ کیفیت انسان کو اس دنیا

میں نصیب ہو جائے تو یقیناً اور بلا شبہ اس دنیا ہی میں جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ حدیث اس مضمون کا ذکر فرما رہی ہے۔ **اعمل ماشئت فقد غفرت لک** کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندے میں تجھے بخش چکا ہوں اب تو جو چاہے کرے تو ہمیشہ میری رضا کی باتیں کرے گا، میرے پیارے کو جیتنے والی باتیں کرے گا اور گناہ کی طرف تیرا میلان اختیار کرنا ناممکن ہو چکا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کثرت گناہ کی وجہ سے دعا میں کوتاہی نہ ہو۔ فرماتے ہیں بعض دفعہ انسان اس خیال سے کہ میرے گناہ بہت بڑھ گئے ہیں دعا میں بھی کوتاہی کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اب کہاں بخشا جاؤں گا۔ اب تو معاملہ حد اختیار سے آگے نکل ہو چکا ہے۔ اتنے گناہوں کو اب کون بخشے گا تو فرمایا یہ بھی جرم ہے۔ کثرت گناہ کی وجہ سے دعا میں کوتاہی نہ ہو،

> ''۔۔۔گناہ کرنے والا اپنے گناہوں کی کثرت وغیرہ کا خیال کر کے دعا سے ہرگز باز نہ رہے۔ دعا تریاق ہے۔ آخر دعاؤں سے دیکھ لے گا کہ گناہ اسے کیسا برا لگنے لگا۔۔۔''

پس گناہ سے بچنے کا طریق بھی دعائیں ہی ہیں جو فضل الٰہی کو کھینچتی ہیں اور بخشش کا مضمون صرف خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ پس وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ گناہ چھوڑ دیں اور گناہوں کی دنیا سے ہجرت کر کے روحانی دنیا کی طرف چلے جائیں ان کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ پیغام ہے کہ تمہارے گناہ کتنے بھی بڑھ چکے ہوں ایک ہی راہ ہے تمہاری ہجرت کی کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو وہ تمہیں بدی کی دنیا سے نیکی کی دنیا کی طرف ہجرت کی توفیق عطا فرمائے۔ فرماتے ہیں:

> ''۔۔۔جو لوگ معاصی میں ڈوب کر (یعنی گناہوں میں غرق ہونے کے بعد) دعا کی قبولیت سے مایوس رہتے ہیں اور توبہ کی طرف رجوع نہیں کرتے، آخر وہ انبیاءؑ اور ان کی تاثیرات کے منکر ہو جاتے ہیں۔۔۔''

فرماتے ہیں یہ جو مایوسی ہے ایک بہت بڑا گناہ ہے جو دراصل انسان سے اس کا سارا دین چھین لیتا ہے۔ وہ لوگ جو گناہوں میں پڑ کر سمجھتے ہیں کہ اب تو ہم ڈوب گئے اور اب تو دعا بھی ہمیں نہیں بچا سکتی بالآخر وہ انبیاءؑ کے بھی منکر ہو جاتے ہیں اور ایمان کے ہر پہلو سے وہ منہ پھیر کر کفر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

"۔۔۔ یہ توبہ کی حقیقت ہے جو اوپر بیان ہوئی اور یہ بیعت کی جز کیوں ہے؟ (فرمایا) تو بات یہ ہے کہ انسان غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ جب وہ بیعت کرتا ہے اور ایسے کے ہاتھ پر جسے اللہ تعالیٰ نے وہ تبدیلی بخشی ہو تو جیسے درخت میں پیوند لگانے سے خاصیت بدل جاتی ہے اسی طرح سے اس پیوند سے بھی اس میں فیوض اور انوار آنے لگتے ہیں جو اس تبدیلی یافتہ انسان میں ہوتے ہیں۔۔۔"

اب دیکھیں بیعت کا مضمون اپنی ذات میں خوب کھول کر یہ بیان کر کے کہ یہ بیعت جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان وہی خدا کے ہاتھ مقبول ہوتا ہے جو اپنی جان بھی بیچ دے، اپنے مال بھی بیچ دے، اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ پر بیچ دے اس بات کا اقرار پھر وہ بیعت کے ذریعے کرتا ہے اور بیعت انسان کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور یہ بیعت جو ہے اس کا بہت ہی باریک اور لطیف مضمون حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ بیان فرماتے ہیں کہ جس کے ہاتھ پر تم بیعت کرتے ہو اس کی اپنی تاثیرات کا بھی تمہاری بیعت سے ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنا ایک اور بات تھی اور باوجود اس کے کہ حضرت ابوبکرؓ آپ کے سچے برحق اور صدیق خلیفہ تھے پھر بھی وہ بیعت جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی گئی وہ اور بیعت تھی اور جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر کی گئی وہ اور بیعت تھی۔

پس خلافت کی بیعت کو جو حضرت رسول اللہ ﷺ کی اپنی خلافت تھی وہ بیعت نہیں قرار دیا جس بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی جانے والی بیعت تھی اور یہ فرق کیوں ہے جبکہ عہد بیعت ایک ہے۔ عہد بیعت دونوں جگہ برابر ہے۔ دونوں جگہ یہ عہد باندھا جا رہا ہے خدا سے کہ اے ہمارے آقا ہم نے وہ سب جانیں جو تو نے عطا فرمائیں اپنی، اپنے عزیز و اقارب کی تیرے حضور پیش کر دی ہیں، اب یہ ہماری نہیں رہیں۔ وہ تمام اموال، وہ تمام نعمتیں جو تو نے ہمیں عطا فرمائیں اب ہم یہ تیرے حضور پیش کرتے ہیں تا کہ ہماری جان بخشی جائے۔ اس عہد بیعت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی وہ عہد بیعت ہے جو نبیوں کے ہاتھ پر لیا جاتا ہے، یہی وہ عہد بیعت ہے جو خلفاء کے ہاتھ پر لیا جاتا ہے لیکن فرق ایک ہے۔ وہ فرق کیا ہے؟ حضرت مسیح موعود

علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:

’’۔۔۔جب وہ بیعت کرتا ہے اور ایسے کے ہاتھ پر جسے اللہ تعالیٰ نے وہ تبدیلی بخشی ہو تو جیسے درخت میں پیوند لگانے سے خاصیت بدل جاتی ہے اسی طرح سے اس پیوند سے بھی اس میں وہ فیوض اور انوار آنے لگتے ہیں جو اس تبدیلی یافتہ انسان میں ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کے ساتھ سچا تعلق ہو، خشک شاخ کی طرح نہ ہو۔۔۔‘‘

اب ایک اور عظیم الشان مضمون ہے جو آپؑ نے ہم پر کھول دیا۔ اب آپ دیکھیں درختوں کے ساتھ بھی تو پیوند کیا جاتا ہے۔ آموں کے ساتھ آموں کا پیوند کیا جاتا ہے۔ مگر اس پیوند میں مماثلت ضروری ہے اور طبیعت کا میلان ایک جیسا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ پھل دار درختوں میں سے ہر درخت کا ہر دوسرے درخت سے پیوند ہو ہی نہیں سکتا۔ بعض پھل دار درختوں کا بعض پھل دار درختوں سے پیوند ہوتا ہے اور اکثر سے نہیں ہوتا۔ تو اس لئے پہلی بات جو سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب تم بیعت کا ارادہ کرتے ہو تو خدا تعالیٰ نے ایک انسان کو تمہاری بیعت لینے کا ذریعہ بنایا ہے اس سے تمہاری فطرت کو پیوند ہونا چاہئے۔ وہ اگر فطرت کا پیوند ہوگا تو پھر اس شخص سے جس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہو تمہاری طرف فیوض جاری ہوں گے اور جتنا خالص پیوند ہوگا اتنا ہی تمہارا وجود اس شخص کے رنگ اختیار کرلے گا جس کے ہاتھ پر تم بیعت کرتے ہو اور اس بیعت میں خشکی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ خشک لکڑی کا پیوند ایک سرسبز درخت سے نہیں ہوسکتا یا ایک سرسبز درخت کی خشک شاخ سے اگر کوئی تر و تازہ شاخ بھی باندھ دی جائے تو وہ پیوند نہیں ہوسکے گا تو دونوں طرف زندگی کی علامتیں ہونا ضروری ہیں۔ جس کی بیعت کی جاتی ہے وہ بھی ایک زندہ شعور کے ساتھ اور دعاؤں کے ساتھ تمہاری بیعت لے رہا ہو اور تم بھی ایک زندہ شعور اور دعاؤں کے ساتھ اس کی بیعت کر رہے ہو اور جانتے ہو کہ اب ایک نیا پیوند ہے جس کی بناء پر ہماری صفات میں تبدیلی پیدا کی جائے گی۔ فرماتے ہیں یہ تبدیلی ضروری ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ سچا تعلق ہو یعنی بیعت میں صرف ایک خشک رسمی الفاظ کا دہرانا نہیں ہے اگر خشک لفظی الفاظ دوہرا کر تم بیعت کرو گے تو ایسا ہی ہوگا جیسے خشک شاخ کو ایک سرسبز شاخ سے باندھ دیا گیا ہو وہ ہزاروں سال بھی بندھی رہے تو سرسبز شاخوں کی

تروتازگی تو حاصل نہیں کر سکے گی۔ پس ذاتی خلوص کا تعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں بیعت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

''۔۔۔جس قدر یہ نسبت ہوگی اسی قدر فائدہ ہوگا۔۔۔''

(ملفوظات جلد اول صفحہ:2 تا 3)

اب دیکھیں یہ مضمون کتنا وسیع ہو گیا ہے اور کتنی اس میں عظمت آ گئی ہے۔ایک چھوٹی سی بات جو عام انسان کے لئے مسئلہ بنی رہتی ہے اور بعض دفعہ عمر بھر کی دانشوری بھی اس بات کا حل نہیں دے سکتی۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بات کو دیکھیں کیسی وضاحت کے ساتھ کھول دیا ہے روز روشن کی طرح روشن کر دیا ہے بیعت کے الفاظ وہی ہیں جو قرآن نے بیان فرمائے ،عہد بیعت کا مضمون وہی ہے جو قرآن نے بیان فرمایا لیکن کس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہو یہ مضمون ہے جو بیعت کے الفاظ میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی عظمت پیدا کر دیتا ہے۔

حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے ہاتھ پر جو بیعت کی گئی پھر ویسی بیعت کبھی نہیں ہوئی ہاں اس دور میں جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تو چونکہ آپؑ نے اپنی ذات کو کامل طور پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات میں کھو دیا تھا اور اپنا کچھ بھی باقی نہیں رکھا تھا اس لئے آپ کی بیعت اگر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت قرار دی جاسکتی ہے تو یہی وہ بیعت ہے جس کو اس دور میں پھر دہرایا گیا ہے مگر ذاتی طور پر نہیں آنحضرت ﷺ کے عشق کامل کے لحاظ سے اپنے سارے وجود کو کھو دینے کے نتیجہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فیض عطا کیا گیا۔آگے جتنی بھی بیعتیں ہیں، ہوئی ہیں یا ہوں گی ان میں عہد بیعت وہی رہے گا مگر درجہ بدرجہ اس کا تعلق اس کی ذات سے ضرور رہے گا جس نے بیعت لی ہے۔اگر خدا کے حضور اس کا ایک خلوص اور تقویٰ کا مقام مسلم ہے تو ہر بیعت کرنے والے کے اندر اسی قدر خلوص اور تقویٰ سرایت کرے گا اور بیعت کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حال کو درست کرتا رہے اور درست رکھے جہاں تک اس کا بس چلے جہاں تک زور لگ سکتا ہے دعاؤں کے ذریعے اور مسلسل کوشش کے ذریعے اپنا حال بہتر بناتا رہے کیونکہ اس کے ساتھ بہت سی زندگیوں کا انحصار ہے۔بہت سے اور وجود ہیں جنہوں نے اس سے مل کر زندہ ہونا ہے۔اگر وہ اپنی زندگی سے ہی غافل ہو گیا تو دوسروں کی زندگی کے کیا سامان

کرے گا۔ یہ ایک اور پہلو اس مضمون سے نکلتا ہے جو بہت ہی گہرا اور بہت ہی دل دہلا دینے والا پہلو ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق آتا ہے کہ ایک دفعہ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک لڑکا جو بارش ہو رہی تھی، پھسلن تھی بے دھڑک اس میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ آپ نے اس بچے کو آواز دی اور فرمایا میاں احتیاط سے، پھسلن ہے، کہیں گر نہ جانا۔ وہ بچہ حیرت انگیز طور پر ذہین تھا اس نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف دیکھا، اس نے کہا امام صاحب! میں گرا تو میں ہی گروں گا آپ احتیاط سے قدم رکھیں کیونکہ آپ گرے تو ایک زمانہ گر جائے گا، آپ کے ساتھ بہت سی زندگیاں وابستہ ہیں۔ کتنا حیرت انگیز مضمون ہے جو اس لڑکے نے اپنی حاضر جوابی کے نتیجہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے سامنے رکھ دیا اور ہمیشہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مضمون بیان فرمایا ہے یہ بہت ہی وسیع ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے آپ کے سامنے کھولا ہے بہت ہی وسعت رکھنے والا مضمون ہے۔ جو مسائل بڑے بڑے دانشوروں سے حل نہیں ہو سکے کہ بیعت اگر ایک ہی ہے تو پھر فرق کیوں پڑتے ہیں۔ بیعت اگر ایک ہی ہے تو نبی کی بیعت اور کیوں ہے، خلیفہ کی بیعت اور کیوں ہے، ایک خلیفہ کی بیعت کیوں اور ہے دوسرے کی کیوں اور ہے، مجدد کی بیعت ایک اور رنگ کیوں رکھتی ہے۔ یہ سارے مسائل حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مختصر تحریر میں کھول دئے اور ایک اور مضمون ہم پر یہ روشن کر دیا ہے کہ تم اگر بیعت سے استفادہ نہیں کرتے لازم نہیں کہ قصور اس کا ہے جس کے ہاتھ پر تم نے بیعت کی ہے کیونکہ اگر تم نے اپنا پیوند صحیح نہ باندھا، اگر سچائی اور خلوص کے ساتھ بیعت نہ کی اگر تم اس عہد بیعت پر کامل خلوص اور وفا سے قائم نہ رہے اور جس کی بیعت کر رہے ہو اس سے پیار اور محبت کا سچا گہرا تعلق نہ رکھا تو پھر وہ بیعت تمہیں فائدہ نہ دے گی بلکہ پیوند ہونے کے باوجود وہ صفات تم میں سرایت نہیں کریں گی۔

جہاں تک درجہ بدرجہ صلاحیتوں کا مضمون ہے یہ تو ایک ایسا مضمون ہے جس میں کوئی بھی ایسی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی کہ جس سے یہ کہا جائے کہ اس مقام پر آ کر کوئی بیعت لینے والا بیعت لینا چھوڑ دے کیونکہ اس کا وہ مرتبہ نہیں جو پہلوں کا مرتبہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے ایک منافقانہ حالت میں کہا کہ لوگ جو محمد رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرتے تھے ان کے اندر تو یہ یہ

باتیں تھیں جو آپ کی بیعت کر رہے ہیں ان میں وہ باتیں نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو وہ بیعت کرنے والے تھے وہ اور تھے اور جو میری بیعت کرنے والے ہیں وہ اور ہیں اس پر تو غور کرو۔ تو ہر بیعت کرنے والے کا اپنا مقام اور مرتبہ بھی ایک ہے، اس کا اپنا اخلاص بھی ہے۔ پس لازم نہیں کہ جس کی بیعت کی جائے اسی کا قصور ہو کہ تم بیعت تو کرتے ہو مگر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ تمہارا بھی قصور ممکن ہے۔ ممکن ہے تم نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی سرسبز شاخوں کو اس کے ساتھ پیوند کے لئے آگے نہیں بڑھایا بلکہ ایک خشک ہاتھ بڑھایا ہے گویا خشک ٹہنی کا پیوند اس سے کر دیا۔

پس یہ بہت ہی وسعت والا مضمون ہے اور یہی حقیقی ہجرت ہے۔ روحانی ہجرت کی اس سے بہتر تمثیل ممکن نہیں کیونکہ جب آپ آم کے ایک پودے کو اکھیڑتے ہیں ایک جگہ سے خواہ اس کی کیسی ہی بدصفات کیوں نہ ہوں جب اس کو زمین سے اکھیڑتے ہیں اور اس کی شاخ کو کسی ایسے سرسبز آم کی شاخ سے پیوند کر دیتے ہیں جو آم تو ہے لیکن مختلف صفات کا آم ہے، اعلیٰ درجے کی صفات کا آم ہے تو اس سے جو آم پیدا ہوتے ہیں وہ وہی مزہ رکھتے ہیں، وہی رنگ و بو رکھتے ہیں جو اس آم کے ہیں جس کے ساتھ پیوند کیا گیا بشرطیکہ وہ شاخ جو کاٹی گئی تھی یا جو پودا اکھیڑ کر دوسری جگہ لے جایا گیا تھا اس کے اندر خلوص نیت ہو یعنی مالی نے خلوص نیت کے ساتھ، احتیاط کے تقاضے پورے کرتے ہوئے یہ پیوند کیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر لازماً وہ صفات تبدیل ہو جاتی ہیں اور نئی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب آموں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ہمارے قادیان کے باغ میں جو حضرت مصلح موعودؓ نے اور حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑے شوق سے لگوایا تھا اس میں ایک سو سترہ یا اس سے کچھ زائد قسمیں تھیں اور ساری پیوند تھی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میرا پیوند جب تک ''خاص الخاص'' یا ''ثمر بہشت'' سے نہ ہو ویسے ہی ٹھیک ہوں تو اس کی بڑی جہالت ہوگی۔ اس لئے اگر آج کوئی یہ کہے کہ پہلے خلفاء نہیں رہے جن کے تقدس اور علو مرتبت کا یہ حال تھا اس لئے ہمیں اس خلیفہ کی بیعت کی کیا ضرورت ہے تو ویسا ہی جاہل ہوگا کیونکہ خلفاء آپس میں، مرتبہ میں ویسی ہی کمی بیشی رکھتے ہیں جیسے انبیاء خدا کے نزدیک کمی بیشی رکھتے ہیں۔ فرمایا تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (البقرہ: 254) یہ وہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض دوسروں پر فضیلت بخشی ہے۔ پس کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے رسول ابراہیمؑ کو تو یہ عظمت تھی اس لئے اس کی بیعت کی گئی، اب

میں داؤدؑ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گا ،اب میں اسماعیلؑ کے ہاتھ بیعت نہیں کروں گا،اب میں سلیمانؑ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گا ، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔وقت کے لحاظ سے جو تمہیں نصیب ہے وہ خلافت ہےاور خلافت اگر اپنے آپ کو سنوارنے میں پوری طرح کامیاب نہ بھی ہوسکی ہو اور دعاؤں میں کمی کی وجہ سے یا اپنے نفس کی نگرانی کی وجہ سے اس میں رخنے بھی ہوں تب بھی تمہارے لئے وہی سب سے پاک نمونہ ہے اور اس سے پیوند کے سوا تمہارے لئے چارہ کوئی نہیں ہے۔اگر اس کے پیوند سے منہ موڑو گے تو دنیا میں کہیں کے بھی نہیں رہو گے۔ایک ناپاک اکھڑے ہوئے پودے کی طرح تمہاری مثال ہوجائے گی جس کی جڑیں ایک دفعہ اکھڑ جائیں تو نہ وہ مشرق کا رہتا ہے نہ مغرب کا۔ ہوائیں جس طرف چاہیں اسے اکھاڑ کر لے جاتی ہیں۔پس پیوند لازم ہے اور پیوند بیعت لازم ہے ہاں تمہارا بھی فرض ہے کہ دعائیں کرو کہ جس کے ساتھ پیوند بیعت کرتے ہو اللہ تمہیں پورے اخلاص اور محبت کے ساتھ اس پیوند کے تقاضے پورے کرنے کی توفیق بخشے اور تمہارا بھی فرض ہے کہ دعائیں کرو اللہ اس کو بھی توفیق بخشے کہ وہ خدا کی نظر میں جو اس سے تقاضے کئے جاتے ہیں وہ ان کو پورا کرنے کی توفیق پائے اور اللہ تعالیٰ دن بدن اس کی حالت بہتر کرتا چلا جائے کیونکہ جب اس کی حالت بہتر ہوگی تو تمہاری بھی حالت بہتر ہوگی۔

پس بیعت کر کے عناد اور دشمنی اور طعن و تشنیع کا تعلق جو ہے اس عہد بیعت کو فسخ کر دیتا ہے۔بیعت کے بعد تمہارا بھی فرض ہے اور اس شخص کا بھی فرض ہے جس کی تم بیعت کرتے ہو کہ مسلسل دعاؤں کے ذریعے یہ توفیق مانگتا رہے کہ اللہ تعالیٰ سچی توبہ کی توفیق عطا کرے،ایسی مغفرت کی توفیق عطا فرمائے جس کا دوسرا نام ہجرت ہے،جس کے بعد گناہوں کی ادنیٰ زندگی کی طرف لوٹنے کا دھیان تک دل میں کبھی نہ آئے۔ ہمیشہ کے لئے وہ دھیان وہ تعلق دلوں سے لوٹ کر ایسا نابود ہوجائے جیسا کبھی تھا ہی نہیں۔حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو ہم یقین کرتے ہیں کہ آپ کو ایک صدیقیت کا مقام حاصل تھا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے اس میں یہی ہجرت کا مضمون ہے جو ظاہری طور پر بھی ہوئی اور روحانی لحاظ سے بھی ایسی کامل ہوئی کہ جس کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تحریر میں ہمیں ملتی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بیعت کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خیال یہ تھا کہ چند دن ٹھہریں گے ،استفادہ کریں گے اور پھر واپس چلے جائیں گے۔اس نیت سے آئے کہ گھر بنا رہے تھے وہ ابھی تکمیل کے مراحل کو نہیں پہنچا تھا، دیواریں کچھ کھڑی تھیں، کچھ ابھی بنی نہیں تھیں، کچھ چھتیں پڑ گئیں، کچھ نہیں پڑی تھیں اور ابھی بہت سے کام تھے جوادھورے چھوڑ آئے تھے۔اس نیت سے آئے کہ میں امام سے فیض حاصل کر کے واپس جاؤں گا اور پھر آؤں گا اور پھر جاؤں گا۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب اجازت مانگتے تھے تو حضور فرماتے تھے کچھ دیر ابھی اور ٹھہریں ، پھر کچھ عرصے کے بعد اجازت مانگتے تھے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے ابھی کچھ دیر اور ٹھہریں ۔ یہاں تک کہ ایک دن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اپنے گھر پیغام بھجوادیں کہ آپ نے اپنا یہ وطن بنالیا ہے آپ یہیں کے ہو گئے ہیں ۔حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی کے سوال کے جواب میں یہ بیان فرمایا وہ دن اور آج کا دن یعنی موت تک، آخری وقت تک مجھے اس گھر ،اس وطن کا خیال تک دل میں نہیں آیا۔کوئی دل میں اشارۃً بھی یہ حسرت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ مکان جس کو میں بنا رہا تھا میں اسے مکمل تو کروالوں، کبھی دل میں یہ واہمہ تک نہیں گزرا کہ کاش میں دیکھ تو لوں کہ وہ کیا چیز تھی اور اب بن کے کیسا لگتا ہے۔فرماتے ہیں وہ تو مٹ گئیں چیزیں، وہ ساری یادیں محو ہو گئیں گویا موت کے بعد انسان ایک نئی دنیا میں آ پہنچا ہے۔ یہ وہ ہجرت ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مقبول توبہ قرار دیتے ہیں، یہی وہ عہد بیعت ہے جس کی طرف قرآن ہمیں بلاتا ہے۔

پس جب آپ کو خدا تعالیٰ نے خلافت کی نعمت عطا فرمائی تو اپنے عہد بیعت کو پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ قائم رکھیں اور محبت اور دل کی گہرائی کے تعلق سے یہ تعلق باندھیں اور اس کی حفاظت پر مامور ہو جائیں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں اگر تمہیں اپنی کسی چیز کی قدر نہ ہو تو تم اٹھا کے گھر کے ایک کونے میں پھینک دیتے ہو مگر جو سب سے زیادہ قیمتی چیز ہو دیکھو کتنی کتنی حفاظت کے سامان تم نہیں کرتے ،کیسا کیسا خیال کرتے ہو کہ اس طرف سے بھی خطرہ ہے،اس طرف سے بھی خطرہ ہے۔ ہر خطرے کی راہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہو۔پس یہ عہد بیعت ہے جو سب عزیز چیزوں سے عزیز تر ہے یہ اگر مقبول ہو جائے تو تمہاری اس دنیا کی زندگی بھی مقبول ہے اور تمہاری زندگی یعنی اس دنیا کی زندگی بھی مقبول الٰہی ہو گی اور اس سے بہتر اور کوئی سودا نہیں ہے۔

پس اے پاکستان سے ہجرت کرنے والو! تم جہاں کہیں بھی ہو خواہ جرمنی میں ہو یا فرانس میں یا ہالینڈ یا پولینڈ یا امریکہ یا افریقہ یا دوسرے ممالک میں ہو یاد رکھو ایک ہجرت تو ہوگئی اور اس ہجرت سے جو خدا نے وعدے فرمائے تھے پورے کر دئے۔ تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا کہ اس ہجرت کے نتیجے میں تمہیں تنگیاں نہیں بلکہ وسعتیں عطا کی گئی ہیں اور خدا نے ایک بھی وعدہ نہیں جو ٹال دیا ہو، ہر وعدہ ہجرت کی برکتوں کا تمہارے ساتھ پورا کر دیا۔ پس اب پوری مستعدی کے ساتھ، کامل خلوص کے ساتھ وہ ہجرت کرو جو ہجرت بدیوں کے ملک سے نیکیوں کے ملک کی طرف ہجرت ہوا کرتی ہے لیکن یہ وہ ہجرت ہے جس کے بعد لوٹ کر جانا نہیں ہے، جس کے بعد مڑ کر دیکھنا نہیں ہے کہ کن لوگوں، کن بدلوگوں سے ہم نے نجات پائی ہے، کن دوستوں کو چھوڑا ہے، کن تعلقات سے روگردانی کی ہے، کن عزیز آرام گاہوں کو ہم ترک کر کے آئے ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی مثال میں نے اسی لئے پیش کی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تحریر کے عین مطابق یہ مثال ہے کہ جب چھوڑتے ہو تو بالکل چھوڑ جاؤ اور بھول جاؤ کہ تم کہاں رہا کرتے تھے، کس دنیا میں بستے تھے۔ وہ سب آرام تج کر دو اور ایک نئی زندگی میں داخل ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ جس خدا نے دنیوی ہجرت کے نتیجہ میں اپنے کئے گئے وعدے تمہاری توقعات سے بھی بڑھ کر پورے فرمائے وہ تمہاری روحانی ہجرت کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ تم پر موت نہیں آئے گی جب تک تمہارا دل تسکین سے نہ بھر جائے جب تک وہ سب لذتیں سینکڑوں گنا زیادہ تمہیں عطا نہ کی جائیں جن لذتوں کو خدا کی خاطر تم نے چھوڑا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ ہجرت آپ کریں تو سب دنیا آپ کے ساتھ ہجرت پر تیار ہوگی۔ یہی وہ ہجرت ہے جو انسانی زندگی کا آخری مقصد ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جماعت احمدیہ کے پھیلنے اور نشو ونما کا جماعت احمدیہ کے خلق مہمان نوازی سے ایک گہرا تعلق ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 30 /اگست 1996ء بمقام نوئے فارن، میونخ۔ جرمنی)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

(الزمر: 54)

پھر فرمایا:

یہ آیت جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس تعلق میں میں انشاء اللہ مضمون کو واضح کروں گا اور حضرت اقدس مسیح موعودؑ کے ایک اقتباس کے حوالے سے آپ کو کچھ نصیحتیں کروں گا لیکن سر دست میں اس خطبے کا آغاز جماعت احمدیہ جرمنی کے اس دورے کے تأثرات سے کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ سفر ہر پہلو سے بابرکت رہا اور جماعت احمدیہ جرمنی کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے اور جانچنے کا موقع ملا اور میں بڑے ہی اطمینان کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے حضور جذبات تشکر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ امسال بھی حسب سابق جماعت جرمنی کا قدم میں نے ترقی کی طرف دیکھا ہے اور ہر پہلو سے خدا تعالیٰ کے فضل سے کمزوریاں دور کرنے اور نیا حسن پیدا کرنے کی طرف توجہ مسلسل جاری رہی ہے۔

چنانچہ جلسہ سالانہ میں شرکت کرنے والے جتنے بھی بیرونی مہمان تشریف لائے تھے وہ گواہ

بھی ہیں اور میرے سامنے ذکر بھی کرتے رہے کہ جتنا ہم نے سنا تھا اس سے بہتر پایا اور ہمہ تن مصروف ہو کر، دن رات ایک کر کے جماعت جرمنی نے ہر پہلو سے اتنا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے کہ بعض لوگ کہتے تھے کہ ہم تو رشک سے دیکھتے رہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم بہت بہتر کام کرنے والے ہیں مگر یہاں اس سے بھی بہت اچھا کام دکھائی دیا۔ خاص طور پر اس دفعہ جلسہ سالانہ کی صفائی کا معیار بہت ہی غیر معمولی طور پر بلند تھا اور ساتھ ساتھ صفائی اس طرح جاری تھی کہ صفائی کرنے والے دکھائی نہیں دیتے تھے مگر صفائی دکھائی دیتی تھی اور بڑی ہی خاموشی اور نظم وضبط کے ساتھ غالباً راتوں کو جب مہمان فارغ ہو جاتے تھے اس وقت بھی وہ صفائی کرتے تھے اور دوران جلسہ بھی مسلسل صفائی جاری رہی۔

علاوہ ازیں خدمت کا جہاں تک تعلق ہے بہت بڑی خدمتیں ان کے سپرد تھیں مثلاً بیرونی مہمانوں کے علاوہ جماعت جرمنی میں جو نئے احمدی ہوئے ہیں ان کی خدمت کے تقاضے کافی پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، ان میں افریقن ممالک سے تعلق رکھنے والے بھی تھے، ان میں مشرقی یورپ کے مختلف قوموں کے لوگ بھی تھے اور وہ بھی جو مستقلاً جرمنی میں بستے ہیں لیکن دوسرے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر ایک کا انتظام بہت ہی عمدہ کیا گیا اور جو ٹیم بھی جس کام پر مامور تھی اس نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ بلکہ ذمہ داری سے بڑھ کر دل لگا کر اپنائیت کے ساتھ خدمت کی۔ چنانچہ ہمارے ساتھ جو قافلے کے لوگ مختلف جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے ہر ایک کا یہی تاثر ہے۔

انگلستان میں بھی خدا کے فضل سے خدمت کا معیار بڑھ رہا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مہمانوں کی عزت کی جاتی ہے۔ بہت احترام کے ساتھ، ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جاتا ہے لیکن ایک فرق ہے کہ اکثر وہ مہمان جو انگلستان میں خصوصاً لندن میں جلسے کے دنوں میں ٹھہرتے ہیں وہ زیادہ تر رشتے داریوں کی وجہ سے اور پرانے تعلقات کی بناء پر ٹھہرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے ساتھ جو حسن سلوک ہے وہ محض ایک مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مہمان کے تعلق سے نہیں ہے۔ وہ تعلق نہ بھی ہوتا تو رشتے داروں کی خدمت کرنا ہمارے مشرقی معاشرے کا حصہ ہے اور ایک طبعی ذوق کے ساتھ دونوں طرف لطف اٹھاتے ہوئے یہ خدمتیں کی جاتی ہیں مگر یہاں جو میں تجربہ بیان کر رہا ہوں جن خاندانوں کو ہم نے جن خاندانوں میں ٹھہرایا ان کا کوئی بھی رشتے کا تعلق نہیں تھا۔ بہت سی سیر گاہوں پر بھجوایا وہاں بھی وہ پہلے واقف ہی نہیں تھے، اجنبی تھے

لیکن جس طرح انہوں نے خدمت کی مجھے انہوں نے بتایا کہ بالکل لگتا تھا کہ بہت ہی معزز مہمان آیا ہوا ہے جس کے لئے فرش راہ بن گئے تھے۔ انتظار کرتے کرتے راتیں آنکھوں میں انہوں نے کاٹیں۔ اپنا سب گھر بار ہمیں پیش کر دیا۔ ان کے بچے محبت سے ملے، ان کے بڑوں نے خدمت کی اور تھکے نہیں، ان کے چہرے پر مسلسل بشاشت کے آثار تھے۔ یہ وہ خوبی ہے جس پر اللہ پیار کی نظر ڈالتا ہے۔ پس میں جماعت جرمنی کو مبارکباد دیتا ہوں۔

میں پہلے بھی کئی دفعہ وہ واقعہ بیان کر چکا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک مہمان کی خدمت پر آنحضرت ﷺ کو اللہ نے اطلاع دی اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اللہ آسمان پر ہنس رہا تھا جب وہ خدمت کرنے والے اس رنگ میں خدمت کر رہے تھے اور ایک روایت میں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب وہ مہمان کو یہ بتانے کے لئے کہ گویا ہم بھی کھا رہے ہیں مچا کے مار رہے تھے یعنی چٹخارے جس طرح کھاتے ہوئے انسان بھرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان پر مچا کے مار رہا تھا۔ یہ ایک بہت ہی عظیم اظہار ہے خدا تعالیٰ کا اپنے پیارے بندوں کے ہر حسن پر نگاہ رکھنے کا۔ **نعوذ باللہ من ذالک** اللہ تعالیٰ تو مچا کے نہیں مارا کرتا۔ نہ وہ ہنستا ہے ان معنوں میں جن میں ہم ہنستے ہیں۔ تو یہ انسانی محاورے کی مجبوریاں ہیں اس لئے آنحضرت ﷺ نے بھی ان محاوروں کو استعمال کر کے ایسی زبان میں ہمارے دل کو پیغام دیا کہ دل اللہ کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس سے بہتر اظہار ممکن نہیں تھا۔ پس ہرگز یہ وہم نہ لائیں کہ **نعوذ بالله من ذالک**، اللہ تعالیٰ کوئی بیٹھا آسمان پر کسی کے مچاکوں کے ساتھ مچا کے مارنے لگ جاتا ہے۔ وہ تو وہ خدا ہے جو غریبوں کے ساتھ غریب ہو جاتا ہے، اپنے خدمت کرنے والے بندوں کے ساتھ ان کی خدمتوں میں شامل ہو جاتا ہے، اس کی جو عظمت ہے وہ اس بات میں ہے کہ وہ اپنے ذلیل سے ذلیل بندے پر بھی جھک سکتا ہے اور یہی اس کی عظمت کے اظہار کے قصے ہیں کہ ایک معمولی سی بات کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ اتنے پیار سے شکریہ ادا کرتا ہے ان بندوں کا جو احسانات کے تلے دبے ہوئے ہیں اور وہ احسانات کا شکریہ ادا ہی نہیں کر سکتے۔ تو یہ حسن خدا کی ذات کا ہے۔ اس کی عظمت اور اس کی رفعت اس میں ہے کہ وہ اپنے کمزور سے کمزور بندوں میں بھی جب کوئی اچھی بات دیکھتا ہے تو ان پر جھک جاتا ہے اور ان کو اپنے جھکنے کے ساتھ رفعت بخشتا ہے۔

پس یہ خوبی جو مہمان نوازی کی خوبی ہے اس کے متعلق بھی جیسا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ

کے حوالے سے میں نے آپ کو بتایا ایسی خوبی نہیں ہے جو نظر انداز کی جاتی ہے۔ یہ مشہود خوبی ہے۔اس پر نظر پڑتی ہے آسمان سے،مگر اس کی وجہ للہ ہونی چاہئے۔ورنہ بے شمار مہمان نوازیاں ہیں جو رشتوں کی خاطر، ذاتی محبتوں کی خاطر کی جاتی ہیں، مجبوراً کی جاتی ہیں، دکھاوے کے لئے کی جاتی ہیں، ان کی کوئی قدر آسمان پر نہیں ہوتی۔ مگر جو اللہ کی خاطر کرتا ہے یہ مہمان نوازی زمینی نہیں رہتی بلکہ آسمانی بن جاتی ہے۔ پس یہی بیان مقصود تھا جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی بھی پیار کی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں۔ تو اس حسن خلق کو بڑھائیں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو پانچ بنیادی شاخوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔

اور یہ حیرت انگیز بات ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جماعت کے کارخانے کا ذکر فرماتے ہوئے کہ جو الٰہی کارخانہ قائم فرمایا گیا ہے اس کی پانچ مستقل شاخیں ہیں ان میں ایک مہمان نوازی کو قرار دیا ہے اور یہ ایک پیش گوئی کا رنگ بھی رکھتا تھا کیونکہ جماعت احمدیہ کے پھیلنے اور نشو ونما کا جماعت احمدیہ کے خلق مہمان نوازی سے ایک گہرا تعلق ہے۔ پھر تمام دنیا کو ایک ہاتھ پر جمع کرنے کا جماعت احمدیہ کے خلق مہمان نوازی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ سب دنیا میں جہاں جلسے منائے جاتے ہیں وہاں بسا اوقات خصوصاً ان دنوں جبکہ کثرت سے نئے مہمان تشریف لا رہے ہیں مہمان نوازی کے تقاضے اونچے ہو جاتے ہیں اور ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس زمانے میں جبکہ گنتی کے چند افراد کی آمد آمد تھی ساری جماعت کو ایک عظیم ذمہ داری کے لئے تیار کرنے کی ہدایت فرمائی اور ہدایت کی کہ آنے والے مہمانوں کا خیال رکھنا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خود اتنا خیال تھا کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

ایک وقت قادیان میں ایک دفعہ جلسے کے دنوں میں چند مہمان بھوکے رہ گئے اور ڈاکٹر حشمت اللہ صاحبؓ کے بچوں کی وہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ ان کے بچوں نے مجھے بڑی تفصیل سے وہ دلائل پیش کئے جس سے پتا چلتا ہے کہ اول طور پر ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب گویا مقصود تھے مگر اول طور پر تھے یا ضمناً تھے یہ بحث بے تعلق ہے۔ امر واقعہ یہ ہے وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے اور اس کی انہوں نے گواہی دی، تو وہ مہمان جو چند مہمان تھے جو بغیر کھانے کے سو رہے تھے یا سونے لگے تھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہاماً فرمایا **اطعموا الجائع والمعتر** کہ جو بھوکا ہے اور

تکلیف میں مبتلا ہے اس کو کھانا کھلا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام بے قراری سے باہر آ گئے رات کو اٹھ کے اعلان کروایا کہ گلیوں میں اعلان کر دو کون ہے جو بھوکا ہے اسے کھانا کھلایا جائے اور راتوں کو اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو کھانا پیش کیا گیا۔

تو مہمان نوازی کی جو میں تعریف کر رہا ہوں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جماعت احمدیہ کے ساتھ اس کا بہت گہرا تعلق ہے اور ہمارے مستقبل سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ مہمان نوازی کے ذریعے ہی ہم نے لوگوں کے دل جیتنے ہیں اور ہر جلسے پر، ہر اجتماع پر خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جماعت احمدیہ پہلے سے بہتر مہمان نواز بنتی چلی جا رہی ہے۔ یہ جو دوسرا پہلو ہے اور یہ بھی زیادہ شکر کے لائق ہے۔ ورنہ لوگ مہمان نوازیاں کرتے تو ہیں چند دنوں کے بعد، چند مہینوں کے بعد، چند سالوں کے بعد تھک جاتے ہیں۔ مگر آج خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ سو سال سے زائد عرصہ گزر گیا لیکن جماعت نہ تھکی، نہ ماندہ ہوئی بلکہ ہر سال پہلے سے بڑھ کر اس میں مہمان نوازی کے اخلاق سنورتے رہے اور زیادہ روشن اور صیقل ہوتے رہے۔ پس اس اعلیٰ خلق کی حفاظت کریں۔

ساری دنیا میں چونکہ یہ جمعہ نشر ہو رہا ہے اس لئے آپ کی جماعت جرمنی کے حوالے سے میں ان سب کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرة:149) تمہارے لئے خدا تعالیٰ نے ایک مطمح نظر بنا دیا ہے لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا ہر ایک کے لئے ایک مطمح ہے، ایک دوڑ کا نشانہ ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ پس تمہارے لئے دوڑ کا نشانہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ تمام خوبیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ پس امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جماعت کو اس پہلو سے بھی اپنی ذمہ داریوں کو صرف ذمہ داریاں سمجھ کر ادا کرنے کی توفیق نہیں بخشے گا بلکہ محبت کے ساتھ ان فرائض کو ادا کرنے کی توفیق بخشے گا۔ دل ڈال کر، اپنی روح ڈال کر یہ خدمتوں کی توفیق بخشے گا کیونکہ اگر یہ خدمتیں دل اور روح کے ساتھ کی جائیں تو پھر بوجھ نہیں بنتیں، پھر لطف بن جاتی ہیں۔ تو جو کام لمبے ہوں جو لیکھے لمبے ہوں ان میں ایسی محنت جو بوجھ بن جائے وہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتی۔ پس ہماری بقاء کا راز اس میں ہے، ہمیشہ کے لئے اپنی نیکیوں کو قائم رکھنے کا راز یہ ہے کہ نیکیوں سے محبت کریں اور محبت کے ساتھ ان باتوں کو سرانجام دیں اس کے نتیجے میں کوئی بوجھ، بوجھ نہیں رہے گا بلکہ زندگی کا ایک لطف بن جائے گا اور یہی بڑی وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے جماعت

احمدیہ جرمنی کو خدا یہ توفیق بخش رہا ہے۔ جب بعض ان میں سے مجھے ملے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا آپ کے متعلق بہت اچھی رپورٹ ملی تو انہوں نے کہا کس بات کا شکریہ۔ ہمیں تو بڑا ہی لطف آیا ہے، مزہ آ گیا، زندگی کے بہترین دن تھے۔ تو چونکہ دل ڈال کر خدمت کی جائے تو وہ مصیبت نہیں بنتی بلکہ خود اپنی جزا بن جاتی ہے۔ وہی خدمت انسان کو وہ لطف عطا کر دیتی ہے جو اس خدمت کو ہمیشگی بخش جاتا ہے۔

پس تمام دنیا کی جماعتوں کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ اس پہلو سے وہ اپنے مہمانوں کے لئے، آنے والے مہمانوں کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں اور ان آنے والے مہمانوں میں سب سے زیادہ اہم مہمان اس وقت نومبائعین ہیں۔ نومبائعین کا اب سلسلہ ایسا بڑھ چکا ہے کہ ان کے لئے ہمیں وسیع تر انتظامات کرنے ہوں گے۔ اب انفرادی کوشش پر ان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اگر اتفاقات پر ان کو چھوڑ دیں گے، انفرادی کوشش پر چھوڑ دیں گے تو ایک بھاری تعداد ان میں سے ایسی رہ جائے گی جن کو پوچھنے والا، دیکھنے والا کوئی نہیں رہے گا اور اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں جو تالیفِ قلب کی ہدایت دیتا ہے، مؤلّفة القلوب بیان کرتا ہے ان لوگوں کو، یہ وہ لوگ ہیں جو ابتدائی دور میں اگر محبت پا لیں تو ہمیشہ کے لئے آپ کے ہو جائیں گے۔ اگر ابتدائی دور میں ان سے سرد مہری کا سلوک ہو اور ان کا کوئی نہ ہو جو انہیں اپنا سکے اور سینے سے لگا سکے تو بعید نہیں ہوتا کہ یہ لوگ آہستہ آہستہ سرک یا پیچھے ہٹ جائیں یا اپنی ایک بے عملی کی سی حالت میں ٹھنڈے پڑ جائیں اور جیسے لوہا گرم ہو تو اس وقت اسے شکلیں عطا کی جاتی ہیں اور ٹھنڈا ہو جائے تو وہ شکلیں قبول کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ پس یہی دور ہے جبکہ آپ کی مہمان نوازی کا خلق ایک ایسے اجتماعی رنگ میں ان آنے والے مہمانوں کے دل جیتنے والا بنے جس کے ساتھ منصوبہ ضروری ہے۔ پس تمام جماعتوں کو اس پہلو سے منصوبہ بنانا چاہئے کہ کثرت سے آنے والے نئے احمدیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہے جسے جماعت احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مہمان کے طور پر سر آنکھوں پر نہ لے اور جس کی خدمت ایک دلی جذبے سے نہ کرے۔ یہ کچھ دیر کی بات ہے۔ یہ مہمان وہ ہیں جو چند دنوں میں میزبان بننے والے ہیں۔ اگر پہلی زندگی کے چند مہینوں کے تجربے میں یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کے تجربے میں یہ آپ کے حسنِ خلق سے متأثر ہو گئے، آپ نے ان کی خدمتیں کیں تو ان میں ایسے پیدا ہوں گے جو آپ سے بڑھ کر خدمت کرنے والے ہوں گے اور آنے والے وقتوں کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو یہ آپ کے ساتھ شانہ بشانہ

مل کر پورے کریں گے۔ پس ہر پہلو سے یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے کہ ہم اپنی مہمان نوازی کے خلق کو انفرادی طور پر بھی بڑھائیں اور اجتماعی طور پر بھی ایسا منظّم کریں کہ اس کے نتیجے میں آئندہ صدیوں میں جو پھیلے ہوئے تقاضے ہیں ان کو ہم بہترین رنگ میں پورا کرنے والے ہوں۔

اب میں آپ کو اس آیت کریمہ کے حوالے سے کچھ باتیں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کہہ دے يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کئے ہیں لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اللہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ تمام تر گناہوں کو بخش دے کوئی بھی باقی نہ چھوڑے اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ یقیناً وہ وہی ہے جو بہت بخشنے والا اور بار بار رحم فرمانے والا ہے۔

اس مضمون کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ گزشتہ دنوں میں جب میں آپ کو تقویٰ کی طرف بلانے اور آنحضرت ﷺ کی پیروی کرنے کی نصیحت کرتا رہا ہوں اور شرک سے کلیۃً پاک ہونے کے متعلق آپ کو سمجھاتا رہا ہوں تو بعض دلوں میں ممکن ہے بے حد خوف پیدا ہو گیا ہو اور بعض نے دبی زبان سے مجھ سے اظہار بھی کیا کہ اگر نیکی کے یہ تقاضے ہیں اور اتنی بلندیاں ہیں جنہیں ہم نے طے کرنا ہے اور بعض صورتوں میں ادنیٰ لغزش بھی ہمیں ہلاک کر سکتی ہے۔ اگر ہم روزمرہ کی زندگی میں ایک مشرکانہ حالت میں سانس لے رہے ہیں اور بسا اوقات سمجھے بغیر خدا کی محبت کے مقابل پر دنیا کی محبتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کو دین کے مقابل پر برتر سمجھتے ہیں، اس کو اولیّت دیتے ہیں تو ہمارا بنے گا کیا؟ یہ چیزیں تو وہ ہیں جو ہمیں روزمرہ دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ نشان دہی کی جاتی ہے تو پھر کچھ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے لیکن نظر کا ہر روشنی کے درجے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا محنت چاہتا ہے، یکدم نہیں ہوا کرتا۔ آپ باہر سے کسی اندھیرے کمرے میں آئیں تو کچھ دیر کے لئے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہوتا پھر رفتہ رفتہ ایک مدھم سی روشنی ابھرتی ہے وہ پھیل جاتی ہے۔ دراصل آپ کی روشنی دیکھنے کی صلاحیت بڑھتی ہے مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کمرہ جو بالکل اندھیرا تھا اس میں کہیں سے رفتہ رفتہ چھن چھن کر روشنی آ رہی ہے اور وہ کمرہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ تو انسان جب توجہ

کرتا ہے اور محنت کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی دیکھنے کی صلاحیت کو روشنی بخشتا ہے۔اس کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے، کہیں باہر سے اور کوئی روشنی نہیں آرہی ہوتی اس وقت لیکن وہ لوگ جن کی بصیرت خدا بڑھاتا ہے پھر بسا اوقات ان کے لئے مزید نور کا بھی سامان کرتا ہے۔ چنانچہ دونوں طرف سے یہ سلسلہ اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ دیکھنے کی طاقت بڑھتی ہے اور اس کی مدد کے لئے آسمان سے نور بھی اترتا رہتا ہے اور قرآن کریم نے یہی دوسلسلے ہیں جن کا ذکر فرمایا ہے کہ اس طرح انسان رفتہ رفتہ نور کی جانب قدم بڑھاتا ہے اور دنیا میں کوئی خدا کے نور کا مظہر ہے تو محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پس اس پہلو سے جب میں آپ سے کہتا ہوں کہ نور کی جانب قدم بڑھائیں تو آنحضرت ﷺ ہی ہمیشہ پیش نظر ہوتے ہیں لیکن نور تک رسائی بہت مشکل ہے سوائے اس کے کہ نور آپ تک پہنچ جائے۔ یہ مضمون بہت پیچیدہ اور باریک ہے مگر اس کا سمجھانا لازم ہے۔ جب آپ کو یہ مضمون سمجھاؤں گا تو پیچیدہ نہیں رہے گا، بالکل صاف دکھائی دینے لگے گا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی مضمون کو ہمارے لئے خود واضح فرمایا ہے۔اہمیت بھی روشن کی ہے اور ساتھ یہ بھی سمجھایا ہے کہ کس طرح مایوس ہوئے بغیر ہمیں رفتہ رفتہ ترقی کرنی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

”۔۔۔نہایت ہی بدقسمت ہے وہ انسان جو حق کی طلب میں نکلے اور پھر حسن ظن سے کام نہ لے۔۔۔“

یعنی نیت یہ کر کے نکلے کہ میں نے حق کو تلاش کرنا ہے یا حق تک پہنچنا ہے ”اور پھر حسن ظن سے کام نہ لے“۔ یہاں حسن ظن کا کیا معنی ہے؟ فرماتے ہیں ”ایک گل گو ہی کو دیکھو کہ اس کو مٹی کا برتن بنانے میں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے“۔یعنی وہ جو مٹی کے برتن بنا رہا ہے اس کو کبھی آپ غور سے دیکھیں اور کئی دفعہ میں نے بھی دیکھا ہے اور بہت ہی دلچسپ نظارہ ہوتا ہے وہ بہت ہی جاذب نظر چیز ہے ۔کس طرح ایک مٹی کے گولے کو مختلف شکلوں میں ڈھالتا، اچانک اس کے اندر سوراخ پیدا کرنا پھر اردگرد وہ نقوش بھرنا۔ سکاٹ لینڈ ایک دفعہ ہم گئے تو وہاں رستے میں مٹی کے برتن بنانے والے بہت بڑے ماہرین تھے تو وہاں کھڑے ہو کر دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ اس نظارے کو چھوڑ کر آگے جائیں۔ ربوہ میں ہمارے ایک مٹی کے برتن بنانے والے تھے ان کے ہاں بھی کئی دفعہ سائیکل پہ

جاتے جاتے میں ٹھہر جایا کرتا تھا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہی مثال دی ہے جو حسن اتفاق سے میرے دل پر پہلے ہی بہت اثر انداز ہو چکی ہے۔فرماتے ہیں مٹی کے برتن بنانے والے کو دیکھو۔اس مثال کا انسان کی ذات سے بھی ایک تعلق ہے کیونکہ انسان مٹی سے بنا ہوا ہے اور مٹی سے ایک برتن بنانے والا اس پر جو محنت کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان پر اس سے بہت زیادہ محنت کی ہوئی ہے۔کوئی نسبت ہی نہیں اس مٹی سے برتن بنانے والے کی اس خالق ازلی سے۔اس کے ساتھ اس کی کوئی نسبت نہیں جس نے ابتدائے آفرینش سے انسان کی تخلیق کا نقشہ بنایا اور مٹی ہی کو مختلف رنگ میں ترقی دیتے دیتے زندگی کی منازل میں داخل کر دیا۔اب یہ مضمون اتنا وسیع ہے کہ ساری دنیا میں بے شمار سائنس دان اس مضمون کی کھوج میں وقف ہیں لیکن اس کی کنہہ کو نہیں پا سکے اور اقرار کرتے ہیں کہ ایک جگہ پہنچ کر گویا آگے ایک چٹان آ کھڑی ہوتی ہے اور آگے راستہ نہیں ملتا۔جو راز معلوم کرتے ہیں کچھ دیر کے بعد پتا چلتا ہے کہ یہ راز معلوم نہیں ہوئے تھے بلکہ ایک معمہ معلوم ہوا تھا جو اتنے اور راز ہمارے سامنے،ان کھلے راز،وہ راز جو سربستہ ہوں وہ راز لے کے آیا ہے کہ جسے ہم حل سمجھ رہے تھے وہ تو ایک معمہ بن گیا اور یہ جو میں آپ سے بات کہہ رہا ہوں علم کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔میں جانتا ہوں ان سائنس دانوں کو جنہوں نے بعض بڑی بڑی دریافتیں کیں اور بڑے فخر سے اعلان بھی کر دیا کہ اب ہم زندگی کی ابتداء کا راز سمجھ گئے ہیں اور ساری دنیا نے ان کو بہت اٹھایا اور بڑھایا کہ یہ وہ شخص پیدا ہوا ہے جس نے زندگی کی ابتداء کا راز معلوم کر لیا۔دس پندرہ سال بعد وہی سائنس دان یہ کہتا ہے کہ بڑی ہی ناسمجھی تھی جو یہ اعلان ہوا،کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔جس کو ہم زندگی کے آغاز کا راز سمجھے تھے وہ تو ایک ایسا معمہ نکلا ہے جو پیچ در پیچ اور بھی اپنے خم میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں سمجھ سکتے۔پس یہ وہ کائنات کا خدا ہے جس نے مٹی سے انسان بنایا ہے اور وہ مٹی کا بنا ہوا انسان خود اپنی حقیقت کو نہیں سمجھ سکا،نہ سمجھ سکتا ہے۔وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں دیکھوں تو سہی مجھے کیسے بنایا گیا ہے لیکن بہت دیر کے بعد اسے یہ ہوش آئی ہے۔آج وہ مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے کہ چار ارب سال پہلے یا ساڑھے چار ارب سال پہلے اس مٹی سے میرا خمیر کیسے اٹھایا گیا تھا۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے آثار کو بھی آج تک باقی رکھا ہے اور ساری جو کہانی ہے انسانی ارتقاء کی وہ ایسی جگہوں پر مرتسم کر دی ہے،نقش کر دی ہے کہ آج تک وہ آثار پڑھے جا سکتے ہیں

اگر بصیرت ہو۔تو بصیرت کے ساتھ ساتھ روشنی بڑھتی ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے اور وہ آثار جو پہلے دکھائی نہیں دیتے تھے دکھائی دینے لگتے ہیں۔مگر اس کے باوجود وہ ایک جگہ پہنچ کر اندھے کے اندھے رہ جاتے ہیں کیونکہ آسمان سے نور نہیں ان پر اترتا اور جب تک آسمان سے نور نہ اترے انسانی بصیرت کی ترقی اسے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔دنیا کے چند راز اس کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن اصلِ الحقیقت اس پہ نہیں کھلتی۔وہ گہری بنیادی حقیقت جو تخلیق کائنات میں موجود ہے وہ اسے پوری طرح دکھائی نہیں دیتی۔خدا تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتا ہے اور پہنچ نہیں سکتا۔پس اس پہلو سے ایک مومن کی بصیرت اور غیر مومن کی بصیرت میں ایک فرق ہے۔مومن کی بصیرت کے ساتھ آسمان پر سے نور اترتا ہے اور وہ نور اس کو وہ روشنی عطا کرتا ہے جو دنیا کی محنت کرنے والوں کو نصیب نہیں ہوتا۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گل گوہی کی مثال ہمارے سامنے رکھی کہ گل گوہی کو دیکھو وہ کیسے مٹی کے برتن بناتا ہے اور حسن ظن کا مضمون یہ ہے کہ وہ ایک مٹی کے گولے کو پکڑتا ہے اور یہ حسن ظن رکھتا ہے کہ اس سے یہ کچھ بن جائے گا جو میں بنانا چاہتا ہوں اور تھکتا نہیں۔وہ مختلف شکلیں دیتا ہے اور لگا رہتا ہے اس کو مزید خوبصورت شکلوں میں ڈھالنے میں اور یقین رکھتا ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔پس مومن جس کے پیچھے خدا تعالیٰ کی مٹی کی تشکیل ایک عظیم تاریخ کے طور پر موجود ہے وہ کیسے مایوس ہوگا۔اگر وہ مایوس ہوگا تو وہ اس روزمرّہ کے پتھیرے سے بھی ذلیل اور بدتر ہو جائے گا جو صرف اینٹیں ہی بناتا ہے۔خود جو مٹی کا بنا ہوا ایک شاہکار ہو وہ اپنی تشکیل سے مایوس ہو جائے ،حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔مگر اگر آپ بنا کے دیکھنا چاہیں تو اینٹ بھی نہیں پتھی جا سکتی۔پہلی دفعہ آپ کوشش کر کے دیکھیں وہ چار کونوں کی اینٹ کی بجائے یا چار اوپر اور چار نیچے کے آٹھ کونوں کی اینٹ کی بجائے وہ چالیس پچاس کونوں کی اینٹ بن جائے گی اور بعض دفعہ اینٹ کی بجائے تھوبا بن جائے گا۔تو محنت کرنی پڑتی ہے اور یہ حسن ظن ہو کہ محنت کام آئے گی تو پھر انسان حقیقت میں ترقی کر سکتا ہے،اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر گنہگار کو،ہر اس شخص کو جو خدا کی راہ میں آگے قدم بڑھانا چاہتا ہے دیکھیں کیسی پیاری پیاری مثالیں دے کر سہارا دے رہے ہیں۔فرمایا حسن ظن سے کام لو،محنت کرنی ہوگی،وقت لگے گا بعض چیزیں ایک دم ہاتھ نہیں آیا کرتیں رفتہ رفتہ ہوگا۔

چنانچہ فرماتے ہیں ’’دھوبی ہی کو دیکھو کہ وہ ایک ناپاک اور میلے کچیلے کپڑے جب صاف کرنے لگتا ہے تو کس قدر کام اس کو کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی کپڑے کو بھٹی پر چڑھاتا ہے، کبھی اس کو صابن لگاتا ہے، کبھی اس کی میل کچیل کو مختلف تدبیروں سے نکالتا ہے‘‘۔ یہ دھوبی کی مثال بھی بہت ہی برمحل ہے کیونکہ انسان اپنے صاف ستھرے لباس کو داغ دار کر لیتا ہے اور خود کر لیتا ہے۔ جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو گویا گل گوہی نے اس شکل میں ڈھال دیا جس شکل میں ڈھالنا اس کو مقصود تھا۔ بے داغ، پاک صاف، معصوم ایک صحت مند بچہ ماں کے پیٹ سے جنم لیتا ہے اور جوں جوں انسان کے زیر اثر آتا چلا جاتا ہے اس کی معصومیت داغ دار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کپڑے کی طرح جسے آپ پہلی دفعہ نیا سمجھ کر پہنتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس پہ دھبے ڈال دیتے ہیں، کئی طرح کے اس پہ نشان پڑ جاتے ہیں اسی طرح وہ بچہ بھی پھر گندہ ہونے لگتا ہے لیکن بہت سے ایسے داغ ہیں جو محنت کے ساتھ دھل جاتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پہلے انہی داغوں کی مثال دے رہے ہیں۔ اب دھوبی کو دیکھیں وہ بھی صبح صبح اٹھ کر جاتا ہے اور بعض دفعہ تالابوں کے کنارے، بعض دفعہ ہم جہاں قادیان میں ہوتے تھے تو دھوبی ڈھاب پر پہنچا کرتے تھے اور صبح سیر کے وقت کئی دفعہ ان کو دیکھ کر وہیں پاؤں جم جایا کرتے تھے کہ دیکھیں کیا کر رہے ہیں۔ وہ کپڑوں کی ایک ڈھیری لے کے آتے تھے جسے پہلے ساری رات وہ سوڈے والے پانی میں ابالتے تھے اور ابالنے کے باوجود اگر اسے عام اسی حالت میں دھولیں تو پھر بھی داغ نہیں اترا کرتے۔ چنانچہ وہ ان کپڑوں کو پٹختا تھا اور مختلف جگہ ان دھوبیوں نے اپنے اپنے پتھر بنا رکھے تھے یا پتھر اپنا رکھے تھے۔ بنی بنائی پتھریلی جگہیں تھیں اور پھر وہ ساتھ ’’چھوا چھو‘‘ کی آوازیں نکالتا تھا اور ہر دفعہ اس کپڑے کو پٹختا تھا پتھر کے اوپر اور ’’چھوا چھو، چھوا چھو‘‘ سارے ڈھاب کے کنارے پر ’’چھوا چھو‘‘ کے گیت اٹھ رہے ہوتے تھے اور بڑا دلچسپ نظارہ تھا مگر بڑی محنت کرتا تھا وہ اور بار بار پتھر پر پٹخنے سے پھر وہ داغ کپڑے کو چھوڑ دیتے تھے۔

تو گناہوں کے داغوں کی بھی تو ایسی ہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ کچھ ہلکے اور کچے داغ ہوتے ہیں۔ کچھ کو تو ٹھنڈے پانی سے دھو کر اسی وقت مل دیں تو وہ اتر بھی جاتے ہیں۔ تازہ گناہوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ داغ جتنا پرانا ہوتا جائے اتنا ہی اس کا دور کرنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ پس اس

مضمون کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان میں سمجھیں تو آپ کو بہت سے معرفت کے راز ہاتھ آئیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو خدا نے جس مٹی سے تشکیل دیا ہے وہ ایک ایسا شاہکار ہے کہ اس کا عام انسان بلکہ بڑے سے بڑا سائنس دان بھی تصور نہیں کر سکتا کہ کتنا عظیم شاہکار ہے۔ اس کو تشکیل کے بعد پھر آپ گندا کرنے لگتے ہیں۔ اس کی شکلیں بدلنے لگتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا مکروہ ہو جاتا ہے کہ پہچانا ہی نہیں جاتا کہ کس ہاتھ کا بنا ہوا تھا اور پھر اس کو داغ دار کرنے لگتے ہیں۔ تو جیسے کپڑا داغ دار ہو کر جب پرانا ہو جائے تو پھر وہ داغ نہیں مٹتے، کپڑا مٹ جاتا ہے مگر داغ نہیں مٹتے۔ وہی حال انسان کا ہے۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ دھوبی سے بھی نصیحت پکڑو۔ وہ دیکھو کتنی محنت کرتا ہے کپڑوں کے داغ دھونے پر اور اگر دیر تک وہ کپڑا دھوبی کے جائے ہی نہ، اگر اس پر محنت کی ہی نہ جائے تو ایسے کپڑے کے داغ پھر بعض دفعہ اس کا ہمیشہ کے لئے جز بن جاتے ہیں اور ان کا مٹنا اور مٹانا ایک امر محال دکھائی دیتا ہے۔ مگر انسان کے لئے اس صورت میں بھی کسی مایوسی کا کوئی مقام نہیں کیونکہ یہ آیت کریمہ یہی بتا رہی ہے کہ اے محمد ﷺ! یہ اعلان کر دے کہ اے میرے بندو! اور یہاں بندوں کا جو حوالہ ہے رسول اللہ ﷺ اپنی طرف دے رہے ہیں۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ تو کہہ دے اے میرے بندو یعنی جو خدا کے عباد میں داخل ہو چکے ہو اور میری غلامی قبول کر چکے ہو، تم میرا دامن تھام چکے ہو اور یہ فیصلہ کر چکے ہو کہ میرے پیچھے چلو گے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میرا رب اتنا عظیم ہے کہ وہ ہر گناہ کو بخشنے کی طاقت رکھتا ہے اور وہی ہے جو گناہوں کو بخشنے کی طاقت رکھتا ہے اور پھر رحیم بھی ہے جو گناہ بخشنے کے بعد پھر بار بار رحم لے کر آتا ہے اور ترقی کے مثبت دور میں داخل فرما دیتا ہے۔

پس اس پہلو سے جب آپ اس مثال کو سامنے رکھیں تو اول تو یاد رکھیں کہ جتنی دیر تک آپ اپنے گناہوں پر راضی رہیں گے اور ان کے خلاف جدوجہد کا آغاز نہیں کریں گے اتنا ہی آپ کے لئے ان کو دور کرنا مشکل، دوبھر یہاں تک کہ ایک وقت میں ناممکن ہو جائے گا یعنی انسانی کوششوں کے بس کی بات نہیں رہے گی۔ پھر آسمان ہی سے کوئی فضل نازل ہو تو ان کو دور کر سکتا ہے ورنہ زندگی بھر پھر آپ کو انہی داغوں میں رہنا ہوگا، انہی داغوں میں دفن ہونا پڑے گا۔ پس اس پہلو سے توجہ کریں کہ

اگر چہ سفر بہت لمبا ہے اور کمزوریاں بہت زیادہ ہیں مگر مٹانے کا سفر شروع ہو جانا چاہئے یعنی داغوں کو مٹانے کا سفر لازماً شروع ہو جانا چاہئے اور جتنی توفیق ملتی ہے اپنا جائزہ لے کر انصاف کی نظر سے، تقویٰ کی نظر سے یہ دیکھیں کہ آپ میں کہاں کہاں، کیا کیا خامیاں ہیں اور کچھ کو آپ پکڑ لیں۔ کچھ کو پکڑ کے فیصلہ کر لیں کہ ان کو تو میں لازماً چھوڑ کے رہوں گا اور پھر دعا کریں۔ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ راز سکھایا ہے کہ پھر اللہ سے مدد مانگنا کیونکہ اس کے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ صبر کے ذریعے یعنی اس حسن ظن کے ذریعے کہ یہ داغ مٹ جائیں گے اور پھر اس کوشش پر ہمیشہ قائم رہتے ہوئے وَالصَّلٰوةِ اور عبادت کے ذریعے نمازیں پڑھ پڑھ کے خدا سے مدد مانگتے رہو اور ان داغوں کو مٹا کے چھوڑو جو بدزیب لگتے ہیں اور آپ کی نظر کو بھی برے لگتے ہیں۔ یہ وہ داغ ہیں جو بعد میں پڑے ہیں، جو ابھی نئے ہیں، ابھی آپ ان کو پہچانتے ہیں کہ بری باتیں ہیں تو آپ سمجھیں گے کہ یہ جو نئے نئے داغ مجھے دکھائی دے رہے ہیں ان کو صاف کر کے میں کام سے فارغ ہو جاؤں گا لیکن جب آپ ان داغوں کو دور کریں گے تو آپ کو دکھائی دے گا کہ ان کے نیچے چھپے ہوئے داغ اور بھی زیادہ بدزیب تھے بدصورت تھے اور زیادہ پکے ہو چکے ہیں۔ تو اگر سفید کپڑے کے اوپر چند داغ ہوں تو اس کا مٹانا یعنی دھوبی کی طرح اس کو پٹخ پٹخ کر پتھروں پر یا ابال ابال کر ان کا صاف کرنا نسبتاً بہت زیادہ آسان کام ہے۔ مگر انسان کے معاملے میں یہ داغ کی تہیں ہیں جو تہہ بہ تہہ جمتی چلی جاتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ اوپر کی تہہ نیچے کے داغوں کو دیکھنے بھی نہیں دیتی۔ انسان کی نظر ان تازہ داغوں پر ہوتی ہے جو ابھی ابھی کل پرسوں کی بات ہے کہ وہ ان گناہوں میں مبتلا ہوا اور اس کی وجہ سے اسے وہ داغ دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی نئی بدتمیزی سیکھی ہے انسان نے تو کچھ دن تک نظر آتی ہے کہ ہاں یہ میں نے ایک نئی بدتمیزی سیکھی ہے اور جب وہ اس کو مٹا لے گا تو اس کی نظافت کا معیار بلند ہو جائے گا اور اس معیار کی بلندی کے نتیجے میں اس کو وہ بصیرت عطا ہوگی جس کا ذکر میں نے کمرے کے حوالے سے کیا تھا یعنی نظر کو عادت پڑ جائے گی داغ دیکھنے کی اور وہ داغ جو پہلے دکھائی نہیں دیتے تھے اب ان مٹتے ہوئے داغوں کے نیچے دیکھیں گے تو آپ کہیں گے ابھی تو بہت کچھ باقی ہے اور ان کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کے لئے پھر صبر اور صلوٰۃ کی ضرورت ہے۔ بہت استقامت کے ساتھ اس عزم پیہم یا عزم صمیم کے

ساتھ کہ آپ چھوڑیں گے نہیں جب تک ان داغوں کو مٹا نہیں لیں گے جب آپ خدا کی طرف متوجہ ہوں گے دعائیں کریں گے صبر سے کام لیں گے تو ایک ایسا بھی وقت آئے گا کہ آپ ان خوش نصیبوں میں داخل ہو جائیں گے جن کے کچھ پرانے داغ بھی مٹ گئے اور ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور پھر ایک اور داغوں کی منزل ہے، داغ دیکھنے کی منزل ہے جو سامنے آ کھڑی ہوگی ۔غرضیکہ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ غیر معمولی طور پر کسی کو توفیق بخشے اور وہ اس دنیا میں صدیقوں میں داخل ہو جائے ورنہ صالحیت کا سفر ہی طے نہیں ہوتا اور بسا اوقات انسان صالحیت کے جھگڑے حل کرتے کرتے ہی مرجاتا ہے۔مگر اگر صالحیت کی منزل پر بھی مرجائے تب بھی وہ خوش نصیب ہے کیونکہ وہ اس گروہ میں داخل ہوجائے گا۔مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء: 70) تو صالحیت کا سفر بھی بہت لمبا سفر ہے یہ جب داغ مٹیں گے تو پھر اور، پھر اور، پھر اور لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور سفر بھی شروع ہو جائے گا جو خوبیوں کا حاصل کرنے کا سفر ہے ۔ ہر مٹتے ہوئے داغ کے ساتھ ایک خوبصورتی ہے جو آپ کو عطا ہوگی ۔اللہ تعالیٰ کا حسن مثبت صورت میں آپ کو دکھائی دے گا، آپ کو اس سے محبت ہوگی، آپ اسے اپنائیں گے تو داغوں کا مٹنے کا سفر اپنے ساتھ حسن کو اختیار کرنے کے سفر کو بھی رکھتا ہے اور بیک وقت یہ دونوں چیزیں پہلو بہ پہلو جاری رہتی ہیں ۔اس جدوجہد میں داخل ہونا ہی حقیقی جہاد ہے اور اس جدوجہد میں پڑنے کے بعد جماعت احمدیہ کو اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت بخشے گا کہ وہ بہت جلد سب دنیا پر غالب آ جائے گی ۔ جب تک غالب آنے کے لئے سلیقے معلوم نہ ہوں وہ تربیت نہ ہو جس تربیت کے گزرنے کے بعد ایک سپاہی بنتا ہے اور خدا کا سپاہی بننا عام سپاہی بننے سے بہت زیادہ مشکل کام ہے ۔آسان ان معنوں میں تو ہے کہ جس حالت میں بھی ہے خدا قبول فرمالیتا ہے کہتا ہے جو کچھ ہے لے کر داخل ہو جاؤ لیکن مشکل ان معنوں میں کہ اس سپاہی کے بننے کے تقاضے پورے کرنا عام دنیا کے سپاہی بننے کے تقاضوں سے بہت زیادہ سخت ہوتے ہیں ۔دنیا میں جتنی بھی بڑی بڑی قومیں سپاہیوں کی تربیت کرتی ہیں انہوں نے سالوں پہ معیار بنا رکھے ہیں کہ بعض قوموں میں تین سال تک سپاہی کی تربیت کافی ہوتی ہے اور بعض اس کو چار یا پانچ سال تک لے جاتے ہیں ۔تو پانچ سالہ تربیت عموماً امریکہ میں مثلاً سپاہی تیار کرتے وقت دی جاتی ہے اور یورپ میں بھی غالباً یہی

معیار ہوگا اور پھر ان میں سے جن کو آگے بڑھانا ہو ان کی تربیت کے سال اور لمبے ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا کے سپاہی بننے میں یہ عجیب بات ہے کہ جنگ میں داخل تو آپ کو فوراً کر لیا جاتا ہے لیکن تربیت کا دور آخری سانس تک جاری رہتا ہے کیونکہ کام بہت وسیع ہیں اور ممکن نہیں کہ انسان ان تقاضوں کو پورا کر سکے اور وقت کی کمی تقاضا کرتی ہے کہ جلدی سپاہی پیش کرو۔ تو کچے پکے جتنے بھی سپاہی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر میری خاطر تم آتے ہو تو آجاؤ میں تمہیں اپنی فوج میں داخل کرتا ہوں لیکن شرط ہے کہ ساتھ ساتھ سیکھنا ضرور ہوگا اور اپنا معیار ضرور بلند کرنا ہوگا۔

پس موت تک جو ہم سپاہی بنتے ہیں اکثر صورتوں میں اور بڑی بھاری اکثریت کی صورتوں میں ہم صالح بننے کی ٹریننگ حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ صالح ہو جائیں اور صالح بننا جس کو نصیب ہو جائے ایسی حالت میں کہ جب وہ مرے تو اللہ تعالیٰ فرمائے کہ یہ صالحین میں تھا اور صالحین کی جماعت میں اس نے دم توڑا ہے یہ بہت ہی بڑا اعزاز ہے کیونکہ صالحیت کا لقب نجات کا لقب ہے۔ جس کو خدا صالح قرار دے دے وہ نجات پا گیا اور مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ میں جو خدا تعالیٰ نے مَعَ کا لقب رکھا ہے پہلے مِّنَ نہیں رکھا اس کی ایک بڑی حکمت یہ ہے تا کہ ان کو نبیوں کا ساتھ نصیب ہو سکے۔ ہر ایک تو من النبین نہیں ہوسکتا ہر ایک تو من الصدیقین نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک تو من الشھدآء نہیں ہوسکتا پس وہ صالح کیا کریں گے جو سب سے نچلی منزل پر بیٹھے رہے یا چلتے چلتے ایسی حالت میں دم توڑ دیا کہ ابھی وہ ابتدائی منزل پر ہی تھے۔ کیا ان کو ان بلند تر وجودوں کا ساتھ نصیب نہیں ہوگا؟

پس پہلا مَعَ یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ مبارک ہو تمہیں کہ تم اب انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ شمار ہو گے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبہ: 119) میں یہی پیغام ہے کہ صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (آل عمران: 194) کہ اے اللہ ہمیں ابرار کے ساتھ موت دے۔ تو کتنے بڑے احسانات ہیں ۔ ایسے احسانات کہ نہ گنے جاسکتے ہیں نہ گنوائے جاسکتے ہیں جو ذوالمنن کے احسانات اپنے بندوں پر ہیں کیسی کیسی شفقتوں کا سلوک فرماتا ہے، کتنے پیار کا اظہار کرتا ہے گنہگاروں کو بخشنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے اور پھر یہ دستور بنالیا ہے کہ تم سفر شروع کرو جہاں بھی تمہارا انجام ہوگا ہم تمہیں صالحین میں شمار کر لیں گے مگر سفر شرط ہے۔ پس آپ یہ سفر کریں اور لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اور یقین رکھیں کہ یہ چیزیں جو بہت مشکل دکھائی دیتی ہیں یہ وقت کے ساتھ ساتھ آسان ہوتی چلی

جائیں گی اور ہر قسم کے داغ مٹائے جاسکتے ہیں اگر خدا تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہواور وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرۃ:45) پرعمل ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں

''۔۔۔جب ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے لئے اس قدر صبر سے کام لینا پڑتا ہے تو پھر کس قدر نادان ہے وہ شخص جو اپنی زندگی کی اصلاح کے واسطے اور دل کی غلاظتوں اور گندگیوں کو دور کرنے کے لئے یہ خواہش کرے کہ یہ پھونک مارنے سے نکل جائیں اور قلب صاف ہو جائے۔'' (ملفوظات جلد اوّل صفحہ:459)

یعنی پھونک مارنے سے یہ سارے گناہ دور ہو جائیں اور قلب اچانک صاف ہو جائے۔ یہ پھونک مارنے والے پیر اور فقیر سب دنیا کو دھوکے دیتے پھرتے ہیں اور ان کی پھونک سے تو ان کا اپنا نفس بھی کبھی صاف نہیں ہوا۔ تعفن کی پھونک ہے جو شرک پھیلاتی ہے۔ ایک بدبو جس کے پاس کوئی شریف النفس انسان کھڑا بھی نہیں ہوسکتا اور اتنی جہالت ان لوگوں نے پھیلائی ہے اور ہر سال یورپ کے سفر کرنے والے بڑے بڑے پھونک مارنے والے صوفی آتے ہیں اور درویش اور فقیر پہنچتے ہیں، ان کے اخباروں میں اشتہار چھپ جاتے ہیں کہ وہ بہت پہنچا ہوا صوفی آ گیا ہے جو ایک نظر سے تمہیں آر پار کر دے، یہاں سے کہیں اور پہنچا دے گا اور اس کی ایک پھونک سے تم ہر بیماری سے شفا پا جاؤ گے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ سب ظلم کے قصے ہیں۔ شرک کی تعلیم ہے جو یہ دینے آتے ہیں اور جنت کی بجائے جہنم کی گارنٹی ہوتی ہے۔ یہ کہنا ان کے لئے جائز ہے کہ ایک پھونک میں ہم تمہیں جہنم میں پہنچا دیں گے۔

احمدیت نے اللہ کے فضل کے ساتھ آپ کو ان اندھیروں سے نکالا ہے۔ اتنا بڑا احسان ہے کہ کوئی انسان اس پر غور کرے تو وہ ساری عمر یہ شکر ادا کرتے کرتے مر جائے تو شکر کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اللہ نے آپ کو کہاں پیدا کر دیا۔ کس روشنی میں پیدا فرما دیا ہے۔ امام مہدی کا زمانہ عطا کیا، اس کی جماعت میں داخل کیا، اس کی جماعت میں شامل ہو کر محض اللہ نے اپنے فضل سے آپ کو مزید ترقیات کی طرف قدم بڑھانے کی توفیق بخشی۔ تو یہ بہت احسانات ہیں جس نے آغاز سفر کے سامان مہیا کئے ہیں لیکن یہ سفر کا انجام نہیں ہے۔ یہ بات ہے جو میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا

ہوں۔آئندہ بھی سمجھا تا رہوں گا کہ احمدیت ایک بہت بڑا احسان ہے۔اندھیروں سے نکل کر آپ آئے ہیں لیکن روشنی میں پہنچ کر سفر ختم نہیں ہوا بلکہ روشنی میں پہنچ کر سفر کا آغاز ہوا ہے اور توحید کا سفر لامتناہی ہے،اپنے نفس کو شرک سے پاک کرنے کا سفر لامتناہی ہے۔ان معنوں میں لامتناہی ہے کہ وہ جو خدا کی طرف سے توحید کے نور سے مزین کئے جاتے ہیں یا روشن کئے جاتے ہیں یعنی انبیاءؑ کا گروہ،ان کے سوا باقی ہر طبقے کے بزرگوں اور نیکوں کے لئے توحید کے متعلق محنت کرنی پڑتی ہے،مسلسل محنت کرنی پڑتی ہے اور توحید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس لئے سفر لامتناہی رہتا ہے کہ آئے دن کوئی نہ کوئی شرک کا حملہ ان کے اوپر ہوتا ہی رہتا ہے۔کبھی اولاد کی طرف سے ابتلاء آ گیا،کبھی نظام جماعت کی سزا کے طور پر ابتلاء آ گیا،کبھی مالی ابتلاء آ گیا،کبھی قریبیوں کی موت ابتلاء بن گئی۔تو انسانی زندگی میں جو توحید کا سفر ہے وہ بظاہر مکمل ہونے کے باوجود ایک انسان یہ سمجھ بھی لے کہ میں توحید کامل پر قائم ہو گیا پھر بھی یہ سفر مکمل نہیں ہوتا کیونکہ ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے چلے جاتے ہیں،نئی نئی آزمائشیں آتی چلی جاتی ہیں،نئے نئے امتحان درپیش ہوتے ہیں تو اللہ کرے ہمیں ان سب تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا ہو کیونکہ ہم پر ذمہ داریاں بہت ہیں۔بہت بڑے کام ہیں جو ہمارے سامنے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو فضلوں کی رفتار بڑھا دی ہے اسے دیکھ کر جہاں روح سجدہ ریز ہو جاتی ہے وہاں خوف بھی پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم سے بڑی توقعات رکھی ہیں۔

کہاں آٹھ دس ہزار احمدیوں کا سال بھر میں ساری دنیا میں جماعت میں داخل ہونا یعنی غیر احمدیوں کا احمدی بننا یا غیر مسلموں کا مسلم بننا،کہاں سولہ لاکھ کا ایک سال میں مہمان بن کر چلے آنا۔تو میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اللہ نے ہم پر نظر رحمت فرماتے ہوئے ہم سے توقعات رکھی ہیں اور جتنے فضل عطا کئے ہیں اتنی ہی ہم سے توقعات بڑھ گئی ہیں۔جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نظر میں ہم اصلاح پذیر ہیں۔خدا تعالیٰ کی نظر میں ہماری وسعتیں پھیل رہی ہیں،ہماری صلاحیتیں بڑھ رہی ہیں اور ان کے مطابق اس کے فضل نازل ہو رہے ہیں اور ان کے مطابق ہم سے توقعات اونچی ہو رہی ہیں۔پس دعا کرتے رہیں اور تھکے بغیر،پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر مسلسل قدم آگے بڑھاتے رہیں۔اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو اور خدا ہم سب کو جو آج زندہ ہیں اس آنے والی صدی کا امام بنا دے۔اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔آمین

عالمی جلسوں میں خدا کے فضلوں کے نظارے دیکھتے ہوئے جماعت کو قول سدید اور دعاؤں کی تحریک

(خطبہ جمعہ فرمودہ 6 ستمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب: 71، 72)

پھر فرمایا:

پچھلے دو مہینے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ دو اہم مرکزی جلسوں کی وجہ سے بہت مصروفیت میں گزرے ایک U.K کا جلسہ اور ایک جماعت جرمنی کا جلسہ، دونوں کے اپنے اپنے رنگ اور الگ الگ مزاج ہیں۔ جہاں تک جماعت U.K کے جلسے کا تعلق ہے یہ فی الحقیقت عالمی نوعیت کا ان معنوں میں ہے کہ تمام دنیا سے، ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ لوگ جو توفیق رکھتے ہیں ضرور اس جلسے پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ مرکزی حیثیت جو کبھی ربوہ کے جلسوں کو نصیب تھی اس شان کے ساتھ تو نہیں، اس کثرت کے ساتھ تو نہیں مگر مزاج کے طور پر ضرور U.K کی جماعت جلسے کو نصیب ہو چکی ہے۔ جرمنی کا جلسہ اپنی نوعیت کی الگ شان رکھتا ہے اس میں جو آنے والوں کا ہجوم ہے اور شامل ہونے والوں کی کثرت وہ محض کثرت کی بناء پر نہیں بلکہ مختلف قوموں کی نمائندگی کے لحاظ سے جو چند ہیں ایک

غیر معمولی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ وہ صرف افراد کی کثرت نہیں بلکہ قوموں کی بحیثیت قوموں کی شمولیت کی کثرت بھی ہے۔

ربوہ کے جلسے میں بھی U.K کے جلسے میں بھی اگر چہ ہر قوم کے لوگ آتے رہے، ہر ملک کے لوگ آتے رہے، آتے ہیں، انشاء اللہ آتے رہیں گے مگر با قاعدہ اس طرح جماعت کے طور پر کثرت سے دوسری قوموں کے لوگوں کا آنا یہ جرمنی کا ہی حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز جرمنی کو بخشا ہے۔ چنانچہ اس سال جو ہجوم کی کثرت دیکھی تو امیر صاحب نے اس بارے میں مجھ سے ذکر کیا کہ اب اتنے مختلف زبانوں والے بیک وقت سنبھالنے مشکل ہو رہے ہیں اور اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔ اتفاق سے جو حل میرے ذہن میں آیا اسی حل کا وہ بھی سوچ رہے تھے کہ جرمنی کا جلسہ بیک وقت دو تین قوموں کا جلسہ ہو رہا ہو اور ایک جلسہ اور ایک پنڈال نہ ہو بلکہ بوسنین مقررین بوسنین زبان میں اپنا جلسہ جاری رکھیں اور البانین مقررین البانین زبان میں اپنا جلسہ جاری رکھیں۔ ان کے علماء ان سے اسی طرح گفتگو کر رہے ہوں جیسے ہمارے ہاں لجنہ کا جلسہ، خواتین کا الگ ہو رہا ہوتا ہے اور مردوں کا الگ اور بعض تقریبات اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

تو اب جو قومی پھیلاؤ کے دن آئے ہیں جب فوج در فوج لوگ داخل ہو رہے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ ایک جلسہ اپنے بہت سے پہلو دائروں کی صورت میں رکھتا ہو اور ایک وسیع جلسہ ان سب دائروں پر محیط ہو اور اس میں بعض ایسی مصروفیات ہوں جن میں سب کو اکٹھا شریک ہونے کا موقع ملے۔ مثلاً جو بھی خلیفۃ المسیح ہو اس وقت اس کی تقریر اور بعض مرکزی علماء کی تقاریر یا بعض بیرونی وفود کی آمد پر ان کو جو موقع دیا جاتا ہے کچھ بات کرنے کا ایسی تقریبات ہیں جو سب میں مشترک ہو سکتی ہیں تا کہ جلسے کی واحدانیت بھی قائم رہے اور اس کے جو پھیلاؤ کے تقاضے ہیں وہ بھی پورے ہوں۔ ورنہ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ البانین لوگوں کے لئے صرف وہ خطاب ہی رکھا جائے جو میں ان کے ساتھ بیٹھ کر ان سے مجلس کرتا ہوں تو باقی وقت جلسے میں ان کا دل نہیں لگتا اور اکثر صبح آئے اور پھر رات کو واپس چلے گئے اور اس افراتفری کے عالم میں وہ اپنے آپ کو جلسے کا اس طرح جزو نہیں سمجھ سکتے جیسا ہر شامل ہونے والے کو سمجھنا چاہئے۔

ایک حل اس کا ہم نے یہ کیا تھا کہ البانین اور بوسنین مہمان جو ہزار ہا کی تعداد میں آتے ہیں ان

کے سپرد بعض ذمہ داریاں کردی تھیں اور جن کے سپرد وہ ذمہ داریاں کی گئیں ان کے اخلاص میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ انہوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت سی باتوں میں پرانے کارکنوں سے بھی بڑھ کر نمونے دکھائے مگر وہ چند لوگ ہیں جو اس طرح منسلک ہو جاتے ہیں، اکثریت اجنبی رہتی ہے اور سوائے اس خطاب کے یا ان خطبات کے جو ان کو سامنے رکھ کر ان سے کئے جاتے ہیں وہ جلسے کا حصہ نہیں بنتے۔ تو اس تجویز کو ابھی تک ہم نے آخری صورت تو نہیں دی مگر مجھے لگتا ہے کہ آئندہ زمانوں کے جو نقشے ابھر رہے ہیں ان میں ایک یہ بھی نقشہ ہوگا کہ ایک عظیم عالمی جلسے میں جہاں کئی ملین احمدی شامل ہو رہے ہوں گے وہاں بیک وقت دس پندرہ بڑی بڑی زبانوں میں جلسے ہو رہے ہوں گے۔ ان کے علماء ان سے خطاب کر رہے ہوں گے اور جہاں مرکزی خطبات آئیں گے وہاں سب اس میں شریک ہو جائیں گے۔ تو یہ نقشہ جو ابھر رہا ہے اس کا آغاز جرمنی سے ہونے والا ہے۔ تو میں امید رکھتا ہوں کہ امیر صاحب جرمنی اس بات کو یاد رکھتے ہوئے اس کا جو انتظامی ڈھانچہ ہے وہ تیار کریں گے اور آئندہ سال ہم اس پر تجربہ کر کے دیکھیں گے۔ انشاء اللہ

تو یہ مصروفیات جو جلسہ جرمنی کی وجہ سے تھیں وہ بھی بہت گہری اور اپنی توجہات کے لحاظ سے بہت پھیلی ہوئی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ پروگرام جو آپ نے بھی ٹیلی ویژن پر دیکھے ہیں ان میں حصہ لینے کا موقع ملا بلکہ بہت سے ایسے امور تھے جو ٹیلی ویژن پر دکھانے والے امور نہیں تھے، آپس کے مشورے تھے، منصوبہ بندیاں تھیں اور ان پر بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے کافی ٹھوس کام کرنے کی توفیق بھی ملی اور بہت سی نئی نئی راہیں احمدیت کی ترقیات کی خدا تعالیٰ کے فضل سے روشن ہوئی ہیں اور جرمنی کے جلسے میں ضمنی جلسے جو آ جاتے ہیں ایک اس میں سے ہالینڈ ہے، ایک بیلجیئم ہے اور آتے جاتے ان دونوں جماعتوں کو بھی اللہ کے فضل سے فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ پس یہ جو غیر معمولی جلسوں کی مصروفیت کا کام تھا جس میں زیادہ تر بیرونی مہمانوں کے آنے کے تقاضے جو ہیں اور آئندہ جلسے کے پروگرام بنانے اور نئی راہیں جو کھلتی ہیں ان پر زیادہ ہمت اور خلوص کے ساتھ قدم آگے بڑھانے کے منصوبے طے کرنے ہیں یہ ایک حصہ تو پورا ہوا لیکن کچھ حصہ ایسا ہے جو ابھی پھیلا پڑا ہے آئندہ سال پر اور وہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔ اس کی سوچ بچار، فکر کرنا، منصوبے بنانا لیکن وہ جو مرکزی کام مستقل نوعیت کے ہیں اب میں ان کی طرف لوٹا ہوں تو بہت بڑا انبار لگا ہوا ہے کاموں کا اور حیرت ہوتی ہے

کہ اتنی دیر الگ رہ کر یہ ضروری کام کیسے پیچھے رہ گئے۔ تو اب انشاء اللہ تعالیٰ زیادہ تر توجہ انہی امور کی طرف دی جائے گی جو مستقل ہیں اور اس کی Volume یعنی اس کی مقدار اتنی بڑھ چکی ہے کہ ایک دن بھی اگر باہر رہ جائے یہاں سے تو پیچھے جو کام ہیں وہ ڈھیریوں میں اونچے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ڈھیر لگ جاتے ہیں ان کے۔ مگر اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی اہم بات ہے جسے آپ کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ جو کام ڈالتا ہے وہ توفیق بھی دیتا ہے اس لئے اس بارے میں آپ کو قطعاً فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام بڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وقت میں برکت بھی بڑھا دیتا ہے۔ کام کرنے والے، خدمت کرنے والے از خود دلوں میں جوش لے کر آگے آتے ہیں اور کبھی بھی اس پہلو سے کمی محسوس نہیں ہوئی اور جو کام مجھے کرنے ہیں وہ مجھے ہی کرنے ہوتے ہیں، وہ بانٹے نہیں جا سکتے اور ان کاموں کے بڑھنے کے باوجود خدا تعالیٰ نے یہ مدد کا سلسلہ ایسا جاری رکھا ہے کہ کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کام حد استطاعت سے آگے نکل گئے ہیں۔ تو بعض لوگ گھبراتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں کہ آپ پہ اتنے بوجھ پڑ گئے ہیں۔ اب آپ ان کو بانٹنا شروع کریں۔ جو فیصلے والی باتیں ہیں آخری وہ اس لئے ہمیشہ خلافت کے ساتھ منسلک رہیں گی کہ فیصلوں کے ساتھ بہت سے غور ہیں، بہت سی باتیں ہیں جو عمومی نظر رکھنے کے بغیر فیصلے ہو ہی نہیں سکتے اور جہاں بھی وہاں کمی آئی ہے وہاں فیصلے غلط ہو گئے ہیں۔ اس لئے جو کام سارے عالم کے ایک مرکزی نمائندے کو کرنے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے کہ مرکزی دماغ کا کام کرے وہ کام بانٹے نہیں جا سکتے سوائے اس کے کہ کوئی آفت آ جائے تو بعض دفعہ دل میں بھی ایک مرکز بن جاتا ہے لیکن اصل مرکز جو خدا تعالیٰ نے بنایا ہے وہ ایک مرکز ہے سوچ کا اور بدن کے کام بھی تو دیکھیں کتنے پھیل چکے ہیں۔ اگر آپ کو پتا لگے کہ کتنے کام ہیں جو انسان کا وجود کرتا ہے تو اس کے تصور سے ہی دماغ مختل ہو جائیں۔ ان کی تفاصیل لکھنے بیٹھیں تو عمریں گزر جائیں تو تفاصیل لکھ نہیں سکتے۔

اس میں راز یہ ہے کہ تدریج اور ترقی کی جو Evolution کا رنگ رکھتی ہو اس کی برکتوں سے بعض کام اپنی ذات میں مکمل ہوتے چلے جاتے ہیں اور سوچنے والا دماغ ان سے بالا ہو کر ان پر نظر تو رکھتا ہے مگر وہ کام پھر اتنی توجہ نہیں چاہتے یہاں تک کہ ہر سال ایک منزل اونچی ہو جاتی ہے اور ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (یونس: 4) کا مضمون انسان پر روشن ہو جاتا ہے کہ کتنا عظیم کائنات

کا کام ہے جس کا وہم وگمان بھی اگر انسان کروڑ ہا کروڑ سال تک زندہ رہے تو نہیں کرسکتا۔ناممکن ہے اس کی اتھاہ کو پہنچ سکے لیکن اس کے باوجود خدا نے وہ کام کئے اور کروائے اور اس کی تربیت دی اور نظام ازخود جاری ہوگیا گویا کہ ازخود جاری ہوگیا حالانکہ ازخود جاری نہیں ہے۔اس پر فرشتے مقرر فرمائے، ہر ایک کا ایک نگران مقرر کیا، ان نگرانوں کے اور نگران بنائے یہاں تک کہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ یوں چل پڑے جیسے کوئی نگران ہی نہیں ہے، ازخود ہی جاری ہوگئے ہیں۔

یہ جو نظام کائنات ہے خدا تعالیٰ نے مذہب میں بھی یہی نظام جاری فرمایا ہے اور ذمہ داریوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حکمت اور اللہ تعالیٰ کی دکھائی ہوئی راہوں پر چلتے ہوئے انسان کام کرے تو اس فکر کی ضرورت نہیں رہتی کہ کام بہت بڑھ گیا ہے۔دماغ سے زیادہ اپنے وجود کو سنبھالنے کا جو کام ہے وہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر شخص کا دماغ اپنی ذات کے محدود دائرے میں ہی اتنے کام کرتا ہے کہ میں نے جیسے کہ بیان کیا ہے اگر آپ اس کا تصور باندھنے کی کوشش کریں تو آپ کی طاقت ہی نہیں ہے۔ ہر حکم جو دماغ دیتا ہے ہر حرکت کے لئے اس کے ساتھ جو بجلی کی لہریں دماغ کے چھوٹے سے محدود دائرے میں آگے پیچھے حرکت کرتی ہیں اور تمام نظام کو منسلک کرتی ہیں اس ایک حکم کے ساتھ اور اس کے نتائج کے ساتھ اس کے متعلق سائنس دان کہتے ہیں کہ لاکھوں میل کا سفر بجلی کے کوندوں کا ہر حکم کے ساتھ ہو جاتا ہے۔اس نے یادداشت کے مرکز تک بھی پہنچنا ہے اور اس نے جسم کے ہر خلیے کو اس کی تعلیم دینی ہے کہ اس کا نتیجہ تم پر کیا ہوگا کیا اثر اس پر پڑے گا۔ یہ بہت ہی تفصیلی اور گہرا مضمون ہے لیکن ہر حکم کے وقت دماغ کے اندر جو رابطے ہیں وہ بجلی کے رابطے وہ لاکھوں میل سفر کر جاتے ہیں اور یہ نظام آناً فاناً تو نہیں پیدا ہوا۔اس کے لئے ایک ارب سال لگے ہیں کہ رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھا ہے لیکن جب بڑھ گیا تو ایسا آسان ہوگیا یوں لگا جیسے کام ہو ہی نہیں رہا۔ ہر آدمی اپنی ذات سے غافل سویا رہتا ہے، اس کا نظام خود بخود حرکت میں رہتا ہے لیکن سوتے ہوئے بھی دماغ کوئی کام ضرور کر رہا ہوتا ہے۔ یہ جو پہلو ہے یہ روحانی دنیا میں بھی اسی طرح جاری ہوتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اور کام اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ منظّم ہوتے چلے جاتے ہیں اور اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ والا مضمون روشن ہوتا جاتا ہے اور انسان ایک عرش سے دوسرے عرش، دوسرے عرش سے تیسرے عرش پر ترقی کرتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں جماعت خدا تعالیٰ کے فضل سے بڑی کامیابی

سے داخل ہو کر اب آگے بڑھ رہی ہے۔

اس لئے جتنے بھی کام بڑھیں گے ایک ذرّے کا بھی وہم نہ کریں کہ خلیفہ کی طاقت سے بڑھ جائیں گے۔ جو مرکزی نظام خدا نے قائم کیا ہے وہی جاری رہے گا اور وہی سارے کام سنبھالے گا اور ساری ذمہ داریاں ادا کرے گا اور ساتھ ساتھ جو تائیدی نظام ہے سلطان نصیر بنتے چلے جاتے ہیں وہ اپنا اپنا کام کرتے چلے جائیں گے لیکن ہر دفعہ ریفرنس دماغ کو جاتا ہے اور یہ جو ریفرنس جانے والی بات ہے یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ سوتے ہوئے میں بھی جسم کے اعضاء میں جگہ جگہ جو تبدیلی واقع ہو رہی ہے ان کا ریفرنس ایک دماغ کو ضرور جاتا ہے یعنی ایک حوالہ جاتا ہے کہ یہ یوں ہو رہا ہے اس کو ریکارڈ کر لو اور یہ یوں ہونا چاہئے کہ نہیں ہونا چاہئے تو اس لئے ریفرنسز جتنے بھی ہوں گے اگر نظام مرتب ہو تو اس کے نتیجے میں طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں پڑتا۔

مگر خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جس رفتار سے جماعت ترقی کر رہی ہے اس میں مزید دعاؤں کی ضرورت ہے اور یہ مضمون میں نے اس لئے کھول کر بیان کیا ہے باوجود اس کامل یقین کے کہ خدا تعالیٰ خود توفیق دے گا اور بڑھائے گا دعا کا خانہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور اس سے فرق پڑتا ہے۔ جتنی زیادہ دعائیں مددگار ہوں اتنا ہی انسان اللہ تعالیٰ کی تائید کو آسمان سے اترتا دیکھتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ دعائیں ہیں جو پھل لا رہی ہیں۔ اس لئے جماعت دعاؤں سے غافل نہ ہو اور دعاؤں والا جو مضمون ہے اس میں فتنوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک انسان اگر لاعلمی میں کوئی فیصلے کرتا ہے تو ان فیصلوں میں اسی حد تک خامی پیدا ہو سکتی ہے اور دشمن ہمیشہ چھپ کر وار کرتا ہے اور جب تک اس کے وار کا طریقہ معلوم نہ ہو اس کی واردات کا اندازہ، طریق معلوم نہ ہو اس وقت تک انسان صحیح طرح اس کے خلاف اگر طاقت رکھتا بھی ہو تو دفاع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اچانک حملے کا جو فلسفہ ہے جنگوں میں استعمال ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک چھوٹا دشمن بھی بڑے دشمن پر غالب آجاتا ہے اگر سرپرائز Surprise کا ایلیمنٹ (Element) آجائے، اچانک پن اس میں آجائے۔ تو دشمن چونکہ ہمیشہ سازش مخفی کرتا ہے اور قرآن کریم نے شیطان کے حوالے سے یہ بات ہم پر خوب کھول دی ہے کہ شیطان تمہیں وہاں سے دیکھ رہا ہے جہاں تم اسے دیکھ نہیں رہے وہاں سے وار کرتا ہے جہاں تمہیں پتا نہیں۔ اس لئے خدا کی پناہ میں آنے کا مضمون ہمیشہ یاد رکھنا

چاہئے۔انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود اَن دیکھے حملے کے خلاف مؤثر دفاع نہیں کرسکتا لیکن وہ حملے جو دکھائی دیں اس میں بھی بسا اوقات مزید مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔مگر اَن دیکھے حملے تو بہت ہی شدید اور مہلک ہو جاتے ہیں۔پس اس پہلو سے دعا جاری رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اَن دیکھی چیزوں کو ہمیں دکھا دے اور وقت پر دکھا دے اور پھر ان کی جوابی کارروائی کی توفیق عطا فرمائے،حکمت بخشے اور اس حکمت کے منصوبے کو جو انسان بناتا ہے اس پر عملدرآمد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

تو دعاؤں کا خانہ تو اپنی جگہ ہمیشہ رہے گا اسے نظر انداز کرنا بے وقوفی اور خودکشی ہے۔پس جہاں خدا مالک اور انسان متوکل ہے اور خدا اس کا وکیل ہے یعنی توکل کرنے والا انسان ہے اللہ تعالیٰ اس کا وکیل بن جاتا ہے ایسی صورت میں بھی قرآن کریم بار بار دعاؤں کی طرف متوجہ فرماتا ہے۔جو زیادہ دعائیں کرے گا اس کا زیادہ وکیل اللہ ہو جائے گا اور جو جتنا توکل کرے گا اتنا ہی ساتھ دعائیں بھی بڑھائے گا کیونکہ توکل کا مضمون دعا چاہتا ہے۔توکل کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو کرنا تھا کرلیا مگر ہم جانتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں،نااہل ہیں،ہر چیز پہ ہماری نظر نہیں،**عالم الغیب** تو درکنار،**عالم الشھادہ** بھی پورے نہیں ہیں،اس لئے ہمارے منصوبوں میں ضرور خامیاں رہ گئی ہیں لیکن جو پوری کوشش کے باوجود خامیاں رہ جائیں ان میں انسان کہتا ہے کہ اے اللہ میں تجھ پر توکل کرتا ہوں اور تو اب ان کمزوریوں کو سنبھال لے اور ان کے بداثرات سے ہمیں بچالے۔یہ توکل سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ میں تھا اور اس توکل کے مضمون کو سمجھنے کی وجہ سے آپؐ کی دعائیں بے انتہا ہو گئیں یعنی اتنی دعائیں تھیں کہ ہم عام زندگی میں اس کا تصور نہیں کرسکتے۔سوتے بھی دعائیں جاری ہوتی رہتی تھیں۔بدن سو بھی جائے تو دماغ جاگتا رہتا تھا اور ہر لحظہ،ہر ہر لمحہ خدا کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھا رہتا تھا۔پس توکل کے مضمون کو اگر آپ سمجھ جائیں تو دعا کا مضمون از خود زیادہ واضح اور روشن ہوتا چلا جائے گا۔

پس یہ جو سارے کام میں نے بتائے ہیں بڑے عمدہ چل رہے ہیں اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خامیوں کے احتمالات نہیں۔خامیوں کے بہت سے احتمالات ہیں اور علم کی کمی منصوبے کی خامیوں کی ذمہ دار بنتی ہے اور انسان **عالم الغیب** ہے ہی نہیں میں نے جیسا کہ عرض کیا **عالم الشھادہ** بھی نہیں۔کئی لوگ آتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جی ہم نے خواب میں دیکھا اور بڑا اخلاص کا اظہار کرتے ہیں ہم احمدی ہو گئے اور سادہ لوح انسان جو اللہ کے نور سے نہیں دیکھتے وہ دھوکے میں آجاتے ہیں حالانکہ

مومن ہوتے ہیں اور بعد میں وہ پھر چقمہ دے کران کی رقمیں لے کر بھاگ جاتے ہیں، ان کی جائیدادوں کو نقصان پہنچا جاتے، ان کو فتنوں میں ملوث کرتے، پولیس میں جا کے رپورٹیں کرتے۔ یہ آج کل تو آئے دن ایسی خبریں آتی ہیں اور اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے مگر وجہ وہی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ آدمی **عالم الغیب** نہیں ہے اور ہر شخص کا **عالم الغیب** نہ ہونا الگ الگ معنے رکھتا ہے۔

مومن جو گہری فراست رکھتا ہے وہ بھی **عالم الغیب** نہیں مگر عام انسانوں کے مقابل پر گویا **عالم الغیب** ہے۔ اس کو اتنا زیادہ دکھائی دے رہا ہوتا ہے کہ عام آدمی کو اس کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوتا لیکن مومن ہوتے ہوئے یعنی عام باتوں میں ہوتے ہوئے جب تقویٰ زیادہ گہرا نہ ہو تو پھر فراست پر اثر پڑتا ہے۔ بعض لوگوں کو جو تبلیغ کا جوش ہے، اب وہ تقوی کی باریکی کا حال میں آپ کو بتاؤں، کہاں اس کی باریکی فائدہ بھی دے سکتی ہے نقصان بھی دے سکتی ہے۔ اگر جوش یہ ہے کہ میں نے نمبر بڑھانا ہے ضرور، اگر جوش یہ ہے کہ مجھے سو کا ٹارگٹ ہے میں نے پورا کرنا ہی کرنا ہے، اگر جوش اس بات کا ہو کہ ایک آدمی چونکہ اچھی باتیں بتا رہا ہے اس لئے اگر میں مان کر اس کو پیش کروں گا تو اور بھی زیادہ اثر پڑے گا کہ میں نے ایک بڑا حقیقی بزرگ دعا گو انسان جماعت کو تحفہ دے دیا۔ یہ فراست کی بات نہیں تقویٰ کی کمی کی بات ہے۔ مومن کی نظر اس لئے محتاط ہوتی ہے کہ اس کی ذات ملوث نہیں ہوتی۔ جہاں اپنے نفس کی کمائی کا اظہار کرنا پیش نظر ہو کہ میرے نفس نے محنت سے یہ بات کمائی ہے اور اس کا مجھے کریڈٹ ملنا چاہئے وہاں ضرور تقویٰ میں کمی آنے کی وجہ سے دھوکہ ہوگا اور بعض چیزیں نظر دیکھ نہیں سکتی اور دیکھنے میں وہ لوگ متقی ہیں، نمازیں ہیں، وقت دیتے ہیں، دین کی خدمت میں وقت دیتے ہیں، تبلیغ پر وقت خرچ کرتے ہیں، اموال کی قربانی کرتے ہیں لیکن تقویٰ بہت ہی باریک مضمون ہے۔ جہاں نیکی دکھانے کی بھی خواہش پیدا ہو جائے وہاں بھی یہ شیطان وہاں سے حملہ کرتا ہے جہاں دکھائی نہیں دیتا۔

یہ جو مضمون میں نے بیان کیا کہ دکھائی نہیں دیتا یہ مضمون ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ موٹی موٹی باتوں میں دکھائی نہیں دیتا۔ موٹی باتوں میں تو شیطان دکھائی دے دیتا ہے پھر بھی انسان ٹھوکر کھاتا ہے، جانتے بوجھتے بھی کھاتا ہے لیکن جہاں دکھائی نہیں دیتا وہ یہ لطیف باتیں ہیں۔ اگر آپ خالصةً للہ ہو کر اپنی نگرانی کریں تو آپ کی نظر بڑھ جائے گی، زیادہ لطیف ہو جائے گی، گہرائیوں میں اترنے کی

صلاحیت پا جائے گی پھر بھی سب کچھ نہیں دیکھ سکے گی۔ یہ فرق ہے **عالم الغیب** میں اور اس مومن میں جو اللہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جب سب کچھ ہو جائے اور انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کو حد کمال تک پہنچا دے پھر جو باقی حصہ ہے وہ بھی بے انتہا ہے اور وہاں توکل شروع ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ تم سو رہے ہوتے ہو خدا تمہارے لئے جاگ رہا ہوتا ہے۔ تم دشمن سے غافل ہوتے ہو خدا اس پر نظر رکھتا ہے۔ تمہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس چیز کی مجھے ضرورت ہے اللہ کو معلوم ہوتا ہے اور وہ ضرورتیں پوری کر رہا ہوتا ہے۔ یہ جو توکل والا مضمون ہے اس میں دعاؤں کی ضرورت ہے کیونکہ یہاں مانگنے والے کو دیا جاتا ہے اور دعاؤں کی اس لئے ضرورت ہے کہ اگر وہ نہیں مانگے گا تو اپنی ذات پہ توکل ہے اس لئے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ بعض لوگ کم فہمی میں یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو کیا منگوانے کا شوق ہے۔ ہم نے توکل کر دیا خدا اب سنبھال لے حالانکہ جو وہ توکل ہے وہ نفس کا دھوکہ ہے۔ اس توکل کا مطلب ہے کہ ہم نے جو چیزیں پوری کر دیں اب لازماً سب کام ٹھیک ہونے چاہئیں اور بالآخر وہ اپنی ذات پر توکل ہی بن جاتا ہے لیکن جہاں خطرات کا احساس ہو اور پتا ہو کہ سب چیزیں کافی نہیں ہیں وہاں کسی مددگار کی ضرورت پیش آتی ہے اور لازماً دل سے دعائیں اٹھتی ہیں کہ اے ہمارے مددگار، اے خدا ان ضرورتوں کو پورا کر دے جن پر ہماری نگاہ ہی نہیں ہے۔ ان خامیوں کو دور کر دے جن پر ہماری نظر نہیں ہے اور پھر ہمارے ان کاموں کو سنبھال لے جو ہمارے بس میں نہیں ہیں۔

تو یہ وہ مضمون ہے جس کی اس وقت جماعت کو سمجھنے کی بڑی گہری ضرورت ہے۔ ہمارے کام پھیل رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ اور اتنے پھیل رہے ہیں کہ اگر اپنی طاقت کو دیکھیں تو ناممکن دکھائی دیتا ہے کہ ہم انہیں سنبھال لیں۔ وہ ارتقائی دماغ جس کی میں بات کر رہا ہوں اس کو بھی تو وقت چاہئے اور جب ترقیات تیزی سے آگے بڑھ جائیں تو اس ارتقائی اجتماعی دماغ کے لئے جتنا وقت درکار ہے وہ ہی نہیں ملتا اور وہاں لازماً اللہ تعالیٰ کے براہ راست دخل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ جو مضمون ہے اس پر غور کر کے جو جدید سائنس دان ہیں انہوں نے یہ راز معلوم کر لیا کہ جو Evolution کا وقت ہم نے دیکھا ہے وہ Evolution کے لئے کافی نہیں ہے یعنی حیرت انگیز دریافت انہوں نے کی ہے اور اب اس میں ہی وہ غرق ہوئے بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں ہم نے جو حساب

لگایا انسانی زندگی تک پہنچنے کے لئے زندگی نے جتنے مراحل کا سفر کیا ہے ایک بلین سال اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، بالکل معمولی حیثیت ہے اور یہ سوچ آگے بڑھی تو اب یہ اس منزل میں داخل ہوگئی ہے کہ ہم جو کہتے تھے Big Bang سے بیس ملین سال کے اندر یہ سارا نظام وجود میں آ گیا اب جونئی دریافتیں ہو رہی ہیں وہ دیکھنے کے بعد اور جو کائنات کے انتظام کے پیچ وخم دکھائی دے رہے ہیں اب یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں بیس ملین سال میں تو یہ ممکن ہی نہیں۔ وہاں ان کو توکل کا پتا نہیں۔توکل بتاتا ہے کہ خدا ہے جو اس جاری کارخانے کے علاوہ اپنے عرش سے ان باتوں پر نظر رکھتا ہے اور اگر ایک بیرونی دماغ فیصلے کرنے والا ان کے کمپیوٹر میں داخل کر دیا جائے تو ایک بلین سال میں آسانی سے وہ سارے مراحل طے ہو سکتے ہیں لیکن فیصلے باہر کرنے پڑیں گے۔اتفاقات سے مضمون آگے نہیں بڑھتا بلکہ اتفاقات جو دکھائی دیتے ہیں ان کو اگر کوئی جوڑنے والا ہو اور اس کا ہاتھ دکھائی نہ دے رہا ہو تو وہ سفر جو اتفاقات کے لئے لاکھوں سال کا سفر ہوگا وہ ایک جوڑنے والا ہاتھ چند سالوں میں طے کر سکتا ہے۔پس خدا کی ہستی کی طرف یہ ہنکائے لئے جا رہے ہیں اور ابھی تک ان کو ہوش نہیں آتی پوری طرح۔بعض کو آ گئی ہے، بعضوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ حقائق ہیں، ہم ان سے کب تک آنکھیں بند کریں گے۔جو حقائق اب تک معلوم ہوئے ہیں وہ اس بات کو ناممکن دکھا رہے ہیں کہ کسی بیرونی باشعور اور عالم ہستی کے بغیر یہ کارخانہ اس رفتار کے ساتھ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔تو اس لئے توکل کا مضمون کائنات میں بھی ایک ہے جسے اب آہستہ آہستہ سائنس دانوں نے دیکھنا شروع کیا ہے لیکن ہمیں تو خدا تعالیٰ نے پکی پکائی دی ہے۔قرآن کریم نے یہ ساری باتیں کھولیں اور آنحضرت ﷺ نے ان کے باریک رازوں سے پردے اٹھا دئے۔پس اس پہلو سے جماعت کو جب سب کچھ خدا تعالیٰ نے شعور بخش دیا تو اس آخری مقام سے غافل ہو جانا ان کی ساری محنت کو ضائع کر سکتا ہے اور توکل کے لئے جو اس مضمون کا توکل ہے کہ لوگ کثرت سے آئیں گے تو کیا کرنا ہے قرآن کریم نے ہمیں صاف نصیحت فرمائی ہے:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۲﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۳﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ ؕؔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۴﴾ (النصر: 2تا4)

اس وقت خدا کی تسبیح کرو۔ اپنے آپ کو خالی کرلو ہر تسبیح سے یعنی یہ یقین کرلو کہ تم غلطیوں سے پاک نہیں ہو۔ اللہ ہی ہے جو غلطیوں سے پاک ہے اور یہ اقرار ہے اپنی کم مائیگی کا جو پھر حمد کے مضمون میں داخل کرتا ہے ۔غلطیوں سے پاک ہی نہیں، ہر حمد کا حامل وہی ہے مالک وہی ہے وَاسْتَغْفِرْهُ اس سے پھر بخشش طلب کرو۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا پھر وہ تمہاری ہر غلطی کو معاف کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور ہر غلطی کو معاف کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے خمیازے سے تمہیں بچائے گا۔ یہ مضمون ذہن نشین رکھیں تو اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس آیت کا انتخاب میں نے کیوں کیا جس کی میں نے ابتداء میں تلاوت کی تھی۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝٧١ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝٧٢

جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا وہ فَوْزًا عَظِيْمًا حاصل کرلے گا۔ پس ہمارا سفر فَوْزًا عَظِيْمًا کا سفر ہے اور اس میں توکل کے مضمون اور اپنی خامیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ لازم ہے کہ ہم اپنی اصلاح بھی ساتھ ساتھ کرتے چلے جائیں اور بغیر اصلاح کے کوئی ارتقاء ممکن نہیں ہے اور جھوٹ کے متعلق جو میں نے جہاد کا اعلان کیا اس اعلان سے جو ابھی جرمنی میں میں نے تازہ کیا ہے اس مضمون کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ جھوٹ نہ بولنا ایک بات ہے اور قَوْلًا سَدِيْدًا ایک اور بات ہے۔ محض جھوٹ نہ بولنے کے باوجود انسان کی خامیاں اس کی نظر سے غافل رہ سکتی ہیں اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ انسان ایسا ہوشیار جانور ہے کہ بغیر جھوٹ بولے بھی اگلے کو دھوکہ دے دیتا ہے اور بغیر جھوٹ بولے بھی اپنی کمزوریوں پہ پردے ڈال لیتا ہے اور جو شخص سچا ہو مگر انسانی فطرت کی مجبوری کے تحت وہ سچ کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اپنی خامیوں کو اپنی نظر سے تو نہ چھپائے۔ اگر اس کو حیا مانع ہے، شرم مانع ہے تو اول حکم یہ ہے کہ وہ خود اپنی خامیوں کا نگران رہے۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ جب وہ کہتا ہے تو یہ چیز اس کا لازمی حصہ بن جاتی ہے کہ اگر اللہ

خامی سے پاک ہے تو میرے اندر خامیاں ہوں گی۔ ہوں گی پر بات نہ رہنے دے، تلاش کرے کہ وہ کیا ہے اور جب خامیوں کی نشاندہی کرے گا معلوم کرلے گا کہ یہ یہ خامیاں ہیں تب حمد کا سفر شروع ہوسکتا ہے اس کے بغیر ممکن نہیں ہے پس یہ ان آیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو مزید واضح اور آسان کر دیا یہ کہہ کر، یہ نہیں فرمایا کہ سچ بولو فرمایا قول سدید کہو۔ اگر تم سچ کے دائرے میں قول سدید کی جو باریک سڑک ہے اس پر چلتے رہو تو پھر خدا کا وعدہ ہے کہ وہ تمہاری ضرور اصلاح کرے گا اور یہ بہت عظیم وعدہ ہے۔ قَوۡلًا سَدِيۡدًا کے متعلق میں پہلے بھی ایک دفعہ خطبے میں تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں اب جو ہمارے مختلف کام سر پر آپڑے ہیں جو منتظمین ہیں ان کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ قَوۡلًا سَدِيۡدًا سے کام لینا چاہئے اور ایک دوسرے کے دائرے میں دخل دینے سے باز رہنا چاہئے اور اگر دے دیں تو پھر مان لیں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ بہت سے انتظامی جھگڑے جو انتظامات کے پھیلنے کی وجہ سے میرے سامنے آرہے ہیں ان میں یہ پتا چل رہا ہے کہ قَوۡلًا سَدِيۡدًا کی کمی ہے ابھی۔ سچ بولتے بھی ہیں تو قَوۡلًا سَدِيۡدًا کے کام نہیں لیتے۔ اگر پکڑے جاتے ہیں تو ضرور بہانے بناتے ہیں کہ نہیں نہیں ہم تو اس وجہ سے اس جگہ دخل دے رہے تھے، یہ ہمارا دائرہ اختیار ہے اس کا نہیں ہے۔ تو قَوۡلًا سَدِيۡدًا میں دو باتیں ہیں سیدھی بات کہنا اور سیدھی راہ پر چلنا۔ اگر انسان بات سیدھی کہے اور بل اور فریب اس میں نہ دے تو ایسا آدمی جھوٹا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض حد سے زیادہ بے وقوف اور وہ ہر جگہ اٹھ کے بات کر دیتے ہیں کہ جی ہم تو سچی بات کریں گے اور یہ جو ہے یہ قَوۡلًا سَدِيۡدًا نہیں ہے کیونکہ قَوۡلًا سَدِيۡدًا میں بھی کچھ حکمت کے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ یہ مضمون بہت گہرا اور باریک ہے اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی پہچان متقیوں سے کیا ہے۔ ایک ہے وہ بڑی واضح ہے۔ وہ لوگ جو اپنی بے وقوفی کی وجہ سے سیدھی بات کرتے ہیں اور اپنے رشتے داروں، عزیزوں کے لئے ہر جگہ ایک مصیبت بن جاتے ہیں شرمندگی کا موجب بنتے رہتے ہیں وہ اور قسم کے لوگ ہیں اور مومن جو اللہ کی آنکھ سے دیکھنے والا وہ جو قَوۡلًا سَدِيۡدًا اختیار کرتا ہے وہ اور طرح کا انسان ہے کیونکہ تقویٰ کے ساتھ فراست کا تعلق ہے اور یہ جو سادہ بات سیدھی ہے اس کا بے وقوفی سے تعلق ہے اور یہ دو باتیں الگ الگ ہیں، پہچانی

جاتی ہیں۔ایک صاحب فراست انسان جانتا ہے کہ اگر میں بل دینا چاہوں تو بل دے سکتا ہوں وہ جانتا ہے کہ اگر میں بات کو چھپانا چاہوں تو چھپا سکتا ہوں، بے اختیار نہیں ہوتا وہ اور اس کے باوجود وہ وہ راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی خاطر جو اس کے لئے کچھ مشکلات بھی پیدا کرسکتی ہیں، کچھ شرمندگی کا موجب بھی بن سکتی ہیں لیکن ایک بے وقوف تو اس طرح نہیں کرتا۔اس کو تو پتا ہی نہیں کہ کوئی اور راہ ہے بھی کہ نہیں وہ تو بات بنائے بھی تو نہیں بنتی ،بنا سکتا ہی نہیں ہے۔تو میں بے وقوفیوں والے قَوْلًا سَدِيْدًا کی طرف آپ کو نہیں بلا رہا بلکہ مؤمنانہ قَوْلًا سَدِيْدًا کی طرف آپ کو بلا رہا ہوں۔جہاں آپ کے اندر صلاحیتیں موجود ہیں کہ ہر بات کو سجا کر سلیقے سے پیش کرسکیں مگر جہاں یہ دیکھیں کہ اس میں تقویٰ کا نقصان ہے وہاں بات کو اتنا کہیں جتنا اللہ کے تقویٰ کا تقاضا ہے۔اب یہ فیصلہ کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے معیار کے مطابق تقویٰ کو پورا سمجھتا ہی نہیں ہے۔اس لئے جس راستے سے بھی آپ اصلاح کا رستہ اختیار کریں،جس طریق سے بھی اختیار کریں آخر تان دعا پر ٹوٹے گی۔

لیکن قَوْلًا سَدِيْدًا میں اللہ تعالیٰ نے ایک وعدہ فرمایا ہے جو باقی باتوں میں نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اگر تم سچائی کے دائرے کے اندر یہ باریک راہ اختیار کرو گے جو قَوْلًا سَدِيْدًا کی ہے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہاری اصلاح کروں گا اور یہ انسانی فطرت کی بات ہے ایک شخص اگر کسی خاص نقص میں مبتلا ہے کسی بیماری کا شکار ہے اور بے وجہ قَوْلًا سَدِيْدًا اس کو ہر دفعہ ننگا کرنا پڑتا ہے اپنے آپ کو اور شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور جانتا ہے کہ جب بھی اس محل پر،اس موقع پر مجھ سے کوئی بات ہوگی مجھے یہی بتانی پڑے گی تو ایسا شخص خود اپنے نفس کی شرمندگی کی وجہ سے مجبور ہے کہ اپنی اصلاح کرے یہاں تک کہ اس شرمندگی کے محل سے نکل جائے۔

پس يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ میں ایک گہرا انسانی فطرت کا راز ہے جو بیان ہو رہا ہے۔جو شخص اپنی خامیوں کو بہادری کے ساتھ ،جرأت کے ساتھ اس حد تک قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس حد تک اللہ نے اجازت دی ہے اور یہ اجازت والی شرط بھی ساتھ ہے ورنہ وہ مؤمنانہ فراست نہیں رہے گی بے وقوفی ہو جائے گی۔بعض جگہ اللہ تعالیٰ نے اجازت بھی نہیں دی کہ تم اپنے گناہوں کا حال لوگوں کو بیان کرتے پھرو۔ایسے شخص کے متعلق رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ

خدا کا مغضوب ہو جاتا ہے اللہ اس کو غضب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بظاہر وہ سچ بول رہا ہے، بظاہر قَوْلًا سَدِيْدًا سے کام لے رہا ہے کہتا ہے جی میں نے یہ بھی گناہ کیا ہے وہ بھی گناہ کیا ہے یہ یہ باتیں میرے اندر پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے مجھے شرم سے پسینے آنے لگتے ہیں کہ بظاہر انہوں نے صرف دعا کی درخواست کی ہے مگر یہ بتانے کے شوق میں کہ اتنے اتنے گناہ ہیں وہ حد سے زیادہ تفاصیل بیان کرتے ہیں یہاں تک کہ گویا بظاہر سامنے ننگے ہو کے کھڑے ہو گئے ہیں اور وہاں غض بصر کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس بات کو دل سے بھلا کر نکال دیا جائے۔ ان کو میں سمجھا تا بھی ہوں بعض دفعہ کہ تمہیں خدا نے اجازت ہی نہیں دی۔ اپنی کمزوریوں کو جن پر خدا نے ستاری کا پردہ ڈالا ہے ان کو نکال کر باہر پھینکنا یہ قول سدید کے خلاف ہے۔ اس لئے قَوْلًا سَدِيْدًا اسلامی اصطلاح ہے۔ قَوْلًا سَدِيْدًا میں جو بات آپ بیان کرنے پر مجبور ہیں اور مختار ہیں خدا کی طرف سے وہاں قَوْلًا سَدِيْدًا سے کام لیں۔ جہاں آپ کو اپنی اندرونی کمزوریاں اچھال کر باہر پھینکنے کی اجازت نہیں سوائے خدا کے حضور، وہاں وہ قَوْلًا سَدِيْدًا نہیں ہے وہ حد سے زیادہ جہالت ہے اور اس لئے خدا نے اجازت نہیں دی یعنی اور باتوں کے علاوہ کہ اس سے فحشاء پھیلتی ہے۔ ایک دفعہ اجازت ہو جائے تو ہر انسان اگر اپنا اندرونہ سارا کھول دے تو دنیا اتنی گندی دکھائی دے گی کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دنیا کتنی گندی ہو گئی ہے اور یہ دنیا کا بڑھتا ہوا گند ہر اصلاح کرنے والے کو مایوس کر دے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکے گا کہ اس دنیا کی اصلاح ہو سکتی ہے، وہ کہے گا چلو پھر میں بھی ساتھ ہی بہتا ہوں۔

تو فحشاء کا یہ مضمون ہے جس کی روک تھام کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ خوب صورت ستاری کا پردہ اتارا ہے کہ تم چھپے رہو بے شک جہاں تمہاری ذاتی کمزوریاں ہیں اور دکھانے کی اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ تم بے حیا ہوتے چلے جاؤ گے اور اگر ظاہر کرو گے تو اور زیادہ بے حیا ہو کر بے دھڑک ان گناہوں میں آگے بڑھ جاؤ گے اور ساری قوم کو بے شرم کر دو گے اس لئے وہاں خدا تعالیٰ نے حکماً روک دیا ہے اور یہ منافقت نہیں ہے، اس میں گہرا اصلاح کا راز ہے۔ پس قَوْلًا سَدِيْدًا کا یہ مطلب بھی نہ نکال لیں۔ قَوْلًا سَدِيْدًا کا مطلب یہ ہے کہ جہاں آپ سے کوئی بات پوچھی جاتی ہے یا جہاں آپ نے بیان کرنی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے دائرے میں ہے وہاں لازماً آپ نے قَوْلًا سَدِيْدًا سے کام لینا ہے۔

اب اس کی مثال ابھی حال ہی میں ایک شادی بیاہ کا جھگڑا میرے سامنے آیا۔ ایک لڑکی جو بیاہی گئی دو دن یعنی دو دن صرف بیاہی گئی، گھر واپس آگئی۔ اس نے کہا مجھے یہ اعتراض نہ ہوتا شاید کہ میرے خاوند کی عمر مجھ سے بیس سال زیادہ ہے مگر اس نے دس سال بتائی ہے اور نکلی بیس سال ہے اس لئے ایسے جھوٹے شخص کے ساتھ میں نہیں رہ سکتی۔ وہ اسی طرح واپس آ کے گھر بیٹھ گئی اور ایسے واقعات کثرت سے میرے سامنے آتے ہیں۔ یہاں چھپانا اس مضمون سے تعلق نہیں رکھتا جو میں نے بیان کیا ہے کہ اپنی کمزوریاں نہیں دکھانی۔ عمر کا ظاہر کرنا یہ کمزوری نہیں ہے جس پر خدا نے ستاری کے پردے ڈالے ہوئے ہیں یہ روزمرہ کے حقائق ہیں اور ان سے روگردانی کرنا اور ان کو چھپانا دو طریق سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ انسان سچ بول رہا ہو اور بات ہی نہ کرے، بات گول کر جائے، عمر کی بات آئے تو ادھر ادھر مونہہ کر جائے۔ ایسا شخص جو ہے اس کو جھوٹا تو نہیں کہیں گے وہ قَوْلًا سَدِيْدًا نہیں ہے اور ایک وہ ہے جو واضح طور پر جھوٹ بول دیتا ہے اس کی ذات کے اندر قول سدید کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا وہ جھوٹا ہے۔

پس جہاں آپ جھوٹ سے نجات حاصل کر رہے ہیں وہاں یاد رکھیں کہ ایسے بہت سے معاملات ہیں جہاں قول سدید کی ضرورت ہے اور وہاں ان باتوں کو ظاہر کرنا خدا کے منشاء کے خلاف نہیں، خدا کے منشاء کے مطابق ہے وہاں ستاری کا مضمون داخل ہی نہیں ہوتا اگر وہاں آپ قَوْلًا سَدِيْدًا سے کام نہیں لیں گے تو آپ دھوکے باز ہوں گے۔ پس جتنے رشتوں کے معاملات ہیں ان میں اکثر صورتوں میں یہی قول سدید کی کمی ہے جس نے بہتوں کی زندگیاں برباد کر کے رکھ دی ہیں۔ مجھے ایک لڑکی کا بڑا دردناک خط ملا کہ جو نقشہ کھینچا گیا خاوند کا اتنا اچھا صحت مند، یہ کرتا ہے، وہ کرتا ہے اور جب میں گھر آئی ہوں تو شاید مرگی کا مریض ہے جو میرے لئے برداشت کرنا مشکل ہے اور اب میں بے بس ہو چکی ہوں۔ اب میرے ماں باپ نے باندھ دیا ہے۔ اب یہی میری زندگی ہے جو رہے گی۔ کچھ ایسی ہیں جو جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے وہ رشتے توڑ کر گھر آ جاتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو کہتی ہیں بس اب ماں باپ نے جھونک دیا تو اسی میں اب ساری زندگی کٹے گی تو کتنا بڑا گناہ ہے۔ قَوْلًا سَدِيْدًا ان معنوں میں ہے کہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سے انہوں نے پوچھا ہی نہیں تھا مگر کوئی یہ تو نہیں پوچھا کرتا ہر ایک سے کہ مرگی کا بیمار ہے کہ نہیں۔ جب رشتوں کی باتیں ہوں تو یہ ان

برائیوں میں سے نہیں ہے جس کا ظاہر کرنا گناہ ہے۔ان بیماریوں کا مضمون ہی بالکل الگ ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جہاں ظاہر کرنا لازم ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے یہ دو آیات نکاح کے موقع پر تلاوت کے لئے خود چنی ہیں یعنی وحی الٰہی کے تابع ۔اس لئے ہمیں یہ سمجھایا گیا کہ رشتوں میں لازماً قَوْلًا سَدِيْدًا سے کام لینا ورنہ بہت تکلیفیں پہنچیں گی معاشرے کو اور اکثر جو تکلیفیں ہیں وہ اسی طرح پہنچتی ہیں ۔آئے دن مجھے خط ملتے ہیں کہ جی ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس کی پچاس ہزار روپے ماہانہ آمد ہے اور آ کے پتا چلا کہ پانچ سو مشکل سے لیتا ہے اور وہ بھی ماں باپ کے اوپر پل رہا ہے۔اب بتائیں یہ تو خیر جھوٹ ہو گیا مگر قَوْلًا سَدِيْدًا میں اور باتیں آجاتی ہیں اس طرح کی۔مثلاً یہاں انگلستان میں ایک کمانے والا جو ہے وہ اگر پانچ سو پاؤنڈ مہینے کا لیتا ہے تو پچیس ہزار روپیہ ہے وہ۔اب قَوْلًا سَدِيْدًا کا تقاضا ہے کہ وہ جا کے بتائے کہ کچھ بھی نہیں ہے مجھے جو پانچ سو ملتا ہے اس سے بمشکل دو وقت کی روٹی کھاتا ہوں ۔وہاں جا کے نادانوں بے چاروں کو، ناواقفوں کو کہے مجھے پچیس ہزار روپے مل رہے ہیں، بڑی شاندار نوکری ہے تو وہ دھوکے میں آجاتے ہیں اور جب بیٹیاں رخصت کر کے بھیجتے ہیں تو یہاں آ کے پتا چلتا ہے کہ کھانے کو کچھ بھی نہیں ان کے پاس۔تو قول سدید کا جو تعلق ہے یہ خانگی معاملات میں بھی ہے اور جماعتی معاملات میں بھی بہت ہے اور میں جماعتی معاملات کے پہلو سے اب آپ کو خصوصیت سے متوجہ کر رہا ہوں اگر چہ حوالے بعض خانگی معاملات کے دئے ہیں۔

ہمارے نظام میں جہاں بھی کہیں رخنے پیدا ہوتے ہے، عام طور پر اللہ کے فضل سے اب جماعت کی اتنی تربیت ہو گئی ہے کہ جھوٹ نہیں بولتی شاذ ہی شاید کبھی کوئی اتفاق سے واقعہ ایسا علم میں آئے کہ کسی نے جھوٹ بولا ہو اور اس کی وجہ سے نظام جماعت میں رخنہ پیدا ہو وہ اب قَوْلًا سَدِيْدًا کی کمی سے ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے بہت سے معاملات ہیں جن کے تجربے آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور انگلستان کے جلسے کے تعلق میں بھی امیر صاحب کے سپرد میں نے کام کئے ہیں کہ کمیشن بٹھائیں،غور کریں یہ واقعہ ہوا کیوں آخر، ہونا چاہئے نہیں تھا۔جب پوچھا جاتا ہے تو جو جواب دیتے ہیں وہ اگر چہ اپنی ذات میں سچا ہو گا مگر پردے ڈالے جاتے ہیں ۔جب تحقیق کی جائے تو وہاں پردے اتارنے کا وقت ہے وہ ستاری کے وقت نہیں ہوا کرتے اس لئے آپ لوگ جب تک تقویٰ کی باریک راہوں کے مضامین کو سمجھیں گے نہیں اپنی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو ادا کیسے

کریں گے۔ایک آدمی جب پوچھتا ہے کہ بتائیں کون ذمہ دار ہے تو اس وقت جن لوگوں سے پوچھا جاتا ہے ان کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے دوست یا تعلق والے پہ پردہ ڈالیں۔رپورٹ یہ بھیج دیتے ہیں کہ ایک کارکن سے غلطی ہوگئی۔وہ ایک کارکن کون ہے۔آپ کے علم میں ہے تو میرے علم میں کیوں نہیں آتا،اس کا نام کیوں نہیں لیتے ،اس کا بتاتے کیوں نہیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے اور اندر اندر چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی کرتے چلے جاتے ہیں کہ جب غلطیاں ظاہر ہوتی ہیں تو پتا چلتا ہے کہ چونکہ انہوں نے وہ ریفرنس نہیں کیا تھا اس لئے غلطیاں ہوئی ہیں۔جو ذہنی ریفرنس کی میں نے مثال دی تھی یہاں میں مضمون جوڑ کر آپ کو بتا رہا ہوں، بہت سے ایسے امور ہیں جہاں اگر خلیفہ وقت کو آپ ریفر کر دیا کریں وقت کے اوپر تو بہت بڑی بڑی خرابیوں سے بچ سکتے ہیں کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کچھ بھی حرج نہیں مگر خلیفہ وقت دیکھتا ہے کہ حرج ہے،اس کو بعد میں پتا چلتا ہے اور اس وقت بہت بڑا نقصان ہو چکا ہوتا ہے۔تو ریفر کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں کہ جی ہم آپ کا وقت بچاتے ہیں۔اچھا وقت بچاتے ہیں کہ جو نقصان پہنچ گیا اس کے بعد جو روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا جو جماعت کے نقصان کی تکلیف پہنچا دی جو تحقیق کے وقت میرے وقت ضائع کئے وہ وقت ہی نہیں ہے میرا؟ تو اس لئے جب بات پوچھی جائے تو قَوْلًا سَدِيْدًا سے کام لیں کہ جی ہاں یہ اختلاف ہوگیا تھا اس نے کہا میرا ڈیپارٹمنٹ ہے،اس نے کہا میرا ڈیپارٹمنٹ ہے،اختلاف بتاتے نہیں۔اگر اختلاف بتائیں تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا کہ کس کی غلطی ہے۔تو اس لئے قَوْلًا سَدِيْدًا کی طرف میں آپ کو متوجہ کر رہا ہوں کہ انتہائی ضروری ہے کہ بڑھتے ہوئے نظام کے لحاظ سے صاف بات کہیں اور جہاں تک ممکن ہے خلیفہ وقت کو ریفر کریں اور جو اطلاعیں دیں وہ صحیح اور واضح دیں وہاں محض سچ کافی نہیں وہاں قَوْلًا سَدِيْدًا لازم ہے کیونکہ انسانی جسم جو اپنے دماغ کو پیغام پہنچاتا ہے وہ خالصۃً سچائی ہوتی ہے، بالکل قَوْلًا سَدِيْدًا کی بات ہوتی ہے،اس میں کوئی فریب نہیں ہوتا اور وہ جسم جس کے دماغ کو بغیر فریب کے اطلاعیں پہنچ رہی ہیں وہ سب سے زیادہ صحت مند ہوتا ہے۔

جہاں فریب آجائے وہاں مثلاً فالج ہوگیا ایک انسان کی Nerves کو،اعصاب کو، فالج کی وجہ سے یہ طاقت ہی نہیں کہ پوری بات پہنچا سکے وہاں دماغ ہمیشہ غلطی کرتا ہے پوری بات نہیں پہنچتی۔تو یہ بھی وہ مضمون ہے جہاں انسان کی مجبوریاں اور کمزوریاں ہیں۔فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کا

مضمون اس سے پھر دوبارہ ابھرتا ہے۔تو آپ کی جو قَوْلًا سَدِيْدًا کی کمزوریاں ہیں وہ خلافت پر اثر انداز ہوں گی یہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں اور یہ بات اتنی اہم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں سمجھانے کی خاطر اپنے آپ کو بھی اس سے بالا نہیں کیا۔حالانکہ جو آنحضرت ﷺ نے امکانی بحث چھیڑی ہے وہ کبھی ایک دفعہ بھی نہیں ہوا کہ ایسا واقعہ ہو گیا ہو اس لئے محض امکانی بحث ہے ہمیں سمجھانے کی خاطر۔فرماتے ہیں جب میں دو جھگڑنے والے فریقوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہوں تو صاف اور کھلی بات مجھے بتایا کرو۔ہو سکتا ہے کہ کوئی چرب زبان، یہ چرب زبانی جو ہے یہاں جھوٹ نہیں فرمایا یہ قول سدید سے ہٹی ہوئی بات ہے۔فرمایا سچ بولنا ہوگا مگر زبان کی چالاکیوں سے، ملمع کاری کی وجہ سے وہ اس طرح اپنا کیس پیش کر رہا ہے میرے سامنے کہ ہو سکتا ہے اس کی کوئی زمین، کوئی جائیداد میں اس کو دے دوں جو اس کا حق نہ ہو۔اگر رسول کریم ﷺ کے لئے ممکن ہے تو خلیفہ کی کیا حیثیت ہے کہ وہ اس سے بالا ہو، ناممکن ہے۔

پس آپ کا مجموعی تقویٰ ہے جو خلافت کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور وہاں آپ کا سدھرنا اور قَوْلًا سَدِيْدًا اختیار کرنا ساری جماعت کی صحت کا ضامن بن جاتا ہے۔پس اگر آپ ایسا کریں گے، غلط فیصلہ ہو تو اس کی ذمہ داری آپ پر بھی ہوگی اور مجھے بھی متوجہ کیا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کہ پھر زیادہ دعائیں کیا کرو جماعت کے لئے بھی، ان کے تقویٰ پر قائم رہنے کے لئے بھی اور جماعت بھی تمہارے لئے پہلے سے بڑھ کر دعائیں کرے تا کہ جو بڑھتے ہوئے وقت کے تقاضے ہیں ترقیات کے ہم ان کو احسن رنگ میں پورا کر سکیں۔احسن رنگ سے مراد ہے اس حد تک پورا کر سکیں جس حد تک ہماری استطاعت ہے اور ابھی اس وقت جو ترقیات ہیں وہ ہماری استطاعت سے آگے نکل چکی ہیں۔میں آپ کو بتا رہا ہوں بہت آگے نکل چکی ہیں اور کل آنے والی جو ترقیات ہیں وہ اور بھی زیادہ آگے نکل جائیں گی۔

پس جب اپنی استطاعت ختم ہو جائے اور اللہ کی استطاعت سے آپ کا پیوند ہو جائے تو پھر ہر چیز ممکن ہو جاتی ہے۔اس پیوند کے لئے دعا کی ضرورت ہے۔وہ پیوند ہے جو ان خلاؤں میں آپ کے خلاؤں کو آبادیوں سے بھر دے گا یعنی غیر معمولی طور پر ان کے اندر رونق پیدا کر دے گا جو اس وقت ہمارے لئے خلا ہیں، مگر اللہ کرے گا۔اگر آپ خدا سے پیوند کر لیں تو آپ کی طاقت میں جب اللہ کی

طاقت شامل ہو جائے تو اس نسبت سے جس حد تک آپ کا خدا سے پیوند ہے آپ کی طاقتیں لامتناہی ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ہو جائیں گی۔ پس توکّل کرتے ہوئے اگر آپ دعاؤں سے غافل نہ رہیں، اپنے عجز سے غافل نہ ہوں اور کامل طور پر توکّل کا مضمون سمجھتے ہوئے اللہ سے التجا کرتے رہیں کہ خدا ہمارے کاموں کو سنوار دے تو میں امید رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ وقت کے تقاضے ہم پورے کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

تین نماز جنازہ پڑھنے کا میں نے فیصلہ کیا ہے غائبانہ، اگرچہ میں نے جماعت کو یہ نصیحت کی ہے کہ آئندہ سے مجھے درخواست نہ کیا کریں نماز جنازہ غائب کی کیونکہ یہ مضمون جو ہے یہ طاقت سے بڑھ چکا ہے اور ایک بہت بڑا ابھر آگے ایک قسم کا اسلام کے اندر گویا نئی چیزیں داخل ہو جائیں گی مستقل حصہ بن کے۔ اس لئے ان چیزوں سے گریز کریں ورنہ میرے لئے الجھن ہو جاتی ہے مجھے مشکل پڑ جاتی ہے۔ کئی لوگ اس طرح جذباتی رنگ میں اپنے ماں باپ کی خدمتوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ میرے لئے ان کو رد کرنا ان کی دل شکنی کا موجب بن سکتا ہے، قبول کرنا اس اپنے فیصلے کی خلاف ورزی ہے کہ میں آئندہ سے ان رجحان کو روکوں۔ اس لئے میں دوبارہ یاد دلاتا ہوں کہ آپ لوگ درخواستیں نہ دیا کریں۔ بعض فیصلے میں خود کروں گا۔ نماز جنازہ پڑھنا غائب حرام تو نہیں ہے۔ جائز ہے، ممکن ہے لیکن موقع اور محل کے مطابق۔ تو بعض دفعہ میں اپنے بعض ایسے تعلقات کی بناء پر جن کی وجہ سے میرا حق ہے کہ میں ان کو استعمال کر کے کسی کی نماز جنازہ پڑھوں۔ بعض دفعہ کسی کی جماعتی خدمات کو جماعتی نقطہ نظر سے ایسا وسیع دیکھوں کہ میں یہ فیصلہ کروں کہ ہاں یہ حق دار ہے، رشتے داروں کی نظر میں نہیں بلکہ میری نظر میں بھی واقعۃً یہ حق رکھتا ہو کہ غیر معمولی استثنائی حالات میں اس کی نماز جنازہ غائب پڑھی جائے۔ تو اب میں یہ تو تفصیل بیان نہیں کروں گا کہ کس نقطہ نگاہ سے مگر زیادہ تر ذاتی تعلقات یا بعض پرانی خدمات میرے پیش نظر ہیں یا بعض فوت شدہ نوجوان کی غیر معمولی صلاحیتیں جنہوں نے دل پر غیر معمولی اثر کیا ہے اس لئے میں آج نماز جمعہ کے بعد تین مرحومین کی نماز جنازہ پڑھاؤں گا۔

ایک تو مکرم میاں محمد ابراہیم صاحب جمونی کی بیگم صاحبہ ہیں جو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ میاں ابراہیم جمونی صاحب کو بنانے میں اور ان کی اخلاص کے معیار کو بڑھانے میں اور قائم رکھنے میں

بہت غیر معمولی طور پر حصے دار تھیں اور عشق تھا ان کو نظام جماعت سے اور خلافت سے اور انکسار کا ایک عجیب عالم تھا تو اس لئے ان کے لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی نماز جنازہ پڑھاؤں گا۔

ایک ہمارے سکول کے زمانوں کے پرانے دوست محمد اسحاق صاحب تھے۔ چوہدری محمد اسحاق صاحب جو چوہدری الیاس کے والد جن کو خدا تعالیٰ نے بہت جماعت کی خدمت کی توفیق بخشی ہے۔ وہ قادیان میں ہائی سکول میں میرے واقف تھے اور تعلقات تھے اور انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے، غیر معمولی۔ مگر اس کو آپ میرے ذاتی کھاتے میں ڈال لیں کیونکہ بچپن کے تعلقات کی وجہ سے میرا دل چاہتا ہے میں بھی ان کی نماز جنازہ میں شامل ہوں۔

اور ایک ان کا الیاس کا بیٹا، چھوٹا بیٹا جن کا نام دانیال تھا، غیر معمولی اخلاص رکھنے والا انسان تھا وہ بہت توکل۔ کینسر تھا، کینسر کے جتنے علاج تھے سب تکلیف دہ تھے مگر ایک دفعہ بھی شکوہ زبان پہ نہیں لایا پوری طرح کامل راضی برضا، اتنا کہا کرتا تھا کہ میرے لئے حضرت صاحب کو دعا کے لئے لکھ دینا۔ جب بڑا آپریشن ہوتا تھا تو کہتا تھا فون کر دیں اور میری طرف سے اطلاع ملتی تھی کہ میں دعا کر رہا ہوں تو پوری طرح سکون مل جاتا تھا، کہتا تھا مجھے بڑا ہی سکون ملتا ہے۔ آخری لمحات خدا نے اس کے آسان فرما دیئے۔ لیکن اس کا جو راضی برضا رہنے کا انداز تھا اس نے اتنا میرے دل پر اثر کیا ہے کہ میرے دل سے یہ خواہش اٹھی ہے کہ میں اس مخلص کی بھی نماز جنازہ ادا کروں۔ تو یہ تین ہوں گی نماز جنازہ غائب اور میں امید رکھتا ہوں کہ آپ سب کی دعائیں مل کر ان کی روحوں کے ثواب کا موجب بنیں گی۔ آمین

آسمان سے جو پانی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا وہ آج جماعت احمدیہ کی روحانی زندگی میں اپنی نشوونما دکھا رہا ہے

(خطبہ جمعہ فرمودہ 13 ستمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰٮهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۵

(یونس:25)

پھر فرمایا:

یہ سورۃ یونس کی پچیسویں آیت ہے جس کی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے۔ زندگی کی ناپائیداری سے متعلق قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن کا انسانی زندگی کی ناپائیداری سے اور پھر اچانک خدا کے حضور جواب دہی کی حالت میں حاضر ہونے سے تعلق ہے۔ یہ وہ آیت ہے جس کا زندگی کے ہر شعبے سے تعلق ہے، زندگی کی ہر قسم سے تعلق ہے اور اس عالم میں جو کچھ بھی ہے اس کی بے ثباتی کا ذکر ہے اور اچانک خدا کی تقدیر جب نازل ہوتی ہے تو پھر وہ لوگ جو صاحب فکر ہیں

وہ جانتے ہیں کہ ان کے لئے پھر کوئی چارہ نہیں رہے گا کچھ بھی، خدا کی تقدیر کے سامنے اس سے بچنے کی، اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ بھی نہ وہ سوچ سکتے ہیں، نہ ان میں طاقت ہے کہ وہ کچھ کر سکیں اور ساری کائنات یہی منظر پیش کر رہی ہے۔

چنانچہ فرمایا اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ کہ انسانی زندگی کو اس کی ناپائیداری سکھانے کے لئے مادی دنیا میں جو زندگی کا آغاز ہے اس کی طرف متوجہ فرمایا ہے یعنی نباتات کی طرف اور یہ جو آیت ہے یہ فصاحت و بلاغت کا ایک ایسا حسین مرقع ہے کہ جتنا اس پر غور کریں اتنا ہی طبیعت اس کی شان و شوکت کے سامنے سرنگوں ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا اور دنیا میں روحانی زندگی کی بناء بھی پانی ہی پر ہے اور جسمانی زندگی کی بناء بھی پانی ہی پر ہے۔ اسی لئے جب قرآن فرماتا ہے وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً کہ ہم نے آسمان کو بِنَآءً بنایا تو بعض مفسرین مشکل میں پڑ جاتے ہیں کہ بناء تو نیچے ہوتی ہے۔ زمین کو بچھونا بنا دیا اور آسمان کو بنیاد بنا دیا۔ آسمان کیسے بنیاد بن گیا؟ تو اس کا ترجمہ پھر عمارت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک ایسی عمارت ہے جیسا کہ ستارے ایک خاص قسم کی شکل میں ڈھلے ہوئے ہیں اور بناء سے مراد آسمان پر بھی ایک عمارت کی بناء رکھی ہے۔

میں نے جو ترجمہ کیا اس میں بناء کو بناء ہی رکھا مگر بریکٹ میں ''زندگی کی بناء'' لفظ ''زندگی'' داخل کر دیا جس سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ پانی ہی پر زندگی کی بناء ہے جو آسمان سے اترتا ہے اور الہام پر زندگی کی بناء ہے جو آسمان سے اترتا ہے تو بناء سے مراد زندگی کی بناء ہے۔ زمین کو بچھونا بنا دیا یعنی ہموار کر دیا ورنہ جو پانی آسمان سے اترتا ہے یہ کبھی نہ ٹھہر سکتا۔ زمین میں ایسی صلاحیتیں پیدا کیں کہ اس کو اپنے اندر جذب کرے اور اس کو کچھ دیر رکھے اس کے نتیجہ میں پھر نباتات کی نشوونما ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں پہاڑوں پر بھی نشوونما ہوتی ہے وہاں پتھر روک بنتے ہیں کچھ تب جا کر زندگی پھولتی پھلتی ہے مگر انسانی زندگی کے لئے تو تمدن کی ترقی مقصود تھی وہ پہاڑی زندگی سے وابستہ نہیں ہو سکتی لازم تھا کہ زمین کو بچھونا بنا کر زندگی کو نشوونما کے لئے مزید مواقع مہیا کئے جائیں۔

پس حَیٰوۃِ الدُّنْیَا کی مثال پانی ہی سی ہے اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ جسے ہم نے آسمان سے اتارا فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ اس کے ساتھ پھر زمین کی نباتات مل جل گئیں۔ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ

اب اس میں یہ نہیں فرمایا کہ نباتات محض پانی سے پیدا ہوئی ہیں۔ نباتات کی بنیاد پہلے رکھی جا چکی تھی۔ نباتات کا بیج موجود تھا اور اگر کہیں بیج نہ ہو تو پانی کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ جتنا چاہے پانی اترے اگر وہ صَلۡدًا پر اترتا ہے چٹیل چٹان پر اترتا ہے اسے زندگی نہیں بخش سکتا اور یہی حال آسمانی پانی کا بھی ہے۔ اگر فطرت میں نیکی کا بیج ہوگا تو پھر آسمان کا پانی فائدہ دے گا، اگر نیکی کا بیج نہیں ہوگا تو وہ اسی طرح بنجر کا بنجر رہے گا پانی خواہ لاکھ اس پر اترے اسے کوئی زندگی نہیں بخش سکتا۔ پس زندگی کی گہری حقیقتیں اس آیت میں بیان ہوئی ہیں اور جتنا ان پر غور کریں اتنا ہی ان امور کو جب سب ایک آیت میں سمیٹے گئے ہیں قوانین قدرت کے مطابق ہی نہیں بلکہ قوانین قدرت کے گہرے راز بیان کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ مِمَّا یَاۡکُلُ النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ پھر اسی ابتدائی زندگی کی شکل سے بلند درجے کی زندگی استفادہ کرتی ہے اور تھوڑی ادنیٰ زندگی اس بالا شعور کو پیدا کر دیتی ہے جو انعام میں دکھائی دیتا ہے اور پھر ان سے بڑھ کر انسانوں میں اور آخری نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی بناء آسمان پر ہے اس کی زندگی کی بناء اس آسمان پر ہے۔ جو پانی اترتا ہے وہ کئی مراحل سے گزرتے ہوئے اس کی نشوونما کا سامان کرتا ہے پہلے نباتات اور پھر حیوانات۔ اگر نباتات نہ ہوں تو براہ راست پانی سے حیوانات زندگی نہیں پاسکتے اور اگر نباتات ہوں اور حیوانات ہوں تو انسان اوّل تو بن ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی اعلیٰ درجے کی ایک صورت ہے اور دوسرے حیوانات کو انسانی زندگی سے نکال دیں تو انسانی زندگی کے محض نباتات پر نہیں پل سکتی۔ ایک بیج کا درجہ ہے جو نباتات کو پروٹینز میں بدلنے کے لئے اور اعلیٰ درجے کی زندگی کی غذائیں بنانے کے لئے حیوانات کی صورت میں بیچ میں داخل فرمایا گیا ہے۔

فرماتا ہے یہ ہے تمہاری زندگی کی حقیقت۔ پھر اس میں سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی کھاتے ہیں۔ اب نباتات میں سے پہلے انسانوں کے کھانے کا فرمایا ہے کیونکہ اصل مقصود انسان ہی ہے اور جو آسمانی پانی ہے اس کی غذا تو خالصۃً انسان ہی کے کام آتی ہے اس لئے اوّلیت انسان کو دی ہے حالانکہ حیوانات کو ایک پہلے نچلے درجے کے طور پر قرآن کریم پیش فرماتا ہے۔ مگر جہاں تک مقصود ہے جہاں تک اس کائنات کے نقشے کی آخری غرض وغایت ہے وہ چونکہ انسان کی پیدائش ہے اور اس کا اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے اس لئے جہاں غرض کا بیان ہوا ہے وہاں انسان کو پہلے رکھ دیا۔ اس میں سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَازَّیَّنَتۡ یہاں تک کہ جب زمین کی جو سبزی ہے وہ پر رونق ہو جاتی ہے اور زینت اختیار کر جائے اس میں خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ

عَلَيۡهَاۤ اور زمین کے بسنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ اب وہ اس پر قدرت پا گئے ہیں وہ چیز ان کی ہوگئی ہے اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا ہماری تقدیر نازل ہوتی ہے کبھی رات کے وقت، کبھی دن کے وقت یا رات کو یا دن کو فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ اس طرح وہ کٹا ہوا جیسے فصل برباد ہو جائے اور کٹنے کے بعد خشک اور بھوسہ بن جائے اس کی مثال دی گئی ہے فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا ایسی کٹ کے برباد ہو جاتی ہے کہ جیسے کل بھی نہیں تھی۔ جو لمبی نشو ونما کا دور ہے اس کی طرف تو دھیان دور کی بات ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کل بھی یہ نہیں تھی کچھ بھی نہیں اس کا رہا باقی۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لئے جو غور کرنے کی عادت رکھتے ہیں اپنی آیات کھول کھول کر اور پھیر پھیر کر بیان فرماتے ہیں۔ نُفَصِّلُ میں تفصیل ہے اور دوسری جگہ قرآن کریم تصریف کا لفظ استعمال فرماتا ہے تو وہ تصریف براہ راست یہاں مذکور نہیں چونکہ اس مضمون کو تصریف کے حوالے سے بھی قرآن پیش فرما چکا ہے اور وہ بھی تفصیل کا ایک حصہ ہوتی ہے اس لئے میں نے معناً وہ ترجمہ کیا ہے ورنہ لفظاً وہ موجود نہیں ہے، لفظاً صرف اتنا ہے کہ اسی طرح ہم آیات کو خوب کھول کھول کر اور قابل فہم بنا بنا کر تمہیں دکھاتے ہیں۔

اس سارے مضمون کا آخری مقصد کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل فکر کے لئے اس میں کون سی نشانیاں ہیں۔ وہ کون ہیں جو فکر کر کے اس سے کچھ ایسی حقیقتیں پا جاتے ہیں جو ان کے لئے دین اور دنیا میں فائدہ مند ثابت ہوں۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپؐ سے فیض پاتے ہوئے خوب کھول کھول کر ہمارے سامنے بیان فرمایا۔ پس وہ آیات جو کھول کھول کر مضمون کو بیان کرتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس ان سے گزرتے ہوئے فوراً ان کے مطالب کی تہہ تک اتر جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جن کو خدا تعالیٰ نے عرفان کی طاقت بخشی ہو یعنی آنحضرت ﷺ جن پر ان آیات کا نزول ہوا اور وہ جنہوں نے آنحضورؐ سے فیض پایا ہو، ان کو یہ باتیں کھلی کھلی دکھائی دیتی ہیں اور اگر مخفی آنکھ سے، غفلت کی نظر سے آپ دیکھیں گے تو ان کھلی کھلی باتوں میں بھی آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ ایک منظر کشی ہے بس اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ کبھی فصلیں برباد ہو جایا کرتی ہیں۔

مگر قرآن کریم یہاں انسان کی زندگی کی بے اعتمادی، اس کی بے ثباتی کا منظر پیش کر کے

یہ فرماتا ہے کہ تمہارے اختیار میں آخر تک بھی دراصل کچھ نہیں ہے جب تک کہ تقدیر الٰہی تمہیں اجازت نہ دے اور تقدیر الٰہی اور اس کے منشاء کے بغیر تم اس تمام نظام کائنات سے یا نظام ربوبیت سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ پس آخری لمحے تک یہ خدا کا فضل ہے جو تمہارے لئے ربوبیت کے سامان کو مہیا فرماتا ہے اور تمہیں طاقت بخشتا ہے، توفیق دیتا ہے کہ اس ربوبیت کے سامان سے فائدہ اٹھا سکو۔ اس بے ثباتی کا تعلق زندگی کے دونوں پہلوؤں سے ہے مادی پہلو سے بھی انسان بہت کچھ بناتا ہے سوچتا ہے کہ میں اس سے یہ کروں گا وہ کروں گا مگر یہاں اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ (النحل:2) ان معنوں میں آتا ہے کہ جب وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ بن گیا اور میرے قبضہ قدرت میں آ گیا تو بعض دفعہ زندگی کے آخری لمحے اس کے لئے وہ حسرتیں لے کے آتے ہیں اس کا کچھ بھی نہیں ہوا ہوتا۔ آئے دن ایسی خبریں ملتی ہیں کہ دنیا کی دولتوں کے پیچھے پڑنے والے بڑے بڑے دھوکے دے کر، بڑے بڑے مال کما بیٹھے، اپنی مال و دولت کی سلطنتیں بنا لیں، آج کے اخبار میں بھی ایسے بعض اشخاص کا ذکر موجود ہے لیکن جو کچھ بنایا مرنے سے پہلے وہ حسرتوں میں تبدیل ہو گیا، سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا اور سزا اور پکڑ کے سوا ان کے لئے کچھ باقی نہ رہا۔ ایسے واقعات انگلستان میں بھی، امریکہ میں بھی آئے دن منظر عام پر ابھرتے رہتے ہیں۔ ہیں بہت زیادہ مگر ابھی دکھائی کم دے رہے ہیں لیکن ہوتا یہی ہے۔ تقریباً ہر انسان کی زندگی کا تجربہ اسے بتاتا ہے کہ جن چیزوں پر بناء کر کے وہ توقع رکھتا ہے کہ ایک میرا بہت ہی شاندار مستقبل ہوگا طمانیت سے لبریز لذّتوں سے بھرپور، وہ بسا اوقات ایسے دکھوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے کمایا تھا اس کے لئے طمانیت کا اور لذّت کا موجب نہیں بنتا بلکہ سب کچھ بے کار چلا جاتا ہے۔

یہ جو دنیا کی بے ثباتی ہے اس کا مذہب سے بھی ایک تعلق ہے اور بہت گہرا تعلق ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک دعا کیا کرتے تھے۔ آپؐ کی ایک زوجہ مطہرہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ یہ دعا کیوں کرتے ہیں کہ اے خدا مجھے ہدایت پر ثبات بخشنا جو سچائی ہے اس پر ثبات بخشنا۔ اب آنحضرت ﷺ جو تمام دنیا کے لئے ثبات کا نمونہ تھے، آپؐ کے عجز و انکساری کا یہ عالم ہے خدا سے دعائیں کرتے ہیں کہ اے خدا مجھے ثبات بخشنا کیونکہ اس راز کو جو ان آیات میں بیان ہوا ہے آپؐ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ جب سوال کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو دل خدا کی دو انگلیوں میں ہیں

جب چاہے ان کو یوں پلٹ دے، جب چاہے انہیں یوں پلٹ دے کسی انسان کی کسی چیز کا بھی کوئی اختیار ایسا نہیں کہ وہ اس پر حقیقی ملکیت رکھتا ہو، حقیقی مالک صرف اللہ ہے۔ تو آنحضرت ﷺ اس بلندی مرتبہ کے باوجود جہاں آپؐ کو آخرت کی سب سے بڑی بادشاہی عطا فرمائے گا، وعدہ فرما دیا گیا، تمام انبیاءؑ پر آپؐ کو ایک فوقیت بخشی گئی جو سب انبیاءؑ کے سردار کے طور پر آپؐ کو بعثت ثانیہ، دوسری دنیا میں یعنی اخروی زندگی میں ایسے وعدے فرمائے گئے جن کا ٹلنا ناممکن ہے لیکن اس کے باوجود اپنا وہ مقام آپؐ نے نہیں چھوڑا کہ سب کچھ، جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جب اپنے فضل کو مجھ سے اٹھانا چاہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا اور جس دل کی یہ قدردانی ہو رہی ہے وہ دل بھی تو اسی نے بخشا اور اسی کی طاقت اور اسی کی غلامی میں ہے جب وہ دل بدل دے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بہت بڑے بڑے نیک انسان بعض دفعہ زندگی کے آخری لمحوں میں پکے کافر اور مرتد اور ناشکرے ہو کے مرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگ زندگی ضائع کر دیتے ہیں گناہوں اور بدیوں میں لیکن ان کا انجام ایسے حال میں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کو یک دم پلٹتا ہے اور وہ دل کا پلٹنا ان کی کائنات میں ایک انقلاب برپا کر دیتا ہے، ایسا انقلاب برپا ہوتا ہے کہ ساری پرانی بدیوں کو وہ انقلاب کھا جاتا ہے، کالعدم کر دیتا ہے گویا ایک قیامت صغریٰ ہے جو ان کی ذات میں برپا ہوتی ہے۔ پہلے سب اعمال، پہلی ساری زندگی مر کے مٹ جاتی ہے اور ایک نیا وجود ابھرتا ہے۔ تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ جو اس آیت میں کھینچا گیا ہے وہ بہت ہی اہم ہے ہمارے لئے اپنے اعمال کی جانچ کی غرض سے اور یہ شعور پیدا کرنے کے لئے کہ اس چند روزہ زندگی کے لئے ہم کیوں خواہ مخواہ دنیا میں لوگوں پر ظلم کریں، کسی کے مال چھینیں، کسی کا مال غصب کریں، کسی پر تکبر کے رنگ میں اپنی دولت کی برتری اور اپنی امارت اور اپنی حکومت کی برتری جتائیں اور اسی فخر کی حالت میں مر جائیں اور ایسی حالت میں مریں کہ جب بھی مریں گویا کل کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ جو آیت ہے گویا کل کچھ بھی نہیں تھا یہ ہر مرنے والے پر صادق آتی ہے۔ جو کچھ بھی وہ کر چکا ہو، جو کچھ بھی کما بیٹھا ہو، جب موت کی ساعت آتی ہے تو یہ جو قرآن کریم کا بیان ہے اس پر بعینہٖ صادق آتا ہے۔ اس کی سوچ اس وقت اسے بتاتی ہے کہ ہیں یہ تو یوں ہاتھ سے نکل گیا گویا کل تک، کل بھی کچھ نہیں تھا، کچھ بھی ہمارا نہیں تھا۔

؎ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا (خواجہ میر درد)

درد کا یہ مصرعہ میں پہلے بھی بارہا پڑھ چکا ہوں کیونکہ بہت عارفانہ بات ہے۔ مرتے وقت انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ خواب ہی تھی کچھ بھی نہیں تھی تو اس دنیا کے لئے اتنی جان مارنا کہ بنی نوع انسان پر ظلم کرنا بہانے بنا بنا کر، ملک گیری کی ہوس کو پورا کرنا، مظلوم قوموں کو دبانا اور طاقت کے نشے میں اپنے اردگرد اپنے ماحول کے حقوق کو بھی غصب کرتے چلے جانا، دولت کمائی ہے تو اتنی کماتے چلے جانا کہ ایک دنیا غریب ہو جائے آپ کی دولت کی وجہ سے آپ کو کوئی پرواہ نہ ہو اور آپ اس کو اکٹھے رکھتے چلے جائیں، ایک جگہ جمع کرتے چلے جائیں جو بنی نوع انسان کے فائدے میں کام نہ آئے یہ ساری انسانی زندگی کا خلاصہ ہے۔

آج کی دنیا میں جتنی تباہیاں ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں حکومتوں کے رویے کو دیکھیں انسانوں کے رویے کو دیکھیں۔ قرآن کریم دولت کمانے کو منع نہیں فرماتا کیونکہ یہ سارا مضمون خاک سے زندگی پیدا کرنے کا اور اس کی نشوونما کا مضمون ہے خدا کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم بھی بڑھنے کی تمنا سے ہاتھ دھو بیٹھو یا دل سے نکال بیٹھو اور جہاں ہو وہیں کھڑے ہو کر جامد ہو جاؤ۔ ہرگز اللہ تعالیٰ یہ تعلیم نہیں دیتا مگر یہ وہ مضمون ہے جو جاری اور ساری ہے۔ آسمان سے پانی اترتا ہے اپنے آپ کو مٹی میں ملا دیتا ہے نئی زندگی کی صورت میں ابھرتا ہے اور سب کچھ ہونے کے بعد پھر وہ دوبارہ آسمان پر چڑھتا ہے اور پھر اسی سفر کو از سر نو دوبارہ شروع کرتا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ:4) کا ایک ایسا خوب صورت نظارہ ہے کہ جس کے بغیر زندگی قائم رہ ہی نہیں سکتی۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ جو مثال دی ہے پانی کی اس میں یہ بھی سبق دے دیا کہ اگر تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے اور اعلیٰ مقاصد کی خاطر اپنی طاقتوں کو استعمال کرو گے تو یاد رکھو کہ یہ کبھی ضائع نہیں جائیں گی بار بار دوبارہ تمہارے ہی کام آئیں گی۔ وہ پانی پھر آخر تم پر نازل کیا جائے گا جو تمہارے ہاتھ سے ایک دفعہ نکل جاتا ہے مگر دوسروں کو زندگی بخشتے ہوئے جائے گا۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے فیوض کا جو جاری کرنے کے بعد پھر وہ پانی پلٹا کرتا ہے اور اگر ایک جگہ جمع ہو جائے، ایک حوض میں بند ہو جائے تو سوائے تعفن کے وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا اور ایسا زہریلا ہو جاتا ہے پھر کہ اس میں زندگی بھی نہیں پنپ سکتی۔ پس یہ کائنات کا نقشہ کہ آسمان سے پانی کا اترنا اور پھر بہتے چلے جانا، تمام فیوض بخش دینا اور پھر جو کچھ بھی اس نے کیا اس کے فائدے سے آخر وقت تک اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی

استفادہ نہیں کرسکتا اس کو اگر انسان پیش نظر رکھے تو دنیا میں اس کے رہنے کے سلیقے بدل جائیں، اس کے آداب تبدیل ہو جائیں، اس کی سوچیں مختلف رستوں پر چلیں گی پھر۔ پھر وہ دنیا میں ایسا رہے گا کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے فائدہ دے گا اور ہر حال میں ہمیشہ اٹھنے کی تیاری رکھے گا۔

ایسا شخص جس کو یہ نہ پتا ہو کہ میرا کوچ کا حکم کب آتا ہے اس کو ہمیشہ تیار رہنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک بات میں نے آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کی تھی وہ لاعلم آدمی تھے مگر بہت ہی باطنی طور پر خدا تعالیٰ کی طرف سے علم یافتہ تھے۔ بہت ذہین اور عالم اور منصف مزاج سکھ بادشاہ تھے۔ وہ ایک دفعہ پگڑی باندھ رہے تھے بہت بڑی پگڑی باندھتے تھے تو کسی حواری نے ان سے سوال کیا کہ آپ جو اتنا لمبا کام کر رہے ہیں غالباً وہ ان کے مسلمان مرید تھے۔ ان کی طرف سے سوال تھا کہ اتنی لمبی جو پگڑی باندھتے ہیں اگر اچانک پتا چلے کہ فلاں جگہ یہ واقعہ ہو گیا تو کیا کریں گے آپ، پگڑی باندھتے باندھتے بڑا وقت لگتا ہے۔ تو اپنی تلوار سے جو ساتھ ہی تھی یوں پگڑی کاٹ کے کہا کہ میں یوں کروں گا کہ جہاں وقت آیا وہیں پگڑی ختم اور جو ضرورت کی آواز ہے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تو ہمہ وقت تیار رہنے کا جو مضمون ہے وہ اس مثال سے بھی نظر آتا ہے۔ کاروبار تو اب ہمیشہ انسانی زندگی سے آگے بڑھے ہوتے ہیں۔

؎ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں (حیرت الہ آبادی)

مگر وہ لوگ جو صاحب عرفان ہوں وہ ان سامانوں پر بھروسہ نہیں کرتے اپنی زندگی پر بھروسہ نہیں کرتے ذہنی طور پر تیار رہتے ہیں کہ جہاں بھی وقت ختم ہوا پگڑی بھی وہیں ختم ہو جائے گی اور پھر اس کو آگے نہیں بڑھنے دیا جائے گا۔ ایسی تیاری کی حالت میں انسان زندگی بسر کرے تو وہ خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے اور جب بھی مرے وہ اپنے حساب کے لئے تیار رہتا ہے۔ جو لوگ غفلت کی حالت میں اس مضمون سے لاعلمی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کا حساب تیار ہی نہیں ہوتا کبھی۔ بعض لوگوں سے آپ پوچھیں وہ ہر وقت ذہنی طور پر تیار رہتے ہیں اپنے کاروبار میں وہ سمیٹے رکھتے ہیں کاموں کو اور جو کام آگے آنے والے ہیں ان کے متعلق وہ بعض دفعہ ہدایتیں چھوڑتے جاتے ہیں تا کہ کسی وقت بھی بلاوا آئے تو پچھلوں کو تکلیف کا سامنا نہ ہو، جو کچھ حساب ہے صاف ہے، سب کو پتا ہو کہ کیا میں چاہتا تھا، کیا کرنا ہے لیکن جو لوگ غافل ہیں نہ وہ اپنی دنیا کے کاروبار کو سنبھال سکتے ہیں کیونکہ جب بھی خدا کی طرف

اچانک وقت آتا ہے تو ان کا کیا کرایا سب بھوسہ بن جاتا ہے اور نہ آخرت کے لئے تیار رہتے ہیں اور آخرت میں جب حاضری کا وقت آتا ہے تو بے سروسامان بغیر کسی تیاری کے اسی طرح حاضر ہو جاتے ہیں تبھی آنحضرت ﷺ نے ذہنی طور پر تیاری کا حکم دیا۔

ایک شخص نے قیامت کے متعلق عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ! قیامت کب ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا پوچھتے ہو، تیاری بھی کی ہے؟ اگر ہو بھی اور تیاری نہیں کی تو تمہیں اس سے کیا کب ہوگی۔ چھوٹی سی بات میں دیکھیں کتنی عظیم نصیحت فرمادی ہے۔ قیامت ہوگی ضرور۔ کب کا سوال تب ہوا اگر تم تیار رہو کیونکہ تمہاری قیامت آج بھی آسکتی ہے، ہر لمحہ آسکتی ہے اور تیاری سے مراد ہے کہ ہر لمحہ تیار رہو اگر ہر لمحہ تیار ہو تو پھر پوچھو بے شک کہ کب ہوگی۔ وہ اب ہوگی یا کل ہوگی تم ہر حالت میں مطمئن رہو کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ تم نجات یافتہ حالت میں دنیا سے رخصت ہو گے لیکن اگر تیاری کوئی نہیں کی ہوئی تو پھر کیا فائدہ؟ پس جماعت کو ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہمارے بہت سے الجھے ہوئے اخلاقی معاملات اس شعور کی کمی کی وجہ سے ہیں کہ ہم دنیا میں گویا آ کر ٹھہر جانے کے لئے آئے ہیں۔

تمام دنیا کی حکمتوں کی بدچلنیاں اور ظلم وستم اس احساس اور شعور کی کمی کی وجہ سے ہیں مگر دنیا کی حکومتوں کو تو بعض دفعہ یا حکومت والوں کو بعض دفعہ بار بار کی ٹھوکروں سے کچھ تجربہ ہو جاتا ہے کئی ایسے وزیر ہیں جو بے چارے اترنے کے بعد گلیوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں تو ان کا بے حیثیت ہونا، ان کا بے اختیار ہونا نہ صرف دکھائی دیتا ہے بلکہ باتوں میں بتاتے بھی ہیں کہ جی کل تک تو ہمارا یہ حال تھا آج ہمارا یہ حال ہے۔ ایک صاحب ایک دفعہ مجھے اسٹیشن پر ملے تھے اچھے معزز عہدوں پر فائز، ان سے میری گفتگو ہوئی میرے وہ احمدی دوست نہیں باہر کے کوئی تھے وہ کہتے کیا حال پوچھتے ہیں آپ پہلے بڑے بڑے سلام کیا کرتے تھے جھک کے اب ہمارا چپڑاسی بھی ملے تو نظر ادھر ادھر پھیر لیتا ہے کہ مجھے کوئی کام نہ بتادیں۔ دنیا کی بے ثباتی کا کچھ ذاتی احساس بڑے لوگوں کو دنیا میں ہوتا رہتا ہے لیکن جو خدا تعالیٰ کے حضور اعمال پیش کرنے کا مضمون ہے اس میں بسا اوقات یہ احساس پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس وقت شعور آتا ہے جب کہ وقت ہاتھ سے گزر چکا ہے اور پھر آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

پس بے ثباتی کا مضمون آپ کے اعمال کی نگرانی کے لئے ضروری ہے لیکن اگر مرنے کے بعد جی اٹھنے کا مضمون ساتھ نہ ہو تو پھر بے ثباتی بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی بلکہ بعض بے ثباتی گناہ

بڑھانے کا موجب بن جاتی ہے۔اس صورت میں یہ مضمون پیدا ہوگا کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کہ تم عیش کر جاؤ جو کرنا ہے کیونکہ دوبارہ پھر اس عالم میں نہیں آنا۔تو ایک ہی مضمون ہے ایک حوالے کے ساتھ نیکی کی تعلیم دینے والا بن جاتا ہے ایک حوالے کے ساتھ بدی کی تعلیم دینے والا بن جاتا ہے۔ یہ دنیا میں جتنے بھی بدکردار لوگ یا حکومتیں ہیں ان کو یہ تو پتہ ہے کہ ہے بے ثباتی مگر مرنے کے بعد جی اٹھنے کا خیال نہیں ہے ،مرنے کے بعد حساب دینے کا خیال نہیں ہے اس لئے ''بابر بہ عیش کوش'' کی آواز ان کے دل سے اُٹھتی ہے۔عیش کر جاؤ پھر دوبارہ نہیں آنا دنیا میں ایک ہی دفعہ جو کچھ ہونا ہے ہو جانا ہے جتنے دن ہیں مزے میں اڑا دو۔

لیکن اگر بے ثباتی کو جی اٹھنے کے بعد حساب کتاب کے ساتھ باندھا جائے تو ناممکن ہے کہ انسان اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہو۔ ہر لمحہ وہ متوجہ ہو جائے گا اور اگر یہ یقین ہو کہ کسی لمحہ میں میں جا سکتا ہوں تو پھر تو اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنے اعمال پہ نظر رکھنا ہوگا۔وہ یہ دیکھتا رہے گا کہ میں اب بھی تیار ہوں کہ نہیں ،اب تیار ہوں کہ نہیں۔آج اگر اس وقت جان جائے تو کس حالت میں جان دوں گا۔پس وہ جماعت جس نے سب دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے سپرد خدا نے یہ ذمہ داری فرما دی ہے۔کچھ اس میں دیکھا ہے تو خدا نے یہ ذمہ داری سپرد فرمائی ہے ورنہ ہر کس و ناکس کو تو یہ توفیق نہیں ملی۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور بہت ہی بڑا انعام ہے۔آسمان سے جو پانی محمد رسول اللہ ﷺ پر اترا وہ آج جماعت احمدیہ کی روحانی زندگی میں اپنی نشوونما دکھا رہا ہے اور سرسبزی دکھائی دے رہی ہے،طراوت دکھائی دے رہی ہے، ہر قسم کی زندگی کی شکلیں ابھر رہی ہیں لیکن اگر ہم اس بات کو بھلا دیں کہ ہم اس کے جوابدہ ہیں اور مستغنی ہو جائیں ، یہ سمجھیں کہ گویا ہمارا حق تھا ہم پر یہی ہونا تھا تو کسی وقت بھی جان ایسی حالت میں نکل سکتی ہے کہ ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہا ہو اور انفرادی طور پر لازم نہیں کہ ایک نیک جماعت میں شامل ہو کر ہر فرد برابر فائدہ اٹھا سکے بلکہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جن پر جتنا بڑا انعام ہوا اتنا ہی بڑا نقصان اٹھا سکتے ہیں۔

تو اجتماعی زندگی میں یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو اپنے فضل سے بڑے مقاصد کے لئے چنا ہے یہ ایک بات ہے مگر یہ کہ ہر شخص محفوظ اور مامون ہے یہ بالکل اور بات ہے۔ ہرگز ہر

شخص مامون و محفوظ نہیں ہے۔اگر کسی دماغ میں یہ وہم و گمان کا کیڑا اپنی پیدائش میں ہی کروٹ بدل رہا ہو یعنی ابھی پیدا بھی نہ ہوا ہو اور پیدائش کی حالت میں اس کا بیج بن رہا ہو تو ہمیشہ یادر کھے اس دعا کو جو رسول اللہ ﷺ اپنے لئے کیا کرتے تھے کہ اے خدا مجھے نیکی پر ثبات عطا فرما، مجھے ہدایت پر قائم رکھنا۔تو آپ کی اس نیکی کی کیا ضمانت ہے؟ آپ کی تو کوئی حیثیت نہیں۔آپ کی تو نیکی میں ایسی بدیاں لگی رہتی ہیں جو گھن کی طرح آپ کی نیکیوں کو کھاتی چلی جاتی ہیں۔ہم میں سے ہر ایک کا یہی حال ہے،کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔تو اس کا بغیر دعا کے سہارے کے اور بغیر ہمیشہ اس بات پر مستعد رہنے کے کبھی نیک انجام نہیں ہوسکتا کہ وہ دیکھتا رہے کہ میرے اعمال اب کس رخ پر ہیں۔کیا میرا رخ مسلسل ہدایت کی طرف آگے کی طرف ہے یا نہیں ہے اور دنیا سے میرا کتنا تعلق ہے۔

دنیا سے تعلق کے مضمون میں ہر چیز کا اپنا اپنا ایک امتحان ہے جو انسان کو درپیش رہتا ہے۔کبھی عام طور پر انسان سوچتا بھی نہیں۔بے ثباتی کا یہ مطلب نہیں کہ میں چلا جاؤں گا بے ثباتی کا تو یہ مطلب ہے کہ میرے تعلقات، میرے رشتے، میری کمائیاں مجھ سے چھوٹ جائیں گی اور وہ بسا اوقات اس طرح بھی چھٹتی ہیں کہ آپ رہتے ہیں اور وہ چلی جاتی ہیں۔کبھی آپ دولتیں چھوڑ کر مر جاتے ہیں کبھی دولتیں آپ کی زندگی میں آپ کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔کبھی آپ اپنے پیاروں سے اچانک جدا ہو جاتے ہیں اور کبھی آپ کے پیارے آنکھوں کے سامنے آئے دن آخرت کا سفر کرنا شروع کر دیتے ہیں اور آپ کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔بعض لوگ بڑے دردناک خط لکھتے ہیں کہ ہم پر تو ابتلاؤں کا ایک دور آ گیا ہے کل فلاں فوت ہوا آج وہ فلاں فوت ہو گیا، اب فلاں کی بیماری کی خبر ملی ہے اور یہ سلسلہ جو ہے وہ ایک سال سے یا دو سال سے ہم پر ابتلاؤں کا جاری ہے۔کبھی حادثات کا کوئی شکار ہو گیا تو مجھ سے پوچھتے ہیں ہم کیا کریں۔ان کو میں یہی کہتا ہوں کہ انا للّٰہ جو ہے وہ صرف گنوانے کے مضمون میں نہ پڑھا کریں کہ ہاتھ سے چیز جاتی رہی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا انّه للّٰه جو مرنے والا ہے وہ اللہ کا تھا اس لئے چلا گیا یہ سکھایا اِنَّا لِلّٰهِ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانے والے ہیں وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

تو ان کے لوٹنے کا غم کرنے کی بجائے اپنے لوٹنے کی فکر کیا کرو۔یہ سوچا کرو کہ تم ایسی حالت میں تو نہیں لوٹو گے کہ خدا کے بنے بغیر چلے جاؤ واپس۔جو مرنے والے تھے وہ تو اپنا حساب لے کر حاضر ہو گئے اگر ان کی خاطر تم واویلا کر کے خدا کو بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھو تو اِنَّا لِلّٰهِ کیسے پڑھو گے اور اگر واویلا کرو گے تو وہ تو آ ہی نہیں سکتے، ناممکن

ہے، خدا جاسکتا ہے۔تو یہ دوٹوک بات ہے اس کے سوا تمہارا چارہ ہی کوئی نہیں ہے۔ جو مرضی کرلو، سر پیٹتے رہو ساری عمر، چھاتیاں پیٹو مگر جانے والا واپس نہیں آئے گا تم ضرور جاؤ گے۔ ایسی حالت میں نہ جاؤ کہ جانے والا تمہیں وہاں بھی نہ ملے کیونکہ تم خدا کو گنوا بیٹھے ہو تو اس کے سوا اور کوئی حل ہی نہیں ہے اس کا۔ اگر اس مضمون پر انسان غور کرے تو تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف پر اس کا ردعمل ایک مثبت ردعمل ہوگا وہ ضائع نہیں ہوسکتا بلکہ ہر ایسی تکلیف جس کو خدا کی خاطر وہ برداشت کرتا ہے اس کے لئے بھی جزائے خیر پر منتج ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اس کے کئی گناہ جھاڑ دیتا ہے، کئی گناہوں کی پردہ پوشی فرماتا ہے کئی ایک سے اعراض فرما دیتا ہے اور پھر اصلاح فرما دیتا ہے اس کی۔

یہ بہت سے فوائد ہیں جو کسی کھوئی ہوئی چیز کے وقت جو ردعمل انسان میں پیدا ہوتا ہے اس سے وابستہ ہوتے ہیں اور اگر صحیح ردعمل نہ ہو تو جو کچھ ہے وہ بھی گیا۔ جو کچھ تھا وہ تو جا چکا، جو کچھ ہے وہ بھی جاتا رہے گا اور رونے پیٹنے کے سوا زندگی اور کسی کام نہیں آئے گی اور مرنے کے بعد اور بھی زیادہ رونا پیٹنا ہے۔ بڑا ہی بے وقوف ہے جو دنیا کی بے ثباتی کے مضمون کو نہیں سمجھتا۔ دو چار اوپر تلے چلے گئے تو کیا دو چار دس ہزار سال میں نکل گئے تو کیا۔ یہ قطعی بات ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ہم اللہ ہی کے ہیں اسی کی طرف ہم نے جانا ہے آج نہیں گئے تو کل گئے اس لئے دوسروں کی فکر کی بجائے جب کوئی مرے اپنی فکر کیا کرو۔ یہ ہے بے ثباتی کا مضمون جو اِنَّا لِلّٰهِ نے ہمیں سکھلا دیا اور لوگ ان کی فکر کرتے ہیں اپنی نہیں کرتے۔ خطرہ ہے کہ جب تم کسی کو جاتے دیکھو تو تم بھی ضائع نہ ہو جاؤ۔ یاد رکھنا تم اللہ کے ہو اللہ ہی کی طرف سے آئے تھے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے سب سے بڑی فکر تو اپنی کرنی چاہئے۔

آنحضرت ﷺ نے جو نماز جنازہ کی دعا سکھائی وہ عجیب ہے **اللھم اغفر لحینا ومیتنا** مرنے والوں کو بعد میں رکھا ہے زندہ کو پہلے کر دیا۔ فرمایا مرنے والے کی اب تم کیا فکر کرو گے وہ تو چلا گیا ہاتھ سے۔ سب سے زیادہ ضرورت ہے زندوں کی بخشش کی دعا مانگو کہ وہ مرنے سے پہلے بخشے جا چکے ہوں۔ مرنے کے بعد دعائیں بھی کام آتی ہیں مگر وہ دعا جو زندگی میں کسی کو بخشوا دے اس سے بڑھ کر اور کوئی دعا نہیں ہوسکتی اور پھر غائب سے پہلے شاہد کو کر دیا **و شاھدنا و غائبنا** مرنے والے غائب ہو گئے ہیں لیکن جو موجود ہیں ان کی فکر کرو کہ اللہ ان کو صحیح حال پر قائم رکھے یہاں تک کہ جب وہ مر رہے ہوں تو ایمان پر جان دینے والے ہوں۔ پس آنحضرت ﷺ کی دعائیں بھی قرآنی

تعلیم کے رنگ ہی میں رنگی ہوئی ہیں۔کہیں بھی آپ ان میں کوئی قرآن سے فرق نہیں دیکھیں گے۔ان کے اندر قرآن ہی کا رنگ ہے جو مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے اور ایک ادنیٰ بھی کہیں آپ تضاد نہیں دیکھیں گے آنحضرت ﷺ کی دعاؤں میں اور قرآنی تعلیمات میں بلکہ جوں جوں آپ غور کرتے چلے جائیں گے آپ حیران ہوتے چلے جائیں گے بلکہ حیرت کے سمندر میں غرق ہو جائیں گے کہ کتنی تفصیل کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی سوچیں قرآن کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں ایک ادنیٰ بھی کہیں اختلاف یا فرق دکھائی نہیں دے گا،ایک ہی کائنات ہے۔

پس اس پہلو سے آنحضرت ﷺ کی نصائح پر بھی غور کریں تو یہی مضمون ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ثبات دنیا کا مضمون بھی اسی طرح دکھائی دیتا ہے جیسا کہ قرآن پیش فرماتا ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کی نصائح پر غور کرنے ہی سے حقیقت میں قرآن کا مضمون کھلتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔تفصیل سے بیان کر دیا ہے مگر ان کے لئے جو یَتَفَکَّرُوْنَ (النحل:12)اس پر بھی تو غور کرو۔مضمون تو کھلا کھلا ہے لیکن لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ایسی قوم کے لئے جو فکر کرتی ہے اور ایسی کھلی بات نہیں ہے کہ ہر جاہل عالم کو برابر یکساں اچانک سمجھ آجائے گی۔ایسی بات جو سب کو برابر سمجھ آئے وہ سطحی ہوا کرتی ہے اور قرآن کریم سطحی باتیں بیان نہیں کرتا۔ایسی باتیں جو قرآنی حقائق ہیں جب وہ کھلی کھلی بھی ہوں تو ان میں گہرائی ہوتی ہے اس لئے اس کی سطح دکھائی دینے کی یہ مراد نہیں کہ آپ کو سب کچھ دکھائی دے گیا۔مراد یہ ہے کہ سطح دیکھو گے تو پھر نیچے ڈوبو گے پھر اور نیچے، پھر اور نیچے تمہیں تہہ بہ تہہ حقائق کی تہیں دکھائی دیں گی اور ہر اس تہہ میں مزید تم حقائق اور ہدایات کے موتی پاؤ گے ان کے جواہر جڑے ہوئے ہوں گے۔بے شمار مفادات ہیں جو قرآن کریم کی تہوں سے وابستہ ہیں جو اس کے بطن میں درجہ بدرجہ نیچے ڈوبنے سے دکھائی دیتی ہیں یا نظر آتی ہیں۔تو آنحضرت ﷺ کی نصائح کے ذریعے ہی ہم اس مضمون کو سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسی مضمون پر مختلف رنگ میں روشنی ڈالی کہ بے ثباتی کے ساتھ،وہ دنیا جو بے ثبات ہے اس سے ایسا تعلق نہ جوڑ بیٹھو کہ تمہارے لئے دین و دنیا دونوں میں نقصان کا موجب ہو اور جب وقت آئے تو تم یہ دیکھو کہ تمہارا وجود کل بھی کسی فائدے کا نہیں تھا لمبی زندگی تم نے فائدے میں گزارنی ہو یہ تو اور مضمون ہے۔جا ایسی حالت میں رہے ہو کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ساری سرسبزی جو ہے وہ پاؤں تلے روندے جانے

والے بھو سے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، میں آپؑ کے اقتباسات میں سے چند آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

سب سے پہلے تو آنحضرت ﷺ کی ایک نصیحت جو حضرت ابن عمرؓ کو آپؐ نے کی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں عنہما عمر پر بھی اللہ کی رحمت ہو ان کے بیٹے پر بھی اللہ کی رحمت۔ آنحضرت ﷺ نے میرے کندھوں کو پکڑا اور فرمایا تو دنیا میں ایسا بن گویا تو پردیسی ہے یا راہ گزر مسافر ہے۔ پردیسی جو ہے وہ بے چارہ بے اختیار ہوتا ہے اس کا بھی کوئی اختیار نہیں۔ راہ گزر مسافر کی بھی یہی کیفیت ہے وہ اپنی ملکیت میں نہیں پھر رہا ہوتا۔ پردیسی سے مراد ہے اس کے وطن کے حقوق نہیں ہیں وہ کسی اور وطن میں ہے ۔مسافر سے مراد یہ ہے وہ چلتا پھرتا ہے لیکن کہیں بھی اس کا قیام نہیں ہے وہ کسی جگہ کو اپنا بنا کے وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ تو دنیا کی بے ثباتی کا یہ نقشہ آنحضرت ﷺ نے کھینچا اور ایک چھوٹی عمر کے بچے کو کندھے سے پکڑ کر بتایا کہ ساری زندگی اسی طرح رہنا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس تعلق میں فرماتے ہیں یعنی ایک یہ روایت ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے متعلق جو یوں درج ہے کہ

> ''ایک معزز خاندانی ہندو دیوان صاحب جو صرف حضرتؑ کی ملاقات کے واسطے قادیان آئے تھے قبل نماز ظہر آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خواہش ظاہر کی کہ ان کو کچھ نصیحت کی جائے۔ حضرت نے فرمایا ہر ایک شخص کا ہمدردی کا رنگ جدا ہوتا ہے۔ (ہر ایک شخص کی ہمدردی کا رنگ جدا ہوتا ہے اور آگے جو رنگ ہے وہ بتا رہا ہے کہ یہ کون شخص ہے جس کی ہمدردی کا یہ رنگ ہے۔) اگر آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں تو وہ آپ کے ساتھ یہی ہمدردی کر سکتا ہے کہ آپ کی کسی بیماری کا علاج کرے اور اگر آپ حاکم کے پاس جائیں تو اس کی ہمدردی یہ ہے کہ کسی ظالم کے ظلم سے بچائے۔ ایسا ہی ہر ایک کی ہمدردی کا رنگ جدا ہے۔ ہماری طرف سے ہمدردی یہ ہے کہ ہم آپ کو نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا روزے چند ہے اگر یہ خیال دل میں پختہ ہو جائے تو تمام جھوٹی خوشیاں پامال ہو جاتی''

''تمام جھوٹی خوشیاں پامال ہو جاتی'' کیونکہ جس کو یہ پتا ہو کہ یہ جو میں نے سب کچھ حاصل

کیا ہے کسی وقت مجھ سے جدا ہو سکتی ہے۔ یہ دولت یا وہ بچے یا عزیز جو مجھے پیارے ہیں کسی وقت یہ مجھ سے جدا ہو سکتے ہیں یا میں ان سے جدا ہو سکتا ہوں تو اس کو تو ہر وقت کا دھڑ کا لگ جائے گا اور جتنا زیادہ وہ اگلی دنیا کے خیال سے غافل ہوگا اتنا ہی یہ دھڑ کا شدید اور ظالم دھڑ کا ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کو جب یہ وہم پیدا ہو جائے کہ ہمارے بچے نہ مر جائیں تو ان کی اپنی زندگی موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ کئی عورتیں جن کی بیماریاں جو اپنے علاج کے لئے کئی دفعہ ملتی ہیں یا خط لکھتی ہیں ان میں ایک یہ بھی بیماری ان میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتی ہیں ہمیں یہ ڈر ہے کہ ہمارا خاوند واپس ہی نہ آئے شاید۔ ہمارا بچہ نہ مر جائے، اب سکول گیا ہے تو پتا نہیں اس پہ کیا آفت ٹوٹ گئی ہے اور اس وہم میں جو حقیقت بھی بنا نہیں، ہو سکتا ہے اس کی ساری زندگی کبھی بھی نہ بنے، اس میں وہ اپنی زندگی کی موجود حقیقتوں کو ذبح کر دیتی ہے اور نہایت وحشت کی حالت میں زندگی بسر کرتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ یہ دیکھو میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اگر یہ خیال دل میں پختہ ہو جائے تو تمام جھوٹی خوشیاں پامال ہو جاتی ہیں۔ اب آپ دیکھیں ''جھوٹی خوشیاں'' کیسا فرمایا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عبارت کا ایک ایک لفظ ایک ایسا قیمتی موتی ہے جسے وہاں سے اکھاڑا نہیں جا سکتا اس کی جگہ تبدیل نہیں کی جا سکتی۔ ایک عام آدمی کہتا ہے خوشیاں برباد کر دیتا ہے تو پھر اچھی نصیحت کر رہے ہو۔ جو خوشیاں ہیں وہ بھی گئیں ساری کی ساری۔ فرماتے ہیں جھوٹی خوشیاں پامال کر دیتا ہے یہ خیال ''**اور غیر اس کے جھوٹ سارا**'' یہ مضمون ہے جو اس ایک لفظ میں بیان فرما دیا۔ فرماتے ہیں سچی خوشیاں بھی ہیں۔ یہ خیال سچی خوشیاں کو تقویت بخشتا ہے اور جھوٹی خوشیوں کو پاؤں تلے پامال کر دیتا ہے اور انسان خدا تعالیٰ کی طرف اپنا دل لگاتا ہے۔

یہ جو نصیحت تھی اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس معزز ہندو دیوان کو سمجھ آئی یا نہ آئی لیکن اس کے حالات دیکھتے ہوئے غالباً اس سے بہتر نصیحت اس کو کی نہیں جا سکتی تھی۔ ایک ہندو دیوان ہی صاحب حیثیت انسان تھا کیونکہ ہندو دیوان بڑے معزز لوگ تھے دنیا کے لحاظ سے بھی اور مال و دولت کے لحاظ سے بھی، رعب اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی۔ تو فرمایا کہ یہ دنیا کی چند دن کی باتیں ہیں تم اپنے اثر رسوخ کو ظلم میں استعمال نہ کرنا۔ اپنی دولت کا بے جا استعمال نہ کرنا، اس کا بے محل استعمال نہ کرنا ورنہ تم جھوٹی خوشیوں میں رہو گے۔ تم سمجھتے رہو گے کہ تم بڑی چیز ہو لیکن جب وقت آئے گا تو کچھ بھی نہیں نکلو گے۔ پس یہ وہ نصیحت

ہے جو صرف ایک دیوان کے نہیں سب دنیا کے دیوانوں کے اور فرزانوں کے کام برابر آتی ہے اس سے اعلیٰ نصیحت ہو نہیں سکتی کہ انسان دنیا کی ناپائیداری کا خیال کرے۔ فرماتے ہیں

”۔۔۔لمبے منصوبے اور ناجائز کارروائیاں انسان اسی واسطے کرتا ہے کہ اس کو معلوم نہیں کہ زندگی کے ایام کتنے ہیں۔ جب انسان جان لیتا ہے کہ موت اس کے آگے کھڑی ہے تو پھر وہ گناہ کے کاموں سے رک جاتا ہے خدا رسیدہ لوگوں کو ہر روز اپنے اور اپنے دوستوں کے متعلق معلوم ہوتا رہتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔۔۔“

وہ گردوپیش سے دیکھ کر اپنی فکر کرتے ہیں یہی بات ہے جو میں نے اِنَّا لِلّٰہِ کی تشریح میں آپ کے سامنے رکھی تھی کہ جب کوئی جایا کرے تو اپنی فکر کیا کرو اس سے بہت بڑھ کر تمہاری توجہ اپنے ضمیر کی طرف پھرنی چاہئے کہ ہم بھی تو اسی طرح نکل جائیں گے تو ہمارا کیا بنے گا اور جانا وہاں ہے جس کی سرکار میں جواب دہی ہے جس کے سوالوں سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں وہ رک جاتا ہے اور خدا رسیدہ لوگوں کو گردوپیش کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے

”۔۔۔اس واسطے وہ دنیا کی باتوں پر خوش نہیں ہو سکتے اور نہ ان پر تسلی پکڑ سکتے ہیں۔۔۔“

(ملفوظات جلد پنجم صفحہ:40-39)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام طاعون کی مثال دیتے ہیں یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ طاعون عام تھی غالباً یہ پھر 1900ء کے بعد بیسویں صدی کے آغاز کی بات ہوگی۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”۔۔۔یاد رکھو کہ زبان سے خدا کبھی راضی نہیں ہوتا اور بغیر ایک موت کے کوئی اس کے نزدیک زندہ نہیں ہوتا۔۔۔“

یہ جو دوسرا پہلو ہے اس کے متعلق پہلے بھی میں نے متوجہ کیا ہے جماعت کو مگر اب پھر میں عرض کرتا ہوں کہ صوفی جو کہتے ہیں کہ مر جاؤ پہلے اس سے کہ تم مار دیئے جاؤ۔ یہ جس رنگ میں انسان سمجھتا ہے اس سے ڈر جاتا ہے اور خوف زدہ ہوتا ہے میں کیسے مر جاؤں اور زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے پر ایک موت قبول کرلوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس مضمون کو بڑی حکمت اور پیار کے ساتھ سمجھاتے ہیں فرماتے ہیں:

’’۔۔۔ یاد رکھو زبان سے خدا کبھی راضی نہیں ہوتا اور بغیر ایک موت کے کوئی اس کے نزدیک زندہ نہیں ہوتا۔ **جس قدر اہل اللہ ہوتے ہیں سب ایک موت قبول کرتے ہیں** اور جب خدا ان کو قبول کرتا ہے تو زمین پر بھی ان کی قبولیت ہوتی ہے۔۔۔‘‘

یہ کہہ کر وہ لوگ جو اپنے رشتوں، اپنے اثر رسوخ کے تعلقات کو توڑنے سے گھبراتے ہیں ان کو تسلی بھی دیدی کہ جس موت کی ہم بات کرتے ہیں وہ ایسی خوفناک چیز نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو کہ انسان سب دنیا سے کٹ جائے سب دنیا کے تعلقات توڑ دے۔ اللہ تعالیٰ موت کو قبول کرتے ہی وہ نئی زندگی ضرور بخشتا ہے جو مادی موت سے بھی متعلق ہے اور مرنے کے بعد اسے مردہ نہیں رہنے دیتا۔

جس خدا کا یہ قانون ہے کہ ہر مردے کو جی اٹھائے گا دوبارہ اٹھالے گا وہ اس دنیا میں بھی تم سے یہی سلوک کرے گا اس لئے موت سے ڈرتے کیوں ہو۔ مر کر دیکھو پھر تمہیں پتا چلے گا کہ تمہارے مراتب، تمہارے دوستیوں کے تعلقات، تمہارے اردگرد ماحول پر جو تمہیں شان وشوکت نصیب ہوئی تھی اس پر بھی موت آجائے گی۔ وہ ایسی حقیر اور بے معنی چیزیں دکھائی دیں گی کہ جو چیزیں خدا تمہیں دے گا ان کے مقابل پر ان کی کوئی حیثیت دکھائی نہیں دے گی کیونکہ فرماتے ہیں

’’جب خدا ان کو قبول کرتا ہے تو زمین پر بھی ان کی قبولیت ہوتی ہے۔ پہلے خدا تعالیٰ خاص فرشتوں کو اطلاع دیتا ہے کہ فلاں بندے سے میں محبت کرتا ہوں اور وہ سب اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کی محبت زمین کے پاک دلوں میں ڈالی جاتی ہے اور وہ اسے قبول کرتے ہیں جب تک ان لوگوں میں سے کوئی نہیں بنتا تب تک وہ پیتل اور تانبا ہے اور اس قابل نہیں کہ اس کی قدر کی جاوے‘‘ (ملفوظات جلد سوم صفحہ:620)

پس موت کا جو تصور ہے وہ بڑا بھیانک ہے مگر اس تصور کے بھیانک پن میں کمی تب آتی ہے اگر جی اٹھنے کا مضمون ساتھ باندھا جائے اور جی اٹھنے کا جو مضمون ہے وہ مرنے کے بعد ہی انسان مشاہدہ نہیں کرتا اس دنیا میں دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے جب میں آپ کو جی اٹھنے کی طرف توجہ دلاتا ہوں یعنی دوبارہ زندہ ہوجانے کی طرف، مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی زندگی عطا کرنے کی بات کرتا ہوں تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ حوالہ اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ آپؑ نے

اس کا ایک قطعی ثبوت ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔فرمایا جتنے خدا کے بنے ہیں ان کو دیکھو وہ خدا کے لئے مر گئے تھے اور کوئی بھی ایسا نہیں رہا جسے مردہ حالت میں خدا نے چھوڑ دیا ہو اسی دنیا میں ان کو ایسی عزت، ایسی زندگی کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہ جو اس نئے دور کے ساتھ اپنے پرانے دور کا موازنہ کر کے دیکھیں تو ان کو اپنی جو خود قبول کی ہوئی موت ہے وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں ایک حقیر قربانی دکھائی دے گی۔ وہ اس لئے کہ جو پہلے کی زندگی تھی اس کی نعمتیں جو انہوں نے چھوڑی تھیں ان نعمتوں کے مقابل کچھ بھی نہیں جو خدا نے ان کو عطا کر دی ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے تجربے سے یہی مضمون بیان فرماتے ہیں کہ:

اک قطرہ اس کے فضل نے دریا بنا دیا

میں خاک تھا اسی نے ثریا بنا دیا (درثمین:117)

وہ کیا خاک تھی، وہ قطرہ کیا تھا؟ وہ وہ قربانیاں تھیں وہ پہلے کی زندگی تھی جسے آپ نے خدا کی خاطر مٹی میں ملا دیا۔اسے خود اپنے ہاتھوں سے خدا کی راہ میں قربان کرتے ہوئے گویا دنیا کی زندگی کے ذرائع سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔دنیا کی زندگی کے ذرائع میں دو ہی چیزیں ہیں پانی اور مٹی۔فرمایا کہ جو کچھ میں نے خدا کی راہ میں قربان کیا وہ پانی کا ایک قطرہ اور تھوڑی سی مٹی تھی اس کے سوا کوئی حیثیت نہیں تھی مگر:

اک قطرہ اس کے فضل نے دریا بنا دیا

میں خاک تھا اسی نے ثریا بنا دیا

اب دیکھیں کل عالم میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر خدا نے کیسا بلند فرمایا ہے۔زمین کے کنارے گونج اٹھے ہیں اس نام سے اور یہ ذکر بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔وہ خاک کی مٹھی جو آپ کہتے ہیں میں تھا اس نے تو کل عالم بننا ہی بننا ہے۔کوئی دنیا کی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔وہ قطرہ جو آپ تھے جب اسے خدا کی راہ میں قربان کیا تو وہ ساری دنیا کے لئے زندگی بخش پانی بن رہا ہے اور بنتا چلا جائے گا۔پس یہ حقائق ہیں جو آپ کے سامنے رکھے جا رہے ہیں کوئی فرضی قصے نہیں ہیں جن کی بناء پر آپ کو اصلاح احوال کی طرف متوجہ کر رہا ہوں۔اللہ تعالیٰ ان کو سمجھنے کی اور ان پر عمل پیرا ہونے کی اور ان سے استفادے کی ہمیں توفیق بخشے۔آمین

ہر احمدی مسلمان کو بددیانتی کے خلاف مستعد ہو جانا چاہئے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 20 رستمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۵﴾ (الزمر: 54، 55)

پھر فرمایا:

یہ آیات کریمہ جو سورۃ الزمر کی نمبر ۵۴ اور نمبر ۵۵ آیتیں ہیں۔(ان کا ترجمہ پیش کرنے سے پہلے میں گزشتہ خطبہ میں جو آیت تلاوت کی گئی تھی اس کے حوالے کی درستی کا اعلان کرنا چاہتا ہوں وہ سورۃ یونس کی آیت پچیس تھی لیکن لکھنے والے نے غلطی سے سورہ الرعد لکھ دیا تھا تو میں نے بھی جو لکھا تھا وہی پڑھ کے سنا دیا۔ آیت تو وہی تھی مگر صرف سورۃ کا حوالہ تھا آیت کا نمبر بھی وہی ہے یعنی پچیس نمبر مگر رعد کی بجائے اس کو یونس سمجھیں اب۔ یعنی جس نے بھی حوالہ دیکھنا ہو وہ یونس میں سے حوالہ دیکھے۔)

یہ دو آیتیں جو تلاوت کی ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا تو ان سے کہہ دے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اپنی

جانوں کے مفاد کے خلاف اعمال کئے ہیں یہ مراد ہے جانوں پر ظلم کیا ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو، تمام تر گناہوں کو بخشا ہے، بخش سکتا ہے اگر وہ چاہے۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ اگر وہ چاہے، کہ الفاظ یہاں نہیں ہیں۔ مگر دوسری جگہ جہاں بھی یہ مضمون آیا ہے اگر وہ چاہے کہ الفاظ ہیں تو اس لئے وہ اس مضمون میں شامل ہیں اس لئے میں نے وہ الفاظ پڑھے ہیں مگر لفظی ترجمے میں نہیں ہیں۔ لفظی ترجمہ صرف اتنا ہوگا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ تمام تر گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ یقیناً وہی ہے جو بہت زیادہ بخشنے والا اور بار بار رحم فرمانے والا ہے۔ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ اور اپنے رب کی طرف جھکو وَاَسْلِمُوْا اور اس کی فرمانبرداری اختیار کرو۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ پیشتر اس کے کہ تمہارے پاس عذاب آجائے ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ پھر تم مدد نہیں دئے جاؤ گے۔

تو یہ جو آیت ہے خدا تعالیٰ کی غیر معمولی بخشش اور بے انتہا بخشش کا مضمون پیش کر رہی ہے اس کے ساتھ ایک تنبیہ بھی فرما رہی ہے۔ اگر انسان اس خیال سے کہ خدا ہر گناہ بخش سکتا ہے بخش دے گا، گناہوں میں دلیر ہوتا رہے اور آگے بڑھتا رہے تو پھر عین ممکن ہے کہ اس کی موت ایسے وقت میں آئے جبکہ خدا کی ناراضگی کا اظہار اس دنیا میں اس سے شروع ہو چکا ہو اور جب پکڑ کا وقت آجائے پھر کوئی بخشش نہیں ہے۔ تبھی فرعون نے جب آخری ڈوبتے ہوئے ایمان کا اقرار کیا، موسیٰ کے اور ہارون کے خدا پر ایمان لانے کا اقرار کیا اور بخشش مانگی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ آٰلْئٰنَ یعنی بچانے کا ذکر کیا کہ مجھے بچالے اب کون سا وقت ہے اور پھر پکڑ آگئی۔

پس یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان دو انتہاؤں کے درمیان جو راہ اختیار کرنی ہے یہی دراصل وہ راہ ہے جسے پل صراط کہا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ کامل یقین کہ خدا گناہ بخش سکتا ہے انسان کو مایوسی سے بچاتا ہے جو اپنی ذات میں ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ جب بھی نصیحت آموز خطبات دیتا ہوں تو بعض احمدیوں کی طرف سے دنیا کے مختلف ممالک سے بڑی سخت پریشانی کا اظہار آتا ہے کہ ہم تو فلاں چیز میں ڈوبے ہوئے ہیں ہم نے اب کہاں بخشے جانا ہے یعنی توجہ پیدا ہوتی ہے گناہوں سے توبہ کی مگر سمجھتے ہیں کہ اب ہمارا بخشش کا زمانہ گزر چکا ہے۔ یہ اپنی ذات میں ایک کفر ہے اور خدا تعالیٰ

کی عظمت شان کے خلاف ایک گستاخانہ مضمون ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بدظنی کے طور پر بیان فرماتے ہیں کہ اپنے رب پر بدظنی نہ کرو۔ بندوں پر بدظنی بھی بڑا گناہ ہے مگر رب پر بدظنی بہت ہی بڑا گناہ ہے اور یہ جو بدظنی ہے یہ گناہوں سے باز آنے میں مدد نہیں دیتی بلکہ گناہوں میں آگے بڑھا دیتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو عبارت ہے میں نے اس مضمون کی تائید میں رکھی ہے وہ میں پڑھوں گا تو آپ کو سمجھ آجائے گی کہ اگر انسان مایوس ہو جائے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا پھر اور گناہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ وہ شخص جس نے ننانوے قتل کئے تھے اور وہ جگہ جگہ پھرتا تھا یہ سوال لئے ہوئے کہ کیا میں بخشا جا سکتا ہوں اور کیسے بخشا جا سکتا ہوں تو ہر طرف سے جب مایوسی ہوئی اور ایک بہت بڑے بزرگ جس پر اس کی توقع تھی کہ وہ تو ضرور میری صحیح راہنمائی کریں گے انہوں نے کہا کہ نہیں کوئی رستہ نہیں ہے۔ اس نے کہا پھر جہاں ننانوے وہاں سو بھی ہو جائیں پورے تو اسی کو قتل کر دیا۔ تو اب یہ دیکھیں کہ بعض دفعہ مایوسی گناہ کو بڑھانے میں مددگار ہو جاتی ہے اور انسان کو زیادہ جرأت بخش دیتی ہے کہ اب جو کچھ ہو چکا، ہو چکا پھر سب کچھ صحیح ہے۔

اور وہ لوگ جن کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِیۡٓـَٔتُهٗ (البقرہ:82) کہ ایسا شخص جس کو اس کی برائی نے گھیرے میں لے لیا ہو وہ ایسے ہی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اب تو ہم گھیرے میں آچکے ہیں اب بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے تو پھر پڑے رہو اسی میں آگے بڑھتے رہو اور اکثر گناہوں میں جو شدت اختیار ہوتی ہے وہ خدا کے فضل سے مایوسی کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ پس یہ آیت گناہوں پر انگیخت کے لئے نہیں بلکہ گناہوں سے بچنے کے لئے امید پیدا کرنے کے لئے ہے۔ ابھی بھی وقت ہے تم واپس لوٹ سکتے ہو، ابھی بھی وقت ہے تم واپس لوٹ سکتے ہو، ابھی بھی وقت ہے تم واپس لوٹ سکتے ہو کوئی تمہارے ایسے گناہ نہیں ہیں جن کو خدا بخش نہ سکتا ہو۔

پس یہ بہت ہی عظیم اظہار ہے اللہ تعالیٰ کی بخشش کا جو گنہگاروں کے لئے سب سے بڑا سہارا ہے۔ اگر وہ اس سہارے کا مضمون سمجھیں اگر واپسی کی تلاش شروع کریں اگر ان کے نفس کی پشیمانی بڑھنے لگے اگر وہ توبہ کی طرف مائل ہوں تو یہ آیت گنہگاروں کا سب سے بڑا سہارا ہے لیکن اگر یہ کہیں کہ خدا نے تو بخشنا ہی نہیں اب تو ہم بہت آگے گزر گئے ہیں اور اس کے نتیجہ میں گناہوں میں

آگے بڑھیں تو پھر ان کے لئے اس آیت کا اگلا حصہ ہے جو اطلاق پاتا ہے۔ وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ہے تو بہت بخشنے والا لیکن اللہ کی طرف توبہ کرتے ہوئے جھک جاؤ اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کردو۔ اَسْلِمُوْا میں فرمانبرداری بھی ہے اور سپردگی بھی ہے۔ اس کے سپرد کردو اپنے آپ کو، اس پر پھینک دو کہ اب تو تو نے ہی کچھ کرنا ہے، کرنا ہے ہم سے تو یہ داغ مٹتے نہیں اور اَسْلِمُوْا میں پھر دعا کا مضمون داخل ہو جاتا ہے۔ جب آپ کسی کے سپرد اپنے آپ کو کردیں تمام توکل اس پر کریں تو ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب تو تیرے سوا کوئی سہارا رہا ہی نہیں ہم نے اپنا سارا وجود تیرے حوالے کردیا اس لئے تو مددگار ہوجا۔ پس اَسْلِمُوْا کے نتیجے میں جو عاجزانہ دعائیں اٹھتی ہیں وہ بخشش کے لئے اور گناہوں سے بچنے کے لئے بہت ہی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

فرمایا یہ کرلو مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ اس وقت سے پہلے کہ عذاب آجائے۔ جب عذاب آجائے گا تو پھر بچ نکلنے کا، پھر بخشش کا کوئی وقت باقی نہیں رہے گا۔ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ پھر تم کسی طرف سے مدد نہ دیئے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ پھر اللہ تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ جب پکڑ کا وقت آئے گا تو پھر کوئی بھی تمہارا مددگار نہیں ہوگا۔ جب اللہ مددگار نہیں ہوگا تو کسی اور کو بھی توفیق نہیں ہوگی کہ وہ تمہاری مدد کرسکے اور تُنْصَرُوْنَ میں وہ دعا والا مضمون بھی ظاہر ہوگیا جس کی طرف میں نے اَسْلِمُوْا کے حوالے سے اشارہ کیا تھا۔ اَسْلِمُوْا میں جو سپردگی ہے اس کے ساتھ دعا کا ایک لازمی تعلق ہے اور تُنْصَرُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو گناہوں سے توبہ کی توفیق ملے گی اللہ کی مدد کے بغیر نہیں مل سکتی۔ اگر عذاب سے پہلے پہلے توبہ کرو گے تو اللہ کی مدد تمہیں نصیب ہوگی اور وہ مدد ہی ہے جس کی وجہ سے تم گناہوں سے نجات پاسکتے ہو۔ اگر وہ مدد نہ آئی اور تم نے مدد نہ مانگی یعنی تم نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی اور پکڑ کا وقت آگیا تو پھر نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد اترے گی نہ دنیا کا کوئی بچانے والا تمہیں بچا سکے گا۔ اس لئے بہت ہی اہم اور گہرا مضمون ہے اور جو نفس کی تربیت کا مسئلہ ہے یہ ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے۔ شاذ ہیں جو معصوم ہیں یعنی انبیاء علیہم السلام باقی سب کسی نہ کسی پہلو سے غیر محفوظ رہتے ہیں اور جب تک دعاؤں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے سہارے تلاش نہ کریں اور اس کی پناہ گاہ کی طرف ان کی نظر نہ رہے اور جب وہ یہ کہیں اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم تو اس کی پناہ گاہ پر نظر ہو پھر دعا

کریں ورنہ منہ سے کی ہوئی دعا کے کوئی بھی معنے نہیں بنتے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں تمہارے منہ کی باتوں سے خدا خوش نہیں ہوسکتا، کچھ بھی نہیں ہوگا۔تو میں نے جو پناہ گاہ پر نظر کا محاورہ استعمال کیا ہے یہ ایک اہم بات ہے جواب سمجھانا چاہتا ہوں۔اللہ پناہ گاہ ہے اور جب آپ کہتے ہیں کہ ہم شیطان سے تیری پناہ میں آتے ہیں اور تیری پناہ مانگتے ہیں تو ہر گناہ کے مقابل پر ایک پناہ گاہ ہوا کرتی ہے اور ہر گنہگار جو اپنے گناہ کو جانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس گناہ کی پناہ گاہ کیا ہے۔پس جب وہ اس پناہ گاہ پر نظر رکھے گا، کسی خاص گناہ کے حوالے سے جانے گا کہ اس حفاظت میں آؤں گا تو میں بچوں گا تو اس کی دعا معنی خیز ہو جائے گی وہ صرف منہ کی باتیں نہیں رہیں گی۔پھر جب وہ کہے گا اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم تو شیطان رجیم کے ان خطرات سے وہ پناہ میں آئے گا جو اس کے ذہن میں حاضر ہوں گے۔وہ جانتا ہوگا کہ ان سے بچنے کے لئے خدا تعالیٰ کی یہ رحمت نازل ہو تو پھر میں ان سے بچ سکتا ہوں اور اس کے نتیجہ میں ایک اور مضمون بھی انسان کے ذہن پر روشن ہوتا ہے جو قرآن کریم کی ان ہدایات سے تعلق رکھتا ہے جو ہر گناہ سے بچنے کے تعلق میں ہیں۔

پس دعا کے ساتھ انسان کو عرفان نصیب ہونا چاہئے۔دعا کے ساتھ انسان کا ذہن زیادہ روشن ہونا چاہئے اور وہ روشنی اس طرح ملتی ہے آپ کہتے ہیں اے خدا فلاں گناہ ہے میں تو گھیرے میں آ گیا مجھے معاف کردے مجھے بچالے لیکن پھر کیسے خدا بچایا کرتا ہے ان گناہوں سے۔قرآن کریم میں جو انبیاءؑ کے اور ان کی قوموں کے حالات کے ذکر ہیں ان گنہگاروں کے اور ان کے بچنے کے حالات مذکور ہیں وہ ساری معین پناہ گاہیں ہیں جن میں آپ پناہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔دیکھیں حضرت یوسفؑ نے بھی ایک دعا کی تھی اور عجیب دعا ہے کہ جیل خانے کو پناہ گاہ سمجھا اور اے خدا میں ان کے شر سے بچنے کی تیری مدد کے بغیر طاقت نہیں رکھتا۔جو میرا ذہن کام کرتا ہے وہ تو یہ ہے کہ اگر جیل خانے میں جانا پڑے اس بدی سے بچنے کے لئے تو میں تجھ سے یہی مانگتا ہوں۔اب معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کا مکر اتنا شدید تھا اور ان کی جو دنیاوی کشش تھی وہ اتنی فتنہ پرداز تھی کہ ایک نبی نے جب دعا مانگی ہے تو پناہ گاہ کا تصور سامنے رکھ کر دعا مانگی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے تجربہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ ان شیطانوں سے بچ نکلنے کی نہ مجھ میں طاقت ہے اگر خدا مدد نہ کرے اور نہ ان حالات میں مجھے کوئی پناہ گاہ نظر آ رہی ہے سوائے

اس کے کہ میں جیل میں چلا جاؤں۔ پس جیل سے بچنے کی دعا نہیں مانگی تھی جب ان کے فتنے سے بچنے کی دعا مانگی کہ خدا ہمیں بچالے۔ تو بعض لوگ اس کے بعد جب پڑھتے ہیں کہ اس کے باوجود جیل میں چلے گئے اور فتنہ ناکام نہ ہوا تو وہ فتنہ جیل بھیجنے کا فتنہ نہیں تھا، فتنہ جیل سے باہر رکھ کر گناہوں میں قید کرنے کا فتنہ تھا۔ اس قید پر جو گناہوں کی قید تھی آپ نے مادی قید کو ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کی تائید فرما دی۔ اگر خدا تعالیٰ سمجھتا کہ اس نبی کو علم نہیں ہے یہ دعا اس کو نہیں کرنی چاہئے تھی تو اللہ تعالیٰ دوسرا مضمون سمجھا دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہی فیصلہ فرمایا کہ ہاں جیل ہی میں جانا بہتر ہے لیکن اس پناہ گاہ کے ساتھ جو اور بہت سی رحمتیں وابستہ تھیں وہ ساری عطا کر دیں۔

اس لئے جب میں پناہ گاہ کی بات کرتا ہوں کہ اس کو معین کرو تو اس لحاظ سے کہ وہ ایک حقیقی دعا بنے گی پھر معین ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ جان لے گا کہ تمہارے دل میں کتنا خلوص ہے۔ کس حد تک تم ان گناہوں سے بچنے کے خواہاں ہو۔ پھر جو مشکل قربانیاں دکھائی دیتی ہیں نہ صرف یہ کہ وہ آسان ہو جائیں گی بلکہ ان کے اندر بے شمار رحمتیں اور برکتیں رکھ دی جائیں گی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ یہ کہہ سکتا تھا کہ جیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں میں تمہیں ویسے بچالوں گا۔ مگر جیل کی قربانی کو قبول کرنے میں دیکھیں کتنی لامتناہی حکمتیں تھیں۔ ایک مثلاً یہ کہ سات سال تک جس قحط کے عذاب میں مصر نے مبتلا ہونا تھا اور گردوپیش کے تمام ممالک نے بھی بھوکے مرنا تھا۔ اس ابتلاء سے یوسف کی قید نے بچایا ہے، باہر رکھ کر اللہ تعالیٰ اگر بچانے کے سامان کرتا تو یہ واقعہ پیدا ہوا ہے جس میں جیل بہانہ بنی ہے۔ بادشاہ کی رؤیا کا حضرت یوسفؑ تک پہنچنا یہ ممکن نہیں تھا عام حالات میں کون عزیز مصر کے پاس بادشاہ کا یہ پیغام لے کے جاتا کہ اس رؤیا کی تعبیر بتاؤ۔

پس خدا تعالیٰ کی جو حکمتیں ہیں وہ بہت ہی عظیم اور حیرت انگیز ہیں انسانی عقل کی رسائی وہاں ہو ہی نہیں سکتی جب تک ان حکمتوں کو ہم رونما ہوتے نہ دیکھ لیں۔ پس دیکھو کتنا بڑا انعام ہوا ہے یوسفؑ کی قربانی کا، اس دعا کا، وہ نہایت ہی خوف ناک پناہ گاہ جو اپنے لئے مانگی ہے چونکہ اخلاص سے مانگی گئی تھی وہ دعا قبول کی گئی اور اس کے ساتھ ایسی برکتیں رکھ دی گئیں کہ وہ جیل کے چند تنہائی کے سال ان برکتوں کے مقابل کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ جو حضرت یوسفؑ کی پناہ گاہ تھی غور کریں یہ ساری دنیا کی پناہ گاہ بن گئی۔ دور دور سے جو پناہ ڈھونڈتے ہوئے آتے تھے وہ حضرت

یوسفؑ کی اس پناہ گاہ کی برکت سے آتے تھے،اس کے صدقے سے آتے تھے اور اپنے بھائی آئے اور اپنے باپ سے ملاقات ہوئی یہ سارے جو خدا تعالیٰ نے انعامات وابستہ فرمائے یہ اسی گناہ سے بچنے کی پناہ گاہ تھی اس کے سوا اور کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بچپن کی رؤیا پوری ہوئی، چاند ستاروں نے سجدہ کیا یعنی اطاعت میں آ گئے۔

یہ دیکھیں کتنے عظیم الشان فوائد ہیں جو ایک مخلصانہ دعا سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بظاہر انسان سمجھتا ہے سرسری مطالعہ کرنے والا کہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت تھی یوسفؑ کو اس مصیبت میں ڈالتا وہیں دعا قبول کر لیتا۔ مگر چونکہ برکتیں بہت تھیں اور یہ بتانا تھا کہ خدا کی خاطر جو سختی کی پناہ گاہ ڈھونڈتے ہو وہ لوگوں کے لئے آرام کی پناہ گاہ بنے گی اور کثرت سے لاکھوں لوگ اور بڑی بڑی قومیں اس سے فائدہ اٹھائیں گی اور لمبے عرصے تک اس کی برکتیں پھیلتی چلی جائیں گی۔ پھر حضرت یوسفؑ کے بھائی آئے وہاں ان کے ساتھ رہے اس کے نتیجہ میں حضرت یوسفؑ کی قوم کو پھر اس بادشاہ، وہ بادشاہ فرعون نہیں تھا بلکہ باہر کے آئے ہوئے بادشاہ تھے،ان کے علاقے میں دیر تک بنی اسرائیل کو وہ سارے حقوق ملے اس سے پہلے جن سے وہ محروم تھے اور بنی اسرائیل پھر مصر میں جو آباد ہوئے ہیں تو اسی کی برکت سے آباد ہوئے ہیں۔

اور جب اس قوم نے خدا کو بھلا دیا جو حضرت یوسفؑ کی دعا اور قربانی کے نتیجہ میں اس پناہ گاہ تک پہنچی تھی تو وہ پناہ گاہ نہ رہی بلکہ اس پناہ گاہ سے لوگ پناہیں مانگنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ اور آپ کے ساتھیوں نے دعائیں کیں کہ اے خدا ہمیں اس پناہ گاہ سے نجات بخش، ہمیں نکال دے اس سے اور ایک وہ بھی ہے جب اس پناہ گاہ سے رہائی نصیب ہوئی ہے جس کو لوگوں کے اپنے اعمال نے گندا کر دیا تھا۔ تو قرآن کریم نے جو قصص بیان فرمائے ہیں وہ سلسلہ بہ سلسلہ گہری حکمتوں کے راز رکھتے ہیں اور وہ عقلوں کو روشن کرتے ہیں اور انسانی، مذہبی تاریخ کو سمجھنے کی توفیق عطا کرتے ہیں تو ان باتوں پر غور کرو۔ میں یہ مضمون اس لئے کھول رہا ہوں کہ میں نے عمداً ایک لفظ استعمال کیا آپ کو سمجھانے کے لئے اگر میں یہ باتیں نہ بتاتا تو آپ کو سمجھ نہ آتی کہ کیوں کہہ رہا ہوں کہ پناہ گاہ کو معین کرو۔

تم جانتے ہو کہ بعض گناہوں سے بچنے کی کیا راہ ہے جو تم اختیار کر سکتے تھے اگر تم سوچتے، غور کرتے۔ تمہیں طاقت نہیں ہے وہ راہ تو ہے۔ ہر انسان جانتا ہے اگر یہ ہو جائے تو پھر میں

بچ سکتا ہوں تو اس کو معین کرو اور پھر خدا سے یہ دعا مانگو کہ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس گناہ سے، اس کمزوری سے، اس لغزش سے، اس بدعادت سے، اس بدخلقی سے اور میں جانتا ہوں کہ میرے بس میں نہیں کہ میں یہ حل کرسکوں مگر میں جانتا ہوں کہ حل ہے کیا اور ہر انسان پر روشن ہوتا ہے وہ حل اور اگر نہ ہوتو پھر منجملہ یہ دعا کرسکتا ہے کہ تو بہتر جانتا ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ہر گناہ گار، ہر کمزور، ہر مصیبت میں پھنسا ہوا انسان اس کے حل سے واقف ضرور ہوتا ہے کہ اگر یہ ہوتو پھر میں بچ سکتا ہوں تو اسے معین رکھ کر پھر دعائیں کرے پھر اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت فرمائے گا اور اس وقت سے پہلے جو اس کی پکڑ کا وقت ہے وہ ضرور آپ کو بچالے گا۔ یہ وعدہ جو ہے پکڑ کا وقت اس میں ایک ایسا لفظ ہے جو بڑا ہی ڈرانے والا لفظ ہے یا ڈرانے والا محاورہ ہے کیونکہ ہمیں پتا نہیں پکڑ کا وقت کب آجاتا ہے۔ اس میں دو پیغام ہیں ایک تو یہ کہ زیادہ دیر نہ لٹکاؤ بات کو کیونکہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے یہ فیصلہ کہ کب پکڑ کا وقت شروع ہوتا ہے، میں اس سے پہلے پہلے بچ جاؤں۔ بعض دفعہ لوگ دریاؤں میں بہتے ہیں جو بعد میں آبشاروں میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں ان کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ آگے آبشار آنے والی ہے اور جب وہ پانی تیز ہو جاتا ہے اور اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ وہ تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں اس وقت وہ وقت ہاتھ سے گزر چکا ہوتا ہے پھر جتنے مرضی چپو ماریں ناممکن ہے کہ اس بہاؤ کی طاقت کے برخلاف چل سکیں۔ تو اچانک آتا ہے اور اس وقت تدبیر کا وقت گزر جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے ابتلاؤں اور آزمائشوں اور گناہوں کا حال ہے کہ جب وہ وقت آئے گا تو آپ کے بس میں نہیں ہوگا آپ کے علم میں نہیں ہوگا کہ کب کیسے آنا ہے اس لئے اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کی ضرورت ہے۔

اور اگر آپ کسی معین بچنے کی جگہ کا تصور باندھنے کے بعد پھر دعائیں کریں گے تو یہ سب سے بڑی ضمانت ہے اس بات کی کہ آپ اچانک پکڑے نہ جائیں گے کیونکہ جو خلوص سے دعائیں مانگنے والا ہے اللہ تعالیٰ کبھی اس کو اچانک نہیں پکڑتا اگر اس کی کمزوری لمبی ہو رہی ہے تو اس کو وہ مہلت دیتا ہے جس سے رفتہ رفتہ وہ کمزوری سے بچ نکلنے کی طاقت حاصل کر لیتا ہے یا جانتا ہے کہ کچھ نہ کچھ گناہوں کے کنارے بھرنے لگے ہیں۔ میں آگے نہیں بڑھ رہا گناہوں سے پیچھے ہٹ رہا ہوں، میں مزید شکنجے میں نہیں آرہا بلکہ کچھ نہ کچھ آزادی حاصل کر رہا ہوں۔ یہ کچھ نہ کچھ کا جو مضمون ہے یہ خدا کے

غضب سے بچانے کے لحاظ سے بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر فوری طور پر آپ نجات نہ بھی حاصل کر سکتے ہوں اگر کامل یقین کے ساتھ معین دعا کریں اور پھر اس کے لئے کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ ایسے مخلص کو پکڑا نہیں کرتا یا اس کی مہلت کو کاٹ نہیں دیا کرتا جو واقعۃً اس کی طرف بڑھ رہا ہو اور پھر وہ مضمون جو حضور اکرم ﷺ نے اسی مغفرت کے تعلق میں ہمیں سمجھایا ہے کہ پھر اگر وہ بدیوں سے بچ نہ بھی سکا ہو اگر بچ رہا ہو اور اس حالت میں بھی جان نکل جائے تب بھی خدا تعالیٰ کی بخشش اس پہ غالب آجائے گی۔

تو یہ وہ اللہ ہے یہ وہ ہمارا رب ہے جس سے ہمارا معاملہ ہے اور اس نے اس معاملے کی ساری راہیں کھول کھول کر، آسان کر کر کے ہمیں سمجھا دی ہیں۔ اگر اس کے باوجود ہم ان سے استفادہ نہ کریں تو بہت بڑا نقصان ہے اور بہت بڑی حماقت ہے۔ پس ایک یہ بات ہے جس کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور دوسرے اس کے اور بھی پہلو ہیں جن پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روشنی ڈالی ہے۔ اب میں آپؑ کے الفاظ آپ کے سامنے رکھتا ہوں تا کہ آپ کو یہ سمجھ آئے کہ اس جدوجہد میں جو بہت ہی بڑا جہاد ہے نفس کا اس میں ہمیں کیا کچھ کرنا چاہئے، کن چیزوں سے بچنا چاہئے کیونکہ ہمارے سامنے ایک عالمی جہاد درپیش ہے۔ وہی ہے جو ہمیشہ مجھے پریشان رکھتا ہے کہ اتنی بڑی قوموں کو ہم نے دعوتیں دے دی ہیں اور خدا تعالیٰ بھی اس کثرت سے ہمیں وہ قومیں عطا فرما رہا ہے کہ اب ایک فوج کا سوال نہیں فوج در فوج، Armies پر Armies آرہی ہیں اور ان کو سنبھالنا ہے۔ ان کو سنبھالیں گے کیسے اگر اپنی کمزوریوں کا یہ حال ہو کہ ان سے تو ہم نپٹ نہیں سکتے ان سے نجات نہیں حاصل کر سکتے اگلوں کو کیسے بچائیں گے۔

یہ وہ مضمون ہے جس کے پیش نظر میں نے یہ تمہید باندھی اور اب میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالوں سے آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ ہم پر کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ ہمیں کیا کچھ کرنا چاہئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ''کشتی نوح'' میں جو زبان استعمال فرمائی ہے یعنی جو محاورے استعمال فرمائے ہیں ان کو پڑھ کے تو لگتا ہے کہ کوئی بچ ہی نہیں سکتا کیونکہ آپؑ نے دوسرے کنارے بتائے ہیں بخشش والا وہ بہت وسیع ہے لیکن جہاں پہنچ کر انسان گر جاتا ہے وہ بھی تو ایک کنارہ ہے۔ اس کنارے پر کھڑا ہو کر کوئی آدمی بتا رہا ہو کہ یہ دیکھو اس قسم کی کھڈ ہے، یہاں پہنچے تو تم گئے، یہ قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان احتمالات کے پیش نظر کہ کوئی

بھی آپؑ کی جماعت میں داخل ہونے والا ضائع نہ ہو جائے ،کوئی بھی اس Precipice پر جو چٹان کا کنارہ ہے قدم نہ رکھے جہاں سے گرنے کے بعد پھر واپسی کا کوئی رستہ نہیں رہا کرتا۔

تو فرماتے ہیں یہ بھی میری جماعت میں نہیں ہے، وہ بھی میری جماعت میں نہیں ہے، وہ بھی میری جماعت میں نہیں ہے اور جماعت میں نہ ہونے والے کی جو کمزوریاں ظاہر کی ہیں ان کو پڑھتے ہوئے بعض دوست کہتے ہیں مجھ سے ذکر بھی کیا کہ ہماری تو جان نکل جاتی ہے ڈر کے مارے جب ''کشتی نوح'' اٹھاتے ہیں، پڑھی ہی نہیں جاتی کیونکہ ہر بات پہ لگتا ہے کہ ہم جماعت سے نکل گئے ۔کوئی بھی ایسی ہدایت نہیں ہے جس پہ ہم یقین سے کہہ سکیں کہ ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت میں داخل ہیں ۔تو یاد رکھیں وہاں جماعت میں داخل سے مراد وہ حصار ہے جس کے بعد خدا کی پناہ میں انسان آجاتا ہے اور ناممکن ہے کہ اس کو کوئی نقصان پہنچ سکے۔پس جب یہ کہتے ہیں کہ میری جماعت میں نہیں ہے تو اس چاردیواری کی بات کررہے ہیں جس کے متعلق اللہ نے خوش خبری دی تھی کہ جو تیری چاردیواری میں ہے اس کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ناممکن ہے کہ اسے کوئی شیطان،شیطانی وسوسہ یا شیطانی کوششیں نقصان پہنچا سکیں تو ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جماعت کے اس دائرے سے بھی نکال کے پھینکا جارہا ہے جو جدوجہد کا دائرہ ہے، جو اس دار کی طرف رخ کئے ہوئے ہے جس دار میں آخری پناہ مل جاتی ہے۔ چنانچہ یہ جو عبارت ہے یہ تشریح کی تائید میں ہے جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

آپؑ فرماتے ہیں گناہوں کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے حد سے تجاوز نہ کرنا۔اگر حدوں کے اندر رہو گے تو عیش وعشرت میں بھی بخشش ہو سکتی ہے۔اگر ظلم کرتے ہو لیکن حد سے آگے نہیں بڑھتے ،اگر غریبوں سے بے پرواہ ہو مگر کچھ پرواہ ضرور رکھتے ہو تو یہ وہ سارے رستے ہیں جن سے تمہیں مغفرت کی طرف راہ مل سکتی ہے اور میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ دوسری طرف حد سے تجاوز نہ کر جانا۔پس یہ دوسرا کنارہ اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بیان فرمارہے ہیں جس سے واپسی ممکن ہے۔اگر آپ اس سے آگے نہیں جائیں گے تو واپسی ممکن ہوتی ہے اور اس آیت کا اطلاق اس مضمون پر ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ بخش سکتا ہے، ہر چیز بخش بھی دیتا ہے لیکن ایسے حد سے نہ بڑھ جانا کہ پھر تم پر عذاب آجائے اور پھر عذاب آنے کے بعد تم

اس کی زد سے نکل نہ سکو۔ فرماتے ہیں:

''حد سے زیادہ عیاشی میں بسر کرنا لعنتی زندگی ہے''

(روحانی خزائن جلد 19 صفحہ: 71)

''حد سے زیادہ عیاشی'' یہ کیا چیز ہے حد سے زیادہ عیاشی۔ عیاشی کا ایک معنی تو ہے جو تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہوئے آرام کی راہیں تلاش کرنا اور ان میں ڈوبے رہنا اور مزید کی ہوس باقی رکھنا کہ جس حد تک بھی ممکن ہے ہم دنیا میں وہ سارے آرام اور عیش حاصل کر سکیں جن کی انسان تمنا کر سکتا ہے۔ اس آرزو کو لے کر جو صاحب حیثیت اور امیر لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ پھر وہ آگے بڑھتے چلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ پھر وہ دنیا کے مصائب اور مسائل اور تکلیفوں سے اس وقت تک ناواقف رہتے ہیں جب وہ تکلیفیں ان پر جب تک پڑ نہ جائیں اور آخر پڑ جایا کرتی ہیں۔ تو وہ عذاب والا مضمون جب تک ظاہر نہ ہو ان کو ہوش ہی نہیں آتی۔ وہ عیش و عشرت میں آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ تو وہ عیاشی حد سے زیادہ لعنتی ہے جو توازن نہیں رکھتی جہاں واپسی کے لئے انسان اپنی راہیں کھلی نہیں رکھتا، جب بگٹٹ آگے دوڑا چلا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتا۔ تو فرماتے ہیں یہ عیاشی کی زندگی لعنتی زندگی ہے۔

''حد سے زیادہ بد خلق اور بے مہر ہونا لعنتی زندگی ہے''

اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کشتی نوح میں یہ فرمایا کہ جو اپنے بھائی سے ذرا سا بھی تکبر سے پیش آتا ہے ذرا سا بھی بد خلقی سے پیش آتا ہے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ اس کی تشریح ہو رہی ہے۔ فرمایا ہے وہ جماعت جو میں کہہ رہا ہوں وہ پاکوں کی وہ جماعت ہے جس کی حفاظت کا خدا نے وعدہ کر دیا ہے۔ اگر تم میرے ہو جاؤ اور میرے گھر والے بن جاؤ تو اس کے لئے یہ یہ صفات تم میں ہونی چاہئیں۔ اب وہ فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے اندر یہ برائیاں اس حد تک قبضہ نہ کریں تو پھر مایوسی کی وجہ کوئی نہیں تم پھر بھی بچ سکتے ہو۔ تو بد خلقی کو پسند تو نہیں فرما رہے۔ حد سے زیادہ بد خلقی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اپنی زبان، اپنی روش اور رویے پر کوئی اختیار بھی نہیں پھر رہتا۔ لوگ ایسے بد تمیز ہو جاتے ہیں بعض دفعہ کہ نہ اپنوں سے اخلاق سے پیش آتے ہیں، نہ غیروں سے پیش آتے ہیں، نہ موقع دیکھتے ہیں نہ محل۔ اپنے بچوں سے بھی بد تمیز، اپنی

بیویوں سے بھی بدتمیز، اپنے رشتے داروں سے، اپنے بڑوں سے، اپنے چھوٹوں سے اور نا قابل برداشت وجود بن جاتے ہیں۔ فرمایا اگر یہ کرو گے تو پھر واپسی نہیں ہوگی۔

بدخلقی کے ساتھ اگر شرمندگی کا احساس رہے تو ایسی بدخلقی کو حد سے بڑھی ہوئی بدخلقی نہیں کہا جا سکتا۔ بعض بدخلق میں نے دیکھے ہیں بدخلقی سے پیش آتے ہیں اور بعد میں پھر رورو کے معافیاں بھی مانگتے ہیں اور بعض جلدی، بعض ذرا دیر میں۔ تو بدخلقی خواہ کتنی ہی بڑھی ہوئی ہو اگر کچھ ندامت کا احساس زندہ ہے، کچھ حیا باقی ہو تو ایسی بدخلقی کو انسان حد سے بڑھی ہوئی بدخلقی نہیں کہہ سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعریف فرما دی کہ حد سے بڑھی ہوئی بدخلقی، آپؑ کے الفاظ ہیں ''حد سے زیادہ بدخلق اور بے مہر ہونا لعنتی زندگی ہے'' بے مہر ہونے سے مراد پھر یہ ہے کہ انسان کے دل میں جو خدا نے نرمی اور شفقت رکھی ہوتی ہے وہ اٹھ جاتی ہے اور پھر دل ایسا سخت ہو جاتا ہے کہ پھر اس پر خدا تعالیٰ کی رحمت نازل نہیں ہوتی۔

ایک شخص نے اپنی بیٹی کو زندہ درگور کیا جہالت کے زمانے میں اور بڑی دردناک کہانی ہے۔ کس طرح وہ بیٹی پوچھتی رہی کیا ہو گیا، تم مجھ پہ کیوں مٹی ڈال رہے ہو۔ اس نے توجہ نہیں دی۔ بار بار وہ یہ بیان کرتا رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہ آواز آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی مٹی میں دبتی چلی گئی۔ میں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ نظر اٹھا کے دیکھا تو آنحضرت ﷺ زارو قطار رو رہے تھے۔ آنسوؤں کا دریا تھا جو آنکھوں سے بہہ رہا تھا اور یہ فرما رہے تھے کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا اور وہ بدنصیب کیسا بدنصیب تھا جس کی زندگی میں اس کی آخرت کا فیصلہ ہو گیا۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ فرماتے ہیں جو بے مہر ہو جائے، جس کے دل سے محبت مٹ جائے بنی نوع انسان سے یا خدا تعالیٰ کی مخلوق سے شفقت کو بھول چکا ہو اس کی پھر کوئی نجات نہیں ہے۔ وہ لعنتی زندگی ہے۔

''حد سے زیادہ خدا یا اس کے بندوں کی ہمدردی سے لاپرواہ ہونا لعنتی زندگی ہے۔۔۔''

یعنی خدا یاد ہی نہ رہے اور کروڑوں انسان ایسے ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور خدا اپنی عظمت اور اپنی ان صفات کے ساتھ یاد نہیں جو بندوں میں بھی عظمت پیدا کرتی ہے بندوں کی صفات بھی تبدیل کر دیتی ہے۔ اس لئے خدا یاد نہیں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ نہیں کہتے۔ ان میں بعض نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو مسجدوں کو آباد کئے ہوئے ہیں مگر خدا کو نہیں جانتے خدا سے ناواقف ہیں۔ اگر

یہ بات درست نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ آخری زمانے کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ کبھی نہ فرماتے:

''مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدی''

(مشکاة المصابیح ،کتاب العلم،الفصل الثالث)

کہ نمازیں خدا کے ذکر کی یقینی علامت نہیں ہیں۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم مسجدیں آباد کئے ہوئے ہو،نمازیں پڑھ رہے ہواور واقعۃً تم ذکر الٰہی کر رہے ہو۔اگر دنیا میں ذکر الٰہی کے آثار تم میں ظاہر نہیں ہوتے ، دنیا کی زندگی تمہاری ویسی ہی رہتی ہے جیسی پہلے تھی جیسے مسجد میں داخل ہوئے ویسے مسجد سے باہر نکل آئے۔تو فرمایا **مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدی** آباد تو ہوں گی ان کی مسجدیں اور ہدایت سے بالکل خالی۔کوئی ہدایت نہیں ہوگی ان میں۔

تو یہ بھی ایک بڑا اہم مضمون ہے کہ خدا یاد ہی نہ رہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما رہے ہیں ''حد سے زیادہ خدا یا اس کے بندوں کی ہمدردی سے لاپرواہ ہونا'' خدا سے لاپراوہ ہونا تو میں نے آپ کو بتا دیا ہے جس کی مثال آپ کے سامنے رکھی ہے۔اس کے بندوں کی ہمدردی سے لاپرواہ ہونے کا حال یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن کو اپنے بچوں، اپنے قریبی رشتہ داروں کے سوا عامتہ الناس دنیا کی مصیبت اور تکلیف کا احساس ہی کوئی نہیں ہوتا۔وہ بعض بڑے بڑے ریسٹورانٹس میں جہاں مشہور ہیں تکے اور کباب اور بعض جگہ وہ کہتے ہیں یہاں بریانی اچھی پک رہی ہے یہاں فلاں قورمہ اچھا بن رہا ہے وہاں گزر کے جا رہے ہوتے ہیں اور بعض ایسی بستیوں سے گزر رہے ہوتے ہیں جہاں مفلوک الحال لوگ رہتے ہیں اوران کے اگر بارش ہو جائے تب بچنے کے سامان نہیں، گرمی بڑھے تب بچنے کے سامان نہیں،سردی بڑھے تب بچنے کے سامان نہیں اور فاقہ کش بچے گلیوں میں گند میں کھیلتے ہیں کبھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ بھی خدا کی مخلوق ہے،ہم نے ان کے لئے کیا کیا ہے۔

اگر یہ احساس ہو تو پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں یعنی مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر احساس پیدا ہو کچھ نہ کچھ تو انسان ان کی فکر کرے۔یہ تو نہ ہو کہ بالکل بے نیاز اور بے حس ہو کر ان لوگوں کے پاس سے گزر جاؤ اور تمہیں کبھی خیال ہی نہ آئے کہ تمہارے آرام وآسائش میں ان کا بھی کچھ حق ہے۔تو فرمایا یہ ایک لعنتی زندگی ہے۔

’’۔۔۔ ہر ایک امیر خدا کے حقوق اور انسانوں کے حقوق سے ایسا ہی
پوچھا جائے گا جیسا کہ ایک فقیر بلکہ اس سے زیادہ۔۔۔‘‘

ہر وہ شخص جس کو خدا نے دولت بخشی ہے جس کے حالات بہتر بنائے ہیں فرمایا وہ ویسا ہی خدا کے ہاں پوچھا جائے گا جیسے ایک فقیر جس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ کیونکہ فقیر کے پاس تو خرچ کرنے کا کچھ ہے ہی نہیں۔ اس پر یہ آزمائش آئی ہی نہیں کہ مصیبت زدگان اور غریبوں کو دیکھے اور اس کے باوجود اس کا دل سخت رہے مگر امیر پر تو یہ آزمائش روز آتی ہے اور روز بسا اوقات بعض امیر اس میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ فرمایا پوچھا جائے گا یہ یاد رکھنا کہ تم میں سے ہر ایک پوچھا جائے گا۔ فرماتے ہیں:

’’۔۔۔ جو اس مختصر زندگی پر بھروسہ کر کے بکلی خدا سے منہ پھیر لیتا
ہے اور خدا کے حرام کو ایسی بے باکی سے استعمال کرتا ہے کہ گویا وہ حرام اس کے
لئے حلال ہے۔۔۔‘‘ (روحانی خزائن جلد 19 صفحہ: 71)

اب یہ وہ تعریف ہے گئے گزروں کی جواب ہو رہی ہے۔ جو کشتی نوح کی تعریف تھی وہ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو ان کے مقام سمجھائے جا رہے تھے کہ اس مقام پر ذرا بھی تم نے ٹھوکر کھائی تو اعلیٰ درجے کے لوگوں میں شمار نہیں ہوسکو گے۔ اب یہاں بدترین لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ بدترین اگر اس حد تک ہو جاؤ گے جیسا کہ ذکر کیا جا رہا ہے تو پھر تمہاری واپسی نہیں۔ واپسی نہیں کا مضمون لعنت سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ لعنت کا مطلب ہے دوری اور لعنت جب کسی کو کہا جائے کہ لعنت ہے تو ایک تو جذبات کے غصے کے اظہار کے لئے آپ کہہ دیتے ہیں لعنت۔ مگر انبیاءؑ اور عارف باللہ لوگ لعنت کو ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔

لعنت کا وہ جو مذہبی مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا سے دور چلا گیا اور اتنا دور ہٹ گیا کہ اب وہ واپس نہیں آسکتا اس کو ملعون کہتے ہیں۔ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام لعنتی زندگی کہہ کر یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ان چیزوں میں اگر تم حد سے تجاوز کر گئے تو یاد رکھنا خدا کی تقدیر میں تم لعنتی لکھے جاؤ گے اور پھر تمہاری واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ فرمایا جو حلال اور حرام کا فرق نہیں کرتا اور حرام کو حلال کی طرح کھاتا ہے اور کتنے ہیں ہمارے مسلمان بھائی جو پاکستان میں ہیں یا باہر ہیں وہ جن کو خدا تعالیٰ نے سب سے زیادہ حلال اور حرام کھول کھول کے بتایا اور دیکھیں کس طرح حرام رزق

پر منہ مارتے ہیں کہ ادنیٰ سا بھی احساس نہیں ہوتا کہ حرام ہے۔ذکر ہی کوئی نہیں اس بات کا۔فرمایا یہ لعنتی زندگی ہے۔اب جتنے مرضی ان کے خلاف اسلام کے فتوے دیئے جائیں وہ فتوے دینے والے خود بھی حرام پر ایسا منہ ماریں جیسے اپنی ماں کے دودھ پر بچہ منہ مارتا ہے تو وہ دوسروں کو لعنت سے کیسے بچا سکیں گے؟

اور رزق حلال کے متعلق اس لئے اور بھی زیادہ زور کی ضرورت ہے کہ یہ وہ فتنہ ہے جو نیکوں میں بھی داخل ہوتا ہے، نسبتاً آسانی سے داخل ہو جاتا ہے کیونکہ مالی منفعتوں سے اس بنا پر رک جانا کہ خدا کے منشأ کے خلاف ہیں یہ مشکل کام ہے اور کچھ نہ کچھ انسان نفس کے لئے بہانے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔چنانچہ آج جو ہماری اردو کی سوال و جواب کی مجلس تھی اس میں ایک صاحب نے یہی سوال کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ناممکن ہے کہ ہم تجارت کریں اور بے ایمانی نہ کریں یعنی تجارت کرنا اور حرام کھانا ایک ہی چیز کے دو نام بن گئے ہیں اس لئے اب بتائیں ہم کیا کر سکتے ہیں۔مجبور ہیں۔یعنی خدا تعالیٰ کی پکڑ سے بچنے کے لئے یہ عذر تھا کہ جب وہ حرام سے بچ ہی نہیں سکتے تو پھر جو مرضی کریں سب کچھ ٹھیک ہے۔ان کو میں نے سمجھایا کہ جس دوست نے آپ سے سوال کیا ہے، ان کا اپنا نہیں تھا کسی دوست نے بات کی تھی پاکستان سے آیا تھا اور ان سے ملا تھا، ان کو میں نے سمجھایا کہ دیکھیں اگر انسان کا ضمیر گندہ نہ ہو تو ہر قسم کے حالات میں وہ پاک زندگی بسر کر سکتا ہے۔اب یہ درست ہے کہ ایک انسان تجارت میں جتنا بچنے کی کوشش کرے کسی نہ کسی جگہ اسے کچھ تھوڑا سا اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے بعض دفعہ کچھ پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے جسے عامتہ الناس میں لوگ رشوت بھی کہتے ہیں حالانکہ بعض شرائط کے ساتھ وہ رشوت نہیں رہتی۔مگر اس کے علاوہ اور بعض ایسی باتیں ہیں آپ اپنے دودھ دہی کی دکان کریں، دودھ میں پانی نہ ڈالیں اور اس کے باوجود منافع تھوڑا رکھتے ہوئے بھی آپ گزارہ کریں تو یہ کہہ دینا کہ دودھ میں پانی نہ ڈالیں تو تجارت نہیں چل سکتی کیونکہ سب دنیا دودھ میں پانی ڈالتی ہے یہ ہے ہی غلط کیونکہ دنیا جو پانی ڈالتی ہے اس سے باقی ساری دنیا جو انہی کی دنیا ہے بیزار بھی ہے اور اگر قسمت سے کوئی ایسا دودھ والا مل جائے جس پر آپ کو یقین ہو کہ یہ پانی نہیں ڈالتا تو آپ اس کو دگنی تگنی قیمت دے کر بھی اس سے وہ دودھ لیں گے۔اس لئے یہ خیال کر لینا کہ ایسے لوگوں کی تجارت چلتی ہی نہیں جھوٹ ہے بالکل۔بہت سے ایسے تجربے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں

کی تجارت نہ صرف چلتی ہے بلکہ باقی تجارتوں پہ غالب آجایا کرتی ہے۔قادیان میں ایسے فقیرانہ مزاج کے مہاجر تھے جو بڑے عزت والے خاندانوں سے وابستہ ،سید زادے اور بعض معزز پٹھان شہزادوں سے تعلق رکھنے والے قادیان آئے دودھ دہی کی دکان کھولی اور اتنا لوگ اٹڈ اٹڈ کرآتے تھے کیونکہ ان کی دیانت اور تقویٰ کی وجہ سے وہاں ہر چیز صاف ستھری اور خالص اوراس کے نتیجہ میں باقی دکانوں سے زیادہ مزے دار ملتی تھی۔تو اسی سے انہوں نے پھر جائیدادیں بنائیں ،اسی سے ان کی اولادیں بڑی بڑی تعلیم حاصل کر کے دنیا میں پھیل گئیں۔

تو دوطریق سے اللہ تعالیٰ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے والوں کی مدد فرماتا ہے ایک تو یہ کہ اگر واقعۃً سچی دیانت ہو تو ایسی تجارتوں میں خدا برکت عطا فرما دیتا ہے اور جو اس تجربہ کو جانتے نہیں وہ دور بیٹھے ڈر کر ان باتوں سے ویسے ہی احتراز کر جاتے ہیں، پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور دوسرا آسمان سے لازماً برکتیں نازل ہوتی ہیں ۔ان کے اموال میں برکتیں پڑتی ہیں۔ان کے زندگی کے حالات میں، ان کی اولادمیں، ان کی صلاحیتوں میں، اوران کی دین سے وابستگی اور وفا میں برکتیں پڑتی ہیں اور ایسے بچے پیچھے چھوڑ کے جاتے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ دنیا میں بھی اعلیٰ ترقی حاصل کرتے ہیں اور دین میں بھی وہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں جو دیانت کی معمولی باتیں ہیں اب دودھ دہی کی دکان کیا ہوئی مگر دیکھو آپ حالات پر نظر ڈال کے دیکھیں ان کی اولادوں کا جائزہ لیں وہ دنیا میں پھیلی گئی ہیں۔وہ بڑی عزت اور عظمت سے یاد کئے جانے والے لوگ ہیں۔اب ان کا نام آپ کو تاریخ احمدیت میں ملے گا تو آپ کا سر جھکے گا ادب سے اور آپ میں سے اکثر کو شاید پتا ہی نہ ہو کہ وہ ایک دودھ کی دکان کرنے والا آدمی تھا۔کچھ کھیر بنانی سیکھ لی، کچھ دہی اچھی بنانی سیکھ لی اور اسی سے خدا تعالیٰ نے اس کے گھر کو برکتوں سے بھر دیا۔اب ہمارے ماٹا ہوتے تھے،ان کی اولاد دیکھیں خدا نے کیسی پھیلا دی ہے دنیا میں ،اور کتنی ان کو برکتیں دی ہیں وہ آلو چنے بیچنے والے تھے بس،مگر تھے دیانتدار۔

تو دیانت میں بہت سی برکتیں وابستہ ہیں جو فوری بعض دفعہ دکھائی نہیں دیتیں مگر ہوتی ضرور ہیں اور یہ سفر اس لئے ضروری ہے کہ انفرادی طور پر برکتوں کی خاطر نہیں خدا کی خاطر جب آپ دیانت اختیار کریں تو برکتیں ضرور ملتی ہیں۔مگر اگر یہ نہیں کریں گے تو ساری قوم لازماً بددیانت

ہو جائے گی اور جو قومیں بد دیانت ہو جائیں وہ ایک دوسرے کا خون پی رہی ہوتی ہیں اور دنیا سے ان کی تجارتیں بے سود بے معنی ہو کے رہ جاتی ہیں اور دنیا ان کو دھتکار دیتی ہے۔اس لئے دن بدن ان کی روپے کی قیمتیں گرتی ہیں ان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں ان کی منڈیاں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوشحال ہیں کیونکہ ہر بے ایمان معاشرے میں وقتی طور پر خاندانوں کو خوشحالی ملتی ہے اور حکومتیں بدحال ہو جاتی ہیں کیونکہ ٹیکس نہیں جاتا ان کو۔اب ٹیکس کی بات وہاں چلی تھی اسی سوال جواب میں۔میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ میں جانتا ہوں کہ اگر انسان کتنی بھی دیانتداری اختیار کر لے بعض ملکوں میں جب ٹیکس کی جگہ آئے گی تو وہاں ٹیکس والے مجبور کر دیں گے بد دیانتی پر اور بد دیانتی پر مجبور کریں گے اور ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ یا وہ اپنی جائز آمد سے بہت بڑھ کر ٹیکس ادا کرے اور تجارت کا ایک دم صفایا ہوتا چلا جائے یا پھر بد دیانتی میں ملوث ہو جائے۔میں نے کہا اس سے بھی بچنے کی راہ ہے کیونکہ ایسے لوگ جانتے ہیں کہ جب وہ ایک ٹیکس والے کو پیسے دیتے ہیں تو محض اس لئے نہیں دیتے کہ ان کا جائز ٹیکس لگے وہ پھر اپنا جائز ٹیکس بھی بچاتے ہیں اور ناجائز فائدے اور بھی حاصل کر لیتے ہیں۔تو انسان اگر تقویٰ سے بچنا چاہے تو بچ سکتا ہے۔ان سے کہے کہ تمہارا منہ جو بھرنا ہے وہ مجھے بتاؤ اپنے منافع میں سے بھرنا پڑے گا نسبتاً منافع کم ہو جائے گا اگر دیانتداری پر قائم رہے اور اپنے منافع سے اس ظالم کا منہ بھرتا ہے تو میں جانتا ہوں کہ خدا ایسی تجارت کو بے برکت نہیں کیا کرتا۔ہمیشہ اللہ تعالیٰ غیر معمولی حالات پیدا کر دیتا ہے اور ایسا تاجر بچ جاتا ہے اگر بچنے کی خواہش ہو۔

یہ باتیں میں باہر بیٹھا نہیں کر رہا مجھے تجارت کی دنیا کی خبر نہیں ہے میں دور سے دیکھ کر ایک فرضی ہدایتیں دے رہا ہوں۔جماعت احمدیہ کی بعض تجارتوں میں خلیفۃ المسیح نے مجھے نہ صرف ڈائریکٹر مقرر فرمایا بلکہ ایسا اختیار دیا کہ گویا میرا مشورہ جو تھا وہ حاوی تھا باقی سب مشوروں پر اور کاٹن کی تجارت تھی بعض دوسری چیزیں ایسی تھیں۔اس حال میں ہم نے شروع کیا کہ بہت ہی برا حال ہو چکا تھا سب کچھ بکنے کو تیار تھا لیکن خدا نے سہارے دئے اور ہر مشکل کے وقت مدد فرمائی صرف فیصلہ یہ تھا کہ ہم جس حد تک ممکن ہے دیانتداری سے کام کریں گے اور اگر کسی محکمے سے اس قسم کا رابطہ کرنا پڑتا ہے تو بعض ایسے آدمی تھے جو اس بات کے ماہر تھے ان کے ذریعے رابطہ کرنا پڑتا تھا لیکن

ہدایت ہماری یہ تھی کہ ایک دمڑی بھی حکومت کی یا ملکی دولت کی ہم اپنے لئے نہیں لیں گے۔صرف ہمیں امن سے کام کرنے دیں اور خدا نے برکت ڈالی۔

سود سے کہتے ہیں،سود سے کیسے بچو گے؟ یہ ٹھیک ہے کہ بسا اوقات انسان نہیں بچ سکتا،لیکن اگر ارادہ ہو،نیت ہو اور اخلاص ہو اور دعا ہو تو بچ بھی سکتا ہے۔ ہمارے ایک کاروبار میں مسلم کمرشل بینک سے واسطہ تھا اور کاٹن کے یعنی اس روئی کے کاروبار میں بہت بڑے قرضے لازماً اٹھانے پڑتے ہیں اور ان قرضوں کے بغیر وہ کاروبار چل ہی نہیں سکتے کیونکہ عام جو کارخانے دار ہیں یا جننگ فیکٹریوں کے مالک ہیں ان کے پاس اتنا سرمایہ تو ہوتا ہی نہیں کہ وہ بڑی قیمت دے کر وہ زمینداروں کوان کی کاٹن کی قیمت پہلے ادا کر دیں۔ بہت سی مجبوریاں ہیں،قرضے لینے پڑتے ہیں۔اب میرے دل پہ یہ بڑا اگراں تھا اور میں نے دعا بھی کی۔میں نے کہا اللہ میاں جماعت احمدیہ کی فیکٹری ہے ہم نمونہ بننا چاہتے ہیں،ہمیں بچا اس مصیبت سے اور ایک دوست کے تعارف سے مسلم کمرشل بینک کے جو جنرل مینیجر بلکہ پریذیڈنٹ تھے ان سے ملا اور ان سے میں نے کہا کہ دیکھیں اتنے لاکھ قرضہ آپ سے لینا چاہتے ہیں لیکن سود نہیں دینا۔اب وہ بہت ذہین آدمی تھے اور بڑے حوصلے والے انسان تھے۔اب خدا نے واسطہ بھی ایسے شخص سے ڈالا جس میں یہ طاقت تھی اس بات کو سننے اور سمجھنے کی۔تو تھوڑا سا تعجب ہوا۔وہ کہتے ہیں اچھا اب بتائیں کیا بات ہے۔میں نے کہا ہمارا دین ہمیں اجازت نہیں دیتا اور تجارت مجبور کرتی ہے لیکن ایک بات ہے کہ آپ کمرشل ادارے ہیں،آپ کا کاروبار ہی منافع پر ہے اس کا مجھے احساس ہے۔مگر یہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسا کہ ہمیں ہمیشہ منافع ہوتا ہے اگر منافع ہوا تو ہم آپ کو جتنا سود دیتے ہیں اس سے زیادہ پیسہ تحفةً دیں گے،شرط نہیں ہے،کوئی اس کا تناسب مقرر نہیں کرنا۔تو مجھے دیکھ کے انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے منظور ہے اور جس بینک کے آفیسر کی طرف انہوں نے حوالہ دیا ان سے نچلا وہ بھی بہت بڑا اونچے مقام کا افسر تھا وہ حیران رہ گیا۔اس نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔میں نے کہا ہو گیا تم جا کے پوچھو اور اس کے بعد پھر میں بھی ان کی موجودگی میں الگ ان سے ملا اور ان سے میں نے بھی یہی سوال کیا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کام تو آپ نے کر دیا ہے۔اتنا بڑا فیصلہ جو آپ کے سارے حصہ داروں کے سامنے بہت ہی ایک نا قابل قبول حالت پیش کرتا ہے۔اس نے کہا بات یہ ہے،میں ابھی بتا تا ہوں میرے فیصلے میں راز کیا

ہے۔ کہتے ہیں میں نے اپنے تجربے سے مردم شناس ضرور ہوں اور میرا یہ تجربہ ہے کہ بے ایمان لوگ کاغذ بڑے بھر کے لاتے ہیں اور کاغذوں کے منہ پکے کر لیتے ہیں اور جتنے مرضی پکے کاغذات ہوں دھوکہ دے جاتے ہیں لیکن اگر آدمی دیانتدار ہو تو وہ دھوکہ نہیں دے گا۔ میں نے تو آپ کو دیکھا مجھے یہ پتا لگ گیا کہ ہے دیانتدار اور اس لئے میں نے آپ سے کاغذ بھی نہیں مانگے ،فیکٹری کے کاغذ نہیں مانگے کہ رکھواؤ اس کے مقابل پر۔ مجھے پتا تھا اور میں اپنے اس فیصلے پر ایسا اعتماد رکھتا ہوں کہ اس اعتماد کی خاطر مجھے پتا تھا کبھی غلطی نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسا ہی ہوا۔ مسلسل اس بینک نے ہمیں بغیر سود کے قرضہ دیا ہے اور مسلسل ہمارے اوپر پورا اعتماد کیا اگر ہمارا منافع کم ہوا تو ہم نے کچھ کم تحفہ دیا، زیادہ ہوا تو زیادہ خوشی سے قبول کیا مگر سودی کاروبار پھر نہیں ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ کفیل بن جاتا ہے، رستے نکال لیتا ہے۔ اس لئے یہ بہانے نہ بناؤ کہ ہم بددیانتی پہ مجبور ہیں۔ ہر احمدی مسلمان کو بددیانتی کے خلاف مستعد ہو جانا چاہئے۔ جو روزمرہ کے اپنے اموال میں بددیانتی نہیں کرے گا اس کے بھائی کو بھی پھر اس سے خطرہ نہیں ہوگا۔ آج جو بعض شکایتیں آتی ہیں اور بڑی بھاری تعداد شکایتوں کی وہ ہے جو مالی لین دین کی خرابی سے تعلق رکھتی ہے ان سے جماعت کو نجات ملے گی اور اگر ایک انسان اپنے ذاتی معاملات میں جو عام تجارتی کاروبار ہیں ان میں دیانتداری کے لئے محنت کرتا ہے تو نفسیاتی لحاظ سے اس کے لئے ناممکن ہے کہ حیلے تراش کر، کسی بھائی کے پیسے پر نظر رکھ کر اسے دھوکہ دینے کی کوشش کرے۔

تو اس اعلیٰ معیار تقویٰ پر قائم ہوں تو جماعت کو بہت سے جھمیلوں سے نجات ملے گی اور ایسی جماعت جو خدا کی خاطر تقویٰ پر اور دیانت پر قائم ہو اس کے اموال میں لازماً برکت دی جاتی ہے۔ آگے جو بڑے بڑے کام درپیش ہیں ان کے لئے آپ حیران ہو جائیں گے کس طرح خدا تعالیٰ غیب سے، اپنے فضل سے روپے مہیا کرتا چلا جائے گا جیسا کہ اب کر بھی رہا ہے مگر اپنی دیانت کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

باقی اقتباس اور باقی حوالے انشاء اللہ اگلے جمعے میں پیش کروں گا۔ انشاء اللہ

اللہ تعالیٰ کو ادائیں وہی پسند آتی ہیں جن کا سچائی و خلوص سے تعلق ہو۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 27 ستمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۲﴾ (الحدید: 22)

پھر فرمایا:

گزشتہ خطبہ میں جو مضمون چل رہا تھا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک اقتباس کے حوالے سے تھا اس کی چونکہ ابھی صرف دوسطریں ہی ختم ہوئی تھیں اس لئے میں نے وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ آئندہ خطبہ میں اسی اقتباس کو اور اس سے تعلق رکھنے والے مضمون کو آگے بڑھاؤں گا۔ پہلے ایک اور آیت تھی جس کے تعلق میں یہ اقتباس پیش کیا جارہا تھا اب ایک اور آیت ہے جس کے تعلق سے اقتباس پیش کیا جائے گا اور ان دونوں میں بھی گہرا تعلق ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ اس مضمون پر میں مزید روشنی ڈالوں یا اس آیت کریمہ سے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقتباس سے مزید روشنی حاصل کروں اور آپ کے ساتھ شریک ہوں میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت احمدیہ ماریشس کا آج سالانہ جلسہ شروع ہو رہا ہے اور اسی طرح

جماعت احمدیہ سپین کا بارھواں (12) سالانہ جلسہ شروع ہو رہا ہے اوران دونوں جماعتوں نے بار بار اصرار کیا ہے کہ اس خطبہ جمعہ میں ان کا بھی ذکر خیر چلے اوران کو مخاطب کر کے بھی کچھ باتیں کی جائیں۔ پس مضمون تو وہی رہے گا اس کے حوالے سے ان کو بطور خاص مخاطب کرنے کے لئے مجھے یاد آیا تو موقع محل کے مطابق وہ ذکر کروں گا مگر اس ابتدائی عمومی ذکر میں ہی ان لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ذکر جو آج یہاں چل رہا ہے یہ ساری دنیا میں اس وقت جہاں جہاں بھی جماعت احمدیہ کا سیٹلائٹ کے ذریعہ رابطہ قائم ہے وہاں چل رہا ہے اور دنیا کے ہر خطے میں چوبیس گھنٹے کے ہر منٹ یا ہر لمحے میں خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ یہ باتیں پہنچ رہی ہیں اور جہاں جہاں بھی احمدی انہیں سن رہے ہوں گے طبعاً ان کے دل میں ان دونوں جماعتوں کے لئے خصوصیت سے دعا کی تحریک ہوگی اور یہ غالباً ان کا مقصد ہے۔ باقی نصیحتیں تو سب کے لئے مشترکہ ہی ہوا کرتی ہیں ہاں اگر کوئی ایسی بات ذہن میں آئی جو ان دونوں جماعتوں کو بطور خاص کہنی ہو تو انشاء اللہ میں اس کا ذکر کروں گا۔

یہ آیت کریمہ جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ۔ سَابِقُوْٓا میں تیزی سے بڑھنے کا مضمون ہے اور ایک دوسرے سے مسابقت کا مضمون بھی ہے۔ سَبَقَ کہتے ہیں ایسے شخص کو جو تیزی سے آگے نکل گیا یعنی ایک شخص جو آگے نکل جائے تیزی سے خواہ وہ شخص ہو یا گھوڑا بھی ہو اس کے لئے سَبَقَ کا لفظ آئے گا۔ سبقت لے گیا۔ مگر سَبَقَ کا مطلب ہے کہ مقابلہ میں سبقت لے گیا تو یہ مضمون زیادہ تحریص کی خاطر، زیادہ توجہ دلانے کی خاطر ایسا صیغہ بیان فرمایا ہے جس میں مغفرت کے تعلق میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کا مضمون داخل فرما دیا۔ ہر شخص کے لئے مغفرت حاصل کرنے میں جلدی کرنی چاہئے ، لیکن سَابِقُوْٓا کہہ کر یہ فرما دیا کہ تم ایک دوسرے سے بھی مغفرت میں مقابلے کرو یعنی یہ مطلب نہیں کہ کھلم کھلے چیلنج دے کر مقابلے کرو مگر کوشش کرو کہ اپنے ان بھائیوں سے آگے بڑھو جو ہمیشہ مغفرت طلب کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور مغفرت طلب کرنے کی تائید میں ان کے اعمال رونما ہوتے رہتے ہیں۔ پس ایسا چیلنج نہیں کہ جو اکٹھا ایک لائن پہ کھڑا کر کے بھگایا جا رہا ہو۔ مراد یہی ہے کہ ہر مومن کو محض یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں بلکہ باقیوں کو دیکھ کر اپنی حیثیت کی تعیین کرے۔ اگر مغفرت کے میدان میں اسے اپنے سے آگے بہت سے دکھائی دے رہے ہوں تو پھر مقابلہ کرے اور یہ کوشش

کرے کہ سب سے آگے بڑھ جائے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اپنے رب کی طرف سے مغفرت میں مقابلہ کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھو۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ اور جنت کی طرف آگے بڑھو جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کی طرح ہے۔ اس میں بہت سے پہلو ہیں جو تفصیل طلب ہیں ان کی تفصیل میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں مگر یاد رکھیں کہ یہاں جنت کو اور مغفرت کو گویا ایک دوسرے کا متبادل پیش کیا گیا ہے یعنی اگر تم مغفرت کی طرف تیزی سے آگے بڑھو گے جنت کی طرف بھی آگے بڑھو گے اور گویا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور جہاں تک یہ مضمون ہے کہ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اگرچہ اسے محض جنت کی وسعت کے بیان کے تعلق میں پیش کیا جاتا ہے مگر میرے نزدیک اس کا تعلق ویسا ہی مغفرت سے ہے کیونکہ مغفرت کی وسعت کے ساتھ جنت کی وسعت کا تعلق ہے۔ جتنی بھی کسی کو خدا کی رحمت سے مغفرت نصیب ہوگی اسی قدر اس کی جنتوں کو وسعت ملے گی اور یہ دونوں مضامین ایک دوسرے سے باہم پیوستہ ہیں اور مغفرت کا تعلق چونکہ رحمت سے ہے اور رحمت ہر چیز پر حاوی ہے اور جنت بھی رحمت ہی کے نتیجہ میں ہے اس لئے یہ دونوں مضامین ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں اعمال کا ذکر نہیں اور جنت کا ذکر ہے۔ یہی وہ ایک مقام ہے جہاں کسی اور مضمون کے بیان کرنے کی بجائے محض مغفرت ہی کو جنت کی کنجی کے طور پر پیش فرمایا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بہت غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس مضمون کو میں نے یہاں اس لئے اٹھایا ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو اقتباس میں آپ کے سامنے رکھ رہا تھا اس میں خوف کے بہت سے پہلو ہیں اور جوں جوں وہ اقتباس آگے بڑھتا چلا جاتا ہے انسان بہت زیادہ خوف زدہ ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تجزیہ کر کے، کھول کھول کر انسانی نفوس کے دھوکے اور وہ گناہ بیان کئے ہیں جن میں وہ ملوث ہوتا ہے اس کو پڑھتے پڑھتے ہر انسان کی طبیعت خوفزدہ ہو جاتی ہے کہ کہیں نہ کہیں اسے اپنی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ وہ ساری بیماریاں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمائی ہیں وہ تمام تر ایک شخص میں اگر ہوں تو وہ شیطان کا دوسرا مظہر ہوگا ایک اور شیطان اور اس شخص کے دو نام ہوں گے گویا کہ وجود ایک ہی

ہوگا۔مگر جب یہ بیماریاں بیان کی جاتی ہیں تو مراد یہ ہے کہ ہر وہ شخص جوان عبارتوں کو پڑھتا ہے وہ اپنے نفس پر ان کا اطلاق کرتا ہوا آگے بڑھے اور جہاں بھی اس کا نفس اس کو متنبہ کرے کہ یہ تو تمہاری تصویر ہے وہاں ٹھہرے اور غور کرے اور پھر فیصلہ کرے کہ کس طرح اس الجھن سے نجات مل سکتی ہے۔اس مصیبت سے کہ انسان ایک گناہ میں پھنس گیا ہے اور نجات کی راہ دکھائی نہیں دیتی اس غیر معمولی خوفزدہ حالت سے نکالنے کے لئے مغفرت کا مضمون ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کی مغفرت یعنی اللہ کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے اور مغفرت کی وسعت کے مضامین اور بھی بہت سے بیان ہوئے ہیں۔مگر اس آیت کریمہ میں مغفرت کی وسعت اور عظمت کا جو بیان ہے ویسا اور کسی آیت میں آپ کو نہیں ملے گا کہ مغفرت کو ہر دوسری چیز پر حاوی کر دیا گیا، ہر چیز سے وسیع کر دیا گیا اور جنت ہی کا نام مغفرت رکھ دیا ہے اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جنت کسی کے اعمال کے زور سے نصیب نہیں ہوسکتی کیونکہ عقل کے خلاف بات ہے کہ ایک انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے وہ جنت ملے جس کی وسعتوں کی انتہا کوئی نہیں۔انسانی اعمال اگر کامل طور پر اللہ کی رضا کے تابع بھی ہوں تب بھی انسانی زندگی محدود، اس کے عمل کے دائرے محدود اور ایک محدود چیز کی جو اپنی مکانیت کے لحاظ سے بھی محدود ہو، زمانی لحاظ سے بھی محدود ہو لامتناہی جزا اور ایسی وسعت والی جزا جس کا جنت میں نقشہ کھینچا جاتا ہے یہ عقل کے خلاف بات ہے یعنی اس کا سبب اور نتیجہ کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔سبب بہت ہی محدود ہے اور نتیجہ بہت وسیع اور لامتناہی۔اس لئے اس مضمون کا مغفرت سے تعلق ہے اور مغفرت سے جب تعلق ہوتا ہے تو کمزور آدمی بھی اس میں داخل ہوجاتے ہیں اور بہت بڑے بڑے پاکباز بھی اس میں داخل ہوجاتے ہیں اور اس پہلو سے جو وسعت جنت کی بیان کی گئی ہے اس مضمون میں بھی وہی وسعت شامل ہوجاتی ہے یعنی یہ وہ مغفرت کی آیت ہے جو ذلیل ترین گنہگار کے اوپر بھی سایہ کئے ہوئے ہے اور وہاں بھی جو انسانی کمزوریاں اس بزرگ نبی کو اپنے اندر دکھائی دیتی ہیں ان پر بھی اس کی رحمت کا سایہ ہے۔

تو جہاں وسعتوں کا مضمون ہو وہاں اس سے بہتر انداز بیان اختیار ہو نہیں سکتا کہ مغفرت جنت ہی کا دوسرا نام ہے اور مغفرت کا سایہ اتنا وسیع ہے کہ اس سے کائنات کا کوئی پہلو باہر نہیں

رہتا۔ عرض کا معنی میں وسعت کر رہا ہوں کیونکہ عربی لغت میں اس کا ایک معنی وسعت بھی ہے۔ بہت سے معانی ہیں ایک معنی قیمت بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ترجمہ یہ بنے گا کہ اپنے رب کی طرف سے ایسی مغفرت کی طرف آگے بڑھو اور ایسی جنت کی طرف آگے بڑھو جس کی قیمت زمین و آسمان کی قیمت کے برابر ہے۔ مگر میں نے جو ترجمہ کیا ہے وہ بھی عربی لغت سے ثابت مگر اس سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کا تصدیق یافتہ ترجمہ ہے کیونکہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہؓ میں سے بعض نے یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی جو وسعتیں ہیں ان تمام وسعتوں پر جنت حاوی ہے یعنی ان سے کم نہیں پوری کی پوری ان پر اتر رہی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو جہنم کہاں ہے؟ اس کا جواب رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں دیا کہ قیمت ہے یہ مراد جسے تم غلط سمجھ رہے ہو۔ آپؐ نے تسلیم کیا اور فرمایا کہ جہنم بھی وہیں ہے لیکن تم سمجھ نہیں سکتے ان باتوں کو۔

اس دور کا انسان ابھی اپنے علم میں اتنا آگے ترقی نہیں کر سکا تھا کہ وہ جہتوں کو سمجھ سکتا ہو اور Dimensions جو بڑھ رہی ہیں، انسانی تصور جن پر محیط ہوتا چلا جا رہا ہے اس کا کوئی ادنیٰ تصور بھی اس وقت موجود نہیں تھا صرف شش جہات تھیں جن سے وہ جانتا تھا اور ایک وقت کی جہت جس کو وہ شامل کر لے اس کے سوا اس کے سامنے کوئی چیز نہیں تھی اور شش جہات بھی دراصل تین جہات ہیں۔ اس کو ہم شش اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا ایک کنارا اگر یوں پھیلی ہوئی جہت ہے تو ایک بائیں طرف پھیلا ہوا سمجھتے ہیں اور ایک دائیں طرف پھیلا ہوا سمجھتے ہیں حالانکہ جو حساب دان ہیں وہ اس کو ایک جہت کہتے ہیں کیونکہ کسی ایک انسان کے حوالے سے تو ہے نہیں کہ وہاں کھڑا ہو تو اس کے بائیں طرف اور اس کے دائیں طرف یہ جہت ہے، لامتناہی پھیلی ہوئی ہے۔ تو جس کو ہم شش جہات اردو میں کہتے ہیں انگریزی میں اس کو Three Dimensions کہتے ہیں اگر وقت کو داخل کر لیں تو Four Dimensions۔ تو چار Dimensions میں گھرا ہوا انسان یہ تصور کر ہی نہیں سکتا تھا اس زمانے میں کہ کوئی چیز بھی ہے جہت کے اعتبار سے جو اپنی ضد کے ساتھ ایک جگہ اکٹھی ہو جائے۔

اب تین چیزوں کو اکٹھا فرمایا گیا ایک زمین و آسمان اور اس میں ہمیں جنت تو دکھائی دے ہی نہیں رہی کہیں۔ اس لئے پہلا سوال تو یہ اٹھنا چاہئے تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ ہے کہاں؟ جنت کہاں چلی گئی؟ ہم تو زمین و آسمان کو صبح بھی دیکھتے ہیں شام کو بھی، رات، دوپہر اور ہمیں تو یہ زمین

آسمان خالی خالی نظر آتے ہیں کوئی جنت ہی نہیں دکھائی دے رہی۔ تو اس سوال کا جواب جوانہوں نے دیا، اسی آیت کریمہ میں موجود تھا کہ جب یہ کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے تو ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی اور طرح کی چیز ہے جس کے مادی وجود جس سے متصادم نہیں ہوتے۔ گویا Dimensions اور ہیں۔ ایک ہی وقت میں، ایک ہی مقام، ایک ہی وقت کی قدر کو اکٹھا کر دیں تب بھی وہ ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دیں گی، ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی قائم نہیں ہوگا۔

میں نے اس کی مثالیں بارہا دی ہیں کہ یہاں جو ریڈی ایشن ہے فضا میں اس کی جہتیں مختلف نہیں ہیں۔ یہ Three Dimensions یا Four Dimensions کے اندر ہے۔ اس کے باوجود محض اس کی لطافت کے فرق کی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ اگر Dimensions بدل جائیں تو اس کے وجود کا کوئی تصور ہی نہیں ہوسکتا، اس کی نوعیت ہی نہیں سمجھ آسکتی۔ موجود رہے گی مگر کسی پہلو سے بھی انسان اس کو اپنے دائرہ تصور میں کھینچ کر لا نہیں سکتا۔ یہ Dimensions کا فرق ہے۔ لطافت کا فرق اور ہے۔ لطافت کے نتیجہ میں ٹیلی ویژن کی لہریں آپ یہاں نہ دیکھ رہے ہیں، نہ سن رہے ہیں مگر گھر جا کے ٹیلی ویژن ON کریں گے تو آپ ان کو پکڑ لیں گے۔ مگر کوئی ٹیلی ویژن ایسی نہیں ہے، نہ ہوسکتی ہے جو دوسری جہت کی اس چیز کو کھینچ لائے جو ہمارے ساتھ ہے مگر ہمیں معلوم نہیں ہے، ہمیں دکھائی بھی نہیں دے رہی، ہمیں تصور ہی نہیں ہے اس کا کوئی۔

تو یہ فرق ہیں جو قرآن کریم کی آیات بتاتی ہیں اور ایسا عظیم علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آئندہ زمانوں کی باتیں ہو رہی ہیں جس کا وہم و گمان بھی انسان نہیں کرسکتا تھا کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا، یہ ناممکن ہے۔ پس اسی آیت کریمہ نے یہ مضمون پیش کیا ہے کہ تین چیزیں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں جہنم بھی یہیں ہے، جنت بھی یہیں ہے اور یہ دنیا جس میں ہم بس رہے ہیں یہ زمین و آسمان یہ بھی یہیں ہیں اور ان کی وسعتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور کیسے ملتی جلتی ہیں ''ک'' کے لفظ نے ہمیں دعوت دی ہے کہ غور کریں اور معلوم کریں یہ وسعتیں کیا ہیں اور جو فرق ہے جہنم اور جنت کے درمیان وہ مغفرت کا ہے، صرف اعمال صالحہ کا سوال نہیں کیونکہ اعمال صالحہ اگر اپنی انتہا کو بھی پہنچ جائیں تو جیسا کہ میں نے ثابت کیا ہے ان کی منصفانہ جزا یہ نہیں ہوسکتی۔ جتنے اعمال

اس کو دس گنا کر دیں سو گنا، ہزار، لاکھ گنا کر دیں محدود اعمال کی لامتناہی جزا تو عقل میں آ ہی نہیں سکتی اس لئے اس کا مغفرت سے تعلق ہے اور بہت ہی اہم مضمون ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے انسان کو بھی ایک حیرت انگیز طور پر خوش خبریوں، لامتناہی انعامات کی دعوت دے دی گئی اور عظیم سے عظیم انسان کو بھی انکسار سکھا دیا گیا کہ یہ جو عظمتیں اور وسعتیں ہیں یہ تمہیں اللہ کے فضل سے ملیں گی اس کے بغیر تو ممکن نہیں۔ چنانچہ اس کے معاً بعد یہی فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ یہ باتیں فضل کی ہیں۔ فضل جیسے ''جھونگا'' دیا جاتا ہے ''جھونگے'' کا نام ہے مگر بندوں کے جھونگے اور اللہ کے جھونگے میں دیکھو کتنا فرق پڑ گیا ہے۔ بندہ ایک چیز خرید تا ہے اس کی قیمت ادا کرتا ہے اور اس کے ساتھ معمولی سا کچھ اور حاصل کر لیتا ہے جھونگے کے طور پر اور جو رقم دیتا ہے وہ اس چیز کے برابر ضرور ہوتی ہے جو چیز خریدی جا رہی ہے۔ مگر خدا کے سودے دیکھو بندوں سے کیسے عجیب ہیں۔ وہ رقم بھی نہیں دیتا جس سے اس کے عمل کے برابر جزائیں مل سکیں۔ اکثر اعمال کھوکھلے، ننگے، دھوکے، انسان ساری زندگی غفلت کی حالت میں بسر کر دیتا ہے سمجھتا ہے کہ میں بڑے نیک اعمال کر رہا ہوں ہاتھ پلّے کچھ بھی نہیں ہوتا اور اللہ اس گھٹیا سی چیز کو جس میں کچھ نیکی کا عنصر بھی آ جائے اس کو قبول فرما لیتا ہے اور پھر جھونگا وہ جو لامتناہی ہے۔ قیمت وہ جو وصول ہی نہیں ہوئی اور اس کے برابر نہیں دے رہا بلکہ ایسا دے رہا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ مضمون، یہ وہ بات ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس موقع پر یوں کھول دیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یہ نہ سمجھنا کہ تم اپنے اعمال کے نتیجہ میں کچھ بھی حاصل کر سکو گے، مغفرت ہے جس کے نتیجہ میں اعمال نظر انداز ہو جائیں گے۔ مغفرت کی چادر یہ نہیں دیکھا کرتی کہ اعمال کیسے ہیں۔ جب وہ ڈھانپ لے گی تو ہر کمزوری کو ڈھانپ لے گی اور وہ چادر اتنی وسیع ہے کہ زمین و آسمان کی وسعتوں پر محیط ہے۔

اور اب وسعتوں کا حال بھی عجیب ہے۔ ان پر آپ غور کریں تو وہ وسعتیں لامتناہی نہیں بلکہ ہمیشہ آگے بڑھتی چلی جانے والی ہیں۔ لامتناہی ان معنوں میں ہیں یعنی کہ ہمیشہ آگے بڑھتی چلی جانے والی ہیں۔ اب زمین و آسمان اور کائنات کا تصور جس لمحے بھی آپ باندھیں گے کہ یہ اتنا فاصلہ ہوگا اسی لمحے آپ غلط ثابت ہو جائیں گے کیونکہ وہ فاصلے اور بڑھ چکے ہوں گے اور اس تیزی سے بڑھ رہے ہیں کہ انسانی تصور اس کا ادنیٰ سا حصہ بھی پا نہیں سکتا کیونکہ ایک سیکنڈ میں اگر آپ لاکھوں

حصّہ کی رفتار کے ساتھ بھی سوچ رہے ہوں، ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے کے حساب سے بھی تو زمین و آسمان کی وسعتیں اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور انسان کو ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں سوچنے کی طاقت ہی نہیں ہوتی بہت معمولی سے طاقت ہے۔ اتنی معمولی سی ہے کہ اگر فلم کو اٹھارہ فریم فی سیکنڈ کے لحاظ سے آگے بڑھایا جائے تو انسانی دماغ یہ معلوم ہی نہیں کر سکتا کہ کھڑی چیز ہے یا چلتی چلی جارہی ہے۔ یہ تو اس کی وسعت کا حال ہے اور وعدے وہ دیئے جارہے ہیں جو لامتناہی، کبھی ختم نہ ہونے والے اور آگے بڑھتے چلے جانے والے۔

تو یہ خدا کے مغفرت کے سودے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ بلا رہا ہے۔ اس کے لئے سَابِقُوْٓا کا لفظ فرمایا کہ جلدی کرو، ایسی حالت میں نہ مرجانا کہ تمہیں مغفرت نصیب نہ ہوئی ہو۔ تم اگر مغفرت کے نصیب ہونے سے پہلے مر گئے تو کچھ بھی ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ پس بہت ہی اہم مضمون ہے اور اس میں جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے نتیجہ میں انسان کے دلوں کو ٹھہرایا گیا ہے ورنہ وہ ہاتھ سے نکل جاتے گناہوں کے تصور سے، ان کو سنبھالا گیا ہے۔ وہاں خوف بھی دلایا گیا ہے کہ سنبھلنے کے دن خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے ہیں جہاں مغفرت کا تصور تمہیں سنبھالے رکھے گا جب آنکھیں بند ہوئیں تو مغفرت کا مضمون ہاتھ سے نکل جائے گا اس سے پہلے پہلے حاصل کر لو اور اس معاملے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تیز رفتاری کے ساتھ مغفرت کی طرف آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

پس جہاں مغفرت کا مضمون ہے وہاں گناہوں کو جرأت نہیں دلائی جارہی بلکہ نیکیوں کو جرأت دلائی جارہی ہے۔ یہ بھی عجیب اس کلام الٰہی کا کمال ہے کہ جب اتنی بڑی مغفرت کا مضمون ہو تو گنہگار انسان تو یہی سمجھے گا کہ اب میں یہیں بیٹھ رہوں جب مغفرت لامتناہی ہے تو میرے گناہوں کی کیا بات ہے میں تو بخشا ہی جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمارہا۔ متنبہ کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ گناہ چھوڑنے میں جلدی کرو کیونکہ مغفرت کا تعلق گناہ چھوڑنے کی کوشش سے ہے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھو کیونکہ تمہیں پتا کوئی نہیں اس کا وقت کب آئے گا، تمہارا وقت کب آئے گا۔ اگر اس نے پہلے سے زیادہ کمائیاں کر لی ہوں تم سے زیادہ کمائیاں کر لی ہوں اور تم جلدی مرجاؤ تو تم اس سے بہت پیچھے رہ جاؤ گے اس لئے اس حرص کے ساتھ آگے بڑھو کہ کہیں وہ زیادہ ہی نہ لے گیا ہو مجھ سے۔ یہ زیادہ کی تمنا بعض دفعہ لطیفوں کی صورت میں بھی بیان ہوتی ہے مگر وہ لطیفے دراصل انسانی فطرت کی

نقاشی کرتے ہیں۔ان میں محض ہنسی کی بات نہیں بہت سنجیدہ پیغامات ہوتے ہیں۔پس جیسا کہ میں نے ایک دفعہ آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کیا تھا ایک اندھے نے ایک سوجاکھے کے ساتھ مل کر، پیسے ڈال کے حلوہ بنوایا اور یہاں کے ملکوں میں تو اس کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے مگر غریب ملکوں میں بڑی قیمت ہے کیونکہ وہاں تو شعراء بھی یہ کہتے ہیں کہ **''ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے''** کہ روز روز عید نہیں ہوا کرتی کہ وہ حلوہ کھائے اور ان ملکوں میں تو اس کا وہم وگمان بھی نہیں آ سکتا کہ سال میں ایک دن کسی عید میں بعض لوگوں کو حلوہ ملتا ہے تو میں اس ملک کی بات کر رہا ہوں یہ مغرب کے حافظ صاحب نہیں تھے بلکہ مشرقی ملک کے رہنے والے تھے۔تو انہوں نے بے چاروں نے کچھ پیسے جوڑے، کچھ ایک سوجاکھے نے اور دونوں نے مل کر حلوہ تیار کروایا۔جب کھانے لگے تو کچھ دیر کے بعد حافظ صاحب کو خیال آیا مجھے کیا پتا یہ کتنا تیز کھا رہا ہے۔میں اندھا بے چارہ، پیسے برابر کے ہیں تو مجھے تیز کرنا چاہئے کچھ۔اس نے ذرا رفتار تیز کر دی جلدی جلدی لقمے کھانے شروع کر دیئے۔تھوڑی دیر کے بعد خیال آیا کہ مجھے کیا پتا کہ وہ ایک ہاتھ سے کھا رہا ہے کہ دو ہاتھ سے کھا رہا ہے تو چلو دونوں ہاتھوں سے کھاتے ہیں۔اس نے دونوں ہاتھوں سے کھانا شروع کر دیا اور وہ بے چارہ جو دوسرا تھا وہ حیران ہو گیا حافظ صاحب کو دیکھ کے کہ یہ کر کیا رہے ہیں۔وہ تو کھانا ہی چھوڑ بیٹھا۔وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔کھاتے کھاتے حافظ صاحب کو خیال آیا کہ کوئی ترکیب اس نے کی ہوگی مجھے نظر نہیں آ رہی۔حلوہ سارا اٹھایا انہوں نے کہا جی باقی میرا حصہ ہے۔تو اندھے کو بھی جو چیز پسند ہے اس میں سبقت کی روح تو ہے نا اور جس کو نظر نہیں آ رہا۔ہم بھی تو اندھے ہی ہیں۔ہمیں نہ اپنے اعمال نظر آ رہے ہیں نہ یہ پتا ہے کہ کب مرنا ہے۔زمین وآسمان کی حقیقت سے نا آشنا یہ پتا نہیں کہ کب خدا کی مغفرت نصیب ہو سکتی ہے، کون سا عمل ہے جو اسے پسند آ جائے گا۔تو اس دنیا کے اندھے سے بہت بڑھ کر سبقت کی روح اختیار کریں۔اس میں ہنسی کی بات نہیں ہے۔آپ دونوں ہاتھوں سے مغفرت طلب کریں، سارا تھال اٹھا لیں اعمال کا تب بھی محدود رہیں گے اور جو مغفرت کا مضمون ہے وہ آگے بہت آگے بڑھ جائے گا۔اس کی جو وسعت ہے وہ وسعت والی مغفرت آپ کے ان اعمال سے نصیب نہیں ہو سکتی وہ فضل سے نصیب ہوگی اور فضل کا وعدہ ہے اگر کوشش کرتے رہو۔تو اگر کوشش کرو کہ اللہ ہمیں ان محدود، گندے، ناپاک اعمال کے نتیجہ میں بھی بخش دے تو اس طرف بڑھنے کی ضرورت ہے یعنی اپنے

اعمال کو رفتہ رفتہ جہاں تک ممکن ہو ان گندے اعمال کو دور کر کے نیک اعمال میں داخل ہونے کی سعی، مسلسل سعی بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش اور پھر آخر پر پھر وہی بات کہ سب کچھ کر گزرنے کے بعد پھر بھی پتا نہیں کیا حالت ہے تو پھر اس دنیا کے اندھے کی طرح نیک اعمال پر ایسے ہاتھ مارو کہ گویا کہ سب کچھ سمیٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس حالت میں اگر موت آتی ہے تو خدا کا یہ وعدہ لازماً پورا ہوگا سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ اس مغفرت کی طرف آگے بڑھو یعنی اس جنت کی طرف ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، ان کا عرض، ان کا پھیلاؤ، ان کی وسعتیں زمین اور آسمان کی وسعتوں کی طرح ہیں۔ لامتناہی ہیں۔ کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ جلدی کر لو کیونکہ تمہاری زندگی محدود ہے یہ جنتیں محدود نہیں ہیں اور لامتناہی جنتوں کی طرف بلانے کا عمل فضل اللہ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے فضل طلب کرتے رہو اور وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ میں ان وسعتوں سے بھی زیادہ مضمون بیان ہوگیا ہے جو پہلے پیش کی گئی ہیں کیونکہ لفظ عظیم ایک معنی میں اعظم سے بھی زیادہ وسیع لفظ ہے۔ اس لئے اللہ کا نام اعظم نہیں رکھا۔ خدا تعالیٰ نے خود اپنے نام کو اعظم کے طور پر پیش نہیں فرمایا کیونکہ اعظم میں پھر بھی مقابلہ ہے کوئی چھوٹی چیزیں بھی ہیں۔ مگر عظیم میں اصل میں یہ معنی ہے کہ اس کے سوا عظمت ہے ہی کسی کو نہیں۔ اعظم اگر کہا جائے تو مراد ہے دوسرے بھی عظیم لوگ ہیں وہ نسبتاً کم عظمت والے ہیں خدا نسبتاً زیادہ عظمت والا ہے مگر عظیم میں ایک ایسی حیرت انگیز شان ہے کہ وہ کامل طور پر عظمت کے مضمون کو سمیٹ لیتی ہے، اس میں مقابلہ کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ وہی عظیم ہے اور کوئی عظیم ہے ہی نہیں، ہر عظمت اس کی ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی عظمت نہیں۔

حمد وثنا والے مضمون میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی مضمون بیان فرمایا ہے اسی رنگ میں کہ ”**عظمت ہے اس کی عظمت**“۔ اب دیکھیں قرآن کریم سے کتنا گہرا تعلق ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو، لیکن پڑھنے والا اگر غور نہیں کرے گا تو اسے نہیں سمجھ آئے گی۔ ”**عظمت ہے اس کی عظمت**“ سے مراد یہ ہے کہ اور کسی کی عظمت ہے ہی کچھ نہیں۔ یہ وہم دل سے نکال دو۔ مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک ہی جو عظیم ہے۔ تو وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ میں وہ جو وسعتوں والی جنت ہے اس سے بھی زیادہ وسیع تصور پیش فرمایا گیا ہے اور اس تصور نے ایک

اور مضمون پیدا کر دیا کہ انسان جو اس کائنات کو بہت وسیع سمجھتا ہے اس سے زیادہ اس کا تصور پہنچ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ بعض سائنس دان اور اونچے درجے کے حساب دان یہ سمجھتے ہیں کہ حسابی رو سے اس کائنات کے سوا دوسری کائنات ہو ہی نہیں سکتی بس یہی ہے لیکن اب جو نئی دریافتیں ہو رہی ہیں ان سے یہ امکانات کھل رہے ہیں اور وہ حیران اور ششدر رہ گئے ہیں کہ یہ کائنات بھی کسی اور طرف متحرک ہو رہی ہے، وسعتوں کے علاوہ کسی اور طرف بڑھ رہی ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کوئی کشش ہونی چاہئے اس میں۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔

تو وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ تم کائنات کے حوالہ سے یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ خدا کے پاس بس یہی کچھ ہے جو تمہیں دے گا۔ تمام کائنات کی وسعتیں بھی مانگ لو تب بھی خدا کے خزانے ختم نہیں ہوتے اور یہی مضمون ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے بعینہٖ اسی طرح ہمیں سمجھایا۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ ساری کائنات بھی اس سے مانگ لو تو اس کے فضلوں میں تو کوئی کمی نہیں آئے گی، اس کی طاقتوں میں، اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اتنی بھی نہیں آئے گی جیسے سوئی کو کسی وسیع سمندر میں ڈبو کر باہر نکال لو اس کے ناکے پہ جتنا پانی چمٹا ہوگا اتنی کمی بھی نہیں آئے گی اللہ کے خزانوں میں اگر تم اس ساری کائنات کو مانگ لو۔ تو وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ نے اس مضمون کو بے انتہا وسعت عطا فرما دی ہے مگر فضل کے طالب ہمیشہ رضا پر نظر رکھا کرتے ہیں۔

مغفرت کے ساتھ جہاں رحمت کا تعلق ہے وہاں فضل کے ساتھ رضائے باری تعالیٰ کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کوئی استدلال نہیں، ایک انسان کی کوئی ادا کسی کو پسند آجائے اسے جو چاہے دے جتنا چاہے دے۔ اس کا مغفرت سے تعلق نہیں ہے کیونکہ مغفرت میں تو اس کی کمزوری کے نتیجہ میں سزا نہ دینے کا مضمون ہے، اس کی غفلت کے نتیجہ میں اسے بعض نعمتوں سے محروم نہ کرنے کا مضمون ہے۔ فضل کا مضمون اس سے آگے بلند تر مضمون ہے جس میں پسند کی بات ہے۔ اب بعض لوگ ایسے بھی ہیں ساری عمر گناہوں میں مبتلا ان کی کوئی ایسی ادا خدا تعالیٰ کو پیاری لگتی ہے کہ سارے گناہ بخش دیئے لامتناہی جنتوں میں داخل کر دیا یہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ کے ساتھ تعلق ہے اور اس کے لئے ہمیشہ انسان کو رضا کا طالب رہنا چاہئے۔

مغفرت کے طالب کے لئے اپنے گناہوں پر نظر رکھ کر ان کو کم کرنے کی کوشش کرنا ہے۔اس کوشش میں وہ کامیاب نہ بھی ہوتو اللہ کی مغفرت اسے ڈھانپ سکتی ہے لیکن نیت کا خلوص لازمی ہے۔نیت صاف ہو، سچی ہو، کوشش ضرور ہواور جاری رہےاور کسی مقام پر ٹھہرے نہیں اور کوشش یہ ہو کہ رفتار بڑھتی رہے، کم نہ ہو۔ یہ ہے وہ مضمون جس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا وعدہ ہے جو لامتناہی جیسا کہ میں نے بیان کیا ہےاس حد تک لامتناہی کہ کائنات کی وسعتوں پر محیط ہے اور انسانی جنت بھی جو انسان کو ملے گی وہ بھی کائنات کی وسعتوں پر محیط ہے لیکن اس کا دائرہ بڑھ رہا ہےاور آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔فضل یہ کہتا ہے کہ ایسی باتیں کیا کرو جو پیاری لگیں۔بعض دفعہ کسی کی ایک ادا ہی ایسی پیاری لگتی ہے کہ انسان اس کو اپنا دل دے بیٹھتا ہےاور ہمیشہ کے لئے اسی کا ہو جاتا ہے۔چھوٹی سی بات ہوتی ہے۔اب وہ بادشاہ جہانگیر جس نے نور جہاں کو دل دے دیا تھا۔ایک لونڈی تھی۔دل اتنی سی بات پہ دیا کہ اس سے ایک بھولے پن کی ادا نکلی۔اس نے اس کو دو کبوتر پکڑائے تھے کہ یہ کبوتر میں تمہارے پاس رکھا رہا ہوں ان کو ذرا مضبوطی سے پکڑے رکھنا میں ابھی کام کر کے آؤں گا تو تم سے لے لوں گا۔اس بے چاری سے، ڈھیلا ہاتھ تھا، وہ شاید رحم دل تھی زور سے نہیں پکڑا ایک کبوتر ہاتھ سے نکل کر اڑ گیا۔جب بادشاہ واپس آیا تو اس نے اس سے پوچھا کہ ہیں! ایک کبوتر!! میں تو تمہیں دو دے کے گیا تھا۔اس نے کہا اڑ گیا، کہ کیسے اڑ گیا؟ اس نے دوسرا ہاتھ چھوڑ دیا کہ ایسے اڑ گیا۔کیسے کا مضمون یہ سمجھی کہ طریقہ پوچھ رہے ہیں کیسے اڑا۔اس ادا پہ وہ بجائے اس کے کہ ناراض ہوتا فریفتہ ہو گیا اور اس سے وہ شادی ہوئی جس کے نتیجہ میں ہندوستان کی تاریخ میں عظمتوں کے رنگ بھرے گئے۔بہت عظیم شادی تھی یہ بادشاہوں کی تاریخ میں اور بات ایک بھولی سی ادا تھی جو بظاہر نقصان کی تھی۔تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے پیار سے بعض دفعہ دیکھتا ہے کہ چھوٹی سی ادا بھی اس کو پیاری آتی ہے جو بظاہر نقصان کی ادا ہے۔

اس مضمون کو آنحضرت ﷺ یوں بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑے لطف سے اس بندے کو دیکھ رہا ہے بہت ہی پیار کرتا ہے، پیار سے اس کو یہ بات پسند آئی کہ ایک دعا کرنے والے نے اس جوش میں کہ میں اپنا انکسار ظاہر کروں خدا کو یہ کہنے کی بجائے کہ اے میرے رب! تو میرا رب میں تیرا بندہ، یہ کہہ دیا کہ اے میرے رب میں تیرا رب اور تو میرا بندہ۔اب کتنا کفر کا کلمہ ہے، مولوی ہوتا تو وہیں

ختم کر دیتا اسے لیکن اللہ ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ اس کو ایسا پیار آیا اس ادا پر کہ جان بوجھ کے نہیں کیا، محبت کے جوش میں افراتفری کے عالم میں خدا کو بندہ کہہ بیٹھا ہے اپنے آپ کو رب کہہ بیٹھا ہے اور اللہ اسی پہ پیار کی نظر ڈال رہا ہے۔ تو اس کے ہاں ہر ادا مطلوب ہو سکتی ہے اس میں کوئی گہرا حسن ہونا چاہئے جو اس کے فطرت کے خلوص کا مظہر ہو اس کی اداؤں کی سچائی ہو۔

تو اس کی تلاش کرو اور ایک ہی ذریعہ ہے اس کی تلاش کا کہ اپنے آپ کو سچا کر لو کیونکہ جہاں بھی خدا کی ایسی اداؤں پر پیار کی نظر کا مضمون ملتا ہے وہاں میں نے غور کر کے دیکھا کہ ہر جگہ سچائی کے نتیجہ میں یہ بات پیدا ہوتی ہے۔ اگر نور جہاں نے بناوٹ سے وہ بات کی ہوتی تو اس زمانے کے بادشاہوں کے نزدیک تو وہ گردن زدنی تھی۔ اگر وہ ذہین بادشاہ بناوٹ کے کوئی بھی آثار دیکھتا تو ہو سکتا تھا اسے دیوار میں چنوا دیتا لیکن صرف سچائی تھی اور سچائی کے نتیجہ میں غلطی بھی پیاری لگتی ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جس کا فضل اللہ سے تعلق ہے اس کو سمجھیں اور مغفرت کی کوشش کا جہاد تو کرنا ہی کرنا ہے کیونکہ اگر نہیں کریں گے اور محض فضل کے لئے بیٹھے رہیں گے تو یہ سچائی کے خلاف ہوگا اور فضل سچائی کے نتیجہ میں اترتا ہے سب سے زیادہ فضل سچوں کو ملتا ہے۔

تمام انبیاءؑ کو نبوت کا فیض فضل کے نتیجہ میں ملا ہے اور فضل کے بغیر نبوت مل ہی نہیں سکتی کیونکہ فضل میں اس کی کوششوں، محنتوں، اس کی انتہا سے زیادہ دینے کا مضمون ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا ایسا جھونگا جو اصل سے بے انتہا آگے بڑھ جائے اس کی کوئی بھی نسبت باقی نہ رہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کا ذکر سورہ جمعہ میں ملتا ہے پھر آپ ؐ کی بعثت ثانیہ کا ذکر ملتا ہے اور آخر پر تان اس بات پر ٹوٹی ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ یہ عظیم نعمتیں جو تمہیں بتائی جا رہی ہیں پہلے ایک بار، پھر اس کا اجراء نعمت کا ایک ایسے زمانے میں جو بہت دور کا زمانہ ہے وہاں جا کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا فیض پھر نازل ہو جائے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ اللہ ہے جو فضل نازل فرماتا ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ پر کیا بغیر وجہ کے دیتا ہے؟

خدا کے ہاں ایک گہری اندرونی منطق ہے ایک ایسا انصاف کا مضمون ہے جو فضل کے

ساتھ ساتھ جاری ہے اور بہت لطیف ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ دکھائی نہیں دیتا مگر گہرے نظام پر ہر چیز مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ادائیں وہی پسند آتی ہیں جن کا سچائی سے تعلق ہے اور خلوص سے تعلق ہے اور اس کے بغیر کوئی ادا اس کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ جب ایسی بات کوئی دیکھ لے پھر خدا اس کو اپنا دل دے دیتا ہے اور فضل کے مضمون کا تعلق دل دینے سے ہے اصل میں۔ جس طرح ایک عظیم مغل بادشاہ نے ایک اپنی لونڈی کو دل دے دیا وہ دل دے بیٹھا تو اپنی ساری سلطنت دے دی، سب سے عظیم مقام دے دیا۔ اب کبوتر اڑانے سے اس سلطنت کا کیا تعلق ہے۔ یہ مضمون دل دینے کے مضمون کے سوا سمجھ آ ہی نہیں سکتا تو وہ دل دے بیٹھا۔ تو اللہ بھی گویا اپنے بندوں کو ان کی بعض حقیر سی پیاری سی ادا پہ جو حقیر تو ہے مگر پیاری ہے دل دے بیٹھتا ہے جب دل دے بیٹھتا ہے تو سارا اس کا فضل، اس کی ساری عظمتیں اس کو عطا ہونے لگتی ہیں۔

اس مضمون کو بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت ہی عارفانہ رنگ میں بیان فرمایا ہے لیکن ابھی تو اس کی باری ہی نہیں آئی جو پہلا اقتباس میں پڑھ رہا تھا یہ تمہید میں نے اس لئے باندھی تھی کہ میں آپ کو بتاؤں کہ آپ ڈریں گے بہت اس اقتباس سے، بعضوں کی تو جان نکل جائے گی ڈر کے مارے کہ یہ اگر ہیں بخشش کے تقاضے اور دنیا میں نئی زندگی پانے کے تقاضے تو ہم تو گئے۔ ان کو بتاتا ہوں کوئی بھی نہیں جائے گا اگر وہ ان باتوں پہ نظر رکھے جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں کہ مغفرت کی طرف آگے ضرور بڑھو۔ جتنی طاقت ہے اتنا بڑھو اور پھر یقین رکھو کہ مغفرت نصیب ہو جائے تو تمام کائنات کی نعمتیں نصیب ہو گئیں اور وہ نعمتیں نصیب ہوں گی جو بڑھتی چلی جائیں گی اور پھر فضل کا مضمون اس پر مستزاد ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں (یہ میں شاید پڑھ چکا تھا یا نہیں) کہ:

> ”ہر ایک امیر خدا کے حقوق اور انسان کے حقوق سے ایسا ہی پوچھا جائے گا جیسا کہ ایک فقیر“

یہ پڑھ لیا تھا پچھلی دفعہ؟ بعض کہتے ہیں پڑھ لیا بعض نہیں میں پھر بھی پڑھ دیتا ہوں کوئی حرج نہیں، امیر بھی اسی طرح پوچھا جائے گا جیسے ایک فقیر۔ اب کیا اس میں ناانصافی ہے۔ امیر کو تو اور طرح پوچھنا چاہئے فقیر کو اور۔ فقیر بے چارہ تو غریب ہے لیکن وہی مضمون آپ کو بتا رہا ہوں کہ خدا کے ہاں

نہایت لطیف توازن ہے۔امیر کس نے بنایا؟ خدا نے بنایا اور فقیر کس نے بنایا؟ وہ بھی تو خدا ہی نے بنایا ہے۔اس لئے پوچھنے میں فرق نہیں کرے گا۔امیر کو اس کی حیثیت کے مطابق پوچھا جائے گا یہ مضمون ہے اور فقیر کو بھی اس کی حیثیت کے مطابق پوچھا جائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ صرف امیر ہی نیکی کرسکتا ہو یا عطا کرسکتا ہو،فقیر بھی عطا کرسکتا ہے اور بعض دفعہ فقیروں کی عطائیں امیروں پر سبقت لے جاتی ہیں۔تو جب انعام کا مضمون جاری ہوگا تو پھر پکڑ اور سزا کا مضمون بھی جاری ہوگا ہاں ان کی غلطیاں ،ان کے ماحول کے مطابق دیکھی اور پرکھی جائیں گی اور استطاعت کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے گا۔

لیکن یہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے لائق ہے ’’ بلکہ اس سے بھی زیادہ‘‘۔اس سے بھی زیادہ کا پھر کیا مضمون ہے۔ایک طرف فرماتے ہیں ہاں اسی طرح دیکھا جائے گا۔اس سے بھی زیادہ سے وہ مضمون مراد ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے کہ امیر کو چونکہ نعمتیں زیادہ ملی ہیں اس لئے اس کی ذمہ داریاں پھیل گئی ہیں۔ان معنوں میں امیر سے زیادہ پوچھا جائے گا کیونکہ فقیر کے پاس تو ہے ہی تھوڑا سا۔کسی کو آپ چار آنے دیں کہ چار آنے کا سودا لے آؤ اور پھر اس سے حساب کریں تو وہ ایک منٹ کے تھوڑے سے حصے میں حساب ہو جائے گا۔دو پیسے کا تیل لیا ایک پیسے کا فلاں لیا۔کسی کو لاکھ روپیہ دیں تو حساب میں وقت لگتا ہے۔تو زیادہ پوچھنے سے یہ مراد ہے کہ چونکہ امیر کی استطاعت زیادہ ہے اس لئے اس سے زیادہ تفصیلی حساب ہوگا بہ نسبت ایک غریب کے جس کی استطاعت ہی تھوڑی ہے۔

’’پس کیا ہی بدقسمت وہ شخص ہے جو اس مختصر زندگی پر بھروسہ کر کے بکلّی خدا سے منہ پھیر لیتا ہے‘‘ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد 19 صفحہ:71)

پس کیا ہی بدقسمت وہ شخص ہے جو اس عارضی دنیا پر، معمولی سی زندگی پر بھروسہ کر کے بکلّی خدا سے منہ پھیر لیتا ہے۔آپ سے میں نے گزشتہ خطبہ میں گزارش کی تھی کہ یہ مضمون ’’کشتی نوح‘‘ کے حوالے سے پڑھیں تو پھر آپ کو سمجھ آئے گی یہ اس کا دوسرا کنارا ہے جو بیان ہو رہا ہے۔کشتی نوح کے مضمون میں یہ تھا کہ ادنیٰ سی بھی غفلت کرے گا تو مارا جائے گا۔مطلب ہے کہ وہ سزا کے نیچے آجاتا ہے،ایسی تلوار کے نیچے آجاتا ہے جو ٹوٹ کے گرسکتی ہے اس کے اوپر۔یہاں چونکہ مغفرت کے مضمون کے ساتھ تعلق ہے اس

لئے فرمایا ہے کہ جتنا بھی تم بے اعتنائیوں میں آگے بڑھو اگر کُل تعلق نہ توڑ بیٹھو تو امکان ہے کہ تم بچ جاؤ۔اس لئے کیا ہی بدقسمت ہے وہ شخص جو دنیا کی زندگی پر بھروسہ کرتے ہوئے بکلّی خدا سے منہ پھیر لیتا ہے۔کلی والوں کے لئے مغفرت کا کوئی مضمون نہیں ہے۔

جن کی برائیاں، زندگی کی بدیاں ان کو گھیرے میں لے لیں اور پھر خدا سے کلیۃً غافل ہو جائیں ان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے وہ اور ہی قسم کے لوگ بن جاتے ہیں۔بعض ملکوں میں بھاری کثرت ان لوگوں کی ہے جو بکلّی خدا سے منہ پھیر بیٹھے ہیں اور یہ زمانہ بڑا نازک ہے جس میں ہم اس وقت گزر رہے ہیں۔تو یاد رکھو کہ اگر انسان خدا سے جدائی کرتے کرتے بغیر کسی ضمیر کی آواز کے آگے بڑھتا چلا جائے یا یوں کہنا چاہئے ضمیر کی آواز پر دھیان دیئے بغیر آگے بڑھتا چلا جائے تو لازماً ایک ایسا مقام آئے گا جہاں وہ حد سے گزر جائے گا اور اس سے تجاوز کرنے کے بعد پھر واپسی کی راہ کٹ جاتی ہے،تو وہ راہیں ہیں۔اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ان راہوں یا ان حدود کی نشان دہی کر رہے ہیں جن حدود سے آگے پھر مغفرت کا مضمون ختم اور پکڑ اور جہنم کا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔تو یاد رکھو کہ وہ شخص بڑا ہی بدنصیب اور بدقسمت ہے جو مختصر زندگی پر بھروسہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اتنا دل لگا بیٹھتا ہے کہ گویا خدا اس کے تصورات سے باہر نکل چلا ہے،اس کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہا۔اگر یاد آتا ہے تو ایک خادم کے طور پر یاد آتا ہے کہ یہاں ضرورت پڑی ہے اے خدا! میرا کام کر دے۔

بیمار ہوتا ہے تو یاد آنے کا یہ مطلب نہیں کہ بکلّی نہیں نکلا،بکلّی نکلا ہوا ہے اور یاد خدا کے طور پر نہیں آتا بلکہ نوکر کے طور پر آتا ہے۔ایک متکبر شخص اپنے سے ادنیٰ وجود کو جس طرح سمجھتا ہے کہ میری خدمت کے لائق بنایا گیا ہے جب ضرورت پڑے گی آواز دے گا تو خدا سے وہ تعلق ہرگز نہیں ہے وہ خدا اس کی دنیا سے نکل چکا ہے اور تب ہی پھر وہ آتا نہیں۔ایسا شخص لاکھ آوازیں دیتا رہ جائے خدا اس کی دنیا میں نہیں آتا کیونکہ اس کی آواز اس کو پہنچتی نہیں۔پس بکلّی خدا سے تعلق توڑ بیٹھنا ایک اتنا خطرناک مضمون ہے کہ جو روزمرّہ زندگی میں درپیش آنے کے باوجود ہم سوچتے نہیں ہیں کیونکہ تعلق جب ٹوٹے تو ٹوٹتے ٹوٹتے،ٹوٹتا ہے۔جڑے تو جڑتے جڑتے جڑتا ہے ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہمارا رخ ٹوٹنے کی طرف آگے بڑھ رہا ہے یا جڑنے کی طرف آگے بڑھ رہا ہے اتنا سا شعور ہے

جس کے پیدا ہونے سے آپ کتنی بڑی خطرناک ٹھوکروں سے بچ سکتے ہیں۔

پس اس بات کو سمجھانے کی خاطر یہ ساری میں نے تمہید باندھی ہے خدا سے بکلّی تعلق نہ ٹوٹ جائے اگر یہ ٹوٹا تو کچھ بھی نہیں رہے گا اور بکلّی تعلق تب نہیں ٹوٹے گا جب آپ نگاہ رکھیں گے کہ آپ کا تعلق ٹوٹ رہا ہے یا مضبوط ہو رہا ہے، بڑھ رہے ہیں اس کی طرف یا اس سے دور ہٹتے ہیں۔ دور ہٹتے ہوئے بھی جہاں یہ شعور پیدا ہو گیا کہ ہم نے بہت کچھ کھو دیا ہمیں واپسی چاہئے وہیں سے واپسی کا رستہ شروع ہو جائے گا، وہیں سے مغفرت کا مضمون شروع ہو جائے گا لیکن اگر اتنی تاخیر ہو جائے کہ معاملہ حد سے بڑھ جائے تو پھر آپ کا تعلق ٹوٹ چکا ہوگا، آپ کو وہم میں بھی نہیں آئے گا کہ آپ کیا کھو بیٹھے ہیں اور اس وقت پھر خدا سے دوری کی لذّتیں شروع ہوتی ہیں، انسان آزاد ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے میں ہی مالک ہوں میں سب کچھ ہوں پھر جو کچھ ہو وہ کر گزرتا ہے۔ اگر حاکم ہے تو ایسا خود مختار حاکم ہے ایسا ڈکٹیٹر بن کے ابھرتا ہے کہ اس کے لئے ہر فعل جائز ہے۔ اگر وہ ملازم ہے تو بد دیانتی میں اس کے مالک کے معاملات میں ظالمانہ طور پر تصرّف کے معاملے میں اس کو ذرّہ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ حکومتوں کے ملازم دیکھ لیں اب ہمارے ممالک میں جہاں بدقسمتی سے بد دیانتی زیادہ ہو گئی ہے وہاں یہی حال ہے۔ حکومت کے مال کو تو یوں سمجھتے ہیں اس کی کوئی حقیقت، حیثیت ہی کوئی نہیں اس میں سے وہی مال ہے جو ہمارا بن سکتا ہے باقی جائے جہنم میں کوئی پرواہ نہیں تو اکثر ان کا بن جاتا ہے اور ایسی حکومتوں کے خزانے جب خالی ہوتے ہیں تو اس میں اوپر سے لے کے نیچے تک سب شریک ہوتے ہیں، سب مجرم ہیں۔ وہ جو حکومت کر رہے ہیں وہ بھی مجرم ہیں، جو حکومت کی تمنا لئے باہر بیٹھے ہیں وہ بھی مجرم ہیں کیونکہ ہر ایک کی تمنا میں حکومت کو منفعت میں تبدیل کرنے کی نیت شامل ہوتی ہے ایسے لوگوں کا پھر کچھ بھی نہیں بنا کرتا۔ اس وقت یہ سوال نہیں ہوا کرتا یہ جائے تو فلاں آئے، اس وقت تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ یہ جائے گا بھی تو کیا آئے گا۔ یہ جائے یا وہ آئے یا وہ جائے اور یہ آئے ایک ہی بات کے دو نام ہیں، کوئی بھی فرق نہیں پڑتا۔

پس اس مضمون کو اس عربی شعر پر میں اب ختم کرتا ہوں جو پہلے بھی سنا چکا ہوں لیکن امراؤالقیس کا یہ شعر بہت ہی گہری حکمتوں پر مبنی ہے اور لطف دینے والا ہے اس شعر کے حوالے سے آپ کو یہ مضمون یاد رہے گا وہ کہتا ہے:

أَلا اَيّهَا الْلَيْلُ الطَّوِيْلُ أَلا انْجَلى
بِصُبْحٍ وَمَا الاصْبَاحُ مَنْكَ بِأَمْثَلِ

کہ اے طویل رات، ظلم کی، اندھیروں کی، تکلیفوں کی ”انجلی“ روشن ہو جاؤ، دن میں تبدیل ہو جا لیکن ٹھہر ”الا ایها اللیل الطویل الا انجلی بصبح“ صبح میں بدل جا ”فما الاصباح منک بامثل“ لیکن میں کیا کہہ رہا ہوں وہ صبح جو آنے والی ہے وہ تجھ سے بہتر تو نہیں آئے گی۔ جو صبح آنے والی ہے وہ تاریک تر صبح ہے ہماری۔

پس وہ بدنصیب قومیں جن کا ہر انقلاب بدتر اندھیروں میں تبدیل ہوجایا کرتا ہے ان قوموں کو روشنی دینے کے لئے خدا نے ہمیں مقرر فرمایا ہے، ان کی کامل مایوسیوں کو مغفرت کی امیدوں میں تبدیل کرنے کے لئے خدا نے ہمیں مقرر فرمایا ہے۔ پس ہم نے صرف اپنا بوجھ نہیں اٹھانا ان بدنصیبوں کا بوجھ اٹھانا ہے جن کی تعداد، جن کی طاقت ہم سے بہت زیادہ ہے اور جن کے نزدیک ہماری کوئی بھی حیثیت نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کی زندگی ہم سے وابستہ کردی گئی ہے۔ آج خدا کے فضل سے ہم ہی ہیں اس مغفرت کے طالب جس کا ذکر یہاں موجود ہے اور جس مغفرت کے طالبوں کے سپرد خدا نے دوسروں کی مغفرت کے کام بھی فرما دیئے ہیں۔ پس ایسے ملکوں کے لئے، ایسی قوموں کے لئے خواہ وہ مغربی ہوں یا مشرقی دعائیں بھی کریں اور کوششیں بھی کریں کہ ان کو اپنے گناہوں کا احساس ہو جائے، یہ معلوم ہو کہ ہے تکلیف دہ بات، ہم جس راہ پہ چلے ہیں وہ اچھی راہ نہیں ہے پیشتر اس کے کہ وہ وقت آ جائے جہاں سے کوئی واپسی نہیں ہوا کرتی۔ اگر ہماری دعائیں اور ہمارا توجہ دلانا ان کے اندر یہ شعور پیدا کر دے تو پھر آخری کنارے سے پہلے پہلے یہ مڑ سکتے ہیں اور واپسی ممکن ہے۔

اللہ کرے ہمیں اپنی آخرت کو بھی محفوظ کرنے یعنی خدا کے فضل کی مغفرت کی چادر میں لپیٹنے کی توفیق ملے اور تمام بنی نوع انسان میں جہاں تک ہمارا اثر پہنچتا ہے ان سب کی بدحالت کو ایسی حالت میں تبدیل کرنے کی توفیق ملے جہاں سے مغفرت کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تفرید الٰہی، یعنی کائنات میں صرف اور صرف خدا کی ہستی باقی رہ جانے والی ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 4 /اکتوبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِآئَ ءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ (الزمر: 68 تا 71)

پھر فرمایا:

یہ آیات جن کی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے ان کا عنوان اس پہلی آیت کا یہ پہلا ٹکڑا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وائے حسرت انسانوں پر جو اللہ کی قدر نہیں کرتے جیسا کہ اللہ کی قدر کرنی چاہئے اور اگلا مضمون جو ہے وہ قدر کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جن میں بنی نوع انسان اکثر غافل ہیں اور اللہ کی قدر نہیں کرتے۔ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

خدا وہ ہے جس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔کائنات کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہو۔ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ یعنی زمینیں بھی اور آسمان بھی، زمینی لوگ بھی اور آسمانی لوگ بھی سب خدا کے حضور ایسے ہوں گے جیسے ان کی صف لپیٹ کر گویا خدا کے ہاتھوں کے گرد لپیٹ دی گئی ہو۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ یہ وہ وقت ہوگا جب کہ پھر صور پھونکا جائے گا اور پہلا صور جو ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ پہلے صور کے نتیجہ میں جو کچھ بھی زمین و آسمان میں ہے وہ غش کھا کے جا پڑے گا یعنی وہ تفرید کا ایک ایسا لمحہ ہے جس کی کوئی اور مثال کہیں دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتی یعنی قرآن کریم کی آیات میں جیسا تفرید الٰہی کا مضمون یہاں بیان ہوا ہے اس کامل اطلاق کے ساتھ کہ وہ ہر کائنات کی شے پر حاوی ہو کہیں اور مضمون بیان نہیں ہوا۔ یہ ہے اللہ کی قدر کہ خدا کے سوا ہر چیز عملاً ایسے ہو جیسے غائب ہو چکی ہو، اس کا کوئی وجود نہیں رہا اور مَنْ جو لفظ ہے وہ تمام ذی شعور ہستیوں کے اوپر اطلاق پاتا ہے، جو بھی آسمانوں میں ہے اور جو بھی زمین میں ہے سب کے اوپر یہ لفظ اطلاق پا رہا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شعور کے لحاظ سے وہ مالکیت کا عروج ہے ایسی مالکیت جلوہ گر ہوگی کہ جس کی کوئی مثال آپ کو کہیں اور پہلے دکھائی نہیں دے گی ایک ہی ذی شعور ہستی رہ جائے گی تمام کائنات میں آسمانی وجود ہوں یا زمینی وجود ہوں سب، کچھ وقفے کے لئے، جس کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں اپنے ہوش و حواس سب کھو دیں گے اور ملکیت کا تصور تمام تر مکمل ہو کر خدا کی طرف لوٹے گا۔اس کے بعد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا دور شروع ہوتا ہے۔ ہر چیز جو خدا نے پیدا کی ہر شعور جو خدا نے بخشا زمینی ہو یا آسمانی ہو وہ ایک وقت میں واپس لوٹ جائے گا خدا کی طرف۔اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہوگا۔اس کو تفرید کہتے ہیں یعنی اکیلا رہ جانا اور یہی ملکیت کا مفہوم ہے کہ حقیقی مالک چونکہ وہی ہے اور ثانوی ملکیتیں جو اس نے بخشی ہیں وہ چونکہ واپس لے لی جائیں گی کیونکہ اس کے بعد پھر فیصلوں کا مضمون شروع ہوگا۔ایسے فیصلے جو کائنات کے آغاز سے لے کر آخر تک تمام اہم امور سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے فیصلے پھر اس دن کئے جائیں گے۔اس لئے خدا کی ملکیت کا ظہور اس سے پہلے، حشر نشر سے پہلے مکمل ہو جانا چاہئے لیکن اس میں ایک اِلَّا بھی ہے جس کے متعلق اس سے پہلے میں روشنی ڈال چکا ہوں۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ سوائے اس کے جسے اللہ چاہے۔مفسرین اس

بحث میں الجھے رہے ہیں، بعض احادیث سے بھی بعض استنباط ہوتے ہیں گویا حضرت موسیٰؑ وہ پہلے ہوں گے جو اٹھیں گے، دوبارہ ہوش میں آئیں گے۔ اس پہلو سے اگر وہ پہلے ہوش میں آنے والے بھی ہوں تو پھر وہ کون ہے جسے خدا بے ہوشی سے محفوظ رکھے گا اور اس کے باوجود اس کی ملکیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہ وہ مضمون ہے جو میں آپ پر آج کھولنا چاہتا ہوں۔ مالکیت تام ہوگی ایسی تام کہ اس میں کسی اور کے حصے کا کوئی شک شبہ کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس کے باوجود پھر بھی جسے اللہ چاہے گا اسے اس بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دے گا یعنی پہلے صور پھونکا جانا ہے اس کی بے ہوشی ہے۔

میرے نزدیک باوجود دوسرے علماء کے اختلاف کے یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ اس میں مَنْ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے خواہ کیسے بھی مرتبے رکھتے ہوں کبھی کسی فرشتے کے تعلق میں ان کو ملکیت میں خدا تعالیٰ کے پورے سائے تلے، خدا تعالیٰ کی مالکیت کے سائے تلے ایک ہو جانے کا تصور نہیں ملتا۔ گویا صفت مالکیت کا کامل ظہور ہوا ہے۔ سوائے آنحضرت ﷺ کے جن کو خدا نے اس دنیا میں اپنی مالکیت کا مظہر بنایا ہے اور کسی نبی کا وجود نہیں ہے جو اس تصور میں رسول اللہ ﷺ کا شریک ہو سکے تبھی تاکستان والی تمثیل میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی مضمون پیش کیا ہے کہ جب بیٹے کی بھی بات نہیں سنی جائے گی تب مالک آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی نبی ہے جس کو تمثیلاً اللہ کا نام دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی نبی کو اللہ کا نام نہیں دیا گیا۔ اللہ کا نام کسی اور نبی کو دینا محفوظ نہیں تھا کیونکہ خدا کا نام کامل طور پر آنحضرت ﷺ پر اطلاق پا کر محفوظ رہتا ہے اور اس بات کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ، اللہ بن گئے ہیں یا اللہ کی صفات میں برابر کے شریک ہو گئے ہیں۔ پس مالکیت بھی اسی کو سونپی جانی تھی جس کے پاس مالکیت محفوظ ہے۔ جو اس کامل طور پر اپنے وجود کو کھو چکا ہے کہ واہمہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ وجود جسے خدا اپنی مالکیت میں شریک کر رہا ہے خود واقعتہً مالک بن بیٹھے گا۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام: 163) تو کہہ دے کہ میرا اپنا تو کچھ رہا ہی نہیں باقی۔ میرا مرنا جینا، میری عبادتیں میری قربانیاں سب کچھ کلیۃً خدا کی ہو چکی ہیں۔ ایک ایک سانس، ایک ایک لمحہ میرے اللہ کا ہو چکا ہے یہ وہ وجود ہے جسے خدا نے مالک فرما دیا، مالکیت میں اپنا شریک کر لیا۔ پس اگر قیامت کے دن مالکیت کلیۃً خدا کی طرف لوٹ جائے تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا

وجود اشارۃً بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔ ہاں اس مالکیت کا نظارہ کرنے والا کوئی ہونا چاہئے تھا ورنہ یہ انتہائی لطف کا لمحہ کائنات کی دسترس سے باہر ہو جاتا۔

پس وہ ایک منظر ہے جس کو میرا دل قبول کرتا ہے اور میرا ذہن اس کی تصویر کھینچتا ہے، روح کا ذرّہ ذرّہ اس پر فدا ہوتا ہے۔ تمام مالکیت خدا کی طرف لوٹ گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کا وجود اس میں باشعور ہونے کے باوجود اس میں حائل نہیں ہے۔ اس وقت پھر ایک صور پھونکا جائے گا۔ احادیث میں آتا ہے سب سے پہلا شخص جو سر اٹھائے گا وہ موسیٰ ہوں گے تو اس کو دیکھنے والا بھی تو کوئی تھا یعنی خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو، میرے نزدیک، پہلے کامل ہوش میں رکھا تھا۔ آپؐ گویا یہ نظارہ کر رہے ہیں کہ سب سے پہلے کون رسول سر اٹھاتا ہے وہ حضرت موسیٰؑ ہیں۔ ''سب سے پہلے'' میں علماء رسول اللہ ﷺ کو اس طرح نکال دیتے ہیں کہ گویا آپؐ بھی تمام میں شامل تھے اور اس کے باوجود موسیٰؑ کو پہلے ہوش آئی رسول اللہ ﷺ کو نہیں آئی۔ یہ جو حدیثیں ہیں بہت الجھاؤ والی ہیں اور ان پر تفصیل سے میں ایک دفعہ روشنی ڈال چکا ہوں لیکن منطقی بحثوں میں پڑے بغیر میں پھر اپنے اس کامل ایمان کا اظہار کرتا ہوں کہ وہ حدیثیں درست روایت کے لحاظ سے تھیں یا نہیں ان کا جو بھی مفہوم ہے اس آیت کریمہ میں جو مَنْ ہے وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ورنہ مالکیت میں کوئی اور حق دار ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر خدا کے علاوہ کوئی اور شعور میں رکھا جائے اور مالکیت اس کی طرف کامل طور پر لوٹ جائے تو ہر باشعور اس مالکیت میں کسی نہ کسی رنگ میں حصہ پائے گا اور اپنے انفرادی وجود کی حیثیت سے وہ باقی رہے گا۔ مگر وہی ہے جو رکھا جاسکتا ہے جس کا باقی رہنا نہ رہنا ان معنوں میں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتا کہ گویا وہ خدا کی کسی صفت میں اس سے برابری کا کسی پہلو سے بھی دعویدار رہا ہو یا اس کے وہم و گمان سے بھی یہ بات گزر سکے یہ کامل وجود سوائے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اور کوئی نہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تفاسیر بھی اسی بات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں مالکیت میں سورہ فاتحہ میں جو لفظ مالک آتا ہے آخر پر یہ ظاہر کر رہا ہے، ثابت کر رہا ہے کہ وہ آخری رسول اللہ ﷺ، جو آخری پیغمبر بن کے خدا کا پیغام لے کے دنیا کے سامنے آئے وہ خدا کی مالکیت کے مظہر تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہیں اور اس صفت میں آپؐ کا کوئی اور شریک نہیں۔

پس اس پہلو سے یہ اللہ کی قدر ہے جو کسی کو علم نہیں، کوئی اس کا حق ادا نہیں کرتا۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اللہ کے سوا کسی کو اس قدر کا علم نہیں جو یہ قدر ہے کہ ہر چیز جو اس نے پیدا کی ہے بالآخر کالعدم ہو جائے گی۔صرف ایک وجود جسے وہ چاہے گا رکھے گا۔اس وجہ سے نہیں کہ مالکیت میں کوئی رخنہ پیدا ہوگا،اس لئے کہ مالکیت میں اس کے ہونے سے کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوسکتا۔پھر کیا ہوگا۔وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ تب خدا تعالیٰ کی طرف سے وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۔ارض سے مراد یہاں وہ محل ہے،ارض سے مراد ہر جگہ زمین نہیں ہوا کرتی،ارض سے مراد وہ Expanse ہے،وہ دائرہ وسعت ہے جس میں کوئی واقعہ رونما ہو رہا ہوگا وہ اللہ کے نور سے روشن ہو جائے گا۔ایک حیرت انگیز نور کا جلوہ ہوگا جو ہر چیز کو ڈھانپ لے گا۔اس وقت کتاب پیش کی جائے گی۔وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ اور نبیوں کو شہداء کے طور پر لایا جائے گا۔اب اس میں بھی بعض دفعہ غلطی سے رسول اللہ ﷺ کو اس لئے داخل کیا جاتا ہے آپؐ بھی نبی ہیں۔آپؐ بھی شہید ہیں۔مگر قرآن کریم کی دوسری آیت یہ بتا رہی ہے کہ تمام نبی جب شہداء کے طور پر پیش ہوں گے تو آپؐ ان سب پر ان سب کے شہید کے طور پر پیش ہوں گے۔اس لئے وہاں الگ ذکر جو شہید کا ہے یہ بتا رہا ہے کہ جو مضمون میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس کے ساتھ وہ متصادم نہیں ہے،یہ آیت کہ نبی شہداء کے طور پر پیش ہوں گے۔دوسری جگہ خدا تعالیٰ نے کھول دیا ہے کہ سب نبی بطور شہداء آئیں گے اور اے محمد ﷺ! پھر تو ان سب کے اوپر شہید بن کر آئے گا یعنی ان کا شہید بنا دیا جائے گا۔وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ حق کے ساتھ ان کے درمیان پھر فیصلہ کیا جائے گا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جس پر ظلم کیا جائے۔وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ہر جان اس وقت جو کچھ اس نے کیا ہے وہ پورا پورا اس کا بدلہ دیا جائے گا۔وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ اور وہ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

اس آیت کا تعلق محض اس المناک وفات سے نہیں ہے جو ہمارے پیارے بھائی آفتاب احمد خان کی وفات سے ہمیں صدمہ پہنچا ہے۔اس موقع پر اس وفات کے حوالے سے اس آیت کا مضمون آپ کو میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ یاد رکھیں سب نے وہیں جانا ہے،کوئی مستثنیٰ نہیں۔یاد رکھیں کہ

وہی ایک ہے جو باقی رہنے والا ہے، وہی ہے جو باقی رہے گا۔ باقی سب ثانوی وجود یہاں تک کہ اپنے نفس کا احساس تک سب کچھ مٹ جانے والا ہے۔ پس اس کی تیاری کرنی چاہئے کہ وہ وقت جو سب پر آنا ہے اس کی فکر کریں۔ جو بھائی اچھے حال میں خدا کی رضا کی راہوں پر چلتا ہوا رخصت ہو گیا اس کی فکر کا تو موقع نہیں اپنی فکر کا موقع ہے کیونکہ ابھی ہمارا دار العمل باقی ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم نیک اعمال پر، اگر کچھ ہیں قائم رہیں گے کہ نہیں رہیں گے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اپنے بداعمال کے داغ دھوسکیں گے کہ نہیں دھوسکیں گے۔ وہی جانتا ہے کہ کس صورت میں ہم اس آواز پر لبیک کہیں گے جو سب کو آنے والی ہے۔

اسی لئے اِنَّا لِلّٰهِ کے تعلق میں میں نے پہلے بھی یہ بات آپ کے سامنے کھولی تھی کہ جب ہم اِنَّا لِلّٰهِ پڑھتے ہیں تو پہلے اپنے اوپر پڑھا کریں اور مرنے والے پر اس کا اطلاق آپ پڑھیں نہ پڑھیں ویسے ہی ہوتا ہے، وہ تو لوٹ بھی گیا۔ انّہ للّٰہ و انّہ الیہ راجعون تو نہیں فرمایا کہ یہ مرنے والا اللہ ہی کی طرف سے آیا تھا اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔ اس مضمون کو تو خدا نے نکال ہی دیا ہے یہاں سے۔ فرمایا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ہم جو زندہ ہیں اس وقت، ہم بھی تو اسی کی طرف سے آئے ہیں اور ہم سب بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ پس جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کو اپنی فکر زیادہ چاہئے جانے والے کی فکر کے مقابل پر کیونکہ جب خدا نے اس کے اعمال کا دروازہ بند کر دیا تو پیچھے رہنے والوں کا اس میں دراصل کچھ بھی دخل باقی نہیں رہتا۔

دعائیں ہیں، دعائیں تو ہوتی رہتی ہیں ہمیشہ لیکن زندوں کے لئے پہلے اور مرنے والوں کے لئے بعد میں۔ ہر جنازے پر آنحضرت ﷺ کا یہی طریق تھا کہ پہلے **اللّٰھم اغفر لحیّنا و میتنا** اے اللہ ہمارے زندوں پر اپنی مغفرت فرما اور میتوں، مردوں کی بھی مغفرت فرما۔ تو جس مضمون کو حضور اکرم ﷺ نے جہاں بیان فرمایا، جہاں رکھ دیا ناممکن ہے کہ اس کو اپنی جگہ سے اٹھا کر کسی اور جگہ رکھا جائے اور بدزیبی پیدا نہ ہو۔ وہ محل جہاں رسول اللہ ﷺ نے ایک لفظ رکھ دیا وہیں رہتا ہے اور اس کو ہٹایا نہیں جاسکتا، اس کو ہلایا نہیں جاسکتا۔ پس اس سے پیغام ہمیں یہ ملنا چاہئے کہ ہر وہ موت جو کسی نیک صالح انسان کی موت ہو جس نے اپنی زندگی کو خدا کے لئے خدمت میں وقف کر رکھا ہو اس سے سب سے پہلی توجہ اپنے اعمال کی طرف پھرنی چاہئے اور اپنی بقیہ زندگی کی بے اختیاری کی طرف

نگاہ جانی چاہئے اور یہ ایک عزم صمیم پیدا ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا یہ نہ ہو کہ مجھے ایسے وقت میں آواز آ جائے کہ جب بے خبری کی حالت میں، میں اپنی حالت سے بے خبر خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاؤں اور اس کوشش میں مصروف نہ ہوں کہ میرے گناہوں کے داغ مٹ رہے ہوں۔ اس جدوجہد میں میری جان نہ جائے، **نعوذ باللہ من ذالک** کہ جس سے پتا چلتا ہو کہ میں خدا کی راہ میں سرک سرک کے بھی زور سے طاقت کے ساتھ، کبھی کمزوری کے ساتھ، مگر آگے بڑھ رہا ہوں، مسلسل آگے بڑھ رہا ہوں۔ یہ وہ انسان کی سوچ ہے جو اس کی آئندہ زندگی کی ضمانت ہے، اس بات کی ضمانت ہے کہ جس حال پہ بھی اس پر موت آئے گی وہ خدا کی رضا پر مرے گا۔

پس اس پہلو سے آفتاب احمد خان صاحب کے وصال کے نتیجہ میں جو ہمارے اندر خلاء پیدا ہوا ہے وہ خلاء اسی طرح بھر سکتا ہے کہ آپ کے نقش قدم پر چلنے والے اور آپ کی وفات سے سبق لینے والے بکثرت پیدا ہوں اور انگلستان کے چونکہ امیر تھے اور بہت ہی شاندار امارت رہی، بہت ہی کامیاب رہی ہے اس لئے انگلستان کی جماعت میری اولین مخاطب ہے۔ یہ تو ہمیں وہم پیدا ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی کے چلے جانے سے خدا کے کام بند ہو سکتے ہیں، ناممکن ہے۔ ہاں کسی کے چلے جانے سے اس سے نقوش قدم پر چلنے والے اگر نئے پیدا ہو جائیں تو وہ اس کا وصال کام آگے بڑھانے والا تو بنتا ہے، کام کو پیچھے دھکیلنے والا نہیں بنتا۔

اور یہی وہ شعر ہے جو ایک عربی شاعر نے کہا جو خود زندہ جاوید ہے:

اذا سید منا خلا قام سید

قؤول لما قال الكرام فعول (السموأل بن غريض)

ہم تو ایک زندہ قوم ہیں ہم میں کسی بڑے آدمی کے مرنے سے قوم نہیں مرا کرتی۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ''**اذا سید منا خلا**'' جب ایک سردار، عظیم الشان خوبیوں کا مالک ہم میں سے نکل جاتا ہے گزر جاتا ہے **قام سید** ایک اور سردار اٹھ کھڑا ہوتا ہے **قؤول لماقال الكرام** جو معزز لوگ کہا کرتے تھے ویسی ہی باتیں وہ بھی کہتا ہے **فعول** اور اسی طرح عمل کرنے والا ہے۔ محض زبانی جمع خرچ پر بات کو نہیں چھوڑتا بلکہ اپنے افعال، اپنے نیک اعمال سے ثابت کرتا ہے کہ وہ ان نیکوں میں اسی طرح ایک زندہ وجود ہے جس طرح مرنے والا اس کی ذات میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

پس جب ہم کہتے ہیں وہ زندہ رہے گا یا ہمیشہ زندہ رہے تو مراد یہی ہوتی ہے کہ اپنے پیچھے ایسے وجود چھوڑ جائے جن میں ہو کر پھر وہ زندہ رہے اور ایک سے زیادہ ہوتے چلے جائیں، بجائے کم ہونے کے۔ یہ تصور دنیا میں بھی پایا جاتا ہے مگر ایک بھیانک صورت میں۔ سچی، حقیقی صورت میں جو بھیانک نہیں بلکہ بہت ہی دلربا ہے وہ اسلام ہی میں پایا جاتا ہے یہ تصور۔ کہانیوں میں ذکر ملتا ہے ایک Hydra-Headed جن کا، ایک ایسے بھوت کا جس کے ایک سے زیادہ سر تھے اور جتنے سر کاٹتے تھے اتنے ہی زیادہ اگتے چلے جاتے تھے اور ناممکن تھا کہ اس کو ختم کیا جا سکے۔ یہ تصور پرانے زمانے کی کہانیوں میں ملتا ہے مگر ایک حقیقت پر مبنی ہے محض ایک وہم نہیں محض ایک کہانی نہیں۔ Hydra ایک ایسا جانور ہے جو واقعۃً یہ صفات رکھتا ہے۔ اس کے سر کو اگر کاٹا جائے تو وہ کٹا ہوا سر اپنے نیچے سے ایک اور وجود پیدا کر کے سارا جسم مکمل کر لیتا ہے اور کٹا ہوا جسم ایک سر نکال کر ایک اور وجود مکمل کر لیتا ہے۔ پس عجیب جانور ہے کہ جس کو کاٹ کر ختم نہیں کیا جا سکتا، جسم اپنا سر پیدا کر لے گا، سر اپنا جسم پیدا کر لے گا۔ پس اس قسم کے واقعات پرانے زمانوں میں سائنس دانوں نے مشاہدہ کئے ہیں۔ اس زمانے کے سائنس دان بھی بہت غور کرنے والے لوگ تھے، بڑے بڑے فلسفی تھے جنہوں نے Hydra کا یہ حال دیکھا ہوگا اس سے یہ کہانیاں بن گئیں۔ کوئی جن بھوت ہے جس کو جتنا کاٹو وہ اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مگر اسلام میں جو یہ تصور ہے یہ نیکی کی ترویج سے تعلق رکھتا ہے اور اس مضمون سے تعلق رکھتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی ایک نہیں ہے اور اللہ قائم رہتا ہے اور اگر اللہ قائم رہے تو اس سے تعلق رکھنے والے بھی قائم رہا کرتے ہیں ان معنوں میں۔ پس اگر خدا سے تعلق جوڑے رکھو گے تو تم نیک معنوں میں Hydra بن جاؤ گے جس کا ایک سر جدا ہو تو دوسرا سر بھی اگ آتا ہے اور ایک اور جسم بھی نکل آتا ہے اس سر کے نیچے سے، تو وہ بڑھتا ہے، کم نہیں ہو سکتا۔

پس وہ لوگ جو اپنے بڑوں، بزرگوں، نیکوں کی وفات کے اوپر یہ عزم لے کر زندہ رہتے ہیں کہ ہم نے ان نیکوں کو نہیں مرنے دینا۔ جس خدا نے ان کے وجود کو یہ نیکیاں بخشی تھیں ہم اسی سے اپنا تعلق بڑھائیں گے اور اس تعلق کے نتیجہ میں ہمارے اندر کمزوری پیدا ہونے کی بجائے پہلے سے بڑھ کر تقویت آئے گی۔ جو قومیں، جو روحانی، مذہبی قومیں اس راز کو سمجھ لیں ان کے اوپر کبھی موت نہیں آ سکتی۔ ناممکن ہے کہ وہ ختم ہو جائیں، ہمیشہ بڑھتی چلی جائیں گی لیکن بدنصیبی ہے کہ مذہبی قوموں میں

اکثر اپنی زندگی کو کسی موت پر آگے بڑھانے کی بجائے ماضی کی موتوں کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ وہ قومیں مردہ لوگوں کے ساتھ زندہ ہونے لگ جاتی ہیں یعنی ان معنوں میں نہیں کہ ان کی خوبیوں کو لے کر خود ان نیکیوں کو آگے بڑھائیں بلکہ مردوں کے تصور سے اپنے آپ کو ایسا باندھ لیتی ہیں کہ گویا ہماری زندگی ان کی زندگی تک تھی اور اب بھی اگر ہم زندہ ہیں تو ان کے واسطے زندہ ہیں۔ خوبیوں سے نہیں، ان کی عطاؤں سے زندہ ہیں۔ پس جتنے بھی بزرگ ہیں جن کی قبروں پر سجدے کئے جاتے ہیں، جتنے بھی داتا ہیں جن سے مرادیں مانگی جاتی ہیں یہ سارے اس برعکس صورت کا مظہر ہیں کہ قوم اپنی زندگی ماضی کے حوالے کر کے ایک مردہ جسم کو آگے دھکیلتی چلی جاتی ہے، جو کتنا مختلف مضمون ہے اس مضمون سے جو قرآن کریم آپ کے سامنے رکھتا ہے کہ اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق رکھو اور بڑھتے چلے جاؤ۔ ایک کامل وجود سے دوسرے وجود پیدا ہوں۔

بار بار میں اس مضمون کو آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور آنحضرت ﷺ کے حوالے سے رکھتا ہوں۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: 30)۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ہیں اور اکیلے نہیں رہنے والے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ پہلے کہاں تھے جب ان کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا اکیلے تھے لیکن آپ اٹھے تو آپ کے ساتھ جو لوگ اٹھے وہ آپؐ نے اٹھائے ہیں۔ جو معیت والے خوش نصیب یہاں مذکور ہیں وہ معیت محمد رسول اللہ ﷺ نے خود ان کو عطا کی اور آپؐ کی بدولت، آپؐ کی قوّت قدسیہ سے وہ لوگ زندہ ہو ہو کر آپؐ کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ پس یہاں وہ Hydra کا برعکس مضمون ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا کہ مومنوں میں سے اگر ایک سردار پیدا ہوتا ہے تو وہ کم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود پھیلتا چلا جاتا ہے اور یہ مضمون ایک فرق رکھتا ہے Hydra کے ساتھ۔ Hydra میں اس کا بڑھنا اس کی موت سے لازماً وابستہ ہے۔ مگر مومن کی نشوونما موت سے پہلے یقینی طور پر ہو کر اس بات کو ناممکن بناتی ہے کہ ان کا سردار مر جائے تو قوم بھی ساتھ مر جائے۔ اپنے جانے سے پہلے اپنے زیر تربیت، اپنے پروں کے نیچے پلے ہوئے لوگوں کو وہ وجود چھوڑ جاتا ہے۔ تب ہی خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کے ساتھ آپؐ کے صحابہ کے اسوہ کا ذکر فرمایا۔ یہ تو مراد نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے موجود ہوتے ہوئے کسی اور اسوہ پر نظر پڑ سکتی تھی۔ وہ تو مٹے ہوئے اسوہ نظر آتے تھے۔ وہ ایسے تھے جیسے سورج کے سامنے

شمعیں بجھ چکی ہوں۔ کون تھا جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے اسوہ کی تلاش کیا کرتا تھا، کون تھا جو عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کے اسوہ کے پیچھے بھاگتا تھا۔ ایک ہی تھا محمد رسول اللہ ﷺ جن کا اسوہ تھا اور باقی سب اسوے اس کے سامنے مٹے ہوئے تھے۔ پس قرآن کریم کی یہ ہدایت کہ ان کے اسوہ کی پیروی کرو، بتا رہی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جب جدا ہو جائیں گے تو یہ لوگ اپنی ذات میں محمد رسول اللہ ﷺ کی شمعوں کو زندہ رکھنے والے ہوں گے کہ آپ اپنے وصال سے پہلے یہ کر چکے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ کا مضمون صادر آچکا ہے۔ اس لئے زندگی ہی میں ایسا ہونا لازم ہے۔ مگر اگر نہ ہوا ہو تو پھر کسی کی موت اگر کچھ زندہ لوگ پیدا کر دے تو کتنی خوش قسمت موت ہوگی اور وہ لوگ بھی خوش قسمت ہوں گے جو کسی کے مرنے سے مر نہیں جایا کرتے بلکہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ سارا مضمون ہے جس کے پیش نظر میں نے اس آیت کریمہ کی آپ کے سامنے تلاوت کی اور میں امید رکھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ تعالیٰ قرآن کی ان آیات کے مصداق بنیں گے۔

جب ان کے وصال کی خبر ملی اس وقت میں ہارٹلے پول میں تھا اور سوائے اس کے میرے دل سے کوئی آواز نہیں اٹھی کہ اِنَّا لِلّٰهِ ہمارا ایک بھائی ہم سے جدا ہو گیا۔ میں نے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا کہ تذکرہ کا مطالعہ کرو مجھے بتاؤ یہ جو اچانک سا واقعہ ہوا ہے عجیب، کیا اشارۃً کسی جگہ ذکر ملتا ہے الہام میں، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہام میں۔ تو ایک ایسا الہام انہوں نے نکالا ہے جو میں یہ نہیں کہتا کہ لازماً اس واقعہ پر اطلاق پاتا ہے مگر مشابہ بہت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں، یہ ذکر حبیب میں مفتی صاحب کی روایت ہے، حضرت مفتی صاحبؓ کی۔ فرمایا

''تھوڑی سی غنودگی کے ساتھ الہام ہوا اِنَّا لِلّٰهِ ہمارا بھائی اس دنیا سے چل دیا۔''

اور یہ وہ خبر ہے جس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما رہے ہیں۔

''مصداق ذہن میں نہیں آیا'' (تذکرہ: 664)

حالانکہ اکثر الہامات جو اشارۃً بھی ہوتے رہے ہیں مثلاً پل ٹوٹ گئے یا دو شہتیر ٹوٹ گئے، **شاتان تذبحان** ہر جگہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک توجیہہ پیش فرمائی ہے ایک

تعبیر بیان کی ہے کہ میرے نزدیک یہ وہ امکانی طور پر مصداق ہے اس الہام کے یعنی اپنے صحابہؓ میں سے بعض کے نام لئے۔ بعض جگہ یقینی مگر بعض جگہ امکانی طور پر فرمایا۔ یہ وہ الہام ہے جو خاموش پڑا ہوا ہے آج تک تذکرہ میں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے بعد اور کچھ نہیں فرمایا اور کسی صحابیؓ نے پھر اس کی کوئی اور توجیہہ کر کے کسی پر اطلاق نہیں کیا اور چونکہ یہ فقرہ ویسا ہی تھا جیسا کہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا، کوئی الہام نہیں تھا مگر ایک دل کا بے ساختہ اظہار تھا اس کے سوا میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ تو یہ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا اور دل کو ایک سکینت بھی نصیب ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر دور تک نظر رکھتا ہے اور بعض ایسے الہامات جو بظاہر بے عنوان ہوں یہ خدا کے بہت سے بندوں پر اطلاق پائیں گے اور پاتے چلے جائیں گے۔ پس یہ بھی میں نہیں کہتا کہ آفتاب احمد خان ہی ہیں جو اکیلے باقاعدہ مراد تھے۔ یہ تو ایک بہت بڑا دعویٰ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تو نعوذ باللہ سمجھ نہیں آئی مگر مجھے آ گئی مگر میری مراد صرف اتنی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک معین شخص بتا کر نہ سمجھانا یہ ایک حکمت رکھتا ہے کہ ایسے کئی پاک وجود اس دنیا سے رخصت ہوتے رہیں گے جن کے وصال کی خبر سے بے ساختہ مومنوں کے دل سے یہ آواز اٹھے گی ''اِنَّا لِلّٰہِ! ہمارا بھائی اس دنیا سے چل دیا''۔ پس ایک بھائی چل دیا مگر دعا کریں کہ کثرت سے ایسے اور بھائی پیدا ہوتے رہیں۔

آپ کے ذکر خیر میں میں کچھ باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ کی نیکیوں سے باقی لوگوں کو بھی نصیحت ہو اور وہ ویسا بننے کی کوشش کریں۔ مختصراً آپ کے حالات زندگی یہ ہیں کہ 24/ستمبر 1924ء کو آپ محترم خان ثناء اللہ خان صاحب اور محترمہ امتہ المجید صاحبہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مکرم شیخ محمد صاحب صحابیؓ تھے اور آفتاب خان صاحب مجھے بتایا کرتے تھے کہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی آپ کے آباؤ اجداد میں سے کسی طرف سے ہیں۔ پس اندھیروں سے دن نکلنے کا جو مضمون ہے وہ اس پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ محمد حسین صاحب بٹالوی کی اوّل تو ان کا اپنا ایک نواسہ سعید حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لا کر اپنے نانا کے کذب پر مہر تصدیق ثبت کر گیا۔ کذب پر بھی ایک تصدیق ہوا کرتی ہے اور بڑے کھلم کھلا اعلان کیا کرتے تھے کہ میرا نانا جھوٹا نکلا، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سچے تھے۔ تو اب مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

محمد حسین صاحب بٹالوی کی اولاد میں سے تصدیق کرنے والے اور اوّل درجے پر خادم، خدمت کا مقام حاصل کرنے والوں میں ایک ہمارے آفتاب خان صاحب بھی بنتے ہیں۔ آپ کے نانا شیخ محمد صاحب تھے۔ بڑے ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور سے آپ نے تاریخ میں MA کیا۔ میں مختصر بتا رہا ہوں آپ کی والدہ بھی ایک صحابیؓ کی اولاد تھیں۔ 1945ء تا 1947ء تک گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں پڑھاتے رہے۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی وہاں سے MA کیا ہے آپ نے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں پڑھایا، پھر 1947ء میں انکم ٹیکس افسر لاہور مقرر ہوئے۔ پھر 1948ء میں فارن سروس آف پاکستان میں آئے ہیں پہلی بار اور 1948ء سے 1989ء تک سیاسی مبصر اور سفیر کے طور پر پاکستان کی خدمت کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں واشنگٹن نیویارک جکارتہ، لندن، دہلی، اٹلی وغیرہ وغیرہ اور یوگوسلاویہ، یہ لکھا تو نہیں ہوا مگر مجھے یاد ہے آپ یوگوسلاویہ میں بڑی خدمت سرانجام دیتے رہے ہیں۔ یہ آپ کی جو پروفیشنل زندگی ہے ایک بیوروکریٹ کے طور پر اس کا یہ خلاصہ ہے۔

1949-50ء میں UNO کی میٹنگ میں شمولیت کی جبکہ چوہدری ظفر اللہ خان صاحبؓ وزیر خارجہ تھے۔ مسئلہ کشمیر، لیبیا، تیونس، مراکو اور الجیریا کے مسائل پیش کئے گئے جن میں آپ کو پاکستان کی طرف سے نمائندگی یعنی بیوروکریٹک لیول پر نمائندگی میں خدمت کی توفیق ملی۔ وزارت خارجہ میں ڈائریکٹر جنرل کے طور پر بھی آپ کی پوسٹنگ رہی، اٹلی اور یوگوسلاویہ میں پاکستان کے سفیر تھے اور جماعتی خدمات کا جہاں تک تعلق ہے پہلی بار آپ کو 1981ء میں جلسہ سالانہ ربوہ میں تقاریر کا انگریزی ترجمہ پیش کرنے کا موقع ملا۔ یہ وہ ابتدائی تجربہ تھا جو خدا تعالیٰ نے میرے ذریعہ کروایا اور مجھے پتا نہیں تھا کہ آئندہ خدا تعالیٰ مجھ سے اس نہج میں کام لینا چاہتا ہے اس لئے مجھے خیال آیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے زمانے میں، آخری دو تین سال کے اندر بہت اصرار کے بعد میں نے یہ نظام شروع کیا کہ کیسٹس کی صورت میں حضرت خلیفۃ المسیح کے خطبات افریقہ اور دوسرے ایسے ممالک میں جہاں پاکستانی سمجھنے والے موجود ہیں پھیلائے جائیں اور کیسٹس کی ترسیل کا سلسلہ اس وقت شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت تک جو باہر سے آنے والے مہمان تھے ان کے لئے جلسہ سالانہ میں ساتھ ساتھ جاری تقریر کا ترجمہ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوتے تھے ساتھ وہ کچھ بتا دیا کرتے تھے مگر اکثر تو بے چارے بت بن کر محض ادب میں جلسے پر حاضر رہا کرتے تھے۔ تو

خدا تعالیٰ نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ پہلے ترجمہ کرنے کا جاری نظام جو ہے وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی زندگی کے آخری ایام میں شروع ہو چکا تھا اور آفتاب احمد خان صاحب لندن سے تشریف لائے تھے میں جانتا تھا کہ ان کی اردو بھی بہت اچھی ہے، انگریزی بھی بہت اچھی ہے اس لئے ان سے درخواست کی اور انہوں نے ماشاء اللہ بہت عمدہ طریق پر اس ترجمہ کا حق ادا کیا۔ مختلف وقتوں میں، مختلف کمیٹیوں میں قرآن کریم کے جو ترجمہ کا سلسلہ چلا تھا میں نے اپنے ساتھ ایک کمیٹی بنائی ہوئی تھی اس میں بھی یہ شامل رہے اور صدر قضا بورڈ کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ 1986ء میں پہلی بار امیر UK مقرر ہوئے۔ جب امیر مقرر ہوئے ہیں تو جہاں تک ان کی نیکی اور تقویٰ کا تعلق تھا ایک ذرّہ کا بھی مجھے کبھی شک نہیں پڑا لیکن جہاں تک ان کی بیوروکریٹک تربیت کا تعلق تھا اس کے پیش نظر مجھے لازماً ساتھ ساتھ چلنا پڑتا تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ نظام جماعت کو چلانا اور چیز ہے اور بیوروکریٹ ہوکر ایک بہترین مثال قائم کرنا ایک اور بات ہے۔ حکومت کی ملازمتیں، دنیا کی اعلیٰ تعلیمات کے باوجود، ایک شخص کی نیکی کے باوجود اسے جماعتی خدمات کے لحاظ سے پوری طرح صیقل نہیں کرسکتیں۔ یہ قصہ ہی اور ہے۔ انہی لوگوں کو یہ طریقہ آتا ہے جو بچپن سے خدام الاحمدیہ، اطفال الاحمدیہ، انصاراللہ ان کی تنظیموں سے جو طوعی کام کرنے والی تنظیمیں ہیں ان سے گزرے ہوں اور ان کو پتا ہو کہ طوعی کام لینا ہوتا کیا ہے۔

ایک بیوروکریٹ نے تو جب حکم دے دیا وہ حکم ہو گیا کام چل پڑا خواہ کوئی دل سے قبول کرے یا نہ کرے۔ مگر نظام جماعت میں لوگوں کے دلوں کو ساتھ لے کر چلنا یہ راز ہے نظام جماعت کی کامیابی کا اور اس کے علاوہ ہر بندے کی پہچان صحیح ہو کہ یہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں۔ ظاہری طور پر بعض دفعہ لوگ قابل ہوتے ہیں باطنی طور پر قابل نہیں ہوتے۔ تو اس پہلو سے ان کو میں نے سمجھایا کہ جہاں تک ممکن ہے جو اہم فیصلے ہیں ان میں مجھ سے بات کر لیا کریں۔ چنانچہ اس دن کے بعد تا وفات انہوں نے مسلسل اس بات کو اپنائے رکھا، کبھی بھی کوئی فیصلہ آخری نہیں کرتے تھے جب تک پہلے مجھ سے بات نہ کر لیں۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ان کے مشوروں کو میں مان جاتا تھا اور کئی دفعہ کہتا تھا کہ میرے نزدیک تو یہ ٹھیک نہیں۔ چھوڑ دیں اس بات کو اور بڑے شرح صدر کے ساتھ مسکراتے ہوئے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ چونکہ ایک دوستانہ رنگ تھا بھائیوں کی طرح اس لئے میں ہمیشہ اپنے اس اختیار کو بلکہ

اکثر اپنے اس اختیار کو کام میں لاتا ہی نہیں تھا کہ اگر مجھے تسلی نہیں ہے تو میں ان کو مجبور کروں کہ وہ اپنا مشورہ بدلیں اور اسی پر عمل کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔ آپس میں گفت وشنید میں کہتا تھا اچھا آپ تجربہ کرلیں مگر میری رائے یہی ہے۔ اب یہ بھی ان کے تقویٰ کی نشانی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں لوگ جو میرے اردگرد ہیں وہ ہاں ہاں کر کے ہی اردگرد ہوتے ہیں، بالکل جھوٹ ہے۔ بہت سے میرے قریب ایسے ہیں جو اس لئے قریب ہیں کہ بڑی جرأت اور اعتماد کے ساتھ، اخلاق کے ساتھ اپنی رائے پیش کرتے ہیں جو میری رائے کے مخالف ہو لیکن شرط یہ ہے کہ جب میں فیصلہ دے دوں کہ یہ کرنا ہے، وہ نہیں کرنا اپنی رائے کو اس طرح مٹا دیتے ہیں جس کا وجود ہی کوئی نہیں تھا۔ یہ بات سو فیصدی آفتاب خان صاحب کی امارت پر اطلاق پاتی ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے کہا جی میرے نزدیک فلاں فلاں جو دوست ہیں وہ فلاں کام بہترین کر سکتے ہیں اور ساتھ معذرت کے ساتھ کہتے تھے مجھے پتا ہے آپ کو اتفاق نہیں۔ میں جانتا ہوں آپ کو اختلاف ہے مگر مجھے یقین ہے۔ میں نے کہا اگر آپ کو یقین ہے تو شوق سے کریں، میری طرف سے اجازت ہے۔ خدا کرے آپ کا یقین درست نکلے۔ تو اس کے بعد چھ مہینے، کبھی سال کے بعد سر پھینکا ہوئے آتے تھے کہ وہی بات ہوئی جو آپ کہتے تھے۔ مجھے یقین تھا مگر غلط نکلا۔ تو یہ جو لمبے تجربے سے ایک فراست نصیب ہوتی ہے یہ بیوروکریسی کو ملتی ہی نہیں کیونکہ ان کا ماحول مختلف ہے۔ نہایت ذہین ہونے کے باوجود اعلیٰ سے اعلیٰ افسر بھی اس تجرباتی فراست سے محروم رہتے ہیں جو لمبے عرصے کے ایسے کاموں سے نصیب ہوتی ہے جس میں جبر کو کوئی دخل نہیں ہے۔ طوعی کام ہیں اور اس میں وہی افسر کامیاب رہتا ہے جو طوعی خدمت لینے کا سلیقہ سیکھ جاتا ہے اور اس کے لئے پھر تجربے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مجلس شوریٰ کے موقع پر اور ایسے مواقع پر کئی دفعہ بعض غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں مگر فوراً اس کی تصحیح فرماتے تھے۔ جب بھی میں ان کو کہتا تھا یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا جب بالکل صیقل ہو گئے اور اس جلسے کے بعد ایک موقع پر مجھ سے کہا کہ اب تو دیکھیں سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اس مجلس شوریٰ کے بعد بھی یہی بات کی گویا یہ بتانا چاہتے تھے کہ جس طرح آپ نے مجھے تیار کیا میں پوری طرح تیار ہو گیا لیکن جب تیار ہوئے تو اللہ نے واپس بلا لیا۔ اس کی رضا پر ہم راضی ہیں۔ وہ اور بھی ایسے ہمیں عطا کر دے گا لیکن خلاء جو چھوڑا ہے وہ بہت بڑا ہے، معمولی خلاء نہیں کیونکہ جماعتی کاموں کے علاوہ

جو جماعتی دائرے سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان سے بیرونی تعلقات میں بہت کام لئے ہیں کیونکہ بحیثیت ایک نہایت ذہین، کامیاب اور شریف النفس بیوروکریٹ کے ان کا تعلق اپنے ماتحتوں سے بھی گہرا تھا اور اپنے افسران سے بھی بہت گہرا تھا اور اردگرد جو بھی ان سے ملنے، ان سے رابطے میں آئے ان سے بھی تعلقات ہو جاتے تھے اور بیوروکریسی سے نکلنے کے بعد میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے تعلقات اس قدر گہرے اثر انداز ہوئے ہوں ان لوگوں پر جن سے کبھی گورنمنٹ کی خدمت کے دوران واسطے پڑتے تھے۔ لوگ تو اس وقت سر جھکاتے ہیں کسی افسر کے سامنے، جب اس کی افسری ختم ہوئی تو ان کا سر بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن ماتحتوں کا بھی یہی حال ہے ان کے سامنے ان کی اطاعت کے جذبے بڑے اخلاص سے قبول کرتے، جب بات ختم ہوئی تو ان کو کوئی چھوٹا سا بھی کام کہیں ان کی مجال ہے جو یہ سن لیں کہتے ہیں تم اپنی جگہ ہم اپنی جگہ، اب ہم آزاد ہیں۔ ان کے حسن خلق سے کبھی کوئی آزاد نہیں ہوا اور یہ حسن خلق کی وجہ سے تھا اس لئے کبھی بھی کسی افسر کے ساتھ کبھی رابطہ ہوا ہے تو جب بھی اس سے کوئی کام پیش آیا اس نے بڑی محبت سے ان کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔

اس لئے اس تعلق میں میں ان سے سیاسی راہنماؤں سے تعلقات میں بھی کام لیتا رہا، یورپین معاملات میں بھی ان سے کام لیتا رہا اور پاکستان، ہندوستان کے پرانے تعلقات میں بھی ان سے کام لیتا رہا اور خدا کے فضل سے ہمیشہ انہوں نے کامیابی کے ساتھ وہ کام سرانجام دیئے لیکن انکساری کا یہ عالم تھا کہ جانے سے پہلے ضرور پوچھا کرتے تھے کہ میری یہ رائے ہے کہ اس طرح میں بات کروں گا۔ آپ اگر اس میں تبدیلی چاہتے ہیں تو مجھے بتادیں۔ چنانچہ اب آخری جو ان سے خصوصی کام لیا گیا ہے وہ انٹرنیشنل فورم میں جو امریکہ میں منعقد ہوا جس میں مسلمانوں اور یہود کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کیا تجاویز ہوسکتی ہیں، اس عنوان کے تابع انہوں نے جن کو دعوت دی ان میں آفتاب خان صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ یعنی ان کی جو آواز، ان کا جو رسوخ ہے، ان کا کردار ہے وہ سیاست دانوں کی وساطت سے ان کو پہنچا ہے۔ بہت سے امریکہ یا کینیڈا یا یورپ کے لوگ ہیں چونکہ اس تعلق میں آپ کے بہت قریب رہے ان میں سے کسی نے ان کا نام بھیجا ہے کہ اس کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ چنانچہ مجھ سے ذکر کیا کہ مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مفید ہے جماعت کے لئے تو میں چلا جاتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ ضرور جائیں اور آپ کو تو اس

مضمون پر کافی عبور ہے۔انہوں نے کہا ہاں میں گلف کرائسز بھی پڑھ چکا ہوں سنا بھی ہوا ہے اور بھی آپ کو جانتا ہوں، آپ کے خیالات کو ان موضوعات پر، تو میں تیاری کرلوں گا فکر نہیں۔ جانے سے پہلے نماز کے وقت میرے دفتر تک چھوڑنے گئے تو کہا کہ مجھے ابھی تسلی نہیں ہورہی۔ میرا دل چاہتا ہے آپ مجھے دوبارہ خود بتائیں کہ کیا کرنا چاہئے۔اس پر جو میں نے ان کو بات بتائی تو چمک اٹھے۔انہوں نے کہا یہ میرے دماغ میں نہیں تھی پہلے۔اس سے تو سارا مضمون کا رخ ہی بدل گیا ہے۔اب میں اسی طرح پیش کروں گا اور واپس آ کر اتنا خوش تھے، کہتے تھے ساری مجلس میں اسرائیل کے نمائندے بھی تھے، مقامی یہودی بھی، مسلمانوں کے ممالک کے نمائندے ہر قسم کے مگر سب سے زیادہ میری تقریر کو سراہا گیا اور لوگ بعد میں دوڑ دوڑ کر آ کے مجھ سے ملتے رہے اور گرم جوشی سے دو دو ہاتھوں سے مصافحے کئے اور اسرائیل کے نمائندے نے معذرت کی کھڑے ہو کر کہ مجھ سے جو اپنی تقریر میں گستاخانہ باتیں ہوگئی ہیں رسول اللہ ﷺ کے متعلق یا دوسرے میں معذرت کرتا ہوں میری غلطی تھی اور اس مقرر نے آفتاب خان نے مجھے درست کیا ہے اور بعد میں پھر بھری مجلس میں وہ معافی مانگنے کے لئے پھر آیا۔تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی فراست تھی۔ جو بات سمجھتے تھے اسے پیش کرنے کا سلیقہ جانتے تھے، بہترین انگریزی بولتے تھے اس پر عبور تھا مگر ساتھ انکسار تھا اور واپس آ کر خوشی سے جس طرح انسان ایک چیز میں ابلتے ہوئے بلبلے پیدا ہوتے ہیں اس طرح آپ ہنستے جاتے تھے اور خوش تھے، کہتے خدا نے دیکھو کیسا عمدہ موقع دیا۔اگر میں نہ جاتا اور جس رنگ میں آپ نے اسرائیل کی بات چھیڑنے کا کہا تھا نہ چھیڑتا تو اس گستاخ کو کسی نے درست نہیں کرنا تھا اور وہ ایک ایسی بدتمیزی کی بات کر گیا تھا کہ اس کے نتیجے میں سب پر یہ تأثر پڑتا تھا کہ نعوذ باللہ من ذالک، رسول اللہ ﷺ یہود کے معاملے میں ظالم تھے لیکن جس رنگ میں میں نے بات کی اور کھڑے ہو کر احتجاج کا حق استعمال کیا اور کھول کر ان کو بتایا کہ بالکل جھوٹ ہے۔ کہتے صرف ایک بات میں حیران ہوں کہ ہمیں تو تجربہ تھا مولویوں کا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسرائیلی یہودی، اسرائیل کا نمائندہ اتنا جلدی اپنا مؤقف بدل لے گا۔ یہ بھی یہ کہتے ہیں میرے لئے نیا تجربہ تھا۔میرے دلائل کو سنا اور سر تسلیم خم کیا، اٹھ کر سب کے سامنے معذرت کی، اپنی غلطی پر معافی مانگی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف گستاخی کر کے دلآزاری کا کام کیا ہے اور ناجائز کام کیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے جو میں

نے کہی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ پھر ایسے لوگوں کی، مخلصین کی مدد بھی فرماتا ہے اور جس جذبہ سے آپ نے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا تھا مجھے یقین ہے آسمان سے وہ طاقت اتری ہے جس نے اس کے دل پر رعب ڈالا ہے اور ساری مجلس اس بات پر متفق تھی کہ یہی وہ تقریر ہے جو سب سے اعلیٰ، سب سے عمدہ تھی تو کامیابی کی اس لوٹ پر، اس آخری مہر پر آپ کا وصال ہوا ہے۔

جملہ فرائض کو جب بھی، جو بھی سپرد کئے گئے بڑی کامیابی سے سرانجام دیا اور ان فرائض کی سرانجام دہی کے بعد ہمیشہ جب لوٹتے تھے تو بلاشبہ یہ کہا کرتے تھے کہ اس میں میری قابلیت کا کوئی دخل نہیں۔ میں نے نشان پورے ہوتے دیکھے ہیں اللہ کی مدد اترتی دیکھی ہے اور چونکہ دین کا کام تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کو قبول فرمالیا۔ یہی ان کا طریق بیان تھا جو امریکہ سے واپس آکر تھا اور جیسا کہ واقعات ثابت کرتے ہیں، واقعتہً خدا کی طرف سے نصرت اترے بغیر اتنی بڑی تبدیلی نہیں ہوسکتی کہ اسرائیل کا نمائندہ یہودی، مسلمانوں کے مقابل پر رسول اللہ ﷺ کے متعلق بات کہہ کر معافیاں مانگے، ساری مجلس میں معافی مانگے اور پھر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں واقعۃً مطمئن ہوگیا ہوں کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں مجلس کے اختتام کے وقت فوراً اٹھا ہے اور تیزی کے ساتھ آفتاب خان صاحب کی طرف لپکا، مصافحہ کیا اور کہا میں پھر معافی مانگتا ہوں، مجھے معاف کردیں۔ تو یہ رعب جو نصرت کا ہے یہ خدا تعالیٰ اپنے پاک بندوں کو ہی عطا کرتا ہے، ان کے اخلاص کی قدر کے ساتھ عطا کرتا ہے۔

پس بہت نیک انجام کو پہنچے ہیں اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے اور کام تو اس نے بنانے ہی بنانے ہیں مگر خدا کرے ان کی اولاد میں پھر ایسے اور بہت سے اٹھیں اور ہمیشہ اٹھتے رہیں جو ان کی یادوں کو اپنے نیک اعمال سے زندہ کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی نیکیوں کو اپنانے اور زندہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ حقیقۃً اِنَّا لِلّٰہِ ہمارا بھائی اس دنیا سے چل دیا اور اس دنیا میں چلا گیا جو دائمی ہے جہاں خدا تعالیٰ کی جبروت اور جلال اور مالکیت جلوہ گر ہوگی۔ اللہ اس وقت آپ کو اپنی رحمت کے سائے تلے رکھے۔

نماز جنازہ کے تعلق میں کچھ اور بھی نام ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں ان کو بھی نماز جنازہ میں یاد رکھیں۔ مبارک محمود صاحب پانی پتی لاہور جماعت کے مخلص، فعال کارکن جن کے ساتھ بچپن ہی سے مجھے خدام الاحمدیہ کے سلسلہ میں کام کرنے کا موقع ملا اور ہمیشہ بہت ہی اخلاص

کے ساتھ یہ مفوّضہ فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔لاہور کے دوستوں کا ایک گروہ تھا جس میں یہ بھی تھے صدیق شاکر صاحب بھی تھے اور نیلا گنبد فیملی کے یحییٰ صاحب وغیرہ قیوم صاحب یہ سب ہمارا ایک گروہ تھا جو خدمات دین کے معاملات میں ہم مل کر مشورے کرنے کے بعد لاہور کے دائرے میں کام کرتے تھے۔ میں تو لاہوری نہیں تھا مگر ربوہ سے آکر جس گروہ میں مل کر مجھے کام کا مزہ آتا تھا وہ بہت ہی سعادت کے ساتھ یہ خدمت کیا کرتے تھے ان میں مبارک محمود پانی پتی کا نام بھی انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا کیونکہ بڑا سلیقہ تھا خدمت کا۔

اور پھر چوہدری محمد لطیف صاحب ہیں سیکرٹری وقف جدید آف گھٹیالیاں ان کو میں نے اس لئے چنا ہے کہ ان کے متعلق رپورٹیں مرکز سے یہ ہیں کہ بے انتہا مخلص داعی الی اللہ تھے اور جب بھی ان کے سپرد کوئی کام ہوا ہے انہوں نے بہت آگے بڑھ کر کام کیا اور یہ وفات ان کی، یہ ایک شہادت کا رنگ اس لئے رکھتی ہے کہ آپ کسی دوسری جگہ گھٹیالیاں دینی کام میں یا ڈش پر خطبہ سننے جارہے تھے یا اس قسم کا کوئی سلسلہ یا دعوت الی اللہ کا کام تھا یا ایسے لوگ جن کے پاس ڈش نہ ہوں وہ ساتھ کے گاؤں میں جایا کرتے ہیں تو مقصد دین کا ہی تھا جس سفر میں بس کے حادثے میں آپ شہید ہوگئے۔تو ان کے متعلق مرکز سے خاص طور پر یہ خط ملا تھا کہ ان کی ساری زندگی خاموش لیکن بہترین خدمت میں صرف ہوئی ہے اس لئے اگر ممکن ہو تو ان کو بھی نماز جنازہ میں شامل کر لینا چاہئے۔ یہ جو آخری ہے نا ''اگر ممکن ہو'' یہ میں نے اپنی طرف سے بتایا ہے یعنی زبان یہ بول رہی تھی لیکن چونکہ میں نے منع کیا ہوا ہے کہ نام نہ لیں اس لئے کہا نہیں مجھے۔سارا خط یہ بتا رہا تھا کہ سمجھ جائیں ہماری بات اور اس بھائی کو بھی شامل کرلو تو، چنانچہ میں نے اسی وقت لبیک کہا۔

عالم بی بی صاحبہ اہلیہ چوہدری فضل دین صاحب آف گھسیٹ پورہ یہ فضل الٰہی صاحب عارف مربی سلسلہ کی والدہ ہیں۔سادہ مزاج، نیک طبع اور دعا گو جو مثالی بزرگ عورتیں ہمارے معاشرے میں ہوا کرتی تھیں، ابھی بھی ہیں، ان میں سے ایک تھیں۔ان کو بھی شامل کرلیا گیا ہے اور ایک آخری تازہ اطلاع جو ملی ہے وہ سیدہ منیرہ ظہور جو بہت ہی اعلیٰ پائے کی شاعرہ بھی تھیں، الفضل سے آپ کو ان کے ساتھ تعارف ہوا ہوگا، اکثر ان کے شعر الفضل میں چھپا کرتے تھے، مجھے پہلے لکھ کے بھیجا کرتی تھیں۔بعض دفعہ کوئی تھوڑی سی ترمیم میں تجویز کر دیتا تھا تو خوشی سے قبول کرتی

تھیں۔ان کا اخلاص کا تعلق بھی بہت گہرا تھا ان کو بھی میں نے اس فہرست میں شامل کرلیا ہے۔اس لئے چار غائبانہ جنازے اس ایک حاضر جنازے کے ساتھ ہوں گے۔

خطبہ ثانیہ کے بعد حضور انور نے فرمایا:

ایک بات جو میں نے کہنی تھی وہ ایسے لوگوں کے لئے دعا کی تحریک ہے جو نادانستہ طور پر یا دانستہ طور پر آفتاب خان صاحب کا دل دکھاتے رہے اور ان کا مزاج ایسا تھا کہ خاموشی سے مجھے بتائے بغیر کہ کس نے کیا گستاخی کی ہے بڑے تحمل کے ساتھ بات سن کے وہ گنوا دیتے تھے۔ مجھے اطلاع ملتی تھی مجھے بہت تکلیف پہنچتی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ جو الزامات لگا کر آپ کے خلاف گستاخی کی ہے تم نے انصاف کا سلوک نہیں کیا، تم نے فلاں نہیں کیا ان سب میں یہ بالکل بے قصور ہوتے تھے۔مگر چونکہ طبیعت میں تحمل اور حوصلہ بڑا تھا اس لئے جرات کے ساتھ کئی لوگ آ کے جسے بے باکی کہنا چاہئے نہایت بدتمیزی کے کلمے بھی لکھ دیتے تھے کہہ بھی دیتے تھے وہ چپ کر کے دبا کے بیٹھ جاتے تھے۔جب مجھے یہ علم ہوا میں نے ان کی طرف سے بے چین ہوکر، بے قرار ہوکر ان کو سمجھانے کی بعض دفعہ کوشش کرتا رہا۔بعض سمجھے،بعض نہیں سمجھے۔مگر اللہ بہتر جانتا ہے اور کتنے واقعات ہوئے ہوں گے جس کی انہوں نے مجھے کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔تو ان کے لئے بھی دعا کریں جو گستاخیوں کے مرتکب ہوگئے۔اب وہ معافی بھی نہیں مانگ سکتے کیونکہ ہم میں یہ نہیں رہے۔تو حیّـنـا میں ان کو بھی شامل کرلیں اللہ ان کو بھی ہدایت دے، جو ان سے زیادتیاں ہوئیں اللہ معاف فرمائے اور ان کی زیادتیاں آفتاب خان صاحب کی نیکیوں کے پلڑے میں ڈال دے۔خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔آمین

خدا کی طرف بلانے والے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں عالمی صفات ہوں۔ وہ ہر قسم کے تعصّبات سے پاک ہو۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 11 را کتوبر 1996ء بمقام اوسلو، ناروے)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیت کریمہ کی تلاوت کی:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ (حٰمٓ السجدہ: 34)

پھر فرمایا:

اگر چہ آج کل دنیا میں دعوت الی اللہ پر زور دینے کی شدید ضرورت ہے اور آسمان سے جو ہوائیں چل رہی ہیں وہ دعوت الی اللہ کی مدد اور معاون ہیں اور انہی ہواؤں کی برکت ہے کہ جماعت احمدیہ کی کوششوں کو پھل لگ رہے ہیں ورنہ پھل دار ہوائیں اگر خدا نہ چلائے تو وہ کھیتیاں بھی جو بیجوں تک پہنچ جاتی ہیں وہ بیجوں سے خالی مرجایا کرتی ہیں۔ ایسی ہوائیں بھی ہم نے پنجاب میں چلتی دیکھی ہیں کہ کھیتیاں پھل لانے پر تیار ہوں تو ایسی جنوبی ہوا چلتی ہے جو ان کے پھلوں کو وہیں سکھا دیتی ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہی ہے جو جب چلتی ہے تو محنتیں پھل لاتی ہیں بلکہ محنتوں سے بہت زیادہ پھل نکلتے ہیں اتنے کہ ان کو محنتوں سے کوئی نسبت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ عالمی دور ہے دعوت الی اللہ کا اور اس کے پھل دار ہونے کا جس دور کی طرف میں سب جماعت کو بار بار بلا رہا ہوں اور متوجہ کر رہا ہوں۔

ناروے میں بھی مجھے اس مضمون پر آپ سے کچھ کہنا ہے لیکن اس سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ناروے کا یہ خطبہ تمام دنیا میں ٹیلی ویژن کے ذریعے دیکھا اور سنا جارہا ہے اور اس کے لئے اگر چہ جماعت کا فیصلہ تھا کہ جو بھی خرچ ہو جماعت برداشت کرے گی مگر ناروے کے تین مخلصین نے پیش کش کی کہ ان کی خواہش ہے کہ یہ تینوں خطبات ان کے مشترکہ خرچ پر ہی تمام دنیا کو بھجوائے جائیں یعنی عالمی طور پر نشر کئے جائیں اس لئے میں نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزاء عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ میں یہاں کے ٹیلی ویژن کے سربراہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، میں یہ نہیں جانتا کہ پورے ٹیلی ویژن کے سربراہ ہیں یا اس شعبہ کے سربراہ ہیں جس کے ذریعے سے ہمیں یہ سہولت مہیا ہوئی ہے مگر وہ بہت ہی مخلص اور نیک طبیعت انسان ہیں۔ ان سے ہمارا پہلے ایک دفعہ رابطہ ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے تعاون کی ضرورت پیش آئی جو انہوں نے بڑی خوشی سے مہیا کی۔ اب دوبارہ جو ہم نے ٹیلی ویژن کے یہاں سے پروگرام اٹھانے کا ان سے ذکر کیا اور تعاون چاہا تو باوجود اس کے کہ بہت ہی مشکلات حائل تھیں اور کئی چیزیں ایسے وقت پر مہیا نہیں تھیں جن کے ذریعے یہ انتظام ہو سکتا مگر انہوں نے اپنے فرائض منصبی سے ہٹ کر ذاتی اخلاص سے کوشش کی اور آج اللہ کے فضل کے ساتھ یہ ممکن ہوا ہے کہ ہم اس خطبہ کو تمام عالم کے لئے ٹیلی وائز کر رہے ہیں تو ایسے نیک طبع لوگ دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ان کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اللہ انہیں اور بھی نیکی اور اپنے قرب کی راہیں عطا فرمائے۔

اب میں اس مضمون کی طرف پھر واپس آتا ہوں۔ ناروے کا جو مسئلہ ہے وہ بعض اور شمالی یورپین کی طرح زیادہ سنگین ہے۔ اگر چہ یورپ میں بلکہ سب دنیا ہی میں دہریت کی ہوائیں چل رہی ہیں اور خدا عملاً انسانی زندگی سے الگ ہو چکا ہے مگر بعض ممالک میں یہ دہریت کا زہر باقی ممالک کے مقابل پر زیادہ گہرا جا چکا ہے اور اس نے تمام فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ ان ممالک میں شمالی یورپ میں سوئٹزرلینڈ بہت آگے ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے تمام تعلیمی ادارے عملاً دہریت کی آماجگاہ بن چکے ہیں اسی طرح شمالی یورپ میں سب سے زیادہ اس Peninsula کو دہریت میں آگے بڑھنے کی توفیق تو نہیں کہنا چاہئے، آگے بڑھنے کی جسارت ہوئی ہے یعنی سیکنڈے نیوین Peninsula ڈنمارک سے لے کر ناروے کے شمال تک باقی شمالی ممالک کے مقابل پر دہریت

میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں اور ان کے بھی تعلیمی ادارے ہیں زیادہ تر جو دہریت کی آماجگاہ ہیں۔اس وجہ سے ان کو خدا تعالیٰ کے دین کی طرف بلانا ایک مشکل کام ہے اگر اس کا سلیقہ نہ ہو اگر انسان صورت حال کا تجزیہ کر کے مناسب رستے اختیار نہ کرے اس وقت تک جب تک ایسا نہ ہو ان لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا ممکن نہیں ہے۔ بہت طرح سے، بہت طریقوں سے ان جگہوں پر کوششیں کی گئیں اور ان سارے ممالک میں وہی ایک ہی ردّعمل ہے یعنی سوئٹزرلینڈ ہو یا ڈنمارک یا سویڈن یا ناروے۔ جو قسمت سے پھل ملتا ہے وہ اللہ کے فضل سے اچھا ہوتا ہے لیکن بہت شاذ کے طور پر ملتا ہے اور جماعتی لحاظ سے ان چاروں ممالک میں کوئی مقامی ایسے مخلصین پیدا نہیں ہو سکے جو اپنی جماعت بنا سکیں اور جن کو کہا جا سکے کہ یہ اس ملک کے باشندے ہیں اور ملک کے باشندوں کے لحاظ سے ان کی ایک بڑی جماعت ہے۔ کہیں کچھ آتے بھی ہیں تو چلے بھی جاتے ہیں اور آکر قرار پکڑنے والے جو ہیں اگر چہ ان کا معیار اللہ کے فضل سے بہت اونچا ہے اور وہ سچے خدا کے مخلص بندے ہیں لیکن شاذ کے طور پر ہیں، بہت ہی کم تعداد ہے۔

اس پہلو سے فکر کی بات ہے لیکن مایوسی کی بات نہیں۔فکر کی اس پہلو سے کہ ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ کون سے طریق ہیں جن سے ان قوموں کو دین کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔اس آیت کریمہ سے متعلق، جس کی میں نے تلاوت کی ہے، میں پہلے بھی اس مضمون پر روشنی ڈال چکا ہوں کہ قرآن کریم نے کسی حکمت کے پیش نظر دعوت اسلام کا ذکر نہیں فرمایا، کسی مذہب کا نام نہیں لیا بلکہ دعوت الی اللہ کا ذکر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ کو بھی داعی الی اللہ کے طور پر پیش فرمایا گیا ہے۔اس میں بہت گہری حکمت ہے اور بہت بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اس حکمت کو نظر انداز کر کے کوئی تبلیغی منصوبہ بنائیں۔ وہ قومیں جو مذہب سے دور جا چکی ہیں ان میں بہت حد تک ان مذاہب کے بگڑے ہوئے عقائد کا تعلق ہے جو ان کی عقل سے متصادم ہو چکے ہیں۔ پس ان کا دہریہ ہونا ویسا قصور نہیں جیسا کہ سرسری نظر سے دکھائی دیتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک مذہبی پس منظر بگڑ چکا ہو، اگر اس میں سے معقولیت کلیۃً خارج ہو چکی ہو، اگر انسانی سوچ اور فکر سے مذہبی عقائد متصادم ہو جائیں تو ایسی جگہوں میں مذہب کا پایا جانا ان کی خوبی نہیں ہے بلکہ ان کی دماغی حالت کے خلاف ایک الزام ہے کہ یہ بڑے بے وقوف اور کم نظر

لوگ ہیں جو ایسے الجھے ہوئے بیوقوفوں والے عقائد پر اس قدر شدّت کے ساتھ عمل پیرا ہیں ۔ پس یہ صورت حال ہے جس کا ہمیں تجزیہ کرنا ہے ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یورپ میں ہر جگہ جہاں بھی دہریت پھیلی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ عیسائیت کے بگڑے ہوئے عقائد ہیں اور یہ سلسلہ آج اور کل کی بات نہیں صدیوں سے شروع ہے اور مسلسل عیسائیت کے بگڑے ہوئے عقائد کے خلاف یورپ کے دانشوروں نے احتجاج کئے اور جب ان احتجاجات کے نتیجہ میں اولین طور پر ان کو سزائیں دی گئیں اور ان سزا پانے والوں میں بہت بڑے بڑے ان کے چوٹی کے سائنسدان بھی ہیں جن میں نیوٹن بھی ہے ایک ۔

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ نیوٹن نے مذہب کے خلاف نہیں بلکہ عیسائیت کے خلاف بغاوت کی تھی اور عیسائیت کے خلاف نہیں بلکہ عیسائیت کے بگڑے ہوئے عقائد کے خلاف بغاوت کی تھی ۔ نیوٹن کو کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر شپ عطا ہوئی اور اس کے ساتھ بڑے بڑے فوائد بھی وابستہ تھے لیکن نیوٹن چونکہ بے حد ذہین انسان تھا خدا تعالیٰ نے اسے چوٹی کا دماغ دیا تھا اور تقویٰ عطا کیا تھا یعنی جس بات کو سچ نہیں سمجھتا تھا اس پر ایمان نہیں لاتا تھا یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں جو اس نئے ، جدید سائنسی دور کا جد امجد ہے وہ نیوٹن ہے ۔ آئن سٹائن نے بھی کام کئے اور بھی بڑے بڑے دانشور یہاں پیدا ہوئے ہیں مگر نیوٹن کے مقام سے اس کو ٹلا نہیں سکتے ۔ تو بلا شبہ اس نئے سائنسی دور کا جد امجد ہے جس نے بہت ہی حیرت انگیز انکشافات کئے اور قدرت کو جیسی صفائی کے ساتھ ، جیسے روشن دماغ سے وہ سمجھا ، کم اس کی نظیر دنیا میں ملتی ہے ۔ پس نیوٹن نے جو ایک عیسائی تھا اور Trinity یعنی تثلیث کے عقیدے پر پیدا ہوا تھا اس نے جب غور شروع کیا تو ، اب اس کی وہ نوٹ بک بھی شائع ہو چکی ہے جس نوٹ بک پر اس نے حاشیے پر تحریریں لکھی ہیں ، غور کرتے کرتے وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ بات اب کسی طرح قبول نہیں ہے کہ خدا تین ہوں کیونکہ ساری کائنات کا مشاہدہ ایک خدا کی گواہی دے رہا ہے اور جو دلائل ہیں عیسائیت کے وہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان دلائل کا مسیح کی عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اب دیکھیں ایک دانشور ایسا ہونا چاہئے ۔ لمبے عرصے تک تحقیق کی ، صرف سائنس کی گواہی پر عیسائیت کو ردّ نہیں کیا بلکہ پھر جستجو کرتا ہوا مسیح تک جا پہنچا ہے اور بائبل کی اولین آیات پر جن پر درحقیقت عیسائیت کی بنیاد ہے اور پھر پرانی بائبل یعنی تورات پر اور اس کے بعد دوسری کتب پر سب پر گہرے مطالعے کے بعد اس نے غور کیا ہے ۔ پس عہد نامہ جدید ہو یا قدیم

دونوں کا مطالعہ کر کے ان کے حوالے نکالے اور قطعی طور پر ثابت کیا کہ یہ عیسائیت نہ عہد نامہ قدیم سے تعلق رکھتی ہے، نہ عہد نامہ جدید سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بگڑے ہوئے عیسائی پادریوں کے دماغ کی پیداوار ہے اور اس پر میں ایمان نہیں لاسکتا۔ ایک ہی خدا ہے جو موسیٰ کا بھی خدا تھا اور عیسیٰ کا بھی خدا تھا اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہے، ساری کائنات کا وہی خدا ہے۔ جب اس عقیدے کا اس نے اعلان کیا تو باوجود اس کے کہ وہ علمی لحاظ سے بہت ہی چوٹی کا انسان بلکہ ایسا انسان جس کی ساری دنیا میں قدر کی جاتی تھی اس کو پروفیسر شپ پیش کر کے یونیورسٹی نے اپنا فخر سمجھا تھا کہ ہماری یونیورسٹی میں یہ پروفیسر بن کر آجائے لیکن اس کو بے عزت کر کے یونیورسٹی سے نکالا گیا۔ اس کے خلاف باقاعدہ چرچ کی طرف سے ریزولیشن پیش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لا مذہب ہو چکا ہے حالانکہ وہ تثلیث سے خدا کی طرف لوٹا تھا اور اس نے قطعاً پرواہ نہیں کی۔ وہ Stipend جو اس کے لئے یونیورسٹی کی طرف سے مقرر تھا ساٹھ پاؤنڈ سالانہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی چیز تھی یعنی آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ساٹھ پاؤنڈ کی اس وقت کیا قیمت تھی اس نے سب قربان کر دیا مگر اپنا عقیدہ تبدیل نہیں کیا۔ اس نے کہا ایک ہی خدا ہے اس کے سوا میں کسی اور عقیدے کا قائل ہو نہیں سکتا کیونکہ میرا دماغ اس کو تسلیم نہیں کرتا۔

تو یورپ کے دانشوروں نے سچائی کی قیمتیں ادا کی ہیں اور جو چوٹی کے خدا پرست تھے ان کو عیسائیت نے دہریہ کر کے باہر نکالا ہے۔ اس کی اور بھی مثالیں ہیں یہاں بڑے بڑے دانشور جو فلسفہ دان اور حساب دان جنہوں نے خدا کی توحید کی خاطر علم بلند کیا اور عیسائیت کے غلط عقیدوں کو ردّ کیا ان کو ان کے منصفین نے جو ان کی بائیوگرافی لکھنے والے ہیں، انہوں نے بھی دہریہ قرار دیا، انہوں نے کہا مذہب سے متنفر اور دور ہو چکے تھے۔ بہر حال یہ ایک بڑا دردناک باب ہے یورپ کی تاریخ کا جس کا مطالعہ ہمارے لئے کئی پیغام لے کر آتا ہے۔ اول یہ کہ یورپ کو دہریہ کہہ کر یا دہریت یا دہریت کی طرف مائل ہو کر کلیۃً ردّ کر دینا اور یہ سمجھنا کہ یہ لوگ خدا کے دشمن ہیں یہ درست نہیں ہے۔ وہ لوگ جو دہریہ کہلائے ہیں ان میں بڑے بڑے خدا پرست تھے انہوں نے اپنے توحید کے عقیدے کی قیمت ادا کی ہے۔

اور آج بھی اکثر جو دہریہ ہو چکے ہیں یہ سوچ کر کہ وہ دہریہ ہیں وہ مذہب کو مانیں گے نہیں

اس لئے ان سے ناامید ہو جانا، ان سے تبلیغ کا رابطہ قائم نہ کرنا یہ بھی بہت بڑی بے وقوفی ہوگی ۔مگر اسلام کی طرف اگر آپ ان کو بلاتے ہیں تو یہ بھی قرآنی حکمت کے خلاف ہے کیونکہ وہ لوگ جن کو خدا پر یقین نہ ہو وہ کسی مذہب کی طرف، آئیں گے کیوں؟ پہلی بنیاد تو خدا ہے یعنی خدا پر ایمان کا عقیدہ۔تو آپ لوگ بے شمار بحثیں ان سے کرتے رہیں کہ عیسائیت ایسی ہے، اسلام ایسا ہے۔اسلام میں یہ فضیلت ہے، عیسائیت میں یہ نقائص ہیں۔وہ لوگ جو اپنی دانشوری اور عقل کی وجہ سے خدا ہی سے پیچھے ہٹ چکے ہیں کیونکہ خدا کا غلط تصور ان کو پیش کیا گیا وہ آپ کے اسلام کی کیا قدر کریں گے۔شرافت کے ساتھ، نرمی کے ساتھ باتیں سنیں گے اور ہاں میں ہاں بھی ملا دیں گے اگلا قدم نہیں اٹھائیں گے۔اس لئے جہاں بیماری ہے اس جڑ کو پکڑنا ضروری ہے۔

پس دعوت الی اللہ کا مطلب یہ ہے ان کو اس خدا کی طرف واپس لاؤ جو ان سے کھو چکا ہے۔اللہ تعالیٰ پر ایمان کی طرف واپس لے کے آؤ۔اگر یہاں لے آؤ گے تو پھر رسالت کا ذکر شروع ہوگا اس سے پہلے نہیں ہوسکتا۔یہی سبق خدا تعالیٰ نے ہمیں کلمہ میں دیا **لآ الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** اور **لآ الٰہ الا اللّٰہ** پر اتنا زور دیا گیا کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”من قال لآ الٰہ الا اللّٰہ ،دخل الجنۃ“

(صحیح ابن حبان، کتاب الایمان ، باب فرض الایمان ،رقم الحدیث:171)

وہاں اپنی رسالت کا بھی ذکر نہیں فرمایا کیونکہ **لآ الٰہ الا اللّٰہ** میں دراصل تمام قسم کی رسالتوں کا تصور موجود ہے۔اگر اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس معبود سے رابطہ ہوگا کیسے؟۔وہ رابطہ ہے جس کا نام رسالت ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ کے بعد **لآ الٰــہ الا الـلّٰـہ** کے بعد اگلا سبق یہ سکھایا **لآ الٰـہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** یا **اشھدانّ محمداً عبدہ ورسولہ**۔

تو رسالت کی طرف آپ پہلے بلانا شروع کریں۔**لآ الٰـہ الا اللّٰہ** کی طرف توجہ نہ ہو اور خالی ایسی تختی پر جو چکنی ہو چکی ہو اس پر لکھنے کی کوشش کریں ، کچھ بھی لکھا نہیں جائے گا۔وہ چکناہٹ دہریت کی چکناہٹ ہے۔اس کو پہلے دھوئیں اور صاف کریں پھر آپ دیکھیں کہ کس طرح یہ اسلام کی طرف مائل ہوں گے اور دانشور اگر خدا کا قائل ہوگا تو اس کے لئے اسلام کے سوا چارہ ہی کوئی نہیں کیونکہ وہ لوگ جو عیسائیت میں متشدد ہیں اکثر بے وقوفی کی وجہ سے ہیں انہوں نے اپنے دماغ بند

کر لئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں عقیدہ جو بھی ہو بس سچا ہے ہم نے ماننا ہی یہی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو انتہا پرست مسلمانوں میں بھی مل رہے ہیں، ہندوؤں میں بھی ملتے ہیں، دنیا کے ہر مذہب میں موجود ہیں اور ان کی انتہا پسندی ان کی بے وقوفی کا مظہر ہے جنہوں نے عقل سے کچھ سوچا ہی نہیں جنہوں نے کہا بس جو کچھ کہا گیا درست ہے، جو کچھ لکھا گیا صحیح لکھا گیا اور لکھنے والے کون تھے وہ ازمنہ وسطیٰ کے وہ مذہبی راہنما یا سکالرز جنہوں نے جو سمجھا وہ لکھ لیا اور یہ سمجھے کہ یہ خدا کا نوشتہ ہے۔ پس ان کے لکھے ہوئے پر ایمان لانا فی الحقیقت خدا کے لکھے پر ایمان لانا نہیں بلکہ بگڑے ہوئے دور کے علماء کے لکھے پر ایمان لانا ہے اور سوائے بے وقوف کے کوئی ان علماء کی تحریروں پر ایمان لا ہی نہیں سکتا کیونکہ ازمنہ وسطیٰ کے جو علماء تھے ان میں بڑے بڑے چوٹی کے بزرگ اور علماء بھی تھے مگر جن کو انہوں نے پیروی کے لئے چنا ہے ان لوگوں کو چنا ہے جن کا دنیا کے متعلق کوئی علم نہیں تھا اور باوجود علم نہ ہونے کے انہوں نے دنیا کے غلط نقشے کھینچے اور قرآن کریم کی غلط تفسیریں کیں اور قرآن کریم کی طرف وہ تحکم منسوب کیا جو قرآن میں موجود نہیں تھا یعنی جبر کے ساتھ دنیا میں اسلام کا پھیلاؤ، اسلام تمہیں حق دیتا ہے کہ جو کوئی بھی اسلام کے خلاف بات کرے یا کسی بزرگ کے خلاف بات کرے اس کی گردن اڑا دو۔ یہ باتیں نوشتہ خدا تو نہیں تھیں، نہ تمام علماء نے لکھیں مگر جنہوں نے لکھیں ان کی انہوں نے پیروی کی اور ان کی نیک باتوں کو چھوڑ بیٹھے۔

پس اس پہلو سے بے وقوفی ہے کہ اوّل تو قرآن اور رسول کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے انہوں نے اسلام ازمنہ وسطیٰ کے علماء سے سیکھا اور پھر ان کی ہر اچھی بات کو ردّ کرتے ہوئے، بے اعتنائی کرتے ہوئے، اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ صرف ان باتوں کو چنا جن میں انسان کو انسان کے خلاف نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے، جن میں مذہب کے نام پر تشدد کی تعلیم دی جاتی ہے، جن میں مسلمان کو تحکم کا حق دیا جا رہا ہے اور یہی حال عیسائیوں کا بھی ہے، یہی حال ہندوؤں کا بھی ہے کوئی مذہب بھی اس صورت حال سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تو ایسے لوگ جو ان لوگوں کو ردّ کر بیٹھے ہوں ان کو اگر آپ مذہب کی طرف بلائیں گے تو جس مذہب کی طرف بلائیں گے اس مذہب کی ایک بھیانک تاریخ ان کی آنکھوں کے سامنے ابھر آئے گی۔ اسلام کی طرف بلائیں گے تو وہ سمجھیں گے خمینی کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ اسلام کی طرف بلائیں گے تو قذافی کی طرف سمجھیں گے بلایا جا رہا ہے، سعودی

عرب کے شہزادوں کی طرف بلایا جارہا ہے۔ ہر دفعہ جب بھی آپ اسلام کا نام لیں گے ان ممالک میں کسی ایک کا تصور ابھرنا لازم ہے۔ جیسے کہ جوان کی درمیانی زمانے کی تاریخ ہے سپین وغیرہ کے دور کی اس میں جب عیسائیت کا نام لیتے ہیں تو سپین کے ظالم بادشاہوں کا تصور انسان کی نظر کے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسی تصور کو انسان عیسائیت کا نمائندہ سمجھتا ہے۔ پس اس طرز عمل میں بہت سے خدشات ہیں اوّل تو یہ کہ جن کو مذہب سے اس بناء پر دوری ہوئی ہو کہ مذہب ان کی عقل میں نہیں آتا ان کو مذہب کی طرف بلائیں، کسی نام سے بھی بلائیں، وہ دور بھاگیں گے لیکن خصوصیت سے اس زمانے میں اگر آپ اسلام کا نام لیں گے تو وہ بھڑک اٹھیں گے۔ بعض دفعہ تشدد کا اظہار کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ بعض لوگ شرافت سے باتیں سن لیں گے اور کوئی دلچسپی نہیں دکھائیں گے۔ پس یہاں آپ عیسائیت اور اسلام، اسلام اور دوسری تحریکات کے یا مذاہب کے موازنے کے ذریعے ان لوگوں کے دلوں میں جا نہیں پاسکتے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ ایک ہی رستہ ہے۔ اللہ کی طرف بلائیں اور اللہ کی طرف بلانے کی مختلف راہیں ہیں۔ ہر شخص کے لئے وہ راہ کھلی ہے اور ہر شخص خدا کی طرف آنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ اب منصوبے بننے چاہئیں۔ اسی محور کے گرد بننے چاہئیں۔ اللہ کی طرف بلانے کے طریق کیا کیا ہیں اور کس طرح یہ خدا کی طرف مائل ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ایک عالمی تصور رکھتا ہے یعنی اسلام نے اسے ایک عالمی خدا بلکہ ساری کائنات کے ایک ہی خدا کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ اس لئے خدا کی طرف بلانے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں عالمی صفات ہوں وہ ہر قسم کے تعصّبات سے پاک ہو۔ وہ یورپ اور غیر یورپ میں تفریق نہ جانتا ہو یعنی ان معنوں میں کہ اس کا عمل کسی قسم کے مشرقی تعصب کے زیر اثر نہ ہو۔ مذہبی طور پر بھی وہ محض نام کی طرف نہ بلانے والا ہو بلکہ **ایسے خدا کی طرف بلانے والا ہو جو ساری کائنات کا خدا ہے، سب انسانوں کا رب ہے اور اس کے لئے اس پر لازم ہے کہ اپنے اندر خدا کے وہ رنگ پیدا کرے ورنہ زبانی طور پر خدا کی طرف بلانے سے کوئی خدا کی طرف نہیں آئے گا۔** یہ وہم ہے محض۔ ہاں آپ کے اندر اگر خدائی رنگ دیکھے گا، خدائی صفات دیکھے گا جو ایسی صفات ہیں جن میں بے انتہا جذب ہے متنفر بھی اپنی نفرت کی دیواریں توڑتا ہوا اس حسن کی طرف بڑھے گا اگر واقعۃً صفات الٰہی کی طرف سے اس کو دعوت ملے

اور صفات الٰہی کا انسان میں جلوہ گر ہونا ہی ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے یعنی اسی آیت میں ذکر ہے وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا۔

اب عمل صالح بھی محض اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ عمل صالح، قرآن کریم کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں، ہر مذہب کی طرف منسوب فرمایا گیا ہے۔ ہر شخص جو ایمان لاتا ہے اور عمل صالح کرتا ہے خواہ وہ یہودی ہو خواہ عیسائی ہو اللہ تعالیٰ نے اس کو پیار کی نظر سے دیکھا ہے اگر اپنے ایمان میں سچا ہو اور اس میں دوغلا پن نہ پایا جاتا ہو، اگر یوم آخرت کا قائل ہو اور اس کے مطابق اپنے اعمال کی نگرانی کرتا ہو۔ یہ وہ شرائط ہیں جن کے ساتھ خدا تعالیٰ نے عمل صالح کو تمام بنی نوع انسان کی طرف منسوب فرمایا ہے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ تو دعوت الی اللہ دراصل دو دعوتیں ہیں یہ بات ہے جو دعوت الی اللہ کرنے والے بعض دفعہ بھول جاتے ہیں۔ ایک دعوت ہے لوگوں کو خدا کی طرف بلانا اور ایک دعوت ہے اپنے آپ کو خدا کی طرف بلانا۔ اپنے آپ کو جو خدا کی طرف بلانا ہے یہ اصل مشکل کام ہے اور جب تک یہ مشکل حل نہ ہوگی، بات ہو نہیں سکتی کیونکہ منحصر ہے اس پر کہ آپ پہلے اپنے نفس کو خدا کی طرف بلائیں اور ہر دعوت جو اپنے نفس کو دیں اس پر لبیک کہیں۔

پس عَمِلَ صَالِحًا اور دعوت الی اللہ دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف مخاطب بدل گئے ہیں۔ دعوت الی اللہ کرنے والا داعی الی اللہ ہے جب لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہے اور داعی الی اللہ ہی ہے جب وہ اپنے وجود کو، اپنے نفس کو خدا کی طرف بلاتا ہے اور اس کے نتیجے میں عمل صالح کا دور شروع ہو جاتا ہے، اعمال صالحہ کو اپنانے کا دور جس کو ہم صبغۃ اللہ بھی کہہ سکتے ہیں یعنی اللہ کے رنگ کو اپنانا اور اس سے بہتر اور کون سے رنگ ہو سکتے ہیں۔ وَمَنْ اَحْسَنُ کا جو ترجمہ ہے اس کا مطلب ہے اس سے زیادہ حسین کون ہوسکتا ہے۔ حسن میں ایک کشش ہے، حسن میں ایک جاذبیت ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کر کے دیکھو جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں، اللہ کی طرف بلاؤ لیکن اپنے نفس کو بھی بلاؤ اور جب اپنے نفس کو بلا چکو گے تب تم کہہ سکو گے کہ میں مسلمان ہوں۔ مسلمان کا مطلب یہاں صرف مسلم بمعنی مسلمان جو عام طور پر معروف معنے ہیں وہ نہیں بلکہ وہ وسیع معنے ہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر ملتا ہے، جس کی رو سے حضرت ابراہیمؑ بھی مسلمان تھے، اس سے پہلے دیگر انبیاءؑ بھی سب مسلمان تھے، ان معنوں میں مسلمان تھے کہ جب خدا نے کہا اَسْلِمْ (البقرہ: 131) اسلام لے آؤ یعنی گویا اپنے آپ کو میرے سپرد کر دو تو انہوں

نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا۔

پس ہر وہ انسان جو دعوت الی اللہ کا شغف رکھتا ہے، اس میں مگن ہو جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے نفس کو بھی دعوت دیتا ہے کہ خدا کی طرف لوٹو ورنہ کوئی بھی تمہاری آواز پر، تمہارے کہنے پر خدا کی طرف منہ نہیں کرے گا یہ ایک سوال اٹھتا ہے کہ پھر کیسے اس میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب تو اس آیت کا عنوان بن چکا ہے وَمَنْ اَحْسَنُ اس سے زیادہ بھی حسین قول کسی کا ہوسکتا ہے جو لوگوں کو بھی خدا کی طرف بلائے اور اپنے آپ کو بھی خدا کی طرف بلا رہا ہو اور اس کے اعمال خوب صورت ہوتے ہوتے ایسے حسن میں ڈھل جائیں کہ اس کے قول کی تائید کرنے لگیں اور ہر دعوت سننے والا یقین کر لے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہے جو مجھے خدا کی طرف بلا رہا ہے۔ یہ آپ کر کے دیکھیں دہریت کی طاقت نہیں ہے کہ اس عظیم قوت کا مقابلہ کر سکے کیونکہ حسن میں، جو حسن خدا تعالیٰ نے اس آیت میں پیش فرمایا ہے اس میں اس قوت جاذبہ سے زیادہ طاقت ہے جس کو ہم کشش ثقل کہتے ہیں جس کا راز نیوٹن نے سمجھا اور جس کی وجہ سے آج تک سائنسی دنیا اس کی عظمت کے گیت گاتی ہے۔

کشش ثقل سے بالا وہ طاقت ہے جو زمین سے رفعت عطا کرتی ہے اور آسمان کی طرف بلند کر دیتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سچے قول اور کلمہ حق کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ عمل صالح اس کو رفعت عطا کرتا ہے، اس کو بلندی دیتا ہے۔ پس وہ طاقت جو کشش ثقل پر غالب آ جائے وہ اس آیت میں مذکور ہے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا اس کا قول سب دوسری جاذب نظر طاقتوں سے بڑھ جائے گا۔ وہ شخص ہر دوسری کھینچنے والی طاقت پر غالب آ جائے گا ورنہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس کا مطلب ہے سب سے زیادہ حسین اور جو سب سے زیادہ حسین ہے وہ لازماً اپنی طرف کھینچے گا۔ جتنے مرضی لوگ بیٹھے ہوں بعض دفعہ عالمی طور پر حسیناؤں کے اجتماع ہو جاتے ہیں اور بڑی بڑی اس کے متعلق کارروائیاں ہوتی ہیں اخباروں میں ان کی تصویریں چھپ جاتی ہیں مگر انسانی فطرت ہے کہ لوگوں کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنے نفس کے لحاظ سے جس کو حسین سمجھا جاتا ہے اسی کی طرف دوڑتا ہے۔ نہ اس میں رنگ کی شرط ہے، نہ اس میں نقوش کے موٹے یا پتلے ہونے کی کوئی شرط ہے۔ افریقہ میں حسن کا ایک الگ معیار ہے، یورپ کے مختلف ممالک میں ایک الگ معیار ہے۔ مغربی ممالک میں اور مشرقی ممالک میں اور۔

لیکن حسن پھر حسن ہی ہے کوئی نہ کوئی اس میں موزونیت ضرور پائی جاتی ہے یعنی اس تصویر، اس حسن میں جو مختلف شکلیں ہونے کے باوجود انسانوں کو کھینچتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ مغربی قوموں کے رنگ سفید ہیں اس لئے حسین ہیں افریقہ کے رنگ سیاہ ہیں اس لئے وہ بدصورت ہیں بڑی جہالت ہوگی کیونکہ سیاہ رنگ میں بھی ایک حسن ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے اگر موزونیت ہو۔ اگر توازن ہو تو سیاہ رنگ میں بھی ایسی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جن آنکھوں کو شناسائی ہو اس حسن سے، جس کا ذوق اس حسن کی شناسائی کے مطابق ڈھل چکا ہو وہ بے اختیار اس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ پس احسن کا مطلب ہے ہر قسم کے حسن سے بڑھ کر جتنی بھی جاذب نظر چیزیں ہیں جو بھی دوسرے کو کھینچنے کا ادعا کرتی ہے یا کھینچنے کی طاقت رکھتی ہے ان سب سے بڑھ کر اس میں داعی الی اللہ میں حسن ہے جو خدا کی طرف بلاتا ہے غیروں کو بھی اور اپنے نفس کو بھی اور بلاتے بلاتے خدا کی آواز کے سامنے ایسا کامل طور پر جھک جاتا ہے کہ اپنے سارے وجود کو اس کے سپرد کر دیتا ہے۔

مسلمین کا یہ مطلب ہے اس کا وجود اپنا نہیں رہتا خدا کا وجود بن جاتا ہے اور جب خدا کا وجود بن جائے اور خدا اس میں جلوہ گر ہو تو کوئی سفلی طاقت اس وجود سے کسی کو ہٹا نہیں سکتی اسے اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی تمام انبیاءؑ کی متحدہ، مشترکہ گواہی اس کے حق میں ہے۔ آغاز سے لے کر آخر تک جہاں بھی جب بھی نبی آئے ان کے اندر خدا تعالیٰ نے ایسی طاقت پیدا کر دی کہ دشمنوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا اور جو ایک دفعہ کھینچے گئے پھر ان سے توڑے نہیں گئے۔ بڑے بڑے مظالم ہوئے عیسائیت گواہ ہے کہ عیسائیت سے تڑوانے کی خاطر بعض مسیح کے ماننے والوں کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ جانوروں کے سامنے، بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا گیا لیکن وہ اپنے ایمان پر قائم رہے انہوں نے مسیح کا دامن نہیں چھوڑا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس دامن کے ساتھ خدا کا دامن وابستہ ہے اگر مسیح کا دامن چھوڑیں گے تو خدا کا دامن چھوڑ دیں گے۔ وہ کون سا حسن تھا جس کو مسیح نے ایسا طاقتور بنا دیا۔ یہی مسلمین والا حسن تھا کہ وہ خدا کے ہوئے، خدا کی خاطر لوگوں کو بلایا خدا کی صفات کو اپنی ذات میں جاری کر دیا اور پھر خدا نما بن کر اٹھے اور جب ایک خدا نما کی محبت دل میں پیدا ہو جائے تو کوئی دنیا کی طاقت نہیں ہے جو اس کے خلاف کھینچ سکے۔

میں نے کشش ثقل کی مثال دی تھی اب یہ کوئی فرضی مثال نہیں کہ عملاً اس صورت حال پر

چسپاں ہوتی ہے۔ دنیا کی طرف بلانا، دنیا کے آرام کی طرف بلانا، دنیا کی عزتوں کی طرف بلانا، دنیا کی وجاہتوں کی طرف، مال و دولت اور حکومتوں کی طرف بلانا یہ سب کشش ثقل کا مظہر ہے۔ وہ کشش جو بلندی سے نیچے کی طرف کھینچ رہی ہے اور بڑی طاقت ور کشش ہے۔ ہر چیز بلندی پہ ہے اگر وہ محفوظ طور پر اٹکائی نہ گئی ہو کہیں ذرا بھی بہانہ ملے کشش ثقل کو تو وہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ کسی چیز کو بلندی پر رکھنا ایک حکمت کو بھی چاہتا ہے اور ایسے مضبوط سہاروں کو چاہتا ہے جن میں کشش ثقل پہنچی ہوئی ہے لیکن آپ کو دکھائی نہیں دے رہی یعنی پہاڑوں کی چوٹی پر وہ پتھر جو اٹکا ہوا ہے اور ایسے پتھر بھی ہیں جو لاکھوں سال سے، کروڑوں سال سے شاید اٹکے ہوئے ہوں۔ کئی ایسے بھی ہیں جو اربوں سال سے اٹکے ہوں گے لیکن وہ ہل نہیں سکتے اور آپ سمجھیں گے کہ کشش ثقل کمزور ہے اور دیکھو اس پتھر کو تو کھینچ کر نیچے نہیں لا سکی۔ کشش ثقل اس پتھر تک پہنچی ہوئی ہے وہ اس لئے مضبوطی سے قائم ہیں کہ کشش ثقل نے اسے تھاما ہوا ہے۔ اس لئے کشش ثقل کا بلندی اور ڈھلائی سے جو تعلق ہے یا اتران سے، یہ تعلق آپ کو دکھائی نہیں دے رہا مگر عملاً ڈھلوان ہو یا نشیب ہو، نشیب اور ڈھلوان ہم اس چیز کو کہتے ہیں جہاں کشش ثقل آ کر ایک مقام پر ایک چیز کو روک لیتی ہے، اس بلند مقام پر کشش ثقل پہنچ جاتی ہے، اس کو کھینچ رہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ پہاڑ جو ہیں یہ کبھی چند سیکنڈ کے لئے بھی وہاں اٹک نہیں سکتے تھے اگر کشش ثقل سے ان کو طاقت عطا نہ کی ہوتی۔ تو یہ چٹان یہ پہاڑ سارے کے سارے یہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ بھی زمین کے ساتھ ہموار ہو جاتے اور کوئی ان کی حرکت کو روک نہ سکتا۔ پس کشش ثقل کے مضمون کو سمجھیں۔ یہ بلندی تک اثر انداز ہوتی ہے مگر اگر مقناطیس کی طاقت کو ایسے استعمال کیا جائے کہ کوئی دوسرا سہارا نہ ہو مقناطیس اس چیز کو اٹھا لے تو یوں محسوس ہوگا جیسے کشش ثقل ناکام ہو گئی لیکن یہ بھی درست نہیں ہے وہاں بھی کشش ثقل ہی کامیاب ہوتی ہے کیونکہ وہ اٹھانے والا وجود جو مقناطیس کو پکڑے ہوئے ہے یا جس کے ساتھ مقناطیس لگایا گیا ہے وہ خود کشش ثقل کے اوپر سہارا لئے ہوئے ہے۔

لیکن آسمان سے کوئی طاقت جیسا کہ سیاروں کی طاقت ہے سورج کی طاقت ہے دوسری بڑی طاقتیں ہیں وہ زمین کو اس کی کشش ثقل سمیت کھینچ رہی ہیں اور ساری کائنات کو کوئی ایک طاقت ہے جو کسی طرف کھینچ رہی ہے جس کے متعلق سائنسدان کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر کامیاب نہیں

ہوئے۔ پس وہ آسمانی طاقت ہے جو غالب آتی ہے کشش ثقل پر۔ تبھی قرآن کریم فرماتا ہے کہ یہ سب چیزیں جو تمہیں فضا میں کھڑی دکھائی دے رہی ہیں ان کو خدا تعالیٰ نے سہارا دیا ہوا ہے اور یہ کھڑی ہیں ورنہ زمین کی کشش اور ان چیزوں کی آپس کی ایک دوسرے کی کشش ان کو اکٹھا کر کے فنا کر دیتی۔ تو آسمانی طاقت ہر دوسری طاقت پر غالب ہے یعنی سائنسی لحاظ سے بھی کوئی ایک خدا تعالیٰ، ایک ایسا کارساز ہے، ایسا ایک کائنات کا خالق اور مالک ہے جس کی طاقت ہر لمحہ تمام کائنات کے ہر وجود کو جو معلق دکھائی دے رہا ہے سہارا دیئے ہوئے ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم دیکھ نہیں رہے اس کو۔

پس وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا میں جس طاقت کا ذکر ہے یہ اللہ کے ساتھ وابستہ ہونے کا حسن ہے اور یہ حسن جو ہے یہ ہر دوسری چیز پر غالب آتا ہے۔ پس دیکھئے عیسائیت کی مثال میں نے آپ کے سامنے رکھی کس طرح اس راہ میں وہ کاٹے گئے اور مارے گئے اور انہوں نے کچھ بھی پرواہ نہ کی لیکن سب سے بڑا مظہر اس دعوت الی اللہ کے حسن کا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صورت میں پیدا ہوا۔ دیکھیں کس شان کے ساتھ، کس قوت کے ساتھ اپنے دور میں ان لوگوں کو بھی کھینچا جو آپ سے نفرت کرنے والے تھے اور ایسا کھینچا کہ جو خون کے پیاسے تھے وہ خون فدا کرنے کے لئے ترسنے لگے کہ کاش محمد رسول اللہ ﷺ پر ہمارا خون بھی نچھاور ہوسکتا۔ یہ وہ آسمانی قوت ہے جو زمینی قوتوں پر غالب آنے والی ہے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی قوت حسن تھی دراصل جس نے عرب میں ایک حیرت انگیز معجزہ برپا کیا جو پھر عرب کی سرحدوں سے چھلک کر دوسری زمینوں میں جا پہنچا اور بڑی قوت کے ساتھ، بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا رہا ہے اور اس وقت تک یہ پھیلا ہے جب تک آنحضرت ﷺ کے حسن سے یہ لوگ حصہ پاتے رہے اور اس حسن کی کشش سے دنیا کو اپنی طرف کھینچتے رہے اور اپنا بناتے رہے۔

اب نیا دور آ گیا ہے جب بیچ میں، اس کشش اور آج کے زمانے کے درمیان ایک بڑا انقطاع پیدا ہو چکا تھا اسلام نے بڑھتے بڑھتے اپنے قدم روک لئے۔ اسلام نے نہیں روکے بلکہ درحقیقت مسلمانوں نے قدم روک لئے اور اسلام کے مظہر بنے ہوئے تھے اس لئے دنیا کو یہی دکھائی دیا کہ اسلام نے اپنے قدم روک لئے ہیں لیکن کیوں روکے؟ کیا واقعہ ہوا؟ اس لئے کہ وہ لوگ خود دنیا کی طرف مائل ہو گئے اور جس کشش ثقل کے خلاف ان کو جہاد کرنا تھا جس سے لوگوں کو نوچ کر بلندی

کی طرف لے جانا تھا خود اس کشش کے شکار ہو گئے تو کیسے اس حسن کا مظہر بنتے جنہوں نے زمین سے توڑ کر، سب رشتے اور تعلق کاٹ کر آسمانوں کی طرف رفعتیں عطا کرنی تھیں اس کے سوا اور کوئی اس کا منطق نہیں ہے کوئی وجہ نہیں کہ اسلام باوجود اس کے کہ قرآن وہی قرآن ہو، حدیث وہی حدیث ہو، اسلام کا عمل خواہ فقہاء میں اختلاف بھی ہو بنیادی طور پر ایک ہی ہو خدا کی عبادت کرنا ہے روزے رکھنے ہیں، نمازیں پڑھنی ہیں، زکوٰۃ دینی ہے، تو جو ضمنی اختلافات ہیں آپ ان کو بھلا بھی دیں اور یہ سوچیں کہ اسلام اپنی ماہیت کے لحاظ سے، اپنی قوت کے لحاظ سے، اپنی تعلیم کے لحاظ سے قرآن میں بھی محفوظ تھا، سنت میں بھی محفوظ تھا اور اس کے باوجود اسلام نے آگے بڑھنا بند کر دیا اس لئے کہ مسلمان جو علم بردار تھے وہ خود کشش ثقل کا شکار ہو گئے۔ وہ زمین کی طرف جھک گئے اور پھر ان میں یہ طاقت نہیں تھی کہ آسمان کی طرف بلائیں۔

اب یہ نیا دور شروع ہوا ہے۔ آپ اس تاریخ کے پرحکمت مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ تمام امور جو اسلام کی راہ میں حائل ہوئے ہیں، وہ تمام روکیں جنہوں نے اسلام کی ترقی کی راہیں بند کر دیں ان کو دور کرنا ہے لیکن ان روکوں کی تلاش میں باہر نہ نکلیں اپنے نفس میں ڈوبیں، دیکھیں یہ تو وہی روکیں ہیں جو آپ کے اندر موجود ہیں کیونکہ اسلام کی راہ میں کوئی باہر کی روک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ دیکھو کتنی بڑی بڑی طاقتیں تھیں جو اسلام سے ٹکرائیں اور اسلام کا رستہ روکنے کی دعویدار بن کے اٹھیں لیکن پارہ پارہ ہو گئیں۔ اس لئے اسلام کا راستہ روکنے کے لئے کوئی بیرونی طاقت کبھی کامیاب نہیں ہوئی ہاں اندرونی خامیاں ہیں جو اسلام کا رستہ روکتی ہیں۔

اب عالم اسلام کی طاقت دیکھو ایک ارب سے تجاوز کر چکی ہے لیکن اس ساری عالم اسلام کی ایک ارب کی جمعیت میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اسرائیل کے ایک چھوٹے سے علاقے کا مقابلہ کر سکیں۔ دندناتا ہوا مسلمانوں کو مقابلے پر بلاتا ہے اور ظلم اور تشدد میں بے باکانہ کارروائیاں کرتا ہے۔ طاقت نہیں ہے ایک ارب مسلمانوں میں کہ اس کا مقابلہ کر سکیں۔ پس انہوں نے دعوت الی اللہ کیا کرنی ہے یہ تو اپنے وزن ہی سے بیٹھ گئے ہیں۔ کشش ثقل جتنا بڑھتی ہے اتنا ہی بے کار کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسا وابستہ کر دیتی ہے سطح زمین سے اور اس کے نشیب سے کہ پھر اس میں اٹھنے کی طاقت نہیں رہتی۔ ایک شاعر کہتا ہے:

؎ بسانِ نقش پائے رہ رواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں (انشاءاللہ خان انشاء)

یہ تو اپنی عظمتوں کے نقش پا بن چکے ہیں اور اپنی تمنا کے غلام اس کے کوچے میں نقش بن کر بیٹھ گئے ہیں ان میں کہاں اٹھنے کی طاقت ہے۔ وہ قدم جن کے یہ نقوش پا تھے وہ تو ان کو چھوڑ کر عظیم رفعتوں کی طرف روانہ ہو چکے، وہ دور بدل گئے۔ مگر یہ نقوش پا بے طاقت، بے سہارا آج بھی ان راہوں میں ملتے ہیں جن کا نام آج مسلمان لیا جاتا ہے۔ مگر اسلام کی شان، اسلام کی شوکت، اسلام کی تمام صفات حسنہ جو غیر معمولی جذب کی طاقت رکھتی تھیں ان سے غائب ہو چکی ہیں۔ اگر نہ ہوتیں تو یہ دردناک منظر جو آج ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے یہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

آپ نے بدلنا ہے اس کو ورنہ آپ وہ جماعت نہیں ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں انقلاب کے لئے پیدا کیا ہے۔ آپ نے لازماً بدلنا ہے اور بدلنے کے لئے اپنے گھر سے باہر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اپنے نفس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ تبدیل کرنا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد:12) اللہ تعالیٰ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ نہ بدل دیں جو ان کے نفوس میں ہے۔ پس دیکھیں دعوت الی اللہ کی اس آیت نے آپ کو کتنا وسیع اور عظیم اور کامل پیغام دیا ہے۔ فرمایا خدا کی طرف بلاؤ اس سے زیادہ اچھی بات ہو نہیں سکتی۔ اس سے زیادہ حسین اور دلکش جاذب نظر بات ہو نہیں سکتی لیکن اپنے آپ کو بھی بلاؤ اس کے بغیر یہ بات مکمل نہیں ہوگی۔

عَمِلَ صَالِحًا نیک اعمال کی طرف رخ کرو تب تم داعی الی اللہ بننے کے اہل ہو گے اور اگر ایسا ہو جاؤ گے تو خدا تمہیں اجازت دیتا ہے کہ تم کہو کہ میں مسلمان ہوں اس کے بغیر تمہیں مسلمان کہلانے کا بھی حق نہیں ہے اور وہ شخص جسے خدا کہے کہ تم مسلمان ہو اور کہے کہ اعلان کرو جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے اعلان کروایا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام: 164)۔ میں تو ہر مسلمان سے بڑھ کر سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ تو مسلمین کا یہ مطلب ہے یعنی حضرت محمد مصطفی ﷺ جن صفات حسنہ کی وجہ سے مسلمان کہلائے آپ کو خدا تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اعلان کر دو کہ ہاں میں مسلمان ہوں وہ صفات حسنہ پیدا کئے بغیر آپ خدا کی طرف نہیں بلا سکتے کیونکہ وہ سوسائٹی ہے خاص طور پر

ناروے کی جو مذہب سے متنفر ہونے کے بعد خدا سے متنفر ہو بیٹھی ہے، خدا سے روٹھ چکی ہے۔ خدا کی طرف واپس بلانے کے لئے ان کی کشش ثقل سے بڑھ کر ایک روحانی جذب آپ کو اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا جس کو قرآن کریم کی یہ آیت مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا کہہ کے اس کی طرف متوجہ فرما رہی ہے۔ بڑا ہی حسین اور دلکش اور قوت جاذبہ رکھنے والا وجود آپ کا وجود بن جائے گا اگر آپ اس قرآنی نصیحت پر عمل کریں اور پھر تجربہ کر کے دیکھیں۔

ناروے میں کثرت سے ایسے نوجوان ہیں جو سعید فطرت ہیں۔ وہ چند جو شریر ہیں ان کو تو یہاں کا ٹیلی ویژن، یہاں کے اخبار اچھالتے ہیں اور کہتے ہیں ان میں Racism ہے ان میں غیر قوموں سے نفرت پائی جاتی ہے ان میں تشدد پایا جاتا ہے مگر وہ چند ہیں۔ ناروے کی قوم بحیثیت قوم نیک مزاج اور سعید فطرت ہے اور جب بھی ان کا واسطہ کسی ایسے انسان سے ہو جس میں وہ قدریں ہوں جن کو یہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو لازماً اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ہمارے بہت سے احمدی ہیں جن کے ساتھ پاکستان میں ظالمانہ سلوک ہوئے اور یہاں کی حکومت نے بھی اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان کے حق میں فیصلے نہیں دیئے۔ خود یہاں سے لوگ اٹھے ہیں جنہوں نے حیرت انگیز طور پر محنت کی اور ان کی تائید شروع کی۔ یہاں سے ایک خاتون گئیں پاکستان جا کر ان کے ساتھ رابطے کئے ان کے حالات دیکھے واپس آ کر یہاں رپورٹیں شائع کیں اور کہا کہ بڑا بھاری ظلم ہوا ہے ہماری قوم پر داغ لگ گیا ہے۔ جو ایسے ایسے شریف النفس لوگ ہوں ان کو دہریہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے بہت بڑی بے وقوفی ہے اور ظلم ہے۔ یہ دہریہ عقل کی وجہ سے ہیں۔ اگر یہ دہریہ نہ ہوتے تو بہت بڑے پاگل ہوتے کیونکہ جو عقائد خدا کے متعلق ان کو بتائے گئے تھے ان پر قائم رہنا ہی دنیا پر ایک ظلم ہے۔

پس لآ الٰہ والی تختی تو صاف ہو چکی اب الا اللّٰہ آپ نے بھرنا ہے اور جہاں الا اللّٰہ بھریں گے وہاں لازماً اس کا قطعی منطقیانہ نتیجہ نکل کر رہے گا کہ محمد رسول اللّٰہ اس سے پیدا ہوگا۔ پس لآ الٰہ کا کام یہ قومیں کر چکی ہیں الا اللّٰہ کے رنگ آپ نے بھرنے ہیں مگر اگر اپنے وجود میں اللہ کا رنگ نہ بھرا ہوا گر صفات باری تعالیٰ کی واقفیت ہی کوئی نہ ہوا گر انصاف، تقویٰ، سچی ہمدردی، سچائی اور بنی نوع انسان کی خدمت پر ہمہ وقت تیار رہنا جیسے خدا رحمٰن ہے قطع نظر رنگ، نسل، مذہب کے ہر ایک سے سچا پیار رکھنا اور اس کا عملی نمونہ دکھانا، شرافت سے بات کرنا، عقل سے بات کرنا یہ سب الٰہی رنگ کے

نمونے ہیں۔ پس الٰہی رنگ اختیار کریں اور آپ کا عمل صالح پیدا ہوگا۔ عمل صالح اور دعوت الی اللہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جب یہ دو طاقتیں اکٹھی ہو جائیں تو ناقابل تسخیر طاقت بن کر ابھرتی ہیں کسی دنیا کی طاقت کی مجال نہیں ہے کہ ان کا مقابلہ کر سکے۔

پس آپ ہی میں وہ وجود ہیں جو نا روے کی تقدیر بدل سکتے ہیں جو اس دہریہ ملک کو خدا کی محبت سے بھر سکتے ہیں۔ اگر اپنے آپ کو اس کا لائق بنائیں کہ وہ خدا کی طرف بلانے والے بن سکیں۔ پس یہی میرا پیغام آپ کو بھی ہے اور ان سب ملکوں کے احمدیوں کو جہاں دہریت نے کئی لحاظ سے انسان کی اعلیٰ قدروں کو بالکل کھا کر کھوکھلا اور ویرانہ بنا دیا ہے۔ جیسے تیزاب بعض دھاتوں کو کھا جاتا ہے اسی طرح دہریت تمام انسانی قدروں کو کھا جاتی ہے اور اگر اس کے باوجود شرافت دکھائی بھی دے تو ایک کھوکھلی شرافت ہوتی ہے۔ وہ اس لائق نہیں ہوتی کہ اپنی قوم کو اعلیٰ قدروں پر قائم رکھ سکے۔ پس میں امید رکھتا ہوں اور یقیناً رکھتا ہوں کہ تمام دنیا کے احمدی خصوصیت کے ساتھ دہریت کے خلاف ایک جہاد شروع کریں گے اور دہریت کے خلاف جہاد کا یہی ایک طریق ہے اس کے سوا اور کوئی طریق نہیں کہ اللہ کی طرف بلائیں تو اپنے نفس کو بھی بلائیں۔ اپنے اندر الٰہی صفات پیدا کریں اور پھر دیکھیں کہ کس طرح دنیا آپ کی طرف دوڑی چلی آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

دعا کے بغیر بدیوں سے بچنا ممکن نہیں۔
مسلسل دعا، توکّل و کوشش سے ہی نئی زندگی حاصل ہوگی۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 18 /اکتوبر 1996ء بمقام بیت النور اوسلو، ناروے)

حضور نے تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد فرمایا:

گزشتہ خطبہ جمعہ میں میں نے ناروے کی جماعت کو تبلیغ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ دعوت الی اللہ گھر سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے بیان فرمایا۔ جب تک تم اپنے نفس کو دعوت الی اللہ کی طرف نہیں بلاتے اور تمہارا نفس لبیک کہتا ہوا اللہ کی طرف آ نہیں جاتا اس وقت تک عمل صالح ہو نہیں سکتا اور اگر عمل صالح نہ ہو تو دعوت الی اللہ جو غیروں کو دی جاتی ہے وہ بے معنی اور بے کار ہو جاتی ہے اس کا حسن زائل ہو جاتا ہے۔ پس دعوت الی اللہ کی خوبصورتی کے لئے قرآن کریم نے کیسی عمدہ شرط باندھی ہے کہ دوسروں کو دعوت کرو مگر اپنے آپ کو بھی بلکہ اپنے آپ کو کرو گے تو تمہارا حق ہے کہ دوسروں کو دعوت دو ورنہ تمہارا دعوت دینا بے کار رہو گا۔ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں Physician, heal thyself دنیا کہہ سکتی ہے کہ اے علاج کرنے والے اپنا تو علاج کر۔

پس جتنی جتنی اصلاح ہوتی چلی جائے اسی حد تک اتنی اتنی انسان کو دعوت الی اللہ کی توفیق ملتی چلی جاتی ہے مگر اس کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ یہ وہ دوسرا نکتہ ہے جو میں آج آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ اس انتظار میں آپ نہیں بیٹھ سکتے کہ جب تک میں اپنے نفس کی پوری اصلاح نہ کرلوں اس

وقت تک قرآن مجھے دعوت الی اللہ کا حق نہیں دے رہا، یہ بالکل غلط استنباط ہے کیونکہ نفس کی اصلاح تو ایک لامتناہی سلسلہ ہے، نہ ختم ہونے والا۔اس کا ماڈل جو قرآن کریم نے ہمارے لئے مقرر فرمایا وہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ اور آپؐ کے عقب میں چلنے والے تمام انبیاءؑ، آپؐ کے عقب میں چلنے والے ان معنوں میں کہ صفات حسنہ میں قرب الٰہی کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے جو نمونے قائم فرمائے کوئی نبی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔پس زمانے کے لحاظ سے وہ پہلے تھے مگر چلنے کے لحاظ سے وہ پیچھے رہ گئے۔ان معنوں میں یہ کوئی فرضی بات نہیں ہو رہی ایک حقیقی تعریف ہے جو سو فیصد درست ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عقب میں تمام انبیاءؑ کا سفر ہے اور صراط مستقیم کا جو پہلا گروہ ہے وہ یہی ہے جو آگے آگے بڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیں دعا سکھاتا ہے۔اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝٦ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ:6,7) کی پیروی کرنی ہے جو اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ بلاشبہ آنحضرت ﷺ کی صفات حسنہ کا نیک سے نیک انسان بھی حقیقی تصور نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہو اور اس دور میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلام احمد کا لقب دے کر آپ کو اس کام پر مامور فرمایا اور آپؑ کو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت حسنہ میں اس طرح جھانکنے کی توفیق عطا فرمائی کہ پہلے کبھی کسی نے اس پیار اور محبت اور اس قرب کے ساتھ آپؐ کی سیرت کا سفر نہیں کیا تھا۔آپؐ کی سیرت کے مطالعہ میں کوئی غرق نہیں ہوا تھا جیسا کہ حضرت مسیح موعودؑ آپؐ کی سیرت کے مطالعہ میں اللہ کی توفیق سے غرق ہوئے ہیں یعنی ایسی دنیا میں چلے گئے جو ہمیشہ کے لئے آپؑ کی دنیا بن گئی۔

آپؑ کا کوئی مضمون، آپؑ کی کوئی تحریر، نثر ہو یا نظم ہو اس ذکر سے خالی نہیں ملتی کہ جو کچھ آپؑ نے پایا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے پایا۔پس اللہ کی تعریف کے بعد بار بار حضرت رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا قرب مجھے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ملا ہے۔یہ وہ ہے جو اندر کی راہ دکھاتا ہے۔یہ باہر دروازے تک نہیں پہنچاتا۔یہ وہ رسولؐ ہے جو ہاتھ پکڑ کر اندر لے جاتا ہے اور حسن کی بارگاہ کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔پس اس پہلو سے آنحضرت ﷺ کا بلند مرتبہ، عالی مقام اور وہ منزل جس منزل پر آپؐ ہم سے آگے جا پہنچے ہیں اس کا کوئی تصور عام انسان نہیں کر سکتا۔ہم بھی جوں جوں آپؐ کے حسن کا مطالعہ کرتے ہیں حضرت مسیح موعود

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آنکھ سے دیکھیں تو مزہ آتا ہے ورنہ باہر کی سطح پر ہی نظریں گھومتی رہتی ہیں۔

یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کو مرتبہ حاصل ہوا کہ جیسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے گھر کے اندر کی راہ دکھائی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریرات میں اس کا مطالعہ کریں نظموں میں اس کا مطالعہ کریں تو انسان اگر یہ سوچے کہ میں نے اس نبیؐ کی پیروی کرنی ہے تو لرز جائے گا۔ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ انسان ساری زندگی کبھی اس نبیؐ کی پیروی کرتے ہوئے حقیقت میں پیروی کا حق ادا کر سکے۔ یہ باتیں روحانی دنیا کی باتیں ہیں۔ بہت سے آدمی شاید اس کو نہ سمجھ سکیں مگر عام دنیا میں آپ روزمرّہ کا تجربہ رکھتے ہیں۔

ایک دنیا کا چیمپیئن کسی کھیل میں بھی ہو آپ جب اس کو جیتتا ہوا دیکھتے ہیں اور بڑے بڑے چیمپیئنز کے سامنے، بڑے بڑے دنیا کے ہیروؤں کے اور چیمپیئنز کے ساتھ اس کے مقابلے دیکھتے ہیں تو حقیقت میں آپ کو اندازہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کتنا بڑا انسان ہے اس نے اپنی کھیل میں کتنا بڑا مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جن ملکوں کو ہرا کر وہ اوپر آیا ہے ان ملکوں کے چیمپیئنز کے متعلق بھی آپ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ آپ سے کتنا آگے ہیں اور وہ جب اپنے ملک میں جیتتے ہیں تو اپنے ملک میں جن کو ہراتے ہیں ان کا بھی آپ صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ جو آپ کے ضلع اور آپ کی تحصیل، آپ کی کاؤنٹی میں جو چیمپیئن ہیں ان سے دو دو ہاتھ کر کے دیکھیں تب آپ کو پتا چلے گا کہ ان کے مقابل پر آپ کی کچھ بھی حیثیت نہیں، کچھ بھی مقابلہ ممکن نہیں ہے۔ عام روزمرّہ کے آدمی کی بات کر رہا ہوں وہ اپنے ضلع کا چیمپیئن چھوڑ کے اپنے سکول کے چیمپیئن سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اب دیکھیں درجہ بدرجہ ان لوگوں کا مقام کتنا بلند ہو چکا ہے جو عالمی مقابلوں میں اوّل مقام پر پہنچتے ہیں اور آپ گھر بیٹھے آرام سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی غلطیاں بھی دیکھتے ہیں اس کی کامیابیاں بھی، تبصرے بھی کرتے ہیں کہ یہ کرتا تو بہتر تھا، یہ ہوتا تو اچھا ہو جاتا لیکن کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے حقیقت میں کہ آپ کے اور ان کے درمیان فاصلے کتنے ہیں۔ روحانی دنیا میں تو یہ تصور اور بھی زیادہ مشکل ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کسی ایک دور کے چیمپئن نہیں ہیں کل عالم کے ہر دور کے چیمپئن ہیں ۔تو ایسا وجود جس کو خدا یہ قرار دے دے کہ تمام زمانوں میں، ہر ملک میں، ہر قوم میں جب سے دنیا بنی ہے جب تک دنیا قائم رہے گی اس وقت تک تو ہی ہے جو سب پر بالا رہے گا اور سب پر فائق رہے گا

اس کے پیچھے چلنے کا ادعا لے کر ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کی اور جو منزل ہے وہ آپ نے دیکھ لیا کہ کتنی دور کی ہے۔اس لئے یہ خیال کر لینا کہ اس منزل تک پہنچیں گے تو پھر تبلیغ شروع کریں گے حد سے زیادہ بے وقوفی ہوگی کیونکہ وہ منزل نہ آپ کے ہاتھ آنی ہے نہ کہیں تبلیغ ہوگی۔اپنے وجود کو ضائع کر دیں گے اور جو کچھ ہاتھ میں ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

اس لئے یہ مقصد، یہ مضمون کہ آپ اپنے نفس کو خدا کی طرف بلائیں اور اس کے نتیجہ میں عمل صالح پیدا ہو اور آپ کی آواز میں طاقت پیدا ہو ہرگز آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ جب تک آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ نے اپنی سب بدیاں دور کر دی ہیں اور سب نیکیاں حاصل کر لیں اس وقت تک آپ کو میدان عمل میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔اس کا مطلب ہے کہ تمام دنیا میں سوائے آنحضرت ﷺ کے کسی کو تبلیغ کا حق نہیں رہتا پھر کیونکہ اس مرتبہ کو جو آنحضور ﷺ نے حاصل فرمایا آپؐ کے صحابہؓ بھی نہیں پہنچ سکے تھے بڑے سے بڑے صحابہؓ بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے تو اس لئے یہ وہم دل سے نکال لیں لیکن وہ مضمون اپنی جگہ اہم ضرور ہے۔یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصلاح نفس کے بغیر آپ دنیا کی اصلاح کے لئے قدم اٹھا سکتے ہیں۔

پس ان دونوں کے درمیان توازن کا قیام ضروری ہے اور یہی بات ہے جو میں آپ کو سمجھا کر حوصلہ دینا چاہتا ہوں کہ جتنے قدم بھی آپ اپنے نفس کی اصلاح کی طرف اٹھائیں گے اور دعا کر کے توجہ سے اٹھائیں گے اس کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوگا۔یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ دعائیں کرتے ہوئے اپنی بدیوں کو کم کرنے کی کوشش کریں، اپنی نیکیوں کو بڑھانے کی کوشش کریں اور اللہ تعالیٰ آپ کا ساتھ نہ دے۔آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ خدا کی طرف جو ایک قدم بڑھاتا ہے اللہ اس کی طرف دس قدم بڑھاتا ہے۔پہلے فرمایا ایک بالشت بڑھاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی طرف کئی قدم بڑھاتا ہے اور چل کے جاتا ہے تو وہ دوڑ کے آتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری دعاؤں کے نتیجے میں جو ہمیں پھل ملتا ہے وہ ہماری کوششوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

پس اپنے نفس کا جائزہ لیں۔ہر انسان بے شمار کمزوریوں میں مبتلا ہے اور یہ ایک فیصلے کا دن ہونا چاہئے کہ آج کے بعد میری زندگی کا سفر کمزوریوں سے دوری کا اور نیکیوں کے قرب کا سفر ہوگا۔جس دن آپ یہ فیصلہ کر لیں اسی دن آپ کو دعوت الی اللہ کی توفیق ملے گی اور دعوت الی اللہ کا حق

بھی نصیب ہو جائے گا کیونکہ آپ اپنی کوششوں سے اگر چہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں کوئی منزل سر نہ کر سکیں لیکن جب دعا کریں گے اور قرب الٰہی کی طرف قدم بڑھائیں گے تو آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان لازماً صادق آئے گا اور اس کے نتیجے میں جو روزمرہ کی صحت کی حالت ہے یعنی روحانی صحت کا نصیب ہونا وہ غیر معمولی فرحت بخشنے والی بات ہے اور طاقت عطا کرتی ہے اس کے نتیجے میں انسان کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں اور خود اچھی چیزوں کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر انسان کو بیماریوں کا تجربہ ہے بیماری کی انتہائی حالت میں بھی انسان سمجھتا ہے کہ میں زندہ ہوں لیکن نہ بھوک، نہ پیاس، نہ کچھ کھانے کو دل چاہے، نہ کسی سے ملنے کو، نہ بات کرنے کو اور سمجھ رہا ہے آدمی کہ میں زندہ ہوں لیکن جب زندگی لوٹتی ہے اس کی طرف تو ہر لمحہ وہ اپنے آپ کو پہلے سے بہتر محسوس کرتا ہے اور اس کی بھوک واپس آنے لگتی ہے اس کی طلب واپس آنے لگتی ہے۔ وہ چیزیں جن میں مزہ باقی نہیں رہا تھا وہ مزہ دینے لگتی ہیں۔ وہ دوست جن سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی وہ نظر آئیں تو طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے۔ اپنے زیادہ اپنے لگنے لگتے ہیں۔ یہ زندگی کا سفر ہے جو بیماری کے وقت ہر انسان اس سے نجات کے وقت شروع کرتا ہے اور یہ سفر بتاتا ہے کہ ہر لمحہ جو قدم اٹھاتا ہے وہ ایک بشاشت کا قدم ہے اس میں ایک طلب پیدا ہو جاتی ہے اور یہی صورت حال ہے جو انسان کو روحانی سفر میں نصیب ہوتی ہے۔

جب بھی آپ بدیوں سے دور ہونے کا سفر کریں گے اور دعا کریں گے کیونکہ دعا کے بغیر یہ سفر ممکن نہیں ہے تو آپ کے اندر ایک نئی زندگی جاگ اٹھے گی۔ جو آپ سب سے زیادہ اس کے گواہ بنیں گے کہ ہاں میں زندہ ہو رہا ہوں۔ وہ زندگی ہے جو آپ کو دعوت الی اللہ کی توفیق عطا کرے گی اور جتنا بھی آپ دعوت الی اللہ اس زندگی کے حصول کے ساتھ کریں گے اتنا ہی اس دعوت الی اللہ یعنی اللہ کی طرف بلانے میں برکت نصیب ہوگی اور لوگ آپ کی طرف متوجہ ہونے لگیں گے۔ پس انتظار نہیں کرنا کہ جب تک بدیاں ہٹ نہ جائیں اس وقت تک دعوت نہیں کرنی، نہ اس بات پر تسلی رکھ کر اپنی عمر ضائع کرنی ہے کہ عمر بڑی پڑی ہے کسی وقت بھی ٹھیک ہو جائیں گے اب چلنے دو۔

جدوجہد کا آغاز فوری طور پر ضروری ہے اور دعا اور توکل کے بغیر یہ جدوجہد زندہ نہیں رہ سکتی۔ مسلسل دعا، مسلسل توکل اور پھر کوشش اور اخلاص کے ساتھ کوشش، یہ وہ چیز ہے جو آپ کو ایک نئی

زندگی بخشے گی، نئی طاقتیں عطا کرے گی اور اپنے گردوپیش کو آپ زندہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرلیں گے۔ اگر یہ نہیں کرتے تو پھر آپ کی دعوت الی اللہ بے کار ہے، بے ثمر رہے گی۔ لوگ جو نظریاتی لحاظ سے بات مان بھی جائیں گے لیکن جو تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت ہے وہ عمل صالح سے ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے جو اچھے قول کی مثال دی ہے وہاں عمل صالح کے متعلق فرمایا وہ اس کو رفعت بخشتا ہے۔

تو اچھا قول ان معنوں میں بھی وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ (حٰمٓ السجدہ:34) اس سے بہتر کون سا قول ہو سکتا ہے اس سے زیادہ خوبصورت کون سی بات ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے اللہ کی طرف بلا رہے ہوں لوگوں کو۔ ایسا بلانا ہے جس پر دنیا کا کوئی انسان اعتراض نہیں کر سکتا۔ جو نہیں بھی مانتے وہ بھی نہیں اعتراض کر سکتے۔ وہ کم سے کم گردن جھکا کے سنیں گے۔ کہیں گے ہم مانتے تو نہیں خدا کو لیکن آدمی اچھا ہے جو خدا کی طرف بلا رہا ہے۔ اس دعوت کی طرف بلائیں تو یہ قول حسن یعنی سب سے خوبصورت قول ہے مگر اس کو رفعت کیا چیز بخشتی ہے آپ کا نیک عمل۔ اگر نیک عمل ساتھ نہ ہو تو بعض دفعہ یہ قول الٹا پڑ جاتا ہے۔ بعض دفعہ لوگ کہتے ہیں حالت دیکھو ذرا بُلا کس طرف رہا ہے اور اپنا کیا حال ہے۔ گنجا سر کے گنجے پن کی دوائیں بیچتا پھرتا ہو تو کون ہے جو اس کی طرف توجہ دے گا سوائے اس کے کہ لوگ ہنسیں اور مذاق اڑا کر الگ ہو جائیں۔

اس لئے آپ کا بنیادی فرض ہے کہ یہ روز مرّہ کی حکمت کی عام باتیں ہیں ان کو تو سمجھیں ان میں کوئی اینچ پینچ نہیں، کوئی گہرا فلسفہ نہیں ہے، بڑی معرفت کی بات نہیں ہے، سادہ سی بات ہے کہ جس کی طرف آپ نے بلانا ہے اس کی طرف بڑھنے کی خود کوشش شروع کریں اور جب آپ کوشش شروع کریں گے تو اس کے نتیجہ میں ایک تو برکت وہ ہے جو سچائی کی برکت ہوتی ہے۔ ایک انسان جب یقین کرتا ہے کہ اللہ ہی ٹھیک ہے، اللہ ہی کی طرف جانا ہے تو اس کے اندر ایک سچائی کی طاقت پیدا ہوتی ہے اور اس کی کوششوں کے بعد وہ سچائی کی طاقت ہے جو اس کے قول کو نصیب ہوتی ہے۔ سچے آدمی کی بات دنیا سنتی بھی ہے اور دنیا پر وہ اثر انداز بھی ہوتی ہے اور یہاں سچائی کا ایک معنیٰ ہے جو آپ کے لئے سمجھنا ضروری ہے۔

کئی لوگ ہیں ویسے سچ بولتے ہیں لیکن ان کا عمل ان کو جھٹلا رہا ہے۔ سچے لوگ ہیں مگر خدا کی طرف بڑھنے کے لئے وہ مخلصانہ کوشش نہیں کرتے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں تو جب وہ خدا کی

طرف بلائیں گے تو قول سچا ہوگا اور عمل جھوٹا ہوگا اور ایسے قول کو بھی خدا جھوٹا قرار دیتا ہے اور وہ شخص سمجھ بھی نہیں سکتا کہ میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے میں تو اللہ کی طرف بلا رہا ہوں اور سچے دین کی طرف بلا رہا ہوں۔ یہ تو سچی باتیں ہیں لیکن اس کا عمل اس کو جھٹلا رہا ہوگا اور ایسے شخص کے قول کو خدا جھوٹا قرار دیتا ہے۔اس کی مثال میں نے آنحضرت ﷺ کی سچائی کی گواہی دینے والے منافقین کی صورت میں آپ کے سامنے بار بار رکھی ہے۔اس سے سچی گواہی کیا ہوسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے کوئی کہے کہ تو خدا کا رسولؐ ہے۔اس گواہی کو پیش کر کے چونکہ وہ منافق لوگ ہیں ان کی زندگی کا عمل اس کی تائید نہیں کرتا کہ وہ عملاً آنحضرت ﷺ کو سچا سمجھ رہے ہوں۔اللہ ان کی گواہی پیش فرما کر کہتا ہے خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔خدا گواہی دیتا ہے کہ تو سچا ہے لیکن تیرے سچ کی گواہی دینے والے جھوٹے ہیں۔

تو دیکھیں بظاہر ایک متضاد بات ہے لیکن کتنی گہری صداقت اس میں پائی جاتی ہے اور تضاد نہیں ہے۔اس میں ایک مفہوم ہے وہ سمجھنا چاہئے۔مفہوم یہ ہے کہ ایک انسان جب قول سے کچھ کہتا ہے تو اس سے بحث نہیں کہ وہ سچی بات کر رہا ہے یا جھوٹی بات کر رہا ہے اگر اس کے دل کا اندرونہ اس قول کی تائید میں نہیں ہے، اگر عمل اس کی موافقت نہیں کرتا تو جھوٹا ہے خواہ وہ قول بظاہر سچا ہی ہو۔تو یہ میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ جب آپ دعوت الی اللہ کریں گے اور آپ خود خدا کی طرف حرکت کرنا شروع کریں گے تو آپ کے اندر ایک سچائی کی گواہی اٹھ کھڑی ہوگی اس سے آپ کے قول میں برکت پڑے گی اور طاقت نصیب ہوگی اور بات بات میں فرق ہوتا ہے۔صرف چالاکی اور لفاظی کا فرق نہیں بلکہ سچائی کے وزن کا فرق ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کو دنیا سمجھے نہ سمجھے لیکن تسلیم کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔

ایک سچے آدمی کی بات میں جو وزن ہے اس کے ساتھ ایک جھوٹے چالاک آدمی کی بات کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑے بڑے آپ نے دیکھے ہوں گے بڑی لفاظیاں کرنے والے، مجلسیں لگانے والے اور سجانے والے ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں۔نہ ان کے اوپر نہ دوسروں پر۔جیسے جیسے لطیفے چھوڑ جائیں گے لوگ ان پر ہنسیں گے۔کوئی ایسا بے وقوف ہے وہ ایسا ہے وہ ایسا ہے اور ایسے ریڈیو پر بھی بڑے آتے ہیں بیان کرنے والے لیکن اپنا کردار دیکھو تو ان باتوں سے کوئی بھی متاثر نہیں ہوا۔نہ ان کی باتیں سن کر کسی میں نیکی پیدا ہوتی ہے۔پروگرام پنجابی کے بھی ہیں، اردو کے بھی

ہیں۔ایسے بڑے بڑے لفظ آتے ہیں اور پاکستان میں بڑے وہ ہر دلعزیز پروگرام ہیں لیکن ان پروگراموں کو دیکھ کر ایک بھی آدمی صالح کبھی نہیں بنا لیکن ایک آدمی جو خدا والا ہو وہ چھوٹی سی بات کرتا ہے اس کی بات میں وزن پیدا ہوتا ہے اس میں ایک تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ اس سلسلے میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ میری ایک کمزوری تھی، میں دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا بہت لمبے عرصے سے مگر نہیں ہو رہی تھی۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بغیر سامنے مخاطب کرتے ہوئے کہ تم یہ کمزوری چھوڑ و ایک بات کی ہے اور وہ ایسا گہرا اثر کر گئی کہ جیسے وہ کمزوری تھی ہی نہیں لیکن ایک دفعہ نہیں ایسا بار ہا ہوا ہے۔ بہت سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہؓ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آنے والا آیا اور حضرت مسیح موعودؑ نے اس کے متعلق اس کو سمجھانے کے لئے یا عام سب حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کوئی نصیحت شروع کر دی۔مثلاً ایک ان میں سے تھا جو شراب کا عادی تھا اور ایسا سخت عادی تھا کہ اس کے لئے شراب چھوڑنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کا غالباً بیان ہے، مگر وہ نہ بھی ہو تو کسی اور مقتدر صحابیؓ کا بیان ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ نے بھی اس کو سمجھایا اور کوشش کی مگر اس کے پلے بات نہیں پڑی۔باتیں ٹھیک تھیں مگر اثر نہیں پڑا۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے عموماً شراب کے متعلق بات شروع کر دی حالانکہ اس نے سوال کیا بھی نہیں تھا اور چند فقروں میں اس کے متعلق کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہیں اس کا دل پاک ہو گیا، ہمیشہ کے لئے شراب نوشی سے نفرت ہو گئی۔

تو یہ وہ قوّتِ قدسیہ ہے جس کا ذکر آنحضرت ﷺ کے حوالے سے قرآن میں ملتا ہے اور یہ قوّتِ قدسیہ آپؐ کے غلاموں میں پیدا ہوتی ہے۔جتنا کوئی آپؐ کے قریب ہوا تنی ہی زیادہ وہ قوّتِ قدسیہ حاصل کرتا ہے۔یہ جو مثال دی ہے اس کی تفاصیل چونکہ مجھے یاد نہیں مگر جو مرکزی نکتہ ہے وہ بالکل یہی ہے جو میں بیان کر رہا ہوں کہ بسا اوقات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہؓ کی کوششوں سے جو برائی کسی کی دور نہ ہو سکی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند فقروں نے اس برائی کو کاٹ پھینکا اور کثرت سے آپؑ کے صحابہؓ اس بات کے گواہ ہیں۔یہ قوّتِ قدسیہ کا مشاہدہ تھا جو انہوں نے کیا اور یہی وہ چیز تھی جس نے ان کے اندر حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

پس قوت قدسیہ کوئی فرضی چیز نہیں ہے۔قوّت قدسیہ سچائی کے ایک معیار کا نام ہے وہ سچائی جوانسان کے ظاہر و باطن پر پوری طرح قبضہ کر لے وہ ایک اتنی بڑی طاقت بنتی ہے کہ کوئی دنیا کی دوسری طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔آنحضرتﷺ اس مرتبہ اور مقام پر پہنچے تھے کہ جہاں ذات حق سے آپ نے اپنا وجود پوری طرح ملا دیا۔ایسا ملا دیا کہ خدا کی طاقت جوحق کی طاقت ہے وہ آپ کی ذات میں جلوہ گر ہوئی اور یہی وہ قوت قدسیہ ہے جس کا قرآن پہلے ذکر کرتا ہے اور ہر علم اور حکمت کی بات کا بعد میں ذکر کرتا ہے۔بار ہا میں نے سمجھایا ہے جماعت کو کہ اس نکتہ پر غور کرو کہ قرآن کریم میں اللہ فرماتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہﷺ پر وحی نازل فرمائی اور قرآن سکھایا، آیات سکھائیں تو آیات کی تلاوت کے بعد پہلی طاقت آپؐ کی یہ تھی يُزَكِّيهِمْ۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ (الجمعه:3)۔

وہ تلاوت قرآن کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ نے جو آپ پر آیات نازل فرمائیں وہ بیان کرتا ہے ساتھ ہی يُزَكِّيهِمْ ان کا تزکیہ شروع کر دیتا ہے۔حالانکہ سب دنیا یہ سمجھتی تھی بڑے بڑے انبیاءؑ بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے کہ جب تک علم نہ دیا جائے، جب تک علم کی حکمتیں نہ سمجھائی جائیں تزکیہ ہو نہیں سکتا۔مگر آنحضرتﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی سے بھی ایک بالا قدم ہے، اوپر کا مقام ہے۔ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں کہ اے خدا میری اولاد میں سے اور ذریت میں سے ایک ایسا نبیؐ برپا فرما جس کو تو کلام عطا کرے اور پھر وہ لوگوں کو علم سکھائے اور پھر وہ ان کو علم کی معرفتیں یعنی حکمتیں بتائے پھر ان کو پاک کرے۔

اب یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دیکھو، کتنی منطقی دعا ہے جو ایک عام انسان بلکہ ایک نبی کی سمجھ کے مطابق بھی اس طرح ہونی چاہئے اس کے سوا ممکن نہیں ہے۔اللہ پہلے اسے چنے، اس کو آیات عطا کرے پھر وہ اللہ سے علم پا کر لوگوں کو علم سکھائے، پھر وہ اس علم کی حکمتیں بیان کرے اور مولویوں کی طرح تشدد کے ساتھ یہ نہ کہے کہ علم ہے خدا کا مانو تو مانو نہیں تو جاؤ جہنم میں۔محنت کرے ان پر، ان کو ہر علم کی پس پردہ یا اس کے اندر چھپی ہوئی حکمتیں سمجھائے تا کہ دماغ بھی مطمئن ہوں اور دل بھی مطمئن ہو جائیں یہ جب کیفیت ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نتیجہ نکالا کہ اس کے بعد ایسے شخص میں تزکیہ کی طاقت پیدا ہو جائے گی۔محض علم دینے والا کسی کو پاک نہیں کرسکتا کیونکہ علم دماغ

کو قائل کرتا ہے حکمتیں دل کو قائل کرتی ہیں کیونکہ جب ایک علم کے متعلق پورا یقین ہو جائے کہ یہ سچا ہے اور سمجھ آ جائے کہ کیوں یہ سچا ہے تو طبعاً دل پوری طرح اس کا قائل ہو جاتا ہے اور دماغ اور دل کا یہ اتحاد ہے جو تزکیہ نفس کے لئے ضروری ہے۔ جب یقین ہو جائے اور دل مطمئن ہو جائے تو حضرت ابراہیمؑ نے پھر یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے بعد ایسا وجود ان کا تزکیہ بھی کرے گا اور یہی دعا مانگی۔

جہاں بھی قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا مذکور ہے اسی طرح مذکور ہے اے خدا ان میں سے ایک ایسا شخص پیدا کر، صرف ایک جگہ مذکور نہیں کئی جگہ ہے تین یا دو جگہ لازماً ہے، اے خدا تو ان میں سے ایسا شخص پیدا کر جس سے تو کلام کرے اس پر اپنی آیات نازل فرمائے وہ ان آیات کا علم پا کر اپنے گردو پیش، اپنے ماحول میں وہ علم سکھانے لگے اور علم سکھانے کے بعد اس کی حکمتیں بتائے جب حکمتیں بتائے تو پھر عرض کیا وَ يُزَكِّيْهِمْ اور حکمتیں بتا کر تو پھر تزکیہ ہونا ہی ہونا ہے۔ پس وہ حکمتیں بتائے اور ان کا تزکیہ یعنی ان کو پاک کرنے لگے، ان کو قدوسی بنادے۔ اب عقلی طور پر اس دعا پر ایک ذرّہ بھی اعتراض ممکن نہیں لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا مقام عقل کی ان حدوں سے بالا تھا یعنی عقل پر مبنی مگر اس سے اوپر کا قدم۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا یہ جواب دیا کہ ہاں تیری دعا منظور ہے مگر اس ترتیب کے ساتھ۔ میں ایک ایسا وجود قائم کر رہا ہوں جو خدا سے الہام پا کر علم حاصل کرتا ہے روحانی علم لیکن ساتھ ہی تزکیہ شروع کر دیتا ہے۔ تزکیہ کرتا ہے تو پھر سمجھاتا ہے۔ اب یہ اور ترتیب ظاہر ہوگئی۔ حیرت انگیز ہے۔ جس سے انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں کی گندگیاں دور نہ ہوئی ہوں، جن کے اندر ٹیڑھے پن ہوں ان کو آپ بات سمجھائیں بھی تو کہاں تک سمجھا سکتے ہیں اور ان کو حکمتیں بھی بتائیں تو تبدیلی تو ہوگی مگر مشکل ہے کیونکہ جو شخص ٹیڑھے مزاج، بے ہودہ سوچوں والا، دنیا میں اٹکا ہوا اس کو عمل کی بات بھی سمجھا دیں، عمل کی حکمتیں بھی بتا دیں تو پھر بھی مزاج ادھر نہیں آئے گا، طبیعت نہیں آتی بعض دفعہ ادھر، اس کا کیا علاج؟

اس لئے حقیقت میں کوئی بد انسان اگر زیادہ بد ہو تو علم اور حکمت کے ذریعے اصلاح پذیر ہو نہیں سکتا اس میں ضرور کچھ ٹیڑھا پن باقی رہ جائے گا لیکن ایک شخص جس کا دل پاک اور صاف ہو اور وہ سچا ہو چکا ہو اور اس کے رجحانات سچے ہو جائیں اس کو آپ علم سکھائیں اور علم کی حکمتیں بتائیں تو وہ

سونے پر سہاگہ ہو جائے گا، حیرت انگیز پاک تبدیلیاں ہوں گی کیونکہ وہ کپڑا ایسا ہے جو اچھے رنگ قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور گندے کپڑوں پر بعض دفعہ اچھے رنگ چڑھتے ہی نہیں جتنا مرضی زور لگا لیں۔ اس لئے پہلے جو رنگ ساز ہیں وہ کپڑوں کے رنگ کاٹتے ہیں اور جب کاٹ دیں پھر وہ ان رنگوں کو چڑھاتے ہیں جو وہ چڑھانا چاہتے ہیں اور اس سے پہلے وہ کپڑا ان کو قبول نہیں کرسکتا۔

تو انسان نے تو بہت سے شرک کے رنگ اپنے اوپر چڑھا رکھے ہیں بہت سی بدیوں کے رنگوں میں ایسا ملوث ہو چکا ہے کہ اس پر الٰہی رنگ چڑھ نہیں سکتے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو وہ بالا قوت عطا کی جو قوت قدسیہ میں ایک معراج ہے اس سے بڑھ کر ایک انسان کی پاکیزگی کا تصور نہیں ہوسکتا کہ سمجھائے بغیر اس کا قرب آپ کو پاک کر دے لوگ اس کے قریب آئیں اور دیکھیں کہ وہ بدل چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا ہے کہ حضور کے قرب میں آنے کے نتیجے میں لوگوں میں ایسی تبدیلی پیدا ہوئی ہے کہ وہ خود ساری زندگی سمجھ نہیں سکے کہ کیا واقعہ ہوا تھا اور قرآن کریم فرماتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے قرب کی ایک خاص علامت ہے۔ ایسا وجود جیسا محمد رسول اللہ ﷺ کا تھا وہ خدا کے اتنا قریب تھا کہ براہ راست خدا سے الٰہی رنگ پکڑ گیا تھا اور یہ تبدیلی کی طاقت خدا کے سوا ممکن نہیں ہے۔ یا اس شخص میں ہوسکتی ہے جو الٰہی رنگ پکڑ جائے اور اس کا قرب اپنی ذات میں ایسی مقناطیسی لہریں جاری کرے کہ از خود وہ انسان تبدیل ہونا شروع ہو جائے یہ ایک سائنسی حقیقت ہے۔

کئی دفعہ رابطے ظاہری طور پر نہ بھی ہوں تو باطنی رابطے قائم ہوتے ہیں اور ایک انسان وہی رنگ پکڑ لیتا ہے جو ساتھ کی چیزوں کا رنگ ہے۔ آپ میں سے اکثر طلبا جانتے ہیں ٹیونگ فور، ایک ٹیونگ فور کو آپ حرکت دیں یعنی بجائیں ساتھ ایک اور پڑا ہوا ہو ٹیونگ فور یعنی بجنے والا آلہ تو اس کو آپ ہاتھ بھی نہ لگائیں جو ساتھ والا ہے جب وہ جنبش میں آئے گا اور آواز پیدا کرے گا تو جس کو آپ نے ہاتھ بھی نہیں لگایا اس میں بھی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ ہمیں بچپن میں جب ہم سائنس کی کلاسیں شروع کر رہے تھے تو پہلے پہلے دکھایا تھا اور بڑا مزہ آتا تھا اس کو دیکھ کے، ایک ٹیونگ فور کہتے ہیں اس طرح ایک چیز ہوتی ہے جس کا ایک چمٹا جیسا لوہے U شکل کا وہ ایک جگہ پڑا ہوا ہے ساتھ ایک اور چمٹا بالکل ویسا ہی اسی دھات کا، اسی سائز کا، اسی وزن کا اس کو آپ چٹکی سے یوں ماریں اس

کوتو ایک سنسناہٹ سی پیدا ہو جائے گی، گونج سی پیدا ہوگی، ہاتھ رکھ کے بند کر دیں تو گونج پھر بھی آرہی ہوگی، آپ حیرت سے دیکھیں گے تو ساتھ والا ٹیونگ فورجس کو آپ کا ہاتھ لگا ہی نہیں پاس سے بھی نہیں گزری انگلی، وہ بجنے لگ گیا ہے۔

تو یہ قوّتِ قدسیہ ہے جو پاک وجودوں کو عطا ہوتی ہے اور پھر وہ اپنے قرب میں وہی لہریں ان کی روحوں میں، ان کے اجسام میں، ان کے دلوں میں، ان کے دماغوں میں جاری کر دیتے ہیں۔ پس آنحضرت ﷺ کی قوّتِ قدسیہ کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ گواہی دی ہے کہ میں بھی تیرہ سو سال کے فاصلے پر زمینی لحاظ سے، جغرافیائی لحاظ سے اتنا دور ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ ﷺ کی قوّتِ قدسیہ سے زندہ ہوا ہوں کیسی عظیم گواہی ہے، حیرت انگیز، کہ وہ قوّتِ قدسیہ جس پہ ہم تعجب کر رہے تھے کہ ساتھیوں کے بغیر بتائے کیسے نیک اور پاک کر دیا۔ آج ایک انسان، غلام پیدا کرتا ہے وہ دعویٰ کرتا ہے خدا کی قسمیں کھا کے کہتا ہے میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے زندہ ہوں کسی دلیل سے زندہ نہیں ہوا۔ آپؐ کی قوت قدسیہ نے براہ راست مجھے زندہ کر دیا ہے اور وہ ٹیونگ فور جو مدینے میں بج رہا تھا اور مرتعش تھا بظاہر دنیا سے رخصت ہو گیا مگر آج بھی اس کا ارتعاش لوگوں کے دلوں کو جو اس سے ملتے جلتے ہوں جو ہم مزاج ہوں جو اپنا سر اس کے حضور سر تسلیم کے طور پر خم کر دیں ان کے اندر وہی ارتعاش پیدا کر دیتا ہے، تو قوّتِ قدسیہ ہے جو لازم ہے اور یہ قوتِ قدسیہ قرب الٰہی سے نصیب ہوتی ہے اس کے بغیر ممکن نہیں۔

پس قرآن کریم نے جو دعوت الی اللہ کا فارمولا بیان کیا ہے بالکل حقیقی اور سائنٹیفک ہے کہ تم کرو ضرور لیکن اپنے وجود میں وہ تبدیلیاں پیدا کرنی ہوں گی جو قرب الٰہی کی نشان دہی کریں۔ جو تمہارے عمل کو صالح بنائے یعنی اللہ کے قریب کر دے پھر تمہاری آواز میں ایک طاقت پیدا ہو جائے گی۔ پھر تو بعض ایسے لوگ ہیں جو بولے بغیر بھی اصلاح کر دیا کرتے ہیں۔ ان کے پاس آ کر بیٹھنے والے متأثر ہوتے ہیں اور عام دنیا میں آج کل بھی احمدیوں میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ بعض لکھتے ہیں کہ ہم دفتر کی مجبوریوں کی وجہ سے تبلیغ نہیں کرتے تھے کیونکہ قانون ہے اور ہمارے معاہدے ہیں لیکن ہمارے ساتھ بیٹھنے والے بعض لوگ وہ دن بدن ہمارے قریب آنے شروع ہوئے جیسے ان کو محبت ہو گئی ہو اور آخر ایک دن بول پڑے کہ تم ہو کیا چیز، دنیا سے تو مختلف ہو۔ یہی ملک ہے ہمارا ملک بھی اور دوسروں کا بھی یہاں تو ایسے نمونے نہیں نظر آرہے جیسے تم ہو۔ نہ تمہیں رشوت سے دلچسپی، نہ تمہیں اور کسی

بدی میں، اپنا دفتر کا کام انتہائی دیانتداری سے کرتے ہو، شرافت سے ہر ایک سے سلوک، اخلاق سے پیش آنے والے، ہر چھوٹے بڑے سے جھک کر اس کی بات سننے والے۔ یہ باتیں اس شخص نے بتائیں کہ ہمارے ایک دوست نے میرے سامنے آ کے بیان کیں جو ہمارے دفتر میں کام کرتا تھا۔ کہتا میں مجبور ہو گیا ہوں آپ سے پوچھنے کے لئے کہ آپ کون ہیں۔ یہ چیز کیسے حاصل ہوگئی۔ جب ان کو بتایا کہ میں احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتا ہوں تو پھر وہ بھاگے نہیں کیونکہ اس کشش کا اتنا اثر تھا کہ انہوں نے کہا کہ مجھے لٹریچر دیں میں مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ لٹریچر لیا، مطالعہ کیا، خدا کے فضل سے احمدی ہو گئے۔ تو آغاز میں ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ یہ قوت قدسیہ از خود دلوں کو متحرک کر رہی تھی۔

پس اس علاقہ میں جس میں آپ بستے ہیں یہاں خدا سے دوری، اسلام سے دوری، یک طرفہ پراپیگنڈا اتنا سخت چل رہا ہے اسلام کے خلاف کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس علاقہ کو فتح کرنے کے لئے قوّتِ قدسیہ ضروری ہے وہ آپ کو حاصل ہوگی جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اپنے نفس کو خدا کے لئے تیار کرنا جیسے ایک گھوڑی کو سدھایا جاتا ہے تا کہ وہ کاٹھی قبول کر لے تا کہ وہ لگام پہن لے اور پھر آپ کی مرضی کے تابع حرکت کرے اور آپ کی مرضی کے تابع سکون کرے، حرکت وسکون دونوں آپ کی مرضی کے تابع ہو جائیں تو نفس کے متعلق بھی ایسی ہی کیفیت ہے۔ جیسے ایک گھوڑی کو سدھایا جاتا ہے آپ سدھانا شروع کریں اور جتنا جتنا سدھائیں گے اللہ تعالیٰ کا تصرّف اس پر ہوتا چلا جائے گا اور جو نفس اللہ کے تصرف میں آئے گا اس میں لازماً طاقت پیدا ہوگی اس میں ایک ہُنر مندی پیدا ہوگی اور وہ پہلو اس کا ایسا بولے گا کہ اس کی آواز لازماً دوسروں کو سنائی دے گی۔

پس اس پہلو سے، اس بناء پر میں بار بار آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ اپنے نفوس میں پاک تبدیلیاں پیدا کریں اور اپنی بیویوں میں پاک تبدیلیاں پیدا کریں اپنی بہنوں میں، اپنے بھائیوں میں اور اس مضمون کو چھوڑیں نہیں جب تک آپ کا بار بار کہنا آپ کے گردو پیش میں تبدیلیاں نہ کر لے کیونکہ اکیلے کی تبدیلی کافی نہیں ہوا کرتی۔ اگر آپ خود تبدیلیاں کر رہے ہیں اور پاک تبدیلیاں ہیں جبکہ اس سے پہلے آپ اور آپ کے گھر کا ماحول آزادانہ تھا اور ہر قسم کی بدیوں میں ملوث اور دنیا کے عیش وعشرت میں مبتلا تھے تو اگر آپ اکیلے تبدیلی پیدا کریں گے تو متنبہ رہیں اس بات میں کہ آپ کا گھر، آپ کے عزیز آپ سے دور ہونا شروع ہو جائیں گے۔ ان کو عادت ہے اور اس طرح کی زندگی کی، اچانک ان کے اندر

وہ سمجھیں گے کہ مولوی پیدا ہو گیا ہے۔ اچھی مصیبت ہے اچھا بھلا پہلے ہمارے ساتھ مل کر یہ کام کیا کرتا تھا اور اب اس نے یہ کام چھوڑ دیئے ہیں اور ہمارے لئے بھی مشکل پیدا کر دی۔ اس لئے ماحول اور دوستوں میں تو یہ بات اتنا نقصان نہیں دیتی کیونکہ دوست چھوڑ دیں تو جائیں پھر، لیکن گھر کو چھوڑ کر آپ کہاں جائیں گے، اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں سے ضائع ہوتے کیسے دیکھیں گے۔

اس لئے اس کا دوسرا قدم یہ ہے کہ جب اپنے اندر پاک تبدیلیاں پیدا کریں تو اپنی بیوی کو ساتھ لے کے چلیں، اپنی اولاد کو ساتھ لے کے چلیں اور حکمت اور پیار سے اگر ان کو سمجھایا جائے تو وہ ضرور ساتھ دیتے ہیں۔ اگر سمجھایا نہ جائے اور الگ آپ اپنی دنیا بنائے رکھیں اور سمجھیں کہ یہ ہمارے پیچھے ہیں، حکم سے مانیں گے تو جھوٹ ہے۔ حکم سے کوئی بھی نیکی نہیں مانا کرتا۔ یہ مودودی دماغ ہے جو یہ بات مانتا ہے کہ جبراً اور حکماً نیکیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ یہ بہت بڑا پاگل پن ہے۔ کبھی جبر اور حکم کے ذریعے نیکی پیدا نہیں ہوئی ہاں ایک مصنوعی عمل ضرور پیدا ہوا ہے۔ نیکی تو دل کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا نام ہے۔ پریڈ کا نام تو نہیں ہے۔ مودودی اسلام کے نتیجہ میں باجماعت نمازیں تو ہوسکتی ہیں اور داڑھیاں بڑھ سکتی ہیں، شلواریں ٹخنوں سے اوپر ہوسکتی ہیں اور ایک قسم کی بھیانک شکل ظاہر ہوسکتی ہے جو لوگوں کو کھینچنے کی بجائے متنفر کر رہی ہو اور اس پر یہ فخر کیا جائے کہ اسلام آ گیا اور دلوں میں خدا بیٹھ گیا بالکل جہالت اور بے وقوفی ہے۔

دلوں میں خدا بیٹھتا ہے ایسی پاک نصیحت سے جو دل میں جاگزیں ہو جائے، جو دل نشین ہو کر زندگی کا حصہ بن جائے اس کے بغیر یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ پس جبراً اور حکماً آپ اپنے خاندان کو بھی نہیں بدل سکتے کجا یہ کہ مودودی تصور کے مطابق سارے معاشرے کو آپ تبدیل کر دیں۔ کبھی دنیا میں جبر نے پاک تبدیلیاں پیدا نہیں کیں مصنوعی صورتیں بدلی ہیں۔ لیکن روحوں پر جبر کا کوئی بھی دخل نہیں ہے۔ پس اس پہلو سے آپ دنیا کے تجارب پہ نظر ڈال کے دیکھیں ہر جگہ یہی دکھائی دے گا کہ جبر دل کا حسن پیدا نہیں کر سکتا۔

میں نے بارہا ان علاقوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جہاں کسی زمانے میں احمدیت خدا تعالیٰ کے فضل سے بڑے زور سے پھیلی تھی اور بہت بڑے بڑے خاندان تقریباً علاقہ کے سارے ہی معززین احمدی ہو چکے تھے اور اس کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے اور مجھے یہ بات اس لئے سمجھ نہیں آیا کرتی تھی کہ میں جانتا ہوں قرآن کے مطالعہ سے کہ وہ لوگ جو خود ایک دفعہ امام وقت کو قبول کر لیں وہ تباہ

نہیں ہوا کرتے پھر وہ پیچھے نہیں ہٹا کرتے لیکن قرآن کریم نے یہ بات ضرور فرمائی ہے کہ پھر بعض دفعہ ان کے وارث ایسے خلف ہو جاتے ہیں ایسی نسلیں ہو جاتی ہیں جو تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تو صاف پتا چلا کہ قرآن سچا ہے۔ یہ لوگ جو ابتداء میں احمدی ہوئے انہوں نے قربانیاں دیں اور قرب الٰہی حاصل کیا وہ نہیں پیچھے ہٹے، اولادیں چلی گئیں۔ مگر اولادوں کے جانے کی وجہ ہونی چاہئے۔ اگر باپ کا عمل نیک تھا تو کیوں اولادیں اثر کے نیچے نہیں آئیں اور کیوں دور ہٹ گئیں۔ جب بھی میں نے جائزہ لیا بلاشبہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوئی کہ ان باپوں نے اپنی بیویوں کے اندر پاک تبدیلی پیدا نہیں کی اور یہ سمجھتے رہے کہ بیویاں اس زمانے میں تو زیادہ ہی مطیع ہوا کرتی تھیں اب تو نئی نسل کی بیویاں اور طرح کی ہوگئی ہیں مگر اُس زمانہ میں بیویاں بہت مطیع ہوا کرتی تھیں ظاہری طور پر، اور اندر کھاتے بیٹھ کے اور باتیں کیا کرتی تھیں کیونکہ وہ اطاعت بھی جبر کی اطاعت تھی۔ اب جو اطاعت ہے وہ پیار اور محبت کی اطاعت ہے۔ یہ اطاعت جو ہے وہ Companionship کی اطاعت ہے۔ اِس میں اور اُس میں فرق ہے۔ تو پہلے زمانے میں بظاہر لگتا تھا کہ بڑا ہی اچھا زمانہ ہے کیسی شریف عورتیں ہیں خاوند کے سامنے آنکھ نہیں اٹھاتیں، بات نہیں کرتیں لیکن جب خاوند باہر چلا جائے تو پھر کیا کرتی ہیں۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ خاندان جن کا میں نے جائزہ لیا وہ پتا ہے کیا کیا کرتے تھے۔ وہ یہ کرتے تھے کہ خاوند جب گیا دفتر میں یا اپنے کاموں پر تو بیوی نے اولاد کے کان بھرنے شروع کئے اور کہا کہ تمہارا باپ تو پاگل ہو گیا ہے تمہاری ضرورتیں کاٹ کاٹ کر چندے قادیان بھیج رہا ہے اور دیکھو تمہارا کیا حال ہے۔ جائیدادیں اپنی جماعت کو دے رہا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے معصوم وہ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے مگر ان کے دل پر اثر ضرور پڑتا ہے پھر کہ واقعی یہ تو باپ بڑا ظالم ہے اور ایسے بچوں نے مجھ سے خود ذکر کیا جو دور ہٹ گئے تھے میری ملاقات اور مجالس کے بعد جب بے تکلفانہ قریب آئے تو ایک دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا ہے، ایک ہی کہانی دہرائی گئی مگر بار بار دہرائی گئی کہ ایسے بچے قریب آئے انہوں نے کہا کہ آپ نے بالکل سچی باتیں کی ہیں ہم سے یہی گزری ہے۔

ایک نے کہا ہماری ماں تو ہمیں یہ مطالبے بتایا کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ اپنے ابا سے کہو مجھے موٹر سائیکل لے دیں، مجھے فلاں چیز لے دیں اور جب ہم کہتے تھے تو باپ کہتا تھا میرے پاس تو نہیں پیسے۔ تو ماں کہتی تھی دیکھا وہی بات نکلی اتنا چیک اس نے قادیان بھجوایا ہے۔ وصیت کر بیٹھا

ہے، تمہیں اپنی وراثت سے بھی محروم کر دیا ہے۔تم مرو گے تو یہ جائیداد جو ہے اس کا دسواں حصہ وہ جماعت لے جائے گی۔وہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ایسا بداثر ان پر پڑا کہ انہوں نے وصیتیں بھی ادا نہیں کیں۔وہ ساری زندگی قربانی کرتا رہا مگر غیر موصی کے طور پر دفن ہوا۔تو گرد و پیش کو دیکھنا تو بعد کی بات ہے اپنے گھر کو دیکھنا سب سے اوّل ہے اور یہاں جبر نہیں چل سکتا۔جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے یہ فرضی باتیں ہیں کہ جبر کے ذریعے آپ خاندان کی اصلاح کر سکتے ہیں اس کو غلام بنا سکتے ہیں۔اپنی زندگی میں جب تک آپ میں طاقت ہے وہ جیسے کوئی ناک میں نکیل ڈالی ہو اور پیچھے پیچھے چلا رہے ہیں اس کو، پیچھے تو چل پڑیں گے لیکن نفرت کے ساتھ، ان ارادوں کے ساتھ کہ اب آنکھیں بند کرو پھر دیکھنا ہم کیا کرتے ہیں اور یہی ہوا کہ کثرت کے ساتھ بہت ہی مخلص خاندان جن کے سربراہ مخلص تھے جو فدائی تھے اپنی زندگی میں جب آواز آتی تھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے یا بعد میں خلفاء کی طرف سے جو حاضر ہوتا تھا پیش کر دیا کرتے تھے لیکن بیویوں سے غافل رہ گئے اور اولاد تو پھر بیویوں کے پیچھے چلی کیونکہ یہ دستور ہے کہ پانی نیچے کی طرف بہتا ہے۔بیویاں جس زندگی کی طرف ان کو بلاتی تھیں وہ آسانی کی زندگی تھی، آرام کی زندگی تھی۔باپ جس زندگی کی طرف بلاتا تھا وہ چڑھائی تھی، مشقت اور محنت کی زندگی تھی اور اگر حکمت سے کام لیتا تو بچوں اور بیویوں کو سمجھا کر، پیار اور محبت کے ساتھ لے کر چلتا تو کبھی وہ اولادیں ضائع نہیں ہو سکتی تھیں اور انہی علاقوں میں ایسی مثالیں ہیں جن علاقوں کی بات میں کر رہا ہوں۔ان میں تیسری نسل، چوتھی نسل بھی آ چکی ہے اور ہر نسل فدائیوں کی پیدا ہو رہی ہے کیونکہ بلا استثناء ان خاندانوں میں خاوندوں نے اپنی بیویوں کو قائل کیا اور عبادتوں میں اپنے ساتھ شریک کیا، جماعت اور مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت ان کو گھول گھول کے پلائی یہاں تک کہ وہ دونوں فدائی بن گئے اور ان کی اولاد کبھی ضائع نہیں کی گئی۔ناممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی اولاد ضائع ہو جائے سوائے اس کے کہ بعض دفعہ بدبختی سے ایسے ماحول میں ایک بچہ پڑ جاتا ہے جس پہ ماں باپ کی نظر نہیں ہوتی اور استثناء کے طور پر وہ ٹھوکر کھا جاتا ہے۔مگر میں نے تو نیک ماں باپ جہاں دونوں برابر کے شریک ہوں نصیحت میں اور تربیت میں ان کی اولادوں کو تو ضائع ہونے کے بعد بھی واپس آتے دیکھا ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ ان کی نیکی کا بھرم رکھتا ہے۔

آج ہی ایک خط مجھے ملا ہے ایک ایسے شخص کا جو کسی ملک میں ہے میں اس کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتا، مجھے ملا تو پتا چلا کہ عمر کا ایک طویل عرصہ اب جو بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس کا دل واپس احمدیت کی طرف آیا ہے۔ نہایت مخلص فدائی ماں باپ کی اولاد مگر دور ہٹ گئی تھی اور کوئی توجہ نہیں تھی۔ واپس آیا ہے تو اس زور کے ساتھ، اس اخلاص کے ساتھ، اس احساس کے ساتھ کہ جو کچھ میں نے گنوایا ہے اس کو میں نے اب پورا کرنا ہے اور پوچھا کہ کیا ہوا تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ دنیا کی تو کوئی دلیل چلتی نہیں وہاں، وہ دعا ہے جو ماں باپ کی ہے جو گھیر کر اور طرح کی نکیل ناک میں ڈال کے لائی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی نکیل ہے وہ دعاؤں کی قبولیت کے نتیجہ میں دلوں کی پاک تبدیلیوں کی نکیل ہے۔

تو آپ کو جب تک اپنے بیوی اور بچوں پر حقیقی دسترس نہیں ہوتی حکم کی نہیں بلکہ پیار کی Companionship کی جس میں سارا خاندان ایک ہی طرح کا ہو اور اکٹھے ہی ایک طرف چلیں یہ دوسری منزل ہے جس کی طرف میں آپ کو بلا رہا ہوں۔ اس کو آپ سمجھ جائیں گے اور اس پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کی اولادوں میں بھی وہ پاک تبدیلی پیدا ہوگی اور آپ کی پاک تبدیلی میں مزید طاقت آئے گی۔ ورنہ ایک خاوند جب اپنی بیوی کو یا اپنے بچوں کو اپنے سے ہٹے ہوئے رستوں پر چلتا دیکھتا ہے تو اس کی آگے بڑھنے کی طاقت میں بھی کمی آجایا کرتی ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے چڑھائی چڑھ رہا ہے اور بوجھ اٹھایا ہوا ہے تو بوجھ اٹھا کے کہاں کوئی تیز رفتاری سے بلندی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ ہلکے پھلکے قدم ہوں تو زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آدمی آگے بڑھتا ہے کہاں یہ کہ چار پانچ بیوی بچوں کا بوجھ کمر کے پیچھے لادا ہوا ان کو بھی گھسیٹ رہا ہے اوپر کی طرف، آپ بھی چلنے کی کوشش کر رہے ہو تمہاری رفتار میں لازماً کمی آئے گی اور وہ کمی بعض دفعہ مہلک ثابت ہوتی ہے آخر تھک کر لوگ چھوڑ دیتے ہیں۔

مگر جو طریقہ میں بتا رہا ہوں ایسے بچے ہوں جو آپ کے آگے آگے بھاگ رہے ہوں اور بعض بچے جب آپ پہاڑوں کے سفر کرتے ہیں تو جب ان کا دل چاہ رہا ہے کہ ہاں ہم بھی جائیں گے تو واقعۃً وہ دوڑ دوڑ کے آگے نکلتے ہیں۔ ماں باپ بعض دفعہ بلاتے ہیں کہ کہیں ٹھوکر نہ کھا جانا لیکن ان کی طبیعت میں ایسا جوش، ایسی بشاشت ہوتی ہے کہ روکے نہیں رکتے اور ماں باپ بجائے اس کے کہ ان کو کھینچ کر آگے لے کے جائیں گے ان کو تیز رفتاری کے خطرات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر بچہ نہ مانے اور آپ اس کو گھسیٹ کے لے کے جائیں تو پھر دیکھیں کیا حال ہے۔ جتنی

مرضی طاقت ہے وہ کہیں ٹھڈے مارے گا آپ کو، کہیں شور مچائے گا، کہیں آپ کے بال نوچے گا مصیبت میں مبتلا کر دے گا یہاں تک کہ آپ کہیں گے چلو دفع ہو، نہیں جاتے کہ میں بھی نہیں جاتا تم بھی نہ جاؤ۔ تو یہ وہ روزمرہ کے زندگی کے تجارب ہیں جو زندگی کے اہم مسائل کو سمجھنے میں ہمیں مدد دیتے ہیں۔ پس ایسے ماحول پیدا کریں کہ آپ کے بچے آگے آگے بھاگیں اور واقعۃً جب ایسے بچے آگے بھاگتے ہیں تو وہ ماں باپ جن میں اتنا تیز چلنے کی سکت نہیں ہوتی سچ مچ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور مجھے پھر وہ بچے شکایتیں بھیجتے ہیں۔ کہتے ہیں دیکھو ہمارے ماں باپ کو، ہم خدام کا یہ کام کرتے ہیں نیکی کا یہ کام کرتے ہیں ہماری اماں کہتی ہے کہ نہیں تمہیں اتنا کام نہیں کرنا، باپ کہتا ہے کہ نہیں اتنا وقت نہیں دینا تو آپ ہمارے ماں باپ کو سمجھائیں وہ ہمارے رستوں میں کیوں حائل ہو رہے ہیں۔ تو جو منظر میں نے سیر و تفریح میں، بچوں کے حال کا آپ کے سامنے رکھا روحانی دنیا میں بالکل وہی منظر ہے جو ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ جو بچے پھر دل کی مرضی سے اور دل کی گہرائی سے اپنے ماں باپ کے پیغام کے ساتھ ہو جائیں بسا اوقات وہ ماں باپ سے بھی آگے چھلانگیں مارتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ تو ایسی نسلیں پیدا کریں یہاں، وہ نسلیں کہ جب آپ آنکھیں بند کر لیں تو یقین ہو کہ وہ کبھی بھی ہمارے چلے ہوئے رستوں سے پیچھے نہیں ہٹیں گی، کبھی بھی ان راہوں سے قدم نہیں روکیں گی جن راہوں پر ہم زندگی بھر ان کو چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی حفاظت میں آ جاتے ہیں۔ یہ وہ نسلیں ہیں جو آپ کی اور آپ کے پیغام کی ہمیشہ حفاظت کرتی چلی آتی ہیں۔ آپ کے مرنے کے بعد بھی ان کی نیکیوں کا اجر آپ کو پہنچتا رہے گا۔ آپ کے مرنے کے بعد بھی ان کی دعائیں آپ کو پہنچتی رہیں گی اور اس طرح نسلاً بعد نسلٍ یہاں ایک ایسا پاک تبدیلی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو لازماً اس ملک کی تقدیر کو بدل کے رہے گا۔

پس اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے رستوں پر اسی نہج پر چلنے کی توفیق بخشے جس نہج پر خدا کے پاک لوگ چلتے رہے اور جس کی طرف قرآن کریم نے ہمیں سمجھایا کہ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کی دعا مانگا کرو صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ (آمین)

اللہ کا پیار دل میں ہوگا تو کائنات کے رازوں پر دسترس ہوگی۔اُتنا ہی خدا کی محبت آپ کے دل پر غالب ہوگی۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 25/اکتوبر 1996ء بمقام بیت نور اوسلو، ناروے)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝۱۹۱ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۲ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۱۹۳ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝۱۹۴ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝۱۹۵ (آل عمران: 191 تا 195)

پھر فرمایا:

یہ آیات کریمہ جن کی میں نے تلاوت کی ہے جب بھی میں ناروے آتا ہوں مجھے بکثرت یاد آتی ہیں اور کوئی ایسا سفر نہیں جس میں صبح شام ذہن میں ان آیات کا مضمون نہ گھومتا ہو کیونکہ جن

آیات کا یعنی موسم اور حالات کے ادلنے بدلنے کا اور قدرت کے رازوں کا ذکر جو مومنوں پر کھولے جاتے ہیں ان آیات میں ملتا ہے ان کا ایک گہرا تعلق ناروے سے ہے اگرچہ دنیا کے ہر خطے سے ہے۔اس لئے ناروے میں آکر جتنا یہ آیات یاد آتی ہیں اتنا ہی دل میں تکلیف کا احساس بڑھتا ہے کہ ہم اس ملک کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے اور جو اس ملک کا حق تھا جو اس ملک کے نمک کھانے کا حق تھا وہ ہم نے ادا نہیں کیا۔اس مضمون پر غور کرتے ہوئے اس سفر میں جو چند دن کے لئے آپ سے جدا ہوا تھا اور ناروے کے بعض حصوں کا سفر کیا تھا اس میں ان آیات نے میرے ذہن اور دماغ پر قبضہ کئے رکھا اور اب مجھے یہ خیال آیا کہ انہی آیات کے حوالے سے میں ان مسائل کا حل تلاش کروں جو مومن کے اندر صرف جذبات ہی کو حیرت انگیز طور پر ولولے عطا نہیں کرتیں بلکہ ذہن کو بھی تیز کرتی ہیں اور عقل کو بھی مسائل تک رسائی بخشتی ہیں۔

سب سے پہلی بات کہ وہ کیا طریق اختیار کیا جائے جس سے جماعت کے اندر ایک ولولہ پیدا ہو جائے ،ایک ایسی لگن لگ جائے جس کے نتیجہ میں وہ اس ملک میں اسلام پھیلانے کا حق بہر حال ادا کریں اور کوئی روکے بھی تو ان سے روکا نہ جائے۔انہی آیات میں موجود ہے کہ یہ طریق، یہ جذبہ اور یہ توفیق عشق الٰہی کے بغیر مل نہیں سکتی کیونکہ جو نقشہ کھینچا گیا وہ یہ ہے کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ کہ زمین وآسمان کی پیدائش میں اور رات اور صبح کے ادلنے بدلنے میں لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ نشان تو بہت ہیں مگر عقل والوں کے لئے بکثرت نشان ہیں اور عظیم الشان نشان ہیں لیکن عقل والوں کی تعریف کیا فرمائی گئی ہے۔ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ عقل والے تو وہ ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہو کر بھی اور لیٹے ہوئے بھی، بیٹھے ہوئے بھی وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ اور اپنے پہلوؤں پر بھی وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اس محبت کے جذبے سے جب وہ زمین وآسمان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں تو بے اختیار ان کے منہ سے یہ دعا نکلتی ہے۔رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کہ اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ باطل پیدا نہیں کیا۔اتنا عظیم الشان کارخانہ ہے اتنے گہرے حکمت کے راز ہیں کہ ان پر نظر ڈال کر کوئی انسان یہ وہم بھی نہیں کرسکتا کہ یہ سب چیزیں از خود اور بے مقصد پیدا ہوئی ہیں اور ایک اندھی

Evolution نے کائنات کو اس مقام تک پہنچایا جس پہ ہم دیکھ رہے ہیں اور اس مقام تک پہنچا کر زندگی کو ساتھ ترقی دیتے ہوئے اس مقام تک پہنچایا کہ وہ زندگی دیکھ سکے کہ یہ کائنات کیا ہے اور اس کا حسن کیا ہے؟ یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو کر پھر ان مومنوں کی تخلیق کرتی ہیں جن کا ان آیات میں ذکر ہے کہ جب وہ مومن جو خدا کی محبت میں مدہوش رہتے ہیں جب وہ غور کرتے ہیں تو لازماً ان کے دل خدا تعالیٰ کی محبت میں اور بھی زیادہ گھائل ہو جاتے ہیں اور لازماً ان کی توجہات زمین و آسمان کے رازوں کو سمجھنے کی طرف مبذول ہوتی ہیں اور نتیجہ سب ایک ہی نکالتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا اے ہمارے رب تو نے یہ چیزیں باطل پیدا نہیں کیں۔

اس بار جب میں نے اس مضمون پر غور کیا تو ایک اور نکتہ جو سمجھ آیا وہ یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے یہ آیت محض ناروے کے لئے تو پیدا نہیں کی تھیں۔ وہ بیابان عرب جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پیدا ہوئے وہ آواز جو آپؐ نے صحرائے عرب سے بلند کی وہ سب سے زیادہ ان آیات کے مطابق ایک ایسا وجود پیش کرتی ہے جو دن رات خدا کی محبت میں مبتلا تھا اور اس نے تو ان ملکوں کی سیر نہیں کی جو دنیا کی نظر میں بہت ہی خوب صورت اور غیر معمولی طور پر قدرتی نظاروں سے ایسے مزین کئے گئے ہوں۔ اس نکتہ پر غور کرتے ہوئے مجھے اپنے بچپن سے لے کر اب تک جو ذہنی سفر ہے وہ یاد آیا اور میں نے سوچا کہ میں آپ کو بھی اس بات سے مطلع کروں کہ حسنِ قدرت کے لئے محض پہاڑوں اور سبزہ زاروں اور بادلوں اور بجلی کی چمک اور بجلی کی گھن گرج اور آبشاروں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ حسن تو جو شاہکار بنانے والا ہے یا شاہکار ایسے تصویر بنانے والے کی ذات میں ہوتا ہے جو مصور ہے اور جسے شاہکار بنانے کی توفیق ملتی ہے اور مصور کے حالات پر جب غور کریں اور اس کے کاموں کو دیکھیں تو ضروری نہیں ہے کہ مصور کوئی بہت ہی خوب صورت چیز بنائے اور اس پر آپ کے دل سے اس کے لئے تعریف کے جذبے بے اختیار اُبلیں بلکہ وہ مصور جو اپنے فن میں کامل ہے وہ ایک بھیانک منظر بھی پیش کرتا ہے تو اس میں ایک حیرت انگیز حسن پوشیدہ ہوتا ہے، وہ حسن کمال ہے۔ پس وہ خدا جو خلق میں کمال رکھتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی خالق ہو نہیں سکتا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون: 15) ایسا خدا ہے جس سے بڑھ کر کوئی حسین خالق بن نہیں سکتا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ بھی بنایا ہے اس میں بھی ایک حسن رکھ دیا ہے۔ چنانچہ اس دوران مجھے وہ بعض صحرائی علاقوں

کے سفر بھی یاد آئے، بعض بنجر بیابان بھی آئے جہاں بعض دفعہ گھنٹوں بیٹھا رہا کرتا تھا اور اس بنجر میں بھی ایک ذاتی حسن تھا، ان ریگستانوں میں بھی ایک ذاتی حسن تھا جو دل و دماغ پر قبضہ کئے ہوئے تھا اور پھر جب آپ غور کا سفر شروع کریں تو گردوپیش بہت سی ایسی چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں جو پہلے دکھائی نہیں دیتی تھیں اور یَتَفَکَّرُوْنَ کا جو لفظ ہے اس نے مجھے یاد دلایا کہ بسا اوقات جب میں نے ان جذبوں میں ڈوب کر اپنے گردوپیش کی زمین پر نظر ڈالی تو وہاں عجیب عجیب چیزیں دکھائی دینے لگیں کچھ کیڑے، کچھ جانوروں کے چھوڑے ہوئے غار نما خلا یا غاریں تو نہیں کہہ سکتے مگر بھٹ کہتے ہیں غالباً، جانوروں کی وہ جگہیں جہاں وہ سر چھپانے کے لئے پناہ لیا کرتے ہیں، پھر ایسے بل دکھائی دیئے جو بعض دفعہ سانپوں کی آماجگاہ بن جاتے ہیں، بعض دفعہ چوہوں کی، بعض دفعہ اور جانور کھودتے ہیں کوئی دوسرے ان میں آکر پناہ لیتے ہیں۔ پھر اردگرد وہ مخلوق دکھائی دینے لگی جو حیرت انگیز طور پر ہر ایک ان میں سے خدا تعالیٰ کے تخلیق کے کمال کی گواہ بنی ہوئی تھی۔ وہاں کے مچھر، وہاں کی مکھیاں، وہاں کے مختلف قسم کے پرندے اور چرندے اور جانور جو دوسرے جانوروں کا شکار کر کے پلتے ہیں ان سب کے وجود کے آثار وہاں دکھائی دینے لگے اور میں حیرت میں ڈوب گیا کہ یہ دیکھو یہ دنیا جو پہلے نظر نہیں آتی تھی اب پتا چلا کہ کوئی بھی زمین ایسی نہیں کوئی زمین کا ایسا چپہ نہیں ہے جہاں خدا تعالیٰ نے اپنی صناعی کے شاہکار کے نشان نہ چھوڑے ہوں۔

وہاں ہی میں نے ایک چھوٹی سی صحرائی چڑیا دیکھی یعنی ایک معین واقعہ کی یاد آپ کو دلا رہا ہوں کوئی فرضی سیر نہیں کر رہا۔ ایسے وقت کی سیر کرا رہا ہوں جو میں نے واقعۃً گزارا اور جو کچھ میں نے سوچا، جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس آیت کے حوالے سے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب میں نے اس مضمون پر غور کیا کہ کیا نا روے ہی ایک ایسا ملک ہے جو خدا تعالیٰ کی حسن صنائی کی یاد دلانے والا ہے تو اس وقت میرے خیالات ان رستوں پہ چل پڑے اور سب سے پہلے مجھے عرب کے صحرا کا تصور آیا کہ سب سے زیادہ حسین انسان جس نے خدا کو سب سے زیادہ حسین صورت میں دیکھا ہے وہ تو عرب کے ریگستان میں پیدا ہوا تھا اس لئے یہ آیت ہر انسان کو مخاطب ہے اور اس شان سے مخاطب ہے کہ جس کے نتیجہ میں اگر آپ اس کی شان سے مرعوب ہو کر وہ تصورات کا سفر اختیار کریں جس کی طرف اس آیت نے اشارہ کیا ہے یعنی یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو جہاں بھی

آپ ہوں لق ودق صحرا میں ہوں یا شاداب سبزہ زاروں اور آبشاروں کے ملک میں ہوں ہر جگہ آپ کو خالق کی صناعی کے شاہکار دکھائی دیں گے۔ایک چھوٹا سا خوبصورت سا پرندہ اچھل کر سامنے آیا اور میں حیرت سے اس کو دیکھنے لگا بہت ہی چھوٹا لیکن اتنے متوازن اس کے اعضاء اور ایسا ہلکا پھلکا بدن اور اس قدر اس کے رنگوں میں حسن،اس کے رنگوں کا حسن شوخی نہیں رکھتا تھا جیسا کہ بعض ملکوں کے پرندوں کے رنگوں میں شوخی پائی جاتی ہے بلکہ اس مزاج کے ساتھ آہنگ تھا لیکن غور کرنے پر جب اس پر میں نے گہری نظر ڈالی تو میں حیران رہ گیا کہ اس موقع اور محل کے مطابق اس سے خوبصورت،اس سے بہتر،اس سے زیادہ موزوں پرندہ ان حالات میں کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان بھی تجویز نہیں کرسکتا تھا کوئی بڑے سے بڑا صناع بھی سوچ نہیں سکتا تھا اور عین ان حالات کے مطابق اس کی غذا وہاں مہیا تھی۔ان غاروں میں چھپے ہوئے یا ان بلوں میں گھسنے والے مختلف جانوروں کی غذا بھی وہاں مہیا تھی اور وہ ساری جگہ جو پہلے سنسان دکھائی دے رہی تھی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی یوں لگا جیسے اچانک جاگ اٹھی ہے، ہر طرف اللہ تعالیٰ کے حسن کی گواہیاں دینے والے پیدا ہو گئے۔

اس مضمون کو میں نے ایک دفعہ پھر اس طرح یاد کیا کہ انگلستان کے ایک قدرتی مناظر کی تصویریں لینے والے اور ان پر غور کرنے والے اور بہت خوبصورت انداز میں Mr. David Attenborough ان کو پیش کرنے والے ہیں کہ ان کی کتب جب بھی میں پڑھتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کو ایمان نصیب ہوتا تو یقیناً اس آیت کے مصداق یہ بھی بن جاتے جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔وہ آپ کو جنگلوں،صحراؤں میں،دلدلوں میں لے جاتے ہیں ایسی جگہوں پر جہاں بظاہر زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے پھر وہ مٹی کھودتے ہیں پھر وہ ریت کریدتے ہیں دلدلوں میں،مٹھی بھرتے ہیں دلدلوں سے اور ہاتھ نکال کے دکھاتے ہیں تو وہاں عجیب وغریب قسم کی مخلوقات جو ان حالات کے لئے انتہائی موزوں ہے وہ اپنے کاروبار میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔پھر اس کی زندگی کے صبح و شام پر وہ روشنی ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا سائنس دان جس کو قدرت کے ان حیرت انگیز نظاروں پر خدا تعالیٰ نے ایسی دسترس بخشی ہو یعنی اس کا ذہن رسا ان کی گہرائیوں تک اترتا ہو وہ ایمان سے کیسے محروم ہے۔ایک دفعہ میں نے اپنے ایک ایسے دوست کو جو میرا خیال تھا کہ Mr. David Attenborough کو جانتے ہوں گے ان سے میں نے

درخواست کی کہ اس شخص سے ملنے کا مجھے بہت شوق ہے۔ میں کریدنا چاہتا ہوں کہ ان سب رازوں تک رسائی کے باوجود اس کا ذہن کیوں اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ باطل پیدا نہیں کیا۔

تو آپ کو خدا تعالیٰ نے ایسے ملک میں پیدا کیا ہے جہاں خدا کی صناعی کا حسن ظاہر و باہر ہے جہاں مٹی کرید کر نہیں دیکھنا پڑتا، جہاں سناٹوں میں ڈوب کر گہری نظر سے اردگرد کی مخلوق کو اچانک، کوشش سے جاگتے ہوئے دیکھ کر پھر یہ خدا کی یادوں کا سفر نہیں کرنا پڑتا بلکہ یہاں تو اللہ کی یادیں آپ کے سامنے چاروں طرف آپ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ حسین مناظر جو اس ملک میں ہیں وہ تو اپنے ہواؤں کے لطف کے لحاظ سے اندھوں کو بھی دکھائی دینے چاہئیں۔ جو ہوائیں یہاں چلتی ہیں ان کا ایک عجب لطف ہے جس کے متعلق ساری دنیا کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایسی شفاف ہوا، ایسی صحت افزا ہوا جیسی ناروے میں ہے دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں انہوں نے کوڑھیوں کے لئے ایک تجربہ گاہ بنائی اور مجھے پہلے تو اچھا نہیں لگا یہ خیال، اتنے پاک، صاف ستھرے ملک کی ہوا کوڑھیوں کی سانسوں سے بیمار کرنے کی کوشش کی جائے مگر وہ جو تجربہ کرنا چاہتے تھے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ہم یقین سے کہہ سکیں کہ ان تجربوں میں کوئی دوسری بیماری مخل نہیں ہوگی سوائے ناروے کے اور کوڑھیوں پر تجربے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے وہ کہاں بنائے گئے ہیں لیکن سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ وہ فضا کو مسموم نہیں کریں گے بلکہ ان کو کوڑھیوں کی شفا کے لئے خدا تعالیٰ کچھ اور نئے راز عطا کر دے گا جو پہلے معلوم نہیں تھے۔ کہاں تک یہ درست ہے یہ الگ بحث ہے۔

میں واپس اس مضمون کی طرف آتا ہوں کہ آپ کو تو خدا تعالیٰ نے اپنے ظاہر و باہر حسن کا نظارہ کرایا ہے جیسا کہ غالب کہتا ہے:

؎ جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں؟　　(دیوان غالب: 187)

یعنی کائنات ساری خدا کے حسن کے پردے ہیں اور ان پردوں میں خدا کا حسن چھپا ہوا ہے مگر ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے اگر وہ گہری نظر سے ان پردوں کے پیچھے حسن کو تلاش کرنے کی

کوشش کرے۔ وہ پردے بولنے لگتے ہیں۔ وہ پردے اس حسن کو ظاہر کر دیتے ہیں اگر آپ کو دیکھنے کی آنکھ نصیب ہو۔ مگر اس کے علاوہ ایسی بھی صورت ہوتی ہے جیسا کہ غالب نے کہا کہ:

ع جب وہ جمال دل فروز ،صورت مہر نیم روز

جب وہ دل کو بھڑ کا دینے والا جمال دن چڑھے کے سورج کی طرح ظاہر ہوجائے تو ''پردے میں اسے چھپائے کیوں'' کون ہے جو اس کو دیکھ سکتا ہے، وہ تو نظروں کو خیرہ کر دے گا۔ ایسی صورت میں اسے پردوں کی کیا ضرورت ہے۔ تو اگر اس شعر کا کوئی اطلاق کہیں ہوتا ہے تو وہ ناروے پہ ضرور ہوتا ہے مگر اس کے منفی معنوں کا بھی اطلاق ہو رہا ہے جس کی وجہ سے مجھے فکر ہوتی ہے اور تکلیف پہنچتی ہے کہ واقعی آنکھیں ایسی خیرہ ہوگئی ہیں کہ ان کو وہ حسن جو کھلا اور ظاہر و باہر ہے وہ دکھائی نہیں دیتا اور غافل رہتی ہیں۔ لوگ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اور خالق کی طرف دھیان نہیں جاتا بلکہ یہ حسن ہی ان کی نظر کی صلاحیتوں کو گویا جلا دیتا ہے اور خاکستر کر دیتا ہے۔

پس یہ وہ چیزیں ہیں جو اس سفر میں میں سوچتا رہا اور میں نے سوچا کہ اسی مضمون کو آج آپ کے سامنے رکھوں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ظاہر و باہر حسن آپ کو دیکھنے کی توفیق بخشی ہے اس کو اگر آپ نہ پہچان سکیں اور اس کے نتیجے میں وہ مضمون دل میں پیدا نہ ہو جس کا ان آیات میں ذکر ہے اور بار بار سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں اچھلنے نہ لگے تو پھر آپ اس ملک کی خدمت کی کوئی توفیق نہیں رکھتے۔ پھر آپ جیسے چاہیں یہاں زندگی بسر کریں، جیسے چاہیں بلند ارادے باندھیں یہ وہ خدمت ہے جو محبت کے سوا نصیب نہیں ہوسکتی۔ پس محبت الٰہی ہی سب باتوں کا جواب ہے اور ایسے حسین ملک میں اگر آپ توجہات کو ان مناظر سے پیچھے خالق کائنات کی طرف دوڑا دیں، اگر اس کے تصور سے اپنے ذہن کو ضرور مزین کریں تو ناروے سے زیادہ حسن آپ کے ذہنوں میں، آپ کی شخصیتوں میں پیدا ہوجائے گا کیونکہ یہ تو ایک ظاہری حسن ہے مگر خدا کا تصور جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے جو راتوں کو بھی اٹھتے ہیں اور صبح بھی، کروٹیں بدلتے ہوئے بھی خدا کو یاد کرتے ہیں وہ حسن انسان کو ایک ایسے مجسم حسن میں تبدیل کر دیتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ناممکن ہے کہ دوسرے اس کی طرف خدا کے حصول کے لئے دوڑیں نہیں اور اس کو اپنا وسیلہ بنائیں، یہ سارا مضمون اسی نتیجہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

چنانچہ فرمایا کہ جب وہ غور کرتے ہیں اور فکر کرتے ہیں تو ایک چیز ان کے دماغ میں ضرور جاگتی ہے کہ یہ باطل نہیں ہے۔ اتنا حیرت انگیز کارخانہ، ایسا متناسب یہ ازخود بے وجہ، بے مقصد پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایک کرسی کو آپ بنے ہوئے دیکھیں تو کوئی نہیں سوچ سکتا کہ ازخود پیدا ہوگئی ہوگی کوئی نہیں سوچ سکتا کہ اگر ازخود بھی پیدا ہوئی ہے تو بے مقصد ہے۔ صناعی کا ایک مقصد ہوتا ہے جو دکھائی دینے لگتا ہے اور ہم نے کئی قسم کے، رنگا رنگ کے ہٹ رستے میں دیکھے ہیں یعنی جن کو عام طور پر لوگ Huts کہتے ہیں یا جھونپڑیاں، یہاں کی جھونپڑیاں بھی بڑی خوبصورت ہیں۔ مگر بعض بالکل سادہ اور معمولی، بعض بہت زیادہ حسین اور مزین لیکن کسی گھٹیا سے گھٹیا ہٹ کو دیکھ کر بھی کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ بے مقصد یہاں کھڑی کردی گئی تھی پرانے Barns جہاں توڑی وغیرہ اس قسم کے جانوروں کے چارے رکھے جاتے ہیں وہ ان کے کھنڈرات ہیں بہت ہی بدزیب لکڑیاں گل گئیں، رنگ بگڑ گئے، چھتیں ٹوٹ گئیں لیکن ان کو دیکھ کر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بے مقصد پیدا کئے گئے تھے۔

پس یہی آواز ہے جو مومن کے دل سے ان باتوں پر غور کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور بڑے زور سے اٹھتی ہے کہ اے خدا! تو نے ان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ پس ہمیں تو آگ کے عذاب سے بچا۔ اب دیکھیں ان دونوں باتوں کا کیا جوڑ ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا ان چیزوں کو اس لئے تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ لوگ یہ سن کر آگے گزر جاتے ہیں لیکن ٹھہر کر سوچتے نہیں کہ اس کا آگ کے عذاب سے آخر کیا تعلق ہے۔ کائنات کو دیکھا بے مقصد پیدا نہیں ہوئی یہ خیال آیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے گیت گائے بات وہیں ختم ہو جانی چاہئے۔ مگر جن مومنوں کی بات ہو رہی ہے جن کی یادیں ہمیشہ خدا سے وابستہ رہتی ہیں جو رات اور دن کو اللہ کی محبت میں اٹھنے والے لوگ ہیں ان کا ذہن صرف ان نظاروں میں نہیں اٹکا رہتا جو وہ دیکھتے ہیں بلکہ لازماً اپنی طرف مائل ہوتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ یہ جو سامنے کے مناظر ہیں یہ کائنات جو ہمیں دکھائی دیتی ہے ہم تو اس سے بہت ہی زیادہ ناقابل بیان حد تک عظیم شاہکار ہیں خدا تعالیٰ کی قدرت کا۔

اگر یہ زمین و آسمان اسی طرح رہ جاتے تو کون تھا جو خدا کے اس حسن کو اور خدا کی اس صنعت کو دیکھتا، پہچانتا اور اس کی وسعتوں اور عظمتوں میں ڈوب سکتا۔ انسان ہی ہے جو آخری شاہکار ہے۔ انسان کی ذات میں یہ کائنات زندہ ہوگئی ہے۔ یہ مٹی، یہ درخت، یہ گھاس، یہ نہ سوچنے والی

چیزیں اچانک حیرت انگیز طریق پر سوچنے لگی ہیں۔ پس قرآن کا یہ جو طرز کلام جس طرح اچانک رخ پھیرا گیا ہے وہ خود صناعی کا ایک حسن پیش کرتا ہے۔ اگر آپ اس مضمون کو نہ سمجھیں تو یہ دو باتیں بے معنی سی ہوں گی۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کیوں پھر آگ کے عذاب سے بچائے۔ اگر کائنات خوبصورت ہے تو اس کا تمہاری آگ سے کیا تعلق؟ تمہاری آگ سے یہ تعلق ہے کہ تم بھی خوبصورت ہو اور کائنات سے بہت زیادہ خوبصورت ہو، ساری کائنات کا خلاصہ ہو۔

انسان کی صناعی میں جو کچھ خلقت کی، تخلیق کی صنعتیں رکھ دی گئی ہیں باہر کی کائنات کا ان کے ساتھ کوئی بھی مقابلہ نہیں اور سب سے بڑی چیز سوچ، یہ مردہ کائنات اچانک جاگ اٹھی اور آپ کی صورت میں جاگی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، آپ سن رہے ہیں، آپ محسوس کر رہے ہیں، آپ کا تصور وہاں تک جا پہنچا ہے جہاں تک اس کائنات کا وجود کسی صورت میں بھی آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔ زمین اپنی ساری عظمتوں کے ساتھ اگر اس میں انسان نہ ہوتا تو اپنے تصور کو دوسرے سیاروں تک نہیں پہنچا سکتی تھی، سورج تک بھی نہیں پہنچا سکتی تھی جس سورج سے وہ زندگی پا رہی ہے۔ اگر آپ انسانی سوچ اور فکر کی صلاحیتوں سے الگ کر کے اس زمین اور اس خوبصورت کائنات کو دیکھیں تو انسان کو نکالتے ہی یہ کائنات آپ کو عدم میں ڈوبتی ہوئی دکھائی دے گی، کچھ بھی زمین کا باقی نہیں رہے گا، نہ ناروے ہوگا، نہ صحرائے عرب ہوگا، نہ دوسرے ممالک، نہ سمندر، نہ خشکیاں، کوئی بھی خدا تعالیٰ کی صنعتوں کا حسن اپنی ذات میں حسن کہلانے کا مستحق تو رہے گا مگر اسے حسن کہنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ جب دیکھنے کی آنکھ نہ ہو تو چیزیں عدم ہو جایا کرتی ہیں اسی لئے فلسفیوں نے اس پر ہمیشہ سے بحثیں اٹھائی ہیں۔ کئی فلسفی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات تو ہماری سوچ کے نتیجے میں ہے۔ اگر ہم اپنی سوچ کو سمیٹنا شروع کریں اور ہر چیز جو ہمیں دکھائی دیتی ہے، جو سنائی دیتی ہے، جو محسوس ہوتی ہے، جو ہمیں سردی یا گرمی پہنچاتی ہے اس سے اپنے سوچ کے تعلق کاٹ لیں تو ہم تو ہوں گے مگر یہ کائنات نہیں رہے گی۔ پس سوچنے والا ہے اور غور کرنے والا ہے جس کے متعلق بعض فلسفی کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے وہی ہے ورنہ اس کے بغیر کوئی کائنات کا وجود نہیں۔ بعض کہتے ہیں کائنات کا وجود ایک بیرونی وجود ہے، سوچ کے ساتھ اس کا تعلق بس اتنا ہی ہے کہ اتفاق سے تم پیدا ہو گئے اور تم دیکھ رہے ہو ورنہ تم نہ بھی ہوتے تو کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کے متعلق میں نے پہلے بھی کسی وقت قرآن کریم کا وہ

حل آپ کے سامنے رکھا تھا جو اس مسئلے کو حل کرتا ہے جس تک فلسفیوں کی نظر نہیں گئی۔ عالم اس ساری کائنات کو کہا گیا ہے اور عالم کی جگہ عالمین استعمال ہوا ہے یعنی مختلف وقتوں میں، مختلف صورتوں میں، مختلف دائروں میں یہ کائنات بٹی ہوئی ہے اس لئے عالمین ہے اور عالم کا مطلب ہے وہ چیز جس کا علم ہو۔ اب دیکھیں قرآن کریم نے سورہ فاتحہ کی پہلی آیت میں بِسْمِ اللّٰهِ کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ فرمایا کہ اللہ کی حمد کے گیت گاؤ سب حمد اسی کے لئے ہے جو تمام عالمین کا رب ہے۔ اب اس پہلو سے جب آپ غور کریں تو پتا چلے گا کہ سارے انسان، سارے سوچنے والے وجود کلیۃً مٹ جائیں تو عالمین اس لئے نہیں مٹیں گے کہ اللہ ہی ہے جو سب کو جانتا ہے اور ان کو معلوم کے دائرے سے آپ کبھی نکال ہی نہیں سکتے۔ اس لئے اس فلسفے کا جو الجھنیں پیدا کرنے والا فلسفہ ہے جس میں ڈوب کر جس کو حل کرنے کی کوشش میں آج تک کوئی فلسفی کامیاب نہیں ہوسکا، یورپ نے بھی بڑا زور مارا، بڑے بڑے اعلیٰ دماغ یہاں پیدا ہوئے کچھ اس طرف ہٹ گئے کچھ اس طرف ہٹ گئے مگر مسئلہ سمجھ نہیں آیا کہ واقعۃً اس میں سچائی تو ہے کہ اگر سوچ نہ ہو تو یہ کائنات کیا ہے کچھ بھی نہیں گویا مٹ گئی گویا اس کائنات کا وجود ہماری سوچ کے ظاہر ہونے سے پیدا ہوا اور جب ہم سوچتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ درست نہیں۔ ہم نہ بھی ہوتے تو کائنات رہتی لیکن کیسے پتا چلتا کہ کائنات ہے۔ اس بحث میں ہزاروں سال سے لوگ الجھے ہوئے ہیں لیکن حل نہیں کر سکے۔

قرآن کریم کی سورہ فاتحہ کی پہلی آیت نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔ فرمایا تم اپنے زاویہ ءِ نگاہ سے سوچتے ہو، تم سمجھتے ہو تم ہی ہو جس کی سوچ کے نتیجہ میں ایک بیرونی چیز دکھائی دے رہی ہے اور اس کے وجود کو ثبات ملا ہے لیکن تمہاری سوچ جاتی کہاں ہے، کہاں تک جاسکتی ہے؟ زمین کی جو پنہائیاں ہیں ان تک بھی تمہاری سوچ نہیں پہنچتی۔ تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس زمین کے اندر گہرائی تک کیا کچھ ہے اور بعد اس کے کہ سائنس دان ہمیشہ ترقی کرتے چلے جارہے ہیں اور اپنی جستجو کو آگے بڑھا رہے ہیں جیسا Mr. David Attenborough کا میں نے ذکر کیا وہ جگہیں جو زندگی سے خالی دکھائی دیتی تھیں ان کو جب کھولا، کھودا اور ٹٹولا تو وہاں زندگی کا ایک جہان دکھائی دیا مگر یہ بھی صرف ایک سطحی علم ہے۔ جو اس کے پس منظر ہے، اس کے پیچھے ہے ان کی خوراک کا نظام، کیسے ان کو عقل عطا کی گئی، کیسے ہر جانور کو اپنی مرضی اپنے مقصد کے رستے بتائے گئے کہ تم ان پر چلو تو تمہاری بقا کے

سارے سامان یہاں موجود ہیں۔ کون سی ذات ہے جس نے ان کو سمجھایا اور کیسے ان کے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں بلکہ ایسے جانوروں میں بھی جن کا دماغ ابھی پیدا نہیں ہوا ان کے مقصد کی باتیں اس طرح لکھ دی گئیں جیسے کمپیوٹر کسی چیز کو لکھ دیتا اور صرف پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں۔ مگر اس کمپیوٹر کے لئے کوئی جگہ ہونی چاہئے جہاں وہ لکھا جائے۔ یہ جو کمپیوٹر خدا تعالیٰ نے بنایا ہے وہ دماغ سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا کے سارے ماہرین حیاتیات جو ہیں کہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ ان گنت تعداد ایسے کیڑے مکوڑوں بلکہ اس سے پہلے کی حالتوں کی ہے جب وہ کیڑے مکوڑے کہلانے کے مستحق نہیں ہیں، جن کے اندر دماغ کا کوئی وجود نہیں اور احساس کے کوئی ریشے نہیں ہیں، پھر بھی ان سب کو پتا ہے کہ ہم نے کہاں جانا ہے، کیا کرنا ہے، کیا کھانا ہے، کہاں سے کھانا، کہاں ہماری زندگی محفوظ ہے، کہاں ہماری زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ مزید سوچنا چھوڑ دیتے ہیں، تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کیا ہے مگر یہ علم ہے کہ ہو یہی رہا ہے۔

تو جس انسان کی سوچ اتنی محدود ہے کہ ایک کیڑے کی جو احساس کی طاقت ہے اس کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ نہیں جانتا کہ وہ کیسے کام کر رہی ہے اس سے جو عالم جاگا ہے اس کی حیثیت بھی کیا ہے۔ ایک سرسری سا عالم جاگا ہے جو اصل عالم کے مقابل پر ایک پر پشہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک مچھر کے پر سے کم اس کی حیثیت ہے جو انسان کو ہے۔ پس کتنی سی کائنات اس نے جگا دی ہے۔ اکثر کائنات اسی طرح پڑی ہے جو اس کے لئے علم سے باہر ہے اور پھر فلسفیوں کا یہ کہنا کہ ہمارے وجود سے کائنات ہے ہم سوچیں تو یہ کائنات بنتی ہے، نہ سوچیں تو کچھ بھی نہ رہے اس کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ اصل سوچنے والا تو خالق ہے۔ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہی نہیں بلکہ ان کو پالنے والا ہے اور علم کی انتہا کے بغیر پالنا ممکن نہیں۔ جتنے بھی جاندار دنیا میں زندہ ہیں ان کو پالنے کے گہرے علم کی ضرورت ہے کہ ان کو کس چیز کی ضرورت ہے، کتنی ضرورت ہے، کیا ان کو خدا ہوشیاریاں عطا کرے تو بعض ماحولوں میں زندہ رہ سکتے ہیں اور کیا نہ کرے تو وہ چل نہیں سکتے۔

ایک ایسی جھیل پر جہاں ہم نے مچھلیوں کی بہت تلاش کی اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا میں نے بچوں کو وہ Seagulls دکھائیں جو اُڑ رہی تھیں اور نیچے اترتی تھیں اور کچھ لے کے نکل جاتی تھیں۔ ناروے میں رہ کر کوئی انسان Seagulls پر بھی غور نہ کر سکے تو کتنی حیرت کی بات ہے۔ کھلے

پانیوں میں ان کی زندگی کی بناء رکھ دی گئی ہے اور وہ روز اس یقین کے ساتھ جاگتی ہیں کہ ایک رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے جو ساری کائنات کا رب ہے اور ہمارے پالنے کے لئے اس نے سامان کر رکھے ہیں۔ وہ بھوکی نہیں مر سکتیں ورنہ انسان سوچے کہ اوپر سے پانی میں دیکھے تو اس کی سطح کے Reflection کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے گا۔ کہاں یہ کہ وہ مچھلی پر جھپٹے اور ایسے نشانے کے ساتھ جھپٹے کہ مچھلی عین اس کے پنجے میں آئے اور اسے وہ لے کے اڑ جائے اور ہر روز اس توکل کے ساتھ ہر جانور جاگتا ہے کہ میرا رزق میرے خدا نے مہیا کر رکھا ہے اور رزق لینے کی اور پکڑنے کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اب کوّوں کو صلاحیت نہیں، چیلوں کو یہ صلاحیت نہیں، لاکھوں کروڑوں، اربوں جانور ہیں جن کو یہ صلاحیت نہیں کہ سمندر کے پانی یا جھیلوں کے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھ بھی سکیں اور پکڑ بھی سکیں۔

پس قرآن کریم فرماتا ہے۔ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (بنی اسرائیل :85) کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی ایک شاکلت پہ پیدا کیا ہے اور اس کی شاکلت، جس طرح اس کو ڈھالا ہے، جس شکل میں ڈھالا گیا ہے اس میں آپ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اگر کریں گے تو وہ چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہر چیز اپنی ذات میں کامل اور مکمل ہے۔ پس دیکھو اس Seagull کو کہ کس طرح خدا تعالیٰ کے توکل پر اٹھتی اور توکل پر سوتی ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ نے اس کے توکّل کو ناکام نہیں کیا، نامراد نہیں کیا۔

اس مضمون کی طرف انسان کی توجہ پھیرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دیکھو کتنے ہی ایسے جاندار ہیں جن کا رزق تم پر نہیں ہے اللہ پر ہے۔ اللہ نے اس کے **مستقر** بھی اس کو بتادیئے ہیں اور **مستودع** بھی بتادیئے ہیں۔ اللہ نے اسے سمجھا دیا ہے کہ کن علاقوں میں اس نے لوٹ لوٹ کر آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بتادیا ہے کہ کن جگہوں پر عارضی ٹھکانے کرنے ہیں۔ پس وہ بے شمار جانور جو گرمیوں میں یہاں دکھائی دیتے ہیں اور سردیوں میں غائب ہو جاتے ہیں کبھی غور تو کریں کہ یہ آیات کریمہ آپ کو کیا سمجھا رہی ہے۔ ہر ایک کا ایک **مستودع** ہے، ایک **مستقر** ہے اور اسے پتا ہے کہ کتنی دیر میں کہاں ٹھہروں اور کس وقت میں وہاں سے روانہ ہو جاؤں۔

تو یہ وہ مضمون ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا جو انسان جتنا غور کرتا چلا جاتا ہے اس کی طبیعت اپنی طرف لازماً مائل ہونی چاہئے اور جن اولوالالباب کا ذکر کیا ہے ان کی طرف ضرور

مائل ہوتی ہے۔اچانک انسان ایک اور احساس کی دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ میں عالم کیا ہوں اصل عالم تو وہ ہے جو ساری کائنات پر اپنے علم کے ذریعے اپنے غلبہ کو کامل کئے ہوئے ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (البقرہ:256) اس کے علم کی کرسی ساری کائنات پر مسلط ہے زمین پر بھی اور آسمان پر بھی اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے یہی آیت کرسی بتاتی ہے وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ان کا علم تو اتنا بھی نہیں ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّے پر احاطہ کر سکیں اتنی ہی توفیق ملتی ہے جتنی خدا اجازت دیتا ہے اس سے زیادہ اب ان کے علم کو آگے بڑھنے کی توفیق نہیں ملتی تو پھر ہم کیسے عالم اور اس عالم کی بناء ہم پر کیسے ہوگئی۔

جہاں تک مادی عالم کا تعلق ہے اس کی بناء علم پر ہے اس بات پر تو مفکرین سارے متفق ہیں کہ اگر علم نہ ہو تو گویا جہان غائب ہو گیا مگر ہمارے نہ ہونے سے تو اس جہان کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔اگر غائب ہوگا تو معمولی سا ہوگا اور وہ وقت جو لامتناہی ہے جس کو ہم ازل بھی کہتے ہیں اور ابد بھی جس کا نہ ماضی میں کوئی کنارہ ہے نہ مستقبل میں،اس وقت میں ہماری سوچ کی کیا حیثیت ہے۔وہ تو ساری کائنات میں کسی جگہ ایک باریک سا نقطہ بھی ڈال دیں تو وہ کائنات اس نقطے کے مقابل پر زیادہ عظیم ہے جتنے ازل اور ابد ہمارے سوچ کے نقطہ سے عظیم تر ہیں کیونکہ ازل میں اور ابد میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر چیز کو سکیڑتی چلی جاتی ہے، سمیٹتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ چیز نظروں سے غائب ہو جاتی ہے تو عالم وہی ہے جو اللہ ہے۔

پس سورہ فاتحہ نے دیکھیں کیسا عظیم الشان علم و معرفت کا جہان ہمارے سامنے کھول دیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اس کے بعد اس سے بڑھ کر انکساری کا سبق انسان کو کیا مل سکتا ہے کہ عالمین تو خدا سے قائم ہے۔ان کا ذرّہ ذرّہ،ان کے باریک تر راز بھی اللہ پر روشن ہیں جو وہ بنانے والا ہے اور اس نے جو ہمیں بنادیا تو ہمارے اندر بھی ایک عالمین بنادیا ہے۔اس ساری کائنات کا خلاصہ انسان ہے اور اس خلاصہ کو وہ عظمت بخشی جس کے مقابل پر ساری کائنات کی کوئی حیثیت نہیں رکھی۔آنحضرت ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **لولاک لما خلقت الافلاک** (موضوعات کبری حرف لام روح المعانی جلد اول صفحہ: 70) یہ افلاک تو تیرے بنانے کے لئے سیڑھی تھے،ایک ذریعہ تھے۔اگر تجھے نہ بنانا ہوتا تو اس کائنات کو آغاز ہی سے پیدا نہ کیا جاتا۔کوئی ضرورت

نہیں تھی کیونکہ وہ سوچ جو زمانے اور Space، زمان و مکان میں پھیلتی ہے اس سوچ کو زمان و مکان میں پھیلنے کے باوجود زندگی نہیں ملتی ۔ یہ اور نکتہ ہے جو آپ کو ضرور یاد رکھنا چاہئے۔

بڑے سے بڑا سائنس دان، بڑے سے بڑا فلسفی جو زمان و مکان کے مسائل کو حل کرتا ہے محض اپنی حکمتوں سے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر وہ خالق تک نہ پہنچ سکے تو عالم تک جو پہنچا ہے وہ تو ایک معمولی سی بات ہے ۔اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ان کائنات کے رازوں اور ان کی وسعتوں کے مقابل پر جو خدا تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں۔ ہاں اگر عالم تک پہنچ جائے **العالم** یعنی خدا تعالیٰ تک، اگر خالق تک پہنچ جائے تو گویا تمام عالمین تک پہنچ گیا گویا تمام عالمین کو اس نے فتح کرلیا۔ یہ وہ مقام محمدی ہے جس کو قرآن کریم نے کئی پہلوؤں سے پیش فرمایا ہے ﷺ۔ آپؐ اس مرتبہ تک پہنچے جہاں خدا تعالیٰ اپنی ایسی صفات کے ساتھ آپؐ کو دکھائی دینے لگا کہ اس سے پہلے کبھی کسی آنکھ نے اس صفائی اور اس لطافت کے ساتھ اپنے خدا کی صفات کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ ان صفات حسنہ کا مظہر بنے تو آپؐ کا دل عرش عظیم کہلایا اور یہ جو سفر ہے یہ سوچوں کا وہ سفر ہے جس کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت آپ کو انگلی پکڑ کر لے جا رہی ہے۔

پہلے کائنات پر غور کریں مگر اللہ کی محبت کے ساتھ ۔اس کے بغیر یہ سارا غور بے کار ہو جائے گا۔ اللہ کا پیار دل میں ہو تو جتنا جتنا کائنات کے رازوں پر آپ کو دسترس ہو گی اتنا ہی خدا تعالیٰ کی محبت آپ کے دل پر غالب آتی چلی جائے گی ۔ یہ سوچوں کا سفر بالآخر وہاں تک پہنچاتا ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقام ہے۔ چنانچہ اس کے معاً بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا یعنی مومن کے دل سے پھر یہ آواز اٹھتی ہے۔ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ یہ ایک حیرت انگیز ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہوا مضمون ہے۔ اس کی ترتیب پر غور کئے بغیر آپ اس کو سمجھ نہیں سکتے ۔ بصارت کے سوا انسان کو شنوائی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر بصیرت ہے اور بصارت ہے تو پھر وہ سننے کی آواز آپ سنیں گے اور اس کا جواب دیں گے ۔ ورنہ ایک اندھا حقیقت میں جو خدا تعالیٰ کی کائنات کے رازوں کا نظارہ نہیں کر سکتا اس کو وہ آواز سمجھ نہیں آئے گی کہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ اس کو کہا جائے کہ دیکھو خدا نے نور پیدا کیا، خدا نے رنگ پیدا کیا، خدا نے توازن پیدا کیا وہ کہے گا مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ آپ اسے کہیں کہ خدا نے اتنی وسیع کائنات پیدا کی۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے تو اپنے جسم کے باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ قدم رکھتا ہوں تو پتا کوئی

نہیں کہ گڑھے میں جاؤں گا یا کسی مضبوط زمین پر قدم رکھوں گا تو مجھے کیا اس سے۔

پس سَمِعْنَا کا مقام دیکھنے کے بعد آتا ہے، بصیرت اور بصارت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔تو خدا تعالیٰ نے پہلے دیکھنے کا سفر شروع کیا ہے۔وہ دیکھتے ہیں، غور کرتے ہیں، وہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں وہ نئے نتائج نکالتے ہیں۔اس وقت وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی آواز سنائی دے۔اس وقت وہ سنتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ ہاں یہ درست ہے۔رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ بے اختیار ان کے دل سے آواز اٹھتی ہے اے ہمارے رب ہم نے سن لیا جب ایک منادی کرنے والے یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے منادی کی لِلْاِيْمَانِ ایمان کی طرف بلایا اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا جب تک پہلے ربوبیت سے واقفیت نہ ہوئی ہو، ایمان بالغیب یہاں کام نہیں آتا۔یہ مضمون ایک الگ اور وسیع اور گہرا مضمون ہے کہ ایمان بالغیب کا کیا مطلب ہے مگر یہاں اس موقع پر جو پچھلا مضمون ہے اس سے تعلق باندھا گیا ہے جہاں یہ عرض کیا تھا بندے نے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے یہاں تک پہنچایا گیا ہے کہ ہم نے اب ایک منادی کرنے والے کو سنا۔پہلے تو ہمارا تصور محض سوچوں کی راہ سے خدا تک پہنچ رہا تھا، امکانات کی دنیا میں تھا، حقائق کی دنیا تک ابھی اس نے قدم نہیں رکھا تھا۔مگر ایک حقائق کی دنیا والے نے آواز دی جو اپنے رب کے وطن سے آیا ہوا تھا یعنی رب کے وطن سے مراد ہے وہ رب جو اپنے مومنوں کی سوچوں میں بستا ہے اور جب اس تک رسائی ہو جائے تو گویا وہ خدا کا وطن بن جاتا ہے۔پس خدا کا وطن اس پہلو سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا وہ وطن تھا جس میں خدا اتر آیا تھا۔پس جس نے خدا کا وطن دیکھ لیا اور پھر خدا کو دیکھنے کے بعد اترا ہو اور پھر آواز دے رہا ہو اس وقت ایمان میں ایک اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔پس اپنے دیکھنے کے نتیجہ میں رب رب کہتے ہوئے بھی یہ عرض کرتے ہوئے کہ اے خدا ہم تجھے پہچان گئے ہیں ہمیں آگ میں نہ ڈالنا، ہم کوشش کریں گے ہم ٹھیک ہو جائیں۔مگر یہ جو اقرار ہے یہ اصل اقرار اس وقت پیدا ہوا جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ منادی سنی ہے کہ اے سوچوں کی وادیوں میں بسنے والو! تمہیں ابھی بھی پتا نہیں کہ رب کون ہے۔وہ رب مجھ سے پوچھو، میرے ذریعے دیکھو اور میری زبان سے سنو کہ وہ رب کیا ہے۔یہ آواز جب سنی تو انہوں نے کہا

اٰمَنَّا اے خدا! ہم ایمان لے آئے۔

تو اب دیکھیں پہلا ایمان جو کتنا مضبوط اور شاندار دکھائی دے رہا تھا عام دنیا داروں سے کتنا ممتاز کر رہا تھا ان لوگوں کو جو خدا کی یاد میں کائنات پر غور کرتے ہوئے سوچوں کے سفر اختیار کرتے ہیں، لگتا تھا بس یہی منزل ہے اس کے بعد کوئی منزل نہیں لیکن پھر ایک وصل کی منزل آئی ہے جو اندر کی راہ دکھانے والی ہے جو بتاتی ہے کہ میں ہو آیا ہوں وہاں سے جس طرف تم جا رہے ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ جھوٹ ہے اور یہ دستور آنحضرت ﷺ کی اپنی زندگی کے ہر معاملے میں تھا۔ ایک دفعہ مدینہ میں رات کو شور پڑا اور خطرہ تھا کہ کسی طرف سے کوئی شرارت پیدا ہو رہی ہے لوگوں نے جلد سے جلد اپنی گھوڑیوں پر کاٹھیاں کسیں اور ان کو زینیں پہنائیں اور جب وہ روانہ ہوئے دیکھنے کے لئے وہ کون سی جگہ تھی۔ تو محمد رسول اللہ ﷺ واپس آ رہے تھے۔ تو یہ رسول اللہ ﷺ کی واپسی کا سفر تھا آپ نے ان کو بتایا کہ میں دیکھ آیا ہوں فکر کی کوئی بات نہیں جو بھی خطرہ تھا وہ ٹل گیا ہے۔

پس خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ واپس آنے والا وجود ہے جو ان مومنوں کو ملتا ہے جو ابھی سفر میں، ابھی رستے میں ہیں اور جب وہ کہتا ہے کہ ہاں میں خدا کو دیکھ آیا ہوں۔ میں نے اپنے رب کا نظارہ کیا ہے تو پھر یہ کہتے ہیں اٰمَنَّا اے خدا! اب ہمیں پتا چلا ہے کہ ایمان ہوتا کیا ہے؟ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وہ آگ جس سے بچنے کی دعا مانگی گئی تھی وہ اب پوری ہوئی ہے۔ وہ محض ایک ایسی دعا نہیں تھی جو آپ نے مانگی اور یقین کر لیا کہ اب ہم بچ گئے۔ ہم نے آگ سے بچنے کی دعا مانگی ہے۔ اس کے پورا ہونے کی علامتیں نظر آنی چاہئیں اور وہ علامتیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پہچان ہے، آپ پر ایمان لانا ہے، آپ کے دعاوی پر ایمان لانا ہے۔ اس کے بعد خدا یہ دعا سکھاتا ہے رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا پھر مغفرت کا سفر شروع ہوتا ہے وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا اور ہم میں تو بہت سی کمزوریاں ہیں۔ کمزوریوں کو دور کئے بغیر ہم کیسے تیری عقوبت سے بچ سکیں گے۔ اس لئے اب پہلوں کی تو مغفرت فرما دے اور آئندہ اب تو ہی ہماری کمزوریاں دور کر کیونکہ ہمیں اپنی کوششوں سے تو کمزوریاں دور ہوتی دکھائی نہیں دیتیں۔ بارہا انسان کوشش کرتا ہے ہر دفعہ ناکام ہو جاتا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ پر جو ایمان لانا ہے اس کا تقاضا یہ ہے جس کا مطلب ہے کہ آنحضور ﷺ میں یہ باتیں تھیں جو اپنے پر ایمان لانے والوں کو سمجھائیں کہ جس خدا تک میں پہنچا ہوں، جہاں سے ہو کر میں آیا

ہوں وہ بڑی مغفرت والا خدا ہے اور بغیر گناہوں کی بخشش کے تمہیں اس کی لقاء نصیب نہیں ہوسکتی۔ تم اس لقاء سے محروم رہو گے اگر پہلے بخشش نہیں کراؤ گے۔ کتنے گہرے راز کی بات بتائی اور خدا سے متعارف ہونے والا انسان ہی ہے جو یہ راز بتا سکتا ہے۔ یہ سفر کی باریکیاں محض اس بات سے تو نہیں مل سکتیں کہ انسان نے سوچا، غور کیا، خدا کی قدرت کے نظارے دیکھے اور ان سے مرعوب ہوا، ان کے حسن سے وہ گھائل ہو گیا، خدا کی ہستی اور اس کے حسن کا قائل ہو گیا یہ ساری چیزیں سوچوں کی باتیں ہیں، بہت اچھی لگتی ہیں مگر معرفت کے راز نہیں ہیں۔ معرفت کا راز وہی ہے جو خدا نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہمیں سمجھایا کہ دیکھو میں مغفرت کرنے والا ہوں جو تمہاری زندگی گزر گئی ہے کوئی نہیں جانتا کہ ساری گزر گئی ہے یا کچھ باقی ہے۔ ایک بچہ بھی نہیں جانتا کہ میری کتنی زندگی باقی ہے، کتنی گزر گئی ہے اور زندگی کا ہر حصہ جو گزرا ہوا ہے وہ بہت سی کوتاہیوں کا شکار ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال میں جو کوتاہیاں ماں باپ سے ہو جاتی ہیں ان کا بھی نقصان بچوں کو پہنچ رہا ہوتا ہے۔ انسان اپنے فرائض منصبی سے جو کوتاہی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے جو دوسری طرف توجہ پھیرتا ہے یہ بھی اس کے دل پر زنگ لگانے والی چیزیں ہیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے ایک غسل کا طریق بتایا اور وہی طریق ہے جو صحابہؓ کی زبان سے جاری ہوا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اے اللہ ہمیں غسل کی توفیق بخش۔ سارے گناہوں کے داغ مٹ جائیں۔ وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا اور نہا دھو کر جب آپ بعد میں باہر نکلیں تب بھی آپ کے جسم کی وہ کمزوریاں، وہ بھیانک داغ جو جسم کا حصہ بن چکے ہیں وہ دھونے سے دور نہیں ہوا کرتے۔ وہ سَیّاتِ ہیں جو ہمیشہ آپ کو کمزوریوں میں پھر بھی مبتلا کر سکتی ہیں۔ ایک آدمی لنگڑا ہے، ایک آدمی کانا ہے ایک آدمی کو کوئی اور سوچ کی طاقت نہیں ہے یہ اس کی سَیّات ہیں۔ روحانی دنیا میں انہی کو سَیّاتِ کہا جائے گا۔ فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ سمجھایا کہ پھر یہ دعا کرنا یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ پیغام دیا، یہ دعا کرو۔ اے خدا! اب ہماری کمزوریاں دور فرما دے۔

اور آخری بات جو مانگی گئی ہے وہ میں آپ کو بتاتا ہوں اس کو مانگے بغیر نا روے کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ جب تک یہاں جماعت احمدیہ کا بوڑھا، بچہ، ہر مرد اور ہر عورت جب تک وہ زندگی حاصل نہ کر لیں جس زندگی کا ان آیات میں ذکر ہے اس وقت تک وہ زندگی کا کوئی پیغام نا روے کو نہیں دے سکتے۔ کوئی زندگی بخش رستہ اختیار نہیں کر سکتے جس سے اس مردہ ملک کو یا نیم مردہ

ملک کو زندہ کر دے۔ وہ یہ رستہ ہے۔ چنانچہ فرمایا آخری بات یہ اور کتنی گہری حکمت اور معرفت کی بات ہے کہ کمزوریاں دور کرنے کا سفر بھی تو وقت چاہتا ہے اور بعض انسان اتنی کمزوریوں میں مبتلا ہیں کہ ان کو وقت مل ہی نہیں سکتا اور عمر کے ایسے حصے میں ان کا احساس بیدار ہوا ہے جب کہ اکثر عمر کا وقت گزر گیا اور ضائع ہو گیا تو آخری دعا کیسی پتے کی، کیسی گہری دعا ہے جو سمجھا دی۔

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ اب ہمارا جو کچھ ہے تیرے سپرد ہو گیا۔ کمزوریاں دور کر اور کیسے دور کر اور کتنی رفتار سے دور کر یہ تیرا کام ہے۔ اب ہم نے تو عرض حال کر دی۔ ایک ہی التجاء ہے کہ مارنا نہیں جب تک کہ ہم تیرے حضور نیکوں میں نہ لکھے جائیں۔ یہ وہ درجہ کمال ہے جو مومن کے سفر کا ہے۔ جو اس طرح آغاز میں کائنات کی مردہ چیزوں پر غور کرنے سے شروع ہوتا ہے پھر زندگی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پھر اپنی طرف اور ایک نکتہ ہے جو یاد رکھنے کے لائق ہے۔ آغاز اللہ کی محبت سے کریں گے تو سفر کامیاب ہوگا لیکن وہ محبت جو بعد میں نصیب ہوگی وہ ابتدائی درجہ کی محبت کے مقابل پر بدر جہا بہتر ہوگی کیونکہ ابتدائی محبت تو بعض دفعہ دہریوں کو بھی ہو جاتی ہے یعنی ان کو خدا کے اوپر یقین نہیں پھر بھی دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ہو۔ کافروں کو بھی نصیب ہو جاتی ہے ہر مذہب والوں کے دل میں، ہر شریف آدمی کے دل میں خدا تعالیٰ نے اپنی محبت کا نمک چھڑکا ضرور ہے لیکن وہ کام نہیں آتی جب تک آنحضرت ﷺ سے محبت کے گر نہ سیکھیں جائیں اور آپ ہی کے حضور التجا نہ کی جائے کہ ہمیں اپنے غلاموں میں شامل کر لیں۔ پھر آپ کے سکھائے ہوئے رنگ اختیار کر کے جس طرح حضور نے فرمایا یعنی خدا نے آپ کو سمجھایا اور آپ نے ہمیں سمجھایا اس طرح اگر آپ سفر شروع کریں اللہ کی طرف تو اس کا انجام لازماً نیک ہوگا اور ایسے لوگوں میں تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت خدا کی طرف سے ملا کرتی ہے آپ کے اندر انقلاب برپا کرنے کی ایسی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ ناممکن ہوگا دنیا کی کسی قوم کے لئے کہ وہ آپ کی راہ میں کوئی دیوار کھڑی کر سکے ہر روک کو آپ عبور کر جائیں گے اور دلوں کی فتح آپ کے نام لکھی جائے گی۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ خدا کرے کہ جلد جلد ہم ناروے کے حالات کو بدلتا ہوا دیکھیں۔ وہ آرزو جو دیر سے، مدتوں سے میرے دل میں چٹکیاں بھرتی ہے کاش ہم یہاں Norwegian قوم کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا دیکھیں۔ خدا کرے کہ اس آرزو کے پورا ہونے کے دن قریب تر آجائیں۔ آمین

تربیت کے مضمون اور اصلاح نفس کا سب سے زیادہ تعلق قَوْلًا سَدِيدًا سے ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ یکم نومبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧١﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧٢﴾ (الاحزاب: 71، 72)

پھر فرمایا:

یہ دو آیات ہیں جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان سے متعلق میں تفصیلی گفتگو سے پہلے اپنے دورے کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں اور دراصل اسی تعلق میں ان آیات کی طرف ذہن پھرا ہے میں ابھی ناروے کے دورے سے واپس آیا ہوں اور رستے میں ایک دن سویڈن بھی ٹھہرنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ سب جگہ میں نے جماعت میں ایک نئی بیداری کی روح دیکھی ہے، ایک نیا ولولہ دیکھا ہے اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ MTA نے اس میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے یعنی مسلم ٹیلی ویژن احمدیہ نے تربیت کے تعلق میں بہت ہی بھاری ایک کام کر دکھایا ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے اب نوجوانوں، لڑکوں، لڑکیوں، مردوں اور عورتوں کے اندر سے وہ صداقت کی طرح پھوٹ رہا ہے لیکن ابھی بہت سے کام ہونے والے ہیں اور ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

میں مختصراً بتاتا ہوں کہ ان ممالک میں خصوصاً جن کو سیکنڈے نیوین Countries کہا جاتا ہے ان میں دہریت باقی یورپ کے مقابل پر بہت زیادہ ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ جنوب سے شمال تک یورپ کا سفر کریں تو جوں جوں شمال کی طرف بڑھتے ہیں دہریت کا عنصر بڑھتا چلا جاتا ہے ہاں بیچ میں ایک ایسا جزیرہ ہے جو دہریت میں سب کو پیچھے چھوڑ گیا ہے وہ سوئٹزرلینڈ ہے اور اکثر لوگوں کو علم نہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں تمام یورپ کے ممالک سے زیادہ دہریت پائی جاتی ہے اور جہاں دہریت پائی جائے وہاں ایک تضاد بھی دکھائی دے گا۔ یورپ کے اندر شمال اور جنوب میں ایک تضاد ہے۔ جنوب میں مذہب کا رجحان زیادہ ہے مگر ایسے مذہب کا رجحان جس نے دہریت پیدا کی یعنی جہالت کے ساتھ ایسے عقائد سے چمٹ رہنا جن کو انسانی ضمیر قبول نہیں کرتا۔ انسان کی عقل، اس کا فہم اس کو رد کرتے ہیں۔ یہ وہ عقائد ہیں جن کو آپ آج کل کی اصطلاح میں Fundamentalist عقائد کہتے ہیں یعنی بنیاد پرست۔ ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ عقیدہ ذہن اور دل کو مطمئن کرتا ہے کہ نہیں وہ اس کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں بس یہی ہمارا عقیدہ ہے اور چونکہ ایسے عقیدے سے چمٹنے کے لئے عقل کو خیر باد کہنا پڑتا ہے اس لئے اکثر یہ لوگ انتہا پسند ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ جو انتہا پسند نہ ہوں جن کا مزاج معتدل ہو، جن کا ذہن روشن ہو ان کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو وہ جو اس کو برداشت کرتے ہیں کہتے ہیں ہمیں کیا ضرورت ہے اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی۔ ایک وہ جو پیچھے ہٹ کر کھلم کھلا دہریت کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ تو جونہی ہم جنوب سے شمال کی طرف جاتے ہیں اگرچہ دہریت بڑھتی ہے مگر عقل کی روشنی بھی ساتھ بڑھ رہی ہوتی ہے اور ضد اور تعصب مذہب کے معاملے میں، دنیا کی بات نہیں میں کر رہا، مذہب کے معاملے میں ضد نسبتاً کم ہوتا جاتا ہے۔

اور اٹلی اور سپین اور پرتگال میں جہاں عیسائیت زیادہ زور سے قائم ہے وہاں دو انتہائیں ہیں یا بالکل کٹر پکے دہریہ، ایسے جنہوں نے بسا اوقات حکومتوں پہ قبضے بھی کئے اور مذہب کے خلاف کھلم کھلا علم بغاوت بلند کیا اور وہ کٹر عیسائی جن کے نزدیک عقل اور سوچ اور فہم کی کوئی طاقت نہیں، کوئی قیمت نہیں مذہبی مسائل نہیں۔ مذہب الگ ہے اور عقل الگ ہے اور جب مذہب اور عقل میں آپس میں کوئی واسطہ نہ رہے تو اس کے نتیجہ میں تشدد پیدا ہونا لازمی ہے۔ پھر ایسے لوگوں کو مذہب کے نام پر جو بھی آپ عقیدہ بتائیں گے وہ اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار ہوں گے خواہ وہ دیکھتے ہوں کہ یہ

ظلم ہے خواہ وہ جانتے ہوں کہ یہ عقیدہ اور یہ عمل انسانی قدروں سے متصادم ہے،ٹکرا رہا ہے۔ جہاں ایک دفعہ عقل کو خیر باد کہہ دیا تو پھر باقی کیا رہے گا۔

پس یہی سلسلہ اسی طرح شمال کی طرف آگے بڑھتا ہے وہاں عقل اور فہم کو زیادہ اہمیت ہوتی چلی جارہی ہے اور مذہب جو ردّ ہورہا ہے وہ درحقیقت عیسائیت کی بگڑی ہوئی صورت ردّ ہوتی ہے اس لئے بہت ضروری ہے کہ ہم ایسے ممالک میں حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اصل مرض کو پہچان کر اس کے مطابق اس کا علاج کریں۔ یہ اس صورت حال میں،اب MTA کی طرف واپس آتا ہوں کہ ہمارے بچے جو وہاں پل رہے تھے،نوجوان جو کالجوں اور سکولوں میں جاتے تھے ان کے سامنے ایک عجیب تضاد کی صورت تھی،ایک طرف عیسائی اپنے بگڑے ہوئے اور فرضی عقائد کی طرف بچوں کو سکول میں اپنی طرف بلاتے تھے اور یہ بھی ایک عجیب تضاد ہے ان ملکوں میں کہ عیسائیت کو اسلامی ممالک کے خلاف ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس پہلو سے دہریہ بھی ہوں تو وہ عیسائیت کے فروغ میں کوشش کرتے ہیں اور حکومتیں عیسائیت کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ بہت سے ایسے ان کے سربراہ یعنی سربراہ مراد ہے شعبوں کے سربراہ مجھے ملے،مختلف شعبوں کے ان کا خود کوئی عقیدہ نہیں تھا لیکن عیسائیت کو فروغ دینے میں پوری طرح وہ حکومت کی پالیسی کے ساتھ تھے۔

تو یہ تضادات کی دنیا ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں جہاں صداقتیں مجروح ہوگئی ہیں مختلف حصوں میں بٹ گئی ہیں اور اس کے نتیجہ میں ہماری وہ نسلیں جو ایسے ممالک میں پرورش پارہی ہیں ان کے لئے کئی قسم کے خطرات ہیں۔ایک ان کا یہ طریق تھا کہ عیسائیت کے وہ پہلو جو عقل کے بالکل خلاف ہیں ان سے گزرتے ہوئے جیسے بائی پاس سڑکیں بنائی جاتی ہیں،شہروں میں داخل ہوئے بغیر باہر باہر سے نکل جاؤ،ان تمام مقامات سے گریز کرتے ہوئے عیسائیت کو اس طرح پیش کرتے ہیں محبت ہے،عفو ہے اور اس سے بہتر حسن اور کیا ہوسکتا ہے عیسیٰؑ کی قربانی ہے اس نے سب کچھ اپنا بنی نوع انسان کے لئے خرچ کردیا۔تو یہ وہ مضامین ہیں جو فطرتاً ہر انسان کے اندر موجود ہیں اور ان کے ساتھ ایک فطری علاقہ اور ایک تعلق ہے اور جہاں تک عیسائیوں کے عقائد کی بھیانک نامعقولیت ہے اور تضادات ہیں ان کی طرف وہ نہیں آتے بلکہ اسلام کے اندر جو ان کو تضاد دکھائی دیتے ہیں ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جرمنی میں بھی میرا یہی تجربہ ہوا۔وہاں بھی بچوں سے اسلام کے خلاف ایسی

باتیں کرتے ہیں جوان کے ضمیر کے مطابق مناسب نہیں ہوتیں مثلاً عورتوں پر ظلم، سفاکی، خمینی ازم، ایک شخص نے اسلام کے خلاف کتاب لکھی کوئی اور ملک اپنے دائرہ سیاست سے باہر نکل کر باقی ملکوں کی سرحدیں پھلانگتا ہوا اس ملک میں پہنچتا ہے اور اپنا فتویٰ جاری کرتا ہے۔ یہ وہ ایسی باتیں ہیں جو سراسر خلاف عقل ہیں اور چونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والے ان باتوں میں ملوث ہو گئے ہیں اس لئے ان کو بہترین موقع مل گیا ہے اور وہ جب یہ حملہ کرتے ہیں تو ہمارے نوجوانوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ایک یہ ان کو خطرہ عقائد کی طرف سے ہے۔ ایک اعمال کی طرف سے یہ خطرہ کہ جہاں جہاں دہریت بڑھی ہے وہاں وہاں جنسی تعلقات میں جو بھی پابندیاں ہیں وہ اٹھتی چلی گئی ہیں یہاں تک کہ جنسی بے حیائی بالکل ایک عام، ایک مسلم چیز بن گئی جس کو اب بے حیائی سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اب وہ نوجوان جو اٹھتی ہوئی عمر میں ایسے ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں جن کو ایک طرف ان کے مذہب کے وہ بظاہر نقائص دکھائے جاتے ہیں جن نقائص کی تائید اس مذہب کے بڑے بڑے سربراہ، اس دنیا میں مسلمان حکومتوں کے سربراہ وہ پوری طرح اپنے عمل سے کرتے ہیں اور ان کے پاس کوئی جواب نہیں اس کا۔ ان کے اندر یہ تجزیہ کرنے کی توفیق نہیں کہ یہ مذہب کے داغ نہیں ہیں یہ انسانوں کے داغ ہیں جو مذہب کی طرف منسوب ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف جوانی کا الھڑ پن اور طبعی جذبات جو جوش میں ہوتے ہیں ان کے لئے ماحول سازگار، جو چاہیں کریں کوئی اخلاقی اعتراض نہیں اٹھ سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرنا ہوگا کہ گھر چھوڑ کر سوشل جوان کے سسٹم ہیں بچوں کی حفاظت کے نام پر ان کی پناہ لے کر اپنا دین بھی گنوائیں اپنی دنیا بھی گنوا دیں اور چونکہ یہ ایک کھلی راہ ہے اس لئے خودسری کا رجحان بچوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس رجحان کو مسلمانوں میں اور ایشیائیوں میں وہ عمداً تقویت دیتے ہیں۔

یہ وہ خطرات ہیں جو چند ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں جن کے پیش نظر ضرورت تھی کہ ہر بچے تک ان پہلوؤں سے اصل حقیقت حال کھولی جائے، اس مضمون کا تجزیہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ اس میں کیا غلطیاں ہیں، اصل حقیقت کیا ہے اور یہ چیز ہر گھر پہنچ کر اور ہر بچے تک پہنچ کر ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ جو دلوں کو مطمئن کرے بہت مشکل کام ہے۔ MTA کے ذریعے خدا تعالیٰ کے فضل سے جو ہمارے سوال و جواب کی بے تکلف مجالس ہیں، دہریہ بھی، کٹر عیسائی بھی، دوسرے شمال

جنوب کے آدمی سوال کرتے ہیں اور ان کی تصویر دکھائی جاتی ہے اور سوال کا جواب سنتے ہوئے ان کے سر تائید میں ہلنے لگتے ہیں۔تو ہماری نوجوان نسلوں کو ایک احمدی مربی کی باتیں اتنا مطمئن نہیں کرتیں جتنا یہ نظارہ کہ جو ہم پر اعتراض کیا کرتا تھا وہ تو خود اسلام کے حربے سے گھائل ہو رہا ہے، اسلام کی صداقت سے مرعوب ہو رہا ہے، دکھائی دے رہا ہے کہ وہ مان رہا ہے۔ یہ غیر معمولی طاقت ور ایک دلیل ہے جوان نوجوانوں کو مطمئن کرتی ہے اور اسی وجہ سے MTA کے ذریعہ خدا تعالیٰ کے فضل سے جو تبلیغی کام ہے اس کو ایک طرف بھی رکھ دیں تو تربیت کے کاموں میں غیر معمولی سہولت حاصل ہوئی ہے۔ناممکن تھا کہ ہر گھر میں کوئی مطمئن کرنے والا مربی پہنچ سکتا، پہنچتا بھی تو اس کے لئے مشکل تھا اور عملاً اگر آپ مربی کا نوجوانوں سے رابطہ دیکھیں جس کا میں نے تفصیلی جائزہ لیا ہے تو گنتی کے چند نوجوان ہیں جن تک مربی کی رسائی ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے آزاد دائروں میں گھومتے پھرتے ہیں اور عام طور پر مربی ان کے پاس نہیں پہنچتا وہ مربی کے قریب نہیں پھٹکتے لیکن جب گھروں میں ٹیلی ویژن پہنچ جائے اور ایک ایسی اس میں قوت پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے نوجوان بھی کبھی نہ کبھی اس کو دیکھنے پر مجبور ہو جائیں اور یہ قوت پیدا ہوئی ہے بچوں کی وجہ سے۔ بچے تو MTA کے عاشق ہو رہے ہیں، ہر جگہ دنیا میں سوائے امریکہ کے بعض علاقوں کے اور اس تعلق میں میں قول سدید کے فقدان کی بعض مثالیں آپ کے سامنے رکھوں گا۔اکثر ماں باپ،نوجوانوں نے یہ بتایا کہ ہمارے بچے تو ٹیلی ویژن پر خاص طور پر آپ کے پروگرام آتے ہیں اردو کلاس اور اس کو انہوں نے سوشل پروگرام بنایا ہوا ہے، اردو سمجھ آئے نہ آئے مزہ بہت اٹھاتے ہیں بچے اور دوسرے جو متفرق بچوں کے نغمے لڑکیوں کے،لڑکوں کے وہ ایسا کھینچے جاتے ہیں اس طرف کہ اس کے مقابل پر کوئی دوسرا پروگرام کسی کو دیکھنے ہی نہیں دیتے،شور ڈال دیتے ہیں کہ ہم نے یہی دیکھنا ہے۔تو دیکھو خدا تعالیٰ نے بچوں کے ذریعے بڑوں کی تربیت کا کیسا انتظام کروا دیا اور اکثر جب بڑے ایک دفعہ دیکھ لیں تو پھر وہ لازماً اور دیکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں پھر اور دیکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ایک تو یہ پہلو تھا جس پہلو سے خدا تعالیٰ کے فضل سے MTA کی بہت سی برکتیں میرے مشاہدے میں آئیں اور دل بہت مطمئن ہوا اور اس یقین سے مزید بھر گیا کیونکہ یقین ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے، سچائی پر یقین بڑھتا رہتا ہے ایک مقام نہیں جہاں ٹھہر جائے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی خاص تقدیر

سے جماعت احمدیہ عالمگیر کو ایسا انعام عطا فرمایا جس کے ساتھ اس کی زندگی وابستہ ہوگئی ہے۔ اگر MTA کے ذریعے ہم افریقہ کے جنگلوں تک نہ پہنچ سکتے، اگر MTA کے ذریعے چین اور جاپان تک نہ پہنچ سکتے، امریکہ کے مختلف گوشوں میں اور شمال اور جنوب تک نہ پہنچ سکتے تو کتنی بڑی نسلیں ہیں جو مرکز کے براہ راست دائرہ اثر سے باہر رہتیں۔ اگر چہ وہ ساری ابھی تک اس دائرے میں نہیں ہیں یہ کہنا مبالغہ ہوگا اور قول سدید کے خلاف ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ سب اب تربیت کے دائرے میں آگئے ہیں بالکل غلط ہے۔ ابھی بہت سفر ہم نے کرنے ہیں مگر اتنے احمدی لازماً ہر ملک میں MTA کی وجہ سے احمدیت کی محبت میں پہلے سے بہت بڑھ گئے ہیں کہ آگے وہ پھر علم بردار بن گئے ہیں۔ اب اس وجہ سے ان جماعتوں میں جہاں ہماری براہ راست رسائی نہیں تھی ایسے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں ایسے بوڑھے پیدا ہوگئے ہیں جو آگے پھر جماعت کی تربیت کی طرف توجہ کرتے ہیں، جو سیکھتے ہیں وہ آگے سکھاتے ہیں۔ پھر بہت سی تربیتی کلاسز ہیں جن میں MTA براہ راست ان کے لئے پروگرام مہیا کرتا ہے اور افریقہ کے جائزے سے پتا چلا ہے کہ بعض علاقے، بڑے وسیع علاقے جہاں بہت سے دیہات میں کوئی بھی احمدی مربی نہیں پہنچ سکا اور افریقہ کے حالات بہت مختلف ہیں وہاں نہ سڑکوں کا صحیح انتظام، نہ مواصلات کا پورا صحیح انتظام، پھر غربت کی وجہ سے دینے کے لئے پیسے بھی نہیں اور وہاں MTA بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو ان کے لئے میں نے پروگرام یہ بنایا کہ مختلف افریقن ممالک میں، مختلف خطوں میں علاقوں کو تقسیم کر کے ان کے درمیانی حصے میں MTA تمام لوازمات کے ساتھ مہیا کر دیا گیا اور جماعت کو یہ تاکید کی گئی کہ اپنی تربیتی کلاسز وہاں رکھیں تا کہ دور دور سے آنے والے وہاں پہنچیں اور وہ براہ راست اس کو دیکھیں اور ان کو ایک لگن پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ان تربیتی کلاسز کی جو رپورٹس پہنچتی یعنی تربیت کے لئے جو ہم مدارس سے بناتے ہیں، عارضی مدارس لگاتے ہیں ان کی رپورٹوں سے پتا چلا ہے کہ چالیس چالیس پچاس پچاس میل پیدل چل کے وہاں پہنچے ہیں۔ اگر وہ چالیس پچاس میل تک چل کے نہ آتے تو مربی کے لئے کہاں ممکن تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس چالیس چالیس میل پیدل چل کے پہنچے اور جب وہ شامل ہوئے اور دیکھا تو ان کی کایا پلٹ گئی۔ بعض علاقوں میں تو مربی نے مجھے رپورٹ دی ہے بعض یہاں پہنچے ہیں مل کر بتایا ہے کہ دور تک ایسا خلاء تھا کہ ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی یہاں بڑی نسلوں کو سنبھالیں گے کیسے۔ ایسے علاقوں میں جہاں

عیسائی علاقے تھے احمدیت نے آغاز میں بڑی فتوحات حاصل کیں، ان کی آگے نسلوں میں عیسائی پادریوں نے دوبارہ نفوذ کی کوششیں شروع کیں کیونکہ ان کے پاس پیسہ بے شمار ہے، ذرائع بہت ہیں، موٹر سائیکلیں، جیپیں، ہسپتالوں کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقتیں تو وہاں انہوں نے دوبارہ جس طرح کنارے سیلاب میں جھڑتے ہیں اس طرح ان زمینوں کو جھاڑنا، گرانا شروع کیا اور ایک دو ایسے معاملات ہوئے جن میں ایک مسلمان عیسائی ہوا جس کی وجہ سے آزادی مذہب تو اپنی جگہ لیکن تکلیف تو بہرحال ہوتی ہے تکلیف کا ردّعمل چاہے شریفانہ ہی ہو، مار پیٹ نہ ہو۔ مگر تکلیف یا تو اس کو ہوتی ہے جو محسوس کرتا ہے یا اگر وہ کم فہم ہو تو کسی اور کو پہنچاتا ہے، یہ فرق ہے مولوی اور غیر مولوی میں، پادری مولوی ہو یا غیر پادری مولوی ہو، میں سب کی مولویت کی بات کر رہا ہوں۔ مذہبی متعصبین کی صورت میں ان کے ہاں سے ایک آدمی اچک لے اگر کوئی دوسرا لے جائے تو وہ ان کو تکلیف سرسری ہوتی ہے، اصل میں وہ اس کے نتیجے میں تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مارکوٹ کے قتل و غارت کر کے اس کی جائیدادیں چھین کر، اس کو حقوق سے محروم کر کے اس سلسلہ کو روکا جائے لیکن جو خدا کا سچا بندہ ہو اسے بھی تکلیف پہنچتی ہے، تکلیف کے خلاف کوئی اعتراض نہیں مگر وہ ردّعمل یہ نہیں دکھاتا۔ خود گھلتا ہے دعاؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے ایسے ذرائع کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کو تمام دنیا میں انسان بحیثیت انسان درست سمجھتا ہے اور وہ ردّعمل جو ہے پھر وہ مقابل پر خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ان ضائع ہوئی ہوئی زمینوں کو واپس لے آتا ہے۔

پس اس پہلو سے جب توجہ کی گئی تو میں نے ان کو خاص طور پر کہا کہ ایسے لوگوں کو براہ راست مقابل پہ تبلیغ کرنے کی بجائے ان کو اپنے ساتھ لائیں، ملائیں جلائیں، احمدی ماحول میں لے کے آئیں اور ان پر چھوڑ دیں کہ وہ خود فیصلہ کریں۔ چنانچہ کل ہی رپورٹوں میں یہ رپورٹ ملی کہ بعض جو کسی زمانے میں بہت ہی بااثر احمدی تھے اور بااثر خاندانوں سے تعلق رکھنے والے وہ عیسائی تو نہیں ہوئے مگر عملاً پیچھے ہٹ گئے تھے، خاموش ہو گئے تھے، کہتے ہیں جب ان مجالس میں آئے جہاں MTA کے پروگرام دکھائے گئے جہاں خاص طور پر علماء نے ان کی خاطر بعض مقامی پروگرام بھی تیار کئے تو ان کی کایا پلٹ گئی۔ بعض ان میں سے یہ عہد کر کے واپس لوٹے ہیں کہ ہمارے علاقے میں جتنی زمینیں کھوئی گئی ہیں ہم نے ایک ایک چپہ واپس لینی ہیں اور اس پہ اضافہ کرنا ہے اب یہ ہم پر چھوڑ

دیں، ہم یہ خدا سے عہد کر کے واپس جارہے ہیں تو یہ برکت بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے MTA کی وجہ سے ہمیں نصیب ہوئی۔ دور دور جنگلوں میں بھی اس کو پھیلا دیا گیا ہے۔

تو یورپ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے جو نوجوان نسلوں کے سنبھالنے کا انتظام ہوا ہے اس میں MTA نے بہت گہرا کام دکھایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے تربیت میں یہ ایک بہت ہی مفید چیز ثابت ہوئی ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور بڑا فائدہ ان لوگوں میں یہ ہے کہ کثرت سے میں نے بچوں کو MTA کے کاموں میں مصروف دیکھا ہے۔ جس نے ایک نغمہ پڑھنا ہے وہ اس کی تیاری بھی کرتا ہے۔ وہ جو پہلے زیادہ مسجد میں نہیں آتا تھا وہ اب سٹوڈیو میں اپنا نغمہ تیار کرنے کی خاطر پہنچتا ہے اور پھر ساری خدمتیں، چونکہ ایک بھی پروفیشنل ہم نے ملازم نہیں رکھا ہوا، سب طوعی ہیں اس لئے کثرت کے ساتھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے دائرے میں ایک دوسرے سے ملے جلے بغیر تا کہ ایک دوسرے کی عزت کی اقدار کی حفاظت ہو سکے وہ اپنی اپنی ٹیموں میں کام کر رہے ہیں اور اتنا خوش ہیں کہ درخواستیں آتی تھیں ہر جگہ کہ ہمیں بھی شامل کیا جائے، ہمیں بھی شامل کیا جائے۔ ایک بھی درخواست یہ نہیں آئی کہ اتنا بوجھ ڈال دیا آپ نے، ہمیں واپس کر دیں۔

اور پھر اللہ کی شان یہ ہے کہ جو بھی MTA کے کاموں میں آگے ہیں تعلیم میں سب سے اچھے نتائج ان کے ہیں اور حیرت انگیز طور پر ایسے نتائج میرے سامنے رکھے گئے کہ نارویجیئن زبان میں سارے علاقے میں وہ پاکستان سے آئے ہوئے احمدی اول آگئے اور نارویجین بچے پیچھے رہ گئے۔ تو یہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انعامات کے سلسلے ہوتے ہیں یہ مربوط ہوتے ہیں، ان کے فوائد کسی ایک جہت میں نہیں ہوتے۔ صرف عالمی نہیں بلکہ اندرونی طور پر ان کے اندر بہت سی برکت کی شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں اور یہ زندگی کی علامت ہے۔ زندگی اور موت میں یہی فرق ہے۔ موت پھوٹتی نہیں ہے۔ اس کی شاخیں نہیں بنتیں۔ زندگی شاخیں بناتی ہے اور نشوونما پاتی ہے پھر اگر زہریلے درخت ہوں تو وہ بھی کرتے ہیں ایسا زور مارتے ہیں اور جو کلمہ طیبہ ہو اس کا شجر بھی خوب پھوٹتا ہے، پھولتا ہے، پھلتا ہے۔

تو جماعت کو اللہ تعالیٰ نے MTA کے ذریعے کثرت سے ایسے نوجوان عطا کر دیئے ہیں کہ MTA کی ایک پھولنے پھلنے والی سرسبز شاخ بن گئے ہیں اور ان کاموں میں ملوث ہونے کی وجہ

سے ان کی تربیت ہو رہی ہے ان کو باہر کی ہوش ہی کوئی نہیں رہی ۔اب بجائے اس کے کہ مائیں کہیں ہماری بچیو! تم کہاں جاتی ہو، کیوں بد اثر قبول کرتی ہو اپنی سہیلیوں سے، الٹا مائیں ان سے شکوہ کرتی ہیں کہ اپنے لئے بھی تو وقت رکھو تم نے سب کچھ ہی دین کو دے دیا ہے۔مگر جو سمجھ دار مائیں ہیں وہ شکوہ نہیں کرتیں، وہ مسکراتی ہیں، خوش ہوتی ہیں ۔تو یہ ایک بہت ہی وسیع فائدہ ہے جو ہمیں پہنچ رہا ہے۔اب میں اس مضمون کو واپس اس آیت کی طرف لے کے آتا ہوں جس کی میں نے تلاوت کی تھی۔

تربیت کے مضمون کا اور اصلاح نفس کا سب سے زیادہ تعلق قول سدید سے ہے اور قرآن کریم نے جہاں جھوٹ کے خلاف غیر معمولی قوت سے جہاد کیا ہے وہاں قول سدید کو جو خدا تعالیٰ نے غیر معمولی محبت اور پیار اور حیرت انگیز برکتوں کا موجب قرار دیتے ہوئے اس آیت میں بیان کیا ہے اس کی اور مثال کہیں اور دکھائی نہیں دیتی اور بہت گہرا نفسیاتی مسئلہ ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ یہاں جھوٹ اور سچ کا مقابلہ نہیں ہے، یہاں سچائی کی اعلیٰ قسموں کا بیان ہے ۔سچائی بھی پھوٹتی ہے اور اس سے لطیف تر سچائیاں پیدا ہوتی ہیں اور سب سے اعلیٰ سچائی کی قسم اور قول سدید ہے۔پس قول سدید اپنی جگہ ہر انسان کی اعلیٰ اقدار کا محافظ بن جاتا ہے۔پس MTA کا پیغام تو ایک بیرونی پیغام ہے جو دلوں تک پہنچتا بھی ہے اور تبدیلیاں بھی پیدا کرتا ہے مگر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ بعض دفعہ یہ تبدیلیاں نفس کو دھوکہ بھی دے دیتی ہیں۔مثلاً ایسے نوجوان جوان کاموں میں وقف ہیں انہی میں ایسے بھی ملیں گے جو نماز نہیں پڑھ رہے۔تو نیکی میں تو تضاد ہو نہیں سکتا۔ یہ ان کا فعل قول سدید کے خلاف ہے۔اگر دین کی محبت کی وجہ سے انہوں نے اپنے قیمتی وقتوں کو MTA پر یا اسی طرح کے دوسرے دینی کاموں پہ خرچ کیا تو دین کی محبت کا اوّل تقاضا تو یہ تھا کہ نماز پر قائم ہو جائیں۔

اور قول سدید سے مراد محض زبان کا قول نہیں ایک عمل کی تصویر ہے جو قول سدید کی اصطلاح میں بیان فرمائی گئی ہے ۔ایسے لوگ تضادات سے پاک ہوتے ہیں ان کے اندر بل نہیں ہوتے۔ بلوں میں چیز کو چھپایا جاتا ہے اور جب وہ کھل جائے، بل دور کر دیں تو اصل چیز پھر خوب کھل کر سامنے آتی ہے ۔تو انسانی فطرت میں جو بل دینا اپنی نیتوں کو، اپنے اعمال کو، یہ ایسے داخل ہے جیسے سانپ کی فطرت میں بل دے کر بیٹھنا ہے اور یہ قول سدید کے خلاف ہے۔ جو خدا تعالیٰ نے مثلاً بائبل میں واضح طور پر نفس کے ساتھ شیطان کو مشابہت دی ہے اور شیطان کا دوسرا نام سانپ رکھا ہے

اس میں بنیادی طور پر یہی مقصد پیش نظر ہے کہ دیکھو سانپ بل والا جانور ہے اور چھپ کر بل دے کر بیٹھتا ہے، اپنے جسم کو سکیڑ کر جب حملہ کرتا ہے تو جس پر حملہ ہوتا ہے اس کو پتا بھی نہیں لگتا کہ کہاں سے حملہ ہوا اور کیوں ہوا۔ اچانک ان بلوں میں لپٹی ہوئی چیز کی طرف سے ایک بڑا سخت حملہ ہوتا ہے اور پیشتر اس کے کہ انسان کو خبر ہو وہ ڈسا جاتا ہے اور زہر اپنا اثر دکھا دیتا ہے لیکن سانپ ہی کے اندر ایک اور بات بھی ہے جب یہ کھل کر حملہ کرتا ہے تو سیدھا ہو جاتا ہے اور کوئی بل نہیں رہتا پھر۔ تو بل دینا چھپانے کے مترادف ہے۔ بل فریب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے سانپ کو حملہ آور، وہ یوں لگتا تھا جیسے دم کے کنارے پر کھڑا ہو گیا ہے، حیرت ہوتی تھی دیکھ کر۔ ایک دفعہ غلطی سے ایک پتھر کے گرد لپٹے ہوئے بہت بڑے سانپ کو میں نے درخت کی جڑ سمجھ لیا اور جڑ سمجھ کے وہ چونکہ اچھی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی میں نے کہا اس کو کھینچتا ہوں اس کی سوٹی بنائیں گے اور جب ہاتھ ڈال کے کھینچا ہے تو سانپ کھڑا ہوا ہے اتنا اونچا کہ میرے قد سے دگنا تگنا اونچا تھا اور لگتا تھا بالکل دم کے کنارے پر کھڑا ہے۔ حیرت تھی کہ یہ نرم لوچ والا جسم اس طرح سیدھا کیسے ہو سکتا ہے مگر چونکہ کھل کر اس نے حملہ کرنا تھا، اس وقت اس کو بلوں کی ضرورت نہیں تھی جتنے کو برے حملہ کرتے ہیں وہ یوں کھڑے ہو جاتے ہیں اور کھڑے ہو کر سامنے سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ کمینے دشمن کو بھی جب آپ چھیڑیں، جب انہیں مجبور کریں کہ جو کچھ ہو ظاہر کرو تو پھر جب وہ کھل کر حملہ کرتے ہیں تو تب آپ بعض دفعہ حیران رہ جاتے ہیں کہ اس بدبخت میں اتنا زہر چھپا ہوا تھا۔ اس نے تو اپنے بلوں میں ہمیں پتا نہیں لگنے دیا، نرم لوچ والا جسم، بل کھایا ہوا، دیکھنے میں خوبصورت، جو درخت کی جڑ تھی وہ تو زہریلا سانپ نکلا۔ تو انسانی فطرت میں جو بل دینے کا مضمون ہے یہ اس کی اصلاح کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اسی لئے شیطان کو انسان کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا۔ اس کے بلوں میں جو فریب کا پہلو ہے اس طرح حملہ کرتا ہے کہ دکھائی نہیں دیتا اور اگر اس کو کھولو گے تو پھر وہ کھل کر سامنے آئے گا پھر دوبدو لڑائی ہو گی پھر وہ دشمن اگر مارا گیا تو پھر ہمیشہ کے لئے مارا جائے گا۔

تو اپنے نفس کو اس شیطان کی طرح سمجھیں جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور وہ کیسے دوڑ رہا ہے قرآن فرماتا ہے تم اس کو دیکھ نہیں رہے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دیکھیں بالکل سانپ والی کیفیت جو چھپ کے بیٹھا ہوا ہے آپ اسے دیکھ بھی نہیں رہے

ہوتے اور وہ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ان جھاڑیوں کے بیچ میں سے اس کی چھوٹی سی آنکھ اس وقت آپ کو دکھائی نہیں دیتی لیکن کھلتا تب ہے جب حملہ کرنا ہو۔وہ ایک دم اپنے بل کو کھولتا ہے اور پھر آخری وار کر دیتا ہے۔تو اسی طرح نفس کا حال ہے۔وہ حملہ کرتا ہے اس وقت جب تک آپ کو دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔جب حملہ ہو جائے تو وہ حملہ آپ پر اثر انداز ہو جاتا ہے پھر اس کے چھپنے کی ضرورت نہیں۔اگر نفس کا حملہ آپ کو بے حیا بنا دے تو پھر اس کو چھپنے کی کیا ضرورت ہے پھر وہ بے حیائی کا سانپ کھل کے سامنے آجاتا ہے اور آپ اس کے ہم نوا ہو کر پھر آگے بڑھتے ہیں۔

قَوْلًا سَدِيْدًا کے اوپر قرآن کریم نے جو زور دیا ہے یہ ہمارے سب نیک کاموں پر حاوی ہے اور MTA بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔MTA ایک نیک کوشش ہے مگر اس کوشش میں حصہ لینے والے ہمیشہ اس معاملے میں خبر دار رہنے چاہئیں کہ ہم جو کوشش کرتے ہیں کیا واقعۃً اللہ کی خاطر ہے یا اس میں نفس کا دکھاوا آگیا ہے اور نفس کے دکھاوے کے MTA میں زیادہ امکانات ہیں بہ نسبت دوسری کوششوں کے۔کیونکہ ایک بچہ اپنی آواز کو MTA کے ذریعے ساری دنیا تک پہنچا دیتا ہے اور دکھائی بھی دے رہا ہوتا ہے اس لئے اتنا شوق پیدا ہو گیا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے بچے کی تصویر ہے اور یہ اس نے خط لکھا ہوا ہے آپ کے نام،اس تصویر کے ساتھ اس خط کو MTA پر پڑھ کے سنائیں۔اب اس میں نیکی کون سی ہے۔صرف جماعت کو جو اللہ تعالیٰ نے ایک عالمی مواصلات کا ایک عظیم الشان رعب عطا فرمایا ہے اور توفیق عطا فرمائی ہے اس سے غلط استفادے کے لئے ایک رجحان ہے یعنی اس کی نیت میں۔اس سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے گناہ شامل ہے مگر وہ سرزمین جہاں گناہ پلتے ہیں اسی سرزمین سے یہ خواہش اٹھی ہے۔کیا مطلب ہے؟ ساری دنیا میں جماعت اتنی قربانیاں دے رہی ہے اتنا پیسہ قربان کر رہی ہے وقت قربان کر رہی ہے کہ ایک عورت کا بچہ وہاں دکھا دیا جائے اور اس کا مقصد پورا ہو جائے۔ساری عورتوں کے بچے دکھا دیئے جائیں تو لوگ MTA دیکھنا ہی بند کر دیں گے کیونکہ ایسی تصویروں کی کثرت جن میں ذاتی کوئی دلچسپی نہ ہو وہ لوگوں کو متنفر کر دیتی ہے۔اب آپ سب لوگ لندن والے ''جنگ'' پڑھتے ہیں اکثر اور ایک صفحہ اوپر سے نیچے تک مولویوں کی تصویروں سے کالا سیاہ ہوا ہوتا ہے کبھی آپ نے ایک ایک کو دیکھا ہے غور سے؟ سرسری نظر ڈالتے ہیں اور آگے گزر جاتے ہیں تو آپ یہ پچاس مولویوں سے تو اتنا بیزار

ہو جاتے ہیں اگر پانچ ہزار یا پانچ لاکھ بچے MTA پر دکھائے جائیں تو چونکہ اس رجحان میں مولویت ہے کہ دکھاوا ہو، اتنے مولوی تو آپ برداشت کر ہی نہیں سکتے، MTA بند ہو جائے گی۔

تو MTA کے ساتھ جہاں فوائد ہیں وہاں نقصانات بھی ہیں اور نقصانات کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں دکھاوا پیدا ہو جاتا ہے اور جہاں دکھاوا دین کے بنیادی فرائض پر اثر انداز ہو جائے وہاں شرک ہو جاتا ہے۔ پس MTA کی ٹیمیں اگر کام کر رہی ہیں، عصر کی اذان ہوئی ہے یا ظہر کی جو بھی نماز ہو اور مسجد میں ایک طرف بیٹھے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں جی ہم دین کا کام کر رہے ہیں اس لئے کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی یہ تو سراسر شرک ہے اور نفس کا بہت بڑا دھوکہ ہے کہ دین کا کام کس لئے کر رہے ہو۔ اس لئے کہ عبادت قائم کرو اور جو دین کا کام عبادت کی راہ میں حائل ہو اس کو دین کا کام کہہ کیسے سکتے ہو۔ صرف جھوٹ ہے اور نفس کا دھوکہ ہے۔ وہی بل فریب ہے نیتوں کا جو پتا نہیں لگنے دیتا کہ کیا اصل بات ہے۔

تو قرآن کریم نے نہ صرف سچ پر زور دیا بلکہ قَوْلًا سَدِيْدًا پر زور دیا ہے اور یہاں لفظ سَدِيْدًا خاص معنے رکھتا ہے۔ جیسے میں نے بیان کیا جب ایک دشمن بھی کھلے تو سیدھا ہونا پڑتا ہے اس کو، فریبوں کا دور بلوں کا دور ہے اور جب سَدِيْدًا ہو جائے تو پھر دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی جماعت تو قول سدید کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ محض تمہارا یہ سمجھ لینا کہ تم سچ بولتے ہو اور کھلم کھلا جھوٹ نہیں بولتے یہ تمہارے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ تمہاری اصلاح کے تقاضے بہت بلند ہیں۔ اگر محمد رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چلنا ہے اور ان سے فیض پانا ہے تو قول سدید کو لازماً ایک دائمی عادت کے طور پر اپنانا ہوگا اور قول سدید والا اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ میری بات سے کسی کو دھوکہ تو نہیں ہو گیا۔ ایک بات بیان کر رہا ہے اس سے خواہ مخواہ اس کی نیکی کا رعب پڑ گیا اور اس کا مقصد یہ نہیں تھا۔ جو قول سدید نہیں کرتا وہ خوش ہوگا کہ چلو الحمد للہ ساتھ یہ بھی مسئلہ طے ہوا لیکن جو قول سدید کا عادی ہے وہ متنبہ ہو جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دیکھو اس میں میرے نفس کی کوئی خوبی نہیں ہے دھوکہ نہ کھا جانا یہ اصل مسئلہ یوں ہے۔ یہ وجہ ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک صورت پیدا ہوئی تو یہ عادت ہے جو رفتہ رفتہ دل کے اندر روشنی پیدا کر دیتی ہے اور اس روشنی کے بغیر آپ اپنے نفس کے بل اور فریب کو دیکھ نہیں سکتے۔

بلوں کا تعلق اندھیروں سے ہے۔ سانپ کو جن اس لئے کہا گیا ہے اور جن اس کا عربی میں نام ہے، **''جان''** اس کو کہا جاتا ہے کہ وہ چھپا رہتا ہے اور روشنی ہر چھپے ہوئے گوشے کو ظاہر کر دیتی ہے اور کھول دیتی ہے۔ پس قول سدید ہے جو روشنی پیدا کرتا ہے اور اندرونی روشنی پہلے پیدا کرتا ہے اور بیرونی روشنی اس کے بعد اس سے پھوٹتی ہے اسی میں نور کا مضمون شامل ہے۔ نور کی حکمت آپ کو اس کو سمجھے بغیر سمجھ نہیں آسکے گی۔ جب آپ صاف ہو جائیں اور سیدھے ہو جائیں اور اس بات پر مستعد رہیں کہ میری وجہ سے کسی کو دھوکہ نہ ہو اور اگر دھوکے کا خطرہ ہو تو آگے بڑھ کر اس کا دھوکہ دور کرنے کی کوشش کریں اور آنحضرت ﷺ کا بعینہٖ یہی اسوہ تھا، جہاں کسی شخص کے متعلق یہ خطرہ محسوس کیا کہ اسے نفس کے متعلق کوئی دھوکہ تو نہیں ہو گیا وہاں ٹھہر کر اس دھوکے کو دور کیا ہے اور اس قول سدید کا حق ادا کر کے پھر آگے بڑھے۔

ایک اور موقع پر ایک بدوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے رعب اور جلال سے تھر تھر کانپنے لگا، اس پہ لرزہ طاری ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے بڑے تحمل اور پیار سے اس کو کہا دیکھو بھائی میں بھی تمہاری طرح ایک بندہ ہوں، ایک بشر ہوں مجھ سے ڈرو نہیں اور یہ فقرہ کہ میں بھی ایک بڑھیا کے پیٹ سے پیدا ہوا، بڑھیا کا لفظ ان معنوں میں کہ خاتون تھی جس کے اندر کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ بات سن کر تو اس کو کچھ حوصلہ ہوا پھر آپؐ نے آگے بات شروع کی اور اگر وہ یہ سمجھتے **نعوذ باللہ من ذالک** جو سمجھ سکتے ہی نہیں تھے کہ بڑی شان ہے اور بڑا میرا رُعب ہے یہ رُعب کے نیچے آ گیا ہے اب میں جو کہوں گا اس کو قبول کرے گا تو یہ ایک نفس کا دھوکہ تھا جس دھوکے میں آنحضرت ﷺ کبھی بھی ایک لمحہ کے لئے بھی مبتلا نہیں ہوئے اور جو اس دھوکے میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو دھوکوں سے نجات بخش ہی نہیں سکتا۔

پس قول سدید کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آپ اپنے نفس کے متعلق اگر باخبر رہیں اور سیدھے رہیں اور اپنے نفس کا غلط تأثر نہ پڑنے دیں تو یہ وہ سچ ہے جو حیرت انگیز طور پر دنیا کو مرعوب کرتا ہے۔ یہاں جو رعب ہے کسی کی بشری عظمت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سچائی کی عظمت کی وجہ سے ہے اور آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا رعب اس قول سدید میں تھا۔ بات سیدھی اور صاف اتنی طاقتور کہ وہ دلوں کو بلکہ قوموں کو مرعوب کرتی تھی آئندہ زمانوں کو مرعوب کرنے والی باتیں تھیں۔ حدیثیں پڑھ کے دیکھیں بعض چھوٹی چھوٹی نصیحتیں ہیں جیسا کہ یہ مثال میں نے ایک دی ہے قیامت تک اس کی

طاقت ختم نہیں ہوگی کیونکہ سچائی کی طاقت ہے اور سچائی بھی وہ جو قول سدید ہے۔ تو قول سدید کو آپ اختیار کریں تو آپ کے نفس کی صرف اصلاح نہیں ہوگی آپ کی باتوں میں طاقت آئے گی اور پھر لوگ سنیں گے اور سنیں گے اور اس سے مرعوب ہوں گے اور اسے ماننے پر مجبور ہوں گے۔

چنانچہ اسی دورے کے عرصے میں بار بار میرے سامنے یہ باتیں پیش کی گئیں کہ جی ہم تبلیغ تو کرتے ہیں مگر یہ قومیں ایسی ہیں دہریت میں اتنا آگے نکل گئی ہیں کہ ان پر اثر نہیں ہوتا۔ ان سے میں نے کہا میں یہ مان ہی نہیں سکتا، ناممکن ہے۔ ساری دنیا میں تو خدا نے اثر کی ہوائیں چلا دی ہیں، آندھیاں بن گئی ہیں وہ، عظیم انقلاب برپا ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کو بس ناروے اور سویڈن سے ہی دشمنی تھی کہ یہاں اثر نہ ہو۔ یہ بالکل وہم ہے تمہارا۔ قول سدید اور حکمت، یہ دو تقاضے ہیں ان کو اگر پورا کرو تو یہ قومیں ضرور اثر قبول کرتی ہیں کیونکہ جہاں میں نے ان کی دہریت دیکھی وہاں دہریت کے نتیجہ میں، جو دہریت سچائی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی ان کے اندر سچائی کی طرف رجحان بھی دیکھا ہے۔ اب یہ بظاہر تضاد ہے مگر کوئی تضاد نہیں ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ سچائی جھوٹے عقائد کو قبول کر ہی نہیں سکتی۔ ان کی بغاوت خدا کے خلاف نہیں تھی، ان کی بغاوت تثلیث کے خلاف تھی اور تثلیث کے خلاف بغاوت کو خدا کے خلاف بغاوت قرار دینا ظلم ہے لیکن چونکہ ان کے پاس متبادل نہیں تھا اس لئے سمجھے کہ تثلیث ہی خدا ہے اور یہ خدا قابل قبول نہیں ہے، اس کو انہوں نے رد کر دیا۔ مگر جو ان میں زیادہ بڑے دانشور تھے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا کہ تثلیث خدا نہیں ہے، تثلیث ردّ ہوگی، خدا ردّ نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں نے ناروے کو یہ سمجھاتے ہوئے نیوٹن کی مثال دی تھی کہ دیکھو نیوٹن اس دور کی سائنس کا جدا مجد ہے۔ تمام عظیم سائنس نیوٹن سے پھوٹی ہیں، اس کی فکر و نظر سے اور وہ ایک مؤحد تھا، ایک ایسا مؤحد جو عمر کے ایک بڑے حصے تک تثلیث کو اس لئے مان رہا تھا کہ اس نے ورثے میں پائی تھی مگر چونکہ سچا انسان تھا، اگر سچا نہ ہوتا تو اتنی بڑی حکمت کے راز اس کو کبھی معلوم ہی نہ ہوتے۔ ایک دن اس کو خیال آیا کہ میں کیا مانگ رہا ہوں، یہ تثلیث اس کائنات سے متصادم ہے۔ میں نے جس کے راز معلوم کئے ہیں وہ تو خدا کی گواہی دے رہی ہے، یہ تثلیث کہاں سے آ گئی بیچ میں۔ وہ دہریہ نہیں بنا۔ اس نے کہا یہ عیسیٰؑ پر الزام ہے کیونکہ وہ سچا تھا۔ اگر وہ سچا تھا تو لازماً مؤحد ہوگا اس لئے میں مطالعہ کروں گا اور

Old Testament یعنی عہد نامہ قدیم سے عہد نامہ جدید کا موازنہ کر کے معلوم کروں گا کہ کیا حقیقت ہے اور کیا جھوٹ ہے۔اس نے موازنہ کیا اور اپنی ڈائری میں وہ نوٹ کیا کرتا تھا اور وہ نوٹ اس کے ایک بائیوگرافر کے ہاتھ میں آ گئے اس نے اس پر کتاب شائع کی ہے اور حیرت انگیز صفائی کے ساتھ وہ مؤحد بندہ خدا کا، اس مضمون کو بھانپ گیا کہ تثلیث اور اس قسم کے جھوٹے عقائد بعد میں آنے والے لوگ اپنے مذہبوں کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں، مذہبوں کے بانی کبھی بھی ایسے بے ہودہ اور لغو عقائد کے قائل نہیں ہو سکتے۔ بڑے مضبوط دلائل اس نے دیئے، بڑے مضبوط دلائل اندرونی بائبل کے موازنے کے وقت دیئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹا فقرہ ہے، اس کا یہ مطلب تھا ہی نہیں جو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔تو وہ جب اس نے اپنا ردعمل دکھایا تو اس کو یونیورسٹی کی کیمبرج کی پروفیسر شپ سے، چیئر سے مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا یعنی نکال دیا گیا عملاً اس کو، استعفیٰ تو نام کے ہوا کرتے ہیں مراد یہ ہے کہ ہم تمہیں نہیں رکھیں گے، عزت چاہتے ہو تو آپ ہی باہر ہو جاؤ اور اس کا گزارہ سارا اس پر تھا اس نے کوئی پرواہ نہیں کی۔تو سچائی ہے اصل بات جس کی طرف میں بار بار آپ کو توجہ دلا رہا ہوں۔سچائی میں اگر قول سدید ہو تو پھر قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور قول سدید ہو تو اس میں ایک طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایسے یورپ میں بہت سے دانشور تھے جو سچے تو تھے مگر پرواہ بھی نہیں انہوں نے کی کہ ہمارے سچ کو پہچاننے کے باوجود دنیا جہالتوں میں مبتلا ہے۔ چرچوں سے اور بعض انتہا پسند یونیورسٹیوں سے جو اس زمانے میں عیسائیت کے قبضے میں تھیں تثلیث کی تعلیم دی جا رہی ہے ہمیں کیا اس سے، یہ کہہ کر چپ کر کے بیٹھے رہے۔اس چیز سے نہ ان کے عمل کی اصلاح ہو سکتی تھی نہ قوم کے عمل کی اصلاح ہو سکتی تھی اور قرآن کریم نے یہی مضمون ہے جو کھولا ہے کہ سچائی کافی نہیں۔اگر آپ ان سے انفرادی طور پر پوچھتے وہ ایسے بے شمار تھے جو سمجھتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے، انہوں نے مذہب میں دلچسپی لینی چھوڑ دی لیکن سچائی کے لئے ایک ننگی تلوار بن کے اٹھ کھڑے ہونا، اس کو قول سدید کہتے ہیں اور اگر وہ ایسا کرتے تو یورپ کی کبھی سے اصلاح ہو چکی ہوتی مگر انہوں نے یہ قربانی نہیں دی اور اس قربانی کے بغیر اور قَوْلًا سَدِيْدًا سے چمٹے بغیر اصلاح ممکن نہیں ہے اور اپنے نفس میں ممکن نہیں، اپنے تعلقات میں ممکن نہیں۔

میں بار ہا جماعت کو متنبہ کر چکا ہوں اب پھر کرتا ہوں آئندہ بھی کرتا رہوں گا کیونکہ اس کی ضرورت بہت ہے، اپنی سوچوں میں پہلے بل نکالیں اور اپنی ذات سے سیدھے ہو جائیں، پھر آپ کو پتا چلے گا کہ اصلاح نفس ہوتی کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اس کا نتیجہ یہ ہے قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا سچی بات نہیں، سیدھی بات کہنے کے عادی بن جاؤ۔ صاف ستھری سیدھی بات، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا، فرمایا اللہ وعدہ فرماتا ہے۔ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ تم سے تو اپنے اعمال کی اصلاح نہیں ہوتی اگر تم قول سدید کو پکڑ لو تو خدا وعدہ کرتا ہے کہ میں تمہارے اعمال کی اصلاح کروں گا اور یہ جو وعدہ ہے یہ قانون کی صورت میں بھی جاری ہے اور ایک بالا رادہ فعل کی صورت میں بھی رونما ہوتا ہے۔

قانون فطرت سیدھے لوگوں کو ہمیشہ اصلاح کے رستے پہ ڈال دیتا ہے جو صاف اور سیدھی بات کرنے کے عادی ہوں جو اپنی آنکھ سے بھی اپنی برائیوں کو نہ چھپائیں اور اپنی کوئی ایسی شخصیت غیر پر ظاہر نہ کریں جس کے وہ مالک نہیں ہیں۔ اس کا اور بعض کمزوریوں پر پردے ڈالنے کا مضمون الگ الگ ہے وہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی کی کمزوری کو اچھالنا اور ظاہر کرنا قرآن اس کو فحشاء کہتا ہے۔ پس اس فرق کو سمجھیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں اچھا قول سدید ہے تو عورتیں بعض کہتی ہیں ہم نے ساری عمر خاوند کے گھر جانے سے پہلے جو بدیاں کی تھیں ہمارا فرض ہے خاوند کو بتا دیں اور اس فرض کے نتیجے میں ان کی زندگیاں برباد اور خاوندوں کی زندگیاں برباد۔ جو بات کسی کو پوچھنے کا حق نہیں ہے عجیب خدا نے عدل قائم فرمایا ہے وہ تمہیں بتانے کا بھی حق نہیں ہے۔ وہ اندرونی معاملات جن میں خدا تعالیٰ نے دوسرے کو کریدنے کی اجازت نہیں دی، تجسس کی اجازت نہیں، وہاں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم سچائی کے نام پر ان کو خود بیان کرو گے تو یہ بے حیائی ہوگی اور اس کی سزا پاؤ گے، ایک بڑا جرم ہے۔

تو یہ میں بار بار غلط فہمی دور کرتا ہوں اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ بالا رادہ اپنی اس شخصیت کو دنیا پر ظاہر کرنا جو شخصیت نہیں ہے، اپنے اس حسن کو حسن بنا کر دکھانا جو حسن نہیں تھا، بالا رادہ فریب کے ساتھ اپنی کمزوریوں پر پردے ڈالنا جھوٹ کے ذریعے، یہ چیزیں ہیں جو قول سدید کے خلاف ہیں اور

وہ جرائم جن کی میں بات کر رہا ہوں جو شاذ کے طور پر رونما ہوتے اور اکثر انسان ان کے اوپر سے خود پردے اٹھاتے بھی نہیں ہیں لیکن اپنے اندر سے جو پردے اٹھاتے ہیں وہ ان چیزوں سے اٹھاتے ہیں جو ان کے اندر ہیں نہیں اور جو کمزوریاں ہیں ان پر جان کر پردے ڈالتے ہیں اور چھپاتے ہیں اور اس وقت بھی چھپاتے ہیں جب تحقیقات کا موقع ہو اور لازم ہے کہ وہ ظاہر کریں اور پھر جو اچھی باتیں اور نیک باتیں ان کے علم میں آئیں ان کو وہ برمحل قول سدید کے مطابق جن تک پہنچانی چاہئیں ان تک نہیں پہنچاتے اور قول سدید کے خلاف یہ عمل کرتے ہیں کہ جہاں نہیں پہنچانی چاہئیں وہاں وہ پہنچاتے ہیں اس سے لذت حاصل کرتے ہیں۔

جتنا بھی سوسائٹیوں میں پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور کسی شخص کے متعلق ایک طرف سے بات سن کر دوسرے کو بیان کرنا کہ اس میں تو یہ بھی کمزوری ہے، یہ بھی کمزوری ہے، وہاں باتیں کرنا جہاں ان کا تعلق ہی کوئی نہیں اور جہاں ضروری تھیں پہنچانی وہاں نہیں پہنچاتے ،اس کے نتیجے میں اصلاح ممکن ہی نہیں رہتی۔ ایسی سوسائٹیاں جہاں ایسے اڈے بن جائیں کبھی بھی ان کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور ہمیشہ بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن اگر آپ کے علم میں ایسی بات آئی ہے جو نظام جماعت کی کمزوری ہے یعنی نظام جماعت میں وہ کمزوری نہیں ہونی چاہئے لیکن نظام جماعت چلانے والوں نے پیدا کر دی ہے قول سدید کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نظام جماعت کے ان بالا افسروں تک اس بات کو پہنچائیں جنہوں نے اصلاح کرنی ہے۔

تو دیکھیں کیسی صاف بات ہے قول سدید کرو۔ يُّصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ قول سدید کا مطلب ہے صاف بات اور صحیح آدمیوں تک پہنچانا، بے محل بات نہ کرنا اور یہ چھوٹی سی نصیحت اتنے وسیع دائرے میں انسانی اعمال پر اثر انداز ہے کہ آپ اگر اس پر غور کریں تو حیرت سے اس سمندر میں ڈوب جائیں گے چھوٹا سا کلمہ کتنا عظیم ہے اور اس کے بعد فرمایا: يُّصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ کچھ ذنوب بھی تو ہیں ان کو ظاہر کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے تمہیں نہیں حکم دیا جو تمہارے اندرونی گناہ ہیں۔ خدا یہ تو نہیں کہہ رہا کہ ان کو کھولتے رہو اور دنیا میں اچھالتے رہو اس سے تو اصلاح کے برعکس مضمون پیدا ہوگا ایسی سوسائٹیاں جہاں گناہ کی کھلم کھلا باتیں ہوتی ہوں وہاں بے حیائی بڑھتی ہے اصلاح کبھی نہیں ہوتی جن کی ٹیلی ویژن گندی ہوگئی ان

کی ساری قوم ہی گندی ہوگئی اور باتیں سچی ہیں اور کھلم کھلا کی بھی گئی ہیں لیکن قول سدید نہیں ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارے وہ گناہ اور کمزوریاں جو تم سے قول سدید اختیار کرنے سے پہلے سرزد ہو چکی ہیں اللہ ان پر پردے ڈالے گا۔ یَغۡفِرۡ کا مطلب یہ ہے کسی چیز کو ڈھانپ دینا۔ اس میں دو طرح سے پردے ہیں۔ اپنی ناراضگی سے پردے میں لے آئے گا اپنی ناراضگی کو ان تک نہیں پہنچنے دے گا اور لوگوں کی نظر اور ان کی تنقید سے پردہ ڈال دے گا۔ تو چھوٹی سی آیت میں ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت کھاتے ہوئے کتنے معانی کے کتنے سمندر بیان ہوگئے ہیں۔ یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ جو اس رستے پر چل پڑے گا، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں یہ تربیت کا اصول جان لے گا اور اس پر عمل پیرا ہوگا قول سدید کا عادی ہو خدا اس کے اعمال کی اصلاح شروع کر دے گا اس کی کمزوریوں پر پردے ڈھانپ دے اور پھر ان سے بخشش کا سلوک فرمائے یہ دونوں مضمون ہیں یَغۡفِرۡ میں۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا، فرمایا وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا یہ سفر کی انتہا نہیں ہے جو بیان ہو رہی ہے۔ یہ تو سفر کا آغاز ہے جو بتایا جا رہا ہے اس کے بعد تم اس لائق ہو گے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرو اور جو کوئی پھر اللہ اور اس رسول حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرے گا۔ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا اسے عظیم کامیابیاں نصیب ہوں گی اور یہ سارا مضمون اس پہلی آیت سے مربوط ہے جس میں فرمایا ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ قرآن ہے تو شک سے بالا لیکن متقیوں کے لئے ہدایت ہے یہاں انہی متقیوں کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ قَوۡلًا سَدِیۡدًا کہنے والے، سچی بات کو سچے انداز سے پیش کرنے والے جب وہ یہ کر گزریں گے تو پھر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے سکول میں داخل ہوں گے جس کی کامیابیاں لامتناہی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون کو صرف سمجھنے کی نہیں بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جماعت کی مالی قربانی کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے ساری جماعت پر جو فضل نازل فرمائے وہ حیرت انگیز ہیں

(خطبہ جمعہ فرمودہ 8 رنومبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ
كَرِيْمٌ ۝۱۲ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ
بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۳
(الحدید: 12، 13)

پھر فرمایا:

قرآن کریم کی جن آیات کی میں نے تلاوت کی ہے یہ آج کے خطبہ کی تمہید بنیں گی کیونکہ آج تحریک جدید کی مالی قربانی سے متعلق خطبہ دینا ہے اور نئے سال کا آغاز کرنا ہے۔ مالی قربانی کی روح کو جس طرح قرآن کریم نے مختلف جگہوں پر پیش فرمایا ہے ان میں سے ایک یہ آیت ہے جو ایک نئے عجیب انداز میں قرآن کریم کا مالی قربانی کا فلسفہ پیش فرماتی ہے اور دراصل یہ فلسفہ ایک دنیاوی فلسفے کے مقابلے پر رکھا گیا ہے۔ عام طور پر ان آیات کا ترجمہ تو کیا جاتا ہے مگر جن مضامین سے ان کا تقابل ہے ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کون ہے جو اللہ کو قرضہ حسنہ دے فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ وہ اس قرضے کو اس کے لئے بڑھا دے اور پھر اجر کریم اس کا باقی رہے یعنی قرضے کو بڑھانا اس قرضے کی جزا نہیں ہوگا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ جب بھی کچھ لیتا ہے بڑھا کر ہی دیتا ہے تو اس کا سب حساب چکا دیا جاتا ہے۔ اسے اس سے بڑھ کر دیا جاتا ہے جو اس نے دیا، بہت بڑھ کر دیا جاتا ہے اور اجر کریم پھر بھی باقی ہے، وہ معزز اجر جو اس کا باقی دنیا کے خدمت کرنے والوں سے ممتاز کردے گا۔ تجارت میں روپیہ لگانے والوں سے ان کا مقام کہیں سے کہیں بڑھا دیتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ قرضِ حسنہ کی خدا کو ضرورت کیا ہے۔ جو دینے والا ہے جو عطا کرنے والا ہے جو بڑھا کر دیتا ہے پھر بھی حساب نہیں چکاتا، بند نہیں کرتا کھاتہ، کہتا ہے میرے علم میں بہت کچھ تمہارے لئے باقی ہے۔

تو دراصل اس مضمون کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کے ان احکامات پر غور کرنا چاہئے جو سود کی مناہی سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن کریم نے سود کے نظام کی جڑیں اکھیڑ دی ہیں اور ہرگز مومن کو اجازت نہیں کہ اپنا روپیہ اس شرط پر کسی کو دے کہ وہ بڑھا کر واپس کرے۔ اب اس کا متبادل ایک عام تجارت بھی ہوسکتا ہے لیکن ہر شخص کو تجارت کا فن نہیں آتا، ہر شخص اپنے روپے کا بہترین مصرف نہیں جانتا۔ تو اگر اللہ تعالیٰ روپے کا ایسا مصرف بند فرما دے جس کے نتیجے میں آپ کو دکھائی دیتا ہے کہ وہ روپیہ بڑھ رہا ہے اور عملاً جن ہاتھوں میں وہ روپیہ بڑھتا ہے وہ اسے گھٹانا بھی جانتے ہیں اور نتیجۃً ہمیشہ گھٹتا ہے، بڑھتا نہیں۔ اس سودے سے آپ کو بچایا ہے خطرناک ضیاع سے آپ کو بچا لیا یہ حکم دے کر کہ سودی کاروبار میں داخل نہ ہونا تم جتنا روپیہ بینک میں رکھو گے تم سمجھو گے کہ بڑھ رہا ہے مگر جب ایک عرصے کے بعد اصل حقیقتوں سے اس بڑھی ہوئی رقم کی قدر کا مقابلہ کرو گے تو ہمیشہ گھاٹا پاؤ گے۔ آج ایک لاکھ روپیہ بینک میں رکھاتے ہیں آج ایک لاکھ روپیہ کا مکان بھی خرید سکتے ہیں اور جو مختلف قسم کی مصنوعات ہیں یا ایگریکلچر کی Production، زراعتی جو بھی پھل اور سبزیاں اور گندم اور جو کچھ بھی زراعت میں پیدا ہوتا ہے میرا مطلب یہ ہے زراعتی پیداوار اس کو بھی خرید کے دیکھ سکتے ہیں کہ ایک لاکھ میں کتنا آتا ہے چھ سال میں جب آپ کا روپیہ دگنا ہو چکا ہوگا جو بینک میں پڑا پڑا دگنا ہوا ہے تو وہی مکان خریدنے کی کوشش کریں جو چھ سال پہلے آپ ایک لاکھ میں خرید سکتے

تھے اس کی بسا اوقات سوائے اتفاقی حادثات کے وہ مکان آپ کے ہاتھ سے آگے جا چکا ہوگا۔ جو کچھ آپ مصنوعات یا پیداوار کی صورت میں چیزیں خرید سکتے تھے چھ سال پہلے، چھ سال کے بعد دو لاکھ میں وہ نہیں خرید سکیں گے اور انفلیشن (Inflation) کا جو ریٹ ہے جو اس کی رفتار ہے وہ سود کی بڑھتی ہوئی آمد سے ہمیشہ تیز ہوتی ہے کیونکہ یہ جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔ سود کی رفتار تو فکسڈ ہے یعنی اگر دس فیصدی آپ کو ملے گا، وہ تو دس فیصدی ملتا نہیں۔ یہ دگنا ہونے کی بات بھی زیادہ سے زیادہ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں عملاً دینے کے ہاتھ اور ہیں اور لینے کے ہاتھ اور ہیں اور اگر بڑھ بھی جائے تو انفلیشن (Inflation) اکثر اوقات سوائے بعض اقتصادی حادثات کے وہ میں بحث نہیں چھیڑ رہا اس وقت اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے باوجود بھی یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ یاد رکھیں کہ سود سے جتنا روپیہ آپ کا بڑھتا ہے طبعی ذرائع سے جو روپے کی قیمت کم ہو رہی ہے وہ بڑھوتی کو کم کر کے نیچے اتارے گی، آگے نہیں بڑھا سکتی۔ اس لئے وہ لوگ جو احمدی مجھ سے پوچھتے ہیں میں ان کو Real Estate کا جب مشورہ دیتا ہوں تو امر واقعہ یہ ہے کہ Real Estate اگر گر بھی جائے یعنی جائیداد، تو اس عرصے میں کچھ نہ کچھ وہ دے رہی ہوتی ہے اور وہ کل جو آمد ہے وہ سود سے بہر حال زیادہ ہے۔

مگر قرآن کریم نے جو نظریہ پیش فرمایا ہے وہ اور ہے۔ ہر بچانے والے کا روپیہ اس قابل ہوتا ہی نہیں کہ تجارت میں لگایا جا سکے۔ سرمایہ کاری کے لئے کچھ بنیاد تو ہونی چاہئے اور کچھ عقل بھی ہونی چاہئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے وہ مشورہ نہیں دیا جو خطرات سے خالی نہیں ہے۔ بظاہر ایک منافع سے روکا جو منافع تھا ہی نہیں حکم وہ دیا ہے جو آپ سمجھتے ہیں ہمارے مقصد کے خلاف ہے حالانکہ آپ کے مقصد کی حفاظت کے لئے دیا گیا ہے لیکن اپنے زعم میں آپ سمجھتے ہیں او ہو اگر ہم روپیہ لگا دیتے نا سود پر، بینک میں رکھتے تو اب تک پتا نہیں کتنا ہو جانا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بے وقوفی نہ کرو، ہم تمہیں اس سے بہتر ایک قرض کا نظام دکھاتے ہیں، ہمیں قرض دے دیا کرو۔ اب یہاں جب آپ پہنچ کر قرض کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔

وہ جس نے قرض سے روکا تھا ایک غلط قرض سے روکا تھا اس نے اپنے ذمہ قرض وصول کرنا لے لیا اور فرمایا ہمیں کیوں نہیں دے دیتے قرضہ حسنہ۔ تم سمجھتے ہو قرضہ حسنہ نقصان کا سودا ہے اور واقعۃً دنیا کے کاروبار میں جہاں سودی نظام ہو وہاں نقصان ہی دکھائی دے رہا ہے۔ فرمایا ہمارا ابھی تو

ایک روحانی بینک کھلا ہے تم اس میں قرضہ حسنہ دے کے دیکھو تم سے کیا ہوتا ہے۔ جتنا دو گے اس سے بہت زیادہ بڑھا کر ہم تمہیں واپس کر دیں گے اور پھر ہم کہیں گے ابھی اجر باقی ہے اور اجر بھی وہ باقی ہے جو کریم ہے۔ یہ جو نظام ہے اس کا تجربہ کرنے والوں نے ہمیشہ توقع سے بھی بڑھ کر کارفرما دیکھا ہے کبھی بھی اس میں غلطی نہیں ہوئی جو خدا کی خاطر اپنے روپیہ کی غلط سرمایہ کاری نہیں کرتے اس سے بچ جاتے ہیں ان کے روپے میں اللہ تعالیٰ غیر معمولی برکتیں عطا فرماتا ہے۔

اور دوسرا جو اس کے علاوہ خدائی نظام کو قرض دیتے ہیں ان کی تو نسبتیں ہی بدل جاتی ہیں ان کی کیفیات میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ اتنی برکتیں ملتی ہیں کہ اس کا عام انسان جس کو تجربہ نہ ہو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جماعت کی مالی قربانی کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے ساری جماعت پر جو فضل نازل فرمائے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں اور بڑھتا ہوا مالی قربانی کا رجحان بتا رہا ہے کہ خدا نے دیا تھا تو واپس کر رہا ہے پہلے تھوڑا قرض دیا تھا پھر اس سے زیادہ، پھر اس سے زیادہ بڑھتے بڑھتے کہیں سے کہیں بات جا پہنچتی ہے۔ آج ایک مجلس سوال و جواب میں نثار صاحب آپ کے فنانس سیکرٹری جو UK کے بڑی دیر سے فنانس سیکرٹری ہیں ماشاء اللہ، ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا تجربہ ہے آپ نے کب چارج لیا تھا۔ انہوں نے کہا میں نے 1980ء میں لیا تھا۔ میں نے کہا اس وقت جماعت کی مالی توفیق کیا تھی اور کتنا چندہ تھا تو انہوں نے کہا سارے چندے ملا لیں طوعی، غیر طوعی، تحریک جدید، دوسرے وصیت، تو ایک لاکھ سے زیادہ بجٹ نہیں تھا اس سال۔ اب عام بجٹ جو ہے وہ بڑھ کے بارہ لاکھ تک جا پہنچا ہے اور اس کے علاوہ طوعی چندے ہیں ایسے جو شمار کر لیں تو بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ جو سال گزرا ہے اس میں جماعت نے جو مسجد کے لئے قربانی دی ہے اور دیگر طوعی چندوں میں حصہ لیا ہے جماعت UK نے اس کا ٹوٹل (Sum) تین ملین کے قریب جا پہنچتا ہے۔ تو کہاں وہ ایک لاکھ اور ابھی 1980ء سے لے کر سولہ سال گزرے ہیں تو سولہ سال میں قربانی بڑھتے بڑھتے تین ملین تک خدا تعالیٰ نے توفیق بخش دی ہے اور جماعت کی آمد میں کمی نہیں ہوئی بلکہ بڑھ رہی ہے۔ نئی نسلوں سے خدا کا حیرت انگیز سلوک ہے۔ عجیب و غریب کاروبار ہیں اور لڑکے آ کے، جب نوجوان مجھے باتیں بتاتے ہیں تو ہنستے ہیں کہ یہ ہوا کیسے؟ کہتے ہیں ہمیں تو سمجھ نہیں آتی کیا بات تھی۔ ایک نوجوان ملنے کے لئے

آئے انہوں نے کہا مجھے امریکہ میں ایک نوکری ملی ہے اتنی زیادہ آمد ہے کہ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی آمد ہے۔ میں نے کہا تم بڑے اچھے رہے ہوگے انٹرویو میں۔ انٹرویو، کیا خاک میں نے انٹرویو دیا۔ انٹرویو لینے والا اتفاق ایسا ہوا کہ وائس پریذیڈنٹ خود تھا اس نے دو باتیں کیں۔ اس نے کہا تم پاس ہو باقیوں کے Que لگے ہوئے تھے۔ انٹرویو دینے والوں کے بورڈ میں کتنے ہی آئے، ناکام ہوئے۔ اس نے دیکھا پہچان لیا کیونکہ وہ طاقت بھی رکھتا تھا اور فراست بھی، اس نے کہا باتیں کرو بس، چلو اب جاؤ بھاگو تم، پیش ہو جاؤ کام کے لئے اور جو اس کی Salary میں نے بھی سنی، میں آپ کو بتاتا نہیں اس کا ذاتی راز ہے، مگر میں حیران رہ گیا اور چونکہ جانتا ہے کہ اللہ کا فضل ہے وہ اس ارادے کا اظہار کر کے گیا کہ سوال ہی نہیں اب میرے لئے کہ چندوں میں کسی قسم کی کمی کروں، پہلے وہ حق ادا کروں گا خدا کے شکرانے کے طور پر پھر باقی کاموں میں، چیزوں میں برکت پڑے گی۔

تو یہ مالی نظام جو قرضے کا نظام ہے اس کو اس پہلو سے اس پس منظر میں سمجھیں گے تو سمجھ آئے گی ورنہ لوگ پاگل کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کو قرضے کی کیا ضرورت ہے، اللہ غریب ہے اللہ فقیر ہے؟ اور یہ پاگل پہلے بھی ہوتے تھے اب بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ کہتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ فَقِیۡرٌ وَّنَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ (آل عمران: 182) ہم اَغۡنِیَآءُ ہیں اللہ فقیر ہے ہمارے پاس آئے ہیں پیسے دو لیکن کیسے دیتا ہے، کیسے لیتا ہے اور پھر کیا سلوک فرماتا ہے وہ مضمون دیکھ لیں تو انسان حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ناممکن ہے کہ خدا کے سلوک کو دیکھ کر کوئی ایسی بے حیائی کا کلمہ تصور میں بھی لا سکے۔ جو لیتا ہے دیا بھی تو اسی نے تھا یہ بھی نہیں سوچتے بے وقوف اور لیتا کیسے عذر رکھ کے، کیسی عزت نفس کو قائم کرتے ہوئے لیتا ہے یہ نہیں کہتا میں نے تمہیں دیا ہے مجھے واپس کر دو۔ یہ بھی کہتا ہے بعض جگہ لیکن اور رنگ میں، مجھے اس طرح واپس کرو کہ غریبوں کو دے دو۔ جہاں دین کی ضرورت ہے وہاں یہ ایک انداز ہے کہتا ہے قرضہ دو۔ تم قرضہ دیتے تو ہو لوگوں کو، تمہیں ایک قرضے سے منع کیا ہے اور ایک اور قرضے کا دفتر کھول رہا ہوں اور اس قرضے کے بعد پھر تمہیں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ساری جماعت کی تاریخ گواہ ہے کہ ایسے ہی ہوا ہے۔ دو دو آنے دینے والوں کو خدا نے ایسی برکتیں دیں، ان کی اولادوں کی کایا پلٹ کے رکھ دی ہے۔ اگر وہ یاد رکھیں کہ یہ کیوں آسمان سے

فضل نازل ہوئے ہیں تو پھر ان کو سمجھ آئے گی کہ یہ وعدے ہیں جو پورے ہو رہے ہیں۔ عام طور پر لوگ اپنے خاندانوں کی ان عظیم قربانیوں کو جو نسبتاً بہت ہی معمولی تھیں اس طرح بھلا دیتے ہیں کہ اس دو آنے کی کیا بات بچوں سے کرنی ہے یا چار آنے کی کیا بات کرنی ہے۔ یہ ان کو نہیں پتا کہ وہ چار آنے اور دو آنے ہی ہیں جواب لاکھوں کروڑوں بن گئے ہیں ان کے لئے اور وہی مضمون ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اس کو بڑھا دیتا ہے وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ۔ اَجْرٌ کَرِیْمٌ اس کے علاوہ اس کے لئے باقی ہے۔ تو اپنے بچوں کو یہ تو بتایا کریں تا کہ ان کو پتا چلے کہ خدا تعالیٰ کتنا بڑھاتا ہے اور کتنا بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

بعض خاندانوں سے میں اس خیال سے کہ ان کو یہ وہم نہ ہو کہ دنیا میں ترقی ہو رہی ہے سب باہر نکل رہے ہیں ترقیات ہر قسم کی مل گئی ہیں ہمیں بھی مل گئیں ان سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے وہ رشتے دار جنہوں نے احمدیت کا انکار کیا اور آپ کے آباء جو احمدی ہوئے ان کو تکلیفیں بھی دیں ان کی اولادوں کا کیا حال ہے۔ تو اکثر اوقات اچانک ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ کہتے ہیں ان کی اولادوں کا تو حال ہی کوئی نہیں۔ کوئی ٹپری داس، کوئی فقیر، کسی کا برا حال، کوئی قرضے لے کر بھاگا ہوا لوگوں کے، کوئی جیل میں زندگی بسر کر رہا ہے، نہ گاؤں میں عزت نہ باہر۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی عزتیں ساری احمدیت کے لئے ہیں، دنیا کی عزتیں احمدیت کے لئے ہیں لیکن اصل اجر کریم ہے۔ باقیوں کو بھی ملتی ہیں مگر اجر کریم سے مرحوم ہیں اور ان کو جو ملتا ہے وہ قانون قدرت کے مطابق عام جاری نظام ہے اس سے ملتا ہے۔ یہ جو عطا اور قرضے کا نظام ہے اس کے نتیجے میں صرف جماعت احمدیہ کو مل رہا ہے اور یہ باریک فرق اگر آپ اپنی اولادوں کو نہیں بتائیں گے تو آگے وہ کئی نیکیوں سے محروم رہ سکتے ہیں اس لئے میں اکثر خاندانوں سے ملاقات کے وقت پوچھتا ہوں تم نے اپنے آباؤ اجداد کا کوئی ذکر کیا بچوں سے۔ بعض دفعہ ان کو بھی نہیں پتا ہوتا، شرمندہ ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ میں ان کو بتاتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کو میں بتاتا ہوں کہ آپ کے باپ کون تھے، آپ کے دادا کون تھے، آپ کے نانا کون تھے اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

پس یہ وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کا ذکر تفاخر کے طور پر نہیں، انکسار پیدا کرنے کے لئے کرنا ہے۔ تفاخر اور انکسار میں بڑا فرق ہے۔ پرانے لوگ اپنے آباؤ اجداد کی باتیں فخر سے بیان کرتے ہیں

خواہ آگے اولادیں ان سب نیکیوں سے محروم رہ گئی ہوں اور کہتے ہیں وہ ہمارے بڑے تھے اور جب آپ ان کی قربانیوں کا ذکر کریں گے کہ دو آنے دیئے تھے یا چار پیسے دیئے تھے یا چادر اتار دی تھی تو اس سے تفاخر کیسے پیدا ہوسکتا ہے، اس سے سوائے انکسار کے کچھ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ تو وہی مضمون ہے جو ایاز اور محمود کا مضمون ہے۔ ایاز جب اپنے پرانے کپڑے دیکھتا تھا تو فخر کے لئے تو نہیں دیکھتا تھا ان گلے سڑے کپڑوں میں، اس ٹوٹے ہوئے صندوق میں کیا بات تھی جو ایاز کو کھینچے لئے چلی جاتی تھی۔ راتوں کو چھپ کر جاتا تھا، دیکھتا تھا انکسار کی خاطر، اس لئے کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں شاہی انعامات کے نتیجے میں کہ یہ میرا آغاز تھا یہ میری طاقت، جو کچھ بھی پونجی تھی یہی کچھ تھا ان کپڑوں سے نکلا ہوں تو شاہی محلات میں جا کے خلعتیں عطا ہوئی ہیں۔ تو تحریک جدید کی جو یادیں ہیں وہ بھی دراصل ایاز کی پونجی کی یادیں ہیں لیکن ایاز کی پونجی تو گل سڑ گئی، ان بزرگوں کی پونجی گلی سڑی نہیں وہ بڑھتی چلی گئی ہے اور آج آپ کے تفاخر، آپ کی جو بھی چیزیں ہیں اگر آپ ان کو یاد نہیں رکھیں گے تو پھر آپ میں فخر پیدا ہوگا، اگر اپنے آباؤ اجداد کی قربانیوں کو یاد رکھیں گے تو کبھی کوئی فخر کا سوال نہیں۔

یہ مضمون میں اس لئے تحریک جدید کے اعلان سے پہلے بیان کر رہا ہوں کہ اب جو میں اعداد و شمار آپ کے سامنے رکھوں گا آپ حیران رہ جائیں گے کہ جماعت کتنی ترقی کر چکی ہے لیکن اپنا وہ پرانا بکس نہ بھولنا جس میں آپ کے پرانے کپڑے ہیں کہ ان کپڑوں نے ہی برکت بخشی ہے انہی عظیم بزرگوں کی قربانیاں ہیں جو اب یہ رنگ لائی ہیں اور ابھی آپ میں بہت گنجائش ہے۔ ان میں تو جتنی تھی وہ ساری پوری کر دی تھی انہوں نے، غریب لوگ تھے اس سے زیادہ کی طاقت ہی نہیں تھی۔ مگر جماعتوں میں جہاں میں ذکر کروں گا بہت عظیم قربانیاں ہیں مگر اس کے باوجود ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو میری نظر میں بھی ہے اور نظر میں نہیں بھی ہے جس کو استطاعت زیادہ ہے اور ابھی تک وہ اپنی استطاعت کے مطابق قربانی نہیں کر رہے۔ جب کوئی اچھا منتظم آ کر ان کے دلوں میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے قربانی کی روح ان کے اندر از سر نو زندہ ہونے لگتی ہے تو پھر خدا کے فضل سے ان جیبوں میں سے بہت کچھ نکل آتا ہے جو پہلے خالی دکھائی دیتی تھیں۔

تو ابھی بھی ان سب عظمتوں کے باوجود جو قربانی میں ہم نے حاصل کیں ان پہلی نسلوں کی قربانی کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ جس خلوص اور محبت اور پیار سے اپنی ساری توفیق کو استعمال

کرتے ہوئے انہوں نے قربانیاں دی ہیں اب بھی ہیں مگر نسبتاً کم ہیں ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (الواقعہ:14، 15)۔ پہلوں میں بہت بڑی جماعت تھی اب آخرین میں نسبتاً تھوڑے ہیں ۔مگر اس کے باوجود چونکہ خدا نے ہمارے پردے ڈھانک دیئے ہیں ہمارے اخلاص کو غیر معمولی عظمت بخشی ہے اور دنیا میں اس کا رعب قائم کر دیا ہے اس لئے یہ جو اعداد وشمار ہیں یہ آپ کو حیران کر دیں گے کس طرح خدا تعالیٰ ترقی پر ترقی عطا فرماتا چلا جاتا ہے اور یہ صرف مالی پہلو نہیں ہے، اَجْرٌ كَرِيْمٌ کی بات جو خدا نے فرمائی ہے اس کا بھی ذکر سن لیں۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

مالی ترقی کا وعدہ کر کے پھر آگے تفصیل بیان نہیں فرمائی وہ معمولی بات ہے، دنیا کی بات ہے ۔اجر کریم کا مضمون پھر آگے شروع کر دیتا ہے ۔فرماتا ہے جس دن تو مومنوں کو دیکھے گا اور مومنات کو يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ان کا نور ان کے آگے آگے بھاگے گا اور ان کے دائیں طرف بھی۔ دائیں طرف کیوں؟ اس لئے کہ جنت کا ذکر ہو رہا ہے جنت میں دائیں طرف ہی ہے کیونکہ بائیں طرف دنیا کی مظہر ہے۔ دنیا کی نعمتیں تو خدا دنیا میں ادا کر چکا ہوگا اس لئے ان کا ذکر نہیں چھیڑا۔اب اَجْرٌ كَرِيْمٌ کی بات ہو رہی ہے اس میں نور جو ہے وہ آگے آگے بھاگے گا اور دائیں طرف یعنی دینی پہلو سے ان کی روشنی دکھائی دینے لگے گی اور دنیاوی پہلو سے وہ اگر نظر انداز بھی ہو گئے تھے دنیا میں تو جن کا نور آگے آگے بھاگے اور دائیں طرف روشن ہوا ان کو کون ہے جو نظر انداز کر سکتا ہے۔ وہی ہیں جو دکھائی دینے والے ہیں۔

اب جگنو کی دم سے تھوڑی سی روشنی پیدا ہوتی ہے پھر بھی اندھیری راتوں میں وہ اچھی لگتی ہے تو وہ نور جو آگے آگے بھاگ رہا ہو اور دائیں طرف یعنی اعلیٰ اقدار کو، روحانی اقدار کو اس نے روشن تر کر دیا ہو۔ یہ اجر عظیم ہے یا اجر کریم ہے جس کا قرآن نے وعدہ فرمایا بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ آج کے دن تمہیں خوشخبری ہے۔ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہ باغات ہیں جن کے نیچے، جن کے دامن میں نہریں بہتی ہیں خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یہ خدا کے بندے جو قرضہ حسنہ دیں گے خدا

کو، ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یہ فوز عظیم ہے نہ کہ وہ چار پرسنٹ یا دس پرسنٹ کی کمائی ہوئی تمہاری چیزیں، ان کی حقیقت کیا ہے اس کے مقابل پر۔ وہ تو عارضی زائل ہونے والی، باطل ہونے والی چیزیں تھیں سارے قرضے تمہارے اتار کر اس سے ہزاروں گنا زیادہ بھی خدا دے دے گا تو یہ خدا پر قرض باقی رہے گا پھر۔

یہ قرضہ حسنہ جس کی طرف قرآن نے ہمیں بلایا اور اس دور میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ اس طرف اس مادی دنیا کو بلائیں اور انہی میں سے پھر لوگ زندہ ہو ہو کر آپ کے گرد جمع ہوں دنیا کے کونے کونے سے خدا کی پاک روحیں اکٹھی ہوں اور پھر وہ خدا تعالیٰ کے اس نظامِ قرض میں داخل ہو کر اس کے حیرت انگیز پھل دیکھیں، کھائیں اور دوسروں کو کھلائیں۔ تحریک جدید کی برکتوں سے جو کچھ دنیا کو فیض پہنچ رہا ہے یہ وہ پھل ہیں جو اس دنیا میں مل رہے ہیں اور ان پھلوں کا بھی یہی قصہ ہے ہم سمجھ رہے ہیں بڑے پھل مل گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قیامت کے دن تمہیں جب اصل پھل ملیں گے تو تم کہو گے ہاں ہمیں دنیا میں ملے تھے لیکن یہ وہ نہیں ہیں ملتی جلتی چیزیں تھیں۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ یہ کیا چیزیں ہیں یہ ان سے بہت زیادہ بڑی نعمتیں ہیں اور یہ اجر عظیم یا اجر کریم ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

پس اس پہلو سے مالی قربانی کوئی ایسی چیز نہیں جو مادی طور پر منافع بخش ہو یا وہ مقصود ہو۔ اگر وہ مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا مجھے سود پہ روپیہ دو۔ صاف ظاہر ہے کہ مومن کی نیت میں قرضہ حسنہ لازماً رہنا چاہئے اور زیادہ لینے کی نیت کے ساتھ نہیں دینا چاہئے۔ جو پہلوں نے دیا تھا اس طرح دیا تھا۔ اب ایک اور امتحان درپیش ہوتا ہے دینے والے کو وہ اگر زیادہ لینے کی نیت سے دے گا تو اس دنیا میں تو اسے مل جائے گا مگر پھر اجر کریم نہیں ملے گا کیونکہ وہ قرضہ حسنہ نہیں تھا۔ مگر میرا تجربہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو قرضہ حسنہ نہیں دیتے، خدا کو سود پہ رقم دیتے ہیں ان معنوں میں کہ ان کا تجربہ ہے جب دیتے ہیں ضرور زیادہ ملتا ہے تو ان کو دنیا میں مل تو جاتا ہے مگر اجر عظیم یا اجر کریم کا وعدہ، فوز العظیم اور اجر کریم کا وعدہ ان کو نہیں ملتا۔

اللہ کی مرضی ہے احسان کے طور پر جو چاہے کر دے اس کی رحمتوں کی راہ میں تو کوئی قدغن نہیں لگا سکتا یعنی یہ مراد ہرگز نہیں مگر عام دستور کے مطابق، عقل کے تقاضوں کے مطابق یہی دکھائی

دیتا ہے کہ جو اس دنیا کو چاہتے ہوئے دے گا اس کو دنیا ہی میں ملے گا اور جو زائد ملے گا وہ فضل کی باتیں ہیں اس قانون قرض کی باتیں نہیں جس کا مضمون میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ تو یہ یاد رکھیں جب دیں تو قرضہ حسنہ کے طور پر دیں، سود کے طور پر نہ دیں اور قرضہ حسنہ کے طور پر دیں گے تو یہ سب کچھ ہوگا جو میں بیان کر رہا ہوں۔ پھر ناممکن ہے کہ یہ کچھ نہ ہوا گر سود کے طور پر دیں گے تو ممکن ہے خدا زیادہ کر دے ممکن ہے سب کو ردّ ہی کر دے کہ گندا سودا ہے۔ بعض دفعہ خدا تعالیٰ کلیۃً ردّ فرما دیتا ہے۔ آپ کے ہاتھ سے تو نکل گیا مگر پھر وہ اصل بھی واپس نہیں آئے گا کیونکہ جو فاسد سودے ہوں ان کی ادائیگی ضروری نہیں ہوا کرتی۔ تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس روح کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے جماعت مالی قربانی میں آگے سے آگے بڑھتی چلی جائے گی۔

اب میں اعداد و شمار کی دنیا میں اترتا ہوں، سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ آج اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ دفتر اوّل کے باسٹھ (62) سال پورے ہوئے اور تریسٹھویں (63) سال میں داخل ہو رہا ہے یعنی باسٹھ (62) سال پہلے تحریک جدید کا آغاز ہوا تھا اور آج بھی دفتر اوّل میں شامل لوگ زندہ موجود ہیں میں بھی ان میں سے ایک ہوں اللہ کے فضل سے اور بھی بہت سے ہیں اور دفتر اوّل ابھی تک جاری ہے اور جو فوت ہو گئے ان کی طرف سے جو زندہ ہیں انہوں نے ان کے کھاتوں کو زندہ کر دیا اس لئے اس پہلو سے تو یہ دفتر اب کبھی نہیں مرے گا ہمیشہ انشاء اللہ زندہ رہے گا۔ اس کا 63واں سال شروع ہو رہا ہے۔ دفتر دوم جو بعد میں قائم کیا گیا اس کا باونواں (52) سال ہے یعنی دس (10) سال کے بعد پھر دفتر دوم کا آغاز ہوا یعنی پہلا رجسٹر بند اور نیا رجسٹر شروع ہو گیا۔ پھر دفتر سوم کے بتیس (32) سال ہو چکے ہیں یعنی دس (10) کی بجائے بیس (20) سال بعد ایک دفتر سوم کا آغاز ہوا۔ پھر دفتر چہارم کے گیارہ (11) سال ہوئے ہیں یعنی یہ وہ دفتر جو میں نے شروع کیا تھا کہ پہلے کھاتے بند اور نئی نسلوں کی خاطر ایک اور دفتر کھولا تھا یہ سب اگلے سال میں داخل ہو رہے ہیں اب۔

تہتر (73) ممالک کی رپورٹس آئی ہیں جبکہ گزشتہ سال ان ممالک کی تعداد کم تھی اور امسال میں نے ہدایت کی ہے کہ اگلے سال کم سے کم سو (100) ممالک کو تحریک جدید میں ضرور شامل کرنا ہے۔ اوّل تو یہ ٹارگٹ، یہ ہدف سامنے رکھنا چاہئے کہ اگر ایک سو چون (154) ممالک میں احمدیت ہے تو کیوں ایک سو چون (154) ممالک تحریک میں شامل نہ ہوں۔ چندہ عام میں تو خدا کے فضل

سے بہت سے نئے ممالک، نئے آنے والے بڑی ہمت کے ساتھ اور عزم کے ساتھ داخل ہوئے ہیں۔ جو چندہ پورا نہیں دے سکتے بعضوں کی درخواستیں بھی آئی ہیں کہ ہم ابھی حال ہی میں احمدی ہوئے ہیں ہمیں نصف شرح سے اجازت دی جائے تو ان کے اندر یہ مالی نظام کی اہمیت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کم دینا ہے تو کم دیں مگر پوچھ کر کم دیں۔ تو یہ جو دفاتر ہیں یہ اب سارے تو ہر جگہ پھیل نہیں سکتے جو وفات پا گئے وہ تو گزر گئے مگر نئے ممالک میں کم سے کم آخری دفتر کا اجراء لازم ہونا چاہئے اور اب آخری کا ہوگا کیونکہ اب جو کھاتہ نیا کھلے گا اس میں وہی آئیں گے جو نئے آنے والے ہیں تو مجھے امید ہے ہر کوشش جماعت کی پھل لاتی ہے صرف توجہ کی بات ہے۔ اب تو وہی حساب ہوگیا کہ درخت پھلوں سے لدا پڑا ہے ذرا سا ہلا دو بس اس سے زیادہ تم نے کوئی کام نہیں کرنا۔ جو بھی تحریکیں میں نے کی ہیں ان کا یہی نتیجہ دیکھا ہے کہ جماعت نے صرف درخت ہی ہلائے ہیں اور پھل پہلے سے تیار خدا نے کئے ہوئے تھے وہ گرتے ہیں ان کو جھولیوں میں بھر لینا ان کو سمیٹنا، صاف ستھرا رکھنا، ان کی حفاظت کرنا دشمنوں اور گندوں سے، یہ جماعت کا فریضہ رہ جاتا ہے۔ تو میں امید رکھتا ہوں کہ تحریک جدید میں انشاء اللہ آئندہ سال اس پہلو سے میں آپ کو بڑی خوشخبریاں دے سکوں گا۔

وعدہ جات کا جہاں تک تعلق ہے ایک زمانہ تھا جبکہ ہمیشہ وعدہ جات سے ادائیگیاں پیچھے رہ جایا کرتی تھیں اور بڑی مصیبت پڑی ہوتی تھی دفتر والوں کو، کہ او ہو اتنی کمی رہ گئی، اتنی کمی رہ گئی اور اب یہ حال ہے کہ وعدہ جات سے جماعت ہمیشہ آگے بڑھا کر دیتی ہے۔ اب یہ عجیب جماعت ہے، یہ جماعت اس شان کی اس روح کی جماعت کوئی دنیا میں دکھائے تو سہی کہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعوے کی دلیل مانگتے ہیں جب سورج چڑھ جائے اس کی دلیل کیا مانگو گے تم۔ اس مادی دنیا میں، ساری دنیا میں کل عالم میں ایسی قربانی کرنے والی جماعت جو طوعی طور پر پیش کرے اور کوئی اس پر جبر نہ ہو اور جتنا وعدہ کرے اس سے آگے بڑھا دے کوئی صورتیں ہوں تو نکال کے تو دکھاؤ کہیں۔

ایک دفعہ ایک Non-Ahmadi سے گفتگو ہو رہی تھی انہوں نے کہا جی باقی بھی تو قربانی دے رہے ہیں سارے دنیا کے ممالک شامل ہو رہے ہیں، آپ اپنی قربانی کا صرف ذکر کرتے ہیں۔ میں نے کہا دکھاؤ تو سہی کون سی جماعتیں ہیں۔ سارے ملازمین ہیں حکومت کا پیسہ کھانے والے، تیل کا پیسہ کھانے والے اور زکوٰۃ چاٹنے والے۔ وہ کہاں جماعت ہے جو ساری کی ساری

اپنے سارے بوجھ اپنی جان سے لگا کے اس طرح چلے جیسے ماں بچے کو جان سے لگا کر چلتی ہے اور بوجھ محسوس نہیں کرتی۔ یہ جماعت دکھاؤ کہیں، جس میں ہر ایک حصہ لے رہا ہو اور یہ احساس ہو کہ ابھی کم لیا ہے اور توفیق ہو تو اور لیں اور جتنا لے پچھتائے نہیں بلکہ اور زیادہ مزہ آنا شروع ہو جائے۔ جتنا دے اور بھی زیادہ دینے کو دل چاہے۔ یہ تو الٰہی سلسلے ہیں۔ انبیاءؑ کی جماعتوں کے سوا یہ توفیق نہ کبھی دنیا میں کسی کو ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے، چیلنج ہے کر کے دکھا دو یہ۔ اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سچائی اور دکھائی نہیں دیتی تو یہ زندہ جماعت، یہ قربانی کرنے والی جماعت ہے جس کو دیکھو اور ایمان لے آؤ اس کے بغیر تمہارے لئے، تمہاری شرافت کے لئے اور کوئی چارہ نہیں ہے، اتنی کھلی کھلی حقیقت ہے۔ یہ جواب جب میں نے دیا تو سوال کرنے والا جو ایک بوسنین تھا وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ اس نے کہا بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے، ایسی ہمیں کوئی نہیں دکھائی دے رہی جگہ۔

تو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جماعت کا تو قصہ ہی اور ہے اور جو نور کے وعدے ہیں وہ تو اس دنیا میں بھی پورے ہوں گے کچھ نہ کچھ، لیکن اصل میں وہ آخرت میں پورے ہوں گے۔ اگر پاکستانی روپے میں ڈھالا جائے نو کروڑ بائیس لاکھ کا وعدہ گزشتہ سال تھا اور وصولی خدا کے فضل سے پاکستانی روپوں میں نو کروڑ ساٹھ لاکھ ہوئی ہے، بائیس کی بجائے۔ یہ اس سے بھی زیادہ ہوتی مگر پاکستانی روپے کی قیمت گر گئی ہے اس لئے وہ اعداد و شمار یہ خطرہ تھا کہ کم نہ نظر آئیں مگر بڑھایا خدا نے اتنا کہ اس کی گرتی ہوئی قیمت کے باوجود پھر بھی ابھی زیادہ ہے خدا کے فضل سے۔ انٹرنیشنل کرنسی میں دیکھیں تو آپ کو فرق زیادہ نظر آئے گا۔ وعدہ جات چودہ لاکھ چالیس ہزار سات سو پاؤنڈ تھے۔ وصولی پندرہ لاکھ آٹھ ہزار تین سو پاؤنڈ ہوئی۔ مگر گزشتہ سال کی وصولی کو دیکھیں تو پھر آپ کو اصل چھلانگ نظر آئے گی۔ اس سے پہلے سال بارہ لاکھ چوبیس ہزار کی وصولی تھی اس سال پندرہ لاکھ کی وصولی ہوئی ہے تو یہ اتنا نمایاں فرق ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ اپنی ذات میں ایک نشان ہے۔

سال اکسٹھ (61) اور باسٹھ (62) کا موازنہ اگر آپ چاہتے ہیں پاؤنڈوں میں اور وصولی کا موازنہ، تو وہ یوں ہے کہ اکسٹھ (61) میں تیرہ لاکھ اکتیس ہزار پاؤنڈ کا وعدہ تھا۔ باسٹھ (62) میں چودہ لاکھ چالیس ہزار سات سو سڑسٹھ کا وعدہ تھا گویا اضافہ وعدوں میں ایک لاکھ نو ہزار ایک سو سنتالیس پاؤنڈ کا ہوا۔ وصولی کے لحاظ سے سال 95-1994ء میں تیرہ لاکھ اکتیس ہزار کے وعدے کے

مقابل پر بارہ لاکھ چوبیس ہزار وصولی ہوئی۔ یہ کم ہے لیکن جس وقت بند کیا گیا تھا اس وقت یہ وصولی تھی اور ایک غلطی انہوں نے یہ کی ہے کہ پاکستانی روپے کو آج کے حساب سے جب اس کو تقسیم کیا ہے تو یہ رقم کم ہوگئی ہے۔ دو سال پہلے جو پاکستانی روپے کی قیمت تھی اگر اگر اس پر ڈھالیں تو پھر یہ رقم باوجود اس کے کہ اضافہ وصولی کے لحاظ سے زیادہ نہیں پھر بھی بڑھ جائے گی لیکن اگلے سال اب آپ دیکھ لیں کہ باسٹھ (62) میں وعدہ چودہ لاکھ چالیس ہزار کا تھا اور روپے کی قیمت گرنے کے باوجود وصولی پندرہ لاکھ آٹھ ہزار تین سو اِکیس ہے۔ پس اگر کوئی پیچھے کمی تھی جو مجھے علم ہے کہ روپوں میں کمی نہیں ہوئی تھی وہ بھی خدا کے فضل سے پوری ہوگئی۔

مجاہدین کی تعداد کے لحاظ سے میں نے کہا تھا کہ بڑھائیں پہلے ایک لاکھ سے بھی کم تھی تو تحریک جدید میں تو لکھوکھہا ہونے چاہئیں۔ اب کیونکہ گزشتہ چند سالوں میں تو تیس چالیس لاکھ کا اضافہ ہو چکا ہے جماعت کی تعداد میں، اس پہلو سے ان میں سے تحریک جدید کے مجاہدین آنے چاہئیں تھے۔ یہ رفتار ابھی کم ہے لیکن بہرحال اضافے کی طرف رجحان ہے ایک لاکھ اکاسی ہزار دو سو انتیس کی بجائے امسال دو لاکھ اٹھارہ ہزار چھ سو چالیس مجاہدین تحریک جدید ہیں اور یہ اضافہ اپنی ذات میں خدا کے فضل سے اکیس فیصد ہے۔ سینتیس ہزار کا اضافہ ہوا، اکیس فیصد اضافہ ہے گویا کہ۔

ممالک کا جہاں تک تعلق ہے امریکہ نے تحریک جدید کے میدان میں حیرت انگیز طور پر قدم آگے بڑھایا ہے گزشتہ سال ان کی وصولی دو لاکھ پچھتر ہزار امریکن ڈالر تھی اور چونکہ انہوں نے وقف جدید میں یہ ارادہ کیا تھا، عزم کیا تھا کہ وقف جدید میں ہم نے دنیا میں کسی کو آگے نہیں نکلنے دینا وہ پورا کر لیا تھا اس لئے میں نے ان پر تحریک جدید میں اتنا زور نہیں دیا۔ میں نے کہا کہیں طاقت سے بڑھ کر نہ بوجھ پڑے لیکن از خود ہی ان کو خیال آیا کہ وقف جدید میں ہم نے اتنا کیا ہے تو تحریک جدید کو کیوں پیچھے چھوڑیں؟ آخر ہماری جماعتیں تحریک جدید ہی کا تو پھل ہیں۔ اس خیال سے انہوں نے کوشش کی گزشتہ سال ان کی وصولی دو لاکھ پچھتر ہزار ڈالر تھی اس سال ان کی وصولی پانچ لاکھ ایک ہزار امریکن ڈالر رہے اور یہ اضافہ بیاسی فیصد بنتا ہے ماشاءاللہ۔

اور مجاہدین کی تعداد میں بھی امریکہ نے حیرت انگیز اضافہ کیا ہے، دو ہزار دو سو مجاہدین تھے گزشتہ سال۔ یہ سال جو گزرا ہے اس میں تین ہزار آٹھ سو انتالیس مجاہدین بڑھے ہیں۔ اب سوال یہ

پیدا ہوتا ہے کہ مجاہدین بڑھے ہیں تو کہیں یہ کوئی رسمی طور پر چھ، چھ روپے لے کر تو نہیں بڑھائے گئے۔ یہ حقیقی اضافہ جو ہے تب پتا چلے گا جب ان کے چندہ دہندگان کے چندوں کی اوسط دیکھیں گے۔ اگر مجاہدین کی تعداد بڑھ رہی ہو اور اوسط گر رہی ہو تو مجاہدین کے لحاظ سے تو خوشی کی خبر ہے مگر اوسط کے لحاظ سے اندازہ ہوگا کہ تھوڑا تھوڑا دے کر خانہ پری کر کے دوست شامل ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم جب اعداد و شمار پر آتے ہیں ان کا موازنہ کرتے رہتے ہیں مختلف پہلوؤں سے۔ گزشتہ سال ان کا فی کس قربانی کا معیار جب کہ چندہ دہندگان دو ہزار دو سو تھے فی کس قربانی کا معیار اناسی پاؤنڈ فی کس تھا امسال جبکہ چندہ دہندگان کی تعداد تین ہزار آٹھ سو انتالیس ہے فی کس قربانی کا معیار بیاسی پاؤنڈ ہو گیا ہے یعنی کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے تو یہ ایک حقیقی اضافہ ہے جس کے متعلق کسی پہلو سے بھی دیکھیں اس کو انسان عزت کی اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔

اس اضافے کے لحاظ سے دوسرا جو ملک غیر معمولی طور پر قدر کے لائق ہے وہ پاکستان ہے۔ پاکستان کی تحریک جدید کو میں نے چھیڑا تھا۔ میں نے کہا خدا کے لئے کچھ شرم کرو، وقف جدید اتنی بعد میں آئی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی تم ابھی تک وہیں بیٹھے ہوئے ہو تو بہت انہوں نے پھر محنت کی ہے۔ وکیل اعلیٰ صاحب نے اپنی خاص نگرانی میں سارے شعبوں کو حرکت دے دی اور انصار، خدام سے استفادہ کئے تو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی فضل فرمایا پہلے ان کی قربانی تھی اعداد و شمار آگے ہیں اتنا کہ پچاسی لاکھ روپے کا اضافہ ہوا ہے ان کا ایک کروڑ کے دائرے میں تھے اتنا مجھے یاد ہے۔ اب خدا نے اتنا زیادہ ان کو آگے بڑھا دیا مگر مشکل یہ ہے کہ دوسرے آگے بڑھنے والے بھی تو تیز بڑھ رہے ہیں اس لئے ان کی پوزیشن اول نہیں آسکی پھر بھی۔

ابھی تک جو دس جماعتیں ہیں ان میں مجموعی وصولی کے لحاظ سے جرمنی نے کسی اور کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اگر چہ ان کا امسال کا اضافہ تھوڑا ہے مگر چونکہ پہلے ہی خدا کے فضل سے وہ بڑی ٹھوس قربانی اور محکم قربانی کر رہے ہیں جس میں تزلزل نہیں ہے تو جرمنی کی اس دفعہ جو پوزیشن ہے وصولی کی تین لاکھ بیالیس ہزار پاؤنڈ ہے۔ امریکہ نمبر دو پر ہے تین لاکھ تیرہ ہزار اور امریکہ نے پاکستان کو ایک نوچ نیچے کر دیا ہے آگے ورنہ پہلے جرمنی کے بعد پاکستان آیا کرتا تھا۔ تو ہے تو یہ گڑ بڑ والی بات لیکن مجبوری ہے نیکی کے کاموں میں دوڑ تو ہوتی ہے کچھ آگے بڑھیں گے، کچھ پیچھے ہٹیں

گے۔تو پاکستانیوں سے معذرت کے ساتھ یہ عرض ہے یہ بڑی انہوں نے دوڑ ماری، بہت کوشش کی ،خوب بھاگے لیکن امریکہ پھر بھی آگے نکل گیا اور یہ جو دوڑ ہے اس کا مزہ آتا ہے دیکھنے کا، مارا مار مقابلے ہورہے ہوں پھر کوئی آگے نکل آئے کوئی پیچھے رہ جائے یہ گھوڑوں کی دوڑ کا جو اصل مزہ ہے وہ یہ ہے کہ Neck to Neck دوڑ ہورہی ہو اور غیر متوقع گھوڑا ایک دم آگے آ جائے تو یہ جو دوڑ ہے قربانیوں کی یہ ہماری گھڑ دوڑ ہے بہت ہی مزے کی قرضہ حسنہ والا مضمون بھی اپنا اور یہ جوا بھی اس پہ لگایا ہوا ہے ہم نے،اسی پر سارا داؤ پیچ ہے۔تو دیکھیں کتنے مزے کی دوڑ ہوئی ہے امریکہ آخر آگے نکل گیا اور برطانیہ کو ماشاء اللہ توفیق ملی ہے چوتھے نمبر کو قائم رکھا ہے یا پیچھے سے آیا مجھے علم نہیں لیکن چوتھا نمبر نہیں چھوڑا برطانیہ نے،کینیڈا پانچویں پر ہے،انڈونیشیا چھٹے پر،سوئٹزرلینڈ ساتویں پر، ہندوستان آٹھویں پر اور ماریشس نویں نمبر پر اور جاپان دسویں نمبر پر ہے۔یہ جو موازنے ہیں یہ پوری طرح حقیقت میں اعداد وشمار کے لحاظ سے ہم نسبتیں تو بنا لیتے ہیں مگر روح قربانی کے یقینی فیصلے اس پر نہیں ہو سکتے کیونکہ ملکوں کے حالات مختلف ہیں اقتصادیات مختلف ہیں فی کس احمدی کتنے ملازمت میں ہیں کتنے فارغ ہیں کتنے تجارت کررہے ہیں بہت سے ایسے عوامل ہیں جو اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے بعض لوگ مجھے احتجاج کے خط لکھ دیتے ہیں کہ آپ نے فلاں بات دیکھی ہوتی تو شاید ہمارا اخلاص زیادہ ثابت ہوتا۔

اخلاص تو اللہ نے دیکھنا ہے۔پس **سبحان من یر انی** پر نظر رکھا کریں۔ہم تو اعداد وشمار کی بات کرتے ہیں اس میں بھی ایک لطف ہے اس سے بھی فائدے پہنچتے ہیں اس سے بھی کچھ لوگ آگے نکل جاتے ہیں اور جو پہلے پیچھے تھے کئی لوگوں میں نئے جذبے بیدار ہوتے ہیں۔تو اس نیک نیت کے ساتھ ایک پر لطف ذکر چلتا ہے۔اس لئے مراد یہ نہیں کہ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ہم ذلیل ہو گئے ہم پیچھے کر دئے گئے، یہ اعداد وشمار پیش اس طرح کئے جاتے تو شاید ہم آگے نکل آتے۔یہ فضول باتیں ہیں اپنی طرف سے جو تجزیہ جائز ہے وہی کیا جاتا ہے اور روپے کی قیمتوں کا بڑھنا، گرنا ورنہ ان بحثوں میں نہیں ہم پڑ سکتے ورنہ یہ اقتصادیات کا ایک ایسا قصہ چل پڑے گا جس کو ماہرین بھی سمیٹ نہیں سکتے،حقیقت میں بہت، بے شمار فیکٹرز ہیں۔

تو اللہ بہر حال مبارک فرمائے امریکہ کو اس نے غیر معمولی ترقی کی،آگے بڑھا۔جرمنی کو بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی ابھی تک اپنی سرداری قائم رکھی ہے۔پاکستان کو یہ فائدہ ہوا کہ بہت گر جاتا

اگر غیر معمولی کوشش نہ کرتے کیونکہ روپیہ بھی گر گیا اور دوسرے ملک اوپر سے آ گئے اس کے باوجود پاکستان کا اوپر آنا ایک بہت بڑی خدا تعالیٰ کے فضل سے توفیق ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر کرنسیوں کی مقامی لحاظ سے یہ جو کرنسیوں نے ترقی کی یا آگے پیچھے ہوئیں ان کے لحاظ سے اگر انہی کرنسیوں میں مقابلے کئے جائیں نہ کہ پاکستانی روپے یا ڈالر میں ڈھال کر یا پاؤنڈوں میں ڈھال کر تو اپنی اپنی کرنسی کے لحاظ سے تو اس طرح پھر ہمیں توفیق مل جاتی ہے کہ پاکستان کو اوّل قرار دے دیں کیونکہ اپنی کرنسی کے اعتبار سے پاکستان نے پچاسی لاکھ اضافہ کیا اور ایک کروڑ ستاسی لاکھ روپے ان کے بنتے ہیں۔

امریکہ نے دو لاکھ چھبیس ہزار پانچ سو پچاس کر کے جو اضافہ کیا ہے وہ بیاسی اعشاریہ اڑتیس فیصد (82.38%) ہے۔ پاکستان کا پاکستانی کرنسی میں تراسی فیصد (83%) ہے تو تھوڑا سا جس کو Neck to neck race کہتے ہیں نا، کہ چوتھائی گردن آگے نکل گیا گھوڑا یا اتنا اس سے بھی کم اور Photo Finish ہے یہ ان دونوں کے درمیان۔ جرمنی کو اس پہلو سے ان دونوں نے کافی پیچھے چھوڑا ہے یعنی چوبیس فیصد جرمنی کا اضافہ ہوا ہے لیکن ان کے حالات جس طرح متوازن چندے دے رہے ہیں ان پر شکوہ کوئی نہیں ہے۔ بہر حال ایک یہ ذریعہ تھا میں چاہتا تھا کہ پاکستان کو بھی کچھ تھوڑا سا مزہ آ جائے اور پاکستان کو مزہ کے لفظ سے اتنا مزہ نہیں آتا جتنا ''سواد'' کے لفظ سے مزہ آتا ہے تو ایسی بھی تھوڑی سی بات کر دی کہ پاکستان کو بھی سواد آ جائے کہ ہاں ہم آگے نکل گئے ہیں ماشاء اللہ۔ باقی اعداد و شمار کی اب اس وقت یہاں گنجائش نہیں ہے کئی پہلو سے تیار کئے گئے ہیں مگر وقت ختم ہو گیا ہے جمعہ کا، میں نے بعد میں سفر پہ بھی جانا ہے۔

تو اس تمہیدی بیان کے بعد ان آیات کی روشنی میں جو میں نے تلاوت کی تھیں، میں تحریک جدید کے نئے سال کا آغاز کرتا ہوں۔ یہ مختلف دفاتر کے لئے مختلف نمبر کے سال ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جماعت کو ہمیشہ اسی طرح ایک پاک محبت کے مقابلے کی دوڑ میں نہ کہ ایک حسد کے مقابلے کی دوڑ میں، پاک محبت کے مقابلے کی دوڑ میں ہمیشہ آگے سے آگے بڑھتا چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

ہر وہ فعل جو خدا کی محبت دلوں میں پیدا کرے اور اسے قریب لائے وہ حقیقی جہاد ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 15 رنومبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ تلاوت کیں:

وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۶﴾ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَ زِیَادَۃٌ ؕ وَ لَا یَرۡہَقُ وُجُوۡہَہُمۡ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّۃٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷﴾ (یونس: 26، 27)

پھر فرمایا:

آج کل خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ جماعت احمدیہ ایک عالمی جہاد میں مصروف ہے جو دعوت الی اللہ کا جہاد ہے جو تمام جہادوں سے افضل اور اعلیٰ اور درحقیقت جہاد کی غایت ہے۔ جہاد کا قیام ہی اللہ کی طرف بلانے کی غرض سے ہے۔ ہر وہ فعل جو خدا تعالیٰ سے پرے دھکیلے وہ جہاد کا برعکس ہے۔ ہر وہ فعل جو خدا کی محبت دلوں میں پیدا کرے اور اسے قریب لائے وہ حقیقی جہاد ہے اس لئے تلوار کے جہاد کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ تلوار جو خدا کی محبت اور خدا کی طرف بلانے کے نام پر اٹھائی جائے اور قتل و غارت پر منتج ہو اس سے خدا تعالیٰ کی محبت تو نہیں بڑھ سکتی اس لئے اس چیز کا نام جہاد رکھنا گناہ ہے اور قرآن کریم کے واضح ارشادات سے متصادم ہے، بالکل ٹکراتا ہے قرآن کریم

کے مضامین سے۔

جہاد کی جو تعریف قرآن کریم نے مختلف جگہ کی ہے وہ بنیادی طور پر وہی ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ ہر وہ چیز جو خدا کے قرب پر منتج ہو جس کے نتیجے میں خواہ نفس اللہ کے قریب آئے یا لوگ اللہ کے قریب آئیں وہ ہر کوشش جہاد ہے۔ تو جہاد کا مرکزی معنی کوشش کا ہے اور اسلامی اصطلاح میں وہ کوشش جو خدا کے قریب کرے اسے جہاد کہتے ہیں اور دعوت الی اللہ کا مقصد کیا ہے۔ اس کا مطلب جنگ اور فساد نہیں ہے بلکہ امن کا قیام ہے۔ یہ دو آیات جن کی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس مضمون کو نہ صرف بیان کرتی ہیں بلکہ درجہ کمال تک پہنچاتی ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں ہم خدا کی طرف بلا رہے ہیں۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (النحل:126) کے ارشاد میں اللہ نے فرمایا ہے اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ ہم خدا کی طرف بلا رہے ہیں۔ مگر کیسے بلانا ہے، کیا مقاصد ہیں، ان کے اوپر روشنی ڈالنے والی یہ آیت ہے۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ یہ تو ممکن نہیں کہ اللہ سلامتی کی طرف بلا رہا ہو اور آپ اللہ کی طرف بلا رہے ہوں اور اس کا نتیجہ جنگ ہو، آپ اللہ کی طرف بلا رہے ہوں اور اس کا نتیجہ فساد ہو اور سلامتی کے برعکس ہو۔ تو اصل بلانا خدا کا بلانا ہے۔ وہی داعی الی اللہ ہے جو خدا کی آواز کے مطابق بلاتا ہے، جس طرف خدا بلا رہا ہے اسی طرف وہ بھی بلا رہا ہو اس لئے اس دعوت الی اللہ کی تشریح یہ ہے کہ تم تو اللہ کی طرف بلا رہے ہو مگر یاد رکھنا کہ تمہارا بلاوا سلامتی کی طرف ہونا چاہئے کیونکہ خدا کا بلاوا سلامتی کی طرف ہے۔ تو کیسے خدا کی طرف بلاؤ گے جب بلاؤ گے فساد کے رنگ میں اور فساد پیدا کرتے ہوئے اور ظلم کے ساتھ اور سفا کی کے ساتھ، تو خدا کی آواز اور ہوگی تمہاری آواز اور ہوگی۔ خدا ایک اور طرف بلا رہا ہوگا، تم ایک اور طرف بلا رہے ہوگے تو یہ دونوں باتوں میں انطباق نہیں ہوتا۔

پس یہ آیت بہت ہی اہم ہے اس نقطہ نگاہ سے کہ خدا کی طرف بلانا کس کو کہتے ہیں اور اس کے مقاصد کیا ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے ساتھ کیا سلوک فرماتا ہے۔ پہلے تو فرمایا وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ اللہ تو امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اگر ساری دنیا دعوت الی اللہ کے نتیجے میں دعوت الی اللہ کو قبول کر لے تو مراد یہ ہوگی کہ تمام دنیا دارالسلام بن جائے، ساری دنیا امن کا گھر بن جائے۔ پس دیکھو دنیا میں کتنے دعاوی کرنے والے ہیں کہ ہم قیام امن کی

خاطر مہمات جاری کرتے ہیں، قیام امن کی خاطر لڑائیاں کرتے ہیں قیام امن کی خاطر ہم نے یہ بڑے بڑے اہم فیصلے کئے ہیں جو غریب قوموں پر زبردستی ٹھونسیں گے۔ یہ سارے دعاوی جھوٹ پر مبنی ہیں کیونکہ ان دعاوی کے بعد ہم نے دنیا میں امن بڑھتا تو کبھی نہیں دیکھا فساد پھیلتے ضرور دیکھے ہیں۔ بدامنی پھیلتی ہے ہر جگہ ظلم وسفا کی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ پس جو مقصد اپنی ذات سے متصادم ہو جائے اس کے اندر ایک اندرونی تضاد ہو وہ مقصد یقیناً جھوٹا ہے اور بے کار ہے اور اس سے کوئی بھی فائدہ بنی نوع انسان کو نہیں پہنچ سکتا۔

پس داعیین الی اللہ کی ہدایت کے لئے میں نے یہ آیت چنی ہے۔ میں آپ کو اب سمجھانا چاہتا ہوں کہ اس میں اور کیا کیا مضامین شامل ہیں۔ پہلی بات تو وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ اس کو بھول کر آپ نے کوئی پیغام نہیں پہنچانا اور سلامتی کی طرف کیسے بلا سکتے ہیں اگر آپ کو سلامتی نصیب نہ ہو۔ پس یہ دوسرا پہلو ہے جو بہت ہی اہم ہے۔ اللہ کا نام سلام ہے اس لئے جب آپ خدا کی طرف بلاتے ہیں تو یہ آیت بتا رہی ہے کہ دارالسلام کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ کا نام بھی سلام ہے۔ پس آپ میں اگر سلام نہ ہو تو آپ سلام کی طرف بلا ہی نہیں سکتے اور امر واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان اگر اپنی فطرت، اپنی طبیعت، اپنے مزاج کا جائزہ لے تو اسے خوب اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کی شخصیت کے کون کون سے پہلو سلام سے خالی ہیں۔ ان میں بدامنی ہے، ان میں بے چینی اور بے قراری ہے اور تضادات کے نتیجہ میں یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ پس دارالسلام کی طرف بلایا جا ہی نہیں سکتا جب تک کہ بلانے والی شخصیت اس بات کا جہاد نہ کرے کہ اس کے اندر سلام پیدا ہونا شروع ہو جائے اور اس کا گھر دارالسلام ہو جائے کیونکہ اللہ تو دارالسلام کی طرف بلاتا ہے۔ اگر بلانے والا دارالسلام اپنے اندر رکھتا ہی نہ ہو تو وہ دارالسلام کی طرف بلانے کا مجاز نہیں۔ اگر مجاز ہے یعنی خدا نے فرمایا ہے کہ بلاؤ تو بلائے گا تو سہی مگر بے کار بلائے گا اس کا نتیجہ کوئی نہیں نکل سکتا۔

وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ فرمایا، بلاتا تو ہے مگر زبردستی نہیں بلاتا اور پہچانتا ہے کہ کون اس لائق ہیں کہ وہ اس گھر کی طرف لے جائے جائیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ مَنۡ يَّشَآءُ فرماتا ہے تو یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فیصلہ کرتا ہے جو جبری فیصلہ ہے جیسے انسان جو چاہے کرے۔ جب یہ آپ کہتے ہیں کہ انسان جو چاہے کرے تو ہمیشہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک

جابر ہے اس کی مرضی ہے وہ مادر پدر آزاد ہے جو اس کے من میں آئے کر گزرے اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پوچھنے والا تو کوئی نہیں مگر اللہ تعالیٰ خود ان صفات حسنہ کے انتہائی مقام پر فائز ہے جس سے آگے صفات حسنہ ہو ہی نہیں سکتیں اور اس کی صفات حسنہ اس پر نگران، خدا کی صفات حسنہ خود نگران ہیں یعنی اس بات کی ضامن ہیں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو صفات حسنہ کو گزند پہنچا سکے کیونکہ جہاں خدا کی ایک صفت نے اپنی جلوہ گری میں دوسری صفت میں نقص ڈالا وہاں خدا، خدا نہ رہا۔ پس یہ کامل عدل اور کامل توازن حسن کامل پیدا کرتا ہے۔

پس اس پہلو سے اللہ تعالیٰ جب یہ فرماتا ہے کہ جس کو چاہتا ہے بلاتا ہے مراد ہرگز یہ نہیں کہ جبری فیصلہ کرتا ہے اقتداری فیصلہ کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہی نہیں کہ وہ اس کے اہل ہے بھی کہ نہیں۔ یَّشَآءُ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جیسا کہ خوب کھول کر بیان فرمایا ہے لفظ یَّشَآءُ میں اچھی بات ہونا لازم ہے۔ چنانچہ براہین احمدیہ میں بھی آپ نے اس مضمون کو خوب تفصیل سے کھولا اور خصوصاً آریوں کے ساتھ بحث اور گفتگو اور عیسائیوں کے ساتھ بحث اور گفتگو میں اس نکتے کو کھولا ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یَّشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ جبراً کسی کو کچھ کہتا ہے یا فیصلہ کرتے وقت بے دلیل فیصلہ کرتا ہے یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ یَّشَآءُ میں چاہنا ہے اور اچھی چیز، بری چیز چاہی نہیں جا سکتی۔ ایک منصف مزاج ناانصافی چاہ ہی نہیں سکتا۔ ایک محبت کرنے والا نفرت چاہ ہی نہیں سکتا۔ تو جب یہ کہا جائے ''اللہ چاہتا ہے'' تو لازم ہے کہ وہ چاہنا مبنی بر عدل ہے، مبنی بر حسن ہے اور ایسا چاہنا ہے کہ اس کے اندر کسی قسم کے ظلم کا کوئی شائبہ تک بھی موجود نہیں۔ پس ان معنوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ دار السلام کی طرف بلاتا ہے مگر سب نہیں آئیں گے۔ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اس کو ہدایت دے گا جس کے متعلق وہ یہ فیصلہ فرماتا ہے کہ وہ اس لائق ہے کہ اسے ہدایت دی جائے اور جس کے لئے خدا کی طرف سے بلانے میں ایک چاہت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یَّشَآءُ کے لفظ میں ایک چاہت کا مضمون بھی ہے۔ آپ جو چیز چاہتے ہیں اس کی طلب کرتے ہیں، اس کی جستجو کرتے ہیں۔ اگر بے اختیار ہوں تو وہی طلب ایک بھڑکی میں تبدیل ہو جاتی ہے ایک آگ سی سینے میں جل جاتی ہے کہ میں چاہتا ہوں اس کو مگر میرے اختیار میں نہیں کہ میں اسے بلا لوں اور اللہ کے اختیار میں ہے۔

تو ایک اور بھی بہت خوب صورت مضمون مَنْ يَّشَآءُ میں یہ موجود ہے کہ بلاتا سب کو ہے مگر جو اس کو پیارے لگتے ہیں جن کے اندر یہ خوب صورتی، اس حسن کا مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ خدا کی طرف آ سکیں تو پھر ان کے لئے اللہ کے دل میں ایک چاہت پیدا ہو جاتی ہے یعنی لفظ مَنْ سے مراد وہ دل نہیں جو انسان کا دل ہے مگر ایک معنوی طور پر ایک چیز دل کہلاتی ہے جو ارادے کا مرکز ہے یا چاہت کا مرکز ہے تو ان معنوں میں اللہ کے دل میں بھی ایسے شخص کے لئے ایک چاہت پیدا ہو جاتی ہے اور جب خدا کے دل میں چاہت پیدا ہو تو وہ آتا ہی آتا ہے اس کے لئے نہ آنا ممکن ہی نہیں رہتا۔ پس دیکھو یہاں تلوار کا کون سا موقع ہے؟ کہیں جبر کی کون سی گنجائش باقی ہے؟

دنیا والے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی جب جذب پیدا ہو جائے تو ایسا جذب بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دوسرے سے ''بن آئے نہ بنے'' مگر وہ جذب اگر پیدا ہو جائے تو پھر اگلے کے لئے بے اختیاری ہو جاتی ہے۔ تو اللہ کے اندر جب کسی کی چاہت پیدا ہو جائے، جب جذب پیدا ہو جائے تو پھر وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ پس خدا کے بندے جو خدا کی طرف بلاتے ہیں ان کے لئے اس میں بہت ہدایت کے سامان ہیں۔ اس آیت کے اسی ٹکڑے میں عظیم مضامین بیان ہوئے ہیں کہ تم جن کو بلاتے ہو یاد رکھو ان کے حسن پر نگاہ رکھو اور کوشش یہ کرو کہ ان کے اندر جو بہترین مادے فطرت میں موجود ہیں ان کو اجاگر کرو ان کو اٹھاؤ اور باہر لاؤ ان کو جو دبے ہوئے ہیں اور مخفی ہیں۔ جس طرح ایک آگ کا متلاشی راکھ کرید کر آگ کے چنگارے ڈھونڈتا ہے ہر انسان میں کچھ خوبیاں مخفی ہیں کچھ مدفون ہیں ان پر نظر رکھو اور ان سے کام لو۔ جب وہ چمک اٹھیں گی جب ان میں جس طرح شعلے میں، آگ کے چنگارے میں یا جلتے ہوئے کوئلے میں جو چنگارا تو کہلاتا ہے مگر وہ ابھی بھڑ کا نہیں ہے اس میں چنگاریاں اس سے اٹھنے لگیں اور اپنے گرد کو جلانے یا روشن کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر وہ دیدہ زیب ہو جاتا ہے وہ نظر کو کھینچنے لگتا ہے تو اسی طرح مومن کے دل میں بھی کچھ نیکیاں دبی ہوتی ہیں جب وہ اٹھتی ہیں تو پھر اللہ کی توجہ ان کی طرف پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ ایسا نور تھا جو ویسے ہی بھڑک اٹھنے کو تیار تھا۔ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (النور: 36) آگ اسے چھوئے نہ چھوئے اس سے قطع نظر اس کی ذات میں شعلہ بننا اور چمک اٹھنا اور ماحول کو روشن کر دینا اس طرح شامل تھا کہ فطرتاً اس میں یہ مادہ پایا جاتا

تھا اس نے ہونا ہی تھا یہ، اس پر آسمان سے اللہ تعالیٰ کے نور کا شعلہ اترا ہے اور نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ وہ نور پر نور بن گیا۔ تو اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو چاہا تو بے مقصد تو نہ چاہا، بے وجہ تو نہیں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اختیار فرمایا اور فضیلت بخشی۔ نور کا آغاز آپؐ کی ذات میں ہے وہاں وہ چمکا ہے وہاں سے وہ اٹھ کر دنیا کو روشن کرنے پر آمادہ ہوا تھا تب آسمان سے وہ شعلہ نور اترا ہے جس نے اپنے ساتھ اس کو چمٹا لیا اور ایک خدا اور بندے کا جس حد تک بھی اتصال ممکن ہے وہ اتصال ہمیں آنحضرت ﷺ کے نور کا خدا کے نور کے ساتھ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

تو یہی مضمون ہے جو ہر بندے پر کسی نہ کسی حد تک اس کی توفیق کے مطابق جاری ہوتا ہے اور یَّشَآءُ کا مطلب سمجھ آجاتا ہے۔ اللہ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو چنا، جس کو چاہتا چن سکتا تھا مگر اس کے چاہنے میں ایک حسن ہے اس بات کو لوگ بھول جاتے ہیں اور وہ بد چیز کو چاہ ہی نہیں سکتا۔ جس کو سب سے اچھا چاہا اس میں سب سے اچھا ہونے کی صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ سب سے اچھا بننے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے جیسا وہ تھا ویسا ہی اس سے سلوک فرمایا۔ پس تقدیر اور تدبیر کا جو سنگم ہے وہ اس طرح پیدا ہوتا ہے۔ بندے کی تدبیر کے مطابق خدا کی تقدیر اترتی ہے اور یہ دونوں مل کر پھر تقدیر ہی بن جاتے ہیں پھر تدبیر جدا نہیں رہتی۔ تو اس مضمون کو میں بیان کر رہا ہوں۔ بہت ہی اعلیٰ شان کے انسانوں میں تو ہمیں دکھائی دینے لگتا ہے مگر عام انسانوں میں یہ دکھائی نہیں دیتا جس کی وجہ سے ہم سے کوتاہی ہو جاتی ہے اور ہماری کوتاہی کے نتیجے میں ہماری دعوت الی اللہ کی کوششیں ضائع چلی جاتی ہیں۔

پس پہلی نصیحت آپ کو یہ ہے کہ جن کو آپ خدا کے رستے کی طرف بلاتے ہیں ان میں خوبیوں کی تلاش کریں بلکہ ان کو چاہیں جو اچھے ہیں جن کی خوبیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ کج بحثوں اور ضدی لوگوں سے یا بد اخلاق لوگوں سے کئی داعی الی اللہ سر ٹکراتے رہتے ہیں، ساری عمران کی یہ سر ٹکراتے گزر جاتی ہے اپنا سر پھوڑتے ہیں اور اس کے سر میں کچھ داخل نہیں کر سکتے اس لئے کہ خدا تعالیٰ کی سنت کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ پس اس مضمون کو اور آگے بڑھائیں اور پھیلائیں تو پھر یہ حکمت عملی ہمارے سامنے آئے گی کہ تمہیں لازماً حسن کی تلاش کرنی ہے تا کہ اسے چمکاؤ، اسے اور زیادہ کر دو اور ایسا کر دو کہ اللہ کی پیار کی نظر اس پر پڑنے لگے۔ جب خدا کی نظر اس پر پڑے گی تو پھر تم ایک طرف ہو جاؤ اس نے آنا ہی آنا ہے۔ اور

بلاتے تو تم ہو مگر وہ لبیک کہے گا خدا کی آواز پر اور رسولؐ کی آواز پر نہ کہ تمہاری آواز پر۔ تو داعی الی اللہ کا یہ غرور بھی توڑ دیا کہ ہم نے بلایا تھا اس لئے وہ احمدی ہو گیا، ہم نے دعوت دی تھی اس لئے اس نے حق کو قبول کیا۔ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (آل عمران: 173) وہ استجابت کرتے ہیں یا کی تو اللہ اور رسولؐ کے لئے کی کیونکہ رسولِ خدا کی صفات کا مظہر بنا ہوا تھا۔

تو اس لئے دعوت الی اللہ والے کے لئے ان آیات میں بہت ہی عظیم حکمتوں کے سمندر موجزن ہیں۔ اگر آپ ان کی تہہ میں اتر کر دیکھیں تو پتا چلے گا کہ حکمتوں کے سمندر ہیں جو قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں جو کوزے سے بھی چھوٹی ہیں ان میں آپ کو بھرے ہوئے اور موجیں مارتے ہوئے دکھائی دینے لگیں گے۔ تو پہلی بات تو یہ یاد رکھیں کہ آپ نے حسن کی تلاش کرنی ہے اور حسن ہر انسان میں موجود ہوتا ہے لیکن بعضوں میں زیادہ بعضوں میں کم۔ تو حسن کا متلاشی پہلے تو زیادہ حسن کی طرف جایا کرتا ہے نہ کہ کم حسن کی طرف، کم حسن کی طرف تو تب جاتا ہے جب زیادہ حسن ملے نہ۔ اگر سونے کی ڈلیاں ریت پر بکھری پڑی ہوں تو ریت کے اندر جو ریت کے ذرّوں کی طرح سونا ملا ہوا ہوتا ہے اس کے کھوج میں وہ وقت ضائع نہیں کرے گا پہلے وہ ڈلیوں کو چنے گا جب ڈلیاں ختم ہو جائیں پھر ریت کی باری آتی ہے پھر ان باریک ذرّوں کی تلاش ہوتی ہے پھر اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے گڑھے کھودنے پڑتے ہیں۔ ان میں پانی ڈال کر یا نہروں کے پانی کا رخ اس طرف پھیر کر ان میں وہ ریت کو ڈالتے اور بار بار کھنگالتے ہیں یہاں تک کہ سونا الگ اور ریت الگ ہو جائے، محنت پھر بھی وہ کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ چونکہ تھوڑا سونا ہے نسبتاً زیادہ محنت کرنی پڑے گی اس لئے چھوڑ ہی دو۔ تو آپ نے چھوڑنا تو ہے نہیں، آپ کو چھوڑنے کا حکم ہی نہیں ہے۔ حکم یہ ہے کہ حسن کی تلاش کرو ایسا حسن جس پر اللہ کی نظر پڑنے لگے اور اس مضمون کے لئے اگلی آیت اس مضمون کو جیسا کہ مزید بڑھائے گی، اس مضمون کے لئے نہیں اس مضمون کو سمجھنے کے لئے اگلی آیت یا اس آیت کا اگلا ٹکڑا ہے وہ اس کو خوب روشن کر دے گا جب ہم وہاں تک پہنچیں گے، لیکن نصیحت کے طور پر میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ پہلے خدا کے اچھے صاف ستھرے بندوں کی تلاش کریں وہاں سے دعوت الی اللہ شروع کریں تھوڑے وقت میں آپ کو زیادہ پھل ملے گا اور ایسے سعید فطرت بھی بندے ہوتے ہیں جن کو اگر آپ نہ بھی کہیں تو اللہ ویسے ہی بلا لاتا ہے چنانچہ وحی کے ذریعے، کشوف کے ذریعے، الہامات کے ذریعے، ایسے واقعات کے نتیجے میں جو بظاہر اتفاقات ہوتے ہیں مگر

جب ان پر آپ نظر ڈالتے ہیں تو اتفاق نہیں بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک تقدیر جاری ہو رہی ہوتی ہے اس لئے وہ اتفاق نہیں کہلا سکتے۔

چنانچہ خدا کے بہت سے ایسے نیک بندے جن تک پیغام پہنچا ہے ان کے حالات جب مجھ تک پہنچے ہیں تو ایک نہیں بے شمار ایسے شواہد دکھائی دیتے ہیں ایسے گواہ مہیا ہو جاتے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کی نظر ان پر پڑی تھی تو پھر حالات کو اس کے مطابق اس کو حاصل کرنے کے لئے ساز گار فرما دیا گیا۔ چلتے چلتے بظاہر ایک حادثے کے نتیجے میں اس کا رخ بدل جاتا ہے، بظاہر اتفاقاً ایک احمدی کے دروازے پر دستک دیتا ہے بظاہر اتفاقاً اسے اندر بلا لیا جاتا ہے، بظاہر اتفاقاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصویر وہاں لٹکی دکھائی دیتی ہے اور بظاہر اتفاقاً اسے پہلے سے ہی خواب آئی ہوئی ہے کہ یہ وجود ہے جو مجھے بلا رہا ہے۔ تو سب جگہ کہنے والا کہے گا اتفاقاً، اتفاقاً، اتفاقاً، اتفاقاً'' لیکن جو اس مضمون کو سمجھتا ہے وہ کہے گا بظاہر اتفاقاً۔ دیکھنے والا اتفاقاً بھی کہہ سکتا ہے مگر اتفاق کے سلسلے کو اتفاقاً نہیں کہہ سکتا۔ ہر چیز اتفاقاً ہو سکتی ہے، اتفاقاً اس نے کہیں تو جانا تھا رستہ بھولنا تھا تو کسی گلی میں تو نکلنا تھا، اتفاقاً کسی کا دروازہ تو کھٹکھٹانا تھا مگر اگر ہر اتفاق ایک خاص رخ کی طرف آگے بڑھ رہا ہو، اگر وہ گلی احمدی کی گلی نکلے، اگر وہ دروازہ احمدی کا دروازہ نکلے، وہ احمدی موجود ہو اور ایسا حسن خلق رکھتا ہو کہ دروازہ کھٹکھٹانے والے کو اندر آنے کی دعوت دے اور اس کی خاطر مدارات کرے اور وہاں تصویر لٹکی ہو جو اتفاقاً بھی ہو سکتی تھی مگر اسی کمرے میں بٹھائے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصویر ہو اور پھر خواب آئی ہو تو اتفاقاً اب بتائیں کون پاگل ہے جو ان سب باتوں کو اکٹھا اتفاق کہے گا؟ تو ہر اتفاق میں تنہائی پائی جاتی ہے۔ جہاں دو اتفاق اکٹھے ہوں وہاں اتفاق کی بجائے کسی تجویز کا مضمون ابھرتا ہے کہ مجوزہ بات ہے۔ کوئی تین ہو جائیں تو اور بھی زیادہ اس بات کا امکان شروع ہو جاتا ہے کہ سوچی سمجھی تدبیر ہے اور جب اس سے زیادہ ہو جائیں تو پھر تو اتفاق کہنا ہی حد سے زیادہ بے وقوفی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بلانا ہے اور اللہ تعالیٰ ویسے ہی نیک بندوں کا رخ اس طرح پھیر رہا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

؎ آ رہا ہے اس طرف احرار یورپ کا مزاج
نبض پھر چلنے لگی مردوں کی ناگہ زندہ وار (درثمین اُردو: 130)

تو خدا کی تقدیر یہ فیصلے کرتی ہے کہ کب موسم آیا ہے پھل کے پکنے کا، کب نیک روحوں کو سمیٹنے کی کوشش ہونی چاہئے، کب خدا کی طرف سے آسمان سے ایسے نشان اتریں کہ نیک روحیں ان نشانات کو دیکھ کر خدا کے رستے کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ سب وہ تقدیر کے پہلو ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دے رہے مگر اللہ کی ہر بات سوچی سمجھی ایک تدبیر کے مطابق رونما ہوتی ہے۔

پس اس دور میں اللہ کو حسن کی تلاش ہے اور وہ آپ کی کوشش کے بغیر بھی اکٹھے کر کر کے لا رہا ہے۔ پس جو آپ کی کوشش ہے اس کو جب پھل لگتے ہیں تو دراصل یہ بھی خدا ہی کی تدبیر کا ایک حصہ ہے اور خدا کی تدبیر کو تقدیر بھی کہتے ہیں۔ اللہ اس کو تدبیر بھی کہتا ہے قرآن کریم میں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (یونس: 32) وہ تقدیروں کے فیصلے، امر یہاں تقدیر ہے، اللہ تدبیر کے ذریعے کرتا ہے۔ تو تقدیر سے بالا ایک تدبیر ہے جو خدا کی تدبیر ہے۔ تو اس پہلو سے خدا کی تدبیر نے جو تقدیر ہم پر کھول دی ہے وہ تمام دنیا کی سعید روحوں کو ایک ہاتھ پر اکٹھا کرنے کی تقدیر ہے۔ اس کے لئے خدا تعالیٰ نے جو ہمیں طریق سمجھائے ہیں ان میں سے یہ ایک طریق ہے جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں اچھے لوگوں کی تلاش کریں اللہ کو ان کی ضرورت ہے اور جن میں کم حسن ہے ان میں حسن پیدا کریں کیونکہ جو نسبتاً کم حسن رکھتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ پھر حسن پیدا کریں۔ اگر آپ حسن نہیں پیدا کریں گے تو آپ کے ہاتھ وہ پھل نہیں لگیں گے جن کی آپ کو حرص ہے اور حرص بھی بے جا ہے کیونکہ گندوں کو شامل کرنا اور نام کے طور پر تعداد بڑھانا یہ تو دعوت الی اللہ کا مقصد ہی نہیں ہے۔ دعوت الی اللہ کے نتیجے میں یہ تعداد بڑھتی ہے تو نیکی کو تقویت دینے کی خاطر بڑھتی ہے اور اس پہلو سے تعداد کا بڑھنا مفید ہے۔ مگر گند اکٹھا کر لیں، بد اکٹھے کر لیں تو یہ دعوت الی اللہ کے مقصد کے بالکل منافی مقصد ہے بلکہ جو کچھ دعوت الی اللہ ہوئی ہے اس کو نقصان پہنچانے والا مقصد ہے۔ تو آپ یاد رکھیں آپ نے پہلا کام اچھوں کی تلاش، دوسرا کام اچھی باتیں تلاش کر کے ان کو ابھارنا اور ان کے ذریعے حسن کو بڑھانا ہے اور یہ جو کام ہے اس کے لئے بھی حکمت چاہئے تبھی خدا تعالیٰ ہمیشہ دعوت کے مضمون کے ساتھ حکمت کا مضمون باندھتا ہے۔

اب ایک شخص کی خوبی کو پہچان لیں اور اس کا ذکر اس سے کریں تو خواہ وہ کیسا ہی بدہو اس کا دل دراصل یہی چاہتا ہے کہ میں اچھا ہوں اور جب کوئی شخص اس کی کسی اچھی بات پر نظر ڈالے تو وہ

بہت خوش ہوتا ہے خواہ سر سے پاؤں تک بدیوں سے وہ داغ دار ہو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ آپ میں اگر پہچان ہے، اگر عرفان ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کسی کی خوبی کو پہچان کر اس پر کام کریں، نہ کہ اس کی بدیوں سے بات شروع کریں۔ بدیوں پر غلبہ کے لئے کوئی وہاں Foot Hold ہونا ضروری ہے۔ جب فوجیں کسی دوسرے ملک پر حملہ کرتی ہیں تو اس کو فتح کرنے کے لئے پہلے وہاں ایک چھوٹی سی جگہ تجویز کرتے ہیں کہ یہاں ہم اتریں، یہاں اپنا وہ قدم جمائیں جس قدم کے جمانے کے بعد پھر ہم اردگرد کام کر سکتے ہیں۔ تو یہ بھی بیہودہ طریق ہے کہ پہلے بدیوں پر ہی حملہ کر دو۔ قدم جمانے کے لئے اپنے مزاج کی چیز پر قدم جمایا جاتا ہے۔ جو سرزمین قبول کر سکے کسی فوجی یلغار کو اسی کو چُنا جاتا ہے۔ پس حکمت عملی کا تقاضا یہ ہوتا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے یہاں تک کہ ابھی زائر میں جو انگلستان کا یہاں سے فوجی وفد روانہ ہونے والا تھا اس کے کمانڈر نے اپنے بیان میں یہ بات بھی داخل کی۔ ان سے پوچھا کسی ٹیلی ویژن کے ایک سوال کرنے والے نے کہ آپ کیسے کام کریں گے۔ اس نے کہا سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ وہاں قدم جمانے کے لئے کون سی جگہ موزوں ہے جب تک ہمیں وہ جگہ نہ مل جائے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے تو جائزہ لے کر اس جگہ کو ڈھونڈیں گے پھر وہاں قدم جمائیں گے پھر اردگرد کا کام آسان ہو جائے گا۔ تو کسی انسان کو دعوت دے کر بلانے سے پہلے اس کے دل میں وہ جگہ تو ڈھونڈیں جس میں آپ کا قدم صدق، آپ کی سچائی کا قدم مضبوطی کے ساتھ گڑ جائے اور وہ خوبیوں کی جگہ پر ہوگا۔ یہ ایسا ہونا صرف خوبی کی جگہ پر ممکن ہوگا۔ یہ نہیں کہ ہر اس کی عادت کے ساتھ اپنا تعلق باندھنا، اگر اکثر بد ہے تو آپ کو بد ہوئے بغیر اس سے تعلق قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

پس خوبی کی تلاش کرنا اور اس سے تعلق باندھنا ضروری ہے پھر ماحول کو رفتہ رفتہ خوبیوں میں تبدیل کرنے کا کام ممکن ہے اور وہ شخص جس کے ساتھ یہ تعلق قائم ہوا اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ وہ ضرور آپ کی نیکی سے پہلے سے زیادہ مغلوب ہوتا چلا جاتا ہے اور متأثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں بھی یہی حساب ہے کسی بچے کو مائیں ڈانٹ ڈانٹ کر ٹھیک کرنے کی جتنی مرضی کوشش کر لیں کبھی بھی نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ بغاوت پیدا ہوتی جاتی ہے ضد ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں جب دورے کرتا ہوں تو بسا اوقات مائیں ایسے بچوں کو لے کر آتی ہیں کہتی ہیں ہماری تو بات ہی نہیں مانتا،

یہ تو سرکش ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور جب وہ کہہ رہی ہوتی ہیں میں اس کے بچے کی آنکھوں میں غیظ و غضب دیکھ رہا ہوتا ہوں اور بھی زیادہ متنفر ہو رہا ہوتا ہے ماں باپ سے کہ ہمیں تو یہ ملانے کے لئے لائے تھے کہ ٹیلی ویژن پہ ہم جس کو دیکھا کرتے تھے اس سے ملاقات ہوگی اور وہ ہمیں چاکلیٹ بھی دے گا تو اس کو تو ہمارا دشمن بنا رہے ہیں یہ۔ تو وہ پہلے سے زیادہ متنفر ہو جاتے ہیں۔ پھر میں ان کو آگے بلاتا ہوں پیار سے اور کافی ان میں غصہ آ چکا ہوتا ہے اس وقت تک، پیار کر کے، تھپکا کر، آہستہ آہستہ باتیں کر کے ان کا خوف دور کرتا ہوں۔ کہتا ہوں ماں باپ کی بات نہ سنو، تم تو اچھے ہو، اندر سے تم اچھے ہو نا آخر۔ کہتے ہیں ہاں ہم اچھے ہیں تو جب وہ اپنی اچھائی تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ بعض دفعہ ماں باپ بھی بتانے لگ جاتے ہیں کہ ہاں اس میں یہ بات تو ہے۔ تو میں نے کہا جب یہ بات ہے تو کیوں آپ نے اس کو بد بنا کر پیش کیا۔ پھر اس سے باتیں ہوتی ہیں رفتہ رفتہ، بلا استثناء آج تک میں نے کبھی اس حکمت عملی کو جو خدا کی سکھائی، قرآن کی حکمت عملی ہے ناکام ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی خوبیوں کو جب بیان ہوتا دیکھتا ہے اور خوبی کے حوالے سے میں اس سے وعدے لیتا ہوں کہ تم نے اب یہ کام بھی نہیں کرنا وہ بھی نہیں کرنا تو وعدے کرتا ہے اور اگلی ملاقات میں یا بعض دفعہ خطوں کے ذریعے ماں باپ شکریہ ادا کرتے ہیں کہ واقعۃً تبدیل ہو گیا ہے اور پھر وہ مستقل تبدیلی رہتی ہے۔

ایسے بچے بھی جن کو سکول کے اساتذہ تبدیل نہیں کر سکے اور ماں باپ کو شکایتیں کرتے تھے کہ شاید یہ پڑھنے کے قابل ہی نہ سمجھا جائے اس میں یہ برائیاں ہیں جب ان سے اس طریق پر بات کی جو خوب صورتی کی تلاش اور خوب صورتی پر عمل درآمد کر کے اس کے اندر نیا حسن پیدا کرتا ہے تو اس کے بعد، یعنی ایسی مثالیں ہیں جو معین میں بیان کر رہا ہوں کوئی فرضی باتیں نہیں کر رہا، ان کے ماں باپ نے بتایا کہ اساتذہ نے تعریف کی ہے اس کی اب کہ اس بچے میں تو انقلاب آ گیا ہے۔ تو آپ نے جو باتیں بچے میں انقلاب کرنے کے لئے کرنی ہیں وہ ساری دنیا میں وہی کام آئیں گی۔ ان باتوں میں انسانی فطرت ہے جو مرکزی نقطہ ہے وہ ہر بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورت سب میں برابر ہوتی ہے اور یہی حکمت عملی ہے جو دنیا کو دعوت الی اللہ کی طرف بلانے میں کامیاب ہوگی۔

تو اپنے تعلقات بڑھائیں محض پیغام نہ دیں۔ گردو پیش احسان کا مضمون جاری کریں اور پھر خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے ان کی خوبیوں کو آگے بڑھائیں۔ جب خوبیوں میں ایک قسم کا بڑھنے کا

مادہ از خود جاگ اٹھے گا تو آپ سمجھیں گے کہ آپ کام کر رہے ہیں، دراصل اللہ کی تقدیر کام کرتی ہے گویا Takeover کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اور پھر اسے کھینچ کر اپنی طرف لے آتا ہے۔ چنانچہ یہ آیت اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے یوں بیان کرتی ہے۔ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ پھر جسے اللہ تعالیٰ پسند کرنے لگتا ہے اسے صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کی طرف لے آتا ہے۔ مَنْ يَّشَآءُ میں کون مَنْ ہے۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا یہ جو فعل ہے اللہ تعالیٰ کا يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ، يَهْدِيْ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا ہے اصل میں ''ل'' کا تعلق يَهْدِيْ سے لگتا ہے اور بھی اس میں مضامین ہیں اگر وقت اجازت دے گا تو میں اس کو سمجھاؤں گا لیکن پہلی بات یاد رکھیں کہ اللہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اَحْسَنُوْا جو اپنی بدیوں کو دور کر کے حسن میں تبدیل کرتے ہیں۔

اَحْسَنُوْا کا جو لفظ ہے یہ بہت وسیع معنی رکھتا ہے، ایک یہ کہ وہ لوگ جو احسان کریں کسی پر ان کا اللہ مددگار بن جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ دوسروں کی بدی کو دور کر کے حسن میں تبدیل کریں۔ تیسرا یہ کہ اپنے حسن کو اور بھی زیادہ اجاگر کریں۔ پس یہ تین چیزیں بیک وقت شروع ہونی چاہئیں اور ساتھ ساتھ چلتی رہنی چاہئیں۔ پس لِلَّذِيْنَ کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ہدایت ان کو دیتا ہے۔ دوسرا آیت کا یہ ٹکڑا اپنی ذات میں ایک مکمل الگ مضمون بھی رکھتا ہے اور وہ اس طرح ہوگا کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وہ لوگ جو احسان کرنے والے ہیں ان کے لئے حُسْنٰى ہے یہاں الْحُسْنٰى جواب ہو جائے گا۔ لِلَّذِيْنَ کا۔ وہ لوگ جو احسان کرنے والے ہیں ان کا کیا ہے؟ ان کے لئے حُسْنٰى ہے وَزِيَادَةٌ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

اب ''حُسْنٰى'' کیا ہوتی ہے۔ حُسْنٰى کا عام معنی تو ہے اچھی بات لیکن اہل لغت بیان کرتے ہیں کہ حُسْنٰى کسی خوبی کا درجہ کمال تک پہنچنا ہے اور اس کو Superlative Degree جو انگریزی میں کہا جاتا ہے وہی حُسْنٰى پر بھی صادق آتا ہے۔ افضل اور تفضیل کا جو صیغہ ہے، جو معنی اس میں پائے جاتے ہیں وہ حُسْنٰى لفظ میں پائے جاتے ہیں سب سے اچھی، سب سے اعلیٰ۔ تو لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا اگر آپ اَحْسَنُوْا فعل کو الگ بیان کر کے ذرا رُکیں اور پھر کہیں الْحُسْنٰى ان کے لئے حُسْنٰى ہے تو گویا آیت کا یہ ٹکڑا اپنی ذات میں مکمل آیت بن جاتی ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کو کھینچ تان کر بنانے کی ضرورت نہیں بعینہٖ یہی معنی اس کے اندر داخل ہے۔ پس لِلَّذِيْنَ

اَحۡسَنُوا وہ لوگ جو اس کام میں مصروف ہوتے ہیں کہ دوسروں پر احسان کر رہے ہیں، دوسروں کے حسن کو بہتر بنا رہے ہیں پھر خدا کی تقدیر ان کے اندر بھی ان کے حسن کو بڑھانے لگتی ہے یعنی یہ جزأ کے طور پر ہے اور لفظ ''زِيَادَةٌ'' نے صاف بتا دیا کہ جزأ ہی مراد ہے کیونکہ خدا تعالیٰ بندے کے اعمال کی جزأ اُن کے حقوق سے ہمیشہ زیادہ دیتا ہے۔

فرمایا وہ لوگ جو دعوت الی اللہ کر رہے ہیں لوگوں کو بلا رہے ہیں خدا کی طرف دارالسلام کی طرف بلا رہے ہیں کیونکہ اللہ بھی دارالسلام کی طرف بلاتا ہے ان کو جزأ کے طور پر اللہ تعالیٰ یہ توفیق بخشتا ہے کہ ان کی اپنی خوبیاں بڑھ کر حُسۡنٰی کا مقام حاصل کر لیتی ہیں یعنی درجہ کمال کو جا پہنچتی ہیں۔ وَ زِيَادَةٌ اور جب درجہ کمال کو پہنچ گئیں تو زِيَادَةٌ کیا ہوا۔ زِيَادَةٌ میں وہ شعلہ نور والی بات ہے جو پہلے رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں۔ آنحضرت ﷺ کا حسن اس آیت میں جو آیت نور ہے اس میں درجہ کمال تک پہنچتا ہوا دکھایا جا رہا ہے اس سے آگے وہ بڑھ نہیں سکتا بھڑک اٹھا ہے، پھر زیادہ کیسے ہوا۔ اس لئے کہ اللہ کا نور اس میں اتر آیا اور جب اللہ کا نور اتر آیا ہے تو انسانی درجہ کمال کا مقام ختم ہو گیا پھر خدا کے کمال میں سفر کا مضمون شروع ہو جاتا ہے اور وہ لامتناہی ہے۔

پس بہت ہی عظیم اجر کا دعویٰ ہے جو داعیین الی اللہ کے لئے ہے کیونکہ سارا مضمون ہی وہ ہے اور اتنا عظیم الشان دعویٰ ہے کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں، کوئی آخری اس کا کنارہ نہیں ہے۔ جو لوگ بھی خدا کی خاطر حسن پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اور حسن کے ساتھ لوگوں پر احسان کریں گے ان کے لئے خدا وعدہ فرماتا ہے کہ ان کے حسن کو اس حسن کی صلاحیتوں کے آخری کناروں تک پہنچا دے گا جس سے بڑھ کر انسان میں حسن ہو نہیں سکتا۔ جب وہاں پہنچ گیا، اپنے درجہ کمال کو پہنچ گیا پھر اپنے حسن کا نور ان پر اتارے گا اور پھر کوئی اس کی انتہاء نہیں ہے زِيَادَةٌ ہی بس ایک لفظ ہے جو بیان کیا جا سکتا ہے کیونکہ زِيَادَةٌ میں سب سے زیادہ کی بحث نہیں چھیڑی گئی، ہو ہی نہیں سکتی تھی، ان کا نور پھر خدا کے تعلق کی بناء پر، اس سے وصل کے نتیجہ میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

پس آپ دعوت الی اللہ کے اس اعلیٰ عرفان سے آراستہ ہو کر جو اس آیت کریمہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے پھر سفر شروع کریں ان لوگوں کی تلاش کریں جن کو خدا کی طرف بلانا ہے ان کی خوبیوں پر نظر رکھیں ان کی تلاش کریں جس طرح اللہ خوبیوں پر نظر رکھتا ہے اور تعلق جوڑتا ہے بعینہٖ یہی مضمون

ہے جو یہاں ہمارے سامنے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ بندے اور خدا کے تعلق میں یہی معرفت کا نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کا غیر اللہ سے تعلق کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ ہر غیر اللہ محدود ہے، ہر غیر اللہ کوئی نہ کوئی نقص رکھتا ہے، ہر انسان خواہ کتنا بھی خوب صورت دکھائی دے جب خدا کے زاویہ نظر سے اس کو دیکھیں گے اس میں نقائص دکھائی دیں گے اس میں کمزوریاں نظر آئیں گی۔ اوّل تو بندوں کے نقطہ نظر سے بھی بے شمار کمزوریاں ہیں۔ انسان کا اپنا نقطہ نظر جو ہے جہاں سے وہ اپنی ذات کو جانچتا ہے اگر وہ اچھا اور سچا ہو تو انسان اپنے اندر اتنی بدیاں پائے گا کہ اس کے ہوش وحواس گم ہو جائیں گے۔ وہی ظفر کا شعر ہے جو میں پہلے بھی کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں ہر دفعہ اس موقع پر مجھے یاد آتا ہے چونکہ اچھا ہے اس لئے میں اس کو بار بار بیان کرنے سے تھکتا نہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے اس نکتہ کو اردو شعر میں بہت عمدگی سے بیان کیا وہ کہتا ہے

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر

اپنے حال سے جب تک غافل تھے لوگوں کے عیب وہنر تلاش کرتے رہے۔

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اپنی برائیاں دکھائی دینے لگیں تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کے مقابل پر کوئی بھی برا دکھائی نہیں دیا۔

اب بظاہر یہ ایک شعری مبالغہ ہے لیکن میرے نزدیک ظفر نے خواہ حقیقت کو پہچان کر کہا تھا یا شعر کو خوب صورت بنانے کے لئے کہا تھا جو بات کہہ گیا وہ بات بالکل سچی ہے کیونکہ انسان اپنی برائیاں زیادہ دیکھ سکتا ہی نہیں جتنی مرضی تلاش کر لے۔ ہر انسان نے اپنی برائیوں پر اتنے پردے ڈھانپے ہوئے ہوتے ہیں اور اتنی احتیاطیں برتی جاتی ہیں کہ اس کی برائیاں دکھائی دینا شاذ کا کام ہے۔ وہ جو بد آپ کو دکھائی دیتے ہیں بے حیا بھی ہوں تب بھی آپ کو نہیں پتا کہ جو دکھائی دے رہی ہیں برائیاں وہ تو جس طرح ایک آئس برگ کی ٹپ ہوتی ہے برف کا تودہ جو سمندر میں تیر رہا ہے ایک بٹا دس (1/10) صرف نظر آتا ہے اس کا باقی حصہ سب چھپا ہوتا ہے۔ تو برائیاں ساری کی ساری تو کسی کی پتا لگ ہی نہیں سکتیں صرف ایک ہے وجود جس کی برائیاں آپ کو پتا لگ سکتی ہیں وہ آپ کا اپنا وجود ہے اور اگر آپ دیانت داری سے اپنی برائیاں تلاش کر لیں تو ''**نگاہ میں کوئی برا نہ رہا**'' والا مضمون ضرور سچائی کے ساتھ صادق آئے گا۔

پس جب یہ حال ہے انسان کا تو اللہ کا تعلق کیسے قائم ہو جائے۔ بدوں کے ساتھ تو تعلق قائم نہیں ہوا کرتا۔ اس نکتہ کو آنحضرت ﷺ نے جس طرح سمجھایا حیرت انگیز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک ہی بات پر دل بے اختیار عاشق ہوتا ہے اچھل اچھل کر، جس طرح دودھ کے لئے بچے کا دل اچھلتا ہے اور بچے کی پکار پر ماں کا دل اچھلتا ہے اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہر بات پر طالبِ حق کا دل بے اختیار سینے میں اچھلنے لگتا ہے۔ دیکھیں کیسا نکتہ بیان فرمایا، فرمایا خدا کی مخلوق ہے، ناممکن ہے کہ وہ کلیۃً حسن سے خالی ہو کیونکہ جب خالق حسین ہے تو اس کے نقش کو چاہے جتنا مرضی آپ گندہ کر دیں کہیں نہ کہیں سے اس کا حسن ضرور جھانکے گا۔ مٹی ہوئی چیزیں بھی اپنے سابقہ حسن کی داستان خود دُہراتی ہیں۔ کھنڈروں کو دیکھیں، بڑی بڑی عمارتوں، بڑے بڑے عظیم محلات کے کھنڈرات بھی بظاہر جنوں، بھوتوں اور گیدڑوں اور بچھوؤں اور سانپوں کی آماجگاہ بن جاتے ہیں مگر جب آپ ان کا معائنہ کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں تو آپ کو دکھائی دیتا ہے کہ کسی زمانے میں بہت خوب صورت عمارتیں تھیں کیونکہ حسن کا نقش کلیۃً مٹ ہی نہیں سکتا۔ پس اس پہلو سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ وہ کلیۃً بد ہی ہوگی، کوئی انسان حسن سے عاری ہو گیا ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔

تو آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ جب بندے سے تعلق رکھتا ہے تو اس حسن کے مقام پر اپنے 'قدم صدق' کو جماتا ہے۔ وہاں اپنا سچائی کا قدم رکھتا ہے جو حسین اور ستھرا مقام ہے۔ پس جس طرح فوجیں Move کرتی ہیں فتح کرنے کے لئے ایک علاقے کو اور وہاں ایک War Head بناتی ہیں جہاں سے پھر انہوں نے آگے جنگ لڑنی ہے۔ اللہ جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ میں نے کسی بندے کے دل میں اتر آنا ہے تو اس کو پتا ہے کہ میرے بندوں کی کون کون سی خوبیاں ان میں ابھی بھی قائم ہیں۔ وہاں وہ قدم رکھتا ہے اور پھر وہاں سے وہ پھیلنا شروع ہوتا ہے اور اس کی بدیوں کو خوبیوں میں تبدیل کرنے لگتا ہے۔ تو آپ کے لئے بھی یہی حکمت عملی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی بندہ حسن سے کلیۃً عاری ہو۔ آپ کے پاس کافی گنجائش موجود ہے کہ آپ خدا کے بندوں کے حسن کو تلاش کریں، ان کی خوبیوں پر نظر رکھیں اور انکساری اس کے ساتھ یہ رکھیں کہ اپنے وجود کی بدیوں پر بھی نگاہ ڈالیں تا کہ جب آپ کسی وجود کو برا دیکھ رہے ہوں اور خوبیوں کے لئے محنت کر رہے ہوں، کوشش کر رہے ہوں کہ پتا کریں تو غلطی سے کہیں دماغ میں یہ غرور نہ سما جائے کہ آپ ہی سب سے اچھے ہیں۔

اس لئے دوسرا پہلو اس کا یہ ہے اپنے حال پر نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھا کریں، انکساری کے ساتھ، اور پھر جو خوب صورتی ہے اس کے ساتھ جب آپ تعلق جوڑیں گے تو آپ کے ذریعہ پھر اللہ اس سے تعلق جوڑے گا کیوں کہ جو خدا کے بندے خدا کی خاطر کام کرتے ہیں اللہ ان سے بڑھ کر ان کی خاطر کام کرتا ہے ورنہ اللہ چاہتا تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بغیر ہی ساری دنیا کی اصلاح فرما سکتا تھا!؟ مگر بندوں میں سے اس نے چن لیا یہ بھی اس کے احسانات میں سے ایک بے حد خوبصورت احسان ہے کہ مگر بندوں کو یہ اثر دیا کہ تم آپ ہی اپنے لئے کام کر رہے ہو اور تم کرو گے تو پھر میں تمہارا ساتھ دوں گا، پھر تمہاری مدد کروں گا۔ پس اس پہلو سے جب خدا کا کوئی بندہ داعی الی اللہ، اللہ کی خاطر دعوت دے گا اور محنت کرے گا اور سفر اختیار کرے گا اور کوشش کرے گا، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کی دعوت کو پھل نہ لگیں۔ اس ضمن میں آپ یاد رکھیں کہ بہت سے داعی الی اللہ جو یہ کہتے ہیں ہم کوشش تو بڑی کر رہے ہیں، ہم نے تو سب کچھ پورا کر دیا اب اللہ کے اختیار میں ہے، کچھ نہیں ہو رہا تو وہ خدا پر الزام لگاتے ہیں اور یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ ہم صحیح کوششیں کر رہے ہیں۔ اگر کوششیں اس اخلاص کے ساتھ ہوں جو خدا چاہتا ہے، اگر نیتیں پاک ہوں، دل پاک اور صاف ہوں، اگر اپنے اندر بھی اَحۡسَنُوۡا کا عمل جاری ہو چکا ہو یعنی دوسروں کے اوپر صرف احسان اور ان کو بہتر بنانے کا تعلق جاری نہ ہو بلکہ اپنی ذات میں بھی یہ کام جاری ہو چکا ہو تو خدا کا یہ وعدہ کیوں پورا نہیں ہوگا کہ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى کہ جو لوگ اپنے آپ کو اچھا بنانا چاہتے ہیں، پہلے تو میں نے دوسروں کے حوالے سے بات کی تھی اب میں اس حوالہ سے آپ کو سمجھا رہا ہوں، ان کے لئے تو لازم ہے کہ اللہ ان کو حُسۡنٰى عطا کرے گا۔ وَزِيَادَةٌ اور اور بھی زیادہ۔ زِيَادَةٌ میں ایک اور مضمون یہ ہے کہ بہت سی خوبیاں جن کا آغاز کے لحاظ سے بھی کوئی وجود ان میں نہیں تھا یعنی ان سے کام شروع ہو ہی نہیں سکتا تھا وہ نئی خوبیاں بھی ان کو عطا کرنے لگے گا۔ تو ایک زِيَادَةٌ کا وہ مفہوم تھا کہ اللہ اپنے فضل کے ساتھ اپنے حسن کا ان کے ساتھ رابطہ قائم کر لے گا۔ وہ بہت ہی دل کش مضمون ہے لیکن روز مرّہ جاری و ساری مضمون ایک یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو حسن کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، حسن کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اگر وہ غیروں کا بڑھائیں گے خدا کی خاطر تو اللہ ان کا بڑھائے گا۔ اگر وہ اپنا حسن بڑھائیں گے تا کہ غیر، خدا کا حقیقی نمائندہ سمجھتے ہوئے اور خدا کی طرف سے آیا ہوا پہچان

کران کی آواز پر لبیک کہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تمہارے اندر حُسْنٰی پیدا کروں گا، تمہیں بہت ہی خوب صورت بنا دوں گا یعنی وہ دراصل تمہاری کوشش سے نہیں ہوگا خدا کی خاطر کوشش کرنے کا پھل ہے کہ تمہارا حسن پہلے سے بڑھ جائے۔ وَ زِيَادَةٌ ان معنوں میں ہوگا پھر کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اور بھی بہت سی خوبیاں دے گا جو تمہیں پہلے پتا ہی نہیں تھیں، جن سے تم آشنا نہیں تھے اور جو بھی شخص دعوت الی اللہ کے عمل کو اس طرح کرتا ہے وہ جانتا ہے اس کے تجربہ میں آئی ہوئی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی خوبیاں بڑھاتا ہے۔ کئی باتوں کی طرف اس کی پہلے توجہ نہیں ہوتی جب وہ دعوت الی اللہ کے میدان میں اترتا ہے تو اس کی خوبیاں علم میں بھی بڑھ رہی ہوتی ہیں، عمل میں بھی بڑھ رہی ہوتی ہیں، اور وہ ہمیشہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔

اس کے آخر پر قرآن کریم اس نتیجہ پر اس آیت کو ختم کرتا ہے، یعنی ابھی آیت جاری ہے مگر میں نے صرف جو نتیجے کا پہلا حصہ ہے وہ آج بیان کرنے کے لئے چنا ہے۔ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ایسے لوگوں کے چہروں پر خدا کبھی سیاہی نہیں چڑھنے دے گا اور کبھی ان کو ذلیل اور نا کام نہیں ہونے دے گا۔ کتنا عظیم الشان دعویٰ ہے۔ کتنا عظیم الشان وعدہ ہے۔ حسن تو اپنی ذات کے حوالے سے اس کو پتا لگ ہی جائے گا جب بڑھے گا لیکن دشمن تو بدی کی تلاش میں رہتا ہے اور دشمن بعض دفعہ خدا کی طرف سے عطا فرمودہ حسن کو پہچانتا ہی نہیں کیونکہ اس کی غلیظ، گندی نظر صرف بدیوں کی تلاش میں ہے اور بعض دفعہ اتنی زہریلی ہو جاتی ہے کہ اس کو حسن بھی برا دکھائی دینے لگتا ہے۔ جس کے مذاق ہی بدل جائیں ان کو حسن اچھا نہیں لگتا۔ اب چند دن ہوئے ایک جگہ سے یہ اطلاع ملی کہ ہمارے بچے تو MTA میں دلچسپی نہیں لیتے اس لئے ایم۔ ٹی۔ اے کو ایسا بنائیں کہ وہ دلچسپی لینے لگیں۔ میں ان کو لکھوا رہا ہوں کہ آپ وہ ٹیلی ویژن کیوں نہیں دکھاتے جس میں ان کو دلچسپی ہے۔ ہمارے ٹیلی ویژن کو ویسے کیوں بنوا رہے ہو۔ جس میں ان کو دلچسپی ہے وہ گندگی کے پروگرام ہیں، وہ جنوں بھوتوں کے پروگرام ہیں، وہ آفتوں کے، ڈائنوں کے، بلاؤں کے پروگرام ہیں، خوفناک وجود جو آسمان سے اتر رہے ہیں، دنیا کے وجود کچھ ان کے مقابلے کر رہے ہیں، فرضی کہانیاں، جھوٹے قصے۔ آپ نے ان کے مذاق بگاڑ دئے ہیں تو ہم کیوں اپنے ٹیلی ویژن کا مذاق بگاڑیں۔ ان کو ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ پس وہ حسن کو برا دیکھ رہے ہیں۔ جن لوگوں نے

اپنے بچوں کو اس حد تک دنیا کے گندے ذوق سے لذّت اندوز ہونے کی چھٹی دے رکھی تھی، اب ذوق بگڑ رہے ہیں اور ہمیں کہتے ہیں ہم اپنا مزاج ان کی خاطر بگاڑ دیں۔ یہ تو نہیں ہوسکتا۔ آپ کے بچوں کا جو مزاج ہے وہ آپ نے بگاڑا ہے۔ آپ کا یہ حق نہیں کہ ہمارا مزاج بھی بگاڑیں آپ اور ہم جو سچا ذوق اور سچائی کی محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ آپ کے بچوں کو دلچسپی نہیں ہم یہ بات چھوڑ دیں۔ یہ نہیں ہوسکتا اور اگر وہ اچھی باتوں میں دلچسپی نہیں لیں گے تو آپ کی آنکھوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے آپ کی نسلیں ضائع ہو جائیں گی کوئی ان کو سنبھال نہیں سکتا۔

اس لئے اوّل تو یہ بھی ایک متکبرانہ بات ہے کہ جی ہمارے بچے تو بڑے اونچے ہیں آپ کے ٹیلی ویژن سے۔ اونچے وونچے کوئی نہیں ہیں، بگڑے ہوئے ہیں، نیچے ہیں اور آپ ان کو اونچا اٹھائیں گے تو وہ اٹھ جائیں گے۔ کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر بعض پروگرام دکھائیں تو ان کے اندر دلچسپی پیدا ہو جائے گی بلکہ آپ کے مزاج بگڑے ہوئے ہیں اس لئے بچوں کے بگڑے ہیں اور بچوں کے جلدی سنبھلیں گے، آپ کی نسبت زیادہ جلدی اصلاح پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اگر سو فیصد نہیں تو اکثر صورتوں میں ماں باپ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے بچوں نے تو مصیبت ڈالی ہوئی ہے اور کوئی ٹیلی ویژن دیکھنے ہی نہیں دیتے۔ ایک ماں ڈیڑھ سال کا بچہ لے کر آئی کہ یہ تو جب بھی ٹیلی ویژن آن ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ ٹیلی ویژن دکھاؤ۔ بول بھی نہیں سکتا، اشارہ کرتا ہے میری طرف کہ جس میں وہ آتا ہے اور دوسرا ٹیلی ویژن دیکھیں تو رونے لگ جاتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ نے بچے پکڑ لئے ہیں اب اللہ کے فضل سے جماعت کے۔ تو اگر آپ کو وہم ہے کہ آپ ان کی تربیت کریں گے۔ اب بچے آپ کی تربیت کریں گے۔ مگر یہ باتیں جو ہیں یہ درست نہیں ہیں کہ یہ چھوٹی چیزیں ہیں۔ ہم اعلیٰ درجہ کے ملک کے اعلیٰ ٹیلی ویژن دیکھنے والے لوگ ہیں، ہمارے جیسے دکھاؤ۔ تو میں نے کہا کہ پھر تم اپنے پروگرام بناؤ اور اپنا ٹیلی ویژن بھی بنالو ساتھ ہی۔ ایسے پروگرام بناؤ گے جو سب کی اصلاح کے لئے ہوں اور سچائی پر مبنی ہوں ان میں لغو اور جھوٹی باتیں اور جھوٹے انداز نہ ہوں تو پھر ہمیں دو ہم بنا بنا کر تمہیں بھی دکھائیں گے، دنیا کو بھی دکھائیں گے لیکن بگڑے ہوئے ذوق کی ہم متابعت کبھی کسی صورت میں نہیں کر سکتے۔

پس یہ ساری وہ باتیں ہیں جن کا اس آیت کریمہ میں اشارۃً ذکر ہے مگر واضح اشارے ہیں۔ جب آپ کریدتے ہیں تو صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ

قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ داعی الی اللہ اگر خدا کی خاطر دنیا میں خوبیاں پھیلانے کا عزم لے کر اٹھے گا تو خدا اس کے چہرے کو کبھی ذلیل نہیں ہونے دے گا۔ اس کے چہرے پر کبھی سیاہی نہیں چڑھے گی اور یہ وعدہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ہے۔ چنانچہ آیت کا بقیہ حصہ جنت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ پھر ان کے لئے ہمیشہ کی جنتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون کو سمجھ کر اس کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ جتنا آگے بڑھائیں گے اتنا ہی خدا کی طرف سے زِيَادَةٌ عطا ہوتا چلا جائے گا۔ آمین

جب بھی خدا سے عظمتیں طلب کریں تو انکساری کی عظمتیں اور اس سلام کی عظمتیں طلب کریں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 22/نومبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝٢٧ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝٢٨
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٢٩ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝٣٠ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٣١

(الرحمٰن: 27 تا 31)

پھر فرمایا:

یہ سورۃ رحمان کی آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس پر یعنی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ اور صرف تیرے رب کی شان جمال وجلال ہے جو باقی رہے گی۔ وہ صاحب جلال ہے اور صاحب اکرام ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرتے ہو یا تکذیب کرو گے۔ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اسی سے سوال کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ہر وقت وہ ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ يَوْمٍ یہاں وقت کے پیمانے کے طور پر ہے اس لئے لمحہ لمحہ بھی یہاں يَوْمٍ کے مفہوم

میں داخل ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پس تم اپنے رب کی کن کن آیات کی تکذیب کرو گے۔ یہاں دونوں کا لفظ خطاب میں شامل ہے مگر جب ہم اردو میں تم کہتے ہیں تو لازم نہیں ہوا کرتا کہ ''دونوں'' لفظ کو دہرایا جائے مگر قرآن کریم نے یہاں جب بھی سوال اٹھایا ہے تو تم دونوں کہہ کر اٹھایا ہے۔ تو تم دونوں کن کن باتوں میں یعنی خدا تعالیٰ کی کس کس شان اور جلوہ گری کی تکذیب کرتے ہو یا کرو گے۔

یہ آیات بہت ہی گہرے عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کی پوری تفسیر کا تو اس وقت موقع نہیں مگر ایک دو امور ایسے ہیں جن کی طرف جماعت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ہر چیز فانی ہے اب یہ ایک ایسا اعلان ہے جو روزمرّہ میں سب کو علم ہے لیکن اسے دہرایا کیوں گیا ہے اس قدر زور کے ساتھ ایک ایسی صورت میں جو چھوٹوں اور بڑوں دونوں کے لئے ایک عظیم چیلنج کا رنگ رکھتی ہے۔ جن اور انس، بڑے لوگ اور چھوٹے لوگ، دونوں کو مخاطب کرتی ہے اور بڑی شان کے ساتھ ان کو چیلنج کرتی ہے۔ اس میں اس مضمون کے بیان کا عنوان یہ رکھنا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ یہ کچھ گہری حکمت رکھتا ہے۔ درحقیقت ہر فانی انسان اپنے آپ کو لافانی سمجھ رہا ہوتا ہے اور یہ عجیب متضاد زندگی ہے جو انسان گزارتا ہے اور اس کو شعور بھی نہیں کہ میرے اندر ایک، سوچوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ سب دنیا کو مرتے اور گزرتے ہوئے دیکھتا ہے، سب دنیا کو دیکھتا ہے کہ اس جہاں میں کوئی نہیں رہا۔ آئے دن روزانہ دنیا تبدیل ہو رہی ہے، ہر موت کے ساتھ ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ جہان ہی بدل جاتا ہے تو کتنے ہی ان گنت بدلے ہوئے جہانوں کا وارث ہو کر وہ اپنی ذات کے متعلق یہ گمان نہیں کرتا کہ مجھے بھی ایک دن اس دنیا سے گزر جانا ہے اور جب وہ گزرے گا تو پھر ان لمحوں میں وہ احساس کہ میں فانی تھا اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

یہی مضمون قرآن کریم میں فرعون کے ذکر میں کئی جگہ بیان ہوا ہے لیکن خاص طور پر اس کی ڈوبتی ہوئی گھڑیوں کی دعا کہ، اب میں ایمان لاتا ہوں بنی اسرائیل کے خدا پر، اس وجہ سے ردّ کر دی گئی یعنی کلیۃً نہیں مگر مرکزی نقطہ کے لحاظ سے دعا ردّ کر دی گئی کیوں کہ فانی انسان جب فنا کو آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھتا ہے وہ لمحہ ہے اس کے یقین کا کہ اب میں اس دنیا میں نہیں رہنے والا، میں فانی تھا اور اسی لمحے اس کی ساری زندگی اس کو اکارت جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تمام کوششیں، تمام اموال، سب دولتیں، سب نام

نام ونمود، سب اسی دنیا میں دھرے رہ جاتے ہیں اور وہ اکیلا اکیلا خدا کے حضور حاضر ہونے کے لئے جب تیار کھڑا ہو پھر وہ اس قسم کے وعدے کیا کرتا ہے اب میں ایمان لاتا ہوں، اب مجھے نجات دے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم فنا کو دیکھ لو اور پھر نجات کی دعائیں مانگو تو تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی، بدنی زندگی مل بھی جائے تو روحانی زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پس یہ وہ مضمون ہے جو ساری دنیا میں سب کے لئے قدر مشترک رکھتا ہے۔ فی الحقیقت انسان اپنی فنا پر ویسا یقین نہیں رکھتا جیسا یقین اس کی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا جانتے ہوئے کہ موت مقدر ہے پھر بھی اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتی۔ تو قرآن کریم کا اس شان کے ساتھ اس مضمون کا ذکر فرمانا جو بظاہر دنیا میں سب کو معلوم ہو یہ بتا رہا ہے کہ تمہیں وہم ہے کہ تم جانتے ہو، تم نہیں جانتے کہ ہر چیز فانی ہے اور جب ہر چیز کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد یہ ہے اعلان وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ کہ ہاں تیرے رب کا جلال و جمال کا جلوہ ہے۔ جو باقی رہے گا اور دوسرا وَجْهُ کا مطلب رضا ہے جو باقی رہے گی۔ یعنی خدا کی رضا جس کو باقی رکھنا چاہے گی اسے رکھے گی اور جو کچھ بھی رہے گا رضا کی بنا پر، اس سے لٹک کر، اس کے سہارے رہے گا۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو اللہ کے جلال اور جمال کا جلوہ باقی رہے گا اور جس پر اس کی دائمی ازلی ابدی رضا کی نگاہ پڑی ہے وہ بھی باقی رہ سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی رضا میں شامل ہو کر اس سے الگ رہ کر نہیں۔

دوسری بات جو اس میں خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ چیزوں کے فنا کا، ان کی عظمت کے ساتھ جو تعلق ہے یہ مضمون اس بات کو خوب کھول کر بیان فرما رہا ہے کہ تمہاری عزتیں، تمہاری دنیا کی نمود کی کمائی جو کچھ بھی ہے اس کی خاطر تم دنیا سے چمٹے ہوئے تھے تو یاد رکھو کہ وہ بھی فنا ہیں اور اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہاں ایک خدا کے جلال و جمال کا جلوہ ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ اس لئے اگر عزتوں کی خاطر تم کچھ کرتے ہو، اپنی دنیا کی نام ونمود کے لئے محنتیں کرتے ہو تو وہ وقت آئے گا جب وہ چیزیں مٹ جائیں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض قوموں اور بعض لوگوں اور بعض بڑے بڑے بادشاہوں کی عزت اور نام ونمود تو ہمیں دنیا میں پیچھے باقی رہتی دکھائی دیتی ہے یہ کیوں باقی رہی۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس مضمون کا آخری فنا کے فیصلے سے تعلق ہے

اس لئے اگر اس وقت سے پہلے کہ دنیا میں انسان کی صف لپیٹ دی گئی کسی کی عزت و جاہ وجلال کا تذکرہ باقی رہ بھی جائے تو اس کی حقیقت کوئی نہیں کیونکہ خدا کے علم میں یا خدا کے فیصلوں میں وقت کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انسان کے علم اور فیصلوں میں وقت کی حیثیت ہے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی زمانہ تقسیم نہیں کرتا۔ نہ ماضی، نہ حال، نہ مستقبل۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور یہی اس کی ازلیت اور ابدیت ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے سوا ہر چیز کو فنا ہے۔ کسی چیز کو بھی ازل اور ابد کا دعویٰ نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے اور پہلے جو توہمات تھے دنیا کے مثلاً آریہ سماج کا عقیدہ کہ دنیا ازل سے ہے اور بعض یورپین فلسفیوں کا بھی یہ خیال کہ کوئی چیز عدم سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی اس لئے ازل سے ہے اس خیال کو کلیۃً غلط ثابت کرنے میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بھی ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ پہلے جو یہ خیال تھا کہ پروٹان کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ ایٹم Destroy نہیں ہو سکتا اور ایک Law تھا، یعنی نظریہ نہیں اس کو Law کہتے ہیں۔ Indestructibility of Atom جو کچھ مرضی ہو جائے ایٹم Destroy نہیں ہو سکتا اور ڈاکٹر عبدالسلام کے دور سے پہلے سائنس دانوں نے ثابت کر دیا کہ ایٹم تو Destroy ہو سکتا ہے اگر نہ ہو سکتا تو ایٹم بم کیسے بن جاتا اور پھر جب کائنات پر زیادہ گہری نظر ڈالی تو Black Hole کا جو تصور ابھرا ہے اور اس کا علم اور اس کی ماہیت سے متعلق جو سائنسی اندازے لگائے گئے تو پتا لگا کہ Black Hole تو بنتا ہی اس وقت ہے جب کہ ایٹم آپس میں کچلے جاتے ہیں اور الیکٹرانز کے فاصلے اپنے مرکز سے اس دباؤ کی طاقت سے جو Gravitational Pull ہے یعنی کشش ثقل اس کے نتیجہ میں یوں آپس میں اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ بہت عظیم الشان وسیع کائنات سمٹ کر گویا ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود ہو جاتی ہے جو پھر سمٹتا اور پھر سمٹتا ہے اور اپنی طاقت کے زور کے ساتھ ایک خودکشی کر لیتا ہے یعنی وجود اس طاقت کی عظمت کے سامنے جھک کر ایک فنا کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کے متعلق انسان کچھ نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہے اس کی پرلی طرف، اس کو کہتے ہیں Event Horizon۔

تو یہ حصہ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے اس معاملے میں تو سائنس دانوں کی آنکھیں کہ یہ کائنات ازل سے بہرحال نہیں ہے مگر جہاں تک ابد کا تعلق ہے اس بات پر کافی اٹکے رہے ہیں کہ پروٹان Indestructible ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم ومغفور نے اس نظریہ میں بہت

بڑا کام کیا ہے اور بیماری سے پہلے مجھے ان سے اس بارے میں جو گفتگو کا موقع ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے Mathematically یعنی حساب کی مدد سے جو ثابت کیا ہے کہ دنیا کی پروٹانز کی عمر اتنی ہے۔نظریہ کے طور پر تو اب سائنس دان اسے قبول کر چکے ہیں لیکن دو تین نظریئے ہیں۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں اس سے ایک حصہ کم، بعض کہتے ہیں ایک حصہ زیادہ مگر جو حصہ ہے وہ بھی بہت بڑا تصور ہے اس لئے آپ کو میں عددی تصورات میں الجھانا نہیں چاہتا۔

تو 32 Raise to the Power of ہے یا 33 یا 34 ہے یہ بحث چل رہی ہے بس اور 32 اور 34 میں اتنا فرق ہے بظاہر ایک کا فرق ہے لیکن جب Powers میں باتیں کی جاتی ہیں تو اس مقام پر پہنچ کر عام انسانی ذہن اس کا تصور کر ہی نہیں سکتا کہ کتنی بڑی چیز ہے۔مگر سائنسدان اللہ کے فضل کے ساتھ اور حساب دان بہت باریک باتوں کو اپنے استدلال کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں اور کائنات کے کناروں تک کی خبریں اپنے استدلال کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں۔تو ڈاکٹر صاحب نے جہاں تک مجھے یاد ہے 33 Raise to the Power of کا نظریہ پیش کیا تھا اور مجھے بتا رہے تھے بلکہ کئی دفعہ بتایا کہ اس وقت دنیا میں لیبارٹری بڑی بڑی عظیم بے انتہا خرچ کر کے کام کر رہی ہیں۔ان میں ایک امریکہ میں بھی ہے ایک اٹلی میں بھی ہے اور شاید ایک اور جگہ بھی اور اب تک جو خبریں ملی ہیں وہ امید افزاء ہیں۔اگر یہ قطعیت سے ثابت ہوگیا تو ہرگز بعید نہیں کہ ایک اور نوبل پرائز ان کو مل جائے یعنی بطور حق کے ان کو ایسا Nobel Laureate بننے کی توفیق ملے کہ دو دفعہ زندگی میں Nobel Laureate بنیں۔

تو یہ ایک دنیا کا انعام و اکرام ہے جو ممکن تھا کہ ہو جاتا مگر جہاں تک عقلی تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کی فضلیت عقل کی روشنی کے لحاظ سے ساری دنیا میں مسلم ہے۔کوئی دنیا کا سائنسدان نہیں ہے جو عظمت کی نگاہ سے آپ کو نہ دیکھے بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت کردار کے لحاظ سے یہ ایک وہ سائنس دان ہے جس کی دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی عزت کرتے تھے اور حقیقت میں ان کے سامنے عظمت کے ساتھ سر جھکاتے تھے۔ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف گفتگو میں مجھے انہوں نے کئی دفعہ بتایا کہ فلاں ملک کا سربراہ اس طرح مجھ سے پیش آتا ہے، فلاں ملک کا اس طرح پیش آتا ہے، دعوتیں دیتے ہیں کہ ہمارے پاس آؤ ہم شاہی اعزاز کے ساتھ تمہاری خدمت کر کے

کچھ تسلی پائیں کہ ہم نے بھی کسی بڑے انسان کی کوئی خدمت کی ہے لیکن ان باتوں کے باوجود تکبر کا نام ونشان نہیں تھا اور یہ وہ اصل عظمت کردار تھی جس کا میڈل سے تعلق نہیں ہے۔

پس اس مضمون کو اس طرف منتقل کرتے ہوئے میں چند باتیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بیان کروں گا مگر اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں عامۃ الناس کے لئے بھی ایک عجیب پیغام ہے جو کوئی بلندی حاصل نہیں کر سکتے۔ان کو یہ پیغام ہے کہ تم بھی تو یا بڑے لوگوں میں ہو یا چھوٹے لوگوں میں ہو مگر بڑے بھی مٹ جاتے ہیں، چھوٹے بھی مٹ جاتے ہیں اور بڑے بھی اپنی بڑائی کی شانوں کے ساتھ مٹا دیئے جائیں گے اور چھوٹے بھی جو قدریں بھی وہ رکھتے ہیں ان کے سمیت مٹا دیئے جائیں گے تو اس عارضی چیز کے لئے تم کیوں کسی سے حسد کرو کیوں تکلیف میں مبتلا رہ کر زندگی گزارو کہ فلاں تو اتنا بڑا ہو گیا، فلاں نے اتنا علم حاصل کیا، فلاں کو اس طرح دنیا نے عزتیں دیں۔فرمایا دنیا، دنیا کی عزتیں یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں، اس سے کیوں نہیں تعلق جوڑتے جس کی رضا کا چہرہ کبھی فنا نہیں ہوگا۔

یہ وہ مضمون ہے جو ان آیات میں ہر بنی نوع انسان کی محرومی کے زخموں پر ایک ایسا پھایا رکھتا ہے کہ ہر دکھ کا علاج ہے لیکن اگر انسان اپنی توجہ پھیرے۔چنانچہ آج صبح ڈاکٹر صاحب کے لئے دعا کے وقت یہ مضمون میرے ذہن میں ابھر کر میری دعا کو ایک اور رخ دے گیا۔میں نے کہا یہ دنیا کی عزتیں تو آج نہیں تو کل فنا ہونے والی ہیں کچھ بھی ان کا نہیں رہتا لیکن جو تیری رضا کی عزت ہے، جس کا وَجْهُ رَبِّكَ میں ذکر آیا ہے وہ دائمی ہے۔پس ان کے لئے قرآن کے الفاظ میں میں نے یہ دعا کی ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر:29) اے مطمئن روح! اپنے رب کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ رَاضِيَةً ہو۔تو اپنے رب سے راضی ہو اور مَّرْضِيَّةً ہو، پس وَجْهُ رَبِّكَ کی جو لازوال زندگی اور لازوال وجود کی خوش خبری ہے وہ ان دو لفظوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

کوئی انسان جو اپنے رب سے راضی نہ ہو وہ ہمیشگی نہیں پا سکتا۔کوئی انسان جس سے خدا راضی نہ ہو وہ ہمیشگی نہیں پا سکتا۔پس اس مضمون کے ساتھ ہی میری توجہات بدل گئیں۔یہ کہنے کی بجائے کہ آج ہم سے ایک ایسا وجود رخصت ہوا جس کے نتیجے میں ایک خلاء پیدا ہو گیا اور جماعت کو

آئندہ یہ خلاء محسوس ہوتا رہے گا میں نے کہا وہ مضمون کیوں نہ میں بیان کروں جو ہمیشگی کا مضمون ہے اور لازوال مضمون ہے۔ پس نیک انجام کے ساتھ میری توجہ نیک آغاز کی طرف گئی اور مجھے یہ خیال آیا کہ درحقیقت لوگ اچھے انجام کی طرف دیکھتے دیکھتے اس سے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بسا اوقات آغاز کا خیال ہی نہیں کرتے حالانکہ بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں بعض دفعہ انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی انہی وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔

جیسے چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو جو عظمتیں ملی ہیں وہ بار بار یاد کرایا کرتے تھے دنیا کو، میری ماں کی دعائیں تھیں۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی توحید کے ساتھ وابستگی اور وفا، اس کا غیر متزلزل اور محکم یقین خدا کی وحدانیت پر اور غیر اللہ کو رڈ کرتے چلے جانا یہ وہ خوبیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ان کے لئے ایک نعمت کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ پس میں اپنی پاک بزرگ ماں کی دعاؤں کا ایک پھل ہوں اور یہ مضمون ان کو انکساری کی طرف لے جاتا تھا کہ کھل کر باتیں کرتے تھے، مجھ سے تو بہت بے تکلفی تھی، کہا کرتے تھے کہ بس قصہ وہی ہے سارا، میں کیا، میرا وجود کیا، دعاؤں کا پھل ہوں۔

اور ڈاکٹر صاحب بھی دعاؤں ہی کا پھل تھے۔ ان کے والد بزرگوار چوہدری محمد حسین صاحب اور ان کی والدہ ہاجرہ بیگم نام تھا ان کا دونوں ہی بہت مقدس وجود تھے، بہت پاکیزہ، صاف ستھرے، خالص پاکیزہ زندگی گزارنے والے اور احمدیت کے بعد تو سونے پر سہاگے کا عالم تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی پیدائش سے پہلے رؤیا دیکھا کہ ان کو ایک خوب صورت پاک بیٹا عطا کیا جا رہا ہے اور اس کا نام عبدالسلام بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت مصلح موعودؓ کو رؤیا لکھی اور چونکہ بہت منکسر المزاج تھے اپنی رؤیا کی بنا پر خود نام نہیں رکھا خواب لکھ کر حضرت مصلح موعودؓ سے پوچھا کہ میں اس بچے کا کیا نام رکھوں۔ تو آپ نے فرمایا یہ اللہ نے تمہیں بتا دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا یہی نام رکھ لو۔ پس عبدالسلام اس بیٹے کا نام الٰہی منشاء اور رضا کے مطابق رکھا گیا جو ان کی خاص دعاؤں کا پھل تھا اور ساری زندگی پھر اس نے اس رؤیا کی سچائی کو ظاہر کیا اور اپنے ماں باپ کے خلوص کی قبولیت کو ظاہر کیا۔

تو اس میں ایک اور بھی ہمارے لئے سبق ہے۔ایک وجود گزر گیا مگر اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے اے اللہ احمدیت کو اور نوبل لارئیٹ Nobel Laureate عطا کر مگر وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ نوبل لارئیٹ کتنے ہیں اور کتنوں کا مقابلہ کرے گی احمدیت، ہزار نوبل لارئیٹ ہیں اور بنتے چلے جائیں گے۔چار اور بھی لے لئے احمدیت نے مانگ مانگ کے تو کتنا فرق پڑے گا لیکن وہ انعام یافتہ جو خدا کے دربار سے انعام یافتہ ہو وہ تو اگر ان پڑھ بھی ہو تو ایسا انعام یافتہ بن سکتا ہے کہ تمام کائنات کو چوٹی کے علماء اور چوٹی کے اعزاز پانے والے اس کی جوتیوں کو اٹھانے میں فخر محسوس کریں،اس کے پاؤں کی خاک چومنے میں فخر محسوس کریں۔تو چھوٹی باتوں پہ ہم کیوں راضی ہوں، چھوٹی دعائیں کیوں مانگیں۔ وہ دعائیں مانگیں جیسی ڈاکٹر عبدالسلام کے باپ نے اپنے بیٹے کے لئے کی تھیں اور جن کو خدا نے اسی طرح قبول فرمایا کہ اپنی رضا کا مظہر بنایا اور اس بات کا قطعی ثبوت آپ کی زندگی کے لمحہ لمحہ نے دیا ہے۔

سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ تک پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل۔ بلکہ ایک دفعہ مجھے کہہ رہے تھے کہ جب میں کسی سائنسی اجتماع میں جاتا ہوں تو بعض سرگوشیوں کی آواز آتی ہے یہ وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے اور بھی سائنسدان اب ماننے لگے ہیں پہلے سے بڑھ گئے ہیں لیکن جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے اور اس جھنڈے کو بلند کیا ہے ویسا کوئی اور سائنس دان اس جیتی دنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا اور پھر خدائے واحد و یگانہ کی عظمت کے نتیجے میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں ہمیشہ رہا۔نظام جماعت کے سامنے خادمانہ حیثیت کی حفاظت کی ہے۔

اب میں ان کی عمر کے لحاظ سے چھوٹا، دنیا کے علم کے لحاظ سے تو حیثیت ہی کوئی نہیں مگر جب مجھ سے گفت و شنید کرتے تھے، ملتے تھے وہ عزت و احترام کے تمام تقاضے جو خلافت سے وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ان کو اس طرح پورا کرتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا اور باتوں میں مشورہ کر کے وہ کہتے تھے جو میں کہتا تھا وہ کرتے تھے جو میں بیان کرتا تھا یا مشورہ نہیں لیں گے، مشورہ لیں گے تو قبول کریں گے اس کو۔غرضیکہ مجھے ان کی انکساری کو دیکھ کر رشک آتا تھا کہ کتنا بڑا عالم ہے سائنس کے مضامین میں۔سوچیں میں ان سے بحث کر رہا ہوں یہ نہیں کبھی کہا کہ آپ کو پتا کچھ نہیں،

آپ کو حساب بھی نہیں آتا تو آپ مجھ سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مگر انتہائی توجہ سے بات سن کر دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ رفتار کے اوپر بحث چلی کہ سائنس کا یہ اور خاص طور پر حساب دانوں کا یہ قطعی نظریہ ہے کہ روشنی کی رفتار سے کوئی چیز آگے نہیں بڑھ سکتی تو میں نے ان سے کہا کہ یہ جو حد لگائی جا رہی ہے یہ میں تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ میرے نزدیک خدا تعالیٰ کے اوپر حد بندی نہیں ہو سکتی، خالق کے اوپر نہیں ہو سکتی۔ حساب کھول دیئے باقاعدہ۔ اپنا حساب دان کھول لیا اور نقشے بنائے اور دائرے بنائے اور بتایا کہ یہ دیکھیں حسابی رو سے ناممکن ہے اور فزکس کے نظریہ کے لحاظ سے بھی یہ ناممکن ہے۔ میں نے باتیں سمجھیں، میں نے کہا آپ نے جو باتیں کہی ہیں دلیل کے ساتھ کہی ہیں میں دلیل کا انکار نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ یہ ساری باتیں آپ کے اس کائنات کے تصور سے وابستہ ہیں اور مشروط ہیں جواب تک آپ پر ظاہر ہوا ہے اور کیا یہ درست نہیں کہ مادہ میڈیم ہے لہروں کے لئے اور اگر مادہ نہ بھی ہو تو کوئی میڈیم ہونا چاہئے اور میڈیم کی صفات ہیں جو رفتار طے کرتی ہے تو کیا ایتھر کے علاوہ کوئی اور میڈیم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایتھر نہیں ہے تو پھر خود یہ محل نظر ہے کہ چیز حرکت میں کیسے رہتی ہے اور ویو (Wave) کیسے بنتی ہے جب کہ ویو (Wave) مادے کی صفت ہے اور حرکت کی صفت نہیں ہے۔ یہ باریک باتیں تھیں ڈاکٹر صاحب کو تو ایک لمحہ نہیں لگا ان باتوں کو سمجھنے میں۔

مجھے انہوں نے جواب میں کہا کہ آئن سٹائن تو قائل ہے کہ ایتھر ہے اور ایتھر ہی کی صفات ہیں جو جلوہ گر ہیں مگر باقی سائنس دان قائل نہیں ہوئے ابھی اور ابھی تک قطعی ثبوت کوئی نہیں مل سکا۔ میں نے کہا مل سکتا ہے کہ نہیں؟ کہا کہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا اگر ایتھر کے سوا کوئی اور میڈیم ہو جس کی صفات مختلف ہوں تو رفتار بڑھ سکتی ہے!؟ انہوں نے کہا بڑھ سکتی ہے۔ میں نے کہا اب یہ بتائیں کہ اگر کسی چیز کو مادی میڈیم کی ضرورت نہ ہو اور وہ روحانی وجود ہو؟ آپ خدا کی ہستی کے قائل تھے اس کا انکار کر ہی نہیں سکتے تھے تو اس کو کون سا قانون پابند کرے گا کہ اس کا پیغام روشنی کی رفتار سے ان گنت زیادہ تیزی کے ساتھ جہاں وہ پہنچانا چاہئے پہنچا دے تو اس کے بعد وہ نہیں بولے پھر۔ صرف کہا ہاں اصولاً میں مان گیا ہوں یہ ٹھیک ہے یہ ہو سکتا ہے مگر معلوم دنیا میں اب تک جو ہے وہ یہی ہے

اس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔

تو اس رنگ میں ان کے اندر یہ حوصلہ تھا اور یہ انکسار تھا کہ بالکل ان پڑھ، سائنس کے ابتدائی علم سے بھی عاری انسان، جس کا ماضی ان کے علم میں تھا کیا حیثیت رکھتا تھا کچھ بھی نہیں۔ اس سے اتنے بڑے مضامین کے اوپر بڑے حوصلے کے ساتھ گفتگو کرنا، اسے سمجھانے کی کوشش کرنا اور جب کوئی ایسی دلیل دی جائے جوان کے اپنے عقیدے کے مطابق تسلیم ہونی چاہئے تسلیم کر لی، کر لیتے تھے تو یہ بھی رفعت کی علامت ہے یعنی انکسار، اور ان دونوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں تبھی سجدے کا رفعتوں سے تعلق ہے رَفعت (راء کی زیر کے ساتھ) لفظ عربی میں تو ہے مگر اردو میں بعض لوگ رَفعت (راء کی زبر کے ساتھ) بھی کہہ دیتے ہیں اس لئے میں رَفعت بھی کہہ دیا کرتا ہوں مگر اصل لفظ رِفعت ہے۔ تو رفعتیں جو انسان کو عطا ہوتی ہیں ان کا انکساری سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ سجدے میں **ربی الاعلی** کی دعا سکھائی گئی ہے۔ رب سب سے اعلیٰ ہے اور مراد یہ ہے کہ تم نے اس کے حضور جب ماتھا ٹیک دیا ہے جتنا نیچے ہو سکتے تھے ہو گئے ہو اب ربِ اعلیٰ کو یاد کرو تو تم اس سے فیض پاؤ گے اور رفعتیں حاصل کرنے والا اتنا ہی زیادہ جھکتا چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں مضمون لازم وملزوم ہیں۔ سب سے زیادہ انکسار دنیا میں آنحضرت ﷺ نے دکھایا ہے اور سب سے زیادہ رفعتیں آپؐ کو عطا ہوئی ہیں۔

پس ایک بڑے آدمی کے گزرنے کے ساتھ ان مفاہیم پر گفتگو ہونی چاہئے جو لوگوں کو بڑا بنانے والے ہیں اور سب کے لئے برابر پیغام رکھتے ہوں۔ اب علم کے لئے اگر میں کہہ بھی دوں کہ دعا کرو کہ اللہ ہمیں سونوبل لارئیٹ عطا کر دے تو کیا اس کا آخری نتیجہ نکلے گا؟ کیا وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ جائیں گے جنہیں کسی مکتب میں بیٹھنے کی توفیق نہیں ملی۔ تمام صاحب علم انسانوں سے اور ذی روح، ذی شعور وجودوں سے علم میں آپؐ کا وجود آگے بڑھ گیا تو ان رفعتوں کے لئے کیوں نہ دعا مانگی جائے جس میں ہم سب برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ چھوٹا بڑا غریب ایک تیسری دنیا کا آدمی، ایک ترقی یافتہ مغربی ملک کا باشندہ ان سب کے لئے قدر مشترک ہے کہ اصل علم کا منبع، اصل عزتوں کا منبع جس کا علم اور جس کی عزتیں باقی رہنے والی ہیں وہ اللہ کی ذات ہے اسی کی طرف جھکو، اس کی طرف دل لگاؤ تم میں سے ہر ایک کو پھر وہ رفعتیں عطا ہو سکتی ہیں کہ جو اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔

تو اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے ان کو بہت بلند مرتبے عطا فرمائے اوران کی رفعتوں کی جو جان ہے یعنی دعاؤں کا پھل وہ جان اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں اورنسلوں میں آگے جاری فرمائے۔ بعض بچے ان کی اولاد میں سے بہت سعید فطرت اور ایسا وجود رکھتے ہیں جن پر توقع سے نظریں پڑتی ہیں۔ ان کی بیٹی عزیزہ ہے، حمید الرحمان اور عزیزہ کا چھوٹا بیٹا جب بھی میں اس کو دیکھتا ہوں میں ان کو کہتا ہوں کہ اس میں تو مجھے ڈاکٹر سلام نظر آ رہا ہے، ایک اور ڈاکٹر سلام۔ تو یہ میری مراد ہرگز نہیں کہ وہ صرف نوبل لارئیٹ بن جائے گا کسی وقت، میں جب کہا کرتا ہوں تو میں ان کو سمجھا رہا ہوں کہ میری یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ اس میں وہ خوبیاں پیدا کر دے جو روحانی رفعتوں کی علم بردار ہوتی ہیں اور روحانی رفعتوں کے مقابل پر دنیا کی رفعتوں کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتیں پھر اس کے صدقے میں نوبل لارئیٹ بھی بنے تو کیا کمی، کیا بات ہے **سبحان اللّٰہ، نور علی نور** یعنی نوبل لارئیٹ کے اوپر رضا کی نظر جب پڑے گی تو نور پر نور نازل ہو جائے گا تو یہ دعا اس بچے کے لئے تو میں کرتا ہی ہوں آپ بھی یاد رکھیں اور اپنی اولادوں کے لئے یہ دعا کریں۔ اگر دنیاوی طور پر عظمتیں اور رفعتیں مقدر میں نہیں ہیں تو صرف ایک بات ہم مانگتے ہیں کہ تیری نظر ان پر ایسی پڑے کہ ان کی پیدائش بھی سلام کی پیدائش ہو اور ان کا وصال بھی سلام کا وصال ہو۔

وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا (مریم: 34)

جو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا بچپن کی بتلائی گئی ہے وہ یہ وہ سلام ہے جس کے متعلق میں آپ کو توجہ دلا رہا ہوں۔ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے ہی وہ سلام لکھ دیا تھا جو سلام موت کا سلام بھی بن گیا اور زندگی کا سلام بھی بن گیا۔ پس جب بھی خدا سے عظمتیں طلب کریں تو انکساری کی عظمتیں طلب کریں اور اس سلام کی عظمتیں طلب کریں جو آسمان سے اترتا ہے اور پھر وہ جس شکل میں بھی نازل ہو بہت ہی خوب صورت اور دلکش دکھائی دیتا ہے لیکن کسی سے توقع رکھنا اور بات ہے اور اس توقع کا پورا ہونا ایک اور بات ہے۔ یہ دعا بھی ہونی چاہئے کہ اللہ ہر منزل کے خطرات سے بچا کر کسی شخص کو اپنی صلاحیتوں کے عروج تک پہنچائے۔ پس جن بچوں میں نجابت دیکھتا ہوں، اعلیٰ اقدار دیکھتا ہوں ان کی ذہانت ان کے چہرے بشرے سے ٹپکتی ہے ان کے لئے میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ خدا اس کو اس کے آسمانی نقطہ عروج تک پہنچائے۔

اب حضرت مصلح موعودؓ کی پیش گوئی میں یہ بہت ہی عارفانہ نکتہ ہے جو بیان ہوا ہے کہ ہر شخص کا ایک آسمانی نقطہ عروج ہے اور وہاں تک وہ بلند ہوسکتا ہے اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا لیکن بھاری اکثریت ہے، اتنی بھاری اکثریت کہ شاید اس کو اعداد و شمار میں شمار ہی نہ کیا جاسکے جو اس نقطہ عروج سے نیچے رہ کر مر جاتی ہے اور کئی ایسے بھی ہیں جو اس نقطہ عروج کی طرف حرکت کرنے کی بجائے مختلف سمت میں حرکت کرتے ہیں۔ اس مضمون کو قرآن کریم کی اس آیت نے کھولا ہے اور میں بارہا سمجھا چکا ہوں۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (الاعراف: 177) ایک بدنصیب کا ذکر قرآن کریم فرماتا ہے اگر اللہ اسے چاہتا تو جو صلاحیتیں ہم نے عطا کی تھیں ان کے نتیجے میں اسے اس نقطہ عروج آسمانی کی طرف بلند کر لیتا جو اس کا منتہیٰ تھا۔ وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وہ زمین کی طرف جھک گیا۔

پس آغاز اچھا ہونا ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے اور دعاؤں کی ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے کہ ایسے وجود جن پر تمہاری محبت اور پیار اور شفقت کی نظر ہو جن سے تم توقعات رکھتے ہو کب تک تم ان کی حفاظت کر سکو گے، کب تک ساتھ دو گے، کب تک یہ یقین رکھو گے کہ دنیا کے اثرات اسے اپنی طرف نہیں کھینچ لیں گے اس لئے یہ دعا بھی لازم ہے کہ اسے نیک انجام تک اللہ پہنچائے اور اس نقطہ نگاہ سے سب سے پیاری دعا جو میری زندگی کی جان ہے جس کے لئے میں کئی دفعہ، بعض دفعہ لوگوں کو رمضان سے پہلے بھی عاجزانہ خط لکھ کر خصوصیت سے متوجہ کرتا ہوں وہ یہ دعا ہے کہ ان میں شامل کر دے جن کے لئے آسمان سے یہ آواز اٹھے، ان کا استقبال اس لازوال آواز کے ساتھ ہو۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر: 28 تا 31) تو جسے یہ نیک انجام نصیب ہو جائے اس سے بہتر کیا انسان تصور کر سکتا ہے؟

پس اس جانے والی پاک روح کے لئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ان لوگوں میں شمار فرمائے جن کی وفات کے وقت یہ آواز کان میں سنائی دی ہو، جس کی روح سے خدا اس طرح مخاطب ہوا ہو اور ان کی اولاد کو بھی وہ وجہ عظمت عطا کرے جو تعلق باللہ کی وجہ ہے۔ جہاں تعلق باللہ وجہ عظمت بنتا ہے، جہاں رفعتیں سجدے میں مضمر ہیں، جہاں ربی الاعلیٰ کی دعا اس طرح اٹھتی ہے کہ انسان

پھر ادنیٰ رہ ہی نہیں سکتا، وہ اعلیٰ سے تعلق جوڑ کر ضرور اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔ یہ دعائیں اپنے لئے بھی، اپنی اولادوں کے لئے، سب گزرے ہوئے اور آئندہ لوگوں کے لئے بھی کریں کیونکہ جزا کا وقت تو ابھی باقی ہے یعنی آخری فیصلے تو قیامت کے دن ہونے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ جماعت احمدیہ کو یہ عظمتیں نصیب فرمائے اور پھر اپنے نشان کے طور پر دنیا کی برکتیں بھی بخشے کیونکہ دنیا کی آنکھ ان باتوں کو دیکھتی نہیں ہے مگر جب خدا کی عظمتیں دنیا کے نشانوں میں ظاہر ہوتی ہیں تب وہ آنکھیں کھولتی ہے اور وہ ان باتوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

اب میں مختصراً کچھ یہ مضمون جو تھا میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا لمبا مضمون ہے اس کے جو پہلو میرے ذہن میں تھے وہ پورے تو میں بیان نہیں کر سکا مگر امید ہے مرکزی نکتہ احباب جماعت کو سمجھ آ گیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے احوال کا خلاصہ یہ ہے کہ 29 /جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے تھے۔ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب جو صاحب رؤیا وکشوف بزرگ تھے ان کا نکاح بھی حضرت مصلح موعودؓ نے پڑھایا تھا، ان کی والدہ ماجدہ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ یہ حکیم فضل الرحمٰن صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ حکیم فضل الرحمٰن وہ مبلغ ہیں جو تئیس (23) سال تک اپنی جوانی میں اپنی بیوی سے الگ رہے اور اف تک نہیں کی کبھی۔ افریقہ کے جنگلوں میں زندگی گزاری۔ نہایت پاکباز اور بہت ہی بااخلاق اور جاذب نظر شخصیت تھی۔ یہ ہمارے امریکہ کے ڈاکٹر حمید الرحمان صاحب کے خالو تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ماموں اور ڈاکٹر حمید الرحمٰن صاحب کے خالو تھے۔ ثریا بیگم جن کا وصال ابھی ہوا ہے جن کی نماز جنازہ پڑھائی تھی ان کی ہمشیرہ ڈاکٹر حمید الرحمان کی والدہ تھیں۔ تو یہ خاندان آپس میں اس طرح بڑے قریبی تعلق میں بندھا ہوا ہے اور بہت پاک روایتیں ہیں جو اس خون میں جاری ہیں۔ پس دعا کریں کہ یہ آئندہ بھی ہمیشہ جاری رہیں۔

وہ مجھے جو یاد تھا کہ رؤیا میں دیکھا تھا وہ رؤیا نہیں بلکہ کشفی طور پر آپ کو یہ دکھایا گیا تھا یہ نوٹس ہیں ان میں لکھا ہے'' تین (3) جون 1925ء کو خدا تعالیٰ نے کشفی طور پر دکھلایا کہ ایک فرشتہ ظاہر ہوا جس کے ہاتھوں میں ایک معصوم بچہ تھا، فرشتے نے وہ بچہ چوہدری محمد حسین صاحب کو پکڑا دیا اور کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹا عطا فرمایا ہے آپ نے اس بچے کا نام پوچھا تو آواز آئی عبدالسلام۔'' یہ رؤیا انہوں نے جب لکھ کر حضرت مصلح موعودؓ کو بھجوائی اور نام کی درخواست کی تو آپ نے لکھا'' جب خدا تعالیٰ

نے خود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں'' یعنی یہ بات حضرت مصلح موعودؓ کا لکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی رؤیا اور کشوف کی سچائی پر آپ کو کامل یقین تھا اور ویسے بھی انکسار کا پھر یہی تقاضا ہے جب کہہ دے خدا نے نام رکھ دیا ہے مگر محض اس وجہ سے نہیں مجھے یقین ہے کہ چونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ ایک صاحب کشف انسان ہیں اس لئے یہی لکھنا اس وقت یا صرف یہی لکھنا جائز تھا کہ جب خدا نے نام رکھ دیا تو ہم کیسے دخل دیں۔

چنانچہ پھر یہ بڑھے ہیں تو اللہ کے فضل سے دعاؤں کے ساتھ۔ اب یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ باقی بھی تو بہن بھائی ہیں ان کا تعلیمی کردار، بڑے ذہین ہیں، ہوشیار بھی ہیں، اچھے اچھے مرتبے حاصل کئے، کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ ایسا ہے جیسے کوئی چیز شوٹ Shoot کر کے ایسا اوپر نکل جاتی ہے کہ باقی سب چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں اس کے مقابل پر، کوئی نسبت نہیں ہے۔ ہر میدان میں ایسے ایسے انہوں نے میڈل بچپن سے حاصل کرنے شروع کئے ہیں، ریکارڈ پر ریکارڈ توڑتے چلے گئے ہیں اور بعض ایسے ریکارڈ جو پھر اور ہو ہی نہیں سکتے۔ جب سو فیصدی نمبر لے لو گے تو ریکارڈ کیسے ٹوٹے گا اور پھر جب پاکستان میں ناقدری کی گئی تو انگلستان میں آئے اور انگلستان کی حکومت کی فراخ دلی ہے یا قدر شناسی کہنا چاہئے، فراخ دلی کا سوال نہیں، انہوں نے بڑی عزت کا سلوک کیا امپیریل کالج کی پروفیسر شپ کی سیٹ عطا کی اور مسلسل ان کے ساتھ بہت ہی عزت اور احترام کا سلوک جاری رکھا ہے۔

پھر اٹلی نے آپ کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے جو ایک تحریک کی کہ میرے نزدیک وہاں ٹرانسٹی میں ایک سنٹر بنانا چاہئے سائنس کے فروغ کا تو حکومت اٹلی نے بڑا حصہ خرچ کا ادا کیا پھر دوسرے اداروں نے بھی اس میں حصہ لیا اور خاص طور پر غریب ممالک کے بچوں کو تعلیمی سہولتیں دے کر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کو نقطہ عروج تک پہنچانا، یہ آپ کا مقصد تھا اور اس میں قطعاً مذہبی تعصب کا اشارہ تک بھی نہیں تھا۔ غیر احمدی، پاکستانی، غیر پاکستانی، پولینڈ کے لڑکے، عیسائی، دہریہ سب پر یہ فیض برابر تھا جو رحمانیت کا فیض ہے اور اللہ کے فضل سے اس کے ساتھ بنی نوع انسان کو بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اب تعلیمی ڈگریاں اور میڈل بیان کرنے کا تو وقت نہیں ہے میں نے جو چیزیں اہمیت کی سمجھیں وہ بیان کر دیں۔ اب یہ ہمارا بہت ہی پیارا علموں کا خزانہ، دنیاوی علوم میں

بھی، روحانی علوم میں بھی ترقی کرنے والا ہمارا پیارا ساتھی اور بھائی ہم سے جدا ہوا۔ اللہ کے حوالے، اللہ کے پیار کی نگاہیں ان پر پڑیں اور ان کو سنبھال لیں اور اس کے علاوہ ان کی اولاد کے لئے بھی یہی دعا کریں کہ خدا ان سے ہمیشہ حسن سلوک رکھے، شفقت اور رحمت کا سلوک رکھے اور ان دعاؤں کو آگے بھی، ان کے خون میں، ان کی نسلوں میں جاری کردے جو ان کے حق میں قبول ہوئیں۔

اب آپ کے سامنے ایک اور ذکر خیر کرنا چاہتا ہوں وہ ہمارے بہت ہی پیارے مخلص فدائی امریکن دوست کا ذکر ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر تھے، پی ایچ ڈی تھے، برادر مظفر احمد ظفر جو امریکہ کے نائب امیر تھے۔ یہ بھی انتہائی منکسر المزاج اور بے حد مستعد خدمت کرنے والے اور پی ایچ ڈی تھے مگر اپنے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے تھے اور ڈیٹن میں پروجیکٹ کیور (Cure) کے ڈائریکٹر تھے۔ مجھ سے بہت پرانا تعلق ہوا ہے جلسہ سالانہ پر ان کے آنے کی وجہ سے اس کے بعد یہ مسلسل بڑھتا رہا کیوں کہ ان کے اندر بہت گہری خوبیاں تھیں اور بڑا روشن دماغ تھا۔ امریکنوں کے مسائل کو جس وضاحت کے ساتھ یہ سمجھتے تھے بہت کم ہیں جن کو اتنا عبور تھا اور ان مسائل میں جب ان سے گفتگو ہوئی تو میں نے ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھایا اور مستعد ایسے کہ جب میں وہاں جایا کرتا تھا تو میری حفاظت کے تعلق میں جو انسانی کوششیں ہوتی ہیں ان کے یہ انچارج ہوا کرتے تھے، دن رات لگتا تھا ایک لمحہ بھی نہیں سوتے۔ جب نکلتا تھا یہ سامنے مستعد کھڑے ہیں۔

پھر ڈرائیونگ کرنی اور بہت تیز۔ میں نے کئی دفعہ سمجھایا کہ خدا کے لئے کچھ آرام کرلیا کریں۔ ورنہ آپ کو کیا، مجھے صدمہ پہنچے گا۔ تو پھر تھوڑا سا وعدہ کیا اچھا اچھا میں خیال رکھوں گا مگر کئی دفعہ یہ ہوا کہ اپنا کام کر کے پیچھے رہ گئے اور میں نے ذکر کیا کہ اوہو ہم تو یہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں، کھانا بھی کھانا تھا ان کے بغیر مزہ نہیں آئے گا وہ تو بہت پیچھے رہ گئے ہیں تو ابھی بات ختم نہیں ہوئی کہ سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ ہوا کی طرح چلتے تھے ڈرائیونگ میں اور مزہ یہ ہے کہ پکڑے نہیں جاتے تھے۔ دعائیں کرتے ہوئے جاتے ہوں گے تو خدا کا غالب قانون جو ہے وہ دنیا کے قانون پر غالب آ کر ان کی حفاظت فرمالیتا تھا۔ کبھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا خدا کے فضل سے۔ تو چند دن بیمار رہ کر اچانک جو جگر کا کینسر تھا جس کا علم بعد میں ہوا جس کی وجہ غالباً ان کا صبر ہے۔ انہوں نے معلوم ہوتا ہے عمداً بتایا نہیں، ابتدائی علامتوں کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا۔ اس وقت پتا چلا جب وہ آگے بڑھ چکا تھا اور ان کا

وصال میرے لئے بہت گہرے صدمے کا موجب بنا ہے مگر یہ صدمے تو انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ یہی پیغام ہے جو ہمیشہ سہارا بنتا ہے۔ ان کی بیگم سسٹر رضیہ بھی غیر معمولی اخلاص رکھنے والی، مستعد اور بہادر خاتون ہیں۔ عورتوں میں وہ یہ ڈیوٹی دیا کرتی تھیں، ان کے اوپر ان کو ظاہر ہے کہ زیادہ اعتماد تھا۔ ایک دفعہ مجھے یوں لگا جیسے اچانک پیچھے سے کوئی دور جا پڑا ہے۔ تو دیکھا تو پرائیویٹ سیکرٹری ان کے کندھے کا شکار ہوئے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ اس لائن سے آگے کوئی مرد نہیں جائے گا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ پرائیویٹ سیکرٹری یا کون ہے وہ لائن آئی ہے تو یوں کندھا مارا ہے کہ پرائیویٹ سیکرٹری لڑھکتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ تو بڑی مستعد تھیں ماشاء اللہ۔ اب بھی مستعد ہیں، مستعد رہیں گی انشاء اللہ ان کے لئے اور ان کی اولاد کے لئے بہت دعا کریں۔

دیگر مرحومین جن کا جنازہ آج جمعہ کے بعد پڑھا جائے گا ان میں سرفہرست ہمارے صادق صاحب مرحوم شہید ہیں۔ ان کا ذکر مختصر ضروری ہے۔ بہت ہی پیارا وجود تھا، بڑی بہادری سے اپنی جان جان آفریں کو پیش کی ہے خدمت دین میں، دعوت الی اللہ میں۔ یہ وہ ہیں جن کے والد 1965ء میں احمدی ہوئے تھے۔ کٹر اہل حدیث علاقہ ہے وہ اور وہ چونکہ صاحب اثر تھے، سب سے پہلے ان کے بھائی احمدی ہوئے تھے ان کی تبلیغ سے والد احمدی ہوئے تھے۔ یہ اور ان کے ایک بھائی میاں عنایت اللہ تھے جو اس وقت تو سینے میں گھونٹ کر اپنے بغض چھپاتے رہے جب تک والد زندہ تھے۔ ان کے سامنے سر اٹھانے کی ان کو مجال نہیں تھی مگر ان کے وصال کے فوراً بعد انہوں نے شدید مخالفت شروع کی اتنی شدید مخالفت کہ اپنے بھائی جو ایمان لایا تھا باپ سے پہلے ہدایت اللہ صاحب ان کی زندگی اجیرن کر دی لیکن پھر آخر خود احمدیت کی صداقت کا 1974ء میں شکار ہوئے۔ جب 1974ء کی تحریک زوروں پر تھی اور شور تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ اب ایسی دیوار سی بن گئی ہے کہ کوئی احمدی نہیں ہوسکتا تو یہ مخالفت پھلانگ کر امن کے دائرے میں آگئے اور اس کے بعد سے پھر ایک ننگی تلوار تھے احمدیت کی تبلیغ میں، احمدیت کا پیغام پہنچانے میں۔ انہی کی تبلیغ سے محمد اشرف صاحب آف جلھن ضلع گوجرانوالہ وہ بھی کٹر اہل حدیث علاقہ کے تھے وہ احمدی ہوئے اور جب وہ احمدی ہوئے تو پھر اس علاقے کے مولویوں اور دوسروں سے برداشت نہیں ہوا۔ سب سے پہلے انہوں نے اشرف صاحب کو شہید کیا اور

اس کے بعد ان پر نظر رہی لیکن انہوں نے عین ان کے گڑ گڑھوں میں جا کر تبلیغ جاری رکھی چنانچہ پچھلے ایک دو سال کے اندر جب میں نے تحریک کی ہے دعوت الی اللہ کی تو خدا کے فضل سے پندرہ اہل حدیث کو بڑا مضبوط احمدی بنانے کی ان کو توفیق ملی۔ آخر یہ معاملہ دشمنوں کی برداشت سے باہر نکل گیا تو یہ جمعہ پر جارہے تھے تو ایک پل پر جہاں دشمن تاک لگائے بیٹھا تھا انہوں نے گولیاں برسا کر یا کارتوسوں کی فائروں سے ان کو وہیں چھلنی کر دیا۔ وہیں شہید ہو گئے۔ تو ان کی جو واپسی ہے بڑی عظیم واپسی ہے۔ ایسی واپسی ہے جس کی قرآن ضمانت دے رہا ہے کہ یہ تو مرے بھی نہیں یہ تو زندہ رہنے والے وجود ہیں ان پر نہ تم رونا۔ اپنی فکر کرو کہ تم کیسے واپس جاتے ہو۔ یہ تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ تو ان کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ سارا خاندان بڑا بہادر ہے اللہ کے فضل کے ساتھ۔ ان کی اولاد میں بھی وہی رنگ ہیں عظمت کے، جو خلوص سے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ وفا سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب باقی جو نماز جنازہ پڑھی جائیں گی ابھی نمازِ جنازہ ادا ہو گی جن کی وہ غلام رسول صاحب معلم اصلاح وارشاد ہیں جو ہمارے مبارک احمد ظفر صاحب جو اس وقت نائب وکیل المال ہیں ان کے یہ والد ہیں۔ بہت سادہ مزاج میں جانتا تھا انہیں بہت اچھی طرح۔ ساری عمر بالکل سادہ کپڑوں میں دیکھنے والا پہچان بھی نہیں سکتا تھا کہ کیسا انسان ہے مگر ساری اولاد کی تربیت بہت ہی پیاری اور اعلیٰ درجہ کی کی ہے اور کبھی کسی کے خلاف شکوہ زبان پہ نہیں آیا۔

عنایت علی صاحب کھاریاں، ہمارے اخلاق انجم صاحب کے والد۔ یہ بھی وہ مبلغین ہیں جن کے والدین یا بزرگوں کو میں نے آج جنازے کے لئے چنا ہے۔ جو دین کی خاطر باہر تھے پیچھے ان کے بزرگوں کی وفات ہوئی ہے یا ملا تو آخری موقع جانے کا ملا۔ مسعودہ بیگم صاحب عبدالسلام صاحب ٹیلر ماسٹر ربوہ کی بیگم اور عبدالمنان طاہر صاحب کی والدہ۔ وہ بھی آپ کے مبلغ ہیں جو یہیں اس وقت کام کر رہے ہیں اور راؤ محمد اکبر صاحب جو یہاں آیا کرتے تھے اکثر جلسے پر بڑے ہی فدائی اور بہادر انسان۔ اپنے علاقے میں یہ احمدیت کے لئے بلا شبہ ایک پر رعب ننگی تلوار تھی جس کی مخالفت کی وہاں جرأت نہیں ہوتی تھی پوری۔ اندر اندر مخالفتیں ہوتی تھیں ادھر ادھر لوگوں کو تنگ کیا جاتا تھا مگر راؤ صاحب کے کڑاکے کے سامنے کیونکہ ان کی برادری ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ بڑی بہادر اور لڑائی کرنے والی برادری یعنی ان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں ملتا تھا جس طرح پرانے زمانوں میں ہوا کرتا

تھا۔ جہالت میں کہ کوئی نبی اگر کسی بڑے قبیلے کا فرد ہو تو کہتے اس کی وجہ سے ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں تو ان کا بھی چونکہ قبیلہ مضبوط تھا اس لئے ان کو جرأت ہوتی تھی اور اپنے قبیلے کی خاطر کبھی بھی انہوں نے احمدیت کا پیغام چھپایا نہیں تو یہ بھی اچانک وفات پا گئے ہیں۔ بہت ہی پیارا مخلص انسان تھا، بہت تبلیغ کرنے والے۔ اللہ ان سب کو غریق رحمت فرمائے۔ ابھی نماز جمعہ کے معاً بعد انشاء اللہ ہم ان سب کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔

ایک نام رہ گیا ہے ایک مربی نہیں دو مربیوں کی والدہ ہیں جو فوت ہوئی ہیں۔ ایک ہمارے ملک محمد اکرم صاحب مربی مانچسٹر کی والدہ رضیہ بیگم بھی وفات پا گئی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ ان کو بھی نماز جنازہ میں شامل رکھیں۔

اس دور کی کایا پلٹنی ہے تو اعلیٰ اخلاقی نمونوں سے پلٹی جائے گی

اپنے اخلاق کو بہت اعلیٰ درجہ کے اخلاق بنائیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 29 /نومبر 1996ء بمقام بیت الحمد مالمو، سویڈن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام: 105 تا 107)

پھر فرمایا:

یہ آیات جن کا میں نے آج خطبہ جمعہ کے لئے انتخاب کیا ہے۔ یہ سورۃ انعام کی نمبر 105 تا نمبر 107 آیات ہیں۔ پیشتر اس سے کہ ان آیات کے حوالے سے آپ کو کچھ نصیحت کروں، میں بتادینا چاہتا ہوں کہ اس وقت یہ خطبہ جمعہ مالموسویڈن (Malmo Sweden) سے دیا جارہا ہے۔ وہ لوگ جو واقف نہیں، اس وقت تک کہ مالموسویڈن (Malmo Sweden) سے ہی یہاں کی نیشنل ٹیلی ویژن نے ہمیں یہ سہولت مہیا کی ہے۔ اگرچہ پیسے لئے مگر بہت ہی رعایتی اور یہ جو خرچ ہے۔ یہ چند مخلصین نے اٹھایا ہے۔ ان کے شوق وذوق کی وجہ سے ہی یہ صورت حال قبول کی گئی۔

پس اس وقت یہ خطبہ MTA کی طرف سے سویڈن کی نیشنل ٹیلی ویژن براہ راست اٹھا رہی ہے اور لندن کی معرفت دنیا کو نہیں پہنچ رہا بلکہ ہمارے سیٹلائیٹ پر سویڈن کی جو نیشنل ٹیلی ویژن کمپنی ہے اس نے اٹھایا ہے اور براہ راست ہمارے سیٹلائیٹ کو بھیج رہی ہے۔

یہ جو عالمی رابطے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس دور کی ایک خاص اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جس کا جس قدر بھی شکر یہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اتنے حیرت انگیز فوائد MTA کے سامنے آرہے ہیں کہ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اتنی زیادہ برکتیں اس نظام میں ہوں گی اور ضرورت کتنی تھی اس کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ اب جبکہ میں دورے کرتا ہوں بچوں سے ملتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت اس دور کا واحد تربیت کا ذریعہ ہے ورنہ بھاری تعداد میں ہمارے بچے ہیں جو مربیوں کی تربیت کے دائرے سے باہر ہیں جن کے ماں باپ کو خود تربیت نہیں آتی، جن کے والدین، ان کے عزیز و اقارب خود تربیت کے بہت محتاج ہیں، روزمرّہ کے اخلاق سے بھی ناواقف، اسلامی آداب سے نابلد۔ غرضیکہ یہ ایک ایسی ضرورت حقّہ تھی کہ اگر خدا تعالیٰ زبردستی ہمیں اس طرح انگلی پکڑ کر نہ لے جاتا تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم اس کی طاقت رکھتے ہیں اور اس وقت رکھتے بھی نہیں تھے، مگر لاعلمی میں کہ ہم طاقت رکھتے ہیں جب ہم اس دور میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے پھر اپنے فضل سے ہماری استطاعت بڑھانی شروع کی اور اتنی بڑھائی کہ آج چوبیس (24) گھنٹے مسلسل تمام دنیا میں اگر کوئی ایک ٹیلی ویژن ہے جو پیغام بھجوا رہی ہے اور پروگرام دکھا رہی ہے تو صرف MTA ہے ساری دنیا میں اس کے سوا کوئی نہیں، تب ہی حکومتیں حیرت زدہ ہیں۔

بڑے بڑے ماہرین ادب سے سر جھکاتے ہیں کہ جماعت احمدیہ نے وہ کام کر دکھایا جس کی آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کو بھی طاقت نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس طرح کہ مختلف ملکوں کے لئے، مختلف وقتوں میں الگ الگ پروگرام تو دکھائے جاتے ہیں مگر وہ بھی Advertisement یعنی اشتہار بازی کے ذریعہ اور اس کی خاطر اور جہاں اشتہار بازی آجاتی ہے وہاں مخرب اخلاق پروگراموں کا داخل ہونا لازم ہے۔ جتنی بھی ہندوستانی کمپنیاں آج پاکستان کو خصوصیت سے متأثر کر رہی ہیں اور ان کے نہایت گندے اور بدذوق فلمی پروگرام دیکھنے کے ہمارے پاکستانی عادی بن رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے پیسے کمانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ جتنے گندے اخلاق

کا دنیا تقاضا کرے اس سے بھی بڑھ کر گندے اخلاق پیش کرو کیوں کہ بے حیائی کی بھوک بھی مٹ جایا کرتی ہے۔ چند دن ایک قسم کی بے حیائی کی عادت پڑے تو اس سے آگے بڑھے بغیر پھر اس پہلی بے حیائی کا مزہ باقی نہیں رہتا۔ یہی Drug Addiction کا فلسفہ ہے۔

اور جماعت احمدیہ اس کے برعکس فلسفہ کو جو مثبت فلسفہ ہے، استعمال کر رہی ہے یعنی نیکیوں کے لئے بھی عادت پیدا کرنی پڑتی ہے، از خود نیکیوں میں دلچسپی پیدا نہیں ہوا کرتی۔ تھوڑی تھوڑی نیکیاں چکھا چکھا کر ساری دنیا کی جماعت کو آگے بڑھانا، یہ ہمارے اعلیٰ مقاصد میں سے ایک مقصد ہے اور جب بھی نیکی کی عادت پڑتی ہے تو یہ عادت بدی کی عادت سے زیادہ پختہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی کی عادت میں اللہ تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے ایک ایسی روحانی دائمی لذّت ہے، جس کا ردعمل کوئی نہیں، مگر بدی کی دلچسپیاں خواہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہوں، کتنی طاقت سے اپنی طرف کیوں نہ کھینچیں، ہر شخص جب مزید بدی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ اس کے ضمیر کی ایک آواز ضرور اٹھتی ہے، جو اس کو ملامت کرتی ہے اور ہر دفعہ اس ملامت کے Barrier اس کی حدیں پھلانگ کر، انسان بدی کے اگلے دور میں داخل ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ آواز مر جائے اور جب مر جائے تو پھر اس کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف اس کی واپسی یا نیکیوں کی طرف واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ کا خاص فضل اسے سنبھال لے۔

پس اب بھی ہم نے دیکھا ہے کہ MTA کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہماری نئی نسلوں کے ذوق سدھر رہے ہیں۔ وہ بچے جو دن رات کارٹونوں کے سامنے یا خوفناک فلموں کے انتظار میں نہایت ہی مخرب اخلاق فرضی کہانیوں میں مبتلا ہو چکے تھے یعنی ایسے عادی بن گئے تھے جیسے کوئی نشے میں مبتلا ہو جائے وہ اب سب وہ پروگرام چھوڑ کر احمدیہ پروگراموں کو جن کے اندر سادگی اور فطری ایک جذب ہے، سچائی ہے، فطری جذب ہے، بے اختیاری ہے، کوئی بھی اس میں ایکٹنگ نہیں ہے، اس کے جب عادی بنتے ہیں تو پھر عادی ہوتے چلے جاتے ہیں ایک جگہ سے بھی کبھی آج تک یہ اطلاع نہیں آئی کہ احمدی بچوں نے کچھ عرصہ دیکھا اور اس کے بعد اس کو چھوڑ کر دوسرے ٹیلی ویژنوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ جب آئے تو ان کا ذوق بڑھتا گیا ان کا تعلق بڑھتا گیا اور جو بھی ہمارے پروگرام ہیں ان کے ساتھ ایک ذاتی وابستگی پیدا ہو گئی ہے۔

پس اس پہلو سے آج بھی جو خطبہ براہ راست یہاں سے نشر کیا جا رہا ہے یہ کل عالم میں احمدیت کی یک جہتی اور ایک جان ہونے کا ایک عظیم ثبوت ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے سوا یہ ممکن نہیں تھا۔ پس ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اور بھی ہماری عالمی یک جہتی کو بڑھائے، ہم ایک مزاج بن کر ابھریں اور وہ جو قومی اور نسلی اختلافات ہیں ان کو مٹانے کے لئے تمام دنیا سے ایک مزاج کے لوگوں کا ایک قوم کا ایسا ابھرنا لازم ہے جو ایک مرکزی دماغ کے ساتھ وابستہ ہو، ایک مرکزی دل کے ساتھ دھڑکتی ہو اور اس کے زیر و بم میں ان کی ساری زندگی ہو۔ یہ معجزہ ہے جو حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کا معجزہ ہے جو آخرین کے لئے مقدر تھا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ہمیں عطا فرمائی۔

اس دور کے جو تقاضے ہیں ان کے تعلق میں یہ آیت کریمہ میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی۔ سب سے اہم تقاضا میرے نزدیک اس وقت اخلاق حسنہ کا تقاضا ہے، نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی دنیا کو ضرورت ہے اور اخلاق حسنہ دنیا سے مٹتے جا رہے ہیں، محدود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ قومیں جو کبھی اپنے اخلاق کی وجہ سے سر اٹھا کر چلا کرتی تھیں، جن کے دعوے تھے کہ ہماری گلیوں میں چوری کوئی نہیں ہماری گلیوں میں بے ہودہ حرکتیں کوئی نہیں انگلستان کا بھی ایک زمانے میں برحق دعویٰ اور یہی دعویٰ تھا مجھے یاد ہے جب میں طالب علم تھا تو ایک دفعہ Hampstead-Heath کے ایک کنارے سے چونکہ ہمارا وہاں ایک پروگرام تھا جس میں دیر ہوگئی اور Tube بند ہو چکی تھی اور ٹیکسی کی توفیق نہیں تھی اس وقت میں پیدل لندن مسجد پہنچا ہوں اور رات کے وقت کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا، خاموش گلیاں، پرسکون گلیاں اور صبح نماز کے وقت میں وہاں پہنچا اور صبح کی نماز میں شامل ہو گیا آرام کے ساتھ۔ یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رستے میں کوئی چور اُچکا آئے گا اور پکڑے گا اور پولیس میں بھی ایسی شرافت اور مستعدی تھی کہ بے وجہ دکھائی نہیں دیتی تھی مگر جہاں ضرورت پڑے وہاں پولیس نکل آتی تھی کہیں سے۔ اب وہ حالات بالکل یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اب تو گلی گلی کا موڑ خطرناک ہو گیا ہے اب تو ان کے جو دانشور ہیں وہ شور مچا رہے ہیں کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے ہر قسم کا امن اٹھ گیا، بچوں کا امن اٹھ گیا، لڑکیوں کا امن اٹھ گیا، اپنے ماں باپ سے گھر میں بچوں کو خطرے ہیں اور یہ خطرات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پس اس دور کی کایا پلٹنی ہے تو اعلیٰ اخلاقی نمونوں سے پلٹی جائے گی محض باتوں سے یہ

عظیم کارنامہ جو آپ کے سپرد ہے یہ پورا نہیں ہوسکتا، اس پر عمل ناممکن ہے۔

یہ ایک ہی پروگرام ہے کہ اپنے اخلاق کو بہت اعلیٰ درجہ کے اخلاق بنائیں جو عملی زندگی میں تمام ماحول کو روشن کرنے لگیں ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیں۔ آپ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اجنبی کی حیثیت سے یہاں چلیں جیسے ان کے ہاں Aliens اترتے ہیں فرضی طور پر اور آ کر اور بھی زیادہ ان کے اخلاق برباد کر جاتے ہیں۔ ان کا قتل و غارت، ان کا خون خرابہ، ان کا ظلم وستم یہ ان بچوں کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے جو بڑی دلچسپی کے ساتھ ان پروگراموں کو دیکھتے ہیں مگر اور قسم کے بھی Aliens ہوا کرتے ہیں جن کا آنا دنیا کے لئے اجنبی ہو اور سب سے بڑے Aliens جو دنیا میں نازل ہوتے ہیں وہ وقت کے انبیاء ہیں کیونکہ ان کے آنے کے ساتھ ساری سوسائٹی کو بالآخر ان کے رنگ اختیار کرنا ہوتے ہیں اور ان کا خلق غالب آتا ہے، نظریات سے بڑھ کر ان کا خلق غالب آتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آنحضرت ﷺ کی دعا کے بعد سب سے زیادہ انقلابی طاقت آپؐ کا خلق بیان فرمائی ہے یہ خلق محمدی تھا جس نے لازماً غالب آنا تھا اور اجنبی دنیا میں جب ایک اجنبی اترتا ہے تو شروع میں اس کی مخالفت ہوتی ہے وہ عجیب باتیں کرتا ہے، عجیب ادائیں دکھاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم میں سے نہیں ہے اس لئے اسے اپنے سے نکال باہر پھینکو۔ مگر بنیادی طور پر، انسانی فطرت کی گہرائی میں حسن خلق کے تقاضے ایسے داخل ہیں کہ کوئی دنیا کی طاقت انہیں مٹا نہیں سکتی۔ بد سے بد سوسائٹی میں بھی دل کے اندر کی آواز یہی ہے کہ کاش اس ماحول کو حسن خلق روشن کر دیتا، کاش ہمارے دن بدل جائیں، کاش ہمارا فساد امن میں تبدیل ہو جائے۔ یہ آواز ہر مجرم کی آواز بھی ہے ہر انسان جو بد سوسائٹی کا ممبر ہے جو اس کے نتیجہ میں دن بدن نیچے اتر رہا ہے اوپر دیکھ کر اوپر چڑھنے کی تمنا اس کی کبھی نہیں مرتی۔ پس دل کی اس آواز کو انبیاءؑ کے خلق ابھارتے ہیں اور بالآخر دل کی یہ آواز جیتا کرتی ہے۔

آج بھی میں نے اپنے ناروے اور سویڈن اور ڈنمارک کے دورے میں محسوس کیا ہے کہ یہاں اگر کوئی چیز تبدیلی لا سکتی ہے تو آپ کے خلق ہیں، آپ کے اخلاق ہیں۔ اخلاق حسنہ کے سوا یہ ممکن نہیں ہے اور اس تعلق میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند اقتباس میں نے آج آپ کے سامنے رکھنے ہیں لیکن اس سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کی

پیروی میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تمام ان باتوں کو کھولا ہے اور خوب کھولا ہے جو سچائی کو جھوٹ سے الگ کرنے والی، دن کو رات سے الگ کرنے والی اور اس طرح کھول دیا ہے مضمون کو کہ اس کے بعد کوئی احمدی یہ شکوہ نہیں کر سکتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات ہم سے چھپالی۔ آنحضرت ﷺ کا یہی پاک نمونہ تھا جسے اس کامل غلام نے اپنا لیا۔

حضور اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے کہ ہم اس طرح، اس لئے آیات کو پھیر پھیر کر تجھے سناتے ہیں تا کہ تو ہم سے مضامین کی گہرائی کا علم سیکھ لے۔ عرفان جہاں تک بھی انسان کو پہنچا سکتا ہے، وہاں تک تیسرا ادراک پہنچے اور خدا کا فضل اور رحمت تجھ پر اس طرح نازل ہو کہ تو مجسم خدا کا فضل اور رحمت بن جائے۔ یہ مقاصد ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے جس کی وجہ سے، جب خدا تعالیٰ نے مختلف مضامین کو، مختلف آیات کو ادل بدل کر، چکر دیتے ہوئے کبھی اس پہلو سے، کبھی اس پہلو سے روشن کیا تو مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ دنیا کی تدریس کا کام ایسا کامل طور پر کریں کہ جب آپؐ کے سکھائے ہوئے، حیرت انگیز طور پر آپؐ کے حکمت سکھانے اور علم سکھانے اور حکمتوں کے راز بتانے کو دیکھیں تو بے اختیار ان کے منہ سے یہ نکلے۔ تو نے اپنے رب سے سیکھنے کا خوب حق ادا کر دیا، ایسا سیکھا ہے کہ اس کی کوئی مثال دکھائی نہیں دیتی۔

پس آنحضرت ﷺ کے سکھانے کا کمال تھا جس نے آپؐ کے غلاموں کے منہ سے یہ فقرے نکال دیئے واہ واہ! کیسا شاگرد ہے یعنی اللہ کا شاگرد، خدا سے وہ کچھ سیکھ گیا جس کی عام انسان میں طاقت نہیں تھی کیونکہ تصریف آیات میں عام انسان کی عقل ان کی گہرائی کو پا بھی نہیں سکتی جو باتیں حکمت کی تہہ بہ تہہ راز اندرونی راز بیان کئے جائیں ان کے لئے غیر معمولی ذکی اور فہیم انسان کی ضرورت تھی۔ پس جب آنحضرت ﷺ کے عرفان کی باتیں کیا کرتے تھے تو صحابہؓ کے منہ کی آواز ہے جو قرآن نے محفوظ کی ہے۔ بے اختیار ان کے دل سے آوازیں اٹھتیں سبحان اللہ تو نے اپنے رب سے خوب سیکھا ہے، ایسا سیکھا ہے کہ سیکھنے میں تو نے کمال کر دیا اور اگر تو نہ سیکھتا تو ہم بھی کچھ نہ سیکھتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی بعینہٖ یہی رنگ ہے آنحضرت ﷺ سے سیکھا اور سیکھنے کا حق ادا کر دیا اور پھر اس طرح کھول کھول کر ہمارے سامنے بیان فرمایا کہ کوئی پہلو اس کا اندھیرے میں رہنے نہیں دیا۔

ان آیات کا میں ترجمہ اب آپ کے سامنے رکھتا ہوں قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا دیکھو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بصیرتیں تم تک آ پہنچی ہیں اور بصیرتیں کس صورت میں آئی ہیں یہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے نزول کی صورت میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ مضمون ہے جو آگے کھلتا ہے۔ تمہارے پاس ہر قسم کی بصیرتیں، طرح طرح کی عظیم الشان بصیرتیں جو تمہیں روشنی بخشنے والی ہیں تمہارے رب کی طرف سے آ چکی ہیں۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم لاعلمی میں وہ باتیں کرتے ہیں جو کر رہے ہیں۔ سب کچھ دیکھ چکے ہو، سب کچھ جان چکے ہو جانتے بوجھتے ہوئے اگر اب تم کوئی غلط مسلک اختیار کرو تو نہ خدا پر کوئی الزام، نہ محمد رسول اللہ ﷺ پر کہ گویا انہوں نے سکھانے میں کمی کر دی تھی پھر جو سیکھے گا تو اسی کے فائدے میں ہوگا اور جو اندھا بن جائے گا تو اس کا اندھا پن اسی کے خلاف استعمال ہوگا۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے کلام کی صورت میں خدا کا کلام نازل ہو رہا ہے۔ اچانک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مخاطب ہیں اور کہتے ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن میں حفیظ نہیں ہوں تم پر، جو سکھانے کا حق تھا وہ ادا کر دیا لیکن حفیظ صرف خدا ہے اس کی حفاظت میں آؤ گے تو تم ان تمام باتوں سے استفادہ کر سکو گے جو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ اگر خدا کی حفاظت سے باہر نکلو گے تو یہ باتیں تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس طرح ہم آیات کو ادل بدل کر مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں اور بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ وَلِيَقُوْلُوْا تا کہ وہ کہیں دَرَسْتَ اے محمد ﷺ! تو نے سیکھنے کا حق ادا کر دیا، کمال درجے کا سیکھا ہے۔ اب یہ بھی تصریف الآیات کی ایک عظیم الشان مثال ہے۔ ابھی آنحضرت ﷺ کا کلام ہے خدا کی طرف سے جو نازل ہوا لیکن آنحضرت ﷺ کی طرف سے اللہ مخاطب ہو رہا ہے سب کو اور اب كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ اللہ اپنے ہاتھ میں ضمیر کو لے لیتا ہے کلام کی باگ ڈور براہ راست سنبھالتا ہے۔ فرماتا ہے اسی طرح نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ہم آیات کو ادلتے بدلتے ہیں وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ اور مقصد یہ ہے کہ بے اختیار ان کے دلوں سے آوازیں اٹھیں کہ اے محمد ﷺ! تو نے سیکھنے کا حق ادا کر دیا ایسا پڑھا ہے کہ کمال کر دیا وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اور تا کہ اس مضمون کو اہل علم پر ایسا کھول دیں کہ

اس کے ہر پہلو کو اس پر روشن کر دیں۔ اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا جاتا ہے اسی کی پیروی کر لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اور جو شرک کرنے والے ہیں وہ خدا کے سوا اپنی امنگوں یا دنیا کی حکومتوں اور طاقتوں کو اپنا خدا بنا بیٹھے ہیں، ان سے اعراض کر ان سے منہ پھیر لے۔

اسی مضمون کے تعلق میں آنحضرت ﷺ نے آخری خطبہ میں جو حجۃ الوداع کا خطبہ کہلاتا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ کا مجمع یا شاید اس سے بھی زیادہ تھے جو اس آخری خطبہ میں آنحضور ﷺ کے سامنے حاضر تھے یہ آخری حج تھا جو آپؐ نے ادا فرمایا یہ آخری خطبہ تھا جو آپ نے اپنے عشاق کو دیکھتے ہوئے ان کے سامنے بیان کیا اور اللہ کے حضور دراصل ایک حجت تھی، ان پر حجت تھی جو پوری کر رہے تھے اور خدا کے حضور یہ عرض کر رہے تھے اے خدا یہ سب گواہ ہیں جو کچھ تو نے مجھے کہا تھا میں نے سب کچھ بیان کر دیا ایک ذرّہ بھی کمی نہیں آنے دی۔ فرمایا، اے لوگو! عنقریب تم اپنے رب سے ملو گے۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے کیسے عمل کئے دیکھو میرے بعد دوبارہ کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں اڑاتے پھرو اور آگاہ رہو تم میں سے جو یہاں موجود ہے ان لوگوں کو پیغام پہنچا دیں جو کہ موجود نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جس کو وہ پیغام پہنچایا جائے وہ سننے والے سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ پھر آپؐ نے فرمایا کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا ہے، کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا ہے۔ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا ہے۔ صحابہؓ کہتے ہیں ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا اے میرے اللہ گواہ رہ کہ جس کام کی خاطر تو نے مجھے بھیجا تھا میں نے اس کا تمام حق ادا کر دیا ہے۔ یہ ایک لاکھ کا مجمع گواہ ہے، یہ بلند آواز سے اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ جو کام تو نے میرے سپرد کئے تھے وہ تمام تر پورے کر دیئے اور یہ پیغام پہنچا دیا۔

یہ آخری خطبہ تھا حجۃ الوداع کا جس میں شریعت کی تکمیل کا یہ منظر حیرت انگیز ہے یعنی شریعت صرف مکمل نہیں ہوئی بلکہ وہ کامل رسول ﷺ جس نے شریعت کو بنی نوع انسان تک پہنچانا تھا اس نے ایک لاکھ کے مجمع میں ان سے یہ گواہی لی اور خدا کے حضور اس گواہی کو پیش کیا کہ اے خدا میں اپنا حق ادا کر چکا ہوں اور یہی دراصل اس بات کی علامت تھی کہ آپؐ رخصت ہونے والے ہیں،

واپس اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملنے والے ہیں۔ کئی صحابہؓ تھے جن کا ذہن اس طرف گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے یہ ہمارے رسول ﷺ کی جدائی کا خطبہ ہے شاید اس کے بعد ہمیں آپؐ کو دیکھنا نصیب نہ ہو۔ چنانچہ اگلے حج سے پہلے پہلے اس خطبہ وداع کے بعد آپؐ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی ہمیں یہ راز سمجھائے اور خوب کھول کھول کر ہمارے سامنے یہ باتیں بیان فرمائیں اور سب سے اہم اور قیمتی راز یہ ہمیں بتایا کہ یہ سب کچھ جو عمل کی طاقت ہے اچھی باتیں سننا اور پھر ان پر عمل کرنا یہ اللہ کے فضل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے جتنا چاہو تم زور مارو، جتنا چاہوں میں تمہیں سمجھاؤں میں تم پر یہ بات خوب کھول دینا چاہتا ہوں کہ توفیق اسی کو ملے گی جس پر خدا کا فضل نازل ہوگا اور توفیق آسمان ہی سے اترا کرتی ہے۔

اب لمبا عرصہ ہو گیا میں جماعت احمدیہ کو اخلاق حسنہ سے متعلق اپنے خطبات میں نصیحت کرتا ہوں۔ میں بتاتا ہوں کہ کس طرح ہمارا سفر گھروں سے شروع ہوگا۔ جب تک ہمارے گھروں میں اخلاق حسنہ کے نمونے جاری نہ ہوں، جب تک خاوند اور بیوی کے درمیان، باپ اور بیٹی اور باپ اور بیٹوں کے درمیان، ماں اور بیٹیوں اور ماں اور بیٹوں کے درمیان ایک جنت کا سا معاشرہ قائم نہ ہو اور اخلاق حسنہ کے پاک نمونے گھروں میں جاری نہ ہوں اس وقت تک یہ دعویٰ کہ ہم دنیا کو تبدیل کر دیں گے محض ایک جنت الحمقاء میں بسنے والی بات ہے یعنی احمق بھی تو ایک جنت بنا لیا کرتے ہیں وہ ان جنتوں میں جا بستے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جنتیں اور ہیں جن میں ان لوگوں کی رسائی ہوگی جو صاحبِ عقل ہیں احمق کو وہاں تک کوئی رسائی نہیں۔

پس یاد رکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسی طرح دراست کے حق ادا کئے اور ہمیں خوب کھول کھول کے سمجھا دیا۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور کا انقلاب اخلاق حسنہ سے وابستہ ہے کیونکہ مجھے کامل یقین ہے کہ دنیا کو آج سب سے زیادہ اخلاق کی پیاس ہے۔ دلائل کی دنیا میں تو ہر انسان یہ طاقت ہی نہیں رکھتا کہ بڑے بڑے اہل علم اور اہل فضل پر غالب آ سکے۔ اگر وہ سچا بھی ہو تو دنیا بہت چالاک ہے اور دنیا ظاہری علوم میں اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ایک عام سادہ لوح انسان کے لئے اور ایک مخلص احمدی کے لئے جس نے بات بھی دنیا کے برعکس کرنی ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کو سمجھا کر ان کو مغلوب کر سکے لیکن ایک چیز ہے جو دنیا کے پاس نہیں وہ اخلاق حسنہ

ہیں۔ ایک چیز ہے جس کی پیاس دنیا میں بڑھتی چلی جارہی ہے۔ پس آج اخلاقِ حسنہ سے آپ بڑے بڑے علماء اور اہل علم وفضل کے منہ بند نہیں کر سکتے مگر ان کے کردار تبدیل کر سکتے ہیں کیونکہ اخلاق حسنہ میں ایک حیرت انگیز انقلابی طاقت ہوا کرتی ہے۔

وہ لوگ جو اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو کر دنیا میں پھرتے ہیں وہ اس سے بہت زیادہ روشن ہوتے ہیں جیسے جگنو کی دم چمکتی ہے۔ اندھیری رات میں جگنو کی دم بھی تو چمکا کرتی ہے مگر چھوٹی سی روشنی ہے جو دوسرے جگنوؤں کو اس کی طرف کھینچ لاتی ہے کچھ کیڑے مکوڑے ان سے راہ پا جاتے ہیں مگر مومن کا نور تو اس کے آگے بھاگتا ہے اس کے دائیں طرف آگے بڑھتا ہے اور مومن کا نور دور دور تک لوگوں کے لئے ماحول کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ نور اخلاق فاضلہ کا نور ہے، اخلاق حسنہ کا نور ہے، حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سنت کو اپنانے کا نور ہے اس کو اپنی عادات میں داخل کر لیں اس نور سے آراستہ ہو جائیں تو آپ از خود چمکنے لگیں گے۔ آپ کی غربت، آپ کے پھٹے پرانے کپڑے، آپ کی سادگی آپ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ کے نور کو روکا نہیں کرتیں بلکہ بسا اوقات بڑھانے کا موجب بن جاتی ہیں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ایک غریب انسان جو سادہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں ہو اس کا جسم مجسم نور بن جاتا ہے اور اس کا نور خدا کے فضل اور رحمت کو اپنی طرف اس طاقت کے ساتھ کھینچتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اللہ کا فضل اور رحمت اس پر اس حیرت انگیز شفقت کے ساتھ برستے ہیں کہ وہ شخص جو پھٹے پرانے، سادہ کپڑوں میں ملبوس ہو بسا اوقات اس کی باتیں خدا کی باتیں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”رب اشعث اغبر“

خبردار ایسے بھی غریب ہیں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، پراگندہ بال ان کے سروں پر خاک پڑی ہوتی ہے۔

”لو اقسم علی اللّٰہ لا برہ“

(صحیح مسلم کتاب الجنة و الصفة نعیمها وأهلها ،باب النار یدخل الجبارون والجنة یدخلها الضعفاء)

اگر وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ایسا ضرور ہوگا تو ضرور ایسا ہو کر رہتا ہے۔ یہ وہ نورانی وجود

ہیں جن کی خاک، جن کے کپڑوں کی بدحالی، جن کے سر کے بالوں کا بکھرا ہوا ہونا اوران میں خاک پڑے ہونا ان کے نور کی طاقت کو روک نہیں سکتے کیونکہ خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسے غریب اور فقیر لوگ جب کہہ دیتے ہیں کہ خدا کی قسم یہ یونہی ہوگا تو ویسا ہی ہوتا ہے کیونکہ اللہ کی تقدیر ان کی آواز کے ساتھ چلتی ہے۔ یہ وہ تبدیلی کرنے والے لوگ ہیں جو دنیا میں انقلاب برپا کیا کرتے ہیں۔ نہ اچھے کپڑے آپ کے کام آئیں گے، نہ خوب صورت گھر، نہ اعلیٰ درجے کی موٹریں ان پہلوؤں سے تو دنیا آپ سے بہت زیادہ آگے نکل چکی ہے۔ **ایک ایک ایسا دنیا میں امیر آدمی ہے کہ جس کی دولت تمام دنیا کی جماعت کی دولت کے برابر یا اس سے بھی شاید بڑھ کر ہو تو روپے پیسے میں، ظاہری چمک دمک میں، اپنے کپڑوں کے حسن میں، اپنے مکانوں کی آرائش میں آپ اگر فخر کرتے ہیں تو ایک بے کار فخر ہے ان چیزوں میں کوئی طاقت نہیں، کوئی ان کو دیکھ کر آپ کے پیچھے نہیں چلے گا۔ مگر غربت میں خدا ترسی، غربت میں خدا کے اخلاق کو اپنانا، اس کی صفات حسنہ کو اپنے وجود میں جاری کر لینا صرف یہ ایک طاقت ہے جو جماعت احمدیہ کو نصیب ہو رہی ہے اور بڑھ رہی ہے اور اسی کی طرف میں آپ کو بلاتا ہوں۔ اس طاقت کی پرورش کریں۔ اسے اور بڑھائیں۔ جتنا یہ اخلاق حسنہ کی طاقت اونچی ہوگی اتنا ہی جماعت احمدیہ کی سربلندی ہوگی۔** اتنا ہی گردوپیش کے بڑے بڑے سرکش لوگ بھی آپ کے اخلاق حسنہ کی طاقت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے چلے جائیں گے اور اس بات کی گواہی ہر طرف سے مل رہی ہے کہ یہی ہوتا ہے اور یہی ہو رہا ہے اور یہی ہوگا۔ بسا اوقات آنے والے جو بیعت کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کس چیز نے آپ کو آمادہ کیا تو کسی احمدی کا نام لیتے ہیں یا اس کے ساتھ آئے ہوں تو اشارہ کرتے ہیں اس کے خلق حسن نے ہمیں آمادہ کیا ورنہ دلیل کی بات نہیں تھی۔ یہ ہم میں رہتے ہوئے اجنبی تھا ہمارے ماحول میں ایک مختلف قسم کی چیز تھی جس نے توجہ کو کھینچا ہے اور اس کے اخلاق نے ہمارے دلوں میں یقین پیدا کیا یعنی اپنے متعلق کہتا ہے میرے دل میں یقین پیدا کیا کہ یہ غلط انسان نہیں ہے یہ مختلف اور اجنبی اور دلکش وجود ہے اور جب اس ماحول میں اس رجحان کے ساتھ اس لٹریچر کا مطالعہ کیا جو اس احمدی نے دیا تو دل تو پہلے ہی آمادہ تھا دل کے دروازے تو پہلے ہی کھول دیئے گئے تھے اس نے ہر بات پر آمنا و صدقنا کہا کیونکہ جب اس شخص سے پیار ہو جائے جس کے اخلاص متاثر کرتے ہیں تو اس کی باتوں کے خلاف دل میں

کوئی ردّعمل نہیں ہوتا اور پھر تبلیغ کام آتی ہے، پھر منہ کے الفاظ میں بھی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

پس آج ہم نے اس دور میں جس دور میں احمدیت داخل ہوئی ہے سب سے زیادہ اخلاق حسنہ کی حفاظت کرنی ہے سب سے زیادہ اخلاق حسنہ کو اپنا کر اس طاقتور ہتھیار کے ذریعہ دنیا پر غالب آنا ہے اور آپ یقین جانیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی قومیں بھی اس ہتھیار کا دفاع نہیں جانتیں کیونکہ وہ اس ہتھیار سے خالی ہیں۔ ان کو علم ہی نہیں کہ اخلاق حسنہ ہوتے کیا ہیں۔ ظاہری خلق کے لحاظ سے آپ کو بہت اچھے اچھے لوگ ملیں گے مگر ظاہری اخلاق جو Civilization کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اس کے اندر کوئی بقا نہیں۔ جب اس کے مفادات سے دوسرے کے مفادات ٹکراتے ہیں تو وہ خلق محض ایک فلم سی دکھائی دیتا ہے، جھلی سی جو اس کے وجود پر تھی اور فوراً پھٹ جاتی ہے۔ بڑی بڑی مہذب قومیں ہیں جن کے مفادات جب کسی غریب قوم سے بھی ٹکرائیں تو ساری اخلاقیات کی جھلی پھٹ کر پارہ پارہ ہو جاتی ہے اندر سے ایک وحشی درندہ نکلتا ہے اس کے ناخن جو پہلے اندر چھپے ہوئے تھے انگلیوں کے اندر دبے ہوئے تھے وہ باہر نکل آتے ہیں، اس بھیڑیئے کی طرح جو ایک کہانی میں ایک بچے کی نانی بن کر بیٹھا ہوا تھا اور جب وہ اس کے قابو آیا تو پھر اس کے ناخن باہر نکلے پھر اس کے دانت باہر نکلے اور اس کی اصلیت تب ظاہر ہوئی۔ پس جن اخلاقِ حسنہ سے آپ متاثر ہیں جو خدا کے بغیر ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ پر ایمان کے بغیر بھی دنیا کو ہلکے پھلکے سے اخلاق میسر ضرور آتے ہیں لیکن جب بھی ان کے طبعی نفسی تقاضوں سے ان اخلاق کا ٹکراؤ ہو تو ان کے اخلاق پارہ پارہ ہو کر بکھر جاتے ہیں غریب قومیں جن کے اندر خون کا قطرہ بھی باقی نہیں ان کے خون کو بھی چوسنے کے لئے وہ اسی طرح دانت تیز کرتے ہیں جیسے امیر قوموں سے دولتیں لوٹنے کے لئے تیز کرتے ہیں۔ اب افریقہ کا کیا حال ہے کئی جگہ افریقہ کے ممالک کا یہ حال ہو چکا ہے کہ جیسے انیمیا کی آخری صورت ہو اس کے بعد ان کو خود خون کے ٹیکے دے کر ان کو زندہ کرنا پڑتا ہے تا کہ یہ زندہ ہوں تو پھر ہم دوبارہ اس کمائی سے جو یہ خود کرے اپنا خون واپس لیں اور اس سے بھی زیادہ سود در سود واپس لیں۔ یہ اخلاق حسنہ ہیں؟۔ یہ ہرگز اخلاق حسنہ نہیں۔ قرآن کریم کی تعریف کے مطابق آنحضرت ﷺ کو خدا نے جو تعلیم بخشی جس خلق کا آپ نمونہ بنے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کا تو وقت نہیں مگر یاد رکھیں اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر:7) کبھی کسی پہ احسان نہ کر اس نیت کے ساتھ کہ تو اس سے کچھ

زیادہ لے گا، اس کے بدلے تجھے فائدہ پہنچے گا۔

پس آنحضرت ﷺ کے اخلاق کا اگر کوئی خلاصہ ہوسکتا ہے تو یہ ہے کہ آپؐ کا دینے کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہا ہے۔ کبھی اس نیت سے ایک ذرّہ بھی آپؐ نے کسی پر احسان نہیں فرمایا کہ یہ بعد میں میرے کام آجائے گا، ہوسکتا ہے کسی وقت اس کی ضرورت پڑ جائے یا ہوسکتا ہے یہ امیر ہو جائے تو میں اس کی دولت سے فائدہ اٹھاؤں، یہ سب جاہلانہ باتیں ہیں۔ قرآن کریم نے جو اخلاق کی تعریف فرمائی ہے اس میں ایک یہ نکتہ، اور بھی بہت سے ہیں وہ اخلاق فاضلہ کو جو حقیقی اخلاق ہیں جو اللہ سے وابستہ ہیں جو صرف ایمان والوں کو نصیب ہوتے ہیں ان کو دنیا کے اخلاق سے اس طرح ممتاز کر دیتے ہیں کہ دونوں مختلف وجود بن جاتے ہیں ان کی نوع بدل جاتی ہے دنیا کے اخلاق ان اخلاق حسنہ کے مقابل پر جو قرآن سکھاتا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوئے، کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے گویا وہ اخلاق ہی نہیں ہیں۔ وہی مثال ان پر آتی ہے کہ:

؎ رات مجلس میں تیرے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا (خواجہ میر درد)

یہ اگر حقیقت میں شعر کسی ذات پر صادق آتا ہے تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر صادق آتا ہے۔ وہ اخلاق حسنہ جو آپؐ سے وجود میں آئے، آپؐ سے ظاہر ہوئے۔ خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ ان اخلاق کو دیکھ کر دنیا کے اخلاق کے چہرے کو دیکھیں تو کہیں نور دکھائی نہیں دے گا۔ تمام نور کا مجمع، تمام نور جس پر مرتکز ہو گیا جو منبع بھی بنا جس سے نور پھوٹا اور پھر اسی میں نور مرکوز ہو گیا وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا حسن ہے پس اس طرف توجہ کریں۔

ایک ہی وجود ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:5) اے محمد ﷺ تیرا قدم اخلاق کی چوٹی پر واقع ہے۔ تو منزل بہ منزل اخلاق میں نہیں بڑھ رہا اخلاق تیرے قدموں کے نیچے ہے۔ یہ ویسا ہی محاورہ ہے جیسے جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر تم نے اخلاق سیکھنے ہیں تو محمد رسول اللہ ﷺ کے قدم چومو! کیونکہ وہیں سے تمہیں اخلاق ملیں گے۔ اخلاق کی ہر بلند سے بلند چوٹی آپؐ نے سر کر لی ہے اور اس چوٹی پر فائز ہیں۔ پس یہ وہ اخلاق ہیں جن کی تعلیم آنحضرت ﷺ نے زبان خاموش سے بھی دی اور قرآن نے اس زبان خاموش کی

بات خوب کھول کر آپ تک پہنچائی۔ وہ باتیں جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے انکسار کی وجہ سے آپؐ کی فطرت میں مخفی حسن کے طور پر تھیں قرآن نے اسے خوب کھول دیا، تصریف آیات کی، ایک پہلو بھی ایسا نہیں رکھا جو دنیا پر روشن نہ کر دیا گیا ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''جب تک خدا کسی کے دل کے دروازے نہ کھولے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، دلوں کے دروازے کھولنا خدا تعالیٰ ہی کا کام ہے۔۔۔ جب انسان کے اچھے دن آتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو انسان کی دوستی اور بہتری منظور ہوتی ہے تو خدا انسان کے دل میں ہی ایک واعظ کھڑا کر دیتا ہے۔۔۔''

کیسی گہری عرفان کی بات ہے۔ جب تک دل میں خدا واعظ نہ کھڑا کرے اس وقت تک بیرونی بات انسان پر کچھ بھی اثر نہیں کر سکتی۔ اثر کرتی ہے تو نفس کی آواز بن کر اثر کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا فطرت کا گہرا راز ہے جسے لوگ کم سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ باہر کی بات نے ہم پر اثر کیا، باہر کی بات جب تک نفس کے اندر سے ایک ہم نوا نہ پیدا کر دے اس آواز کی تائید میں دل نہ بول اٹھے اس وقت تک بیرونی آواز کوئی بھی اثر نہیں کر سکتی جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ:

؎ دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے　　(دیوان غالب:242)

اس مقام تک پہنچانا انبیاءؑ کا کام ہے اور انبیاءؑ کے غلاموں کا کام ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیکھو کیسے راز کی بات بیان فرمائی جب تک تمہارے دل میں کوئی بات ایک واعظ نہ اٹھا دے، تمہارے دل کے اندر سے ایک نصیحت کرنے والا نہ اٹھ کھڑا ہو اس وقت تک تمہیں بیرونی بات کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور کیسے پیارے انداز میں بیان فرمایا ''جب انسان کے اچھے دن آتے ہیں'' دل عش عش کر اٹھتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے۔ کیسا پیارا فقرہ ہے ''جب انسان کے اچھے دن آتے ہیں۔'' تو کیوں نہ اپنے اچھے دنوں کے لئے دعا کرو کیوں نہ خدا سے التجا کرو کہ ہمارے دن پھیر دے اور ہمارا دل بے اختیار کہہ اٹھے کہ ہمارے اچھے دن آ گئے بہار کا سماں پیدا ہو تو پھر کونپلیں ضرور پھوٹیں گی پھر اندر کا واعظ ضرور بیدار ہوگا۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔اور جب تک خود انسان کے اندر ہی واعظ پیدا نہ ہو تب تک

بیرونی واعظوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔۔۔''

وہی بات ہے جو اللہ کا احسان ہے کہ میں آپ کے سامنے پہلے بھی پیش کرتا رہا ہوں مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ میں سن کر تو اس کا لطف ہی اور ہے کیسے دلکش، کیسے حسین، کیسے گہرے سچے انداز سے آپؑ نے بیان فرمایا تب تک بیرونی واعظوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر سے ایک واعظ نہ پیدا ہو۔

''۔۔۔مگر وہ کام خدا کا ہے ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام صرف بات کا پہنچا دینا ہے تصرف خدا کا کام ہے۔۔۔''

كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ دیکھیں اس قرآن کے گہرے فلسفے کے ساتھ کس طرح آپ کا کلام وابستہ ہے ساتھ ساتھ چل رہا ہے کوئی ایک بات بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایسی نہیں فرماتے جس کی بنیاد حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کی نصائح اور نیک عمل میں نہ ہو اور قرآن کی آیات کے تابع اس کے سائے میں وہ بات نہ آگے بڑھتی ہو ہر بات کی کوئی نہ کوئی بنیاد آپ کو لازماً قرآن میں ملے گی۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔تصرف خدا کا کام ہے ہم اپنی طرف سے بات کو پہنچا دینا چاہتے ہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پوچھے جاویں (اور بات پہنچانے میں کتنی ذمہ داری ہے اور کتنا خدا کا خوف ہے) کہ کیوں اچھی طرح سے نہیں بتایا اسی واسطے ہم نے زبانی بھی لوگوں کو سنایا ہے تحریری بھی اس کام کو پورا کر دیا ہے۔''

(ملفوظات جلد 5 صفحہ:590)

سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم واقعی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے سیکھنے اور سکھانے کے خوب رنگ سیکھے اور جو حق تھا وہ خوب پورا کر دیا۔

پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ہماری جماعت میں شہ زور اور پہلوانوں کی طاقت رکھنے والے مطلوب نہیں۔۔۔''

اگر یہ وہم ہو کہ بڑے بڑے کھلاڑی، بڑے بڑے باکسنگ کرنے والے، بڑے بڑے

کشتیاں لڑنے والے جماعت میں آئیں گے تو جماعت کی عزت افزائی کا موجب بنیں گے تو فرماتے ہیں اس وہم کو دل سے نکال دو ہمیں ان پہلوانوں کی ضرورت نہیں ہے۔

''۔۔۔بلکہ ایسی قوت رکھنے والے مطلوب ہیں جو تبدیل اخلاق کے لئے کوشش کرنے والے ہوں۔۔۔''

اب دیکھیں فقرے کتنے سچے، کتنے محتاط ہیں یہ نہیں فرمایا جو عظیم اخلاق والے آجائیں، عظیم اخلاق والے بنیں گے کیسے، فرمایا جو تبدیل اخلاق کے لئے کوشش کرنے والے ہوں، آپ سارے، میں، آپ، ہم سب اس میں داخل ہو گئے ہیں۔ ساری جماعت جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اپنا امام مان بیٹھی ہے کہ خدا کا مقرر کردہ امام ہے ایک بھی نہیں جو اس کلام سے باہر رہ جائے ورنہ اگر یہ فرماتے کہ عظیم اخلاق حسنہ والے آنحضرت ﷺ کی متابعت میں کامل اخلاق کے رنگ اختیار کرنے والے چاہئیں تو ہم سے بھاری اکثریت ایسی ہوتی جو سمجھتی کہ ہم مخاطب ہی نہیں ہم کہاں اور یہ ایسے اخلاق والے کہاں اور بہت سے جو اپنے آپ کو سمجھتے وہ بے وقوف ہوتے۔ ان کو محض وہم ہوتا کہ وہ صاحب اخلاق ہیں اور ان کا تکبر ان کو اس جماعت میں داخل ہوتا ہوا دکھاتا مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کلام دیکھو کس طرح ایک فیض عام بن گیا ہے۔ ہر احمدی چھوٹا بڑا، مرد عورت، بچہ سب اس میں داخل ہو گئے۔ فرمایا ہمیں کوشش کرنے والے چاہئیں تو کوشش تو شروع کریں اور وہ کوشش کیسے شروع کی جائے اس کے گُر بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیں خوب کھول کھول کر سمجھاتے ہیں۔

''۔۔۔یہ ایک امر واقعی ہے کہ وہ شہ زور اور طاقت والا نہیں جو پہاڑ کو جگہ سے ہٹا سکے۔ نہیں، نہیں۔ اصلی بہادر وہی ہے جو تبدیلِ اخلاق پر مقدرت پاوے۔۔۔''

کوشش کرے اور پھر چھوڑے نہیں یہاں تک کہ اس کی طاقت بڑھ جائے یہاں تک کہ وہ اس بات کا اختیار حاصل کرلے خدا تعالیٰ سے کہ اپنے اخلاق کو تبدیل کر دکھاوے۔

''۔۔۔پس یاد رکھو کہ ساری ہمت اور قوت تبدیل اخلاق میں صرف کرو کیونکہ یہی حقیقی قوت اور دلیری ہے۔'' (ملفوظات جلد اول صفحہ: 88 تا 89)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ’’خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہیں ایک ایسی جماعت بنادے کہ تم دنیا کے لئے نیکی اور راستبازی کا نمونہ ٹھہرو۔‘‘ پہلے حوالے کے بعد اب جو یہ حوالہ پڑھ رہا ہوں اس مقصد کی خاطر، آپ کو سمجھانے کے لئے کہ آپ اگر کوشش کریں گے تو ضرور کامیاب ہوگی کیونکہ یہ کوشش ہواؤں کے رخ کی کوشش ہوگی اگر ہوا کے رخ کے مقابل پر آپ دوڑ لگانے کی کوشش کریں تو بسا اوقات آپ کی کوشش ناکام ہو جائے گی۔ بعض دفعہ مخالف ہوا کے جھونکے تو انسان کو اٹھا کر پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں ایسے سائیکل چلانے والے آندھیوں میں جو سائیکل چلاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پورے زور سے آگے بڑھ رہے ہیں سائیکل دھکیل کے پیچھے جا پڑتا ہے مجھے بھی خود اس کا تجربہ ہو چکا ہے بعض دفعہ بسوں کو آندھیوں کی تیزی روک کر پیچھے کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے۔ آسمان سے ہوائیں چل پڑی ہیں کہ تمہیں اخلاق حسنہ عطا کریں۔ اب تم کس تردّد میں مبتلا ہو اب کیوں رکتے ہو۔ کوشش کرو اور یقین رکھو کہ تمہاری کوششیں ان آسمانی ہواؤں کے رخ پر چلنے کے نتیجہ میں کامیاب ہوں گی جن کو چلانے کا خدا نے فیصلہ فرمالیا ہے۔

> ’’خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہیں ایک ایسی جماعت بنادے کہ تم دنیا کے لئے نیکی اور راستبازی کا نمونہ ٹھہرو۔ سو اپنے درمیان سے ایسے شخص کو جلد نکالو جو بدی اور شرارت اور فتنہ انگیزی اور بدنفسی کا نمونہ ہے۔ جو شخص ہماری جماعت میں غربت اور نیکی اور پرہیز گاری اور حلم اور نرم زبانی اور نیک مزاجی اور نیک چلنی کے ساتھ نہیں رہ سکتا وہ جلد ہم سے جدا ہو جاوے۔‘‘ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ:221)

پس ایسے لوگ لازماً جدا ہو جاتے ہیں اگر غالب ماحول ان کے مزاج کے مخالف ہو وہ زیادہ دیر ساتھ چل نہیں سکتے۔ اکثر اس فتنوں کے دور میں جو مرتد ہوئے ہیں وہ تمام تر وہی لوگ تھے جو جماعت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی خاطر قربانیوں کی راہوں میں چل سکتے ہی نہیں تھے، پہلے ان کے پردے ڈھکے ہوئے تھے کیونکہ کوئی ابتلا نہیں تھا، کوئی آزمائش نہیں تھی۔ وہ سمجھتے تھے جماعت کا ممبر بننے سے ہمیں فائدے ہی ہیں لیکن جہاں مخالفت کی آندھیاں چلی ہیں ان کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہیں

رہا، جڑوں سے اکھیڑے گئے۔ وہی ثابت قدم رہے جن کے اندر ایمان کی جڑیں مضبوط تھیں اور گہری تھیں جو کلمہ طیبہ کی طرح ایک شجر کی صورت تھے کہ جڑیں زمین میں پیوستہ اور شاخیں آسمان میں خدا سے باتیں کرتی تھیں۔

پس آج کے دور میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت سے ان لوگوں کا نکلنا جن کے نکلنے کی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمنا فرمائی ہے آپ کے اخلاق حسنہ کے نتیجہ میں ہوگا۔ اگر جماعت کے رنگ بدل جائیں ساری جماعت اعلیٰ اخلاق پر قائم ہو جائے تو یہ چند بدکردار اور بدخلق لوگ ایسی جماعت میں رہ ہی نہیں سکتے۔ ان کے مزاج اور ہوں گے، ان کا ماحول بدل چکا ہوگا لیکن اگر آپ ان کو اپنے اندر پناہ دیں اگر بدتمیز اور بدخلق انسان کو جو اپنی بیوی سے جھگڑتا ہے جو اپنے بچوں پر ظلم کرتا ہے آپ اگر پیار کی نظر نہیں ڈالتے تو اس کو قبول کی نظر سے دیکھیں باہر آئے تو آپ کی سوسائٹی میں اس طرح کھلی بانہوں سے اس کا استقبال ہو جیسے ایک صاحب خلق کا ہوتا ہے تو یاد رکھیں آپ نے اس کو پناہ دے رکھی ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرما رہے ہیں اپنی پناہیں ایسے لوگوں سے اٹھا لو، ان کو نکلنے دو، ان کے لئے اپنے اندر رہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑو۔

پس اپنے اعلیٰ اخلاق کو اتنا ترقی دو کہ بدخلق اجنبی دکھائی دینے لگیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ جب آپ اجنبی تھے یعنی اس سوسائٹی میں جو بدکردار ہو چکی ہے۔ اب ایسے غالب آ جاؤ اپنے خلق حسنہ میں کہ بدکردار لوگ اجنبی دکھائی دینے لگیں اور وہ تمہارے وطن کو چھوڑ کر اپنے نئے وطنوں کی طرف روانہ ہوں۔ ہجرت بعض دفعہ دوطرفہ رخ رکھتی ہے پہلے انسان خدا کی خاطر گندے لوگوں سے ہجرت کر کے خدا کی جانب بڑھتا ہے پھر اس کے گرد ایک شہر آباد ہونے لگتا ہے جس کی طرف سب اچھے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔

دیکھو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہجرت نے کیا ثابت کیا بعینہٖ یہی تو بات تھی۔ اپنے وطن، اپنی قوم، اپنی دنیاوی عظمتوں اور جائیداد اور مال ومنال کو سب کچھ ترک کر کے آپؑ ہجرت کرتے ہوئے ایک لق ودق صحرا میں آ پہنچے اور اپنے موعود بیٹے کو اور اس کی ماں کو وہاں آباد کر دیا۔ اب دیکھو تمام دنیا سے دور دور سے کس طرح لوگ اس شہر کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ وہ آماجگاہ ہو گیا ہے نیکیوں کی، کیونکہ حج میں یہ لازم ہے کہ اپنے بدی کے کپڑے اتار پھینکو اور ایک سادہ غریبانہ چادر میں

ملبوس ہو جاؤ جو بے داغ چادر ہو یہ تمہیں سمجھانے کی خاطر کہ اللہ کو ایسی ہجرتیں قبول ہیں۔ تو ایک مہاجر نے دیکھو کیسی ہجرتیں پیدا کر دیں۔ کتنے ہزار سال پہلے کی بات ہے اور آج تک خانہ کعبہ کی طرف ساری دنیا سے لوگ کشاں کشاں کھچے چلے آتے ہیں، وہی رنگ لیتے ہوئے وہی رنگ اپناتے ہوئے۔

اب یہ اللہ کی طرف سے نصیب کی بات ہے۔ انہیں مقام ابراہیم نصیب ہوتا ہے یا نہیں یہ ان کی نیتوں کا حال جانے مگر خدا کے حضور اس طرح حاضر ہونے والے کا کوئی نمونہ دنیا میں آپ کو کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ ظاہری طور پر اپنی بدیوں کو چھوڑتے ہوئے آتے ہیں اگر واپس بدیوں کی طرف لوٹ جائیں تو ان کا نصیبہ۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس شہر کو از سرِ نو آباد کیا ہے اور وہ رونقیں بخشی ہیں جو رونقیں اس شہر کو چھوڑ چکی تھیں۔ پس یہ ہجرتیں ہیں۔ ایک نیکیوں کی ہجرت ہے اور ایک بدیوں کی ہجرت ہے، ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے وہ ساری نیکیاں جو ابراہیمؑ کی وجہ سے اس شہر میں مجتمع ہو گئی تھیں ایک ایک کر کے روانہ ہوئیں نہ توحید رہی، نہ اخلاق حسنہ، نہ صفات باری تعالیٰ کا کوئی مظہر، سارا مکّہ ویران ہو گیا۔

تب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلی ہجرت کی ہے پھر اور یہ ہجرت ابراہیمؑ کی ہجرت سے بہت زیادہ شاندار اور بہت زیادہ بقاء رکھنے والی ہجرت تھی۔ وہ ساری خوبیاں مکّہ میں لوٹ آئیں، وہ توحید کی آماجگاہ بن گیا۔ ہر حسن وہاں سے پہاڑی چشموں کی طرح پھوٹنے لگا، آبِ زم زم میں پاکیزگی پیدا ہو گئی اور سچائی کا پانی بن گیا۔ یہ وہ ہجرت ہے جو پھر اپنے عقب میں اور ہجرتیں لے کر آیا کرتی ہے۔ پس آپ کا فرض ہے بداخلاق کے شہر سے ہجرت کر جائیں اور اخلاق حسنہ، اخلاق مصطفوی کی طرف روانہ ہوں اور یقین رکھیں کہ آپ میں سے ہر ایک کی ہجرت اپنے پیچھے فوج در فوج بنی نوع انسان کو کھینچے لئے چلی آئے گی۔ تب یہ نیکیوں کا شہر جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دوبارہ قائم کیا ہے تب یہ سچا ہمیشگی کا شہر بن جائے گا۔ پھر یہ شہر ایک شہر نہیں رہتا یہ ساری دنیا میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے زمین کے کناروں تک شہرت پاتا ہے۔

پس خدا کرے کہ ہمیں یہ توفیق نصیب ہو کہ ہم ان کھوئے ہوئے اخلاق حسنہ کو جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے دنیا میں زندہ کئے گئے تھے ان کو پھر حاصل کر سکیں اپنے وجود کا حصہ بنا لیں اپنے گھر کو چمکائیں۔ جگنو کی طرح اگر تھوڑے سے ماحول کو نہیں تو اپنے قریب رہنے والی بیوی کو تو پتا

چلے کہ آپ کے اندر کوئی نور ہے۔ اپنے گھر میں بسنے والے بچوں اور بچیوں کو تو یہ محسوس ہو کہ ہاں نور کا ایک آسمان سے شعلہ اترا ہے، نور کا ایک کرشمہ ہے جو ہمارے گھر میں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ نور اگر گھروں میں نہیں دیکھیں گے اگر گھر اندھیرے اور ویران رہیں گے اگر اپنے ماحول میں آپ بدخلق رہیں گے بدتمیز رہیں گے، گالیاں دینے میں جلدی کرنے والے ہوں گے اگر زبان پاک اور صاف نہیں ہو گی اگر بخشش سے ناواقف ہوں گے اگر حوصلہ آپ کے قریب تک نہ پھٹکے تو پھر دنیا کو آپ کیسے تبدیل کریں گے۔

خدا کرے کہ ان حقائق کو ہم دیکھیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، سمجھیں، سوچیں اور کامل یقین کے ساتھ کہ اگر ہم کوشش کریں گے تو آج خدا کی مرضی ہے کہ ہم ایسے ہی بن جائیں ہماری کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عفو کا مضمون ہے جس کو گھروں میں جاری کرنا لازم ہے۔
اس کے بغیر گھروں میں پاکیزہ فضا پیدا نہیں ہوسکتی۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 6؍دسمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۳﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵﴾ (التغابن: 13 تا 15)

پھر فرمایا:

جب میں سویڈن میں تھا تو وہاں مجھے ایک خاتون کا خط آیا جس کا مفہوم یہ تھا تفصیل نہیں لکھی کہ آپ عفو اور مغفرت پر بھی کبھی خطبہ دیں کیونکہ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو تأثر میں نے قائم کیا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے خاوند اپنے بچوں کے ساتھ معمولی باتوں پر بھی سختی کرتے ہیں تو اپنی شکایت سے زیادہ ان کو بچوں کا خیال معلوم ہوتا تھا مجھے خیال آیا کہ اس سے پہلے میں بارہا اس مضمون پر خطبات دے چکا ہوں اس لئے ابھی اتنی جلدی ضرورت نہیں ہے اور چلنے سے ایک رات پہلے، واپس آنے سے ایک رات پہلے میں نے ایک رؤیا دیکھی جو مجھے اس طرف متوجہ کر گئی کہ

ضرورت ہے اور وہ رؤیا یہ تھی کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک کتاب کا درس دے رہا ہوں اور آخری حصے پہ پہنچا ہوں اور وہاں پہنچ کر جو بات میں بیان کرتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بار بار بیان کر چکے ہیں۔ میں جماعت کو اس درس میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ جب تک تم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مزاج نہیں سمجھو گے آپؑ کی تحریرات کا حقیقی مفہوم نہیں پا سکتے اور یہ تکرار نہیں بلکہ اصرار ہے اور اس پر رؤیا ختم ہوگئی۔ باقی باتیں میں نے آنکھ کھلنے کے بعد سوچیں تو میں حیران رہ گیا کہ جو بات میں سوچ رہا تھا کہ تکرار ہوگی اگر دوبارہ باتیں کروں گا، اسی وہم کا جواب مجھے رؤیا میں بتایا گیا کہ بعض باتیں بار بار اس لئے ضروری ہیں کہ ان پر اصرار کئے بغیر لوگ سمجھتے نہیں۔ پس تکرار وہ چیز ہے جو سمجھ میں آ چکی ہو اور پھر بے وجہ انسان اسے دہرائے اور اصرار وہ ہے کہ ایک بات بار بار کہی جائے اور کوئی نہ سمجھے اور پھر سمجھایا جائے اور پھر نہ سمجھے اور پھر سمجھایا جائے یہاں تک کہ انسان بلاغ کا حق ادا کر دے۔ اس رؤیا کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ لازماً میں اس کی طرف توجہ دوں گا۔

اور یہ آیت کریمہ جو آج کے لئے منتخب ہوئی ہے یہ معین طور پر تو میں نے نہیں کی تھی مگر پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کو جب میں نے بتایا کہ اس مضمون پر آیت چاہیے اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے کہ انہوں نے وہ آیت چنی جو بعینہٖ اس مضمون پر صادق آ رہی ہے اور سب سے پہلی آیت بلاغ کے مضمون کو کھول رہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ پس اگر تم پھر جاؤ گے۔ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ تو یاد رکھو ہمارے رسولؐ پر تو اس کے سوا کچھ فرض نہیں ہے کہ خوب کھول کھول کر بات کو بیان کر دے تو الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ کا وہی مفہوم ہے جو رؤیا میں اصرار کا مفہوم مجھے سمجھ آیا تھا کہ جب تک بات کھل نہ جائے انسان وہ بات کہتا چلا جائے اور حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کا بعینہٖ یہ طریق تھا جب تک ایک مضمون کو خوب اچھی طرح سمجھا نہ لیتے یہاں تک کہ بسا اوقات دوبارہ پوچھتے بھی تھے کہ بتاؤ تمہیں کیا سمجھ آئی ہے اس وقت تک اس بات کو دہراتے تھے اور بہت سی

ایسی نصائح ہیں جو کثرت سے دہرائی گئی ہیں۔

اور اس پہلو سے ’’ذکر‘‘ میں جو زور ہے نصیحت کر اور کرتا چلا جا وہ اَلْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ کا ہی ایک پہلو ہے۔ پس حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جہاں جہاں بھی بظاہر تکرار فرمائی ہے وہ تکرار نہیں ہے بلکہ اصرار ان معنوں میں کہ جب تک وہ بات سمجھ نہ آئے میں نہیں چھوڑوں گا۔ پس اس آیت کے حوالے سے مضمون اور بھی زیادہ کھل گیا اور روشن ہو گیا جو رؤیا میں مجھے دکھایا گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہ وہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اور اللہ ہی پر مومن توکل کرتے ہیں۔ پہلی بات تو ضمناً یہ بتانی ضروری ہے کہ اس آیت کا پہلی آیت سے کیا تعلق ہے۔ اس کا پہلی آیت کے آخری حصے سے تعلق ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسولؐ پر تو صرف کھول کھول کر بات کو پہنچا دینا تھا جو اس نے پہنچا دی لیکن تمہارے پھر جانے سے اسے نقصان کوئی نہیں پہنچے گا یہ وہ مضمون ہے جس کو اگلی آیت نے اُٹھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایک ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی نہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا وہی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے اور خالق ہے پس تمہارے چھوڑنے سے محمد رسول اللہ ﷺ کو کیا فرق پڑے گا انہوں نے بات کھول دی اپنا فرض ادا کر دیا۔ اگر تم پھرتے ہو تو ایک کوڑی کا بھی فرق، ایک ذرّہ بھی فرق محمد رسول اللہ ﷺ پر نہیں پڑے گا کیونکہ اللہ آپ کو نہیں چھوڑے گا اور تم بھی یہ رنگ اختیار کرو۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ پس چاہئے کہ مومن خدا ہی پر توکل کیا کریں جیسا کہ حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کا تمام تر توکل اپنی نصیحت پر نہیں بلکہ اللہ پر تھا اور یہ توکل علی اللّٰہ کا مضمون دعاؤں کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے اور اس تعلق میں بھی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک نصیحت موجود ہے۔

ایک باپ کے متعلق جب سختی کی اطلاع ملی کہ بہت سختی کرتا ہے تو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے شرک قرار دیا، سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کا مضمون جو ہے یہ توحید کی طرف جو غیر معمولی توجہ دلائی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بلاغ تمہارا کام ہے اور زبردستی تمہارا کام نہیں ہے اور اگر تم یہ سمجھو گے کہ تم زبردستی کسی کو ٹھیک کر لو گے تو یہ شرک ہے اور یاد رکھو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تمہیں کبھی بھی خدائی طاقتیں نصیب نہیں ہو سکتیں تم اپنی مرضی سے کسی کو بدل نہیں سکتے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی یہی مضمون اس موقع پر جو ایک شکایت سے تعلق رکھتا ہے جو ایک شخص جو ویسے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے والے بظاہر ایک بزرگ صحابی تھے مگر ان کے دل میں کوئی ایسا رخنہ تھا جس کی اصلاح ضروری تھی وہ اپنی اولاد پر بہت زیادہ سختی کرتے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ تم مشرک ہوا گر یہ کام کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو تم خود ٹھیک کر لو گے یہ ہو نہیں سکتا اس لئے دعا پہ زور دو۔

یہ جو اگلا آیت کا حصہ ہے وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ جب جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی نصیحت سے اثر لینے کی بجائے پیٹھ پھیر کر چلے جاتے تھے تو ان کو پھر بھی اس حال میں چھوڑا نہیں کرتے تھے۔ اپنی نصیحت کے اثر انداز ہونے کے متعلق اللہ پر توکل فرمایا کرتے تھے اور اللہ آپ کی دعاؤں کو سنتا تھا اور جہاں بلاغ بظاہر ناکام رہا وہاں توکل علی اللہ کامیاب ہو جاتا تھا کیونکہ اصل تو وہی معبود ہے اس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز ہے تو کتنا عظیم الشان مضمون ہے جو ان آیات میں ایک ترتیب کے ساتھ، ایک تدریج کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ فرمایا اللہ پر توکل کرو۔ رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی طریق تھا کہ اپنے آپ کو پیچھے چھوڑ کر جانے والوں کو اس طرح ترک نہیں فرما دیتے تھے کہ اب ان کا معاملہ خدا پر میں چھوڑتا ہوں بلکہ ان کے لئے دعائیں کرتے تھے اور اپنے بلاغ کے کامیاب ہونے سے متعلق خدا کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

اب یہ بھی وہی مضمون ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آنحضور ﷺ کی عظیم کامیابی کے راز کے طور پر بیان فرمایا۔ وہاں بلاغ کو نہیں پیش کیا وہاں دعا اور توکل علی اللہ کو پیش کیا۔ آپؐ کو جو آخری عظیم کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ دعاؤں کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر جو توکل تھا اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو آپؐ نے دعائیں کی ہیں تو ایسی

دعائیں کی ہیں کہ اے خدا تیرے سوا اب کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا اس دنیا میں وہ تو ہی ہے جو انقلاب برپا کرے گا اور جب ایسی دعائیں کیں تو اللہ نے انقلاب برپا کردیا اور وہ انقلاب ایک عظیم معجزہ ہے جس کی کوئی مثال نبوت کی تاریخ میں آپ کو کہیں دکھائی نہیں دے گی کہ کوئی نبی وفات نہ پائے جب تک کہ اپنی ساری قوم کی کایا نہ پلٹ دے۔ وہ قوم جو اس کے خون کی پیاسی ہو جو شرک میں انتہا درجے تک ڈوب چکی ہو کسی کے علم میں کوئی مثال ہے تو لا کے تو دکھائے۔ اس کے پاسنگ کی مثال بھی ساری دنیا میں مذہبی تاریخ میں آپ کو دکھائی نہیں دے گی ایک محمد رسول اللہ ﷺ اور جس طرح اللہ ایک ہے اللہ پر توکل کرنے والا بھی دراصل ایک ہی تھا یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جن کی کوئی مثال تاریخ انبیاءؑ میں ایسی دکھائی نہیں دیتی۔ درجہ بدرجہ سب ہی توکل کرنے والے تھے درجہ بدرجہ سب نے ہی دعاؤں کا فیض پایا مگر کسی کی دعائیں ایسی ثابت نہیں جس نے ساری قوم کی کایا پلٹ دی ہو سوائے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے۔

پھر خدا تعالیٰ اس کے بعد فرماتا ہے، اس نصیحت کے مضمون کو اپنے گھر اور ماحول پر اطلاق کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے یہ ازلی ابدی راز ہیں نصیحت میں کامیابی کے۔ تم بھی ان کی طرف توجہ کرو اور گھر سے بات شروع کرو اور یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے خونی اقرباء تمہارے ہیں جس طرح چاہو ان سے سلوک کرلو جو اصول خدا تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں اگر تم نے ان کو نظر انداز کیا تو تمہاری اپنی صلب سے تمہارے دشمن پیدا ہو سکتے ہیں۔ پس یہی وہ مضمون ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو بتایا کہ تم اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ضائع نہ کرو اپنا دشمن نہ بناؤ کیوں کہ تم آنحضور ﷺ کی سنت کے مطابق عمل نہیں کر رہے ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ کیوں غور نہیں کرتے، کیوں فکر نہیں کرتے، تمہاری اپنی بیویاں، تمہاری اپنی اولاد تمہاری دشمن ہے یعنی ان میں سے تمہارے دشمن ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو ایسے بد نصیب ہیں کہ گویا ان کی بیویاں بھی ان کی دشمن ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں اور ان کی اولاد بھی ان کی دشمن ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے کیوں ہوتی ہے؟ ان کی غلط نصیحت اور غلط تربیت کے رنگ کی وجہ سے۔ چنانچہ یہ کہنے کے بعد، یہ تنبیہہ کرنے کے بعد فَاحْذَرُوْهُمْ ان کے معاملے میں احتیاط سے کام

لو۔ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۔(التغابن :15)اب تین طریق ہیں نصیحت کے اپنے گھر میں بھی وہی استعمال کرو اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تمہاری غلطیوں سے بھی مغفرت کا سلوک فرمائے گا اور کوئی بداثر ان کا تمہاری اولاد پر نہیں پڑے دے گا لیکن لازم ہے تم پر کہ اس طریق کو اختیار کرو جو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ کا طریق تھا بعینہٖ یہی طریق تھا۔

وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا اگر تم عفو سے کام لو اور صفح سے کام لو اور مغفرت سے کام لو۔ یہ تین کیا چیزیں ہیں۔ بظاہر تو عفو اور صفح کو ایک ہی معنوں میں سمجھا جاتا ہے یعنی درگزر اور ایک ہی اس کا ترجمہ بھی ملتا ہے مگر ان میں فرق ہے اور اصل معنی عفو کا ہے کہ اس طرح نظر انداز کر دینا ایک چیز کو گویا ہے ہی نہیں، گویا موجود ہی نہیں تھی۔ یعنی ابتداء میں بچوں کی غلطیاں، بیوی کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن تم یوں سلوک کرو گویا تم نے دیکھی ہی نہیں تمہیں پتا ہی نہیں لگا اور ان کو کچھ سہولت اور آسانی دو ورنہ ہر وقت جو مرد گھر پر سوار رہے گا اس سے تو زندگیاں برباد ہو جائیں گی، عذاب بن جائیں گی۔ ہر وقت دیکھنا، ہر وقت میں میخ نکالنا، ہر وقت نقائص ڈھونڈنا یا نہ بھی ڈھونڈے تو نظر آ ہی جاتے ہیں۔ تو فرمایا جو لوگ اکٹھے رہتے ہیں ان پر لازم ہے کہ عفو سے کام لیں اکثر ایسا وقت گزاریں کہ گویا ان کو پتا ہی نہیں کیا ہو رہا ہے لیکن ہر چیز میں نہیں۔ وہ بدخلقیاں، وہ معمولی معمولی باتیں جو آغاز میں ہلکے طور پر ظاہر ہوا کرتی ہیں یعنی ابھی جرم نہیں بنتیں اور بعض خطائیں ہیں برتن گر کے ٹوٹا ہے ٹھوکر لگ جاتی ہے کسی چیز پہ کسی چیز کو نقصان پہنچ جاتا ہے کھانا دیر میں پکا، روٹی جل گئی، یہ وہ ساری چیزیں ہیں جو گھر کے روزمرہ کے معاملات ہیں جن میں عفو لازم ہے انسان اس طرح دیکھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس طرح سنے جیسے کچھ سنا ہی نہیں یہ عفو کا معنی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے نگاہوں سے متعلق کہ ''**وہ دیکھتے مجھے یوں ہیں کہ دیکھتے ہی نہیں**'' اس طرح عفو کی نظر ڈالتے ہیں گویا نہیں دیکھ رہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیکھنے کا یہی انداز تھا اور حضرت مصلح موعودؓ کا ہمیں پتا ہے بچپن سے یہی دیکھا کہ لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہے اور دیکھ سب کچھ لیتے تھے تو

قرآن کریم نے جو عفو کا مضمون بیان فرمایا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ بے وقوف ہو، غافل ہو۔ غفلت کا مضمون ایک بالکل الگ مضمون ہے جس کو قرآن کریم ایک الگ موقع پر اٹھاتا ہے۔ یہاں علم کے باوجود اپنے دل کی کشادگی کی وجہ سے، وسیع حوصلے کی وجہ سے، اس طرح رہو جیسے تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ برتن ٹوٹا ہے گویا تمہیں آواز ہی نہیں آئی کسی جگہ کوئی داغ دھبہ لگ گیا ہے کوئی کھانا جل گیا ہے تو جیسے تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔ تو یہ وہ روزمرّہ کا گھر کے معاملات میں بیوی اور بچوں سے سلوک ہے جو عفو کہلاتا ہے۔

یاد رکھو عفو کے نتیجہ میں گناہوں اور جرائم کی حوصلہ افزائی نہیں ہوا کرتی۔ عفو کے نتیجہ میں ایک شرم اور حیا پیدا ہو جاتی ہے اور جو بچے ہیں یا بیوی ہے وہ آخر سمجھ ہی جاتے ہیں ان کو پتا چل جاتا ہے کہ عفو ہو رہا ہے اور عفو کے نتیجہ میں کبھی بھی گناہ بے دھڑک اور بے حیا نہیں ہوا کرتے۔ آنکھوں میں ایک شرم پیدا ہو جاتی ہے اور یہ شرم دونوں طرف ہوتی ہے۔ پس یہ عفو کا مضمون ہے جس کو گھروں میں جاری کرنا لازم ہے اس کے بغیر گھروں میں پاکیزہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ بعض عورتوں کو میں نے دیکھا ہے ایک دفعہ میری موجودگی میں ایک عورت نے اپنے بچے کو کہا ایسا دو ہتھڑ ماروں گی کہ منہ تیرا ادھر پھر جائے گا۔ اب وہ اور بھی تھے اس لئے اس کو نہیں پتا چلا کہ وہ کیا بات کہہ گئی ہے بڑی بدتمیزی ہے، بڑی بدخلقی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عورت کی ماں ایسی تھی۔

اب یہ بھی یاد رکھو کہ اگر اپنے گھروں میں تم بدرسمیں ڈال دو گے تو بدرسمیں آگے تمہاری نسلوں تک پہنچیں گی اور آئندہ نسلوں کو بھی خراب کریں گی اور بدخلقی ایک ایسی چیز ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑا کرتی۔ جن خاندانوں میں ماں باپ کی بدخلقی اثر انداز ہو جائے نسلاً بعد نسلٍ وہ بدخلقی چلتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ بہت سے بدتمیز مرد جو عورتوں سے بدتمیزی کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہماری شان ہے باپ بھی اسی طرح ہمارا کیا کرتا تھا اور بعض عورتیں جب بدتمیزیاں کرتی ہیں تو کہتی ہیں ہماری ماں بھی اسی طرح کیا کرتی تھی جن کی مائیں بدتمیز ہوں اور خاوند کے سامنے زبان کھولنے والی ہوں ان کی لڑکیاں اس پہ فخر کر کے اس طریق کو آگے بڑھاتی ہیں کہ خبردار! جو ہم سے ایسی بات کی ہم ایسی کپتیاں ہیں یہ کریں گی، وہ کریں گی اور ایک

ایسا جھوٹا اور بے معنی فخر ہے جس سے ساری زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ آپس کے تعلقات میں ایسا زہر گھل جاتا ہے کہ ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنا ایک جہنم کے ماحول میں زندگی بسر کرنا ہے۔

پس مرد ہو یا عورت ہو اس کو اپنی نگرانی کرنی چاہئے اور عفو میں پناہ لینی چاہئے اور جو عفو میں پناہ لے وہ بداخلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ عفو آغاز ہے حسن خلق کا۔ دیکھی ہیں، نظر پھیر لی، خیال کیا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا مگر اس کے بعد پھر فرمایا۔ وَتَصْفَحُوْا اب تَصْفَحُوْا کا مطلب ہے صاف کر کے گویا ہے ہی نہیں ایسا مٹا ڈالو گویا نہیں ہے۔

عفت الدیار محلها و مقامها (لبید بن ربیعة العامری)

شہر اس طرح مٹ گئے کہ نہ ان کا عارضی ٹھکانے کا نشان رہا نہ ان کے مستقل ٹھکانے کا نشان رہا اور عرب شعراء نے عفو لفظ کو انہی معنوں میں بڑے اچھے اچھے شعروں میں استعمال کیا ہے یعنی کلیۃً مٹ جانا لیکن عفو کا وہ مضمون جو یہاں اطلاق پاتا ہے وہ اور ہے اور وہ عرب لغت کھول کر بیان کرتی ہے۔

صفح سے جو مراد یہاں اطلاق پا رہی ہے وہ یہ ہے کہ تم ان کو تھوڑا سا ڈانٹو اور کچھ خفگی کا اظہار کرو تو کبھی کبھی جب یہ دیکھو کہ تمہارے عفو نے کام نہیں کیا تو صَفْحًا جَمِيْلًا صفح سے کام لو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کچھ ناراضگی کا اظہار کرو اور صفح کا لفظ جو ہے وہ بہت ہی ایک اعلیٰ درجہ کا انتخاب ہے اس موقع کے لئے کیونکہ صفح اس بات کو بھی کہتے ہیں کہ ایک انسان کسی سے کچھ دیر کے لئے ناراضگی کی وجہ سے منہ پھیر لے یعنی چھپانے کے لئے نہیں بلکہ اس اظہار کے لئے کہ تم نے ایسی حرکت کی ہے کہ اب میں ویسا پیار کا تعلق تم سے نہیں رکھ سکتا۔ یہ نظریں جو ہیں یہ نظر پھیرنا اور ہے اور عفو کی نظریں پھیرنا بالکل اور ہے۔ پس چونکہ معانی ملتے ہیں اس لئے ترجمہ کرنے والے زیادہ باریکی میں اگر نہ جائیں تو ایک ہی جیسا ترجمہ کر دیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔

عفو میں نظر انداز کرنا، درگزر کے ان معنوں میں کہ گویا کوئی واقعہ نہیں ہوا، آپ دیکھ رہے ہیں اپنے حوصلے کی وجہ سے اسے برداشت کر رہے ہیں۔ صَفْحًا کا مطلب ہے بعض دفعہ

بچے جب ایسی حرکت کریں جو ناپسندیدہ ہے اور کرتے رہیں، آپ ان سے منہ پھیر لیتے ہیں ان معنوں میں کہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ہماری طرف وہ پیار اور شفقت کی توجہ نہیں رہی اور یہ چیز اصلاح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اسے انگریزی میں Reprove کہتے ہیں یعنی ایسے رنگ میں سرزنش کرنا کہ جو سزا کے معنی تو نہیں رکھتی لیکن لفظوں میں یا طرز سے وہ غلطی کرنے والے کو احساس دلا دیتی ہے کہ ہم سے کچھ ایسی بات ہوئی ہے کہ اب ہم ویسے پیار کے مستحق نہیں رہے توجہ پھر گئی ہے۔تو یہ بھی ایک بہت ہی اہم اصلاح کا طریق ہے جس کو قرآن کریم نے میاں بیوی کے تعلق ہی میں بیان فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر کوئی عورت کپت کرنے والی ہو،لفظ پنجابی ہے لیکن ہے بڑا زبردست اس لئے میں استعمال کرتا ہوں اس کو بے دھڑک، فرمایا کہ فساد برپا کردے بات بات پر بدتمیزی کرنے والی آگے سے اٹھ کھڑی ہونے والی تو فرمایا اس کو نصیحت کرو اور پھر اسے کچھ عرصے کے لئے علیحدہ اپنے بستر میں چھوڑ دو اب وہ علیحدہ چھوڑنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ سمجھے کہ میرا کچھ اس نے دیکھا ہی نہیں، میرا نقص اس کو پتا ہی نہیں چلا بلکہ یہ اعراض ایسا ہے جس سے بڑی وضاحت کے ساتھ جرم کرنے والے اور خطا کرنے والے کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اب معاملہ آگے بڑھ گیا ہے، اب اس کا تعلق اثر انداز ہو گیا ہے۔اب اگر میں ایسی باتیں پھر کروں گی یا کروں گا تو مجھے اس سے وہ شفقت نصیب نہیں ہو سکتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔تو یہ عفو کے بعد صفح ہے۔

چنانچہ صفح میں یہ بھی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان ناراضگی کے اظہار پر اپنا گھر چھوڑ کر باہر نکل جائے۔کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کوئی بری بات آپ دیکھتے ہیں تو اس جگہ کو چھوڑ کر ہٹ جاتے ہیں صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ناراضگی کا اظہار ہے گو سختی اس میں نہیں پائی جاتی۔چنانچہ اگر کوئی بدتمیزی کی باتیں کرتا ہے دین کے متعلق تو وہاں دراصل صفح کا معنی ہی ہے جو مضمون بیان ہوا ہے ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ یعنی محسوس ہو ان کو کہ ہماری یہ حرکت اس شخص کو پسند نہیں آئی اس کے بعد بھی اگر ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جو قابلِ سرزنش ہے تو پھر مغفرت کا خانہ کھلا رہ جاتا ہے اور بعض باتوں میں اظہار ناراضگی کے بعد بھی مغفرت ہوتی ہے اور ان معنوں میں صفح کے بعد مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی ناراضگی کو پھر اتنا لمبا نہ کرو کہ تعلق ٹوٹ ہی جائے،

ایسا نہ ہو کہ رشتہ وداد ہی قطع ہو جائے کچھ حوصلہ دکھاؤ پھر اور واپسی کے سفر کے لئے مغفرت سے کام لو۔

تب ہی خدا تعالیٰ جب بعض اپنے بندوں کا پیار سے ذکر کرتا ہے کہ ان سے یہ خطا ہوئی یہ خطا ہوئی تو پھر مغفرت کا مضمون ہمیشہ اس کے بعد آتا ہے اور مغفرت کے مضمون سے پہلے جب خدا کا دل مائل ہوتا ہے، دل چاہتا ہے کہ اس سے میں پیار کروں تو اس کو خود دعائیں سکھاتا ہے اور خود اس کو طریق بتاتا ہے کہ یہ باتیں کرو پھر مجھے تم بہت اچھے لگو گے پھر میں تمہاری طرف لوٹ آؤں گا اور اس کے لئے کوئی بہانہ ہونا چاہئے ورنہ بعض لوگ ایسے بھی میں نے دیکھے ہیں کہ وہ ناراض ہوئے واپسی کا رستہ ہی یاد آتا نہیں ہے، دل چاہے بھی تو آپس میں ایسی اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے کہتا ہے دوبارہ ہم کس منہ سے بات کریں گے اور اس کے نتیجے میں لمبے عرصے تک بعض دفعہ جدائیاں پڑ جاتی ہیں۔ میرے علم میں جب ایسے لوگ آتے ہیں تو میں سمجھاتا ہوں کہ اپنی انا کو توڑو یہ جھوٹی انا ہے تم سمجھتے ہو کہ اگر میں نے اب کہا تو میری خفت ہو جائے گی تو واپسی کے رستے ہر شخص کی اپنی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ اللہ نے واپسی کا رستہ اختیار کیا ہے اور قرآن نے کھول کر بیان فرمایا ہے۔ اس کو بھی تو واپسی چاہئے ایک بندے سے ناراض ہوا ہوا ہے، دوسری طرف منہ کیا ہوا ہے بندے کو محسوس ہو گیا ہے کہ اب مجھے چھوڑ رہا ہے کچھ، وہ التفات نہیں رہا، وہ دعاؤں میں مقبولیت نہیں رہی۔ خدا کے اظہار کے بے شمار طریقے ہیں جو بندے کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اب کچھ معاملہ آگے بڑھ گیا ہے پھر اللہ واپس آتا ہے، بندہ تو نہیں پھر اس کو پکڑ سکتا۔ اللہ تعالیٰ تو بندے کی پکڑ، پہنچ سے کہیں بالا اور اس کی رسائی سے بہت اونچا ہے تو یہ اس کی رحمت کا طریق ہے، خود جھکتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسے پھر سکھایا ایسی ایسی باتیں کرو وہ ہمیں بڑی اچھی لگیں گی، پھر میں تجھے معاف کروں گا تو معافی کے بھی کیسے پیارے رنگ ہیں اللہ کے، خود ہی معافی کے ڈھنگ سکھائے اور پھر معاف کر دیا اور گویا واپسی کا رستہ قائم ہو گیا۔

بندوں میں بھی کچھ واپسی کے رستے ہوا کرتے ہیں اور حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ بھی وہ رستے نکالا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب وہ آپؐ کے اوپر ایک بہت

ہی ظالمانہ، جھوٹا الزام لگا، آپ نے کچھ عرصہ علیحدگی اختیار کی جب خدا تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ الزام بالکل جھوٹا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ معصوم ہیں تو آپ نے واپسی کے وقت نرم باتیں شروع کر دیں، حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا اب نرم باتوں کا کیا فائدہ، اللہ نے حکم دیا ہے تو آئے ہو، مگر انسانی فطرت ہے آپ نے اپنی طرف سے پیار اور نرمی کی باتیں کیں مگر عائشہ صدیقہؓ سمجھتی تھیں کہ اللہ کا حکم آ گیا اب مجبور ہو گئے ہیں۔ تو واپسی کے رستے انسان ہمیشہ ڈھونڈا کرتا ہے اور اپنی زندگی کے تجربوں پر آپ نظر ڈال کے دیکھ لیں ایک دفعہ جب آپ صــفــح کا معاملہ شروع کر دیں تو پھر بسا اوقات واپسی میں الجھن پیدا ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس سلسلے میں بہت سے پیارے انداز دکھائے جن سے پتا چلتا ہے کہ مغفرت کے لئے صفح کے بعد رستہ بنانا چاہئے اور انسان کو واپس لوٹنا چاہئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس انا کو توڑنے کے لئے ایک بہت ہی پیارا نسخہ بیان فرمایا۔ بعض دفعہ صفح سچ ہے ناراضگی حق ہے لیکن اب اگلا بھی ناراض ہو بیٹھتا ہے وہ سمجھتا ہے میں سچا ہوں تو پھر واپسی کا پل قائم کرنا ذرا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں ”**سچے ہو کر جھوٹوں کی طرح تذلل اختیار کرو**“ پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔ یہ جو انا کا معاملہ ہے، انا جو حائل ہو جاتی ہے دوبارہ تعلقات کے قیام کے لئے اس کو توڑنے کے لئے اس سے اچھا کوئی رستہ نہیں ہے اور میں نے خود بھی اس کو استعمال کر کے دیکھا ہے، دوسروں کو بھی استعمال کروایا ہے بہت ہی اعلیٰ درجے کا نسخہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا سچے ہو کر جھوٹے ہونے کا اقرار کرو۔ اب سچے ہو کر جھوٹا ہونے کا اقرار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر انسان سمجھ رہا ہے کہ میں جھوٹا نہیں ہوں اور یقین رکھتا ہے کہ میں جھوٹا نہیں ہوں تو پھر اس کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ کہنا کہ سچے ہو کر جھوٹوں کی طرح تذلل اختیار کرو ایک ہی معنی رکھ سکتا ہے دوسرا معنی اس میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کا یہ معنی ہو نہیں سکتا کہ سچے ہو تو جھوٹ بول کر اپنے آپ کو جھوٹا کہو اور کئی لوگوں کو اس فقرے کا مفہوم نہ سمجھ آنے کے نتیجہ میں واپسی کا رستہ ہی نہیں پھر یاد رہتا۔ وہ کہتے ہیں ہم سچے ہیں ہم کیسے کہیں کہ ہم جھوٹے ہیں۔ یہ نہیں کہنا کہ ہم جھوٹے ہیں، تذلل ایسا اختیار کرو گویا تم جھوٹے ہو۔ تو اچھا جو بھی ہے ہمیں معاف کر دو، قصور ہمارا ہی سہی اب یہ کہنے کا طریق ہے، یہ تو جھوٹ نہیں ہے۔ اچھا چھوڑو اس جھگڑے کو، جو پرانی باتیں ہیں ان کو طول نہ دو ختم کرو چلو میں ہی جھوٹا سہی یہ جب کہتے ہیں ”میں ہی جھوٹا سہی“ تو اس کا

مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ نے جھوٹے رنگ میں اپنے جھوٹ کا اقرار کیا ہے۔ یہ ایک طرز کلام ہے اور چھوٹے چھوٹے بعض لفظ زبانوں میں بہت ہی مفید اور کار آمد الفاظ ہوتے ہیں تو ہلکا سا Twist دے دیں بات کو جو بدی کی خاطر نہیں بلکہ نیکی کی خاطر ہو تو اس سے معاملے حل ہو جاتے ہیں۔

ابھی کل ہی ایک شخص کی طرف سے معافی کا خط ملا ہے جس نے اپنی عمر کا ایک لمبا عرصہ اخراج میں ضائع کر دیا اس بحث میں کہ نہیں میں سچا ہوں اس لئے میں کیسے معافی مانگوں اور ہر دفعہ اصرار۔ میں نے کہا پھر اگر تمہارا یہ اصرار ہے تو بیٹھے رہو اسی پہ، دلائل اور گواہیاں کہتی ہیں تم جھوٹے ہو اور تمہیں اصرار ہے اپنے سچ پر اور تم کہتے ہو میں پھر کیسے معافی مانگوں۔ آخر خدا نے اس کو عقل دی اس نے جب دوبارہ معافی مانگی تو جو امور عامہ کے کارکن ہیں انہوں نے ان سے پوچھا کہ اسی شرط کے ساتھ مانگ رہے ہو۔ اس نے کہا نہیں اب میں نے کافی دیکھ لیا ہے اس کا نقصان، میں جو بھی ہوں مجھے معاف کر دیا جائے۔ میں یہ بحث چھیڑتا ہی نہیں کہ میں سچا تھا کہ جھوٹا تھا۔ میں نے اسی وقت اس کو معاف کر دیا کیونکہ کسی کو جماعت سے الگ رکھنا تو میرے لئے بھی بڑی تکلیف کا موجب ہوتا ہے لیکن اگر کوئی غلط ضد پر اٹکا رہے تو اس کی غلط ضد کو تسلیم کرنا عفو اور درگزر اور مغفرت کے تقاضوں کے اندر نہیں ہے، وہ اس سے باہر کی چیز ہے۔

قرآن کریم فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ کا جو مضمون بیان کرتا ہے اس میں شرط ہے کہ عفو کی ایسی صورت میں تب اجازت ہوگی اگر اس کے نتیجہ میں اصلاح ہو۔ اگر اس کے نتیجہ میں غلطیاں پھیل جائیں اور غلط اصول قائم ہو جائیں اور فتنے پیدا ہونے شروع ہو جائیں تو پھر عفو کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے لوگ بعض دفعہ میرے ہی خطبوں کے حوالے دے کر مجھے ملزم کرتے ہیں کہ آپ نے تو عفو پر اتنا خطبہ دیا تھا مغفرت کی وہ وہ باتیں کی تھیں، آپ بھول گئے اب کیوں نہیں کرتے مغفرت سے کام۔ حالانکہ ان کو پتا نہیں کہ قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی ہر قسم کی صفات بیان فرمائی ہیں وہ تمام صفات آنحضرت ﷺ کی ذات میں جلوہ گر تھیں اور ان کے درمیان عدل تھا، ان کے درمیان ایک توازن تھا اور اس عدل کو قائم رکھنا لازم ہے۔ ورنہ محض مغفرت کے نام پر اگر آپ ہر بات کو نظر انداز کریں اور ہر بات کو معاف کریں گے تو اس کے نتیجہ میں گناہ بہت ہی شوریدہ سر ہو جاتے ہیں وہ باغی ہو کر سارے معاشرے کو برباد کر دیتے ہیں۔ تو ان چیزوں کے درمیان فرق رکھیں اور تب ہی رسول اللہ

ﷺ کی بعض ناراضگیاں بہت لمبا عرصہ چلی ہیں مگر اس لئے کہ ان معاملات میں آپ سمجھتے تھے کہ خدا کی اجازت کے بغیر میں مغفرت سے کام نہیں لے سکتا۔ جب اجازت آئی تو پھر آپ نے وہ مغفرت سے کام لیا۔ جہاں ایسا معاملہ نہیں تھا وہاں آپ نے بڑے بڑے درگزر اور عفو اور مغفرت سے کام لئے ہیں۔ تو یہ مضامین ایسے ہیں جو توازن کا تقاضا کرتے ہیں اپنی طبیعتوں میں ان باتوں میں توازن رکھئے۔

پس مغفرت کی بھی ضرورت پڑے گی اگر وہ ایسے گناہ ہوں جن سے بخشش سے کام لینا ہے تو پھر عفو کے اس مضمون کے بعد جو میں نے بیان کیا ہے، اس سے علیحدگی کے بعد پھر واپس لوٹو، پھر معافی دو اور معافی کے بعد اور بھی زیادہ محبت بڑھ جایا کرتی ہے بسا اوقات، کسی نے کہا ہے۔

''بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر''

جنگ کی اپنی تلخیاں سہی مگر جنگ کے بعد جو ملنے کا مزہ ہے وہ پھر بات ہی اور ہے۔ تو مغفرت اس مزے کا نام ہے جو کچھ لڑائی، کچھ جنگ کے بعد انسان کرتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تعلق میں بڑھ جاتا ہے اسی لئے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون کو ایک موقع پر اس طرح بیان فرمایا ہے کہ گویا خدا کو گناہ اچھا لگتا ہے کیونکہ اس کے بعد اس کو مغفرت کا بڑا مزہ آتا ہے۔ وہ میں نے ایک موقع پر تفصیل سے سمجھایا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو لیکن یہ اپنی جگہ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ غفور رحیم ہے اس کو مغفرت کا اس سے لطف آتا ہے کہ اس کی مغفرت کے نتیجہ میں گناہوں کو حوصلہ نہیں ملتا بلکہ گناہ مٹتے ہیں اور بندے کا خدا سے پیار بڑھ جاتا ہے اور یہ وہ حکمت ہے جو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں مغفرت کے مضمون کو جتنا بار بار بیان فرمایا ہے شاید ہی کوئی اور مضمون ہو جو اس طرح اصرار اور تکرار کے ساتھ بار بار بیان ہوا ہو، مگر تکرار نہیں بلکہ بلاغ مبین کے طور پر بیان ہوا ہو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ پس یاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے۔ یہاں دو باتیں ہیں جن پر اس آیت کا اختتام ہے۔ اوّل یہ کہ اللہ تو غفور ہے اگر تم غفور نہیں بنو گے تو اللہ سے تعلق کاٹ لو گے ادھر اولاد کو دشمن بناؤ گے وہ ہاتھ سے جاتی رہے گی، بیوی جس کو تمہارے لئے سکینت اور راحتِ قلب کے لئے پیدا کیا گیا وہ تمہارے لئے سکینت اور راحتِ قلب دینے کی بجائے تمہارے خلاف عناد رکھنے والی ہو جائے گی۔ اولاد جس پر انسان کی آئندہ نسلوں کی بقاء کا انحصار ہے اس کی اپنی

بقاء ہے وہ دشمن کے طور پر باقی رہے گی اور ہمیشہ اس کو بغض اور عناد سے یاد رکھے گی۔

بعض دفعہ بعض جاہل مرد اتنا زیادہ سختی سے کام لیتے ہیں کہ ان کے اپنے بچے مجھے لکھتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ہم دعا کیسے کریں گے کہ دل سے جھوٹ تو نہیں اٹھ سکتا ہم اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے یہ کرو اور وہ کرو، ان سے زیادہ سے زیادہ منہ بند تو کرلیں گے کہ اف نہیں کہنا مگر پھر ان کے لئے دعا دل سے کیسے نکلے گی اور جس لکھنے والے کی میں بات کر رہا ہوں وہ بالکل سچائی کے ساتھ لکھ رہا تھا۔ اس نے جس طرح وضاحت کی بالکل عیاں تھا اس میں کوئی بناوٹ نہیں وہ بے چارہ سخت مظلوم اور مجبور تھا اور دل چاہتا تھا کہ میں بھی نیک لوگوں کی طرح اپنے ماں باپ کے لئے دعائیں کروں لیکن اس نے کہا اس نے تو گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ماں پر سختی، بیٹیوں پر سختی، ہم پر سختی اور ایک دشمن کے طور پر ہمارے گھر میں بس رہا ہے وہ شخص اور کوئی بھی ایسا ذریعہ باقی نہیں رہنے دیا کہ ہم اس کے لئے دل میں کسی کونے میں محبت محسوس کریں۔

تو اپنی اولاد کو عدو بنانا باپ کا کام ہے، یہ قرآن کریم نے کھول دیا ہے مضمون کہ تمہاری بیویوں میں سے، تمہاری اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں۔ مگر کس کے دشمن ہیں ''جو عفو سے کام نہیں لیتا''۔ جو ترتیب یہ ہے عفو سے کام نہیں لیتا، صفح سے کام نہیں لیتا، میں اس کا معنی پہلے بیان کر چکا ہوں اور مغفرت سے کام نہیں لیتا اس کی اولاد اس کی دشمن ہو جائے گی اور پھر خدا کا تعلق بھی کاٹا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے۔ جو ان باتوں میں عفو، درگزر وغیرہ سے کام نہیں لیتا وہ رحیم نہیں ہوسکتا اور جو مغفرت نہیں کرتا اس کا غفور سے تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔ تو دین و دنیا دونوں ہی ہاتھ سے نکل جائیں گے اگر انسان اس بدتمیزی کی روش پہ اصرار کرے اور اولاد کو اچھا بنانا اس کا فرض ہے کیونکہ اگر وہ اس کی بداخلاقی کے نتیجہ میں بری بن کے دنیا میں قائم ہوگی تو صرف یہ سوال نہیں ہے کہ اس سے کاٹی جائے گی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ لوگ آئندہ دوسروں کو جو اپنی بدخلقی کا نشانہ بنائیں گے کیونکہ ہر بچے کا ایک ہی طرح ردّعمل نہیں ہوتا۔ بعض تو وہ ہیں جیسا کہ میں نے بیان کیا تکلیف محسوس کرتے ہیں، بے قراری محسوس کرتے ہیں، دعاؤں کے لئے خط لکھتے ہیں کہ خدا کے لئے ہمیں کچھ بتائیں ہم کیا کریں ہم اللہ کی نظر میں بد بننا نہیں چاہتے مگر بے اختیاری کا عالم ہوگیا ہے لیکن ایسے کم ہوتے ہیں۔ اکثر وہ ہیں جو اس رنگ میں رنگین ہو جاتے ہیں پھر، باپ گھر سے نکلا تو ایک بچہ دوسرے

پر پھر تشدد کرتا ہے اور مائیں پھر بعض دفعہ اسی رنگ میں رنگین ہو جاتی ہیں سارے گھر میں دنگا فساد، ایک دوسرے پر برتن اچھالنا، چیزیں پھینکنا۔ گھر ہے جو ایک فساد کی آماجگاہ ہو جاتا ہے اور پھر آگے یہ نسلیں اگلی نسلوں پر بڑا ہی ظلم کرنے والی بنتی ہیں۔ بہت سے معاملات جو میرے سامنے آتے رہتے ہیں مجھے صاف پتا چل جاتا ہے کہ کس ماں باپ کی گود میں اس عورت نے پرورش پائی ہے یا اس مرد نے پرورش پائی ہے ان کی ساری تاریخ ان کے اندر لکھی ہوئی ہے جو دہرا رہی ہے اپنے آپ کو، کتنی نسلوں تک یہ بدپھل کھائیں گے آخر۔ اس لئے ضروری ہے کہ بار بار بلاغ مبین کے ذریعے ان پر بات کھولی جائے اصرار کیا جائے کہ خدا کے لئے ہوش کرو کسی دن سوچو تو سہی کہ تم کیا ہو گئے ہو تم نے اپنے گھر کا کیا حال بنا رکھا ہے اور اس کے بدنتائج سے پھر تم بھاگ نہیں سکو گے اور مر بھی جاؤ گے تو وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے کیونکہ ہر آنے والی نسل تمہیں بددعائیں دے گی۔ پس اس وجہ سے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درس والی رؤیا تھی اس نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے، اس پر میں زور دوں اور بار بار زور دوں اور آپ کو سمجھاؤں کہ عفو اور درگزر کے بغیر اور صفح اور مغفرت کے بغیر ہم حقیقت میں اپنی اولاد کی کیا دنیا میں کسی کی بھی تربیت نہیں کر سکتے۔

اب میں چند احادیث، جتنا بھی وقت ہے، وہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ باقی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھی اقتباسات ہیں وہ آئندہ خطبہ میں بھی اس مضمون کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق بتایا کہ آپؐ نے فرمایا:

ما نقصت صدقة من مال ولا عفا رجل عن مظلمة الا زاده اللّٰه عزًا

(مسند احمدبن حنبل ،مسند العشرة المبشرين با لجنة،باقی مسند المكثرين من الصحابة ،مسند أبی هريرةؓ)

کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں ہوا کرتی، یہ بھول جاؤ بات کہ صدقہ سے مال کم ہوتا ہے۔ صدقہ سے مال ہمیشہ بڑھتا ہے اور اس میں برکت پڑتی ہے اور یہ بھی بہت ہی گہرا مضمون ہے اپنی ذات میں الگ تفصیل کا محتاج ہے۔ بعض دفعہ میں نے اس پر روشنی ڈالی مگر بعض دفعہ پھر بھی اسے بتانا پڑے گا کہ ایک طریق سود کے ذریعے مال بڑھانے کا ہے ایک قرضہ حسنہ خدا کو دینے کے ذریعے مال بڑھانا ہے ایک صدقات کے ذریعے مال کا بڑھانا ہے

اور یہ ساری باتیں اپنی جگہ سچی ہیں کہ سود کے ذریعے نہیں بڑھتا بلکہ اس پہ نحوست پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کو قرضہ حسنہ دینے سے لازماً بڑھتا ہے اور غریب کی مدد کرنے سے، ضرورت منداور محتاج کا خیال رکھنے سے مال میں ضرور برکت پڑتی ہے لیکن یہ چونکہ ضمنی مضمون یہاں آیا ہے اس لئے میں اس کو سردست چھوڑتا ہوں۔

اگلی بات یہ ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی انسان عفو سے کام لے اور خدا تعالیٰ نے اس کو عزت نہ دی ہو۔عفو سے اگر کام لو گے تو تمہاری عزت بڑھے گی عزت کم نہیں ہوگی اور یہ ایک بہت ہی گہرا نفسیاتی راز ہے جو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ نے ہم پر کھولا اور امر واقعہ یہ ہے کہ وہ ماں باپ جو اپنی اولاد سے عفو کا سلوک کرتے ہیں ہمیشہ ان کی عزت ان کی اولاد کے دل میں بڑھتی ہے اور عفو کے ذریعے باہر سوسائٹی میں بھی عزت بڑھتی ہے اور کبھی عفو سے انسان گرتا نہیں یعنی لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس کو کیا پتا چلتا ہے چلو چھوڑو پرے اس کو۔عفو میں ایک وقار پایا جاتا ہے۔عفو کے مضمون میں یہ بات داخل ہے کہ علم ہو گیا ہے لیکن دیکھو ہم اپنی اعلیٰ حوصلگی کی وجہ سے، اپنے وسیع القلب ہونے کی وجہ سے تجھ سے اعراض کر رہے ہیں اس کے نتیجہ میں ہمیشہ ایسے شخص کے لئے دل میں عزت بڑھتی ہے اس کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔

حضرت مصلح موعودؓ اس کی ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کی مثال تھے۔حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی میں نے بہت قریب سے اور بار بار دیکھا عجیب عفو کا رنگ تھا یعنی جانتے تھے کہ یہ کچھ ہو رہا ہے مگر یوں نظر کرتے تھے گویا دیکھا ہی کچھ نہیں مگر جب دیکھتے تھے تو پھر صفح جمیل ضرور ہوتا تھا جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں جب ایسے دیکھا کہ نظر آ گیا کہ اس نے دیکھ لیا ہے پھر اس سے ناراضگی کا اظہار بھی بالکل اسی طرح جیسے قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ پھر اس سے کچھ دیر کے لئے گویا الگ ہو گئے، نگاہوں میں اجنبیت آ گئی، یہ ہے وہ عفو کا دوسرا طریق یعنی معنیٰ وہی ہے مگر اور رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔گویا نہیں دیکھا، اس کو نہیں دیکھا جو توجہ چاہتا ہے۔ہر وقت جس کو عادت ہو کہ مجھ پر پیار کی نظر رہے اس سے نظریں ہٹانا بہت بڑی سزا ہے اور Reprove کا معنی اس لحاظ سے اس میں داخل ہو جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر تم اگر عفو سے کام لو گے تو عفو کے نتیجہ میں تمہیں کبھی بھی گھٹیا اور چھوٹا نہیں سمجھا جائے گا۔اب اس میں ایک اور بڑی عجیب راز کی

بات بیان فرمادی جس کی طرف توجہ دلا کے اب چونکہ وقت ختم ہو رہا ہے میں اس خطبہ کو ختم کروں گا کہ عفو ہے کیا، وہ عفو جس کے نتیجہ میں اولاد بدتمیز ہوتی ہے اور کھل کھیلتی ہے، شرارتیں کرتی چلی جاتی ہے اس کے نتیجہ میں اس اولاد کے دل میں ان ماں باپ کی عزت کبھی نہیں پیدا ہوئی اس لئے عفو پہچاننے کا کتنا عمدہ ذریعہ بیان فرما دیا۔ فرمایا عفو ہے ہی وہی جس کے ذریعے تمہاری عزت بڑھے۔ جہاں تم نے عفو کے نام پر خطاؤں سے نظر پھیری ہے اور خطائیں شوخ ہوگئی ہیں اور بچے بدتمیز ہو گئے ہیں تم بے وقوف ہو جو سمجھتے ہو کہ عفو سے کام لیا جا رہا ہے۔ تم وہ حد پھلانگ چکے ہو جہاں عفو کی جو عمل داری تھی وہ ختم ہوگئی اس حد سے باہر آ گئے ہو۔ تو ایک ہی چھوٹے سے پیارے فقرے میں آنحضرت ﷺ نے کتنا عظیم الشان نکتہ بیان فرما دیا عفو کی پہچان کا۔ فرمایا اس وقت تک تمہارا عفو ہے جب تک اس کے نتیجہ میں تمہاری عزت بڑھتی ہے جہاں تمہاری عزت ختم ہونی شروع ہو جائے وہاں عفو ختم ہے۔

پس وہ مائیں جو اپنے بچوں کو خاص طور پر جب وہ دوسروں کے گھروں میں جائیں تو ہر قسم کی کھلی چھٹی دے دیتی ہیں، دوڑے پھرتے ہیں آوازیں نکالتے، چیخیں مارتے، بدتمیزی کا اظہار اور ان کے ہنسنے کی طرز میں ہی بدتمیزی پائی جاتی ہے اور جو میزبان ہے اس کو تکلیف پہنچ رہی ہے اس کے بچے حیران ہو جاتے ہیں یہ کیا ہو رہا ہے اور ماں بیٹھی ہے بے حس، پرواہ ہی کوئی نہیں اور وہ پھر ان کی قیمتی چیزیں جو انہوں نے سجاوٹ کی چیزیں رکھیں، اٹھا کے وہ پھینکیں، کوئی شیشہ توڑ دیا بہت قیمتی، کوئی اور چیز کسی کو نقصان پہنچا دیا، اور ماں ہے ''بڑا شرارتی ہے ایسا نہ کر یا کر'' اور ایسا بچہ ضرور ماں سے بدتمیز ہوتا ہے یہ میرا تجربہ ہے ایک دفعہ بھی میں نے اس بات کو غلط نہیں دیکھا۔ ایسی مائیں جو ڈھیل دیتی ہیں ان کی عزت گر جاتی ہے اور ذلیل ہو جاتی ہیں وہ، اور وہ اولاد پھر ان پر بھی تحکم کرنے لگتی ہے۔

یہ مضمون ہے جو آنحضرت ﷺ نے بیان فرما دیا کہ یاد رکھو عفو سے عزت کم نہیں ہوا کرتی بلکہ خدا ہمیشہ ایسے شخص کی عزت بڑھا تا ہے۔ جہاں کم ہوتی دیکھو گے وہاں تم عفو کی حدیں پھلانگ گئے اس لئے لازم ہے تم پر کہ تم اپنی نگرانی کرو اور عفو کی حد سے باہر نہ نکلو۔ **عن مظلمةٍ** لفظ تھا جو میں بھول گیا تھا بیان کرنا۔ **مظلمةٍ** سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسی باتیں جن سے تم پر کچھ ظلم ہوا ہے تمہارا نقصان ضرور ہوا ہے اور تکلیف کا موجب بنا ہے پھر، عام روزمرّہ جو باتیں ہیں

ان میں عفو تو اور چیز ہے مگر یہ عفو اس موقع کی باتیں ہیں جیسی کہ مثالیں بیان کی تھیں کہ تھوڑا بہت نقصان پہنچا دیا۔

اب جو باہر کے بچے آپ کے ہاں آتے ہیں ان سے بھی انسان عفو سے کام لیتا تو ہے مگر اگر وہ عفو کا کام آپ کو نقصان سے بچا نہ سکے اور آپ کی عزت بھی کم ہو تو پھر وہاں بھی عفو سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ دوسرے ماں کے بچے پر سختی نہ کریں، اس کو ماریں نہیں مگر صفح جمیل کا حکم اس کے بعد آپ پر لازماً صادق آتا ہے کہ سمجھائیں ماں باپ کو، کیونکہ صفح میں صرف اعراض کر کے ناراضگی کا اظہار نہیں بلکہ لفظوں میں ناراضگی کا اظہار بھی لغت کی رو سے لفظ صفح میں داخل ہے تو سمجھانا چاہئے اس کی ماں کو یا اس کے باپ کو جو بھی ساتھ ہو کہ دیکھو تم بچوں سے ٹھیک سلوک نہیں کر رہیں یہ نقصان پہنچا رہے ہیں اور تکلیف دہ بات ہے۔ اس میں سزا دینے کا مفہوم نہیں ہے مگر اظہار ناپسندیدگی اس رنگ میں کہ دوسرے کو محسوس ہو کہ ایک غلط بات ہو گئی ہے۔

تو اس طرح اپنے معاشرے کو قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ڈھالیں تو گھر میں اگر تربیت اچھی ہو جائے گی تو یاد رکھیں پھر آپ ایک دنیا کی مربی قوم کے طور پر ابھریں گے اور ایسی قوم جو ان نصائح پر جو گھر سے شروع ہوتی ہیں اور بظاہر چھوٹی چھوٹی ہیں جو ان سے فائدہ اٹھاتی ہے اس کے مرتبے بہت بلند ہو جاتے ہیں اور زادہ اللّٰہ کا جو مضمون ہے وہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ عزت دیتا ہے اس شخص کو۔ یعنی بات تو نفسیاتی ہے مگر اللہ کی طرف عزت کو پھیر دینا دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے ایک تو یہ کہ قانون قدرت ہے، خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ضرور عمل دکھائے گا ایسی صورت میں اگر عفو سچا ہے تو تم ضرور اس کے نتیجہ میں زیادہ عزت کے ساتھ یاد کئے جاؤ گے، عزت کے ساتھ تم سے سلوک کیا جائے گا لیکن اس سے بڑھ کر مضمون یہ ہے کہ جب اللہ کسی کو عزت دیتا ہے تو اس کی پھر کوئی حد نہیں رہتی وہ اس کے مرتبے کو جتنا چاہے بڑھائے، بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

پس محض ایک نفسیاتی ردعمل کے طور پر نہیں بلکہ اگر تم خدا کی خاطر ایسا کرو گے۔ اگر اللہ کے خوف یا اس کی محبت کے نتیجہ میں ایسا کرو گے تو پھر تمہاری عزتیں ضرور دنیا میں بڑھیں گی اور یہ وہ

مضمون ہے جو ساری عالمگیر جماعت سے ان معنوں میں تعلق رکھتا ہے کہ اگر وہ گھر میں عفو سے کام لیں گے تو خدا محض گھر میں آپ کو جزا دینے کا پابند نہیں ہے۔ اللہ کی جزا تو پھر گلیوں، شہروں، ملک ملک پھیلتی ہے اور وہ کسی حد بندی کی پابند نہیں ہے اس لئے یہ جماعت کی عزت اور وقار کو بڑھانے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قرآن اور رسول ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں نصیحتوں پر عمل درآمد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بنی نوع انسان کی تربیت صرف رسول اللہ ﷺ کے تابع ہو کر ہی کی جاسکتی ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 13 / دسمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ (آل عمران: 133 تا 135)

پھر فرمایا:

گزشتہ خطبہ میں مَیں نے آئندہ نسلوں کی تربیت کی طرف توجہ دلائی تھی جن کا اس دور کی نسل کی تربیت سے گہرا تعلق ہے۔ اگر موجودہ دور کی نسل کی صحیح تربیت نہ ہو تو آئندہ بھی کسی دور کی تربیت نہیں ہو سکتی اور اگر اپنی نسل کی تربیت نہ ہو تو اپنے گردوپیش اور ماحول کی تربیت بھی نہیں ہو سکتی اور اگر اپنے بیوی بچوں سے سلوک ظالمانہ ہو اور شقی القلب لوگ حقوق تلف کر رہے ہوں اپنے گھر والوں کے اور تربیت کے تعلق میں سخت گیری کو پسند کریں تو نہ وہ اپنے گھر والوں کی تربیت کر سکتے ہیں نہ اپنے ماحول کی تربیت کر سکتے ہیں بلکہ اس کے برعکس خوفناک ردعمل پیدا ہو سکتے ہیں جو آئندہ

تربیت سے محرومی کے علاوہ یعنی مثبت پہلوؤں سے محرومی کے علاوہ خطرناک منفی پہلو نسلوں میں جاری کر سکتے ہیں۔

یہ خلاصہ ہے اس خطبہ کا جو میں نے گزشتہ مرتبہ دیا اور اسی حوالے سے اب میں اس مضمون کو پھیلانا چاہتا ہوں کیونکہ ہمارا کام محض اپنے بچوں کی تربیت کرنا نہیں، اپنی بیوی کی تربیت کرنا نہیں، اپنی بیوی اور بچوں سے حسن سلوک سے پیش آنا نہیں، بلکہ یہاں گھر میں جو کام ہم کریں گے اور سیکھیں گے، ان کو پھر ہم نے دنیا میں اپنے گردو پیش پھیلانا ہے اور اسی پہلو سے آئندہ بنی نوع انسان کی تربیت کی بنیادیں ڈالنی ہیں۔ مگر بنیادیں تو آج ڈالی جائیں گی، تو کل عمارت تعمیر ہوگی۔ آج بنیادیں ہی نہ ڈالی جائیں، تو کل کی عمارت کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے۔ پس اس پہلو سے جس کا تعلق بہت حد تک ہماری جو خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ دعوت الی اللہ کی کوششیں ہیں، ان سے ہے اور یہ دونوں مضامین ایک دوسرے کے ساتھ یوں بندھے ہوئے ہیں کہ گویا لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کا تعلق دوسرے سے توڑا نہیں جاسکتا۔ کوئی داعی الی اللہ ان اہم امور سے غافل رہتے ہوئے، اپنی دعوت میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

پس اس تعلق میں زیادہ وسیع تر مضمون پر مشتمل آیات کا انتخاب کیا ہے، جس کا عنوان یہ باندھا گیا ہے۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اکثر اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت کا تعلق تقویٰ سے باندھا گیا ہے، فلاح سے باندھا گیا ہے، دین و دنیا کی کامیابیوں سے باندھا گیا ہے۔ اب اس آیت پر غور کرنے سے یا ان آیات کے باہمی ربط پر غور کرنے سے یہ بات کھلتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی کسی دوسری آیت سے بے وجہ جڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ گہری حکمتیں ہیں جو مختلف آیات کو آپس میں باندھتی ہیں اور ہر نتیجہ جو آیت نکالتی ہے اس نتیجہ کا اسی آیت سے ہی نہیں بلکہ آئندہ آنے والی آیت کے مضمون سے تعلق ہوتا ہے۔

پس چونکہ رحم کی تعلیم دینی تھی اس لئے اس کا عنوان یہ باندھا وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو تا کہ تم پر پھر رحم کیا جائے اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے نتیجہ میں رحم کس نوع کا رحم ہے، اس کی وسعتیں کیا ہیں، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ کہ اس جنت کی طرف دوڑو جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اور وہ اس اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے وابستہ ہے جو رحمۃ للعالمین کے مضمون اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اللہ کی رحمت جو تمام عالمین پر پھیلی ہوئی ہے اس رحمت نے محمد رسول اللہ ﷺ پیدا فرمائے جن کی رحمت تمام جہانوں پر پھیلا دی اور ان کی اطاعت سب سے زیادہ اللہ کے رحم کو جذب کرنے والی ہے۔ اگر ان کی اطاعت کرو گے یعنی اللہ اور رسولؐ کی تو ان کی رحمانیت سے حصہ پاؤ گے اور اگر اطاعت سے منہ موڑو گے تو اسی حد تک تم رحم سے محروم کئے جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں سے محروم کئے جاؤ گے۔

پس سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ میں جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اس رحمت سے جو اپنی بیویوں سے، اپنی ازواج سے، اپنے بچوں سے کی جاتی ہے اس کے مقابل پر بہت وسیع تر ہے اور ان دونوں آیات کا ایک بہت ہی گہرا تعلق یہ بھی ہے کہ ہم تو اپنے بچوں کی پرورش کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں مگر آنحضرت ﷺ تمام بنی نوع انسان کی پرورش کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں اور آپؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ آپؐ نے کسی پہلو سے بھی اس پرورش میں کوتاہی نہیں کی۔ ہم جو چھوٹے چھوٹے دائروں میں پرورش کے ذمہ دار بنائے گئے اگر ہم ان دائروں میں ناکام ہو جائیں تو کتنا بڑا گناہ ہے اور کتنی بڑی محرومی ہے کیونکہ ہماری تو تھوڑی سی پہنچ جہاں تک بھی ہے اسی نسبت سے ہماری ذمہ داریاں قائم فرمائی گئی ہیں۔ کسی کا گھر چھوٹا ہے تو اس چھوٹے گھر کی ذمہ داری اس پر ہے کسی کا گھر بڑا ہے تو بڑے گھر کی۔ کوئی امیر ہے تو اس امارت کے حوالے اور اس کی نسبت سے انسان کی اپنے گردوپیش ذمہ داریاں قائم ہوتی ہیں، غریب کی اسی نسبت سے قائم ہوتی ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کی رحمت اگر سارے جہانوں پر محیط ہے تو اسی پہلو سے آپؐ کا حساب کتاب سارے جہانوں کے تعلق سے لیا جانا تھا اور اس تعلق میں خدا تعالیٰ اس آیت کے ذریعہ آپؐ کو کلیۃً بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو یہ عنوان باندھا نہیں جا سکتا تھا۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اگر آنحضرت ﷺ نے رحمت کے تمام تقاضوں کو پورا نہ کر دیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ان کی پیروی کرو گے تو تم پر خدا کی رحمت کے تمام تقاضے جو خدا کی رحمت سے تمہارے وابستہ ہیں وہ پورے کر دیئے جائیں گے۔ پس یہ آنحضرت ﷺ کی کامیاب رسالتؐ اور کامل رسالتؐ کی طرف ایک گواہ آیت ہے جس

نے رحمت کا واقعتہً حق ادا کر دیا۔ جب کر دیا تو اطاعت کرو گے تو تم رحمت سے حصہ پاؤ گے۔ اطاعت نہیں کرو گے تو اسی حد تک رحمت سے محروم کر دیئے جاؤ گے اور جب کرو گے تو پھر کوئی اس کی انتہا نہیں ہے رحمت کی عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ساری کائنات پر جو جنت وسیع ہے وہ جنت تمہارا انعام ہوگی۔

پس اس دنیا کی زندگی میں آنحضرت ﷺ کی رحمت کو آگے دنیا میں جاری کرنے کے لئے اگر ہم ذریعہ بن جائیں تو یہ ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ کا معنی اس تعلق میں، یعنی حضرت رسول اللہ ﷺ کی رحمت براہ راست خدا تعالیٰ کی طرف سے کئی صورتوں میں نازل ہوتی ہے جو رحمانیت کی جلوہ گری ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کے کوثر سے یہ رحمت تو تب ہی جاری ہوگی اگر ہم پیالے بھر بھر کے آگے لوگوں کو پلائیں گے اور یہ پلانے والے ہیں جو دراصل اس اطاعت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ پس اطاعت کے مضامین بہت سے ہیں اور مختلف قسموں میں پھیلے پڑے ہیں مگر جہاں عنوان لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ باندھا گیا یہاں اطاعت بہ تعلق رحمت ہے اور اطاعت بہ تعلق رحمت اسی طرح ہوگی کہ اگر ہم آنحضرت ﷺ کے کوثر سے تمام دنیا کو رحمت کے پیالے بھر بھر کے سیراب کرنے کی کوشش کریں۔ پس دیکھئے وہ مضمون جو گھر کی چاردیواری سے شروع ہوا تھا اب رسول اللہ ﷺ کے تعلق میں آکر کس طرح اچھل کر صرف شہروں کی حدوں سے ہی نہیں نکلا بلکہ تمام دنیا پہ محیط ہو گیا ہے تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے لگا ہے اس لئے اس کی غیر معمولی اہمیت ہے اور تقویٰ تو لازماً ہر چیز میں، ہر فعل میں مضمر ہے۔

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ کہہ کر یہ واضح کر دیا گیا کہ رحم دراصل متقیوں پر ہی کیا جائے گا اور رحمت سے حصہ پانا متقیوں کا ہی نصیب ہے تو یہ سارے مضامین آپس میں لپیٹ کر گویا ایک گلدستہ کی صورت میں اکٹھے کر دیئے گئے۔ اب اس کی تفصیل کیا ہے۔ چونکہ اطاعت کا تعلق رحمت سے تھا اس لئے اس رحمت کی تفصیل اب تیسری آیت میں مذکور ہے۔ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ یہ رحمت مادی بھی ہے اور مادی رحمت بھی وہ رنگ رکھتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی رحمت کے رنگ تھے يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وہ نہایت خوشحالی کی حالت میں بھی خرچ کرتے ہیں اور تنگ دستی کی حالت میں بھی خرچ کرتے ہیں۔

اب آنحضرت ﷺ کو یہ دو دور نصیب ہوئے اور ساری زندگی ہوتے رہے اور پھر بھی آپؐ کے خرچ میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی اور سراء میں خرچ کرنا لوگ سمجھتے ہیں آسان ہے حالانکہ یہ بہت سادگی ہے انسان کی۔ وہی سمجھ سکتا ہے آسان ہے جو انسانی فطرت کے رازوں سے واقف نہیں ہے۔ انسانی فطرت میں جو حرص رکھ دی گئی ہے اس حرص کے نتیجے میں بسا اوقات دولت بڑھنے سے کنجوسی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جتنی دولت بڑھتی ہے اتنا ہی انسان خسیس ہوتا چلا جاتا ہے اور روزمرّہ کے معمولی معمولی اخراجات جو غریبوں کی حالت سدھار سکتے ہیں ان سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کا ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے جس کے اندر وہ سمٹ کے باقی دنیا سے الگ ہو جاتا ہے۔ تو اس لئے سراء کے اوپر انسان یہ تعجب کرے کہ خوشحال تو خرچ کر ہی دیتے ہیں یہ غلط ہے۔

جو مومن خوشحال ہیں، ان کی زندگی پر نہ خوش حالی فرق ڈالتی ہے نہ تنگی فرق ڈالتی ہے۔ جو اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ کا حق ادا کرنے والے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کی طرح مادی قربانیوں میں بھی رحمت کا مظہر اس طرح بنتے ہیں کہ اگر ان کو کم ملا ہو تو پھر بھی اس سے وہ اپنے بھائی کی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ بلندی سے پانی نیچے کی طرف بہتا ہے ہر انسان جو تنگ دست ہے، بسا اوقات اس سے بھی تنگ دست دنیا میں ہوتے ہیں۔ اگر وہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کا سچا غلام ہے تو اس کو نظر رکھنی چاہئے اور اپنے سے تنگ ہاتھ والوں کو، زیادہ محتاجوں کو تلاش کر کے ان کی جستجو میں رہتے ہوئے ان پر خرچ کرے۔ لیکن صرف یہی نہیں بلکہ بعض دفعہ انسان اپنے نفس کی وجہ سے زیادہ تنگ دست ہو جاتا ہے اور ایک شخص اپنے نفس کی وجہ سے غنی رہتا ہے تو حضور اکرم ﷺ کے تعلق میں یہ بہترین معنی ہے جو صادق آئے گا کیونکہ ہر شخص کی اپنی کیفیت ہے اس کی نسبت سے، اس پر معنی کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا تنگ دستی میں خرچ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ آپؐ کو جب اپنے سے غریب تر ملتا تھا تو اس پر ہی صرف کرتے تھے بلکہ تنگ دستی میں آپؐ کو غنیٰ نصیب تھا اور تنگ دستی میں غنیٰ جو ہے وہ انسان کو امیر کر دیتا ہے۔

''الغنٰی غنی النفس''

(صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس)

امیری تو وہ ہے جو نفس کی امیری ہو۔ پس آنحضرت ﷺ اپنے سے زیادہ خوش حال لوگوں کی ضرورتیں پوری فرماتے تھے جب کہ خود بھی تنگ دستی ہو۔ یہ وہ عظمت کردار ہے جو حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کے مرتبہ کو تمام عالمین پر محیط کر دیتی ہے اور ان سے بالا کر دیتی ہے۔ وہ شخص جو عام قانون کے برعکس حرکت کرتا ہے، پانی نیچے کی طرف بہتا ہے یہ اوپر کی طرف فوارے کی طرح پھوٹتا ہے اور بلندیوں کو بھی سیراب کر جاتا ہے۔ وہ سیرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا بیان ہے ان آیات میں، جن کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ آپؐ ہی ہیں جو سراء اور ضراء میں خرچ کرتے ہیں ورنہ یہ حوالہ کیوں ہوتا۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تو حضور اکرم ﷺ کی سیرت ہی کا نقشہ ان آیات میں کھینچا گیا ہے اور اسی کی طرف بنی نوع انسان کو بلایا گیا ہے۔

پس جماعت احمدیہ جس نے خدا کے حکم کے ساتھ تمام دنیا کے اخلاق کو درست کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس کے لئے اس کے سوا راہ ہی کوئی نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کی غلامی اختیار کرے اور یہی غلامی ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ یہ توفیق بخشے گی کہ اپنے سے اونچوں کی بھی وہ تربیت کریں گے اور اپنے سے نیچوں کی بھی تربیت کریں گے کیونکہ جب وہ سراء کی حالت میں ہوں گے تو پھر تو طبعی طور پر ان کی طرف سے پانی نیچے بہنا چاہئے مگر وہ جو فطرت کی خساست کی روکیں ہیں وہ ان کی راہ نہیں روکیں گی۔ پس ان کا پانی اوپر سے بھی نیچے بہتا ہے، نیچے سے بھی اوپر بہتا ہے۔ یہ رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نقشہ ہے جو ان آیات میں وضاحت کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

اور پھر اس مضمون کو خدا تعالیٰ آگے بڑھاتا ہے۔ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اپنے غیظ کو وہ پی جاتے ہیں کیونکہ سختی اور مسلسل شفقت اکٹھے نہیں چلا کرتے اور اس کا تعلق ضراء سے بھی ہے کیونکہ ان کا جو رحم ہے وہ ان کی طرف بھی جاری ہوتا ہے جو ان کو غیظ دلاتے ہیں۔ پس یہ مضمون ایک نئے دائرے میں پھیل گیا ہے۔ وہ شفقتوں اور رحمتوں کے اس مضمون سے اب یہ تعلق رکھتا ہے جو عام انسانی اخلاق سے وابستہ ہیں اور ان کا صرف مالی قربانی سے تعلق نہیں ہے اب یہ اخلاقی مضمون بن گیا ہے۔ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ جب ان کو کوئی نقصان پہنچاتا ہے اور غصے کا حق دیتا ہے، اس کا جواز دیتا ہے اس وقت اس کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ یہ اپنے غصے کو روک لیتے ہیں اور ان لوگوں سے حسن سلوک سے رکتے نہیں جن سے حسن سلوک ان کے

لئے رحمت کا موجب بن سکتا ہے۔

اب یہ جو حصہ میں نے داخل کیا ہے ''ان لوگوں سے حسن سلوک سے رکتے نہیں جن کے لئے ان کا حسن سلوک رحمت کا موجب بن سکتا ہے'' اس نے اس مضمون میں ایک ایسی وسعت بخشی ہے، اس بات نے جو دراصل حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی سیرت سے تعلق رکھنے والی بات ہے اور قرآن نے خود یہی تعریف فرمائی ہے اور اس خطبہ کے آخر پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے میں آپ کو بتاؤں گا کہ یہ مضمون اس میں داخل ہے۔ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ اس موقع پر بنتے ہیں جہاں غصے کا ضبط کرنا اس شخص کے لئے فائدہ مند ہے جس کے مقابل پر غصے کو ضبط کیا جارہا ہے۔ جہاں اس کے لئے نقصان دہ ہے وہاں غصے کو ضبط نہیں کرتے۔

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ میں عفو کا وہی مضمون ہے جو میں پہلے خطبہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں اس کا مطلب صرف بخشا نہیں جیسا کہ عام طور پر ترجمہ میں کر دیا جاتا ہے، كَاظِمِيْنَ سے تعلق ہے اس کا۔ كَاظِمِيْنَ میں غصہ ضبط کیا جاتا ہے جبکہ وہ شدت کے ساتھ پھوٹ پڑنے پر تیار ہو اور عفو اس سے پہلے کا مضمون ہے کہ وہ عام طور پر لوگوں سے درگزر بھی کرتے ہیں۔ اب ان دونوں کا بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ ایک انسان میں بیک وقت ان دونوں باتوں کا ہونا ممکن ہے مگر ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتی۔ بیک وقت ہونا تو ممکن ہے کیونکہ وہ لوگ جو عَافِيْنَ کے عادی نہ ہوں وہ كَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ ہو ہی نہیں سکتے، ناممکن ہے۔ روزمرّہ کی زندگی میں جو چھوٹے بہت قصور ہوتے رہتے ہیں ان سے اگر انسان نظریں نہ پھیر سکے اور اس کے برعکس مین میخ نکالنے کا عادی ہو، وہ لوگوں کے قصوروں کی تلاش میں رہے ایسے لوگ ہمیشہ اپنی زندگی کو برباد کرتے رہتے ہیں، لوگوں کے لئے رحمت کا موجب بننے کی بجائے ان کے لئے ایک عذاب کا موجب بنے رہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اصلاح کی خاطر یہ کر رہے ہیں مگر اصلاح کا حق خدا نے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو اس سیرت کے ساتھ دیا ہے جو اللہ نے آپؐ کو عطا کی ہے اور اس سیرت سے ہٹنے کے بعد کسی کو کوئی اصلاح کا حق نہیں رہتا، اصلاح کی مقدرت نہیں رہتی، توفیق ہی نکل جاتی ہے ہاتھ سے۔

پس یہ وہ صورت حال ہے جس کو آپ کو سمجھنا چاہئے گہری نظر سے کیونکہ ان اخلاق کو اپنانے کے لئے جب تک ان کی معرفت نہ ہو، ان کی گہرائیوں سے انسان واقف نہ ہو، تفاصیل پیش نظر نہ ہوں تو

ان چیزوں کو اپنی ذات میں جاری کرنا آسان نہیں ہوا کرتا، پس عَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ آنحضرتؐ کا ایک طبعی فطری اظہار تھا جس میں کسی بناوٹ کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ فطری اظہار جو خودرو اظہار کی طرح ہوتا ہے اور اس میں کسی بناوٹ کی کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رسول اللہ ﷺ عَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ طبعاً تھے لیکن كَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کے لئے کوشش کی ضرورت ہے اور جدو جہد کی ضرورت ہے اور وہ اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو عفو کا عادی ہو۔

پس عفو سے مراد ان روزمرّہ کی باتوں میں، ان قصوروں میں نظر ہٹا لینا ہے جن قصوروں سے کوئی بھی انسان حقیقت میں آزاد نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کی اس پہ خاص رحمت ہو۔ تو ان کا مزاج یہ نہیں ہوتا کہ سوسائٹی میں لوگوں کے قصوروں کی تلاش کرتے رہتے ہیں، اس نے تو یہ کر دیا، اس نے تو وہ کر دیا، جو قصور ان کے سامنے خود ابھر آتے ہیں ان سے بھی نظر پھیرتے ہیں۔ اب یہ وَ لَا تَجَسَّسُوْا والے مضمون کی ایک اعلیٰ صورت بیان فرمائی گئی ہے۔ عفو تجسس کے برعکس مضمون ہے۔ تجسس کا مطلب ہے تلاش کر کے معلوم کرو وہ کیا کرتا رہتا ہے اندر بیٹھا ہوا اور گھر میں بھی یہی خرابیاں ہیں جو بہت سی بڑی خرابیوں کو جنم دیتی ہیں، پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ اگر کوئی بیوی خاوند کے نقائص کی جستجو میں رہے تو اس کی زندگی ویسے ہی حرام ہو جاتی ہے۔ وہ سوچتی رہتی ہے خاوند باہر گیا تھا تو پتا نہیں کیا کر رہا ہے وہاں بیٹھا اور کس کے گھر گیا تھا اور کیوں گیا تھا اور ساس بہو کی غلطیوں اور قصوروں کی تلاش میں رہتی ہے۔ بہو بہانے نکالتی ہے کہ کس طرح اپنے خاوند کا دل اس کی ماں سے توڑ کر جدا کرے یہ بتانے کے لئے کہ اس کی ماں یہ یہ کام کرتی ہے۔ یہ جو عادتیں ہیں یہ مہلک ہیں انسانی زندگی کے لئے، انسانی عمل کے لئے مہلک ہیں ان کو یہ وعدہ کیسے خدا دے سکتا ہے۔ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ایسی جنتوں میں ہے عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کہ اس کا پھیلاؤ تمام کائنات کے برابر، اس پر پھیلا پڑا ہے۔ جنہیں گھر کی جنت تو نصیب نہیں ہو سکتی وہ بیچارے باہر کی جنت کا تصور ہی نہیں کر سکتے ان میں اہلیت ہی نہیں پیدا ہوتی، خدا کیسے جھوٹے وعدے کرے گا ان سے۔

اس لئے اگرچہ مضمون پھیلا ہے مگر گھر کے حوالے سے پھر آپ کو یاد کرانا پڑتا ہے کہ عَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ تجسس کے برعکس صورت حال ہے۔ تجسس سے صرف نظر کریں، لوگوں

کے حالات میں ڈوب کر ان کی برائیاں تلاش نہ کریں اور وہ برائیاں جو از خود ابھر کر آپ کے سامنے آتی ہیں جہاں تک ممکن ہے ان سے عفو کا سلوک کریں اور یہ جو کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ میں مَیں نے کہا تھا اگر وہ اصلاح ممکن ہو تو پھر ایسا کریں وہ عفو کے حوالے سے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ بالکل واضح طور پر بیان فرمادیا ہے۔ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ:41) عفو کرتے ہیں مگر بغیر کسی شرط کے نہیں کرتے۔ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ وہ جس نے عفو اس طرح کیا کہ اس کے نتیجے میں لازماً اصلاح ہوتی ہے اس کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ جو عفو اس طرح کرے کہ اصلاح کی بجائے بدی کا حوصلہ بلند ہو جائے اور جرائم زیادہ پھیل جائیں وہ عفو ہرگز خدا تعالیٰ کو پسندیدہ نہیں۔

تو کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ اور عَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کا یہ مضمون ہے جو یہاں بیان ہوا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اسوہ سے سیکھو۔ آپؐ کا عفو غالب تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر اصلاح ہوتی تھی تو عفو فرماتے تھے، اگر اصلاح نہیں ہوتی تھی تو عفو نہیں فرماتے تھے اور اگر اس پر بنیاد ہے کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ ہونے کی تو لازماً یہ مضمون وہاں بھی پھیل جائے گا، وہاں تک بھی جا پہنچے گا۔ غصہ ضبط کیا جاتا ہے جہاں تک ممکن ہے کہ غصہ ضبط کرنے سے اصلاح ہو لازم ہے کہ غصہ ضبط کرو اور اگر غصہ ضبط کرنے سے جرم کی حوصلہ افزائی شروع ہو جائے اور بغاوت پھیل جائے تو ایسا غصہ ضبط کرنا تو حد سے بڑی حماقت ہے۔

پس رحمت کے باوجود غصہ ضبط کرنا لیکن رحمت کے تقاضوں کے خلاف غصہ ضبط نہیں کرنا، یہ ہے وہ رحمت کا مضمون جو بڑی وضاحت سے قرآن کریم نے پیش فرمایا اور ایک دوسری آیت کو بھی حل کر دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ فرمایا وہ دشمنوں پر اَشِدَّآءُ اس لئے نہیں ہیں کہ وہ سخت گیر لوگ ہیں، بدتمیز اور بدمزاج لوگ ہیں۔ باوجود رحیم ہونے کے پھر بھی اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہیں اور اس سے بہتر ترجمہ یہ ہوگا کہ رحمت کی وجہ سے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہیں اور یہی وہ ترجمہ ہے جو اس آیت کے حوالے سے میں کر رہا ہوں یعنی ان کی رحمت کا تقاضا ہے کہ جہاں سختی ہو، سختی کی ضرورت ہو اور سختی کے بغیر اصلاح ہو نہ سکتی ہو اور سختی نہ کی جائے تو نہ اس شخص پر رحم ہے جو بغیر اصلاح کے آزادانہ دندناتا پھرے گا، نہ اس دنیا پر رحم ہے جو اس سے نقصان اٹھائے گی۔ تو کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ اور عَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کا یہ مضمون ہے جو

دوسری آیات کے حوالے سے ہم پر کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ خود بھی ایسے تھے، اپنے صحابہؓ کو بھی ایسا ہی بنادیا یعنی ان لوگوں کا ذکر چل رہا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:30) تو قرآن کریم کی جس آیت کی طرف سے بھی آپ داخل ہوں اسی جنت میں داخل ہوتے ہیں جس کے ارض وسماء کائنات پر پھیلے پڑے ہیں۔ اندر وہ ساری چیزیں آپ کو دکھائی دینے لگیں گی اور ہر آیت بنیادی طور پر ایک ہی اصل کے تابع چلتی ہے اور آپس میں آیات کا کوئی تضاد کہیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں ممد اور مددگار بن جاتی ہیں۔ پس اس لحاظ سے عَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ کا مضمون سمجھیں اور پھر جو تربیت کی توفیق آپ کو ملے گی وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ سارے بنی نوع انسان کی تربیت کی طاقت رکھے گی۔ اب یہ بات بھی بہت اہم ہے سمجھنے والی کیوں کہ ہر انسان اگر اپنے مزاج کے مطابق تربیت کرے یا اپنے قومی مزاج کے حوالے سے تربیت کرے تو اپنی قوم کا مزاج کسی حد تک درست کرسکتا ہے مگر دوسری قوموں کا مزاج درست نہیں کرسکتا اس کے لئے عالمی مزاج کی ضرورت ہے اور عالمی رسولؐ کے تابع ہو کر عالمی مزاج پیدا کئے بغیر آپ بنی نوع انسان کی بحیثیت بنی نوع انسان تربیت کرنے کے مستحق نہیں ہو سکتے بلکہ آپ کی تربیت نسبتی رہے گی۔ ایک قوم کی تربیت کر رہے ہیں دوسری کی بگاڑ رہے ہیں۔ ایک قوم کا حق ادا کر رہے ہیں دوسرے کا چھین رہے ہیں۔

تو عالمی حوالہ ضروری ہے تربیت کے لئے اور جب عالمی حوالے کی بات کریں گے تو ایک ہی حوالہ ہے یعنی حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ جنہوں نے اللہ کے بعد اس دنیا میں اللہ کی ان صفات حسنہ کو اپنا لیا کہ گویا ایک خدا نما وجود بن گئے۔ خدا تو نہیں تھے مگر آپؐ کی صفات میں خدا دکھائی دینے لگا اس لئے آپؐ کی اطاعت لازم ہے۔ ورنہ براہ راست اللہ کی اطاعت کا حکم ہوتا تو بظاہر بہت اچھی بات ہوتی کہ بس اللہ کی اطاعت کرو، کیا پتا اللہ کی اطاعت کیسے ہوتی ہے، کیسے کریں گے؟ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق اللہ کو جو سمجھتا ہے وہی کرتا پھرتا ہے تو قرآن کریم نے یہ احتیاط برتی اور بڑی سختی کے ساتھ اس پر کاربند رہا اور ہمیشہ کے لئے کاربند ہے، اللہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو جوڑا ہے جب بھی اطاعت کی بات ہوئی ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ اور یہ بتانے کے لئے کہ تمہیں محمد رسول اللہ ﷺ کو سمجھے بغیر، آپؐ کی صفات پر غور کئے بغیر، آپؐ کے حوالے کے بغیر اللہ کی اطاعت

کا مضمون سمجھ آ ہی نہیں سکتا اس لئے ان سے سیکھو، ان کے پیچھے چلو پھر تم پر ہر مضمون روشن ہو جائے گا خواہ وہ تقویٰ کا ہو، رحمت کا ہو اور بنی نوع انسان سے تعلقات کا مضمون ہو یعنی اس مضمون کو جس دائرے پر پھیلاؤ گے سختی کا مضمون ہو، شفقت اور رحمت کا نرمی کا مضمون ہو ہر مضمون آنحضرت ﷺ کے حوالے سے انسان پر روشن ہوتا چلا جائے گا۔

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اب متقین سے جو بات شروع ہوئی ہے وہ محسنین پر جا پہنچی ہے۔ متقی میں غلط باتوں سے بچنے کا مضمون زیادہ پایا جاتا ہے یعنی ایک شخص جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے یا جو خود دوسرے سے نقصان نہ اٹھائے۔ محسن کا مطلب یہ ہے کہ وہ احسان کرتا چلا جاتا ہے ہر طرف۔ یعنی نقصان تو درکنار اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا مگر محض یہی اس کا تشخص نہیں ہے وہ ایک محسن کے طور پر ابھرتا ہے اور ہر طرف احسان پھیلاتا چلا جاتا ہے اور سراء اور ضراء والے مضمون نے اس احسان والے مضمون کو پہلے ہی کھولا تھا مگر وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ نے اس کو ایک اور عظمت بخش دی۔ فرمایا تم کرو گے جنت کی خاطر، یہ بھی ایک چیز ہے مگر جو اعلیٰ درجے کے مومن ہیں وہ اللہ کی محبت کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ہمیں تو نیکیوں کا مزہ ہی اس بات میں آتا ہے کہ اللہ کی محبت ملے۔ فرماتے ہیں اگر اللہ کی محبت کا چسکا پڑ جائے تو نیکیوں کی اگر یہ سزا ہوتی کہ اللہ کی محبت تو ملے گی لیکن جہنم کی تکلیفیں بھی ہوں گی تو ہم خوشی سے جہنم قبول کر لیتے۔ پس یہ وہ مضمون ہے جو اپنے معراج کو پہنچایا گیا ہے یہاں۔ متقین سے بات شروع ہوئی، حقوق کی ادائیگی سے بات شروع ہوئی، حقوق تلف نہ کرنے کی بات شروع ہوئی، باوجود تکلیف اٹھانے کے لوگوں پر احسان کی بات شروع ہوئی، یہ سب تقویٰ کی باتیں ہیں یعنی تقویٰ سے پھوٹتی ہیں مگر اس میں حوالہ صرف یہ ہے کہ ہمیں جنت ملے۔ یعنی تقویٰ کی ترقی یافتہ حالتیں ہی احسان ہیں دراصل، مگر حوالہ جنت کا تھا۔ تم چاہتے ہو کہ وسیع جنت مل جائے، ساری کائنات پر پھیلی ہوئی تو، یہ کام کرنا۔ مگر اگر تم آنحضرت ﷺ کی غلامی میں عفو کے اور احسان کے اور برمحل غصے کے اور برمحل سزا کے مضامین سیکھ لو گے اور نیت یہ ہوگی کہ اس سے اللہ کی محبت نصیب ہو تو پھر تم محسن بن جانا یعنی ہمیشہ تمہاری طرف سے لوگوں کو احسان ہی پہنچے تب یاد رکھنا کہ اللہ محسنین سے محبت کرتا ہے تو یہاں حضور اکرم ﷺ کو ایک محسن اعظم

کے طور پر بھی پیش فرمایا گیا ہے جو دراصل رحمۃ للعالمین کی ایک دوسری صورت ہے۔

اب میں احادیث کے حوالے سے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات کے حوالے سے چند اور باتیں اسی مضمون سے تعلق رکھنے والی کھولتا ہوں۔ مسند احمد سے یہ روائیت لی گئی ہے۔ حضرت معاذ بن انسؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا

''سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ تو قطع تعلق کرنے والے سے تعلق قائم رکھے اور جو تجھے دیتا اسے بھی دے اور جو تجھے برا کہتا ہے اس سے تو درگزر کر''

(مسند احمد بن حنبل، مسند المكيين،حديث معاذ بن انس الجهنى،حديث 1591)

یعنی عفو کا مضمون ہے درگزر کرنے کے معنوں میں کہ برا کہتا ہے، بدلہ نہ لو اور برداشت کر جاؤ اور یہ برداشت کرنا عفو کی، یہی انتہائی غصے کو برداشت کرنے کی پہلی منزل بنتا ہے اس کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ ''جو تجھے نہیں دیتا اسے بھی دے'' یعنی اپنی عطا کو دوسروں سے لینے کے حوالے سے کبھی نہ باندھو چنانچہ قرآن کریم نے اس مضمون کو دوسری جگہ کھولا ہے۔ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (المدثر:7) اس وجہ سے کبھی احسان نہ کرو کہ تم زیادہ حاصل کرلو۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مضمون اس طرح بے نفسی کا مضمون ہے کہ خدا سے بھی توقع نہ رکھو بلکہ پھینک دو چیز۔ یہ غلط ہے کیونکہ تَمْنُنْ کے بعد تَسْتَكْثِرُ کی نہی ہے۔ اللہ پر تو آپ احسان کر ہی نہیں سکتے، ناممکن ہے۔ تو اسی کی عطا کے تابع ہے اس کی عطا سے باہر جا کیسے سکتے ہیں اس لئے اس سے اور بھی مانگیں تو تب بھی آپ اس کی عطا کے نیچے رہیں گے۔ پس جب اللہ فرماتا ہے کہ میری خاطر خرچ کرو گے تو تمہیں زیادہ ملے گا تو اس میں اگر کسی انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں خرچ کروں تا کہ اللہ مجھے زیادہ دے تو یہ بد خلقی نہیں ہے۔ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

تَمْنُنْ اور تَسْتَكْثِرُ سے اگر کوئی اس کو ٹکراؤ دکھائی دے سکتا ہے تو صرف ایک موقع پر۔ ایک انسان کسی پر احسان کرے اور اس وجہ سے صرف کرے کہ اللہ اسے زیادہ دے وہی چیز، تو یہ اعلیٰ درجہ کی نیکی نہیں رہے گی کیونکہ پھر جب خدا اس کو دنیا میں کچھ دے دے گا تو اس کا حساب پورا ہو گیا اس سے بھی زیادہ مل گیا اور بات ختم ہو گئی۔ تو اگر انسان اس وجہ سے خرچ کرے کہ رضائے باری تعالیٰ نصیب ہو تو وہی محسن والا مضمون وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یہ اس پر صادق آئے گا تو اگر چہ ظاہری

طور پر تو لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ کا مضمون یعنی احسان نہ کرو، کسی کو ممنون نہ کیا کرو اس نیت سے کہ تم زیادہ لو اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ جب تم بنی نوع انسان میں کسی کے ساتھ حسن سلوک کرو، کچھ اسے دو تو ہرگز اس سے زیادہ لینے کی کوئی بھی خواہش تمہارے دل میں نہ ہو۔ نمبر دو، اگر ہو تو اللہ سے لینے کی خواہش ہو کیوں کہ وہ تمہارے زیر احسان نہیں آ سکتا، مَنّ کے نتیجہ میں۔ مَنّ تم نے کسی اور پہ کی ہے، اللہ سے لے رہے ہو یہ جائز ہے، گناہ نہیں ہے مگر اگر نظر مادے پر ہی ٹھہر گئی اور مادی جزا ہی تمہارا مقصود بن گئی تو اتنا ہی ملے گا۔

چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے جو اللہ سے یہ کہتا ہے کہ مجھے اس دنیا کی حسنہ عطا کرے اسے دنیا کی حسنہ ہی ملتی ہے پھر، آخرت کی حسنہ نہیں ملتی اور مومنوں کو یہ سکھایا رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ:202) تو کبھی بھی اپنے احسان کو محض مادی فوائد کی توقع سے خواہ وہ خدا سے ہوں باندھا نہ کرو بلکہ اس کو ان سے وابستہ نہ ہی کرو تو بہتر ہے کیونکہ اگر بے تعلق کر لو گے مادی فوائد سے چاہے وہ خدا کی طرف سے عطا ہوں تو پھر تمہاری نظر زیادہ بلند ہو جائے گی اور مادی فوائد تو اللہ نے دینے ہی دینے ہیں اس لئے جو چیز بن مانگے مل جاتی ہے خواہ مخواہ اس میں مانگنے کی ضرورت کیا ہے اس چیز کو مطمع نظر بنانے کی کیا ضرورت ہے جو بغیر مطمع نظر بنائے اللہ نے اپنی طرف سے دے ہی دینی ہے۔ تو اسی لئے جب مومن کسی پر احسان کرتے ہیں اور وہ شکریہ ادا کرتا ہے تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ ان کو جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا شکریہ ادا نہ کرو۔ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوۡرًا (الدھر:10) ہم تم سے نہ جزاء چاہتے ہیں نہ شکریہ چاہتے ہیں کیونکہ یہ ہم نے جو کچھ کیا تھا یہ جزاء کے تصور سے کیا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے تصور سے کیا ہے۔ پس رضائے باری تعالیٰ اگر مقصود رہے تو شکریہ تو رکنے ہی نہیں ہیں، پھر بھی آئیں گے۔ شکریہ تو کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بنی نوع انسان کو ہدایت کر دی ہے کہ تم شکریہ ادا کیا کرو۔ اس لئے شکریہ کی مناہی نہیں ہے بلکہ شکریہ تو سکھایا گیا ہے، قبول کرنے کی مناہی ہے کیونکہ جو شکریہ قبول کرتا ہے اس کا نفس موٹا ہو جاتا ہے، اس کی نیت کی پاکیزگی میں فرق آ جاتا ہے اور اسے شکریوں کے ہی چسکے پڑ جاتے ہیں، انتظار کرتا رہتا ہے کہ میں نے یہ کیا تھا ابھی تک شکریہ کا خط نہیں آیا۔ ابھی تک اسے قبول نہیں کیا گیا اور یہ مجھے نہیں پتا چلا کہ

میرے زیر احسان آیا ہے کہ نہیں وہ شخص۔ یہ تصور ہی جھوٹا اور باطل ہے۔ شکریہ سے ایسے بے نیاز ہو جاؤ کہ جس کو اُردو میں یوں ظاہر کیا ہے ”نیکی کر دریا میں ڈال“ اس طرح نیکی کرو کہ گویا دریا میں غرق ہو گئی۔ پتا ہی نہیں پھر وہ گئی کہاں۔ انسانی لاشیں بھی نہیں ملتیں دریاؤں سے بعض دفعہ، نیکیاں کہاں ڈھونڈتے پھرو گے پھر۔ تو یہ وہ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کا مضمون ہے جس کا اس مضمون سے گہرا تعلق ہے کہ تم جب احسان کرو تو اس احسان کے بدلے میں نہ بندے سے جزاء چاہو، نہ اس لئے احسان کرو کہ اللہ تعالیٰ وہی مادی جزاء تمہیں اس دنیا میں دے دے، نہ اس لئے احسان کرو کہ وہ تمہارا شکریہ ادا کریں اور تمہارے نفس کو مطمئن کریں کہ ایک چیز تمہارے ہاتھ سے نکلی اس کی دوسری قدر تمہارے ہاتھ میں واپس آ گئی۔

پس حقیقت میں شکریہ کا مضمون ذات باری تعالیٰ کی خاطر نیکیوں سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ بنی نوع انسان بسا اوقات صرف اس لئے احسان نہیں کرتے کہ زیادہ ملے، اس لئے کہ ان کی طبیعتوں میں نفاست پیدا ہو چکی ہوتی ہے مادے کے مقابل پر وہ جوابی شکریہ اور جوابی محبت کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے بظاہر وہ بے لوث خرچ کر رہے ہیں مگر حقیقت میں بے لوث خرچ نہیں کیا کرتے۔ پنجابی کا محاورہ کئی دفعہ میں نے آپ کو سنایا ہے اور اس موقع پر پھر بھی یاد آ جاتا ہے کہ ”سُتے پتر دا منہ کی چُمناں“ مائیں کہتی ہیں جب بیٹا سویا پڑا ہے اس کا منہ چوم کے ہم کیوں اپنا وقت ضائع کریں اس کو پتا ہی نہیں لگتا تو ہمیں کیا فرق پڑتا ہے لیکن اللہ کی خاطر ستے پتر کے منہ بھی چومے جاتے ہیں۔

وہ بنی نوع انسان جو غافل ہے محمد رسول اللہ ﷺ اس کے بھی محسن بن گئے، ان کے لئے بھی بے انتہا رحمت بن گئے، ان کے لئے كَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ تھے جو ہر وقت آپؐ کو دکھ پہنچاتے تھے۔ وہ جن کے لئے كَاظِمُ الْغَيْظَ تھے، وہ وہ تھے جو ہر وقت آپؐ کو دکھ پہنچاتے تھے اور رحمت کا جو سلسلہ ہے وہ پھر بھی ان کے حق میں جاری رہا۔ اس طرح جاری رہا کہ ان کے حق میں جب اور کچھ پیش نہیں گئی تو دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ اگر عفو نے کام نہیں کیا، اگر درگزر نے کام نہیں کیا، اگر نصیحت نے کام نہیں کیا تو پھر باری تعالیٰ کے حضور جھک گئے۔ کہا اے خدا میں تجھ سے رحمت مانگتا ہوں میرے پیش نہیں جاتی، میرا بس نہیں چلتا۔ تو اس سے بڑا دنیا میں جیسا کہ محاورہ ہے ستے پتروں کے منہ چومنے والا اور ہو کون سکتا ہے، ناممکن ہے۔ مائیں تو پتر کا منہ بھی نہیں چومتیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ تو ان

کے منہ چومتے رہے اپنی رحمت کی وجہ سے جو غفلت میں سوئے ہوئے تھے اور جو آئندہ نسلوں میں کبھی پیدا ہونے تھے مختلف زمانوں میں، مختلف مکانوں میں، مختلف ممالک میں، مختلف رنگ و نسل میں۔ ان کے لئے بے قرار رہے، ان کے لئے دعائیں کرتے رہے تو یہ وہ رحمت کی عالمی حیثیت ہے جس کی جزاء لازماً یہ ہونی چاہئے کہ ایسی جنت کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کہ سارے زمین و آسمان پر وہ محیط ہو مگر یہ بھی کافی نہیں ہے کیونکہ یہ کرتے تھے تو رضائے باری تعالیٰ کی خاطر۔ اس لئے وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ سے بہتر کوئی عنوان نہیں ہو سکتا، کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔

پس آنحضرت ﷺ کی پیروی کے نتیجے میں لامتناہی ترقیات کے رستے کھلتے ہیں اور سب سے بڑی جزاء اللہ کی محبت کی جزاء ہے اس سے بڑی اور کوئی جزاء نہیں۔ تو محبت کی خاطر یہ کام کرو گے تو تھکو گے نہیں۔ ایک اور فائدہ اس کا یہ ہے اور اس مضمون پر بھی میں کئی دفعہ روشنی ڈال چکا ہوں مگر جیسا کہ مجھے رؤیا میں بتایا گیا کہ بعض چیزیں ہیں جو تکرار کی خاطر نہیں اصرار کی خاطر کرنی پڑیں گی۔ یعنی تکرار کرتے ہوا گر اس غرض سے کہ تمہارا اصرار ہو کہ تم نے ضرور یہ بات پہنچا کے چھوڑنی ہے تو یہ اصرار جائز اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے اور اسے تکرار نہیں کہا جا سکتا۔ تو اس پہلو سے میں آپ کو پھر سمجھاتا ہوں کہ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ نے ہمیں کوششوں کو آسان کرنے کی راہ بھی دکھلا دی ہے۔ یہ کام جو بتائے گئے ہیں بڑے مشکل کام ہیں غصے کی حالت میں بھی اپنے دل میں ضبط کرو اور پھر عفو کے تعلق میں بھی اس وقت درگزر نہیں کرنی جب خطرہ ہو کہ یہ درگزر کسی کو باغی بنا دے گی۔ کتنے باریک مضامین ہیں اور ہر شخص کی دسترس میں نہیں کہ ان کو پوری طرح سمجھ کر ان کا حق ادا کر سکے اور پھر دقتیں بھی بڑی ہیں اس راہ میں، غصہ برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ غصے کی حالت میں انسان بے اختیار دوسرے کو گالی دے جاتا ہے، تھپڑ مار دیتا ہے۔ دوسرے دن پھر آ کے معافی بھی مانگنی پڑتی ہے، فون بھی کرنے پڑتے ہیں کہ معاف کرنا کل غصے کی حالت میں ہم سے یہ ہو گیا تھا، اب آپ ہمیں معاف کر دیں تو اس سے تو معافی اس وقت مانگی جارہی ہے جب اس کا دکھ کا حال کچھ خود بخود ہی ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا ہے کہ غصے کی حالت میں تم معاف کیا کرو، اس وقت کوئی کلمہ نہ نکالا کرو تو کوئی آسان کام تو نہیں ہے مگر محبت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ اگر اللہ کی محبت کی خاطر ہو تو یہ چیزیں آسان ہوں گی۔ اگر جزاء کی خاطر ہوں تو پھر بھی کسی حد تک آسان

ہو جاتی ہیں مگر محبت میں تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ پیار کی خاطر سب سودے آسان ہو جاتے ہیں۔ سب قربانیاں معمولی اور ہلکی دکھائی دیتی ہیں اور اس کے نتیجے میں پھر کوئی چیز بڑی رہتی ہی نہیں خواہ جتنی بڑی قربانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو عاجزی کا آخری مقام نصیب ہوا ہے۔ آپؐ نے جو کچھ بھی کیا اللہ کی محبت میں کیا اور اللہ کی محبت کی جزاء اتنی زیادہ تھی کہ جو کیا وہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور جو تکلیفیں اٹھائیں وہ اس محبت کی وجہ سے آسان اور کچھ بھی نہ رہیں، باقی ہی نہ رہیں گویا کہ تو اس لئے جب حضور اکرمؐ راتوں کو کھڑے ہو کر ساری ساری رات خدا سے بخشش طلب کیا کرتے تھے، فضل مانگا کرتے تھے تو یہ مضمون ان کو سمجھ آ ہی نہیں سکتا جو اس محبت کے مضمون اور اس عجز کے مضمون کو نہ سمجھیں جو محبت کے نتیجے میں پیدا ہونا لازم ہے۔ اللہ سے محبت کی خاطر جو کچھ کیا، کیا اور محبت کی جزاء ایسی نازل ہوئی کہ آپؐ کے سارے وجود کو اس نے لپیٹ لیا۔ ساری زندگی محمد رسول اللہ ﷺ کی خدا کی گود میں پلی ہے تو پھر جو کچھ کیا تھا وہ تو لگتا تھا کچھ بھی نہیں ہوا، تکلیف کون سی پہنچی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اس مضمون کو یوں بیان فرماتے ہیں:

ابتداء سے تیرے ہی سایہ میں میرے دن کٹے
گود میں تیری رہا میں مثلِ طفلِ شیر خوار (درثمین: 126)

تو نے تو مجھے گود سے اتارا ہی کبھی نہیں۔ جس طرح ایک دودھ پیتا بچہ ہے وہ ماں کی گود میں رہتا ہے اور وہی اس کی جنت ہے میں اس تیری گود میں پلا ہوں، غیر کے دکھ مجھے پہنچ ہی نہیں سکتے تھے یعنی پہنچے تو بے ضرر ہو کر پہنچے۔ تیری حفاظت میں مجال تھی کسی غیر کی کہ مجھے حقیقی دکھ پہنچا سکے، پہنچاتے رہے مگر تیری محبت ان کو رحمت میں تبدیل فرماتی رہی اور تسکین قلب میں تبدیل فرماتی رہی۔

پس محبت کے مضمون کو سمجھ کر اس راہ میں قدم آگے بڑھائیں گے تو ہر مشکل آسان ہوتی چلی جائے گی اور ہر مشکل کی جزاء ملتی چلتی جائے گی ورنہ غصے کو گھونٹنا بڑا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ مجھ سے ایک شخص نے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اسلام نے جو یہ تعلیم دی ہے تو بڑی مصیبت ہے اس سے تو کئی قسم کی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی کہ تم اپنے غصے ضبط کرو، اپنی خواہشات ضبط کرو۔ تو وہ نفسیات کا ماہر تھا اس نے کہا ہم جانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے انسان کو طرح طرح کی نفسیاتی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا ان کو ہوتی ہیں جو غصے ضبط کرتے ہیں جو

اپنے نفس کی خاطر کچھ کرنے سے محروم رہتے ہیں تو احساس محرومی ہے اور ایک غصہ اتارنے کا موقع ہے مگر مجبوری سے ضبط کیا جاتا ہے اور اتر تا نہیں ان کو بیماریاں لگا کرتی ہیں۔ جو بالا رادہ غصہ ضبط کرتے ہیں ان کو بیماریاں نہیں لگا کرتیں۔ پس جو کھولتے رہتے ہیں دل چاہتا ہے کہ غصے کو اتارنے کا موقع ملے تو پھر ہم یوں ڈسیں اور یوں بدلے اتاریں وہ ذہنی مریض ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے اگر نفسیات نے، میں نے کہا، آپ کو یہ پڑھایا ہے تو غلط پڑھایا ہے، بالکل غلط ہے انسانی نفسیات کا یہ نظریہ کہ اپنے شوق سے، دسترس رکھتے ہوئے، چاہتے ہوئے آپ اپنا ہاتھ روک لیں تو آپ نفسیاتی مریض بن جائیں گے۔ نفسیاتی مریض نہیں ہوں گے بلکہ آپ کی نفسیات کو ایک مزید طاقت عطا ہوگی اور انسانی نفس جو بھی جس چیز کا بھی آپ نام رکھتے ہیں وہ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے اس سے۔ اس کو مزید حوصلے ملتے ہیں مگر اس کو چھوڑ بھی دیں تو جو رضائے باری تعالیٰ نصیب ہو رہی ہے اس نے احساس محرومی کون سا رکھا ہے باقی۔ اگر ضبط اللہ کی خاطر ہے اگر کسی نعمت کو حاصل کرنے سے آپ ویسے ہی رک جاتے ہیں خدا کی خاطر، چاہتے ہوئے، دسترس رکھتے ہوئے رک جاتے ہیں اس کی جزاء تو مل گئی ہے اور جزاء اس سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے کیونکہ یہ طوعی زندگی ہے، مجبوری کی زندگی نہیں۔ طوعی زندگی کے مضامین ہی مختلف ہیں جب آپ ایک چیز چھین سکتے ہیں کسی سے اور نہیں چھینتے تو اس سے احساس محرومی نہیں پیدا ہوتا اور اگر اس لئے نہیں چھینتے کہ جو دیکھ رہا ہے آپ کو وہ آپ سے زیادہ پیار کرے گا تو احساس محرومی تو درکنار آپ کو اس کے بالکل برعکس اس چیز سے بڑھ کر پیار اور محبت کی دولت مل جاتی ہے تو آپ کو نفساتی بیماری کس چیز کی لگے گی۔ تو اس قسم کی نفسیاتی بیماریوں کے تصور کو پاؤں تلے پامال کرتے ہوئے محمد رسول اللہ ﷺ کے صراط مستقیم پر آگے بڑھیں اور ایک ایک کر کے یہ اخلاق آنحضرت ﷺ سے سیکھیں جن کی تفاصیل قرآن نے خوب کھول کر بیان کر دی ہیں اور حدیثوں نے بھی اس مضمون کو محفوظ کر دیا ہے، اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عفو سے پہلے دل کا قوی ہونا ضروری ہے۔ جسے اپنے غصے پر قابو نہیں وہ غیروں سے عفو سے پیش آ ہی نہیں سکتا۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 20 / دسمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(الاعراف: 200، 201)

پھر فرمایا:

ان آیات کے متعلق جو عفو اور درگزر اور نیک باتوں کے حکم سے تعلق رکھتی ہیں ان کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جماعت احمدیہ فجی کا سالانہ جلسہ آج شروع ہو رہا ہے اور دو یا تین دن تک جاری رہے گا۔ انہوں نے درخواست کی تھی کہ چونکہ بعض نئی جماعتیں جو فجی میں پیدا ہوئی ہیں وہ بھی اس جلسے میں شریک ہو رہی ہیں اور خدا کے فضل سے دور دور کے جزائر سے بھی لوگ آئے ہوئے ہیں اس لئے فجی کا ذکر اگر اس خطبہ میں ہو جائے تو ان کی دلداری کا موجب بنے گا اور حوصلہ افزائی کا موجب بنے گا۔ تو میں تمام دنیا کی جماعتوں کی طرف سے فجی کے احمدیوں کو اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ کہتا ہوں اور خصوصاً ان نئے مہمانوں کو جو احمدیت میں داخل ہوئے ہیں اب مہمان نہیں بلکہ گھر والے بن گئے ہیں ان کو اَهْلًا وَّ سَهْلًا وَّ مَرْحَبًا کہتا ہوں۔

یہ آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں وہی مضمون نسبتاً مختلف زاویہ سے بیان ہوا ہے جو پہلے بھی خطبات میں پیش کرتا رہا ہوں۔ خُذِ الْعَفْوَ عفو کو پکڑ بیٹھ، مضبوطی سے اس پر قائم ہو جا لیکن اس کے ساتھ ہی وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ اور اس کے ساتھ معروف طور پر جو اچھی باتیں ہیں ان کا حکم بھی دیتا رہ، ان کو نصیحت کرتا رہ۔ عفو کا جو مضمون میں پہلے بیان کر چکا ہوں وہی اس لفظ عفو میں شامل ہے یعنی درگزر ان معنوں میں کرنا کہ گویا کوئی چیز واقع ہوئی نہیں۔ دوسرے اس کو اس طرح دور کرنے کی کوشش کرنا کہ جو شخص کسی خطا کا مرتکب ہوا ہو اس کے دل سے وہ خطا مٹ جائے۔ پس عفو میں اصلاح کا جو معنی ہے یہ قرآن کریم کی آیات سے قطعی طور پر ثابت ہے اور احادیث نبویہ سے بھی اس مضمون کو تقویت ملتی ہے کہ عفو میں پہلے برائی کو صاف کر دینا دو طرح سے ہے یعنی اپنے دل پر اس کی میل نہ لانا اور اپنے دل کو ایسے شخص سے دور نہ ہٹنے دینا۔

دوسرا توجہ کی وجہ سے اور پیار اور حکمت کے ساتھ اس بدی کا نقش اس کے دل سے محو کر دینا اور ایسا محو کر دینا گویا وہ تھی ہی نہیں۔ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ میں یہ مضمون ہے جو بیان ہوا ہے کہ عفو ایسی کہ نہ اپنے دل پر میل آئی نہ دوسرے دل پر میل رہنے دی اور اس کے نتیجہ میں اصلاح لازماً طبعی طور پر ہو گی۔ اس عفو کے بعد پھر مثبت تعلیم کی ضرورت ہے اور عرف کی طرف بلانا کہ جب تم کمزوریوں سے پاک ہوئے ہو تو پھر کچھ مثبت قدم نیکیوں کی طرف بھی بڑھاؤ۔ یہ وہ پہلو ہے جس پہ ہمیں اپنی اولاد کے تعلق میں بھی ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے اور اپنے ماحول کے تعلق میں بھی ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے کہ جب بھی کوئی خطا ہو اس خطا سے اس طرح عفو کیا جائے جیسا کہ پہلے خطبات میں میں بیان کر چکا ہوں اور پھر اس عفو کے ساتھ ہی اس طرف توجہ ہو کہ عفو کا انداز ایسا ہو کہ آپ ہی کے دل سے میل نہ مٹے بلکہ بدی کرنے والے کے دل سے بھی میل مٹ جائے اور اصلاح کا ایک طبعی نتیجہ اس سے ظاہر ہو۔ جب یہ ہو تو پھر نیکیوں میں آگے قدم بڑھانا ضروری ہے کیونکہ اگر اسی حال پر چھوڑ دیا جائے تو ایسے لوگ پھر واپس اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ سکتے ہیں مگر جب نیکی کا مزاج پیدا ہو جائے اور اس وقت حکمت کے ساتھ اس شخص کو جس کے دل میں ایک نرمی پیدا ہوئی ہے اور نیک بننے کی طرف توجہ پیدا ہوئی ہے اس کو ہاتھ پکڑ کر کچھ قدم آگے نیکی میں بڑھانا یہ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ کے تابع آتا ہے۔

پس آنحضرت ﷺ کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ ایسا عفو کرو جس کی وضاحت میں آنحضور ﷺ

کے ارشادات کی روشنی میں کر چکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی نیکی پر آگے بڑھادو تا کہ پہلے مقام کی طرف لوٹنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے کیونکہ بعض صورتوں میں جب جہلاء کے ساتھ آپ یہی معاملہ کرتے ہیں تو وہ غلط ردّ عمل دکھاتے ہیں اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ تبلیغ میں ہر قسم کی تکلیف اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جب آپ ان کو نیکیوں کی طرف بلاتے ہیں تو اس کے ردّ عمل میں پھر وہ آپ کو ایسی تکلیف پہنچاتے ہیں جو بعض دفعہ جذباتی اور بعض دفعہ بدنی ہوتی ہے۔

ایسی صورت میں فرمایا اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ جب جہلاء سے یہ معاملہ کرو گے تو اس کے نتیجہ میں تکلیفیں پہنچیں گی لیکن اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جہلاء کو نظر انداز کر دو، ان سے منہ موڑ لو اور یہ احتمال ہے کہ بعض لوگ یہی معنی سمجھ بیٹھیں۔ جاہلوں سے منہ موڑنے کی ان معنوں میں قرآن کریم میں کہیں تعلیم نہیں ہے کہ ان کی اصلاح کی کوشش کئے بغیر ان سے منہ موڑ لو۔ ان کی جہالت کا علم اصلاح کی کوشش کے ساتھ ایک لازمی تعلق رکھتا ہے اور قرآن کریم میں بکثرت ایسی آیات ہیں، جن میں جہالت کا علم پہلے سے سوچ کر نہیں حاصل کیا جاتا ہے کہ یہ شخص جاہل ہے، اس کو نصیحت نہیں کرنی، اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کرنی، بلکہ ہمیشہ بلا استثناء جہالت کا علم اس صورت میں ہوتا ہے کہ انسان، خصوصاً خدا کے نبی ایک قوم کی جہالت دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر ان میں سے بعض ان سے جاہلانہ طریق پر پیش آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کی جہالت علم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پس عرب قوم کی جہالت کو آنحضرت ﷺ نے جس طرح دور فرمایا اگر اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ کا یہ مطلب لیا جاتا کہ جاہلوں سے کنارہ کشی کر جاؤ، ان کی طرف پیٹھ پھیر کر ایک طرف الگ ہو جاؤ تو عرب میں وہ عظیم انقلاب کیسے برپا ہوتا جس نے جاہلوں کی کایا پلٹ دی۔ پس یہ مفہوم غلط ہے کہ ان سے شروع ہی سے اعراض کرو ہاں جب نصیحت کر بیٹھو تو پھر اعراض کرو اور پھر ان کے ساتھ ضد نہ کرو کیونکہ وہ لوگ جو فطرتاً بدتمیز ہوں، جو نیکی کے نتیجے میں بدی پہنچا رہے ہوں ان سے پھر بار بار سر ٹکرانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نسبتاً نیک فطرت لوگوں کی تلاش کرو۔

چنانچہ اس کے معاً بعد فرمایا وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ تم تو نیکی کی تعلیم دو گے ان کی بھلائی کی بات کر رہے ہو گے مگر شیطان کی طرف سے اگر تمہیں يَنۡزَغَنَّكَ یعنی ضرور ایسا ہو گا کہ ایسا بعض صورتوں میں ہو گا۔ چنانچہ نون ثقیلہ جب شَدّ کے

ساتھ آتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ بعض صورتوں میں ایسا ضرور ہوگا کہ شیطان تمہیں تکلیف پہنچائے گا اور نَزْغٌ کہتے ہیں چھبونے کو خواہ دل کا کچوکہ لیا جائے یا جسم کا، نیزے کی انی سے چبھویا جائے یا زبان کی نوک سے دل کو زخم پہنچایا جائے دونوں صورتوں میں یہ نَزْغٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پس جب تو ایسی باتیں کرے گا تو مقابل پر نہایت ہی بدتمیزی کی، دل کو تکلیف پہنچانے والی باتیں سننی پڑیں گی اور پھر جسمانی طور پر بھی ایذا رسانی کی کوشش کی جائے گی اس صورت میں فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کیونکہ اللہ کی خاطر تو نے یہ جہاد شروع کیا ہے پس اللہ کی پناہ مانگ اور اللہ کی پناہ میں آجا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس حوالے سے فرماتے ہیں۔ یہ دراصل ایک قطعی وعدہ ہے آنحضور ﷺ کو کہ اس کے نتیجہ میں مَیں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا کیوں کہ جو تکلیفیں ہیں ان کی چارہ گری بھی خدا فرمائے گا اور ان کے گزند سے محفوظ رکھنے کے انتظام بھی خدا تعالیٰ فرمائے گا۔ پس اگرچہ ایک تکلیف پہنچتی تو ہے مگر اس کے مقابل پر خدا کی طرف سے اتنے پیار کا اظہار ہو جاتا ہے کہ گویا وہ تکلیف کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون کو بارہا نظم میں اور نثر میں پیش فرمایا ہے مثلاً:

ہیں تری پیاری نگاہیں دلبرا اک تیغ تیز
جن سے کٹ جاتا ہے سب جھگڑا غم اغیار کا (درثمین اُردو:10)

تو تیغ تیز سے کاٹا ہے تو غم اغیار کو کاٹا ہے یعنی ایسی جو اپنوں کے لئے پیار اور بھلائی کا موجب بن جائے اپنوں کے لئے مرہم کا کام دے یہ مضمون ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلی بار اس طرح بیان فرمایا کہ اس کی اور کوئی مجھے مثال دکھائی نہیں دیتی کہ تیغ سے مرہم کا کام لیا۔

ہیں تری پیاری نگاہیں دلبرا اک تیغ تیز

پیار کی نگاہیں تیغ تیز کیسے ہوگئیں؟

جن سے کٹ جاتا ہے سب جھگڑا غم اغیار کا

تو دل میں جو کچھ بھی میل آجاتی ہے لوگوں کے دکھوں سے، کوئی غم اغیار کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے دل کے اندر، اس سب کو تیرے پیار کی نگاہیں کاٹ کے پھینک دیتی ہیں۔ پس یہ وہ مضمون ہے فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کا جو آنحضرت ﷺ کے حق میں ایک قطعی وعدہ تھا اور حضرت مسیح موعود

علیہ السلام نے یہی تشریح فرمائی ہے جو بڑی شان کے ساتھ پورا ہوا ہے۔ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ وہ تیرے حال کو جانتا بھی ہے اور سننے والا بھی ہے۔ سننے والے کا ذکر پہلے فرمایا کہ جب تیرے دل سے کوئی ہوک اٹھے گی تو خدا ضرور اسے سنے گا تو خدا کی نگاہوں سے پردے میں نہیں ہے نہ اس کے علم سے باہر ہے اور علیم ہے تو ظاہر نہ بھی کرے تو خدا کو علم ہے کہ تیرے دل پر کیا گزرتی ہے۔

یہ وہ نصیحت کی راہ کی مشکلات ہیں جن سے ہمیں خوب اچھی طرح آگاہ ہونا چاہئے اور جن سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد پھر اس میدان میں اس احتمال کو پیش نظر رکھ کر قدم رکھنا ہے۔ یہ تکلیفیں تو راہ میں آئیں گی، یہ کانٹے تو چبھوئے جائیں گے مگر اس کے نتیجہ میں قرب الٰہی مانگو تو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔ پیغام کا حق ادا کر دیا اور اللہ کا قرب عطا ہو گیا اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت حاصل کی جاسکتی ہے یا اس سے بڑھ کر اس فعل کی اور کیا بہتر جزاء، یوں کہنا چاہئے تھا اس سے بہتر اور کس بہتر جزاء کی توقع کی جاسکتی ہے۔ چھوٹا سا کام معمولی سی چوب اور رضائے باری تعالیٰ ایسی کہ تمہیں اپنی پناہ میں لے لے، اپنی گود میں اٹھالے اور پھر جو زخم پہنچا دل داری کر کر کے اس زخم کی تکلیف کو بے انتہا روحانی لذّتوں میں تبدیل فرمادے۔

اس مضمون پر آنحضرت ﷺ کی احادیث اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات کے اقتباسات میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو عفو کے لئے جس دل گردے کی اور حوصلے کی ضرورت ہے وہ تکلیف کو صبر سے برداشت کرنے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ عفو کے بعد اور نصیحت کے بعد جو تکلیفیں پہنچیں گی انہیں برداشت کرو تو تم دل کے قوی اور مضبوط ہو۔ آنحضرت ﷺ نے عفو سے پہلے دل کا قوی ہونا ایک شرط قرار دیا ہے اور یہی حقیقت ہے اور یہی گہری انسانی فطرت کا راز ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے اور یہ حدیث بخاری کتاب الأدب (باب الحذر من الغضب) سے لی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا طاقتور پہلوان وہ شخص نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے۔ طاقتور پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے۔ پس غیر کی طرف سے ضرر کا تو ابھی سوال پیدا نہیں ہوا ابھی آپ کے اندرونی ردّ عمل کی بات ہو رہی ہے اور عفو اس حالت میں ممکن ہی نہیں کہ انسان اپنے نفس پر قابو نہ پاسکے۔ جسے اپنے غصے پر عبور نہیں ہے وہ

غیروں سے عفو سے کام لے ہی نہیں سکتا۔ غصے کی حالت میں تو انسان بے اختیار ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ بعد میں بعض دفعہ عمر بھر پچھتانا پڑتا ہے کہ کس قدر ظالمانہ بات کر بیٹھا۔ تو عفو کا آغاز ہی اس پہلوانی سے ہوتا ہے جو نفس کے اندر کام کرتی ہے۔ انسان اپنے جذبات پر ایسی قوت کے ساتھ قبضہ کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی وہ عام تاب و طاقت نہیں رکھتا اس کی بدنی طاقت ہے اس کی روحانی طاقت ہے اور آنحضرت ﷺ نے عفو کے آغاز کی کہانی پیش فرما دی۔ عفو کے سفر پہ چلو گے تو یہ زادِ سفر ساتھ رکھنا۔

غصہ پر قابو کرنے کا فن سیکھو اس کی مہارت حاصل کرو پھر اس کام پر نکلو اور یہی وہ سب سے بڑی بلاء ہے جس نے دنیا میں ہر طرف فساد برپا کر رکھا ہے اور جماعت احمدیہ میں بھی سب سے زیادہ مصیبت اسی غصے پر قابو نہ پانے کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے جو گھروں کو برباد کر دیتی ہے، جو معاشرے کو تباہ کر دیتی ہے جو جماعت کے امن کو اٹھا دیتی ہے، ایسے ایسے جرائم پر منتج ہوتی ہے جس کے نتیجے میں پھر عمر بھر ایک خاندان نہیں دوسرا خاندان بھی، ان کے تمام عزیز و اقارب بھی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں، جماعت کے لئے بھی وہ ایک انتہائی تکلیف کا موجب بن جاتے ہیں۔ معصوم لوگ جن کا حقیقت میں کوئی قصور بھی نہیں ہوتا اس جہل کے غصے کا شکار ہو جاتے ہیں اور عمر بھر ان کے پیار کرنے والے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔

تو عفو سے پہلے اس حالت پر غور کرو جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے بڑی حکمت سے توجہ دلائی کہ پہلوان تو وہ ہے جو اپنے غصے پر اس وقت جبکہ غصہ جوش کی حالت میں ہو، اس وقت قابو پا لے اور اس کی باگیں ہاتھ سے چھوڑے نہ اور طنابیں کھینچ کر رکھے مضبوطی کے ساتھ تا کہ یہ جو صبر کا ایک خیمہ سا انسان بنا رکھتا ہے اپنے لئے جس کے اندر وہ محفوظ رہتا ہے اس کی طنابیں ٹوٹیں تو صبر کا سارا خیمہ ہی اکھڑ گیا اور انسان پھر کوئی پناہ نہیں پاتا۔ تو غصے سے بچنے کے لئے کردار کی مضبوطی اور طاقت، اپنے غصے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رکھنا، اپنے صبر کے خیمے کی حفاظت کرنا، کیونکہ صبر کے خیمے کے اندر ہی انسان رہے تو وہ بلاؤں سے بچتا ہے ورنہ نہیں بچتا۔

یہ وہ مضمون ہے جو حضور اکرم ﷺ نے ہمارے سامنے کھولا اور اپنا آنحضرت ﷺ کا جو کردار تھا اس سے پتا چلتا ہے کہ غصے کی وہ حالت پیدا ہی نہیں ہوتی تھی اور یہ وہ خاص طور پر قابلِ توجہ بات ہے کہ وہ انسان جو غصے پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے رفتہ رفتہ ان حالات میں جب دوسروں کو

غصہ آتا ہے اس کو غصہ آتا ہی نہیں اور یہ شیطان اس طرح مٹتا ہے جب آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے تو یہ مراد تو نہیں کہ ہر وقت نفس امارہ سے لڑائی ہو رہی ہے ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے دل سے ایک غصے کا جذبہ اٹھتا ہے اور پھر آپؐ اس سے لڑتے ہیں اور اسے زیر کر لیتے ہیں۔ یہ تو ابتدائی سفر ہے مومنوں کو سکھانے کے لئے۔ وہ شخص جو اس میں کامیاب ہوتا ہے اس کی کامیابی کی علامت یہ ہے کہ جن عام جگہوں پر لوگوں کو غصہ آجاتا ہے اسے آتا ہی نہیں اور حلم اس سے پیدا ہوتا ہے۔

کئی دفعہ جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا گھر میں معمولی سا نقصان ہو جاتا ہے اور بعض لوگ بھڑک اٹھتے ہیں شور پڑ جاتا ہے یہ کیا ہو گیا اس نے فلاں چیز توڑ دی، یہ نقصان پہنچا دیا۔ جن کو خدا تعالیٰ غصہ ضبط کرنے کی توفیق عطا فرما دیتا ہے رفتہ رفتہ ان میں حلم پیدا ہو جاتا ہے ان میں کسی قسم کا کوئی اشتعال پیدا ہی نہیں ہوتا بڑے سکون کے ساتھ، آرام سے انہی چیزوں کو دیکھ رہے ہیں جس کے نتیجہ میں دوسرے دلوں میں ہنگامے برپا ہو رہے ہوں۔ حیرت سے دیکھتے ہیں ان کو ہو کیا گیا ہے پاگلوں کو، سمجھاتے ہیں بس کرو خدا کا خوف کرو، ہو کیا گیا ہے چھوٹی سی چیز ضائع ہوئی ہے ایک برتن ٹوٹا ہے اس کے مقابل پر تم دل توڑ دو گے اور ہمیشہ کے لئے توڑ دو گے۔

تو یہ وہ مضمون ہے جو آنحضرت ﷺ کی نصائح اور سیرت سے مکمل ہوتا ہے ایک موقع پر، یہ بھی بخاری ہی کی روایت ہے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی بدو مسجد نبوی میں آکر پیشاب کر گیا یا کر رہا تھا لوگ پہنچے وہ رسول اللہ ﷺ بھی دیکھ رہے ہیں صحابہؓ بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس میں جہالت کی یہ حالت تھی اس کی کہ ان کے سامنے بیٹھا ایک طرف مسجد نبوی میں پیشاب کر رہا ہے جہاں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ صحابہؓ بیان کرتے ہیں یہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ یوں کھڑے ہوئے جیسے اس پر بپھر کر ٹوٹ پڑیں گے اس کے ٹکڑے اڑا دیں گے اس قدر ان کو طیش آیا اور پھر خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یہ فعل تو ان کے جذبات میں ایک غیر معمولی اشتعال پیدا کر گیا۔ آنحضرت ﷺ اس طرح بغیر کسی تحریک دل کے، بغیر کسی گھبراہٹ، کسی بے چینی کے، کسی ردعمل کے اس طرح کھڑے کے کھڑے رہے۔ فرمایا یہ کیا کر رہے ہو چھوڑو اس کو۔ ایک یا دو ڈول پانی کے بہا دو، تمہارا جو گند ہے وہ صاف ہو جائے گا۔

(صحیح بخاری کتاب الأدب ،باب قول النبیؐ یسروا ولا تعسروا)

اب اس میں حلم بھی ہے اور یہ بھی ہمیں سمجھایا گیا ہے کہ ردّعمل جب ایک دفعہ ایک چیز کا غلط شروع ہو جائے تو پھر اس پر قابو پانا واقعی مشکل ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زیر تعلیم، زیر تربیت صحابہؓ جو آپ سے نئے اخلاقی رنگ سیکھ رہے تھے ان کے اندر جب غصے کی حالت پیدا ہوئی ہے تو قابو نہیں رہا اور بہت کم لوگ ہیں جن کو غصے کی حالت پر قابو کا اختیار رہتا ہے لیکن اگر آپ کوشش کریں تو پھر ان حالتوں میں غلط ردعمل پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اسی چیز کو رسول اللہ ﷺ بھی دیکھ رہے تھے بڑے آرام سے فرمایا، پانی بہا دو اور اس کے بغیر حل تھا بھی کچھ نہیں۔ اگر ایسے آدمی کو مارا جاتا، اس کو ذلیل کیا جاتا اور اسے گالیاں دی جاتیں، دھکے دے کر باہر نکال دیا جاتا وہ پیشاب کیسے صاف ہو جاتا وہ گند تو اسی طرح رہنا تھا۔ تو فرمایا حکمت سے اس چیز کے ازالے کی کوشش کرو جو بدی ظاہر ہو گئی ہے بجائے اس کے کہ سزاؤں کی طرف دوڑو اور وہ سزائیں جائز اس لئے نہیں کہ ایک آدمی کی غافلانہ حالت کے نتیجے میں ایک جرم ہوا ہے۔ یہ بھی ایک بہت اہم بات ہے کہ ہر بدی کا فعل ہر شخص سے ایک طرح صادر نہیں ہوتا۔ بعض لوگ شرارت کی رو سے، گزند پہنچانے کی خاطر یا ذلیل کرنے کی خاطر یا اور کئی طریقے سے غیرت اکسانے کی خاطر بعض کام کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر نظر کی آپؐ جانتے تھے کہ سادہ آدمی ہے، بے وقوف ہے بے چارہ، اس کو پتا ہی کچھ نہیں صفائی ہوتی کیا ہے، اس کو یہ بھی نہیں پتا کہ احترام کے کیا تقاضے ہیں ایسے شخص کو مارنا بالکل لغو اور بے ہودہ بات ہے۔

ایک اور موقع پر مسجد میں ایک شخص نے نماز کی حالت میں کسی غلطی کی طرف توجہ دلانے کے لئے اپنی رانوں پر زور زور سے ہاتھ مارنے شروع کئے اور ایسی حالت میں شور ڈال دیا رانوں پہ ہاتھ مار مار کے وہ تماشہ سا ہو گیا۔ صحابہؓ کہتے ہیں جب نماز ختم ہوئی ہمارا یہ حال تھا کہ ہماری آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے۔ وہ کانپ رہا تھا مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف جب نگاہ پڑی ہے ساری فکریں دور ہو گئیں، سب غم دھل گئے، کتنے پیار سے دیکھ رہے تھے اس کو، اس محبت اور اس شفقت کے ساتھ فرمایا بھئی اس طرح نہ کیا کرو جب کوئی غلطی دیکھو **سبحان اللّٰہ** پڑھا کرو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ (ماخوذ از صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ۔۔۔)

تو وہ شخص جس کی آزمائش مختلف قسم کی تکلیفوں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے اور اس کا ردّعمل خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہے جس کا ردّعمل خدا کے تابع اپنے رنگ نکالتا ہے کبھی غصہ بھی آتا

ہے اس کو مگر بے محل نہیں ہوتا اور اکثر شفقتیں اس کی تکلیفوں پر پردے ڈال دیتی ہیں اور اتنا کہ گویا اسے تکلیف ہوتی ہی نہیں تو اللہ کی پناہ میں آنے کا ایک یہ بھی مطلب ہے۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کا یہ بھی مضمون ہے جسے آپ سمجھیں کہ جب آپ خدا کی پناہ مانگتے ہیں خدا سے تو خدا وہ پناہ دیتا ہے اور جب پناہ دیتا ہے تو بہت سی تکلیف کے مواقع سے آپ بچ نکلتے ہیں۔ لوگوں میں ہیجان پیدا ہو رہا ہے، لوگوں کے جذبات میں ایک قیامت برپا ہوگئی ہے آپ بڑے سکون کے ساتھ انہی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور ایسے پیار اور محبت سے برائی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو گہرا اثر دکھاتی ہے۔ پھر یہ بات ''ڈول بہا دو'' فرما کر آپ ؐ نے فرمایا تمہیں آسانی پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں۔ اے امت مسلمہ! تم بنی نوع انسان کی آسانی کے لئے پیدا کئے گئے ہو ان کے لئے سہولتیں پیدا کرو ان کے لئے تنگیاں پیدا نہ کرو۔

پس نیکی کے تعلق میں جو سچا ردعمل ہے وہ برائی کا ایسا ازالہ نہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ سزاؤں پر زور نہیں ہے بلکہ پیار اور محبت اور شفقت سے اصلاح پر زور ہے اور یہ طریق حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نہیں سمجھا سکتا تھا، نہ کبھی کسی نے سمجھایا۔ تمام انبیاءؑ کی کہانی آپ پڑھ لیں یہ شان، یہ شوکت، یہ پیار، یہ حسن کہ مکارم الاخلاق پر قدم ہو جہاں باقیوں کے اخلاق اپنی انتہاؤں کو پہنچ کر ٹھہر گئے اس پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے قدم پڑے ہوئے تھے اس سے اونچے تھے یہ چیزیں سیکھیں گے تو پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے اپنے گھروں کی اصلاح کی بھی توفیق ملے گی اور بنی نوع انسان کی اصلاح کی بھی توفیق ملے گی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ آگ کس شخص پر حرام کر دی گئی ہے۔ کیسا عجیب انداز ہے سوال کا کیونکہ انسان کے اعمال کی درستی میں جہنم کا خوف بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ اپنے نفس کا ہمیشہ جائزہ لیں اور گردوپیش کا جائزہ لیں تو جنت کی تمنا آپ کے اخلاق کی درستی بھی نسبتاً بہت ہی کم اثر رکھتی ہے لیکن جہنم کا خوف بہت زیادہ اثر رکھتا ہے انذار ہے جسے ایک غلبہ حاصل ہوتا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اسی حوالے سے بات فرمائی کیا میں تمہیں وہ بات نہ بتاؤں جس کے نتیجہ میں آگ حرام ہو جاتی ہے صحابہؓ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ﷺ آپ ؐ نے فرمایا وہ حرام ہے ہر اس شخص پر جو لوگوں کے قریب ہے۔

اب یہ انداز بیان دیکھیں کتنا لطیف ہے اور ایسا کہ ٹھہر کر غور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔قریب کس کو کہتے ہیں ہر اس شخص پر جولوگوں کے قریب ہے ان کے لئے آسانی پیدا کرتا ہے نرم سلوک کرتا ہے جو الفاظ ہیں آنحضرت ﷺ کے وہ یہ ہیں

"تحرم علی کل قریب هین لین سهل"

(ماخوذ از مسند احمد بن حنبل ،مسند المکثرین من الصحابة ،مسند عبد اللہ بن مسعودؓ ،حدیث نمبر:3928)

آگ حرام ہے ہر اس شخص پر جو قریب ہے۔اب قریب کس کو کہتے ہیں ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں، ہر آدمی کسی اور کے قریب ہے، کوئی کسی کے قریب ہے تو قریب کا کیا مطلب ہے؟ اس قریب کا وہ مطلب ہے جو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کہ اے محمد ﷺ جب تجھ سے میرے بندے سوال کریں۔ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ تو میں تو ہر وقت قریب رہتا ہوں ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قریب ہوں ان کی تکلیفیں دور کرنے کے لئے قریب ہوں۔ان کی حاجت روائی کے لئے قریب ہوں اور ان کی اصلاح کے لئے قریب ہوں، یہ قرب ہے جن معنوں میں قریب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

تو اگر اللہ قریب ہے اور آپ بھی اللہ کی طرح قربت کے رنگ اختیار کر لیں تو کیسے ممکن ہے کہ اللہ ایسے شخص کو آگ میں ڈال دے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو فرمایا جو بارہا میں ذکر کر چکا ہوں مگر اس ذکر سے میں تھک نہیں سکتا۔

؎ آگ ہے پر آگ سے وہ سب بچائے جائیں گے
جو کہ رکھتے ہیں خدائے ذوالعجائب سے پیار (درثمین اُردو:154)

تو جن کے دل میں خدا کا پیار ہو ان پر آگ حرام کر دی جاتی ہے اور جو قریب ایسے ہوں جیسے خدا قریب ہوتا ہے خدا سے قربت کے رنگ ڈھنگ سیکھ کر قریب ہوتے ہیں۔آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں ان کو آگ چھوئے گی بھی نہیں پس ان معنوں میں آپ بنی نوع انسان کے قریب ہو جائیں۔

بعض لوگ بڑے مراتب تک پہنچتے ہیں تو بنی نوع انسان سے دور ہو جاتے ہیں بعض لوگ امیر ہو جاتے ہیں دولت مند ہو جاتے ہیں تو بنی نوع انسان سے دور ہو جاتے ہیں غرضیکہ اکثر انسان اپنی بڑائی کی علامت یہ سمجھتے ہیں کہ بنی نوع انسان سے دور ہو جائیں لیکن سب سے بڑا تو خدا ہے اللہ تعالیٰ

سے بڑھ کر اور کون عالی اور کبیر ہے وہی سب سے اعلیٰ، وہی اکبر لیکن سب سے قریب خدا ہے اسی لئے خدا تعالیٰ کی صفات میں بظاہر دو متضاد صفات بیان کی جاتی ہیں وہ سب سے بعید بھی ہے اور سب سے قریب بھی ہے اور آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر کسی انسان کا تصور بھی کوئی انسان نہیں کر سکتا بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بڑائی کا تصور اکثر انسانوں کے بس کی بات نہیں جیسے دور افق میں دیکھتے دیکھتے آپ کی نظر گویا فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے ڈوب جاتی ہے اور آگے پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا اسی طرح حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی عظمتیں اور رفعتیں ہیں کہ ان کو دیکھتے دیکھتے انسان کی نظر غائب ہو جائے گی مگر جن کو خدا توفیق نہ عطا فرمائے ان کو رسول اللہ ﷺ کی رفعتیں دکھائی نہیں دے سکتیں اس کے باوجود سب سے قریب تھے۔

ان تمام انعامات کے باوجود جو خدا نے آپ پر فرمائے اور آپؐ کو افضل المخلوقات قرار دیا، آپ کو کائنات کی وجہ، جس وجہ سے کائنات کو پیدا کیا ہے فرمایا اور سب سے پہلے آپ کی تخلیق بیان فرمائی، سب سے آخر آپ کو رکھا یعنی مقصود کے طور پر، مقام کے لحاظ سے سب سے بلند اور عام لوگوں کے اس طرح قریب تھے کہ آدمی حیران ہوتا ہے وہ واقعات پڑھ کر، ان کے درمیان گھومتے پھرتے، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی آپ سے بات کرتا تھا تو ٹھہر جاتے تھے، توجہ سے اس کی بات سنا کرتے تھے، بوڑھی عورتیں آپ سے اس طرح بات کرتی تھیں جیسے بڑا حق ہوتا ہے آپ کے اوپر، اپنے بوجھ آپؐ پر ڈال دیا کرتی تھیں۔ یتیم بچے آپ سے ایسی باتیں کرتے تھے جیسے ان کے باپ سے بڑھ کر جو فوت ہو گیا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ان کے ذمہ دار ہیں اور تھے بھی۔ ہر شخص آپؐ کے قریب تھا یعنی ان معنوں میں کہ آپؐ اس کے قریب تھے ورنہ جہاں تک مراتب کی دوری ہے وہ تو اتنی تھی کہ اس پہلو کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے کوئی صحابیؓ بھی آپ کے قریب نہیں تھا کیونکہ انبیاءؑ سے بھی آپؐ اونچے تھے۔ پس یہ وہ قریب کے معنی ہیں جن پر غور کرنے کے بعد آپ کو اپنی زندگی کو ڈھالنے میں مدد ملے گی۔

آپ کو جتنی بلندی حاصل ہو، جتنا مرتبہ بڑا ملے، جتنی دولت ملے جتنی حکومت کا بلند مقام حاصل ہو آپ اتنا ہی بنی نوع انسان پر جھکتے چلے جائیں اور قریب ہوتے چلے جائیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس قرب کے بغیر آپ تکبر سے بچ نہیں سکتے اور تکبر والا انسان جنت میں داخل نہیں ہو سکتا، آگ سے بچ نہیں سکتا۔ پس قریب ہونے سے آگ سے بچنے میں یہ مفہوم داخل ہے کہ اگر تم قریب ہو تو تم میں کوئی

تکبر نہیں ہوگا۔ اگر تم قریب رہو گے تو لازماً منکسر المزاج ہو گے اور اگر ایسا ہو گے تو پھر تمہیں آگ نہیں چھو سکتی۔

پھر فرمایا ان کے لئے آسانی مہیا کرنے والا ہو ھین، لین آسانی بھی اور ملائمت بھی۔ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ یہ جو قرآن کریم نے فرمایا ہے اس کے مقابل پر رسول اللہ ﷺ لِنْتَ لَهُمْ فرمایا یعنی تو ان کے لئے ایسا نرمی کا گوشہ رکھتا ہے کہ ان کی طرف خود بخود اپنی محبت اور پیار اور شفقت کی وجہ سے جھک جاتا ہے۔ تو یہ لِنْتَ کا مفہوم ہے جو بیان ہو رہا ہے کہ ''قریب ھین لین'' وہ ان کے لئے آسان ہے یعنی اس سے بات کرنا بھی آسان ہے اور اگر کوئی خوف ہے بھی تو وہ خود دور کر دیتا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ ایسے لوگوں کے خوف کو بھی دور فرما دیا کرتے تھے جو آپؐ کی ہیبت سے بعض دفعہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح کانپتے لگتے تھے جو ہوا کے جھونکے سے کانپتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ ان کو ٹھہراتے، سکون بخشتے، حوصلہ دیتے یہاں تک کہ وہ بے تکلفی سے اپنا ما فی الضمیر آنحضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے۔

تو اس طرح قریب ہوں کہ حوصلے دیں۔ ان کی باتیں سنیں، ان کی تکلیفیں دور کرنے کے لئے کوشش کریں اور ''ھین'' ہوں گے تو ''لین'' بنیں گے۔ یعنی اپنی روش میں آسانی پیدا کریں دوسروں کو آپ اپنے تک پہنچنے میں آسانی دیں۔ تو پھر فرمایا ''لین'' ہو وہ اور پھر ''سھل'' اتنے روزمرّہ آپ کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے والے، بے تکلف ہونے والے کہ گویا آپ کے لئے وہ آسان ہو گئے ہیں۔ ''سھل'' ایسے میدان کو بھی کہتے ہیں جس میں اونچ نیچ باقی نہ رہے جو سارا یکساں ہو، اس پر چلنا اور دوڑنا آسان ہو کیونکہ وہ بالکل ہموار ہو تو فرمایا وہ سھل ہو جائیں یعنی اتنی عظیم آنحضرت ﷺ کی صفات اس میں بیان ہوئی ہیں جو پردے ڈال کر رسول اللہ ﷺ بیان فرما رہے ہیں دوسروں کے حوالے سے بات کر رہے ہیں، اپنا یہ حال تھا۔ یہ تمام صفات بدرجہ اتم آپؐ میں موجود تھیں تو تب ہی لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کیونکہ آپؐ نے کبھی کوئی نصیحت نہیں کی جس پر بدرجہ اتم پہلے خود کاربند نہ ہوں۔ تو بعض دفعہ سیرت کے بیان میں آپ کو، سیرت کی تلاش میں آپ کو نصیحتوں پر غور کرنا پڑتا ہے۔ بعض لوگوں کی سیرت اگر ان کی نصیحتوں سے دیکھو تو جھوٹی سیرت بنے گی کیوں کہ اکثر لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں لیکن وہ جس کے قول کا ذرّہ ذرّہ سچا ہو جو پہلے عمل کئے بغیر دوسرے کو کوئی بات کہے ہی نہ اس کی سیرت نصیحتوں میں دکھائی دے گی ورنہ وہ خود تو

نہیں کہے گا کہ میں ایسا ہوں اور میں ایسا ہوں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ حکم دے کہ تو اپنا تعارف کروا۔ آنحضرت ﷺ اس حکم کے بغیر اپنا تعارف نہیں کروایا کرتے تھے لیکن دوسروں کو فرماتے تھے کہ دیکھو تم قریب رہنا۔ ھین ہونا لین ہونا، نرمی اختیار کرنا ایسا کہ سھل ہو جاؤ جیسے چٹیل میدانوں میں لوگ آسانی سے دوڑتے پھرتے ہیں کوئی چڑھائی کا خطرہ نہیں، کوئی اترائی کا خطرہ نہیں۔ نہ گڑھے، نہ ایسی بلندیاں جن پر چڑھنا دشوار ہو، اس طرح حضور اکرم ﷺ اپنے صحابہؓ، اپنے گردوپیش کے لئے اتنے آسان ہو گئے تھے کہ گویا سھل بن گئے۔ فرمایا ایسے شخص پر یقیناً آگ حرام کر دی گئی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کسی چیز میں جتنا بھی رفق اور نرمی ہوا تنا ہی اس کے لئے زینت کا موجب بنتی ہے۔ آپؐ کے الفاظ یہ ہیں

”ان الرفق لا یکون فی شیء الا زانہ ولا ینزع من شیءٍ الا شانہ“

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ و الادب ،باب فضل الرّفق)

یہاں شان کا مطلب وہ شان وشوکت نہیں جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، یہ شان لفظ ہے ہمزے کے ساتھ جس کا مطلب ہے برائی، شئون بدیوں کو اور برائیوں کو کہتے ہیں، مکروہ باتیں۔ زان کا لفظ زینت سے نکلا ہے فرمایا یقیناً نرمی ایسی چیز ہے کہ جس چیز میں بھی ہو اس کے لئے زینت کا موجب بن جاتی ہے اور جس میں نہ ہو، جتنی اس سے کھینچ کے باہر کر دی جائے اتنا ہی اس کو عیب دار کر دیتی ہے اس کے اندر نقائص پیدا کر دیتی ہے مگر نرمی بھی برمحل اور موقع کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ اس مضمون کو آگے الگ کھولا جائے گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ یہاں نرمی کرنے والا جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ رفیق ہے دراصل۔ ہم خدا تعالیٰ کو جب رفیق کہتے ہیں یا حفیظ، یا عزیز، یا رفیق تو رفیق کا معنی دوست کا بھی ہوتا ہے۔ رفیق حیات، رفیقہ حیات، زندگی بھر کا دوست، زندگی بھر کی دوست، یہ لفظ رفیق سے نکلا ہے اور دوستی کے لئے رفیق ضروری ہے یعنی ایسی نرمی کہ کبھی سختی بھی برداشت کر لی۔ کبھی دوسرے سے بھی مطالبے ہوئے تو اس نے برداشت کر لیا آپ کی بات کو۔ دونوں طرف رفق ہو تو رفیق بنتا ہے ورنہ نہیں بنتا۔ تو اللہ تعالیٰ رفیق ہے اور اللہ تعالیٰ کے تعلق میں رفیق کا یک طرفہ صرف حقیقت میں معنی

بنتا ہے یعنی وہ ایسا نرم ہے کہ تم لوگوں کی طرف سے بار بار ایسی باتیں دیکھتا ہے جو خدا تعالیٰ کی دوستی اور تعلق کو کاٹنے والی باتیں ہوں لیکن رفیق ہے، جو اس کا رفق ہے وہ ہٹتا ہی نہیں۔ پس **یا حفیظ، یا عزیز، یا رفیق** میں رفیق کے یہ معنی ہیں کہ اے ایسا پیار کرنے والے! اے ایسے ساتھی، جس کو بار بار اپنے بندوں کی طرف سے تکلیف دہ باتیں پہنچیں۔ جس کے بعد رفق باقی نہیں رہا کرتا پھر بھی وہ رفیق رہتا ہے۔ یہ صفت اگر بندہ اپنے اندر پیدا کرے تو حقیقی معنوں میں خدا اس کا رفیق ہو جاتا ہے لیکن اگر خدا کے بندوں کے تعلق میں وہ یہ بات پیدا نہ کرے تو خدا کی رفاقت بھی اس کو نصیب نہیں ہوتی۔ پس خدا کے تعلق میں رفیق برابر کی چوٹ دونوں طرف نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا سلوک فرمایا کہ بندوں کے ساتھ تم رفیق ہو جاؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو تو میں تمہارا رفیق ہو جاؤں گا کیونکہ خدا سے حسن سلوک تو آپ کر ہی نہیں سکتے۔ تو خدا کی رفاقت نصیب کرنے کا کتنا آسان رستہ بتا دیا کہ بندوں کے تعلق میں تم رفاقت کرو اور تمہیں میں اپنی رفاقت عطا کر دوں گا۔

"لایعطی علی العنف و لا یعطی علی ما سواہ"

(صحیح مسلم ، کتاب البر والصلة و الادب ،باب فضل الرّفق)

کہتے ہیں خدا رفق کا بدلہ ایسا دیتا ہے اور اتنا دیتا ہے کہ سخت مزاجی اور سخت گیری اس کے بدلے کی اس سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی یعنی اس کا ترجمہ کرنا ان معنوں میں مشکل ہو رہا ہے کہ سخت گیری کا تو بدلہ دیتا ہی نہیں۔ پس اگر میں یہ کہوں کہ رفق کا بدلہ اتنا دیتا ہے کہ سخت گیری کا نہیں دیتا تو یہ معنی اس کے بنتے نہیں کہ نیکی کی جزاء اتنی دیتا ہے کہ بدی کی نیک جزاء اتنی نہیں دیتا۔ اس لئے میں طبعاً یہاں ٹھہر گیا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس مضمون کو بیان کروں۔ اصل مطلب یہ ہے کہ سخت گیری کا جہاں حق بھی ہو وہاں سخت گیری کا استعمال برمحل بھی ہو تو اس کا فائدہ اتنا نہیں پہنچتا انسان کو جتنا رفق کے، نرمی کے استعمال سے فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ یہ طرز کلام ایسی ہے کہ اس پر ٹھہر کر غور کر کے ترجمہ نہ کریں تو بالکل غلط ترجمہ ہو جائے گا جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ لکھا یہ ہوا ہے کہ خدا نرمی کا جتنا اجر دیتا ہے سخت گیری کا نہیں دیتا تو گویا سخت گیری کا بھی کچھ نہ کچھ تو دیتا ہے اجر۔ یہ مراد نہیں ہے۔ وہی معنی بنتے ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ یا تو یہ معنی بنیں گے کہ سخت گیری برمحل ہو تو اس کی جزاء بھی انسان کو ملتی ہے مگر رفق کی جزاء تو بالکل اور ہی بات ہے سخت گیری برمحل

ہونے کے باوجود رفق کا مقابلہ نہیں کرسکتی، نرمی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ سخت گیری کی پکڑ کم کرتا ہے اور رفق کا بدلہ زیادہ دیتا ہے کیونکہ جزاء کا معنی موقع اور محل کے مطابق ہوگا۔ پس سخت گیری کی اتنی جزاء نہیں دیتا جتنی رفق کی دیتا ہے اور یہ اگر ترجمہ کیا جائے تو بالکل یہی ترجمہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ پکڑ کے وقت ہاتھ نرم کردیتا ہے اور نرمی کے سلوک کے وقت ہاتھ کو کھلا کردیتا ہے اور یہ بھی رفق کا ہی تقاضا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا رفیق ہونے کی ایک یہ بھی شان ہے کہ سخت گیری میں بھی رفیق رہتا ہے ورنہ اگر لوگوں سے سخت گیری اسی طرح کرتا جیسا کہ موقع اور محل کا تقاضا تھا کہ سخت گیری کی جائے پھر تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی جان دار باقی نہ رہتا تمام زندگی کی صف لپیٹ دی جاتی۔ تو یہ دوسرا معنی بھی چونکہ قرآن کے مطابق ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ سخت گیری کا سختی سے بدلہ بہت کم دیتا ہے اور تم نرمی کرو گے تو بہت زیادہ اس نرمی کی جزاء دے گا، اتنی زیادہ کہ گویا تمہارے عمل کے ساتھ اس کی کوئی نسبت ہی نہیں رہے گی۔

پھر سخت گیری اور بدخلقی کے متعلق آپؑ فرماتے ہیں۔ یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے جو میں پڑھ رہا ہوں۔ (البدر جلد 3، نمبر 19-18، تاریخ 8 تا 16 مئی 1904ء صفحہ 3) فرماتے ہیں:۔

’’سخت دل ہر ایک فاسق سے بدتر ہوتا ہے‘‘

اب اس سے آپ اندازہ کریں کہ سخت گیری کتنا بڑا گناہ ہے۔ سخت دلی انسان کو ہر فاسق سے بدتر کردیتی ہے اور ہمیشہ فسق و فجور کے باوجود قوموں کو باقی رکھا مگر جب ان کے دل سخت ہو گئے تو پھر خدا کا عذاب ان پر نازل ہوا ہے۔ یہود کی تاریخ ہمارے سامنے گواہ ہے فرمایا ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ: 75) تم نے بدیاں کیں خدا نے باوجود اس کے عفو کا سلوک فرمایا، مغفرت فرمائی۔ بدیوں پر بدیاں دیکھتا رہا مگر تمہیں پکڑا نہیں مگر جب تم سخت دل اور پتھر دل ہو گئے پھر خدا کا غضب تم پر نازل ہوا ہے۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام بھی قرآن کریم پر مبنی کلام ہے احادیث نبوی پر مبنی کلام ہے۔ اپنی طرف سے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کوئی بات بھی نہیں کہتے۔ تو یہ معنی ہے ہر فاسق سے بدتر ہوتا ہے۔ تمہارے گناہ خدا تعالیٰ کے مغفرت کی نیچے رہیں گے اگر تمہارے دل میں خوف خدا ہو، کوشش ہو، توبہ کی طرف توجہ ہو۔ مگر اگر تم پتھر دل بن گئے پھر کوئی بخشش تمہیں نصیب نہیں

ہوسکتی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس مضمون میں جماعت کو ایک نصیحت فرماتے ہیں اور باقی اقتباسات پڑھنے کا چونکہ وقت نہیں ہے میں اسی نصیحت کو پڑھ کر، آپ کو سمجھا کر اس خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔

''تم آپس میں جلد صلح کرو اور اپنے بھائیوں کے گناہ بخشو کیونکہ شریر ہے وہ انسان کہ جو اپنے بھائی کے ساتھ صلح پر راضی نہیں وہ کاٹا جائے گا کیونکہ وہ تفرقہ ڈالتا ہے۔۔۔''

اب آپ کو میں نے پہلے شروع میں ہی بتایا تھا کہ سارے نظام جماعت پر، دنیا کے مختلف ملکوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں یقین کے ساتھ آپ کو بتاتا ہوں کہ دلوں کی سختی نے فساد برپا کر رکھا ہے، گھر اجاڑ دیئے ہیں، جماعتیں برباد کر دی ہیں۔ جن جماعتوں میں بھی ایسے چند پتھر دل لوگ آ گئے انہوں نے سارے نظام جماعت کا ستیاناس کر دیا۔ بعض سالہا سال سے سنبھلتے ہی نہیں کیونکہ ان میں چند لوگ سخت دل ہیں اور اس کے نتیجہ میں بعض دفعہ ان کی امارتیں ختم کرنی پڑیں۔ ان سے ووٹ دے کر اپنے عہدیداروں کا انتخاب کرنے کا حق بھی لے لیا گیا۔ مربی مقرر کئے گئے، دوسرے بھیجے گئے، مجال ہے جو ٹس سے مس ہوں کیونکہ سخت دل ہر فاسق سے بدتر ہوتا ہے ان کے دلوں کی سختی نے تفرقہ ڈال دیا ہے اور یہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں وہ جو صلح پر راضی نہیں ہوتا وہ کاٹا جائے گا کیونکہ وہ تفرقہ ڈالتا ہے۔

''۔۔۔تم اپنی نفسانیت ہر ایک پہلو سے چھوڑ دو اور باہمی ناراضگی جانے دو اور سچے ہو کر جھوٹے کی طرح تذلل اختیار کرو تا تم بخشے جاؤ۔۔۔''

پھر فرماتے ہیں:۔

''۔۔۔نفسانیت کی فربہی چھوڑ دو کہ جس دروازے کے لئے تم بلائے گئے ہو اس میں سے ایک فربہ انسان داخل نہیں ہوسکتا۔۔۔''

قریب کے تعلق میں مَیں نے آپ کو سمجھایا تھا کہ جو قریب ہے وہ تکبر سے دور ہے۔ جو قریب نہیں ہے وہ اسی حد تک متکبر ہو جاتا ہے اور تکبر کے متعلق جو تمثیل ہے وہ فربہی کی تمثیل ہے کہ جتنا تکبر ہوگا اتنا ہی گویا موٹا ہوگا لیکن جن راہوں سے جنت کی طرف بلایا جاتا ہے وہ باریک راہیں ہیں۔ ان سے اس قسم کا پھولا ہوا، اپنے تکبر میں متورم ہوا ہوا شخص داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ فرماتے ہیں تم فربہی

چھوڑ دو، ہر ایک پہلو سے چھوڑ دو کہ جس دروازے کے لئے تم بلائے گئے ہو اس میں سے ایک فربہ انسان داخل نہیں ہوسکتا۔

”۔۔۔کیا ہی بدقسمت وہ شخص ہے جو ان باتوں کو نہیں مانتا جو خدا کے منہ سے نکلیں اور میں نے بیان کیں۔۔۔“

اس سے زیادہ پر شوکت کلام آپ کو سمجھانے کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے۔ فرماتے ہیں بدنصیب وہ شخص ہے جو ان باتوں کو نہیں مانتا جو خدا کے مونہہ سے نکلیں اور میں نے بیان کیں یعنی کلام الٰہی ہے جو میری زبان پر جاری ہوا ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

”۔۔۔تم اگر چاہتے ہو کہ آسمان پر تم سے خدا راضی ہو تو تم باہم ایسے ایک ہو جاؤ جیسے ایک پیٹ میں سے دو بھائی۔۔۔“

اب آپ دیکھیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کم سے کم بھائیوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو ایسا پیار دیں کہ ان کی مثال دی جاسکے۔

آج کل تو بھائی بھائی سے ایسا لڑتا ہے اور جائیدادوں کی خاطر ایسے تصرفات کرتا ہے اور بعض دفعہ ایسی ظالمانہ کارروائیاں کرتا ہے کہ بھائی کے علم کے بغیر پٹواریوں سے مل کر جائیداد کے انتقال بھی کروا بیٹھتا ہے۔ تو اب یہ مثال آپ کو کیسے سمجھ آئے گی، جیسے ماں کے پیٹ سے نکلے ہوئے دو بھائی۔

مراد ہے اچھے وقتوں کی بات ہو رہی ہے جب بھائی واقعی بھائی ہوا کرتے تھے تو اب ویسا بننا ہوگا آپ کو۔ ان بھائیوں کی مثال لو جو حقیقت میں فرشتہ سیرت بھائی ایک دوسرے کی خاطر اپنے حقوق قربان کرنے والے ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

”۔۔۔ایک پیٹ میں سے دو بھائی۔ تم میں سے زیادہ بزرگ وہی ہے جو زیادہ اپنے بھائی کے گناہ بخشتا ہے اور بدبخت ہے وہ جو ضد کرتا ہے اور نہیں بخشتا سو اس کا مجھ میں حصہ نہیں۔۔۔“

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد 19 صفحہ: 12,13)

یہ نصیحت بیان کرنے کے بعد، مَیں پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک اور اقتباس ابھی پیش کر دیتا ہوں تاکہ اس عرصے میں اگلے خطبات سے پہلے کوئی غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ عفو

کس کو کہتے ہیں اور مغفرت کیا ہوتی ہے۔

''بدی کا بدلہ اُسی قدر بدی ہے جو کی گئی لیکن جو شخص عفو کرے اور گناہ بخش دے اور اس عفو سے کوئی اصلاح پیدا ہوتی ہو نہ کوئی خرابی تو خدا اس سے راضی ہے اور اسے اس کا بدلہ دے گا۔ پس قرآن کے رو سے نہ ہر یک جگہ انتقام محمود ہے۔ (یعنی قابل تعریف ہے) نہ ہر یک جگہ عفو قابل تعریف ہے بلکہ محل شناسی کرنی چاہئے اور چاہئے کہ انتقام اور عفو کی سیرت بپابندی محل اور مصلحت ہو نہ بے قیدی کے رنگ میں۔ یہی قرآن کا مطلب ہے''

(کشتی نوح، روحانی خزائن جلد 19 صفحہ: 30)

تو بعض لوگ ایک ہی طرف کی بات سمجھ کر سمجھتے ہیں کہ ہر جگہ ہر وہ شخص جو کسی بات پر مجاز بنایا گیا ہے اس سے آنکھیں بند کر کے ہر جرم کے نتیجہ میں عفو مانگو حالانکہ بعض جگہ عفو کی اجازت نہیں ہوتی اور اس وجہ سے اجازت نہیں ہوتی کہ یا تو اس کی بدی کی حوصلہ افزائی ہوگی یا ماحول کی حوصلہ افزائی ہوگی یعنی ماحول میں بدیوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ پس بعض ایسے لوگ جو سلسلہ سے ایسی بے وفائی کرتے ہیں کہ وہ تمام دنیا میں سلسلہ کے وقار کو نقصان پہنچا دیتے ہیں اور سلسلہ کی عزت کو ذلیل اور رسوا کر دیتے ہیں ان کو اگر معاف کیا جائے تو کل دس، بیس، پچاس اور بھی پیدا ہو جائیں گے اس لئے غلط حوالے دے کر مجھے میری ہی باتوں کا غلط رنگ میں پابند کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میں جو آپ کو سمجھا رہا ہوں سمجھتا ہوں کہ عفو کے کیا معنی ہیں اور کس موقع پر ہونا چاہئے اور مجھے پتا ہے کہ کہاں انسان کو عفو کا اختیار نہیں ہے۔ وہاں عفو کرنا خدا کی ناراضگی مول لینے والی بات ہے۔

پس یہ کہہ کر میں اب اس خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔ باقی انشاء اللہ آئندہ جو جمعہ ہے وہ وقف جدید کے تعلق میں ہوگا کیونکہ ہمارا وقفِ جدید کا سال ختم ہو رہا ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ جماعتوں کو اگرچہ بار بار یاد دہانی کرائی جا چکی ہے مگر بہت سی جماعتوں کی طرف سے ابھی وقفِ جدید کی سالانہ رپورٹ نہیں موصول ہوئی تو اب تو بہت تیز رفتاری آ چکی ہے مواصلات میں۔ پس آپ فیکس کے ذریعے یا دوسرے ذرائع سے جو بھی جلدی رپورٹ پہنچانے کے ذرائع آپ کو میسر ہیں اپنی وقف جدید کی کارگزاری کی رپورٹ بھیجنے میں مزید تاخیر نہ کریں۔ جزاکم اللہ

نیکیوں کو نور بنا دینے والا نسخہ یہی ہے کہ ہر نیکی کی نیت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اثر انداز ہو۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 27 دسمبر 1996ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے درج ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۲۰﴾

(الحدید: 19، 20)

پھر فرمایا:

آج کا خطبہ جیسا کہ میں نے کل ہندوستان کے جلسے کے ابتدائی خطاب میں ذکر کیا تھا وقف جدید کے مضمون کے لئے وقف ہے۔ پرانا دستور یہی چلا آرہا ہے کہ یا تو سال کے آخری خطبہ میں وقف جدید کے سال نو کا آغاز ہوتا ہے یا اس سے آئندہ سال کے آغاز میں پہلے خطبہ میں۔ جب میں ہندوستان گیا تھا تو یہی تاریخ تھی، یہی دن تھے جب میں نے وہاں 1991ء میں وقف جدید کے نئے سال کے آغاز کا اعلان کیا تھا اب یہ دونوں جلسے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجیب تصرف ہے کہ وہی دن ہیں اور وہی تاریخیں ہیں اور جو بھی برکتیں ان میں مضمر ہوں گی

وہ ہماری وہمی نہیں بلکہ عملاً اللہ تعالیٰ ان برکتوں کو دکھائے گا تو ہمارا یقین اور ایمان خدا تعالیٰ پہ اور بھی زیادہ جلا پائے گا۔

وقف جدید کی تحریک کا آغاز تو 1958ء سے ہے یا 1957ء کے آخر سے اور اس پہلو سے ایک لمبے زمانے سے یہ تحریک چلی آ رہی ہے مگر بیرون پاکستان چندوں کے لحاظ سے اسے ممتد کرنے کا آغاز چند سال پہلے ہوا۔ جب میں نے یہ تحریک کی تو اس وقت میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ اتنی بڑی ضرورتیں پیدا ہونے والی ہیں کیونکہ تبلیغ جاری تو تھی مگر دھیمی دھیمی اور اس میں وہ نئی حرکت اور نئی سرعت پیدا نہیں ہوئی تھی جواب اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا ہو چکی ہے اور تبلیغ ہی کے تقاضے ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے نئے مالی تقاضے ابھرے اور اس کی وجہ سے عام چندوں تک محدود رہتے ہوئے وہ ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ مثلاً وقف جدید کے تعلق میں میں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی جماعتیں چونکہ ابھی غریب ہیں اور تقسیم کے بعد ان کو بہت بڑا دھکا لگا تھا جس سے ابھی تک وہ سنبھلی نہیں اس لئے وہاں کی وقف جدید کی ضرورتیں ان کے چندے کی صلاحیت کے مقابل پر بہت زیادہ ہیں۔

اس طرح افریقہ کی جماعتیں چونکہ بیشتر غریب ہیں نہ وہ پوری طرح اپنے چندوں میں خود کفیل ہیں، نہ وقف جدید کی طرز کا نظام وہاں جاری کرنے سے یا وقف جدید کی نہج پر ان کی تعلیم و تربیت کرنے کے لئے ہمارے پاس وہاں کوئی ایسے ذرائع مہیا ہیں کہ ہم ملکی طور پر ہی ان ضرورتوں کو پورا کرسکیں اس لئے میں نے یہ تحریک کی کہ مغربی ممالک بالخصوص اور بیرونی ممالک بالعموم اس تحریک میں شامل ہو جائیں اور محض پاکستان ہی کو یہ اعزاز نہ رہے کہ وہ اکیلا یا ہندوستان اور پاکستان دونوں یا بنگلہ دیش یہ تینوں دراصل کہنے چاہئیں تھے مجھے، کہ ان تینوں میں یہ اعزاز نہ رہے کہ یہ تو ایک ایسی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں جو خالصۃً للہ ایک عظیم مقصد کے لئے قائم کی گئی اور باقی جماعتیں دنیا کی محروم رہ گئی ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے مجھ پر یہ امر واضح نہیں تھا کہ کوئی حقیقی ضرورت ایسی ابھری ہے جس کو پورا کرنے کے لئے یہ تحریک کی جائے اور اندازہ تھا کہ یہ ضرورتیں بڑھ رہی ہیں اس لئے آمد کے ذرائع بھی بڑھنے چاہئیں لیکن بعد کے حالات سے پتا چلا کہ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے تحریک دل میں ڈالی گئی تھی کیونکہ اچانک تبلیغ میں ایسی سرعت پیدا ہوگئی اور دنیا کا رجحان احمدیت کی طرف اس تیزی سے بڑھنے لگا کہ ان کو تبلیغ کرنے کا تو الگ مسئلہ، ان کی تربیتی ذمہ داریوں کو

سنبھالنے کے لئے بہت بڑی مالی ضروریات در پیش تھیں۔ کیونکہ انہی میں سے مبلغ نکالنا، ان کی تربیت کے سامان کرنا، ان کو جگہ جگہ جلسوں کے ذریعہ اور تربیتی کلاسز کے ذریعہ اس دین کی تفصیل سمجھانا جس کو عموماً بغیر سمجھے عامۃ الناس قبول کرتے ہیں اور یہ معاملہ صرف احمدیت کے لئے خاص نہیں دنیا کے ہر مذہب کا یہی حال ہے۔ عامۃ الناس عمومًا ایک عقیدے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ بعض نشانات کو دیکھ کر، بعض رجحانات کو دیکھ کر اور بعض دفعہ آسمان سے ایسے تائیدی نشان ظاہر ہورہے ہوتے ہیں جن کو دیکھنے سے وہ یقین کر لیتے ہیں کہ یہ سچا سلسلہ ہے مگر اس کے عقائد کی تفصیل، اس پر عمل کرنے کے جو طریق ہیں ان سے بسا اوقات ناواقف رہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے وہ نظام جاری فرمایا کہ اپنے مرکز میں پہلے مختلف قوموں کے نمائندوں کو بلاؤ جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ ان کو بلاؤ، ان کو وہاں ٹھہراؤ، ان کی تعلیم و تربیت کرو اور پھر واپس بھیجو تا کہ وہ اپنے اپنے مقامات پر جا کر خدمت دین کا کام بہتر طریق پر سرانجام دے سکیں۔ یہ ضروریات تھیں جن کے لئے خدا تعالیٰ نے مغربی جماعتوں کو یعنی آزاد ایسے ملکوں کو جو نسبتاً ترقی یافتہ ہیں ان کو بھی اس تحریک میں شمولیت کی توفیق بخشی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بہت ہی اعلیٰ پھل ہمیں دکھائے اور ایسے جن کا ہمارے ذہن میں کہیں دور کے گوشوں میں بھی کوئی تصور نہیں تھا لیکن اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے میں قرآن کریم کی ان آیات کا ترجمہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور مختصراً ان کے مضامین کو آپ کے سامنے کھولنے کی کوشش کروں گا۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ یقیناً صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں۔ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یعنی وہ لوگ جن کے صدقہ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی خاطر اللہ کو قرضہ حسنہ کے طور پر کچھ دیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا يُّضٰعَفُ لَهُمْ ان کے لئے بڑھایا جائے گا، کیا بڑھایا جائے گا یہ بات مبہم چھوڑ دی گئی ہے اور یہ مبہم چھوڑنا دو طریق پر ہوا کرتا ہے۔ بعض لوگ جن کی نیتیں خراب ہوں وہ مجمل وعدہ کر دیا کرتے ہیں، مبہم سا وعدہ کر لیتے ہیں تا کہ ہم پھر پکڑے نہ جائیں۔ جب نہ پورا کرنے کو دل چاہے تو کہتے ہیں ہم نے یہی کہا تھا نا کہ کچھ دیں گے تو کچھ دے دیں گے، یہ کب کہا تھا کہ کب دیں گے اس لئے کوئی مطالبہ نہ کرو ہم سے۔ مگر جو کریم ہو، جو بے انتہا احسان کرنے والا ہو وہ جب مجمل وعدہ کرتا ہے تو مراد یہ ہے کہ اس سے

بہت زیادہ دیں گے جو تم سمجھ رہے ہو اس لئے معین کر کے ہم اپنے ہاتھ نہیں باندھتے۔ حسبِ حالات، تمہارے اخلاص کے تقاضوں کے مطابق جتنا چاہیں گے اتنا دیتے چلے جائیں گے مگر جو بھی دیں گے تمہاری توقعات سے بڑھ کر دیں گے۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں یہ چیز شامل ہوتی ہے اس کے سوا ایک بھی خدا کا وعدہ نہیں ملتا جو محسنین سے یا اس کی راہ میں خدمت کرنے والوں سے کیا گیا ہو اور اس میں ان توقعات سے بڑھ کر دینے کا مضمون شامل نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: یُّضٰعَفُ لَهُمْ اور ان کے لئے بڑھا دیا جائے گا۔ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ اور ان کے لئے معزز اجر بھی ہوگا یعنی اَجْرٌ كَرِيْمٌ سے مراد جیسا کہ ایک اور آیت کے حوالے سے میں نے بیان کیا تھا ان کو اموال ہی میں برکت نہیں دی جائے گی، ان کی عزتوں میں بھی برکت دی جائے گی، ان کو معزز بنایا جائے گا اور کریم سے مراد سخی بھی ہے۔ وہ شخص جو اعلیٰ اقدار کی خاطر دل کھول کے خرچ کرتا ہے۔ تو اَجْرٌ كَرِيْمٌ خدا سے متوقع ہے اور وہ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ان کو بھی کریم بنانے والا ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اب یہاں لفظ صدیق کا استعمال اتفاقی نہیں ہے۔ دیکھیں نبوت کا یہاں ذکر نہیں ملتا۔ صدیق اور اس کے بعد شہداء کا ذکر فرمایا اور مُصَدِّقِيْنَ اور مُصَدِّقَات کا مادہ وہی ہے جو صدیق کا ہے اور مُصَدِّقَات اور مُصَدِّقِيْنَ میں جو باب استعمال فرمایا گیا ہے اس میں کچھ مبالغے کے معنٰی ضرور پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو بکثرت صدقہ دینے والے ہیں، جو بکثرت صدقہ دینے والیاں ہیں وہ چونکہ اپنے نیک اعمال میں اور خدا کی خاطر دل کھولنے میں ایک نمایاں منصب پا گئے، نمایاں صورت اختیار کر گئے اس لئے اللہ کی طرف سے بھی ان سے نمایاں اجر کا وعدہ ہونا چاہئے تھا۔ پس جہاں اَجْرٌ كَرِيْمٌ فرما دیا اس سے اگلی آیت ہی میں ایک ایسا مضمون بیان فرمایا ہے جو نبوت سے نیچے سب سے اعلیٰ منصب کا وعدہ کر رہا ہے۔

چنانچہ فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے رسولوں پر یعنی یہی لوگ ہیں جن کی ایک مزید تعریف یہ فرما دی گئی ہے کہ ان کا خرچ محض اپنی ذاتی کرامت سے نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسولؐ پر ایمان کے نتیجہ میں یہ پیدا ہوا ہے۔ فرمایا: هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ اس معیار کے لوگ وہ ہیں جن کو ہم صدیق شمار فرمائیں گے اور اس

سے بڑا اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ اور کیا ہوسکتا ہے پھر یہ کہ صدیقیت کا مقام پا جائیں اور صدیقیت کا مقام خدا کی راہ میں خرچ بڑھانے کے نتیجہ میں اور پھر لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ وَ نُوۡرُھُمۡ پیچھے جب تحریک جدید کے سال کا آغاز کرتے ہوئے میں نے قرآن کریم کی ایک آیت آپ کے سامنے رکھی تھی اس میں نور کا وعدہ تھا، اس آیت میں بھی نور کا وعدہ ہے کہ انہیں صدیقیت کا مقام بھی ملے گا، شہادت کا مقام بھی ملے گا عِنۡدَ رَبِّھِمۡ اپنے رب کے حضور۔

لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ وَ نُوۡرُھُمۡ ان کے لئے ان کا اجر بھی ہے اور ان کا نور بھی ہے۔ اب ان کا اجر اور ان کا نور سے کیا مراد ہے؟ یہ مختصر بیان کر کے میں وقفِ جدید کی طرف واپس لوٹوں گا۔ اجر جو ہے وہ تو قربانیوں سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔ جس شخص میں جتنی توفیق تھی اس نے اس حد تک قربانی کی اور اللہ تعالیٰ نے اس شرط کے ساتھ کہ میں بڑھاؤں گا اور تمہاری توقعات سے بڑھ کر دوں گا اس کو پورا فرما دیا یہ تو اجر ہو گیا لیکن نُوۡرُھُمۡ انکا نور کیا ہے؟ دراصل ان کا نور ہی ہے جو اجر کا فیصلہ کرتا ہے اور نور سے مراد وہ دل کی پاکیزگی اور صفائی ہے جس کے ساتھ انسان ایک قربانی خدا کے حضور پیش کرتا ہے اور اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ جتنا وہ نور بلند ہوگا، روشن تر ہوگا خدا کے حضور خالص ہو کر چمکے گا اسی حد تک اس کے اجر کو بڑھا دیا جائے گا اور اجر کو اعزاز بخشا جائے گا۔

پس صدیقیت کا تعلق نور سے ہے اور شہادت کا بھی تعلق نور سے ہے۔ صالحیت کا اس تفصیل سے تعلق نہیں ہے نور کے ساتھ، جیسا ان دو مراتب کا ہے۔ اس لئے دیکھیں یہاں صرف دو ہی مراتب کا ذکر ہے صدیقیت کا اور شہادت کا اور نہ نبوت کا ہے نہ صالحیت کا ہے تو صالحیت جو عام روزمرہ کی نیکیاں ہیں انسان کو اس بلند مقام تک نہیں پہنچایا کرتیں جس کی پہلی سیڑھی شہادت ہے اور دوسری سیڑھی صدیقیت ہے اور چونکہ نبوت بالعموم اس طرح عطا نہیں ہوا کرتی وہ منصب ہی بالکل الگ ہے۔ اس لئے جہاں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی جزاء کا تعلق ہے وہاں نبوت کا ذکر سر فہرست فرما دیا لیکن جہاں روزمرّہ کی مومن کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ اس میں جو اعلیٰ درجے کی قربانیاں کرنے والے ہیں ان کو دو انعامات کا وعدہ فرمایا کہ تم میں صدیق بھی پیدا ہوں گے اور شہید بھی پیدا ہوں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑا احسان ہوگا۔

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ

اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ان کے لئے تو جہنم کے عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پس مالی قربانی کے جو مرتبے ہیں ان کو سمجھے بغیر حقیقت میں مالی قربانی کا جذبہ صحیح طریق پر بیدار ہو ہی نہیں سکتا اور ان مراتب کو سمجھنے کے نتیجہ میں مالی قربانی میں جو احتیاطیں ضروری ہیں ان سے بھی انسان واقف ہو جاتا ہے کیونکہ بسا اوقات مالی قربانی دیکھا دیکھی سے بھی ہو جاتی ہے۔ مالی قربانی میں مسابقت کا جائز شوق بھی شامل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن اگر نظر ان بلند مقامات کی طرف اور مراتب کی طرف ہو جن کا ذکر قرآن کریم نے فرمایا ہے تو مالی قربانی میں ایک نئی جلاء پیدا ہو جائے گی اور مالی قربانی ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

پس اس پہلو سے وقفِ جدید کے ذکر میں جب میں بعض مثالیں بھی دوں گا، بعض عظیم الشان قربانیوں کا ذکر بھی کروں گا تو ہرگز یہ مراد نہیں کہ اپنی قربانیوں کو محض اس غرض سے بڑھائیں کہ آپ کا ذکر چلے۔ اس غرض سے بڑھائیں کہ آپ میں مسابقت کی وہ روح پیدا ہو جو آپ کے لئے مطمع نظر بنا دی گئی ہے، جو آپ کا ماٹو قرار دے دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 111) تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے بنائی گئی ہو اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرۃ: 149) یہ جو آیت تھی یہ میرے ذہن میں تھی وہ دوسری آیت کا بھی اس مضمون سے تعلق ہے مگر میرے ذہن میں جو آیت تھی جو میں ڈھونڈ رہا تھا وہ یہ دوسری آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ہر ایک کے لئے ایک نصیب العین ہے جس کی وہ پیروی کرتا ہے اس کے لئے وہ پابند ہو جاتا ہے اس کے لئے وہ اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے، وہ قبلہ بن جاتا ہے جس کی طرف منہ پھیر لیتا ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ تمہارا نصب العین جن کی طرف تم نے اپنے چہرے پھیرنے ہیں، اپنی توجہات کو مرکوز کرنا ہے وہ ہے ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے بڑھو۔ پس اس جذبے کے ساتھ قرآن کریم نے ہمارا مقصد، ہمارا نصب العین ہی نیکیوں میں آگے بڑھنا قرار دے دیا ہے۔ اگر ایک انسان اپنے بھائی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ہرگز ریاکاری نہیں کہا جا سکتا، اسے ہرگز معمولی بات سمجھ کر ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس اعلیٰ نیت کے باوجود اس سے بھی بلند تر نیتیں ہیں اور ان میں سے اوّل یہ ہے کہ اللہ کا تصور ذہن پر حاوی ہو اور کوئی بھی چندہ

ایسا ادا نہ کیا جائے جس میں خدا کی محبت کی آمیزش نہ شامل ہو۔ اگر خدا کی محبت کی آمیزش شامل ہو جائے تو سب کچھ مل گیا پھر آگے بڑھنے کی توفیق بھی ملتی ہے اور غیر معمولی طور پر ملتی ہے اور اُس نصب العین سے اِس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے بلکہ اُس کو بڑھانے والی چیز ہے اور نیکیوں کو نور بنا دینے والا نسخہ یہی ہے کہ ہر نیکی کی نیت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اثر انداز ہو یعنی نیکیاں دراصل اللہ کی محبت سے پھوٹیں۔ وہ چیزیں جو نور سے پھوٹتی ہیں وہ نور ہی رہیں گی اور یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ کثیف ہو جائیں۔ پس اس پہلو سے آپ کو مختصرً النصیحت یہی ہے کہ جب یہ آپ کوائف سنیں گے اور قربانیوں کی دوسری تحریکیں بھی آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی تو ہمیشہ اللہ کی محبت کو اپنے دل میں پہلا مرتبہ دے کر اور اس کے حوالے سے قربانیوں کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ پھر خدا کے فضل سے آپ کی قربانیوں میں کبھی کوئی رخنہ نہیں آئے گا اور بے حد ایسی برکتیں شامل ہو جائیں گی جن کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے یعنی اجر کریم آپ کو عطا کیا جائے گا۔

وقف جدید کا یہ اکیالیسواں (41) سال ہے اور یکم جنوری 1997ء سے ہم بیالیسویں سال میں داخل ہونے والے ہیں۔ رپورٹوں کے معاملے میں گزشتہ سال بھی یہ شکایت تھی کہ بہت سے ممالک سست رفتاری سے رپورٹیں بھجواتے ہیں اور بسا اوقات ایسے ممالک بھی ہوتے ہیں جہاں جدید ترین طریق رسل و رسائل کے مہیا نہیں ہیں اس لئے جو نسبتاً بعد میں شامل ہونے والے ممالک ہیں ان کی تربیت میں ابھی زیادہ وقت درکار ہے اور ان کے ہاں وقفِ جدید کا نظام بھی اس طرح جاری نہیں جس طرح پہلے سے شامل ہونے والے ترقی یافتہ، تربیت یافتہ ممالک میں ہے۔ تو اگرچہ اس وقت جماعتوں کی تعداد یعنی ممالک کی تعداد غالباً ایک سو باون یا اس سے اوپر ہو چکی ہے تو اتنی بڑی تعداد میں سے صرف چھپن کا رپورٹیں بھجوانا بتاتا ہے کہ کتنا بڑا کام ابھی ہم نے کرنا ہے ان کی تربیت کا اور وقف جدید ہی کا ایک یہ مقصد ہے کہ دیہاتی اور نئے غیر تربیت یافتہ ممالک کی تربیت کی جائے۔

پس اس پہلو سے یہ جو بیالیسواں (42) سال ہے اس میں ہم اپنے سامنے ایک کام کا پہاڑ کھڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ چھپن ممالک نے رپورٹ بھیجی ہے اور اکثر جنہوں نے نہیں بھیجی یا تو کام بہت معمولی ہوا ہے یا ابھی وہ تربیت کے محتاج ہیں۔ تو ان چھپن ممالک نے تقریباً ایک سو چھپن کی تربیت کرنی ہے اور یہ جو چندہ ملے گا یہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہی مقاصد پر خرچ ہوگا۔ وقفِ جدید میں جو

بیرون کا چندہ ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے یہ زیادہ تر ہندوستان اور افریقہ پر خرچ ہوتا ہے اور زیادہ تر کیا تمام تر کہنا چاہئے، ہندوستان اور افریقہ پر خرچ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان سے بھی وقفِ جدید کے چندوں میں جو بچت ہوتی ہے وہ بیرونی ممالک میں خرچ کے لئے بھیجنے لگے ہیں۔تو یہ سعادت ان کی ابھی قائم ہے کہ بیرونی دنیا پر خرچ کرنے میں کوئی بار محسوس نہیں کرتے، کوئی کمزوری نہیں پاتے اور بڑے حوصلے اور خوشی کے ساتھ پاکستان سے باہر کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں۔

مغربی دنیا میں بھی اب بہت حد تک یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ اپنے غریب بھائیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں بہت حوصلے اور وسعت قلب کے ساتھ حصہ لیتے ہیں اور کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا جاتا کہ اتنا چندہ ہم نے دیا تھا ہم پر اتنا کیوں خرچ نہیں ہوا، اتنا بڑا حصہ دوسرے ممالک کو کیوں دے دیا گیا یہ سوچ ہی بیمار سوچ ہے جو احمدیت میں خدا کے فضل سے پنپنے کی گنجائش ہی نہیں رکھتی، توفیق ہی نہیں رکھتی۔ایک آدھ ملک میں جب یہ بیماری پیدا ہوئی اور میں نے اسی وقت ان کو پکڑا تو اس کے بعد وہ بالکل اس طرح مٹ گئی جیسے ان کی جڑیں اکھیڑ دی گئی ہوں پھر کبھی اس وہم نے ان کے خیالات میں پراگندگی پیدا نہیں کی۔

تو اس کو بھی آپ یاد رکھ لیں کہ ہمارے چندے خدا کی خاطر ہیں اور یہ ساری دنیا خدا نے پیدا کی ہے۔اسلام عالمگیر مذہب ہے اسلام کے تقاضے، ضرورت کے تقاضے دنیا میں کہیں بھی پیدا ہوں گے۔پس یہ بحث نہیں ہے کہ چندہ کس نے دیا ہے اور کہاں خرچ ہونا چاہئے یعنی کس نے دیا ہے کی بحث نہیں ہے اور یہ بحث نہیں ہے کہ جس نے دیا ہے اسی پر خرچ کیا جائے۔ یہ بحث ضرور رہے گی کہ اس وقت عالمی تقاضوں کے لحاظ سے کس ملک کو زیادہ ضرورت ہے اور کون سا ملک ہے جو تیز رفتاری کے ساتھ سچائی کی طرف متوجہ ہو رہا ہے اور اسی نسبت سے اس کی ضرورتیں بڑھ رہی ہیں۔ پس خرچ میں ہمیشہ جماعت احمدیہ نے اس بات کو راہنما رکھا ہے اور یہ بات بے تعلق سمجھی ہے اور ہمیشہ بے تعلق سمجھی جائے گی کہ کس نے زیادہ دیا تھا اور کس نے کم دیا تھا۔ضرورت جہاں زیادہ ہے وہاں زیادہ خرچ کیا جائے گا اور ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔

پس اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بیرونی دنیا کا چندہ پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے چندوں سے اب خدا کے فضل سے بہت بڑھ چکا ہے اور عین اس وقت یہ برکت ملی ہے جب کہ

ضرورت بہت شدید ہوگئی تھی۔ مثلاً ابھی میں نے افریقہ کے ممالک کا دورہ کروایا ہے تو پتا چلا کہ بہت بڑی بڑی جماعتیں ہیں جن سے ابھی تک ہمارا ڈش انٹینا کے ذریعہ بھی رابطہ نہیں ہو سکا اور جو نمائندے میرے گئے انہوں نے محنت کی بہت دور دراز کے گہرے علاقوں میں گئے اور بعض رپورٹوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ دیکھ کر اس طرح ان کے چہرے چمک اٹھے کہ اچھا ہمارا بھی خیال ہے ان کو لیکن ایک خوش کن بات جو سب جگہ دکھائی دی، وہ یہ تھی کہ ایسے علاقے جن میں کثرت سے بیعتیں ہوئی تھیں اور دو تین سال پہلے ہوئی تھیں۔ جب وہاں رابطہ کیا گیا تو تمام تر احمدیت پر قائم تھے اور بڑے خلوص سے قائم تھے اور انہوں نے کھلم کھلا یہ کہا کہ ہم نے تو سچ سمجھ کر قبول کیا ہے۔ اگر آپ ہماری طرف توجہ نہ بھی کرتے تو احمدیت پر ہم نے قائم ہی رہنا تھا۔ مگر ہمیں پورا پتا ہی نہیں کہ احمدیت ہے کیا، تفاصیل کا علم نہیں ہے۔ اس لئے آپ کا فرض تھا ہمیں پوچھتے اور ہماری ضروریات پوری کرتے۔ چنانچہ ان سب جگہوں میں ایک تو میں نے یہ ہدایت کی کہ ڈش انٹیناز لگائے جائیں کثرت کے ساتھ اور مرکزی انتظام کے تابع روزانہ اس علاقے کے باشندے ایک جگہ اکٹھے ہو سکیں۔

دوسرا یہ کہ وہاں ان کے لئے بڑی مساجد بننی چاہئیں۔ ایسے مراکز بننے چاہئیں جہاں ان کی تربیت کا انتظام ہو اور انہی میں سے مبلغین بنائے جائیں اور پھر ان کو انہی علاقوں میں مستقل جگہوں پر مقرر کر دیا جائے۔ یہ ضرورتیں جو ہیں یہ اتنی زیادہ ہیں کہ جس علاقے میں یعنی افریقہ میں جہاں دس لاکھ سے اوپر احمدی ہوئے ہوں ایک سال میں وہاں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی کم سے کم ضرورتیں پوری کرنے پر بھی کتنے خرچ کی ضرورت ہوگی اور چونکہ پچھلے سال یہ خرچ بہت بڑھے اس لئے میرے دل میں یہ فکر تھی، میں بار بار ان سے پوچھتا تھا کہ وقفِ جدید کے چندے میں سے کتنا باقی رہ گیا ہے اور نئی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہم کہاں کہاں سے روپیہ سمیٹ سکتے ہیں۔

اب خدا تعالیٰ نے کس طرح مدد فرمائی ہے اور جس ملک کے ذریعے مدد فرمائی ہے اس ملک کی انتظامیہ کے بھی خواب و خیال میں نہیں تھا کہ یہ عظیم کارنامہ خدا ہمارے ہاتھوں سرانجام دلوائے گا۔ چنانچہ سرفہرست آج اس سال کی قربانی میں امریکہ ہے اور اتنی عظیم وقفِ جدید میں قربانی کی توفیق ملی ہے کہ امیر صاحب جب فون پہ مجھے بتا رہے تھے تو کہتے تھے میں تو حیران ہوں کہ کیا ہوا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ خاموشی کے ساتھ اتنا روپیہ اکٹھا ہو چکا ہوگا کہ جب وہ

رپورٹ پیش ہوئی تو میرے دل میں ایک ہیجان برپا ہو گیا کہ ہوا کیا ہے۔ اب آپ سوچیں پہلی بات تو یہ دیکھیں کہ خدا تعالیٰ نے ہر چندے میں، ہر ملک میں برکت ڈالی ہے اور امسال گزشتہ سال کے مقابل پر بہت زیادہ عطا کیا ہے۔

وعدہ جات کے لحاظ سے جو 1996ء کے وعدہ جات ہیں وہ چار کروڑ بتیس لاکھ اکتالیس ہزار تین سو باون روپے بنتے ہیں۔ 1996ء کا یہ جو سال گزرا ہے ابھی، وعدہ جات چار کروڑ اور بتیس لاکھ۔ وصولی سات کروڑ بائیس لاکھ ستائیس ہزار آٹھ سو چھپن۔ اب یہ کیسے ہو گیا کچھ سمجھ نہیں آرہی کیونکہ وقفِ جدید کے وعدے آگے ہوتے تھے وصولی پیچھے پیچھے جایا کرتی تھی اور سٹرلنگ میں یہ وعدے چھ لاکھ پچپن ہزار ایک سو بہتر پاؤنڈ تھے جب کہ کل وصولی دس لاکھ چورانوے ہزار تین سو اکسٹھ پاؤنڈ ہے اور ایک نیا سنگ میل جو اس سال رکھا گیا ہے وہ امریکہ کی طرف سے ہے۔ تمام دنیا کی وصولی، سارے یورپ کی وصولی ملا کر، پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش کی وصولی ملا کر دس لاکھ چورانوے ہزار تین سو اکسٹھ پاؤنڈ ہے۔

اب یاد رکھ لینا اچھی طرح ساری دنیا کی وصولی دس لاکھ چورانوے ہزار تین سو اکسٹھ پاؤنڈ ہے۔ اس میں سے امریکہ کی وصولی اس میں پانچ لاکھ چونسٹھ ہزار ایک سو اکسٹھ پاونڈ ہے یعنی تمام دنیا کے چندوں سے وہ اکیلا آگے بڑھ گیا ہے۔ پچھلے سال میں ان کی تعریف کر رہا تھا کہ انہوں نے جرمنی کو بھی شکست دے دی، پاکستان سے بھی کچھ کچھ آگے نکل گئے لیکن قریب قریب کی دوڑ تھی۔ اب وہ اتنا پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ باقی لوگ اب بس ان کے لئے دعائیں ہی کریں گے اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے اب اور امریکہ کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ آج سے دس سال پہلے یعنی میری ہجرت کے آنے کے دو سال بعد تک بلکہ تقریباً تین سال بعد تک ان کا کل چندہ سارے امریکہ کا اتنا ہی تھا جتنا آج وقفِ جدید کا ہے اور جب انہوں نے بتایا تو میں نے فوراً پوچھا میں نے کہا مجھے تو جہاں تک یاد پڑتا ہے نو لاکھ چھتیس ہزار ڈالر آپ کا کل چندہ بھی نہیں تھا۔ تو پھر امیر صاحب نے اس کو باقاعدہ جائزہ لے کر اعداد و شمار کا اس بات کی تائید کی ہے، اس کی توثیق فرمائی ہے کہ ہمارا کل چندہ دس سال پہلے اتنا نہیں تھا اور یہ توفیق کیسے بڑھی۔ سوال یہ ہے کہ یہی لوگ تھے، اسی قسم کے لوگ تھے جو پہلے بھی امریکہ میں رہا کرتے تھے، مالی حالات بعض دفعہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ وقت کے ساتھ بڑھیں بعض دفعہ پیچھے بھی چلے جاتے

ہیں چنانچہ ڈاکٹر جو وہاں سب سے زیادہ امیر طبقہ ہے ان کے مالی حالات پہلے سے خراب ہوئے ہیں، ایک زمانے میں تو امریکہ میں ڈاکٹر ہونا سونے کی کان کا مالک ہونا تھا لیکن اب بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ڈاکٹروں کی آمد میں کمی آئی ہے لیکن ان کے چندوں میں اضافہ ہوا ہے۔ تو جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک عمومی سا وعدہ تھا کہ ہم بڑھائیں گے اب یہ نکتہ بھی سمجھ آیا کہ تمہاری توفیق مالی ہی نہیں بڑھائیں گے بلکہ تمہارے حوصلے بھی بڑھائیں گے، اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق میں وسعت دیں گے اور کبھی بھی تمہیں پیچھے نہیں جانے دیں گے۔ جو تم آگے قدم اٹھا چکے ہو اس سے اور آگے بڑھو گے، واپسی کی طرف نہیں دھکیلے جاؤ گے اور کوئی ایسے حالات نہیں ہوں گے جو تمہیں مجبور کر دیں کہ پہلے سے کم ہو جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ جو خدا کا سلوک ہے دنیا کی ہر اس جماعت سے ہے جو مالی قربانی میں آگے بڑھتی ہے، حوصلہ کرتی ہے اور اچانک اس کی توفیق بڑھ جاتی ہے۔

اب جہاں تک تفصیلات کا تعلق ہے سب تفاصیل تو اس وقت پیش کرنا پیش نظر نہیں ہے مگر مختصر موازنہ میں عرض کرتا ہوں۔ گزشتہ سال 1995ء میں پانچ لاکھ ستہتر ہزار سات سو نوے پاؤنڈ کا وعدہ تھا۔ امسال 1996ء چھ لاکھ پچپن ہزار ایک سو بہتر پاؤنڈ کا وعدہ تھا۔ وعدہ کے لحاظ سے اضافہ ستہتر ہزار تین سو بیاسی پاؤنڈ ہوا۔ وصولی کے لحاظ سے گزشتہ سال چھ لاکھ ستر ہزار نو سو تیرہ پاؤنڈ کی وصولی تھی۔ امسال خدا کے فضل سے دس لاکھ چورانوے ہزار تین سو اکسٹھ پاؤنڈ کی وصولی ہے۔ جس میں سب سے زیادہ حصہ امریکہ نے لیا ہے۔ تعداد کے لحاظ سے بھی بہت برکت ملی ہے۔ میں پہلے بھی بارہا عرض کر چکا ہوں کہ وقفِ جدید کے تعلق میں تعداد بڑھانے کی طرف توجہ بہت زیادہ دیں۔

مالی ضرورتیں جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ثابت بھی کر کے دکھایا ہے اللہ تعالیٰ آپ ہی کچھ کرتا رہتا ہے ہمیں تو پتا بھی نہیں لگتا۔ یاددہانی کراؤ نہ کراؤ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ از خود ہی دلوں میں ایسی تحریک اٹھ جاتی ہے اور انتظامیہ کو خدا تعالیٰ ایسی ہمت عطا فرما دیتا ہے کہ چندے جتنی ضرورت ہے وہ مل ہی جاتے ہیں اور اب تو بعض دفعہ لگتا ہے ضرورت سے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن جب سال ختم ہوتا ہے تو ضرورت پھر چندوں سے جا ملتی ہے۔ تو یہ بھی ایک مسابقت کی دوڑ ہو رہی ہے جماعت کے چندوں اور جماعت کی ضروریات میں۔ تو گزشتہ سال وصولی کا جہاں تک تعلق ہے چھ لاکھ ستر ہزار تھی۔ دس لاکھ چورانوے ہزار اس دفعہ ہوئی اور تعداد کے لحاظ سے گزشتہ سال ایک لاکھ

چھیالیس ہزار چار سو باسٹھ افراد تھے اور امسال ایک لاکھ ستر سٹھ ہزار چار سو ترانوے افراد ہیں جو شامل ہوئے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ بہت بڑی تعداد، ہزارہا کی تعداد میں ایسے دوست پیدا ہوئے ہیں جن کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا چسکا پڑ گیا ہے کیونکہ جو ایک دفعہ خرچ کرے وہ پھر پیچھے نہیں ہٹا کرتا، اس کو واقعۃً چسکا پڑ جاتا ہے۔

دس سال پہلے، میں نے جیسا کہ بیان کیا تھا، امریکہ کا کل بجٹ آٹھ لاکھ پینتیس ہزار تھا اور اب وقف جدید کا بجٹ نو لاکھ چھتیس ہزار آٹھ سو ڈالر ہو چکا ہے اور انہوں نے اتنی احتیاط سے اعداد و شمار اکٹھے کئے ہیں کہ ساتھ تیس سینٹ بھی لکھا ہوا ہے، نو لاکھ چھتیس ہزار پانچ سو آٹھ ڈالر تیس سینٹ۔ تو خدا تعالیٰ نے بہت برکت دی ہے جماعت کے اخلاص میں اور کوششوں میں اور صرف ان باتوں ہی میں نہیں باقی بہت سی اور باتوں میں بھی خدا کے فضل سے امریکہ کا قدم ترقی کی طرف ہے اور ہونا بھی ایسا چاہئے تھا کیونکہ امریکہ دنیا کے امیر ترین ممالک میں سے ہے اور وہاں ابھی بھی ایسے احمدی موجود ہیں جن کو اگر آمادہ کیا جائے کچھ اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے پر تو اللہ تعالیٰ ان کے دل کی توفیق بھی بڑھائے گا اور ان کی مالی توفیق اس وقت بھی ان چندوں سے پیچھے ہے کیونکہ اسی قسم کے حالات کے لوگ بکثرت موجود ہیں اور جب ہم موازنہ کرتے ہیں تو انہی میں سے بعض ایسی حیرت انگیز قربانیاں کرنے والے ابھرے ہیں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ توفیق ہو ہی نہ اور قربانیاں دے رہے ہوں اور جنہوں نے بھی دیں ان کے مالوں میں کمی کہیں نہیں آئی، برکت ہی ہے جو بڑھتی چلی جارہی ہے۔ تو آج امریکہ سب دنیا کی جماعتوں میں صف اول پر کھڑا ہے۔ اگر پاؤنڈوں میں اس کا حساب کیا جائے تو پانچ لاکھ چونسٹھ ہزار ایک سو اکسٹھ پاؤنڈ ان کا چندہ وصولی ہے جب کہ باقی سب دنیا کی جماعتوں کی اتنی وصولی نہیں۔

دوسرے قدم پر پاکستان ہے اور تیسرے پر جرمنی ہے۔ برطانیہ کو چوتھی پوزیشن حاصل ہے جو غالباً ایک عرصے سے چلی آرہی ہے اور کینیڈا کو پانچویں پوزیشن حاصل ہے۔ اب برطانیہ اور کینیڈا کا فرق تھوڑا رہ گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس رفتار سے کینیڈا مسلسل برطانیہ کے قریب آرہا ہے بعید نہیں کہ اگلے سال آگے نکل جائے۔ ہندوستان چوبیس ہزار پانچ سو ستائیس پاؤنڈ وصولی ہے جو ہندوستان کے لحاظ سے بہت تعجب انگیز ہے۔ چودہ لاکھ چونسٹھ ہزار روپے انہوں نے دیئے جو

ہندوستان کے پرانے زمانوں کے چندوں کے لحاظ سے جو دس سال پہلے کے جو چندے اس میں اتنے بنتے نہیں تھے ان کے، تو امریکہ کی طرح ہندوستان کو بھی خدا تعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کرنے کی بہت توفیق عطا فرمار ہا ہے۔

انڈونیشیا میں سمجھتا ہوں ابھی اپنی توفیق سے پیچھے ہے کیونکہ ہندوستان کے مقابل پر انڈونیشیا کے احمدیوں کے مالی حالات بہت بہتر ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے جو فرق پڑا ہے وہ ہندوستان کی تبلیغ کے نتیجے میں فرق پڑا ہے ورنہ پہلے تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ تقریباً انڈونیشیا کی جماعتیں ہندوستان کی تعداد کے مقابل پر نصف تھیں بلکہ نصف سے کچھ زیادہ اور چندوں میں اتنا فرق کہ وقفِ جدید میں ہندوستان نے ساڑھے چوبیس ہزار پاؤنڈ پیش کئے، انڈونیشیا نے صرف آٹھ ہزار چھ سو نوے۔ تو یہ صاف پتا چل رہا ہے کہ وہاں ابھی تک ہمارے نظام جماعت میں پوری بیداری نہیں اور پورا انتظام نہیں ہے ورنہ امریکہ یا ہندوستان کے مقابل پر انڈونیشیا کی جماعت کی اخلاص کی حالت پیچھے نہیں ہے۔ بعض دفعہ تو لگتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ دنیا میں مخلص ہیں۔ اس قدر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور جماعت اور اسلام سے محبت رکھنے والے لوگ ہیں کہ بہت سے ہیں ان میں جو ذکر کے ساتھ ہی رونے لگتے ہیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار محبت کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

تو جہاں اخلاص موجود ہو وہاں اگر قربانی میں لوگ پیچھے رہ رہے ہوں تو یقین جانیں کہ انتظامیہ کی خرابی ہوا کرتی ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں بھی میں نے انتظامیہ بدلائی ہے اور ان کو توجہ دلائی ہے تو فوری طور پر جماعت نے اپنی قربانیوں کو بہت آگے بڑھا دیا۔ پس اس پہلو سے امریکہ کی انتظامیہ بھی دعا کی مستحق ہے، اس معنی میں جزاء کی مستحق کہ ہم بھی ان کے لئے دعا کریں کہ انہوں نے اپنے انتظام کو بہت بہتر بنالیا اور جماعت کے اخلاص کو جو موجود تھا اس کو اب اس راہ میں گویا جیسے جوت دیا جائے اس طرح اخلاص کو پہلے سے بڑھ کر جوتا جا رہا ہے۔ ماریشس اپنی تعداد کے لحاظ سے قربانی میں ہمیشہ بہتر ہوتا ہے مگر امسال وقفِ جدید میں اتنی نمایاں بہتری نظر نہیں آئی کیوں کہ بیلجیئم جو اس کے مقابل پر ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو ابھی نئی نئی بن رہی ہے گویا کہ ماریشس اور بیلجیئم کا چندہ تقریباً برابر ہے۔ ماریشس کا چار ہزار نو سو ستر ہ اور بیلجیئم کا چار ہزار آٹھ سو سینتیس۔ ناروے جو چھوٹے ممالک میں سے آگے بڑھنے والا ایک ملک ہے۔ ناروے خدا کے فضل

سے چار ہزار چھ سو بانوے پاؤنڈ چندہ وقفِ جدید میں دے کر دسویں نمبر پر رہا ہے۔

فی کس مالی قربانی کے لحاظ سے بھی باوجود اس کے کہ امریکہ میں چندہ دہندگان کی تعداد بہت بڑھائی گئی ہے۔ بہت بڑھائی گئی ہے اس دفعہ، پھر بھی مالی قربانی کو اگر تقسیم کیا جائے فی چندہ دہندہ تو امریکہ باقی سب ملکوں سے آگے نکل گیا ہے۔اس سے پہلے جاپان اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان بات رہا کرتی تھی۔شروع میں جاپان آگے تھا پھر سوئٹزرلینڈ نے وہ جگہ لے لی اور گزشتہ دو چار سال سے سوئٹزرلینڈ نے قبضہ کیا ہوا تھا کہ فی کس چندہ دہندہ قربانی میں ہم دنیا میں کسی کو آگے نکلنے نہیں دیں گے اور اب دیکھیں کتنا فرق پڑ گیا ہے۔امریکہ میں فی کس قربانی کا معیار اب ایک سو چوبیس پاؤنڈ اور سات پینی بنتا ہے اور سویٹزرلینڈ میں ستر پاؤنڈ ستانوے پینی۔تو اس پہلو سے بھی بہت آگے بڑھ گیا ہے خدا کے فضل سے امریکہ فی کس چندہ دہندہ کی مالی قربانی کے لحاظ سے اور جاپان اکتیس پاؤنڈ تیس پینی کے چندے کے ذریعہ نمبر تین پر آیا ہے اور بیلجیئم اللہ کے فضل کے ساتھ انیس پاؤنڈ تینتالیس پینی دے کر چوتھی پوزیشن حاصل کر گیا ہے اور جرمنی پانچویں پوزیشن پر گیارہ پاؤنڈ پچاس پینی فی کس کے لحاظ سے دے کر اللہ کے فضل سے اعزاز حاصل کر گیا لیکن جرمنی کے متعلق میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ خدا کے فضل سے ان کے چندے اتنے متوازن ہیں اور بالعموم مالی قربانی میں ساری جماعت کثرت سے حصہ لے رہی ہے اس لئے وہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی تحریک میں غیر معمولی طور پر آگے نکل جائیں۔جن ممالک نے مثلاً امریکہ نے اپنے لئے یہ ایک ٹارگٹ پہلے سے بنا رکھا تھا کہ دنیا میں ایک چندے میں تو ہم نے باقی سب کو لازماً پیچھے چھوڑنا ہے، اس اخلاص کی نیت کو خدا نے یہ پھل دیا ہے کہ وہ اتنا آگے نکل گئے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا آگے جا سکتے ہیں۔مگر جرمنی کو یہ کہنا کہ تم وقف جدید میں بھی ان سے مقابلہ کر کے آگے نکلنے کی کوشش کرو یہ میرے نزدیک مناسب مطالبہ نہیں ہے کیونکہ عموماً جرمنی کی جماعت اتنی بڑی قربانی دے رہی ہے کہ اس کی وجہ سے خدا کے فضل سے بہت سے دوسرے ممالک کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور جرمنی میں بھی جو بڑھتی ہوئی ضروریات ہیں ان میں جرمنی خود کفیل ہے۔

بالغان کے چندے کی جو دوڑ ہوا کرتی ہے پاکستان کے اندران میں ربوہ خدا کے فضل سے اول رہا ہے، کراچی دوم اور لاہور سوم۔ جہاں تک اضلاع کے مقابلے کا تعلق ہے پاکستان کے اضلاع

کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی آپس کی دوڑ میں اب ان کی کیا پوزیشن ہے۔ راولپنڈی فرسٹ ہے جو میرے لئے بہت تعجب کی بات ہے کیونکہ میں سمجھا کرتا تھا کہ راولپنڈی ان باتوں میں کافی پیچھے ہے مگر معلوم ہوتا ہے کوئی نئی تحریک وہاں اٹھی ہے جس کی وجہ سے خدا کے فضل سے راولپنڈی کی جماعت کا یہ اعزاز مل گیا کہ وہ سارے پاکستان میں ضلعی لحاظ سے اوّل آئی ہے اور سیالکوٹ نمبر دو۔ یہ بھی تعجب کی بات ہے کیونکہ سیالکوٹ تو کافی نکما ہو گیا تھا بے چارہ۔ اب معلوم ہوتا ہے اٹھ رہے ہیں کچھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ جو سیالکوٹی میرے سامنے بیٹھے ہیں وہ مسکرا رہے ہیں کہ شکر ہے ہماری بات بھی آ گئی کہیں۔ فیصل آباد نمبر تین پر ہے اور اسلام آباد نمبر چار پر۔ اسلام آباد کے لئے قابلِ شرم ہے کیونکہ بڑی منظّم جماعت اور مالی لحاظ سے بھی اچھی متوسط جماعت ہے۔ فیصل آباد ان کو پیچھے چھوڑ جائے، سیالکوٹ پیچھے چھوڑ جائے یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ گوجرانوالہ ماشاءاللہ ہمت کر کے آگے آیا ہے پانچویں نمبر پر آ گیا ہے۔ گجرات چھٹے نمبر پر ہے اور سرگودھا ساتویں نمبر پر اور شیخوپورہ آٹھویں نمبر پر اور کوئٹہ نویں پر اور عمر کوٹ سندھ دسویں نمبر پر۔ یہ جو اضلاع ہیں نچلے مرتبے کے اضلاع ہیں، ان میں مَیں سمجھتا ہوں کہ ابھی بہت گنجائش موجود ہے۔ سیالکوٹ میں بھی ہے، فیصل آباد میں بھی ہے، اسلام آباد میں تو ہے ہی، گوجرانوالہ، گجرات وغیرہ یہ سارے وہ اضلاع ہیں جو میں نظری طور پر جانتا ہوں کہ جتنی خدا نے ان کو تعداد عطا کی ہے احمدیوں کی اور جو مالی توفیق بخشی ہے عین اس کے مطابق چندے دکھائی نہیں دے رہے۔

دفتر اطفال میں لاہور خدا کے فضل سے اول آ گیا ہے، ربوہ دوم ہے اور کراچی سوم۔ یہ تو ہے وقفِ جدید کی رپورٹ۔

میں اس وقت ہندوستان کی جماعتوں کو جو اس وقت جلسے میں بطور خاص اس جمعہ میں حاضر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ جمعہ تو بالخصوص ہمارے لئے وقف ہے ان کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ وقف جدید کے کام کو آپ وہاں بڑی تیزی سے بڑھائیں اور منظّم کریں کیونکہ آپ کی اکثر تبلیغ اس وقت وقفِ جدید کے ذریعے ہو رہی ہے اور بہت سی پھیلتی ہوئی نئی ضرورتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے وقفِ جدید نے سنبھال رکھا ہے تو اس کو اہمیت دیں اور جن اضلاع میں آپ کی تبلیغ کے لحاظ سے کمزوری ہے ان کی فہرست میں پڑھنا نہیں چاہتا اس وقت ان کی طرف متوجہ ہوں اور وقف جدید کے

نظام کو جو بیرونی طاقت مل رہی ہے باہر سے ٹیکہ مل رہا ہے یہ کوشش کریں کہ آپ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو کر اس مدد سے مبرّا ہو جائیں اس مدد کے محتاج نہ رہیں۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ قادیان ہی نے تو سب دنیا کو دینی ضرورتوں کے لحاظ سے پالا ہے۔ ہندوستان ہی کو لمبے عرصے تک یہ فخر حاصل رہا ہے کہ جب باہر کی دنیا چندوں سے تقریباً نا آشنا تھی تمام دنیا کی ضرورتیں ہندوستان پوری کرتا تھا۔ پھر پاکستان نے ہجرت کے بعد یہ عظیم خدمت اپنے ہاتھوں میں لی، خوب سنبھالا، خوب حق ادا کیا۔ تو ہندوستان کے تعلق میں چونکہ پرانی غیرتیں ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہندوستان میں پیدا ہونا ہے اس محبت کے تقاضے کے طور پر میری دلی خواہش یہی رہتی ہے کہ ہندوستان کو پھر وہ پرانی عظمتیں نصیب ہو جائیں۔ تو اس پہلو سے وقفِ جدید بھی ایک ذریعہ بن گئی ہے ہندوستان کی پرانی کھوئی ہوئی عظمتوں کو واپس حاصل کرنے کا تو اس کی طرف آپ متوجہ ہوں اور اللہ توفیق عطا فرمائے کہ آپ کے اندر کثرت کے ساتھ وہ ولی پیدا ہو جائیں جن ولیوں کا حضرت مصلح موعودؓ نے وقفِ جدید کے تصور میں ذکر فرمایا ہے۔

وقف جدید کا تعلق ولائیت سے حضرت مصلح موعودؓ نے رکھا اور جو نقشہ کھینچا ہے اپنے اس روحانی خواب کا وہ یہ ہے کہ جگہ جگہ بڑے بڑے اولیاء اور قطب پیدا ہو رہے ہیں۔ دیہات میں اور گاؤں گاؤں میں رازی پیدا ہو رہے ہیں۔ تو وقفِ جدید کی تحریک تو بالکل عمومی، عام سی ایک دنیا کی نہیں دین کے لحاظ سے پسماندہ دیہات کی تحریک تھی مگر جو مقاصد تھے وہ اتنے بلند تھے کہ گاؤں گاؤں میں رازی پیدا ہوں، گاؤں گاؤں میں اولیاء اللہ اور قطب پیدا ہونے شروع ہو جائیں اور فرمایا آغاز ہی میں آپ نے جو نقشہ کھینچا اپنے دل کا، فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ وقفِ جدید کے ذریعے گاؤں گاؤں اولیاء اللہ پیدا ہوں اور اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ میں خود نگرانی کروں اور باقی تنظیمیں ہیں ان کی طرح نہیں بلکہ براہ راست معلمین پر نظر رکھوں، ان سے رابطہ رکھوں اور جب تک صحت نے توفیق دی آپ بہت حد تک یہ کام کرتے رہے پھر وہ توفیق نہ رہی کیونکہ بہت بیمار ہو گئے تھے مگر یہ آپ کے ارادے اور خواہشات تھیں۔

پس اس پہلو سے میں سمجھتا ہوں کہ صدیقیت کا جو ذکر میں نے کیا ہے قرآن کریم کی آیت میں، یہ وہی صدیقیت والا نقشہ ہے جو حضرت مصلح موعودؓ کے ذہن میں پیدا ہوا۔ وہی خواب ہے جو

آپ نے دیکھا تھا۔ وقفِ جدید کا ولائیت سے تعلق قائم کرنا اور تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ آج ہی سوال و جواب کی مجلس میں کسی نے یہ سوال چھیڑا تو میں نے کہا دیکھیں ہم ولی تو نہیں پیدا کر سکتے کیونکہ ولائیت تو صرف اللہ عطا کرتا ہے۔ صدیق بھی کوئی زور بازو سے نہیں ہوسکتا اللہ ہی عطا کرتا ہے مگر لوگوں کو یاد دلاتے رہنا چاہئے یہ کام ہمارا فرض ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وقفِ جدید کو پہلے سے بڑھ کر اس طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ اپنے تمام کارکنوں پر نظر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ جن جماعتوں میں وقفِ جدید کا کام ہو رہا ہے وہاں اولیاء اللہ پیدا ہو رہے ہیں کہ نہیں۔ پس اگر یہ مطمع نظر بنا رہے تو میں امید رکھتا ہوں کہ پھر زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ، اپنے ذہن میں اس مقصد کو حاضر رکھتے ہوئے زیادہ امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایسے بندے اس کی نگاہ میں آ جائیں اور اس کا وہ قرب حاصل کریں جسے ولایت کہا جاتا ہے۔

جہاں تک یورپ کی نئی ضرورتوں کا تعلق ہے اس میں وقفِ جدید کا کوئی خرچ نہیں ہو رہا اور نہ نئی تحریک میں مَیں نے یہ ذکر کیا تھا کہ یورپ میں بھی خرچ کیا جائے مگر وہ ضرورتیں بالعموم خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ چندوں سے پوری ہو رہی ہیں اور جماعت یورپ جو اپنے چندے بڑھا رہی ہے اس کے ساتھ اکثر ان کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ مگر مشرقی یورپ میں ابھی تک جو مشن ہاؤسز کا قیام یعنی جماعتی مراکز کا قیام، نئی مسجدیں بنانا یہ ایسے کام ہیں جن کے لئے اب ہمیں نئی مالی ضرورت درپیش ہے اور یہ چونکہ ایسی ضرورت نہیں ہے جو مستقل چندے کی شکل میں جماعت سے طلب کی جائے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھار اچانک پیدا ہونے والی ضرورتوں کے لئے کوئی تحریک کی جاسکتی ہے اور وہی کافی ہوگی۔

اس وقت جو ہمیں زیادہ ضرورت ہے وہ البانیہ میں ہے جہاں بکثرت احمدیت پھیلی ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے مشرقی ممالک جہاں خدا تعالیٰ کے فضل سے توجہ ہو رہی ہے ان میں البانین سپیکنگ دوسری قومیں، دوسرے ممالک میں بستی ہیں پھر بوسنین ہیں ان کی طرف بھی بہت توجہ ہے، ان کی بھی بہت توجہ ہے۔ ان سب کا بنیادی حق ہے کہ وہاں مساجد بنائی جائیں، وہاں مراکز قائم کئے جائیں، وہاں تربیتی اجتماعات کا مستقل انتظام ہو اور انہی میں سے معلم تیار کئے جائیں۔

پس اس سال کے لئے میں جماعت کے سامنے پندرہ لاکھ ڈالر کی تحریک کرتا ہوں اور جیسا

کہ میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا میں نے یہ نیت کی ہے اللہ تو یہ توفیق عطا فرما دیتا ہے کہ جو بھی تحریک کروں اس کا سواں حصہ میں خود دوں اور یہ بتانے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ میں بتاؤں کہ میں یہ کر رہا ہوں۔ یہ مقصد ہے کہ بعض لوگ بوجھ سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ نئی نئی تحریکیں پیش کی جارہی ہیں ان کے دل کی تسلی کے لئے ان کو بتارہا ہوں کہ میں شامل ہوتا ہوں تو تحریک کرتا ہوں ورنہ میں یہ سمجھتا کہ مجھے حق نہیں تھا۔ تو اس پہلو سے میرا تجربہ ہے کہ جب بھی زیادہ تحریکیں کی ہیں خدا نے مالی وسعتیں خود بخود عطا کر دی ہیں تو اس لئے اس معاملے میں مجھے ذرا بھی وہم نہیں کہ میں کوئی ایسا بوجھ ڈال رہا ہوں جس کو جماعت اٹھا نہیں سکتی۔ یہ جانتا ہوں کہ جب بھی کوئی مزید تحریک کی جاتی ہے اللہ میری وسعت کو بھی بڑھاتا ہے، آپ کی وسعت کو بھی بڑھاتا ہے۔

تو پھر اگر ضرورت حقہ ہے اور جائز ہے تو تحریک میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے۔ مگر چونکہ عام چندوں کی ذمہ داریاں بہت جماعت نے اٹھا رکھی ہیں اس لئے اس تحریک کو بھی بعض دوسری تحریکات کی طرح اس طرح پیش کر رہا ہوں کہ وہ سب احمدی جو عام چندوں میں حسب توفیق حصہ لے رہے ہیں اور ان کے لئے زیادہ بوجھ اٹھانا ممکن نہیں ہے وہ محض تبرک کی خاطر کچھ نہ کچھ دے کر اس میں شامل ہو جائیں اور وہ صاحب حیثیت جن کو خدا تعالیٰ نے بڑی توفیق عطا فرمائی ہے وہ اپنی توفیق کے مطابق خود فیصلہ کریں اور وہ زیادہ تر اس کا عمومی بوجھ اٹھانے کے لئے آگے آئیں۔

جیسا کہ میرا سابقہ تجربہ ہے یہ انشاء اللہ دیکھتے دیکھتے وعدے وصول ہو جائیں گے اور میں امید رکھتا ہوں کہ پہلے سال دو تہائی اور دوسرے سال اس کا ایک تہائی وصولی کی صورت میں ہمیں مل جانا چاہئے کیونکہ فوری ضرورت جو اس سال کی ہے وہ ایک ملین کی تو لازماً ہے اور بعد کی اگلے سال کی ضرورت چندوں سے بچت کے علاوہ پانچ لاکھ کے قریب ہوگی اور جس رفتار سے چندے بڑھ رہے ہیں میں سمجھتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ آگے وہ ضرورتیں چندوں ہی سے پوری ہوتی رہیں گی، کسی نئی تحریک کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور خاص طور پر اس لئے بھی مجھے امید ہے کہ یورپ میں جو نئے احمدی ہونے والے ہیں ان میں خصوصاً Albanian نسل کے لوگوں میں مالی قربانی کی روح پائی جاتی ہے اور بعض تو ایسے ہیں جو بڑے زور اور اصرار کے ساتھ پوچھ پوچھ کے کہ باقی کیا دیتے ہیں ہم سے وہ سب کچھ لو خود دینے کے لئے آگے آتے ہیں۔ تو بہت ماشاء اللہ حیرت انگیز قربانی کا جذبہ ہے جو

Albanian نسل کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ پس جب یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے، جب ان کی توفیق بڑھے گی تو یہ بعید نہیں کہ آئندہ چند سالوں میں بجائے اس کے کہ باہر سے مدد لیں خود باہر کے دوسرے علاقوں کے لئے مددگار بن جائیں۔

تو ان امیدوں کے ساتھ، ان دعاؤں کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ ان توقعات کے ساتھ جو ہمیشہ اپنے دائروں سے بڑھ کر پوری ہوتی ہیں۔ توقعات کے جو دائرے ہمارے ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ ان سے بڑھ کر پوری ہوتی ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور احسانات پر پورا توکل کرتے ہوئے اس نئے سال میں داخل ہوتے ہیں جو وقفِ جدید کا بیالیسواں سال ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ جیسا کہ شکر کا حق ہے شکر کی طرف بھی توجہ آپ کریں گے کیونکہ جب فضل بڑھیں اور شکر پیچھے رہ جائے تو یہ ایک بہت ہی تکلیف دہ توازن کا بگڑنا ہے۔ شکر ساتھ ساتھ بڑھنا چاہئے اور اس احساس کو دل پر قبضہ کر لینا چاہئے کہ ایک ایسے محسن سے واسطہ ہے جس کا جتنا بھی شکر کریں اتنا زیادہ احسان ہو جاتا ہے کہ سنبھالا نہیں جاتا۔ اس لئے ہمیشہ ہم پیچھے رہتے ہیں کبھی شکر میں آگے نہیں بڑھ سکتے اور یہ احساس ہی ہے جو شکر کی طاقت بڑھاتا ہے، ذکر کی طاقت بڑھاتا ہے خدا کی یاد میں پیار پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضلوں کے ساتھ جماعت کو ہمیشہ یہی توفیق بخشے گا کہ وہ جیسا کہ شکر کا حق ہے شکر کا حق ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی یادوں سے دل کو نور عطا کرتے ہوئے اس میدان میں ہمیشہ آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اشاریہ

خطبات طاہر جلد 15

(1996ء)

اشاریہ

اخلاق انجم صاحب مربی سلسلہ 911

اذان

ارتقاء

د، ڈ، ر، ز

دعوت الی اللہ

دل

دماغ

دن/دنیا

دہریت

دہلی

دیانت

عربی اشعار

فارسی شعر

شفاعت

شکر

شمالی امریکہ

حضرت مولانا جلال الدین شمس صاحبؓ

شوریٰ

شہزاد

شیخوپورہ

شیر محمود

شیطان

صادق صاحب مرحوم

مرزا صادق شر صاحب

حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ

نماز/نماز جنازہ

حضرت نوح علیہ السلام

نور

حضرت حکیم مولانا نور الدینؓ صاحب خلیفۃ المسیح الاول